مدینہ منورہ کی مبارک فضاؤں میں
ترتیب دی جانیوالی عظیم تفسیر
دور حاضر کے تقاضوں کے عین مطابق

جدید

گلدستہ تفاسیر

مرتب

حضرۃ مولانا عبد القیوم مہاجر مدنی دامت برکاتہم العالی

اردو کی چھ مستند تفاسیر سے منتخب

اول مکمل تفسیر عثمانی

تفسیر ابن کثیر

تفسیر مظہری

تفسیر عزیزی

معارف القرآن
حضرت مولانا مفتی اعظم رحمہ اللہ

معارف القرآن
حضرت مولانا کاندھلوی رحمہ اللہ

تفسیر میرٹھی
مولانا عاشق الٰہی میرٹھی رحمہ اللہ

پسند فرمودہ

حضرت مولانا قاری محمد عثمان نائب مہتمم دار العلوم دیوبند
حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب مدظلہ
حضرت مولانا مفتی عبد الستار صاحب رحمہ اللہ

تفسیری افادات و نکات

حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانی رحمہ اللہ — مجدد الملت حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ
شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ — حضرت علامہ شمس الحق افغانی رحمہ اللہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گلدستۂ تفاسیر

مدینہ منورہ کی مبارک فضاؤں میں
ترتیب دی جانیوالی عظیم تفسیر
دور حاضر کے تقاضوں کے عین مطابق

جلد ۳-۴

جدید گلدستہ تفاسیر

سورۃ الانفال تا سورۃ الحج

مرتب حضرۃ مولانا عبدالقیوم مہاجر مدنی مدظلہ العالی
مسترشد خاص
شیخ المشائخ حضرت مولانا عبدالغفور عباسی المدنی نوراللہ مرقدہ

پسند فرمودہ
حضرت مولانا مفتی عبدالستار صاحب رحمہ اللہ
حضرت مولانا مفتی عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ
حضرت مولانا قاری محمد عثمان نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند
حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب مدظلہ العالی
مفسر قرآن حضرت مولانا محمد اسلم شیخوپوری مدظلہ
حضرت مولانا محمد موسیٰ کرماڈی مدظلہ العالی

اوّل مکمل تفسیر عثمانی
تفسیر مظہری
تفسیر عزیزی
تفسیر ابن کثیر
معارف القرآن
حضرت مولانا مفتی اعظم رحمہ اللہ
معارف القرآن
حضرت مولانا کاندھلوی رحمہ اللہ
تفسیر میرٹھی
مولانا عاشق الٰہی میرٹھی رحمہ اللہ

تفسیری افادات ونکات
حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانی رحمہ اللہ
مجدد الملت حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ
شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ
حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب رحمہ اللہ
حضرت علامہ شمس الحق افغانی رحمہ اللہ

اِدارۂ تالیفاتِ اشرفیہ چوک فوارہ مُلتان پاکستان
(061-4540513-4519240)

گلدستہ تفاسیر

جملہ حقوق محفوظ ہیں

تاریخ اشاعت......................محرم الحرام ۱۴۲۸ھ

ناشر..........................ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان

طباعت..................سلامت اقبال پریس ملتان

انتباہ

اس کتاب کی کاپی رائٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں
کسی بھی طریقہ سے اس کی اشاعت غیر قانونی ہے

قانونی مشیر

قیصر احمد خان

(ایڈووکیٹ ہائی کورٹ ملتان)

قارئین سے گذارش

ادارہ کی حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔
الحمدللہ اس کام کیلئے ادارہ میں علماء کی ایک جماعت موجود رہتی ہے۔
پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو برائے مہربانی مطلع فرما کر ممنون فرمائیں
تاکہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاکم اللہ

ملنے کے پتے

ادارہ تالیفات اشرفیہ.... چوک فوارہ.... ملتان — اسلامی کتاب گھر... خیابان سرسید روڈ... راولپنڈی
ادارہ اسلامیات.......... انارکلی.......... لاہور — دارالاشاعت.......... اُردو بازار.......... کراچی
مکتبہ سید احمد شہید........ اردو بازار...... لاہور — مکتبۃ القرآن...... نیوٹاؤن............ کراچی
مکتبہ رحمانیہ........ اُردو بازار .... لاہور — مکتبہ دارالاخلاص... قصہ خوانی بازار...... پشاور
مکتبہ رشیدیہ........ سرکی روڈ.................. کوئٹہ

ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K
(ISLAMIC BOOKS CENTERE

119-121- HALLIWELL ROAD
BOLTON BL1 3NE. (U.K.)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

الحمدللہ کہ ''گلدستہ تفاسیر'' آپ کے ہاتھوں میں ہے اور یہ ضروری ہے کہ اس تفسیر کے باقاعدہ مطالعہ سے قبل اس سے متعلق ہماری معروضات آپ کے نظر نواز ہو جائیں جس سے اس تفسیر کی خصوصیات اور اس کی تالیف کی مشکلات سے آپ کو آگاہی ہو۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ یہ تفسیر چھ مستند تفاسیر کی تلخیص اور چھ مستند اکابرین یعنی حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ، قطب العالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ، حکیم الامت مجدّد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی رحمہ اللہ، اور علامۃ الزماں حضرت مولانا شمس الحق افغانی رحمہ اللہ کے تفسیری افادات و نکات کا مجموعہ ہے،

تو اس طرح اس تفسیر میں جو کچھ بھی ہے وہ اسلاف کی تفاسیر سے اقتباسات اور اکابرین علماء کے علوم و معارف کا انتخاب ہی ہے مرتب کی طرف سے اس میں ایک حرف بھی شامل نہیں کیا گیا۔

ہمارے والد ماجد حضرت مولانا حاجی عبدالقیوم مہاجر مدنی دامت برکاتہم العالیہ نہ صرف یہ کہ صاحب نسبت بزرگ ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے شیخ المشائخ حضرت مولانا عبدالغفور المدنی رحمہ اللہ سے اپنی اصلاح و تربیت کرائی اور پھر اہل حق نقشبندیہ اور چشتیہ تھانویہ سلسلہ میں ما شاء اللہ مجاز ہیں۔ اللہ کی طرف سے ان کو اس تفسیر کی تالیف و ترتیب کے دوران کئی ساری مبشرات سے بھی مشرف فرمایا گیا ہے جو اس تفسیر کے مقبول عنداللہ ہونے اور مسلمانوں کے لئے نفع مند ہونے کی علامات ہیں۔

ان مبشرات کے ساتھ ایک بشارت یہ بھی ہے کہ اس تفسیر کا کام مدینہ منورہ میں ہوا بلکہ بعض بعض مقامات تو ایسے ہیں جن پر نظر ثانی وغیرہ خود مسجد نبوی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) ہی میں ہوئی ہے اور یہ بات حصول برکت و قبولیت کا قوی وسیلہ ہے۔

اس تفسیر کیلئے حضرت والد صاحب دامت برکاتہم نے جس لگن سے کام کیا اور جس طرح ان کے اوقات میں برکت ڈال دی گئی اور ہمارے اشاعتی مراحل میں بھی جس طرح غیبی امداد کے کرشمے دیکھے گئے اس پر ہم رحمتِ خاص کے متوجہ ہونے کا یقین رکھتے ہیں۔ **اللھم لک الحمد ولک الشکر**

چونکہ یہ کام انتہائی عظیم اور بے حد احتیاط سے کرنے کا تھا اس لئے ہم نے پہلے فقط جلد اوّل شائع کی تا کہ اس پر اکابر علمائے کرام اور دیگر اہل علم حضرات کی آراء، راہنمائی اور تبصرے آ جائیں چنانچہ الحمدللہ حضرات علمائے کرام نے بڑی فراخدلی اور علمی دیانتداری کے ساتھ اپنی آراء سے نوازا ہم تہہ دل سے ان کے مشکور ہیں (جزاہم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء) اب ان حضرات کی رہنمائی کی روشنی میں ہم نے ترتیب و تالیف کا پورا کام کیا ہے تو گویا اب یہ کام اکابر علماء کی ایک بڑی جماعت کا پسند فرمودہ و تجویز کردہ ہے۔

بہرحال اپنی طرف سے اس کام میں بھرپور احتیاط سے کام لیا گیا ہے مگر اہلِ علم اور خصوصاً تصنیف و تالیف کے شعبہ سے وابستہ حضرات بہتر جانتے ہیں کہ اس راستہ کی مشکلات کیا ہوتی ہیں ایک نئی تصنیف کے مقابلہ میں مختلف اقتباسات کی ترتیب قدرے مشکل ہوتی ہے اس لئے اگر اصحاب علم اب بھی تفسیر کا کوئی مقام یا کوئی پہلو مشورہ کے قابل سمجھیں تو ہمیں ضرور اپنے مشورہ سے نوازیں اور جہاں کوئی بات صرف نظر کے قابل ہو تو وہاں اپنی شانِ کریمی سے نوازدیں۔ ؎ بہ پوش گر بخطائے رسی وطعنہ مزن کہ ہیچ نفس بشر خالی از خطا نبود

ہم نے اس کی اشاعت میں بھی ہر طرح کے حُسن و زیبائش کا پورا پورا خیال رکھنے کی کوشش کی ہے، تفسیر میں موقع و مقام کی مناسبت سے مقدس و تاریخی مقامات کی تصاویر دی ہیں تا کہ قارئین کو زیادہ فائدہ ہو اور ان کی طبیعت کی بشاشت بڑھے۔ خلاصہ یہ ہے ع ہم نے تو کچھ کمی نہ کی جو ہم سے ہو سکا

آخر میں ہم اپنے معاون حضرت مولانا زاہد محمود قاسمی صاحب مدظلہ (مدرّس قاسم العلوم ملتان) کے مشکور ہیں جنہوں نے گلدستہ تفاسیر کی ترتیب میں ہمارا بھرپور تعاون کیا اور طبع ہونے سے پہلے پورے مسودہ کو حرف بحرف پڑھا اللہ تعالیٰ ان کے علم و عمل میں برکت اور قبولیت عطاء فرمائیں، آمین۔

موجودہ ایڈیشن قارئین کی سہولت کیلئے جلد ۳-۴ اور جلد ۵-۶ کو اکٹھا کر کے مکمل 7 حصے پانچ جلدوں میں شائع کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ شرف قبولیت نصیب فرمائیں۔ محتاج دُعاء **محمد اسحٰق عفی عنہ** محرم ۱۴۲۸ھ

فہرست عنوانات

سورة الانفال تا سورة ابراهیم

سورة انفال

سورة الانفال
تا
سورة الحج

سورۃ الانفال

سورۂ انفال مدینہ منورہ میں نازل ہوئی اوراس کی پچھتر (۷۵) آیتیں اوردس رکوع ہیں

جوشخص اس کوخواب میں پڑھے گا اس کی تعبیر یہ ہے کہ اس کوعزت وکامیابی کا تاج ملے گا اور وہ اپنے دین میں سلامت رہے گا۔ (ابن سیرین رحمہ اللہ)

ظلم کی انتہا:

مکہ کی سیز دہ سالہ زندگی میں مشرکین نے جو دردناک اور ہوشربا مظالم مٹھی بھر مسلمانوں پر روار کھے اور مظلوم مسلمانوں نے جس صبر واستقلال اور معجز نما استقامت وللہیت سے مسلسل تیرہ برس تک ان ہولناک مصائب ونوائب کا تحمل کیا، وہ دنیا کی تاریخ کا بیمثال واقعہ ہے۔ قریش اور ان کے حامیوں نے کوئی صورت ظلم وستم کی اٹھا کر نہ رکھی۔ تاہم مسلمانوں کو حق تعالیٰ نے ان وحشی ظالموں کے مقابلہ میں ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہ دی۔ صبر وتحمل کے امتحان کی آخری حد یہ تھی کہ مسلمان مقدس وطن، عزیز و اقارب، اہل وعیال مال ودولت سب چیزوں کو خیر باد کہہ کر خالص خدا و رسول کی خوشنودی کا راستہ طے کرنے کے لئے گھروں سے نکل پڑے۔

قتال کی اجازت:

جب مشرکین کا ظلم وتکبر اور مسلمانوں کی مظلومیت وبیکسی حد سے گزر گئی۔ ادھر اہل ایمان کے قلوب وطن وقوم، زن وفرزند، مال ودولت غرض ہر ایک ماسویٰ اللہ کے تعلق سے خالی اور پاک ہوکر محض خدا اور سول کی محبت اور دولتِ توحید واخلاص سے ایسے بھرپور ہوگئے کہ گویا غیر اللہ کی ان میں گنجائش ہی نہ رہی۔ تب ان مظلوموں کی جو تیرہ برس سے برابر کفار کے ہر قسم کے حملے سہہ رہے تھے اور وطن چھوڑنے پر بھی امن حاصل نہ کر سکے تھے، ظالموں سے لڑنے اور بدلہ لینے کی اجازت دی گئی لَقَدِيْرُ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ (الحج رکوع ۶)

ابتدائی لائحہ عمل: مکہ کا ادب مانع تھا کہ مسلمان ابتداء وہاں چڑھ کر جائیں اس لئے ہجرت کے بعد تقریباً ڈیڑھ سال تک لائحہ عمل یہ رہا کہ مشرکین "مکہ" کے تجارتی سلسلوں کو جو شام ویمن وغیرہ سے قائم تھے، شکست دے کر ظالموں کی اقتصادی حالت کمزور اور مسلمانوں کی مالی پوزیشن مضبوط کی جائے۔ ہجرت کے پہلے سال "ابواء" بواط، عشیرہ وغیرہ چھوٹے چھوٹے غزوات وسرایا جن کی تفصیل کتب احادیث وسیر میں ہے، اسی سلسلہ میں وقوع پذیر ہوئے۔

غزوۂ بدر: ۲ھ میں آپ کو معلوم ہوا کہ ایک بھاری تجارتی مہم ابو سفیان کی سرکردگی میں شام کو روانہ ہوئی ہے۔ ابوسفیان کا یہ تجارتی قافلہ جس کے ساتھ تقریباً ساٹھ قریشی ایک ہزار اونٹ اور پچاس ہزار دینار کا مال تھا، جب شام سے مکہ کو واپس ہوا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر پہنچی۔ صحیح مسلم کی ایک روایت کے موافق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے مشورہ لیا کہ آیا اس جماعت سے تعرض کیا جائے، طبری کے بیان کے موافق بہت سے لوگوں نے اس مہم میں جانے سے پہلوتہی کی کیونکہ انہیں کسی بڑی جنگ کا خطرہ نہ تھا جس کے لئے بڑا اجتماع واہتمام کیا جائے۔ دوسرے "انصار" کی نسبت عموماً یہ بھی خیال کیا جاتا تھا کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نصرت وحمایت کا معاہدہ صرف اس صورت میں کیا ہے کہ کوئی قوم مدینہ پر چڑھائی کرے یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ آور ہو۔ ابتداءً اقدام کر کے جانا خواہ کسی صورت میں ہو، ان کے معاہدہ میں شامل نہ تھا۔ مجمع کا یہ رنگ دیکھ کر ابوبکر وعمر اور رئیس انصار سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہم نے حوصلہ افزا تقریریں کیں۔ آخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تین سو سے کچھ زائد آدمیوں کی جمعیت لے کر قافلہ کی طرف روانہ ہوگئے چونکہ کسی بڑے مسلح لشکر سے مڈبھیڑ ہونے کی توقع نہ تھی اس لئے جمعیت اور سامان اسلحہ وغیرہ کا زیادہ اہتمام نہیں کیا گیا، فی الوقت جو لوگ اکٹھے ہوگئے سرسری سامان کے ساتھ روانہ ہوگئے۔ اسی لئے بخاری کی روایت میں حضرت کعب بن مالک فرماتے ہیں کہ "جو لوگ غزوۂ بدر میں شریک نہیں ہوئے ان پر کوئی عتاب نہیں ہوا، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم صرف تجارتی مہم کے ارادے سے نکلے تھے۔ اتفاقاً خدا نے باقاعدہ جنگ کی صورت پیدا فرمادی"۔ ابوسفیان کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادہ کا پتہ چل گیا۔ اس نے فوراً مکہ آدمی بھیجا۔ وہاں سے تقریباً ایک ہزار کا لشکر جس میں قریش کے بڑے بڑے سردار تھے، پورے سازوسامان کے ساتھ مدینہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مقام صفراء میں تھے جب معلوم ہوا کہ ابوجہل وغیرہ بڑے بڑے ائمة الكفر کی کمانڈ میں مشرکین کا لشکر یلغار کرتا چلا آرہا ہے۔ اس غیر متوقع صورت کے پیش آجانے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو اطلاع کی کہ اس وقت دو جماعتیں تمہارے سامنے ہیں۔ تجارتی قافلہ اور فوجی لشکر، خدا کا وعدہ ہے کہ دونوں میں سے کسی ایک پر تم کو مسلط کریگا۔ تم بتلاؤ کہ کس جماعت کی طرف بڑھنا چاہتے ہو؟ چونکہ اس لشکر کے مقابلہ میں تیاری کر کے نہ آئے تھے۔ اس لئے اپنی تعداد اور سامان وغیرہ کی قلت

کو دیکھتے ہوئے بعض لوگوں کی رائے یہ ہوئی کہ تجارتی قافلہ پر حملہ کرنا زیادہ مفید اور آسان ہے۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس رائے سے خوش نہ تھے۔ حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ اور مقداد بن الاسود نے ولولہ انگیز جوابات دیئے اور اخیر میں حضرت سعدؓ بن معاذ کی تقریر کے بعد یہ ہی فیصلہ ہوا کہ فوجی مہم کے مقابلہ پر جوہر شجاعت دکھلائے جائیں۔

کفر کی شکست:

چنانچہ مقام بدر میں دونوں فوجیں بھڑ گئیں۔ حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عظیم عنایت فرمائی۔ کافروں کے ستر بڑے بڑے سردار مارے گئے اور ستر قید ہوئے۔ اس طرح کفر کا زور ٹوٹا اس سورۃ میں عموماً اسی واقعہ کے اجزاء و متعلقات کا بیان ہوا ہے۔

خود ساختہ خیال:

جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اس سفر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم شروع ہی سے فوجی لشکر کے مقابلہ میں نکلے تھے جو "مدینہ" پر از خود اقدام کرتا ہوا چلا آ رہا تھا، تجارتی قافلہ پر حملہ کرنے کی نیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اول سے آخر تک کسی وقت نہیں کی، وہ فی الحقیقۃ اپنے ایک خود ساختہ اصول پر تمام ذخیرۂ حدیث و سیر اور اشاراتِ قرآنیہ کو قربان کرنا چاہتے ہیں۔ یہ منطق ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ کفار محاربین جن کی دستبرد سے مسلمانوں کی جان و مال کوئی چیز نہ بچی اور نہ آئندہ بچنے کی توقع تھی، ان کو جانی و بدنی نقصان پہنچانا تو جائز سمجھا جائے لیکن تجارتی اور مالی نقصان پہنچانا خلاف تہذیب و انسانیت ہو یعنی ان کی جانیں تو ظلم و شرارت اور کفر و طغیان کی بدولت محفوظ نہیں رہیں مگر اموال بدستور محفوظ ہیں گویا زندگی کے حق سے محروم ہو جائیں تو ہو جائیں، پر سامان زندگی سے محروم نہ ہوں۔ اِنَّ ھٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ باقی یہ دعویٰ کہ جو لوگ حملہ آور نہ ہوئے ہوں، ان پر مسلمانوں کو از خود حملہ کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ کے خلاف ہوگا۔ قطع نظر اس سے کہ یہ مسئلہ موجودہ واقعہ سے بے تعلق ہے، کیونکہ کفار مکہ پہلے ہر قسم کے مظالم اور حملے مسلمانوں پر کر چکے تھے اور آئندہ کے لئے باقاعدہ دھمکیاں دے رہے تھے بلکہ اس بارہ میں ان کی سازشیں اور مراسلتیں جاری تھیں۔ فی نفسہٖ بھی صحیح نہیں کیونکہ یہ آیت ابتدائے ہجرت میں اتری تھی جس کے بعد دوسری آیات جن میں مطلق قتال کا حکم ہے نازل ہوئیں۔ پھر یہ بھی قابلِ غور ہے کہ صرف اتنا کہنے سے کہ حملہ آوروں کی مدافعت کرو۔ یہ لازم نہیں آتا کہ کسی حالت میں حملہ کرنے کی اجازت نہیں۔ اس مسئلہ کی تفصیل میرے عزیز مولوی محمد یحییٰ سلمہ نے جو تحریر فوائد میں میرے معین ہیں اپنے رسالہ "الجہاد الکبیر" میں لکھی ہے۔ اور احقر نے کچھ خلاصہ رسالہ "الشہاب" میں درج کیا ہے اور موقع بہ موقع فوائد میں بھی لکھا جائے گا۔ ان شاء اللہ! (تفسیر عثمانی)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے
یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ
تجھ سے پوچھتے ہیں حکم غنیمت کا تو کہہ دے کہ مال غنیمت اللہ کا
وَالرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ
ہے اور رسول کا سو ڈرو اللہ سے اور صلح کرو
بَیْنِكُمْ ۪ وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ
آپس میں اور حکم مانو اللہ کا اور اس کے رسول کا اگر
مُّؤْمِنِیْنَ ① اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا
ایمان رکھتے ہو ایمان والے وہی ہیں کہ جب
ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِیَتْ
نام آئے اللہ کا تو ڈر جائیں ان کے دل اور جب پڑھا جائے
عَلَیْهِمْ اٰیٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِیْمَانًا وَّعَلٰی رَبِّهِمْ
ان پر اس کا کلام تو زیادہ ہو جاتا ہے ان کا ایمان اور وہ اپنے رب پر
یَتَوَكَّلُوْنَ ② الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ
بھروسہ رکھتے ہیں وہ لوگ جو کہ قائم رکھتے ہیں نماز کو
وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ③ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ
اور ہم نے جوان کو روزی دی ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں وہی ہیں
حَقًّا ؕ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ
سچے ایمان والے ان کے لئے درجے ہیں اپنے رب کے پاس

وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝

اور معافی اور روزی عزت کی

مالِ غنیمت کا مالک اللہ ہے:

''بدر'' میں جو مالِ غنیمت ہاتھ آیا اس کے متعلق صحابہؓ میں نزاع تھی۔ نوجوان جو آگے بڑھ کر لڑے تھے وہ کل مالِ غنیمت کو اپنا حق سمجھتے تھے۔ پرانے لوگ جو نوجوانوں کی پشت پر تھے، ان کا یہ کہنا تھا کہ ہمارے سہار الگانے سے فتح ہوئی۔ لہٰذا غنیمت ہم کو ملنی چاہئے۔ ایک جماعت جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کرتی رہی تھی وہ اپنے کو اس مال کا مستحق سمجھتی تھی۔ ان آیات میں بتلا دیا کہ فتح صرف اللہ کی مدد سے ہے۔ کسی کا سہارا اور زور پیش نہیں جاتا۔ سو مال کا مالک خدا ہے۔ پیغمبر اس کے نائب ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ اپنے رسول کی معرفت حکم دے، اسی کے موافق غنیمت تقسیم ہونی چاہئے (اس حکم کی تفصیل آگے آئے گی) پکے مسلمانوں کا کام یہ ہے کہ ہر معاملہ میں خدا سے ڈریں۔ آپس میں صلح و آشتی سے رہیں، ذرا ذرا سی بات پر جھگڑے نہ ڈالیں، اپنی آراء و جذبات سے قطع نظر کر کے محض خدا و رسول کا حکم مانیں، جب خدا کا نام درمیان میں آجائے، ہیبت و خوف سے کانپ اٹھیں، آیات و احکام الٰہی سن کر ان کا ایمان و یقین زیادہ مضبوط ہوتا رہے۔ اس قدر مضبوط و قوی ہو جائے کہ ہر معاملہ میں ان کا اصلی بھروسہ اور اعتماد بجز خدا کے کسی پر باقی نہ رہے۔ اسی کے سامنے سر عبودیت جھکائیں، اسی کے نام پر مال و دولت خرچ کریں۔ غرض عقیدہ، خلق، عمل اور مال ہر چیز سے خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش میں رہیں۔ ایسے ہی لوگوں کو سچا اور پکا ایماندار کہا جا سکتا ہے جو خدا کے یہاں اپنے درجہ کے موافق بڑے بڑے مقامات و مراتب قرب پر فائز ہوں گے۔ جنہیں معمولی کوتاہیوں سے درگزر کر کے عزت کی روزی سے سرفراز کیا جائے گا۔ رزقنا الله منه بفضله و منه (تفسیر عثمانی)

''اَنفال'' کا معنیٰ:

مالِ غنیمت وہ ہے جو جنگ و جہاد کے ذریعہ ہاتھ آئے اور مالِ فئے وہ جو بغیر قتال و جہاد کے ہاتھ آجائے۔ اور لفظ انفال دونوں کے لئے عام بھی بولا جاتا ہے اور خاص اس انعام کو بھی کہتے ہیں جو کسی غازی کو امیرِ جہاد عطا کرے ہے۔ جیسا ایک حدیث قدسی میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بندہ جب اطاعت و عبدیت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے بارہ میں یہ فرماتے ہیں کہ میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں وہ جو کچھ دیکھتا ہے میرے ذریعہ دیکھتا ہے میں اس کے کان بن جاتا ہوں وہ جو کچھ سنتا ہے میرے ذریعہ سنتا ہے۔ میں اس کے ہاتھ پاؤں بن جاتا ہوں وہ جس کو پکڑتا ہے میرے ذریعہ پکڑتا ہے جس کی طرف چلتا ہے میرے ذریعہ چلتا ہے۔ خلاصہ اس کا یہی ہے کہ حق تعالیٰ کی خاص نصرت و امداد اس کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ جن افعال کا صدور بظاہر اس کے آنکھ کان یا ہاتھ پاؤں سے ہوتا ہے، درحقیقت اس میں قدرت حق تعالیٰ شانہ کی کارفرمائی ہوتی ہے

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست میبرد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

مادی اسباب نہ چھوڑو:

حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کے یہ معنی نہیں کہ اپنی ضروریات کے لئے مادی اسباب اور تدابیر کو ترک کر کے بیٹھ جائے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ مادی اسباب و آلات کو اصل کامیابی کے لئے کافی نہ سمجھے بلکہ بقدر قدرت و ہمت مادی اسباب اور تدابیر کو فراہم کرنے اور استعمال کرنے کے بعد معاملہ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرے اور سمجھے کہ اسباب بھی اسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں اور ان اسباب کے ثمرات بھی وہی پیدا کرتے ہیں۔ ہوگا وہی جو وہ چاہیں گے۔ ایک حدیث میں فرمایا اجملوا في الطلب وتوكلوا عليه یعنی رزق اور اپنی حاجات کے حاصل کرنے کے لئے متوسط درجہ کی طلب اور مادی اسباب کے ذریعہ کوشش کرلو پھر معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کرو۔ اپنے دل و دماغ کو صرف مادی تدبیروں اور اسباب ہی میں نہ اُلجھا رکھو۔

دو قسم کا ایمان:

ایک شخص نے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ اے ابو سعید کیا آپ مؤمن ہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ بھائی ایمان دو قسم کے ہیں۔ تمہارے سوال کا مطلب اگر یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں کتابوں اور رسولوں پر اور جنت دوزخ اور قیامت اور حساب کتاب پر ایمان رکھتا ہوں تو جواب یہ ہے کہ بیشک میں مؤمن ہوں۔ اور اگر تمہارے سوال کا مطلب یہ ہے کہ میں وہ مؤمن کامل ہوں جس کا ذکر سورۃ انفال کی آیات میں ہے تو مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میں ان میں داخل ہوں یا نہیں۔ سورۃ انفال کی آیات سے وہی آیات مراد ہیں جو ابھی آپ نے سنی ہیں۔ (معارف القرآن، مفتی اعظمؒ)

فتح کمزوروں کی برکت سے ملتی ہے:

محمد یوسف صالحی نے سبیل الرشاد میں لکھا ہے کہ جب رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم نے مالِ غنیمت کو برابر برابر تقسیم کرنے کا حکم دیا تو حضرت سعد بن معاذؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سوار کو جو قوم کی حفاظت کرتا ہے اتنا ہی دے رہے ہیں جتنا ایک کمزور آدمی کو (جو اپنی بھی حفاظت نہیں کر سکتا دوسروں کو تو کیا بچائے گا) فرمایا تیری ماں تجھے روئے کیا (تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ) تم کو فتح کمزوروں کی (برکات اور دعاؤں) کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منادی نے ندا لگا دی جس نے کسی (کافر جنگی) کو قتل کیا ہو اس سے چھینا ہوا مال قتل کرنے والے کا ہے اور جس نے کسی کو قید کیا ہو تو وہ قیدی اسی کا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قاتل کو مقتول (کافر) سے چھینا ہوا مال عنایت فرما دیتے تھے۔

مسلمانوں کے مختلف گروہوں کا خیال:

سعید بن منصور، امام احمد، ابن المنذر، ابن حبان اور حاکم نے سنن میں حضرت عبادہؓ بن صامت کی روایت سے بیان کیا مسلمانوں کا کافروں سے مقابلہ ہوا اللہ نے دشمن کو شکست دے دی۔ مسلمانوں کے ایک گروہ نے بھاگنے والوں کا تعاقب کیا کسی کو قید اور کسی کو قتل کرنے لگے۔ دوسرا گروہ میدانِ جنگ میں جا گھسا اور مالِ غنیمت جمع کرنے لگا اور تیسرا گروہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے احاطہ میں لئے رہا کہیں دشمن دھوکہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی دکھ نہ پہنچا دے۔ جن لوگوں نے مالِ غنیمت جمع کیا تھا انہوں نے کہا مال ہم نے جمع کیا ہے اس لئے (ہمارے سوا) کسی اور کا اس میں حصہ نہیں ہے۔ جو لوگ دشمن کے تعاقب میں گئے تھے انہوں نے کہا تم ہم سے زیادہ حقدار نہیں ہو ہم نے دشمن کو نکالا اور شکست دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محافظ دستہ نے کہا تم میں سے کوئی بھی ہم سے زیادہ مستحق نہیں ہے۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے گھیرے میں لئے رہے اور حفاظت کرتے رہے کہیں دشمن غفلت میں کوئی دکھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ پہنچا دے ہم اسی حفاظت میں لگے رہے۔ اسی پر آیات يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ کا نزول ہوا۔

یقینی جنتی مؤمن:

علقمہؒ کا بیان ہے ایک سفر میں ہماری ملاقات کچھ لوگوں سے ہوئی۔ ہم نے پوچھا تم کون لوگ ہو۔ انہوں نے جواب دیا نحن المؤمنون حقاً ہم یقیناً پکے مؤمن ہیں ہم لاجواب ہو گئے سمجھ میں نہ آیا کہ ان سے کیا کہیں۔ جب حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا اور ہم نے یہ واقعہ حضرت سے عرض کیا تو آپ نے پوچھا تم نے کیا جواب دیا۔ ہم نے عرض کیا ہم کچھ جواب نہ دے سکے۔ فرمایا تم نے ان سے یہ کیوں نہ پوچھا کہ کیا تم یقینی جنتی ہو مؤمنین حق تو یقینی جنتی ہوتے ہیں۔

مسئلہ: امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک انا مؤمن ان شاء اللہ کہنا ہی مکروہ ہے کیونکہ اس سے ایمان میں شک ہونے کا وہم پیدا ہوتا ہے بلکہ انا مؤمن کے بعد ان شاء اللہ کہنے کی بجائے حقا کہنا صحیح ہے۔ انا مؤمن حقاً کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے اپنا خاتمہ بخیر اور برایمان ہونے کا قطعی یقین ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ اس وقت میں قطعی مؤمن ہوں میرا ایمان شک وشبہ سے پاک ہے۔

حضرت قتادہؒ اور امام ابوحنیفہؒ کا مکالمہ:

امام ابوحنیفہؒ نے قتادہؒ سے پوچھا آپ اپنے ایمان کو ان شاء اللہ سے مشروط کیوں کرتے ہیں۔ قتادہؒ نے جواب دیا حضرت ابراہیمؑ کے اس قول کی تقلید میں حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا تھا، وَالَّذِيْٓ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓئَتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ (یعنی مجھے طمع ہے کہ قیامت کے دن اللہ میرے قصور کو معاف کر دے؛ اس میں لفظ طمع آیا ہے کہ جو عدم یقین پر دلالت کر رہا ہے) امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا آپ نے حضرت ابراہیمؑ کے اس قول کی تقلید کیوں نہیں کی کہ جب اللہ نے ان سے فرمایا اَوَلَمْ تُؤْمِنْ کیا تو ایمان نہیں لایا تو حضرت ابراہیمؑ نے جواب دیا بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ (یعنی ایمان کیوں نہیں لایا مگر میں قلبی اطمینان کے لئے مشاہدہ کرنا چاہتا ہوں)

جنت الفردوس کی دُعاء مانگو:

حضرت عبادہؓ بن صامت راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنت کے اندر سو درجات ہیں ہر درجہ کا دوسرے درجہ سے فاصلہ اتنا ہے جتنا آسمان زمین کے درمیان ہے فردوس کا سب سے اونچا درجہ ہے۔ اسی سے جنت کی چاروں نہریں نکلتی ہیں اس سے اوپر عرش ہوگا۔ دعاء کرتے وقت تم اللہ سے فردوس مانگا کرو۔ (رواہ الترمذی)

جنت کے درجات:

بغوی نے لکھا ہے کہ ربیع بن انسؓ نے فرمایا ستر درجے ہیں ہر درجہ کی دوسرے درجہ سے مسافت اتنی ہے جتنی مسافت اس دوڑ کے میدان کی ہوتی ہے جس میں مشاق سوار گھوڑا ستر برس تک دوڑاتا چلا جائے۔ (تفسیر مظہری)

فوجیوں کے انعام کے چار طریقے:

ابوعبیدؒ کہتے ہیں کہ امام اگر فوج کے افراد کو کوئی انعام دے جوان کے

مقررہ حصے کے علاوہ ہو تو اس کو نفل یا انفال کہتے ہیں اور یہ اس کی کار گزاریوں اور دشمن پر زوردار حملہ کا لحاظ کرتے ہوئے ہوتا ہے۔ یہ نفل جو امام کی طرف سے اعترافِ حسن کارگزاری کے طور پر ملتا ہے چار طریقوں پر ہوتا ہے۔ ہر طریقہ اپنی جگہ پر دوسرے طریقہ سے الگ ہے۔ ایک تو مقتول کا لوٹا ہوا مال و اسباب اُس میں سے کوئی پانچواں حصہ نہیں نکالا جاتا۔ دوسرا وہ نفل جو پانچواں حصہ الگ کرنے کے بعد دیا جاتا ہے۔ مثلاً امام نے کوئی چھوٹا سا لشکر دشمن پر بھیج دیا وہ غنیمت کا مال لے کر پلٹا تو امام اس میں سے اس لشکر کو چوتھائی یا تہائی اپنے حسب صوابدید تقسیم کر دے۔ تیسرا یہ طریقہ کہ جو خمس نکال کر باقی تقسیم کیا جانے والا ہے اس میں سے اپنے حسب صوابدید اور حسب کارگزاری جس کو جتنا مناسب سمجھے دے اور باقی تقسیم کر دے۔ چوتھی صورت یہ کہ ساری غنیمت میں سے نفل دے قبل اس کے کہ خمس نکالے۔

جنت کے محلات کی قیمت:

انسؓ کہتے ہیں کہ ہم نے ایک دفعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرا رہے ہیں تو حضرت عمرؓ نے پوچھا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کونسی چیز ہنسی کا سبب ہوئی؟ تو فرمایا کہ میرے دو امتی خدا کے سامنے گھٹنے ٹیک کر کھڑے ہوگئے ہیں۔ ایک خدا سے کہتا ہے کہ یارب اس نے مجھ پر ظلم کیا ہے میں بدلہ چاہتا ہوں۔ اللہ پاک اس سے فرماتا ہے کہ اپنے ظلم کا بدلہ ادا کرو۔ ظالم جواب دیتا ہے، یارب اب میری کوئی نیکی باقی نہیں رہی کہ ظلم کے بدلے میں اسے دے دوں۔ تو وہ مظلوم کہتا ہے کہ اے خدا! میرے گناہوں کا بوجھ اس پر لاد دے۔ یہ کہتے ہوئے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم آبدیدہ ہوگئے اور فرمانے لگے کہ وہ بڑا ہی سخت دن ہوگا۔ لوگ اس بات کے حاجت مند ہوں گے کہ اپنے گناہوں کا بوجھ کسی اور کے سر دھر دیں۔ اب اللہ پاک طالب انتقام سے فرمائے گا کہ نظر اٹھا کر جنت کی طرف دیکھ! وہ سر اٹھائے گا جنت کی طرف دیکھے گا اور عرض کرے گا، یا رب! اس میں تو چاندی اور سونے کے محل ہیں موتیوں کے بنے ہوئے ہیں۔ یارب! یہ محل کسی نبی اور کس صدیق اور شہید کے ہیں؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا جو اس کی قیمت ادا کرتا ہے اس کو دے دیئے جاتے ہیں۔ وہ کہے گا، یارب! کون اس کی قیمت ادا کر سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تو اس کی قیمت ادا کر سکتا ہے۔ اب وہ عرض کرے گا۔ یارب کس طرح؟ اللہ جل شانہ ارشاد فرمائے گا وہ اس طرح کہ تو اپنے بھائی کو معاف کر دے وہ کہے گا، یارب میں نے معاف کیا۔ اللہ پاک فرمائے گا، اب تم دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے جنت میں داخل ہو جاؤ، اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ "خدا سے ڈرو، آپس میں صلح قائم رکھو کیونکہ قیامت کے روز اللہ پاک بھی مؤمنین کے درمیان آپس میں صلح کرانے والا ہے۔"

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّ
جیسے نکالا تجھ کو تیرے رب نے تیرے گھر سے حق کام کے واسطے اور
فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۝٥
ایک جماعت اہل ایمان کی راضی نہ تھی
يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا
وہ تجھ سے جھگڑتے تھے حق بات میں اسکے ظاہر ہو چکنے کے بعد
يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝٦
گویا وہ ہانکے جاتے ہیں موت کی طرف آنکھوں دیکھتے

اللہ کی توفیق اور امداد پر غور کرو:

یعنی سوچو کہ اس جنگ (بدر) میں شروع سے آخر تک کس طرح حق تعالیٰ کی تحریک و تائید اور امداد و توفیق مسلمانوں کے حق میں کارفرما رہی۔ خدا ہی تھا جو نصرت دین اسلام کے حق (سچے) وعدے کر کے اپنے نبی کو ایک امر حق یعنی کفار کے ساتھ جہاد کرانے کے لئے مدینہ سے باہر بدر کے میدان میں اس وقت لے آیا۔ جبکہ ایک جماعت مسلمانوں کی لشکر قریش سے نبرد آزمائی کرنے پر راضی نہ تھی۔ یہ لوگ ایسی سچی اور طے شدہ چیز میں پس و پیش کر رہے اور حجتیں نکال رہے تھے جس کی نسبت بذریعہ پیغمبر انہیں ظاہر ہو چکا تھا کہ وہ یقیناً خدا کی فرمائی ہوئی اٹل بات ہے (یعنی اسلام و پیروانِ اسلام کا بذریعہ جہاد غالب و منصور ہونا) ابوجہل کے لشکر سے مقابلہ کرنا ان کو اس قدر شاق اور گراں تھا جیسے کسی شخص کو آنکھوں دیکھتے موت کے منہ میں جانا مشکل ہے۔ تاہم خدا اپنی توفیق سے ان کو میدان جنگ میں لے گیا اور اپنی امداد سے مظفر و منصور واپس لایا۔ پس جیسے خدا ہی کی مدد سے از اول تا آخر یہ مہم سر ہوئی، مال غنیمت بھی اسی کا سمجھنا چاہئے وہ اپنے پیغمبر کے ذریعہ سے جہاں بتلائے وہاں خرچ کرو۔ (تنبیہ) کما اخرجک الخ کے کاف کو میں نے اپنی تقریر میں صرف تشبیہ کے لئے نہیں لیا، بلکہ ابوحیان کی تحقیق کے موافق معنی

تعلیل پر مشتمل رکھا ہے جیسے وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ میں علماء نے تصریح کی ہے۔اور اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ الی آخرالآیات کے مضمون کو میں نے اَلْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ کا ایک سبب قرار دیا ہے۔ابوحیان کی طرح " اعزک الله " وغیرہ مقدر نہیں مانا۔ نیز تقریر آیت میں صاحب" روح المعانی " کی تصریح کے موافق اشارہ کردیا ہے کہ " اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ " میں صرف آنِ خروج من البیت مرادنہیں۔ بلکہ خروج من البیت سے دخول فی الجهاد تک کا ممتد اور وسیع زمانہ مراد ہے۔جس میں " وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ " وغیرہ سب احوال کا وقوع ہوا۔ ایک فریق کی کراہیت تو عین خروج من المدینہ ہی کے وقت ظاہر ہوگئی جسے ہم صحیح مسلم اور طبری کے حوالہ سے سورۃ الانفال کے پہلے فائدہ میں بیان کر چکے ہیں اور مجادلہ کی صورت غالباً آگے چل کر لشکر کی اطلاع ملنے پر مقام صفراء میں پیش آئی۔اس کے سمجھ لینے سے بعض مبطلین کے مغالطات کا استیصال ہوجائے گا۔(تفسیر عثمانی)

صحابہ کرام کی جاں نثاری:

ابو وقاص لیثیؒ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بدر کی طرف سب کو لے کر نکلے اور مقام روحاء میں پہنچ کر لوگوں کے سامنے خطبہ دیا اور کہا تم لوگوں کی کیا رائے ہے؟ تو ابوبکرؓ نے کہا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہمیں علم ہو چکا ہے کہ یہ کفار یہاں یہاں تک پہنچ چکے ہیں۔ پھر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم لوگوں کی کیا رائے ہے؟ اب کی مرتبہ عمرؓ نے بھی ابوبکرؓ کی طرح جواب دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر اور ایک بار یہ سوال کیا تو سعد ابن معاذؓ نے کہا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد ہم سے ہے، خدا کی قسم میں نہ کبھی برک الغماد گیا ہوں نہ مجھے اس کی راہ کا علم ہے لیکن اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم یمن کے برک الغماد تک بھی جائیں تو بھی ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلیں گے اور امتِ موسیٰ کی طرح نہ کہیں گے کہ تم اور تمہارا رب جا کر لڑ لو ہم یہیں سے تمہارا ساتھ دیں گے۔ ممکن ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نکلنے کے وقت کسی اور غرض سے نکلے ہوں، پھر اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کوئی دوسری صورت پیدا کر دی ہو، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو صورت چاہیں اختیار کریں۔ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دینا چاہتا ہے دے اور جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ٹوٹنا چاہتا ہے ٹوٹ جائے، جو چاہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مخالف بن جائے اور جو چاہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے صلح کر کے رہے۔ ہمارا مال جو کچھ ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب لے سکتے ہیں۔ سعدؓ کے اسی قول کی بنا پر وہ آیت اتری۔ (تفسیر ابن کثیر)

غزوۂ بدر

تجارتی قافلہ: ابن عقبہ اور ابن عابد نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی کہ قریش کا ایک قافلہ جس میں ہزار اونٹوں پر بڑا قیمتی تجارتی سامان لدا ہوا ہے۔ ابوسفیان بن حرب کی نگرانی میں شام سے آرہا ہے اور کوئی قریشی مرد یا عورت ایسا نہیں بچا ہے، جس کے پاس ایک مثقال بھی ہوا اور اس نے اس تجارت میں حصہ نہ لیا ہو۔ کہا جاتا ہے کہ اس قافلہ میں پچاس ہزار دینار ہیں اور ستر آدمی ساتھ ہیں۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ حضرت عبداللہ بن زبیر محمد بن اسحاق اور سدی کا بیان ہے کہ ابوسفیان چالیس سواروں کے ساتھ شام سے واپس آرہا تھا۔ یہ چالیس سوار قریش کے بڑے لوگ تھے جن میں عمرو بن عاص اور مخرمہ بن نوفل زہری بھی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو باہر نکل چلنے کی دعوت دی اور فرمایا قریش کا یہ قافلہ ہے جس میں قریش کا بہت مال ہے چلو نکل چلیں۔ شاید اللہ تم کو ان کا مالِ غنیمت عطا فرما دے۔ لوگوں نے دعوت قبول کی کچھ لوگ ہلکے (یعنی بغیر ساز و سامان اور اسلحہ کے) تھے اور کچھ بھاری (ساز و سامان اور اسلحہ کے ساتھ) بہت سے لوگ ساتھ نہیں بھی گئے مگر ان کو قابلِ ملامت نہیں قرار دیا گیا کیونکہ ان کو خیال بھی نہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی لڑائی پیش آئے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کچھ زیادہ پرواہ نہیں کی اور فرمایا جس کے پاس سواری موجود ہو ہمارے ساتھ سوار ہو کر چلے کچھ لوگوں نے اجازت طلب کی کہ ہماری سواریاں بالائی مدینہ میں ہیں ہم جا کر لے آئیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں صرف وہ شخص جائیں جن کی سواریاں اس وقت موجود ہوں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خفیہ فوج:

مدینہ سے روانہ ہونے سے دس روز پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طلحہؓ بن عبید اللہ اور سعیدؓ بن زید کو شام کے راستہ کی طرف قافلہ کی ٹوہ لگانے کے لئے بھیج دیا تھا۔ یہ دونوں حضرات سرزمین خوار میں پہنچ کر کشد بن مالک جہنی کے پاس مقیم ہوئے۔ کشد نے دونوں کو اپنی ذمہ داری میں اپنے پاس چھپا کر رکھ لیا۔ جب قافلہ گزر گیا تو دونوں حضرات کشد کے گھر سے باہر آگئے اور کشد ان کو مقام ذوالمروہ تک پہنچا گیا۔ دونوں بزرگ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قافلہ کی اطلاع دینے پہنچے تو حضور صلی اللہ

علیہ وسلم مدینہ سے نکل رہے تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قبضہ ینبوع پر ہوگیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کشد کو ینبوع جاگیر میں کاٹ دیا تھا۔ کشد نے عرض کیا تھا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں تو بوڑھا ہوں (آج مرا کل دوسرا دن) میرے بھتیجے کے نام یہ جاگیر کر دیجئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کشد کے بھتیجے کے نام ینبوع کی جاگیر کر دی۔ پھر اس سے عبدالرحمٰن بن سعد بن زرارہ نے خرید لی (رواہ عمر بن شبیۃ)۔

ابوسفیان نے خطرہ کی خبر مکہ بھیج دی:

ادھر بنی حذام کے ایک آدمی نے مقام زرقاء میں پہنچ کر ابوسفیان کو اطلاع دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قافلہ کی واپسی کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ ابوسفیان ساتھیوں کو لے کر ڈرتے ڈرتے تاک گھات کے لئے نکلا۔ حجاز کے قریب پہنچا تو تجسّسِ احوال کرنے لگا جو سوار ملتا اس سے خبر دریافت کرتا۔ آخر ایک سوار سے اس کو اطلاع ملی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قافلہ کے لئے نکل چکے ہیں۔ ابوسفیان کو اندیشہ پیدا ہوگیا اور اس نے ضمضم بن عمرو غفاری کو بیس دینار مزدوری دے کر مکہ کو بھیجا اور اس سے کہہ دیا کہ مکہ میں پہنچنے کے وقت اونٹ کے کان کاٹ کر کجاوہ الٹا باندھ لینا اور آگے پیچھے سے اپنا کرتہ پھاڑ لینا (فریاد کرنا) اور قریش سے جا کر کہنا کہ اپنے مال کی حفاظت کے لئے باہر آ جائیں اور ان کو یہ بھی بتا دینا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے ساتھیوں سمیت قافلہ کو لوٹنے کے درپے ہیں۔ ضمضم فوراً مکہ کو چل دیا اور جیسا ابوسفیان نے حکم دیا تھا ویسا ہی کیا۔

عاتکہؓ بنت عبدالمطلب کا خواب:

ابن اسحاق نے بروایت عروہ اور بیہقی نے بروایت ابنِ شہاب اور ابنِ اسحاق اور حاکم اور بیہقی نے بالاتفاق عکرمہ کی روایت سے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے اور موسیٰ بن عقبہ کا یہی بیان ہے کہ ضمضم کے پہنچنے سے تین رات پہلے عاتکہؓ بنت عبدالمطلب نے ایک خواب دیکھا۔ صبح کو اس خواب سے ان کو بڑی فکر ہوگئی۔ انہوں نے اپنے بھائی عباسؓ بن عبد المطلب کو بلوایا اور کہا بھائی میں نے ایک خوفناک خواب دیکھا ہے۔ قریش پر کوئی مصیبت اور آفت آنے والی معلوم ہوتی ہے۔ حضرت عباسؓ نے خواب پوچھا تو عاتکہ نے کہا میں اس شرط پر تم سے بیان کر سکتی ہوں کہ تم کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا کیونکہ لوگ اگر اس کو سن لیں گے تو ہم کو دکھ پہنچائیں گے اور ناگوار باتیں سنائیں گے۔ حضرت عباسؓ نے ظاہر نہ کرنے کا وعدہ کر لیا۔ عاتکہ نے کہا میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص اونٹ پر سوار آیا اور وادی کے اوپر پہنچ کر بہت زیادہ چیخ کر تین مرتبہ کہا اے غدارو اپنی قتل گاہوں کی طرف تین دن کے اندر نکلو۔ لوگ اس کے پاس جمع ہو گئے وہاں سے وہ مسجد میں آیا لوگ پیچھے پیچھے آئے اور مسجد میں پہنچ کر اس کا اونٹ سیدھا کھڑا ہوگیا اور کعبہ کے اوپر پہنچ کر اس نے تین چیخیں ماریں اور کہا اے غدارو تین دن کے اندر اپنی قتل گاہوں کی طرف نکلو پھر (وہاں سے چل دیا اور) کوہ ابوقبیس پر پہنچ کر اس نے وہی کہا کہ اے غدارو اپنی قتل گاہوں کی طرف تین دن کے اندر نکلو اس کے بعد اس نے ایک بہت بڑا پتھر اکھاڑ کر نیچے کو لڑھکا یا پتھر لڑھکتا ہوا آیا جس کی گڑگڑاہٹ شدید تھی۔ نیچے پہنچ کر پارہ پارہ ہوگیا اور آپ کی قوم کے ہر گھر میں اس کا ٹکڑا (اڑ کر) جا پہنچا۔ آپ کی قوم کا کوئی گھر اور کوئی کوٹھڑی ایسی نہیں بچی کہ اس میں پتھر کا ٹکڑا نہ پہنچا ہو۔ حضرت عباسؓ نے کہا واللہ یہ خواب ہی ہے (تخیل نہیں ہے) اس کو پوشیدہ رکھنا اگر قریش کو اس کی اطلاع پہنچ گئی تو وہ ہم کو دکھ دینگے۔ اس کے بعد عباسؓ عاتکہ کے پاس سے چلے آئے اور ولید بن عتبہ بن ربیعہ بن عبد الشمس سے ملاقات کی اور چونکہ ولید عباسؓ کا دوست تھا اس لئے عباسؓ نے اس سے اس خواب کا ذکر کر دیا لیکن چھپائے رکھنے کی تاکید کر دی۔ ولید نے اپنے باپ عتبہ سے اس کا ذکر کر دیا اور عتبہ نے اس کا چرچا کر دیا۔ اس طرح بات مکہ میں پھیل گئی اور قریش آپس میں اس کا چرچا کرنے لگے۔

ابوجہل کی طعنہ زنی:

حضرت عباسؓ کا بیان ہے صبح کو میں کعبہ کا طواف کر رہا تھا کہ ابوجہل بن ہشام قریش کی ایک جماعت کے ساتھ بیٹھا وہاں عاتکہ کے خواب کا تذکرہ کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگا ابوالفضل طواف سے فارغ ہو کر ہماری طرف آ جانا۔ میں فارغ ہو کر وہاں پہنچ کر ان لوگوں کے پاس بیٹھ گیا۔ ابوجہل بولا اے اولادِ عبدالمطلب یہ نبیہ تم میں کب سے پیدا ہوگئی۔ میں نے پوچھا کیا بات ہے۔ اس نے کہا عاتکہ کا خواب۔ میں نے کہا عاتکہ کا خواب کیا ہے۔ ابوجہل بولا اے اولادِ مطلب! تم کو اسی پر بس نہیں ہوا کہ تمہارے مرد نبی بن گئے اب تمہاری عورتیں بھی نبیہ ہونے لگیں۔ حضرت عباسؓ کا بیان ہے اس آواز نے ابوجہل کے لئے میری طرف متوجہ ہونے کا موقع نہیں چھوڑا اور میں اس کی طرف سے رک گیا۔ اس پر عاتکہ نے یہ شعر کہے کیا خواب سچا نہ تھا۔ اس کی تصدیق لے کر تو تمہارے پاس ایک بھاگا ہوا شکست خوردہ آدمی آ گیا میں نے جھوٹ نہیں کہا تو نے مجھے جھوٹا کہا جو خود جھوٹا ہے وہ میری اس سچی بات کو جھوٹا کہتا ہے۔

قریشیوں کی تیاری وروانگی:

لوگوں نے جلد جلد تیاری کی اور کہا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اوران کے ساتھیوں کا خیال ہے کہ ابن حضرمی کے قافلہ کی طرح ہوگا ایسا ہرگز نہیں ہوگا خدا کی قسم ان کو کچھ اور ہی نتیجہ معلوم ہوگا۔ غرض لوگ یا تو خود جانے کے لئے نکل کھڑے ہوئے یا اپنی جگہ کسی کو بھیج دیا اور دو یا تین دن میں تیاری کر لی جو طاقتور تھے انہوں نے کمزوروں کی مدد کی۔ اگر کسی کا مسلمان ہو جانا قریش کو معلوم تھا یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے دوست ہونے کا کسی پر شبہ تھا یا خاندان بنی ہاشم کا کوئی فرد تھا ایسے سب لوگوں کو انہوں نے ساتھ لیا۔ چنانچہ عباسؓ ابن عبد المطلب، نوفلؓ بن حارث، طالبؓ بن ابی طالب، عقیلؓ بن ابی طالب اوران کے ساتھ دوسرے لوگ روانہ ہو گئے۔ ابو لہب صرف ایسا شخص تھا جو نہ خود گیا نہ اپنی جگہ کسی کو بھیجا ورنہ ہر قریشی کو یا خود جانا پڑا یا اپنی جگہ دوسرے کو بھیجنا پڑا۔

ابن اسحاق وغیرہ نے لکھا ہے جب لوگ تیاری کر چکے اور روانگی کا ارادہ کر لیا اور جو اچھی بری سواریاں تھیں ان پر سوار ہو گئے اور گانے والی باندیوں کو اور ان کے تنبلوں کو بھی ساتھ لے لیا تو اس وقت سوچا کہ ہمارے اور بنی بکر بن عبد مناۃ بن کنانہ کے درمیان تو خوں ریز جنگ رہی ہے۔ طرفین میں باہم قصاص کے مطالبات ہیں۔ اندیشہ ہے کہ اگر ہم گئے تو ہمارے پیچھے (ہمارے گھروں پر) وہ حملہ نہ کر دیں قریب تھا کہ یہ خیال کر کے وہ جانا ملتوی کر دیں۔

شیطان کی کارروائی:

ابن عقبہ اور ابن عابد کا بیان ہے کہ ابلیس بھی مشرکوں کے ساتھ نکلا اور وعدہ دلاتا رہا کہ تمہارے پیچھے بنیکنانہ بھی تمہاری مدد کے لئے آنے والے ہیں اور میں ضامن ہوں کہ آج تم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا۔ تمام لوگ روانہ ہو کر مقام مرالظہر ان میں فروکش ہوئے۔ ابو جہل نے دس اونٹ ذبح کئے اور لشکر گاہ میں کوئی ڈیرہ خیمہ ایسا نہ بچا کہ وہاں تک اونٹوں کا خون نہ پہنچا ہو۔ ضمضم بن عمرو کو دکھائی دیا کہ وادی مکہ میں اوپر سے نیچے تک خون ہی خون بہ رہا ہے۔

جہیم بن صلت کا خواب:

بیہقی نے ابن شہاب اور ابن عقبہ اور عروہ بن زبیر کی روایت سے لکھا ہے کہ جب سب لوگ جحفہ میں فروکش ہوئے تو ان کے ساتھ بنی مطلب بن مناۃ کے خاندان کا ایک شخص بھی تھا جس کا نام جہیم بن صلت بن مخزمہ تھا۔ یہ شخص آخر میں حنین کی جنگ کے وقت مسلمان ہو گیا تھا۔ یہ شخص کچھ نیم خوابی کی حالت میں سر رکھے ہوئے تھا یعنی کچھ کچھ غافل تھا کہ اچانک اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا کیا تم نے اس سوار کو دیکھا جو ابھی ابھی میرے پاس کھڑا تھا۔ لوگوں نے کہا تو پاگل ہے کوئی بھی نہیں تھا۔ جہیم نے کہا ابھی ایک سوار کھڑا تھا اور کہہ رہا تھا ابو جہل اور عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ اور زمعہ اور ابوالبختری اور امیہ بن خلف مارے گئے۔ جہیم نے کچھ اور سرداران قریش کے نام بھی لئے تھے جو بدر میں گئے۔ پھر میں نے دیکھا کہ اس نے اپنے اونٹ کے سینہ پر تلوار ماری اور زخمی کر کے لشکر میں چھوڑ دیا اور لشکر گاہ میں کوئی ڈیرہ ایسا نہیں بچا کہ اس اونٹ کا خون وہاں نہ پہنچا ہو۔ جہیم کے ساتھی بولے تو شیطان کا بازیچہ بن گیا۔ یہ بات ابو جہل تک بھی پہنچا دی گئی۔ ابو جہل بولا پہلے بنی ہاشم کے جھوٹ سے تمہارا واسطہ پڑا تھا اب بنی مطلب کے جھوٹ میں بھی مبتلا ہو گئے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تیاریاں:

دوسری جانب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جگہ نماز کے لئے ابن ام مکتوم کو قائم کیا اور مدینہ سے روانہ ہو گئے۔ پھر مقام روحاء سے ابو لبابہ کو واپس کر دیا اور مدینہ پر اپنا نائب ان کو بنا دیا۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۱۲ رمضان المبارک کو ہفتہ کے دن مدینہ سے روانہ ہوئے تھے۔ ابن ہشام نے ۸ رمضان بیان کیا ہے۔ مدینہ سے ایک میل نکل کر چاہ ابو عتبہ پر پہنچ کر لشکر قائم کیا اور جو لوگ کم عمر تھے ان کو واپس کر دیا۔ واپس ہونے والوں میں عبد اللہ بن عمرؓ، اسامہؓ بن زیدؓ رافع بن خدیج، براء بن عازبؓ، اسیدؓ بن حضیرؓ، زیدؓ بن ارقم، زیدؓ بن ثابتؓ اور عمیرؓ بن ابی وقاص تھے۔ عمیر رونے لگے آخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو شریک رہنے کی اجازت دے دی اور بدر کی لڑائی میں سولہ سال کی عمر میں آپ شہید ہو گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو حکم دیا کہ چاہ سقیا کا پانی پئیں اور خود بھی اس کنویں کا پانی پیا اور سقیا کے گھروں کے پاس نماز پڑھی اور سقیا سے روانگی کے وقت قیس بن ابی صعصہ کو مسلمانوں کی گنتی کرنے کا حکم دیا۔ قیس نے سب لوگوں کو ابو عتبہ کے کنویں کے پاس کھڑا کر کے گنتی کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کر دیا۔ یہ سب ۳۱۳ ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سن کر خوش ہوئے اور فرمایا طالوت کے ساتھیوں کی بھی یہی شمار تھی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعاء:

اس روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے لئے دعا کی اور عرض کیا اے اللہ! ابراہیمؑ تیرا بندہ تیرا خلیل اور تیرا نبی تھا۔ اس نے مکہ والوں کے لئے دعاء کی تھی۔ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی تیرا بندہ اور تیرا نبی ہوں۔ میں مدینہ والوں کے لئے تجھ سے دعاء کرتا ہوں کہ تو ان کے صاع (چار سیر کا ایک ناپ) اور ان کے مد (ایک سیر کے برابر ناپ) اور ان کے پھلوں میں برکت عطا فرما (یعنی ان کی کھیتی باڑی اور باغوں کی پیداوار میں برکت عطا کر) اے اللہ تو مدینہ کی محبت ہم کو عطا کر اور مدینہ کے آب و ہوا کی خرابی (بخار ملیریا وغیرہ) کو خم میں منتقل کر دے جس طرح تیرے خلیل ابراہیمؑ نے مکہ کو حرم قرار دیا تھا میں بھی مدینہ کی دونوں سوختہ پتھریلی زمینوں کے درمیانی علاقہ کو حرم قرار دیتا ہوں (مدینہ کے دونوں جانب پتھریلی گرم تپتی ہوئی زمین ہے مدینہ دونوں کے درمیان واقع ہے)۔

حبیب بن اساف: حبیب بن اساف اگرچہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے مگر مال غنیمت کے لالچ میں اپنے قبیلہ خزرج کی مدد کے لئے چلے آئے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہمارے ساتھ وہی جائے جو مسلمان ہو کوئی غیر مسلم نہ جائے۔ یہ سن کر حضرت حبیب مسلمان ہو گئے اور کسوٹی پر بہت اچھے اترے۔ آپ نے اچھے کارنامے انجام دیئے۔

آگے روانگی: سقیا کی آبادی سے اتوار کی رات کو روانہ ہوئے اور روانگی کے وقت دعا کی اے اللہ یہ برہنہ پا ہیں ان کو سواری عطا کر یہ برہنہ بدن ہیں ان کو لباس عنایت کر یہ بھوکے ہیں ان کو پیٹ بھر کھانا مرحمت کر یہ نادار ہیں ان کو اپنی مہربانی سے مالدار بنادے۔ کل ستر اونٹ ساتھ تھے باری باری سے لوگ انہی پر سوار ہوتے رہے۔

سواریوں کی کمی: امام احمد اور ابن سعدؒ نے حضرت ابن مسعودؓ کا بیان نقل کیا ہے ہم بدر کے زمانہ میں تین آدمی ایک ایک اونٹ پر تھے۔ ابولبابہؓ اور علیؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم سواری تھے۔ دونوں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سوار ہو جائیں ہم پیدل چلیں گے۔ فرمایا تم پیدل چلنے پر مجھ سے زیادہ قوت نہیں رکھتے اور میں ثواب کا امیدوار تم سے کم نہیں ہوں۔

ہرن کا شکار:

ابن سعد کی روایت میں آیا ہے کہ تین گھوڑے ساتھ تھے۔ تیسرا گھوڑا مرثدؓ بن ابی مرثد غنوی کا تھا۔ مقام تربان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعدؓ بن ابی وقاص سے فرمایا ہرن کو دیکھو سعدؓ نے تیر چلہ پر چڑھایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیچھے سے کھڑے ہو کر اپنی ٹھوڑی سعد کے مونڈھے اور کان کے درمیان رکھی اور فرمایا تیر چلا اے اللہ اس کے تیر کو نشانہ پر صحیح بٹھا دے۔ چنانچہ تیر ہرن کے سینہ پر لگ گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسکرا دیئے سعد دوڑتے ہوئے گئے اور ہرن کو پکڑ لیا۔ کچھ جان باقی تھی سعدؓ ذبح کر کے اس کو اٹھا کر لے آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ساتھیوں کو بانٹ دینے کا حکم دیا۔ چنانچہ وہ گوشت سب کو تقسیم کر دیا گیا۔

آگے روانگی ابوسفیان اور قریشیوں کی خبر:

پھر چلتے چلتے مقام ذوتجنج پر جا کر اترے۔ یہ مقام بھی روحاء کے درمیان واقع تھا پھر یہاں سے کوچ کر کے موڑ پر پہنچ کر مکہ کا راستہ بائیں کو چھوڑ دیا۔ اور دائیں ہاتھ کو نازیہ پر بدر کے ارادہ سے چل دیئے۔ نازیہ کے کنارے کنارے چل کر وادی زحفان کو طے کیا، وادی زحفان نازیہ اور مقام السفراء کے درمیان تھی۔ پھر مضیق السفراء پر پہنچے اور وہاں سے نشیب میں چل دیئے۔ جب صفرا کے قریب پہنچے تو ابوسفیان کی خبر معلوم کرنے کے لئے لبیسؓ بن عمر جہنی کو اور عدی بن زغباء کو بدر کی طرف روانہ کیا۔ لبیسؓ بنی ساعدہ کے معاہد تھے اور عدی بنی نجار کے حلیف تھے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صفراء سے بائیں ہاتھ کو چل کر وادی ذفران کے دائیں جانب چلتے رہے اور وادی کے اندر کچھ حصہ طے کر کے پڑاؤ ڈالا تو اطلاع ملی کہ قریش اپنے قافلہ کی حفاظت کے لئے روانہ ہو گئے ہیں۔

مشورہ اور مہاجرین وانصار کے جذبات:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے مشورہ لیا (کہ اب کیا کیا جائے) مہاجرین نے بطور مشورہ کچھ اچھا کلام کیا۔ اول ابوبکرؓ کھڑے ہو کر اچھا بولے۔ پھر عمرؓ نے بھی کھڑے ہو کر اچھی گفتگو کی پھر مقدادؓ بن اسود کھڑے ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو حکم دیا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر چلئے ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہیں خدا کی قسم ہم وہ بات نہیں کہیں گے جو موسیٰ کی قوم نے موسیٰ سے کہی تھی کہ تم اور تمہارا رب جا کر لڑیں ہم تو یہیں بیٹھ گئے (آگے نہیں بڑھیں گے۔) آپ اور آپ کا رب چل کر لڑیں ہم آپ لوگوں کے ساتھ ہیں آپ کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے ہو کر دشمنوں سے لڑیں گے۔ قسم ہے اس خدا کی جس نے آپ کو حقانیت کے ساتھ بھیجا ہے اگر آپ ہم کو برک الغماد کو لے جائیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمراہی میں ہم وہاں بھی تلواروں سے اس وقت تک لڑینگے جب تک وہاں پہنچ نہ

جائیں۔ یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ مبارک شگفتہ ہوگیا۔ پھر مقدادؓ کے حق میں کچھ کلمات خیر فرمائے اور دعا کی۔ اس کے بعد تیسری بار لوگوں سے مشورہ لیا۔ اب انصار سمجھے کہ روئے خطاب ہماری طرف ہے کیونکہ انہی کی تعداد زیادہ تھی۔ اس پر سعدؓ بن معاذ کھڑے ہوگئے اور عرض کیا یا رسول اللہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خطاب ہم سے ہے۔ فرمایا ہاں سعدؓ نے کہا یا رسول اللہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا چکے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا مان چکے ہم نے اقرار کرلیا کہ جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں وہ حق ہے ہم نے آپ سے مضبوط وعدہ کر لیا اور عہد و پیمان دے دیا کہ جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حکم دینگے ہم سنیں گے اور بجالائیں گے۔ اب جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم چاہیں وہ کریں یا رسول اللہ شاید آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اندیشہ ہو کہ انصار صرف اپنی بستیوں میں ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کرینگے (باہر نکل کر نہیں کرینگے) تو میں انصار کی طرف سے عرض کرتا ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جہاں چاہیں سفر کریں ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہیں۔ جس سے جوڑ کرنا چاہیں کریں جس سے توڑنا چاہیں تعلق توڑیں ہمارے مالوں میں سے جتنا چاہیں لے لیں اور جتنا چاہیں ہم کو دے دیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو مال ہمارے پاس چھوڑ دینگے وہ ہماری نظر میں لئے ہوئے مال سے زیادہ محبوب نہ ہوگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو حکم دینا چاہیں دیں ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر چلیں گے۔ خدا کی قسم اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو لے کر برک عمدان یا برک الغماد پہنچنا چاہیں گے تو ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلیں گے اور اگر سمندر ہمارے سامنے ہوگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس میں بھی گھس جائینگے اور ہم میں سے کوئی شخص پیچھے نہیں رہے گا اگر کل دشمن سے مقابلہ ہوجائے تو ہم کو ناگوار نہ ہوگا۔ ہم لڑائی میں تجربہ کار ہیں امید ہے کہ ہماری (جنگی) کارگزاریوں سے اللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھیں ٹھنڈی رکھے گا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک کام کے لئے نکلے ہوں اور اللہ دوسری بات پیدا کردے پس اللہ کا نام لے کر ہم کو لے کر چلئے ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے رہینگے اور موسیٰ کی قوم کی طرح نہ ہونگے جنہوں نے موسیٰ سے کہا تھا کہ تم اور تمہارا رب جائیں اور جا کر لڑیں ہم تو یہاں سے آگے بڑھنے والے نہیں بلکہ آپ اور آپ کا رب چلیں دشمن سے لڑیں ہم آپ کے ساتھ ہیں ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ سعد کی یہ تقریر سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ چمکنے لگا اور فرمایا اللہ کے نام پر چلو اور خوش ہو اللہ نے مجھ سے دو گروہوں میں سے ایک کا وعدہ کیا ہے۔ خدا کی قسم میں اس وقت بھی گویا ان لوگوں کی قتل گاہوں کو دیکھ رہا ہوں (کہ ان میں سے کون کس جگہ مارا جائے گا) بعض مسلمانوں کو دشمن سے مڈبھیڑ پسند نہ تھی۔

ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے حضرت ابوایوبؓ انصاری کا بیان نقل کیا ہے حضرت ابوایوبؓ نے فرمایا جب ہم ایک دو دن چلتے رہے (اور قافلہ کا پتہ نہ چلا) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان لوگوں سے (یعنی قریش سے) جنگ کرنے کے متعلق آپ لوگوں کی کیا رائے ہے (آگے بڑھ کر قریش سے جنگ کریں یا واپس مدینہ کو لوٹ جائیں) ان لوگوں کو تمہارے نکلنے کی اطلاع پہنچ گئی ہم نے عرض کیا بخدا ہم میں ان لوگوں سے لڑنے کی جان نہیں ہے ہمارا ارادہ تو قافلہ کا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا تم لوگوں کی رائے جنگ کے متعلق کیا ہے؟ ہم نے پہلا جواب دے دیا۔ (تفسیر مظہری)

وَاِذۡ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحۡدَى الطَّآئِفَتَيۡنِ
اور جس وقت تم سے وعدہ کرتا تھا اللہ دو
اَنَّهَا لَـكُمۡ وَتَوَدُّوۡنَ اَنَّ غَيۡرَ ذَاتِ
جماعتوں میں سے ایک کا کہ وہ تمہارے ہاتھ لگے گی اور تم چاہتے
الشَّوۡكَةِ تَكُوۡنُ لَـكُمۡ وَيُرِيۡدُ اللّٰهُ اَنۡ يُّحِقَّ
تھے کہ جس میں کانٹا نہ لگے وہ تم کو ملے اور اللہ چاہتا تھا کہ سچا کردے
الۡحَـقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقۡطَعَ دَابِرَ الۡكٰفِرِيۡنَۙ ۝۷
سچ کو اپنے کلاموں سے اور کاٹ ڈالے جڑ کافروں کی
لِيُحِقَّ الۡحَـقَّ وَيُبۡطِلَ الۡبَاطِلَ وَلَوۡ كَرِهَ
تاکہ سچا کرے سچ کو اور جھوٹا کردے جھوٹ کو اور اگرچہ
الۡمُجۡرِمُوۡنَ ۝۸
ناراض ہوں گنہگار (۳)

اللہ تعالیٰ حق کو غالب کرنا چاہتے تھے:

مسلمان چاہتے تھے کہ ''تجارتی قافلہ'' پر حملہ ہو، کہ کانٹا نہ چبھے اور بہت سا مال ہاتھ آجائے لیکن خدا کی مرضی یہ تھی کہ اس چھوٹی سی بے سرو

سامان جماعت کو کثیر التعداد اور مرتب و پُر شوکت لشکر سے بھڑا کر اپنی باتوں سے سچ کو سچ کر دکھائے اور کفار مکہ کی جڑ کاٹ ڈالے۔ تا کہ اس طرح اس کے وعدوں کی سچائی حیرت انگیز طریقہ پر ظاہر ہو کر سچ کا سچ اور جھوٹ کا جھوٹ ہونا کفار کے علی الرغم صاف صاف آشکارا ہو جائے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ بدر میں قریش کے ستر سردار مارے گئے جن میں ابو جہل بھی تھا۔ اور ستر ہی قید ہوئے۔ اس طرح کفر کی کمر ٹوٹ گئی اور مشرکین مکہ کی بنیادیں ہل گئیں۔ فللّٰہ الحمد و المنه. (تفسیر عثمانی)

بے سروسامانی کا علاج: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقاء صرف تین سو تیرہ اور وہ بھی اکثر غیر مسلح ہیں اور مقابلہ پر تقریباً ایک ہزار جوانوں کا مسلح لشکر ہے تو اللہ جل شانہ کی بارگاہ میں نصرت وامداد کی دعاء کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعاء مانگتے تھے اور صحابہ کرامؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آمین کہتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاء کے یہ کلمات نقل فرمائے ہیں۔

''یا اللہ مجھ سے جو وعدہ آپ نے فرمایا ہے اس کو جلد پورا فرمادے۔ یا اللہ اگر یہ تھوڑی سی جماعت مسلمین فنا ہوگئی تو پھر زمین میں کوئی تیری عبادت کرنے والا باقی نہ رہے گا (کیونکہ ساری زمین کفر وشرک سے بھری ہوئی ہے یہی چند مسلمان ہیں جو صحیح عبادت بجالاتے ہیں)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم برابر اسی طرح الحاح وزاری کے ساتھ دعاء میں مشغول رہے یہاں تک کہ آپ کے شانوں سے چادر بھی سرک گئی، حضرت ابو بکر صدیقؓ نے آگے بڑھ کر چادر اوڑھائی اور عرض کیا یا رسول اللہ آپ زیادہ فکر نہ کریں اللہ تعالیٰ آپ کی دعاء ضرور قبول فرمائیں گے اور اپنا وعدہ پورا فرمائیں گے۔

میدان جنگ کا انتخاب:

جس جگہ پہنچ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اول قیام فرمایا۔ اس مقام کے واقف کار حضرت حباب بن منذرؓ نے اس کو جنگی اعتبار سے نامناسب سمجھ کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ جو مقام آپ نے اختیار فرمایا ہے یہ اللہ کے حکم سے ہے جس میں ہمیں کوئی اختیار نہیں یا محض رائے اور مصلحت کے پیش نظر اختیار فرمایا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ نہیں یہ کوئی حکم خداوندی نہیں، اس میں تغیر تبدل کیا جاسکتا ہے تب حضرت حباب بن منذرؓ نے عرض کیا کہ پھر تو بہتر ہے کہ اس مقام سے آگے بڑھ کر مکی سرداروں کے لشکر کے قریب ایک پانی کا مقام ہے اُس پر قبضہ کیا جائے وہاں ہمیں پانی افراط کے ساتھ مل جائے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا مشورہ قبول فرمایا اور وہاں جا کر پانی پر قبضہ کیا ایک حوض پانی کے لئے بنا کر اس میں پانی کا ذخیرہ جمع فرمایا۔

اس سے مطمئن ہونے کے بعد حضرت سعد بن معاذؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ہمارا خیال یہ ہے کہ ہم آپ کے لئے ایک سایہ بان کسی محفوظ جگہ بنا دیں جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم مقیم رہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سواریاں بھی آپ کے پاس رہیں۔

اور ایک مختصر سا سایہ بان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بنا دیا گیا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبرؓ کے سوا کوئی نہ تھا۔ حضرت معاذؓ دروازہ پر حفاظت کے لئے تلوار لئے کھڑے تھے۔

معرکہ پہلی رات:

معرکہ کی پہلی رات تھی۔ تین سو تیرہ بے سامان لوگوں کا مقابلہ اپنے سے تین گنی تعداد یعنی ایک ہزار مسلح فوج سے تھا۔ میدان جنگ کا بھی اچھا مقام ان کے قبضہ میں آچکا تھا۔ نچلا حصہ وہ بھی سخت ریتیلا جس میں چلنا دشوار مسلمانوں کے ہاتھ آیا تھا۔ طبعی پریشانی اور فکر سب کو تھی۔

حافظ حدیث ابویعلی نے نقل کیا ہے کہ حضرت علی مرتضیٰؓ نے فرمایا کہ غزوۂ بدر کی اس رات میں ہم میں سے کوئی باقی نہیں رہا جو سو نہ گیا ہو۔ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام رات بیدار رہ کر صبح تک نماز تہجد میں مشغول رہے۔

اور ابن کثیرؒ نے بحوالۂ صحیح نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس رات میں جب کہ اپنے عریش یعنی سائبان میں نماز تہجد میں مشغول تھے آپ کو بھی کسی قدر اونگھ آگئی مگر فوراً ہی ہنستے ہوئے بیدار ہو کر فرمایا۔ اے ابو بکر خوشخبری سنو یہ جبرئیل علیہ السلام ٹیلہ کے قریب کھڑے ہیں اور یہ کہہ کر آپ سائبان سے باہر یہ آیت پڑھتے ہوئے تشریف لے گئے سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ یعنی عنقریب دشمن کی جماعت ہار جائے گی اور پیٹھ پھیر کر بھاگے گی۔ بعض روایات میں ہے کہ آپ نے باہر نکل کر مختلف جگہوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ یہ ابوجہل کی قتل گاہ ہے یہ فلاں کی یہ فلاں کی۔ اور پھر ٹھیک اسی طرح واقعات پیش آئے۔ (تفسیر مظہری)

سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے بروایت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نقل کیا ہے کہ جنگ کی حالت میں نیند اللہ تعالیٰ کی طرف سے امن واطمینان کی نشانی ہوتی ہے۔ اور نماز میں نیند شیطان کی طرف سے ہوتی ہے۔ (ابن کثیر)

جنگ میں نیند: اور جیسا کہ غزوۂ بدر میں تکان اور پریشانی دور کرنے

کے لئے اللہ تعالیٰ نے تمام صحابہ کرام پر خاص قسم کی نیند مسلط فرمائی اسی طرح غزوۂ اُحد میں بھی اسی طرح کا واقعہ ہوا۔

قصۂ بدر کا تکملہ: فران سے روانہ ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان پہاڑیوں کے راستہ سے جن کو اصافر کہا جاتا ہے آگے چلے (اصافر کی پہاڑیاں جحفہ کے قریب مکہ کو جاتے ہوئے دائیں جانب کو واقع ہیں) پھر نیچے اتر کر ایک بستی کی جانب جس کا نام دبہ ہے رخ کیا اور حنان کو دائیں جانب چھوڑ دیا حنان ایک بڑے پہاڑ کی طرح ریت کا ٹیلہ تھا۔ پھر بدر کے قریب پہنچ کر پڑاؤ ڈال دیا۔

بوڑھے کی خبر میں سے معلومات لی:

اور خود حضرت ابو بکرؓ کو ساتھ لے کر ایک عرب بوڑھے کے پاس پہنچے اور اس سے قریش کی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کی خبریں دریافت کیں شیخ بولا مجھے اطلاع ملی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے ساتھی فلاں فلاں دن روانہ ہو گئے ہیں اگر اطلاع دینے والے نے مجھے صحیح اطلاع دی ہے تو آج وہ فلاں جگہ ہونگے جس جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑاؤ ڈالا تھا شیخ نے اسی جگہ کا نام لیا، اور مجھے یہ خبر بھی ملی ہے کہ قریش فلاں دن روانہ ہو گئے ہیں اگر خبر دینے والے نے مجھے صحیح خبر دی ہے تو آج قریش فلاں جگہ ہونگے شیخ نے اسی جگہ کا نام لیا جہاں قریش موجود تھے۔ پھر کہنے لگا تم دونوں کون ہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہم ماء سے ہیں (یہ لفظ توریہ کے طور پر استعمال فرمایا بوڑھا تو سمجھا ہوگا کہ بنی ماء السماء جو عرب کا مشہور قبیلہ تھا اس سے ان کا تعلق قرابت ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہ تھی کہ ماء دافق یعنی کودتے ہوئے پانی سے ہم دونوں پیدا ہوئے ہیں)

دو غلاموں کی خبریں:

ابن اسحاق کا بیان ہے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کے پاس لوٹ آئے شام ہوئی تو علیؓ بن ابی طالب، اور زبیرؓ بن عوام اور سعدؓ بن ابی وقاص کو صحابہؓ کی ایک جماعت کے ساتھ بدر کے چشمہ کی طرف خیر خبر لینے کے لئے بھیجا ان لوگوں کو قریب کے کچھ سقے ملے جن میں بنی الحجاج کا غلام اسلم اور بنی العاص بن سعید کا غلام ابو یسار بھی تھا یہ حضرات دونوں کو لے آئے اور ان سے کچھ سوالات کئے اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے نماز پڑھ رہے تھے دونوں نے جواب دیا ہم قریش کے خدمت گار ہیں انہوں نے ہم کو پانی بھرنے بھیجا تھا مسلمانوں کو یہ جواب ناگوار گذرا ان کا خیال تھا کہ یہ دونوں ابوسفیان کے آدمی ہیں (اور قافلہ کہیں قریب ہی ہے) اس لئے ان کو مارنے لگے جب خوب مارا تو انہوں نے کہہ دیا کہ ہم ابوسفیان کے آدمی ہیں صحابہؓ نے ان کو چھوڑ دیا اور اس عرصہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رکوع کیا اور دو سجدے کر کے سلام پھیر دیا اور فرمایا جب انہوں نے تم سے سچی بات کہی تھی تو تم نے ان کو مارا اور جب جھوٹی بات کہی تو تم نے ان کو چھوڑ دیا انہوں نے سچ کہا تھا خدا کی قسم یہ قریش کے آدمی ہیں (پھر دونوں غلاموں سے فرمایا) مجھے قریش کے متعلق بتاؤ دونوں نے عرض کیا وہ اس سامنے والے ٹیلہ کے اس پرے کے اونچے مقام پر اور ریت کے ٹیلہ پر فروکش ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کتنے ہیں دونوں نے عرض کیا بہت ہیں فرمایا گنتی میں کتنے ہیں بولے یہ تو ہمیں معلوم نہیں فرمایا کتنے (اونٹ ذبح کرتے ہیں کہنے لگے ایک دن نو اور ایک دن دس فرمایا تو نو سو اور ایک ہزار کے درمیان ہیں۔ پھر فرمایا ان میں سرداران کون کون ہیں۔ دونوں نے عرض کیا ربیعہ کے دونوں بیٹے عتبہ شیبہ۔ ابو البختری بن ہشام حکیم بن حزام۔ نوفل بن خویلد۔ حارث بن عامر۔ طعیمہ بن عدی۔ نضر بن حارث ربیعۃ الاسود۔ ابو جہل بن ہشام ربیعۃ الاسود امیہ بن خلف۔ حجاج کے دونوں بیٹے بنیہ اور منبہ سہل بن عمرو اور عمرو بن عبدود۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ مکہ کے جگر پارے (یعنی خلاصہ اور مکھن) ہیں جن کو مکہ نے باہر نکالا ہے۔

ابوسفیان کا خوف اور مکہ پہنچنا:

ابن اسحاق وغیرہ نے لکھا ہے کہ ابوسفیان قافلہ کو لے کر آیا مدینہ کے قریب پہنچا تو بہت خوف زدہ تھا ضمضم بن عمرو اور نضیر کی واپسی میں بھی تاخیر ہو گئی تھی۔ غرض ڈرتے ڈرتے پانی پر پہنچا۔ پانی پر مجدی بن عمرو جہنی سے ملاقات ہوئی ابوسفیان نے مجدی سے پوچھا کیا تم کو (یہاں) کچھ سن گن ملی ہے۔ مجدی نے کہا اور تو کسی اجنبی کو میں نے دیکھا نہیں صرف اتنی بات دیکھی کہ دو سوار آئے انہوں نے اس ٹیلہ کے پاس اونٹ بٹھایا اور اتر کر مشکیزوں میں پانی لیا اور چل دیئے ابوسفیان مجدی سے یہ بات سن کر ٹیلہ کے پاس ان کی فرودگاہ پر پہنچا اور اونٹ کی ایک مینگنی اٹھا کر اس کو توڑا اس کے اندر سے کھجور کی گٹھلی برآمد ہوئی کہنے لگا خدا کی قسم یہ تو یثرب والوں کا چارہ ہے (یعنی اونٹوں کو گٹھلیاں وہ ہی کھلاتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ وہ سوار مدینہ کے تھے) فوراً اپنے ساتھیوں کے پاس لوٹ آیا اور قافلہ کا رخ موڑ کر بدر کو بائیں چھوڑ کر ساحل کے راستہ پر پڑ گیا اور تعاقب کرنے والوں کے ڈر سے سرپٹ رات دن چلتا رہا اور جب دیکھا کہ اب میں قافلہ کو بچا لایا۔

پہنچنے کے بعد لشکر والوں کی طرف پیغام:

تو قریش کے پاس قیس بن امراء القیس کو یہ پیام دیکر بھیجا کہ تم اپنے قافلہ کی اور آدمیوں کی جانوں و مالوں کی حفاظت کے لئے مکہ سے نکلے تھے اب چونکہ اللہ نے سب کو بچا دیا ہے اس لئے لوٹ آؤ قریش کو یہ اطلاع اس وقت ملی جب یہ لوگ جحفہ میں تھے ابو جہل کہنے لگا خدا کی قسم بدر پر اترے بغیر ہم نہیں لوٹیں گے بدر پر ہر سال عرب کا ایک تہوار ہوتا اور بازار لگتا تھا یہ زمانہ تہوار ہی کا تھا ہم تین روز بدر میں قیام کریں گے اونٹ ذبح کریں گے کھانا کھلائیں گے شرابیں پلائیں گے گانے والیوں کا گانا سنیں گے عرب ہماری یہ خبریں سنیں گے اور ہمارے آ پہنچنے کی اطلاع ہوگی تو اس کے بعد ہمیشہ ہم سے ہیبت کھائیں گے ان پر ہمارا رعب پڑے گا۔ (تفسیر مظہری)

اللہ کی مدد:

غرض قریش ریت کے ٹیلے اوبطن وادی کے پیچھے پرے کے کنارہ والی اونچی زمین پر فروکش ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ورلے کنارہ پر۔ شروع میں پانی پر مشرکوں کا قبضہ رہا مسلمان پیاسے رہ گئے اور ان پر سخت مصیبت پڑی۔ شیطان نے ان کے دلوں میں وسوسہ ڈالا کہ تمہارا دعویٰ تو یہ ہے کہ ہم اللہ کے دوست ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں موجود ہیں مگر پانی پر مشرکوں نے زبردستی قبضہ کر رکھا ہے اور تم جنابت کی حالت میں بغیر غسل کے نمازیں پڑھتے ہو مگر اسی رات اللہ نے بارش کر دی مشرکوں کی طرف تو ایسی موسلا دھار بارش ہوئی کہ وہ آگے نہ بڑھ سکے اور مسلمانوں کے لئے ہلکی ہلکی بارش ہوئی جس سے وہ نہا بھی لئے بدن کی گندگی بھی دور ہوگئی اور زمین بھی ہموار ہوگئی ریت سخت پڑ گئی اور قدم جمنے لگے (دلدل اور کیچڑ نہیں ہوئی) پڑاؤ بھی درست ہو گیا دلوں میں سکت بھی آ گئی اور ادھر اُدھر چلنے کی رکاوٹ دور ہوگئی وادی بہنے لگی سب نے پانی پی لیا اونٹوں کو بھی پلا دیا اور مشکیزے بھی بھر لئے اسی رات کو مسلمانوں پر ایک ایسی اونگھ طاری ہوگئی کہ سب لوگ سو گئے ایک دوسرے کے سامنے آ کر اٹھاتا تھا مگر اس کو پتہ بھی نہ چلتا تھا اور وہ پہلو کے بل گر پڑتا تھا۔ ابو یعلی اور بیہقی نے دلائل میں حضرت علیؓ کا قول نقل کیا ہے کہ بدر کے دن مقدادؓ کے علاوہ ہم میں کوئی سوار نہ تھا اور میری آنکھوں میں اب تک وہ منظر ہے کہ سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم میں کوئی آدمی ایسا نہ تھا جو سو نہ گیا ہو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ساری رات نماز پڑھتے رہے:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک درخت کے نیچے صبح تک نماز پڑھتے رہے یہ جمعہ کی رات تھی اور دونوں فریقوں کے درمیان ریت کی ایک پہاڑی حائل تھی۔

حضرت عمار اور حضرت عبداللہ کی خبریں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمارؓ بن یاسر اور عبداللہ بن مسعودؓ کو (قریش کی طرف حال معلوم کرنے) بھیجا دونوں نے جا کر ان لوگوں کی فرودگاہ کے آس پاس چکر لگایا اور آ کر اطلاع دی کہ وہ لوگ خوف زدہ ہیں اور ان پر سخت بارش ہوئی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ساتھیوں کو لے کر عشاء کے وقت اور آگے بڑھے تا کہ مشرکوں کے پہنچنے سے پہلے چشمہ پر قبضہ کر لیں چنانچہ آگے پہنچ گئے اور پانی پر قبضہ کر لیا اور بدر کے اول چشمہ پر پہنچ کر ٹھہر گئے مشرکوں کو بارش نے آگے نہ بڑھنے دیا۔

حضرت حبابؓ کی رائے:

ابن اسحاق کی روایت میں آیا ہے کہ حبابؓ بن منذر بن جموع نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا اس جگہ اترنے کا آپ کو اللہ نے حکم دیا ہے پھر تو ہم پیچھے آگے ہٹ نہیں سکتے یا یہ ایک مصلحت اور جنگی تدبیر ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (حکم نہیں بلکہ رائے مصلحت اور جنگی تدبیر ہے حبابؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ اترنے کی جگہ نہیں ہے یہاں سے لوگوں کو الٹا لے چلئے اور قریش کے قریب ترین جو پانی ہے وہاں چل کر ٹھہریئے وہاں چشمہ کے قریب ہم ایک کنواں کھود دینگے اور کنویں پر ایک حوض بنا دیں گے اس طرح چشمہ سے نکلنے کی بجائے پانی کنویں میں آ کر بھر جائے گا اور اس پانی سے ہم حوض بھر لیں گے ہمارے پینے کے لئے تو پانی ہو جائے گا اور وہ نہ پی سکیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم نے مشورہ سمجھ کا دیا۔ ابن سعد نے لکھا ہے کہ جبرئیل نے بھی اتر کر کہا تھا کہ حبابؓ نے جو مشورہ دیا وہ ٹھیک ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھ سب لوگوں کو لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اور قریش کے قریب ترین پانی کے پاس آدھی رات کو پہنچ کر پڑاؤ ڈال دیا پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ایک کنواں کھودا گیا اور اس پر ایک حوض بنا دیا گیا اور حوض کو پانی سے بھر دیا گیا پھر سب لوگوں نے اس میں (اپنے اپنے) برتن ڈال دیئے۔

حضرت سعدؓ کا مشورہ:

سعدؓ بن معاذ نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم آپ کے لئے ایک جھونپڑی بنا دیتے ہیں اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم قیام کریں پاس ہی ہم کچھ اونٹنیاں تیار رکھیں گے پھر ہم دشمن سے مقابلہ کریں گے اگر ہم دشمن پر غالب آ گئے تو مقصد پورا ہو گیا اور اگر کچھ دوسری بات ہوئی تو آپ اونٹنی پر

سوار ہو کر ان لوگوں کے پاس پہنچ جائیں جن کو ہم اپنے پیچھے (مدینہ میں) چھوڑ آئے ہیں کیونکہ وہاں ہمارے پیچھے بکثرت ایسے لوگ رہ گئے ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم (کی محبت میں ہم سے کم نہیں ہیں اگر ان کو خیال ہوتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جنگ پیش آئے گی تو وہ پیچھے نہ رہتے اللہ ان کے ذریعہ سے آپ کی حفاظت کرے گا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خیر خواہی کریں گے اور آپ کے ساتھ مل کر جہاد کریں گے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے سایہ کی جگہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات سن کر سعد کے لئے کلمات خیر ادا فرمائے اور ان کو دعا دی پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک ٹیلہ پر جہاں سے میدان جنگ کی حالت دکھائی دیتی تھی ایک جھونپڑی بنا دی گئی اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو بکرؓ فروکش ہوئے۔ تیسرا کوئی نہ تھا۔ سعدؓ بن معاذ جھونپڑی کے دروازہ پر تلوار گردن سے لٹکائے کھڑے ہو گئے۔

سرداروں کی قتل گاہوں کی نشاندہی:

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میدان جنگ کے مقام پر تشریف لے گئے اور ہاتھ سے اشارہ کر کر کے بتانے لگے کہ یہ فلاں شخص کی قتل گاہ ہے اس جگہ فلاں آدمی مارا جائے گا ان شاء اللہ چنانچہ جہاں جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ کر دیا تھا قریش کے آدمیوں میں سے کوئی بھی وہاں سے بچ نہ سکا (ہر شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی جگہ پر ہی مارا گیا) رواہ احمد و مسلم وغیرہما۔

غزوۂ بدر کی فضیلت وثواب:

طبرانی نے حضرت رافع بن خدیج کی روایت سے بیان کیا ہے کہ بدر کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر اہل اسلام کا کوئی بچہ پیدا ہو کر آخر عمر تک اللہ کی پوری پوری اطاعت کرتا رہے تب بھی (ثواب اور درجہ میں) تمہاری اس ایک رات (یعنی شب بدر) کو نہیں پہنچ سکتا اور فرمایا جو ملائکہ بدر میں حاضر ہوئے تھے وہ ان ملائکہ سے فضیلت رکھتے ہیں جو حاضر نہیں ہوئے۔ اس روایت کے تمام راوی سوائے جعفرؓ بن معلاص کے ثقہ ہیں جعفرؓ غیر معروف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح مقام بدر پر کی۔

قریشیوں کے جذبے:

ادھر قریش اپنی پوری طاقت اور اسلحہ کے ساتھ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں نکلے تھے ان کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے خلاف جوش، غضب غصہ اور سخت اشتعال تھا کہ صحابہؓ نے ان کے قافلہ کو لوٹنا اور قافلہ کے آدمیوں کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا اور اس سے پہلے عمروؓ بن حضرمی کو قتل اور اس کے اونٹوں کو چھین چکے تھے۔

عتبہ بن ربیعہ کو سرخ اونٹ پر سوار دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر اس قوم میں سے کسی میں کوئی خیر ہو سکتی تھی تو اس سرخ اونٹ والے میں تھی اگر یہ لوگ اس کا مشورہ مان لیتے تو سیدھے راستہ پر پڑ جاتے یہ عتبہ ہے یہ لڑائی سے روک رہا اور لوٹ جانے کا مشورہ دے رہا تھا اور کہہ رہا تھا قوم والو آج لوٹنے کی عار کی پٹی میرے سر سے باندھ دو اور کہو کہ عتبہ نامراد ہو گیا اور ابو جہل انکار کر رہا تھا (اور جنگ کے لئے اڑا ہوا تھا) خفاف بن ایما بن رحضہ غفاری نے یا اس کے باپ نے (یہ تینوں آخر میں مسلمان ہو گئے تھے مگر اس وقت کافر تھے) اپنے بیٹے کے ساتھ کچھ اونٹ قریش کے پاس بطور ہدیہ بھیج دیئے اور کہلا بھیجا کہ اگر تم چاہو تو اسلحہ اور آدمیوں سے ہم تمہاری مدد کر سکتے ہیں قریش نے جواب میں کہلایا آپ سے تعلق اور رشتہ پکا ہے جو آپ پر حق تھا وہ آپ نے ادا کر دیا (آئندہ امداد کی ضرورت نہیں) اگر ہمارا مقابلہ آدمیوں سے ہے تو خدا کی قسم ان کے مقابلہ میں ہمارے اندر کوئی کمزوری نہیں ہو سکتی اور اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گمان کے مطابق ہماری لڑائی اللہ سے ہوئی تو اللہ کا مقابلہ کرنے کی کسی میں طاقت نہیں۔

حکیم بن خرام:

جب لوگ ٹھہر گئے تو قریش کے چند آدمی جن میں حکیم بن حزام بھی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے (بنائے ہوئے) حوض پر اتر آئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان کو اترنے دو سوائے حکیم بن حزام کے ان میں سے جس شخص نے بھی اس کا پانی پیا مارا گیا حکیمؓ بن حزام بچ گئے اور اس کے بعد مسلمان ہو گئے اور اسلام میں پختہ رہے جب آپ (مسلمان ہونے کے بعد) مضبوط قسم کھاتے تھے تو یوں کہتے تھے قسم ہے اس اللہ کی جس نے بدر کے دن مجھے بچا لیا۔

عمیر بن وہب کی جاسوسی:

جب قریش ٹھکانے سے ہو گئے تو عمیر بن وہب جمحی کو (جو آخر میں مسلمان ہو گئے تھے) مسلمانوں کی تعداد کا اندازہ لگانے کے لئے بھیجا عمیر نے مسلمانوں کے لشکر کے گرداگرد گھوڑے کو چکر دیا اور لوٹ کر بتایا کہ کم وبیش تین سو ہیں لیکن ذرا ٹھہرو میں یہ بھی دیکھ لوں کہ کہیں ان کی چھپی ہوئی کمک نہ ہو چنانچہ وادی کے اندر وہ دور تک گیا اور جب کچھ نظر نہ آیا تو لوٹ کر قریش سے کہہ دیا میں نے کوئی کمک تو نہیں دیکھی لیکن ایک بات دیکھی اونٹنیاں

موتوں کو اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہیں۔ یثرب کے آب کش اونٹوں پر لوگ بیٹھے ہوئے ہیں وہ ایسی قوم ہے کہ سوائے تلواروں کے نہ ان کے محافظین ہیں نہ پناہ کا مقام کیا تم کو نہیں معلوم کہ وہ باتیں کرتے ہیں ہوشیار رہتے ہیں اور سانپ کی طرح منہ میں زبانیں گھماتے ہیں بخدا میرا خیال ہے کہ ان کا ایک آدمی بھی اس وقت تک قتل نہیں ہوگا جب تک وہ تمہارے کسی آدمی کو قتل نہ کردے اگر وہ اپنی تعداد کے برابر تمہارے آدمیوں کو قتل کردیں (اور خود بھی مارے جائیں) تو اس کے بعد زندگی کا کیا فائدہ؟ اب تم خود سوچ لو۔

ابوسلمہ کی جاسوسی:

اس کے بعد قریش نے ابوسلمہ جشمی کو بھیجا اس نے گھوڑے پر سوار ہو کر مسلمانوں کے گرداگرد چکر لگایا اور واپس آ کر کہا خدا کی قسم میں نے نہ چمڑے کی وردی دیکھی نہ سامان نہ زرہ نہ گھوڑے بلکہ میں نے ان کو ایسی قوم پایا جو خیال کئے ہوئے ہیں کہ اب گھر والوں کے پاس لوٹ کر جانا نہیں۔ وہ مسلم ہیں موت کے طلب گار نہ ان کے محافظ ہیں نہ کوئی پناہ گاہ بس تلواریں ہی ان کا سب کچھ ہیں نیلی آنکھوں والے ہیں۔ ڈھالوں کے پیچھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پتھر کی چٹانیں ہیں غیر متحرک اب تم خود سوچ لو۔

قریشی سرداروں کی بزدلی:

حکیمؓ بن حزام نے جو یہ باتیں سنی تو چل کر عتبہ بن ربیعہ کے پاس پہنچے اور اس سے لوگوں کو واپس لے جانے کی گفتگو کی اور کہا ابوالولید آپ قریش کے معمر بزرگ ہیں سردار ہیں آپ کی بات سب مانتے ہیں کیا آپ ایک کام ایسا کر سکتے ہیں جس کی وجہ سے آپ کا نام ہمیشہ رہے گا۔ عتبہ نے پوچھا حکیم وہ کیا بات ہے حکیم نے کہا لوگوں کو لوٹا کر لے جایئے اور اپنے حلیف عمر بن حضرمی (کے جانی و مالی نقصان) کو خود برداشت کر لیجئے۔ عتبہ نے کہا حکیم تم نے (میرے پاس آ کر تو) ایسا کر لیا میں یہ نقصان اپنے اوپر لیتا ہوں کیونکہ عمر حضرمی میرا حلیف تھا مجھ پر اس کی دیت اور مالی نقصان لازم ہے (میں دے دوں گا) مگر تم ابن حنظلہ کے پاس بھی جاؤ مجھے اندیشہ اور کسی سے نہیں صرف اسی سے۔ ہے وہی لوگوں پر جادو کردے گا۔ ابن حنظلہ سے مراد ابوجہل تھا۔

اس کے بعد عتبہ نے لوگوں میں جا کر ایک تقریر کی اور کہا اے گروہ قریش تم کیا کر رہے ہو خدا کی قسم صبح کو اگر تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے ساتھیوں پر کچھ غلبہ بھی پالو گے تب بھی آئندہ ہمیشہ ایک آدمی دوسرے کو نفرت کی نظر سے دیکھے گا کیونکہ وہ اس کے چچا یا ماموں کے بیٹے کو اس کے کنبہ کے کسی اور آدمی کو قتل کر چکا ہوگا (کسی کو اپنے بھائی برادر کا قاتل کیسے اچھا لگے گا) لہٰذا تم لوٹ جاؤ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسرے عربوں کے (مقابلہ) کے لئے چھوڑ دو۔ اگر دوسرے عرب اس پر غالب آ گئے تو تمہاری مراد حاصل ہو گئی اگر اس کے سوا کچھ ہوا تو وہ تم کو الگ پائے گا تم اس سے تعرض نہ کرو گے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ لوگ موت کے طلب گار ہیں تم میں جب تک خیر ہے ان لوگوں تک نہیں پہنچ سکتے (یعنی ان پر غلبہ پانے کے لئے تم کو بہت بڑا جانی نقصان اٹھانا پڑے گا) لوگو! آج اس عار کی پٹی میرے سر سے باندھ دو اور کہد و عتبہ بزدل ہو گیا حالانکہ تم جانتے ہو کہ میں تمہارے اندر نامرد نہیں ہوں۔

عتبہ نے کہا عنقریب اس زمانہ کو معلوم ہو جائے گا کہ میری یا اس کی کس کی بزدلی ہے اس کے بعد عتبہ نے سر کا خود طلب کیا مگر لشکر بھر میں اتنا بڑا خود کوئی نہیں ملا جو اس کے سر پر آ سکتا مجبوراً چادر اوڑھنی کی طرح اس نے سر سے لپیٹ لی ابوجہل نے تلوار سونت کر اپنے گھوڑے کی پشت پر ماری یہ دیکھ کر ایما بن رحضہ بولا یہ تو بدشگونی ہوئی۔

قریش کے نام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام:

محمد بن عمر اسلمی، بلاذری اور صاحب الامتناع کا بیان ہے کہ قریش کے پڑاؤ ڈالنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ بن خطاب کو یہ پیام دے کر قریش کے پاس بھیجا کہ آپ لوگ واپس چلے جائیں تم سے لڑنے کو میں پسند نہیں کرتا یہ کام میرے مقابلہ پر تمہاری جگہ اگر دوسرے لوگ کریں تو اس سے اچھا ہو گا تم مجھ سے لڑو۔ یہ پیام سن کر حکیم بن حزام نے کہا بات تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے خیرخواہی کی پیش کی ہے اس بات کو مان لو، خدا کی قسم وہ انصاف کی بات جب پیش کر چکا تو اب تم اس پر غالب نہیں آ سکتے۔ کیونکہ اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کرنا تمہاری طرف سے زیادتی ہو گی۔ ابوجہل بولا جب اللہ نے ہم کو ان پر قابو دے دیا ہے تو اب ہم (بغیر ان لوگوں کی بیخ کنی کے) واپس نہیں جائیں گے۔

صف بندی: غرض صبح ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کی صف بندی کی اور تیر کی طرح صفوں کو ہموار کیا آپ کے پاس ایک چھوٹا تیر تھا اس سے اشارہ کر رہے تھے کسی سے فرما رہے تھے ذرا آگے بڑھو کسی کو حکم دے رہے تھے پیچھے ہٹو آخر صفیں درست ہو گئیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جھنڈا مصعبؓ بن عمیر کو دیا جس جگہ جھنڈا نصب کرنے کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا۔ مصعبؓ اس طرف کو بڑھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم لائنوں کو دیکھنے لگے مغرب کی طرف اور سورج کی طرف لشکر

کی پشت کرائی مشرک سامنے تھے ان کا منہ سورج کی طرف رہا۔

حضرت سواد کی خوش نصیبی:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب صف بندی کر رہے تھے تو سواد بن غزیہ کچھ آگے نکل آئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے پیٹ میں گھونسا مارا اور فرمایا سوادؓ سیدھا رہ۔ سوادؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے مجھے دکھ پہنچایا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا واسطہ جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو برحق نبی بنا کر بھیجا ہے آپ کو اس کا بدلہ دینا ہوگا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سنتے ہی شکم مبارک کھول دیا اور فرمایا بدلہ لے لو سواد پیٹ کھلا دیکھ کر پیٹ سے چمٹ گئے اور چومنے لگے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سوادؓ تم نے ایسا کیوں کیا۔ سوادؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ اللہ کا جو حکم تھا وہ سامنے آ گیا اور مجھے خیال ہے کہ میں مارا جاؤں گا اس لئے میری خواہش ہوئی کہ آخری وقت آپ سے چمٹ جاؤں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت صحابہؓ کو حکم دیا جب دشمن تمہارے قریب ہوں تو تیر مارنا اور تلوار سے جنگ اس وقت کرنا جب بالکل ہی قریب آ جائیں۔ کذا روی ابوداؤدؒ عن ابی اسید۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریر:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تقریر فرمائی اور اللہ کی حمد وثناء کے بعد لوگوں کو جنگ پر ثابت قدم رہنے اور اللہ کی خوشنودی کا طلبگار ہونے کی ترغیب دی۔

لڑائی کا آغاز: قریش بھی جنگ کے لئے تیار ہو گئے اور (انسانی شکل میں) شیطان بھی ان کے ساتھ لگا رہا۔ مسلمان اپنی لائن پر جمے رہے (کوئی ابتدا میں آگے نہیں بڑھا) سب سے پہلے عامر حضرمی نے مسلمانوں پر حملہ کیا اس کے مقابلہ پر مہجع بن عالیش حضرت عمرؓ کا آزاد کردہ غلام نکلا عامر نے مہجعؓ کو شہید کر دیا۔ انصار میں سے سب سے پہلے حارثہ بن سراقہ شہید ہوئے آپ کو حیان بن عرقہ نے شہید کیا۔ عتبہ بن ربیعہ اپنے بھائی شیبہ اور بیٹے ولید کے درمیان میدان میں نکلا اس کے مقابلہ کے لئے تین انصاری عبدؓاللہ بن رواحہ عوذؓ ارمعاذؓ نکلے عوذؓ ومعاذؓ کے باپ کا نام حارث اور ماں کا نام عفراء تھا عتبہ نے کہا ہم تم سے مقابلہ نہیں کریں گے۔ ہمارے مقابلہ کے لئے ہمارے ہم سر (قریشی) سردار ہونے چاہئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عبیدہؓ بن حارث کھڑے ہو جاؤ حمزہؓ کھڑے ہو جاؤ علیؓ کھڑے ہو جاؤ حمزہؓ نے تو شیبہ کو سنبھلنے بھی نہ دیا قتل کر دیا۔ علیؓ نے ولید کو فرصت نہ دی قتل کر دیا عبیدہؓ اور عتبہ میں تلواروں کی نوک جھونک ہونے لگی دونوں زخمی ہو گئے یہ دیکھ کر حمزہؓ اور علیؓ اپنی تلواریں لے کر عتبہ پر ٹوٹ پڑے اور اس کا کام تمام کر دیا۔ اور قریش اپنے آدمی (عتبہ) کو اٹھا کر لے گئے۔ صحیحین میں آیا ہے کہ سورت حج میں انہی دونوں کے متعلق آیت هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِیْ رَبِّهِمْ الخ نازل ہوئی۔

اسکے بعد دُعاء: ابن اسحاق کا بیان ہے کہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکرؓ کو ساتھ لے کر جھونپڑی میں لوٹ آئے تیسرا کوئی ساتھ نہ تھا اور اللہ سے اس فتح کی دعا کرنے لگے جس کا وعدہ اللہ نے کیا تھا دعا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ یہ بھی تھے اے اللہ آج اگر یہ گروہ ہلاک ہو گیا تو زمین پر پھر تیری پوجا نہ ہو سکے گی۔ حضرت ابوبکرؓ کہہ رہے تھے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اب اپنے رب کی پکار میں کمی کیجئے اللہ نے جو وعدہ آپ سے کیا ہے وہ یقیناً پورا کرے گا۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کا مشورہ:

ابن جریر، ابن ابی حاتم اور طبرانی نے حضرت ابوایوبؓ انصاری کی روایت سے لکھا ہے کہ عبدؓاللہ بن رواحہ نے عرض کیا یا رسول اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تو مشورہ دینے سے بالاتر ہے مگر میں ایک مشورہ عرض کرتا ہوں کہ اللہ کو اس کا وعدہ یاد دلانے کی اب ضرورت نہیں اس کی ذات اس کی یاد دہانی سے بالا اور اعلیٰ ہے فرمایا ابن رواحہ میں اللہ کو اس کا وعدہ کا واسطہ دیتا رہوں گا۔ کوئی شبہ نہیں کہ اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرے گا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کے حضور میں:

ابن سعدؓ اور ابن جریر نے حضرت علیؓ کا بیان نقل کیا ہے حضرت علیؓ نے فرمایا بدر کے دن میں کچھ دیر لڑتا رہا پھر دوڑا ہوا آیا کہ دیکھوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس حال میں ہیں۔ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں پڑے یا حی یا قیوم فرما رہے ہیں اس سے زیادہ کوئی لفظ نہیں فرما رہے تھے پھر میں لڑائی کی طرف لوٹ گیا کچھ دیر کے بعد واپس آیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ میں یہی الفاظ کہتے پایا اس کے بعد اللہ نے فتح عنایت فرما دی بیہقی نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے بھی یہ حدیث بیان کی۔ اس میں اتنا زائد ہے پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رخ موڑا ایسا معلوم ہوتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ چاند ہے اور فرمایا گویا میں شام کو ہی اس قوم کی قتل گاہوں کو دیکھ رہا تھا۔

سعیدؒ بن منصور نے عبیدؒاللہ بن عبداللہ بن عتبہ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکوں کی کثرت اور مسلمانوں کی قلت

ملاحظہ فرمائی تو دو رکعت نماز پڑھی ابوبکرؓ دائیں طرف کھڑے تھے اور نماز میں دعا کی اے اللہ مجھے بے مدد نہ چھوڑنا اے اللہ میں تجھے اس وعدہ کا واسطہ دیتا ہوں جو تو نے مجھ سے کیا ہے۔

ابن ابی شیبہ احمد مسلم ابوداؤد اور ترمذی وغیرہ نے حضرت عمرؓ بن خطاب کی روایت سے بیان کیا ہے کہ بدر کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکوں کو دیکھا وہ ایک ہزار تھے اور اپنے ساتھیوں کو دیکھا وہ تین سو انیس تھے تو کعبہ کی طرف رخ کر کے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے اور اپنے رب کو پکارنے لگے اور کہنے لگے اے اللہ تو نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے وہ پورا کر اے اللہ اپنے وعدہ کے مطابق مجھے عطا کر اے اللہ اگر مسلمانوں کا یہ گروہ ہلاک ہو گیا تو زمین پر تیری پرستش نہ ہو سکے گی۔ برابر یونہی قبلہ کی جانب ہاتھ پھیلائے پکا رہے تھے یہاں تک کہ دوش مبارک سے چادر بھی گر گئی تھی اور ابوبکرؓ نے آ کر چادر اٹھا کر دوش مبارک پر ڈالی پھر پیچھے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چمٹ گئے اور عرض کیا یا رسول اللہ بس کیجئے اللہ کو پکارنے کی حد ہو گئی اللہ ضرور اپنا وعدہ پورا کرے گا اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔ (تفسیر مظہریؒ)

اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ

جب تم لگے فریاد کرنے اپنے رب سے تو وہ پہنچا تمہاری فریاد کو کہ

مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ ⑨

میں مدد کو بھیجوں گا تمہاری ہزار فرشتے لگاتار آنے والے

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ

اور یہ تو دی اللہ نے فقط خوشخبری اور تا کہ مطمئن ہو جائیں

قُلُوْبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ

اس سے تمہارے دل اور مدد نہیں مگر اللہ کی طرف سے

اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ⑩

بے شک اللہ زور آور ہے حکمت والا

فرشتوں کا اترنا:

اسی طرح کی آیت ''آل عمران'' پارہ لن تنالوا کے رُبع پر گزر چکی۔ وہاں کے فوائد ملاحظہ کئے جائیں۔ البتہ اُس جگہ فرشتوں کی تعداد تین سے پانچ ہزار تک بیان کی گئی تھی اگر واقعہ ایک ہے تو کہا جائے گا کہ اول ایک ہزار کا دستہ آیا ہوگا۔ پھر اُس کے پیچھے دوسرے دستے آئے ہوں، جن کی تعداد تین ہزار سے پانچ ہزار تک پہنچی۔ شاید لفظ ''مردفین'' میں اسی طرف اشارہ ہو۔ (تفسیر عثمانیؒ)

بیہقی نے حضرت ابنؓ عباس حضرت حکیمؓ بن حزام اور حضرت ابراہیم تیمی کی روایت سے حدیث دعاء اور حضرت ابوبکرؓ کا قول نقل کیا ہے اس روایت میں یہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جھونپڑی کے اندر تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر کو ایک جھٹکا ہوا پھر (گویا) بیدار ہو کر آپ نے فرمایا ابوبکرؓ بشارت ہو یہ جبرئیل سر پر زرد عمامہ باندھے ہوئے گھوڑے کی لگام پکڑے ہوئے آسمان و زمین کے درمیان موجود تھے پھر زمین پر اترے اور کچھ دیر کے لئے میری نظر سے غائب ہو گئے پھر گھوڑے پر سوار نمودار ہوئے اور مجھ سے کہہ رہے ہیں جب اللہ سے تم نے دعاء کی تو اللہ کی مدد تم کو پہنچ گئی۔

ابن اسحٰق اور ابن المنذر کی روایت میں حدیث کے یہ الفاظ ہیں یہ جبرئیل ہیں گھوڑے کو چاروں ٹانگوں پر چلاتے ہوئے آگے سے لگام پکڑے آ رہے ہیں۔ بخاری اور بیہقی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے دن فرمایا یہ جبرئیل اسلحہ لگائے گھوڑے کی لگام پکڑے ہوئے ہیں۔

''مردفین کا ترجمہ ہے، قطار در قطار ایک کے پیچھے ایک''

طبرانی نے حضرت رفاعہؓ بن رافع کی روایت سے اور ابن جریر و ابن المنذر و ابن مردویہ کے حوالہ سے بیان کیا کہ اللہ نے اپنے نبی کی اور مسلمانوں کی مدد ایک ہزار ملائکہ سے کی ایک پہلو پر جبرئیل کے ساتھ پانچ سو تھے اور دوسرے پہلو پر میکائیل کے ساتھ پانچ سو۔ الحدیث۔

ابویعلی اور حاکم کا بیان ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے فرمایا میں بدر کے کنویں کے پاس تھا کہ ایسی تیز ہوا آئی جس کی طرح میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ پھر ویسی ہی ایک تیز ہوا آئی پھر اسی طرح کی ایک تیز ہوا اور آئی۔ پہلی ہوا جبرئیلؑ کے آنے کی تھی جو ایک ہزار ملائکہ کے ساتھ اتر کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آئے تھے دوسری ہوا میکائیل کے آنے کی تھی جو ایک ہزار ملائکہ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں جانب اترے تھے۔ ابوبکرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں طرف تھے اور تیسری ہوا اسرفیل کے آنے کی تھی جو ایک ہزار ملائکہ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بائیں جانب نازل ہوئے تھے میں بائیں جانب تھا۔ الحدیث

امام احمد، بزار اور حاکم نے صحیح سند کے ساتھ بیان کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا بدر کے دن مجھ سے اور ابوبکرؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہم

میں سے ایک سے فرمایا تمہارے ساتھ جبرئیل ہیں اور دوسرے سے فرمایا تمہارے ساتھ میکائیل ہیں اور اسرافیل ایک عظمت والا فرشتہ ہے جو میدانِ جنگ میں موجود رہتا ہے مگر صف میں شامل ہو کر لڑتا نہیں ہے۔ ابو یعلی کی روایت ہے کہ حضرت جابرؓ نے فرمایا ہم غزوۂ بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے کہ نماز میں ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرا دیئے تھے (نماز کے بعد) ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسکرا دیئے تھے (کیا وجہ تھی)۔ فرمایا جبرئیل میری طرف سے گزرے تھے قوم کے تعاقب سے واپس آرہے تھے ان کے پروں پر غبار کا کچھ اثر موجود تھا میری طرف دیکھ کر ہنسے تھے میں ان کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا تھا۔

جبریل کی واپسی:

ابنِ سعد اور ابو الشیخ نے حضرت عطیہؒ بن قیس کی روایت سے لکھا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بدر کی لڑائی سے فارغ ہو گئے تو حضرت جبرئیل علیہ السلام سرخ گھوڑی پر سوار، زرہ پہنے نیزہ لئے آئے اور کہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ نے مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا ہے اور حکم دیا ہے کہ جب تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشی نہ ہو میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ سے الگ نہ ہوں۔ کیا اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشی ہوگئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں میں خوش ہو گیا۔ اس کے بعد جبرئیلؑ واپس چلے گئے۔

فائدہ: بعض فرشتے آدمی کی شکل میں بعض لوگوں کے سامنے نمودار ہوئے تھے۔ ابراہیم حرثی کا بیان ہے کہ ابو سفیانؓ بن حارث نے کہا ہم نے بدر میں کچھ گورے رنگ کے آدمی ابلق گھوڑوں پر سوار آسمان و زمین کے درمیان دیکھے تھے۔ بیہقی اور ابن عساکر راوی ہیں کہ حضرت سہلؓ بن عمرو نے فرمایا بدر کے دن میں نے کچھ گورے رنگ کے مرد ابلق گھوڑوں پر سوار آسمان و زمین کے درمیان دیکھے جو قتل بھی کر رہے تھے اور قید بھی کر رہے تھے۔

محمد بن عمر واسلمی اور ابن عساکر کا بیان ہے کہ حضرت عبد الرحمٰن بن عوف نے فرمایا میں نے بدر کے دن دو آدمی دیکھے ایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں اور دوسرا بائیں جانب تھا۔ دونوں سخت ترین قتال کر رہے تھے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے تیسرا آ گیا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے چوتھا آ گیا۔

ابراہیم غفاری کی گواہی:

محمد بن عمر واسلمی کا بیان ہے کہ ابراہیم غفاری نے کہا میں اور میرا چچا کا بیٹا بدر کے پانی پر تھے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے ساتھیوں کی قلت اور قریش کی کثرت دیکھ کر ہم نے کہا دونوں گروہوں کا مقابلہ ہوگا تو ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لشکر اور اس کے ساتھیوں کا قصد کریں گے (یعنی براہِ راست ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کو نشانہ بنائیں گے)۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کے میسرہ (بائیں بازو) کو جا کر دیکھا تو اندازہ کیا کہ یہ قریش سے ایک چوتھائی ہونگے۔ ہم میسرہ میں گھوم ہی رہے تھے کہ ایک بادل آیا اور ہم سب پر چھا گیا ہم نے بادل کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا تو اس میں سے کچھ آدمیوں کی اور ہتھیاروں کی آواز سنائی دی، ایک آدمی اپنے گھوڑے سے کہہ رہا تھا حیزوم آگے بڑھ۔ (اس قصہ میں اقدم حیزوم کا لفظ آیا ہے۔ حضرت مؤلف نے حاشیہ میں لکھا ہے کہ اَقدَم، اِقدَم، اَقدِم تینوں طرح پڑھنا درست ہے۔ نووی نے اِقدَم کو ترجیح دی ہے۔ مراد ہے جنگ میں آگے بڑھنا یا اقدام کرنا۔ حیزوم حیزم سے مشتق ہے۔ حیزوم سینہ کو بھی کہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس گھوڑے کا نام حیزوم اس لئے ہو کہ وہ ملائکہ کے سب گھوڑوں سے آگے تھا)۔

(یہ غیبی آدمی) آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے میمنہ پر اترے پھر ایک جماعت اور اسی طرح کی (اوپر سے) آئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوگئی۔ اب وہ (صحابہؓ کی فوج) قریش سے دوگنی ہوگئی۔ میرا چچا کا بیٹا تو مر گیا میں رکا رہا (یعنی جنگ میں بچ گیا) اور مسلمان ہو گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کی اطلاع دی۔

فرشتے نے ابراہیم کو باندھ دیا:

ابن اسحاق اور ابن جریر نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے ایک غفاری شخص کا اور بیہقی نے سائب بن ابی جیش کا قول نقل کیا ہے۔ غفاری اور سائب کہتے تھے کہ خدا کی قسم مجھے کسی آدمی نے قید نہیں کیا۔ واقعہ یہ ہوا کہ جب قریش کو شکست ہوئی اور وہ بھاگے تو میں ان کے ساتھ بھاگا۔ مجھے ایک دراز قامت گورے رنگ کے آدمی نے پکڑ لیا یہ شخص گھوڑے پر سوار تھا اور آسمان و زمین کے درمیان معلق تھا۔ پھر مجھے باندھ دیا اتنے میں عبد الرحمٰن بن عوف آ گئے اور مجھے بندھا ہوا دیکھ کر پوچھا اس کو کس نے باندھا ہے لیکن کسی نے مجھے گرفتار کرنے کا دعویٰ نہیں کیا۔ آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مجھے پیش کیا گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تجھے کس نے گرفتار کیا ہے۔ میں نے اصل بات بتانی نہیں چاہی اور جواب میں کہہ دیا مجھے نہیں معلوم۔ فرمایا تجھے ایک فرشتہ نے گرفتار کیا

ہے۔ امام احمد ابن سعد اور ابن جریر نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے اور بیہقی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کیا کہ ابوالیسرؓ نے عباسؓ کو گرفتار کیا تھا۔ ابوالیسر گٹھیلے بدن کے ناٹے قد کے آدمی تھے اور عباسؓ قد آور تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوالیسرؓ سے دریافت فرمایا تم نے عباسؓ کو کیسے گرفتار کرلیا۔ ابوالیسرؓ نے کہا یا رسول اللہ گرفتار کرنے میں ایک اور شخص نے میری مدد کی جس کی ہیئت اس اس طرح کی تھی۔ میں نے اس شخص کو نہ پہلے کبھی دیکھا تھا نہ اس کے بعد دیکھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہاری مدد ایک بزرگ فرشتہ نے کی تھی۔

حضرت ابواسید کا بیان:

ابن اسحٰق اور اسحٰق بن راہو یہ کا بیان ہے کہ حضرت ابواسید ساعدی نے نابینا ہوجانے کے بعد فرمایا تھا اگر اب میں تمہارے ساتھ بدر میں ہوتا اور میری آنکھیں بھی ہوتیں تو میں تم کو وہ گھاٹی بتاتا جس سے ملائکہ نکل کر آئے تھے اور مجھے (ان کے آنے میں) کوئی شک تھا نہ شبہ۔

خصوصی نشانی: بیہقی نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ بدر کے دن ملائکہ کی خصوصی نشانی سفید عمامے تھے جن کو انہوں نے پشت پر چھوڑ رکھا تھا (یعنی عمامہ کا کچھ حصہ بطور دم دونوں شانوں کے بیچ میں لٹکا رکھا تھا) اور خیبر کے دن (فرشتوں کی خصوصی نشانی) سرخ عمامے تھے۔ ابن اسحاق نے بھی حضرت ابن عباسؓ کا قول اسی طرح نقل کیا ہے۔ اسی روایت میں اتنا زائد ہے ہاں جبرئیل کا عمامہ زرد تھا۔

طبرانی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت عروہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ بدر کے دن حضرت جبرئیلؑ زبیرؓ کی شکل میں زرد عمامہ باندھے اترے تھے۔ ابن ابی شیبہ، ابن جریر اور ابن مردویہ نے حضرت عبداللہ بن زبیر کی روایت سے بھی اسی طرح بیان کیا ہے۔

ابن سعد نے لکھا ہے کہ بدر کے دن ملائکہ کی خصوصی نشانی سبز اور زرد اور سرخ نورانی عمامے تھے جن کی دمیں انہوں نے شانوں کے درمیان چھوڑ رکھی تھیں اور گھوڑوں کی پیشانیوں پر بطور کلغی اون بندھا ہوا تھا اور ملائکہ ابلق گھوڑوں پر سوار تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ملائکہ نے خصوصی نشانی مقرر کرلی ہے تم بھی (یہی) نشانی اختیار کرو۔ چنانچہ لوگوں نے اون (بطور کلغی) اپنے سروں کے بیچ اور ٹوپیوں پر باندھ لیا۔

حضرت عبداللہ اور حضرت ابوبکرؓ کے مشورہ کا فرق:

عبداللہ بن رواحہ نزول اتم کے مرتبہ پر فائز نہ تھے اسی لئے انہوں نے کہا تھا کہ اللہ کو وعدہ یاد دلایا جائے، اس سے اللہ بہت بالا و برتر ہے (اس کو اس کی ضرورت نہیں) اور حضرت ابوبکرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مرتبہ سے واقف تھے اور آپ کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب حاصل تھا۔ اس لئے حضرت ابن رواحہ کی طرح تو الفاظ زبان سے نہیں نکالے ہاں یہ فرمایا کہ اب اللہ کو واسطہ دے کر دعا کرنے کی حد ہوگئی (اس سے زیادہ ضرورت نہیں) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بے قرار ہونے کی وجہ یہ تھی کہ آپ اشاعتِ اسلام اور استیصالِ کفر کی انتہائی رغبت رکھتے تھے اور آپ کو یہ بھی معلوم تھا کہ اللہ سارے جہان کی عبادت سے بے نیاز ہے (اس کو ضرورت نہیں کہ کوئی اس کی عبادت کرے اور دنیا میں اسلام پھیلے اور کفر مٹے) واللہ اعلم۔

نزول اتم کا درجہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نزولِ اتم کا مرتبہ حاصل تھا۔ اسی لئے باوجود کمال ایمانی کے حضرت ابراہیمؑ نے احیاء موتٰی کو آنکھوں سے دیکھنے کی درخواست کی تاکہ شہودی طور پر اطمینان قلب پیدا ہوجائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہودی اطمینان کے لئے امداد ظاہری کے لئے دعاء کی۔ (تفسیر مظہری)

اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ

جس وقت کہ ڈال دی اُس نے تم پر اونگھ اپنی طرف سے تسکین کے واسطے

عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ

اور اتارا تم پر آسمان سے پانی کہ اس سے تم کو پاک کردے

بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ

اور دور کردے تم سے شیطان کی نجاست

وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ ﴿١١﴾

اور مضبوط کردے تمہارے دلوں کو اور جمادے اس سے تمہارے قدم

مسلمانوں کیلئے مشکلات:

بدر کا معرکہ فی الحقیقت مسلمانوں کے لئے بہت ہی سخت آزمائش اور عظیم الشان امتحان کا موقع تھا۔ وہ تعداد میں تھوڑے تھے، بے سروسامان تھے، فوجی مقابلہ کے لئے تیار ہوکر نہ نکلے تھے۔ مقابلہ پر ان سے تگنی تعداد کا لشکر تھا جو پورے ساز و سامان سے کبر و غرور کے نشہ میں سرشار ہوکر نکلا تھا۔

مسلمانوں اور کافروں کی یہ پہلی قابلِ ذکر ٹکر تھی۔ پھر صورت ایسی پیش آئی کہ کفار نے پہلے سے اچھی جگہ اور پانی وغیرہ پر قبضہ کر لیا۔ مسلمان نشیب میں تھے، ریت بہت زیادہ تھی جس میں چلتے ہوئے پاؤں دھنستے تھے۔ گرد و غبار نے الگ پریشان کر رکھا تھا۔ پانی نہ ملنے سے ایک طرف غسل و وضو کی تکلیف، دوسری طرف تشنگی ستا رہی تھی۔ یہ چیزیں دیکھ کر مسلمان ڈرے کہ بظاہر آثار شکست کے ہیں۔ شیطان نے دلوں میں وسوسہ ڈالا کہ اگر واقعی تم خدا کے مقبول بندے ہوتے تو ضرور تائید ایزدی تمہاری طرف ہوتی اور ایسی پریشان کن اور یاس انگیز صورت حال پیش نہ آتی۔

غیبی مدد: اس وقت حق تعالیٰ نے قدرتِ کاملہ سے زور کا مینہ برسایا جس سے میدان کی ریت جم گئی، غسل و وضو کرنے اور پینے کے لئے پانی کی افراط ہوگئی، گرد و غبار سے نجات ملی۔ کفار کا لشکر جس جگہ تھا وہاں کیچڑ اور پھسلن سے چلنا پھرنا دشوار ہوگیا۔

رحمت کا نزول: جب یہ ظاہری پریشانیاں دور ہوئیں تو حق تعالیٰ نے مسلمانوں پر ایک قسم کی غنودگی طاری کر دی۔ آنکھ کھلی تو دلوں سے سارا خوف وہراس جاتا رہا۔ بعض روایات میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر صدیقؓ رات بھر "عریش" میں مشغول دعا رہے۔ اخیر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر خفیف سی غنودگی طاری ہوئی، جب اس سے چونکے تو فرمایا خوش ہو جاؤ کہ جبریل تمہاری مدد کو آ رہے ہیں۔ عریش سے باہر تشریف لائے تو سیھزم الجمع و یولون الدبر زبان مبارک پر جاری تھا۔ بہرحال اس بارانِ رحمت نے بدن کو احداث سے اور دلوں کو شیطان کے وساوس سے پاک کر دیا۔ ادھر ریت کے جم جانے سے ظاہری طور پر قدم جم گئے اور اندر سے ڈر نکل کر دل مضبوط ہوگئے۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ بدر کے روز مقدادؓ کے سوا کسی کے پاس سواری نہیں تھی۔ ہم سب نیند کے سے عالم میں تھے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک درخت کے نیچے صبح تک نمازیں پڑھتے رہے اور خدا کے آگے روتے رہے۔

حدیث میں ہے کہ بروز بدر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے لئے بنائے ہوئے کاشانہ میں صدیق اکبرؓ کے ساتھ تھے اور دونوں مل کر خدا سے دعا کر رہے تھے۔ ایسے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اونگھ سی آگئی۔ پھر آپ تبسم کرتے ہوئے خود ہی آگئے اور فرمانے لگے، اے ابوبکرؓ! خوش ہو جاؤ وہ ہیں جبرئیلؑ گرد آلود کیفیت میں۔ پھر آپ کاشانے سے باہر آئے اور یہ آیت تلاوت فرما رہے تھے کہ "دشمنوں کو ہزیمت ہوگی اور وہ پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے"۔

اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ

جب حکم بھیجا تیرے رب نے فرشتوں کو کہ میں ساتھ ہوں تمہارے

فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ

سو تم دل ثابت رکھو مسلمانوں کے میں ڈال دوں گا دل میں

الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ

کافروں کے دہشت سو مارو

الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ

گردنوں پر اور کاٹو ان کی پور پور

بَنَانٍ ؕ﴿۱۲﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ

یہ اس واسطے ہے کہ وہ مخالف ہوئے اللہ کے اور اس کے رسول کے

وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ

اور جو کوئی مخالف ہوا اللہ کا اور اس کے رسول کا تو بے شک اللہ کا

شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۳﴾ ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَاَنَّ

عذاب سخت ہے یہ تو تم چکھ لو اور جان رکھو کہ

لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۴﴾

کافروں کے لئے ہے عذاب دوزخ کا

معرکۂ بدر کی اہمیت:

جنگ بدر کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس معرکہ میں خود ابلیس لعین کنانہ کے سردار اعظم سراقہ بن مالک مدلجی کی صورت میں متشکل ہو کر ابوجہل کے پاس آیا اور مشرکین کے خوب دل بڑھائے کہ آج تم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا، میں اور میرا سارا قبیلہ تمہارے ساتھ ہے۔ ابلیس کے جھنڈے تلے بڑا بھاری لشکر شیاطین کا تھا۔ یہ واقعہ آگے آئے گا۔ اس کے جواب میں حق تعالیٰ نے مسلمانوں کی کمک پر شاہی فوج کے دستے جبریل و میکائیل کی کمانڈ میں یہ کہہ کر بھیجے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں (اگر شیاطین آدمیوں کی صورت میں متشکل ہو کر کفار کے حوصلے بڑھا رہے ہیں اور ان کی

طرف سے لڑنے کو تیار ہیں اور مسلمانوں کے قلوب کو وسوسے ڈال کر خوفزدہ کر رہے ہیں تو تم مظلوم وضعیف مسلمانوں کے دلوں کو مضبوط کرو۔ ادھر تم ان کی ہمت بڑھاؤ گے ادھر میں کفار کے دلوں میں دہشت اور رعب ڈال دونگا۔ تم مسلمانوں کے ساتھ ہو کر ان ظالموں کی گردنیں مارو اور پور پور کاٹ ڈالو کیونکہ آج ان سب جنی وانسی کافروں نے مل کر خدا ورسول سے مقابلہ کی ٹھہرائی ہے۔ سوانہیں معلوم ہو جائے کہ خدا کے مخالفوں کو کیسی سخت سزا ملتی ہے۔ آخرت میں جو سزا ملے گی اصل تو وہ ہی ہے لیکن دنیا میں بھی اس کا تھوڑا سا نمونہ دیکھ لیں اور عذاب الٰہی کا کچھ مزہ چکھ لیں۔ روایات میں ہے کہ بدر میں ملائکہ کو لوگ آنکھوں سے دیکھتے تھے اور ان کے مارے ہوئے کفار کو آدمیوں کے قتل کئے ہوئے کفار سے الگ شناخت کرتے تھے۔ خدا تعالیٰ نے یہ ایک نمونہ دکھایا کہ اگر کبھی شیاطین الجن والانس ایسے غیر معمولی طور پر حق کے مقابل جمع ہو جائیں تو وہ اہل حق اور مقبول بندوں کو ایسے غیر معمولی طریقہ سے فرشتوں کی کمک پہنچا سکتا ہے۔ باقی ویسے تو فتح غلبہ بلکہ ہر چھوٹا بڑا کام خدا ہی کی مشیت وقدرت سے انجام پاتا ہے۔ اسے نہ فرشتوں کی احتیاج ہے نہ آدمیوں کی، اور اگر فرشتوں ہی سے کوئی کام لے تو ان کو وہ طاقت بخشی ہے کہ تنہا ایک فرشتہ بڑی بڑی بستیوں کو اٹھا کر پٹک سکتا ہے۔ یہاں تو عالم تکلیف واسباب میں ذرا سی تنبیہ کے طور پر شیاطین کی غیر معمولی دوڑ دھوپ کا جواب دینا تھا اور بس۔ (تفسیر عثمانی)

مسلمان اور کافر کے دل کا فرق:

شاہ عبدالقادرؒ فرماتے ہیں کہ کافروں کے دل فرشتوں کے الہام کے قابل نہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے رعب ڈالنے کو اپنی طرف منسوب کیا اور فرشتوں کو مسلمانوں کے دل ثابت کرنے کا حکم دیا اور اس جنگ میں فرشتے ہاتھوں سے بھی لڑے ہیں۔ (موضح القرآن)

نکتہ: چونکہ معرکۂ بدر میں خود ابلیس لعین کنانہ کے سردار اعظم سراقۃ بن مالک مدلجی کی شکل میں متمثل ہو کر ابوجہل کے پاس آیا اور مشرکین کے حوصلے بڑھائے وراس کو یہ اطمینان دلایا کہ میرا تمام قبیلہ تمہارے ساتھ ہے۔ اور بعد ازاں ابلیسِ لعین شیاطین کا ایک بھاری لشکر لے کر مشرکین کی مدد کے لئے معرکۂ بدر میں حاضر ہوا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں اہل ایمان کے دلوں کو مضبوط کرنے کے لئے فرشتوں کا لشکر نازل کیا اور ان کو حکم دیا کہ اپنے الہامات سے مسلمانوں کے دلوں کو قوت پہنچائیں اور ان کی مدد کریں اور ان کے ہمراہ ہو کر کافروں سے لڑیں ورنہ فی الحقیقت اللہ کو نہ فرشتوں کی احتیاج ہے اور نہ آدمیوں کی وہ ایک فرشتہ سے بھی بڑی بستی تباہ کر سکتا ہے۔ یہ سب من جانب اللہ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اور اپنے صحابہؓ کا اعزاز واکرام تھا۔ (معارف کاندھلویؒ)

فرشتوں کے کام:

اس میں فرشتوں کو دو کام سپرد کئے گئے۔ ایک یہ کہ مسلمانوں کی ہمت بڑھائیں یہ اس طرح بھی ہو سکتا ہے کہ فرشتے میدان میں آ کر ان کی جماعت کو بڑھائیں اور ان کے ساتھ مل کر قتال میں حصہ لیں اور اس طرح بھی کہ اپنے تصرف سے مسلمانوں کے دلوں کو مضبوط کر دیں اور ان میں قوت پیدا کر دیں۔ دوسرا کام یہ بھی ان کے سپرد ہوا کہ فرشتے خود بھی قتال میں حصہ لیں اور کفار پر حملہ آور ہوں۔ اس آیت سے ظاہر یہی ہے کہ فرشتوں نے دونوں کام انجام دیئے، مسلمانوں کے دلوں میں تصرف کر کے ہمت وقوت بھی بڑھائی اور قتال میں بھی حصہ لیا۔ اور اس کی تائید چند روایاتِ حدیث سے بھی ہوتی ہے جو تفسیر درمنثور اور مظہری میں تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں اور قتالِ ملائکہ کی عینی شہادتیں صحابہ کرامؓ سے نقل کی ہیں (معارف مفتی اعظم)

ابونعیم نے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے آپ نے فرمایا کہ میں نے اپنے والد سے پوچھا، ابا! آپ کو ابوالیسرؓ نے کیسے گرفتار کر لیا اگر آپ چاہتے تو اس کو مٹھی میں پکڑ لیتے (آپ قد آور جسیم آدمی ہیں اور ابوالیسرؓ ناٹا ٹھگنا مٹھی بھر آدمی ہے)۔ فرمایا بیٹے ایسا نہ کہو۔ وہ مجھے کوہِ خندقہ سے بھی بڑا دکھائی دیتا تھا۔

ابن انباری نے کہا فرشتے واقف نہ تھے کہ آدمیوں کو کیسے قتل کیا جاتا ہے۔ اللہ نے فاضربوا فرما کر ان کو بتا دیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعاء قبول ہوئی:

بخاری، نسائی اور ابن ماجہ نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ بدر کے دن جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ڈیرہ کے اندر تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی اے اللہ! میں تجھے تیری ذمہ داری اور تیرے وعدہ کا واسطہ دیتا ہوں، اے اللہ! اگر مسلمانوں کو مغلوب کرنے کی آج تیری مشیت ہوئی تو آج کے بعد تیری عبادت نہ کی جا سکے گی۔ یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑ لیا اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! بس۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کے سامنے خوب زاری کر چکے (حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا ختم کر دی) اور زرہ پہنے اچھلتے ہوئے یہ فرماتے ہوئے ڈیرہ سے باہر آ گئے سیهزم الجمع ویولّون الدبر۔

فقط اشارہ سے سر کٹ جاتا:

حاکم اور بیہقی اور ابو نعیم نے بیان کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح بھی کہا ہے کہ حضرت سہلؓ بن حنیف نے فرمایا بدر کے دن ہم میں سے بعض لوگ اپنی تلوار سے مشرک کے سر کی طرف اشارہ ہی کرتے تھے اور تلوار پہنچنے نہ پاتی تھی کہ سر نیچے گر پڑتا تھا بیہقی نے حضرت ربیعؒ بن انس کا بیان نقل کیا ہے کہ گردنوں اور پوروں پر آگ سے جلے ہوئے کی طرح نشان دیکھ کر لوگ پہچان لیتے تھے کہ اس کا کس نے قتل کیا ہے۔ (تفسیر مظہری)

ابن اسحاق اور بیہقی نے حضرت ابو واقد لیثیؓ کا بیان نقل کیا ہے، میں بدر کے دن ایک مشرک کا تعاقب کر رہا تھا لیکن میری تلوار پہنچنے سے پہلے اس کا سر گر پڑا۔ اس سے میں پہچان لیتا تھا کہ کسی اور نے اس کو قتل کر دیا۔ بیہقی نے حضرت خارجہ بن ابراہیم کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیلؑ سے دریافت کیا بدر کے دن اقدم حیزوم کہنے والا کون فرشتہ تھا۔ حضرت جبرئیلؑ نے فرمایا تمام آسمان والوں کو میں نہیں پہچانتا۔

ابولہب کی ذلت:

حضرت ابو رافع فرماتے ہیں دشمن خدا ابولہب خود بدر میں شریک نہ ہوا تھا اپنی جگہ اس نے عاصم بن ہشام بن مغیرہ کو بھیج دیا تھا۔ جب اس کو بدر کی شکست کی اطلاع ملی تو اللہ نے اس کو ذلیل اور رسوا کر دیا اور ہم کو اپنے اندر قوت اور عزت محسوس ہونے لگی۔ میں کمزور آدمی تھا تیر بنایا کرتا تھا اور زمزم کے حجرہ کے اندر بیٹھا تیر چھیلا کرتا تھا۔ ایک روز حجرہ کے اندر بیٹھا تیر تراش رہا تھا ام الفضل میرے پاس بیٹھی تھیں کہ ابولہب کافر پاؤں کو گھسیٹتا ہوا سامنے سے آ گیا اور حجرہ کے بیرونی حصہ میں بیٹھ گیا۔ اس کی پشت میری پشت کی طرف تھی۔ وہ بیٹھا ہی تھا کہ لوگوں نے کہا لو ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب آ گیا۔ ابولہب بولا بھتیجے میرے پاس آؤ تمہارے پاس ضرور اطلاع ہوگی۔ ابوسفیان اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا لوگ کھڑے رہے۔ ابو لہب نے کہا بھتیجے بتاؤ کیا ہوا۔ ابوسفیان نے کہا کچھ نہیں۔ خدا کی قسم مقابلہ ہوا تو ہم نے اپنے شانے ان کے ہاتھوں میں دے دیئے کہ وہ جیسا چاہیں کریں ہم کو قتل کریں یا قید کریں اس کے باوجود خدا کی قسم لوگ کبیدہ خاطر نہیں ہوئے۔ مگر ہمارا مقابلہ ایسے گورے رنگ کے لوگوں سے ہوا جو ابلق گھوڑوں پر سوار تھے اور آسمان و زمین کے درمیان (فضا میں) معلق تھے۔ خدا کی قسم ان کا اندازہ کسی چیز سے نہیں ہوتا تھا نہ ان کے سامنے کوئی چیز ٹھہر سکتی تھی۔ حضرت ابو رافع کا بیان ہے میں نے یہ سن کر خیمہ کا ایک حصہ (غالباً راوی نے جس کو حجرہ کہا ہے وہ حجرہ نما ڈیرہ ہوگا جو طنابوں سے بندھا ہوا ہو گا) اپنے ہاتھ سے اٹھا کر کہا خدا کی قسم وہ ملائکہ تھے۔ ابولہب نے ہاتھ اٹھا کر فوراً میرے منہ پر زور سے ضرب لگائی۔ میں اس سے لپٹ گیا اس نے مجھے اٹھا کر زمین پر دے مارا اور اوپر چڑھ کر مجھے مارنے لگا۔ مگر میں کمزور آدمی تھا۔ ام الفضل نے جو یہ دیکھا تو ڈیرے کی ایک ٹیکی لے کر ابولہب کے زور سے ماری جس سے اس کا سر برے طور سے پھٹ گیا اور بولیں چونکہ اس کا آقا موجود نہیں ہے اس لئے تو نے اس کو کمزور سمجھ لیا۔

ابولہب ذلیل ہو کر منہ پھیر کر چل دیا اور سات راتیں گزرنے نہ پائی تھیں کہ اللہ نے اس کو عدسہ کے مرض میں مبتلا کر دیا اور ختم کر دیا۔ ابن جریر نے کہا عدسہ ایک قسم کا پھوڑا ہوتا تھا۔ عرب اس کو منحوس جانتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ بڑا متعدی مرض ہے۔ ابولہب کو چونکہ عدسہ کا مرض ہوا تھا اس کے مرنے کے بعد بھی تین دن تک اس کی اولاد اس سے دور دور ہی رہی۔ کوئی اس کی لاش کے قریب نہ آتا تھا نہ اس کو دفن کرنے کا قصد کرتا۔ آخر جب بدنامی کا زیادہ اندیشہ ہوا تو ایک گڑھا کھود کر لاٹھیوں کے سہارے لاش کو اٹھا کر اس گڑھے میں ڈال دیا اور دور ہی سے پتھروں سے گڑھے کو پاٹ کر لاش کو چھپا دیا۔ (تفسیر مظہری)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ
اے ایمان والو! جب بھڑو تم کافروں
كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ﴿۱۵﴾
سے میدان جنگ میں تو مت پھیرو ان سے پیٹھ

میدان جنگ سے بھاگنا:

''فرار من الزحف'' جہاد میں سے نکل کر بھاگنا اور لڑائی میں کفار کو پیٹھ دکھانا بہت سخت گناہ اکبر الکبائر میں سے ہے۔ اگر کافر تعداد میں مسلمانوں سے دگنے ہوں اس وقت تک فقہاء نے پیٹھ پھیرنے کی اجازت نہیں دی۔ (تفسیر عثمانی)

بدر کے بعد جب حنین کی لڑائی پیش آئی تو مسلمانوں کی تعداد بارہ ہزار تھی مگر اس کثرت کے باوجود وہ پیٹھ پھیر کر گھبراہٹ سے بھاگ کھڑے ہوئے میرے نزدیک بغوی کی تفسیر زیادہ مناسب ہے اس تفسیر پر ممانعت کے حکم میں عموم ہو جائے گا جماعت کا مقابلہ جماعت سے ہو یا ایک کا ایک سے بہر حال پیٹھ دینے کی ممانعت مستفاد ہوگی جب جمع کا تقابل جمع سے

ہوتا ہے تو افراد کا افراد سے مقابلہ لازم ہے۔

مسئلہ: اکثر اہل علم کے نزدیک میدان جنگ سے مقابلہ کے وقت بھاگنا گناہِ کبیرہ ہے چاروں اماموں کا قول یہی ہے مگر سب کے نزدیک یہ شرط ہے کہ مسلمانوں کی تعداد دشمنوں کے مقابلہ میں نصف سے کم نہ ہو، اگر نصف سے کم ہو تو دشمنوں کو چھوڑ کر بھاگنا جائز ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سات ہلاکت آفریں چیزوں میں قتال سے بھاگنے کا شمار کیا ہے۔ (تفسیر مظہری)

وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا
اور جو کوئی ان سے پھیرے پیٹھ اس دن مگر یہ کہ ہنر کرتا ہو
لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ
لڑائی کا یا جا ملتا ہو فوج میں سو وہ پھرا
بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ
اللہ کا غضب لے کر اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے
وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝
اور وہ کیا برا ٹھکانا ہے

یعنی اگر پسپائی کسی جنگی مصلحت سے ہو، مثلاً پیچھے ہٹ کر حملہ کرنا زیادہ مؤثر ہے یا ایک جماعت سپاہیوں کی مرکزی فوج سے جدا ہوگئی وہ اپنے بچاؤ کے لئے پسپا ہو کر مرکز سے ملنا چاہتی ہے، تو ایسی پسپائی جرم نہیں۔ گناہ اس وقت ہے جبکہ پسپائی محض لڑائی سے جان بچا کر بھاگنے کی نیت سے ہو۔ (تفسیر عثمانی)

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۪
سو تم نے ان کو نہیں مارا لیکن اللہ نے ان کو مارا
وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ
اور تو نے نہیں پھینکی مٹھی خاک کی جس وقت کہ پھینکی تھی
وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ؕ
لیکن اللہ نے پھینکی اور تاکہ کرے ایمان والوں پر اپنی طرف سے

اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝
خوب احسان بے شک اللہ ہے سننے والا جاننے والا

کنکریوں سے کافر مرنے لگے:

جب جنگ کی شدت ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مٹھی کنکریاں لشکر کفار کی طرف پھینکیں اور تین مرتبہ شاھت الوجوہ فرمایا۔ خدا کی قدرت سے کنکریوں کے ریزے ہر کافر کی آنکھ میں پہنچے، وہ سب آنکھیں ملنے لگے۔ ادھر سے مسلمانوں نے فوراً دھاوا بول دیا۔ آخر بہت سے کفار کھیت رہے، اس کو فرماتے ہیں کہ گو بظاہر کنکریاں تم نے اپنے ہاتھ سے پھینکی تھیں لیکن کسی بشر کا یہ فعل عادۃً ایسا نہیں ہوسکتا کہ مٹھی بھر کنکریاں ہر سپاہی کی آنکھ میں پڑ کر ایک مسلح لشکر کی ہزیمت کا سبب بن جائیں۔ یہ صرف خدائی ہاتھ تھا جس نے مٹھی بھر سنگریزوں سے فوجوں کے منہ پھیر دیئے۔ تم بے سروسامان قلیل التعداد مسلمانوں میں اتنی قدرت کہاں تھی کہ محض تمہارے زور بازو سے کافروں کے ایسے ایسے منڈ مارے جاتے، یہ خدا ہی کی قدرت کا کرشمہ ہے کہ اس نے ایسے متکبر سرکشوں کو فنا کے گھاٹ اتارا، ہاں یہ ضرور ہے کہ بظاہر کام تمہارے ہاتھوں سے لیا گیا اور ان میں وہ فوق العادۃ قوت پیدا کردی جسے تم اپنے کسب واختیار سے حاصل نہ کرسکتے تھے۔ یہ اس لئے کیا گیا کہ خدا کی قدرت ظاہر ہو اور مسلمانوں پر پوری مہربانی اور خوب طرح احسان کیا جائے۔ بیشک خدا مؤمنین کی دعا وفریاد کو سنتا اور ان کے افعال واحوال کو بخوبی جانتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ مقبول بندوں پر کس وقت کس عنوان سے احسان کرنا مناسب ہے۔ (تفسیر عثمانی)

طبرانی اور ابوالشیخ نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا مجھے ایک مٹھی کنکریاں دے دو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کافروں کے چہروں پر پھینک ماریں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں کوئی شخص نہ بچا جس کی آنکھوں میں کنکریاں نہ بھر گئی ہوں۔ ابوالشیخ، ابونعیم اور ابن مردویہ نے بیان کیا کہ حضرت جابرؓ نے فرمایا میں نے بدر کے دن آسمان سے کچھ کنکریاں گرنے کی آواز سنی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی طشت میں گری ہیں۔ جب صف بندی ہوگئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کنکریاں لے کر مشرکوں کے چہروں پر پھینک ماریں جس کی وجہ سے ان میں بھگدڑ پڑ گئی۔

آیت کے شان نزول کی دوسری روایت:

حاکم نے بروایت سعید بن میسّب بحوالۂ میسّب بیان کیا کہ احد کے

دن ابی بن خلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بڑھا لوگوں نے اس کا راستہ چھوڑ دیا اور مصعبؓ بن عمیر اس کے مقابلہ پر آ گئے۔ ابی کی زرہ اور خود کے درمیان ایک شگاف تھا جس سے اس کی ہنسلی کی ہڈی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھ پائی اور اس شگاف میں چھوٹا نیزہ (برچھی) مارا۔ ابی فوراً گھوڑے سے گر پڑا، ایک پسلی ٹوٹ گئی مگر زخم سے خون نہیں نکلا (یعنی ایسا زخم نہیں لگا کہ خون نکلتا، کچھ خراش لگ گئی) مگر ابی بیل کی طرح چلانے لگا کہ ساتھیوں نے کہا تو کیسا ڈھیلا آدمی ہے (کوئی زخم نہیں پھر کیوں چلاتا ہے) صرف ایک خراش لگی ہے ابی نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہ کہا تھا کہ ابی کو میں قتل کئے دیتا ہوں قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر یہ زخم تمام ذی المجاز (ذی المجاز ایک میلہ کا نام ہے جہاں عکاظ کے میلہ کے بعد عرب جمع ہوتے تھے) والوں کے لگتا تو سب مر جاتے۔ غرض مکہ کو پہنچنے سے پہلے مر گیا اور اللہ نے آیت وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى نازل فرمائی۔ اس حدیث کی سند صحیح مگر غریب ہے۔

بدر کے غازیوں کا اعزاز:

ابوداؤد وابن ماجہ اور طبرانی نے جید سند سے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ اہلِ بدر کے احوال سے واقف ہو جانے پر فرماتا ہے کہ تم (اب) جو چاہو عمل کرو، میں نے تم کو بخش دیا۔

صحیحین میں حضرت علیؓ کی روایت سے حاطبؓ بن بلتعہ کے خط کا قصہ آیا ہے (کہ حاطبؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے ارادہ کی اطلاع مکہ والوں کو دینے کے لئے خط لکھا تھا اور راستہ میں وہ خط حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے پکڑ لیا تھا) اور یہ بھی آیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ حاطبؓ کی گردن مار دیجئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا وہ شرکاء بدر میں سے نہیں ہے اور اللہ نے اہلِ بدر کے احوال پر مطلع ہونے کے بعد ہی فرمایا ہے کہ جو کچھ چاہو کرو میں نے تمہاری مغفرت کر دی اور یہ بھی فرما دیا کہ تمہارے لئے جنت ضروری ہو گئی۔

بدر کے شہداء کی فضیلت:

بخاری نے حضرت انسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ بدر کے دن حضرت حارثہؓ بن زید شہید ہو گئے تو ان کی ماں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ آپ واقف ہیں کہ حارثہ کا مجھ سے کیا رشتہ تھا۔ اب اگر وہ جنت میں ہو تو میں صبر کروں اور ثواب کی امید رکھوں اور اگر اس کے علاوہ کوئی صورت ہو تو مجھے بتائیے کہ میں کیا کروں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اری! کیا جنت ایک ہے جنتیں تو بہت ہیں اور وہ جنت الفردوس میں ہے۔ بخاری کے علاوہ بعض دوسری روایتوں میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ تیرا بیٹا فردوس اعلیٰ میں ہے۔ اس روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ حارثہؓ دور سے دیکھنے والوں میں شامل تھے ان الفاظ سے اہلِ بدر کی مزید فضیلت پر روشنی پڑتی ہے کہ حارثہ میدانِ جنگ کے وسط میں بھی نہ تھے، ہلاکت گاہ میں بھی نہ تھے، دور سے دیکھنے والوں میں تھے کہ ایک تیر آ لگا جب کہ آپ حوض سے پانی پی رہے تھے۔ اس کے بعد جنت الفردوس میں ان کو جگہ ملی اور جنت الفردوس ہی جنت کا اعلیٰ مرتبہ ہے اور سب سے برتر چیز ہے۔ یہیں سے جنت کی نہریں پھوٹ کر نکلتی ہیں جب ایسے لوگوں کا یہ مرتبہ ہے تو پھر ان لوگوں کے مرتبہ کا کیا کہنا جو دشمن کے سامنے ڈٹے ہوئے تھے اور دشمن کی تعداد بھی تین گنا تھی اور اسلحہ کی طاقت بھی تین گنی تھی۔ (تفسیر مظہری)

ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۸﴾

یہ تو ہو چکا اور جان رکھو کہ اللہ سست کر دے گا تدبیر کافروں کی

یعنی اس وقت بھی خدا نے کفار مکہ کے سب منصوبے خاک میں ملا دیئے اور آئندہ بھی ان کی تدبیروں کو سست کر دیا جائیگا۔ (تفسیر عثمانی)

اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ وَاِنْ

اگر تم چاہتے ہو فیصلہ تو پہنچ چکا تمہارے پاس فیصلہ اور اگر

تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ ۚ

باز آؤ تو تمہارے لئے بہتر ہے اور اگر پھر یہی کرو گے تو ہم بھی

وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَوْ كَثُرَتْ ۙ

پھر یہی کریں گے اور کچھ کام نہ آئے گا تمہارے تمہارا جتھا اگرچہ بہت

وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹﴾

ہوں اور جان لو کہ اللہ ایمان والوں کے ساتھ ہے

بدر میں فیصلہ ہو گیا اب عبرت پکڑو:

یہ خطاب کفار مکہ کو ہے، وہ ہجرت سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کرتے تھے مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ یعنی ہمارے تمہارے درمیان یہ فیصلہ کب ہوگا؟ سو پورا فیصلہ تو قیامت کے دن ہوگا مگر ایک طرح

کا فیصلہ آج میدانِ بدر میں بھی تم نے دیکھ لیا کہ کیسے خارق عادت طریق سے تم کو کمزور مسلمانوں کے ہاتھوں سے سزا ملی۔ اب اگر نبی علیہ السلام کی مخالفت اور کفر وشرک سے باز آجاؤ تو تمہارے لئے دنیا وآخرت کی بہتری ہے۔ ورنہ اگر پھر اسی طرح لڑائی کرو گے تو ہم بھی پھر اسی طرح مسلمانوں کی مدد کرینگے اور انجام کار تم ذلیل وخوار ہو گے۔ جب خدا کی تائید مسلمانوں کے ساتھ ہے تو تمہارے جتھے اور جماعتیں خواہ کتنی ہی تعداد میں ہوں کچھ کام نہ آئیں گے۔ بعض روایات میں ہے کہ ابوجہل وغیرہ نے مکہ سے روانگی کے وقت کعبہ کے پردے پکڑ کر دعاء کی تھی خداوندا! دونوں فریق میں جو اعلیٰ و اکرم ہو اسے فتح دے اور فساد مچانے والے کو مغلوب کر فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ میں اس کا بھی جواب ہو گیا کہ جو واقعی اعلیٰ وافضل تھے ان کو فتح مل گئی اور مفسد ذلیل ورسوا ہوئے۔ (تفسیر عثمانی)

حق والوں کی مشکلات:

بغوی نے اپنی سند سے حضرت قیس بن حبابؓ کا قول نقل کیا ہے۔ حضرت قیسؓ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چادر سر کے نیچے رکھے کعبے کے سایہ میں لیٹے ہوئے تھے ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بطور شکوہ عرض کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے لئے اللہ سے دعا نہیں کرتے اور اللہ سے نصرت کی درخواست نہیں کرتے۔ یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ بیٹھے، چہرۂ مبارک سرخ ہو گیا اور فرمایا تم سے پہلے بعض لوگ ایسے گزرے ہیں کہ زمین میں گڑھا کھود کر گڑھے میں ان کو کھڑا کر کے آرہ سر پر رکھ کر دو ٹکڑے کر دیئے جاتے تھے لیکن یہ اذیت بھی ان کو ان کے دین سے نہیں لوٹا سکتی تھی۔ بعض لوگوں کے گوشت کے اندر لوہے کی کنگیاں، ہڈی اور پٹھے تک کی جاتی تھیں مگر یہ دکھ بھی ان کو ان کے دین سے نہیں پھیر سکتا تھا۔ اللہ اس کام کو ضرور پورا کرے گا یہاں تک کہ تمہارا سوار صنعاء سے حضر موت تک بلا خوف وخطر جائے گا اور راستہ میں سوائے اللہ کے اور کسی کا اس کو ڈر نہ ہوگا (یعنی مسلمانوں کے لیے امن عام ہو جائے گا) مگر تم جلدی کرتے ہو (اور وقت سے پہلے غلبہ کے خواہشمند ہو)۔

دو بچوں کا کارنامہ:

حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کا بیان ہے میں بدر کے دن لائن میں کھڑا ہوا تھا، میں نے دیکھا کہ میرے دائیں بائیں دو لڑکے ہیں اور میں دو نوجوان لڑکوں کے درمیان ہوں، مجھے خیال پیدا ہوا کہ اگر میرے دونوں طرف طاقتور آدمی ہوتے تو بہتر ہوتا (کہ وقت پر کچھ میری مدد کرتے اور کچھ کام کرتے) اتنے میں ایک لڑکے نے چپکے سے مجھے دبایا اور پوچھا چچا کیا آپ ابوجہل کو پہچانتے ہیں، میں نے کہا ہاں لیکن بھتیجے تم کو اس سے کیا سروکار؟ کہنے لگا مجھے اطلاع ملی ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیتا ہے۔ قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر میں اس کو دیکھ پایا تو میری نظر کے سامنے وہ ہٹنے نہ پائے گا۔ یہاں تک کہ ہم میں سے جس کی موت پہلے آئی ہے وہ مارا جائے گا۔ دوسرے نے بھی مجھے ہاتھ سے دبا کر یہی بات کہی۔ مجھے ان کی باتیں سن کر اچنبھا ہوا اتنے میں ابوجہل یہ شعر گاتا ہوا لوگوں میں نظر پڑا۔ ما تنقم الحرب العوان منی بازل عامین حدیث سنی۔ پھر کہنے لگا ایسے ہی دن کے لئے میری ماں نے مجھے جنا تھا۔

میں نے ان لڑکوں سے کہا جس شخص کے متعلق تم دریافت کر رہے تھے وہ یہ ہے۔ یہ سنتے ہی دونوں تلواریں لے کر اس پر جھپٹ پڑے اور دونوں نے فوراً مار کر اس کو ٹھنڈا کر دیا اور لوٹ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اطلاع دے دی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم دونوں نے اس کو قتل کیا ہے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوجہل کے اسلحہ اور اس سے چھینا ہوا سامان معاذ بن عمرو بن جموح کو عطا فرمایا۔ یہ دونوں شخص معاذ بن عمرو اور معاذ بن عفراء تھے۔

بخاری نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوئی دیکھ کر آئے ابوجہل کس حال میں ہے۔ حسب الحکم حضرت ابن مسعودؓ گئے اور جا کر دیکھا کہ عفراء کے دونوں بیٹوں نے اس کو مار کر ٹھنڈا کر دیا ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ نے جا کر اس کی ڈاڑھی پکڑ کر فرمایا کیا تو ابوجہل ہے (کہ اتنا غرور کرتا تھا) ابوجہل نے کہا کیا جس شخص کو اس کی قوم نے یا یہ کہا کہ تم لوگوں نے قتل کر دیا ہے اس سے بڑا کوئی ہے۔

ابن اسحٰق کا بیان ہے کہ حضرت معاذؓ اس کے بعد حضرت عثمان غنیؓ کے دور خلافت تک زندہ رہے۔ قاضی (عیاض) نے العیون میں لکھا ہے کہ ابن وہب کی روایت میں اتنا زائد ہے کہ حضرت معاذؓ اپنا (لٹکا یا کٹا ہوا) ہاتھ اٹھائے خدمتِ گرامی میں حاضر ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر لعاب مبارک لگا دیا فوراً ہاتھ جڑ گیا۔ قاضی عیاض نے شفاء میں ابن وہبؒ کی روایت سے اسطرح نقل کیا ہے کہ ابوجہل نے حضرت معاذؓ کا ہاتھ کاٹ دیا تھا۔ حضرت معاذؓ وہ ہاتھ اٹھائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر لعاب لگا کر (اس کی جگہ پر) جوڑ دیا اور وہ جڑ گیا۔

اسحٰق نے بیان کیا ابوجہل زمین پر پچھڑا پڑا تھا۔ حضرت معاذؓ بن عفراء

اس کی طرف سے گزرے اور تلوار کا ایک کارگر ہاتھ مارا مگر کچھ جان اس میں باقی رہی۔ حضرت معاذؓ جنگ میں شہید ہو گئے پھر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ابوجہل کی طرف سے گزرے۔ آپ کا بیان ہے میں نے اس کو آخری سانسوں میں پایا اور گردن پر پاؤں رکھ کر کہا دشمنِ خدا اللہ نے تجھے ذلیل کر دیا۔ بولا ذلیل کیسے کر دیا۔ تم نے جس شخص کو قتل کیا ہے کیا اس سے زیادہ کوئی باعزت ہے (یعنی جس شخص کو اس کی قوم قتل کر دے وہ ذلیل نہیں ہوتا) مجھے یہ بتاؤ کہ انجام کس کے ہاتھ رہا (یعنی فتح کس کی ہوئی) میں نے کہا اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی فتح ہوئی۔

ابوجہل کا سر:

ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ ابوجہل نے مجھ سے کہا اے بکریوں کے چرواہے تو سخت (دشوار رس) بلندی پر چڑھا ہے (یعنی میرا سینہ اونچے پہاڑ کی طرح ہے جس کی چوٹی پر پہنچنا سخت دشوار تھا اور تو اس پر چڑھا بیٹھا ہے)۔ پھر میں اس کا سر کاٹ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آیا اور عرض کیا یا رسول اللہ یہ اللہ کے دشمن ابوجہل کا سر ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے (تعجب سے) فرمایا، قسم ہے اس خدا کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں میں نے عرض کیا جی ہاں قسم ہے اس کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ یہ کہہ کر میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سر ڈال دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں گر گئے۔ تیسری روایت میں ہے (بطور شکر) دو رکعت نماز پڑھی۔ ابنِ عابد نے قتادہؒ کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر امت کا ایک فرعون ہوتا ہے، اس امت کا فرعون ابوجہل ہے، اس پر اللہ کی مار۔ عفراء کے دونوں بیٹوں نے اس کو قتل کر دیا یا فرمایا ملائکہ نے اس کو قتل کر دیا اور ابن مسعودؓ نے اس کا کام تمام کر دیا اور تیزی سے قتل کر دیا۔ (تفسیر مظہری)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ
اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور اسکے رسول کا
وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ﴿۲۰﴾
اور اس سے مت پھرو سن کر

اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری میں لگے رہو:

پہلے فرمایا تھا کہ اللہ ایمان والوں کے ساتھ ہے" اب ایمان والوں کو ہدایت فرماتے ہیں کہ ان کا معاملہ خدا اور رسول کے ساتھ کیسا ہونا چاہئے؟ جس سے وہ خدا کی نصرت وحمایت کے مستحق ہوں۔ سو بتلا دیا کہ ایک مومن صادق کا کام یہی ہے کہ وہ ہمہ تن خدا اور رسول کا فرمانبردار رہو۔ احوال وحوادث خواہ کتنا ہی اس کا منہ پھیرنا چاہیں مگر خدا کی باتوں کو جب وہ سن کر سمجھ چکا اور تسلیم کر لیا، تو قولاً وفعلاً کسی حال ان سے منہ نہ پھیرے۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَهُمْ
اور ان جیسے مت ہو جنہوں نے کہا ہم نے سن لیا
لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۲۱﴾
اور وہ سنتے نہیں

یہودیوں اور مشرکوں کی طرح نہ بنو:

یعنی زبان سے کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیا حالانکہ وہ سننا ہی کیا جو آدمی سیدھی سی بات کو سن کر سمجھے نہیں۔ یا سمجھ کر قبول نہ کرے۔ پہلے یہودیوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا سمعنا وعصینا (ہم نے سن لیا مگر مانا نہیں) مشرکین مکہ کا قول آگے آتا ہے۔ "قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ" یعنی جو قرآن آپ سناتے ہیں بس ہم نے سن لیا۔ اگر ہم چاہیں تو اسی جیسا کلام بنا کر لے آئیں۔ مدینہ کے منافقین کا تو شیوہ یہ تھا کہ پیغمبر علیہ السلام اور مسلمانوں کے سامنے زبانی اقرار کر گئے اور دل سے اسی طرح منکر رہے۔ بہر حال مومن صادق کی شان ان یہود اور مشرکین ومنافقین کی طرح نہ ہونی چاہئے۔ اس کی شان یہ ہے کہ دل سے زبان سے عمل سے حاضر وغائب احکام الٰہیہ اور فرامین نبویہ پر نثار ہوتا رہے۔ (تفسیر عثمانی)

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ
بے شک سب جانداروں میں بدتر اللہ کے نزدیک وہی بہرے
الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۲۲﴾
گونگے ہیں جو نہیں سمجھتے

جانوروں سے بدتر لوگ:

جنہیں خدا نے بولنے کو زبان سننے کو کان اور سمجھنے کو دل ودماغ دیئے تھے پھر انہوں نے یہ سب قوتیں معطل کر دیں۔ نہ زبان سے حق بولنے اور حق کو دریافت کرنے کی توفیق ہوئی نہ کانوں سے حق کی آواز سنی نہ دل د

دماغ سے حق کو سمجھنے کی کوشش کی۔ غرض خدا کی بخشی ہوئی قوتوں کو اس اصلی کام میں صرف نہ کیا۔ جس کے لئے فی الحقیقت عطا کی گئی تھیں۔ بلاشبہ ایسے لوگ جانوروں سے بھی بدتر ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ؕ

اور اگر اللہ جانتا ان میں کچھ بھلائی تو ان کو سنا دیتا

وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۳﴾

اور اگر ان کو اب سنادے تو ضرور بھاگیں منہ پھیر کر

نااہل قوم:

یعنی اصل یہ ہے کہ ان لوگوں میں بھلائی کی جڑ ہی نہیں۔ کیونکہ حقیقی بھلائی انسان کو اس وقت ملتی ہے جب اس کے دل میں طلب حق کی سچی تڑپ اور نور ہدایت قبول کرنے کی لیاقت ہو۔ جو قوم طلبِ حق کی روح سے یکسر خالی ہو چکی اور اس طرح خدا کی بخشی ہوئی قوتوں کو اپنے ہاتھوں برباد کر چکی ہو، رفتہ رفتہ اس میں قبول حق کی لیاقت واستعداد بھی نہیں رہتی۔ اسی کو فرمایا ہے کہ اللہ نے ان کے دلوں میں قبول خیر وہدایت کی لیاقت نہیں دیکھی۔ اگر ان میں کچھ بھی لیاقت دیکھتا تو اپنی عادت کے موافق ضرور ان کو اپنی آیتیں سنا کر سمجھا دیتا۔ باقی بحالت موجودہ اگر انہیں آیات سنا اور سمجھا دی جائیں تو یہ ضدی اور معاند لوگ سمجھ کر بھی تسلیم اور قبول کرنے والے نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے بعض لوگ اہل جنت کے کام (ساری عمر) کرتے ہیں یہاں تک کہ ان کے اور جنت کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے، اس وقت کتاب (لوح محفوظ) کا لکھا غالب آتا ہے اور وہ دوزخیوں کا کام کر کے دوزخ میں چلے جاتے ہیں الخ رواہ البخاری ومسلم فی الصحیحین عن عبداللہ بن مسعودؓ۔ (تفسیر مظہری)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ

اے ایمان والو حکم مانو اللہ کا اور رسول کا جس وقت

لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ

بلائے تم کو اس کام کی طرف جس میں تمہاری زندگی ہے

اللہ کے احکام پورے کرو:

یعنی خدا اور رسول تم کو جس کام کی طرف دعوت دیتے ہیں (مثلاً جہاد وغیرہ) اس میں ازسرتاپا تمہاری بھلائی ہے۔ ان کا دعوتی پیغام تمہارے لئے دنیا میں عزت واطمینان کی زندگی اور آخرت میں حیاتِ ابدی کا پیغام ہے۔ پس مومنین کی شان یہ ہے کہ خدا اور رسول کی پکار پر فوراً لبیک کہیں۔ جس وقت اور جدھر وہ بلائیں سب اشغال چھوڑ کر ادھر ہی پہنچیں۔ (تفسیر عثمانی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل:

ترمذی اور نسائی نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ حضرت ابی بن کعبؓ نماز پڑھ رہے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کی طرف گذر ہوا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آواز دی حضرت ابی جلدی جلدی نماز پوری کر کے حاضر خدمت ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب میں نے تم کو پکارا تھا تو تم نے فوراً اجابت کیوں نہیں کی (میری دعوت پر لبیک کیوں نہیں کہا اور کیوں حاضر نہیں ہوئے (حضرت ابیؓ نے عرض کیا میں نماز پڑھ رہا تھا فرمایا کیا اللہ یہ نہیں فرماتا ہے يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ حضرت ابیؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ بیشک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر لبیک ضروری تھی آئندہ جب کبھی آپ پکاریں گے میں ضرور جواب دونگا خواہ نماز ہی پڑھتا ہوں یہ حدیث تائید کر رہی ہے کہ جس کام کی دعوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہو اسکی تعمیل ضروری ہے۔

اللہ کے احکام میں سستی کی مثال:

حضرت نعمان بن بشیر کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کی مقررہ حدود میں سستی کرنے والے اور ان میں داخل ہو جانے والے کی مثال ایسی ہے جیسے کسی جہاز میں کچھ لوگ سوار ہوں اور قرعہ اندازی کر کے کچھ زیریں حصہ میں اور کچھ بالائی حصہ میں قیام پذیر ہوں اور زیریں حصہ میں رہنے والا بالائی حصہ میں رہنے والوں کی طرف سے پانی کا مرور کرے اور پانی کے اس مرور سے ان کو تکلیف ہو اس لئے نیچے رہنے والا کلہاڑی لے کر جہاز کے نچلے حصہ میں کچھ سوراخ کرنے لگے یہ دیکھ کر اوپر والے کہیں تم یہ کیا کرتے ہو سوراخ کرنے والا جواب دے تم لوگوں کو میری وجہ سے تکلیف ہوتی تھی اور پانی کا مرور بہر حال مجھے کرنا ہی تھا اسلئے سوراخ کر رہا ہوں اب اگر اوپر والے اس کو سوراخ کرنے سے روک دینگے تو وہ سوراخ کرنے والا بھی بچ جائے گا اور اوپر والے بھی بچ جائیں گے ورنہ وہ تو ڈوبے گا ہی ساتھ میں اوپر والے بھی مرینگے رواہ البخاری۔ (تفسیر مظہری)

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ

اور جان لو کہ اللہ روک لیتا ہے آدمی سے اس کے دل کو

وَاَنَّهٗٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۴﴾

اور یہ کہ اسی کے پاس تم جمع ہو گے

حکم بجالانے میں دیر نہ کرو:

یعنی حکم بجالانے میں دیر نہ کرو، شاید تھوڑی دیر بعد دل ایسا نہ رہے اپنے دل پر آدمی کا قبضہ نہیں بلکہ دل خدا کے ہاتھ میں ہے جدھر چاہے پھیر دے۔ بیشک وہ اپنی رحمت سے کسی کا دل ابتداءً نہیں روکتا نہ اس پر مہر کرتا ہے۔ ہاں جب بندہ امتثال احکام میں سستی اور کاہلی کرتا رہے تو اس کی جزاء میں روک دیتا ہے۔ یا حق پرستی چھوڑ کر ضد وعناد کو شیوہ بنالے تو مہر کر دیتا ہے۔ کذا فی الموضح بعض نے "يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ" کو بیان قرب کیلئے لیا ہے۔ یعنی حق تعالیٰ بندہ سے اس قدر قریب ہے کہ اسکا دل بھی اتنا قریب نہیں۔ "وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ" (ق رکوع ۲) تو خدا کی حکم برداری سچے دل سے کرو۔ خدا تم سے بڑھ کر تمہارے دلوں کے احوال وسرائر پر مطلع ہے، خیانت اس کے آگے نہیں چل سکے گی۔ اسی کے پاس سب کو جمع ہونا ہے وہاں سارے مکنونات وسرائر کھول کر رکھ دیئے جائینگے۔ (تفسیر عثمانی)

ما احییتنی: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بنی آدم کے قلوب خدا تعالیٰ کے پاس تصرف میں ہیں کہ انہیں جس طرح چاہے پھیرے۔ پھر فرمایا: اللھم مصرف القلوب صرف قلوبنا الی طاعتک، یعنی اے دلوں کے پھیرنے والے ہمارے دلوں کو اپنی طاعت کی طرف پھیر دے۔ (تفسیر ابن کثیر)

لڑکے کی دُعاء:

حضرت عمر بن خطابؓ نے ایک لڑکے کو یہ دعا کرتے سنا اے اللہ تو آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے لہٰذا میرے اور میرے گناہوں کے درمیان حائل ہو جا تاکہ میں کوئی برا کام نہ کرسکوں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اللہ تجھ پر رحمت کرے اور اس کو دعا خیر دی۔

آیت کا مقصد:

آیت میں بندہ سے اللہ کے قرب کو بطور تشبیہ بیان کیا ہے جیسے آیت وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ میں (انتہائی قرب کو بطور تشبیہ ظاہر کیا گیا ہے) اور اس امر پر تنبیہ کی گئی ہے کہ اللہ دل کے اسرار سے اتنا واقف ہے کہ آدمی خود اپنے قلبی راز سے غافل ہوسکتا ہے مگر اللہ ناواقف نہیں ہے لہٰذا اخلاص خاطر لازم ہے یا اللہ کی کامل قدرت اور انسان کے دل پر اللہ کے پورا پورا قابو ہونے کی تصویر کشی کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ انسان کے عزم کو شکست کردینے اور مقصد کو بدل دینے پر پورا قابو رکھتا ہے اگر اللہ انسان کی سعادت چاہتا ہے تو کفر ومعصیت اور انسان کے درمیان حائل ہو جاتا ہے (اس صورت میں آدمی گناہ کی طرف نہیں بڑھ سکتا) اور اگر انسان کی بدبختی اس کو منظور ہوتی ہے تو ایمان وطاعت اور قلب کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اس صورت میں آدمی ایمان وطاعت کی طرف نہیں بڑھ سکتا لہٰذا ہر وقت خاتمہ کا ڈر رکھنا اور اللہ سے ہر دم زاری اور التجا اور دعا کرتے رہنا چاہئے۔ حضرت انسؓ بن مالک کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا کثرت سے کرتے تھے یا مقلب القلوب ثبت قلبی علی دینک اے دلوں کو پلٹنے والے میرے دل کو اپنی طاعت پر جمائے رکھنا۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم آپ کے لائے ہوئے دین پر ایمان لاچکے ہیں تو کیا آپ کو آئندہ دین سے لوٹ جانے کا) ہمارے متعلق اندیشہ ہے فرمایا تمام دل اللہ کی ایک چٹکی میں ہیں وہ جس طرح چاہتا ہے ان کو الٹ پلٹ کردیتا ہے۔ رواہ الترمذی وابن ماجہ۔ (تفسیر مظہری)

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا

اور بچتے رہو اس فساد سے کہ نہیں پڑے گا تم میں سے خاص

مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ

ظالموں ہی پر اور جان لو کہ اللہ کا عذاب

الْعِقَابِ ﴿۲۵﴾

سخت ہے

قوموں کا فتنہ:

یعنی فرض کیجئے ایک قوم کے اکثر افراد نے ظلم وعصیان کا وتیرہ اختیار کر لیا، کچھ لوگ جو اس سے علیحدہ رہے انہوں نے مداہنت برتی، نہ نصیحت کی نہ اظہار نفرت کیا تو یہ فتنہ ہے جس کی لپیٹ میں وہ ظالم اور یہ خاموش مداہن سب آجائیں گے۔ جب عذاب آئے گا تو حسب مراتب سب اس میں

شامل ہونگے کوئی نہ بچے گا۔ اس تفسیر کے موافق آیت سے مقصود یہ ہوگا کہ خدا اور رسول کی حکم برداری کے لئے خود تیار رہو اور نافرمانوں کو نصیحت و فہمائش کرو۔ نہ مانیں تو بیزاری کا اظہار کرو۔ باقی حضرت شاہ صاحبؒ نے آیت کا مطلب یہ لیا ہے کہ مسلمانوں کو ایسے فساد (گناہ) سے بالخصوص بچنا چاہئے جس کا خراب اثر گناہ کرنے والے کی ذات سے متعدی ہو کر دوسروں تک پہنچتا ہے۔ پہلے فرمایا تھا کہ خدا اور رسول کا حکم ماننے میں ادنیٰ تاخیر اور کاہلی نہ کرے۔ کہیں دیر کرنے کی وجہ سے دل نہ ہٹ جائے۔ اب تنبیہ فرماتے ہیں کہ اگر نیک لوگ کاہلی کرینگے تو عام لوگ بالکل چھوڑ دینگے تو رسم بد پھیلے گی۔ اس کا وبال سب پر پڑے گا۔ جیسے جنگ میں دلیر سستی کریں تو نامرد بھاگ ہی جائیں۔ پھر شکست پڑے تو دلیر بھی نہ تھام سکیں۔ (تفسیر عثمانی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، خدا کی قسم جب تک تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو گے، عذاب نہیں آئے گا اور جہاں بری باتوں سے تم نے روکنا چھوڑ دیا اور نیک کام کی ترغیب سے رک گئے تو اللہ پاک تم پر سخت ترین عذاب بھیج سکتا ہے، پھر تم لاکھ دعا کرو گے دعا قبول نہیں ہوگی۔ یا یہ کہ اللہ تعالیٰ تم پر دوسری قوم کو مسلط کر دے گا پھر تمہاری ساری دعائیں بے کار ہو جائیں گی۔

فتنہ کا دوسرا مفہوم:

بعض علماء کا قول ہے کہ فتنہ سے مراد ہے بغاوت اور ملک کی تخریب و تباہی، اس کا وبال بے قصور لوگوں کو پہنچتا ہے۔ بے قصور لوگ مارے اور لوٹے جاتے ہیں۔ قتادہؒ نے اس آیت کی تشریح میں فرمایا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو دانشمند صحابیؓ سمجھ گئے کہ عنقریب فتنے پیدا ہونگے۔ اسی بناء پر ابن زید نے کہا کہ فتنے سے مراد اس جگہ افتراق کلمہ اور آپس کی پھوٹ ہے۔

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کی مقررہ حدود میں سستی کرنے والے اور ان میں داخل ہو جانے والے کی مثال ایسی ہے جیسے کسی جہاز میں کچھ لوگ سوار ہوں اور قرعہ اندازی کر کے کچھ زیریں حصہ میں اور کچھ بالائی حصہ میں قیام پذیر ہوں اور زیریں حصہ میں رہنے والا بالائی حصہ میں رہنے والوں کی طرف سے پانی کا مرور کرے اور پانی کے اس مرور سے ان کو تکلیف ہو اس لئے نیچے رہنے والا کلہاڑی لے کر جہاز کے نچلے حصہ میں کچھ سوراخ کرنے لگے یہ دیکھ کر اوپر والے کہیں تم یہ کیا کرتے ہو۔ سوراخ کرنے والا جواب دے تم لوگوں کو میری وجہ سے تکلیف ہوتی تھی اور پانی کا مرور بہر حال مجھے کرنا ہی تھا اس لئے سوراخ کر رہا ہوں۔ اب اگر اوپر والے اس کو سوراخ کرنے سے روک دینگے تو وہ سوراخ کرنے والا بھی بچ جائے گا اور اوپر والے بھی بچ جائیں گے۔ ورنہ وہ تو ڈوبے گا ہی ساتھ میں اوپر والے بھی مرینگے۔ رواہ البخاری (تفسیر مظہری)

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ

اور یاد کرو جس وقت تم تھوڑے تھے مغلوب پڑے ہوئے

فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ

ملک میں ڈرتے تھے کہ اچک لیں تم کو

النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ

لوگ پھر اس نے تم کو ٹھکانا دیا اور قوت دی تم کو اپنی مدد سے

وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۲۶﴾

اور روزی دی تم کو ستھری چیزیں تاکہ تم شکر کرو

کمزوری کو دیکھ کر حکم الٰہی نہ چھوڑو:

یعنی اپنی قلت وضعف کو خیال کر کے خدا کا حکم (جہاد) ماننے میں سستی مت دکھلاؤ۔ دیکھو ہجرت سے پہلے بلکہ اس کے بعد بھی تمہاری تعداد تھوڑی تھی، سامان بھی نہ تھا۔ تمہاری کمزوری کو دیکھ کر لوگوں کو طمع ہوئی تھی کہ تم کو ہضم کر جائیں۔ تمہیں ہر وقت یہ خدشہ رہتا تھا کہ دشمنان اسلام کہیں نوچ کھسوٹ کر نہ لے جائیں۔ مگر خدا نے تم کو مدینہ میں ٹھکانہ دیا، انصار و مہاجرین میں عدیم النظیر رشتۂ مواخات قائم کر دیا۔ پھر معرکۂ بدر میں کیسی کھلی ہوئی غیبی امداد پہنچائی۔ کفار کی جڑ کاٹ دی، تم کو فتح الگ دی، مال غنیمت اور فدیہ اساری الگ دیا۔ غرض حلال طیب ستھری چیزیں اور انواع و اقسام کی نعمتیں عطا فرمائیں تاکہ تم اس کے شکر گزار بندے بنے رہو۔ (تفسیر عثمانی)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ

اے ایمان والو! خیانت نہ کرو اللہ سے

وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ

اور رسول سے اور خیانت نہ کرو آپس کی امانتوں میں

تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۷﴾

جان کر

خیانت سے بچو:

خدا اور رسول کی خیانت یہ ہے کہ ان کے احکام کی خلاف ورزی کی جائے۔ زبان سے اپنے کو مسلمان کہیں اور کام کفار کے کریں۔ یا جس کام پر خدا اور رسول نے مامور کیا ہو اس میں دغل فصل کیا جائے۔ یا مالِ غنیمت میں چوری کی جائے۔ ونحو ذٰلک۔ بہر حال ان تمام امانتوں میں جو خدا و رسول یا بندوں کی طرف سے تمہارے سپرد کئے جائیں، خیانت سے بچو۔ اس میں ہر قسم کے حقوق اللہ وحقوق العباد آ گئے۔

حضرت ابولبابہ کا واقعہ:

روایات میں ہے کہ یہود "بنی قریظہ" نے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صلح کی درخواست کی اور یہ کہ ان کے ساتھ وہ ہی معاملہ کیا جائے جو بنی النضیر کے ساتھ ہوا ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، "نہیں، میں تم کو اتنا حق دیتا ہوں کہ سعد بن معاذ کو حکم بنا لو، جو فیصلہ وہ تمہاری نسبت کر دیں وہ منظور ہونا چاہئے۔ انہوں نے حضرت ابولبابہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لے کر اپنے یہاں بلایا اور دریافت کیا کہ تمہاری اس معاملہ میں کیا رائے ہے؟ ہم سعد بن معاذ کی تحکیم منظور کریں یا نہ کریں۔ ابولبابہ کے اموال اور اہل وعیال بنی قریظہ کے یہاں تھے، اس لئے وہ ان کی خیر خواہی کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے حلقوم کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا یعنی اگر سعد بن معاذ کی تحکیم قبول کی تو ذبح ہو جاؤ گے۔ ابو لبابہ اشارہ تو کر گزرے مگر معاً تنبہ ہوا کہ میں نے خدا اور رسول کی خیانت کی۔ واپس آ کر اپنے کو ایک ستون سے باندھ دیا اور عہد کیا کہ نہ کچھ کھاؤں گا نہ پیونگا حتیٰ کہ موت آ جائے یا اللہ تعالیٰ میری توبہ قبول فرما لے۔ سات آٹھ دن یونہی بندھے رہے۔ فاقہ سے غشی طاری ہو گئی۔ آخر بشارت پہنچی کہ حق تعالیٰ نے تمہاری توبہ قبول کی۔ کہا خدا کی قسم میں اپنے کو نہ کھولونگا جب تک خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے دستِ مبارک سے میری رسی نہ کھولیں۔ آپ تشریف لائے اور اپنے ہاتھ سے اپنے قیدی کو آزاد کیا۔ الیٰ آخر القصہ (ابن عبد البر کا دعویٰ ہے کہ یہ واقعہ غزوۂ تبوک میں شرکت نہ کرنے کی بناء پر پیش آیا تھا واللہ اعلم)۔ (تفسیر عثمانی)

یہ آیت ابولبابہ انصاری کے بارے میں نازل ہوئی یہود بنی قریظہ نے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نور سے صلح کی درخواست کی تو اس بات میں یہود نے ابولبابہ سے مشورہ کیا اور پوچھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ساتھ کیا معاملہ کریں گے۔ چونکہ ان کے مال وعیال اس گھڑی میں ان کے پاس تھے۔ اس لئے بمقتضائے بشریت ابولبابہ نے انگلی سے حلق کی طرف اشارہ کیا یعنی تم سب کو قتل کر ڈالیں گے ابولبابہ یہ اشارہ کر تو گزرے مگر فوراً تنبہ ہوا کہ میں نے خدا اور رسول کے ساتھ خیانت کی واپس آ کر اپنے آپ کو مسجد نبوی کے ایک ستون سے باندھ دیا اور عہد کیا کہ نہ کچھ کھاؤں گا اور نہ پیوں گا حتیٰ کہ موت آ جائے۔

یا اللہ میری توبہ قبول کرے سات آٹھ دن یوں ہی بندھے رہے فاقہ سے غشی طاری ہو گئی آخر بشارت پہنچی کہ حق تعالیٰ نے تمہاری توبہ قبول کی اس پر کہا کہ خدا کی قسم جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دست مبارک سے میری رسی نہ کھولیں گے اس وقت تک میں اپنے آپ کو نہ کھولوں گا آپ تشریف لائے اور خود اپنے دست مبارک سے ان کو کھولا۔ (معارف کاندھلوی)

دو آدمیوں کے درمیان خیانت:

حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ دو آدمیوں کے درمیان کی بات بہر صورت امانت ہوا کرتی ہے۔ بات کو جہاں سنا ہے وہیں چھوڑ دینا چاہئے، کسی کے سامنے کسی کی بات دہرانا نہیں چاہئے، اگر چہ اس نے منع نہ کیا ہو۔

ایک منافق کی خیانت:

جابر بن عبد اللہؓ کہتے ہیں کہ ابوسفیانؓ مکے سے نکلے، جبرائیل نے آ کر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی کہ ابوسفیان فلاں مقام پر ہے تو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا کہ ابوسفیان فلاں مقام پر ہے اس کو گرفتار کرنے کے لئے نکلو اور یہ معاملہ بالکل راز میں رہے۔ لیکن ایک منافق نے ابوسفیان کو لکھ بھیجا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم کو پکڑنے کے درپے ہیں، ہوشیار ہو جاؤ۔ تو یہ آیت اتری کہ اللہ اور رسول کی خیانت مت کرو۔ رسول کا راز ظاہر کر دینا یہی رسول کی خیانت ہے۔

حضرت ابولبابہؓ کیلئے بشارت:

ابن اسحاق نے بروایت یزید بن عبد اللہ بن قسیط بیان کیا کہ ابولبابہؓ کی توبہ قبول ہونے کی آیت اس وقت نازل ہوئی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ام سلمہؓ کے مکان میں تھے اول صبح (سحر کے وقت) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرانے لگے حضرت ام سلمہؓ نے عرض کیا اللہ آپ کو ہنستا رکھے (اس وقت) ہنسنے کی کیا وجہ ہے۔ فرمایا ابولبابہؓ کی توبہ قبول کر لی گئی حضرت ام سلمہؓ نے کہا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا میں یہ خوشخبری (باہر کے لوگوں کو) نہ دیدوں۔ فرمایا کیوں نہیں (دیدو) پردہ کا حکم اس وقت تک نازل نہیں ہوا تھا اسلئے حضرت ام سلمہؓ نے دروازہ پر آ کر کہا ابولبابہؓ تم کو بشارت ہو اللہ

نے تمہاری توبہ قبول فرمالی یہ سنتے ہی لوگ ابولبابہؓ کو کھولنے کے لئے چڑھ دوڑے ابولبابہؓ نے کہا نہیں (مجھے کوئی نہ کھولے) خدا کی قسم جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے ہاتھ سے مجھے نہیں کھول لیں گے (میں کسی کو کھولنے نہ دونگا) چنانچہ فجر کی نماز کو جاتے میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ابولبابہؓ کی طرف تشریف لے گئے اور ان کو آزاد کیا۔ (تفسیر مظہری)

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ
اور جان لو کہ بے شک تمہارے مال اور اولاد
فِتْنَةٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝٢٨
خرابی میں ڈالنے والے ہیں اور یہ کہ اللہ کے پاس بڑا ثواب ہے

آدمی اکثر مال واولاد کی خاطر خدا کے بندوں کی چوری کرتا ہے۔ اس لئے متنبہ فرمایا کہ امانت داری کی جو قیمت خدا کے یہاں ہے، وہ یہاں کے مال واولاد وغیرہ سب چیزوں سے بڑھ کر ہے۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت ابولبابہ کا پورا واقعہ:

مفسرین کے نزدیک حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے جو غزوۂ بنو قریظہ میں پیش آیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ نے بنو قریظہ کے قلعہ کا اکیس روز تک محاصرہ جاری رکھا جس سے عاجز ہو کر انہوں نے وطن چھوڑ کر ملک شام چلے جانے کی درخواست کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی شرارتوں کے پیش نظر اس کو قبول نہیں فرمایا بلکہ یہ ارشاد فرمایا کہ صلح کی صرف یہ صورت ہے کہ سعد بن معاذؓ تمہارے بارہ میں جو کچھ فیصلہ کریں اس پر راضی ہو جاؤ۔ انہوں نے درخواست کی کہ سعد بن معاذؓ کے بجائے ابولبابہؓ کو یہ کام سپرد کر دیا جائے کیونکہ حضرت ابولبابہؓ کے اہل و عیال اور جائداد بنو قریظہ میں تھے، ان سے یہ خیال تھا کہ وہ ہمارے معاملہ میں رعایت کریں گے۔ آپ نے ان کی درخواست پر حضرت ابولبابہؓ کو بھیج دیا۔ بنو قریظہ کے سب مرد و زن ان کے گرد جمع ہو کر رونے لگے اور یہ پوچھا کہ اگر ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر اتر آئیں تو کیا ہمارے معاملہ میں وہ کچھ نرمی فرمائیں گے۔ ابولبابہؓ کو معلوم تھا کہ ان کے معاملہ میں نرمی برتنے کی رائے نہیں ہے۔ انہوں نے کچھ ان لوگوں کی گریہ و زاری سے اور کچھ اپنے اہل وعیال کی محبت سے متاثر ہو کر اپنے گلے پر تلوار کی طرح ہاتھ پھیر کر اشارہ سے بتلا دیا کہ ذبح کئے جاؤ گے۔ گویا اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا راز فاش کر دیا۔

مال واولاد کی محبت میں یہ کام کر تو گزرے مگر فوراً متنبہ ہوا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خیانت کی۔ جب وہاں سے واپس ہوئے تو اس درجہ ندامت سوار ہوئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لوٹنے کے بجائے سیدھے مسجد میں پہنچے اور مسجد کے ایک ستون کے ساتھ اپنے آپ کو باندھ دیا اور قسم کھائی کہ جب تک میری توبہ قبول نہ ہوگی اسی طرح بندھا رہوں گا چاہے اسی حالت میں موت آجائے۔ چنانچہ سات روز مکمل اسی طرح بندھے کھڑے رہے۔ ان کی بیوی اور لڑکی نگہداشت کرتی تھیں، انسانی ضرورت کے وقت اور نماز کے وقت کھول دیتی اور فارغ ہونے کے بعد پھر باندھ دیتی تھیں، کھانے پینے کے پاس نہ جاتے تھے یہاں تک کہ غشی طاری ہو جاتی تھی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اول اس کی اطلاع ملی تو فرمایا کہ اگر وہ اول ہی میرے پاس آجاتے تو میں ان کے لئے استغفار کرتا اور توبہ قبول ہو جاتی۔ اب جب کہ وہ یہ کام کر گزرے تو اب قبولیت توبہ نازل ہونے کا انتظار ہی کرنا ہے۔

چنانچہ سات روز کے بعد آخر شب میں آپ پر یہ آیتیں ان کی توبہ قبول ہونے کے متعلق نازل ہوئیں۔ بعض حضرات نے ان کو خوشخبری سنائی اور کھولنا چاہا مگر انہوں نے کہا کہ جب تک خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مجھے نہ کھولیں گے میں کھلنا پسند نہ کروں گا۔ چنانچہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز کے وقت مسجد میں تشریف لائے تو اپنے دستِ مبارک سے ان کو کھولا۔ آیت مذکورہ میں جو خیانت کرنے اور مال واولاد کی محبت سے مغلوب ہونے کی ممانعت کا ذکر آیا ہے اس کا اصل سبب یہ واقعہ ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابولبابہؓ نے یہ الفاظ کہے تھے میں نہیں کھلوں گا نہ کھانے پینے کا مزہ چکھونگا تاوقتیکہ اللہ میری توبہ قبول نہ کرلے یا میں یونہی مر جاؤں۔ اس واقعہ کی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اطلاع پہنچی تو فرمایا اگر وہ میرے پاس آجاتا تو میں اس کے لئے استغفار کرتا لیکن جب اس نے خود وہ کام کرلیا جو اس نے چاہا تو اب جب تک اللہ اس کی توبہ قبول نہیں فرمائے گا میں اسکو نہیں کھولوں گا۔ چنانچہ ابولبابہؓ سات روز تک اسی حالت میں بغیر کچھ کھائے پئے رہے آخر بے ہوش ہو کر گر پڑے پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی۔

اولاد کا فتنہ: ایک بچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا گیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکو بوسہ دیا اور فرمایا سنو یہ (بچے) کنجوس ہو جانے اور بزدل بن جانے کا سبب ہیں اور یہ اللہ کی رحمت بھی

ہیں۔ رواہ البغوی۔ ابویعلی نے حضرت ابوسعیدؓ کی روایت سے بیان کیا اولاد دل کا چین (بھی) ہے اور بزدلی کنجوسی اور غم کا سبب بھی۔ حاکم نے حضرت خولہ بنت حکیم کی روایت سے بیان کیا کہ اولاد (جنت کے سکھوں میں سے) ایک سکھ ہے۔ (تفسیر مظہری)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ
اے ایمان والو! اگر تم ڈرتے رہو گے اللہ سے تو کردے گا
لَّكُمْ فُرْقَانًا
تم میں فیصلہ

تقویٰ کا پھل: یعنی اگر خدا سے ڈر کر راہ تقویٰ اختیار کرو گے تو خدا تم میں اور تمہارے مخالفوں میں فیصلہ کردیگا۔ دنیا میں بھی کہ تم کو عزت دیگا اور انکو ذلیل یا ہلاک کریگا جیسے بدر میں کیا اور آخرت میں بھی کہ تم نعیم دائم میں رہو گے اور انکا ٹھکانہ دوزخ ہوگا۔ وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ (یس رکوع۴) هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ (المرسلات رکوع۱) دوسری بات یہ ہے کہ تقویٰ کی برکت سے حق تعالیٰ تمہارے دل میں ایک نور ڈال دیگا جس سے تم ذوقاً وجداناً حق و باطل اور نیک و بد کا فیصلہ کرسکو گے۔ اسکے علاوہ ایک بات حضرت شاہ صاحبؒ نے لکھی ہے کہ "شاید فتح بدر میں مسلمانوں کے دل میں آیا ہو کہ یہ فتح اتفاقی ہے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مخفی کافروں پر احسان کریں کہ ہمارے گھربار اور اہل وعیال کو مکہ میں نہ ستادیں، سو پہلی آیت میں خیانت کو منع فرمایا اور دوسری آیت میں تسلی دی کہ آگے فیصلہ ہو جاویگا، تمہارے گھربار کافروں میں گرفتار نہ رہیں گے۔ (تفسیر عثمانی)

صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا راستی اختیار کرو اور (پوری راستی ممکن نہ ہو تو) راستی کے قریب آجاؤ اور بشارت پاؤ کیونکہ تم میں سے کسی کے اعمال تو جنت میں لے جانے والے نہیں۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی (اپنے اعمال کی وجہ سے جنت نہیں جائیں گے۔ فرمایا نہ میں بھی بغیر اس کے کہ اللہ مجھے اپنی رحمت سے ڈھانک لے۔

دل کی بصیرت:

فراستِ مؤمن کا لفظ جو حدیث میں آیا ہے اس سے یہی قلبی بصیرت مراد ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا مؤمن کی فراست سے ڈرو وہ اللہ کے نور یعنی خداداد نورِ بصیرت سے دیکھتا ہے۔ رواہ البخاری فی التاریخ و الترمذی عن ابی سعیدؓ الخدری والطبرانی وابن عدی عن ابی امامۃؓ وابن جریر عن ابن عمرؓ۔ دوسری حدیث ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خواہ مفتی تجھے فتویٰ دے چکے ہوں (مگر تو پھر بھی) اپنے دل سے فتویٰ طلب کر رواہ البخاری فی التاریخ عن وابصۃ بسند حسن۔ یہ قلبی فتویٰ اسی وقت ہوتا ہے جب نفس تمام بری باتوں سے پاک ہوگیا ہو اور قلب کی نفسانیت فنا ہو چکی ہو حقیقت فتویٰ اس وقت ظاہر ہوتی ہے صوفیہ کی اصطلاح میں اسی کو (باطنی) کشف کہتے ہیں۔ (تفسیر مظہری)

وَيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ
اور دور کردے گا تم سے تمہارے گناہ اور تم کو بخش دے گا
وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝۲۹ وَاِذْ
اور اللہ کا فضل بڑا ہے اور جب
يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ
فریب کرتے تھے کافر کہ تجھ کو قید کردیں یا مار ڈالیں یا
يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ۭ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ
نکال دیں اور وہ بھی داؤ کرتے تھے اور اللہ بھی داؤ کرتا تھا
اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝۳۰
اور اللہ کا داؤ سب سے بہتر ہے

کافروں کا مشورہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت:

ہجرت سے پیشتر کفار مکہ نے دار الندوہ میں جمع ہو کر مشورہ کیا، کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق کیا کیا جائے۔ انہوں نے ساری قوم کو پریشان کر رکھا ہے اور باہر کے کچھ لوگ ان کے دام میں پھنستے جاتے ہیں کہیں رفتہ رفتہ بڑی طاقت اکٹھی نہ کرلیں جس کا مقابلہ دشوار ہو۔ اس وقت رائیں مختلف تھیں، کوئی کہتا تھا، قید کیا جائے اور خوب زخمی کئے جائیں، کسی کی رائے تھی کہ انہیں وطن سے نکال دیا جائے تاکہ ہمیں ہر وقت کے خرخشہ سے نجات ملے۔ اخیر میں ابوجہل کی رائے پر فیصلہ ہوا کہ تمام قبائل عرب میں سے ایک ایک جوان منتخب ہو اور وہ سب مل کر آنِ واحد میں ان پر تلوار کا ہاتھ چھوڑیں، تاکہ بنی ہاشم سارے عرب سے لڑائی نہ کرسکیں۔ اور دیت دینی پڑے تو تمام قبائل پر تقسیم ہو جائے۔ یہاں تو وہ

اشقیاء یہ تدبیریں گانٹھ رہے تھے، ادھر ان کے توڑ میں خدا کی بہترین اور لطیف تدبیر تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرشتہ نے اطلاع کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بستر پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو لٹا کر اسی مجمع کی آنکھوں میں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے لئے جمع ہوا تھا خاک جھونکتے ہوئے باہر تشریف لے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اور حضرت علیؓ کا بال بیکا نہ ہوا اور دشمن خائب وخاسر رہے۔ پھر جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا مشورہ دیا تھا بدر میں وہ ہی قتل کئے گئے۔ اس سے بتلا دیا کہ جب خدا ساتھی ہو تو کوئی کچھ نہیں کرسکتا اور جس طرح اس نے اپنے پیغمبر کو بچا لیا، تمہارے گھربار اور اہل وعیال کی بھی جو مکہ میں ہیں حفاظت کرسکتا ہے۔ دشمن اگر قوی است نگہباں قوی تر است۔ (تفسیر عثمانی)

ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ سردارانِ قریش کی ایک جماعت نے مجلسِ شوریٰ کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ضرر رسانی کے درپے ہوئے۔ اس مجلس میں ابلیس بھی ایک شیخِ جلیل کی صورت میں آیا۔ لوگوں نے پوچھا تم کون ہو؟ اس نے جواب دیا میں اہلِ نجد کا شیخ ہوں، میں نے سنا کہ تم لوگ مجلسِ شوریٰ کر رہے ہو، میں بھی چلا آیا تاکہ میری نصیحت اور مشورے سے تم محروم نہ رہو۔ لوگوں نے کہا آیئے ضرور آیئے۔ وہ کہنے لگا کہ تم لوگ اس شخص کے بارے میں خوب فکر اور تدبر سے کام لو ورنہ بہت ممکن ہے کہ وہ تم پر چھا جائے۔ چنانچہ ایک نے رائے دی کہ اسے قید کر دینا چاہئے حتیٰ کہ وہ قید ہی میں ہلاک ہوجائے۔ (تفسیر ابن کثیر)

حضرت علیؓ کی فضیلت:

حاکم نے حضرت علی بن حسینؓ (یعنی امام زین العابدین) کا قول نقل کیا ہے کہ (آیت من الناس من یشری نفسه ابتغاء مرضات اللّٰہ کا مصداق حضرت علیؓ ہی ہیں) علیؓ نے ہی اللہ کی خوشنودی طلب کرنے کے لئے اپنی جان فروخت کی یا خریدی اور اسی کے متعلق مندرجۂ ذیل اشعار فرمائے۔

وقیت بنفسی خیر من وطی الحصیٰ　　ومن طاف بالبیت العتیق وبالحجر
رسول الٰہ اخاف ان یمکروا بہ　　فنجاہ ذو الطول الالٰہ من المکر
بات رسول اللہ فی الغار امنا　　موقی وفی حفظ الالٰہ وفی ستر
وبت اراعیھم وما یتھموننی　　وقد وطنت نفسی علی القتل والاسر

جن لوگوں نے (بطحاء کی) پتھریوں کو روندا اور کعبہ اور سنگ اسود کا طواف کیا ان میں سب سے برتر ہستی کو اپنی جان کی پیش کش کر کے میں نے بچایا جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے مجھے اندیشہ تھا کہ مشرک ان پر خفیہ داؤ نہ کریں آخر مشرکوں کے داؤ سے قدرت والے اللہ نے ان کو بچا لیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات بھر غار کے اندر بے فکری کے ساتھ محفوظ اللہ کی حفاظت و پناہ میں رہے اور میں نے رات بھر مشرکوں کی اور ان کی سازش کی تاک جھانک رکھی اور اپنی جان کو مارے جانے اور قید ہونے پر جمائے رکھا۔ (تفسیر مظہری)

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا
اور جب کوئی پڑھے ان پر ہماری آیتیں تو کہیں ہم سن چکے
لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ
اگر ہم چاہیں تو ہم بھی کہہ لیں ایسا یہ تو کچھ بھی نہیں
اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۱﴾
مگر احوال ہیں اگلوں کے

کافروں کے جھوٹے دعوے:

نضر بن الحارث کہا کرتا تھا کہ ہم چاہیں تو قرآن جیسا کلام بنا لائیں۔ اس میں قصے کہانیوں کے سوا کیا رکھا ہے۔ مگر قرآن تو سب جھگڑوں کا فیصلہ اسی بات پر رکھتا تھا۔ پھر چاہا کیوں نہیں؟ کسی نے کہا تھا کہ میرا گھوڑا اگر چلے تو ایک دن میں لندن پہنچے، مگر چلتا نہیں۔ بہرحال پچھلی قوموں کے احوال سن کر کہا کرتے تھے کہ سب قصے کہانیاں ہیں۔ اب بدر میں دیکھ لیا کہ محض افسانے نہ تھے، وعدۂ عذاب تم پر بھی آیا جیسے پہلوں پر آیا تھا۔ (تفسیر عثمانی)

وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ
اور جب وہ کہنے لگے کہ یا اللہ اگر یہی دین حق ہے
مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ
تیری طرف سے تو ہم پر برسا دے پتھر
السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۲﴾
آسمان سے یا لا ہم پر کوئی عذاب دردناک

ابوجہل کی دُعاء:

اس آیت میں مشرکین مکہ کے انتہائی جہل اور شقاوت وعناد کا اظہار ہے۔ یعنی وہ کہتے تھے کہ خداوندا اگر واقعی یہی دین حق ہے جس کی ہم اتنی

دیر اور اس قدر شد و مد سے تکذیب کر رہے ہیں تو پھر دیر کیوں ہے؟ گزشتہ اقوام کی طرح ہم پر بھی پتھروں کا مینہ کیوں نہیں برسا دیا جاتا۔ یا اسی طرح کے کسی دوسرے عذاب میں مبتلا کر کے ہمارا استیصال کیوں نہیں کر دیا جاتا؟ کہتے ہیں کہ یہ دعاء ابوجہل نے مکہ سے نکلتے وقت کعبہ کے سامنے کی۔ آخر جو کچھ مانگا تھا اس کا ایک نمونہ بدر میں دیکھ لیا۔ وہ خود مع ۶۹ سرداروں کے کمزور اور بے سروسامان مسلمانوں کے ہاتھوں سے مارا گیا۔ ستر سردار اسیری کی ذلت میں گرفتار ہوئے۔ اس طرح خدا نے ان کی جڑ کاٹ دی۔ بیشک قوم لوط کی طرح ان پر آسمان سے پتھر نہیں برسے لیکن ایک مٹھی سنگریزے جو خدا تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے پھینکے تھے وہ آسمانی سنگباری کا چھوٹا سا نمونہ تھا۔ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (تفسیر عثمانی)

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ
اور اللہ ہرگز نہ عذاب کرتا ان پر جب تک تو رہتا ان میں

سنۃ اللہ یہ ہے کہ جب کسی قوم پر تکذیب انبیاء کی وجہ سے عذاب نازل کرتے ہیں تو اپنے پیغمبر کو ان سے علیحدہ کر لیتے ہیں۔ خدا نے جب حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے علیحدہ کر لیا تب مکہ والے بدر کے عذاب میں پکڑے گئے۔ (تفسیر عثمانی)

وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿۳۳﴾
اور اللہ ہرگز نہ عذاب کریگا ان پر جب تک وہ معافی مانگتے رہینگے

عذاب کو روکنے والی دو چیزیں:

نزول عذاب سے دو چیزیں مانع ہیں۔ ایک ان کے درمیان پیغمبر کا موجود رہنا۔ دوسرے استغفار۔ یعنی مکہ میں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم سے عذاب اٹک رہا تھا۔ اب ان پر عذاب آیا۔ اسی طرح جب تک گنہگار نادم رہے اور توبہ کرتا رہے تو پکڑا نہیں جاتا اگرچہ بڑے سے بڑا گناہ ہو۔ حضرت نے فرمایا کہ گنہگاروں کی پناہ دو چیزیں ہیں۔ ایک میرا وجود، اور دوسرے استغفار، کذافی الموضح۔ (تنبیہ) وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ کے جو معنی مترجم محقق قدس اللہ روحہ نے کئے بعض مفسرین کے موافق ہیں۔ لیکن اکثر کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ مشرکین جس قسم کا خارق عادت عذاب طلب کر رہے تھے جو قوم کی قوم کا دفعۃً استیصال کر دے ان پر ایسا عذاب بھیجنے سے دو چیزیں مانع ہیں۔ ایک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود باجود کہ اس کی برکت سے اس امت پر خواہ ''امۃ دعوۃ'' ہی کیوں نہ ہو ایسا خارق عادت متاصل عذاب نہیں آتا۔ یوں کسی وقت افراد و آحاد پر آجائے وہ اس کے منافی نہیں۔ دوسرے استغفار کرنے والوں کی موجودگی خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم جیسا کہ منقول ہے کہ مشرکین مکہ بھی تلبیہ وطواف وغیرہ میں "غفرانک، غفرانک'' کہا کرتے تھے۔ باقی غیر خارق معمولی عذاب (مثلاً قحط یا وباء یا قتل کثیر وغیرہ) اس کا نزول پیغمبر یا بعض مستغفرین کی موجودگی میں بھی ممکن ہے۔ آخر جب وہ لوگ شرارتیں کرینگے تو خدا کی طرف سے تنبیہ کیوں نہ کی جائے گی۔ آگے اسی کو بیان فرمایا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ
اور ان میں کیا بات ہے کہ عذاب نہ کرے ان پر اللہ اور وہ تو روکتے ہیں
عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوْا اَوْلِيَآءَهٗ
مسجد حرام سے اور وہ اس کے اختیار والے نہیں
اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ
اس کے اختیار والے تو وہی ہیں جو پرہیزگار ہیں لیکن ان میں
لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۴﴾
اکثروں کو اس کی خبر نہیں

کافروں کے ظلم کی انتہاء:

یعنی عذاب کا نہ آنا ان دو سبب سے ہے جو اوپر مذکور ہوئے، ورنہ تمہاری شرارتیں اور ظلم وشقاوت تو ایسی چیزیں ہیں کہ فوراً عذاب آجانا چاہئے۔ اس سے زیادہ ظلم کیا ہوگا کہ موحدین کو حرم شریف میں آنے یا عبادت کرنے سے طرح طرح کے حیلے تراش کر روکا جائے بلکہ ان کے وطن (مکہ معظمہ) سے نکال کر ہمیشہ کے لئے کوشش کی جائے کہ یہ خدا کے پاکباز اور عبادت گزار بندے یہاں نہ آنے پائیں۔ اور ستم ظریفی یہ ہے کہ اس ظلم کے جواز کے لئے یہ سند پیش کی جاتی ہے کہ ہم حرم شریف کے متولی با اختیار ہیں جس کو چاہیں آنے دیں جسے چاہیں روک دیں۔ یہ ہمارا حق ہے۔ حالانکہ اول تو یہ حق متولی کو بھی نہیں کہ مسجد میں لوگوں کو نماز و عبادت سے روکے۔ دوسرے حق تولیت ان کو پہنچتا بھی نہیں۔ حرم شریف کے متولی صرف متقی اور پرہیزگار بندے ہو سکتے ہیں مشرک۔ اور بدمعاش

اس کے حقدار نہیں ہو سکتے۔ لیکن ان میں کے اکثر اپنی جہالت سے یوں سمجھ رہے ہیں کہ ہم اولاد ابراہیم ہیں اور فلاں قبیلہ سے ہیں، تولیت کعبہ ہمارا موروثی حق ہے۔ جس کے لئے کوئی خاص شرط و قید نہیں۔ سو بتلا دیا کہ اولادِ ابراہیم میں جو پرہیز گار ہو اسی کا حق ہے۔ ایسے بے انصافوں کا حق نہیں کہ جس سے وہ آپ ناخوش ہوئے نہ آنے دیا۔ (تفسیر عثمانی)

مسجد کے متولی کی صفات:

معلوم ہوا کہ مسجد کا متولی مسلمان دیندار پرہیز گار ہونا چاہئے اور بعض حضرات مفسرین نے ان اولیاؤہ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع قرار دے کر یہ معنی لکھے ہیں کہ اللہ کے ولی صرف متقی پرہیز گار لوگ ہو سکتے ہیں۔ اس تفسیر کے مطابق آیت سے یہ نتیجہ نکلا کہ جو لوگ شریعت و سنت کے خلاف عمل کرنے کے باوجود ولی اللہ ہونے کا دعویٰ کریں وہ جھوٹے ہیں اور جو ایسے لوگوں کو ولی اللہ سمجھیں وہ دھوکے میں ہیں۔

یہ امت قیامت تک عذاب سے محفوظ رہے گی:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے روضہ میں زندہ ہونا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا قیامت تک قائم رہنا اس کی دلیل ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک دنیا میں ہیں۔ اس لئے یہ امت قیامت تک عذابِ عام سے مامون رہے گی۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا
اور ان کی نماز نہیں تھی کعبہ کے پاس
مُكَاءً وَتَصْدِيَةً فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا
مگر سیٹیاں بجانی اور تالیاں سو چکھو عذاب
كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ۝٣٥
بدلہ اپنے کفر کا

مشرکوں کی نماز: یعنی حقیقی نمازیوں کو مسجد سے روکتے ہیں اور خود ان کی نماز کیا ہے؟ کعبہ کا برہنہ ہو کر طواف کرنا اور ذکر اللہ کی جگہ سیٹیاں اور تالیاں بجانا جیسے آج بھی بہت سی قومیں گھنٹیاں اور ناقوس بجانے کو بڑی عبادت سمجھتی ہیں۔ غرض نہ خود اللہ کی عبادت کرتے ہیں نہ دوسروں کو کرنے دیتے ہیں۔ ان بے معنی اور لغو باتوں کو عبادت قرار دے رکھا ہے۔ بعض نے کہا کہ سیٹیاں اور تالیاں بجانا مسلمانوں کی عبادت میں خلل ڈالنے کے لئے ہوتا تھا یا ازراہِ استہزاء و تمسخر ایسا کرتے تھے۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانی)

بچوں اور پاگلوں کو مسجد سے دور رکھو:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنی مسجدوں کو بچاؤ چھوٹے بچوں سے اور پاگل آدمیوں سے اور باہمی جھگڑوں سے۔ چھوٹے بچوں سے مراد وہ بچے ہیں جن سے ناپاکی کا خطرہ ہے اور پاگل سے ناپاکی کا بھی خطرہ ہے اور نمازیوں کی ایذاء کا بھی۔ اور باہمی جھگڑوں سے مسجد کی بے حرمتی بھی ہے اور نمازیوں کی ایذاء بھی۔

اس حدیث کی رو سے متولی مسجد کے لئے یہ تو حق ہے کہ ایسے چھوٹے بچوں، پاگلوں کو مسجد میں نہ آنے دے اور باہمی جھگڑے مسجد میں نہ ہونے دے۔ لیکن بغیر ایسی صورتوں کے کسی مسلمان کو مسجد سے روکنے کا کسی متولی مسجد کو حق نہیں۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ
بے شک جو لوگ کافر ہیں وہ خرچ کرتے ہیں
لِيَصُدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ
اپنے مال تاکہ روکیں اللہ کی راہ سے

مشرکین کی انتقامی کارروائی:

بدر میں بارہ سرداروں نے ایک۔ ایک دن اپنے ذمہ لیا تھا کہ ہر روز ایک شخص لشکر کو کھانا کھلائے گا۔ چنانچہ دس اونٹ روزانہ کسی ایک کی طرف سے ذبح کئے جاتے تھے۔ پھر جب شکست ہوگئی تو ہزیمت خوردہ مجمع نے مکہ پہنچ کر ابوسفیان وغیرہ سے کہا کہ جو مال تجارتی قافلہ لایا ہے، وہ سب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے انتقام لینے میں صرف کیا جائے۔ چنانچہ سب اس پر راضی ہوگئے۔ اسی طرح کے خرچ کرنے کا یہاں ذکر ہے۔ (تفسیر عثمانی)

بروایت محمد بن اسحاق حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ منقول ہے کہ غزوۂ بدر کے شکست زدہ زخم خوردہ، بچے کھچے کفار مکہ جب وہاں سے واپس مکہ پہنچے تو جن لوگوں کے باپ بیٹے اس جہاد میں مارے گئے تھے وہ تجارتی قافلہ کے امیر ابوسفیان کے پاس پہنچے اور کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ یہ جنگ تمہارے تجارتی قافلہ کی حفاظت کے لئے لڑی گئی جس کے نتیجہ میں یہ تمام جانی اور مالی نقصانات اٹھانے پڑے۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ اس مشترک تجارتی کمپنی سے ہماری کچھ مدد کی جائے تاکہ ہم آئندہ مسلمانوں سے اپنا انتقام لے سکیں۔ ان لوگوں نے اس کو منظور کر کے ایک

بڑی رقم دے دی جس کو انہوں نے غزوۂ بدر کا انتقام لینے کے لئے غزوۂ احد میں خرچ کیا اور اس میں بھی انجام کار مغلوب ہوئے اور شکست کے غم کے ساتھ مال ضائع کرنے کی حسرت مزید ہوگئی۔ (معارف مفتی صاحب)

قریش پر جنگ بدر میں جب مصیبت پہنچی اور یہ لوگ مکہ واپس ہوئے اور ابوسفیان بھی قافلہ لے کر لوٹے تو عبداللہ بن ابی ربیعہ اور عکرمہ بن ابی جہل اور صفوان بن امیہ اور قریش کے کئی آدمی جن کے باپ بیٹے بھائی جنگ میں کام آئے تھے ابوسفیان سے اور ان سے جن کا مال تجارت اس قافلہ میں تھا کہنے لگے کہ اے معشر قریش تمہارے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہیں نیچا دکھا چکے ہیں تمہارے شرفاء کو قتل کر دیا ہے، ان سے دوبارہ لڑنے کے لئے اس قافلہ کا مال تم دے دو تاکہ ہم ان سے اپنا انتقام لیں۔ چنانچہ انہوں نے سب مال دے دیا۔ اسی بارے میں اللہ پاک فرماتا ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ یعنی کافر اپنا مال خرچ کر رہے ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

فَسَيُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ
سو ابھی اور خرچ کریں گے پھر آخر ہو گا
حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ ۬ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا
وہ ان پر افسوس اور آخر مغلوب ہوں گے اور جو کافر ہیں وہ
اِلٰى جَهَنَّمَ يُحْشَرُوْنَ ﴿۳۶﴾
دوزخ کی طرف ہانکے جائیں گے

ان کو حسرت ہی ملے گی:

جب دنیا میں مغلوب و مقہور اور آخرت میں معذب ہوں گے، تب افسوس وحسرت سے ہاتھ کاٹیں گے کہ مال بھی گیا اور کامیابی بھی نہ ہوئی۔ چنانچہ اول بدر میں پھر احد وغیرہ میں سب مالی اور جسمی طاقتیں خرچ کر دیکھیں کچھ نہ کر سکے آخر ہلاک یا رسوا ہوئے یا نادم ہو کر کفر سے توبہ کی۔ (تفسیر عثمانی)

لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ
تاکہ جدا کر دے اللہ ناپاک کو پاک سے اور رکھے
الْخَبِيْثَ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ فَيَرْكُمَهٗ جَمِيْعًا
ناپاک کو ایک کو ایک پر پھر اس کو ڈھیر کر دے اکٹھا

فَيَجْعَلَهٗ فِيْ جَهَنَّمَ ؕ
پھر ڈال دے اس کو دوزخ میں

موضح القرآن میں ہے کہ آہستہ آہستہ اللہ تعالیٰ اسلام کو غالب کریگا اس درمیان میں کافر اپنا جان و مال کا زور خرچ کر لینگے۔ تا نیک و بد جدا ہو جاوے۔ یعنی جن کی قسمت میں اسلام لکھا ہے وہ سب مسلمان ہو چکیں اور جن کو کفر پر مرنا ہے وہی اکٹھے دوزخ میں جائیں۔ (تفسیر عثمانی)

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ ع
وہی لوگ ہیں نقصان میں

یعنی دنیوی واخروی دونوں قسم کا نقصان اور خسارہ اٹھایا۔ (تفسیر عثمانی)

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا
تو کہہ دے کافروں کو کہ اگر وہ باز آجائیں
يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ج
تو معاف ہو ان کو جو کچھ ہو چکا

اب بھی وقت ہے:

یعنی اگر اب بھی کفر وطغیان اور عداوت اسلام سے باز آجائیں، اور پیغمبر علیہ السلام کی حلقہ بگوشی اختیار کر لیں تو پہلے حالت کفر میں جو گناہ کر چکے، وہ سب معاف کر دیئے جائیں گے۔ الاسلام یھدم ما کان قبلہ (حقوق العباد معاف نہ ہونگے، ان کا مسئلہ علیحدہ ہے) (تفسیر عثمانی)

وَاِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ
اور اگر پھر بھی وہی کریں گے تو پڑ چکی ہے
الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۸﴾
راہ اگلوں کی

ورنہ یہ بھی برباد ہوں گے:

یعنی جس طرح اگلے لوگ پیغمبروں کی تکذیب و عداوت سے تباہ ہوئے، ان پر بھی تباہی آئے گی۔ یا یہ مطلب ہے کہ جیسے بدر میں ان کے بھائی بندوں کو سزا دی گئی انہیں بھی سزا دی جائے گی۔ (تفسیر عثمانی)

وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ

اور لڑتے رہو ان سے یہاں تک کہ نہ رہے فساد

جہاد وقتال کا اولین مقصد:

یعنی کافروں کا زور نہ رہے کہ ایمان سے روک سکیں یا مذہب حق کو موت کی دھمکی دے سکیں۔ جیسا کہ تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی کفار کو غلبہ ہوا، مسلمانوں کا ایمان اور مذہب خطرہ میں پڑ گیا۔ اسپین کی مثال دنیا کے سامنے ہے کہ کس طرح قوت اور موقع ہاتھ آنے پر مسلمانوں کو تباہ کیا گیا یا مرتد بنایا گیا۔ بہر حال جہاد وقتال کا اولین مقصد یہ ہے کہ اہل اسلام مامون و مطمئن ہو کر خدا کی عبادت کر سکیں اور دولت ایمان و توحید کفار کے ہاتھوں سے محفوظ ہو (چنانچہ فتنہ کی یہ ہی تفسیر ابن عمرو غیرہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے کتب حدیث میں منقول ہے)۔ (تفسیر عثمانی)

مسلمانوں کو کفار سے اس وقت تک قتال کرتے رہنا چاہئے جب تک کہ مسلمان ان کے مظالم سے محفوظ نہ ہو جائیں اور دین اسلام کا غلبہ نہ ہو جائے کہ وہ غیروں کے مظالم سے مسلمانوں کی حفاظت کر سکے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ایک واقعہ سے بھی اسی تفسیر کی تائید ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب امیر مکہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے مقابلہ میں حجاج بن یوسف نے فوج کشی کی اور دونوں طرف سے مسلمانوں کی تلواریں مسلمانوں کے مقابلہ پر چل رہی تھیں تو دو شخص حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس حاضر ہوئے اور کہا کہ اس وقت جس بلاء میں مسلمان مبتلا ہیں آپ دیکھ رہے ہیں حالانکہ آپ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ہیں جو کسی طرح ایسے فتنوں کو برداشت کرنے والے نہ تھے۔ کیا سبب ہے کہ آپ اس فتنہ کو رفع کرنے کے لئے میدان میں نہیں آتے۔ تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی مسلمان کا خون بہانا حرام قرار دیا ہے۔ ان دونوں نے عرض کیا کہ کیا آپ قرآن کی یہ آیت نہیں پڑھتے قَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ یعنی مقاتلہ کرتے رہو یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ بیشک میں یہ آیت پڑھتا ہوں اور اس پر عمل بھی کرتا ہوں۔ ہم نے اس آیت کے مطابق کفار سے قتال جاری رکھا یہاں تک کہ فتنہ ختم ہو گیا اور غلبہ دین اسلام کا ہو گیا۔ اور تم لوگ یہ چاہتے ہو کہ اب باہم قتال کر کے فتنہ پھر پیدا کرو اور غلبہ غیر اللہ کا اور دین حق کے خلاف کا ہو جائے۔ مطلب یہ تھا کہ جہاد وقتال کا حکم فتنہ کفر اور مظالم کفار کے مقابلہ میں تھا وہ ہم کر چکے اور برابر کرتے رہے یہاں تک کہ یہ فتنہ فرو ہو گیا۔ مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی کو اس پر قیاس کرنا صحیح نہیں بلکہ مسلمانوں کے باہمی مقاتلہ کے وقت تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات یہ ہیں کہ اس میں بیٹھا رہنے والا کھڑا ہونے والے سے بہتر ہے۔

خلاصہ اس تفسیر کا یہ ہے کہ مسلمانوں پر اعداء اسلام کے خلاف جہاد و قتال اس وقت تک واجب ہے جب تک کہ مسلمانوں پر ان کے مظالم کا فتنہ ختم نہ ہو جائے اور اسلام کو سب ادیان پر غلبہ حاصل نہ ہو جائے۔ اور یہ صورت صرف قرب قیامت میں ہوگی اس لئے جہاد کا حکم قیامت تک جاری اور باقی ہے۔

معاہدہ والے شخص کے حقوق کا تحفظ:

دوسری ایک حدیث جو ابو داؤد نے بہت سے صحابہ کرامؓ کی روایت سے نقل کی ہے یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی معاہد پر یعنی اس شخص پر جس نے اسلامی حکومت کی اطاعت و وفاداری کا معاہدہ کر لیا ہو کوئی ظلم کرے یا اس کو نقصان پہنچائے یا اس سے کوئی ایسا کام لے جو اس کی طاقت سے زائد ہے یا اس کی کوئی چیز بغیر اس کی دلی رضامندی کے حاصل کرے تو میں قیامت کے دن اس مسلمان کے خلاف معاہد کی حمایت کروں گا۔ (معارف، مفتی اعظمؒ)

حضرت عروہؓ کا خط خلیفہ عبدالملک کے نام:

عبدالملک بن مروان نے عروہ کو لکھا اور چند باتیں دریافت کیں، تو عروہ نے یوں جواب لکھ بھیجا: سلام علیک! میں خدائے واحد کی حمد کرتا ہوں اور پھر تمہیں لکھتا ہوں کہ تم نے مجھ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مکے سے مدینہ کی طرف ہجرت کے واقعات پوچھے ہیں۔ میں تمہیں بتاؤں گا، قوت وطاقت خدا کے سوا کسی کو نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت عطا فرمائی، وہ کیسے اچھے نبی کیسے اچھے سید تھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے جنت میں ہمیں ان کا چہرہ دکھائے انہیں کے دین وملت پر زندگی رکھے اور انہیں کے دین پر مارے اور انہیں کے ساتھ زندہ اٹھائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ہدایت اور نور کی طرف قوم کو بلایا تو لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ کو کچھ ایسی اہمیت نہیں دی۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی کو سن بھی لیتے تھے اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بتوں کا ذکر شروع کیا اور مالدار قریش کے لوگ طائف سے مکے آئے تو ان میں سے اکثر کو یہ تبلیغ ناگوار گزری، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ سے بیزار ہوئے۔ جو کوئی مسلمان ہو بھی جاتا تو اس کو بہکانے لگتے۔ چنانچہ

مائل ہونے والے عامۃ الناس بھی بے رغبت ہو گئے۔ مگر چند لوگ اپنے مستقل ارادے پر قائم رہے۔ اسلام کی طرف سے ان کے خیالات پراگندہ نہیں ہوئے۔ اب قریش کے سرداروں نے باہم مشورہ کیا کہ اسلام قبول کرنے والوں پر سختی کریں۔ یہ فتنہ ایک زبردست زلزلہ تھا جو اس فتنہ میں پھنس گیا سو پھنس گیا اور جس کو اللہ نے محفوظ رکھا تو محفوظ رہا۔ جب مسلمانوں پر یہ قریش بہت ظلم توڑنے لگے تو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ ارضِ حبش کی طرف ہجرت کر جائیں، حبش کا بادشاہ ایک مردِ صالح تھا جس کا نام نجاشی تھا۔ وہ ظالم بادشاہ نہیں تھا۔ چاروں طرف اس کی تعریف ہوتی تھی۔ سرزمین حبش قریش کی تجارت گاہ تھی اور تجار قریش کے وہاں مکانات تھے جہاں وہ تجارت کر کے بہت رزق پیدا کرتے تھے۔ امن حاصل کرتے تھے اور تجارت خوب چمکی ہوئی تھی۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تو عام مسلمان جن پر مکہ والے زیادہ ظلم توڑ رہے تھے، حبش کی طرف چلے گئے کیونکہ ان کو اپنی جان کا خوف تھا۔ وہ وہاں ہمیشہ کے لئے نہیں ٹھہرے صرف چند سال رہے۔ وہاں بھی مسلمانوں نے اسلام پھیلایا وہاں کے شرفاء بھی اسلام لائے۔ جب کفارِ قریش نے یہ رنگ دیکھا کہ مسلمانوں پر ظلم کرنے سے وہ حبش چلے جاتے ہیں اور وہاں کے لوگوں اور سرداروں کو اپنا بنا لیتے ہیں تو اب انہوں نے مصلحت یہی سمجھی کہ نرم برتاؤ اختیار کریں۔ چنانچہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحابِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نرم برتاؤ کرنے لگے۔ چنانچہ پہلی آزمائش مسلمانوں کی یہی تھی، جس نے مسلمانوں کو حبش کی طرف بھیجا۔ چنانچہ جب نرمی پیدا ہوگئی اور وہ فتنہ جس کے زلزلوں نے مسلمان صحابہؓ کو وطن چھوڑنے اور حبشہ جانے پر مجبور کیا تھا اس کے کچھ دب جانے کی خبروں نے مہاجرین حبشہ کو پھر آمادہ کیا کہ وہ مکے واپس چلے آئیں۔ چنانچہ وہ تھوڑے بہت بھی جو گئے تھے واپس آ گئے۔ اس اثناء میں مدینہ کے انصار مسلمان ہو گئے اور مدینہ میں بھی اسلام کی اشاعت ہونے لگی۔ ان اہلِ مدینہ کا مکے آنا جانا شروع ہوا اس سے مکے والے اور بگڑے، مشورہ کیا کہ اب تو ان پر اور سختی کرنا چاہئے۔ چنانچہ عام طور پر مسلمانوں پر مظالم توڑنے لگے مسلمان بڑی مصیبتوں میں مبتلا ہو گئے یہ مسلمانوں کے لئے دوسرا فتنہ اور دوسری آزمائش تھی۔ ایک فتنہ تو یہ کہ حبش کی طرف مسلمانوں کو بھاگنا پڑا اور دوسرا فتنہ وہاں سے مسلمانوں کے واپس آنے کے بعد جب کہ اہلِ مکہ نے دیکھا کہ مدینے سے لوگ آتے جا رہے ہیں اور مسلمان ہوتے جا رہے ہیں۔ چنانچہ ایک بار مدینے سے ستر آدمی آئے جو معتبر اور سردار لوگ تھے اور یہ سب مسلمان ہو گئے، حج کیا اور بمقام عقبہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی اور عہد کیا کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہو رہتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ہو رہیں گے۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحابؓ ہمارے شہر آئیں یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں تو ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور اصحابؓ کی ایسی حمایت کریں گے جیسے کہ اپنی اور اپنے لوگوں کی کرتے ہیں۔ قریش نے اس معاہدہ کو سن کر مزید سختی برتنی شروع کر دی۔ اب حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اصحابؓ کو حکم دیدیا کہ مدینے کی طرف ہجرت کر جائیں، یہ دوسرا فتنہ تھا جس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اور اصحابؓ کو مکے سے نکالا۔ اسی چیز کو اللہ پاک نے قرآن میں ظاہر فرمایا ہے کہ ان کافروں سے قتال کرو حتیٰ کہ یہ فتنے ختم ہو جائیں اور دین اللہ کا ہی سکہ چلے۔ عروہ بن زبیرؓ سے مروی ہے کہ یہ خط عروہ نے عبدالملک بن مروان کو لکھا تھا۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَيَكُونَ	الدِّينُ	كُلُّهُ	لِلَّهِ
اور ہو جائے	حکم	سب	اللہ کا

جہاد کا آخری مقصد:

یہ "جہاد" کا آخری مقصد ہے کہ کفر کی شوکت نہ رہے۔ حکم اکیلے خدا کا چلے۔ دین حق سب ادیان پر غالب آ جائے۔ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ خواہ دوسرے باطل ادیان کی موجودگی میں جیسے خلفائے راشدین وغیرہم کے عہد میں ہوا، یا سب باطل مذاہب کو ختم کر کے، جیسے نزول مسیح کے وقت ہوگا۔ بہر حال یہ آیت اس کی واضح دلیل ہے کہ جہاد و قتال خواہ ہجومی ہو یا دفاعی، مسلمانوں کے حق میں اس وقت تک، برابر مشروع ہے جب تک یہ دونوں مقصد حاصل نہ ہو جائیں۔ اسی لئے حدیث میں آ گیا۔ الجهاد ماض الیٰ یوم القیامة (جہاد کے احکام و شرائط وغیرہ کی تفصیل کتب فقہ میں ملاحظہ کی جائے) (تفسیر عثمانی)

غلبہ اسلام کا مقدر ہے:

حضرت مقداد بن اسود کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے کوئی ایسا مکان اور خیمہ روئے زمین پر باقی نہیں رہے گا جس کے اندر اللہ کلمۂ اسلام کو داخل نہ کر دے (خواہ) عزت مند کو عزت دیکر یا ذلیل کو ذلت دے کر یا تو مکان اور ڈیرے والوں کو (مشرف باسلام کر کے) اللہ عزت عطا فرمادے گا۔ اور ان کو اہل کلمہ بنا دیگا یا (اسلام سے محروم رکھ کر) ان کو ذلیل کر دیگا اور وہ کلمۂ اسلام کے زیر فرمان ہو جائیں

گے اس طرح سارا اقتدار اللہ ہی کا ہو جائے گا۔ رواہ احمد زیر فرمان ہونے سے مراد ہے محکوم ہو جانا اور ذمی بن جانا۔ (تفسیر مظہری)

فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ

پھر اگر وہ باز آجائیں تو اللہ ان کے کام کو

بَصِيْرٌ ﴿۳۹﴾

دیکھتا ہے

مسلمان ظاہر حال کے مکلّف ہیں:

یعنی جو ظاہر میں اپنی شرارت اور کفر سے باز آجائیں، ان سے قتال نہیں۔ ان کے دلوں کا حال اور مستقبل کی کیفیات کو خدا کے سپرد کیا جائے گا۔ جیسا کام وہ کرینگے خدا کی آنکھ سے غائب ہو نہیں کر سکتے۔ مسلمان صرف ظاہر حال کے موافق عمل کرنے کے مکلّف ہیں وفی الحدیث امرت ان اقاتل الناس حتیٰ یقولو لا الہ الا اللہ فاذا قالوھا عصمو منی دمائھم واموالھم الا بحقھا وحسابھم علی اللہ عز وجل۔ (تفسیر عثمانی)

لڑائی کب تک رہے گی:

حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے اس وقت تک لوگوں (یعنی کافروں) سے لڑنے کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ لا الہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قائل ہو جائیں اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے لگیں جب وہ ایسا کرلیں تو ان کے خون اور مال میری طرف سے محفوظ ہو جائیں گے سوائے حق اسلام کے (یعنی حقوق عباد کی وجہ سے ان سے قصاص اور مالی معاوضات لئے جا سکیں گے) اور ان کا (باطنی حساب) اللہ کے ذمہ ہے۔ (تفسیر مظہری)

وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ

اور اگر وہ نہ مانیں تو جان لو کہ اللہ تمہارا حمایتی ہے

نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿۴۰﴾

کیا خوب حمایتی ہے اور کیا خوب مددگار ہے

مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں:

یعنی مسلمانوں کو چاہئے کہ خدا کی مدد اور حمایت پر بھروسہ کر کے جہاد کریں۔ کفار کی کثرت اور ساز و سامان سے مرعوب نہ ہوں۔ جیسے "جنگ بدر" میں دیکھ چکے کہ خدا نے مسلمانوں کی کیا خوب امداد و حمایت کی۔ (تفسیر عثمانی)

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ

اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کو غنیمت ملے کسی چیز سے سو اللہ کے واسطے

لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى

ہے اس میں سے پانچواں حصہ اور رسول کے واسطے اور اسکے قرابت

وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ

والوں کے واسطے اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں کے واسطے

مال غنیمت کی تفصیل:

آغاز سورت میں فرمایا تھا "قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ" یہاں اس کی قدرے تفصیل بیان فرمائی۔ یہ کہ جو مال غنیمت کافروں سے لڑ کر ہاتھ آئے اس کا پانچواں حصہ خدا کی نیاز ہے، جسے خدا کی نیابت کے طور پر پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام وصول کر کے پانچ جگہ خرچ کر سکتے ہیں۔ اپنی ذات پر، اپنے ان قرابتداروں (بنی ہاشم و بنی المطلب) پر جنہوں نے قدیم سے خدا کے کام میں آپ کی نصرت و امداد کی اور اسلام کی خاطر یا محض قرابت کی وجہ سے آپ کا ساتھ دیا اور مدز کوٰۃ وغیرہ ہے لینا ان کے لئے حرام ہوا۔ یتیموں پر، حاجت مند مسلمانوں پر مسافروں پر۔ پھر غنیمت میں جو چار حصے باقی رہے، وہ لشکر پر تقسیم کئے جائیں۔ سوار کو دو حصے اور پیدل کو ایک، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خمس کے پانچ مصارف میں سے "حنفیہ" کے نزدیک صرف تین اخیر کے باقی رہ گئے۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کا خرچ نہیں رہا اور نہ اہل قرابت کا وہ حصہ رہا جو ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت قدیمہ کی بناء پر ملتا تھا البتہ مساکین اور حاجتمندوں کا جو حصہ ہے اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابتدار مساکین اور اہل حاجت کو مقدم رکھا جانا چاہئے۔ بعض علماء کے نزدیک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امیر المومنین کو اپنے مصارف کے لئے خمس الخمس ملنا چاہئے، واللہ اعلم۔ بعض روایات میں ہے کہ جب "غنیمت" میں سے خمس (اللہ کے نام کا پانچواں حصہ) نکالا جاتا تھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اول اس میں کا کچھ حصہ بیت اللہ (کعبہ) کے لئے نکال لیتے تھے۔ بعض فقہاء نے لکھا ہے کہ جہاں سے کعبہ بعید ہے،

وہاں مساجد کے لئے نکالنا چاہئے۔ (تفسیر عثمانی)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ امام اعظمؒ کے نزدیک حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد ساقط ہو گیا اب اس حصہ کو بقیہ اصناف پر خرچ کرنا چاہئے۔ اور امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک آپ کے حصے کو مسلمانوں کی عام ضرورت میں صرف کیا جائے اور قتادہ کا مذہب یہ ہے کہ وہ خلیفہ کا حق ہے۔

مالِ فَیٔ

صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ حنین میں مؤلفۃ القلوب کو مال فئی سے کچھ عنایت فرمایا اور ظاہر ہے کہ غزوۂ حنین میں جو مال غنیمت آپ کو حاصل ہوا وہ مقاتلہ اور جنگ کے بعد حاصل ہوا اور روایات میں اس مال پر فئی کا اطلاق آیا ہے معلوم ہوا کہ فئی کا اطلاق عام ہے غنیمت پر بھی اس کا اطلاق آجاتا ہے۔ (معارف کاندھلوی)

مال غنیمت کے پانچویں حصہ میں سے چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خاندان کو بھی قرآن کی اس آیت نے حصہ دیا ہے اس لئے اس پر متنبہ کیا گیا کہ یہ حصہ لوگوں کی ملکیت سے منتقل ہو کر نہیں آیا بلکہ بلا واسطہ اللہ تعالیٰ شانہ کی طرف سے ہے۔ جیسا کہ ابھی ذکر کیا گیا ہے کہ مال غنیمت کفار کی ملک سے نکل کر براہ راست حق تعالیٰ کی خالص ملکیت ہو جاتا ہے پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور انعام تقسیم ہوتا ہے۔

مسئلہ: لشکر کے ساتھ جانیوالے تاجروں اور گھوڑوں کے سائیسوں کے لئے مال غنیمت میں امام اعظم کے نزدیک کوئی حصہ نہیں۔ جب تک وہ مار دھاڑ میں حصہ نہ لیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد:

امام اعظم ابوحنیفہؒ کا فرمانا یہ ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی جو ذوی القربیٰ کو عطا فرماتے تھے تو اس کی دو بنیادیں تھیں ایک ان کی حاجت مندی اور فقر دوسرے اقامت دین اور دفاع عن الاسلام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت وامداد۔ دوسرا سبب تو وفات نبوی کے ساتھ ختم ہو گیا صرف پہلا سبب فقر و حاجت مندی رہ گیا اس کی بنا پر تا قیامت ہر امام وامیر ان کو دوسروں سے مقدم رکھے گا۔ (ہدایہ۔ جصاص) امام شافعیؒ سے بھی یہی قول منقول ہے (قرطبی) (معارف مفتی اعظمؒ)

دارالحرب سے آنیوالا مال:

اگر امام کی اجازت سے ایک دو آدمیوں نے دارالحرب میں جا کر کسی تدبیر سے کچھ مال حاصل کر لیا تو باتفاق اس میں خمس واجب ہے کیونکہ امام کی اجازت کے بعد جانے والے کی مدد کرنا امام پر لازم ہے اور حفاظتی طاقت رکھنے والی جماعت خواہ چار کی ہو یا زائد کی ہو اگر امام کی اجازت کے بغیر بھی دارالحرب میں جائے گی تو ان کی مدد امام پر لازم ہے تاکہ مسلمانوں کی اور اسلام کی توہین نہ ہو اور جب امام کی پشت پناہی حاصل ہو تو پھر وہ لوگ چور نہیں کہلائے جا سکتے۔

من شیء کے لفظ سے تعمیم ہو گئی یعنی مال غنیمت کتنا ہی ہو خواہ صرف دھاگہ اور سوئی ہو سب کا پانچواں حصہ واجب ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت دار:

امام شافعیؒ نے بسند معتبر حضرت جبیرؓ بن مطعم کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذوی القربیٰ کا حصہ صرف بنی ہاشم اور بنی المطلب کو تقسیم کیا۔ بنی عبدالشمس اور بنی نوفل کو کچھ نہیں دیا۔ بخاری نے صحیح میں بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تقسیم:

تمام ائمہ کا اجماع ہے اور تمام راوی بھی اس امر پر متفق ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مال غنیمت کے پانچ حصے کرتے تھے جن میں سے چار حصے تو شرکاء جہاد کو عطا فرما دیتے تھے اور پانچواں حصہ کے پھر پانچ حصے کرتے تھے جن میں سے ایک حصہ تو اپنے اور اپنے متعلقین کے لئے لے لیتے تھے اپنا اور اپنے گھر والوں کا خرچ اسی سے چلاتے تھے اور کچھ بچ رہتا تو اس سے جہاد کے لئے ہتھیار اور گھوڑے خریدتے تھے اور مسلمانوں کے مصالح میں میں صرف کرتے تھے اور ایک حصہ بنی ہاشم اور بنی مطلب کو بانٹ دیتے تھے، مالدار، نادار، مرد، عورت سب کو دیتے تھے اور تین حصے تیموں مسکینوں اور مسافروں کو عنایت کرتے تھے۔

خادم سے بہتر چیز: صحیحین میں حضرت علیؓ کی روایت سے بیان کیا گیا ہے کہ چکی پینے کی وجہ سے حضرت فاطمہؓ کے ہاتھ میں ٹھیک پڑ گئی تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس (غنیمت میں) کچھ باندی غلام آئے ہیں۔ (کسی باندی کی درخواست کے لئے) حضرت سیدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گئیں لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم موجود نہ تھے ملاقات نہ ہو سکی۔ حضرت عائشہؓ سے آمد کی غرض بیان کر دی اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شانۂ نبوت میں تشریف لے آئے تو حضرت عائشہؓ نے جناب سیدہؓ کی آمد

کا ذکر کر دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اطلاع پا کر فوراً ہمارے گھر تشریف لے آئے۔ ہم اپنے بستروں میں جا چکے تھے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دیکھ کر ہم اٹھنے لگے تو فرمایا اپنی اپنی جگہ لیٹے رہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آ کر ہم دونوں کے درمیان بیٹھ گئے (اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں میرے پیٹ سے لگ گئے) مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم کی ٹھنڈک اپنے پیٹ پر محسوس ہوئی (غالباً سردی کا زمانہ ہوگا) پھر بیٹھ کر فرمایا کیا میں تم دونوں کو ایسی چیز بتاؤں جو تمہاری درخواست کردہ چیز سے بہتر ہے خوابگاہ میں پہنچ کر ۳۳ بار سبحان اللہ ۳۳ بار الحمد للہ ۳۴ بار اللہ اکبر پڑھ لیا کرو، یہ تمہارے لئے خادم سے بہتر ہے۔

مسلم کی روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ (حضرت فاطمہؓ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا) کیا میں تم کو ایسی چیز بتاؤں جو خادم سے تمہارے لئے بہتر ہے، ہر نماز کے وقت اور سوتے وقت ۳۳ بار سبحان اللہ ۳۳ بار الحمد للہ ۳۴ بار اللہ اکبر پڑھا کرو۔

مقتول کافر کا مال:

حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ ایک مشرک نے مسلمانوں کو دعوت مقابلہ دی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو مقابلہ کا حکم دیا۔ حضرت زبیرؓ نے صف سے نکل کر اس مشرک کو قتل کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا سامان حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو دے دیا۔ رویٰ الطحاوی

حضرت انسؓ بن مالک راوی ہیں کہ براء بن مالک (برادر انسؓ بن مالک) نے فارس کے ایک مرزبان سے مقابلہ کیا اور برچھا مار کر اس کی کاٹھی کا اگلا حصہ توڑ کر اس کو زخمی کر دیا جس سے وہ مر گیا۔ پھر اس کے سامان کی قیمت کا اندازہ کیا گیا تو کوئی تیس ہزار کا سامان معلوم ہوا۔ فجر کی نماز جب ہم پڑھ چکے تو حضرت عمرؓ تشریف لائے اور ابوطلحہؓ سے فرمایا پہلے ہم مقتول کے سامان کے پانچ حصے نہیں کرتے تھے لیکن براء نے جو سامان چھینا ہے اس کی قیمت بڑی ہے لہٰذا ہم نے اس کے پانچ سہام کرنے کی تجویز کی ہے۔ چنانچہ تخمینہ سے اس سامان کی قیمت ۳۰ ہزار قرار پائی تو ہم نے (پانچویں حصہ کی قیمت) چھ ہزار (حضرت عمرؓ کو) دے دیئے اور چار سہام یعنی ۲۴ ہزار کا سامان تو یونہی حضرت براء کا تھا ہی ۶ ہزار ادا کرنے کے بعد کل سامان حضرت براء کا ہو گیا) رواہ الطحاوی

طحاوی کی دوسری روایت میں آیا ہے کہ براء بن مالک نے فارس کے ایک سردار کو دو بدو مقابلہ کر کے قتل کر دیا اور اس کا سامان اتار لیا اور حضرت عمرؓ کو تحریری اطلاع دے کر حکم طلب کیا گیا۔ حضرت عمرؓ نے سپہ سالار کو لکھ بھیجا کہ سامان کا پانچواں حصہ اپنے قبضہ میں لے لو اور باقی (چار حصے) براء کو دے دو۔ امیر لشکر نے پانچواں حصہ لے لیا۔ یہ دونوں آثار بتا رہے ہیں کہ مقتول کا سامان ہے تو قاتل کا اور اس کے پانچ سہام قائم کرنا درست نہیں ہے لیکن اگر مال زیادہ ہو اور خلیفہ اس میں سے پانچواں حصہ نکال لینا چاہے تو نکال سکتا ہے۔

صحیحین میں حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کا بیان ابوجہل کے قتل کے سلسلہ میں منقول ہے، اس بیان میں یہ بھی آیا ہے کہ معاذ بن عمرو بن جموح اور معاذ بن عفراء کی تلواریں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معائنہ فرمائیں اور معائنہ کے بعد فرمایا تم دونوں نے اس کو قتل کیا ہے لیکن ابوجہل کا سارا سامان حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ بن عمرو بن جموح کو دے دیا۔ معاذؓ بن عفراء کو کچھ نہیں دیا۔ اگر مقتول کا سامان قاتل کو دینا (عموماً) لازم ہوتا تو (چونکہ دونوں قاتل تھے اس لئے) دونوں کو وہ سامان دیا جاتا۔

مسئلہ: تنفیل یعنی کسی کو اس کے حصے سے زائد دیدینے کا حق باتفاق علماء امیر کو ہے بشرطیکہ دوران قتال میں قتل سے پہلے امیر نے اس کا اظہار کر دیا ہو کیونکہ درحقیقت یہ ترغیب جہاد کی ایک صورت ہے اور امیر ترغیب جہاد پر مامور ہے، اللہ نے فرمادیا حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ اور مسلمانوں کو لڑنے پر برانگیختہ کرو۔

لہٰذا اگر امیر یہ اعلان کر دے، کہ جو شخص کسی مشرک کو قتل کر دے گا تو اس کو دس روپیہ دیئے جائیں گے، یا جو شخص اس قلعہ میں داخل ہو جائے گا اس کو اتنا انعام دیا جائے گا یا فوجی دستہ سے کہہ دے کہ خمس نکالنے کے بعد تم کو (باقی مال کا) آدھا یا چوتھائی حصہ (بطور انعام) دیا جائے گا یا یوں کہے کہ جو کسی عورت کو گرفتار کر لے گا اس کو اسی کی باندی بنا دیا جائے گا، یہ سب صورتیں جائز ہیں۔ حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ بعض فوجی دستوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھیجا کرتے تھے اور عام لشکریوں کے حصہ کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ ان کو بطور انعام کچھ مزید عنایت فرمادیا کرتے تھے۔ متفق علیہ

''جو جس کے ہاتھ آئے'' کا اعلان درست نہیں ہے

یہ بات کہنا اور اس کو اعلان کرنا کہ جس شخص کے ہاتھ جو چیز لگے وہ اس کی ہے ناجائز ہے اس سے اس خمس کا قانون ٹوٹ جائے گا جس کی صراحت اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمادی ہے۔ پھر احادیث میں پیادوں اور سواروں کے حصوں کی جو مقدار آئی ہے اس کا بھی ابطال ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ جن مجاہدین کے ہاتھ میدان جنگ میں کوئی مال

غنیمت نہ آیا ہوگا وہ مال غنیمت کا حصہ پانے سے محروم ہو جائیں گے۔ احناف کی بعض روایات میں آیا ہے کہ اگر امیر مناسب سمجھے تو جتنا مال غنیمت کسی کے ہاتھ آیا وہ سب کا سب اس (جماعت یا فرد) کو دے سکتا ہے، حاکم نے مکحول کی وساطت اور ابوامامہ کی روایت سے حضرت عبادہ بن صامت کا بیان نقل کیا ہے کہ بدر کے دن مقابلہ کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا تھا کہ جس کے ہاتھ جو (مال غنیمت) لگے وہ اسی کا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آیت خمس جو اس کے بعد نازل ہوئی، وہ اس حکم کی ناسخ ہے۔ پس آیت خمس سے یہ حکم منسوخ ہو گیا۔

مسئلہ: انعام ان چہار سہام میں سے دیا جائے گا جو خمس نکالنے کے بعد باقی رہتے ہیں اور دار الاسلام میں جمع ہونے سے پہلے دیا جائے گا۔ لیکن دار الاسلام میں جمع ہونے کے بعد پھر ان چار سہام میں سے انعام نہیں دیا جائے گا بلکہ خمس میں سے دیا جائے گا۔ یہ تفریق امام ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک ہے۔

میں کہتا ہوں اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خمس کے خمس یعنی مال غنیمت کے پچیسویں حصہ میں سے جو خاص طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تھا کسی کو کچھ عنایت کیا تو یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایک موہبت اور بخشش تھی اس سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ مجاہدین کے حصہ کے مال میں سے کسی کو بطور انعام کچھ دینا جائز ہے۔

انعام بقدر مشقت:

دیکھو ترمذی، ابن ماجہ اور ابن حبان نے حضرت عبادہؓ بن صامت کا بیان نقل کیا ہے۔ انه صلى الله عليه وسلم نفل في البدأة الربع و في الرجعة الثلث۔ اس حدیث کا مطلب خطابی نے یہ بیان کیا ہے کہ جب کوئی فوجی دستہ شروع میں کسی جہاد پر جاتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بطور انعام اس کے لئے مال کا چہارم حصہ مقرر فرماتے اور جب سفر سے واپس آ کر بغیر کسی آرام وراحت کے فوراً دوبارہ کسی جہاد پر چلے جاتے تو ان کے لئے ایک تہائی حصہ مقرر فرما دیتے کیونکہ پہلی مرتبہ جہاد کے لئے جانا زیادہ تکلیف دہ اور شاق نہیں ہوتا تھا اس لئے انعامی رقم کم مقرر کی جاتی تھی اور تھک کر سفر سے لوٹنے کے بعد دوبارہ پھر جہاد کے سفر پر جانا بڑا تکلیف دہ ہوتا تھا اس لئے اس کی انعامی رقم بھی زیادہ مقرر کی جاتی تھی۔ ابوداؤد نے حبیب بن سلمہ فہری کی روایت سے بھی یہ حدیث نقل کی ہے۔

مسئلہ: جنگ کے خاتمہ پر اگر امیر لشکر کو کسی کی کوشش دوسروں کی کوشش سے زیادہ معلوم ہوئی تو جائز ہے کہ امیر اس کو اس کے تقسیمی حصہ سے الگ کچھ مزید بھی دے دے خواہ دوران جنگ یا جنگ سے پہلے اگر کوئی انعامی اعلان نہ کیا ہو۔ امام صاحب کے نزدیک صورت مذکورہ میں صرف خمس میں سے انعام دیا جا سکتا ہے۔ لشکر والوں کے حصوں کو کاٹ کر نہیں دیا جا سکتا، ان کے حق کو کم نہیں کیا جا سکتا۔

سوار اور پیادے کا فرق:

ابن مردویہ نے اپنی تفسیر میں عروہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ بنی مصطلق کے کچھ قیدی باندی غلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبضے میں آئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے پانچواں حصہ نکالنے کے بعد باقی مسلمانوں کو بانٹ دیئے۔ سوار کو دوہرا حصہ دیا اور پیادہ کو اکہرا۔ اس حدیث کی سند اس طرح ہے محمد بن محمد سری از منذر بن محمد از محمد پدر منذر از یحییٰ بن محمد بن ہانی از محمد بن اسحاق از محمد بن جعفر بن زبیر از عروہ۔

امام اعظمؒ مندرجہ ذیل اثر کی روشنی میں ایک حصہ گھوڑے کا اور ایک حصہ آدمی کا قرار دیتے تھے۔ زکریا بن حارث نے منذر بن ابی حمصہ ہمدانی کا بیان نقل کیا کہ حضرت عمرؓ کے کسی غلام نے (جو مجاہدین کے کسی دستہ کا سردار تھا) شام کے کسی جہاد میں مال غنیمت کی تقسیم اس طرح کی کہ گھوڑے کا ایک حصہ آدمی کا ایک حصہ دیا، اس کی اپیل حضرت عمرؓ سے کی گئی آپؓ نے یہ تقسیم جاری رکھی۔

لیکن جن آثار واحادیث میں گھوڑے کے دو حصے اور آدمی کا ایک حصہ آیا ہے ان کی تعداد بھی زیادہ ہے اور مذکورہ اثر سے زیادہ وہ قابل اعتماد بھی ہیں اور عموماً جمہور کا معمول مختار بھی یہی ہے۔ رہی یہ بات کہ اس صورت میں گھوڑے کا درجہ آدمی کے برابر یا بڑھ کر ہو جائے گا تو واقعہ ایسا نہیں ہے بلکہ اس میں سامان جہاد کے بیش از بیش فراہم کرنے کی ترغیب ہے کہ ہر شخص زیادہ تیاری کی کوشش کرے اور لوگ جہاد کے لئے گھوڑوں کی پرورش و پرداخت کریں۔ دیکھو گھوڑے کے حصہ سے گھوڑے کو کیا فائدہ پہنچتا ہے۔ اس کا حصہ تو مالک کے پاس چلا جاتا ہے گھوڑے کو کچھ نہیں ملتا۔

ابن جوزی نے اپنی سند سے بروایت سعید بن منصور بوساطت ابن عیاش اوزاعی کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھوڑوں کا حصہ دیا کرتے تھے اور کسی کو دو گھوڑوں سے زائد کا حصہ نہیں دیتے تھے خواہ اس کے ساتھ دس گھوڑے ہوتے۔

خمس نہ نکالنا: حضرت ابن عمرؓ کا بیان ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک لشکر کو مالِ غنیمت میں کچھ طعام اور شہد ملا اس میں سے خمس نہیں نکالا گیا۔ عبید الرحمٰن کے آزاد کردہ غلام قاسم نے بعض صحابیوں کا قول نقل کیا ہے کہ جہاد میں ہم اونٹ کا گوشت کھاتے تھے تقسیم نہیں کرتے تھے یہاں تک کہ جب اپنے پڑاؤ پر آتے تھے تو ہماری خورجیاں گوشت سے بھری ہوتی تھیں۔ یہ تینوں احادیث ابوداؤد نے نقل کی ہیں۔

کھجور کی ایک خشک شاخ تلوار بن گئی:

کھجور کی ایک خشک شاخ تلوار بن گئی، ابن سعدؒ نے زیدؒ بن اسلم اور یزیدؒ بن رومان وغیرہ کی روایت سے لکھا ہے اور بیہقی وابن عسا کر نے بھی یہ واقعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ بدر کی لڑائی میں عکاشہؓ بن محصن کی تلوار لڑتے لڑتے ٹوٹ گئی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایندھن کی ایک لکڑی اٹھا کر دے دی اور فرمایا عکاشہؓ اس سے لڑو۔ جونہی عکاشہؓ نے وہ لکڑی ہاتھ میں لے کر ذرا اس کو حرکت دی وہ لکڑی فوراً ایک لمبی چوڑی سفید تلوار بن گئی۔ عکاشہؓ اسی تلوار سے لڑے یہاں تک کہ مسلمان فتح یاب ہو گئے۔ اس تلوار کا نام عیون تھا۔ عکاشہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب مختلف معرکوں میں اسی سے لڑتے تھے آخر ارتداد کے زمانہ میں طلحہ بن خویلد اسدی (مدعی نبوت) کے ہاتھ سے شہید ہو گئے۔ (تفسیر مظہری)

آیت میں بیان ہے کہ خمس یعنی پانچواں حصہ مال غنیمت میں سے نکال دینا چاہئے چاہے وہ کم ہو یا زیادہ ہو گو سوئی ہو یا تاگا ہی ہو پروردگار عالم فرماتا ہے جو خیانت کرے گا وہ اسے لے کر قیامت کے دن پیش ہوگا اور ہر ایک کو اس کے عمل کا پورا بدلہ ملے گا کسی پر ظلم نہیں کیا جائے گا کہتے ہیں کہ خمس میں سے خدائی حصہ کعبے میں داخل کیا جائے گا حضرت ابوالعالیہ ریاحی کہتے ہیں کہ غنیمت کے مال کے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم پانچ حصے کرتے تھے، چار تو مجاہدین میں تقسیم ہوتے، پانچویں میں سے آپ مٹھی بھر کر نکال لیتے اُسے کعبے میں داخل کر دیتے پھر جو بچا اس کے پانچ حصے کر ڈالتے ایک رسول خدا کا ایک قرابت داروں کا، ایک یتیموں کا، ایک مسکینوں کا، ایک مسافروں کا یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں اللہ کے حصے کا نام صرف بطور تبرک ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حصے کے بیان کا گویا وہ شروع ہے۔

حصوں کی تاکید: ایک صحابیؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے وادی القریٰ میں آکر سوال کیا کہ یا رسول اللہ! غنیمت کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیا ارشاد فرماتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس میں سے پانچواں حصہ تو اللہ کا ہے باقی کے چار حصے لشکریوں کے۔ اس نے پوچھا تو اس میں کسی کو کسی پر زیادہ حق نہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہرگز نہیں یہاں تک کہ تو اپنے کسی دوست کے جسم سے تیر نکالے تو اس تیر کا بھی تو اس سے زیادہ مستحق نہیں۔ حضرت حسنؓ نے اپنے مال کے پانچویں حصے کی وصیت کی اور فرمایا کیا میں اپنے لئے اس حصے پر رضامند نہ ہو جاؤں جو خدا تعالیٰ نے خود اپنا رکھا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

ابودرداءؓ نے عبادہ بن صامت سے کہا فلاں فلاں غزوے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خمس کے بارے میں کیا ارشاد فرمایا تھا؟ آپ نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جہاد میں خمس کے ایک اونٹ کے پیچھے صحابہؓ کو نماز پڑھائی سلام کے بعد کھڑے ہو گئے اور چند بال اپنی چٹکی میں لے کر فرمایا کہ یہ بال اس اونٹ کے جو مال غنیمت میں سے ہے یہ بھی مال غنیمت میں سے ہی ہیں اور میرے نہیں ہیں۔ میرا حصہ تو تمہارے ساتھ صرف پانچواں ہے اور پھر وہ بھی تم ہی کو واپس دیدیا جاتا ہے۔ پس سوئی دھاگے تک ہر چھوٹی بڑی چیز پہنچا دیا کرو،

خیانت نہ کرو: خیانت عار ہے اور خیانت کرنے والے کیلئے دونوں جہان میں آگ ہے، قریب والوں سے دور والوں سے راہِ خدا میں جہاد جاری رکھو، شرعی کاموں میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا خیال تک نہ کرو۔

إِن كُنتُمْ آمَنتُم بِاللَّهِ وَمَا أَنزَلْنَا عَلَىٰ
اگر تم کو یقین ہے اللہ پر اور اُس چیز پر جو ہم نے
عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ
اتاری اپنے بندے پر فیصلہ کے دن

"فیصلہ کے دن" سے مراد "یوم بدر" ہے جس میں حق و باطل کی کشمکش کا کھلا ہوا فیصلہ ہو گیا۔ اس دن حق تعالیٰ نے اپنے کامل ترین بندے پر فتح و نصرت اتاری۔ فرشتوں کی امدادی کمک بھیجی۔ اور سکون و اطمینان کی کیفیت نازل فرمائی۔ تو جو لوگ خدا پر اور اس کی تائید غیبی پر ایمان رکھتے ہیں ان کو غنیمت میں سے خدا کے نام کا پانچواں حصہ نکالنا بھاری نہیں ہو سکتا۔ (تفسیر عثمانی)

خمس دینا ایمان میں داخل ہے:

صحیحین میں ہے کہ وفد عبدالقیس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں تمہیں چار باتوں کا حکم کرتا ہوں اور چار سے منع کرتا ہوں میں تمہیں اللہ پر ایمان لانے کا حکم دیتا ہوں۔ جانتے بھی ہو کہ اللہ پر ایمان

لانا کیا ہے؟ گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور (حضرت) محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور نماز کو پابندی سے ادا کرنا زکوۃ دینا اور غنیمت میں سے خمس ادا کرنا الخ۔ پس خمس کا دینا بھی ایمان میں داخل ہے۔ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب صحیح بخاری شریف میں باب باندھا ہے کہ خمس کا ادا کرنا ایمان میں ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ
جس دن بھڑ گئیں دونوں فوجیں اور اللہ
شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝
ہر چیز پر قادر ہے

جیسے اس دن تم کو مظفر و منصور کیا، وہ قادر ہے کہ آئندہ بھی تم کو غلبہ اور فتوحات عنایت فرمائے۔ (تفسیر عثمانی)

لڑائی والی رات:

ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ لیلۃ القدر کو گیارہویں رات میں ہی یقین کے ساتھ تلاش کرو اس لئے کہ اس کی صبح کو بدر کی لڑائی کا دن تھا۔ حسن ابن علیؓ فرماتے ہیں کہ لیلۃ الفرقان جس دن دونوں جماعتوں میں گھمسان کی لڑائی ہوئی رمضان شریف کی سترہویں تھی یہ رات بھی جمعہ کی رات تھی۔

اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ
جس وقت تم تھے ورلے کنارہ پر اور وہ پر
الْقُصْوٰى
لے کنارہ پر

"ورلے کنارے" سے مراد میدان جنگ کی وہ جانب جو مدینہ طیبہ سے قریب تھی۔ اسی طرح "پرلا کنارہ" وہ ہوگا جو مدینہ سے بعید ہوگا۔

(تفسیر عثمانی)

وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ؕ
اور قافلہ نیچے اتر گیا تھا تم سے

یعنی ابوسفیان کا تجارتی قافلہ نیچے کی طرف ہٹ کر سمندر کے کنارے کنارے جا رہا تھا۔ قافلہ اور مسلمانوں کے درمیان قریش کی فوج حائل ہو چکی تھی۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِى الْمِيْعٰدِ ۙ
اور اگر تم آپس میں وعدہ کرتے تو نہ پہنچتے وعدہ پر ایک ساتھ

یعنی اگر فریقین پہلے سے لڑائی کا کوئی وقت ٹھہرا کر جانا چاہتے تو ممکن تھا اس میں اختلاف ہوتا یا وعدہ کے وقت پہنچنے میں ایک فریق پس و پیش کرتا۔ کیونکہ ادھر مسلمان کفار کی تعداد اور ظاہری ساز و سامان سے خائف تھے، ادھر کفار مسلمانوں کی حقانیت، خدا پرستی اور بے جگری سے مرعوب رہتے تھے۔ دونوں کو جنگ کی ذمہ داری لینے یا شرکت کرنے میں تردد اور تقاعد ہو سکتا تھا۔ (تفسیر عثمانی)

وَلٰكِنْ لِّيَقْضِىَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۙ
لیکن اللہ کو کر ڈالنا تھا ایک کام کو جو مقرر ہو چکا تھا
لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى
تا کہ مرے جس کو مرنا ہے قیام حجت کے بعد اور جیوے
مَنْ حَیَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ؕ
جس کو جینا ہے قیام حجت کے بعد

اللہ کی تدبیر:

یعنی قریش اپنے قافلہ کی مدد کو آئے تھے اور تم قافلہ پر حملہ کرنے کو، قافلہ بچ گیا اور دو فوجیں ایک میدان کے دو کناروں پر آ پڑیں۔ ایک کو دوسرے کی خبر نہیں۔ یہ تدبیر اللہ کی تھی۔ اگر تم قصداً جاتے تو ایسا بروقت نہ پہنچتے۔ اور اس فتح کے بعد کافروں پر صدق پیغمبر کا کھل گیا جو مرا وہ بھی یقین جان کر مرا اور جو جیتا رہا وہ بھی حق پہچان کر۔ اللہ کا الزام پورا ہو۔ کذا فی الموضح۔ اور ممکن ہے مرنے اور جینے سے کفر و ایمان مراد ہوں یعنی اب جو ایمان لائے اور جو کفر پر جما رہے دونوں کا ایمان یا کفر وضوح حق کے بعد ہو۔ (تفسیر عثمانی)

اس لڑائی کا مقصد:

اس آیت کے آخری جملے کی تفسیر سیرۃ ابن اسحاق میں یہ ہے کہ اس لئے کہ کفر کرنے والے دلیل خداد یکھ لیں گو کفر ہی پر رہیں اور ایمان والے بھی دلیل کے ساتھ ایمان لائیں۔ یعنی بغیر آمادگی اور بغیر شرط و قرارداد کے اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں اور مشرکوں کی یہاں اچانک مڈبھیڑ کرا دی کہ حقانیت کو باطل پر غلبہ دے کر حق کو بالکل ظاہر کر دے اس طرح کہ کسی کو

شک شبہ باقی نہ رہے۔ اب جو کفر پر رہے وہ بھی کفر کو کفر سمجھ کر رہے اور جو ایمان والا ہو جائے وہ دلیل دیکھ کر ایماندار بنے، ایمان ہی دلوں کی زندگی ہے اور کفر ہی اصلی ہلاکت ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَ اِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۴۲﴾
اور بیشک اللہ سننے والا جاننے والا ہے

یعنی اللہ کمزور مظلوموں کی فریاد سننے والا ہے اور جانتا ہے کہ کس طریقہ سے ان کی مدد کی جائے، دیکھو بدر میں مسلمانوں کی فریاد کیسی سنی اور کیسی مدد فرمائی۔ (تفسیر عثمانی)

اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا ؕ
جب اللہ نے وہ کافر دکھلائے تجھ کو تیری خواب میں تھوڑے

اللہ کی حمایت پر بھروسہ:

یعنی مسلمانوں کو چاہئے کہ خدا کی مدد اور حمایت پر بھروسہ کر کے جہاد کریں، کفار کی کثرت اور ساز و سامان سے مرعوب نہ ہوں جیسے جنگ بدر میں دیکھ چکے کہ خدا نے مسلمانوں کی کیا خوب امداد و حمایت کی۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ
اور اگر تجھ کو بہت دکھلا دیتا تو تم لوگ نامردی کرتے
فِي الْاَمْرِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ
اور جھگڑا ڈالتے کام میں لیکن اللہ نے بچالیا اُس کو خوب معلوم
بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۴۳﴾
ہے جو بات ہے دلوں میں

اللہ نے بزدلی سے بچالیا:

یعنی انہیں زیادہ سمجھ کر کوئی لڑنے کی ہمت کرتا کوئی نہ کرتا۔ اس طرح اختلاف ہو کر کام میں کھنڈت پڑ جاتی۔ لیکن خدا نے پیغمبر علیہ السلام کو خواب میں تھوڑی تعداد دکھلا کر اس بزدلی اور نزاع باہمی سے تم کو بچالیا وہ خوب جانتا ہے کہ کس چیز سے دلوں میں ہمت و شجاعت پیدا ہوتی اور کس بات سے جبن و نامردی۔ (تفسیر عثمانی)

مولانا رومیؒ نے خوب فرمایا ہے

گر تو خواہی عین غم شادی شود
عین بند پائے آزادی شود

چوں تو خواہی آتش آب خوش شود
در تو خواہی آب ہم آتش شود

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند
با من و تو مردہ با حق زندہ اند

(معارف مفتی صاحبؒ)

وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ
اور جب تم کو دکھلائی وہ فوج مقابلہ کے وقت تمہاری آنکھوں
قَلِيْلًا وَّيُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ
میں تھوڑی اور تم کو تھوڑا دکھلایا اُن کی آنکھوں میں تاکہ کر ڈالے
اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ
اللہ ایک کام جو مقرر ہو چکا تھا اور اللہ تک پہنچتا
الْاُمُوْرُ ﴿۴۴﴾
ہے ہر کام

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب اور اس کی تعبیر:

پیغمبر کو خواب میں کافر تھوڑے نظر آئے اور مسلمانوں کو مقابلہ کے وقت، تاکہ جرأت سے لڑیں۔ پیغمبر کا خواب غلط نہیں۔ ان میں کافر رہنے والے کم ہی تھے، اکثر وہ تھے جو پیچھے مسلمان ہوئے اور خواب کی تعبیر یہ بھی ہوسکتی ہے کہ تھوڑی تعداد سے مقصود ان کی مغلوبیت کا اظہار ہو۔ باقی کفار کی نظر میں جو مسلمان تھوڑے دکھلائی دیئے تو وہ واقعی تھوڑے تھے۔ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب دونوں فوجیں اول آمنے سامنے ہوئیں۔ پھر جب مسلمانوں نے دلیرانہ حملے کئے اور فرشتوں کا لشکر مدد کو پہنچا اس وقت کفار کو مسلمان دگنے نظر آنے لگے کما فی "آل عمران" واخری کافرۃ یرونھم مثلیھم رای العین (آل عمران رکوع ۲) (تفسیر عثمانی)

مسلمانوں کی نظروں میں کافروں کی کمی:

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا دشمنوں کی تعداد ہم کو اتنی کم نظر آتی تھی کہ میں نے اپنے برابر والے آدمی سے کہا کیا تمہارے خیال میں یہ لوگ نوے ہونگے۔ اس نے جواب دیا میرے خیال میں سو ہونگے۔ جب ہم نے ان کا ایک آدمی قید کرلیا (اور جنگ کے بعد) اس سے پوچھا تم کتنے تھے تو اس نے کہا ایک ہزار کافروں کی نظروں میں مسلمانوں کی تعداد کم دکھانے کی وجہ یہ تھی

کہ وہ مسلمانوں کی زیادہ تعداد دیکھ کر بھاگ نہ جائیں۔ابوجہل نے مسلمانوں کی تعداد دیکھ کر کہا تھا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اوران کے ساتھی تو ایک اونٹ کی خوراک ہیں۔ابن المنذ راور ابن ابی حاتم نے بروایت ابن جریج بیان کیا کہ ابو جہل نے یہ بھی کہا تھا ان میں سے کسی کو قتل نہ کرنا بلکہ پکڑ کر رسیوں سے باندھ لینا۔اس پر آیت اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ نازل ہوئی۔

یہ تعداد کی تقلیل کفار کی نظر میں جنگ چھڑنے سے پہلے تھی جب گھمسان کی جنگ ہونے لگی تو اس وقت کافروں کو مسلمانوں کی تعداد اپنی تعداد سے دوگنی نظر آنے لگی۔(تفسیر مظہری)

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِیْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا
اے ایمان والو جب بھڑو کسی فوج سے تو ثابت قدم رہو
وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِیْرًا
اور اللہ کو بہت یاد کرو

ذکر اللہ کی تاثیر:

اس میں نماز، دعا، تکبیر، اور ہر قسم کا ذکر اللہ شامل ہے۔"ذکر اللہ" کی تاثیر یہ ہے کہ ذاکر کا دل مضبوط اور مطمئن ہوتا ہے جس کی جہاد میں سب سے زیادہ ضرورت ہے۔صحابہ رضی اللہ عنہم کا سب سے بڑا ہتھیار یہ ہی تھا۔ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (رعد رکوع ۴)(تفسیر عثمانی)

صحیح احادیث میں یہی آیا ہے۔ اللہ کی یاد کرنے سے مراد ہے فتح کی دعا کرنا تاکہ اللہ کی یاد سے قوت حاصل ہو اور کامیابی کی قوی امید ہو۔اس آخری جملہ میں اس بات کی در پردہ تعلیم کہ مومن بندہ سے اللہ کی مہربانی کسی وقت منقطع نہیں ہوتی۔اس لئے بندہ پر لازم ہے کہ شدائد کے وقت بھی اللہ ہی کی طرف اپنی پوری توجہ رکھے۔اللہ کی یاد سے کسی وجہ سے بھی غافل نہ ہو۔اللہ کی مہربانی پر پورا بھروسہ رکھے اور خلوص دل کے ساتھ اسی کی یاد میں مشغول رہے۔

ہوا کے ذریعہ مدد:

بخاری اور مسلم نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے پروا ہوا کے ذریعہ سے فتح عنایت کی گئی اور عاد کو پچھمی ہوا سے ہلاک کیا گیا۔حضرت نعمان بن مقرن کا بیان ہے، میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب (جہادوں میں) شریک ہوتا رہا ہوں اگر شروع دن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنگ نہ کرتے تھے (لڑنا مناسب نہیں سمجھتے تھے) تو پھر سورج ڈھلنے کا اور (نرم) ہوائیں چلنے اور (اللہ کی طرف سے) نصرت نازل ہونے کا انتظار کرتے تھے۔ رواہ ابن ابی شیبہ۔(تفسیر مظہری)

اگر مقابلہ ہو تو ثابت قدمی دکھاؤ:

عبد الرزاق کی روایت میں ہے کہ دشمن کے مقابلے کی تمنا نہ کرو اور مقابلے کے وقت ثابت قدمی اور اولوالعزمی دکھاؤ گو وہ چیخیں چلائیں لیکن تم خاموش رہا کرو۔طبرانی میں ہے تین وقتوں میں اللہ تعالیٰ کو خاموشی پسند ہے تلاوت قرآن کے وقت، جہاد کے وقت اور جنازے کے وقت۔اور حدیث میں ہے میرا کامل بندہ وہ ہے جو دشمن کے مقابلے کے وقت بھی میرا ذکر کرتا رہے۔یعنی اس حال میں بھی میرے ذکر کو، مجھ سے دعا کرنے کو اور مجھ سے فریاد کرنے کو ترک نہ کرے۔

لڑائی کے وقت اللہ کا ذکر:

حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں پوری مشغولی کے وقت یعنی جب تلوار چلتی ہو تب بھی اللہ تعالیٰ نے اپنا ذکر فرض رکھا ہے۔حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ چپ رہنا اور ذکر اللہ کرنا لڑائی کے وقت بھی واجب ہے، پھر آپ نے یہی آیت تلاوت فرمائی، ابن جریج نے آپ سے دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ کی یاد بلند آواز سے کریں؟ آپ نے فرمایا ہاں۔(تفسیر ابن کثیر)

ذکر کا اثر: میدانِ جنگ میں ذکر اللہ کی کثرت کا حکم اگرچہ بظاہر مجاہدین کے لئے ایک کام کا اضافہ نظر آتا ہے جو عادۃً مشقت ومحنت کو چاہتا ہے۔ لیکن ذکر اللہ کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ وہ محنت نہیں لیتا بلکہ ایک فرحت و قوت اور لذت بخشتا ہے اور انسان کے کام میں اور معین و مددگار بنتا ہے۔ یوں بھی محنت ومشقت کا کام کرنے والوں کی عادت ہوتی ہے کہ کوئی کلمہ یا گیت گنگنایا کرتے ہیں۔قرآن کریم نے مسلمانوں کو اس کا نعم البدل دے دیا جو ہزاروں فوائد اور حکمتوں پر مبنی ہے۔ اسی لئے آخر آیت میں فرمایا، لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ یعنی اگر تم نے ثبات اور ذکر اللہ کے دوگر یاد رکھ لئے اور ان کو میدانِ جنگ میں استعمال کیا تو فلاح و کامیابی تمہاری ہے۔

میدانِ جنگ کا ذکر ایک تو وہ ہے جو عام طور پر نعرۂ تکبیر کے انداز میں کیا جاتا ہے اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ پر نظر اور اعتماد و توکل اور دل سے اس کی یاد لفظ ذکر اللہ ان سب کو شامل ہے۔(معارف مفتی اعظم)

لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ
تاکہ تم مراد پاؤ اور حکم مانو اللہ کا اور اس کے رسول کا

وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ

اور آپس میں نہ جھگڑو پس نامرد ہو جاؤ گے اور جاتی رہے گی تمہاری ہوا

تفرقہ بازی کا نقصان:

یعنی ہوا خیزی ہو کر اقبال و رعب کم ہو جائے گا۔ بدر عمٰی کے بعد فتح وظفر کیسے حاصل کر سکو گے۔ (تفسیر عثمانی)

وَاصْبِرُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿٤٦﴾

اور صبر کرو بیشک اللہ ساتھ ہے صبر والوں کے

کامیابی کی کنجی:

جو سختیاں اور شدائد جہاد کے وقت پیش آئیں ان کو صبر و استقامت سے برداشت کرو، ہمت نہ ہارو، مثل ہے کہ ہمت کا حامی خدا ہے۔ اس آیت میں مسلمانوں کو بتلا دیا گیا کہ کامیابی کی کنجی کیا ہے؟ معلوم ہوا کہ دولت، لشکر اور میگزین وغیرہ سے فتح و نصرت حاصل نہیں ہوتی۔ ثابت قدمی، صبر و استقلال، قوت وطمانیت قلب، یاد الٰہی، خدا اور رسول اور ان کے قائم مقام سرداروں کی اطاعت وفرمانبرداری اور باہمی اتفاق واتحاد سے حاصل ہوتی ہے۔ اس موقع پر بے ساختہ جی چاہتا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے متعلق "ابن کثیر" کے چند الفاظ نقل کر دوں جو اخلاص وایمان کی انتہائی گہرائی سے نکلے ہوئے ہیں۔

"و قد كان للصحابة رضى الله عنهم فى باب الشجاعة والائتمار بما امرهم الله و رسوله به و امتثال ما ارشدهم اليه ما لم يكن لاحد من الامم و القرون قبلهم ولا يكون لاحد ممن بعدهم فانهم ببركة الرسول صلى الله عليه وسلم و طاعته فيما امرهم فتحوا القلوب والاقاليم شرقاً و غرباً فى المدة اليسيرة مع قلة عددهم بالنسبة الىٰ جيوش سائر الاقاليم من الروم و الفرس و الترك والصقالبة و البربر و الجيوش و اصناف السودان و القبط و طوائف بنى آدم قهروا الجميع حتىٰ علت كلمة الله و ظهر دينه علىٰ سائر الاديان وامتدت الممالك الاسلاميه فى مشارق الارض و مغاربها فى اقل من ثلاثين سنة فرضى الله عنهم و ارضاهم اجمعين وحشرنا فى زمرتهم انه كريم تواب". (تفسیر عثمانی)

بخاری نے صحیح میں عمروؓ بن عبد اللہ کے آزاد کردہ غلام ابو النصر سالم کی روایت سے بیان کیا ہے، سالم عمرو بن عبد اللہ کے کاتب بھی تھے کہ عبد اللہ بن ابی اوفی نے ایک خط لکھا جو میں نے پڑھا تھا۔ خط میں یہ لکھا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی جہاد میں جبکہ دشمن کے مقابلہ پر تھے منتظر رہے یہاں تک کہ سورج ڈھل گیا۔ زوال کے بعد (خطبہ دینے) کھڑے ہوئے اور فرمایا لوگو! دشمن سے مقابلہ کی تمنا مت کرو اور اللہ سے عافیت (بچاؤ) کی دعاء کرو لیکن جب مقابلہ ہو ہی جائے تو پھر ثابت قدم رہو اور یقین رکھو کہ جنت تلواروں کے سایہ کے نیچے ہے۔ پھر دعاء کی اے اللہ اے کتاب نازل کرنے والے بادلوں کو چلانے والے اور (کافروں کے) گروہوں کو شکست دینے والے ان کو شکست دے دے اور ہم کو ان پر فتح عنایت کر۔ (تفسیر مظہری)

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِم

اور نہ ہو جاؤ اُن جیسے جو کہ نکلے اپنے گھروں سے

بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَن

اتراتے ہوئے اور لوگوں کے دکھانے کو اور روکتے تھے

سَبِيلِ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ﴿٤٧﴾

اللہ کی راہ سے اور اللہ کے قابو میں ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں

کافروں کا غرور اور انجام:

ابو جہل لشکر لے کر بڑی دھوم دھام اور باجے گاجے کے ساتھ نکلا تھا تا کہ مسلمان مرعوب ہو جائیں اور دوسرے قبائل عرب پر مشرکین کی دھاک بیٹھ جائے۔ راستہ میں اس کو ابو سفیان کا پیام پہنچا کہ قافلہ سخت خطرے سے بچ نکلا ہے۔ اب تم مکہ کو لوٹ جاؤ۔ ابو جہل نے نہایت غرور سے کہا کہ ہم اس وقت واپس جا سکتے ہیں جبکہ بدر کے چشمہ پر پہنچ کر مجلس طرب و نشاط منعقد کر لیں۔ گانے والی عورتیں خوشی اور کامیابی کے گیت گائیں، شرابیں پئیں، مزے اڑائیں اور تین روز تک اونٹ ذبح کر کے قبائل عرب کی ضیافت کا انتظام کریں۔ تا کہ یہ دن عرب میں ہمیشہ کے لئے ہماری یادگار رہے۔ اور آئندہ کے لئے ان مٹھی بھر مسلمانوں کے حوصلے پست ہو جائیں کہ پھر کبھی ہمارے مقابلہ کی جرأت نہ کریں، اسے کیا خبر تھی

کہ جو منصوبے باندھ رہے ہیں اور تجویزیں سوچ رہے ہیں وہ سب خدا کے قابو میں ہیں، چلنے دے یا نہ چلنے دے۔ بلکہ چاہے تو انہی پر الٹ دے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ بدر کے پانی اور جام شراب کی جگہ انہیں موت کا پیالہ پینا پڑا۔ محفل سرور ونشاط تو منعقد نہ کرسکے ہاں نوحہ وماتم کی صفیں ''بدر'' سے ''مکہ'' تک بچھ گئیں جو مال تفاخر ونمائش میں خرچ کرنا چاہتے تھے وہ مسلمانوں کے لئے لقمۂ غنیمت بنا۔

فتح بدر کی اہمیت: ایمان وتوحید کے دائمی غلبہ کا بنیادی پتھر بدر کے میدان میں نصب ہوگیا۔ گویا ایک طرح اس چھوٹے سے قطعۂ زمین میں خدا تعالیٰ نے روئے زمین کی ملل واقوام کی قسمتوں کا فیصلہ فرمادیا۔ بہر حال اس آیت میں مسلمانوں کو آگاہ فرمایا ہے کہ جہاد محض ہنگامۂ کشت و خون کا نام نہیں، بلکہ عظیم الشان عبادت ہے۔ عبادت پر اتراوے یا دکھانے کو کرے تو قبول نہیں۔ لہٰذا تم فخر وغرور اور نمود ونمائش میں کفار کی چال مت چلو۔ (تفسیر عثمانی)

ابوجہل کا تکبر:

ابوجہل سے جب کہا گیا کہ قافلہ تو بچ گیا اب لوٹ کر واپس چلنا چاہئے تو اس ملعون نے جواب دیا کہ واہ کس کا لوٹنا، بدر کے پانی پر جا کر پڑاؤ کریں گے وہاں شرابیں اڑائیں گے کباب کھائیں گے گانا سنیں گے، تا کہ لوگوں میں شہرت ہوجائے۔ اللہ کی شان کے قربان جایئے ان کے ارمان قدرت نے پلٹ دئے یہیں ان کی لاشیں گریں اور یہیں کے گڑھوں میں ذلت کے ساتھ ٹھونس دیئے گئے۔

شیطان کی کارروائی:

ابلیس سراقہ بن مالک بن جعشم مدلجی کی صورت میں مشرکوں میں تھا۔ ان کے دل بڑھا رہا تھا اور ان میں پیش گوئیاں کر رہا تھا کہ بے فکر رہو آج تمہیں کوئی بھی ہرا نہیں سکتا۔ لیکن فرشتوں کے لشکر دیکھتے ہی اس نے تو منہ موڑا اور یہ کہتا ہوا بھاگا کہ میں تم سے بری ہوں میں انہیں دیکھ رہا ہوں جو تمہاری نگاہ میں نہیں آتے۔ حارث بن ہشام چونکہ اسے سراقہ ہی سمجھے ہوئے تھا اس لئے اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے اس کے سینے میں اس زور سے گھونسہ مارا کہ یہ تو منہ کے بل گر پڑا اور شیطان بھاگ گیا۔ سمندر میں کود پڑا اور اپنا کپڑا اونچا کر کے کہنے لگا خدایا میں تجھے تیرا وہ وعدہ یاد دلاتا ہوں جو تو نے مجھ سے کیا ہے۔ طبرانی میں حضرت رفاعہ بن رافع سے بھی اسی کے قریب قریب مروی ہے۔

حضرت ابواسید مالک بن ربیعہ ص فرماتے ہیں اگر میری آنکھیں آج بھی ہوتیں تو میں تمہیں بدر کے میدان میں وہ گھاٹی دکھا دیتا جہاں سے فرشتے آتے تھے۔ بے شک وشبہ مجھے وہ معلوم ہے انہیں ابلیس نے دیکھ لیا اور خدا نے انہیں حکم دیا کہ مؤمنوں کو ثابت قدم رکھو۔ یہ لوگوں کے پاس ان کے جان پہچان کے آدمیوں کی شکل میں آتے اور کہتے خوش ہوجاؤ یہ کافر بھی کوئی چیز ہیں اللہ کی مدد تمہارے ساتھ ہے۔ بے خوفی کے ساتھ شیر کا سا حملہ کردو۔ ابلیس یہ دیکھ کر بھاگ کھڑا ہوا اب تک وہ سراقہ کی شکل میں کفار میں موجود تھا۔

ابلیس کے بھاگنے پر ابوجہل کی تسلیاں:

ابوجہل نے یہ حال دیکھ کر اپنے لشکروں میں گشت شروع کیا کہہ رہا تھا کہ گھبراؤ نہیں، اس کے بھاگ کھڑا ہونے سے دل تنگ نہ ہو جاؤ۔ یہ تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے سیکھا پڑھا آیا تھا کہ تمہیں عین موقعہ پر بزدل کردے، کوئی گھبرانے کی بات نہیں۔ لات وعزیٰ کی قسم آج ان مسلمانوں کو ان کے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) سمیت گرفتار کرلیں گے نامردی نہ کرو دل بڑھاؤ اور سخت حملہ کرو دیکھو خبردار انہیں قتل نہ کرنا زندہ پکڑنا تا کہ انہیں دل کھول کر سزا دیں۔ یہ بھی اپنے زمانے کا فرعون ہی تھا، اس نے بھی جادوگروں کے ایمان لانے پر کہا تھا کہ یہ تو صرف تمہارا ایک مکر ہے کہ یہاں سے تم ہمیں نکال دو۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ جادوگرو! یہ موسیٰ تمہارا استاد ہے، حالانکہ یہ محض اس کا فریب تھا۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ

اور جس وقت خوشنما کر دیا شیطان نے اُن کی نظروں میں اُنکے عملوں کو،

وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ

اور بولا کہ کوئی بھی غالب نہ ہوگا تم پر آج کے دن لوگوں میں سے

وَاِنِّیْ جَارٌ لَّكُمْ ۚ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ

اور میں تمہارا حمایتی ہوں پھر جب سامنے ہوئیں

نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَقَالَ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ

دونوں فوجیں تو وہ اُلٹا پھرا اپنی ایڑیوں پر اور بولا میں تمہارے

مِّنْكُمْ اِنِّیْٓ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّیْٓ

ساتھ نہیں ہوں میں دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے میں

اَخَافُ اللّٰہَ ۚ وَاللّٰہُ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ ﴿۴۸﴾

ڈرتا ہوں اللہ سے اور اللہ کا عذاب سخت ہے

شیطان کا کافروں کی ہمت بڑھانا اور بھاگ جانا:

قریش اپنی قوت وجمعیت پر مغرور تھے لیکن بنی کنانہ سے ان کی چھیڑ چھاڑ رہتی تھی۔ خطرہ یہ ہوا کہ کہیں بنی کنانہ کامیابی کے راستہ میں آڑے نہ آجائیں۔ فوراً شیطان ان کی پیٹھ ٹھونکنے اور ہمت بڑھانے کے لئے کنانہ کے سردار اعظم سراقہ بن مالک کی صورت میں اپنی ذریت کی فوج لے کر نمودار ہوا اور ابوجہل وغیرہ کو اطمینان دلایا کہ ہم سب تمہاری مدد وحمایت پر ہیں۔ بنی کنانہ کی طرف سے بے فکر رہو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ جب بدر میں زور کا رن پڑا اور شیطان کو جبریلؑ وغیرہ فرشتے نظر آئے تو ابوجہل کے ہاتھ میں سے ہاتھ چھڑا کر الٹے پاؤں بھاگا۔ ابوجہل نے کہا، سراقہ! عین وقت پر دغا دے کر کہاں جاتے ہو، کہنے لگا میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ مجھے وہ چیزیں دکھائی دے رہی ہیں، جو تم کو نظر نہیں آتیں (یعنی فرشتے) خدا کے (اس خدائی فوج کے) ڈر سے میرا دل بیٹھا جاتا ہے۔ اب ٹھہرنے کی ہمت نہیں۔ کہیں کسی سخت عذاب اور آفت میں نہ پکڑا جاؤں۔ قتادہ کہتے ہیں کہ ملعون نے جھوٹ بولا، اس کے دل میں خدا کا ڈر نہ تھا۔ ہاں وہ جانتا تھا کہ اب قریش کا لشکر ہلاکت میں گھر چکا ہے کوئی قوت بچا نہیں سکتی۔ یہ اس کی قدیم عادت ہے کہ اپنے متبعین کو دھوکہ دے کر اور ہلاکت میں پھنسا کر عین وقت پر کھسک جایا کرتا ہے۔ اسی کے موافق یہاں بھی کیا یعدھم و یملیھم و ما یعدھم الشیطان الاغروراً (نساء، رکوع۱)

كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ ۚ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ (الحشر رکوع۲) وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ۭ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ۭ اِنِّىْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ۭ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (ابراھیم۔ رکوع۴) (تفسیر عثمانی)

یعنی جب مسلمانوں اور کافروں کے دونوں گروہ آمنے سامنے ہوئے اور شیطان نے ملائکہ کو آسمان سے اترتے ہوئے دیکھا اور سمجھ گیا کہ ان سے مقابلہ کرنے کی مجھ میں طاقت نہیں تو منہ پھیر کر پشت موڑ کر بھاگا۔

طبرانی نے حضرت رفاعہؓ بن رافع کی روایت سے اور ابن جریر و ابن المنذر و ابن مردویہ نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ اللہ نے ایک ہزار فرشتے بھیج کر اپنے پیغمبر (علیہ الصلوۃ و السلام) اور مسلمانوں کو مدد پہنچائی۔ حضرت جبرئیلؑ پانچ سو فرشتوں کے ساتھ ایک طرف اور حضرت میکائیلؑ پانچ سو فرشتوں کے ساتھ دوسری جانب تھے۔ ابلیس بھی شیطانوں کا لشکر اور اپنا جھنڈا لئے آ گیا۔ شیطانی لشکر والے بنی مدلج کے مردوں کے بھیس میں تھے اور خود ابلیس سراقہ بن مالک بن جعشم کی شکل میں۔ اس وقت شیطان نے مشرکوں سے کہا لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ لیکن جونہی جبرئیلؑ ابلیس کی طرف بڑھے اور ابلیس نے ان کو دیکھا اس وقت ابلیس کا ہاتھ کسی مشرک کے ہاتھ میں تھا فوراً ہاتھ چھڑا کر پشت پھیر کر بھاگا اور اس کے چیلے بھی اسی کے ساتھ چل دیئے۔ ایک شخص نے کہا سراقہ تو نے تو کہا تھا اِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ (اب بھاگا جا رہا ہے) کہنے لگا اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّيْٓ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ الخ۔ ابلیس کا یہ فرار ملائکہ کو دیکھنے کے بعد ہوا تھا۔ حارث بن ہشام نے جب ابلیس کا کلام سنا اور حارث اس کو سراقہ ہی سمجھے ہوئے تھے (سراقہ بدر کے بعد مسلمان ہو گئے تھے) تو اس کا دامن پکڑ لیا مگر شیطان نے حارث کے سینے پر ضرب کاری رسید کی۔ حارث گر پڑے اور شیطان بھاگ نکلا۔ کسی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ آخر جا کر سمندر میں گر پڑا۔

شیطان کی دُعاء:

اور دونوں ہاتھ اٹھا کر کہنے لگا، اے میرے رب! اپنا وہ وعدہ پورا کر جو تو نے مجھ سے کیا تھا۔ اے اللہ! میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں اس مہلت کی جو تو نے مجھے (قیامت تک کے لئے) دی تھی۔

اس دعا کرنے کی وجہ یہ تھی کہ ابلیس کو اپنے مارے جانے کا اندیشہ ہو گیا تھا (اس کو ڈر ہو گیا تھا کہ جبرئیلؑ مجھے مار ڈالیں گے)

ابوجہل کا اعلان:

ابوجہل کہنے لگا لوگو! سراقہ نے تمہاری مدد نہ کی تم اس کو کوئی اہمیت نہ دو، اس کی تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سازش ہو ہی گئی تھی۔ عتبہ اور شیبہ کے مارے جانے کا بھی زیادہ خیال نہ کرو، انہوں نے جلدی کی تھی (اس لئے مارے گئے) قسم ہے لات وعزیٰ کی ہم جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے ساتھیوں کو رسیوں سے باندھ نہ لیں گے لوٹ کر نہ جائیں گے۔ تم میں سے کوئی آدمی مجھے ایسا نہ ملنا چاہئے جس نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کسی

آدمی کو قتل کیا ہو، ان کو پکڑ لو تا کہ ہم ان کو ان کے برے کرتوت بتا سکیں۔

شیطان کا ذلیل ہونا:

حضرت طلحہؓ بن عبید اللہ بن کریز کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شیطان جب عرفہ کے دن (حج کے دن) اللہ کی رحمت نازل ہوتے دیکھتا ہے اور یہ بھی دیکھتا ہے کہ اللہ (بندوں) کے بڑے بڑے گناہوں سے (بھی) درگزر فرما رہا ہے تو یہ حالت دیکھ کر وہ اتنا ذلیل حقیر بے عزت اور غضب ناک نظر آتا ہے کہ سوائے یوم بدر کے کبھی اتنا ذلیل نہیں دیکھا گیا۔ عرض کیا گیا (یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) شیطان نے بدر کے دن کیا بات دیکھی تھی (کہ وہ اپنے کو حقیر ترین ذلیل ترین اور بے عزت دیکھنے لگا تھا) فرمایا، اس نے جبرئیلؑ کو دیکھا کہ وہ ملائکہ کو ڈیوٹیوں کی تقسیم کر رہے تھے (یہ دیکھ کر اس کو اپنی ساری مکاری ہیچ نظر آنے لگی اور ذلیل ہو کر بھاگا) رواہ مالک مرسلاً والبغوی فی شرح السنۃ المصابیح والمعالم۔ (تفسیر مظہری)

شیطان کا خوف: شیطان نے فرشتوں کا لشکر دیکھا تو ان کی قوت سے وہ واقف تھا سمجھ گیا کہ اب اپنی خیر نہیں اور یہ جو کہا کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں، امام تفسیر قتادہ نے کہا کہ یہ اس نے جھوٹ بولا اگر وہ خدا سے ڈرا کرتا تو نافرمانی کیوں کرتا۔ مگر اکثر حضرات نے فرمایا کہ ڈرنا بھی اپنی جگہ صحیح ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور عذاب شدید کو پوری طرح جانتا ہے اس لئے نہ ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں البتہ نرا خوف بغیر ایمان و اطاعت کے کوئی فائدہ نہیں رکھتا۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

إِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي
جب کہنے لگے منافق اور جن کے
قُلُوبِهِم مَّرَضٌ غَرَّ هَٰؤُلَاءِ دِينُهُمْ ۗ
دلوں میں بیماری ہے یہ لوگ مغرور ہیں اپنے دین پر
وَمَن يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ
اور جو کوئی بھروسہ کرے اللہ پر تو اللہ زبردست ہے
حَكِيمٌ ﴿٤٩﴾
حکمت والا

منافقوں کی چہ میگوئیاں:

مسلمانوں کی تھوڑی جمعیت اور بے سروسامان اور اس پر ایسی دلیری و شجاعت کو دیکھتے ہوئے منافقین اور ضعیف القلب کلمہ گو کہنے لگے تھے کہ یہ مسلمان اپنے دین اور حقانیت کے خیال پر مغرور ہیں جو اس طرح اپنے کو موت کے منہ میں ڈال دیتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے اس کا جواب دیا کہ یہ غرور نہیں، توکل ہے۔ جس کو خدا کی زبردست قدرت پر اعتماد ہو اور یقین رکھے کہ جو کچھ ادھر سے ہوگا عین حکمت وصواب ہوگا، وہ حق کے معاملہ میں ایسا ہی بے جگر اور دلیر ہو جاتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ يَتَوَفَّى الَّذِينَ كَفَرُوا ۙ الْمَلَائِكَةُ
اور اگر تو دیکھے جس وقت جان قبض کرتے ہیں کافروں کی فرشتے
يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَارَهُمْ وَذُوقُوا
مارتے ہیں اُن کے منہ پر اور اُن کے پیچھے اور کہتے ہیں چکھو
عَذَابَ الْحَرِيقِ ﴿٥٠﴾
عذاب جلنے کا

کافروں کیلئے ذلت کی موت:

یعنی مار کر کہتے ہیں کہ ابھی تو یہ لو، اور عذاب جہنم کا مزہ آئندہ چکھنا۔ بہت سے مفسرین نے اس کو بھی بدر کے واقعہ میں داخل کیا ہے یعنی اس وقت جو کافر مارے جاتے تھے ان کے ساتھ فرشتوں کا یہ معاملہ تھا۔ مگر الفاظ آیت کے سب کافروں کو عام ہیں اس لئے راجح یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ عالم برزخ کا ہو۔ اب بدر کے واقعات سے متعلق یہ ہوگا کہ دنیا میں ان کافروں کی یہ گت بنی۔ برزخ میں یہ ہوگا اور آخرت کے عذاب کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

اس آیت میں حق تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ فرشتے کافر کی روح نکالتے وقت اس کے منہ پر اور اس کی دبر پر یعنی اس کی سرین پر آگ کے گرز مارتے ہیں جس سے معلوم ہوا کہ کافر کا منہ اور اس کی دبر دونوں ایک ہی حکم میں ہیں اس لئے کہ عطف کیلئے معطوف اور معطوف علیہ میں مناسبت ضروری ہے اور یہاں مناسبت یہ ہے کہ جس طرح دبر سے حسی اور ظاہری نجاست خارج ہوتی ہے اسی طرح کافروں کے منہ سے کلمات کفریہ نکلتے ہیں جو نجاست معنویہ ہیں اسی وجہ مشرکین کو نجس اور رجس کہا گیا ہے۔ کما قال تعالیٰ إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ بلکہ زبان سے جو کلمہ معصیت کا نکلتا ہے وہ نجاست کا حکم رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے فقہاء کرام نے

جھوٹ بولنے اور غیبت کرنے کے بعد وضوء کو مستحب لکھا ہے۔ دیکھو فتح القدیر شرح ھدایہ۔ (معارف القرآن کاندھلوی)

بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ ملائکہ لوہے کے گرزوں سے مار رہے تھے اور گرز کی ضرب سے زخموں میں آگ سی لگ جاتی تھی۔ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ کا یہی مطلب ہے۔

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ
یہ بدلا ہے اُسی کا جو تم نے آگے بھیجا اپنے ہاتھوں اور اس واسطے
بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۵۱﴾
کہ اللہ ظلم نہیں کرتا بندوں پر

یہ ذلت ان کے کرتوتوں کا نتیجہ ہے:

یعنی یہ سب تمہاری کرتوت کی سزا ہے ورنہ خدا کے یہاں ظلم کی کوئی صورت ہی نہیں۔ اگر معاذ اللہ ادھر سے رتی برابر ظلم کا امکان ہوتو پھر وہ اپنی عظمت شان کے لحاظ سے ظالم نہیں ظلام ہی ٹھہرے کیونکہ کامل کی ہر صفت کامل ہی ہونی چاہئے۔

چنانچہ صحیح مسلم شریف کی حدیث قدسی میں ہے کہ میرے بندو! میں نے اپنے اوپر ظلم حرام کر دیا ہے اور تم پر بھی حرام کر دیا ہے پس آپس میں کوئی کسی پر ظلم وستم نہ کرے۔ میرے بندو! میں تو صرف تمہارے کئے ہوئے اعمال ہی کو گھیرے ہوئے ہوں۔ بھلائی پاکر میری تعریفیں کرو اور اس کے سوا کچھ اور دیکھو تو اپنے تئیں ہی ملامت کرو۔ (تفسیر ابن کثیر)

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ
جیسے دستور فرعون والوں کا اور جو ان سے پہلے تھے کہ
كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ
منکر ہوئے اللہ کی باتوں سے سو پکڑا اُن کو اللہ نے اُن کے گناہوں پر
اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۵۲﴾
بیشک اللہ زور آور ہے سخت عذاب کرنیوالا

قدیم دستور: یعنی قدیم سے یہ ہی دستور رہا ہے کہ جب لوگ آیات اللہ کی تکذیب وانکار یا انبیاء سے جنگ کرنے پر مصر ہوئے تو اللہ نے ان کو کسی نہ کسی عذاب میں پکڑ لیا۔ (تفسیر عثمانی)

صحیح بخاری میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی قانونی حدود توڑنے والے گناہ گار ہیں اور جو لوگ ان کو دیکھ کر مداہنت کرنے والے ہیں، یعنی باوجود قدرت کے ان کو گناہ سے نہیں روکتے ان دونوں طبقوں کی مثال ایسی ہے جیسے کسی بحری جہاز کے دو طبقے ہوں اور نیچے کے طبقہ والے اوپر آ کر اپنی ضرورت کے لئے پانی لیتے ہوں جس سے اوپر والے تکلیف محسوس کریں۔ نیچے والے یہ دیکھ یہ صورت اختیار کریں کہ کشتی کے نچلے حصہ میں سوراخ کر کے اس سے اپنے لئے پانی حاصل کریں اور اوپر کے لوگ ان کی اس حرکت کو دیکھیں اور منع نہ کریں تو ظاہر ہے کہ پانی پوری کشتی میں بھر جائے گا اور جب نیچے والے غرق ہوں گے تو اوپر والے بھی ڈوبنے سے نہ بچیں گے۔

امام بغویؒ نے شرح السنہ اور معالم میں بروایت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ وصدیقہ عائشہؓ یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کسی خاص جماعت کے گناہ کا عذاب عام لوگوں پر نہیں ڈالتے جب تک کہ ایسی صورت پیدا نہ ہو جائے کہ وہ اپنے ماحول میں گناہ ہوتا ہوا دیکھیں اور ان کو یہ قدرت بھی ہو کہ اس کو روک سکیں اس کے باوجود انہوں نے اس کو روکا نہیں تو اس وقت اللہ تعالیٰ کا عذاب ان سب کو گھیر لیتا ہے۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً
اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ ہرگز بدلنے والا نہیں اس نعمت کو
اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا
جو دی تھی اُس نے کسی قوم کو جب تک وہی نہ بدل ڈالیں اپنے
بِاَنْفُسِهِمْ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۳﴾
جیوں کی بات، اور یہ کہ اللہ سننے والا جاننے والا ہے

نعمتیں کب چھینی جاتی ہیں:

یعنی جب لوگ اپنی اعتدالی اور غلط کاری سے نیکی کے فطری قویٰ اور استعداد کو بدل ڈالتے ہیں اور خدا کی بخشی ہوئی داخلی یا خارجی نعمتوں کو اس کے بتائے ہوئے کام میں ٹھیک موقع پر خرچ نہیں کرتے بلکہ الٹے اس کی

مخالفت میں صرف کرنے لگتے ہیں تو حق تعالیٰ اپنی نعمتیں ان سے چھین لیتا ہے اور شان انعام کو انتقام سے بدل دیتا ہے۔ وہ بندوں کی تمام باتوں کو سنتا اور تمام احوال کو جانتا ہے کوئی چیز اس سے پردہ میں نہیں۔ لہٰذا جس سے جو معاملہ کریگا نہایت ٹھیک اور برمحل ہوگا۔ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ نیت اور اعتقاد جب تک نہ بدلے تو اللہ کی بخشی ہوئی نعمت چھینی نہیں جاتی''۔ گویا '' مَا بِاَنۡفُسِهِمۡ '' سے خاص نیت اور اعتقاد مراد لیا ہے جیسا کہ ترجمہ سے ظاہر ہو رہا ہے۔ واللہ اعلم۔

ذٰلک یعنی یہ عذاب جوان پر نازل ہوا (یہ ظلم نہیں ہے بلکہ) بان اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ جو نعمت کسی قوم کو عطا فرماتا ہے اس کو دکھ اور عذاب سے اس وقت تک نہیں بدلا کرتا جب تک وہ اپنی اچھی حالت کو بری حالت سے خود تبدیل نہ کرلیں (اور مستحق عذاب نہ ہو جائیں) مثلاً اہل مکہ کو اللہ نے رزق، عزت اور امن سے سرفراز کیا اور اصحاب فیل کے لشکر کو تباہ کیا تو اللہ نے بدر کے دن قید وقتل کی مصیبت میں اس وقت تک ان کو گرفتار نہیں کیا جب تک کہ انھوں نے دین اسمٰعیل، ملت ابراہیم، اقرباء سے حسن سلوک، کعبہ کی خدمت، مہمان نوازی اور حاجیوں کو پانی پلانے اور دوسرے اچھے کاموں کو چھوڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کی دشمنی نہ اختیار کرلی اور مسجد حرام سے ان کو روک دیا اور قربانی کے جانوروں کی حرم میں داخلہ ممانعت نہ کردی اور اہل توحید کا خون بہانے کے درپے نہیں ہوگئے اور آیات کی تکذیب اور استہزاء قرآن کو اختیار نہ کرلیا۔

قریشیوں کے حالات کی تبدیلی:

اور تفسیر مظہری میں معتمد کتب تاریخ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ کلاب بن مرہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب میں تیسرے دادا کے دادا ہیں یہ ابتداء سے دین ابراہیم و اسماعیل علیہ السلام کے پابند اور اس پر قائم تھے اور نسلاً بعد نسل اس دین کی قیادت وسیادت ان کے ہاتھ میں رہی۔ قصی بن کلاب کے زمانہ میں ان لوگوں میں بت پرستی کا آغاز ہوا۔ ان سے پہلے کعب بن لوی ان کے دینی قائد تھے جمعہ کے روز جس کو ان کی زبان میں عروبہ کہا جاتا تھا سب لوگوں کو جمع کر کے خطبہ دیا کرتے اور بتلایا کرتے تھے ان کی اولاد میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوں گے۔ ان کا اتباع سب پر لازم ہوگا۔ جو ان پر ایمان نہ لائے گا اس کا کوئی عمل قابل قبول نہ ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں ان کے عربی اشعار شعراء جاہلیت میں مشہور ومعروف ہیں۔ اور قصی بن کلاب تمام حجاج کے لئے کھانے اور پانی کا انتظام کرتے تھے۔ یہاں تک کہ یہ چیزیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان میں آپ کے عہد مبارک تک قائم رہیں۔ اس تاریخی تشریح سے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ قریش کی تبدیلی حالات سے یہ مراد ہو کہ دین ابراہیمی کو چھوڑ کر بت پرستی اختیار کرلی۔ (معارف مفتی اعظم)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جدامجد ''قصی'' کے کارنامے:

اہل تاریخ نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا (عبدالمطلب بن ہاشم) کے دادا کا نام عبد مناف تھا اور عبد مناف (بن قصی) کے دادا کا نام کلاب (بن مرہ بن کعب بن لوی) تھا کلاب سے پہلے اس کے تمام آباء واجداد نسلاً بعد نسل دین اسماعیلؑ پر تھے ہر بیٹے کو اپنے باپ سے ریاست وقوم ملتی تھی، اور دین اسمٰعیل پر قائم رہنے کی وصیت بھی، اولاد اسمٰعیل میں دین ابراہیمؑ کی تبدیلی اور بُت پرستی کی ایجاد قصی بن کلاب کے زمانہ میں ہوئی۔ کعب بن لوی نے عرب کو مجتمع کیا تھا تمام قریش اس کے پاس جمع ہوتے تھے۔ قصی ان کو خطاب کرتا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی اطلاع دیتا اور بتاتا تھا کہ وہ میری نسل میں سے ہوں گے۔ تم لوگ ان کا اتباع کرنا اور ان پر ایمان لانا۔ پھر چند اشعار پڑھتا جن میں سے ایک شعر کا مضمون یہ تھا۔ کاش میں ان کی دعوت کے وقت موجود ہوتا جب قریش حق سے سرکشی کریں گے اور مدد نہ کریں گے قصی منیٰ اور عرفات کے زمانہ میں حاجیوں کو بہت زیادہ کھانا کھلاتا تھا اس کو رفادہ کہا جاتا ہے چمڑے کے بڑے بڑے ٹینک اس نے بنوائے تھے جن میں پانی بھر کر مکہ اور منیٰ اور عرفات میں حاجیوں کو پلاتا تھا۔ اس کو سقایہ کہا جاتا ہے۔ قصیٰ کے حکم سے عہد جاہلیت میں حاجیوں کو کھانا کھلانے اور پانی پلانے کی رسم جاری تھی یہاں تک کہ اسلام آگیا اور اسلام نے بھی اس رسم کو قائم رکھا۔ قصیٰ نے ایک دستور یہ ایجاد کیا تھا کہ مزدلفہ میں رات کو آگ جلاتا تھا تاکہ عرفہ سے روانہ ہونے والے آگ کو دیکھ لیں اور راستہ نہ بھٹک جائیں۔ آگ روشن کرنے کا دستور برابر اسلام میں بھی جاری رہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ اور حضرت عثمان رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانہ میں یہ سلسلہ قائم رہا۔ مزدلفہ میں آگ روشن کی جاتی رہی۔ عمرو بن لحی خزاعی پہلا شخص ہوا جس نے دین اسمٰعیل کو بگاڑا بُت پرستی اور سانڈ چھوڑنے کی رسم نکالی۔ (تفسیر مظہری)

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ

جیسے دستور فرعون والوں کا اور جو اُن سے

قَبْلِهِمْ ۭ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ

پہلے تھے کہ انہوں نے جھٹلائیں باتیں اپنے رب کی پھر ہلاک کر

بِذُنُوْبِهِمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَكُلٌّ

دیا ہم نے انکو اُنکے گناہوں پر اور ڈبو دیا ہم نے فرعون والوں

كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۵۴﴾

کو اور سارے ظالم تھے

فرعونیوں کی ہلاکت:

فرعونیوں اور اُن سے پہلی قوموں کو اُن کے جرائم کی پاداش میں ہلاک کیا۔ اور خصوصیت کے ساتھ فرعونیوں کا بیڑا غرق کر دیا۔ یہ سب اس وقت ہوا جب انہوں نے خدا سے بغاوت اور شرارت کر کے خود اپنی جانوں پر ظلم کئے۔ ورنہ خدا کو کسی مخلوق سے ذاتی عداوت نہیں۔ (تفسیر عثمانیؒ)

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ

بدتر سب جانداروں میں اللہ کے ہاں وہ ہیں

كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۵﴾ اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ

جو منکر ہوئے پھر وہ نہیں ایمان لاتے جن سے تو نے

مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ

معاہدہ کیا ہے اُن میں سے پھر وہ توڑتے ہیں اپنا عہد ہر بار

وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۶﴾

اور وہ ڈر نہیں رکھتے

بدعہد اور بے ایمان بدترین جانور ہیں:

جو لوگ ہمیشہ کے لئے کفر اور بے ایمانی پر تل گئے اور انجام سے بالکل بے خوف ہو کر غداری اور بدعہدی کے خوگر ہو رہے ہیں، وہ خدا کے نزدیک بدترین جانور ہیں۔ فرعونیوں کا حال بدعہدی اور غداری میں یہ تھا۔

وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ (اعراف رکوع ۱۶)

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہود بنی قریظہ وغیرہ کی یہی خصلت تھی۔ آپ سے عہد کر لیتے کہ ہم مشرکین مکہ کو مدد نہ دیں گے۔ پھر اُن کی امداد کرتے۔ اور کہہ دیتے کہ ہم کو عہد یاد نہ رہا تھا۔ بار بار ایسا ہی کرتے تھے۔ آگے بتلایا ہے کہ ایسے غداروں کے ساتھ کیا معاملہ ہونا چاہئے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

حضرت سعید بن جبیرؒ نے فرمایا کہ یہ آیت یہود کے چھ آدمیوں کے بارہ میں آئی ہے جن کے متعلق حق تعالیٰ نے پیشگی خبر دے دی کہ یہ لوگ آخر تک ایمان نہیں لائیں گے۔

عہد پورا کرنے کا عجیب واقعہ:

ابوداؤد، ترمذی، نسائی، امام احمد بن حنبلؒ نے سلیم بن عامر کی روایت سے نقل کیا ہے کہ حضرت معاویہؓ کا ایک قوم کے ساتھ ایک میعاد کے لئے التواءِ جنگ کا معاہدہ تھا۔ حضرت معاویہؓ نے ارادہ فرمایا کہ اس معاہدہ کے ایام میں اپنا لشکر اور سامان جنگ اُس قوم کے قریب پہنچا دیں تا کہ معاہدہ کی میعاد ختم ہوتے ہی وہ دشمن پر ٹوٹ پڑیں۔ مگر عین اُس وقت جب حضرت معاویہؓ کا لشکر اُس طرف روانہ ہو رہا تھا یہ دیکھا گیا کہ ایک معمر آدمی گھوڑے پر سوار بڑے زور سے یہ نعرہ لگا رہے ہیں اللہ اکبر اللہ اکبر وفاء لا غدراً۔ یعنی نعرۂ تکبیر کے ساتھ یہ کہا کہ ہم کو معاہدہ پورا کرنا چاہئے اس کی خلاف ورزی نہ کرنا چاہئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس قوم سے کوئی صلح یا ترک جنگ کا معاہدہ ہو جائے تو چاہئے کہ ان کے خلاف نہ کوئی گرہ کھولیں اور نہ باندھیں۔ حضرت معاویہؓ کو اس کی خبر کی گئی۔ دیکھا تو یہ کہنے والے بزرگ حضرت عمرو بن عنبسہؓ صحابی تھے۔ حضرت معاویہؓ نے فوراً اپنی فوج کو واپسی کا حکم دے دیا تا کہ التواءِ جنگ کی میعاد میں لشکر کشی پر اقدام کر کے خیانت میں داخل نہ ہو جائیں۔ (ابن کثیرؒ) (معارف مفتی اعظمؒ)

فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ

سو اگر کبھی تو پائے اُن کو لڑائی میں تو اُن کو ایسی سزا دے کہ دیکھ

مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَاِمَّا

کر بھاگ جائیں انکے پچھلے تا کہ اُن کو عبرت ہو اور اگر

تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ

تجھ کو ڈر ہو کسی قوم سے دغا کا تو پھینک دے اُن کا عہد انکی

اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ

طرف ایسی طرح پر کہ ہو جاؤ تم اور وہ برابر بیشک اللہ کو خوش نہیں

الْخَآئِنِيْنَ ﴿۵۸﴾

آتے دغاباز

دھوکے بازوں کو عبرتناک سزا دو:

یعنی اگر یہ دغاباز غدار معاہدوں کو علانیہ پس پشت ڈال کر آپ کے مقابل میدان جنگ میں آ جائیں تو ان کو ایسی سخت سزا دیجئے، جسے دیکھ کر ان کے پیچھے رہنے والے یا ان کے بعد آنے والی نسلیں بھی عبرت حاصل کریں اور عہد شکنی کی کبھی جرأت نہ کر سکیں اور اگر ایک قوم نے علانیہ دغابازی نہیں کی، ہاں آثار وقرائن بتا رہے ہیں کہ عہد شکنی پر آمادہ ہے تو آپ کو اجازت ہے کہ مصلحت سمجھیں تو ان کا عہد واپس کر دیں اور معاہدہ سے دستبرداری کی اطلاع کر کے مناسب کارروائی کریں۔ تاکہ فریقین پچھلے معاہدات کی نسبت شک واشتباہ میں نہ رہیں۔ دونوں مساویانہ طور پر آگاہ و بیدار ہو کر اپنی تیاری اور حفاظت میں مشغول ہوں۔ آپ کی جانب سے کوئی چوری اور خیانت نہ ہو سب معاملہ صاف صاف ہو۔ حق تعالیٰ خیانت کی کارروائی کو خواہ کفار کے ساتھ ہو پسند نہیں کرتا۔ سنن میں روایت ہے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور روم میں میعادی معاہدہ تھا، میعاد کے اندر امیر معاویہؓ نے اپنی فوجوں کو روم کی سرحد کی طرف بڑھانا شروع کیا۔ مقصد یہ تھا کہ رومیوں کی سرحد سے اس قدر قریب اور پہلے سے تیار رہیں کہ میعاد معاہدہ گذرتے ہی فوراً دھاوا بول دیا جائے، جس وقت یہ کارروائی جاری تھی، ایک شیخ سواری پر یہ کہتے ہوئے آئے۔ "اللہ اکبر وفاء لاغدرا"۔ یعنی عہد پورا کرو عہد شکنی مت کرو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کسی قوم سے معاہدہ ہو تو کوئی گرہ نہ کھولی جائے نہ باندھی جائے یہاں تک کہ معاہدہ کی مدت پوری ہو جائے۔ یا فریق ثانی کو مساویانہ حیثیت میں معاہدہ واپس کیا جائے حضرت معاویہ کو جب یہ خبر پہنچی تو اُلٹے واپس آ گئے۔ پھر جو دیکھا تو وہ شیخ حضرت عمرو بن عنبسہ رضی اللہ عنہ تھے۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اس سے مراد یہ ہے کہ ان کو ایسی سزا دو کہ پیچھے والوں کو عبرت ہو۔ یعنی ان عہد شکنوں کو اس طرح قتل کرو اور سزا دو کہ مکہ اور یمن کے رہنے والے جو ان کے پیچھے ہیں ان کو عبرت ہو وہ ڈر جائیں اور اپنے جتھوں کو تمہارے مقابلہ پر نہ لائیں۔ اسی بنیاد پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تسلط پانے کے بعد بنی قریظہ کے ہر بالغ کو قتل کیا اور عورتوں بچوں کو باندی غلام بنایا اور ان کا مال تقسیم کیا۔ طبرانی نے حضرت اسلمؓ انصاری کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی قریظہ کے قیدیوں کی انکوائری پر مجھے مامور فرمایا تھا چنانچہ میں نے جس لڑکے کو بالغ پایا اس کی گردن اڑا دی۔ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ تاکہ وہ نصیحت اندوز ہوں اور آئندہ عہد شکنی کی جرأت نہ کریں۔

اس آیت کے نازل ہونے کا واقعہ:

ابوالشیخ نے زہری کی روایت سے بیان کیا ہے کہ حضرت جبرئیلؑ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آ کر کہا آپ نے تو ہتھیار کھول دیئے اور ہم اب تک قوم کے تعاقب میں لگے ہوئے ہیں۔ آپ نکل کر چلئے اللہ نے بنی قریظہ سے جہاد وقتال کرنے کی آپ کو اجازت دیدی ہے اسی کے متعلق آیت وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً الخ نازل ہوئی۔

یہودِ بنی قریظہ پر حملہ:

میں کہتا ہوں یہ قصہ غزوۂ احزاب کے بعد کا ہے۔ حافظ محمد یوسف صالحی نے سبیل الرشاد میں لکھا ہے کہ بنی قینقاع کے یہودیوں نے عہد شکنی کی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا ہوا معاہدہ توڑ دیا تھا اور بغاوت وحسد کا مظاہرہ کیا تھا۔ ایک برقعہ پوش عربی عورت بنی قینقاع کے بازار میں آئی اور زیور خریدنے کسی سنار کے پاس بیٹھ گئی۔ لوگوں نے اس کی نقاب اتروانا چاہی لیکن اس نے نقاب کھولنے سے انکار کر دیا۔ سنار نے اس کے کپڑے کا کنارہ کسی کانٹے میں الجھا دیا۔ عورت جو نادانستگی میں اٹھی تو ننگی ہو گئی۔ لوگ اس پر ہنس پڑے۔ عورت چیخ پڑی عورت کی چیخ سن کر ایک مسلمان نے سنار پر حملہ کر دیا اور اس کو قتل کر دیا۔ سنار تھا یہودی، یہودیوں نے اس مسلمان پر حملہ کر کے مار ڈالا اور مسلمانوں سے کیا ہوا معاہدہ توڑ دیا۔ مقتول مسلمان کے گھر والوں نے مسلمانوں سے فریاد کی، مسلمان غضب ناک ہو گئے۔ اس طرح مسلمانوں میں بنی قینقاع کے یہودیوں میں جھگڑا ہو گیا۔ اس پر آیت وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً الخ نازل ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے بنی قینقاع کی طرف سے (عہد شکنی کا) اندیشہ ہے۔ چنانچہ اس آیت کے حکم کی تعمیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر لشکر کشی کی۔ جھنڈا حضرت حمزہؓ بن عبد المطلب کے سپرد کیا اور مدینہ میں اپنی جگہ حضرت ابولبابہؓ بن عبد المنذر کو قائم کیا۔ یہودی قلعہ بند ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پندرہ روز تک ان کا سخت محاصرہ جاری رکھا آخر اللہ نے ان کے دلوں میں خوف ڈال دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شرائط پر انہوں نے باہر نکل آنا منظور کر لیا۔ شرائط یہ تھیں کہ ان کے سارے مال پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کا قبضہ ہو جائے گا۔ صرف عورتوں اور بچوں کو لے کر وہ جلا وطن ہو جائیں گے۔ چنانچہ تین روز کے بعد وہ مدینہ سے نکل گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے مال میں سے صفی اور کل مال کا پانچواں حصہ خود لے لیا اور چار خمس (۴/۵) ساتھ والوں کو بانٹ دیا۔ بدر کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ پہلا خمس تھا (یعنی بدر کے مسلمانوں کو پہلا مال غنیمت حاصل ہوا تھا جس کا پانچواں حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملا۔ صفی اس مال کو کہا جاتا تھا جو تقسیم سے پہلے کل مال غنیمت میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے لئے چھانٹ لینے کا حق رکھتے تھے)

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ۔

بلاشبہ اللہ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

بغوی نے ایک عمیری شخص کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حضرت معاویہؓ اور رومیوں کے درمیان معاہدہ تھا معاویہؓ بلادِ روم کی طرف جا رہے تھے تا کہ میعادِ معاہدہ ختم ہوتے ہی (بغیر اعلان و اطلاع کے) ان سے جنگ شروع کر دیں آپ نے دیکھا کہ ایک شخص (سامنے سے) گھوڑے پر آ رہا ہے اور کہہ رہا ہے اللہ اکبر اللہ اکبر وفاء عہد کرو، غداری نہ کرو، دیکھا تو وہ حضرت عمروؓ بن عنبسہ تھے حضرت معاویہؓ نے ان کو بلوایا اور پوچھا کیا بات ہے حضرت عمروؓ بن عنبسہ نے فرمایا میں نے خود سنا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے جس کا کسی قوم سے معاہدہ ہو وہ اس معاہدہ کی شکست و ریخت نہ کرے تاوقتیکہ معاہدہ کی مدت ختم نہ ہو جائے یا (فریق مخالف کی خلاف ورزی کی صورت میں) اس کا معاہدہ اسی پر لوٹا نہ دیا جائے، یہ سن کر حضرت معاویہؓ لوٹ آئے۔ (تفسیر مظہری)

مسند احمد میں ہے کہ امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لشکروں کو سرحد روم کی طرف بڑھانا شروع کیا مدتِ صلح ختم ہوتے ہی ان پر اچانک حملہ کر دیں تو ایک شیخ اپنی سواری پر سوار یہ کہتے ہوئے آئے کہ اللہ بہت بڑا ہے، اللہ بہت بڑا ہے، وعدہ وفائی کرو غدر درست نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جب کسی قوم سے عہد و پیمان ہو جائیں تو نہ کوئی گرہ کھولو نہ باندھو جب تک کہ مدتِ صلح ختم نہ ہو جائے یا انہیں اطلاع دے کر عہد نامہ چاک نہ ہو جائے جب یہ بات حضرت معاویہؓ کو پہنچی آپ نے اسی وقت فوج کو واپسی کا حکم دے دیا یہ شیخ حضرت عمرو بن عنبسہ تھے، رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

یہودیوں نے دعوت قبول نہ کی:

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک شہر کے قلعے کے پاس پہنچ کر اپنے ساتھیوں سے فرمایا تم مجھے بلاؤ میں تمہیں بلاؤں گا جیسے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو انہیں بلاتے دیکھا ہے۔ پھر فرمایا میں بھی انہی میں سے ایک شخص تھا پس مجھے اللہ عزوجل نے اسلام کی ہدایت کی اگر تم بھی مسلمان ہو جاؤ تو جو ہمارا حق ہے وہی تمہارا حق ہوگا اور جو ہم پر ہے تم پر بھی وہی ہوگا اور اگر تم اسے نہیں مانتے تو ذلت کے ساتھ تمہیں جزیہ دینا ہوگا اسے بھی قبول نہ کرو تو ہم تمہیں ابھی سے مطلع کرتے ہیں جب کہ ہم تم برابری کی حالت میں ہیں، اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں رکھتا۔ تین دن تک انہیں اسی طرح دعوت دی آخر چوتھے روز صبح ہی صبح حملہ کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فتح دی اور مدد فرمائی۔

یہ الفاظ ہیں گھوڑے تین طرح کے ہیں۔ رحمن کے، شیطان کے اور انسان کے۔ اس میں ہے کہ شیطانی گھوڑے وہ ہیں جو گھڑ دوڑ کی شرطیں لگانے اور جوئے بازی کرنے کے لئے ہوں۔ اکثر علماء کا قول ہے کہ تیر اندازی گھوڑا سواری سے افضل ہے، امام مالکؒ اس کے خلاف ہیں لیکن جمہور کا قول قوی ہے کیونکہ حدیث میں بھی آ چکا ہے۔ حضرت معاویہ بن خدیج، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اس وقت وہ اپنے گھوڑے کی خدمت کر رہے تھے پوچھا تمہیں یہ گھوڑا کیا کام آتا ہے؟ فرمایا میرا خیال ہے کہ اس جانور کی دعا میرے حق میں قبول ہوگی ہے۔ کہا جانور اور دعا؟ فرمایا ہاں خدا کی قسم ہر گھوڑا ہر صبح دعا کرتا ہے کہ اے اللہ! تو نے مجھے اپنے بندوں میں سے ایک کے حوالے کیا ہے تو مجھے اس کی تمام اہل سے اور مال سے اور اولاد سے زیادہ بنا کر اس کے پاس رکھ۔ ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ ہر عربی گھوڑے کو ہر صبح کو دو دعائیں کرنے کی اجازت ملتی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا اِنَّهُمْ
اور یہ نہ سمجھیں کافر لوگ کہ وہ بھاگ نکلے وہ ہرگز تھکا
لَا يُعْجِزُوْنَ ﴿۵۹﴾
نہ سکیں گے ہم کو

کافروں کی کوئی تدبیر نہیں چل سکتی:

نبذ عہد کا جو حکم اوپر مذکور ہوا، ممکن تھا کہ کفار اس کو مسلمانوں کی سادہ لوحی پر محمل کر کے خوش ہوتے کہ جب ان کے یہاں خیانت و غدر جائز نہیں تو ہم کو خبردار اور بیدار ہونے کے بعد پورا موقع اپنے بچاؤ اور مسلمانوں کے خلاف تیاری کرنے کا ملے گا۔ اس کا جواب دے دیا کہ کتنی

ہی تیاری اور انتظامات کرلو جب مسلمانوں کے ہاتھوں خدا تم کو مغلوب و رسوا کرنا اور دنیا و آخرت میں سزا دینا چاہے گا، تو تم کسی تدبیر سے اس کو عاجز نہ کرسکو گے۔ نہ اس کے احاطۂ قدرت و تسلط سے نکل کر بھاگ سکو گے۔ گویا مسلمانوں کی تسلی کردی کہ وہ خدا پر بھروسہ کر کے اس کے احکام کا امتثال کریں تو سب پر غالب آئینگے۔ (تفسیر عثمانی)

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ
اور تیار کرو اُن کی لڑائی کے واسطے جو کچھ جمع کرسکو قوت سے اور
رِّبَاطِ الْخَيْلِ
پلے ہوئے گھوڑوں سے

آلات جہاد کی تیاری فرض ہے:

یعنی خدا پر بھروسہ کرنے کے معنی یہ نہیں کہ اسباب ضروریہ مشروعہ کو ترک کردیا جائے۔ نہیں، مسلمانوں پر فرض ہے کہ جہانتک قدرت ہو سامانِ جہاد فراہم کریں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں گھوڑے کی سواری، شمشیر زنی اور تیر اندازی وغیرہ کی مشق کرنا، سامان جہاد تھا۔ آج بندوق، توپ، ہوائی جہاز، آبدوز کشتیاں، آہن پوش کروزر وغیرہ کا تیار کرنا اور استعمال میں لانا اور فنون حربیہ کا سیکھنا، بلکہ ورزش وغیرہ کرنا سب سامانِ جہاد ہے۔ اسی طرح آئندہ جو اسلحہ و آلات حرب و ضرب تیار ہوں، ان شاء اللہ وہ سب آیت کے منشاء میں داخل ہیں، باقی گھوڑے کی نسبت تو آپ خود ہی فرما چکے " الخيل معقود في نواصيها الخير الىٰ يوم القيامة " کہ قیامت تک کے لئے خدا نے اس کی پیشانی میں خیر رکھ دی ہے اور احادیث میں ہے کہ " جو شخص گھوڑا جہاد کی نیت سے پالتا ہے، اس کے کھانے، پینے بلکہ ہر قدم اٹھانے میں اجر ملتا ہے اور اس کی خوراک وغیرہ تک قیامت کے دن ترازو میں وزن کی جائے گی۔ (تفسیر عثمانی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں منجنیق کا استعمال:

حضرت عمرؓ نے ایک لشکر کو دشمن کے مقابلہ میں روانہ کرتے وقت لشکر سے دریافت کیا تم دشمن کے قلعوں کے ساتھ کیا کرو گے اور ان کو کس طرح فتح کرو گے تو صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہم دبابے بنالیں گے اور ہمارے جوان ان میں بیٹھ کر قلعہ میں نقب لگائیں گے یعنی اس طرح دشمن کے قلعوں کو مسخر کریں گے۔ (دیکھو نہایہ ص ۱۰، ج ۲ و مجمع البحار ص ۳۹۴ ج ۱)

معلوم ہوا کہ اس زمانے میں منجنیق کا استعمال لڑائیوں میں معروف و مشہور تھا۔ غزوۂ خیبر میں جب قلعہ صعب فتح ہوا اور اس میں سے کچھ دبابے اور کچھ منجنیقیں مسلمانوں کے ہاتھ آئیں جو رومیوں کے آلاتِ جنگ تھے اس قلعہ کے فتح کے بعد جب خیبر کے دوسرے دو قلعے وطیح اور سلالم کے فتح کرنے میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دشواری پیش آئی تو اس وقت آپؐ نے یہ ارادہ فرمایا کہ ان لوگوں پر منجنیق کو نصب کیا جائے۔ مگر اس کی نوبت نہیں آئی اور یہ دونوں قلعے بحمدہ تعالیٰ بغیر منجنیق کے نصب کئے فتح ہو گئے۔ بہر حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ان آلات کے استعمال کا ارادہ فرمانا جو غیر مسلموں کی ایجاد تھے یہی اس کی مشروعیت اور جواز کی دلیل ہے۔ پھر جب ۸ھ میں مکہ مکرمہ فتح ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے بعد طائف کی طرف روانہ ہوئے اور بارہ ہزار صحابہؓ آپ کے ہمراہ تھے اور وہاں پہنچ کر طائف کا محاصرہ کیا تقریباً بیس روز محاصرہ رہا جب فتح میں دشواری ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سلمان فارسیؓ کے مشورے سے ان پر منجنیق نصب کی اور یہ منجنیق سلمان فارسیؓ نے خود اپنے ہاتھ سے تیار کی۔ اور ان کے قلعہ کو مسمار کرنے کے لئے اس کو بنایا اور یہ سب کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے آپ کے سامنے ہوا۔ علامہ زرقانی فرماتے ہیں کہ اسلام میں یہ پہلی منجنیق تھی جو دشمنوں کے مقابلہ میں نصب کی گئی اور دنیا میں سب سے پہلا شخص نمرود ہے جس نے منجنیق تیار کی اور ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں پھینکنے کے لئے اس کو استعمال کیا۔ تفصیل کے لئے زرقانی شرح مواہب ص ۳۱ ج ۳ دیکھیں۔ غرض یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تیر و تلوار کے علاوہ جدید آلات حرب بھی استعمال کئے اور صحابہؓ کو ان کے بنانے کا حکم بھی دیا اور آپ کے بعد جب فاروق اعظمؓ کو شام اور عراق کی مہم پیش آئی تو آپ نے صحابہؓ کو قلعہ شکن دبابوں کے بنانے کا اور استعمال کرنے کا حکم دیا۔ (معارف کاندھلوی)

گھوڑوں کی خصوصیت:

سامانِ جنگ میں سے خصوصیت کے ساتھ گھوڑوں کا ذکر اس لئے کر دیا کہ اس زمانہ میں کسی ملک وقوم کے فتح کرنے میں سب سے زیادہ موثر ومفید گھوڑے ہی تھے۔ اور آج بھی بہت سے ایسے مقامات ہیں جن کو گھوڑوں کے بغیر فتح نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ گھوڑوں کی پیشانی میں اللہ تعالیٰ نے برکت رکھدی ہے۔

سامان جنگ کی فضیلت:

صحیح احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سامانِ جنگ فراہم کرنے

اوراس کے استعمال کی مشق کرنے کو بڑی عبادت اور موجبِ ثوابِ عظیم قرار دیا ہے۔ تیر بنانے اور چلانے پر بڑے بڑے اجر وثواب کا وعدہ ہے۔

ہر قسم کی تیاری ضروری ہے:

اور چونکہ جہاد کا اصل مقصد اسلام اور مسلمانوں کا دفاع ہے اور دفاع ہر زمانہ اور ہر قوم کا جدا ہوتا ہے اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جاھدوا المشرکین باموالکم و انفسکم و السنتکم

(رواہ ابوداؤد والنسائی والدارمی عن انسؓ) (معارف مفتی اعظمؒ)

یعنی مسلمانو! معاہدہ توڑنے والے یا عام کافروں کے مقابلہ کے لئے جو تیاری ممکن ہو کرلو۔ اعداد کا معنی ہے ضرورت کے لئے تیاری کرنا۔ قوت سے مراد ہے سامان، اسلحہ، ٹریننگ، ریاضتِ جنگی، گھوڑے، کشتی، تیر اندازی کی مشق، گولی چلانا وغیرہ۔ جہاد کے لئے مال فراہم کرنا بھی اسی ذیل میں آتا ہے۔ بعض کے نزدیک قوت سے مراد ہیں قلعے۔

تیراندازی:

حضرت عقبہ بن عامر کا بیان ہے میں نے خود سنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر فرمارہے تھے وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ خبردار ہو جاؤ، قوت تیر اندازی ہے، خوب سن لو، قوت تیر اندازی ہے، آگاہ ہو جاؤ قوت تیر اندازی ہے۔ رواہ مسلم

حضرت ابو نجیح سلمی کا بیان ہے میں نے سنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے تھے جس نے اللہ کی راہ میں ایک تیر پہنچایا جنت میں اس کے لئے ایک درجہ ہے اور جس نے راہِ خدا میں ایک تیر پھینکا وہ اس کے لئے (گناہوں کا) فدیہ ہے اور آزاد کرنے والا ہے (یعنی وہ دوزخ سے آزاد ہو جائیگا) رواہ النسائی۔ حضرت عقبہ بن عامر کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عنقریب روم کی فتح تم کو عنایت کی جائیگی اور اللہ تمہارے لئے کافی ہوگا پس تم میں سے کوئی تیر بازی سے عاجز نہ ہو (یعنی بطور تفریح تیر اندازی کی مشق جاری رکھو) رواہ مسلم وابو داؤد۔ ترمذی نے حضرت عقبہ والی روایت نقل کی ہے، اس میں اتنا زائد ہے کہ راہِ خدا میں جس کے بال سفید ہوئے قیامت کے دن وہ اس کے لئے نور بن جائیںگے۔ بیہقی نے شعب الایمان میں تینوں حدیثیں نقل کی ہیں، البتہ راہِ خدا کی جگہ اسلام کا لفظ بیہقی کی روایت میں آیا ہے۔

حضرت عقبہؓ بن عامر کی روایت ہے، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، فرمارہے تھے جس نے تیر اندازی سیکھی پھر چھوڑ دی وہ ہم میں سے نہیں ہے یا یوں فرمایا، اس نے نافرمانی کی۔ (رواہ مسلم)

حضرت ابو اسیدؓ کا بیان ہے، بدر کے دن جب ہم نے قریش کے سامنے اور قریش نے ہمارے سامنے صف بندی کرلی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب وہ تمہارے قریب آجائیں تو تیروں سے کام لینا تم پر لازم ہے۔ رواہ البخاری۔ حضرت عقبہؓ بن عامر جہنی کا بیان ہے، میں نے خود سنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے تھے کہ اللہ ایک تیر کے ذریعہ سے تین آدمیوں کو جنت میں لے جائے گا۔ تیر بنانے والا جو تیر بنانے سے امیدوار ثواب ہو۔ تیر پھینکنے والا۔ تیر جوڑ دینے والا۔ تم لوگ تیر اندازی کرو اور گھوڑوں پر سوار ہونے سے تمہاری تیر اندازی بہتر ہے آدمی کے لئے ہر لہو (کھیل) ناجائز ہے سوائے کمان سے تیر پھینکنے اور گھوڑے کی سواری کی ٹریننگ حاصل کرنے اور اپنی بیوی سے تفریح کرنے کے۔ یہ سب باتیں ٹھیک ہیں۔ رواہ الترمذی وابن ماجۃ۔ ابوداؤد

گھوڑوں کی پیشانی کے بال:

حضرت انسؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا گھوڑوں کی پیشانی کے بالوں میں برکت ہے۔ متفق علیہ

حضرت جریر بن عبداللہ راوی ہیں، میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھوڑے کی پیشانی کے بال اپنی انگلی سے مروڑ رہے تھے اور فرمارہے تھے گھوڑوں کے پیشانی کے بالوں سے قیامت تک خیر (بھلائی، نفع) وابستہ رہے گی۔ ثواب (جہاد کا یا شہادت کا) اور مال غنیمت (بصورت فتح) رواہ مسلم۔ بغوی نے بطریق بخاری حضرت عروہ بارقی کی روایت سے یہ حدیث بیان کی ہے۔

تین طرح کے گھوڑے:

حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا گھوڑے تین (طرح کے) ہوتے ہیں ایک گھوڑا آدمی کے لئے (گناہ کا) بار ہوتا ہے دوسرا گھوڑا آدمی کے لئے (بے آبروئی اور دوزخ سے) پردہ (آڑ حفاظت) ہوتا ہے تیسرا گھوڑا آدمی کے لئے ثواب کا ذریعہ ہوتا ہے جو گھوڑا آدمی دکھاوٹ غرور اور مسلمانوں سے اونچا اٹھنے کے لئے پالے وہ اس کے لئے بار (گناہ) ہے اور جو گھوڑا آدمی جہاد میں شریک ہونے کے لئے پالے اور اللہ نے جو حق گھوڑے کی سواری اور گھوڑے کی ذات سے وابستہ کردیا ہے اس کو فراموش نہ کرے تو ایسا گھوڑا اس شخص کے لئے پردہ ہے اور جو گھوڑا کسی مسلمان کو جہاد میں شریک کرنے کے لئے کوئی پالے وہ

باعث اجر ہے اگر ایسے گھوڑے کو کسی چراگاہ یا سبزہ زار میں باندھ دے گا اور گھوڑا اس چراگاہ یا سبزہ زار سے کچھ کھائے گا اسی کے بقدر گھوڑے والے کے لئے نیکیاں لکھی جائینگی اور جو لید یا پیشاب کرے گا اس کے بقدر مالک کے لئے نیکیاں لکھی جائیں گی جب گھوڑا رسی تڑا کر کہیں ایک ٹیلے یا دو ٹیلوں پر کلیلیں بھریگا تب بھی اس کے قدموں کے نشانات اور لید اور پیشاب کے بقدر مالک کے لئے نیکیاں لکھی جائیں گی۔ اگر گھوڑے کو پانی پلانے کے لئے دریا پر لے جائے گا اور وہ وہاں پانی پیئے گا تو جتنا اس نے پانی پیا ہوگا اس کے بقدر مالک کے لئے نیکیاں لکھی جائیں گی۔ رواہ مسلم۔

حضرت ابو وہب حبشی کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ گھوڑے پالو ان کی پیشانیوں اور پٹھوں پر ہاتھ پھیرا کرو ان کی گردنوں میں قلادے ڈالو مگر تانت کے قلادے نہ ڈالو۔ رواہ ابوداؤد والنسائی۔

مجاہد کو سامان دینا:

حضرت زید بن خالد راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے کسی مجاہد کو سامان جہاد دیا اس نے خود جہاد کیا اور جس نے مجاہد کے پیچھے اس کے گھر والوں کی نگہداشت اس کی بجائے کی اس نے جہاد کیا۔ متفق علیہ

حضرت ابو مسعود انصاری کا بیان ہے کہ ایک آدمی ایک اونٹنی جس کے نکیل پڑی ہوئی تھی لے کر آیا اور عرض کیا یہ جہاد کے لئے دیتا ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن اس کے عوض تجھے سات سو اونٹنیاں ملیں گی سب کی نکیلیں پڑی ہوں گی۔ (رواہ مسلم)

حضرت انس راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنے مالوں جانوں اور زبانوں سے مشرکوں سے جہاد کرو۔ رواہ ابوداؤد والنسائی والدارمی۔

ابن ماجہ نے حضرت علیؓ حضرت ابو درداءؓ حضرت ابو ہریرہؓ حضرت ابو امامہؓ حضرت عبد اللہؓ بن عمروؓ، حضرت جابر بن عبد اللہؓ اور حضرت عمرانؓ بن حصین کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جس نے جہاد کے لئے کچھ خرچ بھیجا اور خود اپنے گھر بیٹھا رہا اس کے لئے ہر درہم کے عوض سات سو درہم (کا ثواب) ہوگا اور جس نے خود جہاد کیا اور خود ہی جہاد میں صرف کیا اس کے لئے ہر درہم کے عوض سات ہزار درہم کا ثواب ہوگا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ پڑھی۔

غزوۂ تبوک میں حضرت عثمانؓ کی امداد:

حضرت عبد الرحمن بنؓ حباب کا بیان ہے میں موجود تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیش عسرت (تبوک کو جانے والے لشکر) کو تیار کرنے اور مدد کرنے کی ترغیب دے رہے تھے۔ حضرت عثمان کھڑے ہوئے اور عرض کیا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! سو اونٹ جھولوں اور پالانوں سمیت میرے ذمے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر جیش عسرت کی مدد کی ترغیب دی۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے عرض کیا، میرے ذمے دو سو اونٹ مع ان کی جھولوں اور پالانوں کے ہیں۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر اپیل کی، حضرت عثمانؓ نے پھر کھڑے ہو کر عرض کیا، مجھ پر راہ خدا میں تین سو اونٹ جھولوں اور پالانوں سمیت لازم ہوئے۔ راوی کا بیان ہے میں دیکھ رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ممبر سے اتر رہے تھے اور فرما رہے تھے، اس کے بعد عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو عمل بھی کرے عثمانؓ سے اس کا مواخذہ نہیں (ہوگا) اس کے بعد عثمان جو عمل بھی کرے عثمان سے اس کا مواخذہ نہیں ہوگا۔ رواہ الترمذی۔

حضرت عبد الرحمٰنؓ بن سمرہ کا بیان ہے۔ جیش عسرت کی تیاری کے وقت حضرت عثمانؓ ایک ہزار دینار اپنی آستین میں لے کر آئے اور لا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں بکھیر دیئے میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی گود میں وہ اشرفیاں الٹ پلٹ کر رہے تھے اور فرما رہے تھے، عثمان اس کے بعد جو عمل بھی کرے اس کو ضرر نہ پہنچے گا (یعنی مواخذہ نہ ہوگا) یہ الفاظ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو بار فرمائے۔ رواہ احمد (مظہری)

تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ
کہ اُس سے دھاک پڑے اللہ کے دشمنوں پر اور تمہارے دشمنوں
مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ؕ
پر اور دوسروں پر اُن کے سوا جن کو تم نہیں جانتے اللہ اُن کو جانتا ہے

سامان جنگ کا اثر:

یعنی یہ سب سامان اور تیاری دشمنوں پر رُعب بٹھانے اور دھاک بٹھلانے کا ایک ظاہری سبب ہے۔ باقی فتح وظفر کا اصلی سبب تو خدا تعالیٰ کی مدد ہے جو پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اور وہ لوگ جن کو بالیقین تم نہیں جانتے منافقین ہیں جو مسلمانی کے پردہ میں تھے یا یہود ''بنی قریظہ'' یا روم و فارس وغیرہ وہ سب قومیں جن سے آئندہ مقابلہ ہونے والا تھا۔ (تفسیر عثمانی)

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
اور جو کچھ تم خرچ کرو گے اللہ کی راہ میں

يُوَفَّ اِلَيۡكُمۡ وَاَنۡتُمۡ لَا تُظۡلَمُوۡنَ ﴿۶۰﴾

وہ پورا ملے گا تم کو اور تمہارا حق نہ رہ جائے گا

مالی جہاد کا ثواب:

یہ مالی جہاد کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی جہاد کی تیاری میں جس قدر مال خرچ کرو گے اُس کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔ یعنی ایک درہم کے ساتھ سو درہم وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنۡ يَّشَآءُ اور بسا اوقات دنیا میں بھی اس سے کہیں زیادہ معاوضہ مل جاتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

وَاِنۡ جَنَحُوۡا لِلسَّلۡمِ فَاجۡنَحۡ لَهَا وَتَوَكَّلۡ

اور اگر وہ جھکیں صلح کی طرف تو تو بھی جھک اسی طرف اور بھروسہ

عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۶۱﴾

کر اللہ پر بیشک وہی ہے سننے والا جاننے والا

صلح بھی ہو سکتی ہے:

مسلمانوں کی تیاری اور مجاہدانہ قربانیوں کو دیکھ کر بہت ممکن ہے کہ کفار مرعوب ہو کر صلح و آشتی کے خواستگار ہوں تو آپ کا ارشاد ہے کہ حسب صوابدید آپ بھی صلح کا ہاتھ بڑھا دیں۔ کیونکہ جہاد سے خونریزی نہیں، اعلائے کلمۃ اللہ اور دفع فتنہ مقصود ہے۔ اگر بدون خونریزی کے یہ مقصد حاصل ہو سکے تو خواہی نخواہی خون بہانے کی کیا حاجت ہے اگر یہ احتمال ہو کہ شاید کفار صلح کے پردہ میں ہم کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں تو کچھ پروانہ کیجئے اللہ پر بھروسہ رکھئے وہ اُن کی نیتوں کو جانتا اور اُن کے اندرونی مشوروں کو سنتا ہے اُس کی حمایت کے سامنے ان کی بدنیتی نہ چل سکے گی آپ اپنی نیت صاف رکھئے۔ (تفسیر عثمانی)

شریعت نے کافروں سے اصل حکم جہاد کا دیا ہے اور بوقت ضرورت، حسب مصلحت کافروں سے صلح کی اجازت دی ہے کہ اگر تم کافروں سے صلح کرلو تو جائز ہے مگر واجب نہیں۔

قال ابو حنيفة رضى الله تعالىٰ عنه لا ينبغى موادعة اهل الشرک اذا كان بالمسلمين عليهم قوة لان فيه ترک القتال الماموربه او تاخيره و ذلک مما لا ينبغى للاميران يفعله من غير حاجة قال الله تعالىٰ ولا تهنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان كنتم مومنين وان لم يكن بالمسلمين قوة عليهم فلا باس بالموادعة لان الموادعة خير للمسلمين فى هذه الحالة وقد قال عزو جل وان جنحوا للسلم فاجنح لها الاية ولان هذا من تدبير القتال فان على المقاتل ان يحفظ قوة نفسه او لاثم يطلب العلوا والغلبة اذا تمكن من ذالک۔ (شرح سیر کبیر للامام السرخسی)

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں اگر مسلمانوں میں کافروں کے مقابلہ کی طاقت اور قوت ہو تو پھر ان سے صلح کرنا کسی طرح مناسب اور زیبا نہیں کیونکہ حق تعالیٰ نے کافروں سے جہاد اور قتال کا حکم دیا ہے پس اگر کفار سے صلح کی جائے تو فریضۂ جہاد کا ترک یا اس میں تاخیر لازم آئے گی اور مسلمانوں کے امیر کے لئے یہ کسی طرح زیبا اور لائق نہیں کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں سے بغیر ضرورت اور بغیر مجبوری کے صلح کرے اس لئے کہ حق جل شانہٗ کا ارشاد ہے اے مسلمانو تم دشمنان اسلام کے جہاد و قتال میں کمزور اور سُست نہ پڑو اور اس راہ میں جو تکلیف پہنچے اس سے رنجیدہ اور غمگین نہ ہو اور تم ہی غالب رہو گے۔ اگر تم سچے اور پکے مسلمان ہو۔ (اللہ کا حکم ختم ہوا) اور اگر مسلمانوں میں کافروں کے مقابلہ کی قوت نہ ہو تو پھر صلح کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔ اس لئے کہ ایسی حالت میں صلح کرنا ہی مسلمانوں کے لئے خیر اور مصلحت ہے جیسا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اگر کافر صلح کی طرف مائل ہیں تو تم بھی صلح کی طرف مائل ہو جاؤ۔ نیز ایسی حالت میں صلح کر لینا یہ درپردہ جہاد و قتال کی ایک تدبیر ہے اس لئے کہ مجاہد پر یہ فرض ہے کہ اولاً وہ اپنی قوت کو محفوظ کرے اور قوت حاصل ہو جانے کے بعد پھر دشمن اسلام پر غلبہ کی کوشش کرے جب کبھی اس کو یہ موقعہ ملے۔ امام ابو حنیفہ کے کلام کا ترجمہ ختم ہوا۔ اور یہی مضمون احکام القرآن ص ۶۹ ج ۲ و ص ۷۰ ج ۳ للامام ابی بکر الجصاص میں مذکور ہے فقہاء کرام نے اس امر کی تصریح کی ہے کہ مسلمان فرمانروا کافروں سے ایک مدت معینہ کے لئے صلح کر سکتا ہے مگر جہاں تک ممکن ہو صلح کی مدت کم مقرر کرے اور دس سال سے زیادہ کا معاہدہ نہ کرے۔ جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ میں قریش سے دس سال کے لئے معاہدہ کیا۔ (معارف کاندھلوی)

وَاِنۡ يُّرِيۡدُوۡۤا اَنۡ يَّخۡدَعُوۡكَ فَاِنَّ حَسۡبَكَ

اور اگر وہ چاہیں کہ تجھ کو دغا دیں تو تجھ کو کافی ہے

اللّٰہُ هُوَ الَّذِیْٓ اَیَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ ۝۶۲

اللہ اُسی نے تجھ کو زور دیا اپنی مدد کا اور مسلمانوں کا

اگر صلح کر کے وہ لوگ دغا بازی اور عہد شکنی کا ارادہ کر لیں تو فکر نہ کیجئے۔ خدا آپ کی مدد کے لئے کافی ہے ان کے سب فریب وخداع بیکار کر دے گا۔ اسی نے بدر میں آپ کی غیبی امداد فرمائی، اور ظاہری طور پر جاں نثار وسر فروش مسلمانوں سے آپ کی تائید کی۔ (تفسیر عثمانی)

عبدہ بن ابی لبابہ فرماتے ہیں میری حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات ہوئی آپ نے مجھ سے مصافحہ کر کے فرمایا کہ جب دو شخص خدا کی راہ میں محبت رکھنے والے آپس میں ملتے ہیں ایک دوسرے سے بہ خندہ پیشانی ہاتھ ملاتا ہے تو دونوں کے گناہ ایسے جھڑ جاتے ہیں جیسے درخت کے خشک پتے میں نے کہا یہ کام تو بہت آسان ہے فرمایا یہ نہ کہو یہی اُلفت وہ ہے جس کی نسبت جناب باری تعالیٰ فرماتا ہے اگر تو رُوئے زمین کے خزانے خرچ کر دے تو بھی یہ تیرے بس کی بات نہیں کہ دِلوں میں اُلفت ومحبت پیدا کر دے ان کے اس فرمان سے مجھے یقین ہو گیا کہ یہ مجھ سے بہت زیادہ سمجھدار ہیں۔

وَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ ؕ لَوْ اَنْفَقْتَ

اور اُلفت ڈالی اُن کے دلوں میں اگر تو خرچ کر دیتا

مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ

جو کچھ زمین میں ہے سارا نہ اُلفت ڈال سکتا اُن کے

قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ ؕ اِنَّهٗ

دلوں میں لیکن اللہ نے اُلفت ڈالی اُن میں بیشک وہ زور آور ہے

عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ۝۶۳

حکمت والا

اسلام نے صدیوں کی جنگیں ختم کرادیں:

اسلام سے پہلے جب عرب میں جدال وقتال اور نفاق وشقاق کا بازار گرم تھا ادنیٰ ادنیٰ باتوں پر قبائل آپس میں ٹکراتے رہتے تھے۔ دو جماعتوں میں جب لڑائی شروع ہو جاتی تو صدیوں تک اس کی آگ ٹھنڈی نہ ہوتی تھی۔ مدینہ کے دو زبردست قبیلوں ''اوس'' و ''خزرج'' کی حریفانہ نبرد آزمائی اور دیرینہ عداوت وبغض کا سلسلہ کسی طرح ختم نہ ہوتا تھا۔ ایک دوسرے کے خون کا پیاسا اور عزت وآبرو کا بھوکا تھا۔ ان حالات میں آقائے نامدار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم توحید ومعرفت اور اتحاد واخوت کا عالمگیر پیغام لے کر مبعوث ہوئے۔ لوگوں نے انہیں بھی ایک فریق ٹھہرالیا اور سب نے مل کر خلاف وشقاق کا رخ ادھر پھیر دیا۔ پرانے کینے اور عداوتیں چھوڑ کر ہر قسم کی دشمنی کے لئے حضورؐ کی ذات قدسی صفات کو مطمح نظر بنالیا۔ وہ آپ کی پند ونصیحت سے گھبراتے تھے اور آپؐ کے سایہ سے بھاگتے تھے۔ دنیا کی کوئی طاقت نہ تھی جو درندوں کی بھیڑ اور بہائم کے گلہ میں معرفت الٰہی اور حب نبوی کی روح پھونک کر اور شراب توحید کا متوالا بنا کر سب کو ایک دم اخوت والفت باہمی کی زنجیر میں جکڑ دیتی اور اس مقدس ہستی کا درھم ناخریدہ غلام اور عاشق جاں نثار بنا دیتی جس سے زیادہ چند روز پہلے ان کے نزدیک کوئی مبغوض ہستی نہ تھی۔ بلاشبہ روئے زمین کے خزانے خرچ کر کے بھی یہ مقصد حاصل نہ کیا جا سکتا تھا جو اللہ کی رحمت واعانت سے ایسی سہولت کے ساتھ حاصل ہو گیا۔ خدا نے حقیقی بھائیوں سے زیادہ ایک کی الفت دوسرے کے دل میں ڈال دی اور پھر سب کی الفتوں کا اجتماعی مرکز حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات منبع البرکات کو بنا دیا۔ قلوب کو دفعۃً ایسا پلٹ دینا خدا کے زور قدرت کا کرشمہ ہے اور ایسی شدید ضرورت کے وقت سب کو محبت والفت کے ایک نقطہ پر جمع کر دینا اس کے کمال حکمت کی دلیل ہے۔ (تفسیر عثمانی)

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ

اے نبی کافی ہے تجھ کو اللہ اور جتنے تیرے ساتھ ہیں

الْمُؤْمِنِیْنَ ۝۶۴

مسلمان

افراد اور سامان کی قلت سے نہ گھبراؤ:

اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ اکثر سلف کے نزدیک یہ مطلب ہے کہ اے پیغمبر! خدا تجھ کو اور تیرے ساتھیوں کو کافی ہے۔ یعنی قلتِ عدد اور بے سروسامانی وغیرہ سے گھبرانا نہیں چاہئے۔ اور بعض علماء نے یہ معنی لئے ہیں کہ اے پیغمبر! تجھ کو فی الحقیقت اکیلا خدا کافی ہے اور ظاہرا اسباب کے اعتبار سے مخلص مسلمانوں کی جماعت خواہ کتنی ہی تھوڑی ہو کافی ہے۔ پہلے جو فرمایا تھا اَیَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ گویا یہ اسی کا خلاصہ ہوا۔ (تفسیر عثمانی)

طبرانی وغیرہ نے بروایت سعید بن جبیر حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل

کیا ہے کہ ۳۹ مرد وعورت ایمان لا چکے تھے، ان کے بعد حضرت عمرؓ مسلمان ہوئے۔ اس طرح چالیس مسلمان ہو گئے۔ اس وقت اللہ نے آیت یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ حَسْبُکَ اللّٰہُ الخ نازل فرمائی۔

بزار نے ضعیف سند کے ساتھ عکرمہ کی روایت سے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ جب حضرت عمرؓ مسلمان ہو گئے تو مشرکوں نے کہا آج ہماری قوم (کی طاقت) آدھی ہو گئی۔ اور اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

آیت مکی ہے یا مدنی:

یہ تمام احادیث بتا رہی ہیں کہ یہ آیت مکی ہے مگر کلام کی رفتار کا تقاضا ہے کہ اس کو مدنی کہا جائے کیونکہ یہ سورت بدر کے بعد نازل ہوئی (تو یہ آیت بھی بدر کے بعد مدینہ میں نازل ہوئی ہوگی) (تفسیر مظہری)

یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَی
اے نبی شوق دلا مسلمانوں کو لڑائی کا
الْقِتَالِ ؕ اِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ
اگر ہوں تم میں بیس شخص ثابت قدم رہنے والے
یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ ۚ وَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ
تو غالب ہوں دو سو پر اور اگر ہوں تم میں
مِّائَۃٌ یَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاَنَّھُمْ
سو شخص تو غالب ہوں ہزار کافروں پر اس واسطے کہ
قَوْمٌ لَّا یَفْقَھُوْنَ ﴿۶۵﴾
وہ لوگ سمجھ نہیں رکھتے

مسلمان دس گنا بڑے دشمن پر غالب ہیں:

یہ مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دی کہ تھوڑے بھی ہوں تو جی نہ چھوڑیں خدا کی رحمت سے دس گنے دشمنوں پر غالب آئیں گے۔ سبب یہ ہے کہ مسلمان کی لڑائی محض خدا کے لئے ہے۔ وہ خدا کو اور اس کی مرضی کو پہچان کر اور یہ سمجھ کر میدان جنگ میں قدم رکھتا ہے کہ خدا کے راستہ میں مرنا اصلی زندگی ہے اس کو یقین ہے کہ میری تمام قربانیوں کا ثمرہ آخرت میں ضرور ملنے والا ہے خواہ میں غالب ہوں یا مغلوب۔ اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے جو تکلیف میں اٹھاتا ہوں وہ فی الحقیقت مجھ کو دائمی خوشی اور ابدی مسرت سے ہمکنار کرنے والی ہے۔ مسلمان جب یہ سمجھ کر جنگ کرتا ہے تو تائید ایزدی مددگار ہوتی ہے اور موت سے وحشت نہیں رہتی۔ اسی لئے پوری دلیری اور بے جگری سے لڑتا ہے۔ کافر چونکہ اس حقیقت کو نہیں سمجھ سکتا اس لئے محض حقیر اور فانی اغراض کے لئے بہائم کی طرح لڑتا ہے اور قوت قلبی اور امداد غیبی سے محروم رہتا ہے۔ بناءً علیہ خبر اور بشارت کے رنگ میں حکم دیا گیا کہ مؤمنین کو اپنے سے دس گنے دشمنوں کے مقابلہ میں ثابت قدمی سے لڑنا چاہئے۔ اگر مسلمان بیس ہوں تو دو سو کے مقابلہ سے نہ ہٹیں اور سو ہوں تو ہزار کو پیٹھ نہ دکھلائیں۔

(تنبیہ) بیس اور سو دو عدد شاید اس لئے بیان فرمائے کہ اس وقت مسلمانوں کی تعداد کے لحاظ سے "سریہ" میں کم از کم بیس اور "جیش" میں ایک سو سپاہی ہوتے ہونگے۔ اگلی آیت مدت کے بعد اتری اس وقت مسلمانوں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ اس لئے سریہ کم از کم ایک سو کا اور جیش ایک ہزار کا ہوگا۔ دونوں آیتوں میں بیان نسبت کے وقت اعداد کا یہ تفاوت ظاہر کرتا ہے کہ اگلی آیت کے نزول کے وقت مسلمانوں کی مردم شماری بڑھ گئی تھی۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت عمیرؓ کی شہادت:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم صف بندی کے وقت مقابلے کے وقت برابر فوجوں کا دل بڑھاتے بدر کے دن فرمایا اٹھو اس جنت کو حاصل کرو جس کی چوڑائی آسمان و زمین کی ہے۔ حضرت عمیرؓ بن حمام کہتے ہیں اتنی چوڑائی؟ فرمایا ہاں ہاں اتنی ہی۔ اس نے کہا واہ واہ۔ آپؐ نے فرمایا یہ کس ارادے سے کہا؟ کہا اس امید پر کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی جنتی کر دے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری پیشگوئی ہے کہ تو جنتی ہے۔ وہ اٹھتے ہیں دشمن کی طرف بڑھتے ہیں اپنی تلوار کا میان توڑ دیتے ہیں کچھ کھجوریں جو پاس ہیں کھانی شروع کرتے ہیں، پھر فرماتے ہیں انہیں کھاؤں! اتنی دیر تک بھی اب یہاں ٹھہرنا مجھ پر شاق ہے۔ انہیں ہاتھ سے پھینک دیتے ہیں اور حملہ کر کے شیر کی طرح دشمن کے بیچ میں گھس جاتے ہیں اور جوہر تلوار دکھاتے ہوئے کافروں کی گردنیں مارتے ہوئے راہِ خدا میں شہید ہو جاتے ہیں، رضی اللہ عنہ وارضاہ۔ (تفسیر ابن کثیر)

اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰہُ عَنْکُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِیْکُمْ
اب بوجھ ہلکا کر دیا اللہ نے تم پر سے اور جانا کہ تم میں
ضَعْفًا ؕ فَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ مِّائَۃٌ صَابِرَۃٌ
سستی ہے سو اگر ہوں تم میں سو شخص ثابت قدم رہنے والے

يَّغۡلِبُوۡا مِائَتَيۡنِ ۚ وَاِنۡ يَّكُنۡ مِّنۡكُمۡ

تو غالب ہوں دو سو پر اور اگر ہوں تم میں

اَلۡفٌ يَّغۡلِبُوۡۤا اَلۡفَيۡنِ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ

ہزار تو غالب ہوں دو ہزار پر اللہ کے حکم سے

مَعَ الصّٰبِرِيۡنَ ﴿۶۶﴾

اور اللہ ساتھ ہے ثابت قدم رہنے والوں کے

دوگنی طاقت کے مقابلہ سے بھاگنا حرام ہے:

بخاری میں ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ گزشتہ آیت جس میں مسلمانوں کو دس گنا کافروں کے مقابلہ پر ثابت قدم رہنے کا حکم تھا، جب لوگوں کو بھاری معلوم ہوئی تو اس کے بعد یہ آیت اتری۔ اَلۡئٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ الخ یعنی خدا نے تمہاری ایک قسم کی کمزوری اور سستی کو دیکھ کر پہلا حکم اٹھالیا تھا۔ اب صرف اپنے سے دوگنی تعداد کے مقابلہ میں ثابت قدم رہنا ضروری اور بھاگنا حرام ہے یہ کمزوری یا سستی جس کی وجہ سے حکم میں تخفیف ہوئی نئی وجوہ سے ہوسکتی ہے۔ ابتدائے ہجرت میں گنے چنے مسلمان تھے جن کی قوت وجلادت معلوم تھی۔ کچھ مدت کے بعد ان میں کے بہت سے افراد بوڑھے اور کمزور ہوگئے اور جو نئی پود آئی ان میں پرانے مہاجرین وانصار جیسی بصیرت، استقامت اور تسلیم وتفویض نہ تھی، اور تعداد بڑھ جانے سے کسی درجہ میں اپنی کثرت پر نظر اور '' توکل علی اللہ '' میں قدرے کمی ہوئی ہوگی۔ اور ویسے بھی طبیعت انسانی کا خاصہ ہے کہ جو سخت کام تھوڑے آدمیوں پر پڑ جائے تو کرنے والوں میں جوش عمل زیادہ ہوتا ہے اور ہر شخص اپنی بساط سے بڑھ کر ہمت کرتا ہے لیکن وہی کام جب بڑے مجمع پر ڈال دیا جائے تو ہر ایک دوسرے کا منتظر رہتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ آخر کچھ میں ہی تنہا تو اس کا ذمہ دار نہیں۔ اسی قدر جوش حرارت اور ہمت میں کمی ہو جاتی ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اول کے مسلمان یقین میں کامل تھے، ان پر حکم ہوا تھا کہ اپنے سے دس گنے کافروں پر جہاد کریں، پچھلے مسلمان ایک قدم کم تھے، تب یہی حکم ہوا کہ دوگنوں پر جہاد کریں۔ یہی حکم اب بھی باقی ہے لیکن اگر دو سے زیادہ پر حملہ کریں تو بڑا اجر ہے۔ حضرت کے وقت میں ہزار مسلمان اسی ہزار سے لڑے ہیں۔ '' غزوۂ موتہ '' میں تین ہزار مسلمان دو لاکھ کفار کے مقابلہ میں ڈٹے رہے۔ اس طرح کے واقعات سے اسلام کی تاریخ بحمد اللہ بھری پڑی ہے۔ (تفسیر عثمانی)

مَا كَانَ لِنَبِىٍّ اَنۡ يَّكُوۡنَ لَهٗۤ اَسۡرٰى

نبی کو نہیں چاہئے کہ اپنے ہاں رکھے قیدیوں کو

حَتّٰى يُثۡخِنَ فِى الۡاَرۡضِ ؕ تُرِيۡدُوۡنَ عَرَضَ

جب تک خوب خونریزی نہ کرلے ملک میں تم چاہتے ہو

الدُّنۡيَا ۖ وَاللّٰهُ يُرِيۡدُ الۡاٰخِرَةَ ؕ وَاللّٰهُ

اسباب دنیا کا اور اللہ کے ہاں چاہئے آخرت اور اللہ زور آور ہے

عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ﴿۶۷﴾

حکمت والا

بدر کے قیدیوں کا فیصلہ:

بدر کی لڑائی سے ستر کافر مسلمانوں کے ہاتھوں میں قید ہو کر آئے۔ حق تعالیٰ نے ان کے متعلق دو صورتیں مسلمانوں کے سامنے پیش کیں۔ قتل کر دینا، یا فدیہ لے کر چھوڑ دینا اس شرط پر کہ آئندہ سال اسی تعداد میں تمہارے آدمی قتل کئے جائیں گے۔ حقیقت میں خدا کی طرف سے ان دو صورتوں کا انتخاب کے لئے پیش کرنا، امتحان وآزمائش کے طریقہ پر تھا کہ ظاہر ہو جائے کہ مسلمان اپنی رائے اور طبیعت سے کس طرف جھکتے ہیں۔ جیسے ازواج مطہرات کو دو صورتوں میں تخییر دی گئی تھی۔ اِنۡ كُنۡتُنَّ تُرِدۡنَ الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا وَزِيۡنَتَهَا فَتَعَالَيۡنَ الی آخر الآیۃ (الاحزاب رکوع ۴) یا معراج میں آپ کے سامنے خمر ولبن (دودھ اور شراب) کے دو برتن پیش کئے گئے تھے، آپ نے دودھ کو اختیار فرمایا۔ جبریلؑ نے کہا کہ اگر بالفرض آپ شراب کو اختیار فرماتے تو آپ کی امت بہک جاتی۔ بہر حال آپؐ نے صحابہؓ سے اس معاملہ میں رائے طلب کی۔

حضرت ابوبکرؓ کی رائے:

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یا رسول اللہ یہ سب قیدی اپنے خویش واقارب اور بھائی بند ہیں۔ بہتر ہے کہ فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ اس نرم سلوک اور احسان کے بعد ممکن ہے کچھ لوگ مسلمان ہو کر وہ خود اور ان کی اولاد واتباع ہمارے دست و بازو بنیں اور جو مال بالفعل ہاتھ آئے اس سے جہاد وغیرہ دینی کاموں میں سہارا لگے۔ باقی

آئندہ سال ہمارے ستر آدمی شہید ہو جائیں تو مضائقہ نہیں درجۂ شہادت ملے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا میلان بھی فطری رحمدلی اور شفقت و صلۂ رحمی کی بناء پر اسی رائے کی طرف تھا۔ بلکہ صحابہؓ کی عام رائے اسی جانب تھی۔ بہت سے تو ان ہی وجوہ کی بناء پر جو ابوبکرؓ نے بیان فرمائیں اور بعض محض مالی فائدہ کو دیکھتے ہوئے اس رائے سے متفق تھے۔ (کما یظھر من قولہ تعالیٰ تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا صرح به الحافظ ابن حجرو ابن القیم رحمه الله)

حضرت عمرؓ کی رائے:

حضرت عمرؓ اور سعدؓ بن معاذ نے اس سے اختلاف کیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ یارسول اللہ! یہ قیدی کفر کے امام اور مشرکین کے سردار ہیں ان کو ختم کر دیا جائے تو کفر و شرک کا سر ٹوٹ جائے گا، تمام مشرکین سے ہماری انتہائی نفرت و بغض اور کامل بیزاری کا اظہار ہو جائے گا کہ ہم نے خدا کے معاملہ میں اپنی قرابتوں اور مالی فوائد کی کچھ پروا نہیں کی اس لئے مناسب ہے کہ ان قیدیوں میں جو کوئی ہم میں سے کسی کا عزیز و قریب ہو، وہ اسے اپنے ہاتھ سے قتل کرے۔

فیصلہ: الغرض بحث و تمحیص کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے مشورہ پر عمل ہوا، کیونکہ کثرت رائے ادھر تھی اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم طبعی رافت و رحمت کی بناء پر اسی طرف مائل تھے اور ویسے بھی اخلاقی اور کلی حیثیت سے عام حالات میں وہ ہی رائے قرین صواب معلوم ہوتی ہے لیکن اسلام اس وقت جن حالات میں سے گزر رہا تھا، ان پر نظر کرتے ہوئے وقتی مصالح کا تقاضا یہ تھا کہ کفار کے مقابلہ میں سخت کمر شکن کارروائی کی جائے۔ تیرہ سال کے ستم کشوں کو طاغوت کے پرستاروں پر یہ ثابت کر دینے کا پہلا موقع تھا کہ تمہارے تعلقات قرابت اموال، جتھے اور طاقتیں، اب کوئی چیز تم کو خدا کی شمشیر انتقام سے پناہ نہیں دے سکتی۔ ابتداءً ایک مرتبہ ظالم مشرکین پر رعب و ہیبت بٹھلا دینے کے بعد نرم خوئی اور صلہ رحمی کے استعمال کے لئے آئندہ بہتیرے مواقع باقی رہتے تھے۔ ادھر ستر مسلمانوں کے آئندہ قتل پر راضی ہو جانا معمولی بات نہ تھی۔

اس فیصلہ کی ناپسندیدگی:

اس لئے اس رائے کو اختیار فرمانا وقتی مصالح اور ہنگامی حیثیت سے حق تعالیٰ کے یہاں پسندیدہ نہ ہوا، "ما کان لنبی ان یکون له اسریٰ حتیٰ یثخن فی الارض" میں اسی ناپسندیدگی کی طرف اشارہ ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کی یہ ایک سخت خطرناک اجتہادی غلطی قرار دی گئی۔ اور جن بعض لوگوں نے زیادہ تر مالی فوائد پر نظر کر کے اس سے اتفاق کیا تھا ان کو صاف طور پر " تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا " سے خطاب کیا گیا۔ یعنی تم دنیا کے فانی اسباب پر نظر کر رہے ہو، حالانکہ مؤمن کی نظر انجام پر ہونی چاہئے۔ خدا کی حکمت مقتضی ہو تو وہ تمہارا کام اپنے زور قدرت سے ظاہری سامان کے بدون بھی کر سکتا ہے۔ بہر حال فدیہ لے کر چھوڑ دینا اس وقت کے حالات کے اعتبار سے بڑی بھاری غلطی قرار دی گئی۔ اتنا یاد رکھنا چاہئے کہ روایات سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ محض صلہ رحمی اور رحمدلی کی بناء پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رجحان اس رائے کی طرف تھا۔ البتہ صحابہؓ میں بعض صرف مالی فوائد کو پیش نظر رکھ کر اور اکثر حضرات دوسری مصالح دینیہ اور اخلاقی داعیہ کے ساتھ مالی ضروریات کو بھی ملحوظ رکھتے ہوئے یہ رائے پیش کر رہے تھے۔ گویا صحابہؓ کے مشورہ میں کلاً یا جزءً مالی حیثیت ضرور زیرِ نظر تھی کسی درجہ میں مالی فوائد کے خیال سے "بغض فی اللہ" میں کوتاہی کرنا اور اصل مقصد "جہاد" سے غفلت برتنا اور ستر مسلمانوں کے قتل کئے جانے پر اپنے اختیار سے رضامند ہو جانا صحابہؓ جیسے مقربین کی شان عالی اور منصب جلیل کے منافی سمجھا گیا۔ اسی لئے ان آیات میں سخت عتاب آمیز لہجہ اختیار کیا گیا ہے۔ حدیث میں ہے کہ لڑائی میں ایک شخص کے سر پر زخم آیا، اسے غسل کی حاجت ہوئی۔ پانی سر پر استعمال کرنا سخت مہلک تھا۔ ساتھیوں سے مسئلہ پوچھا، انہوں نے کہا کہ پانی کی موجودگی میں ہم تیرے لئے کوئی گنجائش نہیں پاتے۔ اس نے غسل کر لیا اور فوت ہو گیا۔ حضور کو جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی فرمایا، " قتلوہ قتلهم الله " الحدیث۔ اس سے ظاہر ہوا کہ اجتہادی غلطی اگر زیادہ واضح اور خطرناک ہو تو اس پر عتاب ہو سکتا ہے۔ گویا یہ سمجھا جاتا ہے کہ مجتہد نے پوری قوت اجتہاد صرف کرنے میں کوتاہی کی۔ (تفسیر عثمانی)

بدر کے ایک قیدی حضرت عباسؓ:

امام احمدؒ نے حضرت انسؓ کی روایت سے، ابن مردویہ نے حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے ابن ابی شیبہ احمد، ترمذی، ابن المنذر اور طبرانی وغیرہ نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے ابن المنذر ابن مردویہ ابوالشیخ اور ابونعیم نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے اور ترمذی نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت کو حسن بھی کہا ہے کہ بدر کے قیدیوں میں حضرت عباسؓ بھی تھے۔ ایک انصاری نے آپ کو گرفتار کیا تھا اور انصاریوں نے ان کو قتل کر دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کو جو یہ اطلاع ملی تو (آپ کو رات بھر نیند نہیں آئی اور) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے اپنے چچا عباس کے خیال سے آج رات نیند نہیں آئی۔ انصار کا خیال ہے کہ عباسؓ کو قتل کر دیں۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ تو کیا میں انصار کے پاس جاؤں فرمایا ہاں! حضرت عمرؓ انصار کے پاس گئے اور ان سے کہا عباسؓ کو چھوڑ دو انصار نے کہا واللہ ہم نہیں چھوڑیں گے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی کو پسند کرتے ہیں۔ انصار نے کہا اگر رسول اللہؐ کی یہ رضا ہے تو ان کو لے لو۔ حضرت عمرؓ نے حضرت عباسؓ کو لے لیا۔ جب عباسؓ قبضہ میں آ گئے تو حضرت عمرؓ نے کہا عباسؓ مسلمان ہو جاؤ۔ آپ کا اسلام لانا مجھے خطابؓ کے مسلمان ہونے سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ اور اس بات کی صرف یہ وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کا مسلمان ہونا پسند ہے۔

مختلف آراء: بخاری اور بیہقی نے حضرت انسؓ بن مالک کی روایت سے لکھا ہے کہ کچھ انصاری اجازت لے کر خدمت گرامی میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ اگر آپ اجازت دیں تو ہم آپ کے بھانجے عباسؓ کا زر فدیہ معاف کر دیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں خدا کی قسم ایک درہم بھی نہ چھوڑو۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ قیدی اللہ نے تمہارے قابو میں کر دیئے ہیں۔ یہ سب تمہارے بھائی بند ہیں ان کے متعلق تم لوگوں کا کیا مشورہ ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ آپؐ کے قبیلہ کنبہ کے لوگ ہیں اللہ نے ان پر آپ کو کامیابی اور نصرت عنایت کر دی ہے۔ یہ سب چچا زادے ہیں قبیلہ والے ہیں بھائی ہیں ان کو قتل نہ کیجئے۔ میری رائے ہے کہ ان سے زرِ فدیہ لے لیجئے ہم کو جو مال ان سے وصول ہوگا وہ کافروں کے مقابلہ کے لئے ہمارے لئے باعث قوت ہوگا اور امید ہے کہ آپؐ کے ذریعے سے اللہ ان کو ہدایت فرما دے گا اور یہ آپؐ کے بازو بن جائیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابن خطاب تمہاری کیا رائے ہے۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ان لوگوں نے آپ کو جھٹلایا، وطن سے نکال باہر کیا اور آپؐ سے جنگ کی، میری رائے ابوبکرؓ کی رائے کے موافق نہیں۔ میری رائے ہے کہ فلاں شخص (حضرت عمرؓ کا ایک قریبی عزیز تھا اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے کہا) کو آپؐ میرے قابو میں دے دیں کہ میں اس کی گردن ماردوں تا کہ اللہ کو معلوم ہو جائے کہ ہمارے دلوں میں مشرکوں کی محبت نہیں ہے۔ یہ قریش کے سرداران ہیں پیشوا ہیں لیڈر رہیں ان کی گردنیں مار دیجئے۔

حضرت ابوبکر و حضرت عمرؓ کی مثال:

حضرت عبد اللہ بن رواحہ نے کہا یا رسول اللہ وادی میں بہت سی لکڑیاں جمع کر کے آگ لگا کر ان کو جلا ڈالئے۔ حضرت عباسؓ عبداللہ کی یہ بات سن رہے تھے بولے تم نے قرابت کا رشتہ کاٹ دیا اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لے گئے۔ کچھ لوگ کہنے لگے حضرت ابوبکرؓ کی بات رسول اللہؐ قبول کر لینگے۔ کسی نے کہا حضرت عمرؓ کے مشورہ پر چلیں گے، اور بعض کا خیال ہوا کہ حضرت عبد اللہؓ بن رواحہ کی رائے اختیار کر لینگے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اور فرمایا کچھ لوگوں کے دل اللہ اتنے نرم کر دیتا ہے کہ وہ دودھ سے بھی زیادہ نرم ہو جاتے ہیں اور بعض کے دل اتنے سخت کر دیتا ہے کہ پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو جاتے ہیں۔ ابوبکرؓ تمہاری مثال (صحابہؓ میں) ایسی ہے جیسے ملائکہ میں میکائیلؑ جو بارش لاتے ہیں اور انبیاء میں جیسے ابراہیمؑ جنہوں نے کہا تھا فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ جو میری پیروی کرے وہ میرا ہے اور جو میری نافرمانی کرے تو بے شک تو بخشنے والا مہربان ہے۔ عمرؓ تمہاری مثال (صحابہؓ میں) ایسی ہے جیسے ملائکہ میں جبرئیلؑ جو سخت مصیبت اور عذاب اللہ کے دشمنوں پر لاتا ہے اور انبیاء میں جیسے حضرت نوحؑ جنہوں نے کہا تھا رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا اے رب زمین پر کافروں کے کسی متنفس کو نہ چھوڑ یا جیسے انبیاء میں حضرت موسیٰؑ تھے جنہوں نے کہا تھا رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ اے اللہ ان کے مالوں کو یکسر برباد کر دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے کہ ایمان نہ لائیں یہاں تک کہ دردناک عذاب دیکھ لیں (اور معائنہ عذاب کے بعد ایمان قبول نہیں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تم دونوں متفق الرائے ہوتے تو میں تمہاری رائے کے خلاف نہ کرتا، تم لوگ نادار ہو اس لئے ان میں سے کوئی بغیر فدیہ ادا کئے نہیں چھوٹ سکتا یا اس کی گردن ماردی جائے گی۔

سہیل بن بیضاء: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ سہیل بن بیضاء کو مستثنیٰ فرما دیجئے۔ میں نے اس کو اسلام کا ذکر کرتے سنا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کا بیان ہے مجھے آسمان سے اپنے اوپر پتھر برسنے کا اندیشہ اس روز سے زیادہ کبھی نہیں ہوا (کہ میں نے ایک کافر کی سفارش کی) آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سہیل بن بیضاء مستثنیٰ ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ رو رہے تھے:

دوسرا دن ہوا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ صبح ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ رو رہے ہیں۔عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رونے کی کیا وجہ ہے۔ بتایئے اگر میں بھی رو سکا تو روؤنگا، ورنہ آپ دونوں کے رونے کی وجہ سے رونی شکل بنا لونگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابن خطاب کی رائے کے خلاف کرنے سے ہم پر دردناک عذاب آنے والا ہی تھا اگر عذاب آ جاتا تو ابن خطاب کے علاوہ عذاب سے کوئی بھی نہ بچتا۔ ایک قریب کے درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا اس درخت سے بھی زیادہ نزدیک عذاب جو تم لوگوں پر آنے والا تھا مجھے دکھایا گیا (مگر اللہ نے وہ عذاب ٹال دیا) اس پر آیات ذیل کا نزول ہوا۔ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ

ضحاک کی روایت میں آیا ہے جب بدر کے دن مشرک شکست کھا کر بھاگے تو لوگ لڑائی چھوڑ کر مال غنیمت جمع کرنے میں مشغول ہو گئے۔اس سے حضرت عمرؓ کو اندیشہ پیدا ہو گیا کہ کہیں کفار پھر پلٹ کر حملہ نہ کر دیں۔

مسئلہ: علماء کا بالاتفاق فیصلہ ہے کہ امام المسلمین کو قیدیوں کو قتل کر دینے کا اختیار ہے۔ یہ آیت اسی مضمون پر دلالت کر رہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی قریظہ کو قتل کرا دیا تھا اور نضر بن حارث طعیمہ بن عدی اور عقبہ بن ابی معیط کو بھی گرفتاری کے بعد قتل کرا دیا تھا۔ سبیل الرشاد میں ہے کہ عقبہ بن ابی معیط نے کہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم بچوں کا کون ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آگ۔ عقبہ کو بقول ابن اسحٰق ابن ابی الافلح نے قتل کیا تھا اور بقول ابن ہشام حضرت علیؓ بن ابی طالب نے۔

مسئلہ: قیدیوں کو غلام بنائے رکھنا باتفاق علماء جائز ہے۔ اس میں کافروں کے شر کا دفعیہ اور مسلمانوں کی مصلحت کی تکمیل ہوتی ہے۔ اسی بناء پر امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کوئی از خود قیدی کو قتل کرنے کا اختیار نہیں رکھتا۔ یہ فیصلہ امام کے ہاتھ میں ہے وہ جو مناسب سمجھے کرے ہاں اگر کسی نے از خود (بغیر امام کی اجازت کے) قیدی کو قتل کر دیا تو اس کو قتل کا تاوان نہیں دینا پڑے گا۔

مسئلہ: قیدیوں کو چھوڑ کر بلا معاوضہ دارالحرب میں بھیج دینا یا تاوان لے کر دارالحرب بھیج دینا یا مسلمان قیدیوں سے تبادلہ کر لینا یا ذمی بنا کر دارالاسلام میں آزادی کے ساتھ رکھنا یہ سب شقیں اما مناً بعد و اما فداءً اکی ہیں۔

قوی ترین روایت یہ ہے کہ تبادلہ جائز ہے صاحبین کا بھی قول یہی ہے۔ رہا آزاد کر کے ذمی بنا لینا تو امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک جائز ہے۔ حضرت عمرؓ نے اہل عراق اور باشندگان شام کو ذمی بنا کر رکھا تھا۔

امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ اگر مفت یا مال لے کر یا قیدیوں سے تبادلہ کر کے ان کافروں کو دارالحرب بھیج دیا جائے گا تو کافروں کو قوت حاصل ہو گی اور لوٹ کر وہ دوبارہ ہم سے لڑینگے۔

مسلم نے صحیح میں ابو داؤد نے مسند میں اور ترمذی نے جامع میں حضرت عمران بن حصین کے حوالہ سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مسلمانوں کا ایک مشرک (قیدی) سے تبادلہ کیا۔

بنی فزارہ کے قیدی لڑکے کے بدلہ مسلمانوں کی آزادی:

مسلم اور احمد اور اصحاب السنن الاربعہ نے حضرت سلمہؓ بن اکوع کے حوالہ سے بیان کیا، حضرت سلمہؓ نے کہا رسول اللہ نے حضرت ابوبکرؓ کو ہمارا امیر بنا کر جہاد پر بھی بھیجا۔ ہم نے آپ کے زیر قیادت بنی فزارہ پر لشکر کشی کی۔ جب (بنی فزارہ کے) پانی پر پہنچنے کے لئے ایک گھنٹہ کی مسافت رہ گئی تو حضرت ابوبکرؓ کے حکم پر ہم نے پڑاؤ کیا۔ پھر آپ نے بنی فزارہ پر حملہ کر دیا اور ان کے پانی پر اتر گئے اور وہاں جس (فزاری) کو مارا جانا تھا مارا گیا۔ میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ جن میں عورتیں اور بچے تھے ایک بلندی کی طرف جا رہے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ مجھ سے پہلے یہ پہاڑی پر پہنچ جائیں گے۔ (اور محفوظ ہو جائیں گے) اس لئے میں نے ان کے اور پہاڑ کے درمیان حائل ہو کر ان پر تیر برسانا شروع کئے۔ جب انہوں نے تیر (برستے دیکھے تو رک گئے اور میں ان کو ہنکا تا لے آیا۔ ان میں بنی فزارہ کی ایک عورت بھی تھی جس کے ساتھ عرب کی حسین ترین ایک لڑکی تھی۔ میں ان کو ہنکاتا ہوا حضرت ابوبکرؓ تک لے آیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے وہ لڑکی مجھے عنایت کر دی پھر ہم مدینہ کو آ گئے مگر (راستہ میں) میں نے اس لڑکی کا کپڑا تک نہیں کھولا۔ بازار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات مجھ سے ہوئی۔ حضورؐ نے فرمایا سلمہؓ یہ عورت مجھے دے دے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ تو مجھے پسند ہے اور میں نے اب تک اس کا کپڑا ابھی نہیں کھولا ہے۔ حضورؐ خاموش ہو گئے۔ دوسرا دن ہوا تو پھر بازار میں رسول اللہؐ سے ملاقات ہوئی اور حضورؐ نے فرمایا سلمہ اللہ تیرا بھلا کرے یہ عورت مجھے دے دے۔ میں نے جواب دیا یا رسول اللہ یہ آپؐ کے لئے ہے۔ میں نے اس کا کپڑا ابھی نہیں کھولا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کو مکہ بھیج دیا اور مکہ میں جو مسلمان قیدی تھے اس کے عوض ان قیدیوں کو رہا کرا لیا۔

حضرت زینبؓ کا ہار:

ابن اسحٰق اور ابو داؤد نے حضرت عائشہؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ جب مکہ

والوں نے اپنے قیدیوں کا زرفدیہ بھیجا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینبؓ نے بھی اپنے شوہر ابوالعاص کے فدیہ میں وہ ہار بھیجا جو ان کو حضرت خدیجہؓ نے جہیز میں دیا تھا۔ اس ہار کو دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سخت رقت طاری ہوگئی اور صحابہؓ سے فرمایا اگر تم مناسب سمجھو تو زینبؓ کے قیدی کو چھوڑ دو اور جو چیز اس نے بھیجی ہے اس کو بھی واپس کردو۔ صحابہؓ نے اس حکم کی تعمیل کی۔ حاکم کی صحیح روایت میں اتنا زائد آیا ہے کہ ابوالعاص کو چھوڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے وعدہ لے لیا تھا کہ وہ حضرت زینبؓ کو بھیج دے اس نے وعدہ کے مطابق عمل کیا۔

مطعم بن عدی کی درخواست قبول ہوتی:

صحیح بخاری میں ہے کہ بدر کے قیدیوں کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر مطعم بن عدی زندہ ہوتا اور ان لوگوں کے متعلق مجھ سے درخواست کرتا تو اس کی وجہ سے میں ان کو (بلا معاوضہ) چھوڑ دیتا۔

ثمامہ بن آثال کا مسلمان ہونا:

حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ سوار یمامہ کی جانب روانہ کئے وہ بنی حنیفہ کے ایک آدمی کو پکڑ لائے جس کو ثمامہ بن اثال کہا جاتا تھا۔ صحابہؓ نے اس کو مسجد کے ایک ستون سے باندھ دیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس تشریف لائے اور فرمایا ثمامہ تیرے پاس کیا ہے۔ ثمامہ نے جواب دیا بھلائی۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر تم مجھے قتل کر دو گے تو خونی کو قتل کرو گے اگر کرم کر کے چھوڑ دو گے تو شکرگزار پر کرم کرو گے اگر تم مال چاہتے ہو تو جتنا چاہو طلب کرو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو یونہی چھوڑ کر تشریف لے گئے۔ دوسرا دن ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پھر تشریف لائے اور فرمایا ثمامہ کیا خیال ہے۔ ثمامہ نے گذشتہ جواب کی طرح جواب دیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم چھوڑ کر تشریف لے گئے تیسرا روز ہوا تو پھر تشریف لائے اور فرمایا ثمامہ تیرا کیا خیال ہے ثمامہ نے جواب دیا میرا خیال وہی ہے جو میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہہ چکا ہوں۔ فرمایا ثمامہ کو چھوڑ دو۔ صحابہؓ نے کھول دیا۔ مسجد کے پاس ہی کچھ کھجور کے درخت تھے وہاں جا کر ثمامہ نے غسل کیا پھر مسجد میں آیا اور کہا اشھد ان لا الہ الا اللّٰہ و اشھد ان محمداً رسول اللّٰہ۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی قسم روئے زمین پر کسی کی صورت سے مجھے اتنی نفرت نہ تھی جتنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت سے تھی مگر اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ تمام لوگوں سے زیادہ مجھے محبوب ہے۔ خدا کی قسم کسی دین سے مجھے اتنی نفرت نہ تھی جتنی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین سے تھی مگر اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مذہب مجھے تمام مذاہب سے زیادہ پیارا ہو گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا شہر تمام شہروں سے زیادہ میرے لئے قابلِ نفرت تھا مگر اب تمام شہروں سے زیادہ مجھے محبوب ہو گیا۔ میں عمرہ کرنے جا رہا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سواروں نے پکڑ لیا۔ اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حکم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ثمامہ کو بشارت دی اور عمرہ کرنے کا حکم دیا۔ جب ثمامہؓ مکہ پہنچے تو ایک شخص نے کہا کہ تم بے دین ہو گئے۔ ثمامہؓ نے کہا نہیں میں اسلام لے آیا آئندہ خدا کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر یمامہ سے گیہوں کا ایک دانہ بھی تمہارے پاس نہیں پہنچے گا۔

حضرت عمرؓ اور حضرت سعدؓ کی فضیلت:

امام احمد نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے قیدیوں کے متعلق لوگوں سے مشورہ طلب کیا اور فرمایا اللہ نے ان پر تم کو قابو عطا فرما دیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا یارسول اللہ ان کی گردنیں مار دیجئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان (کے مشورہ) کی طرف توجہ نہ دی۔ حضرت ابوبکرؓ نے کھڑے ہو کر عرض کیا مناسب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے درگزر فرمائیں اور فدیہ قبول کر لیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (حضرت ابوبکرؓ کے مشورہ کے موافق) ان کو معاف کر دیا اور فدیہ قبول کر لیا اس پر اللہ نے نازل فرمایا۔

لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ

ابن اسحٰق نے لکھا ہے کہ جتنے لوگ وہاں حاضر تھے ان میں سے سوائے حضرت عمر بن خطاب اور حضرت سعد بن معاذؓ کے کوئی مال فدیہ کو ناپسند نہیں کرتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے ضرور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قیدیوں کو قتل کرنے کا مشورہ دیا تھا اور حضرت سعدؓ بن معاذ نے بھی عرض کیا تھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خوب خوں ریزی کرنی میرے نزدیک ان لوگوں کو باقی رکھنے سے اچھی ہے اسی لئے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا تھا کہ اگر آسمان سے عذاب آ جاتا تو سوائے عمرؓ بن خطاب اور سعد بنؓ معاذ کے اور کوئی نہ بچتا۔

قیدیوں کے برابر مسلمانوں کی شہادت:

ابن ابی شیبہ، ترمذی نسائی، ابن سعد ابن جریر ابن حبان اور بیہقی نے حضرت علیؓ کی روایت سے لکھا ہے اور ترمذی نے اس کو حسن کہا ہے کہ حضرت جبرئیل نے آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا محمد صلی اللہ علیہ

وسلم تمہاری قوم نے جو قیدیوں کا فدیہ لے لیا ان کی یہ حرکت اللہ کو ناپسند ہوئی اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ اپنی قوم کو دو باتوں میں سے ایک کو اختیار کرنے کا حکم دیدو یا تو وہ آگے بڑھ کر ان قیدیوں کی گردنیں ماردیں یا ان کا فدیہ لے لیں لیکن فدیہ لینے کی شرط یہ ہے کہ قیدیوں کی گنتی کی برابر تمہاری قوم کے آدمی (آئندہ) مارے جائیں گے رسول اللہ نے لوگوں کو بلوا کر ان سے اس حکم کا ذکر کیا۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ قیدی تو ہمارا خاندانی کنبہ ہیں ہمارے بھائی ہیں ہم ان سے فدیہ اس لئے لے رہے ہیں کہ دشمنوں کے مقابلہ میں ہم کو (اسلحہ وغیرہ کی) قوت حاصل ہوجائے اب اگر ان لوگوں کی گنتی کے برابر ہمارے آدمی شہید ہوجائیں تو ہم اس کو برا نہیں سمجھتے (چنانچہ آئندہ جنگ احد میں ستر صحابی شہید ہوگئے)

حضرت عباسؓ کا مسلمان ہونا:

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب بھی بدر کے دن گرفتار کر لئے گئے تھے آپ ان دس میں سے ایک تھے جنھوں نے بدر والے کافروں کے کھانے کا ذمہ لیا تھا خاص بدر کے دن سب (قریش اور دوسرے کافروں کو کھانا کھلانے کی آپ کی باری تھی۔ آپ بیس اوقیہ سونا کھانا کھلانے کے لئے لے کر آئے تھے۔ جب بدر کے دن جنگ ہوگئی تو وہ سونا حضرت عباسؓ کے پاس رہ گیا اور جب گرفتار ہوئے تو وہ سونا بھی آپ کے پاس ہی تھا۔ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ یہ بیس اوقیہ میرے زرفدیہ میں محسوب کر لیا جائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انکار کردیا اور فرمایا جو چیز تم (اسلام کے خلاف) کام میں لانے کے لئے لے کر نکلے ہو میں اس کو تمہارے لئے نہیں چھوڑوں گا (یعنی زرفدیہ میں شمار نہیں کرونگا) حضرت عباسؓ کو مجبور کیا گیا کہ اپنے دونوں بھتیجوں عقیل بن ابی طالب اور نوفل بن حارث کا فدیہ ادا کریں حضرت عباسؓ نے عرض کیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم نے مجھے ایسا کر کے چھوڑا ہے کہ جب تک زندہ رہوں قریش کے سامنے بھیک مانگتا پھروں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو وہ سونا کیا ہوا جو مکہ سے چلتے وقت تم ام الفضل کو دے آئے تھے اور یہ کہہ آئے تھے معلوم نہیں مجھے کیا پیش آئے۔ اگر کوئی حادثہ پیش آجائے تو یہ سونا تمہارا اور عبداللہ اور عبیداللہ اور فضل اور قثم کے لئے موجود ہے یعنی حضرت عباس کے چاروں بیٹوں کے لئے حضرت عباسؓ نے عرض کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کس نے بتایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے رب نے بتایا۔ حضرت عباسؓ فوراً بول اٹھے اشھد ان لا الہ الا اللہ و اشھد انک عبدہ ورسولہ۔ سوائے اللہ کے اس سے کوئی واقف نہ تھا۔ ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، بیہقی ابونعیم اسحاق بن راہویہ۔

سبیل الرشاد میں ذکر کیا گیا ہے کہ اس آیت کے نزول کے وقت حضرت عباسؓ نے فرمایا کاش مجھے اس مال سے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لیا ہے کئی گنا زیادہ لیا ہوتا کیونکہ اللہ نے مجھے اس مال سے بہتر عنایت کردیا یعنی چالیس غلام عنایت کردیئے جن میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں (میرا) مال ہے جس سے وہ کمائی کرتا ہے (اور وہ کمائی میری ہوتی ہے) اور مجھے اللہ سے مغفرت کی امید بھی لگی ہوئی ہے۔

لَوۡلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمۡ
اگر نہ ہوتی ایک بات جس کو لکھ چکا اللہ پہلے سے
فِيۡمَاۤ اَخَذۡتُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ ﴿۶۸﴾
تو تم کو پہنچتا اس لینے میں بڑا عذاب

سزا رک جانے کی وجہ:

یعنی یہ غلطی تو فی حد ذاتہ ایسی تھی کہ سخت سزا ان لوگوں کو دی جاتی جنھوں نے دنیوی سامان کا خیال کر کے ایسا مشورہ دیا۔ مگر سزا دہی سے وہ چیز مانع ہے جو خدا پہلے سے لکھ چکا اور طے کر چکا ہے۔ اور وہ کئی باتیں ہوسکتی ہیں (۱) مجتہد کی اس قسم کی اجتہادی خطاء پر عذاب نہیں ہوگا (۲) جب تک خدا امراً ونہیاً کسی چیز کا صاف حکم بیان نہ فرمائے اس وقت تک اس کے مرتکب کو عذاب نہیں دیتا (۳) اہل بدر کی خطاؤں کو خدا معاف فرما چکا ہے (۴) غلطی سے جو رویہ قبل از وقت اختیار کرلیا گیا یعنی فدیہ لے کر قیدیوں کو چھوڑ دینا خدا کے علم میں طے شدہ تھا کہ آئندہ اس کی اجازت ہوجائیگی۔ ''فَاِمَّا مَنًّۢا بَعۡدُ وَاِمَّا فِدَآءً'' (۵) یہ بھی طے شدہ ہے کہ جب تک پیغمبر علیہ السلام ان میں موجود ہیں یا لوگ صدق دل سے استغفار کرتے ہیں، عذاب نہ آئے گا (۶) ان قیدیوں میں سے بہت کی قسمت میں اسلام لانا لکھا گیا تھا۔ الغرض اس قسم کے موانع اگر نہ ہوتے تو یہ غلطی اتنی عظیم وثقیل تھی کہ سخت عذاب نازل ہوجانا چاہئے تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ اس قولی تنبیہ کے بعد وہ عذاب جو اس طرح کی خوفناک غلطی پر آسکتا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نہایت قریب کر کے پیش کیا گیا، گویا یہ قولی تنبیہ کو زیادہ موثر بنانے کی ایک صورت تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس منظر کو دیکھ کر وقف گریہ وبکاء ہوگئے، حضرت عمر نے سبب پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے سامنے اُن کا عذاب پیش کیا گیا ہے یعنی جس کا آنا ان پر ممکن تھا اگر موانع مذکورہ بالا نہ ہوتے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ پیش کرنا اسی قسم کا تھا جیسے صلوٰۃ کسوف ادا کرتے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم

کے سامنے جنت و دوزخ دیوار قبلہ میں متمثل کر دی گئی تھی۔ یعنی اس متوقع عذاب کا نظارہ کرانا تھا اور بس۔ (تفسیر عثمانی)

فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاتَّقُوا

سو کھاؤ جو تم کو غنیمت میں ملا حلال ستھرا اور ڈرتے رہو

اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۶۹﴾

اللہ سے بیشک اللہ ہے بخشنے والا مہربان

غنیمت کا مال حلال و پاکیزہ ہے:

پچھلے عتاب وتہدید سے مسلمان ڈر گئے کہ مال غنیمت کو جس میں فدیۂ اساریٰ بھی شامل ہے، اب ہاتھ نہیں لگانا چاہئے۔ اس آیت میں تسلی فرما دی کہ وہ اللہ کی عطاء ہے خوشی سے کھاؤ۔ ہاں جہاد کے سلسلہ میں مال غنیمت وغیرہ کو مطمح نظر بنانا اس قدر اہمیت دینا نہیں چاہئے کہ مقاصد عالیہ اور مصالح کلیہ سے اغماض ہونے لگے۔ بیشک وقتی حالات و مصالح کے اعتبار سے تم نے ایک غلط طریق کا راختیار کیا۔ مگر نفس مال میں کوئی خبث نہیں۔ خدا سے ڈرتے رہو گے تو وہ اپنی رحمت سے غلطیوں کو معاف فرما دے گا۔ (تفسیر عثمانی)

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ

اے نبی کہدے اُن سے جو تمہارے ہاتھ میں ہیں

مِّنَ الْاَسْرٰٓى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ

قیدی اگر جانے گا اللہ تمہارے دلوں میں کچھ

خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ

نیکی تو دیگا تم کو بہتر اُس سے جو تم سے چھن گیا

وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۷۰﴾

اور تم کو بخشے گا اور اللہ ہے بخشنے والا مہربان

وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ

اور اگر چاہیں گے تجھ سے دغا کرنی سو وہ دغا کر چکے ہیں اللہ

مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ

سے اس سے پہلے پھر اُس نے اُن کو پکڑوا دیا اور اللہ سب کچھ

حَكِيْمٌ ﴿۷۱﴾

جاننے والا حکمت والا ہے

جو اخلاص سے ایمان لائے ان کو بہتر بدلہ ملے گا:

بعض قیدیوں نے اپنے اسلام کا اظہار کیا تھا (مثلاً حضرت عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ) ان سے کہا گیا کہ اللہ دیکھے گا کہ واقعی تمہارے دل میں ایمان و تصدیق موجود ہے تو جو کچھ زرفدیہ اس وقت تم سے وصول کیا گیا ہے اس سے کہیں زیادہ اور کہیں بہتر تم کو مرحمت فرمائے گا، اور پچھلی خطاؤں سے درگزر کرے گا۔ اور اگر اظہار اسلام سے صرف پیغمبر کو فریب دینا مقصود ہے یا دغا بازی کرنے کا ارادہ ہے تو پیشتر خدا سے جو دغا بازی کر چکے ہیں، یعنی فطری عہد الست کے خلاف کفر و شرک اختیار کیا یا بعض "بنی ہاشم" جو ابو طالب کی زندگی میں عہد کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت پر متفق ہوئے تھے۔ اب کافروں کے ساتھ ہو کر آئے اس کا انجام آنکھوں سے دیکھ لیا کہ آج کس طرح مسلمانوں کی قید اور قابو میں ہیں۔ آئندہ بھی دغا بازی کی ایسی ہی سزا مل سکتی ہے۔ خدا تعالیٰ سے اپنے دلوں اور نیتوں کو چھپا نہیں سکتے اور نہ اس کے حکیمانہ انتظامات کو روک سکتے ہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں، "خدا کا وعدہ پورا ہوا، ان میں جو مسلمان ہوئے حق تعالیٰ نے بیشمار دولت بخشی، جو نہ ہوئے وہ خراب ہو کر تباہ ہو گئے۔ (تفسیر عثمانی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباسؓ کو منہ مانگا مال دیا:

بخاری اور ابن سعد کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بحرین سے کچھ مال آیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا اس کو مسجد میں پھیلا دو (یعنی یونہی بے قدری کے ساتھ ڈال دو) اتنے میں حضرت عباسؓ آ گئے اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (مجھے اس میں سے) عنایت کیجئے میں نے اپنا اور عقیل کا فدیہ ادا کیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لے لو۔ حضرت عباسؓ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا کپڑا بھر لیا اور جب اٹھانے لگے تو اٹھا نہ سکے۔ کہنے لگے کسی کو اٹھوانے کا حکم دیجئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں حضرت عباسؓ نے کہا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھوا دیجئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں۔ حضرت عباسؓ نے (مجبوراً) کچھ حصہ نکال دیا اور اٹھا کر کاندھے پر رکھ کر لے گئے اور جاتے میں کہنے لگے اللہ نے جو وعدہ فرمایا تھا میں وہی لے رہا ہوں۔ اللہ نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباسؓ کی مالی حرص معائنہ فرمائی اور جاتے میں جب نظر کے سامنے رہے برابر دیکھتے رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تک اپنی

جگہ سے نہیں اٹھے جب تک وہاں ایک درہم بھی رہا۔ (تفسیر مظہری)

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا
جو لوگ ایمان لائے اور گھر چھوڑا اور لڑے
بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ
اپنے مال اور جان سے اللہ کی راہ میں اور جن لوگوں نے
آوَوْا وَنَصَرُوا أُولَٰئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ
جگہ دی اور مدد کی وہ ایک دوسرے کے رفیق ہیں
بَعْضٍ ۚ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَا
اور جو ایمان لائے اور گھر نہیں چھوڑا
لَكُمْ مِنْ وَلَايَتِهِمْ مِنْ شَيْءٍ حَتَّىٰ
تم کو اُن کی رفاقت سے کچھ کام نہیں جب تک
يُهَاجِرُوا ۚ وَإِنِ اسْتَنْصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ
وہ گھر نہ چھوڑ آئیں اور اگر وہ تم سے مدد چاہیں دین میں
فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ
تو تم کو لازم ہے اُن کی مدد کرنی مگر مقابلہ میں
وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ
اُن لوگوں کے کہ اُن میں اور تم میں عہد ہو اور اللہ جو تم کرتے ہو
بَصِيرٌ ﴿٧٢﴾
اُس کو دیکھتا ہے

مجبور مسلمان قیدی اور دار الحرب کے مسلمان:

قیدیوں میں بعض ایسے تھے جو دل سے مسلمان تھے، مگر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ سے ہجرت نہ کر سکے اور بادلِ ناخواستہ کفار کے ساتھ ہو کر بدر میں آئے۔ ان آیات میں یہ بتلانا ہے کہ ایسے مسلمانوں کا حکم کیا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ حضرت کے اصحاب دو فرقے تھے "مہاجرین" اور "انصار"۔ مہاجرین کنبہ اور گھر چھوڑنے والے اور انصار جگہ دینے والے اور مدد کرنے والے۔

ان دونوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مواخاۃ (بھائی چارہ) قائم کر دیا تھا۔ آیت کا مضمون یہ ہوا کہ جتنے مسلمان حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حاضر ہیں ان سب کی صلح و جنگ ایک ہے، ایک کا موافق سب کا موافق، ایک کا مخالف سب کا مخالف، بلکہ آغاز ہجرت میں رشتہ مواخاۃ کے لحاظ سے ایک دوسرے کے ترکہ کا وارث بھی ہوتا تھا۔ اور جو مسلمان اپنے ملک میں رہے جہاں کافروں کا زور اور تسلط ہو یعنی دار الحرب سے ہجرت نہ کی ان کی صلح و جنگ میں "دار الاسلام" کے رہنے والے مسلمان (مہاجرین وانصار) شریک نہیں۔ اگر دار الحرب کے مسلمانوں نے صلح و معاہدہ کسی جماعت کفار سے کر لیا ہے تو دار الاسلام کے آزاد مسلمان اُس معاہدہ کے پابند نہیں ہو سکتے، بلکہ اُن سے حسب مصلحت جنگ کر سکتے ہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ دار الحرب کے مسلمان جس وقت دینی معاملہ میں آزاد مسلمانوں سے مدد طلب کریں تو اُن کو اپنے مقدور کے موافق مدد کرنا چاہئے۔ مگر جس جماعت سے ان آزاد مسلمانوں کا معاہدہ ہو چکا ہو اُس کے مقابلہ میں تابقائے عہد دار الحرب کے مسلمانوں کی امداد نہیں کی جا سکتی۔ نیز توریث باہمی کا سلسلہ جو مہاجرین وانصار میں قائم کیا گیا تھا، اس میں بھی دار الحرب کے مسلمان شامل نہیں تھے۔ (تفسیر عثمانی)

اور چونکہ اس آیت کا شان نزول ایک خاص ہجرت ہے مکہ سے مدینہ کی طرف اور غیر مہاجر مسلمان وہی تھے جو مکہ میں رہ گئے تھے اور کفار مکہ کے نرغہ میں تھے تو یہ ظاہر ہے کہ ان کا امداد طلب کرنا انہیں کفار مکہ کے مقابلہ میں ہو سکتا تھا۔ اور جب قرآن کریم نے مہاجر مسلمانوں کو اُن کی امداد کا حکم دے دیا تو بظاہر اس سے یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ ہر حال میں اور ہر قوم کے مقابلہ میں انکی امداد کرنا مسلمانوں پر لازم کر دیا گیا ہے اگر چہ وہ قوم جس کے مقابلہ پر ان کو امداد مطلوب ہے اس سے مسلمانوں کا کوئی معاہدہ التواء جنگ کا بھی ہو چکا ہو۔ حالانکہ اصول اسلام میں عدل وانصاف اور معاہدہ کی پابندی ایک اہم فریضہ ہے۔ اس لئے اسی آیت میں ایک استثنائی حکم یہ بھی ذکر فرما دیا گیا کہ اگر غیر مہاجر مسلمان مہاجر مسلمانوں سے کسی ایسی قوم کے مقابلہ پر مدد طلب کریں جس سے مسلمانوں نے ترک جنگ کا معاہدہ کر رکھا ہے تو پھر اپنے بھائی مسلمانوں کی امداد بھی معاہد کفار کے مقابلہ میں جائز نہیں۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

مسلمانوں کی قسمیں: مسلمانوں کی قسمیں بیان ہو رہی ہیں ایک تو مہاجر جنہوں نے نام خدا پر وطن ترک کیا اپنے گھر بار مال تجارت کنبہ قبیلہ دوست احباب چھوڑے خدا کے دین پر قائم رہنے کے لئے نہ جان کو جان سمجھا نہ مال کو مال۔ دوسرے انصار مدنی جنہوں نے ان مہاجروں کو اپنے ہاں ٹھہرایا اپنے مالوں میں ان کا حصہ لگا دیا ان کے ساتھ مل کر ان کے دشمنوں سے لڑائی کی یہ سب آپس میں ایک ہی ہیں۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں بھائی چارہ کرا دیا، ایک انصاری ایک مہاجر کو بھائی بھائی بنا دیا۔ یہ بھائی بندی قرابت داری سے بھی مقدم

تھی، ایک دوسرے کا وارث بنتا تھا، آخر میں یہ منسوخ ہوگئی۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ

اور جو لوگ کافر ہیں وہ ایک دوسرے کے رفیق ہیں

اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَ

اگر تم یوں نہ کرو گے تو فتنہ پھیلے گا ملک میں

فَسَادٌ كَبِيْرٌ ﴿۷۳﴾

اور بڑی خرابی ہوگی

کافر، کافر کا دوست ہے: یعنی کافر و مسلم میں نہ حقیقی رفاقت ہے نہ ایک دوسرے کا وارث بن سکتا ہے۔ ہاں کافر، کافر کا رفیق و وارث ہے بلکہ سب کفار تم سے دشمنی کرنے کو آپس میں ایک ہیں، جہاں پائیں گے ضعیف مسلمانوں کو ستائیں گے اس کے بالمقابل اگر مسلمان ایک دوسرے کے رفیق و مددگار نہ ہونگے یا کمزور مسلمان اپنے کو آزاد مسلمانوں کی معیت و رفاقت میں لانے کی کوشش نہ کریں گے تو سخت خرابی اور فتنہ بپا ہو جائے گا۔ یعنی ضعیف مسلمان مامون نہ رہ سکیں گے ان کا ایمان تک خطرہ میں ہوگا۔ (تفسیر عثمانی)

مسلمان کی جان کافر کیلئے نہیں دی جاسکتی:

مسئلہ: مبسوط میں ذکر کیا گیا ہے کہ اگر کچھ حربی کافر دار الحرب میں کسی کافر بستی پر حملہ کر دیں اور اس بستی کے باشندوں کو لوٹیں اور وہاں کافر بھی رہتے ہوں اور مستامن مسلمان بھی۔ تو مسلمانوں کے لئے بستی والے کافروں کی مدد کرنی جائز نہیں، ہاں اگر اپنے جان و مال کا اندیشہ ہو تو حملہ کرنے والوں سے مقابلہ کرنا جائز ہے کیونکہ لڑائی میں مقابلہ کرنے کا معنی ہے اپنی جان دینے کے لئے تیار ہو جانا اور مسلمان کی جان صرف اللہ کا بول بالا کرنے اور دین کی عزت کو قائم رکھنے کے لئے دی جاسکتی ہے۔

وطنی حربی کافروں کا مال: امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک حربی کافر مسلمانوں سے لوٹے ہوئے مال کے مالک بن جاتے ہیں اور بستی میں رہنے والے مسلمانوں نے ان سے معاہدہ کر لیا ہے کہ جس مال پر تم قابض ہو گے، اس سے تعرض نہیں کریں گے اس لئے دار الاسلام سے لوٹے ہوئے مال کو چھڑا نے کے لئے اپنے وطنی حربی کافروں سے جنگ جائز نہیں۔ (تفسیر مظہری)

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ

اور جو لوگ ایمان لائے اور اپنے گھر چھوڑے اور لڑے

سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا

اللہ کی راہ میں اور جن لوگوں نے اُن کو جگہ دی اور

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ

اُن کی مدد کی وہی ہیں سچے مسلمان اُن کے لئے بخشش ہے

وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۷۴﴾

اور روزی عزت کی

اعلیٰ مسلمان: یعنی دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی سردار کیساتھ والے مسلمان اعلیٰ ہیں گھر بیٹھنے والوں سے۔ آخرت میں اُن کیلئے بڑی بھاری بخشش ہے اور دنیا میں عزت کی روزی یعنی غنیمت اور دوسرے فائق حقوق۔ (تفسیر عثمانی)

مسند بزار میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حذیفہؓ کو ہجرت اور نصرت میں اختیار دیا تو آپ نے ہجرت کو ہی پسند فرمایا۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا

اور جو ایمان لائے اس کے بعد اور گھر چھوڑ آئے

وَجٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ ۭ وَاُولُوا

اور لڑے تمہارے ساتھ ہو کر سو وہ لوگ بھی تمہی میں ہیں اور رشتہ دار

الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ۭ

آپس میں حقدار زیادہ ہیں ایک دوسرے کے اللہ کے حکم میں

یعنی مہاجرین میں جتنے بعد کو شامل ہوتے جائیں وہ سب باعتبار احکام ''مہاجرین اولین'' کی برادری میں منسلک ہیں ہجرت کے تقدیم و تاخر کی وجہ سے صلح و جنگ یا توریث وغیرہ کے احکام پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ہاں اگر قدیم مہاجرین کا کوئی رشتہ دار پیچھے مسلمان ہوا یا بعد میں ہجرت کر کے آیا تو وہ اس قدیم مہاجر کی میراث کا زیادہ حقدار ہے اگرچہ رفاقت قدیم اوروں سے ہے۔ (تفسیر عثمانی)

اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۷۵﴾

تحقیق اللہ ہر چیز سے خبردار ہے

وہی جانتا ہے کہ کس کا کس قدر حق ہونا چاہئے لہٰذا اس کے احکام سراسر علم و حکمت پر مبنی ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

سورۃ التوبہ

جوشخص خواب میں اس کی تلاوت کرے اس کی تعبیر یہ ہے کہ وہ صالحین سے دوستی رکھے گا۔ (ازتعبیر الرؤیاء)

سورۃ کا پس منظر:

سورۂ انفال اوائل ہجرت میں اور یہ سورہ براءۃ اواخر ہجرت میں نازل ہوئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت یہ تھی کہ جوآیات قرآنی نازل ہوتیں، فرمادیتے کہ ان کوفلاں سورت میں فلاں موقع پررکھو۔ ان آیات کے متعلق (جنہیں اب سورہ "توبہ" یا "براءۃ" کہا جاتا ہے) آپ نے کوئی تصریح نہیں فرمائی کہ کس سورت میں درج کی جائیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ جداگانہ سورت نہیں۔ ان وجوہ پرنظرکر کے مصاحف عثمانیہ میں اس کے شروع میں "بسم اللہ" نہیں لکھی گئی لیکن کتابت میں اس کے اور انفال کے درمیان فصل کردیا گیا کہ نہ پوری طرح اس کا استقلال ظاہر ہواور نہ دوسری سورت کا جز ہونا۔ باقی انفال کے بعد متصل رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ انفال میں مقدم ہے بلا خاص وجہ کے موخر کیوں کی جاتی اور دونوں کے مضامین باہم اس قدر مرتبط ومتسق واقع ہوئے ہیں کہ گویا براءۃ کو "انفال" کا تتمہ اور تکملہ کہا جاسکتا ہے۔ سورۂ انفال تمام تر غزوۂ بدر اور اس کے متعلقات پر مشتمل ہے۔ یوم بدرکو قرآن نے "یوم الفرقان" کہا۔ کیونکہ اس نے حق وباطل، اسلام وکفر اور موحدین ومشرکین کی پوزیشن کو بالکل جداجدا کر کے دکھلا دیا۔ بدر کا معرکہ فی الحقیقت خالص اسلام کی عالمگیر اور طاقتور برادری کی تعمیر کا سنگ بنیاد اور حکومت الٰہی کی تاسیس کا دیباچہ تھا۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ کے مقابلہ میں جس خالص اسلامی برادری کے قیام کی طرف "انفال" کے خاتمہ پر اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ کہہ کر توجہ دلائی ہے اس کا صریح اقتضاء ہے کہ اس عالمگیر برادری کا کوئی طاقتور اور زبردست مرکز حسی طور پر بھی دنیا میں قائم ہو، جو ظاہر ہے کہ جزیرۃ العرب کے سوانہیں ہوسکتا جس کا صدر مقام مکہ معظمہ ہے۔ "انفال" کے اخیر میں یہ بھی جتلا دیا گیا تھا کہ جومسلمان مکہ وغیرہ سے ہجرت کر کے نہیں آئے اور کافروں کے زیر سایہ زندگی بسر کررہے ہیں، دارالاسلام کے آزاد مسلمانوں پران کی ولایت ورفاقت کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ہاں حسب استطاعت ان کے لئے دینی مدد بہم پہنچانی چاہیے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مرکز اسلام میں موالاۃ واخوۃ اسلامی کی کڑیوں کو پوری مضبوطی کے ساتھ جوڑنے کے لئے دو باتوں میں سے ایک ہونی چاہیے یا تمام عرب کے مسلمان ترک وطن کر کے مدینہ آجائیں اور اسلامی برادری میں بے روک ٹوک شامل ہوں اور یا آزاد مسلمان مجاہدانہ قربانیوں سے کفر کی قوت کو توڑ کر جزیرۃ العرب کی سطح ایسی ہموار کردیں کہ کسی مسلمان کو ہجرت کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔ یعنی تقریباً سارا جزیرۃ العرب خالص اسلامی برادری کا ایسا ٹھوس مرکز اور غیر مخلوط مستقر بن جائے جس کے دامن سے عالمگیر اسلامی برادری کا نہایت محکم اور شاندار مستقبل وابستہ ہوسکے۔ یہ دوسری صورت ہی ایسی تھی جس سے روز روز کے فتنہ وفساد کی بیخ کنی ہوسکتی تھی، اور مرکز اسلام کفار کے اندرونی فتنوں سے بالکل پاک وصاف اور آئے دن کی بدعہدیوں اورستم رانیوں سے پورا مامون ومطمئن ہوکر تمام دنیا کو اپنی عالمگیر برادری میں داخل ہونے کی دعوت دے سکتا تھا۔ اسی اعلیٰ اور پاک مقصد کیلئے مسلمانوں نے ۲ ہجری میں پہلا قدم میدان بدر کی طرف اٹھایا تھا۔ جو آخر کار ۸ ہجری میں مکہ معظمہ کی فتح عظیم پر منتہی ہوا جو فتنے اشاعت یا حفاظت اسلام کی راہ میں مزاحم ہوتے رہتے تھے فتح مکہ نے ان کی جڑوں پر تیشہ لگایا۔ لیکن ضرورت تھی کہ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ (انفال۔ رکوع ۵) کے امتثال میں اسلامی برادری کے مرکز اور حکومت الٰہیہ کے مستقر (جزیرۃ العرب) کو فتنہ کے جراثیم سے بالکلیہ صاف کردیا جائے، تاکہ وہاں سے تمام دنیا کو اسلامی دیانت اور حقیقی تہذیب کی دعوت دیتے وقت تقریباً سارا جزیرۃ العرب یک جان ویک زبان ہو اور کوئی اندرونی کمزوری یا خلفشار بیرونی مزاحمتوں کے ساتھ مل کر اس مقدس مشن کو نقصان نہ پہنچا سکے۔ پس جزیرۃ العرب کو ہر قسم کی کمزوریوں اور فتنوں سے پاک کرنے اور عالمگیر دعوت اسلامی کے بلندترین مقام پر کھڑا کرنے کیلئے لازم ہوا کہ دعوت اسلام کا مرکز خالص اسلامیت کے رنگ میں رنگین ہو۔ اسکے قلب وجگر سے صدائے حق کے سوا کوئی دوسری آواز نکل کر دنیا کے کانوں میں نہ پہنچے۔ پورا جزیرہ سارے جہان کا معلم اور ہادی بنے اور ایمان وکفر کی کشمکش کا ہمیشہ کے لئے یہاں سے خاتمہ ہوجائے۔ سورۂ براءۃ کے مضامین کا یہی حاصل ہے۔ چنانچہ چندروز میں خدا کی رحمت اور سچائی کی طاقت سے مرکز اسلام ہر طرح کے وساوس کفر وشرک سے پاک ہوگیا اور سارا عرب متحد ہوکر شخص واحد کی طرح تمام عالم میں نور ہدایت اور عالمگیر اسلامی اخوت پھیلانے کا کفیل وضامن بنا۔ فللہ الحمد علی ذلک۔ الغرض سورۂ انفال میں جس چیز کی ابتداء تھی، سورۂ توبہ (براءۃ) میں اس کی انتہا ہے۔ اسی لئے "اول بآخر نسبتے دارد" کے موافق "براءۃ" کو "انفال" کے ساتھ بطور تکملہ ملحق کردیا گیا۔ اور بھی مناسبات ہیں جن کو علماء نے تفاسیر میں بیان کیا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

سورۃ براءۃ اور سورۃ نور:

ابوعطیہ ہمدانی راوی ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب نے لکھ کر بھیجا، سورۂ برأت (خود) سیکھو اور اپنی عورتوں کو سورۂ نور سکھاؤ۔ میں کہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ سورۂ برات میں ترغیب جہاد ہے اور سورت نور میں پردہ کی تقلین ہے (اول مردوں کا فریضہ ہے اور دوسرا عورتوں کا)

انفال و براء کا ربط:

حضرت عثمان بن عفان نے فرمایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں سورت انفال اور سورت براءت کو ہم جوڑ کہا جاتا تھا اسی لئے سبع طوال میں میں نے ان کو ایک جگہ لکھوایا۔

حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے میں نے حضرت عثمانؓ سے عرض کیا الانفال مثانی میں سے ہے اور براءت مئین میں سے آپ حضرات نے دونوں کو ایک جگہ جمع کر دیا اور دونوں کے بیچ میں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ نہیں لکھی اور براءت کو سبع طوال میں درج کر دیا اس کی کیا وجہ؟ حضرت عثمانؓ نے فرمایا، مختلف زمانوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر متعدد سورتیں نازل ہونے کا سلسلہ جاری تھا۔ جب کچھ نازل ہوتا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کاتب کو بلوا کر حکم دیتے تھے، اس آیت کو فلاں سورۃ میں رکھو۔ سورۂ انفال مدینہ کے ابتدائی ایام میں (یعنی ہجرت کے فوراً بعد) نازل ہوئی اور سورۂ براءت سب سے آخری زمانہ میں اور دونوں کا بیان باہم ملتا جلتا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں صراحت نہیں فرمائی کہ سورۂ براءت سورۃ انفال کا جزء ہے اس لئے میں نے دونوں کو یکجا کر دیا اور براءت کو سبع طوال میں درج کر دیا اور دونوں کے درمیان بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کی سطر نہیں لکھی۔ رواہ البغوی بسندہ واحمد وابوداؤد والنسائی وابن حبان والحاکم والترمذی۔ حاکم نے اس روایت کو صحیح اور ترمذی نے حسن کہا ہے۔

بسم اللہ نہ لکھنے کی وجہ:

بسم اللہ کے ترک کی وجہ ایک یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ براءت کا نزول امان کا حکم اٹھا لینے کے لئے ہوا اور بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ امان (کی تعلیم) ہے۔ حضرت ابن عباس کا بیان ہے کہ میں نے حضرت علیؓ بن ابی طالب سے دریافت کیا براءت میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کیوں نہیں لکھی گئی، فرمایا بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ امان ہے اور براءت تلوار لے کر اتری ہے۔ کذا اخرج ابوالشیخ وابن مردویہ۔ (تفسیر مظہری)

جامع قرآن حضرت عثمان غنیؓ نے اپنی خلافت کے عہد میں جب قرآن مجید کی کتابی صورت میں ترتیب دیا تو سب سورتوں کے خلاف سورۂ توبہ کے شروع میں بسم اللہ نہ تھی اس لئے یہ شبہ ہو گیا کہ شاید یہ کوئی مستقل سورت نہ ہو بلکہ کسی دوسری سورت کا جز ہو۔ اب اس کی فکر ہوئی کہ اگر یہ کسی دوسری سورت کا جز ہو تو وہ کون سی سورت ہو سکتی ہے۔ مضامین کے اعتبار سے سورۂ انفال اس کے مناسب معلوم ہوئی۔

اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جو بروایت ابن عباسؓ یہ منقول ہے کہ سورۂ براءت کے شروع میں بسم اللہ نہ لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ امان ہے اور سورۂ براءت میں کفار کے امان اور عہد و پیمان کو ختم کر دیا گیا ہے۔ سو یہ ایک نکتہ اور لطیفہ ہے جو اصلی سبب کے منافی نہیں۔

مستدرک حاکم میں ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ میں نے حضرت علیؓ سے پوچھا کہ تم نے برأت کے شروع میں بسم اللہ کیوں نہیں لکھی تو فرمایا کہ بسم اللہ امان کیلئے ہے اور اس سورت میں کافروں پر تلوار چلانے کا حکم ہے اس لئے بسم اللہ نہیں لکھی گئی تاکہ قہر الٰہی اور غضب خداوندی کے آثار ظاہر ہوں۔ (درمنثور)

مگر یہ وجہ دراصل ترک بسم اللہ کی علت نہیں بلکہ ترک بسم اللہ کا ایک نکتہ ہے اور اس کی ایک حکمت ہے اس روایت سے یہ معلوم ہوا کہ حضرت علی کا قرآن مصحف عثمانی کے مطابق تھا۔

صحیح یہ ہے کہ بسم اللہ اس سورۃ کے شروع میں اس لئے نہیں لکھی گئی کہ جبریل امین اس سورت کے شروع میں بسم اللہ لیکر نازل نہیں ہوئے عام قاعدہ یہ تھا کہ جب کوئی نئی سورت نازل ہوتی تو اس کو پہلی سورت سے فصل کرنے یعنی جدا کرنے کے لئے اس کی ساتھ بسم اللہ نازل ہوتی مگر سورۂ توبہ کے شروع میں بسم اللہ نازل نہ ہوئی اس لئے صحابہ نے اپنی طرف سے اس سورت کے شروع میں بسم اللہ کی زیادتی نہ کی۔

صحابہ کرام نے جس ترتیب سے قرآن کریم کو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے لیا تھا اسی ترتیب کے ساتھ بلاکم وکاست تک پہنچا دیا اور ذرہ برابر اس میں کوئی تغیر اور تبدل نہیں کیا۔ (ارتقان) (معارف کاندھلویؒ)

تلاوت کا طریقہ: حضرات فقہاء نے فرمایا ہے کہ جو شخص اوپر سے سورۂ انفال کی تلاوت کرتا آیا ہو اور سورۂ توبہ شروع کر رہا ہو وہ بسم اللہ نہ پڑھے۔ لیکن جو شخص اسی سورت کے شروع یا درمیان سے اپنی تلاوت شروع کر رہا ہے اس کو چاہیے کہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھ کر شروع کرے۔ بعض ناواقف یہ سمجھتے ہیں کہ سورۂ توبہ کی تلاوت میں کسی حال بسم اللہ پڑھنا جائز نہیں یہ غلط ہے اور اس پر دوسری غلطی یہ ہے کہ بجائے بسم اللہ کے یہ لوگ اس کے شروع میں اعوذ باللہ من النار پڑھتے ہیں جس کا کوئی ثبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے نہیں ہے۔

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ
صاف جواب ہے اللہ کی طرف سے اور اس۔ کہ رسول کی اُن مشرکوں کو

عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝١ فَسِيْحُوْا فِي

جن سے تمہارا عہد ہوا تھا سو پھر لو

الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ

اس ملک میں چار مہینے اور جان لو کہ تم

غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي

نہ تھکا سکو گے اللہ کو اور یہ کہ اللہ رسوا کرنیوالا ہے

الْكٰفِرِيْنَ ۝٢

کافروں کو

۶ھ کے بعد کے حالات اور اعلان برأت:

۶ھ ہجری میں بمقام "حدیبیہ" جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش کے درمیان معاہدہ صلح ہو چکا، تو بنی خزاعہ مسلمانوں کے اور بنی بکر قریش کے حلیف بنے۔ بنی بکر نے معاہدہ کی پروانہ کر کے خزاعہ پر حملہ کر دیا اور قریش نے اسلحہ وغیرہ سے ظالم حملہ آوروں کی مدد کی۔ اس طرح قریش اور ان کے حلیف دونوں معاہدہ حدیبیہ پر قائم نہ رہے۔ جس کے جواب میں ۸ ہجری میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اچانک حملہ کر کے مکہ معظمہ بڑی آسانی سے فتح کر لیا۔ ان قبائل کے سوا دوسرے قبائل عرب سے مسلمانوں کا میعادی یا غیر میعادی معاہدہ تھا۔ جن میں سے بعض اپنے معاہدہ پر قائم رہے۔ بہت سے قبائل وہ تھے جن سے کسی قسم کا معاہدہ نہیں ہوا تھا۔ اس سورۃ کی مختلف آیات مختلف قبائل کے متعلق نازل ہوئی ہیں۔ شروع کی آیات میں غالباً ان مشرکین کا ذکر ہے جن سے معاہدہ تھا مگر میعادی نہ تھا۔ ان کو اطلاع کر دی گئی۔ کہ ہم آئندہ معاہدہ رکھنا نہیں چاہتے۔ چار ماہ کی مہلت تم کو دی جاتی ہے کہ اس مدت کے اندر اسلامی برادری میں شامل ہو جاؤ یا وطن چھوڑ کر مرکز ایمان وتوحید کو اپنے وجود سے خالی کر دو اور یا جنگی مقابلہ کے لئے تیار ہو جاؤ لیکن یہ خوب سمجھ لینا کہ تم خدا کی مشیت کو روک نہیں سکتے۔ اگر اسلام نہ لائے تو وہ تم کو دنیا و آخرت میں رسوا کرنیوالا ہے۔ تم اپنی تدبیروں اور حیلہ بازیوں سے اسے عاجز نہ کر سکو گے۔ باقی جن قبائل سے کوئی معاہدہ ہی نہ تھا، ممکن ہے انہیں بھی چار ماہ کی مہلت دی گئی ہو۔ یہ اور اس کے بعد کی آیتوں کا اعلان عام ۹ ہجری میں حج کے موقع پر تمام قبائل عرب کے سامنے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کیا۔ (تفسیر عثمانی)

یعنی چین وامن کے ساتھ مسلمانوں سے بے خوف ہو کر چار مہینے ملک میں گھومتے پھرو۔ مگر یہ سمجھ لو کہ تم اللہ کے پنجہ سے چھوٹ نہیں سکتے۔ اللہ نے اگرچہ تم کو مہلت دے دی ہے مگر تم کو اس کی گرفت سے باہر نہیں ہوا اور اللہ کافروں کو ضرور ذلیل کرنے والا ہے دنیا میں قتل اور قید کی ذلت اور آخرت میں عذاب جہنم کی خواری۔ (تفسیر مظہری)

وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ

اور سنا دینا ہے اللہ کی طرف سے اور اُن کے رسُول کی لوگوں کو

يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ

دن بڑے حج کے

حج اکبر: حج کا اکبر اس لئے کہا کہ "عمرہ" حج اصغر ہے اور یوم الحج الاکبر سے دسویں تاریخ "عیدالاضحیٰ" کا دن یا نویں تاریخ "عرفہ" کا دن مراد ہے۔ (تفسیر عثمانی)

عمرہ کو چونکہ چھوٹا حج کہا جاتا ہے اس لیے حج کے ساتھ اکبر کی صفت ذکر کر دی تاکہ عمرہ کا احتمال نہ رہے۔ (تفسیر مظہری)

حج اکبر کے دن سے دسویں تاریخ ذی الحجہ کی مراد ہے کہ اس دن حج تمام ہوتا ہے اور رمی اور قربانی اور حلق اور طواف زیارت کر کے محرم حلال ہو جاتا ہے۔ حج اکبر شریعت میں ہر حج کو کہتے ہیں کیونکہ وہ عمرہ کے مقابل ہے جو حج اصغر کہلاتا ہے عوام الناس میں جو یہ مشہور ہے کہ حج اکبر وہ حج ہے جو خاص جمعہ کے دن ہو اس کی کوئی اصلیت نہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجنا:

حضرت علیؓ کے بھیجنے میں مصلحت یہ تھی کہ عرب کا دستور تھا کہ نقض عہد کا پیغام کوئی عزیز وقریب ہی پہنچایا کرتا تھا اور صدیق اکبرؓ آپ کے خاندانی عزیز وقریب نہ تھے اس لئے آپ نے اتمام حجت کی غرض سے حضرت علیؓ کو روانہ کیا حج کا خطبہ اور نماز صدیق اکبرؓ ہی نے پڑھائی صرف سورۂ براءت کی تیس یا چالیس آیتیں یعنی شروع سورت سے لے کر وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ تک موسم حج میں عیدالاضحیٰ کے دن یعنی دسویں تاریخ ذی الحجہ کو حضرت علیؓ نے پڑھ کر کافروں کو سنادیں اور ان آیات کے ساتھ یہ بھی اعلان کر دیں کہ سال آئندہ کوئی مشرک حج نہ کرنے پائے گا اور نہ کوئی برہنہ طواف کرنے پائیگا یہ اعلان زیادہ تر دسویں تاریخ ذی الحجہ کو منیٰ میں ہوا اور اس وقت تمام قبائل عرب وہاں موجود تھے۔ (معارف القرآن)

اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ۬

کہ اللہ الگ ہے مشرکوں سے

وَرَسُوْلُهٗ ۭ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ

اور اُس کا رسول سو اگر تم توبہ کرو تو تمہارے لئے بہتر ہے اور اگر

تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى

نہ مانو تو جان لو کہ تم ہرگز نہ تھکا سکو گے

اللّٰهِ ۭ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۳

اللہ کو اور خوشخبری سنا دے کافروں کو عذاب دردناک کی

اعلان کن کے خلاف تھا:

یہ اعلان غالباً ان قبائل کے حق میں تھا جنہوں نے میعادی معاہدہ کیا۔ پھر خود ہی عہد شکنی کی (مثلاً بنی بکر یا قریش وغیرہ ہم) یعنی ایسے لوگوں سے کوئی معاہدہ اب باقی نہیں رہا۔ اگر یہ سب لوگ شرک وکفر سے توبہ کرلیں تو ان کی دنیا وآخرت دونوں سنور جائینگی۔ نہیں تو خدا کا جو کچھ ارادہ ہے (تطہیر جزیرۃ العرب کا) وہ پورا ہو کر رہیگا۔ کوئی طاقت اور تدبیر اسے مغلوب نہیں کرسکتی اور کافروں کو کفر وبدعہدی کی سزا مل کر رہے گی۔ (تنبیہ) ان قبائل کی عہد شکنی اگرچہ فتح مکہ ۸ ہجری سے پہلے ہوچکی تھی، بلکہ اسی کے جواب میں مکہ فتح کیا گیا۔ تاہم ۹ ہجری کے حج کے موقع پر اس کا بھی اعلان عام کرایا گیا تاکہ واضح ہوجائے کہ اس قسم کے جتنے لوگ ہیں ان سے کسی قسم کا معاہدہ باقی نہیں رہا۔ (تفسیر عثمانی)

اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ

مگر جن مشرکوں سے تم نے عہد کیا تھا

ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا

پھر انہوں نے کچھ قصور نہ کیا تمہارے ساتھ اور مدد نہ کی تمہارے مقابلہ میں

عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ

کسی کی سو اُن سے پورا کر دو اُن کا عہد اُن کے

اِلٰى مُدَّتِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝۴

وعدہ تک بیشک اللہ کو پسند ہیں احتیاط والے

معاہدہ پورا کرنے والے قبائل:

یہ استثناء ان قبائل کے لئے ہے جن کا معاہدہ میعادی تھا پھر وہ اس پر برابر قائم رہے کچھ کوتاہی ایفائے عہد میں نہیں کی، نہ بذات خود کوئی کاروائی خلاف عہد کی اور نہ دوسرے بدعہدوں کو مدد پہنچائی (مثلاً بنی ضمرہ و بنی مدلج) ان کے متعلق اعلان کردیا گیا کہ میعاد معاہدہ منقضی ہونے تک مسلمان بھی برابر معاہدہ کا احترام کریں گے میعاد ختم ہونے کے بعد کوئی جدید معاہدہ نہیں۔ اس وقت ان کے لئے بھی وہ ہی راستہ ہے جو اوروں کے لئے تھا۔ (تفسیر عثمانی)

۹ھ کا حج اور اعلان عام:

شوال ۹ھ میں جب یہ سورت نازل ہوئی تو حج کے اجتماع میں لوگوں کو سنانے کیلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو بھیجا۔ نسائی نے حضرت جابر کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کو امیر حج مقرر کرکے بھیجا، ہم بھی آپ کے ساتھ گئے (مدینہ سے روانہ ہوکر) عرج میں پہنچے صبح کی نماز کے لئے الصلوۃ خیر من النوم کی ندا ہوئی حضرت ابوبکرؓ تیار ہوکر (نماز کی) تکبیر کہنا ہی چاہتے تھے کہ پیچھے سے اونٹ کی آواز سنائی دی آپ تکبیر کہنے سے رک گئے اور فرمایا، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی جدعاء کی آواز ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خود حج کرنے کا خیال پیدا ہوگیا اور آپ تشریف لے آئے اگر ایسا ہے تو ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز ادا کریں گے اتنے میں حضرت علی اونٹنی پر سوار تشریف لے آئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے دریافت کیا، کیا آپ امیر حج ہوکر آئے ہیں یا قاصد ہوکر، حضرت علی نے جواب دیا قاصد ہوکر، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس لئے بھیجا ہے کہ مواقف حج میں لوگوں کو سورۂ برأت پڑھ کر سنادوں۔ غرض ہم مکہ پہونچے اور یوم ترویہ سے ایک دن پہلے (یعنی ۷ ذی الحجہ کو) حضرت کو ابوبکر نے کھڑے ہوکر لوگوں کو خطاب کیا اور لوگوں کے سامنے آداب حج بیان کئے۔ جب خطبہ سے فارغ ہوگئے تو حضرت علیؓ کھڑے ہوگئے اور آخر تک سورۂ برأت پڑھی پھر ہم حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ نکل آئے۔ جب عرفہ کا دن ہوا تو پھر حضرت ابوبکرؓ نے کھڑے ہوکر لوگوں سے خطاب کیا اور آداب حج سکھائے اور جب آپ خطاب سے فارغ ہوگئے تو حضرت علی کھڑے ہوئے اور سورۂ برأت آخر تک پڑھ کر سنائی۔ پھر قربانی کا دن ہوا اور ہم چلے تو حضرت ابوبکرؓ نے پھر لوگوں کو خطاب کیا روانگی اور قربانی کے احکام اور دوسرے مناسک حج بتائے اور آپ کے بعد حضرت علیؓ کھڑے ہوئے اور لوگوں کو پوری برأت کی سورت پڑھ کر سنائی پھر واپسی کا پہلا دن ہوا تو حضرت ابوبکر نے لوگوں کو خطاب کیا واپسی کی کیفیت اور پتھریاں مارنے کا طریقہ اور دوسرے آداب بیان کیے اور آپ کے بعد حضرت علیؓ نے کھڑے ہوکر سورۂ برأت پوری پڑھ کر سنائی۔

حمید بن عبدالرحمٰن نے حضرت ابوہریرہ کا یہ قول نقل کیا ہے۔ حمید کی یہ بھی روایت ہے کہ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو اپنے ساتھ اونٹ بٹھا کر حکم دیا کہ وہ برأت کا اعلان کردیں ابوہریرہ نے کہا پھر علی نے ہمارے ساتھ منیٰ کے اجتماع میں قربانی کے دن اعلان کیا کہ اس سال کے

بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا اور نہ کوئی برہنہ ہو کر کعبہ کا طواف کریگا۔
نتیجہ: اس قصہ سے صراحت کے ساتھ ثابت ہو رہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کو امارت حج سے معزول نہیں کیا تھا اور حضرت علی کو صرف ان آیات کا اعلان کرنے کے لئے بھیجا تھا۔

چار اہم اعلان:

زید بن تبیع کا بیان ہے ہم نے حضرت علی سے دریافت کیا آپ کو کیا پیام دے کر بھیجا گیا تھا، فرمایا، چار باتوں (کا اعلان کرنے) کیلئے مجھے بھیجا گیا۔ نمبرا: آئندہ ننگا ہو کر کوئی شخص کعبہ کا طواف نہ کرے۔ نمبر۲: جس کا رسول اللہ سے کوئی میعادی معاہدہ (صلح) ہو وہ اپنی مقررہ میعاد تک معاہدہ پر رہے گا اور جس کا کوئی معاہدہ نہ ہو اس کیلئے چار ماہ کی میعاد دی جاتی ہے نمبر۳: جنت میں سوائے مومن کے اور کوئی داخل نہ ہوگا۔ نمبر۴: اس سال کے بعد مومنوں کے ساتھ مشرکوں کا اجتماع نہ ہوگا۔ (یعنی مشرک حج نہ کرسکیں گے)
شیخین نے صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے مجھے دوسرے اعلان کرنے والوں کے ساتھ قربانی کے دن منیٰ میں یہ اعلان کرنے کیلئے بھیجا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا او کوئی برہنہ آدمی کعبہ کا طواف نہیں کرے گا۔ (تفسیر مظہری)

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا
پھر جب گذر جائیں مہینے پناہ کے تو مارو
الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ
مشرکوں کو جہاں پاؤ اور پکڑو
وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ
اور گھیرو اور بیٹھو ہر جگہ اُن کی تاک میں
فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ
پھر اگر وہ توبہ کریں اور قائم رکھیں نماز اور دیا کریں زکوٰۃ
فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝
تو چھوڑ دو اُن کا راستہ بیشک اللہ ہے بخشنے والا مہربان

حرمت والے مہینے:

استثناء سے فارغ ہو کر پھر مستثنیٰ منہ کا حکم بیان فرماتے ہیں یعنی ان عہد شکنی کرنے والوں سے اگر چہ اب کوئی معاہدہ باقی نہ رہا اور اس لئے علی الفور جنگ کی جاسکتی ہے تاہم ''شہر حرم'' کی رعایت مانع ہے کہ فوراً ان پر حملہ کیا جائے خواہ اس لئے کہ اس وقت تک اشہر حرم میں ابتداءً قتال کرنا ممنوع ہوگا یا مصلحتہ کہ تھوڑی سی بات کیلئے عام لوگوں میں کیوں تشویش پیدا کی جائے کیونکہ ان مہینوں میں قتال کی حرمت ان کے یہاں معروف و مسلم چلی آتی تھی۔ بہر حال ماہ محرم کے ختم تک ان کو مہلت دی گئی کہ جو چاہیں اپنا بندوبست کرلیں۔ اس کے بعد تطہیر جزیرۃ العرب کی خاطر جنگ سے چارہ نہیں۔ جو کچھ برتاؤ جنگ میں ہوتا ہے (مارنا، پکڑنا، گھیرنا، داؤ لگانا گھات میں رہنا) وہ سب ہوگا، البتہ اگر بظاہر کفر سے توبہ کر کے اسلامی برادری میں داخل ہو جائیں جس کی بڑی علامت نماز ادا کرنا اور زکوٰۃ دینا ہے تو پھر مسلمانوں کو ان سے تعرض کرنے اور ان کا راستہ روکنے کی اجازت نہیں۔ رہا باطن کا معاملہ وہ خدا کے سپرد ہے مسلمانوں کا معاملہ اس کے ظاہر کو دیکھ کر ہوگا۔

زکوٰۃ نہ دینے والا اور نماز نہ پڑھنے والا:

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کلمہ اسلام پڑھ کر نماز ادا نہ کرے یا زکوٰۃ نہ دے تو مسلمان اس کا راستہ روک سکتے ہیں۔ امام احمدؒ امام شافعیؒ، امام مالکؒ کے نزدیک اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ تارک صلوٰۃ اگر توبہ نہ کرے تو اسے قتل کردے۔ (امام احمدؒ کے نزدیک ردۃً اور مالکؒ و شافعیؒ کے نزدیک حداً و تعزیراً) امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اسے خوب زدوکوب کرے اور قید میں رکھے حتی یموت اویتوب (حتی کہ مرجائے یا توبہ کرے) بہر حال تخلیہ سبیل کسی کے نزدیک نہیں۔ رہے مانعین زکوٰۃ ان کے اموال سے آمادہ پیکار ہوں تو راہ راست پر لانے کیلئے جنگ کی جائے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مانعین زکوٰۃ پر جو جہاد کیا تھا اس کا واقعہ کتب حدیث و تاریخ میں مشہور و معروف ہے۔ (تفسیر عثمانی)

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ
اور اگر کوئی مشرک تجھ سے پناہ مانگے
فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ
تو اُس کو پناہ دیدے یہاں تک کہ وہ سن لے کلام اللہ کا پھر پہنچادے
مَاْمَنَهٗ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝
اُسکو اُسکی امن کی جگہ یہ اس واسطے کہ وہ لوگ علم نہیں رکھتے

مشرک کو پناہ دینا:

پہلے فرمایا تھا کہ اگر اپنی کفریات سے توبہ کر کے اسلام میں داخل ہو جائیں تو مامون ہیں۔ ممکن تھا کہ کسی شخص کو اصول اسلام

سے آگاہی نہ ہو وہ تحقیق و رفع شکوک کی غرض سے مسلمانوں کے پاس آنا چاہے، اس کی نسبت فرمادیا کہ اپنی پناہ اور حفاظت میں لے کر خدا کا کلام اور اسلام کے حقائق و دلائل سناؤ۔ اگر قبول نہ کرے تو اس کو قتل مت کرو، بلکہ کہیں ٹھکانے پر امن کی جگہ پہنچادو، جہاں پہنچ کر وہ مامون و مطمئن ہو جائے، اس کے بعد وہ سب کافروں کے برابر ہے۔ یہ امن دینے کا حکم اس لئے ہے کہ اسلامی اصول و حقائق سے ان لوگوں کو آگاہی نہیں ہے۔ لہٰذا ان کے سامنے حق خوب طرح واضح کر دینا چاہیے۔ اگر اس کے بعد بھی عناد برتے تو "تبین الرشد من الغی" کے بعد دین میں کوئی اکراہ نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

کون سا کلام قدیم ہے

علماء اہل سنت والجماعت کے بڑے طبقہ کا مسلک یہ ہے کہ وصف قدیم وہ کلام ہے جو کلام نفسی کا درجہ رکھتا ہے جو صوت اور تلفظ سے بالا ہے۔ چنانچہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ارشاد ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے کہ لفظی بالقرآن حادث۔ یعنی حضرت حق جل مجدہٗ کی اس وصف قدیم کی ادائیگی جن الفاظ اور جس صوت وغیرہ سے کی جاتی ہے وہ حادث اور مخلوق ہے وہ قدیم نہیں ہے۔ قرآن حکیم میں ہے۔

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ. (توبہ)

اور اگر کوئی مشرک تجھ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دیدے یہاں تک کہ وہ سن لے کلام اللہ کا پھر پہنچادے اس کو اس کے امن کی جگہ۔

یہ کلام اللہ جو یہ مشرک سنے گا بیشک وہ کلام اللہ قدیم ہے مگر جو آواز اس کے کانوں تک پہنچے گی وہ سنانے والے کی آواز ہوگی۔ جو الفاظ اس کے کانوں میں پڑیں گے وہ سنانے والے کے الفاظ ہوں گے۔ یہ آواز اور یہ الفاظ ظاہر ہے حادث ہیں۔ (از افادات حضرت مدنیؒ)

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ

کیونکر ہووے مشرکوں کے لئے عہد اللہ کے نزدیک

اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ

اور اُس کے رسول کے نزدیک مگر جن لوگوں سے

عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا

تم نے عہد کیا تھا مسجد حرام کے پاس سو جب

اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ

تک وہ تم سے سیدھے رہیں، تم اُن سے سیدھے رہو بیشک اللہ کو

يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۞ كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا

پسند ہیں احتیاط والے کیونکر رہے صلح اور اگر وہ تم پر

عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً

قابو پائیں تو نہ لحاظ کریں تمہاری قرابت کا اور نہ عہد کا

يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ

تم کو راضی کر دیتے ہیں اپنے منہ کی بات سے اور اُنکے دل نہیں مانتے

وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ۞

اور اکثر اُن میں بدعہد ہیں

اعلان براءت کی حکمت:

پچھلی آیات میں جو براۃ کا اعلان کیا گیا تھا، اس کی حکمت بیان فرماتے ہیں۔ یعنی ان مشرکین عرب سے کیا عہد قائم رہ سکتا ہے اور آئندہ کیا صلح ہو سکتی ہے جن کا حال تم مسلمانوں کے ساتھ یہ ہے۔ کہ اگر کسی وقت ذرا قابو تم پر حاصل کرلیں۔ تو ستانے اور نقصان پہنچانے میں نہ قرابت کا مطلق لحاظ کریں اور نہ قول و قرار کا۔ چونکہ اتفاق سے تم پر غلبہ اور قابو حاصل نہیں ہے اس لئے محض زبانی عہد و پیمان کر کے تم کو خوش رکھنا چاہتے ہیں ورنہ ان کے دل ایک منٹ کے لئے بھی اس عہد پر راضی نہیں۔ ہر وقت عہد شکنی کا موقع تلاش کرتے رہتے ہیں۔ چونکہ ان میں اکثر لوگ غدار اور بدعہد ہیں اگر کوئی اکادکا وفائے عہد کا خیال بھی کرتا ہے تو کثرت کے مقابلہ میں اس کی کچھ پیش نہیں جاتی۔ بہرحال ایسی دغابازی بدعہد قوم سے خدا اور رسول کا کیا عہد ہوسکتا ہے۔ البتہ جن قبائل سے تم بالخصوص مسجد حرام کے پاس معاہدہ کر چکے ہو، تم ابتدا کر کے نہ توڑو۔ جب تک وہ وفاداری کے راستہ پر سیدھے چلیں تم بھی ان سے سیدھے رہو اور بڑی احتیاط رکھو کہ کوئی حقیر سے حقیر بات ایسی نہ ہونے پائے جس سے تمہارا دامن عہد شکنی کی گندگی سے داغدار ہو۔ خدا کو وہ ہی لوگ محبوب ہیں جو پوری احتیاط کرتے ہیں چنانچہ بنو کنانہ وغیرہ نے مسلمانوں سے بدعہدی نہ کی تھی۔ مسلمانوں نے نہایت دیانتداری اور احتیاط کے ساتھ اپنا عہد پورا کیا۔ اعلان براءۃ کے وقت ان کے معاہدہ کی میعاد منقضی ہونے میں نو مہینے باقی تھے۔ ان میں معاہدہ کی کامل پابندی کی گئی۔ (تفسیر عثمانی)

اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا

بیچ ڈالے انہوں نے اللہ کے حکم تھوڑی قیمت پر پھر روکا

عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا

اُس کے راستہ سے بُرے کام ہیں جو وہ لوگ

يَعْمَلُوْنَ ﴿۹﴾

کر رہے ہیں

دنیا پرست گروہ:

یعنی یہ مشرکین وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیا کی تھوڑی سی طمع اوراپنی اغراض واہواء کی خاطر خدا کے احکام وایات کورد کردیا۔اس طرح خودبھی خدا کے رستہ پرنہ چلے اوردوسروں کوبھی چلنے سے روکا۔جوایسے بدترین اورنالائق کاموں میں پھنسے ہوں اورخدا سے نہ ڈریں وہ عہدشکنی کے وبال سے کیا ڈرینگےاوراپنے قول وقرار پرکیا قائم رہیں گے۔(تفسیرعثمانی)

لَا يَرْقُبُوْنَ فِىْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ؕ

نہیں لحاظ کرتے کسی مسلمان کے حق میں قرابت کا

وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ﴿۱۰﴾

اور نہ عہد کا اور وہی ہیں زیادتی پر

یعنی کچھ تمہارے ہی ساتھ نہیں بلکہ مسلمان نام سے ان کوبیر ہے۔کوئی مسلمان ہو،موقع پانے پراس کونقصان پہنچانے کیلئے سب تعلقات قرابت اورقول وقرار اٹھا کررکھ دیتے ہیں۔اس بارہ میں ان کی ظلم وزیادتی حد سے بڑھی ہوئی ہے۔(تفسیرعثمانی)

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ

سو اگر توبہ کریں اور قائم رکھیں نماز اور دیتے رہیں زکوٰۃ

فَاِخْوَانُكُمْ فِى الدِّيْنِ ؕ

تو تمہارے بھائی ہیں حکم شریعت میں

یعنی اب بھی اگرکفر سے توبہ کرکے احکام دینیہ (نماز زکوٰۃ وغیرہ) پرعمل پیراہوں تونہ صرف یہ کہ آئندہ کیلئے محفوظ ومامون ہوجائینگے بلکہ اسلامی برادری میں شامل ہوکران حقوق کے مستحق ہونگے۔جن کے دوسرے مسلمان مستحق ہیں۔جوکچھ بدعہدیاں اورشرارتیں پہلے کرچکے ہیں سب معاف کردی جائیں گی۔حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ"یہ جوفرمایا کہ بھائی ہیں حکم شریعت میں۔اس سے سمجھ لیں کہ جوشخص قرائن سے معلوم ہوکہ ظاہر میں مسلمان ہے اوردل سے یقین نہیں رکھتا،اس کوحکم ظاہری میں مسلمان گنیں،مگرمعتمداوردوست نہ بنائیں۔(تفسیرعثمانی)

وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۱۱﴾

اور ہم کھول کر بیان کرتے ہیں حکموں کو جاننے والے

وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ

لوگوں کے واسطےاوراگروہ توڑدیں اپنی قسمیں عہدکرنے کے بعد

وَطَعَنُوْا فِىْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ ۙ

اورعیب لگائیں تمہارے دین میں تولڑوکفر کے سرداروں سے

اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ﴿۱۲﴾

بیشک اُن کی قسمیں کچھ نہیں تاکہ وہ باز آئیں

کفر کے امام:

یعنی اگرعہد وپیمان توڑڈالا (جیسے بنی بکرنے خلاف عہدخزاعہ پرحملہ کردیا اورقریش نے حملہ آوروں کی مدد کی) اورکفر سے بازنہ آئے بلکہ دین حق کے متعلق طعنہ زنی اورگستاخانہ عیب جوئی کرتے رہے توسمجھ لوکہ اس طرح کے لوگ"اَئِمَّةَ الْكُفْرِ"(کفر کے سرداراورامام) ہیں۔کیونکہ ان کی حرکات دیکھ کراور باتیں سن کربہت سے کجرواور بیوقوف پیچھے ہولیتے ہیں۔ایسے سرغنوں سے پورا مقابلہ کرو۔کیونکہ ان کا کوئی قول وقسم اورعہد وپیمان باقی نہیں رہا۔ممکن ہے تمہارے ہاتھوں سے کچھ سزاپاکراپنی شرارت وسرکشی سے بازآجائیں۔(تفسیرعثمانی)

اَئِمَّةَ الْكُفْرِ (کفر کے پیشوا) فرمانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ مقاتلہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کفر کے سرداراورپیشواہیں کفرکی سرداری نے ہی ان کومستحق قتل بنادیا ہے بعض کے نزدیک اَئِمَّةَ الْكُفْرِ سے مرادمشرکوں کے سرداراورلیڈر ہیں یعنی اہل مکہ۔کیونکہ ان سے مقاتلہ کی اہمیت زیادہ تھی اوروہ ہی قتل کے زیادہ مستحق تھے۔حضرت ابن عباس نے فرمایا یہ آیت ابوسفیان بن حرب،حارث بن ہشام،سہیل بن عمرو،عکرمہ بن ابی جہل اوردوسرے سرداران قریش کے حق میں نازل ہوئی جنہوں نے عہدشکنی کی تھی،یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے مسلمانوں کومکہ سے نکال دینے کاارادہ کیا تھا بلکہ نکلنے پرمجبورکردیا تھا۔(تفسیرمظہری)

راجح یہ معلوم ہوتا ہے کہ آیت میں ائمۃ الکفر سے کوئی خاص جماعت مرادنہیں بلکہ قیامت تک آنے والے پیشوایان کفرمراد ہیں اوریہ بتلانا مقصود ہے

کہ بلا تعیین تمام ائمۃ الکفر اور بلا تخصیص تمام پیشوایان کفر اور ناقضین عہد سے جہاد و قتال واجب ہے دیکھو البحر المحیط نمبر ا صفحہ ۱۴ جلد ۵ (معارف کاندھلوی)

اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا
کیا نہیں لڑتے ایسے لوگوں سے جو توڑیں اپنی قسمیں اور فکر میں
بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ
رہیں کہ رسول کو نکال دیں اور انہوں نے پہلے
مَرَّةٍ ۭ اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ
چھیڑ کی تم سے کیا اُن سے ڈرتے ہو سو اللہ کا ڈر چاہئے تم کو زیادہ
اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳﴾
اگر تم ایمان رکھتے ہو

بدعہد قوم سے اسلام کی جنگ ہے:

قریش نے قسمیں اور معاہدے توڑ دیئے تھے کیونکہ خلاف عہد خزاعہ کے مقابلہ میں بنو بکر کی مدد کی اور ہجرت سے پہلے پیغمبر علیہ السلام کو وطن مقدس (مکہ معظمہ) سے نکالنے کی تجاویز سوچیں۔ اور وہ ہی نکلنے کا سبب بنے۔ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ الآیہ مکہ میں بے قصور مسلمانوں پر بیٹھے بٹھائے مظالم کی ابتداء کی۔ جب ابوسفیان کا تجارتی قافلہ بچ نکلا تو ازراہ نخوت ورعونت بدر کے میدان میں مسلمانوں سے جنگ کی چھیڑ کرنے کیلئے گئے اور ''صلح حدیبیہ'' کے بعد بھی اپنی جانب سے عہد شکنی کی ابتداء کی کہ مسلمانوں کے حلیف خزاعہ کے مقابلہ پر بنو بکر کی پیٹھ ٹھونکتے رہے اور اسلحہ وغیرہ سے ان کی امداد کرتے رہے۔ آخر کار مسلمان ان سے لڑے اور مکہ معظمہ کو مشرکین کے قبضہ سے پاک کیا اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا الخ سے غرض یہ معلوم ہوتی ہے کہ جو کوئی قوم اس طرح کے احوال رکھتی ہو، اس سے جنگ کرنے میں مسلمانوں کو کسی وقت کچھ تامل نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ان کی طاقت وجمعیت اور ساز وسامان کا خوف ہو تو مومنین کو سب سے بڑھ کر خدا کا خوف ہونا چاہیے۔ خدا کا ڈر جب دل میں آجائے پھر سب ڈر نکل جاتے ہیں۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ بندہ خدا کی نافرمانی سے ڈرے اور اسکے قہر وغضب سے لرزاں وترساں رہے۔ کیونکہ نفع وضرر سب اسی کے ہاتھ میں ہے کوئی مخلوق ادنیٰ سے ادنیٰ نفع وضرر پہنچانے پر بدون اس کی مشیت کے قادر نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ
لڑو اُن سے تا عذاب دے اللہ اُن کو تمہارے ہاتھوں اور رسوا کرے

وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ
اور تم کو اُن پر غالب کرے اور ٹھنڈے کرے دل
مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴﴾ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ۭ
مسلمان لوگوں کے اور نکالے اُن کے دل کی جلن
وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ
اور اللہ توبہ نصیب کریگا جس کو چاہے گا

جہاد فرض کرنے کی غرض:

اس آیت میں مشروعیت ''جہاد کی اصلی حکمت پر متنبہ فرمایا ہے قرآن کریم میں اقوام ماضیہ کے جو قصے بیان فرمائے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب کوئی قوم کفر وشرارت اور انبیاء علیہم السلام کی تکذیب وعداوت میں حد سے بڑھ جاتی تھی تو قدرت کی طرف سے کوئی تباہ کن آسمانی عذاب ان پر نازل کیا جاتا تھا جس سے ان کے سارے مظالم اور کفریات کا دفعۃً خاتمہ ہو جاتا تھا۔

فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (عنکبوت رکوع ۴)

کوئی شبہ نہیں کہ عذاب کی یہ اقسام بہت سخت مہلک اور آئندہ نسلوں کیلئے عبرتناک تھیں لیکن ان صورتوں میں معذبین کو دنیا میں رہ کر اپنی ذلت ورسوائی کا نظارہ نہیں کرنا پڑتا تھا اور نہ آئندہ کے لئے توبہ ورجوع کا کوئی امکان باقی رہتا تھا۔ مشروعیت جہاد کی اصلی غرض وغایت یہ ہے کہ مکذبین ومتعنتین کو حق تعالیٰ بجائے بلاواسطہ عذاب دینے کے اپنے مخلص وفادار بندوں کے ہاتھ سے سزا دلوائے۔ سزا دہی کی اس صورت میں مجرمین کی رسوائی اور مخلصین کی قدر افزائی زیادہ ہے۔ وفادار بندوں کا نصرت وغلبہ علانیہ ظاہر ہوتا ہے۔ ان کے دل یہ دیکھ کر ٹھنڈے ہوتے ہیں کہ جو لوگ کل تک انہیں حقیر وناتواں سمجھ کر ظلم وستم اور استہزاء وتمسخر کا تختہ مشق بنائے ہوئے تھے، آج خدا کی تائید ورحمت سے انہی کے رحم وکرم یا عدل وانصاف پر چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ کفر وباطل کی شوکت ونمائش کو دیکھ کر جو اہل حق گھٹتے رہتے تھے یا جو ضعیف ومظلوم مسلمان کفار کے مظالم کا انتقام نہ لے سکنے کی وجہ سے دل ہی میں غیظ کھا کر چپ ہو رہتے تھے جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعہ سے ان کے قلوب تسکین پاتے تھے اور آخری بات یہ ہے کہ خود مجرمین کے حق میں بھی سزا دہی کا یہ طریقہ نسبۃً زیادہ نافع ہے۔ کیونکہ سزا پانے کے بعد بھی رجوع وتوبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے، بہت ممکن ہے کہ حالات

سے عبرت حاصل کر کے بہت سے مجرموں کو توبہ نصیب ہو جائے چنانچہ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایسا ہی ہوا کہ تھوڑے دنوں میں سارا عرب صدق دل سے دین الٰہی کا حلقہ بگوش بن گیا۔ (تفسیر عثمانی)

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۵﴾
اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے

یعنی ہر ایک کی حالت کو جان کر حکمت کا معاملہ کرتا ہے اور ہر زمانہ میں اس کے مناسب احکام بھیجتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ
کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ چھوٹ جاؤ گے اور حالانکہ ابھی معلوم نہیں کیا اللہ
الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ
نے تم میں سے اُن لوگوں کو جنہوں نے جہاد کیا ہے اور نہیں پکڑا
دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ
انہوں نے سوا اللہ کے اور اُسکے رسول کے اور مسلمانوں کے
وَلِيْجَةً ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾
کسی کو بھیدی اور اللہ کو خبر ہے جو تم کر رہے ہو

جہاد کی ایک اور حکمت:

مشروعیت جہاد کی یہاں ایک اور حکمت بیان فرمائی یعنی ایمان اور بندگی کے زبانی دعوے کرنیوالے تو بہت ہیں لیکن امتحان کی کسوٹی پر جب تک کسا نہ جائے کھرا اور کھوٹا ظاہر نہیں ہوتا۔ جہاد کے ذریعہ سے خدا دیکھنا چاہتا ہے کہ کتنے مسلمان ہیں، جو اس کی راہ میں جان و مال نثار کرنے کو تیار ہیں اور خدا و رسول اور مسلمانوں کے سوا کسی کو اپنا راز دار یا خصوصی دوست بنانا نہیں چاہتے، خواہ وہ ان کا کتنا ہی قریبی رشتہ دار کیوں نہ ہو۔ یہ معیار ہے جس پر مؤمنین کا ایمان پرکھا جاتا ہے۔ جب تک عملی جہاد نہ ہو صرف زبانی جمع خرچ سے کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی۔ پھر عمل بھی جو کچھ کیا جائے اس کی خبر خدا کو ہے کہ صدق و اخلاص سے کیا یا نمود و ریاء سے جیسا عمل ہوگا ادھر سے اسی کے موافق پھل ملے گا۔ (تفسیر عثمانی)

ولیجۃً کا معنی ہے اندرونی دوست، راز دار۔

امت محمدیہ کا مخلص گروہ:

لمایعلم سے اس طرف اشارہ ہے کہ امت محمدیہ میں مخلص مجاہدین کے پائے جانے کی امید رکھنا چاہیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت میں ایک گروہ مسلسل ایسا ہوتا رہے گا۔ جو اللہ کے احکام کو قائم کرے گا کوئی ان کی مدد نہ کرے اور کوئی مخالفت کرے ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا (یعنی اللہ ان کا مددگار اور حامی ہوگا کسی مخالف کی مخالفت ان پر اثر انداز نہ ہوگی) وہ اسی حالت پر قائم ہوں گے کہ اللہ کا حکم آجائے گا (قیامت برپا ہو جائیگی) یہ حدیث معاویہ کی روایت سے صحیحین میں منقول ہے اور ابن ماجہ نے حضرت ابوہریرہ کی روایت سے اس کو بیان کیا ہے حاکم نے بھی یہ حدیث حضرت عمر کی روایت سے بیان کی ہے اور اس کو صحیح بھی کہا ہے لیکن آخری الفاظ یہ ہیں کہ میری امت کا ایک گروہ برابر حق پر قائم رہے گا یہاں تک کہ قیامت بپا ہو جائیگی۔ (تفسیر مظہری)

مسلمانوں سے خطاب:

سولہویں آیت میں ارشاد فرمایا کہ کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم صرف کلمہ اسلام زبان سے کہہ لینے اور اسلام کا دعویٰ کر لینے پر آزاد چھوڑ دیئے جاؤ گے، جب تک اللہ تعالیٰ ظاہری طور پر بھی ان سچے اور پکے مسلمانوں کو نہ دیکھ لیں جو تم میں سے جہاد کرنے والے ہیں، اور جو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے سوا کسی کو اپنا راز دار اور دوست نہیں بناتے۔

اسی آیت میں ان عام لوگوں کو خطاب ہے جو مسلمان سمجھے جاتے تھے اگرچہ ان میں سے بعض منافق بھی تھے اور بعض ضعیف الایمان اور مذبذب تھے، ایسے ہی لوگوں کا یہ حال تھا کہ اپنے غیر مسلم دوستوں کو مسلمانوں کے راز اور اسرار پر مطلع کر دیا کرتے تھے، اس لئے اس آیت میں مخلص مسلمان کی دو علامتیں بتلا دی گئی۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ
مشرکوں کا کام نہیں کہ آباد کریں اللہ کی مسجدیں
اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ۭ
اور تسلیم کر رہے ہوں اپنے اُوپر کفر کو
اُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ښ وَفِي النَّارِ
وہ لوگ خراب گئے اُن کے عمل اور آگ میں
هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۷﴾ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ
رہیں گے وہ ہمیشہ وہی آباد کرتا ہے مسجدیں اللہ کی

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ

جو یقین لایا اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور قائم کیا

الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا

نماز کو اور دیتا رہا زکوۃ اور نہ ڈرا سوائے اللہ کے کسی سے سو

اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ

امیدوار ہیں وہ لوگ کہ ہویں

الْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۸﴾

ہدایت والوں میں

مساجد کی آبادی: پہلے فرمایا تھا کہ مسلمان بدون امتحان کے یونہی نہیں چھوڑے جاسکتے بلکہ بڑے بڑے عزائم اعمال (مثلاً جہاد وغیرہ) میں ان کی ثابت قدمی دیکھی جائیگی اور یہ کہ تمام دنیا کے تعلقات پر کس طرح خدا اور سول کی جانب کو ترجیح دیتے ہیں، اس رکوع میں یہ بتلایا کہ خدا کی مساجد (عبادت گاہ) حقیقۃً ایسے ہی اولوالعزم مسلمان کے دم سے آباد رہ سکتی ہیں۔

مساجد کی حقیقی آبادی یہ ہے کہ ان میں خدائے واحد کی عبادت اس کی شان کے لائق ہو۔ ''ذکراللہ'' کرنیوالے کثرت سے موجود ہوں جو بے روک ٹوک خدا کو یاد کریں۔ لغویات وخرافات سے ان پاک مقامات کو محفوظ رکھا جائے۔ یہ مقصد کفار ومشرکین سے کب حاصل ہوسکتا ہے؟ دیکھئے مشرکین مکہ بڑے فخر سے اپنے کو ''مسجد حرام'' کا متولی اور خادم کہتے تھے۔ مگر ان کی بڑی خدمت گزاری یہ تھی کہ پتھر کی سیکڑوں مورتیاں کعبہ میں رکھ چھوڑی تھیں ان ہی کی نذر ونیاز کرتے، اور منتیں مانتے تھے۔ بہت سے لوگ ننگے طواف کرتے تھے، ذکراللہ کی جگہ سیٹیاں اور تالیاں بجاتے تھے اور خدائے واحد کے سچے پرستاروں کو وہاں تک پہنچنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ لے دے کر ان کی بڑی عبادت یہ تھی کہ حاجیوں کے لئے پانی کی سبیل لگادی یا حرم شریف میں چراغ جلا دیا۔ یا کعبہ پر غلاف چڑھایا، یا کبھی ضرورت ہوئی تو شکست وریخت کی مرمت کرادی، مگر یہ اعمال محض بے جان اور بے روح تھے۔ کیونکہ مشرک کو جب خدا کی صحیح معرفت حاصل نہیں تو کسی عمل میں اس کا قبلہ توجہ اور مرکز اخلاص خدائے وحدہ لاشریک لہ کی ذات منبع الکمالات نہیں ہوسکتی۔ اسی لئے کافر کا کوئی عمل خدا کے نزدیک زندہ اور معتدبہ عمل نہیں ہے۔ (اسی کو حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ سے تعبیر فرمایا) الغرض کفار ومشرکین جو اپنے حال وقال سے اپنے کفروشرک پر ہروقت شہادت دیتے رہتے ہیں، اس لائق نہیں کہ ان سے مساجد اللہ خصوصاً مسجد حرام کی حقیقی تعمیر (آبادی) ہوسکے۔ یہ کام صرف ان لوگوں کا ہے جو دل سے خدائے واحد اور آخری دن پر ایمان لاچکے ہیں، جوارح سے نمازوں کی اقامت میں مشغول رہتے ہیں، اموال میں سے باقاعدہ زکوۃ ادا کرتے ہیں اور خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔ اسی لئے مساجد کی صیانت وتطہیر کی خاطر جہاد کیلئے تیار رہتے ہیں۔ ایسے مومنین جو دل زبان ہاتھ پاؤں، مال ودولت، ہر چیز سے خدا کے مطیع وفرمانبردار ہیں ان کا فرض منصبی ہے کہ مساجد کو آباد رکھیں اور تعمیر مساجد کے جھوٹے دعوے رکھنے والے مشرکین کو خواہ اہل قرابت ہی کیوں نہ ہوں وہاں سے نکال باہر کریں کیونکہ ان کے وجود سے مساجد اللہ کی آبادی نہیں بربادی ہے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

مسند میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جب تم کسی کو مسجد میں آنے جانے کی عادت والا دیکھو تو اسکے ایمان کی شہادت دو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی آیت تلاوت فرمائی۔ اور حدیث میں ہے مسجدوں کے آباد کرنے والے اللہ والے ہیں۔ اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ان مسجد والوں پر نظریں ڈال کر اپنے عذاب پوری قوم پر سے ہٹالیتا ہے۔ اور حدیث میں ہے اللہ عزوجل فرماتا ہے مجھے اپنی عزت کی اپنے جلال کی قسم کہ میں زمین والوں کو عذاب کرنا چاہتا ہوں لیکن اپنے گھروں کے آباد کرنے والوں اور اپنی راہ میں آپس میں محبت رکھنے والوں اور صبح سحری کے وقت استغفار کرنے والوں پر نظریں ڈال کر اپنے عذاب ہٹالیتا ہوں۔ ابن عساکر میں ہے کہ شیطان انسان کا بھیڑیا ہے جیسے بکریوں کا بھیڑیا ہوتا ہے کہ وہ الگ تھلگ پڑی ہوئی ادھر ادھر کی بکری کو پکڑ لے جاتا ہے پس تم پھوٹ اور اختلاف سے بچو جماعت کو اور عام اور مسجدوں کو لازم پکڑے رہو۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

ضحاک نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ان کی اپنے کافر ہونے پر شہادت یہ تھی کہ وہ بت پرستی کرتے تھے بیت حرام کے باہر دیواروں کے پاس انہوں نے کچھ بت نصب کر رکھے تھے جب بیت اللہ کا برہنہ طواف کرتے تھے تو ہر چکر میں بتوں کے سامنے سجدے کرتے تھے۔

مسجد بنانے کی فضیلت: محمود بن لبید کا بیان ہے کہ حضرت عثمانؓ بن عفان نے ایک مسجد بنانے کا ارادہ کیا۔ لوگوں نے اس کو ناپسند کیا (کیونکہ مدینہ شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک مسجد موجود تھی) اور اس ارادہ کو ترک کرنے کی خواہش کی حضرت عثمان نے فرمایا میں نے خود سنا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے تھے جو اللہ کیلئے مسجد بنائے گا اللہ اس کیلئے جنت میں گھر بنائے گا۔

طبرانی نے حضرت ابوامامہؓ کی روایت سے صحیح سند کے ساتھ بیان کیا ہے جو شخص اللہ کیلئے مسجد بنائے گا، اللہ جنت کے اندر اس سے بڑا مکان اس کیلئے جنت میں بنائے گا۔

گمشدہ چیز کا اعلان: حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوئی شخص مسجد کے اندر کسی کو اپنی گم شدہ اونٹنی تلاش کرتے سنے تو کہے اللہ کرے تیری اونٹنی واپس نہ ملے کیونکہ مسجدیں اس کام کیلئے نہیں بنائی گئی ہیں رواہ مسلم۔

گھروں میں مسجد: حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ گھروں کے اندر مسجد (نماز کی جگہ) بنالی جائے اور اس کو پاک وصاف اور خوشبودار رکھا جائے رواہ ابوداؤد والترمذی وابن ماجہ۔

شعر پڑھنا: حضرت عمرو بن شعیب کے دادا راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد کے اندر اشعار گا کر پڑھنے اور خرید وفروخت اور نماز سے پہلے وہاں گھیرا بنا کر بیٹھنے سے منع فرمایا ہے۔ (رواہ ابوداؤد والترمذی)

عمل پر غرور نہ کرو: ابونعیم نے حضرت علیؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے کسی پیغمبر کے پاس وحی بھیجی کہ تمہاری امت میں جو میرے اطاعت گزار بندے ہیں ان سے کہدو کہ اپنے اعمال پر مگن نہ ہو جانا کیونکہ قیامت کے دن جب میں کسی بندے کی حساب فہمی کروں گا اور اس کو عذاب دینا چاہوں گا تو عذاب دوں گا (اس کے اعمال موجب نجات نہ ہوسکیں گے) اور تمہاری امت میں جو میرے نافرمان ہیں ان سے کہدو کہ خود اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو (اور ناامید نہ ہو) میں بڑے بڑے گناہ بخش دوں گا اور پرواہ نہ کروں گا۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر مظہری)

خرید وفروخت وغیرہ: مفسر القرآن حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ عمارت مسجد میں یہ بھی داخل ہے کہ مسجد کو ایسی چیزوں سے پاک کرے جن کے لئے مسجدیں نہیں بنائی گئیں، مثلاً خرید وفروخت دنیا کی باتیں، کسی گم شدہ چیز کی تلاش، یا دنیا کی چیزوں کا لوگوں سے سوال، یا فضول قسم کے اشعار، جھگڑا لڑائی اور شور وشغب وغیرہ (مظہری)

ایمان کیا چیز ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صحابہ کرام سے پوچھا کہ تم جانتے ہو کہ اللہ پر ایمان کیا چیز ہے؟ صحابہ کرام نے عرض کیا کہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی زیادہ جانتے ہیں، آپ نے فرمایا کہ اللہ پر ایمان یہ ہے کہ آدمی دل سے اس کی شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی قابل عبادت نہیں، اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، اس حدیث نے بتلا دیا کہ رسول پر ایمان لانا اللہ پر ایمان لانے میں داخل اور شامل ہے۔ (مظہری بحوالہ صحیحین)

نہ ڈرنے کا مطلب: اور یہ جو ارشاد فرمایا کہ اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرے، اس کے معنی یہ ہیں کہ دین کے معاملہ میں کسی کے خوف سے اللہ کے حکم کو ترک نہ کرے ورنہ خوف کی چیزوں سے ڈرنا، اور دہشت کھانا تو تقاضائے عقل وفطرت ہے، درندے اور زہریلے جانوروں سے چور ڈاکو سے طبعی طور پر ڈرنا اس کے خلاف نہیں، یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے جب جادوگروں نے رسیوں کے سانپ بنا کر دکھلائے تو وہ ڈر گئے، فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِهٖ خِیْفَةً مُّوْسٰی اس لئے ایذاء اور نقصان پہونچانے والوں سے طبعی خوف نہ حکم قرانی کے خلاف ہے نہ رسالت اور ولایت کے ہاں اس خوف سے مغلوب ہو کر کہ اللہ تعالیٰ کے احکام میں خلل ڈالنا یا ان کو ترک کر دینا یہ مومن کی شان نہیں، یہی اس جگہ مراد ہے۔

کافر کو متولی بنانا: حاصل یہ ہے کہ کسی کافر کو کسی اسلامی وقف کا متولی اور منتظم بنانا جائز نہیں باقی رہا ظاہری در ودیوار وغیرہ کی تعمیر سو اس میں کسی غیر مسلم سے بھی کام لیا جائے تو مضائقہ نہیں (تفسیر مراغی)

کافر کا چندہ: اسی طرح اگر کوئی غیر مسلم ثواب سمجھ کر مسجد بنا دے یا مسجد بنانے کیلئے مسلمانوں کو چندہ دیدے تو اس کا قبول کر لینا بھی اس شرط سے جائز ہے کہ اس سے کسی دینی یا دنیوی نقصان یا الزام کا یا آئندہ اس پر قبضہ کر لینے کا یا احسان جتلانے کا خطرہ نہ ہو (درالمختار، شامی، مراغی)

ایمان کی نشانی:

اور اس آیت میں جو یہ ارشاد فرمایا کہ مساجد کی عمارت اور آبادی صرف نیک مسلمان ہی کا کام ہے اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ جو شخص مساجد کی حفاظت، صفائی اور دوسری ضروریات کا انتظام کرتا ہے اور جو عبادت اور ذکر اللہ کے لئے یا علم دین اور قرآن پڑھنے پڑھانے کیلئے مسجد میں آتا جاتا ہے اس کے یہ اعمال اس کے مومن کامل ہونے کی شہادت ہے۔

امام ترمذی اور ابن ماجہ نے بروایت ابوسعید خدریؓ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ وہ مسجد کی حاضری کا پابند ہے تو اس کے ایمان کی شہادت دو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے انما یعمر مسجد الله من اٰمن بالله.

اور صحیحین کی حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص صبح شام مسجد میں حاضر ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کا ایک درجہ تیار فرما دیتے ہیں۔

اللہ کا مہمان: اور حضرت سلمان فارسیؓ نے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص مسجد میں آیا وہ اللہ تعالیٰ کی زیارت کرنے والا مہمان ہے، اور میزبان پر حق ہے کہ مہمان کا اکرام کرے۔ (مظہری بحوالہ طبرانی، ابن جریر، بیہقی وغیرہ)

اَجَعَلْتُمْ سِقَایَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ

کیا تم نے کر دیا حاجیوں کا پانی پلانا اور مسجد

الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ

الحرام کا بسانا برابر اُسکے جو یقین لایا اللہ پر اور آخرت کے دن پر

وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ
اور لڑا اللہ کی راہ میں یہ برابر نہیں ہیں
اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۹
اللہ کے نزدیک اور اللہ راستہ نہیں دیتا ظالم لوگوں کو

ایمان باللہ اور غلبۂ حق اعمال کی روح:

مشرکین مکہ کو اس پر بڑا فخر و ناز تھا کہ ہم حاجیوں کی خدمت کرتے انہیں پانی پلاتے، کھانا کپڑا دیتے اور مسجد حرام کی مرمت یا کسوۂ کعبہ یا تیل بتی وغیرہ کا انتظام کرتے ہیں۔ اگر مسلمان اپنے جہاد و ہجرت وغیرہ پر نازاں ہیں تو ہمارے پاس عبادات کا یہ ذخیرہ موجود ہے۔ ایک زمانہ میں حضرت عباسؓ نے بھی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مقابلہ میں اسی طرح کی بحث کی تھی، بلکہ صحیح مسلم میں ہے کہ ایک دفعہ چند مسلمان آپس میں جھگڑ رہے تھے، کوئی کہتا کہ میرے نزدیک اسلام لانے کے بعد حاجیوں کو پانی پلانے سے زیادہ کوئی عبادت نہیں، دوسرے نے کہا میری خیال میں اسلام کے بعد بہترین عمل مسجد حرام کی خدمت ہے (مثلاً جھاڑو دینا یا روشنی وغیرہ کرنا) تیسرا بولا کہ جہاد فی سبیل اللہ تمام عبادات و اعمال سے افضل و اشرف ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو ڈانٹا کہ تم "جمعہ" کے وقت منبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ کر اس طرح بحثیں کر رہے ہو، ذرا صبر کرو۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ سے فارغ ہو جائیں گے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ چیز دریافت کر لی جائیگی۔ چنانچہ جمعہ کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تو یہ آیات نازل ہوئیں اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الخ یعنی حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد حرام کا ظاہری طور پر بسانا ایمان باللہ اور جہاد فی سبیل اللہ میں سے کسی ایک کی برابر بھی نہیں ہوسکتا (افضل ہونا تو کجا؟) یہاں جہاد کے ساتھ ایمان باللہ کا ذکر کیا تو اس لئے کیا کہ مشرکین کے فخر و غرور کا جواب بھی ہو جائے کہ تمام عبادات کی روح ایمان باللہ ہے، اس روح کے بدون پانی پلانا یا مسجد حرام کی خدمت کرنا محض مردہ عمل ہے تو یہ بے جان اور مردہ عمل ایک زندہ جاوید عمل کی برابری کیسے کرسکتا ہے۔ وَمَا يَسْتَوِي الْاَحْيَآءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ (فاطر۔ رکوع ۳) اور اگر صرف مومنین کے اعمال کا باہمی موازنہ کرنا ہے تو ایمان باللہ کا ذکر جہاد فی سبیل الہ کی تمہید کے طور پر ہوگا اصل مقصود جہاد وغیرہ عزائم اعمال کی افضلیت کو بیان فرمانا ہے۔ ایمان کے ذکر سے تنبیہ فرما دی کہ جہاد فی سبیل اللہ ہو یا کوئی عمل ایمان کے بغیر ہیچ اور لاشئے محض ہے۔ ان عزائم اعمال (جہاد ہجرت وغیرہ) کا تقوم بھی ایمان باللہ سے ہوتا ہے اور اس نکتہ کو وہ ہی لوگ سمجھتے ہیں جو فہم سلیم رکھتے ہوں۔ ظالمین (بے موقع کام کرنے والوں) کی ان حقائق تک رسائی نہیں ہوتی۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت علی، حضرت عباس اور حضرت طلحہ کا مکالمہ:

ابن جریر نے محمد بن کعب کی روایت سے لکھا ہے کہ اس آیت کا نزول حضرت علیؓ حضرت عباسؓ اور طلحہؓ بن شیبہ کے حق میں ہوا تھا۔ تینوں نے اپنے اپنے کارناموں کا فخریہ اظہار کیا تھا۔ طلحہ نے کہا کہ میں کعبہ کا متولی ہوں، میرے ہاتھ میں کعبہ کا کنجیاں ہیں۔ حضرت عباسؓ نے کہا کہ میں حاجیوں کو پانی پلاتا ہوں یہ میری ڈیوٹی اور میرا حق ہے حضرت علی نے فرمایا میں نہیں جانتا آپ لوگ کیا کہہ رہے ہیں میں نے قبلہ کی طرف رخ کر کے چھ سال نمازیں پڑھی ہیں یعنی سب لوگوں سے پہلے اور میں مجاہد ہوں (راہ خدا میں میں نے جہاد کیے ہیں) اس پر آیت مذکورہ کا نزول ہوا۔

حضرت عباسؓ نے اپنی قید کے زمانے میں کہا تھا کہ تم اگر اسلام و جہاد میں تھے تو ہم بھی خانہ خدا کی خدمت اور حاجیوں کو آرام پہنچانے میں تھے۔ اس پر یہ آیت اتری کہ شرک کے وقت کی نیکی بے کار ہے۔ صحابہؓ نے ان پر جب لے دے شروع کی تو حضرت عباسؓ نے کہا تھا کہ ہم مسجد حرام کے متولی تھے ہم غلاموں کو آزاد کرتے تھے ہم بیت اللہ کو غلاف چڑھاتے تھے ہم حاجیوں کو پانی پلاتے تھے اس پر یہ آیت اتری۔ مروی ہے کہ یہ گفتگو حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ میں ہوئی تھی۔ مروی ہے کہ طلحہ بن شیبہ، عباسؓ بن عبدالمطلب، علیؓ بن ابی طالب بیٹھے بیٹھے اپنی بزرگیاں بیان کرنے لگے، طلحہ نے کہا میں بیت اللہ کا کنجی بردار ہوں۔ میں اگر چاہوں وہاں رات گزار سکتا ہوں۔ عباسؓ نے کہا میں زمزم کا پانی پلانے والا ہوں اور اس کا نگہبان ہوں اگر چاہوں مسجد میں ساری رات رہ سکتا ہوں۔ علیؓ نے کہا میں نہیں جانتا کہ تم دونوں صاحب کیا کہہ رہے ہو، میں نے لوگوں سے چھ ماہ پہلے قبلہ کی طرف نماز پڑھی ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ کافروں کا قول تھا کہ بیت اللہ کی خدمت اور حاجیوں کے پانی پلانے کی سعادت بہتر ہے ایمان و جہاد سے۔ ہم چونکہ یہ دونوں خدمتیں انجام دے رہے ہیں اس لئے ہم سے بہتر کوئی نہیں۔ اللہ نے ان کا فخر و غرور اور حق سے تکبر اور منہ پھیرنا بیان فرمایا کہ میری آیتوں کی تمہارے سامنے تلاوت ہوتے ہوئے تم اس سے بے پرواہی سے منہ موڑ کر اپنی کتھا میں مشغول رہتے ہو، پس تمہارا گمان بے جا تمہارا غرور غلط تمہارا فخر نامناسب ہے۔ یوں بھی خدا کے ساتھ کا ایمان اور اس کی راہ کا جہاد بڑی چیز ہے لیکن تمہارے مقابلے میں تو وہ اور بھی بڑی چیز ہے کیونکہ تمہاری تو کوئی نیکی بھی ہو اسے شرک کا گھن کھا جاتا ہے۔ (ابن کثیر)

سب سے افضل لوگ:

حضرت ابوسعید خدری راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا قیامت کے دن اللہ کے پاس سب سے اونچے درجہ والے اور سب سے بدتر کون لوگ ہوں گے فرمایا اللہ کی بکثرت یاد کرنے والے اور یاد کرنے والیاں۔عرض کیا گیا یارسول اللہ اور کیا اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے سے بھی (اللہ کا ذکر بکثرت کرنے والے افضل ہیں) فرمایا اگر کوئی تلوار سے کافروں کو اتنا مارے کہ تلوار ٹوٹ جائے یا خون سے رنگ جائے تب بھی اللہ کا ذکر کرنے والا اس سے افضل ہوگا رواہ احمد والترمذی۔ترمذی نے اس حدیث کو غریب کہا ہے۔(تفسیر مظہری)

زمزم سے پانی پینے پلانے کا قصہ:

بخاری وغیرہ نے حضرت ابن عباس کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سقایہ (پانی پینے پلانے کا مقام) کے پاس تشریف لائے اور پانی طلب فرمایا، حضرت عباسؓ نے (اپنے بیٹے سے) کہا فضل اپنی ماں کے پاس جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اس سے پانی لے آؤ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے اسی (سقایہ) کا پانی پلاؤ، حضرت عباسؓ نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگ اس میں ہاتھ ڈالتے ہیں، فرمایا اسی سے پلاؤ چنانچہ آپ نے اسی کا پانی پیا پھر زمزم (کے چشمہ) پر تشریف لے گئے لوگ پانی پلا رہے تھے اور چشمہ کے اندر کام کر رہے تھے۔ فرمایا کام کیے جاؤ تم اچھے کام پر لگے ہو پھر فرمایا اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ تم مغلوب ہو جاؤ گے۔(یعنی لوگوں کا ہجوم اتنا ٹوٹ پڑے گا اور مجھے دیکھ کر اتنے لوگ اندر اترنے کی کوشش کریں گے کہ تم بے بس ہو جاؤ گے) تو میں بھی اندر اتر کر (مشک یا ڈول کی) رسی اپنے اس مقام پر رکھ لیتا (حضور نے اپنے کاندھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ لفظ فرمایا تھا)

مسلم کا بیان ہے کہ بکر بن عبداللہ مازنی نے کہا میں نے حضرت ابن عباسؓ کے پاس کعبہ کے قریب بیٹھا ہوا تھا کہ ایک اعرابی آیا اور کہنے لگا کیا وجہ کہ تمہارے چچا کے بیٹے تو شہد اور دودھ پلاتے ہیں اور تم لوگ نبیذ پلاتے ہو کیا یہ بات تمہارے افلاس کی وجہ سے ہے یا بخل کی وجہ سے حضرت ابن عباس نے فرمایا الحمدللہ ہم محتاج نہیں نہ ہمارے اندر کنجوسی ہے بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اونٹنی پر سوار ہو کر (زمزم پر) تشریف لائے تھے پیچھے اسامہ بیٹھے ہوئے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا تم لوگوں نے خوب کیا تم نے ٹھیک کیا یونہی کیے جاؤ اب ہم نہیں چاہتے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو بدل ڈالیں۔(تفسیر مظہری)

سب سے افضل عمل:

مسند احمد اور ترمذی، ابن ماجہ میں حضرت ابوالدرداءؓ کی روایت سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا میں تمہیں ایسا عمل بتلاؤں جو تمہارے تمام اعمال سے بہتر اور تمہارے مالک کے نزدیک سب سے زیادہ افضل ہو، اور تمہارے درجات کو سب سے زیادہ بلند کرنے والا اور سونے چاندی کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے بھی افضل ہو، اور اس سے بھی افضل ہو کہ تم جہاد میں دشمن سے سخت مقابلہ کرو جس میں تم ان کو قتل کرو وہ تمہیں قتل کریں، صحابہ کرام نے عرض کیا یارسول اللہ وہ عمل ضرور بتلائیے، آپ نے فرمایا کہ وہ عمل ذکر اللہ ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ ذکر اللہ کی فضیلت جہاد سے بھی زیادہ ہے، اور عمارت مسجد جب بمعنی ذکر اللہ لی جائے تو وہ بھی جہاد سے افضل ہے، مگر اس جگہ مشرکین کا فخر وغرور ظاہر ہے کہ ذکر اللہ اور عبادت کی بناء پر نہ تھا بلکہ ظاہری تعمیر اور انتظامات کی بناء پر تھا، اس لئے جہاد کو اس سے افضل قرار دیا گیا۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ

جو ایمان لائے اور گھر چھوڑ آئے اور لڑے

سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ

اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے

اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ

ان کے لئے بڑا درجہ ہے اللہ کے ہاں

هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ۝۲۰ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ

اور وہی مراد کو پہنچنے والے ہیں خوشخبری دیتا ہے اُنکو پروردگار اُنکا

بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ

اپنی طرف سے مہربانی کی اور رضامندی کی اور باغوں کی

فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ۝۲۱ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ

کہ جن میں اُن کو آرام ہے ہمیشہ کا رہا کریں اُن میں مدام

اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝۲۲

بیشک اللہ کے پاس بڑا ثواب ہے

تین چیزوں پر تین بشارتیں:

یعنی اس کے یہاں ثواب اور درجات کی کیا کمی ہے جس کو جتنا چاہے

مرحمت فرمائے پہلی آیت میں تین چیزوں کا ذکر تھا۔ ایمان، جہاد اور ہجرت۔ ان تین پر بشارت بھی تین چیزوں کی دی۔ رحمت، رضوان، خلود فی الجنۃ۔ ابوحیان نے لکھا ہے کہ "رحمت" ایمان پر مرتب ہے ایمان نہ ہو تو آخرت میں خدا کی رحمت و مہربانی سے کوئی حصہ نہیں مل سکتا اور "رضوان" (جو بہت ہی اعلیٰ مقام ہے) جہاد فی سبیل اللہ کا صلہ ہے۔ مجاہد فی سبیل اللہ تمام نفسانی حظوظ و تعلقات ترک کر کے خدا کے راستہ میں جان و مال نثار کرتا اور خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے انتہائی قربانی پیش کرتا ہے۔ لہٰذا اس کا صلہ بھی انتہائی ہونا چاہیئے اور وہ حق تعالیٰ شانہ کی رضاء کا مقام ہے۔ باقی "ہجرت" وہ خدا کے لئے وطن مالوف اور گھر بار چھوڑنے کا نام ہے۔ اس لئے مہاجر کو خوشخبری دی گئی کہ تیرے وطن سے بہتر وطن اور تیرے گھر سے بہتر گھر تجھ کو ملے گا۔ جس میں ہمیشہ اعلیٰ درجہ کی آسائش و راحت سے رہتا ہوگا جس سے ہجرت کرنے کی کبھی نوبت نہ آئیگی۔ (تفسیر عثمانی)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْۤا اٰبَآءَكُمْ

اے ایمان والو مت پکڑو اپنے باپوں کو

وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ

اور بھائیوں کو رفیق اگر وہ عزیز رکھیں کفر کو

عَلَى الْاِيْمَانِ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ

ایمان سے اور جو تم میں اُن کی رفاقت کرے

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾

سو وہی لوگ ہیں گنہگار

رشتہ داری وغیرہ جہاد و ہجرت میں رکاوٹ نہ بنے:

پچھلی آیات میں بتلایا تھا کہ جہاد و ہجرت اعظم و افضل ترین اعمال ہیں۔ بسا اوقات ان دونوں اعمال میں خویش و اقارب، کنبہ اور برادری کے تعلقات خلل انداز ہوتے ہیں۔ اس لئے فرمادیا کہ جن لوگوں کو ایمان سے زیادہ کفر عزیز ہے، ایک مومن انہیں کیسے عزیز رکھ سکتا ہے۔ مسلمان کی شان نہیں کہ ان سے رفاقت اور دوستی کا دم بھرے حتیٰ کہ یہ تعلقات اس کو جہاد و ہجرت سے مانع ہو جائیں، ایسا کرنے والے گنہگار بن کر اپنی جانوں پر ظلم کر رہے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ

تو کہہ دے اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی

وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِۨاقْتَرَ

اور عورتیں اور برادری اور مال

فْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا

جو تم نے کمائے ہیں اور سوداگری جسکے بند ہونے سے تم ڈرتے ہو

وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ

اور حویلیاں جن کو پسند کرتے ہو تم کو زیادہ پیاری ہیں اللہ سے

وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِىْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا

اور اُسکے رسول سے اور لڑنے سے اُس کی راہ میں تو انتظار کرو

حَتّٰى يَاْتِىَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى

یہاں تک کہ بھیجے اللہ اپنا حکم اور اللہ راستہ نہیں دیتا

الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۴﴾

نافرمان لوگوں کو

جہاد چھوڑنے کی سزا:

یعنی اگر خدا و رسول کے احکام کا امتثال اور ہجرت یا جہاد کرنے سے یہ خیال مانع ہو کہ کنبہ برادری چھوٹ جائیگی اموال تلف ہوں گے، تجارت مندی پڑ جائے گی یا بند ہو جائیگی۔ آرام کے مکانوں سے نکل کر بے آرام ہونا پڑیگا، تو پھر خدا کی طرف سے حکم سزا کا انتظار کرو، جو اس تن آسانی اور دنیا طلبی پر آنیوالا ہے۔ جو لوگ مشرکین کی موالات یا دنیوی خواہشات میں پھنس کر احکام الٰہیہ کی تعمیل نہ کریں ان کو حقیقی کامیابی کا راستہ نہیں مل سکتا۔ حدیث میں ہے کہ جب تم بیلوں کی دم پکڑ کر کھیتی باڑی پر راضی ہو جاؤ گے اور "جہاد" چھوڑ بیٹھو گے تو خدا تم پر ایسی ذلت مسلط کر دیگا جس سے کبھی نکل نہ سکو گے یہاں تک کہ پھر اپنے دین (جہاد فی سبیل اللہ) کی طرف واپس آؤ۔ (تفسیر عثمانی)

ایمان کا کمال:

کمال ایمان یہ ہے کہ آدمی کی طبیعت شریعت کے تابع ہو جا۔ تقاضائے طبیعت بھی وہی ہو جائے جو شریعت کا حکم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: جس نے اللہ کی خوشنودی کیلئے محبت کی اللہ کی خوشنودی کیلئے دشمنی کی اللہ کی خوشنودی کیلئے یا (اللہ کی خوشنودی کیلئے روکا (نہیں دیا) اس نے ایمان کامل کرلیا۔

حضرت عبداللہ بن ہشام کا بیان ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا آپ حضرت عمرؓ بن خطاب کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے حضرت عمرؓ نے عرض کیا یارسول اللہ خدا کی قسم آپ مجھے سوائے اپنی جان کے ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک میں اس کی نظر میں اس کی جان سے بھی زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

میں کہتا ہوں ہاں جن لوگوں کو اللہ نے اپنی معرفت عطا کردی ہے وہ وہی بات کہتے ہیں جو مندرجہ ذیل اشعار میں شاعر نے کہی ہے۔

آنکس کہ ترا شناخت جاں راچہ کند　　فرزند وعیال وخان ومان راچہ کند
دیوانہ کنی ہردو جہانش بخشی　　دیوانہ تو ہر دوجہاں راچہ کند

جس نے تجھے پہچان لیا وہ جان اہل وعیال اور خاندان کا کیا کرے گا تو اس کو اپنا دیوانہ کر کے دونوں جہان بخش رہا ہے تیرا دیوانہ دونوں جہان کا کیا کرے گا۔ (تفسیر مظہری)

رشتہ داروں سے تعلق کی حد:

ماں باپ بھائی بہن اور تمام رشتہ داروں سے تعلق کو مضبوط رکھنے اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی ہدایات سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے مگر اس آیت میں یہ بتلادیا کہ ہر تعلق کی ایک حد ہے ان میں سے ہر تعلق خواہ ماں باپ اور اولاد کا ہو، یا حقیقی بھائی بہن کا، اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق کے مقابلہ میں نظر انداز کرنے کے قابل ہے، جس موقع پر یہ دونوں رشتے ٹکرا جائیں، تو پھر رشتہ وتعلق اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی قائم رکھنا ہے اس کے مقابلہ میں سارے تعلقات سے قطع نظر کرنا ہے۔

ہجرت چھوڑنے کی سزا:

اور حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ اس جگہ حکم سے مراد حکم عذاب ہے کہ دنیوی تعلقات پر اخروی تعلقات کو قربان کر کے ہجرت نہ کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ کا حکم عذاب عنقریب آنے والا ہے یا تو دنیا ہی میں ان پر عذاب آئے گا ورنہ آخرت کا عذاب تو یقینی ہے آیت میں اس جگہ مقصود تو ترک ہجرت پر وعید ہے مگر ذکر بجائے ہجرت کے جہاد کا کیا گیا، جو ہجرت کے بعد کا اگلا قدم ہے، اس میں اشارہ کر دیا گیا کہ ابھی تو صرف ہجرت اور ترک وطن ہی کا حکم ہوا ہے۔

ہجرت کی اہمیت: جب مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرض کردی گئی تو وہ صرف ایک فرض ہی نہیں بلکہ مسلمان ہونے کی علامت بھی تھی، جو باوجود قدرت کے ہجرت نہ کرے وہ مسلمان نہ سمجھا جاتا تھا، یہ حکم فتح مکہ کے بعد منسوخ ہوگیا اور اصل حکم یہ باقی رہ گیا کہ جس زمین پر انسان کو اللہ کے احکام نماز روزہ وغیرہ کی تعمیل ممکن نہ ہو اس سے ہجرت کرنا ہمیشہ کیلئے فرض ہے بشرطیکہ ہجرت پر قدرت ہو۔

مال واولاد کی محبت کا جادو:

امام تفسیر قاضی بیضاوی وغیرہ نے فرمایا کہ بہت کم لوگ ہیں جو اس آیت کی وعید سے مستثنیٰ ہوں کیونکہ عام طور پر بڑے سے بڑے عابد وزاہد اور عالم ومتقی بھی اہل وعیال اور مال ومتاع کی محبت سے مغلوب نظر آتے ہیں الا ماشاء اللہ۔

محبت اختیاری وغیر اختیاری:

مگر ساتھ ہی قاضی بیضاوی نے فرمایا کہ محبت سے مراد اس جگہ اختیاری محبت ہے غیر اختیاری اور طبعی محبت مراد نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی انسان کو اس کی طاقت واختیار سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے، اس لئے اگر کسی شخص کا دل ان دنیوی تعلقات کی طبعی محبت سے لبریز ہو مگر ان سے اتنا مغلوب نہ ہو کہ اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی خلاف ورزی کی پروا نہ کرے، تو وہ بھی اس وعید سے خارج اور اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو غالب رکھنے والا ہے جیسے کوئی بیمار دوا کی تلخی یا آپریشن کی تکلیف سے طبعاً گھبراتا ہے مگر عقلاً اس کو اپنی نجات وسلامتی کا ذریعہ سمجھ کر اختیار کرتا ہے، تو وہ کسی کے نزدیک قابل ملامت نہیں اور نہ کوئی عقل سلیم اس کو اس پر مجبور کرتی ہے کہ طبعی اور غیر اختیاری گھبراہٹ اور کراہت کو بھی دل سے نکال دے، اسی طرح اگر کسی کو مال واولاد وغیرہ کی محبت کے سبب بعض احکام الٰہیہ کی تعمیل میں غیر اختیاری طور پر تکلیف محسوس ہو، مگر اس کے باوجود وہ اس تکلیف کو برداشت کر کے احکام الٰہیہ بجا لائے تو وہ بھی قابل ملامت نہیں، بلکہ قابل تحسین ہے اور اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اس آیت کے مطابق غالب رکھنے والا کہلائے گا۔

محبت کا اعلیٰ مقام: ہاں اس میں شبہ نہیں کہ محبت کا اعلیٰ مقام یہی ہے کہ محبت طبیعت پر بھی غالب آجائے اور محبوب کے حکم کی تعمیل کی لذت ہر تلخی وتکلیف کو بھی لذیذ بنادے، جیسا دنیا کی فانی لذت وراحت کے طلبگاروں کو رات دن دیکھا جاتا ہے۔ کہ بڑی سے بڑی محنت ومشقت کو ہنس کھیل کر اختیار کر لیتے ہیں، کسی دفتر کی ملازمت میں مہینہ کے ختم پر ملنے والے چند سکوں کی محبت انسان کی نیند آرام اور سارے تعلقات پر ایسی غالب آجاتی ہے۔ کہ اس کے پیچھے ہزاروں مشقتوں کو بڑی کوششوں سفارشوں اور رشوتوں کے ذریعہ حاصل کرتا ہے

رنج وراحت شد چو مطلب شد بزرگ
گرد گلہ توتیائے چشم گرگ

اللہ والوں کو یہ مقام اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم اور نعمائے آخرت کی محبت میں ایسا ہی حاصل ہوتا ہے۔ کہ اس کے مقابلہ میں کوئی تکلیف تکلیف نظر نہیں آتی، صحیحین کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین خصلتیں ایسی ہیں کہ وہ جس شخص میں پائی جاویں تو اس کو ایمان کی حلاوت حاصل ہوجاتی ہے وہ تین خصلتیں یہ ہیں، ایک یہ کہ اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ

علیہ وسلم اس کے نزدیک ان کے ماسوائے ہر چیز سے زیادہ محبوب ہو، دوسرے یہ کہ وہ کسی اللہ کے بندے سے صرف اللہ ہی کے لئے محبت رکھے تیسرے یہ کہ کفر وشرک اس کو آگ میں ڈالے جانے کے برابر محسوس ہو۔ (معارف مفتی اعظم)

حضرت ابراہیم کا قول:

یہ آیتیں ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئیں جن کو ہجرت کے بارے میں تردد تھا اور یہ خیال کرتے تھے کہ اگر مدینہ کی طرف ہجرت کر جائیں گے تو اہل وعیال اور خویش واقارب اور یہ مکانات جن میں آرام سے بسر کرتے ہیں یہ سب چھوٹ جائیں گے۔ اور تجارت کا سلسلہ درہم برہم ہوجائے گا اس پر حق تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل فرمائیں کہ ایمان باللہ اور ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ کے مقابلہ میں سب چیزیں ہیچ ہیں۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے قول کو سامنے رکھو فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ یعنی اللہ رب العلمین کے سوا سب میرے دشمن ہیں۔ (معارف کاندھلویؒ)

باپ بیٹے میں جنگ: حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے باپ نے بدر والے دن ان کے سامنے اپنے بتوں کی تعریفیں شروع کیں آپ نے اسے ہرچند روکنا چاہا لیکن وہ بڑھتا ہی چلا گیا، باپ بیٹوں میں جنگ شروع ہوگئی آپؓ نے اپنے باپ کو قتل کردیا اس پر آیت لاتجد الخ نازل ہوئی۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ
مدد کر چکا ہے اللہ تمہاری بہت میدانوں میں
وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ
اور حنین کے دن جب خوش ہوئے تم اپنی کثرت پر
فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ
پھر وہ کچھ کام نہ آئی تمہارے اور تنگ ہوگئی تم پر
الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ﴿٢٥﴾
زمین باوجود اپنی فراخی کے پھر ہٹ گئے تم پیٹھ دے کر
ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ
پھر اتاری اللہ نے اپنی طرف سے تسکین اپنے رسول پر اور
عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ۚ
ایمان والوں پر اور اُتاریں فوجیں کہ جن کو تم نے نہیں دیکھا

وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَذٰلِكَ جَزَاۗءُ
اور عذاب دیا کافروں کو اور یہی سزا ہے
الْكٰفِرِيْنَ ﴿٢٦﴾
منکروں کی

پچھلی آیت میں تنبیہ کی گئی تھی کہ جہاد فی سبیل اللہ کے وقت مومنین کو کنبہ برادری اموال واملاک وغیرہ کسی چیز پر نظر نہ ہونی چاہیے یہاں آگاہ فرمایا ہے کہ مجاہدین کو خود اپنی فوجی جمعیت وکثرت پر گھمنڈ نہ کرنا چاہیے۔ نصرت وکامیابی اکیلے خدا کی مدد سے ہے۔ جس کا تجربہ پیشتر بھی بہت سے میدانوں میں تم کر چکے ہو۔ بدر، قریظہ ونضیر اور حدیبیہ کا کرشمہ تھا۔ اور اب اخیر میں غزوہ حنین کا واقعہ تو ایسا صریح اور عجیب وغریب نشان آسمانی نصرت وامداد کا ہے جس کا اقرار سخت معاند دشمنوں تک کو کرنا پڑا ہے۔ فتح مکہ کے بعد فورا آپ کو اطلاع ملی کہ ہوازن وثقیف وغیرہ بہت سے قبائل عرب نے ایک لشکر جرار تیار کر کے بڑے ساز وسامان سے مسلمانوں پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ یہ خبر پاتے ہی آپ نے دس ہزار مہاجرین وانصار کی فوج گراں لے کر جو مکہ فتح کرنے کیلئے مدینہ سے ہمراہ آئی تھی، طائف کی طرف کوچ کردیا دو ہزار طلقاء بھی جو فتح مکہ کے وقت مسلمان ہوئے تھے، آپ کے ہمراہ تھے یہ پہلا موقع تھا کہ بارہ ہزار کی عظیم الشان جمعیت کیل کانٹے سے لیس ہوکر میدان جہاد میں نکلے۔ یہ منظر دیکھ کر بعض صحابہ سے نہ رہا گیا اور بے ساختہ بول اٹھے کہ (جب ہم بہت تھوڑے تھے اس وقت ہمیشہ غالب رہے تو) آج ہماری اتنی بڑی تعداد کسی سے مغلوب ہونیوالی نہیں۔ یہ جملہ مردان توحید کی زبان سے نکلنا ''بارگاہ احدیت'' میں ناپسند ہوا۔ ابھی مکہ سے تھوڑی دور نکلے تھے کہ دونوں لشکر مقابل ہوگئے۔ فریق مخالف کی جمعیت چار ہزار تھی جو سر کو کفن باندھ کر اور سب عورتوں بچوں کو ساتھ لیکر ایک فیصلہ کن جنگ کیلئے پوری تیاری سے نکلے تھے اونٹ گھوڑے مواشی اور گھروں کا کل اندوختہ کوڑی کوڑی کر کے اپنے ہمراہ لے آئے تھے۔ ہوازن کا قبیلہ تیراندازی کے فن میں سارے عرب میں شہرت رکھتا تھا۔ اس کے بڑے بڑے ماہر تیراندازوں کا دستہ وادی حنین کی پہاڑیوں میں گھات لگائے بیٹھا تھا۔ صحیحین میں براء بن عازب کی روایت ہے کہ پہلے معرکہ میں کفار کو ہزیمت ہوئی وہ بہت سامال چھوڑ کر پسپا ہوگئے یہ دیکھ کر مسلمان سپاہی غنیمت کی طرف جھک پڑے۔ اس وقت ہوازن کے تیراندازوں نے گھات سے نکل کر ایک دم دھاوا بول دیا۔ آن واحد میں چاروں طرف سے اس قدر تیر برسائے کہ مسلمانوں کو قدم جمانا مشکل ہوگیا۔ اول طلقاء میں بھاگڑ پڑی۔ آخر سب کے پاؤں

اکھڑ گئے، زمین باوجود فراخی کے تنگ ہوگئی کہ کہیں پناہ کی جگہ نہ ملتی تھی۔ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم مع چند رفقاء کے دشمنوں کے نرغہ میں تھے۔ ابوبکر، عمر، عباس، علی، عبداللہ بن مسعود وغیرہ رضی اللہ عنہم تقریباً سو یا اسی صحابہ بلکہ بعض اہل سیر کی تصریح کے موافق کل دس نفوس قدسیہ (عشرہ کاملہ) میدان جنگ میں باقی رہ گئے جو پہاڑ سے زیادہ مستقیم نظر آتے تھے۔ یہ خاص موقع تھا جبکہ دنیا نے پیغمبرانہ صداقت وتوکل اور معجزانہ شجاعت کا ایک محیر العقول نظارہ ان ظاہری آنکھوں سے دیکھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سفید خچر پر سوار ہیں، عباس ایک رکاب اور ابوسفیان بن الحارث دوسری رکاب تھامے ہوئے ہیں۔ چار ہزار کا مسلح لشکر پورے جوش انتقام میں ٹوٹا پڑتا ہے۔ ہر چہار طرف سے تیروں کا مینہ برس رہا ہے۔ ساتھی منتشر ہو چکے ہیں۔ مگر رفیق اعلیٰ آپ کے ساتھ ہے، ربانی تائید اور آسمانی سکینہ کی غیر مرئی بارش آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گنے چنے رفیقوں پر ہو رہی ہے۔ جس کا اثر آخر کار بھاگنے والوں تک پہنچتا ہے۔ جدھر سے ہوازن وثقیف کا سیلاب بڑھ رہا ہے آپ کی سواری کا منہ اس وقت بھی اسی طرف ہے۔ اور ادھر ہی آگے بڑھنے کیلئے خچر کو مہمیز کر رہے ہیں۔ دل سے خدا کی طرف لولگی ہے۔ اور زبان پر نہایت استغناء واطمینان کے ساتھ انا النبی لاکذب انا ابن عبدالمطلب جاری ہے۔ یعنی بیشک میں سچا پیغمبر ہوں اور عبدالمطلب کی اولاد ہوں۔ اسی حالت میں آپ نے صحابہ کو آواز دی الی عباداللہ الی انا رسول اللہ۔ خدا کے بندو! ادھر آؤ۔ یہاں آؤ کہ میں خدا کا رسول ہوں۔ پھر آپ کی ہدایت کے موافق حضرت عباس نے (جو نہایت جہیر الصوت تھے) اصحاب سمرہ کو پکارا جنہوں نے درخت کے نیچے حضور کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی تھی۔ آواز کا کانوں میں پہنچنا تھا کہ بھاگنے والوں نے سواریوں کا رخ میدان جنگ کی طرف پھیر دیا۔ جس کے اونٹ نے رخ بدلنے میں دیر کی وہ گلے میں زرہ ڈال کر اونٹ سے کود پڑا اور سواری چھوڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹا۔ اسی اثناء میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تھوڑی سی مٹی اور کنکریاں اٹھا کر لشکر کفار پر پھینکیں جو خدا کی قدرت سے ہر کافر کے چہرے اور آنکھوں پر پڑی۔ ادھر حق تعالیٰ نے آسمان سے فرشتوں کی فوجیں بھیج دیں جن کا نزول غیر مرئی طور پر مسلمانوں کی تقویب وہمت افزائی اور کفار کی مرعوبیت کا سبب ہوا۔ پھر کیا تھا۔ کفار کنکریوں کے اثر سے آنکھیں ملتے رہے جو مسلمان قریب تھے انہوں نے پلٹ کر حملہ کر دیا۔ آنا فانا میں مطلع صاف ہوگیا۔ بہت سے بھاگے ہوئے مسلمان لوٹ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے تو دیکھا کہ لڑائی ختم ہو چکی۔ ہزاروں قیدی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بندھے کھڑے ہیں اور مال غنیمت کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں **فسبحان من بیدہ ملکوت کل شیء** اس طرح کافروں کو دنیا میں سزا دی گئی۔ (تفسیر عثمانی)

غزوہ حنین

سرداروں کا مشورہ:

اصحاب مغازی نے لکھا ہے کہ رمضان ۸ ھ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کرلیا تو سرداران ہوازن کو خوف پیدا ہوا کہ اب مسلمان کہیں ان پر حملہ نہ کردیں آپس میں کہنے لگے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اب بالکل فارغ ہوگئے ہیں ہم پر حملہ کرنے سے ان کیلئے کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی اس لیے مناسب یہ ہے کہ ہم ہی ان پر حملہ کردیں (تا کہ ان کے حوصلے پست ہو جائیں) رائے یہ ہوئی کہ سب لوگوں کو جمع کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ادھر آنے سے پہلے تم ہی ان کی طرف چل دو، مشورہ طے ہوگیا۔

ابن ابی براء نے ان کو شریک ہونے سے منع کر دیا اور بولا مشرق سے مغرب تک جو کوئی بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرے گا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس پر غالب آجائیں گے۔ (لہذا ان سے مقابلہ کرنا بیکار ہے) بنی جشم میں ایک (مشہور مدبر شاعر) سردار تھا جس کا نام تھا ورید بن الصمہ اس کی عمر ایک سو ساٹھ یا ایک سو بیس برس تھی قبیلہ والوں نے اس کی سوجھ بوجھ کی وجہ سے اس کو اپنا کمانڈر بنانا چاہا درید بولا مجھے آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا نہ سواری پر جم کر ٹھیک طرح سے بیٹھ سکتا ہوں پھر بھی تم کو مشورہ دینے کیلئے میں تمہارے ساتھ چلوں گا مگر شرط یہ ہے کہ تم میری مخالفت نہ کرنا۔ اگر میرے مشورہ کے خلاف کرو گے تو میں نہیں جاؤں گا اس وقت مالک بن عوف تیس سالہ جوان ہوازان کا سردار تھا۔ اس نے جواب دیا ہم آپ کے مشورہ کے خلاف نہیں کریں گے۔ غرض جب مسلمانوں پر چڑھائی کا پختہ ارادہ ہوگیا تو مالک کے حکم کے موافق سب لوگ عورتوں سمیت نکل کھڑے ہوئے اور اپنا مال بھی ساتھ لے لیا۔ مالک نے اوطاس میں لشکر گاہ بنائی اور چاروں طرف سے امداد آنی شروع ہوگئی اب ورید بن الصمہ آیا اور کہنے لگا یہ مجھے بچوں کے رونے کی آوازیں کیسی سنائی دے رہی ہے اونٹوں کا بلبلانا، گدھوں کا ڈونکنا بکریوں کا منمنانا اور گایوں کا چیخنا میں کیوں سن رہا ہوں۔ لوگوں نے کہا مالک کے حکم سے لوگ اپنے اہل وعیال اور جانوروں کو ساتھ لیکر آئے ہیں ورید نے مالک سے کہا تم سب کو کیوں کھینچ کر لائے ہو مالک نے جواب دیا۔ میرا خیال یہ ہے کہ جب ہر شخص کے ساتھ اس کے بیوی بچے اور جانور ہوں گے تو وہ ان کی حفاظت ومدافعت کے لئے جم کر لڑے گا (بھاگنے کا ارادہ بھی نہیں کرے گا) درید نے لوگوں سے کہا، یہ بھیڑوں کا چرواہا ہے اس کا جنگ سے کیا تعلق۔ پھر تعجب کے طور پر ہاتھ پر ہاتھ مار کر بولا بھاگنے والے کو کوئی چیز لوٹا کو نہیں لاسکتی اگر جنگ کا پلڑہ تمہارے حق

نہیں ہوتا ہے تو تم کو مردوں کی تلواریں اور نیزے ہی فائدہ پہنچا سکتے ہیں (بال بچے کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتے) اور اگر جنگ تمہارے خلاف پڑی تو بیوی بچوں کی گرفتاری اور مویشیوں کی لوٹ تم کو رسوا کردے گی لہٰذا ان تمام عورتوں بچوں اور جانوروں کو قوم کے بالائی مقامات اور محفوظ علاقوں میں پہنچا دو پھر گھوڑوں پر سوار اور پیدل سب مل کر لڑو اگر تم کو فتح حاصل ہوئی تو بیوی بچے اور جانور سب تم سے آ کر مل جائیں گے اور اگر تم کو شکست ہوئی تو اہل وعیال اور مال کی تو حفاظت رہے گی، مالک نے کہا میں ایسا نہیں کروں گا تم بوڑھے ہو گئے ہو اور تمہاری عقل بھی بوڑھی ہو گئی ہے ورید کو یہ سن کر غصہ آ گیا اور بولا اے گروہ ہوازن کعب اور کلاب کہاں ہیں لوگوں نے جواب دیا ان میں سے تو کوئی نہیں آیا ورید نے کہا طاقت اور بہادری تو غائب ہو گئی۔ اگر یہ دن غلبہ پانے اور برتری حاصل کرنے کا دن ہوتا تو وہ لوگ غیر حاضر نہ ہوتے (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فتح کا امکان نہیں اسی لئے بنی کعب و بنی کلاب نہیں آئے) اے گروہ ہوازن لوٹ چلو اور کعب وکلاب نے جیسا کیا ہے تم بھی ویسا ہی کرو۔ لوگوں نے واپس جانے سے انکار کر دیا۔ ورید نے کہا اچھا تم میں سے کون کون آیا ہے قوم نے جواب دیا عامر کے دونوں بیٹے عمرو اور عوف۔ ورید نے کہا یہ دونوں بنی عامر کے کمزور اشخاص ہیں فرار تو اختیار نہیں کریں گے لیکن ان کی موجودگی بھی فائدہ رساں نہیں ہے۔

مسلمانوں پر حملہ: مالک نے ورید سے پوچھا اس رائے کے علاوہ بھی کوئی رائے ہے جس پر چلنے کا میں قوم کا حکم دوں، ورید نے کہا ہاں اپنی فوج کے کچھ آدمی کمین گاہ میں چھپا دو جو تمہاری مدد کے لئے تیار رہیں۔ اگر دشمن تم پر حملہ آور ہوں گے تو یہ تمہاری چھپی ہوئی کمک دشمنوں کے پیچھے سے ان پر حملہ کرے گی اور تم اپنے ساتھیوں کو لے کر سامنے سے مقابلہ کرو گے اور اگر تم حملہ کرو گے تو ان میں سے کوئی بچ کر نہ جائے گا۔ مالک نے ایسا ہی کیا۔ کچھ لوگوں کو پہاڑی گھاٹیوں اور وادی کے غاروں میں چھپا دیا اور مسلمانوں پر حملہ کیا جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثر ساتھی بھاگ پڑے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تیاری:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ہوازن کے ارادے کی اطلاع ملی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے لڑنے کا ارادہ کر لیا اور عتابؓ بن اسید کو جن کی عمر بیس سال تھی اپنی جگہ مکہ میں حاکم بنایا اور معاذؓ بن جبل کو مسائل اسلام سکھانے کیلئے معلم مقرر کیا بخاری نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حنین کو جانے کا ارادہ کر لیا تو فرمایا کل ان شاء اللہ ہمارا پڑاؤ خیف بنی کنانہ پر ہوگا جہاں کافروں نے کفر پر قائم رہنے کی قسمیں کھائی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صفوان بن امیہ سے کچھ زرہیں اور ہتھیار مستعار مانگے۔ صفوان نے کہا محمد کیا زرہیں اور ہتھیار مجھ سے چھیننا چاہتے ہو یا بطور عاریت مانگتے ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا محض عاریت کے طور پر اور وہ بھی ضمان ادا کرنے کے وعدہ پر (یعنی جو ہتھیار تلف ہوگا اس کا معاوضہ دیا جائے گا) صفوان نے سو زرہیں اور ان کے لائق ضروری اسلحہ دیدیئے، ابن اسحاق نے حضرت جابرؓ کی روایت سے اور ابوداؤد واحمد نے امیہ بن صفوان کے حوالہ سے یونہی نقل کیا ہے۔ سہیلی کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نوفل بن حارث بن عبدالمطلب سے تین ہزار برچھے بطور عاریت لیے تھے اور فرمایا تھا میں گویا دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے یہ برچھے دشمنوں کی پیٹھ توڑ رہے ہیں۔

روانگی: غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہفتہ کے دن ۶ شوال ۸ھ کو بارہ ہزار مسلمانوں کو لے کر مکہ سے روانہ ہوئے، عروہ اور زہری کا بیان کہ جب رسول اللہ مکہ میں تشریف لائے تھے تو آپ کے ساتھ بارہ ہزار اشخاص تھے پھر دو ہزار (مکہ کے) آزاد کردہ (یعنی مکہ کے باشندے جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا جاؤ تم آزاد ہو) بڑھالئے گئے اس طرح چودہ ہزار ہو گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کی دونوں بیبیاں حضرت ام سلمہ اور حضرت میمونہ بھی تھیں جن کے لئے خیمہ لگا دیا گیا تھا۔ ابن اسحاق نسائی اور ترمذی نے بیان کیا ہے اور ترمذی نے اس کو صحیح بھی کہا ہے کہ حضرت حارث بن مالک نے فرمایا ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب حنین کو روانہ ہوئے۔ دور جاہلیت سے نکلے ہوئے ہم کو زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ قریش اور دوسرے کافروں کا ایک درخت سے عقیدت تھی۔ (تفسیر مظہری)

ایک سوار کی اطلاع: حضرت سہیل بن حنظلہ کی روایت ہے کہ ایک سوار نے آ کر عرض کیا یارسول اللہ میں نے فلاں فلاں پہاڑیوں پر چڑھ کر دیکھا تو نظر آیا کہ تمام ہوازن مع عورتوں اور اونٹوں اور بکریوں کے ایک جا اکٹھے ہو گئے ہیں یہ خبر سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے اور فرمایا ان شاء اللہ تعالیٰ یہ مسلمانوں کا مال غنیمت ہوگا۔ پھر فرمایا آج رات ہمارا چوکیدارہ کون کرے گا۔ حضرت انس بن مالک ابی مرثد نے عرض کیا یارسول اللہ میں نگرانی کروں گا فرمایا تو سوار ہو کر اس گھاٹی کے سامنے سے جاؤ اور اوپر پہنچ جاؤ (وہاں سے نگرانی کرو)۔ اور جو لوگ تمہارے سامنے ہیں ان سے غافل نہ رہنا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز پڑھ چکے تو حضرت انسؓ آ گئے اور عرض کیا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق گیا تھا اور گھاٹی کے اوپر (رات کو) رہا تھا جب صبح ہوئی تو میں نے دونوں گھاٹیوں کی طرف نظر دوڑائی مگر کوئی شخص وہاں دکھائی نہیں دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنت تمہارے لئے واجب کر دی گئی اس کے بعد اگر تم کوئی عمل بھی

نہیں کرو گے تب بھی تمہارے لئے کوئی ہرج نہ ہوگا (یعنی اس نیکی نے تم کو جنت کا مستحق بنادیا اور آئندہ نیکیوں سے بے نیاز کردیا) رواہ ابوداؤد والنسائی۔

حضرت عبداللہ کی جاسوسی:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن عدرد کو ہوازن کے حالات معلوم کرنے کیلئے بھیجا۔ عبداللہ بن عدرد جا کر ان کے اندر گھس گئے اور ایک دو روز (حالات کی جستجو میں) وہیں رہے وہاں انہوں نے مالک کو اپنے ساتھیوں سے یہ الفاظ کہتے سنا کہ اس بار سے پہلے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی (لڑنے والی) قوم سے لڑنے کا واسطہ نہیں پڑا نا تجربہ کار لوگوں سے ان کا مقابلہ ہوتا رہا جو لڑائی سے واقف ہی نہیں تھے اس لئے ان پر غالب آتے رہے صبح کو تم لوگ اپنے جانوروں عورتوں اور بچوں کو اپنے پیچھے قطار در قطار جمع کر دینا پھر اپنی طرف سے حملہ کا آغاز کرنا اور تلواروں کی نیا میں توڑ ڈالنا بیس ہزار برہنہ تلواریں لے کر ایک دم ایک ساتھ ایک شخص کی طرح حملہ کر دینا خوب سمجھ لو کہ جو پہل کرے گا غلبہ اسی کو حاصل ہوگا۔

اللہ حفاظت کرنے والا ہے:

راوی کا بیان ہے کہ ہم اوطاس میں ایک بڑے درخت کے نیچے اترے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی درخت کے نیچے فروکش ہوئے وہاں ہم نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے ہوئے ہیں اور ایک دوسرا آدمی بھی آپ کے پاس بیٹھا ہوا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں سو رہا تھا کہ یہ شخص آ گیا اور میری ہی تلوار سونت کر میرے سرہانے کھڑا ہو گیا۔ میں بیدار ہو گیا اس نے مجھ سے کہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اب تم کو مجھ سے کون بچائے گا میں نے کہا اللہ یہ سن کر میں نے اپنی تلوار نیام سے سونت لی اور عرض کیا یا رسول اللہ مجھے اجازت دیجئے میں اللہ کے دشمن کی گردن ماردوں واللہ یہ دشمن کے جاسوسوں میں سے ہے فرمایا ابو بردہ خاموش رہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو کچھ نہیں فرمایا نہ اس کو کوئی سزا دی اور مجھ سے فرمایا ابو بردہ اللہ میری حفاظت کرنے والا، اور بچانے والا ہے (اس وقت تک وہ میری حفاظت رکھے گا) کہ اس کا دین تمام مذاہب پر غالب ہو جائے۔

کافروں کے تین جاسوس:

ابونعیم اور بیہقی کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۱۰ شوال منگل کی شام کو حنین پہنچے۔ مالک بن عوف نے ہوازن کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے احوال کی جستجو کیلئے تین آدمی بھیجے اور ان کو حکم دیا کہ مسلمانوں کے لشکر کے اندر پھیل جائیں (اور ہر ایک دشمن کے احوال کی جستجو کرے) جب یہ جاسوس مسلمانوں کے لشکر سے واپس آئے تو ہر ایک کا جوڑ جوڑ (بند بند) الگ الگ ہو رہا تھا (یعنی سب بے سکت خوف زدہ ہو رہے تھے) مالک نے پوچھا ارے تمہاری یہ کیا حالت ہے جاسوس بولے ہم کو کچھ گورے گورے آدمی ابلق گھوڑوں پر سوار دکھائی دیئے ان کو دیکھتے ہی ہم بے سکت ہو گئے اور وہ حالت ہو گئی جو تم دیکھ رہے ہو، خدا کی قسم ہماری جنگ زمین کے باشندوں سے نہیں ہو گی آسمان والوں سے ہم کو لڑنا ہوگا۔ مالک نے کہا تف ہے تم تمام اہل لشکر سے زیادہ بزدل ہو مالک نے ان لوگوں کو بند کر دیا اس کو اندیشہ ہوا کہ ان کا یہ خوف کہیں لشکر میں نہ پھیل جائے۔ پھر لوگوں سے کہا مجھے ایک جیالا آدمی بتاؤ (جو بیباکی کے ساتھ صحیح اطلاعات فراہم کرے) سب نے ایک شخص کا انتخاب کر دیا وہ شخص (جاسوسی کرنے کیلئے گیا۔ جب واپس آیا تو اس کی بھی وہی حالت تھی جو اس سے پہلے والے تینوں آدمیوں کی تھی اور اس نے بھی وہی بات کہی جو پہلے آدمیوں نے کہی تھی۔

فوجوں کی صف بندی:

محمد بن عمر کا بیان ہے دو تہائی رات گذرنے کے بعد مالک نے وادی حنین میں اپنے ساتھیوں کی ترتیب اور صف بندی کی یہ وادی بڑی خوفناک تھی۔ اس میں بکثرت گھاٹیاں اور تنگ راستے تھے۔ مالک نے اپنے آدمیوں کو ان گھاٹیوں اور تنگ راہوں میں پھیلا دیا اور ان کو حکم دے دیا کہ سب یکدم حملہ کر دیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے ساتھیوں کو تیار کیا اور صبح کو ان کی صف بندی کی جھنڈے اور پھریرے قائم کیے اور بنفس نفیس دو زرہیں خود اور بکتر سے آراستہ ہوئے اور لشکر کی صفوں کے سامنے جا کر معائنہ کیا اور گھوم پھر کر بعض کو بعض کے آگے پیچھے کیا پھر سب کو جنگ پر آمادہ کیا اور فتح کی خوش خبری دی بشرطیکہ لوگ سچے دل سے ثابت قدمی کے ساتھ جمے رہیں۔ خالد بن ولید کو بنی سلیم کی قیادت سپرد کی، خالد کو اور اہل مکہ کو آگے بڑھایا لشکر کے تین حصے کیے میمنہ میسرہ اور قلب (دایاں بازو بایاں بازو اور وسط) قلب میں خود رہے۔

تعداد کی کثرت:

بزار کی روایت میں آیا ہے کہ ایک انصاری نوجوان نے کہا تھا آج تعداد کی کمی کی وجہ سے ہم مغلوب نہ ہوں گے اور جونہی مقابلہ ہوگا دشمن شکست کھا کر پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے یونس بن بکر کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان لوگوں کا یہ قول اور کثرت تعداد پر غرور ناپسند ہوا۔ ابن المنذر نے حسن کا بھی یہی قول نقل کیا ہے اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ سے یہی مراد ہے (یعنی مکہ اور مدینہ والوں کا مل کر اپنی کثرت پر اترانا اور خوش ہونا)

دشمن کا حملہ:

ابن اسحاق امام احمد اور ابن حبان نے حضرت جابرؓ کی روایت سے اور ابویعلی (محمد بن عمر نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے۔ حضرت جابرؓ

نے فرمایا جب وادی حنین ہمارے سامنے آئی تو ہم خوفناک وادی سے نشیب کی طرف گئے وادی میں مختلف راستے تنگ مقامات اور گھاٹیاں تھیں دشمن کے آدمی ہم سے پہلے وادی میں گھاٹیوں، مخفی مقامات اور تنگ جگہوں میں چھپ گئے تھے اور حملہ کرنے کیلئے تیار ہو گئے تھے ہم نیچے کو اتر ہی رہے تھے اور کوئی شبہ بھی نہ تھا کہ یکدم فوجی دستوں نے ایک آدمی کی طرح یکدم ہم پر حملہ کر دیا۔ یہ تیرانداز تھے۔ حضرت انسؓ نے فرمایا ہوازن کی طرف سے جو چیز ہمارے سامنے آئی ایسی تو خدا کی قسم میں نے اس زمانہ میں کبھی دیکھی ہی نہ تھی، دشمن کی کثرت تھی وہ لوگ عورتوں بچوں اور جانوروں کو بھی لے کر آئے تھے، انہوں نے صف بندی اس طرح کی تھی کہ عورتوں کو اونٹوں پر سوار کر کے مردوں کی قطاروں کے پیچھے کر دیا تھا، پھر اونٹوں، گایوں اور بکریوں کو ان کے پیچھے جمع کر دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح وہ نہیں بھاگیں گے دور سے کچھ کالی کالی شباہت نظر آئی ہم سمجھے وہ آدمی ہیں جب ہم وادی سے نشیب میں اترے صبح تڑکے کا وقت تھا ہماری غفلت کی حالت میں کچھ دستے وادی کے تنگ راستوں اور گھاٹیوں سے نکل کر ایک شخص کی طرح یکدم ہم پر حملہ آور ہو گئے جس کی وجہ سے بنی سلیم کے اگلے سوار تتر بتر ہو کر بھاگ پڑے اور ان کے پیچھے اہل مکہ بھی چلے اور ان کے پیچھے دوسرے لوگ شکست کھا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ کسی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھا اور غبار اتنا اٹھا کہ ہم میں سے کسی کو اپنا ہاتھ بھی نہیں سوجھتا تھا۔ حضرت جابر نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (قلب سے) دائیں جانب سمٹ گئے پھر فرمایا لوگو! میری طرف آؤ۔ میں اللہ کا رسول ہوں، میں محمد بن عبداللہ ہوں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بہادری:

ابن اسحاق کی دوسری روایت میں آیا ہے کہ حضرت براء نے فرمایا، جب گھمسان کا رن پڑتا تھا تو ہم حضور کے ذریعہ سے اپنا بچاؤ کرتے تھے (یعنی رسول اللہ کے پیچھے آجاتے تھے) ہم میں بڑا بہادر آدمی وہ ہوتا تھا جو رسول اللہ کے برابر کھڑا ہوتا (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح آگے ہوتے اسی طرح وہ بھی حضور کے برابر کھڑا ہوتا۔ اور آگے کی صف میں بغیر آڑ لیے کھڑا رہتا۔)

عبدالمالک کا مسلمان ہونا:

ابن سعد وابن عساکر نے عبدالمالک بن عبیداللہ کی روایت سے اور طبرانی بیہقی ابن عساکر اور ابونعیم نے عکرمہ کی روایت سے بیان کیا کہ شیبہ بن عثمان نے کہا کہ فتح کے سال جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زبردستی مکہ میں داخل ہو گئے اور مکہ کو فتح کر کے حنین کے جہاد کو گئے تو میں نے سوچا کہ مجھے بھی قریش کے ساتھ ہوازن کی طرف چل دینا چاہیے تاکہ ہوازن سے جب مسلمانوں کی (گھمسان کی جنگ ہو اور) گتھم گتھا ہو تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے غفلت کا موقع پا کر میں ان پر حملہ کر دوں مجھے اپنے باپ کی جس کو حمزہ نے قتل کیا تھا یاد آئی اور میں نے کہا آج میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا اور تمام قریش کا انتقام لے لوں گا اور اگر سارا عرب وعجم بھی محمد کے پیچھے ہو جائے تب بھی میں ان کا اتباع نہیں کروں گا۔ چنانچہ روانگی کے وقت سے میں تاک میں لگا رہا اور برابر میرا حوصلہ بڑھتا ہی جاتا تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی بھاگ کھڑے ہوئے تو میں (حملہ کا موقع تلاش کرنے کیلئے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دائیں طرف گیا میں نے دیکھا ادھر عباسؓ چمکیلی زرہ پہنے کھڑے ہیں، میں نے خیال کیا یہ تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ہیں یہ ضرور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کریں گے پھر میں بائیں طرف سے گیا ادھر ابوسفیان بن حارث موجود تھے میں نے کہا یہ چچا کے بیٹے ہیں یہ بھی ان کو ہرگز بے مدد نہیں چھوڑیں گے۔ پھر میں پیچھے سے گیا اور تلوار سے حملہ کرنے ہی والا تھا کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی تھی کہ میں نے دیکھا میرے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان بجلی کی طرح آگ کے شعلے چمک رہے ہیں مجھے ڈر لگا کہ کہیں مجھ پر نہ آپڑیں اور اپنی نظر جاتے رہنے کے خوف سے میں نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا اور پچھلے قدم لوٹ پڑا اور سمجھ گیا کہ (اللہ کی طرف سے) ان کی حفاظت کی جا رہی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری طرف رخ پھیرا اور فرمایا شیبہ میرے قریب آجاؤ میں قریب پہنچ گیا۔ آپ نے اپنا ہاتھ میرے سینے پر رکھ کر کہا اے اللہ اس سے شیطان کو دور کر دے میں نے فوراً اپنا سر اوپر اٹھایا تو آپ کی صورت مجھے اپنے کانوں آنکھوں اور دل سے بھی زیادہ پیاری دکھائی دینے لگی پھر فرمایا شیبہ کافروں سے لڑو میں فوراً آپ کے آگے بڑھ گیا اور خدا کی قسم میری یہ خواہش ہوگئی کہ آپ کو ہر دکھ سے بچانے کیلئے اپنی جان قربان کر دوں جب ہوازن کو شکست ہوگئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پڑاؤ پر واپس تشریف لے آئے تو فرمایا شکر ہے اس اللہ کا جس نے تم کو خیر پہنچانی چاہی (یعنی تم کو پختہ ایمان عطا کر دیا) پھر آپ نے وہ بات بیان فرما دی جس کا میں نے ارادہ کیا تھا صلی اللہ علیہ وسلم۔ (تفسیر مظہری)

حضرت نضر بن حارث کا مسلمان ہونا:

محمد بن عمر کی روایت ہے کہ حضرت نضر بن حارث نے فرمایا اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہم کو عزت اسلام دے کر سرفراز فرمایا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیج کر ہم پر احسان کیا اور ہم اسی (شرک) پر نہیں مرے جس پر ہمارے باپ دادا مر گئے۔ راوی نے یہ طویل حدیث ذکر کی جس کے آخر میں ہے کہ حضرت نضر نے فرمایا۔ میں قریش کے کچھ اشخاص کے ساتھ جو اس وقت تک اپنے مذہب پر قائم تھے نکلا۔ ان اشخاص میں ابوسفیان بن حرب سفیان بن امیہ اور سہیل بن عمرو تھے ہمارا ارادہ یہ تھا کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو شکست ہوئی تو ان کو لوٹنے والوں میں ہم بھی

شامل ہو جائیں گے ہم مشرکوں کے (دائرہ کے اندر تھے ان کے) بہی خواہ تھے۔ جب دونوں گروہوں کا آمنا سامنا ہوا تو ہوازن نے یکبارگی حملہ کر دیا ہمارا خیال ہو گیا کہ مسلمان اس حملہ کو نہ سہ سکیں گے ہم مسلمانوں کی فوج میں تھے اور میرا ارادہ محمد کے متعلق وہی تھا جس کا میں قصد کر چکا تھا میں ارادہ کو عملی جامہ پہنانے ہی والا تھا کہ میں نے دیکھا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سفید خچر پر سوار مشرکوں کے سامنے کھڑے ہیں اور گورے گورے چہروں والے لوگوں نے ان کو جھرمٹ میں لے لیا ہے میں اپنے ارادہ کے ساتھ محمد کی طرف بڑھا تو ان لوگوں نے چیخ کر کہا ادھر ہی رہنا ادھر نہ بڑھنا چیخ سن کر میرا دل لرز گیا اور اعضا میں کپکپی پیدا ہوگئی۔ میں نے کہا یہ بات تو بدر کے دن کی طرح ہوئی بیشک یہ شخص حق پر ہے اور اس کی (غیب سے) حفاظت کی جاتی ہے۔ اللہ نے میرے دل میں اسلام ڈال دیا اور میرے سابق ارادہ کو بدل دیا۔ (الحدیث بطولہ)

مکہ میں غلط خبر پہنچنا: محمد بن عمر نے حضرت ابوقتادہ کی روایت سے بیان کیا کہ تیزی کے ساتھ بھاگنے والے لوگوں نے ۲۴ گھنٹے مسلسل چل کر مکہ پہنچ کر اہل مکہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شکست کھا جانے کی اطلاع دیدی۔ حضرت عتاب بن اسید اس وقت امیر مکہ تھے اور ان کے ساتھ حضرت معاذ بن جبل بھی تھے یہ خبر سن کر ان لوگوں کو سخت غم ہو گیا لیکن اہل مکہ میں سے کچھ لوگوں کو اس خبر سے خوشی ہوئی اور انہوں نے مسرت کا اظہار کیا۔ ایک شخص بولا اب عرب باپ دادا کے مذہب کی طرف لوٹ آئیں گے جب کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم قتل ہو چکے اور ان کے ساتھی پراگندہ ہو گئے حضرت عتاب نے کہا اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے تو ہو گئے اللہ کا دین تو قائم ہے محمد جس کی عبادت کرتے تھے وہ زندہ ہے کبھی نہیں مرے گا دن یونہی گذرا جب شام ہوئی تو اطلاع آئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہوازن کو شکست دیدی اس خبر کو سن کر حضرت عتاب اور حضرت معاذ خوش ہو گئے اور جو لوگ پہلی خبر سے خوش ہوئے تھے ان کو خدا نے ذلیل کر دیا۔ بھاگنے والے (مسلمان) پھر (سمٹ کر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹ پڑے اور اوطاس میں پہنچ کر خدمت گرامی میں حاضر ہو گئے اور یہاں سے حضور نے طائف کی طرف کوچ کیا۔

بیہقی نے حضرت حارثہ بن نعمان کا بیان نقل کیا ہے جب لوگ پیٹھ دے کر بھاگ گئے تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہ جانے والوں کا اندازہ کیا میرے خیال میں وہ سو تھے۔ احمد طبرانی اور حاکم وابونعیم نے معتبر سند سے حضرت ابن مسعود کا قول نقل کیا ہے کہ حنین کے دن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا لوگ پیٹھ دیکر بھاگ گئے۔ مہاجرین وانصار میں سے صرف اسی آدمی باقی رہ گئے ہم لوگ بھی تقریباً اسی قدم ایڑیاں موڑ کر (پیچھے) ہٹ گئے تھے مگر ہم نے کافروں کو پیٹھ نہیں دی تھی۔

ثابت قدم رہنے والے حضرات وخواتین:

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ ان میں سے ہر ایک نے دس سے زیادہ تلوار کے زخم کھائے تھے۔ یا پہنچائے تھے۔ ابن مردویہ نے حضرت ابوعمر و کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سو آدمی (بھی) باقی نہیں رہے تھے۔ سو کی نفی اور اسی کے اثبات میں کوئی تعارض نہیں (سو نہ ہوں گے، سو سے کم ہوں گے) محمد بن عمر کی روایت ہے کہ حنین کے دن جب لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ چھوڑ کر پھٹ گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حارثہؓ بن نعمان سے فرمایا، حارثہ! کتنے لوگ اپنی جگہ قائم رہے۔ حضرت حارثہ کا بیان ہے میں نے اپنے دائیں بائیں دیکھ کر عرض کیا سو ہوں گے مگر مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ یہ لوگ گنتی میں سو ہی تھے یہ تو اس وقت معلوم ہوا جب ایک روز مسجد کے دروازہ کے پاس رسول اللہ کو جبرئیل سے چپکے چپکے باتیں کرتے میں نے سنا اور جبرئیل نے پوچھا محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ کون ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ حارثہؓ بن نعمان ہے جبرئیلؑ نے کہا یہ وہی ہے جو حنین کے دن سو ثابت قدم رہنے والوں میں شامل تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حارث کو اس گفتگو کی اطلاع دی حارثہ نے عرض کیا میں تو یہ سمجھا تھا کہ دحیہ کلبی آپ کے ساتھ کھڑے ہیں۔

اس روز چار عورتیں بھی اپنی جگہ جمی رہی تھیں ام سلیم بنت ملحان، ام عمارہ، ام سلیط، ام حارث۔

بعض کے نزدیک المومنین سے مراد وہ مسلمان ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ثابت قدم رہے بھاگے نہ تھے۔ بیہقی نے دلائل میں اور طبرانی وحاکم وابونعیم نے حضرت ابن مسعود کی روایت سے بیان کیا ہے، حضرت عبداللہؓ نے فرمایا حنین کے دن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا جب لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر بھاگ پڑے تو میں اسی مہاجرین وانصار کے ساتھ ثابت قدم رہا تقریباً اسی قدم ہم بھی اپنے قدموں کے بل ہٹے تھے مگر ہم نے دشمن کو پیٹھ نہیں دی تھی انہی (اسی آدمیوں) پر سکینہ کا نزول ہوا تھا۔

صحابہؓ کا میدان جنگ میں واپس آنا:

حضرت ابن عقبہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں رکابوں میں پاؤں ڈالے خچر پر کھڑے ہو گئے اور دونوں ہاتھ اٹھا کر کہنے لگے اے اللہ میں تجھے واسطہ دیتا ہوں اس وعدہ کا جو تو نے مجھ سے کیا تھا۔ اے اللہ! ان کو ہم پر غالب نہ ہونا چاہیے۔ پھر حضرت عباسؓ سے فرمایا، عباسؓ! پکارو اے گروہ انصار! اے کیکر کے درخت (کے نیچے بیعت کرنے) والو! اے سورۂ بقرہ والو! حضرت عباسؓ بلند آواز آدمی تھے آپ کا بیان ہے میں نے اونچی

آواز سے ندا کی انصار کہاں ہیں ۔ کیکر کے درخت کے نیچے بیعت کرنے والے کہاں ہیں ۔ سورۂ بقرہ والے کہاں ہیں جونہی انصار نے میری آواز سنی خدا کی قسم وہ ایسے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف) مڑ کر آ گئے جیسے مائیں اپنے بچوں کی طرف مڑ جاتی ہیں۔

عثمان بن ابی شیبہ کی روایت میں حسب صراحت بیہقی وبغوی آیا ہے کہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) عباسؓ مہاجرین کو چیخ کر آواز دو جنہوں نے (حدیبیہ کے موقع پر) درخت کے نیچے بیعت کی تھی اور انصار کو پکارو جنہوں نے (مہاجرین اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو) ٹھکانے دیئے اور مدد کی (میں نے آواز دی انصار فوراً لوٹ پڑے) اور کہنے لگے ہم حاضر ہیں ہم حاضر ہیں انصار کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مڑ کر آنا بالکل ایسا تھا جس طرح اونٹ اپنی اولاد پر (پیار سے) جھک جاتا ہے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سواری سے اتر آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کیلئے انصار کے نیزے کافروں کے برچھوں سے بھی زیادہ خوفناک معلوم ہونے لگے۔

ایک مٹھی کنکریوں سے دشمن کو شکست:

ابویعلی اور طبرانی نے قابل اعتماد سند کے ساتھ حضرت انس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حنین کے دن ایک مٹھی سفید کنکریاں لے کر کافروں پر پھینک ماریں اور فرمایا رب کعبہ کی قسم یہ شکست پا گئے اس روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حضرت علی نے بڑی سخت جنگ کی۔

ابن سعد، ابن ابی شیبہ ،احمد ابوداؤد اور بغوی وغیرہ نے بروایت ابوعبدالرحمٰن یزید فہری (جن کا نام کرز تھا) ایک طویل حدیث کے ذیل میں بیان کیا کہ مسلمان پشت دے کر بھاگ پڑے جیسا اللہ نے فرمایا ہے اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے تھے لوگو! میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں پھر گھوڑے سے اتر کر نرغہ میں گھس گئے اور جو شخص حضور سے زیادہ قریب تھا اس نے مجھ سے بیان کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لپ مٹی لے کر دشمنوں کے چہروں کی طرف پھینکی اور فرمایا چہرے بگڑ گئے ۔یعلی بن عطاء کا بیان ہے جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابل تھے ان کی اولاد نے مجھ سے بیان کیا کہ ہمارے باپ کہتے تھے کہ ہم میں سے ہر ایک کی آنکھیں اور منہ خاک سے بھر گئے ۔اور آسمان کی طرف سے ہم نے ایک ایسی جھنجھناہٹ سنی جیسے کسی طشت میں لوہے کے گرنے سے ہوتی ہے غرض اس طرح اللہ نے ان کو شکست دیدی۔

پانچ ہزار فرشتوں کی امداد:

وَاَنۡزَلَ جُنُوۡدًا لَّمۡ تَرَوۡهَا اور اللہ نے ایسے لشکر اتارے جو تمہیں دکھائی نہیں دیتے تھے۔ ابن ابی حاتم نے سدی کبیر کا قول نقل کیا ہے کہ وہ لشکر ملائکہ کا تھا۔ سعید بن جبیر نے بیان کیا کہ حنین کے دن اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی امداد پانچ ہزار نشان زدہ فرشتوں کو بھیج کر کی تھی۔ ابن اسحاق ابن المنذر ،ابن مردویہ، ابونعیم اور بیہقی نے حضرت جبیر بن مطعم کا بیان نقل کیا ہے کہ دشمنوں کی شکست سے پہلے جب لوگ لڑ رہے تھے میں نے ایک سیاہ چادر آسمان کی طرف سے آتی دیکھی جو آ کر لوگوں کے سامنے گر گئی، میں نے دیکھا کہ (اس چادر کے اندر سے) سیاہ چیونٹیاں اتنی برآمد ہوئیں کہ وادی بھر گئی۔ پھر مجھے خیال ہوا کہ شاید ملائکہ ہیں پس میرے دیکھتے دیکھتے دشمنوں کو فوراً شکست ہوگئی۔ محمد بن عمر نے بروایت یحیٰی بن عبداللہ بیان کیا ہے کہ مشائخ انصار کہتے تھے ہم نے اس روز سیاہ چادروں کی طرح تہ برتہ آسمان سے گرتی ہوئی کوئی چیز دیکھی دیکھتے کیا ہیں کہ بکثرت چیونٹیاں یکدم (وادی میں) پھیل گئیں ہم ان کو اپنے کپڑوں سے جھاڑنے لگے اس کے بعد فوراً اللہ کی مدد سے ہم فتح یاب ہو گئے۔

روایت میں آیا ہے کہ ہمارے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کچھ گورے گورے خوبصورت لوگ حائل نظر آئے جنہوں نے ہم سے کہا چہرے بگڑ گئے لوٹ جاؤ ہم فوراً لوٹ پڑے انہوں نے ہماری مشکیں کس لیں (گرفتار کرلیا) اور یہ وہی تھے۔

محمد بن عمر نے مالک بن اوس بن حدثان کا قول نقل کیا ہے، مالک نے کہا مجھ سے میرے قبیلہ کے چند آدمی جو اس روز شریک جنگ تھے کہہ رہے تھے کہ اس روز کنکریاں جو رسول اللہ نے (کافروں کی طرف) پھینکی تھیں ان کی وجہ سے کوئی آدمی ایسا نہ بچا جس کی آنکھوں میں مٹی نہ پڑی ہو اور ہم کو اپنے سینوں کے اندر ایک ایسی اضطرابی لہر محسوس ہونے لگی جیسے طشت میں پتھر گرنے سے پیدا ہو جاتی ہے۔ اس دھڑکن میں سکون ہی نہیں پیدا ہوتا تھا ہم نے اس روز کچھ گورے رنگ کے آدمی دیکھے جو آسمان و زمین کے درمیان ابلق گھوڑوں پر سوار تھے ان کے سروں پر سرخ عمامے تھے جن کے پلے انہوں نے شانوں کے درمیان لٹکا رکھے تھے ان کے دستے دستے (الگ الگ) تھے ہم کو ان کے رعب کی وجہ سے غور کر کے دیکھنے کی طاقت ہی نہیں تھی۔

ابن ابی حاتم نے (عذاب کی تشریح میں) سدی کبیر کا قول نقل کیا ہے۔ یعنی ان کو تلوار سے قتل کرایا۔ بزار نے قابل اعتماد سند کے ساتھ حضرت انس کی روایت سے بیان کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حنین کے دن فرمایا ان کو خوب کاٹ ڈالو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرماتے وقت اپنے ہاتھ سے حلق کی طرف اشارہ کیا۔

کافروں کی شکست:

بغوی کا بیان ہے جب مشرک شکست کھا کر پیٹھ دیکر بھاگے تو اوطاس پہونچے وہاں ان کے بیوی بچے اور مویشی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے ایک اشعری آدمی کو جس کا نام ابوعامر تھا لشکر کا کمانڈر بنا کر اوطاس کو بھیجا۔ وہاں اس فوج کی مشرکوں سے لڑائی ہوئی درید بن الصمہ مارا گیا مشرکوں کو شکست ہوگئی مسلمانوں نے ان کے بیوی بچوں کو قید کر لیا۔ مالک بن عوف نضری بھاگ کر طائف چلا گیا اور وہاں قلعہ بند ہو گیا اور اس کے جانور اور اہل وعیال گرفتار ہو گئے۔ مسلمانوں کا امیر ابوعامر بھی شہید ہو گیا۔ اہل مکہ نے جب دیکھا کہ اللہ نے اپنے رسول کو فتح یاب اور اپنے دین کو غالب کر دیا تو ان میں سے بکثرت آدمی مسلمان ہو گئے۔

مال غنیمت: مال غنیمت جو جمع کیا گیا تھا رسول اللہ نے اس کو جعرانہ لے جانیکا حکم دیا حکم کی تعمیل کی گئی یہاں تک کہ طائف کے محاصرہ سے فارغ ہو کر خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی جعرانہ آ گئے۔ ابن سعد اور مؤلف العیون نے لکھا ہے کہ قیدی چھ ہزار اونٹ ۲۴ ہزار اور بھیڑ بکریاں چالیس ہزار سے زائد تھیں اور چار ہزار اوقیہ چاندی تھی۔ عبدالرزاق نے سعید بن مسیّب کی روایت سے لکھا ہے کہ اس روز چھ ہزار عورتیں اور لڑکے قید کیے گئے اور ابوسفیان بن حرب کو مال غنیمت کا نگراں مقرر کیا گیا بلاذری نے کہا بدیل بن ورقاء خزاعی کو اور ابن اسحاق نے کہا مسعود بن عمر غفاری کو نگران غنیمت مقرر کیا گیا تھا۔

طائف کے قلعہ کا محاصرہ:

اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوجی چھاؤنی ڈالدی ثقیف کے لوگ اپنے قلعہ پر چڑھ کر قلعہ بند ہو گئے۔ یہ قلعہ عرب کے سارے قلعوں میں بے نظیر تھا۔ قلعہ کے اوپر انہوں نے سو تیرانداز مقرر کر دیئے جنہوں نے دور والوں پر تیر برسانے شروع کر دیئے اور جو لوگ قلعہ کے قریب پہنچ گئے تھے ان پر وہ آگ میں تپائی ہوئی چنگاریاں برساتی ہوئی لوہے کی چھریاں پھینکتے تھے اتنی کثرت سے انہوں نے تیر برسائے کہ معلوم ہوتا ایک ٹڈی دل ہے بہت مسلمان زخمی ہوئے اور بارہ آدمی شہید ہو گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس جگہ پر چڑھ گئے جہاں بنی ثقیف نے مسلمان ہونے کے بعد مسجد بنادی ہے۔ عمرو بن امیہ ثقفی نے جو آخر میں مسلمان ہو گیا تھا اپنی جماعت سے کہا اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم میدان میں نکل کر دوبدو جنگ کی دعوت دیں تو کوئی (کسی مسلمان سے دوبدو) لڑنے کے لئے باہر نہ نکلے جب تک وہ یہاں پڑے رہیں پڑا رہنے دو چنانچہ حضرت خالد بن ولید نے جب میدان میں نکل کر اپنے حریف کو طلب کیا تو کسی نے اوپر سے جھانکا بھی نہیں۔

ابن اسحاق اور محمد بن عمر کا بیان ہے کہ مشائخ کہتے تھے رسول اللہ نے اعلان کیا جو غلام قلعہ سے اتر کر ہمارے پاس آ جائے گا وہ آزاد ہے چنانچہ دس سے کچھ زائد لوگ قلعہ سے نکل کر آ گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد کر دیا۔ محمد بن عمر کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے مشورہ کیا حضرت سلمان فارسی نے عرض کیا میری رائے میں گوپھن نصب کر کے قلعہ پر پتھر برسائے جائیں دور اسلام میں (مسلمانوں کی طرف سے) یہ پہلی گوپھن لگائی گئی جس سے پتھر پھینکے گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ان کے انگور کی ٹہنیاں اور کھجور کے درخت کاٹ دیئے جائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر مسلمان کا مامور کر دیا کہ پانچ درخت (کھجور کے) اور پانچ بیلیں (انگور کی) قطع کر دے۔ مسلمانوں نے بے دریغ بکثرت درخت کاٹنے شروع کر دیئے۔ بنی ثقیف نے پکار کر کہا تم ہمارا مال کس وجہ سے کاٹتے ہو، اگر تم ہم پر غلبہ پالو گے تو یہ مال تمہارا ہو جائے گا ورنہ اس کو اللہ اور قرابت کا لحاظ کر کے چھوڑ دو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں اس کو اللہ اور قرابت کا لحاظ کر کے چھوڑے دیتا ہوں۔ ابن اسحاق کا بیان ہے مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر سے فرمایا میں نے خواب دیکھا کہ مکھن سے بھرا ہوا ایک بڑا پیالہ مجھے ہدیہ میں پیش کیا گیا ایک مرغ نے اس کو دیکھ لیا اور پیالہ میں جو کچھ تھا اس کو گرادیا۔ حضرت ابوبکر نے عرض کیا میرے خیال میں آج آپ وہ چیز نہیں پاسکتے جو آپ کو مطلوب ہے (یعنی طائف کا قلعہ فتح یاب نہ ہوگا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور میں (بھی) یہ نہیں سمجھتا۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں آیا ہے کہ جب طائف کے محاصرہ کو ۱۵ دن گذر گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت نوفل بن معاویہ دئلی سے مشورہ کیا اور فرمایا نوفل اس جگہ ٹھیرنے کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے۔ نوفل نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لومڑی بھٹ کے اندر ہے اگر آپ یہاں پڑے رہیں گے تو (کبھی نہ کبھی اس کو پکڑ لیں گے اگر چھوڑ دیں گے تو یہ لومڑی آپ کو ضرر نہ پہنچا سکے گی۔

بنو ثقیف کیلئے دُعاء: حضرت عروہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا (کل) اونٹ چرنے کیلئے نہ چھوڑے جائیں صبح ہوئی تو آپ نے اور صحابہ نے کوچ کر دیا اور لوٹنے کیلئے سوار ہو گئے تو دعا کی اے اللہ ان کو ہدایت کر دے اور ہم کو ان کی مشقت سے بچالے (یعنی ان کے دلوں میں ایمان ڈال دے تاکہ ہم پر حملہ نہ کریں اور ہم ان پر لشکر کشی نہ کریں)۔ ترمذی نے حضرت جابر کی روایت سے لکھا ہے اور اس کو حسن کہا ہے صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ ثقیف کے تیروں نے ہم کو جلا ڈالا آپ ان کے لئے بددعا کر دیجئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی اے اللہ ثقیف کو ہدایت کر اور ان کو ایماندار بنا کر لے آ۔ (تفسیر مظہری)

غزوۂ حنین کا پس منظر و دیگر تفصیل:

حنین، مکہ مکرمہ اور طائف کے درمیان ایک مقام کا نام ہے جو مکہ مکرمہ سے

دس میل سے کچھ زیادہ فاصلہ پر واقع ہے، رمضان ۸ ہجری میں جب مکہ مکرمہ فتح ہوا، اور قریش مکہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تو عرب کا ایک بہت بڑا مشہور بہادر جنگجو اور مالدار قبیلہ ہوازن جس کی ایک شاخ طائف کے رہنے والے بنوثقیف بھی تھے، ان میں ہلچل مچ گئی، انہوں نے جمع ہوکر یہ کہنا شروع کیا کہ مکہ فتح ہوجانے کے بعد مسلمانوں کو کافی قوت حاصل ہوگئی ہے اس سے فارغ ہونے کے بعد لازمی ہے کہ ان کا رخ ہماری طرف ہوگا، اس لئے دانشمندی کی بات یہ ہے کہ ان کے حملہ آور ہونے سے پہلے ہم خود ان پر حملہ کردیں، اس کام کیلئے قبیلہ ہوازن نے اپنی سب شاخوں کو جو مکہ سے طائف تک پھیلی ہوئی تھیں جمع کرلیا، اس قبیلہ کے سب بڑے چھوٹے بجز معدودے چند افراد کے جن کی تعداد سو سے بھی کم تھی، سب ہی جمع ہوگئے۔ اس تحریک کے لیڈر مالک بن عوف تھے، جو بعد میں مسلمان ہوگئے اور اسلام کے بڑے علمبردار ثابت ہوئے اس وقت مسلمانوں کے خلاف حملہ کا سب سے زیادہ جوش انہی میں تھا۔

مقام حنین پر پہنچ کر مسلمانوں نے پڑاؤ ڈالا تو حضرت سہیل بن حنظلہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ خبر لے کر حاضر ہوئے کہ گھوڑے سوار آدمی ابھی دشمن کی طرف سے آیا ہے وہ بتلا رہا ہے کہ قبیلہ ہوازن پورا کا پورا مع اپنے سب سامان کے مقابلہ پر آگیا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر تبسم فرمایا اور کہا کہ پروا نہ کرو یہ سارا سامان مسلمانوں کے لئے مال غنیمت بن کر ہاتھ آئے گا۔

قبیلہ ہوازن نے قرارداد کے مطابق یکبارگی ہلہ بولا اور گھاٹیوں میں چھپے ہوئے دستوں نے چار طرف سے گھیرا ڈال دیا، گرد وغبار نے دن کو رات بنادیا تو صحابہ کرام کے پاؤں اکھڑ گئے اور بھاگنے لگے صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سواری پر سوار پیچھے ہٹنے کے بجائے آگے بڑھ رہے تھے، اور بہت تھوڑے سے صحابہ کرام جن کی تعداد تین سو اور بعض نے ایک سو یا اس سے بھی کم بتلائی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جمے رہے وہ بھی یہ چاہتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آگے نہ بڑھیں۔

یہ حالت دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباسؓ کو حکم دیا کہ بلند آواز سے صحابہ کو پکارو کہ وہ لوگ کہاں ہیں جنہوں نے شجرہ کے نیچے جہاد کی بیعت کی تھی، اور سورۂ بقرہ والے حضرات کہاں ہیں اور وہ انصار کہاں ہیں جنہوں نے جان کی بازی لگانے کا عہد کیا تھا، سب کو چاہئے کہ واپس آئیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں ہیں۔

حنین کی فتح اور ہوازن وثقیف کے سرداروں کا مسلمان ہوکر حاضر ہونا قیدیوں کی واپسی

حنین میں قبیلہ ہوازن وثقیف کے کچھ سردار مارے گئے، کچھ بھاگ کھڑے ہوئے ان کے ساتھ جو ان کے اہل وعیال اور اموال تھے وہ مسلمانوں کے قیدی اور مال غنیمت بن کر مسلمانوں کے ہاتھ آئے جس میں چھ ہزار قیدی چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار سے زائد بکریاں، اور چار ہزار اوقیہ چاندی تھی، جس کے تقریباً چار من ہوتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوسفیان بن حرب کو اموال غنیمت کا نگراں مقرر فرمایا۔

پھر شکست خوردہ ہوازن اور ثقیف نے مختلف مقامات پر مسلمانوں کے خلاف اجتماع کیا مگر ہر مقام پر ان کو شکست ہوتی گئی، وہ سخت مرعوب ہوکر طائف کے نہایت مستحکم قلعہ میں قلعہ بند ہوگئے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پندرہ بیس روز اس قلعہ کا محاصرہ کیا یہ قلعہ بند دشمن اندر ہی سے تیر برساتے رہے، سامنے آنے کی کسی کو ہمت نہ ہوئی، صحابہ کرام نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کے لئے بددعاء فرمایئے، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کیلئے ہدایت کی دعاء فرمائی اور بالآخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے مشورہ فرماکر واپسی کا قصد فرمایا اور مقام جعرانہ پر پہنچ کر ارادہ فرمایا کہ پہلے مکہ معظمہ جاکر عمرہ ادا کریں، پھر مدینہ طیبہ کو واپسی ہو، مکہ والوں کی بڑی تعداد جو تماشائی بن کر مسلمانوں کی فتح وشکست کا امتحان کرنے آئی تھی، اس جگہ پہنچ کر ان میں سے بہت لوگوں نے مسلمان ہونے کا اعلان کردیا۔

اسی مقام پر پہنچ کر مال غنیمت کی تقسیم کا انتظام کیا گیا تھا، ابھی اموال غنیمت تقسیم ہو ہی رہے تھے، کہ دفعۃً ہوازن کے چودہ سرداروں کا ایک وفد زہیر بن صرد کی قیادت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔

قیدیوں کی درخواست:

جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رضائی چچا ابویرقان بھی تھے، انہوں نے حاضر ہوکر عرض کیا کہ ہم مسلمان ہوچکے ہیں، اور یہ درخواست کی کہ ہمارے اہل وعیال اور اموال ہمیں واپس دیدیئے جائیں اس درخواست میں عرض کیا گیا کہ یارسول اللہ ہم بسلسلہ رضاعت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خویش وعزیز ہیں اور جو مصیبت ہم پر پڑی ہے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مخفی نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہم پر احسان فرمائیں، رئیس وفد ایک شاعر آدمی تھا اس نے کہا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر ہم بادشاہ روم یا شاہ عراق سے اپنی ایسی مصیبت کے پیش نظر کوئی درخواست کرتے تو ہمارا خیال یہ ہے کہ وہ بھی ہماری درخواست کو رد نہ کرتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو اللہ تعالیٰ نے اخلاق فاضلہ میں سب سے زیادہ ممتاز فرمایا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم بڑی امید لے کر آئے ہیں۔ (معارف مفتی اعظم)

اسباب کی کثرت پر ناز اللہ کو پسند نہیں:

جنگ میں مسلمانوں کی تعداد بارہ ہزار تھی اور مشرکین کی تعداد چار ہزار تھی اس وقت بعض مسلمانوں کی زبان سے بطور ناز یہ لفظ نکلا کہ آج ہماری تعداد بہت بڑی ہے ہم کسی سے مغلوب ہونے والے نہیں۔ بارگاہ خداوندی میں یہ

ناز پسند نہ آیا کہ بجائے ہماری رحمت اور عنایت کے اپنی قوت اور کثرت پر کیوں نظر کی چنانچہ جب مقابلہ شروع ہوا تو مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے، اور سوائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مخصوص رفقاء کے بہت سے لوگ میدان جنگ سے منتشر ہوگئے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس کو حکم دیا کہ مسلمانوں کو آواز دیں چنانچہ آواز سنتے ہی مسلمان دوڑ پڑے اور ناز سے تائب ہوکر نیاز کی طرف آئے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع ہوگئے۔ اس وقت خدا تعالیٰ کی مدد پہنچی آسمان سے مدد کیلئے فرشتے نازل کئے اور اپنی رحمت سے مسلمانوں کی شکست کو فتح سے بدل دیا بے شمار کافر مارے گئے اور چھ ہزار بچے اور عورتیں قید ہوکر آئے اور بیس ہزار اونٹ اور چار ہزار اوقیہ چاندی اور چالیس ہزار سے زائد بکریاں مال غنیمت میں مسلمانوں کے ہاتھ میں آئیں جس سے سب پر واضح ہوگیا کہ لشکر عظیم میں سے بعض افراد کا بھی اپنی قوت اور کثرت پر نظر کرنا کس قدر ضرر رساں ہے۔

یک لحظہ زکوئے یار دوری   در مذہب عاشقاں حرام است

نکتہ: مکہ مکرمہ اگرچہ قہراً فتح ہوا مگر وہاں سے ادب اور احترام کی بناء پر کوئی چیز غنیمت میں نہیں لی گئی حق جل شانہٗ نے غنائم حنین سے اس کی تکمیل فرمادی کہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کے دل میں ایسا جوش وخروش پیدا فرمادیا کہ وہ اسلام کی دشمنی میں اپنے تمام اہل وعیال اور تمام اموال اور مویشیوں کو لیکر میدان میں آگئے جو بعد میں سب مسلمانوں کیلئے غنیمت بنے اللہ کے رسول نے ان کے بچوں اور عورتوں کو تو واپس کردیا اور اموال اور مویشیوں کو مجاہدین پر تقسیم کردیا۔ (معارف کاندھلویؒ)

حضرت ابن مسعودؓ کا بیان:

ابن مسعودؓ فرماتے ہیں میں بھی اس لشکر میں تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف اسی مہاجر وانصار رہ گئے تھے ہم نے پیٹھ نہیں دکھائی تھی ہم پر اللہ نے اطمینان وسکون نازل فرمادیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سفید خچر پر سوار دشمنوں کی طرف بڑھ رہے تھے جانور نے ٹھوکر کھائی آپ صلی اللہ علیہ وسلم زین پر سے نیچے کی طرف جھک گئے میں نے آواز دی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اونچے ہوجایئے اللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اونچا ہی رکھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک مٹھی مٹی کی تو بھر دو۔ میں نے بھر دی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کافروں کی طرف پھینکی جس سے ان کی آنکھیں بھر گئیں پھر فرمایا مہاجر وانصار کہاں ہیں؟ میں نے کہا یہیں ہیں۔ فرمایا انہیں آواز دو۔ میرا آواز دینا تھا کہ وہ تلواریں تولے ہوئے لپک لپک کر آگئے اب تو مشرکین کی کچھ نہ چلی اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں اس غزوہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب تھا میں نے دیکھا کہ کوئی چیز آسمان سے اتر رہی ہے چیونٹیوں کی طرح اس نے میدان گھیر لیا اور اسی وقت مشرکوں کے قدم اکھڑ گئے واللہ ہمیں کوئی شک نہیں کہ وہ آسمانی مدد تھی۔

کافروں کی حالت: یزید بن عامر سوائی اپنے کفر کے زمانے میں جنگ حنین میں کافروں کے ساتھ تھا بعد میں یہ مسلمان ہوگئے تھے۔ ان سے جب دریافت کیا جاتا کہ اس موقعہ پر تمہارے دلوں کا رعب وخوف سے کیا حال تھا؟ تو وہ طشت میں کنکریاں رکھ کر بجا کر کہتے بس یہی آواز ہمیں ہمارے دل سے آرہی تھی بے طرح کلیجہ اچھل رہا تھا اور دل دہل رہا تھا۔ (تفسیر ابن کثیر)

ثُمَّ يَتُوبُ اللَّهُ مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ عَلَىٰ مَنْ
پھر توبہ نصیب کریگا اللہ اس کے بعد
يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٢٧﴾
جس کو چاہے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے

کافروں کا مسلمان ہونا:

چنانچہ ہوازن وغیرہ کو اس کے بعد توبہ نصیب ہوئی اور اکثر مسلمان ہوگئے۔ (تفسیر عثمانی)

ابن اسحاق نے یونس بن بکر کی وساطت سے حضرت ابن عمرؓ کا بیان نقل کیا ہے ابن عمر نے فرمایا، میں حنین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا جب ہوازن پر مال اور اہل وعیال کی گرفتاری کی مصیبت جو پڑی تھی وہ پڑ گئی تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بمقام جعرانہ ہوازن کا ایک وفد آیا جس میں چودہ آدمی تھے جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رضاعی چچا بوبرقان بھی شامل تھا۔ اس وفد کا سرگروہ زہیر بن صرد تھا یہ سب لوگ مسلمان ہوگئے تھے بوبرقان نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم سب کی جڑ ایک اور کنبہ ایک ہے اور جو مصیبت ہم پر پڑی ہے وہ آپ سے پوشیدہ نہیں ہے اب آپ ہم پر کرم کریں اللہ آپ پر کرم کرے گا زہیر نے کھڑے ہوکر اپنے خطاب میں کہا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان باڑوں کے اندر جو قیدی عورتیں ہیں وہ آپ کی پھوپھیاں اور خالائیں ہیں۔ یعنی رضاعی۔ اور وہ عورتیں ہیں جنہوں نے آپ کو گود میں کھلایا ہے اور جو آپ کی خدمت ذمہ داری کے ساتھ کرتی رہی ہیں اگر ہمارا ٹکراؤ حارث بن ابی شمر (غانی) شاہ شام یا نعمان بن منذر شاہ عراق سے ہوتا اور ان کی طرف سے ہم پر ایسی مصیبت پڑتی جیسی آپ کے حملے سے پڑی ہے تو ہمیں امید تھی کہ (آخر میں) وہ ہم پر مہربانی اور رحم کرتے اور یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ تو سب سے بڑھ کر کفیل ہیں پھر اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ شعر پڑھ کر سنائے۔

قیدیوں کی درخواست پر مال کی واپسی:

صالحی کا بیان ہے کہ زہیر بن صرد جشمی کہتے تھے جب حنین اور ہوازن کے

دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو قید کرلیا اور پھر (لشکر میں) قیدیوں کی اور بھیڑ بکریوں کی تقسیم کرنے لگے تو میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا یارسول اللہ ہم پر کرم واحسان کیجئے۔ آپ ہی ایسے شخص ہیں جس سے ہم (کرم کے) امیدوار اور منتظر احسان ہیں میں نے کچھ اشعار پڑھے۔ حضور نے اشعار سن کر فرمایا میرا اور اولاد عبدالمطلب کا (اس مال غنیمت اور قیدیوں میں) جو حصہ ہے وہ تمہارے لیے ہے (یعنی تم واپس لے لو میں دست بردار ہوتا ہوں) قریش نے جو یہ بات سنی تو وہ بولے ہمارا جو حصہ ہے وہ اللہ اور اس کے رسول کا ہے (اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا حصہ واپس کردیا لہذا ہم بھی اپنے حصے واپس کرتے ہیں) اور انصار نے بھی یہی کہہ دیا۔ صالحی نے کہا اس حدیث کی سند بہت بڑھیا اور کھری ہے۔ مقدسی نے بھی اس کو اپنی صحیح میں لکھا ہے اور ابن حجر نے اس کے حسن ہونے کو ترجیح دی ہے۔

قیدیوں کی آزادی:

بخاری نے صحیح میں مروان اور مسور بن مخرمہ کی روایت سے یہ قصہ اس طرح نقل کیا ہے کہ جب ہوازن والے مسلمان ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے مال اور اہل وعیال کی واپسی کے لئے درخواست کی تو رسول اللہ نے فرمایا میرے ساتھ جو لوگ ہیں ان کو تم دیکھ رہے ہو اور مجھے سب سے اچھی بات وہی لگتی ہے جو سچی ہو (پس سچی اور صاف بات یہ ہے کہ) تم دونوں میں سے ایک چیز واپس لے لو، یا قیدی یا مال، بنی ہوازن نے کہا ہم قیدیوں کی واپسی پسند کرتے ہیں۔ اس گفتگو کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (خطاب کرنے) کھڑے ہوئے اور مناسب حمد وثناء کے بعد فرمایا: امابعد۔ اب تمہارے بھائی توبہ کرکے تمہارے پاس آئے ہیں۔ میں ان کے قیدیوں کو واپس کرنا چاہتا ہوں تم میں سے جو شخص بخوشی خاطر ایسا کرنا چاہے کرے اور جو شخص اپنے حصہ پر قائم رہنا پسند کرے اس کو ہم (اس کے حصہ کا معاوضہ) اس مال میں سے جو اللہ سب سے پہلے بطور غنیمت عطا فرمائے گا دیدیں گے۔ لوگوں نے عرض کیا ہم نے بخوشی خاطر ایسا کیا (یعنی بلاشرط معاوضہ قیدیوں کو واپس کرنے پر رضا مند ہیں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے یہ نہیں معلوم ہوا کہ تم میں سے کس نے اجازت دیدی اور کس نے نہیں دی لہذا لوٹ کر جاؤ اور جو تمہارے نمائندے ہیں وہ آکر مجھے تمہاری رائے بتائیں لوگ واپس چلے گئے اور ان کے سرداروں نے ان سے گفتگو کی پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں واپس آئے اور عرض کیا کہ سب نے بخوشی خاطر اجازت دیدی۔ (تفسیر مظہری)

آپ کا رضاعی رشتہ داروں کا احترام کرنا:

ابوداؤد، بیہقی اور ابویعلی نے بیان کیا کہ حضرت ابوالطفیل نے کہا میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جعرانہ میں گوشت تقسیم کررہے ہیں (شاید گوشت سے مراد بھیڑ بکریاں ہوں) اتنے میں ایک بدوی عورت آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب پہنچ گئی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کیلئے اپنی چادر بچھادی وہ چادر پر بیٹھ گئی۔ میں نے لوگوں سے پوچھا یہ کون عورت ہے؟ لوگوں نے بتایا یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی ماں ہے (دودھ پلانے والی) ابوداؤد نے مراسیل میں حضرت عمرو بن سائب کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز بیٹھے ہوئے تھے اتنے میں آپ کا رضاعی باپ آیا آپ نے اس کیلئے اپنے کپڑے کا کچھ حصہ بچھا دیا۔ وہ اس پر بیٹھ گیا پھر آپ کی رضاعی ماں آئیں آپ نے ان کیلئے اسی کپڑے کا دوسرا حصہ بچھادیا وہ اس پر بیٹھ گئیں پھر آپ کا رضاعی بھائی آیا آپ کھڑے ہوگئے اور اس کو اپنے سامنے بٹھالیا۔

محمد بن عمر کا بیان ہے جب حنین کے دن مشرکوں کو شکست ہوگئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا تعاقب کرنے کا حکم دیا اور فرمایا اگر قبیلہ بنی سعد کا بجاد تمہارے ہاتھ لگ جائے تو اس کو نہ چھوڑنا اس شخص نے ایک بڑا جرم کیا تھا ایک مسلمان کو پکڑ کر اس کا ایک ایک عضو کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کیا تھا پھر اس کو آگ میں جلایا تھا۔ وہ بھی اپنے جرم سے واقف تھا اس لئے بھاگ گیا تھا مگر سواروں نے اس کو پکڑلیا اور حارث بن عبدالعزی کی بیٹی شیما کے ساتھ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی بہن تھی لاکر قید کردیا تھا۔ شیما کہنے لگی واللہ! میں تو تمہارے سردار کی بہن ہوں مگر لوگوں نے اس کی بات سچ نہیں سمجھی اور پکڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آئے شیما نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں تو تمہاری بہن ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نشانی کیا ہے شیما نے اپنا انگوٹھا دکھایا جس پر کاٹنے کا نشان تھا اور کہنے لگی یہ نشان تمہارے کاٹنے کا ہے، ہم تمہارے اور اپنے ماں باپ کے جانور وادی سرب میں چراتے تھے میں تم کو کولھے پر بٹھائے ہوئے تھی کہ تم نے میرے انگوٹھے میں کاٹا تھا ماں کا دودھ پینے پر میرا تمہارا نزاع ہوتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نشانی پہچان لی اور کود کر فوراً کھڑے ہوگئے۔ شیما کیلئے اپنی چادر بچھادی اور فرمایا اس پر بیٹھ جاؤ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مرحبا کہا آنکھوں میں آنسو آگئے اور رضاعی ماں باپ کی خبر دریافت کی۔ شیما نے کہا ان کا انتقال ہوگیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تم یہاں رہنا چاہو تو عزت وتکریم کے ساتھ تم کو رکھا جائے گا اور واپس اپنی قوم میں جانا ہو تو حفاظت کے ساتھ تم کو واپس پہنچادیا جائے گا۔ شیما نے کہا میں اپنی قوم کے پاس واپس جانا چاہتی ہوں پھر شیما مسلمان ہوگئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو تین باندی غلام دیئے اور ایک یا دو اونٹ دینے کا حکم دیا۔ اور فرمایا تم جعرانہ کو جاکر اپنی قوم کے ساتھ رہو، میں اب طائف کو جارہا ہوں۔ شیما جعرانہ

کولوٹ گئی پھر (طائف سے واپس آکر) جعرانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے ملاقات کی اور اس کو اس کے بقیہ گھر والوں کو اونٹ اور بکریاں عطا فرمائیں۔ شیما نے بجاد کو معاف کر دینے کی درخواست کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے درخواست قبول کر لی (اور جیسا شیما نے کہا ویسا ہی کر دیا)

سرداروں کی تالیفِ قلب: ابن اسحاق کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مؤلفۃ القلوب کو بھی حصہ دیا۔ مؤلفۃ القلوب عرب کے کچھ سردار تھے جن کی تالیف قلب (قول محمد بن عمر مال دے کر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مقصود تھی آپ نے ان کو تقسیم مال کے وقت سب لوگوں سے پہلے حصہ دیا۔ صالحی کا قول ہے ان میں سے بعض آدمیوں کو سو اور بعض کو پچاس اونٹ دیئے ان کی مجموعی تعداد پچاس سے زائد تھی۔ صالحی نے ان کے نام بھی ذکر کیے ہیں اور ۵۷ نام بیان کیے ہیں۔

امام احمد مسلم اور بیہقی نے حضرت رافع بن خدیج کا بیان ذکر کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مؤلفۃ القلوب میں سے ہر ایک مرد کو حنین کے مال غنیمت سے سو سو اونٹ عطا کیے۔

بخاری نے حضرت عمرو بن ثعلب کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لوگوں کو (مال) دیا اور کچھ کو نہیں دیا معلوم ایسا ہوتا تھا کہ جن کو کچھ نہیں دیا وہ ناراض ہو گئے اس پر حضور نے فرمایا مجھے جن لوگوں کی حرص اور بھوک سے (ان کے ضعیف الاسلام ہو جانے یا اسلام سے پھر جانے کا) اندیشہ ہوتا ہے تو میں ان کو (مال) دیتا ہوں اور کچھ لوگوں کو ان کے قلبی (مضبوط) اسلام اور بے نیازی کے سپرد کر دیتا ہوں (ان کو کچھ نہیں دیتا) انہی میں سے عمرو بن ثعلب بھی ہے۔ حضرت عمرو کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ لفظ مجھے اپنے لیے سرخ اونٹوں کے ملنے سے بھی زیادہ پیارا ہو گیا اسی جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا باوجود یہ کہ بعض لوگ مجھے زیادہ عزیز ہوتے ہیں لیکن ان کو چھوڑ کر میں بعض ایسے لوگوں کو دیتا ہوں کہ (مال نہ پہنچنے کی صورت میں) ان کے اوندھے منہ دوزخ میں گر جانے کا مجھے اندیشہ ہوتا ہے (یعنی مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر ان کو نہ دوں گا تو یہ مرتد ہو کر جہنم میں گر پڑیں گے) (رواہ البخاری عن سعد بن ابی وقاص)

حضرت حکیم بن حزام:

شیخین نے صحیحین میں لکھا ہے کہ حضرت حکیم بن حزام نے بیان کیا میں نے حنین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سو اونٹ مانگے آپ نے عنایت فرما دیئے۔ میں نے پھر سو اونٹ مانگے آپ نے وہ بھی دے دئے اور دینے کے بعد فرمایا، حکیم یہ مال شیریں ہے جو شخص سخاوت نفس کے ساتھ اس کو لے گا اس کو مال میں برکت حاصل ہوگی اور جو دل کی حرص سے لے گا اس کو برکت حاصل نہ ہوگی، جیسے کوئی کھائے اور (کتنا ہی کھائے) پیٹ نہ بھرے اوپر کا ہاتھ نچلے ہاتھ سے بہتر ہوتا ہے اور (دینا) ان لوگوں سے شروع کرو جن کے تم سرپرست ہو۔ حکیم نے عرض کیا قسم ہے اس کی جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی برحق بنا کر بھیجا ہے آپ کے بعد میں کسی سے کچھ مانگ کر اپنی ذلت نہیں کروں گا چنانچہ حضرت عمر (اپنے عہد خلافت میں) حضرت حکیم کو ان کا حصہ دینے کیلئے طلب فرماتے تھے اور حکیم لینے سے انکار کر دیتے تھے حضرت عمر فرماتے تھے لوگو میں تم کو گواہ بناتا ہوں کہ میں حکیم کو ان کا حصہ دے رہا ہوں اور وہ لینے سے انکار کر رہے ہیں۔

حضرت صفوان کو پوری گھاٹی عطاء فرمادی:

صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صفوان کو سو اونٹ عطا فرمائے پھر سو دے، پھر سو دے۔ محمد بن عمر کا بیان ہے کہ صفوان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب مال غنیمت کی تلاش (جنگل میں ہر طرف) کرتے پھر رہے تھے۔ ایک گھاٹی کی طرف سے گذر ہوا۔ گھاٹی میں بکریاں اونٹ اور ان کے چرواہے بھرے پڑے تھے۔ یہ مال غنیمت تھا جو اللہ نے اپنے رسول کو (بغیر مقابلہ اور جنگ کے) عطا کیا تھا۔ صفوان کو وہ مال مویشی بہت پسند آئے اور گھاٹی کی طرف دیکھنے لگے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابو وہب کیا تم کو یہ گھاٹی پسند ہے صفوان نے جواب دیا جی ہاں فرمایا وہ مع ان چیزوں کے جو اس کے اندر ہیں تمہاری ہوگئی۔ صفوان نے عرض کیا میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ بلاشبہ اللہ کے رسول ہیں نبی کے سوا کسی اور کا دل بخوشی خاطر کبھی اس کو دینا پسند نہیں کر سکتا۔

مردم شماری: حضرت زید بن ثابت کو حکم دیا کہ مردم شماری کریں اور مال غنیمت کی مقدار بھی معلوم کریں۔ اس کے بعد لوگوں کو حصہ وار مال تقسیم کیا گیا ہر پیدل کو چار اونٹ یا چالیس بکریاں ملیں گھوڑے کے سوار کو بارہ اونٹ یا ایک سو بیس بکریاں دی گئیں (یعنی سوار کا حصہ پیدل سے تین گنا لگایا گیا) اگر کسی سوار کے پاس ایک گھوڑے سے زیادہ گھوڑے نکلے تو مزید گھوڑے کا حصہ نہیں لگایا گیا۔ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ مال غنیمت کے کل اونٹ چوبیس ہزار تھے اور کل بکریاں چالیس ہزار یا اس سے زائد تھیں اور یہ بھی ثابت ہے کہ ایک اونٹ کو دس بکریوں کے برابر قرار دیا گیا ہے اس طرح چار ہزار اونٹ چالیس ہزار بکریوں کے برابر ہوئے اور اونٹوں کی کل تعداد ۲۸ ہزار ہوگئی۔

محمد بن اسحاق نے بروایت محمد بن حارث تیمی بیان کیا کہ کسی صحابی نے جن کا نام محمد بن عمر نے سعد بن ابی وقاص بتایا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے عیینہ بن حصن اور اقرع بن حابس کو تو سو سو اونٹ عطا فرما دیئے اور جعیل بن سراقہ ضمری کو نظر انداز کر دیا۔

حضور نے فرمایا قسم ہے اس کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے جعیل بن سراقہ تو عیینہ بن حصن اور اقرع بن حابس جیسے تمام اہل ارض سے کہیں بہتر ہے لیکن میری غرض ان دونوں کو جوڑے رکھنا ہے تاکہ یہ مسلمان رہیں اور جعیل بن سراقہ کو تو میں نے اس کے اسلام کے سپرد کر دیا ہے (اس کا اسلام اتنا مضبوط ہے کہ وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلے گا)

انصار سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خطاب:

ابوسعید کا بیان ہے کہ اس کے بعد حضرت سعد بن عبادہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انصاریوں کا یہ قبیلہ اپنے دلوں میں آپ سے ناراض ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا وجہ ہے حضرت سعد نے کہا مال غنیمت کی تقسیم کی وجہ سے۔ آپ نے اپنی قوم کو اور دوسرے عربوں کو تو دیا اور انصاریوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سعد تمہارا کیا خیال ہے۔ حضرت سعد نے کہا میں بھی اپنی قوم کا ایک فرد ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو پھر اپنی قوم والوں کو اس احاطہ کے اندر یکجا جمع کر لو۔ حضرت سعد نے باہر آ کر لوگوں کو چیخ کر پکارنا شروع کیا اور سب کو جمع کر لیا۔ ایک مہاجر بھی آ گیا۔ حضرت سعد نے اس کو بھی انصار کے ساتھ بیٹھنے کی اجازت دیدی۔ لیکن دوسرے مہاجرین نے درخواست کی تو حضرت سعد نے ان کی استدعا رد کر دی اجازت نہیں دی جب سب انصار آ گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برآمد ہوئے اور اللہ کی حمد وثنا کے بعد فرمایا اے گروہ انصار! کیا تم گمراہ نہ تھے پھر (میرے ذریعہ سے) اللہ نے تم کو ہدایت فرمائی کیا تم نادار نہ تھے پھر اللہ نے تم کو مالدار کر دیا کیا تم آپس میں دشمن نہ تھے پھر اللہ نے تمہارے دلوں کو ملا دیا۔ انصار نے عرض کیا بیشک ایسا ہی ہوا، اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم پر بڑا احسان اور کرم ہے اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا، انصار نے اس کے جواب میں یہی کہا کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم پر بڑا احسان اور کرم ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے گروہ انصار تم (دوسرے طور پر) جواب کیوں نہیں دیتے۔ انصار نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم اور کیا کہیں اور آپ کو کیا جواب دیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تم چاہتے ہو تو یوں کہہ سکتے تھے اور یہ بات سچی بھی ہوتی اور تمہاری تصدیق بھی کی جاتی کہ آپ ہمارے پاس (وطن اور قوم سے) بھاگ کر آئے تھے ہم نے آپ کو ٹھکانا دیا آپ نادار تھے ہم نے آپ کی مدد کی۔ سب نے آپ کو جھوٹا قرار دیا تھا۔ ہم نے آپ کی تصدیق کی۔ انصار نے جواب دیا اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم پر بڑا احسان ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پھر یہ کیا بات ہے، جو مجھے تمہاری طرف سے پہنچی ہے، انصار خاموش رہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر یہی فرمایا، اس پر کچھ سمجھدار انصاریوں نے عرض کیا، (یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے دانشمند طبقہ نے تو کچھ کہا نہیں، البتہ کچھ نوجوانوں نے کہا تھا کہ اللہ اپنے رسول کو معاف کرے وہ قریش کو دیتے ہیں اور ہم کو نہیں دیتے حالانکہ ان کا خون ہماری تلواروں سے ٹپک رہا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں صلی اللہ علیہ وسلم ایسے لوگوں کو دیتا ہوں جن کے کفر کا زمانہ ابھی حال ہی میں گذرا ہے (اور ایمان ابھی پختہ نہیں ہوا ہے) مجھے ان کو ملانے رکھنا ہے، دوسری روایت کے یہ الفاظ ہیں میں قریش کو دیتا ہوں اس لیے کہ ان کا دور جاہلیت حال ہی میں گذرا ہے اور وہ دکھی ہیں، میں ان کے زخموں پر پٹی باندھ رہا ہوں۔ اے گروہ انصار کیا تم کو اپنے دلوں میں دنیا کے حقیر مال کا احساس ہوا جو ان (نئے) مسلمانوں کو جوڑے رکھنے کیلئے میں نے دے دیا اور تم کو تمہارے اسلام کے اعتماد پر چھوڑے رکھا جو اللہ نے تم کو نصیب کیا ہے اے گروہ انصار کیا تم اس سے خوش نہیں کہ جو لوگ تو بکریاں اور اونٹ لے کر گھروں کو جائیں، دوسری روایت میں لفظ دنیا آیا ہے دنیا لے کر گھروں کو جائیں اور تم اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر اپنے گھروں کو لوٹو اور اللہ کے رسول کو اپنے گھروں میں رکھو۔ قسم ہے اس کی جس کے دست میں میری جان ہے کہ اگر سب لوگ ایک گھاٹی پر چلیں اور انصار دوسری گھاٹی پر تو میں انصار کی راہ پر چلوں گا۔ اور لوگ میرا ظاہر ہیں اور تم میرا باطن ہو، انصار میرا جگر ہیں میرے محل اسرار ہیں اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں بھی انصار ہی کا ایک فرد ہوتا، اے اللہ! انصار پر، انصار کی اولاد پر اور ان کی اولاد کی اولاد پر رحمت نازل فرما، انصار یہ تقریر سن کر رونے لگے ان کی ڈاڑھیاں تر ہو گئیں۔ اور کہنے لگے ہم اللہ اور اللہ کے رسول کو اپنے نصیب اور حصہ میں پا کر خوش ہیں (ہم کو ان کے مقابلہ میں دنیا کا مال درکار نہیں) محمد بن عمر کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بحرین کا بطور جاگیر انصار کیلئے لکھ دینے کا ارادہ کیا تاکہ آپ کے بعد بحرین انہی کے پاس رہے۔ بحرین اس زمانہ کے مفتوحہ علاقوں میں سب سے بڑھیا علاقہ تھا۔ لیکن انصار نے انکار کر دیا اور عرض کیا آپ کے بعد ہم کو دنیا کی ضرورت نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار سے فرمایا، تم میرے بعد دوسروں کی اپنے اوپر بہت زیادہ ترجیح پاؤ گے (یعنی حکومت اور دولت پر لوگ خود قابض ہو جائیں گے تم کو نہیں دیں گے) تو صبر کرنا یہاں تک کہ حوض (کوثر) پر تمہاری مجھ سے ملاقات ہو جائے۔

مالک کی کارروائیاں:

قبائل دوس ہوازن ثقیف اور ثمالہ کے جو لوگ مسلمان ہو گئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مالک کو ان کا سردار بنا دیا اور کچھ دوسرے مسلمان بھی اس کے پاس سمٹ آئے۔ حضور نے سب کی کمانڈ مالک کے سپرد کر دی تاکہ

اپنی جماعت کو لے کر مشرکوں سے لڑنے لگا بلکہ ثقیف کے خلاف اس نے جنگ شروع کردی۔ ثقیف کے جو مویشی جنگل میں چرنے کیلئے نکلتے تھے مالک ان کو لوٹ لیتا تھا اور اکا دکا جو آدمی ہاتھ لگتا تھا اس کو قتل کر دیتا تھا اور مال غنیمت کا پانچواں حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیج دیتا تھا ایک بار سو اونٹ بھیجے اور ایک بار ہزار بکریاں بھیڑیں اہل طائف کے مویشی بھی مالک نے پکڑ لیے اور ایک دن میں ہزار بھیڑ بکریاں ہنکالایا۔

ابن اسحاق نے بروایت یونس بیان کیا ہے کہ رمضان ۹ ہجری میں قبیلہ ثقیف کا وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر مسلمان ہوگیا۔ یہ واقعہ غزوہ تبوک کے بعد کا ہے۔ (تفسیر مظہری)

دلی اطمینان کے بغیر کسی کا حق لینا:

حقوق کے معاملہ میں جب تک خوش دلی کا اطمینان نہ ہوجائے کسی کا حق لینا جائز نہیں، مجمع کے رعب یا لوگوں کی شرم سے کسی کا خاموش رہنا رضامندی کے لئے کافی نہیں، اسی سے حضرات فقہاء نے فرمایا ہے کہ کسی شخص پر اپنی وجاہت کا رعب ڈال کر کسی دینی مقصد کے لئے چندہ کرنا بھی درست نہیں کیونکہ ایسے حالات میں بہت سے شریف آدمی محض شرماشرمی کچھ دے دیتے ہیں پوری رضا مندی نہیں ہوتی اس طرح کے مال میں برکت بھی نہیں ہوتی۔ (معارف مفتی اعظم)

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ
اے ایمان والو مشرک جو ہیں سو پلید ہیں
فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ
سو نزدیک نہ آنے پائیں مسجد الحرام کے اس
عَامِهِمْ هٰذَا ۚ
برس کے بعد

حرم کی مشرکین سے صفائی: جب حق تعالیٰ نے شرک کی قوت کو توڑ کر جزیرۃ العرب کا صدر مقام (مکہ معظمہ) فتح کرادیا اور قبائل عرب جوق در جوق دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے تب ۹ ہجری میں یہ اعلان کرایا گیا کہ آئندہ کوئی مشرک (یا کافر) مسجد حرام میں داخل نہ ہو بلکہ اس کے نزدیک یعنی حدود حرم میں بھی نہ آنے پائے۔ کیونکہ ان کے قلوب شرک وکفر کی نجاست سے اس قدر بلید اور گندے ہیں کہ اس سب سے بڑے مقدس مقام اور مرکز توحید وایمان میں داخل ہونے کے لائق نہیں۔ اس کے بعد صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جزیرۃ العرب سے مشرکین اور یہود ونصاریٰ سب کے نکال دینے کا حکم دیا۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری وصیت کے موافق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں یہ حکم عملاً نافذ ہوا۔ اب بطور استیلاء یا توطن کفار کے وہاں رہنے پر مسلمانوں کو رضامند ہونا جائز نہیں۔ بلکہ تطہیر جزیرۃ العرب بقدر استطاعت ان کا فریضہ ہے ہاں خفیہ کے نزدیک کوئی کافر مسافرانہ عارضی طور پر امام کی اجازت سے وہاں جاسکتا ہے۔ بشرطیکہ امام اتنی اجازت دینا خلاف مصلحت نہ سمجھے۔ باقی حج وعمرہ کی غرض سے داخل ہونے کی کسی کافر کو اجازت نہیں کما ورد فی الحدیث الالایحجن بعد العام مشرک۔ (تفسیر عثمانی)

چونکہ کافر کا باطن ناپاک ہے اس لئے شرعاً وہ ناپاک ہے اس سے اجتناب لازم ہے جس طرح حقیقی نجاست سے اجتناب نمازی کیلئے ضروری ہے اسی طرح کافر سے اجتناب لازم ہے اسی لیے کفار سے گہرا دلی تعاون درست نہیں۔

فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ لہٰذا یہ مسجد حرام کے پاس بھی نہ آئیں۔ احناف کا قول ہے کہ مسجد حرام کے قریب آنے سے ممانعت کا مطلب یہ ہے کہ حج وعمرہ نہ کریں ویسے مسجد حرام میں داخلہ کی ممانعت نہیں ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو موسم حج میں اعلان کرنے کیلئے بھیجا تھا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے، اس اعلان سے مراد ہے حج وعمرہ کی ممانعت کرنا مسجد حرام میں کافر کے داخلہ کی ممانعت مقصود نہیں۔ لہٰذا دوسری مساجد میں کافروں کا داخلہ تو بدرجہ اولیٰ جائز ہے۔

قریب جانے کی ممانعت صرف کلام میں زور پیدا کرنے (اور حج وعمرہ کی سختی کے ساتھ ممانعت کرنے) کیلئے کی گئی ہے۔

بغوی نے لکھا ہے (۱) حرم کے اندر کسی کافر کا داخلہ جائز نہیں، ذمی ہو حربی ہو یا مستامن۔ اس آیت کا بظاہر یہی مطلب ہے۔ اگر امام (امیر المسلمین) حرم کے اندر ہو اور کافروں کی طرف سے دارالکفر سے کوئی (غیر مسلم) قاصد آئے تو حرم کے اندر داخل ہونے کی اجازت اس کو نہیں دی جاسکتی۔ امیر المومنین اپنے کسی آدمی کو حرم کے باہر بھیج کر اس کا پیام معلوم کرالے۔

(۲) حجاز کے اندر تجارت وغیرہ کی غرض سے کافروں کا داخلہ تو ہوسکتا ہے مگر تین روز یعنی مدت سفر سے زائد قیام نہیں ہوسکتا۔ حضرت عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا اگر میں زندہ رہا تو ان شاء اللہ جزیرہ عرب سے یہودیوں اور عیسائیوں کو نکال دوں گا۔ کسی کو سوائے مسلمان کے یہاں نہیں چھوڑوں گا مگر اس کام کی تکمیل سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی لیکن آپ نے اس کی وصیت فرمادی آپ کے بعد حضرت ابوبکرؓ کو بھی اس کا موقع نہیں ملا، آخر حضرت عمرؓ نے سب غیر مسلموں کو جزیرہ عرب سے باہر نکال دیا۔ البتہ تاجروں کو تجارت کے لئے حجاز میں آنے اور تین دن ٹھیرنے کی اجازت دیدی۔ جزیرہ عرب کی حدود اربعہ اس طرح ہیں، طول میں عدن کے آخری کنارہ سے عراق کے سبزہ زار تک اور عرض میں جدہ اور ساحل سمندر سے شام تک۔

بَعۡدَ عَامِهِمۡ هٰذَا ان کے اس سال کے بعد یعنی اس سال کے بعد جس میں سورۂ توبہ اتری تھی اور حضرت ابوبکرؓ نے سب کو حج کرایا تھا اور حضرت علیؓ نے کافروں سے براءت کا اعلان کیا تھا یہ واقعہ ۹ھ کا ہے۔ (تفسیر مظہری)

خلیفۃ المسلمین حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے فرمان جاری کر دیا تھا کہ یہود ونصرانی کو مسلمانوں کی مسجدوں میں نہ آنے دو۔ اس منع کرنے میں آپ اس آیت کی ماتحتی میں تھے۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

اہل شام کا حضرت عمرؓ سے معاہدہ:

عبدالرحمٰن بن غنم اشعریؒ کہتے ہیں میں نے اپنے ہاتھ سے عہد نامہ لکھ کر حضرت عمرؓ کو دیا تھا کہ اہل شام کے فلاں فلاں شہری لوگوں کی طرف سے یہ معاہدہ ہے امیر المومنین حضرت عمرؓ سے کہ جب آپ کے لشکر ہم پر آئے ہم نے آپ سے اپنی جان مال اور اہل وعیال کیلئے امن طلب کی ہم ان شرطوں پر وہ امن حاصل کرتے ہیں کہ ہم ان شہروں میں اور ان کے آس پاس کوئی دیر اور کوئی گرجا گھر اور کوئی خانقاہ نیا نہیں بنائیں گے اور نہ ایسے کسی خرابی والے مکان کی اصلاح کریں گے اور جو مٹ چکے ہیں انہیں درست نہیں کریں گے ان میں اگر کوئی مسلمان مسافر اترنا چاہے تو روکیں گے نہیں خواہ دن ہو خواہ رات ہو ہم ان کے دروازے رہ گزر اور مسافروں کے لئے کشادہ رکھیں گے اور جو مسلمان آئے ہم اس کی تین دن تک مہمانداری کریں گے ہم اپنے ان مکانوں یا رہائشی مکانوں وغیرہ میں کہیں کسی جاسوس کو نہ چھپائیں گے مسلمانوں سے کوئی دھوکہ فریب نہیں کریں گے اپنی اولاد کو قرآن نہ سکھائیں گے ہم میں سے کوئی اگر اسلام قبول کرنا چاہے ہم اسے ہرگز نہ روکیں گے مسلمانوں کی توقیر وعزت کریں گے ہماری جگہ اگر وہ بیٹھنا چاہیں تو ہم اٹھ کر انہیں جگہ دے دیں گے ہم مسلمانوں سے کسی چیز میں برابری نہ کریں گے نہ لباس میں نہ جوتی میں نہ مانگ نکالنے میں ہم ان کی زبان نہیں بولیں گے، ان کی کنیتیں نہیں رکھیں گے، زین والے گھوڑے پر سواریاں نہ کریں گے تلواریں نہ لٹکائیں گے نہ اپنے ساتھ رکھیں گے، انگوٹھیوں پر عربی نقش نہیں کرائیں گے، شراب فروشی نہیں کریں گے اپنے سروں کے اگلے بالوں کو ترشوا دیں گے اور جہاں کہیں ہوں گے زنار ضرور تا ڈالے رہیں گے صلیب کا نشان اپنے گرجوں پر ظاہر نہیں کریں گے اپنی مذہبی کتابیں مسلمانوں کی گزرگاہوں اور بازاروں میں ظاہر میں کریں گے گرجوں میں ناقوس بلند آواز سے نہیں بجائیں گے نہ مسلمانوں کی موجودگی میں باآواز بلند اپنی مذہبی کتابیں پڑھیں گے نہ اپنے مذہبی شعار کو راستوں پر کریں گے نہ اپنے مردوں پر اونچی آواز سے ہائے وائے کریں گے نہ ان کے ساتھ مسلمانوں کے راستوں میں آگ لے کر جائیں گے مسلمانوں کے حصے میں آئے ہوئے غلام ہم نہ لیں گے مسلمانوں کی خیر خواہی ضرور کرتے رہیں گے ان کے گھروں میں انہیں جھانکیں گے نہیں۔ جب یہ عہد نامہ فاروق اعظمؓ کی خدمت میں پیش ہوا تو آپؐ نے ایک شرط اور بھی اس میں بڑھوائی کہ ہم کسی مسلمان کو ہرگز ماریں گے نہیں یہ تمام شرطیں ہمیں قبول ومنظور ہیں اور ہمارے سب ہم مذہب لوگوں کو بھی انہی شرائط پر ہمیں امان ملی ہے اگر ان میں سے کسی ایک شرط کی بھی ہم خلاف ورزی کریں تو ہم سے آپ کا ذمہ الگ ہو جائے گا اور جو کچھ آپ اپنے دشمنوں اور مخالفوں سے کرتے ہیں ان تمام کے مستحق ہم بھی ہو جائیں گے۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

قریب جانے سے منع کرنے کا مطلب:

امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک آیت میں مشرکین کو مسجد حرام کے قریب جانے سے منع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ سال سے ان کو مشرکانہ طرز پر حج وعمرہ کرنے کی اجازت نہ ہوگی، اور دلیل یہ ہے کہ جس وقت موسم حج میں حضرت علی مرتضیٰؓ کے ذریعہ اعلان براءت کر دیا گیا تو اس میں اعلان اسی کا تھا کہ **لا یحجن بعدالعام مشرک**، جس میں ظاہر کر دیا گیا تھا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کر سکے گا۔ (معارف مفتی اعظم)

نجاست کو دیکھنے کا نقصان:

حکماء نے لکھا ہے کہ نجاست کی طرف نظر کرنا ضعف بصر کا سبب ہے اسی طرح یہ ناچیز کہتا ہے کہ کفر اور شرک کی نجاست کی طرف نظر کرنا ضعف بصیرت کا سبب ہے۔ اور اسی پر تمام اولیاء وعارفین کا اجماع ہے۔ اور کتاب وسنت کے نصوص میں جو کافر اور فاسق کی صحبت اور مجالست کی ممانعت آئی ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے۔

کون سی نجاست مراد ہے:

جمہور علماء اسلام اور ائمہ اربعہ یہ کہتے ہیں کہ آیت میں نجاست سے اعتقادی نجاست مراد ہے اور بعض صحابہ وتابعین سے یہ مروی ہے کہ نجاست سے نجاست حسیہ اور ظاہر یہ مراد ہے اور کفار اور مشرکین کلب اور خنزیر کی طرح نجس العین ہیں جو مشرک کو چھوئے اس پر وضو لازم ہے جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من صافح مشرکاً فلیتو ضاء (اخرجہ ابوالشیخ وابن امردویہ)

جیسے حدیث میں مس ذکر سے وضو کا حکم آیا ہے اسی طرح مس کافر سے وضو کے حکم سمجھو۔

واخرن ابن مردویه عن هشام بن عروة عن ابیه عن جده قال استقبل رسول الله صلی الله علیه وسلم جبریل علیه السلام فناوله یده فابی ان یتنا ولها فقال یاجبریل مامنعک ان تأخذ

بیدی قال انک اخذت بید یھودی فکرھت ان تمس یدی یدا قد مسحا یدکافر فدعا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بمآء فتوضا فناولہ یدہ فتنا ولھا تفسیر در منثور صفحہ ۲۲۷ ج ۳ اور دیکھو روح المعانی صفحہ نمبر ۶۸

ہشام اپنے باپ عروہ بن الزبیر سے اور عروۃ حضرت زبیرؓ سے راوی ہیں کہ ایک مرتبہ راستہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جبریل امین سے ملاقات ہوگئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل سے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ جبریل امین نے ہاتھ بڑھانے سے انکار کیا اور عذر یہ کیا کہ اسی راستہ میں آپ نے ایک یہودی سے ہاتھ ملایا ہے اس لئے میں نے ناپسند کیا کہ اس ہاتھ سے ہاتھ ملاؤں جو کافر کے ہاتھ کو مس کر چکا ہے آپ نے اسی وقت وضو کیلئے پانی منگایا اور وضو کر کے جبریل امین کی طرف ہاتھ بڑھایا یا جبریل امین نے فوراً مصافحہ کرلیا

مسئلہ: جمہور علماء کے نزدیک کفار کا مسجد میں آنا ممنوع ہے۔ مگر امام اعظم کے نزدیک بطور غلبہ اور تسلط یا بطور اعزاز واکرام مشرک کا مسجد میں آنا جائز نہیں۔ البتہ مسلمان کا کوئی غلام یا خادم یا کوئی ذمی کسی مسلمان کی اجازت سے ادب اور احترام کے ساتھ مسجد میں کسی ضرورت کی وجہ سے آجائے تو اس میں مضائقہ نہیں۔ باقی کسی کافر اور مشرک کو بطور اعزاز واکرام مسجد میں مدعو کرنا اور اس کافر سے مسجد کے منبر پر تقریر کرانا یہ بلاشبہ حرام ہے۔ (معارف کاندھلویؒ)

وَاِنۡ خِفۡتُمۡ عَيۡلَةً فَسَوۡفَ يُغۡنِيۡكُمُ اللّٰهُ
اور اگر تم ڈرتے ہو فقر سے تو آئندہ غنی کردیگا تم کو اللہ
مِنۡ فَضۡلِهٖۤ اِنۡ شَآءَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌ
اپنے فضل سے اگر چاہے بیشک اللہ سب کچھ جاننے والا
حَكِيۡمٌ ﴿۲۸﴾
حکمت والا ہے

معاشی تنگی کی فکر نہ کرو: حرم میں مشرکین کی آمد ورفت بند کردینے سے مسلمانوں کو اندیشہ ہوا کہ تجارت وغیرہ کو بڑا نقصان پہنچے گا۔ اور جو سامان تجارت یہ لوگ لاتے تھے، وہ نہیں آئیگا۔ اس لئے تسلی کردی کہ اس سے مت گھبراؤ۔ تم کو غناء عطا فرمانا محض اس کی مشیت پر موقوف ہے۔ وہ چاہے گا تو کچھ دیر نہ لگے گی۔ چنانچہ یہ ہی ہوا۔ خدا نے سارا ملک مسلمان کردیا۔ مختلف بلاد وامصار سے تجارتی سامان آنے لگا، بارشیں خوب ہوئیں جس سے پیداوار بڑھ گئی، فتوحات وغنائم کے دروازے کھول دیے۔ اہل کتاب وغیرہ سے جزیہ کی رقوم وصول ہونے لگیں۔ غرض مختلف طرح سے حق تعالیٰ نے اسباب غناء جمع کردیے۔ بیشک خدا کا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

معاشی خوشحالی کی صورتیں:

عکرمہ نے کہا (بموجب وعدہ) اللہ نے ان کو غنی کردیا، جس کی صورت یہ ہوئی کہ بارش خوب ہوئی اور پیداوار کی کثرت ہوگئی مقاتل نے کہا جدہ اور صنعاء اور جوش والے مسلمان ہوگئے اور بکثرت بقدر ضرورت غلہ اپنے ملک سے مکہ میں لے آئے جس سے اہل مکہ کو فقر وفاقہ کا خوف نہیں رہا۔

ضحاک اور قتادہ نے کہا اللہ نے کافروں سے ان کو جزیہ دلوادیا اور اس طرح مکہ کے مسلمانوں کو غنی کردیا۔ (تفسیر مظہری)

قَاتِلُوا الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَلَا
لڑو اُن لوگوں سے جو ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور نہ
بِالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوۡنَ مَا حَرَّمَ
آخرت کے دن پر اور نہ حرام جانتے ہیں اُس کو جس کو حرام کیا
اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗ وَلَا يَدِيۡنُوۡنَ دِيۡنَ الۡحَـقِّ
اللہ نے اور اُس کے رسُول نے اور نہ قبول کرتے ہیں دین سچا
مِنَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ حَتّٰى يُعۡطُوا
اُن لوگوں میں سے جو کہ اہل کتاب ہیں یہاں تک کہ
الۡجِزۡيَةَ عَنۡ يَّدٍ وَّهُمۡ صٰغِرُوۡنَ ﴿۲۹﴾
وہ جزیہ دیں اپنے ہاتھ سے ذلیل ہو کر

مشرکین کے بعد یہود ونصاریٰ کا معاملہ:

جب مشرکین کا قصہ پاک ہوگیا اور ملکی سطح ذرا ہموار ہوئی تو حکم ہوا کہ ''اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) کی قوت وشوکت کو توڑو۔ مشرکین کے وجود سے تو بالکل عرب کو پاک کردینا مقصود تھا لیکن یہود ونصاریٰ کے متعلق اس وقت صرف اسی قدر مطمح نظر تھا کہ وہ اسلام کے مقابلہ میں زور نہ پکڑیں اور اس کی اشاعت وترقی کے راستہ میں حائل نہ ہوں۔ اس لئے اجازت دی گئی کہ اگر یہ لوگ ماتحت رعیت بن کر جزیہ دینا منظور کریں تو کچھ مضائقہ نہیں، قبول کرلو، پھر حکومت اسلامیہ ان کے جان ومال کی محافظ ہوگی، ورنہ ان کا علاج بھی وہ ہی ہے جو مشرکین کا تھا (یعنی مجاہدانہ قتال) کیونکہ یہ بھی اللہ اور یوم آخرت پر جیسا چاہیے ایمان نہیں رکھتے نہ خدا ورسول کے احکام کی کچھ پروا کرتے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تو کجا، اپنے تسلیم کردہ نبی

حضرت مسیح علیہ السلام کی سچی پیروی نہیں کرتے، محض اہواء وآراء کا اتباع کرتے ہیں، جو سچا دین پہلے آیا۔ یعنی حضرت مسیح وغیرہ کے زمانہ میں اور جو اب نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم لیکر آئے، کسی کے قائل نہیں۔ بلکہ جیسا کہ عنقریب آتا ہے اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ خدا کا روشن کیا ہوا چراغ اپنی پھونکوں سے گل کردیں۔ ایسے بد باطن نالائقوں کو اگر یوں ہی چھوڑ دیا جائے تو ملک میں فتنہ وفساد اور کفر وتمرد کے شعلے برابر بھڑکتے رہینگے۔ (تفسیر عثمانی)

مجاہد نے کہا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رومیوں سے جہاد کرنے کا حکم دیدیا گیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اس کے نزول کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ تبوک پر تشریف لے گئے۔

جزیہ لینا: عکرمہ نے کہا مراد یہ ہے کہ لینے والا بیٹھا ہو اور دینے والا کھڑا ہو کر پیش کرے۔ ایک روایت میں حضرت ابن عباس کا قول آیا ہے کہ اس کی گردن روند کر اس سے جزیہ وصول کیا جائے، کلبی نے کہا، لیتے دیتے وقت اس کی گردن پر گھونسا رسید کیا جائے، بعض نے کہا اس کی داڑھی پکڑ کر طمانچہ مارا جائے، بعض نے کہا اس کا گریبان پکڑ کر کھینچتے ہوئے سختی کے ساتھ مقام تحصیل تک لایا جائے۔ بعض نے کہا جزیہ پیش کرنا ہی ذلت ہے امام شافعی نے فرمایا ذمیوں پر اسلام کے احکام لاگو کرنا ہی ان کی تذلیل ہے۔

مجوسیوں سے جزیہ لینے پر اجماع علماء ہے۔

مسئلہ: امام ابوحنیفہ کے نزدیک اہل کتاب سے جزیہ لیا جائے گا خواہ وہ عرب ہوں یا عجمی۔ اور عجم کے مشرکوں سے بھی لیا جائے گا خواہ وہ مجوسی ہوں یا بت پرست البتہ مرتدوں سے نہیں لیا جائے گا۔

مجوسیوں سے جزیہ لینا:

امام ابویوسف نے نصر بن خلیفہ کے حوالہ سے یہ بھی لکھا ہے کہ فروہ بن نوفل اشجعی نے کہا یہ بات بہت سخت ہے کہ مجوسیوں سے خراج لیا جاتا ہے باوجودیکہ وہ اہل کتاب نہیں ہیں یہ بات سن کر مستورد بن احنف ے کھڑے ہو کر کہا تو نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نکتہ چینی کی فوراً توبہ کر ورنہ میں تجھے قتل کردوں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ہجر کے رہنے والے مجوسیوں سے خراج لیا تھا۔ آخر دونوں اس جھگڑے کو حضرت علیؓ کی خدمت میں لے گئے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا میں مجوسیوں کے متعلق ایک بات بیان کرتا ہوں جس کو تم دونوں پسند کروگے مجوسی ایک کتابی امت تھی ان کے پاس (اللہ کی) ایک کتاب تھی جس کو وہ پڑھتے تھے ایک بار ان کے بادشاہ نے شراب پی اور نشہ میں اپنی بہن کا ہاتھ پکڑ کر بستی سے باہر لے گیا۔ پیچھے پیچھے چار آدمی ہولیے، وہاں جا کر اس نے بہن سے قربت کی پیچھے جانے والے لوگ دیکھ رہے تھے۔ جب نشہ اترا تو بہن نے اس سے کہا فلاں فلاں لوگوں کی نظروں کے سامنے تو نے ایسی حرکت کی۔ بادشاہ نے کہا مجھے کچھ معلوم نہیں۔ بہن نے کہا اب تجھے قتل کردیا جائے گا ورنہ میری بات مان لی۔ بادشاہ نے کہا میں ضرور مانوں گا۔ عورت نے کہا اس فعل کو تو مذہبی مسئلہ بنادے اور لوگوں سے کہہ دے کہ آدم کا مذہب یہی ہے حوا کی پیدائش آدم ہی سے ہوئی تھی (گویا حواء آدم کی بیٹی تھیں) لوگوں کو اسی مذہب کی دعوت دے جو تیرا مذہب مان لے اس کو چھوڑ دے جو نہ مانے اس کو تلوار سے قتل کردے بادشاہ نے اس مشورہ پر عمل کیا مگر بادشاہ کا حکم کسی نے نہیں مانا اور شام تک لوگ قتل ہوتے رہے عورت نے کہا میں محسوس کرتی ہوں کہ لوگ قتل ہونے سے نہیں ڈرتے۔ آئندہ تو ان کو جلانے کی دھمکی دے اور ایک جگہ آگ روشن کردے۔ بادشاہ نے اس مشورہ پر عمل کیا اور لوگوں کو دہکتی آگ میں ڈال دینے کی دھمکی دی تو لوگ ڈر گئے اور بادشاہ کی بات مان لی۔ حضرت علیؓ نے فرمایا چونکہ مجوسی اہل کتاب تھے اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے خراج لے لیا اور چونکہ مشرک ہوگئے تھے اس لئے ان سے نکاح اور ان کے ہاتھ کا ذبیحہ حرام قرار دے دیا۔

ابن جوزی نے التحقیق میں لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا اہل فارس کا پیغمبر جب وفات پا گیا تو ابلیس نے ان کیلئے دستور مجوسیت لکھ دیا۔

کیا ہندو اہل کتاب ہیں:

میں کہتا ہوں اگر مجوسیوں کے اسلاف کا اہل کتاب ہونا ان مجوسیوں کے اہل کتاب قرار دینے کے لئے کافی ہے تو ہمارے زمانہ کے یہ ہندو بت پرست بھی اہل کتاب ہوجائیں گے ان کے پاس بھی وید نام کی ایک کتاب ہے جس کے چار حصے ہیں اور ان کا دعویٰ ہے کہ یہ خدائی کتاب ہے۔ پھر ان کے اکثر اصول بھی شرعی اصول کے موافق ہیں اور جن اصول میں اختلاف ہے وہ شیطانی آمیزش کا نتیجہ ہے۔ جس طرح شیطانی تفرقہ اندازی سے مسلمانوں کی ایک جماعت پھٹ کر تہتر فرقے بن گئی۔ ہندوؤں کے اہل کتاب ہونے کی تائید قرآن سے بھی ہورہی ہے اللہ نے فرمایا ہے وان من امة الاخلافیھا نذیر ہر امت میں کوئی نہ کوئی پیغمبر ضرور گذرا ہے۔ مجوسیوں سے تو ہندو اہل کتاب کہلانے کے زیادہ مستحق ہیں۔ مجوسیوں کے بادشاہ نے تو نشہ سے بدمست ہوکر اپنی بہن سے زناء کیا اور اپنے دین وکتاب کو چھوڑ دیا اور دین آدم کا مدعی بن بیٹھا مگر ہندوؤں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار کرنے کی وجہ سے کافر ہوگئے۔ مجھ سے بیان کیا گیا ہے کہ چوتھے وید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی بشارت مذکور ہے جس کو پڑھ کر بعض ہندو مسلمان ہوگئے ہیں واللہ اعلم۔

ہندوں پر جزیہ وقید:

مجوسیوں کے اسلاف اہل کتاب تھے تو اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا (کیونکہ مشرکوں اور بت پرستوں کے اسلاف بھی صحیح طور پر اہل کتاب تھے اس

کے علاوہ) یہ مجوسی تو بہرحال اپنے اسلاف کی کتاب کے حامل اور عامل نہیں۔

پھر (مجوسیوں کی طرح) بت پرستوں کو باندی غلام بنانا باتفاق علماء درست ہے لہٰذا مجوسیوں کی طرح ان پر جزیہ مقرر کرنا بھی درست ہونا چاہیے غلامی ہو یا تقرر جزیہ دونوں صورتوں میں ذاتی (تصرفات کی) آزادی میں تو خلل پڑتا ہی ہے غلام آقا کیلئے کماتا ہے اور اپنی کمائی سے خود اپنا خرچ بھی چلاتا ہے جزیہ ادا کرنے والا بھی اپنی کمائی سے خود بھی کھاتا ہے اور جزیہ بھی ادا کرتا ہے۔

لشکرِ اسلام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات:

سلیمان بن بریدہؓ نے اپنے باپ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی کو کسی لشکر یا فوجی دستہ کا امیر بنا کر بھیجتے تھے تو خصوصیت کے ساتھ اللہ سے ڈرنے اور ساتھ والے مسلمانوں سے بھلائی کرنے کی نصیحت فرماتے تھے پھر فرماتے تھے اللہ کا نام لے کر اللہ کی راہ میں جہاد کرنا جو اللہ کے منکر ہوں ان سے قتال کرنا لڑنا شکست نہ کھانا عہد شکنی نہ کرنا کسی کے ناک کان نہ کاٹنا کسی بچے کو قتل نہ کرنا دشمن سے آمنا سامنا ہو تو سب سے پہلے اس کو تین باتوں کی دعوت دینا اگر وہ ان تین باتوں میں سے ایک بات کو بھی مان لیں تو قبول کر لینا اور جنگ سے باز رہنا اول ان کو اسلام کی دعوت دینا اگر مان لیں تو تم بھی مان لینا اور ان سے جنگ ترک کر دینا پھر ان سے کہنا کہ اپنے گھروں کو چھوڑ کر مدینہ چلے چلو وہاں رہنا اگر تم ایسا کر لو گے تو دوسرے مہاجرین کی طرح ہو جاؤ گے ان کا نفع تمہارا نفع اور ان کا ضرر تمہارا ضرر مانا جائے گا۔ اگر وہ ہجرت کرنے سے انکار کریں تو ان سے کہہ دینا کہ دوسرے بیرونی مومنوں کی فہرست میں ان کا شمار ہوگا۔ اعراب اہل اسلام پر جو حکم لاگو ہے وہی ان پر ہوگا غنیمت اور فے کے مال میں بغیر جہاد میں شرکت کرنے کے ان کا کوئی حصہ نہ ہوگا۔ اگر وہ مسلمان ہونے سے انکار کر دیں تو ان سے جزیہ طلب کرنا جزیہ دے دیں تو لے لینا اور ان سے جنگ ترک کر دینا آخر میں اگر وہ جزیہ ادا کرنے سے بھی انکار کر دیں تو اللہ سے مدد کی درخواست کرنا اور ان سے قتال کرنا۔ الحدیث۔ (رواہ مسلم)

عربی کتابی سے جزیہ لینا:

حضرت انسؓ کی روایت کردہ حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب کتابی سے بھی جزیہ لینا جائز ہے۔ حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد بن ولید کو اکیدر حاکم دومۃ الجندل کی طرف بھیجا حضرت خالد اس کو گرفتار کر لائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جانی پناہ دیدی اور اداء جزیہ کی شرط پر اس سے صلح کر لی۔ (رواہ ابوداؤد)

امام ابوحنیفہ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عربوں میں ان کے سامنے پلے بڑھے تھے اور قرآن بھی عرب کی زبان میں ہی اترا تھا اس لیے عرب کے لیے معجزہ کا ظہور ناقابل انکار تھا اسی وجہ سے عرب (کے بت پرستوں) سے سوائے اسلام کے اور کچھ قبول نہیں کیا جا سکتا ورنہ قتال کیا جائے گا۔ یہی حالت مرتدوں کی ہے مرتد ہدایت پانے اور اسلام کی خوبیوں سے واقف ہونے کے بعد انکار کرتا اور اسلام کو ترک کرتا ہے (اس کے پاس اسلام سے ناواقفیت کا کوئی عذر نہیں ہوتا اسی لیے) اسلام یا قتال کے سوا اس کی طرف سے جزیہ قبول نہیں کیا جا سکتا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیحتیں:

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین باتوں کی نصیحت فرمائی تھی۔ فرمایا تھا مشرکوں کو جزیرۂ عرب سے نکال دو اور (غیر ملکی کافروں کے) وفد کو ویسی ہی اجازت (داخلہ) دو جیسی میں دیتا ہوں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا تیسری بات بیان کرنے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے یا میں بھول گیا۔ متفق علیہ۔

حضرت جابر بن عبداللہ راوی ہیں کہ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے میں یہود و نصاریٰ کو جزیرۂ عرب سے ضرور نکال دوں گا یہاں تک کہ مسلمان کے سوا کسی کو یہاں نہیں چھوڑوں گا۔ (رواہ مسلم)

مؤخر الذکر روایت اسحاق نے اپنی مسند میں نقل کی ہے۔ حضرت ابوعبیدہ بن جراح کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو آخری کلام کیا وہ یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہودیوں کو حجاز سے اور اہل نجران (اہل یمن) کو جزیرۂ عرب سے نکال دو۔ یہ حدیث امام احمد اور بیہقی نے نقل کی ہے۔

جزیہ کی مقدار: امام ابوحنیفہ کے نزدیک مقدار جزیہ کی تعیین باہم صلح اور رضامندی سے ہونی چاہیے۔ جتنی مقدار بھی باہم طے ہو جائے کوئی حد بندی نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (یمن کے) نجرانیوں سے دو ہزار کپڑے کے جوڑوں کی وصولیابی کی شرط پر صلح کی تھی۔

زمین کا جزیہ زمین پر قائم رہے گا خواہ وہ زمین کسی ذمی یا تغلبی (عیسائی) یا مسلمان کے ہاتھ فروخت ہی کر دی گئی ہے (مگر ٹیکس زمین پر قائم رہے گا) یہاں تک کہ عورتوں اور بچوں کی زمینوں پر بھی زمین کا جزیہ عائد ہوگا البتہ پرسنل ٹیکس (شخصی جزیہ) عورتوں اور بچوں پر عائد نہ ہوگا۔

حارثہ بن مضر کا بیان آیا ہے کہ حضرت عمر نے عثمان بن حنیف کو بھیجا انہوں نے فی کس ۴۸ اور ۲۴ اور ۱۲ درہم جزیہ قائم کیا یہ واقعہ صحابہ کی موجودگی کا ہے کسی نے اس کے خلاف آواز نہیں اٹھائی اس لیے یہ تجویز اجماع کے قائم مقام ہوگئی۔

امام ابویوسف نے کتاب الخراج میں بروایت سری بن اسماعیل عامر شعبی

کا بیان نقل کیا ہے کہ حضرت عمر نے عراق کی پیمائش کرائی ۳۶۰ کروڑ جریب زمین پیمائش سے نکلی اناج کاری کے جریب پر ایک درہم اور ایک قفیز غلہ اور انگوروں کے ایک جریب پر دس درہم اور کھجوروں کے ایک جریب پر پانچ درہم ٹیکس کے مقرر کیے اور شخصی جزیہ فی کس ۱۲ اور ۲۴ اور ۴۸ درہم سالانہ طے کیے۔

شعبی نے کہا مجھ سے سعید بن ابی عروبہ نے بروایت قتادہ ابن مجلز کا بیان نقل کیا کہ حضرت عمر نے نماز کی امامت اور فوج کی قیادت حضرت عمار بن یاسر کے اور محکمہ قضا و خزانہ حضرت عبداللہ بن مسعود کے اور زمین کا سروے حضرت عثمان بن حنیف سے متعلق کر کے بھیجا اور ان حضرات کے راشن کے لئے ایک بکری روزانہ مقرر کر دی، آدھی بکری اور شکمی آلات حضرت عمار کیلئے، چوتھائی بکری حضرت ابن مسعود کیلئے اور چوتھائی بکری حضرت عثمان بن حنیف کے لیے۔ اور فرمایا میں اپنی ذات کو اور آپ لوگوں کو اس مال کے معاملہ میں یتیم کے سرپرست کی طرح خیال کرتا ہوں، اللہ نے فرمادیا ہے کہ جو مالدار ہو وہ (یتیم کے مال سے) بچا رہے اور جو نادار ہو وہ (اپنے زیر نگرانی یتیم کے مال میں سے) دستور کے مطابق کھا سکتا ہے۔ جس زمین سے روزانہ ایک بکری لے لی جائے خدا کی قسم میرے خیال میں وہاں بہت جلد نقصان (یعنی بکریوں کی کمی) ہوسکتا ہے۔ حضرت عثمان نے جا کر زمینوں کی پیمائش کی انگور والی ایک جریب زمین پر دس (درہم) کھجور والی جریب پر آٹھ گنے کی ایک جریب پر چھ گیہوں کی ایک جریب پر چار اور جو کی ایک جریب پر دو درہم (سالانہ) مقرر کیے۔ اور شخصی ٹیکس بارہ درہم چوبیس درہم اور اڑتالیس درہم لاگو کیا اور عورتوں بچوں پر کوئی (شخصی) ٹیکس عائد نہیں کیا۔ سعید کا بیان ہے کہ میرے ایک ساتھی نے روایت میں اتنا اختلاف کیا ہے کہ کھجور کی جریب پر دس درہم اور انگور کی جریب پر آٹھ درہم ہونے کا ذکر کیا ہے۔

محمد بن اسحاق نے بروایت حارثہ بن مطرف بیان کیا کہ حضرت عمر نے سواد کو مسلمانوں کیلئے تقسیم کرنے کا ارادہ کیا اور سواد نے (عراق) کی مردم شماری کرائی تو کافروں کی تعداد اتنی نکلی کہ ایک مسلمان کے مقابلہ میں دو دو تین تین کافر آئے (گویا عراق کے دیہاتیوں کی تعداد مسلمانوں سے دوگنی تین گنی نکلی) یہ دیکھ کر صحابہ نے باہم مشورہ کیا حضرت علی نے فرمایا یہ کفار تو مسلمانوں کے اقتصادی مددگار ہو سکتے ہیں اس لیے ان کی زمینیں نہ نکالی جائیں بلکہ سالانہ ٹیکس مقرر کر دیا جائے) چنانچہ حضرت عثمان بن حنیف کو بھیجا گیا اور عثمان نے جا کر (تین طبقات قائم کیے اور) ۴۸ اور ۲۴ اور ۱۲ درہم سالانہ مقرر کیے۔ حنفیہ نے حضرت معاذ والی حدیث کا یہ جواب دیا ہے کہ یمن کو فوجی غلبہ سے نہیں فتح کیا گیا بلکہ صلح سے وہاں تسلط قائم کیا گیا۔ اہل یمن سے مقدار جزیہ بھی مصالحت سے طے ہوئی پھر اہل یمن عموماً محتاج تھے اس لئے مقدار جزیہ ان پر وہ عائد کی گئی جو مفلسوں پر لاگو ہوتی ہے اس کی تائید بخاری کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ ابونجیح نے بیان کیا میں نے مجاہد سے پوچھا شام والوں پر تو فی کس چار دینار مقرر کیے گئے اور یمن والوں پر فی کس ایک دینار اس کی کیا وجہ ہے۔ مجاہد نے جواب دیا یہ سہولت کے پیش نظر کیا گیا (اہل شام مالدار تھے اور اہل یمن نادار)

جزیہ کی کوئی خاص حد شرعاً مقرر نہیں امام مسلمین کی رائے پر اس کی کمی بیشی موقوف ہے۔

مسئلہ: امام ابوحنیفہ امام مالک اور امام احمد کے نزدیک بے روزگار مفلس سے جزیہ نہ لیا جائے۔

جزیہ کس چیز کا عوض ہے: امام ابوحنیفہ امام مالک اور امام احمد کے نزدیک جزیہ کفر کی سزا ہے اور توبہ کے بعد سزا نہیں دی جاتی لہذا حالت کفر کا جزیہ بھی اسلام کے بعد نہیں لیا جاسکتا۔ معاہدہ جزیہ سے قتال کا حکم ختم ہو جاتا ہے اسلام سے بھی قتال کا حکم ختم ہو جاتا ہے رہا جزیہ کا اجرت سکونت ہونا تو یہ ناقابل تسلیم ہے ذمی تو اپنی ملک میں رہتا ہے۔

ہمارے قول کا ثبوت حضرت ابن عباس کی اس روایت سے بھی ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مسلمان پر جزیہ نہیں ہے۔ رواہ احمد والترمذی وابوداؤد۔ ابوداؤد نے لکھا ہے کہ سفیان ثوری سے اس مسئلہ کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا جب ذمی مسلمان ہو گیا تو اس پر (سابق) جزیہ کی ادائیگی نہیں۔ سفیان ثوری نے جو تشریح کی ہے وہ ابن عمر کی روایت سے بھی منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو مسلمان ہو گیا اس پر جزیہ نہیں۔ (رواہ الطبرانی فی المعجم الاوسط)

ناداروں اور معذوروں کا حکم:

ابو یوسف نے بروایت عمرو بن نافع بوساطت ابوبکر بیان کیا کہ حضرت عمرؓ کسی شخص کے دروازے کی طرف سے گذرے وہاں ایک بوڑھا نابینا سائل (بھیک مانگ رہا تھا) باقی حدیث حسب سابق ہے اس روایت میں اتنا زائد ہے کہ حضرت عمر نے اس بوڑھے اور اس جیسے دوسرے لوگوں سے جزیہ لینے کا حکم ساقط کر دیا۔ ابوبکرؓ کا بیان ہے میں اس وقت موجود تھا اور میں نے اس بوڑھے کو دیکھا بھی تھا۔

ابو یوسف نے بروایت ہشام بن عروہ از عروہ (بن زبیر بن عوام) بیان کیا کہ حضرت عمر شام سے واپسی میں کچھ لوگوں کی طرف سے گزرے ان لوگوں کو دھوپ میں کھڑا کیا گیا تھا اور ان کے سروں پر تیل بہایا جا رہا تھا۔ فرمایا یہ کیا بات ہے لوگوں نے کہا ان پر جزیہ واجب ہے اور انہوں نے ادا نہیں کیا ہے۔ جزیہ وصول کرنے کیلئے ان کو تکلیف دی جارہی ہے فرمایا جزیہ ادا کرنے کے متعلق ان کا کیا عذر ہے۔ لوگوں نے کہا یہ اپنی ناداری ظاہر کر رہے ہیں۔ فرمایا ان کو چھوڑ دو اور برداشت سے زیادہ ان کو مجبور نہ کرو۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے لوگوں کو عذاب نہ دو۔

دنیا میں لوگوں کو عذاب دیں گے، اللہ قیامت کے دن ان کو عذاب دے گا، اس کے بعد آپ نے ان کو رہا کر دینے کا حکم دے دیا۔

ابو یوسف نے فرمایا مجھ سے ایک بوڑھے شیخ نے مرفوع حدیث بیان کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن ارقم کو ذمیوں سے جزیہ وصول کرنے کی خدمت پر مامور فرمایا جب عبداللہ نے جانے کیلئے پشت پھیری تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو پکار کر فرمایا سن لو جو شخص کسی معاہد پر ظلم کرے گا یا اس کو ناقابل برداشت کام پر مجبور کرے گا یا اس کو گھٹا ئے گا یا اس کی خوشی خاطر کے بغیر کچھ اس سے لیگا تو میں قیامت کے دن اس کی طرف سے جھگڑا کروں گا۔ اس حدیث سے امام احمد کے مسلک کی تائید ہوتی ہے کہ مقدار جزیہ کی تعیین امام کی رائے پر موقوف ہے امام کو چاہیے کہ ذمی کی طاقت کا لحاظ رکھے برداشت سے زائد کا اس کو تکلیف نہ کرے۔

مسئلہ: اگر کسی ذمی کافر کے معادے کو ایک سال پورا گزر گیا اور اس نے جزیہ ادا نہیں کیا اور پھر مسلمان ہو گیا تو امام شافعیؒ کے نزدیک اس سے پورے گزشتہ سال کا جزیہ لیا جائے گا (اسلام سے واجب الادا جزیہ ساقط نہ ہوگا) کیونکہ جزیہ کافر کے دارالاسلام میں رہنے کی اجرت ہے۔

امام ابو یوسف نے کتاب الخراج میں لکھا ہے کہ مجھ سے کوفہ کے ایک بوڑھے عالم نے بیان کیا کہ عمر بن عبدالعزیز نے عبدالحمید بن عبدالرحمٰن کو لکھ کر بھیجا (تحریر کے الفاظ یہ تھے) تم نے مجھ سے تحریراً دریافت کیا ہے کہ حیرہ کے رہنے والے وہ یہودی اور عیسائی اور مجوسی جو مسلمان ہو جائیں اور حالت کفر کا ایک بڑا جزیہ ان کے ذمہ باقی ہو، اس جزیہ کا کیا کیا جائے تمہارا مقصد یہ ہے کہ سابق جزیہ ان سے وصول کیا جائے تم کو جان لینا چاہیے کہ اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلام کی دعوت دینے کیلئے بھیجا ٹیکس جمع کرنے کے لیے نہیں بھیجا تھا اس لئے ان مذاہب والوں میں سے جو مسلمان ہو جائے اس کے مال پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اس پر جزیہ نہیں (یعنی سابق جزیہ جو اس پر واجب الادا رہ گیا ہو وہ معاف ہو جائیگا)

مسئلہ: امام ابوحنیفہ کے نزدیک سال شروع ہوتے ہی پورے سال کا جزیہ ادا کرنا واجب ہو جاتا ہے امام مالک کا قول بھی ایک روایت میں یہی آیا ہے لہذا ذمیت کا معاہدہ ہوتے ہی سال بھر کا جزیہ ادا کرنا لازم ہے۔

مسئلہ: اگر دو سال یا دو سال سے زیادہ مدت کا جزیہ ذمی نے ادا نہیں کیا تو امام ابوحنیفہ اور امام احمد کے نزدیک تداخل ہو جائیگا یعنی اس سے صرف ایک سال کا جزیہ لیا جائیگا۔ (تفسیر مظہری)

مسئلہ: بچوں، پاگلوں اور عورتوں پر جزیہ واجب نہیں یہ قول متفق علیہ ہے بچے اور پاگل کسی سزا کے اہل ہی نہیں ہیں۔ امام ابو یوسف نے کتاب الخراج میں لکھا ہے کہ مجھ سے عبیداللہ نے نافع کی روایت سے اسلم کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت عمر نے (اپنے تحصیلداروں کو) لکھا تھا بالغوں سے جزیہ لینا عورت اور بچہ سے نہ لینا اور جزیہ میں صرف چار دینار یا چالیس درہم (فی کس سالانہ) لینا یعنی زیادہ نہ لینا۔

بیہقی نے بروایت زید بن اسلم زید کے باپ کا بیان نقل کیا ہے کہ حضرت عمر نے فوجی کمانڈروں لکھ کر بھیج دیا تھا کہ جزیہ صرف بالغوں پر مقرر کرنا۔ حضرت عمر عورتوں اور بچوں پر جزیہ مقرر نہیں کرتے تھے۔ دوسری روایت میں اتنا زائد ہے کہ (حضرت عمر نے لکھا تھا) عورتوں اور بچوں پر جزیہ لاگو نہ کرنا۔

مسئلہ: غلام پر جزیہ نہیں، خواہ خالص غلام ہو یا مکاتب، یا مدبر یا امام ولد کا بیٹ (مکاتب وہ غلام ہے جس کو آقا نے یہ اختیار دے دیا ہو کہ اتنی رقم اگر تم مجھ کو دیدو گے تو آزاد ہو جاؤ گے۔ مدبر وہ غلام ہے جس سے آقا نے کہہ دیا کہ میرے مرنے کے بعد تو آزاد ہے۔ ام ولد وہ باندی ہے جس کے بطن سے آقا کی کوئی اولاد پیدا ہو جائے ایسی باندی کو بیچنا ناجائز ہے اس کا بیٹا اگرچہ اس کے آقا کا بیٹا ہوتا ہے مگر باندی کا بچہ ہوتا ہے)۔ کیونکہ غلام کا کسی طرح کا غلام ہو۔ کوئی مال اپنا نہیں ہوتا۔ آقا کا ہوتا ہے اور ان کے مالکوں پر غلاموں کے حصہ کا یوں جزیہ نہیں کہ غلاموں کی وجہ سے ان پر جزیہ کا وجوب پہلے ہی زیادہ ہوتا ہے۔

مسئلہ: اگر ذمی جزیہ ادا کرنے یا اسلام کے کسی حکم کو ماننے سے انکار کر دے یا کسی مسلمان کو قتل کر دے یا مسلمانوں سے جنگ کرنے کیلئے لوگوں کو جمع کرے یا کسی مسلمان عورت سے زنا کرے یعنی نکاح (غیر شرعی) کر کے مسلمان عورت سے قربت کر لے یا کسی مسلمان کو اسلام کی طرف سے ورغلائے یا مسلمانوں کو راستہ میں لوٹ لے اور رہزنی کرے یا مشرکوں کیلئے جاسوسی کرے یا مسلمانوں کے خلاف کافروں کی راہنمائی کرے یا کافروں کو مسلمانوں کی خبریں پہنچائے اور مسلمانوں کے رازوں سے ان کو واقف کرے تو ظاہر روایت میں آیا کہ امام احمد کے نزدیک ایسے ذمی کا معاہدہ توڑ دیا جائے گا اور وہ ذمی نہیں رہے گا۔ عبدالرزاق نے بروایت ابن جریج بیان کیا ہے کہ دو کتابیوں نے ایک مسلمان عورت پر دست درازی کی تھی حضرت ابوعبیدہ بن جراح اور حضرت ابو ہریرہ نے ان کو قتل کر دیا۔

بیہقی نے شعبی کی روایت سے سوید بن غفلہ کا مقولہ نقل کیا ہے سوید کا بیان ہے ہم حضرت عمر کے پاس موجود تھے امیر المومنین اس زمانہ میں شام میں تھے اچانک ایک نبطی شخص فریاد کرتا آیا کسی نے اس کو مارا تھا۔ اور وہ چیخ رہا تھا حضرت عمر نے صہیب سے فرمایا جا کر دیکھو یہ حرکت کس نے کی صہیب نے جا کر دیکھا تو مارنے والے عوف بن مالک نظر آئے عوف کو لے کر صہیب امیر المومنین کے پاس آ گئے عوف نے کہا ایک مسلمان عورت (گدھے پر سوار جا رہی تھی اس) کو گدھے سے گرانے کیلئے اس شخص نے گدھے کو مارا لیکن جب عورت گدھے سے نہیں گری تو اس نے دھکا دے کر عورت کو گدھے سے گرا دیا اور اس پر چڑھ گیا اس لئے میں نے اس کے ساتھ وہ

سلوک کیا جو آپ کے سامنے ہے حضرت عمر نے (اس نبطی کی طرف خطاب کرتے ہوئے) فرمایا ان شرطوں پر تو ہم نے تم سے معاہدہ نہیں کیا ہے اس کے بعد آپ کے حکم سے اس شخص کو صلیب پر چڑھا دیا گیا۔ پھر حضرت عمر نے فرمایا لوگو! محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دیئے ہوئے ذمے کو پورا کرو لیکن جو شخص ان میں سے ایسی حرکت کرے اس کی ذمہ داری نہیں رہتی۔

ایک روایت میں امام احمد کا قول ہے کہ معاہدہ ذمیت کی شکست صرف اسی وقت کی جاسکتی ہے کہ ذمی ادا جزیہ سے یا ہمارے احکام کو ماننے وے انکار کردے۔

امام ابوحنیفہ نے فرمایا صرف اس صورت میں معاہدہ توڑا جاسکتا ہے کہ ذمی دارالحرب سے مل جائے یا اسکے پاس کوئی فوجی طاقت ہو جس کی وجہ سے وہ دارالاسلام کے کسی حصہ پر قابض ہوگیا ہو ان دونوں صورتوں میں وہ حربی ہو جائے گا ذمی نہ رہے گا باقی کسی صورت میں معاہدہ نہیں توڑا جاسکتا کیونکہ مسلمانوں کو قتال سے باز داشت یعنی کافروں کو قتل کرنے کی ممانعت اس بنیاد پر ہوتی ہے کہ کافر ادائے جزیہ کا وعدہ کر لیتے ہیں اور جزیہ کو اپنے اوپر لاگو مان لیتے ہیں (اس کے بعد ادا بھی کرتے ہیں یا نہیں یہ دوسری بات ہے) جزیہ ادا کرنا معاہدے کی بنیاد نہیں ہے اب اگر کوئی ذمی جزیہ نہیں دیتا اور اس کے پاس جنگی یا فوجی قوت بھی نہیں ہے تو اس نہ دینے کا اعتبار نہیں (ہم اس کو باغی یا حربی نہیں کہہ سکتے) امام المسلمین اس کو گرفتار کرا سکتا ہے اور مار سکتا ہے۔

مسئلہ: اللہ کی شان میں نازیبا الفاظ کہنے یا قرآن مجید یا دین اسلام کے متعلق نامناسب کلمات ادا کرنے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کی بابت ناشائستہ کلام کرنے سے امام احمدؒ کے نزدیک معاہدہ ذمیت ٹوٹ جاتا ہے خواہ معاہدہ کے وقت اس شرط کا تذکرہ آیا ہو (یا نہ آیا ہو)

کچھ یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے کہا السام علیک (آپ پر ہلاکت ہو) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا وعلیکم (اور تم پر بھی) حضرت عائشہ یہودیوں کے الفاظ (اور مطلب) سمجھ گئیں آپ نے فوراً یہودیوں کو جواب دیا علیکم السام واللعنۃ (تم پر ہلاکت اور لعنت ہو) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جواب سن کر فرمایا عائشہؓ نرمی کرو اللہ مہربان ہے ہر کام میں نرمی کو پسند فرماتا ہے حضرت عائشہؓ نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ نے ان کا قول نہیں سنا فرمایا میں نے بھی تو وعلیکم کہہ دیا۔ بعض روایات میں علیکم بغیر واو کے آیا ہے۔ بخاری ومسلم۔

شاتم رسول کی سزا: فتاویٰ میں امام اعظم کا مسلک یہ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دینے والا کوئی ہو مومن ہو یا کافر بہرحال اس کو قتل کر دیا جائے اس کی توبہ بھی قبول نہ کی جائے۔ اس قول کا مطلب صاف ہے کہ رسول اللہ کی شان میں نازیبا کلمات کہنے سے معاہدہ ذمیت ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کی تائید امام ابویوسف کی روایت سے بھی ہوتی ہے۔

اہل نجران سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معاہدہ

جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل نجران کیساتھ ایسا ہی معاملہ فرمایا کہ ان کی پوری جماعت سے سالانہ دو ہزار حلے دینے پر معاہدہ ہوگیا، حلہ دو کپڑوں کے جوڑے کو کہتے ہیں، ایک تہبند اور ایک چادر، ہر حلہ کی قیمت کا اندازہ بھی یہ طے کر دیا گیا تھا کہ ایک اوقیہ چاندی کی قیمت کا ہوگا، اوقیہ چالیس درہم یعنی ہمارے وزن کے اعتبار سے تقریباً ساڑھے گیارہ تولہ چاندی ہوتی ہے۔

بنی تغلب سے معاہدہ:

اسی طرح نصاریٰ بنی تغلب سے حضرت فاروق اعظمؓ کا اس پر معاہدہ ہوا کہ ان کا جزیہ اسلامی زکوٰۃ کے حساب سے وصول کیا جائے مگر زکوٰۃ سے دوگنا۔

مفتوحہ علاقہ کے باشندوں کا جزیہ:

اور اگر مسلمانوں نے کسی ملک کو جنگ کے ذریعہ فتح کیا، پھر وہاں کے باشندوں کی جائدادوں کو انہی کی ملکیت پر برقرار رکھا، اور وہ رعیت بن کر رہنے پر رضامند ہوگئے، تو ان کے جزیہ کی مقرر شرح یہ ہوگی جو حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے عہد خلافت میں نافذ فرمائی کہ سرمایہ دار متمول سے چار درہم اور متوسط الحال سے اس کا نصف صرف دو درہم اور غریب سے جو تندرست اور محنت مزدوری یا صنعت وتجارت وغیرہ کے ذریعہ کماتا ہے اس سے اس کا بھی آدھا صرف ایک درہم ماہوار یعنی ساڑھے تین ماشہ چاندی یا اس کی قیمت لی جائے، اور جو بالکل مفلس یا اپاہج یا معذور ہیں ان سے کچھ نہ لیا جائے۔ اسی طرح عورتوں بچوں اور بوڑھوں سے اور ان کے تارک الدنیا مذہبی پیشواؤں سے کچھ نہ لیا جائے۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

جزیہ وخراج: جزیہ اس مال اور محصول کو کہتے ہیں جو کافروں کے نفوس اور ان کی ذات پر لگایا جائے اور خراج اس محصول کو کہتے ہیں کہ جو کفار کی زمینوں پر لگایا جائے۔ یہ لفظ جزاء سے مشتق ہے یعنی جزیہ۔ قتل کی جزاء اور اس کا بدلہ ہے کہ تم مستحق تو قتل کے تھے۔ لیکن تمہارے ساتھ یہ رعایت کی گئی کہ تمہاری جان بخشی کر دی گئی اور دارالاسلام میں تم کو امن کے ساتھ رہنے کی اجازت دے دی گئی۔ نہ تم کو قتل کیا گیا اور نہ تم کو غلام بنایا گیا جیسے دیت سے قصاص ساقط ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جزیہ سے قتل اور استرقاق ساقط ہو جاتا ہے۔ (دیکھو روح المعانی ص۷۷، ج۱۰)

فقہاء کرام کی تصریحات سے یہ ثابت ہے کہ جزیہ قتل کی جزاء اور اسکا کاف یہ ہے حفاظت جان اور امن کا بدلہ اور فدیہ نہیں اس لئے کہ جزیہ صرف آزاد عاقل مردوں پر واجب ہوتا ہے جو لڑنے اور جنگ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں عورت اور بچے اور مجنون اور غلام راہب اور معذور پر جزیہ نہیں حالانکہ حفاظت ان کی بھی کی جاتی ہے۔ اور باوجود کفر کے ان

پر کوئی جزیہ نہیں اسلام میں جزیہ صرف ان لوگوں سے لیا جاتا ہے۔ جو مستحق قتل کے تھے معلوم ہوا کہ جزیہ قتل کا بدلہ اور اس کا فدیہ ہے نہ کہ امن اور حفاظت کا عوض اور بدل ہے چنانچہ فقہاء کرام لکھتے ہیں ھی لغة الجزاء لانها جزت عن القتل كذا فى الدر المختار۔

نیز زمین عرب مرکز اسلام ہے اور قلب اسلام ہے اس سرزمین میں کسی طرح بھی بت پرستی کی کوئی گنجائش نہیں۔ نیز آپ کی زندگی میں تمام قبائل عرب مسلمان ہو چکے تھے۔ پھر اگر بت پرستی ہو سکتی ہے تو صرف ارتداد سے ہو سکتی ہے اور مرتد باتفاق ائمہ دین جزیہ دے کر قتل سے نہیں بچ سکتا۔ (معارف کاندھلویؒ)

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ٌابْنُ اللّٰهِ
اور یہود نے کہا کہ عُزیر اللہ کا بیٹا ہے

یہودیوں کا عقیدہ: روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بعض یہود کا یہ عقیدہ تھا کہ حضرت عزیر خدا کے بیٹے ہیں لیکن یہ عقیدہ عام یہود کا نہ تھا۔ اور زمانہ مابعد میں تو بعض علماء نے لکھا ہے کہ اب کوئی یہودی اس عقیدہ کا باقی نہیں رہا۔ اگر عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں یہود کا کوئی فرقہ اس کا قائل نہ ہوتا تو ضرور تھا کہ اس وقت یہود قرآن کی حکایت کی تغلیط کرتے۔ جیسا کہ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کو سن کر عدی بن حاتم نے اعتراض کیا تھا کہ احبار و رہبان کو رب تو کوئی نہیں مانتا اس کا جواب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا جو آگے آتا ہے۔ پس ابنیت عزیر کے عقیدہ کو ان کی طرف نسبت کرنا، اور ان کا اعتراض و انکار کہیں منقول نہ ہونا اس کی دلیل ہے کہ ضرور اس وقت اس خیال کے لوگ موجود تھے۔ ہاں جیسے مرور دھور سے بہت سے مذاہب اور فرقے مٹ مٹا گئے، وہ بھی نابود ہو گیا ہو تو کچھ مستبعد نہیں۔ باقی ہم سے ایک نہایت ثقہ بزرگ (حاجی امیر شاہ خان مرحوم) نے بیان کیا کہ سیاحت فلسطین وغیرہ کے دوران میں مجھے بعض یہود اس خیال کے ملے جن کو اسی عقیدہ کی نسبت سے عزیری کہا جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانی)

یہودیوں نے حضرت عزیرؑ کو اللہ کا بیٹا کیسے بنایا:

روایت میں آیا ہے کہ ایک فرشتہ نے ایک برتن میں پانی ملا کر عزیرؑ کو پلا دیا پیتے ہی ساری توریت حضرت عزیر کے سینے میں نقش ہوگئی پھر جب حضرت عزیرؑ قوم کے پاس آئے اور ان سے کہا میں عزیر ہوں تو قوم نے تکذیب کی اور بولے اگر تم عزیر ہو تو توریت ہم کو لکھوا دو۔ حضرت عزیرؑ نے توریت لکھ دی پھر کچھ زمانے کے بعد ایک شخص نے کہا مجھ سے میرے باپ نے اپنے باپ کا مقولہ نقل کیا تھا کہ توریت کو ایک مٹکے میں رکھ کر انگور کی بیلوں (کی جڑ) میں دفن کر دیا گیا تھا (تاکہ بخت نصر کے حملہ کے وقت توریت کا ایک نسخہ محفوظ رہے) اس شخص کی اطلاع پر لوگ اس کے ساتھ مقررہ جگہ پر گئے اور وہ وہاں سے توریت نکال لائے جب اس قدیمی توریت کو حضرت عزیر کی لکھوائی ہوئی توریت سے مقابلہ کر کے دیکھا تو دونوں کو مطابق پایا ایک حرف بھی نہیں چھوٹا تھا اس پر کہنے لگے اللہ نے ایک شخص کے سینہ میں پوری توریت القاء کر دی اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ یہ شخص اللہ کا بیٹا ہے اسی وقت سے یہودی عزیر کو خدا کا بیٹا کہنے لگے۔ (تفسیر مظہری)

عبید بن عمیر نے کہا اس قول کا قائل صرف فنحاص بن عاذورا یہودی تھا (کوئی اور قائل نہ تھا) اسی نے ان الله فقير ونحن اغنياء بھی کہا تھا۔ بغوی نے عطیہ عوفی کی روایت سے حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا ہے کہ یہودیوں میں عزیر کو ابن اللہ ماننے کی بنیاد اس طرح پڑی کہ جب عزیر موجود تھے اور توریت بھی موجود تھی اور تابوت بھی یہودیوں کے پاس تھا تو یہودیوں نے توریت پر عمل چھوڑ دیا اور توریت کو انہوں نے کھو دیا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے توریت ان کے سینوں سے فراموش کرا دی اور تابوت کو اٹھا لیا یہ حالت دیکھ کر حضرت عزیرؑ سے صبر نہ ہو سکا اور انہوں نے اللہ سے دعا و زاری کی اللہ نے دعا قبول فرمالی اور ان کو توریت لوٹا کر عطا فرما دی (یعنی حضرت عزیر کو بھولی ہوئی توریت پھر یاد ہوگئی) حضرت عزیر نے بنی اسرائیل کو اطلاع عام دیدی اور فرمایا قول والو! اللہ نے توریت مجھے دوبارہ عنایت فرما دی لوگ یہ سن کر (ہر طرف سے) ان سے چمٹ گئے (اور یاد کرنے لگے) اس بات کو کافی عرصہ گذر گیا۔ پھر مدت کے بعد اللہ نے تابوت بھی نازل فرما دیا (تابوت کے اندر توریت بندھی) لوگوں نے حضرت عزیر کی تعلیم دی ہوئی توریت کی تابوت والی توریت سے تطبیق کر کے دیکھی تو ایک ہی طرح پایا یہ بات دیکھ کر کہنے لگے عزیر کو دوبارہ توریت عطا ہونے کی وجہ صرف یہ ہے کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے۔ (تفسیر مظہری)

وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ؕ
اور نصاریٰ نے کہا کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے
ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِـُٔوْنَ
یہ باتیں کہتے ہیں اپنے منہ سے ریس کرنے لگے
قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ
اگلے کافروں کی بات کی

یعنی "ابنیت" یا "الوہیت" مسیح وغیرہ کا عقیدہ پرانے مشرکین کے عقیدہ کے مشابہ ہے بلکہ ان ہی کی ایک تقلید میں یہ اختیار کیا ہے جیسا کہ سورۂ مائدہ کے فوائد میں ہم نقل کر چکے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

عیسائیوں نے ابنیت کا عقیدہ کیسے اختیار کیا:

وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ اور عیسائیوں نے کہا کہ مسیح خدا کا بیٹا ہے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ کے آسمان پر اٹھائے جانے کے بعد عیسائی اکیاسی برس تک اسلام پر قائم رہے قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے اور رمضان کے روزے رکھتے تھے۔ جب نصاریٰ اور یہود میں جنگ ہوئی تو ایک بہادر یہودی نے جس کا نام بولس تھا حضرت عیسیٰ کے چند صحابیوں کو شہید کر دیا پھر خود ہی یہودیوں سے کہنے لگا اگر عیسیٰ برحق تھا اور ہم اس کا انکار کر رہے ہیں تو لامحالہ ہم دوزخی ہوں گے اور عیسائی جنت میں جائیں گے اس طرح ہم گھاٹے میں رہیں گے اور عیسائی فائدہ میں (عیسائیوں کو کافر بنانے کی) میں ایک تدبیر کرتا ہوں تا کہ وہ بھی گمراہ ہو کر دوزخی ہو جائیں۔

ایک گھوڑا تھا جس کا نام عقاب تھا عقاب پر سوار ہو کر ہی وہ جنگ کرتا تھا بولس نے اس گھوڑے کی کونچیں کاٹ دیں اور (دکھاوٹ کے طور پر) ندامت کا اظہار کیا اور اپنے سر پر خاک ڈالتا عیسائیوں کے پاس پہنچا نصاریٰ نے پوچھا تو کون ہے بولا میں تمہارا دشمن بولس ہوں مجھے آسمان سے ایک ندا سنائی دی ہے کہ عیسائی ہوئے بغیر تیری توبہ قبول نہ ہوگی اس لئے میں نے یہودیت سے توبہ کر لی اور عیسائی ہو گیا عیسائی (اس کی باتوں میں آ گئے) اور گرجا میں لے گئے وہاں ایک برس تک وہ ایک کوٹھری سے باہر نہیں نکلا نہ دن کو نہ رات کو سال بھر میں انجیل سیکھ گیا۔ پھر باہر آیا اور بولا مجھے ندا آئی ہے کہ اب تیری توبہ قبول ہو گئی۔ عیسائیوں نے اس کی بات سچ مان لی اور اس سے محبت کرنے لگے۔ پھر بولس نسطورا کو ایک کمرے میں لے گیا اور عیسائیوں پر اس کو اپنا نائب بنا کر کہا کہ عیسیٰ اور مریم اور الٰہ تینوں (الوہیت کے عناصر) تھے اس کے بعد روم چلا گیا اور روم کے عیسائیوں کو لاہوت و ناسوت کی تعلیم دی (یعنی یہ کہا) کہ عیسیٰؑ (حقیقت میں) آدمی نہ تھے نہ جسم تھے ان کی یہ ظاہری انسانیت وجسمانیت تو عالم ناسوت تھی عالم لاہوت میں وہ اللہ کے بیٹے تھے۔ یہ عقیدہ اس نے ایک شخص کو سکھا کر رومیوں پر اپنا خلیفہ بنا دیا پھر ایک اور آدمی کو طلب کیا جس کا نام ملکا تھا اس کو تعلیم دی کہ اللہ ازلی ابدی ہے اور عیسیٰ بعینہ اللہ ہے جب تینوں کا عقیدہ الگ الگ مضبوط کر دیا تو ہر ایک کو الگ الگ تنہائی میں طلب کر کے کہا تو میرا مخصوص مقرب ہے میں نے عیسیٰ کو خواب میں دیکھا ہے وہ مجھ سے راضی ہیں۔ میں تو کل اپنے کو قربان کر دوں گا (اور عیسیٰ کے پاس چلا جاؤں گا) تم لوگوں کو اپنے عقیدہ اور مسلک کی تعلیم دینا۔ میں عیسیٰ کو خوش کرنے کیلئے اپنے آپ کو ذبح کر دوں گا اس کے بعد وہ ذبح خانہ (خودکشی کے مقام) میں چلا گیا۔ تیسرا دن ہوا تو تینوں میں سے ہر خلیفہ نے لوگوں کو اپنے مسلک کی دعوت دی ہر ایک کا ایک گروہ بن گیا اور تینوں گروہوں میں باہم اختلاف ہو گیا

اور آپس میں خوب قتل وقتال ہونے لگا۔ (تفسیر مظہری)

قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝
ہلاک کرے انکو اللہ کہاں سے پھرے جاتے ہیں

یعنی خدا ان کو غارت کرے توحید کی صاف اور تیز روشنی پہنچنے کے بعد کدھر اندھیرے میں چلے جا رہے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا
ٹھہرا لیا اپنے عالموں اور درویشوں کو
مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ
خدا اللہ کو چھوڑ کر

علماء ومشائخ کو خدا بنانا:

ان کے علماء ومشائخ جو کچھ اپنی طرف سے مسئلہ بنا دیتے خواہ حلال کو حرام یا حرام کو حلال کہہ دیتے اسی کو سند سمجھتے کہ بس خدا کے ہاں ہم کو چھٹکارا ہو گیا۔ کتب سماویہ سے کچھ سروکار نہ رکھا تھا۔ محض احبار و رہبان کے احکام پر چلتے تھے۔ اور ان کا یہ حال تھا کہ تھوڑا سا مال یا جاہی فائدہ دیکھا اور حکم شریعت کو بدل ڈالا جیسا کہ دو تین آدمیوں کے بعد مذکور ہے پس جو منصب خدا کا تھا (یعنی حلال وحرام کی تشریع) وہ علماء ومشائخ کو دیدیا گیا تھا۔ اس لحاظ سے فرمایا کہ انہوں نے عالموں اور درویشوں کو خدا ٹھہرالیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عدی بن حاتم کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے اسی طرح کی تشریح فرمائی ہے اور حضرت حذیفہ سے بھی ایسا ہی منقول ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں "عالم کا قول عوام کو سند ہے جب تک وہ شرع سے سمجھ کر کہے، جب معلوم ہوا کہ خود اپنی طرف سے کہا یا طمع وغیرہ سے کہا پھر سند نہیں" (تفسیر عثمانی)

رہبان (راہب کی جمع) گرجوں میں رہنے والے (تارک الدنیا) عیسائی (جیسے مسلمانوں میں خانقاہ نشین پیر اور درویش) رب قرار دینے سے یہ مراد ہے کہ وہ اللہ کی نافرمانی کرتے اور علماء وفقراء کے احکام کو مانتے ہیں۔ ترمذی نے صحیح میں اور بغوی نے حضرت عدی بن حاتم کا بیان نقل کیا ہے۔ عدی نے فرمایا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میرے گلے میں سونے کی ہلیب پڑی ہوئی تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عدی اس بت کو اپنی گردن سے نکال کر پھینک دے میں نے اتار دی۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا تو آپ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ پڑھ رہے تھے۔ پڑھ چکے تو میں نے عرض کیا ہم تو علماء واحبار کی پوجا نہیں کرتے تھے۔ فرمایا کیا ایسی بات نہ تھی کہ اللہ کی حلال کی ہوئی چیز کو جب علماء واحبار

حرام قرار دیتے تھے تو تم اس کو حرام سمجھتے تھے اور اللہ کی حرام کی ہوئی چیز کو جب وہ حلال قرار دیتے تھے تو تم اس کو حلال سمجھ لیتے تھے میں نے عرض کیا ایسا تو ضرور ہوتا تھا فرمایا یہی ان کی عبادت تھی۔ (تفسیر مظہری)

وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا

اور مسیح مریم کے بیٹے کو بھی اور ان کو حکم یہی ہوا تھا کہ

لِيَعْبُدُوا إِلَٰهًا وَاحِدًا ۖ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ

بندگی کریں ایک معبود کی کسی کی بندگی نہیں اُسکے سواء وہ

سُبْحَانَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿٣١﴾ يُرِيدُونَ

پاک ہے اُن کے شریک بتلانے سے چاہتے ہیں

أَن يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى

کہ بجھا دیں روشنی اللہ کی اپنے منہ سے اور اللہ نہ رہے گا

اللَّهُ إِلَّا أَن يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ﴿٣٢﴾

بدوں پورا کئے اپنی روشنی کے اور پڑے بُرا مانیں کافر

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا:

یعنی توحید خالص اور اسلام کا آفتاب جب چمک اٹھا پھر یہ دوغلی باتیں اور مشرکانہ دعاوی کہاں فروغ پاسکتے ہیں یہ کوشش کہ بے حقیقت اور بے مغز باتیں بنا کر اور فضول بحث وجدل کر کے نور حق کو مدھم کردیں ایسے ہی کہ کوئی بے وقوف منہ سے پھونکیں مار کر چاند اور سورج کی روشنی کو بجھانا اور ماند کرنا چاہے۔ یاد رکھو خواہ یہ کتنے ہی جلیں مگر خدا نو اسلام کو پوری طرح پھیلا کر رہیگا۔ (تفسیر عثمانی)

غلبۂ اسلام: بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ اور ضحاک نے کہا یہ بات حضرت عیسیٰ کے نزول کے وقت ہو جائے گی تمام مذاہب والے مسلمان ہو جائیں گے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی مرفوع روایت ہے کہ عیسیٰ کے زمانے میں تمام مذاہب برباد ہو جائیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ ظاہر یہ ہے کہ ظہور سے مراد ہے تمام مذاہب پر دین حق کا غلبہ کسی ایک زمانہ میں۔ حضرت مقداد کا بیان اس کی تائید کرتا ہے۔ (تفسیر مظہری)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تین پیشینگوئیاں:

حضرت عدیؓ فرماتے ہیں میرے پاس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے مجھ سے فرمایا اسلام قبول کر۔ تاکہ سلامتی ملے۔ میں نے کہا میں تو ایک دین کو مانتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تیرے دین کو تجھ سے زیادہ مجھے علم ہے۔ میں نے کہا سچ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بالکل سچ، کیا تو رکوسیہ میں سے نہیں ہے؟ کیا تو اپنی قوم سے ٹیکس وصول نہیں کرتا؟ میں نے کہا ہاں یہ تو سچ ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تیرے دین میں یہ تیرے لئے حلال نہیں۔ پس یہ سنتے ہی میں تو جھک گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں خوب جانتا ہوں کہ تجھے اسلام سے کون سی چیز روکتی ہے۔ سن صرف اسی ایک بات کی تجھے روک ہے کہ مسلمان بالکل ضعیف اور کمزور اور ناتواں ہیں تمام عرب انہیں گھیرے ہوئے ہیں۔ یہ پنپ نہیں سکتے۔ لیکن سن حیرہ کا تجھے علم ہے؟ میں نے کہا دیکھا تو نہیں لیکن سنا تو ضرور ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اللہ تعالیٰ اس امر دین کو پورا فرمائے گا یہاں تک کہ ایک سانڈنی سوار حیرہ سے چل بغیر کسی کی امن کے مکہ معظمہ پہنچے گا اور بیت اللہ شریف کا طواف کرے گا۔ واللہ تم کسریٰ کے خزانے فتح کرو گے۔ میں نے کہا کسرے بن ہرمز کے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں کسرے بن ہرمز کے، تم میں مال کی اس قدر کثرت ہو پڑے گی کہ کوئی لینے والا نہ ملے گا۔ اس حدیث کو بیان کرتے وقت حضرت عدیؓ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان پورا ہوا، یہ دیکھو آج حیرہ سے سواریاں چلتی ہیں بے خوف وخطر بغیر کسی کی پناہ کے بیت اللہ شریف پہنچ کر طواف کرتی ہیں۔ صادق ومصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری پیشگوئی بھی پوری ہوئی۔ کسرے کے خزانے فتح ہوئے میں خود اس فوج میں تھا جس نے ایران کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور کسرے کے مخفی خزانے اپنے قبضے میں کئے۔ واللہ مجھے یقین ہے کہ صادق ومصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کی تیسری پیشین گوئی بھی قطعاً پوری ہو کر ہی رہے گی۔ (ابن کثیر)

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ

اُسی نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت

وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ

اور سچا دین دے کر تاکہ اُس کو غلبہ دے ہر دین پر

وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ﴿٣٣﴾

اور پڑے بُرا مانیں مشرک

اسلام کا ہمہ جہتی غلبہ:

اسلام کا غلبہ باقی ادیان پر معقولیت اور حجت ودلیل کے اعتبار سے یہ تو ہر زمانہ میں بحمد اللہ نمایاں طور پر حاصل رہا ہے۔ باقی حکومت وسلطنت کے

اعتبار سے وہ اس وقت حاصل ہوا ہے اور ہوگا، جبکہ مسلمان اصول اسلام کے پوری طرح پابند اور ایمان وتقویٰ کی راہوں میں مضبوط اور جہاد فی سبیل اللہ میں ثابت قدم تھے یا آئندہ ہونگے۔ اور دین حق کا ایسا غلبہ کہ باطل ادیان کو مغلوب کر کے بالکل صفحہ ہستی سے محو کر دے۔ یہ نزول مسیح علیہ السلام کے بعد قریب قیامت کے ہونے والا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

ایمانداروں کا خاتمہ قیامت کی علامت ہے:

مسلم نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا رات ودن ختم نہ ہوں گے یہاں تک کہ (ایک زمانہ میں تمام دنیا میں) لات وعزیٰ کی پوجا ہونے لگے گی میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آیت هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ کے نزول کے بعد تو میرا خیال یہ تھا کہ یہ فیصلہ قطعی ہو چکا (آئندہ کبھی کفر کو غلبہ حاصل نہ ہوگا) فرمایا یہ (اسلام کا غلبہ) تو ہوگا اور جب تک اللہ چاہے گا رہے گا پھر ایک پاکیزہ ہوا چلے گی اور جس کے دل میں رائی برابر بھی ایمان ہوگا اس کی روح قبض ہو جائے گی اور سوائے اہل شر کے اور کوئی باقی نہ رہے گا سب لوگ اپنے اسلاف کے مذہب (شرک) کی طرف لوٹ جائیں گے۔ (تفسیر مظہری)

دو سپر طاقتیں: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سعادت میں روئے زمین پر دو سلطنتیں تھیں ایک ایران کی اور دوسری روم کی ان دونوں بادشاہوں کی سطوت جبروت نے تمام دنیا کو گھیر رکھا تھا۔ اور دوسرے مذاہب ان کی قوت کے سامنے مضمحل ہو رہے تھے۔ کسریٰ شاہ ایران مذہباً مجوسی تھا اور قیصر روم مذہباً عیسائی تھا دنیا میں عیسائیت اور مجوسیت یہی دو مذہب سب سے طاقتور تھے جن کو کسریٰ اور قیصر کی سرپرستی حاصل تھی اور انہیں کا دین تمام ادیان پر غالب تھا اور دیگر ادیان بمصداق الناس علیٰ دین ملوکھم مغلوب تھے۔ ملک عرب میں بت پرستی کا زور تھا اور کچھ قدر قلیل عیسائی اور یہود بھی تھے ان حالات میں اللہ کی طرف سے یہ آیت نازل ہوئی جس میں یہ بشارت دی گئی کہ دین اسلام تمام دینوں پر غالب ہو کر رہے گا۔

چنانچہ مقصد بعثت کی تکمیل ہوئی اور یہی خلافت خاصہ اور خلافت راشدہ ہے۔ یہ جو کچھ لکھا گیا یہ تمام تر حضرت شاہ ولی اللہؒ دہلوی قدس سرہ کے کلام کا خلاصہ ہے۔ جو ازالۃ الخفاء میں قلم حقائق رقم سے ظہور میں آیا ہے۔ (رحمۃ اللہ علیہ علی امر اللیالی والایام)

قیصر وکسریٰ کی شکست: حضرت عمر کے زمانے میں جب سلطنت قیصر مغلوب ہوئی تو گویا تمام ولایات فرنگ مغلوب ہو گئیں اس لئے کہ ولایات فرنگستان یعنی ریاستہائے انگلستان سب قیصر روم کے ماتحت تھیں۔ اور حضرت عثمان کے زمانے میں سلطنت کسریٰ کا نام ونشان بھی نہ رہا ۳۰ ھ میں کسریٰ مارا گیا اور مغرب کی جانب میں اسلامی سلطنت کی حدود اندلس اور قیروان اور بحر محیط تک پہنچی اور مشرق میں بلاد چین تک پہنچی اور مشارق اور مغارب سے مدینہ میں خراج آنے لگا اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو تمام دینوں پر غالب کیا۔ اور اپنا وعدہ پورا فرمایا۔

شیعوں کی پریشانی: شیعہ اس آیت کی تفسیر میں بہت حیران اور سرگرداں ہیں کبھی تو یہ کہتے ہیں کہ اظہار دین سے سیف وسنان کا غلبہ مراد نہیں بلکہ حجت اور برہان کا غلبہ مراد ہے اور کبھی یہ کہتے ہیں کہ یہ پیشین گوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں پوری ہو گئی۔

اور کشف الغمہ میں امام رضا سے منقول ہے لاایمان لمن لا تقیه فقیل یاابن رسول الله صلی الله علیه وسلم الی متی قال الیٰ وقت یوم معلوم وهوخروج قائمنا فمن ترک التقیة قبل خروج قائمنا فلیس منا اور جامع الاخبار میں ہے قال النبی صلی الله علیه وسلم تارک التقیة کتارک الصلوٰة

الغرض شیعوں کے نزدیک بغیر تقیہ کے ایمان ناتمام رہتا ہے اور تارک تقیہ بمنزلہ تارک صلاۃ کے ہے۔ تو حضرات شیعہ بتلائیں کہ پھر دین کا اظہار اور اعلان اور دعوت اور تبلیغ کی کیا صورت ہے۔

نیز کافروں سے خوف کی صورت میں ہجرت واجب ہے آیات قرآنیہ اس بات کے بیان سے بھری پڑی ہیں کہ جہاں اظہار حق اور دین پر عمل ممکن نہ ہو تو وہاں سے ہجرت کر جائیں اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَةٌ فَاِیَّایَ فَاعْبُدُوْنِ یعنی میری زمین وسیع ہے کہیں چلے جاؤ اور جا کر میری عبادت کرو۔

شیعوں کے نزدیک حضرت علی پر ہجرت واجب تھی کہ کافروں اور منافقوں کو چھوڑ کر کہیں چلے جاتے ساری عمر تقیہ ہی میں گزاری اور ہجرت نہ کی۔

ہم خاکپائے غلامان اہل بیت کا عقیدہ یہ ہے کہ معاذ اللہ معاذ اللہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کبھی تقیہ نہیں فرمایا ان کا ظاہر وباطن یکساں تھا وہ اسد اللہ الغالب تھے کہ وہ صاحب شجاعت تھے صاحب کرامت تھے مرکز کرامات وولایت تھے انہیں تقیہ کی کیا ضرورت تھی تقیہ تو کمزور اور خوف زدہ آدمی کیا کرتا ہے معلوم ہوا کہ حضرت امیر نے تمام زندگی جو خلفائے ثلثہ کے ساتھ معاملہ رکھا وہ عین حقیقت اور عین مودت تھا معاذ اللہ محض ظاہر داری نہ تھی بفرض محال اگر خلفائے ثلاثہ کا کچھ ڈر تھا تو وہ ان کی زندگی تک تھا۔ اور جب ابوبکر وعمر دنیا سے چلے گئے تو پھر کس چیز کا ڈر تھا کہ جو برسر منبر اپنے زمانہ خلافت میں ابوبکرؓ وعمرؓ کی فضیلت اور منقبت کو بیان فرماتے تھے۔

نیز اگر حضرت امیر نے ابوبکر وعمرؓ کے ساتھ تقیہ کیا تو امیر معاویہ کے

ساتھ تقیہ کیوں نہ کرلیا۔ اگر حضرت معاویہ کے ساتھ تقیہ کر لیتے تو بہت سے بہت یہ ہوتا کہ قاتلین عثمانؓ مارے جاتے تو وہ کونسے آپ کے عزیز و اقارب تھے جن کا آپ کو اس قدر پاس ولحاظ تھا۔ حضرت سید الشہداءؓ نے تو اپنے اہل وعیال اور لخت جگر کو اس دین کی بابت قتل کرادیا اور اپنے آپ بھی جان بحق ہوئے اور زن و فرزند اور ننگ و ناموس کا کچھ بھی لحاظ نہ فرمایا سید الشہداءؓ نے یہ سب کچھ گوارا کیا مگر یزید کے مقابلہ میں تقیہ کو گوارا نہیں فرمایا۔

حضرت امیر اگر قاتلان عثمان کو امیر معاویہ کے حوالے کردیتے تو خلافت تو بنی رہتی۔ اور باغی اور مفسد لوگ سب ہی آپ کے مطیع اور فرمانبردار ہو جاتے۔ اور دین کی ترقی ہوتی اور بایں ہمہ کچھ ہی سہی آخر قاتلان حضرت عثمان ظالم تھے اور مظلوم نہ تھے۔ اور ہمراہیان اور امام الشہداءؓ کے برابر بے گناہ بھی نہ تھے۔

حضرت علیؓ کی تقیہ سے براءت:

اس لئے تمام اہل سنت کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف تقیہ کی نسبت یہ سب شیعوں کی تہمت ہے سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ

ہم غلامان اہل بیت کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت علی بلاشبہ شیر خدا تھے اور خدا کے محب اور محبوب تھے۔ یہ ناممکن ہے کہ وہ کفار اور منافقین کے سامنے دب کر رہیں۔ اور ان کی خوشامد کرتے رہیں اور خوشامد میں اپنی بیٹی (ام کلثوم) (عمرؓ) کو دیدیں۔ یہ سب ناممکن اور محال ہے

اند کے پیش تو گفتم غم دل ترسیدم کہ آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

(معارف القرآن کاندھلویؒ)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ
اے ایمان والو بہت سے عالم
وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ
اور درویش اہل کتاب کے کھاتے ہیں مال لوگوں کے
بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
ناحق اور روکتے ہیں اللہ کی راہ سے

دُنیا پرست علماء ومشائخ:

یعنی روپیہ لے کر احکام شرعیہ اور اخبار الٰہیہ کو بدل ڈالتے ہیں ادھر عوام الناس نے انہیں جیسے پہلے گذرا خدائی کا مرتبہ دے رکھا ہے جو کچھ غلط سلط کہہ دیں وہ ہی ان کے نزدیک حجت ہے۔ اس طرح یہ علماء ومشائخ نذرانے وصول کرنے، ٹکے بٹورنے اور اپنی سیادت وریاست قائم رکھنے کیلئے عوام کو مکروفریب کے جال میں پھنسا کر راہ حق سے روکتے رہتے ہیں کیونکہ عوام اگر ان کے جال سے نکل جائیں اور دین حق اختیار کرلیں تو ساری آمدنی بند ہو جائے۔ یہ حال مسلمانوں کو سنایا تاکہ متنبہ ہو جائیں کہ امتوں کی خرابی اور تباہی کا بڑا سبب تین جماعتوں کا خراب و بے راہ ہونا اور اپنے فرائض کو چھوڑ دینا ہے۔ علماء ومشائخ اور اغنیاء ورؤساء۔ ان میں سے دو کا ذکر تو ہو چکا تیسری جماعت (رؤساء) کا آگے آتا ہے۔ ابن المبارکؒ نے خوب فرمایا وھل افسدالدین الا الملوک واحبار سوء ورھبا نھا۔ (تفسیر عثمانی)

ائمہ مجتہدین کا اتباع:

اس سے معلوم ہوا کہ مسائل دین سے ناواقف عوام کے لئے علماء کے فتویٰ کا اتباع یا اجتہادی مسائل میں ائمہ مجتہدین کا اتباع اس کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ یہ اتباع درحقیقت خدا ورسول ہی کے احکام کا اتباع ہوتا ہے اہل علم ونظر براہ راست اللہ ورسول کے کلام کو دیکھ کر اس پر عمل کرتے ہیں، اور ناواقف عوام اہل علم سے پوچھ کر انہی احکام پر عمل کرتے ہیں اور اہل علم جو درجہ اجتہاد کا نہیں رکھتے وہ بھی اجتہادی مسائل میں ائمہ مجتہدین کا اتباع کرتے ہیں، یہ اتباع خود قرآن کریم کے حکم کے مطابق ہے اور حق تعالیٰ ہی کی اطاعت ہے جیسا کہ ارشاد ہے: فَسْئَلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ "یعنی اگر تم خود احکام خدا ورسول سے واقف نہیں تو اہل علم سے پوچھ کر عمل کیا کرو"

یہود ونصاریٰ کے عوام نے کتاب اللہ اور احکام خدا ورسول کو بالکل نظر انداز کر کے خود غرض پیشہ ور علماء یا جاہل عبادت گذاروں کے قول وعمل ہی کو اپنا دین بنالیا تھا۔ (معارف مفتی اعظم)

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ
اور جو لوگ گاڑھ کر رکھتے ہیں سونا اور چاندی
وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ
اور اُس کو خرچ نہیں کرتے اللہ کی راہ میں سواُن کو خوشخبری سُنا
بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۴﴾
دے عذاب دردناک کی

سرمایہ پرستوں کا انجام:

جولوگ دولت اکٹھی کریں خواہ حلال طریقہ سے ہو مگر خدا کے راستہ میں خرچ نہ کریں (مثلاً زکوۃ نہ دیں اور حقوق واجبہ نہ نکالیں) ان کی یہ سزا ہے تو اسی سے ان احبار ورہبان کا انجام معلوم کرلو جو حق کو چھپا کر یا بدل کر روپیہ بٹورتے

ہیں۔ اور ریاست قائم رکھنے کی حرص میں عوام کو خدا کے راستہ سے روکتے پھرتے ہیں بہر حال دولت وہ اچھی ہے جو آخرت میں وبال نہ بنے۔ (تفسیر عثمانی)

نکتہ: سونے اور چاندی کو ساتھ ساتھ ذکر کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ تعیین نصاب کے لئے ایک کو دوسرے کے ساتھ ملایا جاسکتا ہے۔ اور ملانے کے بعد ایک نصاب بنا کر اس کی زکوۃ ادا کی جائے ملانے کی صورت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک قیمت کا حساب لگالینا ہے۔ اگر مجموعی قیمت بقدر نصاب ہو جائے تو زکوۃ ادا کی جائے۔

زیادہ ثواب والا دینار:

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک وہ دینار ہے جس کو تو راہ خدا (جہاد) میں خرچ کرے۔ ایک وہ دینار ہے جو تو کسی غلام (کی آزادی) کیلئے صرف کرے، ایک وہ دینار ہے جو تو کسی مسکین کو خیرات کرے، ایک وہ دینار ہے جو تو اپنے بال بچوں کے (ضروری) صرف میں لائے ان میں سب سے زیادہ ثواب والا وہ دینار ہے جو تو اپنے بال بچوں کے (ضروری) صرف میں لائے۔ (صحیح مسلم)

حضرت ثوبان راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (اجر و ثواب میں) سب سے بڑھ کر وہ دینار ہے جو آدمی اپنے بال بچوں کے (ضروری) مصارف میں لاتا ہے اور وہ دینار ہے جو راہ خدا میں کسی سواری کے صرف میں لاتا ہے اور وہ دینار ہے جو جہاد کے موقع پر کسی ساتھی کیلئے خرچ کرتا ہے۔

حضرت ام سلمہ کا بیان ہے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوسلمہ (سابق شوہر) کے بچے جو میرے بھی بچے ہیں اگر میں ان کیلئے کچھ خرچ کروں تو کیا مجھے ثواب ملے گا۔ فرمایا ان کیلئے خرچ کرو جو کچھ ان کے لئے خرچ کرو گی اس کا ثواب پاؤ گی۔ (بخاری ومسلم)

دُوہرا اجر: حضرت ابن مسعود کی بیوی زینب کا بیان ہے کہ میں نے اور ایک عورت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا ہم اگر اپنے شوہروں کو کچھ خیرات دیں تو کیا ہم کو اس کا ثواب ملے گا فرمایا دوہرا اجر ملے گا۔ خیرات کا اور رشتہ (نوازی) کا۔ (بخاری ومسلم)

گھاٹا پانے والے: بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جو حاجت سے زائد ہو وہ کنز ہے، کیونکہ حضرت ابوذرؓ کا بیان ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کے سایہ میں بیٹھے ہوئے تھے مجھے دیکھ کر فرمایا رب کعبہ کی قسم وہ بہت گھاٹا پانے والے ہیں۔ میں نے عرض کیا میرے ماں باپ قربان کون لوگ فرمایا بڑے مالدار سوائے ان (مالداروں) کے جو اس طرح اور اس طرح دیتے ہیں۔ (یعنی) آگے سے پیچھے اور دائیں بائیں سے (لٹاتے ہیں) اور ایسے لوگ بہت کم ہیں۔ (صحیح مسلم وصحیح بخاری تفسیر مظہری)

سرمایہ پرستی سے بچنے کی دُعاء:

حسان بن عطیہؒ کہتے ہیں کہ حضرت شداد ابن اوسؓ ایک سفر میں تھے ایک منزل میں اترے اور اپنے غلام سے فرمایا کہ چھری لاؤ کھیلیں مجھے برا معلوم ہوا آپ نے افسوس ظاہر کیا اور فرمایا میں نے تو اسلام کے بعد سے اب تک ایسی بے احتیاطی کی بات کبھی نہیں کہی تھی اب تم اسے بھول جاؤ۔ اور ایک حدیث بیان کرتا ہوں اسے یاد رکھ لو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب لوگ سونا چاندی جمع کرنے لگیں تم ان کلمات کو بکثرت کہا کرو۔ **اللھم انی اسئلک الثبات فی الامر والعزیمة علی الرشد واسئلک شکر نعمتک و اسئلک حسن عبادتک و اسئلک قلبا سلیماً واسئلک لسانا صادقا واسئلک من خیر ماتعلم واعوذ بک من شر ماتعلم واستغفرک لما تعلم انک انت علام الغیوب**، یعنی یا اللہ! میں تجھ سے کام کی ثابت قدمی اور بھلائیوں کی پختگی اور تیری نعمتوں کا شکریہ اور تیری عبادتوں کی اچھائی اور سلامتی والا دل اور سچی زبان اور تیرے علم میں جو بھلائی ہے وہ اور تیرے علم میں جو برائی ہے اس سے پناہ اور جن کی برائیوں کو تو جانتا ہے ان سے استغفار طلب کرتا ہوں میں مانتا ہوں کہ تو تمام غیب کا جاننے والا ہے۔

مال اژدھا بن جائے گا:

حضرت طاؤسؒ فرماتے ہیں کہ اس کا مال ایک اژدہا بن کر اس کے پیچھے لگے گا جو عضو سامنے آجائے گا اسی کو چبا جائیگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جو اپنے بعد خزانہ چھوڑ جائے اس کا وہ خزانہ قیامت کے دن زہریلا اژدہا بن کر جس کی آنکھوں پر نقطے ہوں گے اس کو پیچھے لگے گا یہ بھاگتا ہوا پوچھے گا کہ تو کون ہے؟ وہ کہے گا تیرا جمع کردہ اور مرنے کے بعد چھوڑا ہوا خزانہ۔ آخر اسے پکڑ لے گا اور اس کا ہاتھ چبا جائے گا پھر باقی جسم بھی۔ صحیح مسلم وغیرہ میں ہے کہ جو شخص اپنے مال کی زکوۃ نہ دے اس کا مال قیامت کے دن آگ کی تختیوں جیسا بنا دیا جائے گا اور اس سے اس کی پیشانی پہلو اور کمر داغی جائے گی۔ پچاس ہزار سال تک لوگوں کے فیصلے ہو جانے تک تو اس کا یہی حال رہے گا پھر اسے اس کی منزل کی راہ دکھادی جائے گی جنت کی طرف یا جہنم کی طرف الخ۔

حضرت ابوذرؓ کی رائے اور عمل:

امام بخاریؒ اسی آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ زید بن وہبؒ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے ربذہ میں ملے اور دریافت کیا کہ تم یہاں کیسے آگئے ہو؟ آپؓ نے فرمایا ہم شام میں تھے وہاں میں نے آیت والذین یکنزون الخ کی تلاوت کی تو (حضرت) معاویہؓ نے فرمایا یہ آیت ہم مسلمانوں کے بارے میں نہیں یہ تو اہل کتاب کے بارے میں ہے۔ میں نے کہا ہمارے اور ان کے سب کے حق میں ہے۔ اس میں میرا ان کا اختلاف ہو گیا انہوں نے میری شکایت کا خط دربار عثمانی

میں لکھا، خلافت کا فرمان میرے نام آیا کہ تم یہاں چلے آؤ۔ میں جب مدینہ طیبہ پہنچا تو دیکھا کہ چوطرف سے مجھے لوگوں نے گھیر لیا اس طرح بھیڑ لگ گئی کہ گویا انہوں نے اس سے پہلے مجھے دیکھا ہی نہ تھا۔ غرض میں مدینہ شریف میں ٹھہرا لیکن لوگوں کی آمد ورفت سے تنگ آ گیا۔ آخر میں نے (حضرت) عثمان رضی اللہ عنہ سے شکایت کی تو آپ نے مجھے فرمایا کہ تم مدینہ شریف کے قریب ہی کسی صحرا میں چلے جاؤ میں نے اس حکم کی بھی تعمیل کی۔ (تفسیر ابن کثیر)

لیکن یہ کہہ دیا کہ واللہ جو میں کہتا تھا اسے ہرگز نہیں چھوڑ سکتا۔ آپ کا یہ خیال تھا کہ بال بچوں کے کھلانے کے بعد جو بچے اسے جمع کر رکھنا مطلقا حرام ہے۔ اسی کا آپ فتویٰ دیتے تھے اور اسی بات کو لوگوں میں پھیلاتے تھے اور لوگوں کو بھی اس پر آمادہ کرتے تھے اسی کا حکم دیتے تھے اور اس کے مخالف لوگوں پر بڑا ہی تشدد کرتے تھے۔ حضرت معاویہؓ نے آپ کو روکنا چاہا کہ کہیں لوگوں میں عام ضرر نہ پھیل جائے یہ نہ مانے تو آپ نے خلافت سے شکایت کی۔ امیر المؤمنینؓ نے انہیں بلا کر ربذہ میں تنہا رہنے کا حکم دیا۔ آپ وہیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ہی رحلت فرما گئے۔ حضرت معاویہؓ نے بطور امتحان ایک مرتبہ ان کے پاس ایک ہزار اشرفیاں بھجوائیں آپ نے شام سے پہلے ہی سب ادھر ادھر راہ للہ خرچ کر ڈالیں۔ شام کو وہی صاحب جو انہیں صبح کو ایک ہزار اشرفیاں دے گئے تھے وہ آئے اور کہا مجھ سے غلطی ہوگئی امیر معاویہؓ نے وہ اشرفیاں اور صاحب کے لئے بھجوائی تھیں میں نے غلطی سے آپ کو دے دیں وہ واپس کیجئے۔ آپؓ نے فرمایا تم پر افسوس ہے میرے پاس تو اب ان میں سے ایک پائی بھی نہیں اچھا جب میرا مال آ جائیگا تو میں آپ کو آپ کی اشرفیاں واپس کر دوں گا۔

ایک مرتبہ حضرت ابوذرؓ کو ان کا حصہ ملا آپ کی لونڈی نے اسی وقت ضروریات کو فراہم کرنا شروع کیا۔ سامان کی خرید کے بعد سات بچ رہے حکم دیا کہ اس کے فلوس لے لو۔ (تفسیر ابن کثیر)

زکوٰۃ دینے کے بعد مال کنز نہیں:

حدیث میں خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس مال کی زکوۃ ادا کر دی جائے وہ کنز تم میں داخل نہیں۔ (ابوداؤد، احمد وغیرہ) (معارف مفتی اعظمؒ)

يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى
جس دن کہ آگ دہکائینگے اُس مال پر دوزخ کی پھر داغیں گے
بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ
اُس سے اُن کے ماتھے اور کروٹیں اور پیٹھیں (کہا جائیگا)

هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ
یہ ہے جو تم نے گاڑھ کر رکھا تھا اپنے واسطے اب مزہ چکھو اپنے
تَكْنِزُوْنَ ﴿۳۵﴾
گاڑھنے کا

بخیل مالدار کی سزا: بخیل دولت مند سے جب خدا کے راستہ میں خرچ کرنے کو کہا جائے تو اس کی پیشانی پر بل پڑ جاتے ہیں زیادہ کہو تو اعراض کر کے ادھر سے پہلو بدل لیتا ہے۔ اگر اس پر بھی جان نہ بچی تو پیٹھ پھیر کر چل دیتا ہے۔ اس لئے سونا چاندی تپا کر ان ہی تین موقعوں (پیشانی) پہلو پیٹھ پر داغ دیے جائیں گے تا کہ اس کے جمع کرنے اور گاڑنے کا مزہ چکھ لے۔ (تفسیر عثمانی)

مال کا حق ادا نہ کرنے کی سزا:

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو سونے چاندی کا مالک اس کا حق (زکوۃ) ادا نہ کرے گا قیامت کے دن اس سونے چاندی سے اس کیلئے آگ کی چٹانیں بنائی جائیں گی اور دوزخ کی آگ میں ان کو دہکا کر اس شخص کے پہلو پیشانی اور پشت پر داغ لگائے جائیں گے جب وہ کچھ ٹھنڈی پڑ جائیں گی تو دوبارہ تپا کر داغ لگائے جائیں گے اور ایسا اس (پورے) دن ہوتا رہے گا، جس کی مقدار پچاس ہزار برس ہوگی، آخر جب بندوں کا فیصلہ ہو چکے گا تو اس شخص کو اس کا راستہ بتا دیا جائے گا جنت کو جانے والا یا دوزخ کو جانے والا۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اونٹوں کا کیا حکم ہے فرمایا اور جو اونٹوں والا ان کا حق (یعنی زکوۃ) ادا نہ کرے گا اور پانی پلانے کے دن ان کو دوہنا (اور دودھ میں سے مساکین کو دینا بھی) منجملہ حقوق کے ہے۔ قیامت کے دن ایک ہموار میدان میں اونٹوں کے سامنے اس کو لٹایا جائے گا اونٹ سب موجود ہوں گے ایک بچہ بھی کم نہ ہوگا، یہ اونٹ اپنے موزوں (یعنی کھروں) سے اس کو روندیں گے اور منہ سے کاٹیں گے اول حصہ جب روندتا چلا جائے گا تو پچھلا حصہ پھر (روندنے کیلئے) لوٹ پڑے گا۔ (یعنی روندنے کا سلسلہ نہ ٹوٹے گا) ایسا اس (پورے) دن ہوتا رہے گا جس کی مقدار پچاس ہزار برس ہوگی۔ آخر جب بندوں کا فیصلہ ہو چکے گا تو اس کو اس کا راستہ بتا دیا جائے گا جنت کی طرف یا دوزخ کی طرف۔ عرض کیا گیا گائے بھینس اور بھیڑ بکریوں کا کیا حکم ہے۔ فرمایا ان کا مالک اگر حق ادا نہ کرے گا تو ہموار میدان میں ان جانوروں کے سامنے اس کو پچھاڑ کر لٹایا جائے گا سب جانور موجود ہوں گے کوئی غیر حاضر نہ ہوگا۔ ان میں کوئی ایسا نہ ہوگا کہ اس کے سینگ پیچھے کو مڑے ہوئے ہوں نہ کوئی جانور منڈا ہوگا، نہ سینگ ٹوٹا ہوا (سب

کے سینگ نوک دار آگے کی طرف ہوں گے) یہ تمام جانور اس شخص کو اپنے سینگوں سے ماریں گے اور کھروں سے روندیں گے اول حصہ گزرتا جائے گا اور پچھلا حصہ لوٹ کر آتا جائے گا۔ یہ عذاب اس (پورے) دن ہوتا رہے گا جس کی مقدار پچاس ہزار برس ہوگی آخر جب لوگوں کا فیصلہ ہو چکے گا تو اس کو اس کا راستہ دکھا دیا جائے گا جنت کا یا دوزخ کا۔ (رواہ مسلم)

یہ حدیث گویا آیت کی تفسیر ہے اس میں اس امر کی صراحت ہے کہ وہ کنز جس کو تپا کر داغ دیئے جائیں گے اس سے مراد وہ کنز ہے جس کی زکوۃ ادا نہ کی گئی ہو۔ (معارف مفتی اعظم)

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا
مہینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک بارہ مہینے ہیں
فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ
اللہ کے حکم میں جس دن اُس نے پیدا کئے تھے آسمان اور زمین
مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ
اُن میں چار مہینے ہیں ادب کے یہی ہے سیدھا دین

اہل کتاب اور مشرکین میں مشابہت:

میرے نزدیک اوپر سے سلسلہ مضمون کا یوں ہے کہ گذشتہ رکوع میں مشرکین کے بعد اہل کتاب (یہود ونصاری) سے جہاد کرنے کا حکم دیا۔ پھر رکوع حاضر کے شروع میں بتلایا کہ ان کے عقائد اور طور وطریق بھی مشرکین سے ملتے جلتے ہیں۔ ان کا عزیر و مسیح کو خدا کا بیٹا کہنا ایسا ہی ہے جیسے مشرکین "ملائکۃ اللہ" کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے، بلکہ نصاری میں "ابنیت مسیح" کا عقیدہ مشرکین کی تقلید سے آیا ہے۔ وہ بتوں کو خدائی کا درجہ دیتے ہیں انہوں نے مسیح وروح القدس کو خدا ٹھہرالیا۔ باوجود دعوائے کتاب کے احبار و رہبان کے احکام کو شریعت الٰہیہ کا بدل تجویز کرلیا۔ یعنی احبار و رہبان رشوتیں لے کر اور حرام مال کھا کر جس چیز کو حلال یا حرام کر دیتے۔ احکام سماوی کی جگہ ان ہی کو قبول کرلیا جاتا۔ ان کا یہ طریقہ ٹھیک مشرکین کے طریقہ سے مشابہ ہے۔ ان کے سرگروہ بھی جس چیز کو چاہتے حلال وحرام ٹھہرا کر خدا کی طرف نسبت کر دیتے تھے جس کا ذکر "انعام" میں مفصل گذر چکا اور یہاں بھی اس کی ایک مثال بیان کی جاتی ہے۔ عرب میں قدیم سے معمول چلا آتا تھا کہ سال کے بارہ "مہینوں میں سے چار مہینے" "اشہر حرم" (خاص ادب واحترام کے مہینے) میں ذوالعقدہ، ذوالحجہ، محرم، رجب ان میں خونریزی اور جدال وقتال قطعا بند کر دیا جاتا تھا۔ حج وعمرہ اور تجارتی کاروبار کے لئے امن وامان کے ساتھ آزادی سے سفر کر سکتے تھے۔ کوئی شخص ان ایام میں اپنے باپ کے قاتل سے بھی تعرض نہ کرتا تھا۔ بلکہ بعض علماء نے لکھا ہے کہ اصل ملت ابراہیمی میں یہ چار ماہ "اشہر حرم" قرار دیئے گئے تھے۔

نسیئ کی رسم: اسلام سے ایک مدت پہلے جب عرب کی وحشت وجہالت حد سے بڑھ گئی اور باہمی جدال وقتال میں بعض بعض قبائل کی درندگی اور انتقام کا جذبہ کسی آسمانی یا زمینی قانون کا پابند نہ رہا تو "نسی" کی رسم نکالی یعنی جب کسی زور آور قبیلہ کا ارادہ ماہ محرم میں جنگ کرنے کا ہوا تو ایک سردار نے اعلان کر دیا کہ امسال ہم نے محرم کو اشہر حرم سے نکال کر اس کی جگہ صفر کو حرام کر دیا۔ پھر اگلے سال کہہ دیا کہ اس مرتبہ حسب دستور قدیم محرم حرام اور صفر حلال رہیگا۔ اس طرح سال میں چار مہینوں کی گنتی تو پوری کر لیتے تھے لیکن ان کی تعیین میں حسب خواہش ردوبدل کرتے رہتے تھے۔ ابن کثیر کی تحقیق کے موافق "نسی" (مہینہ آگے پیچھے کرنے) کی رسم صرف محرم وصفر میں ہوتی تھی۔ اور اس کی وہ ہی صورت تھی جو اوپر مذکور ہوئی۔ امام مغازی محمد ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ پہلا شخص جس نے یہ رسم جاری کی قلمس کنانی تھا۔ پھر اس کی اولاد در اولادیوں ہی ہوتا چلا آیا۔ آخر میں اسی کی نسل سے "ابوثمامہ جنادہ بن عوف کنانی کا معمول تھا کہ ہر سال موسم حج میں اعلان کیا کرتا کہ امسال محرم اشہر حرم میں داخل رہیگا یا صفر۔ اسی طرح محرم وصفر میں سے ہر مہینہ کبھی حلال اور کبھی حرام کیا جاتا تھا۔ اور عام طور پر لوگ اسی کو قبول کر لیتے تھے۔

حلال وحرام کرنے کا حق:

گویا عہد جاہلیت میں کافروں کے کفر وگمراہی کو بڑھانے والی ایک چیز یہ بھی تھی کہ خدا کے حلال یا حرام کئے ہوئے مہینہ کو بدل ڈالنے کا حق کنانہ کے ایک سردار کو سونپ دیا گیا تھا۔ ٹھیک اسی طرح یہود ونصاری کا حال تھا کہ انہوں نے تحلیل وتحریم کی باگ طامع اور غرض پرست احبار و رہبان کے ہاتھ میں دیدی تھی۔ دونوں جماعتوں کی مشابہت ظاہر کرنے کیلئے "نسی" کی رسم کا یہاں ذکر کیا گیا اور اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ الخ اس کے رد کی تمہید ہے۔ یعنی آج سے نہیں جب سے آسمان وزمین پیدا کئے خدا کے نزدیک بہت سے احکام شرعیہ جاری کرنے کیلئے سال کے بارہ مہینے رکھے گئے ہین جن میں سے چار اشہر حرم (ادب کے مہینے) ہیں۔ جن میں گناہ وظلم سے بچنے کا اور زیادہ اہتمام کرنا چاہیے۔ یہ ہی سیدھا دین (ابراہیم علیہ السلام کا) ہے۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت قتادہؒ کا قول ہے کہ ان حرمت والے مہینوں میں گناہ کی سزا اور بوجھ بڑھ جاتا ہے گو ظلم ہر حال میں بری چیز ہے لیکن اللہ تعالیٰ اپنے جس امر کو چاہے بڑھا دے۔

اللہ تعالیٰ کی منتخب چیزیں:

دیکھئے اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے بھی پسند فرمایا فرشتوں میں

انسانوں میں اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم چن لئے اسی طرح کلام میں سے اپنے ذکر کو پسند فرمالیا اور زمین میں سے مسجدوں کو پسند فرمالیا اور مہینوں میں سے رمضان شریف کو اور ان چاروں مہینوں کو پسند فرمالیا اور دنوں میں سے۔ جمعہ کے دن کو اور راتوں میں سے لیلۃ القدر کو پس تمہیں ان چیزوں کی عظمت کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ جنہیں خدا نے عظمت دی ہے۔ امور کی تعظیم اتنی کرنی عقل مند اور فہیم لوگوں کے نزدیک ضروری ہے جتنی تعظیم ان کی اللہ تعالیٰ سبحانہ نے بتلائی ہو۔ ان کی حرمت کا ادب نہ کرنا حرام ہے۔ ان میں جو کام حرام ہیں انہیں حلال نہ کرلو جو حلال ہیں انہیں حرام نہ بنالو جیسے کہ اہل شرک کرتے تھے یہ ان کے کفر میں زیادتی کی بات تھی۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

قربانی کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خطاب:

صحیحین میں حضرت ابوبکر کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کے دن (۱۰ ذی الحجہ کو) خطاب کیا اور فرمایا زمانہ چکر کاٹ کر اسی ہیئت پر آ گیا ہے جس ہیئت پر آسمان و زمین کی پیدائش کے دن تھا سال بارہ مہینے کا ہے جن میں سے چار حرمت والے مہینے ہیں تین پے در پے ذیقعدہ ذی الحجہ محرم اور (ایک) رجب مضر جو جمادی (الثانیہ) اور شعبان کے درمیان ہوتا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ کون سا مہینہ ہے ہم نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی خوب واقف ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر خاموش رہے ہم نے خیال کیا شاید اس مہینہ کا نام کوئی دوسرا نام (مروج نام کے علاوہ) لیں گے (لیکن) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا یہ ذی الحجہ نہیں ہے ہم نے عرض کیا جی ہے کیوں نہیں، فرمایا یہ شہر کون سا ہے ہم نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی خوب واقف ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر خاموش رہے۔ ہمارا خیال ہوا کہ شہر کا نام مقررہ نام کے علاوہ کچھ اور لیں گے فرمایا کیا یہ مکہ شہر نہیں، ہم نے عرض کیا جی ہے کیوں نہیں، فرمایا یہ دن کونسا ہے ہم نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم خوب واقف ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے ہمارا گمان ہوا کہ شاید کہ کوئی دوسرا نام لیں گے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا یہ قربانی کا دن نہیں ہے۔ ہم نے عرض کیا جی ہے کیوں نہیں، فرمایا تو جس طرح تمہارا یہ دن اس ماہ اور اس شہر میں حرمت والا ہے اسی طرح تمہارے آپس میں باہمی خون اور مال اور آبروئیں بھی حرام ہیں (کسی کو کسی کا قتل یا آبروریزی یا ناجائز مال لینا جائز نہیں) عنقریب تم کو اپنے رب کے سامنے جانا ہوگا اور وہ تمہارے اعمال کی باز پرس کرے گا۔ اس لئے خوب سن لو کہ میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگے۔ تم نے سن لیا کیا میں نے حکم پہنچا دیا صحابہ نے عرض کیا جی ہاں فرمایا اے اللہ تو بھی گواہ ہے اب جو حاضر ہے وہ اس کو (یہ حکم) پہنچا دے جو اس وقت موجود نہیں ہے۔ کبھی سننے والے سے وہ شخص زیادہ یاد رکھتا ہے جس کو سننے والا پہنچاتا ہے۔ (تفسیر مظہری)

فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ وَقَاتِلُوا

سو اُن میں ظلم مت کرو اپنے اُوپر اور لڑو سب

الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً

مشرکوں سے ہر حال میں جیسے وہ لڑتے ہیں تم سب سے ہر حال میں

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۶﴾

اور جان لو کہ اللہ ساتھ ہے ڈرنے والوں کے

کافروں سے لڑنا: حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اس آیت سے نکلتا ہے کہ کافروں سے لڑنا ہمیشہ روا ہے (چنانچہ "غزوہ تبوک" جس کا آگے ذکر آتا ہے۔ ماہ رجب میں ہوا) اور آپس میں ظلم کرنا ہمیشہ گناہ ہے۔ ان مہینوں میں زیادہ۔ اکثر علماء کی رائے یہی ہے لیکن بہتر ہے کہ اگر کوئی کافر ان مہینوں کا ادب کرے تو ہم بھی اس سے لڑائی کی ابتداء نہ کریں۔ (تفسیر عثمانی)

اِنَّمَا النَّسِيْٓءُ زِيَادَةٌ فِى الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ

یہ جو مہینہ ہٹا دینا ہے سو بڑھائی ہوئی بات ہے کفر کے عہد میں گمراہی

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّيُحَرِّمُوْنَهٗ

میں پڑتے ہیں اُس سے کافر حلال کر لیتے ہیں اُس مہینہ کو ایک برس اور حرام رکھتے ہیں

عَامًا لِّيُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَيُحِلُّوْا

دوسرے برس تاکہ پوری کرلیں گنتی اُن مہینوں کی جو اللہ نے ادب کے

مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ؕ زُيِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ ؕ

لئے رکھے ہیں، پھر حلال کر لیتے ہیں جو مہینہ کہ اللہ نے حرام کیا، بھلے کر

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۷﴾

دیئے گئے اُن کی نظر میں اُنکے بُرے کام اور اللہ راستہ نہیں دیتا کافر لوگوں کو

یعنی برے کام کو اچھا سمجھ رہے ہیں جب سمجھ الٹ جائے تو بھلائی کا رستہ کہاں ملے۔ اس آیت میں جو رسم نسی کا ذکر فرمایا ہے۔ اس کی تفصیل گذشتہ آیت کے فوائد زیر آیت ذلک الدین القیم گذر چکی۔

لوند کا سال: (تنبیہ) بعض اقوام جو اپنے مہینوں کا حساب درست رکھنے کے لئے لوند کا مہینہ ہر تیسرے سال بڑھاتی ہیں ۔ وہ نسی میں داخل نہیں ۔ اور بعض اکابر سلف سے نسی کے تحت میں یہ منقول ہے کہ عرب جاہلیت میں سال کے مہینوں کا عدد بدل ڈالتے تھے مثلاً بارہ کے چودہ مہینے بنالئے یا حساب میں ایسی گڑبڑی کی کہ جو ذیقعد تھا ذوالحجہ بن گیا حتیٰ کہ ۹ ہجری میں ابوبکرؓ کا حج بھی ان کے حساب سے ذیقعد میں ہوا۔ اور حدیث ان الزمان قد استدار کھیئتہ الخ کی تقریر بھی اسی اصول کے موافق کی گئی۔ ان سب چیزوں پر حافظ ابن کثیر نے تعقب کیا ہے من شاء فلیر اجعہ. یہاں اس پر منفصل بحث کی گنجائش نہیں۔ اگر مستقل تفسیر قرآن لکھنے کی توفیق ہوئی جیسا کہ ارادہ ہے تو وہاں تفصیلی کلام کیا جائیگا۔ (تفسیر عثانی)

تیل کے تاجروں کی اطلاع:

محمد بن یوسف صالحی نے محمد بن عمر اور محمد بن سعید کی روایت نقل کی ہے کہ کچھ نبطی لوگ ملک شام سے مدینہ میں روغن زیتون لاتے تھے انہوں نے مسلمانوں سے تذکرہ کیا کہ رومیوں نے بڑی فوجیں جمع کی ہیں اور ہرقل نے اپنے آدمیوں کو ایک سال کی تنخواہ بھی تقسیم کر دی ہے اور ان کے ساتھ مختلف قبائل بنی لخم، بنی جذام، بنی عاملہ، بنی غسان وغیرہ بھی اپنے اپنے مقاموں سے چل دیے ہیں، ران کا ہراول دستہ بلقاء تک آ گیا ہے مگر یہ ساری اطلاع غلط تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس خبر کی جب اطلاع پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی لوگوں کو شام کی طرف چڑھائی کرنے کی دعوت دے دی۔ طبرانی نے عمران بن حصین کا بیان ضعیف سند سے بیان کیا ہے کہ عرب کے عیسائیوں نے ہرقل کو لکھ کر بھیجا تھا کہ یہ شخص جو نبوت کا دعویٰ کرتا ہے تباہ ہو چکا ہے لوگ مسلسل قحط میں مبتلا ہیں ان کے مویشی ہلاک ہو چکے ہیں اگر آپ اپنے دین کی حمایت چاہتے ہیں تو یہ موقع ہے اس اطلاع پر ہرقل نے اپنے ایک سردار کو چالیس ہزار فوج دیکر روانہ کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ملی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جہاد کا حکم دیدیا۔ (تفسیر مظہری)

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ
اے ایمان والو تم کو کیا ہوا جب تم سے کہا جاتا ہے
انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ
کہ کوچ کرو اللہ کی راہ میں تو گرے جاتے ہو زمین پر
اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ
کیا خوش ہو گئے دنیا کی زندگی پر آخرت کو چھوڑ کر

فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا
سو کچھ نہیں نفع اُٹھانا دنیا کی زندگی کا آخرت کے مقابلہ میں مگر
قَلِيْلٌ ﴿۳۸﴾
بہت تھوڑا

غزوۂ تبوک: یہاں سے غزوہ تبوک کے لئے مؤمنین کو ابھارا گیا ہے گذشتہ رکوع سے پہلے رکوع میں

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ الخ

سے اہل کتاب کے مقابلہ میں جہاد کرنے کی ترغیب دی گئی تھی۔ درمیان میں جو ذیلی مضامین آئے ان کا ربط موقع بہ موقع ظاہر ہوتا رہا ہے گویا وہ سب رکوع حاضر کی تمہید تھی۔ اور رکوع حاضر غزوہ تبوک کے بیان کی تمہید ہے۔ فتح مکہ و غزوہ حنین کے بعد ۹ ہجری میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ شام کا نصرانی بادشاہ (ملک غشان) قیصر روم کی مدد سے مدینہ پر چڑھائی کرنیوالا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مناسب سمجھا کہ ہم خود حدود شام پر اقدام کر کے اس کا جواب دیں۔ اس کیلئے آپ نے عام طور پر مسلمانوں کو حکم دیا کہ جہاد کے لئے تیار ہو جائیں۔ گرمی سخت تھی۔ قحط سالی کا زمانہ تھا۔ کھجور کی فصل پک رہی تھی۔ سایہ خوشگوار تھا۔ پھر اس قدر بعید مسافت طے کر کے جانا اور نہ صرف ملک غسان بلکہ قیصر روم کی باقاعدہ اور سروسامان سے آراستہ افواج سے نبرد آزما ہونا، کوئی کھیل تماشہ نہ تھا۔ ایسی مہم میں مومنین مخلصین کے سوا کس کا حوصلہ تھا کہ جانبازانہ قدم اٹھا سکتا۔ چنانچہ منافقین جھوٹے حیلے بہانے تراش کر کھسکنے لگے۔ بعض مسلمان بھی ایسے سخت وقت میں اس طویل و صعب سفر سے کترا رہے تھے۔ جن میں بہت سے تو آخر کار ساتھ ہو لئے اور گنے چنے آدمی رہ گئے۔ جن کو کسل و تقاعد نے اس شرف عظیم کی شرکت سے محروم رکھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تقریباً تیس ہزار سرفروش مجاہدین کا لشکر جرار لیکر حدود شام کی طرف روانہ ہو گئے اور مقام تبوک میں ڈیرے ڈال دیئے۔ ادھر قیصر روم کے نام نامہ مبارک لکھا جس میں اسلام کی طرف دعوت دی گئی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اس کے دل میں گھر کر گئی۔ مگر قوم نے موافقت نہ کی۔ اس لئے قبول اسلام سے محروم رہا۔ شام والوں کو جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادے کی اطلاع ہوئی قیصر روم سے ظاہر کیا۔ اس نے مدینہ کی ان لوگوں نے اطاعت کی مگر اسلام نہ لائے۔ تھوڑی مدت کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی اور فاروق اعظم کے عہد خلافت میں تمام ملک شام فتح ہوا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے غالب و منصور واپس تشریف لائے اور خدا نے بڑی بڑی سلطنتوں پر

اسلام کی دھاک بٹھلا دی تو منافقین مدینہ بہت فضیحت ہوئے۔ نیز چند سچے مسلمان جو محض سستی اور کسل کی بناء پر نہ گئے تھے بے حد نادم ومتحسر تھے۔اس رکوع کے شروع سے بہت دور تک ان ہی واقعات کا ذکر ہے۔ مگر زیادہ منافقین کی حرکات بیان ہوئی ہیں کہیں کہیں مسلمانوں کو خطاب اور ان کے احوال سے تعرض کیا گیا ہے۔ آیت حاضرہ میں مسلمانوں کو بڑی شدت سے جہاد کی طرف ابھارا اور بتلایا ہے کہ تھوڑے سے عیش وآرام میں پھنس کر جہاد کو چھوڑنا گویا بلندی سے پستی کی طرف گر جانے کا مرادف ہے مومن صادق کی نظر میں دنیا کے عیش وآرام کی آخرت کا مقابلہ میں کوئی وقعت نہ ہونی چاہیے۔ حدیث میں ہے کہ اگر خدا کے نزدیک دنیا کی وقعت پر پشہ کی برابر ہوتی تو کسی کافر کو ایک گھونٹ پانی کا نہ دیتا۔ (تفسیر عثانی)

بغوی نے لکھا ہے کہ طائف سے واپس آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رومیوں سے جہاد کرنے کی تیاری کا حکم دے دیا۔ محمد بن یوسف صالحی کا بیان ہے کہ تبوک کے سال جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رومیوں سے جہاد کرنے کا ارادہ کیا تو وہ زمانہ بڑی تنگ دستی کا تھا۔ گرمی بھی سخت تھی ملک بھی خشک تھا اور پھلوں کی فصل بھی تیار تھی۔ لوگ اپنے پھلوں کی نگرانی کیلئے مدینہ میں رکنا اور سایہ میں رہنا پسند کرتے تھے ایسے وقت اور اس حالت میں روانگی ان کو ناگوار تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ جب کسی جہاد پر جانے کا ارادہ ہوتا تو بطور کنایہ در پردہ بیان فرما دیتے اور توریہ کے طور پر کسی دوسری جگہ کا اظہار کر دیتے تھے صرف تبوک کا جہاد ایسا ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھول کر لوگوں سے ارادہ کا اظہار کر دیا کیونکہ مسافت لمبی تھی زمانہ بھی سخت تھا اور جن دشمنوں کا مقابلہ کرنا تھا ان کی تعداد بھی بہت تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نام لے کر اظہار فرما دیا تا کہ لوگ تیاری کر لیں ابن ابی شیبہ بخاری اور ابن سعد نے حضرت کعب بن مالک کی روایت سے بھی اسی طرح بیان کیا ہے۔ اس روایت میں اتنا زائد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے گرد اگرد رہنے والے قبائل عرب کو بھی شرکت کی دعوت دی تھی اور مکہ کو بھی پیغام بھیج دیا تھا چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بکثرت لوگ ہو گئے لیکن منافق اور مخلص مومنوں میں سے بھی کچھ سست کار لوگ ساتھ نہیں گئے ان لوگوں کے متعلق اللہ نے آیت ذیل نازل فرمائی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمُ انْفِرُوا فِي سَبِيلِ اللهِ

(تفسیر مظہری)

عبدالعزیز بن مروان کا انتقال:

مروی ہے کہ عبدالعزیز بن مروانؒ نے اپنے انتقال کے وقت اپنا کفن منگوایا اسے دیکھ کر فرمایا پس میرا تو دنیا سے یہی حصہ تھا اتنی دنیا لے کر جا رہا ہوں پھر پیٹھ موڑ کر رو کر کہنے لگے ہائے دنیا تیرا بہت بھی کم ہے اور تیرا کم تو بہت ہی چھوٹا ہے افسوس ہم دھوکے میں ہی رہے۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

عقیدۂ آخرت کا اثر: عقائد اسلام کے بنیادی اصول تین ہیں۔ توحید، رسالت، اور آخرت، ان میں عقیدہ آخرت درحقیقت اصلاح عمل کی روح اور جرائم اور گناہوں کے آگے ایک آہنی دیوار ہے، اگر غور کیا جائے تو بدیہی طور پر معلوم ہوگا کہ دنیا میں امن وسکون اس عقیدہ کے بغیر قائم ہی نہیں ہوسکتا۔ آج کی دنیا جرائم کا انسداد تو چاہتی ہے مگر خدا وآخرت سے غافل ہو کر چاہتی ہے اور قدم قدم پر ایسے سامان جمع کرتی ہے جس میں رہ کر خدا وآخرت کی طرف دھیان بھی نہ آئے۔ (معارف مفتی اعظم)

إِلَّا تَنْفِرُوا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا

اگر تم نہ نکلو گے تو دے گا تم کو عذاب دردناک

وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوهُ

اور بدلے میں لائے گا اور لوگ تمہارے سوا اور کچھ نہ بگاڑ سکو گے

شَيْئًا ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٣٩﴾

تم اُس کا اور اللہ سب چیز پر قادر ہے

یعنی خدا کا کام تم پر موقوف نہیں۔ تم اگر سستی کرو گے وہ اپنی قدرت کاملہ سے کسی دوسری قوم کو دین حق کی خدمت کیلئے کھڑا کر دیگا۔ تم اس سعادت سے محروم رہو گے جو تمہارے ہی نقصان کا موجب ہے

منت منہ کہ خدمت سلطاں ہمی کنی
منت شناس ازو کہ بخدمت گذاشت

إِلَّا تَنْصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ إِذْ أَخْرَجَهُ

اگر تم نہ مدد کرو گے رسول کی تو اُس کی مدد کی ہے اللہ نے جس وقت

الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي

اُسکو نکالا تھا کافروں نے کہ وہ دوسرا تھا دو میں کا جب وہ دونوں تھے

الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ

غار میں جب وہ کہہ رہا تھا اپنے رفیق سے تو غم نہ کھا

إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا ۖ فَأَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ

بیشک اللہ ہمارے ساتھ ہے پھر اللہ نے اتاری اپنی طرف سے

عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ

اُس پر تسکین اور اُس کی مدد کو وہ فوجیں بھیجیں کہ تم نے نہیں دیکھیں اور نیچے

كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ۭ وَكَلِمَةُ

ڈالی بات کافروں کی اور اللہ کی بات

اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

ہمیشہ اُوپر ہے اور اللہ زبردست ہے حکمت والا

واقعہ ہجرت: یعنی بالفرض اگر تم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد نہ کرو گے نہ سہی۔ ان کا منصور و کامیاب ہونا کچھ تم پر موقوف نہیں، ایک وقت پہلے ایسا آ چکا ہے جب ایک یار غار کے سوا کوئی آپ کے ساتھ نہ تھا۔ معدودے چند مسلمان مکہ والوں کے مظالم سے تنگ آ کر ہجرت کر گئے تھے آخر آپ کو بھی ہجرت کا حکم ہوا۔ مشرکین کا آخری مشورہ یہ قرار پایا تھا کہ ہر قبیلہ کا ایک ایک نوجوان منتخب ہو اور وہ سب مل کر بیک وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر تلواروں کی ضرب لگائیں تا کہ خون بہا دینا پڑے تو سب قبائل پر تقسیم ہو جائے اور بنی ہاشم کی یہ ہمت نہ ہو کہ خون کے انتقام میں سارے عرب سے لڑائی مول لیں۔ جس شب میں اس ناپاک کاروائی کو عملی جامہ پہنانے کی تجویز تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بستر پر حضرت علیؓ کو لٹایا تا کہ لوگوں کی امانتیں احتیاط سے آپ کے بعد مالکوں کے حوالہ کر دیں اور حضرت علیؓ کی تسلی فرمائی کہ تمہارا بال بینکا نہ ہوگا پھر خود بہ نفس نفیس ظالموں کے ہجوم میں سے ''شاھت الوجوہ'' فرماتے ہوئے اور ان کی آنکھوں میں خاک جھونکتے ہوئے صاف نکل آئے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو ساتھ لیا اور مکہ سے چند میل ہٹ کر غار ثور میں قیام فرمایا۔ یہ غار پہاڑ کی بلندی پر ایک بھاری مجوف چٹان ہے جس میں داخل ہونے کا صرف ایک راستہ تھا وہ بھی ایسا تنگ کہ انسان کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر اس میں گھس نہیں سکتا۔ صرف لیٹ کر داخل ہونا ممکن تھا۔ اول حضرت ابوبکرؓ نے اندر جا کر اسے صاف کیا سب سوراخ کپڑے سے بند کئے کہ کوئی کیڑا کانٹا گزند نہ پہنچا سکے۔ ایک سوراخ باقی تھا۔ اس میں اپنا پاؤں اڑا دیا۔ سب انتظام کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اندر تشریف لانے کو کہا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صدیق کے زانو پر سر مبارک رکھ کر استراحت فرما رہے تھے کہ سانپ نے ابوبکرؓ کا پاؤں ڈس لیا۔ مگر صدیقؓ پاؤں کو حرکت نہ دیتے تھے مبادا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی استراحت میں خلل پڑے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ کھلی اور قصہ معلوم ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعاب مبارکہ صدیق کے پاؤں کو لگا دیا جس سے فوراً شفا ہو گئی ادھر کفار ''قائف'' کو ہمراہ لے کر جو نشان ہائے قدم کی شناخت میں ماہر تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں نکلے۔ اس نے غار ثور تک نشان قدم کی شناخت کی مگر خدا کی قدرت کہ غار کے دروازہ پر مکڑی نے جالا تن لیا اور جنگلی کبوتر نے انڈے دیدیے۔ یہ دیکھ کر سب نے قائف کو جھٹلایا اور کہنے لگے کہ یہ مکڑی کا جالا تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ولادت سے بھی پہلے کا معلوم ہوتا ہے۔ اگر اندر کوئی داخل ہوتا تو یہ جالا اور انڈے کیسے صحیح وسالم رہ سکتے تھے۔ ابوبکر صدیقؓ کو اندر سے کفار کے پاؤں نظر پڑتے تھے۔ انہیں فکر تھی کہ جان سے زیادہ محبوب جس کیلئے سب کچھ فدا کر چکے ہیں دشمنوں کو نظر نہ پڑ جائیں۔ گھبرا کر کہنے لگے کہ یارسول اللہ! اگر ان لوگوں نے ذرا جھک کر اپنے قدموں کی طرف نظر کی تو ہم کو دیکھ کر پا لینگے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابوبکر تیرا کیا خیال ہے ان دو کی نسبت جن کا تیسرا اللہ ہے یعنی جب اللہ ہمارے ساتھ ہے تو پھر کس کا ڈر ہے۔ اس وقت حق تعالیٰ نے ایک خاص قسم کی کیفیت سکون واطمینان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے ابوبکرؓ کے قلب مقدس پر نازل فرمائی اور فرشتوں کی فوج سے حفاظت وتائید کی۔ یہ اسی تائید غیبی کا کرشمہ تھا کہ مکڑی کا جالا جسے ''اوہن البیوت'' بتلایا ہے بڑے بڑے مضبوط و مستحکم قلعوں سے بڑھ کر ذریعہ تحفظ بن گیا۔ اس طرح خدا نے کافروں کی بات نیچی کی اور ان کی تدابیر خاک میں ملا دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تین روز غار میں قیام فرما کر بعافیت تمام مدینہ طیبہ پہنچ گئے۔ بیشک انجام کار خدا ہی کا بول بالا رہتا ہے۔ وہ ہر چیز پر غالب ہے۔ اور اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔

(تنبیہ): بعض نے وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا سے بدر و حنین وغیرہ میں جو نزول ملائکہ ہوا وہ مراد لیا ہے مگر ظاہر سیاق سے وہ ہی ہے جو ہم نے بیان کیا ہے واللہ اعلم۔

حضرت ابوبکرؓ کی فضیلت:

اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ جب کہ پیغمبر اپنے ساتھی (ابوبکر) سے کہہ رہے تھے۔ اذ اخرجہ سے اذ ہما فی الغار اول بدل اور اذ یقول دوسرا بدل ہے۔ ترمذی اور بغوی نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا تم میرے غار کے ساتھی ہو اور حوض پر میرے ساتھی ہو گے۔ مسلم نے حضرت ابن مسعود کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میں (اللہ کے سوا) کسی کو خلیل بنانے والا ہوتا تو ابوبکر کو خلیل بنا لیتا مگر (اب) وہ میرے بھائی اور ساتھی ہیں اور اللہ نے تمہارے ساتھی کو (یعنی مجھے اپنا) خلیل بنا لیا ہے۔ حسن بن فضل کا قول ہے اگر کوئی ابوبکرؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابی نہ کہے تو وہ کافر ہے

قرآنی صراحت کا انکار کرتا ہے، باقی صحابہ میں سے اگر وہ کسی کو صاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ کہے تو بدعتی (فاسق) ہوگا کافر نہ ہوگا۔

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا غم نہ کر بلا شبہ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

اللہ کی معیت بے کیف ہے۔ حضرت شیخ شہید مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ نے فرمایا حضرت ابوبکر کی یہ ہی فضیلت بہت بڑی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر کو اپنے ساتھ ملا کر اللہ کی معیت کی دونوں کیلئے یکجائی ثابت کی اللہ کی جو معیت اپنے لئے ثابت کی وہی معیت حضرت ابوبکرؓ کے لئے بھی ثابت کی جو حضرت ابوبکرؓ کی فضیلت کا انکار کرتا ہے وہ اس آیت کا انکار کرتا ہے اور جو آیت کا منکر ہے وہ کافر ہے۔ رہا حضرت ابوبکر کے دل میں فکر پیدا ہونا تو ایسا بزدلی کی وجہ سے نہ تھا جیسے رافضی تہمت لگاتے ہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک کے متعلق آپ کو اندیشہ ہوا اور انہوں نے (اپنے دل میں) کہا اگر میں مارا جاؤں تو (کوئی حرج نہیں) ایک آدمی کا قتل ہوگا اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہید کر دیئے گئے تو امت ہلاک ہو جائیگی ہم غار والی حدیث میں ذکر کریں گے کہ حضرت ابوبکرؓ کو غم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ کا تھا۔ اپنی جان کا اندیشہ نہ تھا۔

ہجرت: موسیٰ بن عقبہ اور ابن اسحاق اور امام احمد اور بخاری اور ابن حبان نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے اور ابن اسحاق وطبرانی نے حضرت عائشہؓ کی بہن حضرت اسماءؓ کی روایت سے بیان کیا ہے۔

ہجرتِ مدینہ کا آغاز:

حسب بیان بخاری حضرت عائشہؓ نے فرمایا مجھے شعور ہوا تو میں نے اپنے ماں باپ کو ایک (نئے) دین پر چلتے دیکھا کوئی دن ایسا نہیں گذرتا تھا کہ صبح اور شام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر تشریف نہ لاتے ہوں جب مسلمانوں پر زیادہ تکلیفیں پڑیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے خواب میں تمہارا مقام ہجرت دیکھ لیا جہاں بکثرت کھجوروں کے درخت ہیں اور دو سنگلاخ زمینوں کے وسط میں واقع ہے۔ چنانچہ مہاجرین مدینہ کو ہجرت کر گئے اور جو لوگ مکہ چھوڑ کر حبشہ کو چلے گئے تھے۔ وہ بھی عموما (حبشہ سے) مدینہ کو پہنچ گئے۔ حضرت ابوبکرؓ بھی مدینہ جانے کی تیاری کرنے لگے۔ لیکن رسول اللہ نے ان سے فرمایا ذرا توقف کرو۔ (ابھی مجھے اجازت نہیں ملی) امید ہے کہ مجھے بھی اجازت مل جائیگی حضرت ابوبکرؓ نے کہا میرے ماں باپ قربان کیا آپ کو اپنے لئے بھی اجازت کی امید ہے فرمایا ہاں حضرت ابوبکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلنے کی غرض سے رک گئے آپ نے دو اونٹنیاں کیکر کے پتے کھلا کھلا کر چار ماہ تک پالیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف آوری

ایک روز ہم حضرت ابوبکر کے گھر ٹھیک دوپہر کو بیٹھے ہوئے تھے کہ اسماء نے کہا ابا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لا رہے ہیں آپ اس روز سر پر کپڑا اڈالے ایسے وقت آرہے تھے جو خلاف معمول تھا۔ حضرت ابوبکر نے کہا میرے ماں باپ قربان اس وقت جو آرہے ہیں تو ضرور حکم مل گیا ہے (اسی لئے دوپہر کو آرہے ہیں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے داخلہ کی اجازت لی اور اندر آ گئے

خوشخبری: حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا جو لوگ تمہارے پاس ہوں ان کو یہاں سے ہٹا دو حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا کوئی مخبر نہیں بس یہی میری دونوں لڑکیاں ہیں دوسری روایت میں آیا ہے بس یہی آپ کے گھر والے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے یہاں سے نکلنے کی اجازت مل گئی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا مجھے ساتھ چلنے کی اجازت دیجئے۔ فرمایا ہاں (تم میرے ساتھ چلو گے) ابوبکرؓ رونے لگے خوشی سے روتے ہوئے میں نے اس سے پہلے کسی کو نہیں دیکھا تھا۔

اونٹنیوں کی خریداری: حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میرے ماں باپ آپ پر قربان میری یہ دو اونٹنیاں ہیں ان میں سے ایک آپ لے لیجئے۔ فرمایا قیمت سے (لوں گا) جو اونٹ میرا نہ ہو اس پر سوار نہیں ہوں گا۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے فرمایا لیکن جس قیمت پر تم نے خریدی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا اتنی قیمت پر میں نے خریدی تھی فرمایا میں اتنی قیمت پر لیتا ہوں، حضرت ابوبکر نے کہا یہ آپ کی ہوگئی۔

بخاری نے غزوہ رجیع کے بیان میں لکھا ہے کہ یہ اونٹنی جدعاء تھی واقدی نے اس کی قیمت آٹھ سو درہم بتائی ہے۔

سامانِ سفر: حضرت عائشہ کا بیان ہے ہم نے دونوں کیلئے بہترین زاد راہ تیار کیا اور ایک تھیلے میں کھانے کا سامان رکھ دیا۔ واقدی نے لکھا ہے کھانے میں بکری کا پکا ہوا گوشت بھی تھا۔ اسماء نے اپنا کمر بند کاٹ کر اس سے تھیلے کا منہ باندھ دیا۔ اسی لیے ان کا لقب ذات النطاقین (دو کمر بندوں والی) ہوگیا دوسری روایت میں آپ کا لقب ذات النطاق (کمر بند والی) آیا ہے۔

محمد بن یوسف صالحی کا بیان ہے کہ حضرت اسماءؓ نے اپنا کمر بند چیر کر اس کے دو ٹکڑے کر کے ایک سے زاد راہ باندھ دیا اور دوسرے کو خود باندھے رہیں، اسی لیے ان کو ذات النطاق اور ذات النطاقین کہا گیا۔ ایک کمر بند والی اور دو کمر بند والی آپ کا لقب اسی مناسبت سے ہوگیا۔ ابن سعد کے نزدیک دو کمر بند والی کہنے کی یہ وجہ ہوئی کہ انہوں نے اپنا کمر بند چیر کر دو ٹکڑے کر کے ایک سے کھانے کے تھیلے کا منہ باندھ دیا تھا اور دوسرے سے (پانی کے)

مشکیزہ کا منہ جکڑ دیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ نے قبیلہ بنی دئل کا ایک آدمی جو اس وقت کافر تھا بعد کے زمانہ میں مسلمان ہوا اجرت پر لے لیا تھا یہ شخص راہ شناس اور ماہر راہنما تھا۔ دونوں حضرات نے اس کو امین بنا کر دونوں اونٹنیاں اس کے سپرد کر دیں اور اس سے وعدہ لے لیا کہ تین روز کے بعد غار ثور پر وہ دونوں اونٹنیاں لے کر ملے۔

حضرت علیؓ کی ذمہ داری: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو اپنے جانے کی اطلاع دے دی اور حکم دے دیا کہ میری جگہ تم یہاں رہ کر لوگوں کی جو امانتیں میرے پاس موجود ہیں وہ ادا کر دینا (پھر چلے آنا) مکہ کے اندر جس شخص کو اپنی کسی چیز کی حفاظت مقصود ہوتی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لا کر بطور امانت رکھ دیتا تھا کیونکہ آپ کی سچائی اور امانت پر اس کو بھروسہ ہوتا تھا (گویا سب کی نظر میں آپ صادق وامین تھے)

مکہ سے روانگی: حضرت عائشہؓ کا بیان ہے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کوہ ثور کے غار پر جا پہنچے۔ بیہقی کا بروایت حضرت عمر بیان ہے کہ رات میں روانہ ہوئے تھے ابن اسحاق اور واقدی کا قول ہے کہ اس دریچے سے نکلے تھے جو حضرت ابوبکر کے گھر کی پشت میں تھا۔ ابونعیم نے عائشہ بنت قدامہ کی روایت سے لکھا ہے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں کھڑکی سے بھیس بدلے ہوئے نکلا سب سے پہلے میرے سامنے ابوجہل آیا مگر اللہ نے اس کو نابینا کر دیا وہ نہ مجھے دیکھ سکا نہ ابوبکر کو ہم دونوں (اس کے سامنے سے) گذر گئے۔

حضرت ابوبکرؓ کی مالی قربانی: حضرت اسماءؓ کا بیان ہے کہ حضرت ابوبکر اپنا سارا مال یعنی پانچ ہزار درہم لے گئے بلاذری کا بیان ہے کہ اسلام لانے کے وقت حضرت ابوبکر کے پاس چالیس ہزار درہم تھے مگر مدینہ کو ہجرت کرتے وقت ان کے پاس صرف پانچ یا چار ہزار درہم رہ گئے تھے وہ بھی حضرت ابوبکرؓ نے اپنے بیٹے عبداللہ کو دے کر بھیج دیا اور انہوں نے لے جا کر غار تک پہنچا دیئے۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے میرے دادا ابوقحافہ جن کی نظر جاتی رہی تھی آئے اور بولے خدا کی قسم میرا خیال ہے وہ ساری رقم اپنے ساتھ لے گیا میں نے کہا ابا ایسا نہیں وہ تو ہمارے لئے بہت رقم چھوڑ گئے ہیں یہ کہنے کے بعد میں نے کچھ پتھریاں لے کر اس طاقچہ میں رکھ دیں جہاں میرے باپ رقم رکھا کرتے تھے اور ان پر ایک کپڑا ڈال کر دادا کا ہاتھ پکڑ کر وہاں لے گئی اور ان سے کہا ابا آپ اپنا ہاتھ رکھ کر دیکھ لیجئے یہ رقم رکھی ہے بڑے میاں نے ہاتھ رکھ کر دیکھ لیا اور کہنے لگے اگر وہ یہ رقم تمہارے لئے چھوڑ گیا ہے تب تو کوئی ہرج نہیں ہے اس نے یہ اچھا کیا اس سے تمہارا کام چل جائے گا۔ خدا کی قسم حضرت ابوبکر ہمارے لیے کچھ چھوڑ کر نہیں گئے تھے مگر میں نے بڑے میاں کو تسلی دینے کے لیے ایسا کیا تھا۔ حضرت ابوبکر ہمارے لیے کچھ چھوڑ کر نہیں گئے تھے مگر میں نے بڑے میاں کو تسلی دینے کیلئے ایسا کیا تھا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کی فکر

بیہقی کا بیان ہے جب حضرت ابوبکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غار کی طرف روانہ ہوگئے تو راستہ میں کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے چلتے تھے کبھی دائیں کبھی بائیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وجہ پوچھی تو عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں کوئی آگے گھات میں نہ بیٹھا ہو تو آپ کے آگے ہو جاتا ہوں پھر اندیشہ ہوتا ہے کہ پیچھے سے کوئی جستجو میں نہ آجائے تو پیچھے ہو جاتا ہوں اسی طرح دائیں بائیں چلنے لگتا ہوں جب غار کے دہانہ پر پہنچے تو حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو اس خدا کی قسم جس نے آپ کو نبی برحق بنا کر بھیجا ہے آپ اس کے اندر نہ جائیں آپ سے پہلے میں اندر جا کر دیکھ لوں اگر اندر کوئی (موذی کیڑا) ہوگا تو آپ سے پہلے مجھ پر اس کا وار ہوگا چنانچہ آپ پہلے داخل ہوگئے اور ہاتھ سے ٹٹول کر دیکھنے لگے جو سوراخ نظر آتا اپنا کپڑا پھاڑ کر اس میں ٹھونس دیتے تھے اس طرح سب سوراخ بند کر دیئے صرف ایک سوراخ رہ گیا جس کو بند کرنے کیلئے کپڑا نہ رہا تو آپ نے اس کے منہ پر اپنی ایڑی لگا دی پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غار میں داخل ہوگئے۔ سوراخ کے اندر سے سانپ حضرت ابوبکرؓ کو ڈسنے لگے اور آپ کے آنسو بہنے لگے (مگر آپ نے ایڑی نہ ہٹائی) ابن ابی شیبہ اور ابن منذر کی خود حضرت ابوبکرؓ سے روایت ہے کہ جب ہم دونوں غار پر پہنچے تو ایک سوراخ نظر آیا۔ میں نے اس سوراخ میں اپنی دونوں ٹانگوں اڑا دیں اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر کوئی سانپ بچھو ہوگا تو پہلے مجھے ڈسے گا (آپ محفوظ رہیں گے) ابن مردویہ نے جندب بن سفیان کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جب حضرت ابوبکرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب غار پر داخل ہوگئے اور صفائی کرتے میں کوئی چیز آپ کے ہاتھ میں لگ گئی آپ ہاتھ سے خون پونچھنے لگے اور کہنے لگے تو صرف ایک انگلی ہے جو زخمی ہوگئی ہے جو کچھ تجھے دکھ پہنچا ہے وہ اللہ کی راہ میں پہنچا ہے۔

حضرت ابوبکر کیلئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعاء

ابونعیم نے حضرت انس کی روایت سے بیان کیا کہ صبح ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ سے دریافت کیا تمہارا کپڑا کہاں گیا حضرت ابوبکرؓ نے وہ واقعہ عرض کر دیا جس میں کپڑے کو کام میں لائے تھے حضور صلی اللہ علیہ

وسلم نے دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کی اور فرمایا، اے اللہ ابوبکرؓ کو جنت کے اندر میرے درجہ میں میرے ساتھ کر دینا اللہ نے وحی بھیجی کہ آپ کی دعا قبول ہوگئی۔

حضرت ابوبکرؓ کا ایک دن اور رات کا عمل

رزین کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ کے سامنے حضرت ابوبکرؓ کا تذکرہ آیا تو آپ رونے لگے۔ اور فرمایا مجھے دل سے یہ بات پسند ہے کہ میری زندگی کے سارے اعمال کا مجموعہ ابوبکرؓ کے ایک دن اور ایک رات کے عمل کے برابر (درجہ میں) ہو جائے رات تو وہ جس میں ابوبکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غار کی طرف چلے تھے اور غار پر پہنچ کر عرض کیا تھا آپ کو خدا کی قسم آپ پہلے اس کے اندر نہ جائیں میں اول داخل ہو جاؤں اگر کچھ ہوگا تو مجھے دکھ پہنچ جائے گا آپ محفوظ رہیں گے چنانچہ آپ نے اندر جا کر غار کو صاف کیا ایک جانب ایک سوراخ نظر آیا تو اپنا تہبند پھاڑ کر اس سوراخ کو بند کر دیا مگر دو سوراخ اور رہ گئے تو آپ نے دونوں پاؤں ان دونوں کے منہ کے اندر اڑا دیئے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا اب آپ اندر آ جائیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اندر پہنچ گئے اور حضرت ابوبکر کی گود میں سر رکھ کر سو گئے ایک سوراخ کے اندر سے کسی کیڑے نے حضرت ابوبکرؓ کے پاؤں میں کاٹ لیا مگر اس خیال سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہیں بیدار نہ ہو جائیں آپ نے حرکت بھی نہیں کی شدت تکلیف کی وجہ سے آپ کے آنسو بہہ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک پر گرے تو آنکھ کھل گئی اور پوچھا ابوبکرؓ کیا بات ہے ابوبکرؓ نے کہا میرے باپ ماں قربان کسی کیڑے نے مجھے ڈس لیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر فوراً تھتکار دیا اور تکلیف جاتی رہی (مگر آخری عمر میں) پھر اس زہر کا حملہ ہوا اور یہی آپ کی وفات کا سبب بنا۔ اور دن وہ کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی تو عرب مرتد ہو گئے اور کہنے لگے ہم زکوۃ نہیں دیں گے۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا اگر یہ لوگ اونٹ کی ٹانگ میں باندھنے کی ایک رسی دینے سے بھی (جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دیا کرتے تھے) انکار کریں گے تو میں رسی کے لئے ان سے جہاد کروں گا میں نے عرض کیا اے خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو ملائے رکھیے اور ان سے نرمی کا سلوک کیجئے۔ فرمایا کیا تم جاہلیت میں تو بڑے قوی تھے اور اسلام میں آ کر بزدل ہو گئے۔ وحی بند ہوگئی دین کامل ہو گیا۔ کیا میرے جیتے جی دین میں کمی ہو سکتی ہے۔

جنگلی کبوتر اور مکڑی: ابن سعد، ابونعیم بیہقی اور ابن عساکر نے ابومصعب مکی کی روایت سے بیان کیا ابومصعب نے کہا میں نے حضرت انس بن مالک، حضرت زید بن ارقم اور حضرت مغیرہ بن شعبہ کو پایا اور ان سب کو یہ بیان کرتے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب غار کے اندر داخل ہو گئے تو غار کے منہ پر اللہ نے درخت راہ اگا دیا (جس نے غار کا منہ چھپا لیا) اور بحکم خدا مکڑی نے غار کے منہ پر جالا بھی تن دیا اور دو جنگلی کبوتروں نے غار کے منہ میں بسیرا بھی کر لیا۔ جب قریشی جوان ہر طرف سے ڈنڈے لاٹھیاں اور تلواریں لیے آ پہنچے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا فاصلہ چالیس گز رہ گیا تو ایک شخص نے غار میں دیکھا اس کو دو جنگلی کبوتر نظر آئے وہ سمجھا کہ غار کے اندر کوئی نہیں۔ اس کی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سن لی جس سے آپ نے یقین کر لیا کہ اللہ نے آئی ہوئی مصیبت ٹال دی اور دونوں کبوتروں کو دعا دی اور ان کی بھلائی کا بدلہ مقرر فرما دیا۔ چنانچہ وہ جوڑا حرم میں پہنچا وہاں ان کے بچے ہوئے اور حرم کے سارے کبوتر انہی کی نسل سے ہوئے۔

امام احمد نے حسن سند کے ساتھ حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں کے نشان پر مشرک پہاڑ تک آ گئے۔ پہاڑی پر پہنچ کر قدموں کے نشانات گڑبڑ ہو گئے مگر وہ پہاڑی پر چڑھ کر غار کی طرف سے گذر گئے اور غار کے منہ پر مکڑی کا جالا تنا ہوا دیکھ کر کہنے لگے اگر اس میں کوئی اندر گیا ہوتا تو جالا منہ پر تنا ہوا نہ ہوتا۔ غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تین رات ٹھیرے رہے۔

صحیحین میں مذکور ہے کہ حضرت ابوبکرؓ صدیق نے فرمایا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم غار میں ہیں (اور قریش اوپر ہیں) اگر ان میں سے کسی نے اپنے قدموں کی طرف دیکھ لیا تو نیچے ہم کو دیکھ لے گا رسول اللہ نے فرمایا ابوبکر تمہارا ان دو شخصوں کے متعلق کیا خیال ہے جن کا تیسرا اللہ ہے (یعنی اللہ ان کے ساتھ ہے)

دوبار مکڑی کے ذریعہ حفاظت کی گئی:

ابونعیم نے حلیہ میں عطاء بن میسرہ کی روایت سے لکھا ہے کہ مکڑی نے (اللہ کے پیغمبروں کی حفاظت کیلئے) دوبارہ جالا بنا ایک بار حضرت داؤدؑ کی حفاظت کیلئے جب کہ طالوت ان کی جستجو کر رہا تھا اور ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کیلئے جب کہ حضور غار میں تھے۔ بلاذری نے تاریخ میں

مشرکوں کو قیام شناس:

ابوسعید نے بیان کیا کہ مشرکوں نے ایک شخص کو جس کا نام علقمہ بن کرز بن ہلال خزاعی تھا مزدوری پر لے لیا تھا علقمہ فتح مکہ کے سال مسلمان ہو گئے تھے (لیکن ہجرت کے وقت کافر تھے) علقمہ قدموں کے نشانات کے پیچھے پیچھے سب کو لے کر گیا مکہ کے نشیب میں جب غار ثور پر پہنچا تو کہنے لگا یہاں قدموں کے نشانات کٹ گئے ہیں میں نہیں سمجھتا دائیں کو گئے یا بائیں جانب پھر پہاڑ پر چڑھ گیا اور غار کے دہانے پر پہنچ گیا امیہ بن خلف نے کہا یہاں تو محمد کی پیدائش سے بھی پہلے سے مکڑی کا جالا ہے پھر امیہ نے (غار کے منہ پر) پیشاب کر دیا۔

حضرت ابوبکرؓ پر خوف اور اطمینان کا نزول:

بیہقی نے حضرت عروہ کی روایت سے بیان کیا کہ جب رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم مشرکوں کو نہ ملے تو وہ سوار ہو کر آپ کی تلاش میں ہر طرف کو چل دیئے اور چشموں والوں کے پاس بھی انہوں نے آدمی بھیج دیئے ان کے لئے بڑا معاوضہ بھی مقرر کر دیا (کہ اگر وہ پتہ نشان بتادیں گے تو ان کو مقررہ معاوضہ دیا جائے گا) اور اس پہاڑ پر چڑھ گئے جس کے اندر وہ غار تھا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ نے ان کی آوازیں سن لیں، حضرت ابوبکرؓ ڈر کر رونے لگے غم واندوہ اور خوف ان پر مسلط ہو گیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت ابوبکرؓ سے فرمایا غم نہ کرو۔ یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ اسی کے متعلق اللہ نے نازل فرمایا:

فانزل الله سكينته عليه یعنی اللہ نے اپنی طرف سے اطمینان رسول اللہ پر نازل فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا۔ غم نہ کرو بلاشبہ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ کذا ذکرا البلاذری۔

ابن ابی حاتم، ابوالشیخ، ابن مردویہ بیہقی اور ابن عساکر نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ (علیہ کی ضمیر حضرت ابوبکرؓ کی طرف راجع ہے یعنی) اللہ نے اپنا اطمینان حضرت ابوبکر پر نازل فرمادیا جس کی صورت یہ ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا غم نہ کرو بلاشبہ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ (اس قول سے حضرت ابوبکرؓ کے دل میں اطمینان پیدا ہو گیا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو پہلے سے ہی اطمینان حاصل تھا۔ یہ مطلب زیادہ صحیح ہے، فاء (حرف تعقیب) اس پر دلالت کر رہا ہے پھر قریب ترین مرجع کی طرف ضمیر کو لوٹانا بھی زیادہ مناسب ہے۔

فرشتوں نے حفاظت کی:

وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا اور اللہ نے ان کی مدد اس لشکر سے کی جو تم کو دکھائی نہیں دیا۔ یعنی ملائکہ کی فوج بھیج دی جس نے کفار کے چہرے اور نظریں مار مار کر پھیر دیئے تاکہ وہ دیکھ نہ سکیں۔ ابونعیم نے حضرت اسماءؓ بنت ابی بکر صدیق کی روایت سے لکھا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے ایک شخص کو غار کی طرف منہ کئے دیکھا تو عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہم کو دیکھ لے گا فرمایا ہرگز نہیں فرشتے اپنے پروں سے اس کے سامنے آڑ کرلیں گے، کچھ دیر گزرنے نہ پائی تھی کہ وہ شخص سامنے بیٹھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کی طرف منہ کر کے پیشاب کرنے لگا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا اگر یہ ہم کو دیکھ لیتا تو ایسا نہ کرتا۔

بعض علماء نے کہا کہ فرشتوں نے کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دیا کہ وہ لوٹ گئے۔

مجاہد اور کلبی نے کہا بدر کے دن فرشتوں نے آپ کی مدد کی تھی اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غار کے اندر تھے اس وقت اللہ نے دشمنوں کے فریب کو ان کی طرف سے پھیر دیا اور ان کو ناکام کر دیا پھر بدر کے دن بھی ملائکہ کو بھیج کر اپنی نصرت کا اظہار کیا۔

حضرت حسان کے شعر: ابن عدی اور ابن عساکر نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسان سے فرمایا کہ ابوبکرؓ کے متعلق بھی تم نے کچھ کہا ہے حضرت حسان نے عرض کیا جی ہاں۔ فرمایا تو کہو میں سنوں گا حضرت حسان نے کہا، وہ اونچے غار کے اندر دو میں کے دوسرے تھے جب کہ دشمن پہاڑ پر چڑھا ہوا چکر کاٹ رہا تھا۔ صحابہ جانتے تھے کہ ابوبکر سارے انسانوں میں سب سے زیادہ رسول اللہ کے محبوب تھے آپ نے ان کے برابر کسی کو نہیں قرار دیا یہ شعر سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہنس دیئے کہ ڈاڑھیں (یعنی وہ دانت جو آخری داڑھیوں اور سامنے کے دانتوں کے درمیان ہوتے ہیں) نمودار ہو گئیں پھر فرمایا حسان جیسا تم نے کہا وہ ایسے ہی ہیں۔

حضرت عبداللہ: حضرت عائشہؓ کا بیان ہے پھر تین رات دونوں غار میں چھپے رہے اس عرصہ میں عبداللہ بن ابی بکر بھی انہی کے پاس رات کو رہتے تھے۔ عبداللہ ہوشیار اور بات کو جلد سمجھنے والے نوجوان تھے سحر کو اندھیرے ہی میں واپس آجاتے تھے اور صبح کو قریش کے ساتھ اس طرح ہو جاتے تھے جیسے رات کو انہی کے پاس رہے ہوں (دن میں) جو بات سنتے اس کو یاد رکھتے اور جب تاریکی ہو جاتی تو جا کر دن بھر کی خبروں کی اطلاع دیتے۔

عامر بن فہیرہ: ابواسحاق کا بیان ہے کہ حضرت اسماءؓ بنت ابی بکر کھانا بنا کر شام کو پہنچا دیتی تھیں عامر بن فہیرہ جو قریش کے چرواہوں کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ کی بکریاں چرایا کرتا تھا شام کو ایک گھنٹہ رات گئے (جانوروں کو لے کر) غار پر پہنچ جاتا تھا، اس طرح تازہ دودھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کو رات کو مل جاتا تھا ہر رات وہ ایسا ہی کرتا تھا جب تین راتیں گذر گئیں اور تلاش کرنے والے لوگوں کو سکون ہو گیا تو وہ شخص جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ نے سواریاں پہنچانے کیلئے مزدوری پر ٹھیرایا تھا دونوں کے اونٹ لے کر آ پہنچا دونوں حضرات سوار ہو گئے۔ عامر بن فہیرہ بھی راستہ میں خدمت کرنے کیلئے ساتھ ہو گیا عامر بن فہیرہ، عبداللہ بن طفیل کا غلام تھا اور عبداللہ بن طفیل بن سنجرہ حضرت عائشہؓ کا اخیافی بھائی تھا، راہنما دونوں حضرات کو عسفان سے نشیب کی جانب ساحل کے راستہ سے لے چلا پھر اج پر پہنچ کر اس نے راستہ کاٹا۔

حضرت ابوبکرؓ کی بیان کی ہوئی تفصیل:

امام احمد اور شیخین نے بیان کیا ہے کہ حضرت براءؓ بن عازب نے حضرت ابوبکرؓ سے دریافت کیا، جس رات کو آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلے تھے اس کی تفصیل بتایئے آپ دونوں حضرات نے کیا کیا تھا، آپ نے فرمایا رات بھر اور آدھے دن چلتے رہے۔ جب ٹھیک دوپہر ہو گئی

اور راستہ خالی ہوگیا کوئی راہ گیر راستہ میں نظر نہ آتا تھا اور ایک لمبی سایہ دار چٹان سامنے نظر آئی۔ اس کے نیچے دھوپ کا اثر نہیں پہنچا تھا ہم وہیں اتر پڑے اور چٹان کے پاس پہنچ کر میں نے اپنے ہاتھ سے وہاں ایک جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا آپ یہاں سو جائیے میں چاروں طرف کا چوکیدارہ کرتا رہوں گا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سو گئے اور میں باہر آکر ماحول کی نگرانی کرنے لگا۔ مجھے ایک چرواہا نظر آیا جو اپنی بکریاں لیے چٹان کی طرف اسی غرض سے آرہا تھا جس غرض سے ہم وہاں اترے تھے۔ میں (آگے بڑھ کر) اس سے ملا اور پوچھا تو کس کا غلام ہے اس نے مکہ والوں میں سے ایک آدمی کا نام لیا میں اس کو پہچان گیا اور پوچھا تیری بکریوں کے پاس کچھ دودھ بھی ہے اس نے کہا جی ہاں میں نے کہا تو کیا میں دودھ دو لوں، اس نے کہا جی ہاں چنانچہ اس نے ایک بکری کو پکڑا میں نے کہا اس کے تھن جھاڑ کر خاک دھول صاف کردے اس نے مشکل سے ایک بڑا پیالہ دودھ کا دوہ کر مجھے دیا میرے پاس ایک لوٹا تھا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پینے اور وضو کرنے کیلئے میں پانی رکھتا تھا اور اس کے منہ پر کپڑے کا ایک ٹکڑا پڑا ہوا تھا میں دودھ لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا مگر بیدار کرنا مناسب نہ سمجھا اور بیدار کرنے کی نیت سے کھڑے کھڑے دودھ کے برتن میں پانی ڈالنے لگا۔ برتن کا نچلا حصہ ٹھنڈا ہوگیا اتنے میں حضور بیدار ہوگئے میں نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ دودھ پی لیجئے آپ نے پی لیا اور میں خوش ہوگیا پھر فرمایا کیا ابھی روانگی کا وقت نہیں آیا میں نے عرض کیا آگیا چنانچہ دھوپ ڈھلنے کے بعد ہم روانہ ہوگئے۔

ام معبد کی بکری:

طبرانی، حاکم، ابونعیم اور ابوبکر شافعی نے حضرت سلیط بن عمرو انصاری کی روایت سے بیان کیا اور حاکم نے اس کو صحیح بھی کہا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ اور عامر بن فہیرہ اور راہنما مدینے کو جانے کے ارادہ سے نکلے تو ان کا گذر ام معبد خزاعی کے خیمہ کی طرف سے ہوا ام معبد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانتی نہ تھی۔ ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ پردہ نہ کرتی تھی پاکدامن تھی خیمہ کے صحن میں بیٹھا کرتی تھی اور مسافروں کو کھلاتی پلاتی تھی، ان حضرات نے اس سے گوشت اور چھوارے مول لینے کی غرض سے طلب کیے مگر چونکہ اس زمانہ میں وہ لوگ ناز اور کال میں مبتلا تھے۔ اس لئے ام معبد کے پاس کچھ نہ تھا۔ کہنے لگی خدا کی قسم اگر ہمارے پاس کچھ ہوتا تو ہم تم کو دکھ میں نہ رکھتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خیمہ کے ایک کونے میں ایک بکری دکھائی دی فرمایا ام معبد یہ بکری کیسی ہے ام معبد نے کہا کمزوری کی وجہ سے بکریوں کے ساتھ (جنگل کو) نہیں جاسکی ہے۔ فرمایا کیا اس کے پاس دودھ ہے، ام معبد نے عرض کیا یہ تو بہت ہی کمزور ہے۔ فرمایا کیا تمہاری اجازت ہے میں اس کو دوہ لوں ام معبد نے عرض کیا میرے ماں باپ قربان اس کے پاس تو کبھی نر نہیں آیا اگر آپ کو اس کے پاس دودھ معلوم ہوتا ہے تو آپ کو اختیار ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بلوا کر اس کے تھنوں کو اور پشت کو سہلایا اور بسم اللہ کہی اور ام معبد کے لئے بکری کے سلسلے میں کچھ دعا کی۔ بکری نے فوراً ٹانگیں چیر دیں اور دودھ جاری ہوگیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک برتن منگوایا برتن اتنا بڑا تھا کہ وہ سب لوگ اس میں دودھ پی کر سیر ہو جایا کرتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی برتن میں دودھ دوہا، دودھ کے جھاگ منہ تک آگئے اور دودھ اوپر تک بھر گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ام معبد کو (اول) دودھ پلایا وہ سیر ہوگئی تو اپنے ساتھیوں کو پلایا وہ بھی سیر ہوگئے تو خود پیا اور فرمایا پلانے والے کو سب سے آخر میں پینا چاہیئے پھر دوبارہ دوہا پھر بھی برتن بھر گیا اور بھرا برتن اس کے پاس چھوڑ کر سب روانہ ہوگئے ابن سعد اور ابونعیم نے ام معبد کا بیان نقل کیا ہے کہ جس بکری پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ پھیرا تھا وہ میرے پاس ۱۸ھ میں بھی تھی جو حضرت عمر کی خلافت کا زمانہ تھا یہ سال انتہائی کال کا تھا روئے زمین پر (سبزی نام کی) کوئی چیز باقی نہ رہی تھی مگر ہم کو صبح شام اس بکری کا دودھ دوہا کرتے تھے (یعنی وہ برابر دودھ دیتی تھی) اس کا دودھ خشک نہ ہوا تھا)

بیہقی نے دوسرے طریقہ سند کے کچھ کمی بیشی کے ساتھ ام معبد کا قصہ نقل کیا ہے کہ شام کو ام معبد کا بیٹا اپنی بکریاں لے کر واپس آیا تو ام معبد نے اس سے کہا یہ باکھر بکری اور چھری ان دونوں آدمیوں کے پاس لے جا اور ان سے جا کر کہہ دے کہ میرے باپ نے کہا ہے آپ لوگ اس بکری کو ذبح کر کے (بھون کر) کھالیں اور کھلا دیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لڑکے سے فرمایا تو چھری لے جا اور ایک بڑا پیالہ لے آ۔ اس نے کہا یہ تو باکھر ہے اس کے پاس دودھ نہیں ہے۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے تھنوں پر ہاتھ پھیرا اور پیالہ بھر کر دودھ دوہا۔ اس روایت میں ہے کہ حضرت ابوبکر نے فرمایا ہم دو رات وہاں ٹھیرے رہے پھر روانہ ہوگئے۔

اُمّ معبد کا مسلمان ہونا:

ام معبد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبارک کہنے لگی اس کی بکریاں بہت ہوگئیں یہاں تک کہ (کچھ مدت کے بعد) وہ بکریاں لے کر مدینے کو آئی اس کی طرف سے حضرت ابوبکرؓ کا گذر ہوا ام معبد کے بیٹے نے آپ کو دیکھ لیا اور پہچان لیا اور اپنی ماں سے کہا اماں یہ آدمی وہی ہے جو مبارک کے ساتھ تھا ام معبد اٹھ کر حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئی اور بولی اے عبداللہ وہ آدمی جو تمہارے ساتھ تھا کون شخص ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا وہ اللہ کے نبی ہیں

، کہنے لگی مجھے ان کے پاس لے چلو۔ (حضرت ابوبکرؓ اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گئے)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کھانا کھلایا اور کپڑے دیئے اور وہ مسلمان ہو گئی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ جو ام معبد نے بیان کیا:

ہشام بن جبش کا بیان ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد معبد کا باپ دبلی حاملہ بکریاں ہنکاتا گھر واپس آیا اور دودھ کو دیکھ کر تعجب سے پوچھا معبد کی ماں یہ دودھ تمہارے پاس کہاں سے آیا، بکریاں تو دور (جنگل میں) تھیں اور گھر میں کوئی دودھیا بکری نہ تھی۔ معبد کی ماں نے کہا یہ ایک بابرکت آدمی کی برکت ہے۔ جس کا واقعہ اس اس طرح ہوا۔ معبد کے باپ نے کہا ام معبد اس کے کچھ حالات بیان کرو۔ ام معبد نے کہا ایک چمکدار چہرے والا روشن روشاندار حسین خوش اخلاق آدمی تھا۔ نہ تو ند نکلنے کی وجہ سے وہ بدہیئت تھا نہ سر چھوٹا ہونے کے سبب حقیر معلوم ہوتا تھا۔ (یعنی نہ تو ندیلا ہونے کا اس میں عیب تھا نہ سر چھوٹا ہونے سے پیدا ہونے والی حقارت) سیاہ کشادہ چشم اور گھنی پلکوں والا تھا۔ اس کی آواز میں گرج یا تیزی تھی داڑھی گھنی بھنویں پتلی لمبی اور ملی ہوئی تھیں خاموشی کے وقت باوقار اور کلام کرنے کے وقت پررونق، دور سے بہت ہی حسین اور روشن چہرہ نظر آتا تھا اور قریب سے بڑا شیریں اور خوش (گفتار) اس کا کلام بلیغ ،مناسب ممتاز تھا نہ کم ناقص نہ زیادہ بکواس۔ گفتگو پروئے ہوئے موتیوں کی طرح تھی۔ اس کا قد میانہ تھا نہ زیادہ طویل عیب دار نہ اتنا چھوٹا کہ آنکھوں کو حقیر معلوم ہو۔ اس کا قد دو ٹہنیوں کے درمیان کی ٹہنی تھی۔ نہایت خوش منظر اور عالی قدر۔ اس کے ساتھی اس کو گھیرے رہتے تھے۔ اگر وہ کہتا کہ سنو تو کان لگا کر خاموشی کے ساتھ اس کی بات سنتے تھے اور اگر وہ کوئی حکم دیتا تو تعمیل حکم کیلئے ایک دوسرے سے پیش قدمی کرتا تھا وہ مخدوم مطاع تھا بدخلق نہ تھا۔

ابو معبد نے کہا خدا کی قسم یہ تو وہی قریشی ہے جس کے مکہ میں ظہور کا ہم سے ذکر کیا گیا تھا میرا ارادہ تو اس کے پاس رہنے کا تھا اور اگر مجھے کوئی راہ ملی تو آئندہ ضرور ایسا کروں گا۔

ابوجہل کا حضرت ابوبکر کے گھر جانا:

حضرت اسماء کا بیان ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ نکل کر چلے گئے تو ہمارے پاس کچھ قریشی آئے جن میں ابوجہل بھی تھا آکر دروازہ پر کھڑے ہو گئے میں باہر نکل کر گئی ان لوگوں نے مجھ سے پوچھا تیرا باپ کہاں ہے۔ میں نے کہا خدا کی قسم مجھے نہیں۔ معلوم میرے باپ کہاں ہیں ابوجہل بڑا بدکلام خبیث تھا اس نے میرے رخسار پر ایک طمانچہ مارا جس سے میری بالی گر پڑی پھر سب لوٹ گئے۔ ہم تین روز اسی حالت میں رہے، ہم کو معلوم نہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کدھر گئے۔

جن کے اشعار: تین روز کے بعد مکہ کے نشیبی جانب سے ایک جن عرب کے گانے کی طرح کچھ اشعار گاتا ہوا آیا لوگ اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے مگر وہ دکھائی کسی کو نہ دیتا تھا۔ اشعار کا ترجمہ۔ مالک عرش جزائے خیر دے ان دو ساتھیوں کو جنہوں نے ام معبد کے خیمہ میں دو پہر کو قیام کیا دونوں اس خیمہ میں ہدایت کے ساتھ اترے جس سے مجھے ہدایت مل گئی اور جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھی ہو گیا وہ کامیاب ہو گیا، اے بنی قصی اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے تمہاری طرف سے ناقابل مقابلہ فضائل اور سرداری کو نہیں روکا۔ بنی کعب کو مبارک ہو کہ ایک عورت مسلمانوں کے گھات کے راستہ میں مقیم تھی اور وہیں وہ رہتی تھی۔ اپنی بہن سے اس کی بکری اور برتن کے متعلق دریافت کرو اگر تم بکری سے پوچھو گے تو وہ شہادت دیگی ایک گابھن بکری اس نے منگوائی اور اس نے اپنے تھنوں کی جڑوں سے خالص جھاگ دار دودھ دیا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم وہ بکری اسی عورت کے پاس چھوڑ گئے تاکہ دودھ دوہنے والا اس کو پانی پر اتارتے اور پانی سے نکالتے وقت دوہے (یعنی ام معبد کا شوہر اس بکری کو دوہا کرے اور جنگل کو لے جائے اور پانی پلانے کیلئے چشمے پر اتارے اور پھر پانی پلا کر وہاں سے واپس لائے)۔

قریشیوں کا ام معبد کے پاس جانا:

بیہقی کی روایت میں حسن سند کے ساتھ ام معبد کے قصہ کے ذیل میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلاش کرتے کرتے قریش ام معبد کے پاس پہنچے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اس سے دریافت کیا اور حلیہ بیان کیا ام معبد نے جواب دیا تم کیا کہتے ہو ایک مہمان ہمارے پاس ٹھہرا تھا اور گابھن بکری کا اس نے دودھ دوہا تھا۔ قریش نے کہا ہمارا مقصد اسی شخص کو دریافت کرنا تھا۔

سراقہ کا قصہ: شیخین نے صحیحین میں نیز امام احمد نے سراقہ کی روایت سے اور امام احمد و یعقوب بن سفیان نے حضرت ابوبکرؓ کے حوالے سے بیان کیا۔ سراقہ کا بیان ہے کفار قریش کے قاصد ہمارے پاس آئے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کے قتل یا گرفتار کرنے والے کیلئے ایک انعام مقرر کیا اور کہا کہ دونوں میں جس کسی کو کوئی قتل یا گرفتار کرے گا اس کو سو اونٹنیاں دی جائیں گی۔ میں اپنی قوم بنی مدلج کے ساتھ ایک جلسہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک آدمی آکر کھڑا ہوا اور اس نے کہا سراقہ میں نے ابھی ساحل پر کچھ اشخاص دیکھے ہیں، دوسری روایت میں ہے تین سوار دیکھے ہیں میرے خیال میں وہ محمد اور ان کے ساتھی تھے یہ سنتے ہی میں پہچان گیا کہ ہوں نہ ہوں وہی ہوں گے۔ میں نے اس شخص کو اشارہ کیا کہ خاموش رہو وہ خاموش ہو گیا میں اٹھ کر گھر میں گیا اور باندی کو حکم دیا کہ میرا گھوڑا لے کر بطن وادی میں پہنچا دے اور خود اپنے خیمہ کے پیچھے سے ہتھیار لے کر نکل چلا اور نیزہ کو

گھسیٹتا گیا۔ بلم کا بالائی حصہ نیچے کو کر دیا۔ اس طرح گھوڑے تک پہنچا اور سوار ہو کر تیز دوڑاتا ہوا چل دیا۔ یہاں تک کہ مجھے دونوں شخص نظر پڑ گئے۔ قریب ہی پہنچا ہی تھا کہ گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور میں نیچے گر پڑا میں پھر اٹھ کھڑا ہوا اور ترکش کی طرف ہاتھ بڑھا کر اس میں سے فال لینے کے لئے تیر نکالے کہ میں ان کو نقصان پہنچا سکوں گا یا نہیں، فال لینے پر تیر وہی نکلا جو مجھے پسند نہیں تھا یعنی فال یہ نکلی کہ میں ان کو ضرر نہ پہنچا سکوں گا۔ مگر مجھے امید تھی کہ میں اس فال کو الٹ دوں گا اور سو اونٹنیاں لے لوں گا چنانچہ میں پھر گھوڑے پر سوار ہو گیا اور تیروں کی فال نہ مانی اور گھوڑے کو تیز دوڑاتا چلاتا کہ وہ مجھے قریب پہنچا دے۔ میں اتنا قریب پہنچ گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرآن پڑھنے کی آواز میں نے سن لی آپ کی توجہ میری طرف نہ تھی مگر حضرت ابوبکرؓ میری طرف زیادہ متوجہ تھے۔ اسی حالت میں اچانک میرے گھوڑے کے دونوں پاؤں گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے اور میں نیچے گر پڑا۔ میں نے گھوڑے کو جھڑکا اور خود اٹھا مگر گھوڑا پاؤں باہر نہ نکال سکا۔ گھوڑے نے کوشش کی کہ قدم باہر نکال لے اس کوشش میں دھوے کی طرح غبار اٹھ کر اوپر چڑھ گیا۔ میں نے پھر تیروں سے فال لی مگر وہی فال نکلی کہ میں ان کو ضرر نہ پہنچا سکوں گا آخر میں جان گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے محفوظ کر دیئے گئے ہیں اور وہ غالب آئیں گے مجبوراً میں نے امان کیلئے پکارا اور کہا دیکھو میری کیا حالت ہے میں خدا کی قسم ہرگز تم کو کوئی اذیت نہیں پہنچاؤں گا اور میری طرف سے تمہارے لئے کوئی ناخوشگوار حرکت نہ ہوگی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا اس سے پوچھو کیا چاہتا ہے میں نے کہا آپ کی قوم نے آپ کے سلسلہ میں انعام مقرر کیا ہے غرض لوگوں کا جو مقصد تھا میں نے اسکی اطلاع آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دی۔ کچھ زادِ راہ اور سامان کی بھی پیش کش کی مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے کوئی تکلیف نہ دی نہ کچھ مانگا صرف اتنا فرمایا کہ ہماری خبر ظاہر نہ کرنا میں نے درخواست کی کہ (آئندہ کیلئے) مجھے کوئی پروانہ امن لکھ دیجئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ابوبکرؓ اس کو لکھ دو۔ دوسری روایت میں ہے کہ عامر بن فہیرہ کو لکھ دینے کا حکم دیا۔ عامر نے چمڑے کے ایک ٹکڑے پر لکھ دیا پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم آگے چل دیئے اور (علاقہ) مدینہ میں داخل ہونے کے وقت حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا نبی کے لئے جھوٹ بولنا سزاوار نہیں (اس لیے اگر لوگ مجھ سے پوچھیں گے کہ کیا پیغمبر (یہ تو مجھے صاف کہنا پڑے گا) تم لوگوں کو (کسی تدبیر سے ٹال دینا۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ سے جب دریافت کیا گیا آپ کون ہیں تو آپ نے جواب دیا ایک غرض مند۔ اور جب پوچھا گیا یہ تمہارے ساتھ والے کون ہیں تو حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا راہنما جو مجھے راستہ بتاتے ہیں۔

نیک فال: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے قریب پہنچے تو ابو بردہ اسلمی نے اپنی قوم بنی اسہم کے ستر آدمیوں کو لیکر آپ کا استقبال کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم کون ہو ابو بردہ نے کہا بریدہ حضور نے فرمایا ابوبکر ہمارا کام درست اور ٹھیک ہو گیا۔ بریدہ کا معنی ہے ٹھنڈا۔ برودت ٹھنڈک، اردو میں اگرچہ ٹھنڈا ہو جانے یا ٹھنڈک پڑ جانے کا مطلب ہوتا ہے کسی بات کا ختم ہو جانا مگر عربی میں اس کا مفہوم ہے درست ہو جانا کیونکہ جب اختلاف اور جھگڑے کی آگ بجھ جائے گی اور خصومت کی گرمی جاتی رہے گی۔ تو معاملہ میں خنکی یعنی درستگی پیدا ہو جائے گی۔ رسول اللہ نے لفظ بریدہ سن کر اسی مبارک فال کی طرف اشارہ کیا اور استقبال کرنے والے کا نام سنتے ہی اپنے کام کی درستگی پر استدلال کیا) فرمایا کس قبیلہ سے ہو ابو بردہ نے کہا بنی اسلم سے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا ہم کو سلامتی حاصل ہوگئی (لفظ اسلم سے سلامتی پر استدلال کیا) پھر فرمایا بنی اسلم کس کی شاخ ہے۔ ابو بردہ نے عرض کیا بنی سہم کی، فرمایا تیرا سہم (حصہ یا تیر) نکل آیا۔

جھنڈا: صبح ہوئی تو بریدہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا مدینہ میں داخل ہوتے وقت آپ کا ایک جھنڈا ہونا ضروری ہے چنانچہ انہوں نے اپنا عمامہ خود کھول کر اس کا پھریرا بنایا اور ایک نیزے میں باندھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سے گذرے۔

مکہ سے روانگی اور مدینہ میں روانگی کا دن:

حاکم نے لکھا ہے یہ خبر متواتر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے دوشنبہ کے دن برآمد ہوئے تھے اور دوشنبہ ہی کو مدینے میں داخل ہوئے صرف محمد بن موسیٰ خوارزمی جمعرات کے دن مکہ سے روانگی کے قائل ہیں، حافظ (ابن حجر) نے دونوں قولوں کا تعارض اس طرح دور کیا کہ مکہ سے جمعرات کے دن برآمدگی ہوئی اور تین رات غار میں رہے شب جمعہ شب شنبہ شب یک شنبہ پھر پیر کی رات کو غار سے برآمد ہوئے۔ میں کہتا ہوں شاید جمعرات کی رات ہی کو مشورہ کے بعد قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دینے کا ارادہ کیا تھا اور اسی رات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مکان سے نکل کر حضرت ابوبکرؓ کے مکان پر گئے تھے اور دونوں ساتھ ہو کر مکان کی پشت کی طرف والے دریچہ سے برآمد ہوئے تھے واللہ اعلم۔ (تفسیر مظہری)

حضرت ابوبکرؓ کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق و محبت کی دلیل

معاذ اللہ۔ معاذ اللہ اگر ابوبکرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن ہوتے تو جب کافر غار کے منہ پر پہنچے تھے اس وقت ان کو چلانے اور یہ کہنے سے کون روکتا تھا کہ محمد

صلی اللہ علیہ وسلم جس کو تم ڈھونڈتے پھرتے ہو یہ اس غار میں میرے پاس بیٹھا ہے اور ان کے بیٹے عبدالرحمٰن اور ان کی بیٹی اسماء کو جو کھانا لے کر غار پر آتے جاتے تھے ان کو اس امر سے کون مانع تھا کہ کفار سے کہہ دیتے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ ہم کو معلوم ہے آؤ ہم تم کو وہاں لے چلیں۔ خدا ایسے تعصب سے ہر مسلمان کو محفوظ رکھے آمین۔

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند قدس اللہ سرہ ہدیۃ الشیعہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ لفظ لاتحزن جس کا مطلب یہ ہے کہ تو غمگین نہ ہو یہ لفظ ابوبکر کے عاشق صادق اور مومن مخلص ہونے پر دلالت کرتا ہے ورنہ ان کو غمگین ہونے کیا ضرورت تھی بلکہ موافق عقیدہ شیعہ معاذ اللہ اگر ابوبکرؓ دشمن رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے تو یہ نہایت خوشی کا محل تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خوب قابو میں آئے ہوئے ہیں اسی وقت پکار کر دشمنوں کو بلا لینا تھا تا کہ نعوذ باللہ وہ اپنا کام کر لیتے دشمنوں کیلئے اس سے بہتر اور کون سا موقع تھا مگر کہیں انصاف کی آنکھیں اگر مول ملیں تو ہم حضرات شیعہ کے لئے مول لے لیں اور ان کو دے دیں تا کہ وہ کچھ تو پاس رفاقت خلیفہ اول کریں۔

جو پاس مہر و محبت یہاں کہیں ملتا تو مول لیتے ہم اپنے مہرباں کیلئے

غار میں تنہائی تھی ابوبکرؓ کو اس تنہائی میں مار ڈالنے کا بہت اچھا موقع تھا وہاں کون پوچھتا تھا مار کر کہیں چل دیتے اور ابوبکر کے فرزند ارجمند یعنی عبداللہ بن ابی بکر غار ثور پر جاسوسی کیلئے مقرر تھے انہیں کے ذریعہ دشمنوں کو اطلاع کرا دیتے یا اسماء بنت ابی بکر جو غار پر کھانا لے کر آیا کرتی تھیں ان کے ذریعہ دشمنوں کو اطلاع کرا دیتے اگر خاندان صدیقی کو کچھ بھی عداوت ہوتی تو یہ راز داری اور جان نثاری کے معاملے نہیں ہو سکتے تھے۔

غرض یہ کہ ابوبکر کا رنجیدہ اور غمگین ہونا اور دشمنوں کو دیکھ کر رونا یہ سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق اور محبت میں تھا اگر ابوبکر کو اپنی جان کا ڈر ہوتا تو بجائے حزن کے خوف کا لفظ مستعمل ہوتا اس لئے کہ عربی زبان میں حزن کا لفظ رنج و غم کی جگہ یا محبوب کے فراق یا تمنا کے فوت ہو جانے کے محل میں استعمال کرتے ہیں اور جہاں جان پر بنتی ہو اور ڈر کا مقام ہو وہاں خوف کا لفظ استعمال کرتے ہیں چنانچہ موسیٰ علیہ السلام جب کوہ طور پر گئے اور پیغمبری ملی تو خدا تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنے عصاء کو زمین پر ڈالو۔ ڈالا تو اژدہا بن گیا موسیٰ علیہ السلام اس سے ڈر کر ایسے بھاگے کہ پیچھے پھر کر بھی نہ دیکھا اس وقت خداوند کریم نے یہ فرمایا:

اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ اِنِّیْ لَا یَخَافُ لَدَیَّ الْمُرْسَلُوْنَ

''ادھر آ اور ڈر مت میرے پاس رسول ڈرا نہیں کرتے۔''

حضرت ابوبکرؓ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم:

اس جگہ موسیٰ علیہ السلام کو اپنی جان کا ڈر ہوا اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو تسلی کیلئے یہ فرمایا لاتخف ڈرومت اور یوں نہیں فرمایا۔ لاتحزن یعنی رنجیدہ اور غمگین نہ ہو۔ اور اسی طرح موسیٰ علیہ السلام نے جب ایک قبطی کو مار ڈالا اور ان کو ڈر رہا کہ فرعون کے لوگ مجھ کو مار ڈالیں گے تو موسیٰ وہاں سے ڈر کر بھاگے اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا **فخرج منها خائفا** یعنی موسیٰ علیہ السلام وہاں سے ڈرتے ہوئے نکلے اور بیسیوں جگہ کلام اللہ میں خوف کا لفظ موجود ہے۔ اور یہی معنی ہیں اور جہاں غم کا مقام ہے وہاں حزن کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ اپنے ایک وعظ میں فرماتے ہیں۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو جب غار ثور میں کفار کے آنے سے پریشانی ہوئی تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تسلی کیلئے یہ فرمایا **لاتحزن ان اللّٰه معنا**. معنا میں ضمیر جمع لائے اور صدیق اکبر کو بھی اس معیت میں شریک فرمایا اور موسیٰ علیہ السلام کے اصحاب کو جب فرعون اور اس کے لشکر کے آجانے سے پریشانی ہوئی تو موسیٰ علیہ السلام نے یہ فرمایا **کلا ان معی ربی سیهدین** لفظ معی کو بصیغہ مفرد فرمایا یعنی اللہ میرے ساتھ ہے اور معنا صیغہ جمع کا نفرمایا جس کے معنی یہ ہوتے کہ وہ ہم سب کے ساتھ ہے۔ غرض یہ کہ موسیٰ علیہ السلام نے معیت خداوندی کو اپنے ساتھ مخصوص فرمایا اور قوم کو اس دولت میں شریک نہ کیا وجہ فرق کی یہ ہے کہ صدیق اکبر کو اپنی کوئی پریشانی نہ تھی۔ پریشانی فقط حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی کہ مبادا کوئی دشمن آپ کو دیکھ لے اور حضرت صدیقؓ دولت توکل سے مالا مال تھے ان کی تسلی کیلئے یہی کلام مناسب تھا جو حضور پرنور نے استعمال فرمایا اور معیت الٰہیہ میں ان کو شریک کیا اور موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جو لوگ تھے وہ نہ تو حضرت صدیقؓ کے برابر متوکل تھے اور نہ یار غار کی طرح حضرت موسیٰ کے عاشق زار اور جاں نثار تھے ان کو تو اپنی جان کا خطرہ تھا پھر خطرہ ہی نہیں بلکہ اس کا جزم اور یقین تھا کما قال تعالیٰ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ جس میں ان اور لام تاکید اور جملہ اسمیہ تین موکدات موجود ہیں یعنی بس ہم تو یقیناً پکڑے گئے حالانکہ بارہا اس کا مشاہدہ کر چکے تھے کہ فرعون کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی کس طرح مدد فرمائی اور اس وقت بھی خدا کے حکم سے اور اس کے وعدہ نصرت سن کر چلے تھے اور تمام امور کے ہوتے اتنی پریشانی کہ اپنے پکڑے جانے کا یقین اور جزم کر بیٹھے جو ان کے غیر متوکل اور غیر کامل الیقین ہونے کی دلیل ہے۔ اس لئے موسیٰ علیہ السلام نے ان کو دھمکا کر فرمایا۔ کلا ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا جس تاکید سے انہوں نے اپنے پکڑے جانے کو ظاہر کیا تھا اس کا جواب بھی تاکید کے ساتھ دیا گیا اور لفظ معی کو مفرد لائے اور باوجود خبر ہونے کے اس کو مقدم کیا تا کہ فائدہ حصر کا حاصل ہو اس لئے کہ تقدیم ماحقہ التاخیر مفید قصر ہوتی ہے مطلب یہ تھا کہ میرے میرا پرودگار ہے اور تم لوگ بوجہ ضعیف الیقین ہونے کے معیت حق سے محروم

ہو ہر ایک کا کلام اپنے اپنے موقعہ پر نہایت بلیغ ہے اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مخاطب صدیق اکبر جیسے ہوتے تو وہ بھی وہی فرماتے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پرنور نے فرمایا اور اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب وہ لوگ ہوتے جو حضرت موسیٰ کے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی وہی فرماتے جو حضرت موسیٰ نے فرمایا بلاغت کے معنی مقتضائے حال کی رعایت کے ہیں۔

حکیم الامت تھانوی کے کلام کا خلاصہ ختم ہوا دیکھو وعظ الرفع والوضع ص ۴۵ نمبر ۳۲ از سلسلہ تبلیغ۔

نیز موسیٰ علیہ السلام کی معیت۔ معیت ربانیہ تھی جس کو موسیٰ علیہ السلام نے اسم رب کے ساتھ ذکر فرمایا۔ ان معی ربی میرے ساتھ میرا پروردگار ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر صدیق کی معیت معیت الہیہ تھی سب کو نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم نے اسم اللہ کے ساتھ ذکر فرمایا۔ ان اللّٰہ معنا تحقیق اللہ ہمارے ساتھ ہے اسی آیت میں حق جل شانہ کی معیت کو اسم اعظم یعنی لفظ اللہ کے ساتھ ذکر فرمایا جو تمام صفات کمال کو جامع ہے اور موسیٰ علیہ السلام نے خدا تعالیٰ کی معیت کو اسم رب کے ساتھ ذکر فرمایا یہ نکتہ عارف کامل شیخ ابن لبان کی کلام کی تشریح ہے۔ جس کو علامہ قسطلانی نے مواہب لدنیہ میں ذکر کیا ہے۔

سکینت کیا ہے:

فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ سکینت سے طمانیت مراد ہے اور شیخ الاسلام ہروی فرماتے ہیں کہ سکینت ایک خاص کیفیت اور حالت کا نام ہے جو تین چیزوں کی جامع ہوتی ہے۔ نور اور قوت اور روح۔ نور سے قلب روشن اور منور ہو جاتا ہے دلائل ایمان اور حقائق ایقان اس پر منکشف ہو جاتے ہیں حق اور باطل۔ ہدایت اور ضلالت شک اور یقین کا فرق اس پر واضح ہو جاتا ہے۔

قوت سے قلب میں عزم اور استقلال پیدا ہوتا ہے حق جل وعلاء کی اطاعت بندگی کے وقت اس کو خاص نشاط حاصل ہونے لگتا ہے اور اسی قوت کی وجہ سے قلب مومن نفس کے تمام دواعی اور مقتضیات کے مقابلہ میں غالب اور کامیاب رہتا ہے۔

اور روح سے قلب میں حیات اور زندگی پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ سے قلب خواب غفلت سے بیدار ہو کر خدا کی راہ میں چست اور چالاک ہو جاتا ہے۔

بخاری اور مسلم میں ہے کہ غزوہ خندق میں عبداللہ بن رواحہ کا یہ رجز آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر تھا۔

اللھم لولا انت ما اھتدینا

اے اللہ اگر تیری توفیق نہ ہوتی تو ہم ہدایت نہ پاتے

ولا تصدقنا ولا صلینا

اور نہ صدقہ دیتے اور اور نہ نماز پڑھتے

فانزلن سکینة علینا

پس تو اپنی خاص تسکین اور طمانیت ہم پر نازل فرما جس سے ہماری پریشانی اور اضطراب دور ہو۔ تفصیل کیلئے مدارج السالکین ص ۲۷۸ ج ۲۔ کی جانب مراجعت کریں۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اپنی سکینت ابوبکر صدیق پر نازل کی کیونکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سکینت الٰہی ہمیشہ رہتی تھی اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے بھی یہی منقول ہے کہ علیہ کی ضمیر صاحبہ یعنی ابوبکر صدیق کی طرف راجع ہے دیکھو زاد المسیر ص ۴۴۰ ج ۳ لابن الجوزی۔ اور امام رازی نے بھی تفسیر کبیر ص ۴۵۱ ج ۴ میں اس کو اختیار کیا ہے کہ علیہ کی ضمیر ابوبکر صدیق کی طرف راجع ہو۔

شیخ فریدالدین عطاء رحمۃ اللہ علیہ منطق الطیر میں فرماتے ہیں۔

خواجہ اول کہ اول یار اوست ثانی اثنین اذ ھما فی الغار اوست

صدر دین صدیق اکبر قطب حق درہمہ چیز از ہمہ بردہ سبق

ریخت درصدر شریف مصطفیٰ ہرچہ حق از بارگاہ کبریا

لاجرم تابود از تحقیق ریخت ثانی اثنین اوبود بعد از رسول

اوہمہ درسینہ صدیق ریخت چوں تو کردی ثانی اثنینش قبول

(معارف القرآن کاندھلوی)

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا			
نکلو	ہلکے	اور	بوجھل

جہاد کی عام دعوت:

یعنی پیادہ اور سوار فقیر اور غنی جوان اور بوڑھے جس حالت میں ہوں نکل کھڑے ہوں۔ نفیر عام کے وقت کوئی عذر پیش نہ لائیں۔ (تفسیر عثمانی)

بعض کے نزدیک مراد یہ ہے کہ دعوت جہاد سنتے ہی فوراً بلا تامل نکل کھڑے ہوں یا تامل وغور اور تیاری کے بعد نکلو زہری کی روایت ہے کہ حضرت سعید بن مسیب کی ایک آنکھ جاتی رہی تھی اسی حالت میں آپ جہاد کو نکلے کسی نے کہا آپ تو بیمار اور دکھی ہیں فرمایا اللہ نے خفیف (تندرست) اور ثقیل (بیمار) سب کو جہاد کی دعوت دی ہے اگر مجھ سے لڑائی نہ ہو سکے گی تو میں مسلمانوں کی جماعت میں اضافہ کا ہی سبب بن جاؤں گا اور سامان کی حفاظت کرتا رہوں گا۔ (تفسیر مظہری)

حضرت ابو ایوب کا جہاد: حضرت ابوایوب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اول غزوے سے لیکر پوری عمر تک سوائے ایک سال کے ہر غزوے میں موجود رہے اور فرماتے رہے کہ خفیف ثقیل دونوں کو نکلنے کا حکم ہے اور انسان کی حالت ان دو حالتوں سے سوا نہیں ہوتی۔ (تفسیر ابن کثیر)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرنے والے:

اور روایت میں ہے کہ ایک نو مسلم صحرائی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سونا چاندی بانٹتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگا کہ اگر اللہ نے تجھے عدل کا حکم دیا ہے تو تو عدل نہیں کرتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو تباہ ہوا اگر میں بھی عادل نہیں تو زمین پر کون عادل ہوگا؟ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس سے اور اس جیسوں سے بچو، میری امت میں اس جیسے لوگ ہوں گے قرآن پڑھیں گے لیکن حلق سے نیچے نہیں اترے گا وہ جب نکلیں انہیں قتل کر ڈالو پھر نکلیں پھر مار ڈالو پھر جب ظاہر ہوں پھر گردنیں مارو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں قسم خدا کی نہ میں تمہیں دوں نہ تم سے روکوں میں تو ایک خازن ہوں۔ جنگ حنین کے مال غنیمت کی تقسیم کے وقت ذوالخویصرہ ہرقوص نامی ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کیا تھا اور کہا تھا تو عدل نہیں کرتا انصاف سے کام کر۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میں بھی عدل نہ کروں تو پھر تیری بربادی کہیں نہیں جا سکتی۔ جب اس نے پیٹھ پھرائی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کی نسل سے ایک قوم نکلے گی جن کی نمازوں کے مقابلے میں تم میں سے ایک کو اپنے روزے حقیر معلوم ہوں گے لیکن وہ دین سے ایسے نکل جائیں گے جیسے تیر شکار سے تمہیں جہاں بھی وہ مل جائیں ان کے قتل میں کمی نہ کرو آسمان تلے ان مقتولوں سے بدتر مقتول اور کوئی نہیں الخ۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ

اور لڑو اپنے مال سے اور جان سے اللہ کی

اللَّهِ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٤١﴾

راہ میں یہ بہتر ہے تمہارے حق میں اگر تم کو سمجھ ہے

یعنی دنیوی اور اخروی ہر حیثیت سے۔ (تفسیر عثمانی)

غزوہ کیلئے صحابہ کرام کے بڑھ چڑھ کر عطیات:

محمد بن عمر کا بیان ہے کہ خیرات کرنے یعنی تبوک کے لشکر کو تیار کرنے (اور اس کے لئے چندہ دینے) کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترغیب دی سب سے پہلے حضرت ابوبکر اپنا مال یعنی چار ہزار درہم لے کر آئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم نے گھر والوں کیلئے بھی کچھ چھوڑ دیا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا میں نے ان کیلئے اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑا ہے۔ حضرت عمرؓ اپنا آدھا مال لے کر آئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا گھر والوں کیلئے بھی تم نے کچھ چھوڑا ہے۔ انہوں نے عرض کیا جی ہاں جتنا لایا ہوں اتنا ہی چھوڑ کر آیا ہوں۔ حضرت عباسؓ نے حضرت طلحہؓ بن عبیداللہ اور حضرت سعدؓ بن عبادہ کو سواریاں دیں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے دوسو اوقیہ (سونا) لا کر خدمت گرامی میں پیش کیا اور حضرت عاصم بن عدی نے نوے وسق چھوارے دیئے (ایک وسق ساٹھ صاع ایک صاع تقریباً چار سیر)۔ حضرت عثمان بن عفان نے ایک تہائی لشکر تیار کیا، یہاں تک کہ لوگ کہتے تھے اس لشکر کی ہر ضرورت حضرت عثمانؓ نے پوری کی۔ محمد بن یوسف صالحی نے کہا تبوک کی فوج تیس ہزار سے زائد تھی پس حضرت عثمانؓ نے دس ہزار کو پورا سامان دے کر تیار کیا۔

ابوعمر نے الدرر میں لکھا ہے اور اسی کے اتباع میں الاشارہ میں بھی ذکر کیا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے نوسو اونٹ اور ایک سو گھوڑے کل ساز و سامان سمیت سواری کیلئے دیئے تھے۔

ابن اسحاق نے لکھا ہے حضرت عثمانؓ نے اس لشکر کی تیاری میں اتنا خرچ کیا کہ کسی اور نے اتنا خرچ نہیں کیا۔ ابن ہشام نے معتبر روایت سے بیان کیا ہے کہ جیش عسرت (تبوک کی فوج) کیلئے حضرت عثمانؓ نے دس ہزار درہم خرچ کئے۔ محمد بن یوسف صالحی نے کہا یعنی علاوہ سواریاں اور ان کا ساز و سامان دینے کے دس ہزار خرچ کیے۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی الٰہی تو عثمانؓ سے راضی ہو میں اس سے راضی ہوں۔

امام احمد ترمذی اور بیہقی نے حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ کی روایت سے بیان کیا ہے اور ترمذی نے اس روایت کو حسن کہا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے ایک ہزار دینار لا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں ڈال دیئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اشرفیوں کو دست مبارک سے الٹ پلٹ کرتے جاتے اور بار بار فرماتے جاتے تھے۔ آج کے بعد عثمان جو عمل بھی کرے اس کو ضرر نہیں پہنچے گا (یعنی کسی عمل کا گناہ نہ ہوگا یا کوئی عمل گناہ کے قابل ہی نہ ہوگا۔) (تفسیر مظہری)

لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيبًا وَسَفَرًا قَاصِدًا لَّا

اگر مال ہوتا نزدیک اور سفر ہلکا تو وہ لوگ ضرور

تَّبَعُوكَ وَلَٰكِن بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ۚ

تیرے ساتھ ہو لیتے لیکن لمبی نظر آئی اُن کو مسافت

یہ منافقین کو فرمایا کہ اگر سفر ہلکا ہوتا اور بے محنت مال غنیمت ہاتھ آنے کی توقع ہوتی تو جلدی سے ساتھ ہو لیتے لیکن ایسی کٹھن منزلوں کا طے کرنا ان۔سے کہاں ممکن ہے؟

وَسَيَحْلِفُونَ بِاللَّهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا

اور اب قسمیں کھائیں گے اللہ کی کہ اگر ہم سے ہو سکتا تو ہم ضرور چلتے

مَعَكُمْ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ

تمہارے ساتھ وبال میں ڈالتے ہیں اپنی جانوں کو اور اللہ جانتا ہے

اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۴۲﴾

کہ وہ جھوٹے ہیں

یا تو نکلنے سے پہلے قسمیں کھا کر طرح طرح کے حیلے حوالے کریں گے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو مدینہ میں ٹھہرے رہنے کی اجازت دیدیں اور یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی واپسی کے بعد جھوٹی قسمیں کھا کر باتیں بنائیں گے تا کہ اپنے نفاق پر پردہ ڈالیں۔ حالانکہ خدا سے ان کا جھوٹ اور نفاق پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ یہ نفاق و فریب دہی اور جھوٹی قسمیں کھانا انجام کار انہیں کے حق میں وبال جان ہوگا۔

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى

اللہ بخشے تجھ کو کیوں رخصت دیدی تو نے اُن کو یہاں تک کہ

يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ

ظاہر ہو جاتے تجھ پر سچ کہنے والے اور جان لیتا

الْكٰذِبِيْنَ ﴿۴۳﴾

تو جھوٹوں کو

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فراخدلی:

منافقین جھوٹے عذر کر کے جب مدینہ میں ٹھہرے رہنے کی اجازت طلب کرتے تو آپ ان کے کید و نفاق سے اغماض کر کے اور یہ سمجھ کر کہ ان کے ساتھ چلنے میں فساد کے سوا کوئی بہتری نہیں اجازت دیتے تھے۔ اس کو فرمایا کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اجازت نہ دیتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ کیونکہ اس وقت ظاہر ہو جاتا کہ انہوں نے اپنے نہ جانے کو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت پر موقوف نہیں رکھا ہے۔ جانے کی توفیق تو انہیں کسی حال نہ ہوتی۔ البتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو ان کا جھوٹ سچ کھل جاتا۔ پس اجازت دینا کوئی گناہ نہ تھا، البتہ نہ دینا مصالح حاضرہ کے اعتبار سے زیادہ موزوں ہوتا۔ اس اعلیٰ و اکمل صورت کے ترک کی وجہ سے خطاب کو "عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ" سے شروع فرمایا۔ عفو کا لفظ ضروری نہیں کہ گناہ ہی کے مقابلہ میں ہو۔ بعض محققین "عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ" اس جملہ کو صدر کلام میں محض دعا و تعظیم کے طور پر لیا ہے جیسا کہ عرب کے محاورات میں شائع تھا، مگر سلف سے وہ ہی منقول ہے جو ہم نے پہلے بیان کیا۔ اور لفظ "لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ" اسکی تائید کرتا ہے واللہ اعلم۔

نکتہ: عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ سفیان بن عیینہ نے کہا، رسول اللہ پر مہربانی فرمانے اور عزت بخشنے کیلئے اظہار قصور سے پہلے اعلان عفو فرمادیا (یعنی قصور کا اظہار لم اذنت میں کیا اور لم اذنت سے پہلے عفا اللہ عنک فرمادیا) میں کہتا ہوں اگر اظہار عتاب پہلے کیا جاتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وفات پا جانے کا اندیشہ تھا کیونکہ اللہ کا خوف اور اس سے خشیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو انتہائی درجہ کا تھا اس اندیشہ سے بچاؤ کیلئے اظہار عفو پہلے کر دیا۔

بعض نے کہا یہ کلمہ (یعنی عفا اللہ عنک) دعائیہ ہے (خبر نہیں ہے) جیسے کسی کی نظر میں اپنے کسی دوست کی عزت ہو تو وہ اپنے دوست سے کہتا ہے اللہ تجھے معاف کرے تو نے میرے کام کے سلسلہ میں کیا کیا اللہ تجھ سے راضی ہو تو ملاقات کو بھی نہیں آیا۔ بعض نے کہا عفا اللہ عنک کا مطلب ہے اللہ تیرے لئے ہمیشہ معافی قائم رکھے۔

قاضی عیاض نے لکھا ہے گناہ معاف کر دینے کا قائل اس آیت میں وہی کر سکتا ہے جو عربی کلام سے ناواقف ہو۔ آیت میں مراد تو یہ ہے کہ اللہ نے تمہارے لئے اس فعل کو گناہ نہیں قرار دیا اور بات بھی یہی تھی، اللہ کی طرف سے عذر کو قبول کرنے کی کوئی ممانعت بھی نہیں آئی تھی کہ اس کے خلاف کرنے کو گناہ قرار دیا جائے۔ نہ اللہ نے اس کو گناہ قرار دیا بلکہ اہل علم نے تو اس کو عتاب بھی نہیں کہا۔ (تفسیر مظہری)

لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ

نہیں رخصت مانگتے تجھ سے وہ لوگ جو ایمان لائے اللہ پر

وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ

اور آخرت کے دن پر اس سے کہ لڑیں اپنے مال

وَاَنْفُسِهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۴﴾

اور جان سے اور اللہ خوب جانتا ہے ڈر والوں کو

اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ

رخصت وہی مانگتے ہیں تجھ سے جو نہیں ایمان لائے اللہ پر

وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ

اور آخرت کے دن پر اور شک میں پڑے ہیں دل

فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ﴿۴۵﴾

اُن کے سو وہ اپنے شک ہی میں بھٹک رہے ہیں

مؤمنین کی شان: یعنی جن کے دلوں میں ایمان وتقویٰ کا نور ہے ان کی یہ شان نہیں کہ جہاد سے الگ رہنے کی اس طرح بڑھ بڑھ کر اجازت حاصل کریں۔ ان کا حال تو وہ ہے جو اس پارہ کے آخر میں بیان ہوا ہے۔

''تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ''

یعنی بے سروسامانی وغیرہ کے عذر سے اگر ''جہاد فی سبیل اللہ'' کے شرف سے محروم رہ جائیں تو اس فضل کے فوت ہوجانے پر ان کی آنکھیں اشکبار ہوتی ہیں۔ بے حیا بن کر جہاد سے علیحدہ رہنے کی اجازت لینا انہی کا شیوہ ہے جن کو خدا کے وعدوں پر یقین نہیں نہ آخرت کی زندگی کو سمجھتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے اسلام و مسلمین کے غالب و منصور ہونے کی جو خبریں دی ہیں ان کے متعلق ہمیشہ شک وشبہ میں گرفتار رہتے ہیں۔

وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً
اور اگر وہ چاہتے نکلنا تو ضرور تیار کرتے کچھ سامان اُس کا
وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ
لیکن پسند نہ کیا اللہ نے اُن کا اُٹھنا سو روک دیا
وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿۴۶﴾
اُن کو اور حکم ہوا کہ بیٹھے رہو ساتھ بیٹھنے والوں کے

منافقوں کو اللہ نے جہاد سے دُور رکھا:

ان کا ارادہ ہی گھر سے نکلنے کا نہیں۔ ورنہ اس کا کچھ تو سامان کرتے۔ حکم جہاد سنتے ہی جھوٹے عذر نہ لے دوڑتے۔ واقعہ یہ ہے کہ خدا نے ان کی شرکت کو پسند ہی نہیں کیا۔ یہ جاتے تو وہاں فتنے اٹھاتے۔ نہ جانے کی صورت میں انہیں پتہ لگ جائے گا کہ مومنین کو خدا کے فضل سے ایک تنکے کے برابر ان کی پروا نہیں۔ اسی لئے خدا نے صفوف مجاہدین میں شامل ہونے سے روک دیا اس طرح کہ رکنے کا وبال انہی کے سر پر رہے۔ گویا ان کو تکوینا کہہ دیا گیا کہ جاؤ، عورتوں بچوں اور اپاہج آدمیوں کے ساتھ گھر میں گھس کر بیٹھ رہو۔ اور پیغمبر علیہ السلام نے ان کے اعذار کاذبہ کے جواب میں جو گھر بیٹھ رہنے کی اجازت دیدی یہ بھی ایک طرح خدا ہی کا فرمادینا ہے۔ اس لئے تکوینا کی قید بھی ضروری نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

رسول اللہ ﷺ کی جہاد تبوک پر روانگی اکثر منافقوں کا ساتھ دینے سے انکار

ماہ رجب ۹ ھ میں رسول اللہ ﷺ مدینہ سے برآمد ہوئے اور ثنیۃ الوداع میں فوجی کیمپ لگایا۔ (وہاں) آپ کے ساتھ تیس ہزار سے زائد تعداد تھی۔ محمد بن اسحاق اور محمد بن عمرو بن سعد کا یہی قول ہے۔ حاکم نے الاکلیل میں حضرت معاذ کی روایت سے یہ ہی بیان کیا ہے لیکن حاکم نے الاکلیل میں ابوزرعہ رازی کا قول نقل کیا ہے کہ تبوک (کی روانگی) میں ستر ہزار کی تعداد تھی یعنی تابع اور متبوع دونوں کی مجموعی تعداد اتنی تھی مذکورہ بالا دونوں قولوں کا تعارض دور کرنے کیلئے حاکم نے یہی تاویل کی ہے۔ صرف گھوڑ سوار دس ہزار تھے۔

عبدالرزاق اور ابن سعد کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ بجمعرات کو روانہ ہوئے تھے جمعرات کو روانہ ہونا ہی آپ کو پسند تھا۔

مدینہ میں امیر:

بقول ابن ہشام مدینہ میں اپنا جانشین حضور نے محمدؓ بن مسلمہ انصاری کو بنایا تھا دراوردی کی روایت میں محمد بن مسلمہ کی جگہ سباع بن عرفطہ کا نام آیا ہے اور محمد بن عمر وابن سعد نے لکھا ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں ابن ام مکتوم کو حضور نے اپنا جانشین مقرر کیا تھا لیکن ہمارے نزدیک محمد بن مسلمہ انصاری کا جانشین ہونا زیادہ قوی ہے۔ محمد بن مسلمہ سوائے تبوک کے اور کسی غزوہ میں حضور ﷺ سے الگ نہیں رہے۔

ابوعمر نے حضرت علی بن ابی طالب کو رسول اللہ ﷺ کا جانشین قرار دیا ہے۔ ابن دحیہ نے بھی ذکر کیا ہے اور یہی زیادہ صحیح بھی ہے۔ عبدالرزاق نے مصنف میں صحیح سند سے حضرت سعدؓ بن وقاص کا بیان نقل کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ تبوک کو روانہ ہوئے تو مدینہ میں اپنا جانشین حضرت علیؓ بن ابی طالب کو مقرر فرمادیا۔

محمد بن اسحاق کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی کو اپنی جگہ اپنے اہل بیت کا نگراں مقرر فرمایا تھا اور حکم دیا تھا کہ اہل بیت کے پاس رہیں۔

منافقوں کی فتنہ پروری:

منافقوں نے اس واقعہ کو (فتنہ پیدا کرنے کیلئے غلط طور پر) اچھالا اور کہنے لگے رسول اللہ ﷺ علی کا ساتھ رہنا اپنے لیے بار سمجھتے تھے اور ان سے ناراض تھے (اس لیے چھوڑ گئے) حضرت علیؓ کو یہ بات معلوم ہوئی تو آپ اپنے ہتھیار لے کر فوراً نکل کھڑے ہوئے اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ حضور ﷺ اس وقت مقام جرف میں تھے۔ آپ نے حضور ﷺ کو منافقوں کی بات کی اطلاع دی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ جھوٹے ہیں میں نے تم کو صرف ان لوگوں کی نگرانی کیلئے اپنے بجائے چھوڑا ہے۔ جو میرے بعد رہ گئے ہیں لہٰذا تم میری جگہ میرے گھر والوں کی اور اپنے گھر والوں کی نگرانی رکھو۔ اے علیؓ کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ تم میرے لئے ایسے ہو جیسے موسیٰ کیلئے ہارون تھے مگر (فرق یہ ہے کہ) میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ حسب الحکم حضرت علی لوٹ آئے۔ یہ حدیث بخاری ومسلم کی متفق علیہ ہے۔

عبداللہ بن ابی کی منافقت:

عبداللہ بن ابی رسول اللہ ﷺ کے ہم رکاب روانہ ہوا تھا مگر اس نے اپنی جماعت کا پڑاؤ رسول اللہ ﷺ کی لشکر گاہ سے الگ ذباب کی طرف کچھ نچلے حصہ میں قائم کیا جب تک رسول اللہ ﷺ فروکش رہے عبداللہ بھی مقیم رہا لیکن جب رسول اللہ ﷺ تبوک کی جانب روانہ ہوئے تو عبداللہ نے ساتھ چھوڑ دیا اور اپنے ساتھی منافقوں کو لے کر مدینہ کو لوٹ آیا اور کہنے لگا محمد باوجود اتنی بدحالی (سختی) اور گرمی کے اتنی لمبی مسافت پر بنی الاصفر سے لڑنے چلے ہیں جس کی ان میں طاقت نہیں وہ سمجھتے ہیں کہ بنی الاصفر سے لڑنا کھیل ہے۔ خدا کی قسم مجھے تو دکھائی دے رہا ہے کہ محمد کے ساتھی رسیوں میں بندھے ہوئے ہیں (یعنی گرفتار ہو جائیں گے بلکہ ان کی گرفتاری اتنی یقینی ہے کہ مجھے وہ بندھے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں) عبداللہ بن ابی نے اس قسم کی خبریں رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے متعلق فتنہ پیدا کرنے کیلئے مشہور کی تھیں اللہ نے ابن ابی اور اس کے ساتھیوں کے متعلق آیات ذیل نازل فرمائیں۔ (تفسیر مظہری)

نیند میں آدمی معذور ہے:

صبح کو سویرے نماز کیلئے اٹھنے کی تیاری پوری کی، گھڑی میں الارم لگایا، یا کسی کو مقرر کیا جو وقت پر جگائے پھر اتفاق سے یہ تدبیریں غلط ہو گئیں جس کی وجہ سے نماز قضا ہو گئی۔ جیسے رسول اللہ ﷺ کو لیلۃ التعریس میں پیش آیا کہ وقت پر جاگنے کے لئے یہ انتظام فرمایا کہ حضرت بلالؓ کو بٹھا دیا کہ وہ صبح ہوتے ہی سب کو جگا دیں مگر اتفاق سے ان پر بھی نیند غالب آ گئی۔ اور آفتاب نکل آنے کے بعد سب کی آنکھ کھلی تو یہ عذر صحیح اور معقول ہے جس کی بناء پر آنحضرت ﷺ نے صحابہ کرام کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا: لا تفریط فی النوم انما التفریط فی الیقظة، یعنی نیند میں آدمی معذور ہے کوتاہی وہ ہے جو جاگتے ہوئے کوتاہی کرے، وجہ یہ تھی کہ اپنی طرف سے وقت پر جاگنے کا انتظام مکمل کر لیا گیا تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ تعمیل حکم کے لئے تیاری کرنے یا نہ کرنے ہی سے کسی عذر کے معقول یا نامعقول ہونے کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے محض زبانی جمع خرچ سے کچھ نہیں ہوتا۔ (معارف مفتی اعظم)

لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا
اگر نکلتے تم میں تو کچھ نہ بڑھاتے تمہارے لئے مگر خرابی
وَّلَاْاَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ
اور گھوڑے دوڑاتے تمہارے اندر بگاڑ کروانے کی تلاش میں

منافقوں کا جہاد میں نہ جانا بہتر ہے:

یعنی اگر تمہارے ساتھ نکلتے تو اپنے جبن و نامردی کی وجہ سے دوسروں کی ہمتیں بھی پست کر دیتے اور آپس میں لگا بجھا کر مسلمانوں میں تفریق ڈالنے کی کوشش کرتے اور جھوٹی افواہیں اڑا کر ان کو دشمنوں سے ہیبت زدہ کرنا چاہتے۔ غرض ان کے وجود سے بھلائی میں تو کوئی اضافہ نہ ہوتا ہاں برائی بڑھ جاتی اور فتنہ انگیزی کا زور ہوتا۔ ان ہی وجوہ سے خدا نے ان کو جانے کی توفیق نہ بخشی۔

وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ
اور تم میں بعضے جاسوس ہیں اُنکے اور اللہ خوب جانتا ہے
بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۷﴾
ظالموں کو

سادہ لوح مسلمان: یعنی اب بھی ان کے جاسوس یا بعض ایسے سادہ لوح افراد تم میں موجود ہیں جو ان کی بات سنتے اور تھوڑا بہت متاثر ہوتے ہیں (ابن کثیر)۔ ویسا فتنہ وفساد برپا نہیں کر سکتے جو ان شریروں کے وجود سے ہو سکتا تھا، بلکہ ایک حیثیت سے ایسے جواسیس کا ہمراہ جانا مفید ہے کہ وہ بچشم خود مسلمانوں کی اولوالعزمی، بے جگری وغیرہ دیکھ کر ان سے نقل کرینگے تو ان کے دلوں پر بھی مسلمانوں کی ہیبت قائم ہوگی۔

لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ
وہ تلاش کرتے رہے ہیں بگاڑ کی پہلے سے اور اُلٹتے رہے ہیں
الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ
تیرے کام یہاں تک کہ آ پہنچا سچا وعدہ اور غالب ہوا حکم اللہ کا
وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿۴۸﴾
اور وہ ناخوش ہی رہے

منافق ناکام ہی رہیں گے:

جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے یہود اور منافقین مدینہ آپ کے خلاف طرح طرح کی فتنہ انگیزیاں کرتے رہے اور اسلام کی روز افزوں ترقیات کا تختہ الٹنے کیلئے بہت کچھ الٹ پھیر کی۔ مگر بدر میں جب کفر وشرک کے بڑے بڑے ستون گر گئے اور حیرت انگیز طریقہ پر اسلام کا غلبہ ظاہر ہوا تو عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں نے کہا ان هذا امر قد

توجہ کہ یہ چیز تو اب رکنے والی معلوم نہیں ہوتی چنانچہ بہت سے لوگ خوف کھا کر محض زبان سے کلمہ اسلام پڑھنے لگے۔ مگر چونکہ دل میں کفر چھپا ہوا تھا اس لئے جوں جوں اسلام و مسلمین کی کامیابی اور غلبہ دیکھتے دل دل میں جلتے اور غیظ کھاتے تھے۔ غرض ان کی فتنہ پردازی اور مکاری کوئی نئی چیز نہیں۔ شروع سے ان کا یہی وتیرہ رہا ہے جنگ احد میں یہ لوگ اپنی جماعت کو لیکر راستہ سے لوٹ آئے تھے۔ مگر آخر دیکھ لیا کہ حق کس طرح غالب ہو کر رہتا ہے اور باطل کیسے ذلیل ورسوا کیا جاتا ہے۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ؕ

اور بعضے اُن میں کہتے ہیں مجھ کو رخصت دے

اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ؕ وَاِنَّ جَهَنَّمَ

اور گمراہی میں نہ ڈال، سنتا ہے وہ تو گمراہی میں پڑ چکے ہیں اور بیشک دوزخ

لَمُحِيْطَةٌ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۹﴾

گھیر رہی ہے کافروں کو

ایک بڑے منافق کا عذر:

ایک بڑے منافق جد بن قیس نے کہا کہ حضرت مجھے تو یہیں رہنے دیجئے روم کی عورتیں بہت حسین ہوتی ہیں میں انہیں دیکھ کر دل قابو میں نہ رکھ سکونگا۔ تو مجھے وہاں لے جا کر گمراہی میں نہ ڈالئے۔ فرمایا کہ یہ لفظ کہہ کر اور اپنے جبن وکفر پر جھوٹی پرہیزگاری کا پردہ ڈال کر وہ گمراہی کے گڑھے میں گر چکا۔ اور آگے چل کر کفر ونفاق کی بدولت دوزخ کے گڑھے میں گرنے والا ہے۔ بعض نے آیت کو عام منافقین کے حق میں رکھا ہے اور لا تفتنی کا مطلب یہ لیا ہے کہ ہم کو ساتھ لے جا کر اموال وغیرہ کے نقصان میں مبتلا نہ کیجئے اس کا جواب اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا سے دیا۔ (تفسیر عثمانی)

ابن المنذر رطبرانی ابن مردویہ اور المعرفۃ میں ابونعیم نے حضرت ابن عباس کی روایت سے اور ابن ابی حاتم وابن مردویہ نے حضرت جابر بن عبداللہ کے حوالہ سے اور محمد بن اسحاق ومحمد بن عمرو بن عقبہ نے اپنے مشائخ کی سند سے بیان کیا کہ جد بن قیس اپنے ساتھیوں کو (جن کی تعداد دس سے کم تھی) لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مسجد میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھے یہیں رہ جانے کی اجازت دے دیجئے میری کچھ کھیتی باڑی کی زمین ہے (جس کی نگرانی ضروری ہے) میں اس کی وجہ سے معذور ہوں حضور نے فرمایا تیاری کرو تم فراخدست ہو شاید (مال غنیمت میں) تم کو بنی الاصفر (اہل روم) کی کوئی عورت مل جائے جد نے عرض کیا مجھے تو اجازت دے ہی دیجئے اور مصیبت میں نہ ڈالئے میری قوم والے واقف ہیں کہ کوئی بھی مجھ سے زیادہ عورتوں کا دلدادہ نہیں ہے مجھے ڈر ہے کہ اگر میں رومی عورتوں کو دیکھ پاؤں گا تو اپنے کو روک نہ سکوں گا رسول اللہ ﷺ نے اس کی طرف سے رخ موڑ لیا اور فرمایا ہم نے تم کو اجازت دے دی۔

طبرانی نے دوسری سند سے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جہاد کرو اور مال غنیمت میں رومی عورتیں حاصل کرو، بعض منافق کہنے لگے یہ تم کو عورتوں کے لالچ میں پھانسنا چاہتے ہیں اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ وَاِنْ تُصِبْكَ

اگر تجھ کو پہنچے کوئی خوبی تو وہ بُری لگتی ہے انکو، اور اگر پہنچے

مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَآ اَمْرَنَا مِنْ

کوئی سختی تو کہتے ہیں ہم نے تو سنبھال لیا تھا اپنا کام

قَبْلُ وَيَتَوَلَّوْا وَّهُمْ فَرِحُوْنَ ﴿۵۰﴾

پہلے ہی اور پھر کر جائیں خوشیاں کرتے

منافقوں کا مسلمانوں سے حسد:

منافقین کی عادت تھی جب مسلمانوں کو غلبہ وکامیابی نصیب ہوتی تو جلتے اور کڑھتے تھے۔ اور اگر کبھی کوئی سختی کی بات پیش آ گئی مثلاً کچھ مسلمان شہید یا مجروح ہو گئے تو فخریہ کہتے کہ ہم نے از راہ دور اندیشی پہلے ہی اپنے بچاؤ کا انتظام کر لیا تھا۔ ہم سمجھتے تھے کہ یہی حشر ہونے والا ہے لہذا ان کے ساتھ گئے ہی نہیں۔ غرض ڈینگیں مارتے ہوئے اور خوشی سے بغلیں بجاتے ہوئے اپنی مجلسوں سے گھروں کو واپس جاتے ہیں۔

قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ

تو کہہ دے ہم کو ہرگز نہ پہنچے گا مگر وہی جو لکھ دیا اللہ نے

لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ

ہمارے لئے وہی ہے کارساز ہمارا، اور اللہ ہی پر چاہئے کہ بھروسہ

الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۱﴾ قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ

کریں مسلمان تو کہہ دے تم کیا اُمید کرو گے ہمارے حق میں مگر

اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ؕ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ

دو خوبیوں میں سے ایک کی اور ہم اُمیدوار ہیں

بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ

تمہارے حق میں کہڈالے تم پر اللہ کوئی عذاب اپنے

عِنْدِهٖۤ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ۖ فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ

پاس سے یا ہمارے ہاتھوں سو منتظر رہو ہم بھی تمہارے ساتھ

مُّتَرَبِّصُوْنَ ﴿۵۲﴾

منتظر ہیں

سب کچھ اللہ کے اختیار میں ہے:

یعنی سختی یا نرمی جو جس وقت کے لئے مقدر ہے وہ تو ٹل نہیں سکتی، نہ دنیا میں اس سے چارہ ہے۔ مگر ہم چونکہ ظاہر و باطن سے خدا کو اپنا حقیقی مولا اور پروردگار سمجھتے ہیں لہذا ہماری گردنیں اس کے فیصلے اور حکم کے سامنے پست ہیں۔ کوئی سختی اس کی فرمانبرداری سے باز نہیں رکھتی۔ اور اسی پر ہم کو بھروسہ ہے کہ وہ عارضی سختی کو آخرت میں بالیقین اور بسا اوقات دنیا میں بھی راحت و خوشی سے تبدیل کر دے گا۔ اندریں صورت تم ہماری نسبت دو بھلائیوں میں سے کسی ایک کی ضرور امید کر سکتے ہو۔ اگر خدا کے راستہ میں مارے گئے تو شہادت و جنت اور واپس آئے تو اجر یا غنیمت ضرور مل کر رہے گی۔ جیسا کہ حدیث صحیح میں حق تعالیٰ نے مجاہد کی نسبت ان چیزوں کا تکفل فرمایا ہے۔ برخلاف اس کے تمہاری نسبت ہم منتظر ہیں کہ دو برائیوں میں سے ایک برائی ضرور پہنچ کر رہے گی یا نفاق و شرارت کی بدولت بلاواسطہ قدرت کی طرف سے کوئی عذاب تم پر مسلط ہوگا، یا ہمارے ہاتھوں سے خدا تم کو سخت سزا دلوائے گا جو رسوا کر کے تمہارے نفاق کا پردہ فاش کر دے گی۔ بہر حال تم اور ہم دونوں کو ایک دوسرے کا انجام دیکھنے کیلئے منتظر رہنا چاہئے۔ آخر معلوم ہو جائیگا کہ دونوں میں زیادہ انجام بیں اور دور اندیش کون تھا۔ (تفسیر عثمانی)

مخلص مجاہد کا اجر: حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص اللہ کی راہ میں (جہاد کرنے کیلئے) نکلا ہو اور اس کے خروج کا سبب سوائے اللہ پر ایمان رکھنے اور اللہ کے پیغمبروں کو سچا جاننے کے سوا اور کچھ نہ ہو (یعنی کوئی نفسانی لالچ نہ ہو نہ حصول مال نہ ملک گیری اور اقتدار نہ شہرت و عزت دنیوی) تو اللہ نے اس کیلئے وعدہ فرما لیا ہے کہ یا تو حاصل کردہ ثواب اور مال غنیمت کے ساتھ اس کو (صحیح و سالم) واپس کر دوں گا یا (بصورت شہادت) جنت میں داخل کر دوں گا۔ متفق علیہ۔ یعنی دونوں چیزوں میں سے ایک اس کو ضرور عطا کروں گا۔ (فتح یا جنت) لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا کہ فتح کے ساتھ جنت نہیں مل سکتی۔ (تفسیر مظہری)

قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ

کہدے کہ مال خرچ کرو خوشی سے یا ناخوشی سے ہرگز قبول

مِنْكُمْ ؕ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۵۳﴾

نہ ہوگا تم سے بیشک تم نافرمان لوگ ہو

منافق کا مال بھی قبول نہیں ہے:

جد بن قیس نے رومی عورتوں کے فتنہ کا بہانہ کر کے یہ بھی کہا تھا کہ حضرت میں بذات خود نہیں جا سکتا۔ لیکن مالی اعانت کر سکتا ہوں۔ اس کا جواب دیا کہ بے اعتقاد کا مال قبول نہیں خواہ خوشی سے خرچ کرے یا ناخوشی سے۔ یعنی خوشی سے خدا کے راستہ میں خرچ کرینگی ان کو توفیق کہاں وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ تاہم اگر بالفرض خوشی سے بھی خرچ کریں تو خدا قبول نہ کریگا۔ اس کا سبب اگلی آیت میں بتایا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جانشین اس شخص کی اعانت اور صدقہ قبول نہیں کریں گے جس کے منافق ہونے کا ان کو علم ہو۔

(۲) اللہ قبول نہیں فرمائے گا یعنی ثواب نہیں دے گا انکم کنتم قوماً فاسقین سے یہ مراد ہے کہ تم مسلمانوں کے گروہ سے خارج ہوا اس لیے تمہاری طرف سے دی ہوئی مالی مدد قبول نہیں کی جائے گی۔ (تفسیر مظہری)

وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّآ

اور موقوف نہیں ہوا قبول ہونا اُن کے خرچ کا مگر

اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ وَلَا يَاْتُوْنَ

اسی بات پر کہ وہ منکر ہوئے اللہ سے اور اُس کے رسول سے

الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ

اور نہیں آتے نماز کو مگر ہارے جی سے اور خرچ نہیں کرتے

اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿۵۴﴾

مگر بُرے دل سے

قبول نہ ہونے کا سبب:

عدم قبول کا اصلی سبب تو ان کا کفر ہے جیسا کہ ہم پہلے متعدد مواقع میں اشارہ کر چکے کہ کافر کا ہر عمل مردہ اور بے جان ہوتا ہے باقی نماز میں ہارے جی سے آنا یا برے دل سے خرچ کرنا یہ سب کفر کے ظاہری آثار ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ

سو تو تعجب نہ کر اُن کے مال اور اولاد سے

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِى

یہی چاہتا ہے اللہ کہ اُن کو عذاب میں رکھے اُن چیزوں کی وجہ سے

الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ

دنیا کی زندگی میں اور نکلے ان کی جان اور وہ اُس وقت تک

كٰفِرُوْنَ ﴿۵۵﴾

کافر ہی رہیں

ایک شبہ کا جواب:

شبہ گذر سکتا تھا کہ جب یہ ایسے مردود ہیں تو ان کو مال واولاد وغیرہ نعمتوں سے کیوں نوازا گیا ہے۔ اس کا جواب دیا کہ یہ نعمتیں ان کے حق میں بڑا عذاب ہے۔ جس طرح ایک لذیذ اور خوشگوار غذا تندرست آدمی کی صحت وقوت کو بڑھاتی ہے اور فاسد الاخلاط مریض کو ہلاکت سے قریب تر کر دیتی ہے۔ یہ ہی حال ان دنیوی نعمتوں (مال واولاد وغیرہ) کا سمجھو، ایک کافر کے حق میں یہ چیزیں سوئے مزاج کی وجہ سے زہر ہلاہل ہیں۔

چونکہ کفار دنیا کی حرص ومحبت میں غریق ہوتے ہیں اس لئے اول اس کے جمع کرنے میں بیحد کوفت اٹھاتے ہیں۔ پھر ذرا نقصان یا صدمہ پہنچ گیا تو جس قدر محبت ان چیزوں سے ہے اسی قدر غم سوار ہوتا ہے اور کوئی وقت اس کے فکر واندیشہ اور ادھیڑ بن سے خالی نہیں جاتا۔ پھر جب موت ان محبوب چیزوں سے جدا کرتی ہے اس وقت کے صدمے اور حسرت کا تو اندازہ کرنا مشکل ہے۔ غرض دنیا کے عاشق اور حریص کو کسی وقت حقیقی چین اور اطمینان میسر نہیں۔ چنانچہ یورپ وامریکہ وغیرہ کے بڑے بڑے سرمایہ داروں کے اقوال اس پر شاہد ہیں۔ باقی مؤمنین جو دولت اور اولاد کو معبود اور زندگی کا اصلی نصب العین نہیں سمجھتے چونکہ ان کے دل میں حب دنیا کا مرض نہیں ہوتا اس لئے یہی چیزیں ان کے حق میں نعمت اور دین کی اعانت کا ذریعہ بنتی ہیں۔ اس کے علاوہ اکثر کفار کثرت مال واولاد پر مغرور ہو کر کفر وطغیان میں اور زیادہ شدید ہو جاتے ہیں جو اس کا سبب بنتا ہے۔ کہ اخیر دم تک کافر ہی رہیں۔ نیز منافقین مدینہ جن کے حق میں یہ آیات نازل ہوئیں ان کا حال یہ تھا کہ بادل نخواستہ جہاد وغیرہ کے مواقع پر ریاء ونفاق سے مال خرچ کرتے تھے اور ان کی اولاد میں بعض لوگ مخلص مسلمان ہو کر نبی کریم ﷺ کے ہمراہ جہاد میں شریک ہوتے تھے یہ دونوں چیزیں منافقین کے منشائے قلبی کے بالکلیہ خلاف تھیں اس طرح اموال واولاد ان کے لئے دنیا میں عذاب بن گئے تھے۔ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں "یعنی یہ تعجب نہ کر کہ بے دین کو اللہ نے نعمت کیوں دی ہے، بے دین کے حق میں اولاد اور مال وبال ہے کہ ان کے پیچھے دل پریشان رہے اور ان کی فکر سے چھوٹنے نہ پائے مرتے دم تک، تا توبہ کرے یا نیکی اختیار کرے"۔ (تفسیر عثمانی)

معتزلہ کے مسلک کی تردید:

آیت میں (معتزلہ کے مسلک کے خلاف) اس امر کی دلیل ہے کہ بندہ کیلئے جو چیز زیادہ مناسب اور مفید ہو وہ ہی عطا کرنا اللہ پر واجب نہیں ہے (بلکہ وہ ضرر رساں غیر اصلح چیز دے کر بندہ کو مبتلائے عذاب بھی کر سکتا ہے) کیونکہ اس آیت میں اللہ نے بتایا کہ کافروں کو مال واولاد دے کر (ان کو نوازنا اور ان کو فائدہ پہنچانا مقصود نہیں ہے بلکہ) ان کو گرفتار عذاب کرنا اور کفر کی حالت میں ان کی جانیں نکالنا مقصود ہے۔ (تفسیر مظہری)

وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ وَمَا

اور قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی کہ وہ بیشک تم میں ہیں اور وہ

هُمْ مِّنْكُمْ وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ ﴿۵۶﴾

تم میں نہیں ولیکن وہ لوگ ڈرتے ہیں تم سے

لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا

اگر وہ پائیں کوئی پناہ کی جگہ یا غار یا سر گھسانے کو جگہ

لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ ﴿۵۷﴾

تو الٹے بھاگیں اُسی طرف رسیاں تڑاتے

منافقوں کی جھوٹی قسمیں:

یعنی محض اس خوف سے کہ کفر ظاہر کریں تو کفار کا سا معاملہ ان کے ساتھ بھی ہونے لگے گا۔ قسمیں کھاتے ہیں کہ ہم تو تمہاری ہی جماعت (مسلمین) میں شامل ہیں۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے اگر آج ان کو کوئی پناہ کی جگہ مل جائے یا کسی غار میں چھپ کر زندگی بسر کر سکیں یا کم از کم ذرا سر گھسانے کی جگہ ہاتھ آجائے غرض حکومت اسلامی کا خوف نہ رہے تو سب دعوے چھوڑ کر بے تحاشا اسی طرف بھاگنے لگیں چونکہ نہ اسلامی حکومت کے مقابلہ کی طاقت ہے نہ کوئی پناہ کی جگہ ملتی ہے اس لئے قسمیں کھا کھا کر جھوٹی باتیں بناتے ہیں۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ۚ

اور بعضے اُن میں وہ ہیں کہ تجھ کو طعن دیتے ہیں خیرات بانٹنے میں

فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا

سو اگر اُن کو ملے اُس میں سے تو راضی ہوں اور

مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ﴿۵۸﴾

اگر نہ ملے تو جبھی وہ ناخوش ہو جائیں

منافقوں کی مطلب پرستی:

بعض منافقین اور بعض اعراب (بدو) صدقات وغنائم کی تقسیم کے وقت دنیوی حرص اور خودغرضی کی راہ سے حضور کی نسبت زبان طعن کھولتے تھے کہ تقسیم میں انصاف کا پہلو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ مگر یہ اعتراض اسی وقت تک تھا جب تک ان کی خواہش کے موافق صدقات وغیرہ میں سے حصہ نہ دیا جائے۔ اگر انہیں خوب جی بھر کر خواہش وحرص کے موافق دے دیا گیا تو خوش ہو جاتے اور کچھ اعتراض نہیں رہتا تھا گویا ہر طرح مال ودولت کو قبلہ مقصود ٹھہرا رکھا تھا۔ آگے بتلاتے ہیں کہ ایک مدعی ایمان کا مطمح نظر یہ نہیں ہونا چاہیے۔ (تفسیر عثمانی)

حضور ﷺ انصاف نہیں کریں گے تو کون کرے گا:

شیخین اور بیہقی نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ فتح حنین کے دن قبیلہ ہوازن سے چھینا ہوا مال جب رسول اللہ ﷺ نے تقسیم کیا تو سرداران عرب (میں سے بعض) کو تقسیم کے وقت ترجیح دی یہ بات دیکھ کر قوم انصار میں سے ایک شخص بولا یہ بے انصافی کی تقسیم ہے۔ یا یہ کہا کہ یہ تقسیم اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے نہیں کی گئی ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا میں نے کہا میں جا کر رسول اللہ ﷺ کو ان الفاظ کی اطلاع ضرور دوں گا۔ چنانچہ میں نے جا کر اطلاع دے دی۔ سن کر چہرہ مبارک کا رنگ بدل گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چمڑا رنگنے والے گوند کی طرح (سرخ) ہو گیا اور فرمایا اگر اللہ اور اس کا رسول انصاف نہیں کرتا تو پھر اور کون انصاف کر سکتا ہے۔ اللہ کی رحمت ہو موسیٰ پر ان کو اس سے بھی زیادہ دکھ پہنچایا گیا تھا مگر انہوں نے صبر کیا۔

محمد بن عمر نے اس نکتہ چیں کا نام معتب بن قشیر ذکر کیا ہے جو منافق تھا۔

ابن اسحاق نے حضرت عبداللہ بن عمر کی روایت سے امام بخاری، مسلم اور امام احمد نے حضرت جابر کی روایت سے لکھا ہے کہ جس وقت قبیلہ ہوازن سے حاصل کیا ہوا مال غنیمت رسول اللہ ﷺ تقسیم کر رہے تھے ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی طرف متوجہ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ حضرت ابن عمر اور حضرت ابوسعیدؓ خدری کے قول کے موافق یہ شخص بنی تمیم میں سے تھا جس کو ذوالخویصرہ کہا جاتا تھا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا بات ہے اس نے عرض کیا میرے خیال میں آپ نے انصاف سے کام نہیں لیا۔ انصاف (سے تقسیم) کیجئے۔ (تفسیر مظہری)

ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے یمن سے کچا سونا مٹی سمیت آپ ﷺ کی خدمت میں بھیجا تو آپ ﷺ نے صرف چار شخصوں میں ہی تقسیم فرمایا، اقرع بن حابس، عیینہ ابن بدر، علقمہ بن علاثہ، اور زید خیر، اور فرمایا میں ان کی دلجوئی کیلئے انہیں دے رہا ہوں۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۙ

اور کیا اچھا ہوتا اگر وہ راضی ہو جاتے اُسی پر جو دیا انکو اللہ نے اور اُس

وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ

کے رسول نے اور کہتے کافی ہے ہم کو اللہ وہ دے گا

فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ﴿۵۹﴾

ہم کو اپنے فضل سے اور اُس کا رسول ہم کو تو اللہ ہی چاہیے

جو ملے اسی پر راضی رہو:

یعنی بہترین طریقہ یہ ہے کہ جو کچھ خدا پیغمبر کے ہاتھ سے دلوائے اس پر آدمی راضی وقانع ہو اور صرف خدا پر توکل کرے اور سمجھے کہ وہ چاہے گا تو آئندہ اپنے فضل سے بہت کچھ مرحمت فرمائیگا۔ غرض دنیا کی متاع فانی کو نصب العین نہ بنائے۔ صرف خداوند رب العزت کے قرب ورضا کا طالب ہو اور جو ظاہری وباطنی دولت خدا اور رسول کی سرکار سے ملے اسی پر مسرور ومطمئن ہو۔ (تفسیر عثمانی)

محصل زکوۃ کو کتنا دیا جائے:

امام ابوحنیفہ اور اکثر ائمہ نے فرمایا، محصل نے جتنی مدت کام میں صرف کی ہو اتنی مدت کی ضروریات پوری کرنے کے بقدر اس کو دیا جائے مثلاً کسی نے تحصیل کے کام میں ایک دن صرف کیا تو اس کو ایک دن کا معاوضہ بقدر کفایت دیا جائے گا اور ایک سال صرف کیا تو ایک سال کی معاش بقدر کفایت پانے کا مستحق قرار پائے گا کیونکہ زکوۃ کے مال میں غنی کا کوئی حق نہیں عامل کو اس کے عمل کا صرف اتنا اجر دیا جائے گا جتنا فقیروں کے کام میں وقت صرف کرنے سے اس کا واجبی ہو گا۔ گویا یوں کہو کہ زکوۃ تو فقراء کا حق ہے عامل کو فقیروں کے حق میں سے بقدر اجر وکفایت دیا جائے گا۔

اگر اس کی اجرت بقدر کفایت اتنی ہو کہ حاصل کی ہوئی زکوۃ کے کل مال کا اس

کو استحقاق ہو جاتا ہے تو باتفاق علماء کل مال زکوٰۃ اس کو نہیں دیا جاسکتا۔ آدھا دیا جائے گا۔ آدھے سے زائد ہرگز نہیں دیا جائے گا۔ نصف سے زائد کل کے حکم میں ہوتا ہے اگر اس سے زیادہ دیا جائیگا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس نے تحصیل زکوٰۃ فقراء کیلئے نہیں کی اپنے لئے کی۔ اس طرح اصل مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ (تفسیر مظہری)

ایک شخص نے زمانہ نبوی میں ایک باغ خریدا قدرت خدا سے آسمانی آفت سے باغ کا پھل مارا گیا اس سے وہ بہت قرض دار ہو گیا حضور ﷺ نے اس کے قرض خواہوں سے فرمایا کہ تمہیں جو ملے لے لو اسکے سوا تمہارے لئے اور کچھ نہیں۔ (مسلم تفسیر ابن کثیر)

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلۡفُقَرَآءِ وَ الۡمَسٰكِيۡنِ

زکوٰۃ جو ہے سو وہ حق ہے مفلسوں کا اور محتاجوں کا

وَالۡعٰمِلِيۡنَ عَلَيۡهَا وَالۡمُؤَلَّـفَةِ قُلُوۡبُهُمۡ وَفِى

اور زکوٰۃ کے کام پر جانے والوں کا اور جن کا دل پر

الرِّقَابِ وَالۡغٰرِمِيۡنَ وَفِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ

چانا منظور ہے اور گردنوں کے چھڑانے میں اور جو تاوان بھریں

وَابۡنِ السَّبِيۡلِ‌ؕ فَرِيۡضَةً مِّنَ اللّٰهِ‌ؕ وَاللّٰهُ

اور اللہ کے راستہ میں اور راہ کے مسافر کو ٹھہرایا ہوا ہے اللہ کا اور اللہ

عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ۝۶۰

سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے

زکوٰۃ کے مستحقین:

چونکہ تقسیم صدقات کے معاملہ میں پیغمبر پر طعن کیا گیا تھا، اس لئے متنبہ فرماتے ہیں کہ صدقات کی تقسیم کا طریقہ خدا کا مقرر کیا ہوا ہے اس نے صدقات وغیرہ کے مصارف متعین فرما کر فہرست نبی کریم ﷺ کے ہاتھ میں دے دی ہے۔ آپ ﷺ اسی کے موافق تقسیم کرتے ہیں اور کریں گے۔ کسی کی خواہش کے تابع نہیں ہو سکتے۔ حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ "خدا نے صدقات (زکوٰۃ) کی تقسیم کو نبی یا غیر نبی، کسی کی مرضی پر نہیں چھوڑا۔ بلکہ بذات خود اس کے مصارف متعین کر دیئے ہیں۔ جو آٹھ ہیں۔ "فقراء" (جن کے پاس کچھ نہ ہو)۔ "مساکین" (جن کو بقدر حاجت میسر نہ ہو) "عاملین" (جو اسلامی حکومت کی طرف سے تحصیل صدقات وغیرہ کے کام پر مامور ہوں)۔ "مؤلفۃ القلوب" (جن کے اسلام لانے کی امید ہو یا اسلام میں کمزور ہوں وغیر ذلک من الانواع، اکثر علماء کے نزدیک حضور ﷺ کی وفات کے بعد یہ مد نہیں رہی) "رقاب" (یعنی غلاموں کا بدل کتابت ادا کر کے آزادی دلائی جائے۔ یا خرید کر آزاد کئے جائیں۔ یا اسیروں کا فدیہ دے کر رہا کرائے جائیں) "غارمین" (جن پر کوئی حادثہ پڑا اور مقروض ہو گئے یا کسی کی ضمانت وغیرہ کے بار میں دب گئے) "سبیل اللہ" (جہاد وغیرہ میں جانیوالوں کی اعانت کی جائے) "ابن السبیل" (مسافر جو حالت سفر میں مالک نصاب نہ ہو، گو مکان پر دولت رکھتا ہو) "حنفیہ" کے یہاں تملیک ہر صورت میں ضروری ہے اور فقر شرط ہے۔ تفصیل فقہ میں ملاحظہ کی جائے۔ (تفسیر عثمانی)

مؤلفہ قلوب کا حصہ:

امام ابوحنیفہ کے نزدیک مؤلفۃ القلوب کا حصہ ساقط ہو چکا اسلام کو اب تالیف قلوب کیلئے زکوٰۃ کا مال دینے کی ضرورت نہیں رہی ایک روایت میں امام مالک اور امام شافعی کے اقوال بھی یہی آئے ہیں۔

ہم کہتے ہیں جب آیت کے حکم کو مسلمان مؤلفۃ القلوب کے ساتھ خاص قرار دے لیا گیا اور کافر مؤلفۃ القلوب کو حکم کے عموم سے الگ کر دیا گیا تو پھر غنی کو بھی حکم سے الگ کر دینا ضروری ہے۔ کیونکہ مالداروں کیلئے زکوٰۃ کا حلال نہ ہونا مختلف احادیث میں مذکور ہے۔ حضرت معاذ والی حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان آیا ہے کہ ان کے مالداروں سے لیا جائے اور ان ہی کے فقراء کو لوٹا دیا جائے۔

قرض دار: (۱) وہ قرض دار جنہوں نے قرض لے کر گناہ کے راستہ میں خرچ نہیں کیا ایسے قرض داروں کے پاس اگر قرض ادا کرنے کیلئے مال نہ ہو بقدر ادائے قرض زکوٰۃ کا مال ان کو دے دیا جائے۔

(۲) وہ قرض دار جنہوں نے قرض لے کر کسی نیکی کے راستہ میں یا مسلمانوں کے درمیان صلح کرانے میں خرچ کیا ہو یہ لوگ خواہ خود مالدار ہوں مگر ان کا قرض زکوٰۃ کے مال سے ادا کیا جاسکتا ہے۔

(۳) وہ قرضدار جو گناہ کے راستہ میں خرچ کرنے اور فضول خرچیاں کرنے کی وجہ سے قرضدار ہوئے ہوں ان کا قرض ادا کرنے کیلئے زکوٰۃ کا مال نہیں دیا جائے گا۔ امام ابوحنیفہ کا مسلک ہے کہ جس قرض دار کے پاس ادائے قرض کے قابل مال نہ ہو وہ کوئی ہو کسی وجہ سے قرض دار ہوا ہو، اس کا قرض چکانے کیلئے زکوٰۃ کا مال دیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ الغارمین کا لفظ عام ہے قرضدار کے پاس اگر بقدر ادائے قرض مال نہ ہو تو وہ فقیر ہی ہوگا (خواہ کتنا ہی مالدار ہو) رخصت سفر میں بھی امام اعظم اور دوسرے اماموں کا یہی اختلاف ہے (کہ امام اعظم کے نزدیک سفر طاعت ہو یا سفر اباحت یا سفر معصیت، ہر سفر میں رخصت سے فائدہ اٹھایا جائے اور دوسرے اماموں کے نزدیک سفر معصیت میں رخصت سے فائدہ

نہیں اٹھایا جاسکتا نہ فقر صلوٰۃ کا نہ ترک صوم کا)

اگر کسی شخص کے پاس ادائے قرض سے زائد مال ہو اور اتنا زائد ہو کہ اس زائد کی مقدار نصاب زکوٰۃ کو پہنچ جاتی ہو تو امام اعظم اور امام مالک اور امام احمد کے نزدیک اس کو زکوٰۃ دینی جائز نہیں۔

فی سبیل اللہ کا مفہوم: میں کہتا ہوں جب فقر تمام مصارف زکوٰۃ میں ضروری ہے (اور ہر مصرف زکوٰۃ کا غریب ہونا لازم ہے) تو بہتر یہی ہے کہ سبیل اللہ کے لفظ کو نہ صرف جہاد کیلئے مخصوص قرار دیا جائے نہ حج کے لئے بلکہ عام چھوڑ دیا جائے خواہ کوئی مصرف خیر ہو سب کو یہ لفظ شامل ہے لہذا غریب طالب علموں کو جو زکوٰۃ دیتے ہیں وہ بھی فی سبیل اللہ ہی کے ذیل میں آتا ہے۔

ابن السبیل کا معنیٰ:

اگر کسی کے پاس وطن میں تو بہت مال ہو مگر سفر میں ساتھ اتنا مال نہ ہو کہ منزل مقصود پر پہنچ سکتا ہو اور نہ اتنا مال ہو جو زکوٰۃ لینے سے مانع ہو تو اس کو بالاتفاق زکوٰۃ دی جا سکتی ہے۔ امام اعظم کے نزدیک ابن السبیل سے اسی قسم کا مسافر مراد ہے زکوٰۃ کا مستحق ہونے کیلئے امام اعظم کے نزدیک فقر قبضہ کافی ہے یعنی اس کے قبضہ میں اتنا مال نہ ہو جو زکوٰۃ کے استحقاق سے محروم کردے۔ خواہ ملکیت میں کتنا ہی مال ہو (بغیر قبضہ کی) ملکیت استحقاق زکوٰۃ سے مانع نہیں لہذا جو مالدار شخص اپنے وطن میں ہو (مگر اپنے مال پر اس کا قبضہ نہ ہو) یا دوسروں پر اس کا مال قرض ہو (اور قبضہ میں نہ ہو) تو امام صاحب کے نزدیک ایسا شخص (باوجود مالک مال ہونے کے) نادار اور مفلس ہے جیسے مالدار مسافر نادار۔ حالت سفر میں مفلس کذافی المحیط اگر کسی کا مال وطن میں بہت ہو مگر سفر میں اس کے پاس صرف اتنا ہو کہ وطن تک پہنچ سکتا ہو اور جو مال بحالت سفر اسکے پاس ہو وہ نصاب زکوٰۃ سے کم ہو اس صورت میں اس کیلئے زکوٰۃ کا مال لینا درست نہیں، یہ مسئلہ سب علماء کا مسلمہ ہے اور اگر اس کے برعکس ہو یعنی وطن میں بہت مال ہو اور سفر میں اس کے پاس نصاب زکوٰۃ کے بقدر ہو مگر اتنے مال سے وہ منزل مقصود پر نہ پہنچ سکتا ہو۔ ایسے شخص کے لئے بھی امام اعظم کے نزدیک زکوٰۃ لینا جائز نہیں خواہ سفر کی حالت ہو یا برسر سفر ہو اور مال دور ہو یا قریب امام شافعی جواز کے قائل ہیں امام ابوحنیفہ کی دلیل یہ ہے کہ زکوٰۃ کا مال مباح کرنے والی چیز فقر ہے اور یہ شخص فقیر نہیں ہے (نصاب زکوٰۃ کے بقدر اس کے پاس مال موجود ہے منزل مقصود پر پہنچ سکنے یا نہ پہنچ سکنے کو زکوٰۃ کا مال لینے نہ لینے میں کوئی دخل نہیں) امام شافعی کے نزدیک زکوٰۃ لینے کے جواز کی علت ارادہ سفر ہے بشرطیکہ اس کے پاس (ارادہ سفر کے وقت) اتنا مال نہ ہو کہ مسافت سفر طے کر سکے کیونکہ ابن السبیل مصارف زکوٰۃ کا ایک مستقل فرد ہے فقر کا اس میں اعتبار نہیں ہے۔

بڑے اجر والا دینار:

حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک دینار وہ ہے جو تو نے راہ خدا میں خرچ کیا ایک دینار وہ ہے جو تو نے کسی بردہ کی گلوخلاصی کیلئے خرچ کیا ایک دینار وہ ہے جو کسی مسکین کو تو نے بطور خیرات دیا ایک دینار وہ ہے جو تو اپنے گھر والوں کے صرف میں لایا سب سے بڑے اجر والا وہ دینار ہے جو تو اپنے گھر والوں کے صرف میں لایا۔ رواہ مسلم۔

حضرت میمونہ بنت حارث کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں میں نے ایک باندی آزاد کی اور حضور ﷺ کی خدمت میں اس کا ذکر کیا۔ فرمایا اگر تو وہ اپنے ماموؤں کو دے دیتی تو تیرے لئے بڑا ثواب ہوتا۔ رواہ البخاری ومسلم فی صحیحہا۔

دوہری خیرات: حضرت سلیمان بن عامر کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسکین کو خیرات دینی ایک خیرات ہے اور رشتہ دار کو دوہری خیرات ہے ایک تو (معمولی) خیرات دوسرے کنبہ پروری۔ رواہ احمد والترمذی والنسائی وابن ماجہ والدارمی۔

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ حضرت ابوطلحہ نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ! بیرحاء (کا باغ) مجھے اپنے مال میں سب سے زیادہ پسند ہے اور یہ اللہ کے نام پر میں خیرات کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اس کی نیکی اللہ کے پاس میرے لئے جمع رہے گی۔ اب آپ اس میں جیسے اللہ بتائے تصرف کیجئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا میرے نزدیک تو مناسب یہ ہے کہ تم اس کو اپنے قرابت داروں کو دے دو، حسب ہدایت حضرت ابوطلحہ نے وہ (باغ) اپنے قرابت داروں اور چچازادوں کو تقسیم کر دیا۔ متفق علیہ۔

قریبی رشتہ داروں کو خیرات اور زکوٰۃ دینا:

رشتہ ولادت اور تعلق زوجیت رکھنے والوں کو زکوٰۃ دینی امام ابوحنیفہ کے نزدیک درست نہیں، (بیٹا بیٹی ماں باپ کو والدین اولاد کو بیوی شوہر کو اور شوہر بیوی کو زکوٰۃ نہیں دے سکتے) شرعاً اور عرفاً ان کے منافع کے املاک مشترک ہوتے ہیں (اولاد والدین اور زوجین کا باہمی فائدہ اور ضرر ایک ہی مانا جاتا ہے) اس لئے تملیک کامل طور پر نہیں ہو سکتی۔

رابطہ بنت عبداللہ حضرت عبداللہ بن مسعود کی بیوی دست کار تھی اور حضرت ابن مسعود پاس مال نہ تھا اس لئے رابطہ ہی ان کا اور ان کے بچوں کا خرچ چلاتی تھی (ایک روز) حضرت ابن مسعود سے کہنے لگی آپ کے اور آپ کے بچوں کے خرچ نے تو مجھے صدقہ (خیرات کرنے) سے روک دیا، تمہارے خرچ کی موجودگی میں تو میں خیرات کر ہی نہیں سکتی حضرت عبداللہ نے فرمایا میں یہ نہیں چاہتا کہ تم ہم پر خرچ کر کے (خیرات کے) ثواب سے محروم رہو چنانچہ دونوں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور رابطہ نے رسول

اللہ ﷺ سے عرض کیا میں دست کار عورت ہوں دست کاری سے جو کچھ تیار کرتی ہوں اس کو فروخت کر دیتی ہوں (اس طرح میری کمائی ہو جاتی ہے) مگر میرے بچہ اور شوہر کا کوئی مال نہیں ہے (ان سب کا خرچ میں چلاتی ہوں اور) ان کا خرچ مجھے خیر خیرات کرنے سے روک دیتا ہے کیا ان پر صرف کرنے کا مجھے کوئی ثواب ملے گا۔ حضور ﷺ نے فرمایا جو کچھ تم ان پر صرف کرو گی اس کا ثواب تم کو ملے گا تم ان پر خرچ کیا کرو۔ طحاوی نے لکھا ہے کہ یہ رابطہ وہی زینب زوجہ ابن مسعودؓ تھی کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں زینب کے علاوہ کسی دوسری عورت کا حضرت عبداللہ کی بیوی ہونا ثابت نہیں۔

عورتوں کو صدقہ کرنے کی خصوصی ہدایت:

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے ایک روز صبح کی نماز سے فراغت کے بعد رسول اللہ ﷺ عورتوں (کے گروہ) کی طرف تشریف لائے اور فرمایا اے گروہ زنان تم (عورتوں) سے زیادہ ناقص العقل ناقص الدین اور دانشمندوں کی دانش کو زائل کرنے والا میں نے کسی اور (چیز) کو نہیں پایا۔ میں نے دیکھا کہ قیامت کے دن دوزخ والوں میں تمہاری ہی تعداد زیادہ ہوگی اس لئے جس قدر تم سے ہو سکے (خیر خیرات کر کے) اللہ کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرو عورتوں کے گروہ میں حضرت ابن مسعودؓ کی بیوی بھی موجود تھی۔ وہ یہ فرمان سن کر پلٹ کر حضرت ابن مسعودؓ کے پاس آئی اور جو کچھ رسول اللہ ﷺ سے سنا تھا بیان کیا پھر اپنی چادر لے کر چل دی ابن مسعودؓ نے پوچھا، اری یہ (زیور یا لباس) لے کر کہاں جا رہی ہے کہنے لگی میں اس کو خیرات کر کے اللہ اور اس کے رسول کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کروں گی شاید اللہ مجھے دوزخ سے بچا لے۔ ابن مسعودؓ نے فرمایا، اری ادھر آ۔ اس کو مجھ پر اور میرے بچوں پر بطور خیرات خرچ کر (تجھے اللہ ثواب دے گا) کہنے لگی نہیں خدا کی قسم (ایسا نہیں ہو سکتا پہلے) میں رسول اللہ ﷺ کے پاس جا کر دریافت کر لوں۔ الحدیث۔ (جب ابن مسعودؓ کی بیوی نے رسول اللہ ﷺ سے جا کر دریافت کیا تو) حضور ﷺ نے فرمایا اس کو اس پر اور اس کی اولاد پر بطور خیرات خرچ کر وہی لوگ اس کا محل ہیں (یعنی اول ان کا حق ہے وہی محل خیرات ہیں) بخاری میں حضرت ابوسعید خدری کی روایت سے بیان کیا ہے کہ عیدالفطر یا عیدالاضحیٰ کے دن رسول اللہ ﷺ عیدگاہ کو تشریف لے گئے اور نماز کے بعد لوگوں کو نصیحت کی اور صدقہ (خیر خیرات) دینے کا حکم دیا پھر عورتوں کی طرف سے گزرے اور فرمایا اے گروہ زناں خیر خیرات کرو مجھے دکھایا گیا ہے کہ دوزخیوں میں تمہاری ہی تعداد زیادہ ہے عورتوں نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ ایسا کیوں ہے فرمایا تم لعنت زیادہ کرتی ہو اور شوہروں کی ناشکری کرتی ہو۔ الحدیث) اسی حدیث میں ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ کی بیوی نے کہا میرے پاس زیور ہے میں اس کو خیرات کرنا چاہتی ہوں۔ ابن مسعود نے کہا میں اور میرے بچے اس (خیرات) کے زیادہ مستحق ہیں، حضور ﷺ نے فرمایا ابن مسعودؓ نے سچ کہا، تیرا شوہر اور تیرے بچے اس خیر خیرات کے دوسروں سے زیادہ حق دار ہیں۔

طحاوی نے یہ احادیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ صدقہ سے مراد خیرات ہے پہلی حدیث میں آیا ہے کہ ابن مسعودؓ کی بیوی نے کہا میں دست کار عورت ہوں (دستکاری کر کے فروخت کرتی ہوں ان الفاظ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ نصاب زکوۃ کی مالک نہ تھی کہ اس پر زکوۃ واجب ہوتی (صرف دستکاری تھی جس سے گھر کا خرچ چلاتی تھی) دوسری حدیث سے معلوم ہو رہا ہے کہ وہ اپنا کل زیور صدقہ (خیرات) کرنا چاہتی تھی اور کل زیور کی خیرات بطور زکوۃ نہیں ہو سکتی۔ پھر تینوں احادیث سے ثابت ہو رہا ہے کہ اپنی اولاد کو صدقہ دینا جائز ہے حالانکہ باجماع علماء اولاد کو زکوۃ دینی ناجائز ہے اس سے معلوم ہوا کہ حدیث میں صدقہ سے مراد خیرات ہے۔

پڑوسی کا حق: صدقات کے ترجیحی اسباب میں سے ایک مرجح سبب ہمسائیگی بھی ہے حضرت ابن عمر کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پڑوسی سے سلوک کے متعلق جبرئیل مجھے اتنی مسلسل نصیحت کرتے رہے کہ میرا خیال ہوا شاید وہ ہمسایہ کو وارث بنا دیں گے رواہ احمد والبخاری ومسلم وابوداؤد والترمذی۔ حضرت عائشہ کی روایت سے بھی یہ حدیث امام احمد اور شیخین اور اصحاب السنن نے بیان کی ہے۔

مسلم نے حضرت ابوذر کی روایت سے بیان کیا ہے جب شوربہ پکاؤ تو پانی بڑھا دیا کرو اور پڑوسیوں کا خیال رکھا کرو۔

بھوکے کو کھانا کھلانا: منجملہ اسباب مرجحہ کے عیالداری کی وجہ سے بھوک کی شدت بھی ہے (یعنی سخت بھوکے کو پیٹ بھر کر کھلانا بھی افضل ہے) حضرت انس کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بہترین صدقہ (خیرات) یہ ہے کہ تم جوکی جگہ کو سیر کر کے کھلا دو۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان۔

سوال کرنے والا:

سائل کا سوال بھی ایک مرجح سبب ہے اللہ نے فرمایا ہے

وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ سائل کو نہ جھڑکو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سائل کا حق ہے خواہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر آئے۔ رواہ احمد وابوداؤد بسند صحیح۔ ابوداؤد نے حضرت علی کی روایت سے اور طبرانی نے ہرماس بن زیاد کی روایت سے بھی یہ حدیث بیان کی ہے۔

حضرت ام بجید کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سائل کو (کچھ دے کر) لوٹاؤ خواہ جلی ہوئی کھری ہی ہو۔ رواہ مالک والنسائی، ترمذی اور ابوداؤد نے اس کو مرسلاً بیان کیا ہے۔

سب سے برا آدمی: حضرت ابن عباس راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ

نے فرمایا کیا میں تم کو نہ بتاؤں کہ سب سے برا کون آدمی ہے سب سے براوہ شخص ہے کہ اس سے اللہ کے واسطے سوال کیا جائے اور وہ نہ دے۔

یتیم اور قیدی: یتیمی اور قید بھی ترجیحی اسباب میں سے ہے اللہ نے فرمایا ہے وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا اور اللہ کی محبت میں یا کھانے کی محبت ہوتے ہوئے وہ مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔

ایک شخص کو ساری زکوٰۃ دینا:

جب احناف کا مسلک (ثابت ہو گیا اور) معلوم ہو گیا کہ مصرف زکوٰۃ صرف فقراء ہیں اور باقی ساتوں اصناف فقراء ہی کے اقسام ہیں تو اس صورت میں ایک ہی صنف بلکہ ایک شخص کو زکوٰۃ کا کل مال دے دیا جائے تو جواز میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

طبرانی نے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر فرض زکوٰۃ لے کر ایک ہی صنف کو (کبھی) دے دیا کرتے تھے۔

بیضاوی نے لکھا ہے کہ حضرت عمر حضرت حذیفہ حضرت ابن عباس اور دوسرے صحابہ و تابعین کے اقوال و روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ صرف ایک صنف کو کل زکوٰۃ دیدینا جائز ہے۔ تینوں اماموں کا بھی یہی قول ہے ہمارے بعض علماء شافعیہ نے بھی اسی کو پسند کیا ہے میرے والد بھی یہی فتویٰ دیتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ آیت میں تو یہ حکم بیان کیا گیا ہے کہ ان اصناف کے علاوہ کسی اور کو زکوٰۃ نہ دی جائے یہ تو نہیں بیان کیا کہ ان اصناف کو دینا واجب ہے۔

کس کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے:

امام ابوحنیفہ نے فرمایا غنی سے مراد وہ شخص ہے جس کے پاس اتنا مال ہو جس پر زکوٰۃ واجب ہو کسی قسم کا مال ہو۔ بعض علماء نے کہا جس کے پاس صبح شام کا کھانے کو ہے اس کیلئے زکوٰۃ لینی جائز نہیں۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کے پاس اتنا ہو جو اس کو غنی (بے نیاز) کردے اور وہ سوال کرے تو وہ اپنے لئے جہنم کی آگ بڑھا رہا ہے۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ ﷺ غنی کردینے سے کیا مراد ہے فرمایا جو غنا سوال کرنے سے روکتی ہے۔ (اس سے مراد) صبح شام کے کھانے کی مقدار ہے۔ رواہ ابوداؤد من حدیث سہیل بن حنظلہ۔ ابن حبان نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔ بعض علماء نے کہا اگر چالیس درہم (تقریبا دس روپیہ) کا مالک ہو تو زکوٰۃ لینی درست نہیں۔ حضرت ابوسعید خدری راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے ایسی حالت میں سوال کیا کہ اس کے پاس ایک اوقیہ کی مقدار چاندی تھی تو اس نے الحاف کیا (یعنی اس کو لپٹ چمٹ کر مانگنے والا قرار دیا جائیگا) اگر کوئی شخص کمائی سے لگا ہوا ہو تو ایک درہم بھی اس کو غنی بنا دیتا ہے اور اگر کمزور کثیر العیال ہو تو ہزار درہم بھی اس کو غنی نہیں بنا سکتے۔

خلاصہ یہ ہے کہ بغیر حاجت کے سوال حرام ہے اور حاجت ہو تو جائز ہے لہٰذا جس شخص پر فاقہ نہ ہو جس کا معیار حسب روایت سہیل بن حنظلہ صبح شام کا کھانا موجود ہونا ہے تو اس کیلئے سوال حلال نہیں۔ اتنا بھی نہ ہو تو سوال جائز ہے پس جس شخص کو قوام زندگانی حاصل ہو وہ سوال تو نہیں کرسکتا مگر زکوٰۃ بغیر سوال کے لینا اس کیلئے جائز ہے۔

امام ابوحنیفہ نے فرمایا غنی وہ شخص ہے جس کے پاس اصلی ضرورتوں کو پورا کرنے کے بعد بقدر نصاب زکوٰۃ مال باقی رہے حضرت معاذ کی روایت کردہ حدیث میں ہے کہ ان کے مالداروں سے لیا جائے اور انہی کے حاجت مندوں کو لوٹا دیا جائے۔ یہ حدیث دلالت کررہی ہے کہ جس کو دیا جائے وہ شخص وہ نہ ہو جس سے لیا جائے لہٰذا صاحب نصاب کو دینا ناجائز قرار پایا (کیونکہ وہ تو دینے والا ہے لینے والا کیسے ہوسکتا ہے) صاحب نصاب کے پاس مال نامی ہو (بڑھوتری والا) یا غیر نامی دونوں صورتیں زکوٰۃ لینے کی ممانعت میں برابر ہیں۔ کیونکہ حضرت ابوسعید خدری کی روایت میں آیا ہے کہ اوقیہ ہو یا اوقیہ کی مقدار دونوں کا حکم برابر ہے۔ نامی اور غیر نامی کے فرق کا اثر وجوب زکوٰۃ پر پڑتا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کھیتی باڑی کے جانوروں میں، سواری، باربرداری کے جانوروں میں اور گھریلو پالتو جانوروں میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ نے سہولت آفریں قدرت کے ساتھ وجوب زکوٰۃ کو مشروط کیا ہے۔ رہا ممانعت زکوٰۃ کے لئے ہماری طرف سے یہ شرط لگانا کہ ضروریات اصلیہ کو پورا کرنے کے بعد بقدر نصاب بچ جائے تو اس کی وجہ یہ ہے۔ اگر نصاب زکوٰۃ کی مقدار موجود بھی ہو لیکن فراہمی ضروریات اس سے وابستہ ہو تو اس نصاب کا وجود بھی عدم کی طرح ہے۔ اس کی نظیر میں اس پانی کو پیش کیا جا سکتا ہے جو موجود تو ہو مگر بقدر پیاس ہو ایسے پانی کا ہونا نہ ہونے کی طرح ہے اسی لئے باوجود پانی ہونے کے تیمم جائز ہے۔ لہٰذا جو قرضدار مالک نصاب ہو لیکن اس کا نصاب قرض سے زائد نہ ہو یا مجاہد ہو (اور مالک نصاب ہو) یا مسافر ہو اور اس کے گھوڑے کی قیمت بقدر نصاب زکوٰۃ ہو یا کوئی عالم ہو اور مطالعہ مسائل یا درس کی ضرورت کیلئے اس کے پاس کتابیں ہوں یا کسی کے پاس رہنے کا مکان ہو ان سب کو زکوٰۃ دینی جائز ہے اور ان کو زکوٰۃ لینی بھی درست ہے حدیث لایحل الصدقة لغنی الالخمسة الغازی فی سبیل الله والغارم وابن السبیل (غنی کیلئے زکوٰۃ حلال نہیں سوائے پانچ شخصوں کے مجاہد قرضدار اور مسافر) کا اصل مفہوم یہی ہے۔

مسئلہ: اگر کوئی شخص کمائی کرکے ضروریات پوری کرسکتا ہے

مگر ہو حاجت مند (کم مایہ یا بے مایہ) تو اس کو زکوٰۃ دینی جائز ہے۔ کیونکہ آیت اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ میں عموم ہے امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک ناجائز ہے کیونکہ حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا صدقہ حلال نہیں غنی کیلئے نہ طاقت ور صحت مند کیلئے رواہ احمد والنسائی وابن ماجہ وابن حبان والحاکم ابوداؤد ترمذی اور حاکم نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کی روایت سے نیز دار قطنی نے العلل میں اور ابویعلی نے حضرت طلحہ کی روایت سے بھی یہ حدیث بیان کی ہے۔ حضرت جابر کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ زکوۃ کا مال آیا سنتے ہی لوگ چڑھ دوڑے فرمایا لوگو یہ درست نہیں غنی کے لئے نہ صحیح وسالم صحت مند کیلئے نہ طاقت ور برسر کار آدمی کیلئے رواہ احمد والدار قطنی۔

طاقت ور کمائی کر سکنے والا:

عبیداللہ بن عدی کا بیان ہے کہ مجھے دو آدمیوں نے اطلاع دی کہ ہم دونوں مال زکوۃ میں سے کچھ مانگنے کے لئے رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو نظر گھما کر غور سے دیکھا اور دونوں کو طاقت ور پا کر فرمایا اگر تم چاہو تو میں تم کو دے دوں (مگر) اس میں نہ غنی کا حصہ ہے اور نہ طاقت ور کمائی کرنے والے کا۔ رواہ احمد وابوداؤد والنسائی۔ صاحب تنقیح نے کہا یہ حدیث صحیح ہے یہ حدیث کیسی کھری اور عمدہ سند والی ہے اس مبحث کی احادیث کامل ابن عدی میں حضرت ابن عمر کی روایت سے اور سنن ترمذی میں حضرت حبشی بن جنادہ کی روایت سے آئی ہیں۔ امام احمد نے ابوذمیل کی سند سے بنی ہلال کے ایک شخص کی روایت سے بھی یہ حدیث بیان کی ہے اور طبرانی نے حضرت عبدالرحمٰن کی روایت سے بھی۔

ہم کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان گر تم چاہو تو میں تم کو دے دوں اور غنی کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہے صراحۃً بتا رہا ہے کہ طاقتور اہل حاجت کو زکوۃ دینا جائز ہے ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ نہ فرماتے کہ اگر تم چاہو تو دے دوں۔

ہماری دلیل حضرت عمر کی حدیث بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے عطا فرماتے تھے تو میں عرض کرتا تھا کہ مجھ سے زیادہ حاجت مند کو عطا فرمایئے الخ۔ (یہ پوری حدیث پہلے بیان کی جا چکی ہے) یہ حدیث بخاری ومسلم کی متفق علیہ ہے۔ مسلم کی ایک روایت میں اتنا اور بھی ہے کہ (حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) اس کو لے لو، اس سے تمول حاصل کرو اور اس سے خیرات کرو، سالم نے کہا اسی حدیث کی وجہ سے حضرت ابن عمرؓ کسی سے کچھ نہیں مانگتے تھے اور بغیر سوال کے اگر ان کو کچھ دیا جاتا تھا تو رد نہیں کرتے تھے۔

ایک شبہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ حضرت عمرؓ کو عطا فرمایا تھا وہ تو کام کی اجرت تھی۔ فقر کی وجہ سے نہیں عطا فرمایا تھا اسی لئے فرمایا تھا کہ اس کو لے لو۔ اس سے تمول حاصل کرو اور خیرات کرو۔ عمل کی اجرت کا ثبوت مسلم کی اس روایت سے ہوتا ہے جس میں ابوحمید ساعدی نے بیان کیا کہ حضرت عمرؓ بن خطاب نے مجھے صدقہ (زکوۃ) کے کام پر مامور کیا۔ کام تمام کرنے کے بعد جب میں نے رقم زکوۃ ادا کر دی تو آپ نے اجرت عمل مجھے دینے کا حکم دیا، میں نے عرض کیا (امیر المؤمنین) میں نے تو اللہ کے واسطے کام کیا ہے میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے (اس سے لے لوں گا) فرمایا جو کچھ تم کو دیا گیا ہے وہ لے لو کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں میں نے بھی (تحصیل زکوۃ کا) کام کیا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے کام کی اجرت دی تو میں نے بھی تمہاری طرح کہا تھا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا جب تم کو بغیر سوال کے دیا جائے تو کھاؤ اور خیرات کرو۔

جواب: الفاظ عام ہیں اور عموم الفاظ ہی معتبر ہے واقعہ کی خصوصیت ناقابل اعتبار ہے۔ الفاظ کا عموم یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم کو اس مال میں سے کچھ مل جائے اور تم از خود نہ حریص ہو نہ سائل تو اس کو لے لو ان الفاظ میں کوئی خصوصیت نہیں ہے۔

جو شخص احادیث کی تلاش کرے گا اس کو احادیث میں صراحت کے ساتھ یا دلالۃً یہ بات ملے گی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح وتندرست سائل کو زکوۃ کا مال عطا فرمایا۔ مسلم نے بیان کیا ہے کہ حضرت انسؓ نے فرمایا، میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جا رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم موٹی کناری کی نجرانی چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ ایک دیہاتی نے چادر پکڑ کر اتنی زور سے کھینچی کہ چادر کی کناری کا نشان گردن مبارک کے ایک طرف پڑ گیا پھر کہنے لگا محمد! جو مال تمہارے پاس ہے اس میں سے کچھ مجھے بھی دو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف گردن موڑی اور ہنس دیئے۔ پھر اس کو کچھ دینے کا حکم دیا۔ حافظ ابن حجر نے کہا، اس باب کی اکثر احادیث اس کی شاہد ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ میں نے جو احادیث ذکر کر دیں بالا جمال ان سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ طاقتور محتاج کو زکوۃ دینا جائز ہے اس نے سوال کیا ہو یا نہ کیا ہو ہاں سائل قوی کو دینا تو جائز ہے مگر اس کا سوال کرنا اور سوال کر کے لینا مکروہ ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے زکوٰۃ وغیرہ جائز نہیں:

اکثر ائمہ کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نہ واجب صدقہ (یعنی فرض زکوۃ کا مال) لینا حلال تھا نہ نفل صدقہ (خیرات) لینا امام شافعی اور امام احمد کے دو مختلف قول خیرات لینے کے جواز وعدم جواز کے متعلق آئے ہیں، جمہور کے قول کی دلیل حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک راستہ پر گذرے وہاں چھوارہ پڑا تھا فرمایا اگر مجھے یہ

اندیشہ نہ ہوتا کہ یہ صدقہ کا ہوگا تو میں اس کو کھالیتا۔ متفق علیہ۔

حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جب کوئی کھانا پیش کیا جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم دریافت فرماتے یہ ہدیہ ہے یا صدقہ اگر صدقہ کہا جاتا تو آپ ساتھیوں سے فرماتے تم کھالو خود نہ کھاتے اور اگر ہدیہ کہا جاتا تو آپ ہاتھ بڑھا دیتے اور ساتھیوں کے ساتھ خود بھی کھاتے۔ متفق علیہ۔ طحاوی نے بھی بہزاد بن حکیم کے دادا کی روایت سے اسی طرح بیان کیا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آل کیلئے بھی جائز نہیں ہے:

آل رسول کے لئے بھی صدقہ حلال نہ تھا۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضرت حسنؓ بن حضرت علیؓ نے صدقہ کا ایک چھوارہ اٹھا کر منہ میں رکھ لیا۔ حضور نے منہ سے پھینک دینے کیلئے فرمایا اخ اخ۔ پھر فرمایا ہم صدقہ نہیں کھایا کرتے۔ (متفق علیہ)

روایت میں آیا ہے ہمارے لئے صدقہ حلال نہیں۔ رواہ مسلم والطبرانی والطحاوی من حدیث عبدالرحمٰن بن ابی لیلی ومن حدیث رشد بن مالک۔ امام احمد اور طحاوی نے حضرت حسنؓ کے قصہ میں بھی یہی الفاظ نقل کیے ہیں۔

خیرات جائز ہے زکوۃ جائز نہیں امام ابوحنیفہ کا مشہور مسلک اور امام شافعی وامام حنبل کا صحیح قول یہی ہے۔ امام مالک کی طرف بھی ایک روایت میں اس قول کی نسبت کی گئی ہے۔ بلکہ امام مالک سے تو چاروں اقوال مروی ہیں۔ اور چاروں روایات مشہور ہیں اس قول کی دلیل یہ ہے کہ مندرجہ بالا احادیث میں آل محمد کیلئے جس صدقہ کی ممانعت آئی ہے اس سے مراد فرض صدقہ (زکوۃ) ہے اور فرض زکوۃ کی حرمت ہی حضرت مُطلب بن ربیعہ بن حارث کی حدیث میں مراد ہے حضرت ربیعہ بن حارث اور حضرت عباس بن عبدالمطلب ایک بار جمع ہوئے اور بولے اگر ہم ان دونوں لڑکوں یعنی مجھے اور فضل بن عباس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس غرض کیلئے بھیج دیں کہ آپ تحصیل زکوۃ کی خدمت پر ان دونوں کو مقرر کردیں تا کہ دوسرے لوگوں کو جو اجرت ملتی ہے وہ ان کو بھی مل جایا کرے تو مناسب معلوم ہوتا ہے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا ان کو نہ بھیجو (مگر حضرت علی کا مشورہ کسی نے نہ مانا) چنانچہ ہم خدمت گرامی میں حاضر ہوئے۔ حضور اس روز حضرت زینب بنت جحش کے گھر تھے اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم اب نکاح کے قابل ہوگئے اور آپ (اقارب کے ساتھ) سب سے زیادہ اچھا سلوک کرنے والے اور بڑے کنبہ پرور ہیں ہم اس لئے خدمت گرامی میں حاضر ہوئے ہیں کہ آپ وصول زکوۃ کی خدمت پر ہم کو بھی مامور فرما دیں جس طرح اور لوگ وصول کر کے داخل کرتے ہیں اور اجرت پاتے ہیں ہم بھی وصول کر کے داخل کردیں گے اور ہم کو بھی دوسروں کی طرح اجرت مل جائے گی (اس طرح ہم نکاح کرسکیں گے اور ہمارا گذارا ہو جائے گا) یہ سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم دیر تک خاموش رہے پھر فرمایا آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے صدقہ مناسب نہیں یہ لوگوں کا میل کچیل ہے تم محمیہ بن جزء اسدی اور نوفل بن حارث بن عبدالمطلب کو بلالاؤ۔ محمیہ کو حضور نے مال خمس کی نگرانی پر مامور فرما دیا تھا جب دونوں آگئے تو محمیہ سے فرمایا اس لڑکے فضل بن عباس سے اپنی لڑکی کا نکاح کردو۔ محمیہ نے نکاح کردیا اور نوفل بن حارث سے فرمایا تم اس لڑکے سے اپنی لڑکی کا نکاح کردو، انہوں نے بھی اپنی لڑکی کا نکاح حسب الحکم کردیا پھر محمیہ سے فرمایا خمس میں سے ان دونوں کا مہر اتنا اتنا دیدو۔ رواہ مسلم یہ حدیث بتارہی ہے کہ وصول زکوۃ پر اگر کوئی ہاشمی مامور ہو تب بھی مال زکوۃ میں سے اجرت لینی اس کیلئے جائز نہیں اور مامور نہ ہو تو جواز کی کوئی وجہ ہی نہیں۔ لیکن اس حدیث میں صدقہ سے مراد زکوۃ ہے جس کو وصول کرنے کیلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو مقرر فرماتے تھے۔

بخاری وغیرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہم کسی کو اپنا وارث نہیں چھوڑتے، ہم جو کچھ چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہے۔ زندگی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سال بھر کا خرچ گھر والوں کو دے دیا کرتے تھے اور جو کچھ بچ رہتا اس کو اللہ کے مال کی طرح اللہ کے راستہ میں (یعنی جہاد کی تیاری گھوڑوں کی خریداری ہتھیاروں کی فراہمی وغیرہ) صرف کرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کی طرح کیا کرتے تھے۔ (یعنی ترکہ رسول میں سے جو حقیقت میں ترکہ نہ تھا بلکہ حضور کی وفات کے بعد اس کا حکم خیرات یا صدقہ کا حکم تھا اقارب رسول اللہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تقسیم کے مطابق دیا کرتے تھے) اس سے ظاہر ہوگیا کہ بنی ہاشم کیلئے ہر صدقہ (خواہ خیرات ہی ہو) حرام نہ تھا (بلکہ صرف زکوۃ حرام تھی)

ہم کہتے ہیں بنی ہاشم کے شرف کا تقاضا ہے کہ وہ تمام لوگوں کے (خواہ وہ ہاشمی ہی ہوں) میل کچیل سے اپنے کو محفوظ رکھیں اس لئے ہاشمی ہاشمی کی بھی زکوۃ نہیں لے سکتا۔

مسئلہ: بنی ہاشم کے لئے زکوۃ حرام ہے ان میں پانچ بطن شامل ہیں۔ آل علی، آل عباس، آل جعفر، آل عقیل، آل حارث بن عبدالمطلب، یہ امام اعظم اور امام مالک کا قول ہے۔ امام شافعی کے نزدیک بنی مطلب بھی ان میں شامل ہیں کیونکہ خمس میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو ذوی القربی کو دیتے تھے تو بنی مطلب کو بھی اس کا حصہ دار بناتے تھے ان کو بھی دیتے تھے۔ مسائل خمس میں جبیر بن مطعم کی روایت ہم ذکر کرچکے ہیں۔

مسئلہ: امام ابوحنیفہ اور امام محمد کے نزدیک بنی ہاشم کے غلاموں کے لئے

بھی زکوۃ حرام نہیں ہے امام شافعی اور امام مالک کا بھی صحیح ترین قول یہی ہے بعض کے نزدیک بنی ہاشم کے موالی کے لیے زکوۃ حرام نہیں۔ امام ابو یوسف نے فرمایا موالی کی طرف بنی ہاشم کے سوا اور کسی کو نہیں پھیرا جائے گا۔ امام ابوحنیفہ کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مخزومی شخص کو تحصیل زکوۃ پر مقرر فرمایا اس شخص نے ابورافع سے کہا تم بھی میرے ساتھ چلو، تم کو بھی کچھ مل جائے گا۔ ابورافع نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھے بغیر میں نہیں جاسکتا۔ چنانچہ ابورافع نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا تذکرہ کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہمارے آل محمد کے لئے صدقہ حلال نہیں اور کسی قوم کا غلام بھی انہی میں سے ہوتا ہے (یعنی اس کا حکم بھی ویسا ہی ہوتا ہے جیسے اس کے آقا کا) یہ حدیث حضرت ابورافع کی روایت سے امام احمد ابوداؤد ترمذی نسائی ابن حبان اور حاکم نے بیان کی ہے اور طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے ابورافع کا نام ارقم بن ابی الارقم تھا۔

مسئلہ: مال زکوۃ کو ایک شہر سے دوسرے شہر کو لے جانا مکروہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ سے فرمایا تھا ان کے مالداروں سے لیا جائے گا اور ان کے حاجت مندوں کو لوٹا دیا جائے۔ منقول ہے کہ زکوۃ کو جو بال خراسان سے شام کو لایا گیا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے پھر شام سے خراسان کرلوٹا دیا۔ (تفسیر مظہری)

غیر مسلموں کو نفلی صدقہ دینا:

نفلی صدقات میں سے غیر مسلموں کو دینا باتفاق امت جائز اور سنت سے ثابت ہے اور اگر صدقات سے مراد اس جگہ صدقات فرض، زکوۃ عشر وغیرہ ہی ہوں، تو منافقین کو اس میں سے حصہ دینا اس بناء پر تھا کہ وہ اپنی آپ کو مسلمان ظاہر کرتے تھے اور ظاہری کوئی حجت ان کے کفر پر قائم نہ ہوئی تھی۔ اور اللہ تعالیٰ نے بمصلحت حکم یہی دے رکھا تھا کہ منافقین کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے جو مسلمانوں کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ (بیان القرآن ملخصاً)

زکوٰۃ کے مصارف اللہ کی طرف سے متعین ہیں:

ابوداؤد اور دارقطنی نے حضرت زیاد بن حارث صدائی کی روایت سے نقل کی ہے یہ فرماتے ہیں کہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی قوم کے مقابلہ کیلئے ایک لشکر مسلمانوں کا روانہ فرما رہے ہیں میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ لشکر نہ بھیجیں میں اس کا ذمہ لیتا ہوں کہ وہ سب مطیع وفرمانبردار ہوکر آجائیں گے پھر میں نے اپنی قوم کو خط لکھا تو سب کے سب مسلمان ہوگئے اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یااخاصداء المطاع فی قومہ جس میں گویا ان کو یہ خطاب دیا گیا کہ یہ اپنی قوم کے محبوب اور مقتداء ہیں میں نے عرض کیا کہ اس میں میرا کوئی کمال نہیں، اللہ تعالیٰ کے کرم سے ان کو ہدایت ہوگئی اور وہ مسلمان ہوگئے یہ فرماتے ہیں کہ میں ابھی اس مجلس میں حاضر تھا کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کچھ سوال کرنے کیلئے حاضر ہوا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو یہ جواب دیا کہ:

''صدقات کی تقسیم کو اللہ تعالیٰ نے کسی نبی یا غیر نبی کے بھی حوالہ نہیں کیا، بلکہ خود ہی اس کے آٹھ مصرف متعین فرمادیئے۔ اگر تم ان آٹھ میں داخل ہو تو تمہیں دے سکتا ہوں۔ انتہی، (تفسیر قرطبی، ص ۱۶۸ ج ۸)

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صدقہ کسی غنی یعنی مال دار کے لئے حلال نہیں، بجز پانچ شخصوں کے ایک وہ شخص جو جہاد کیلئے نکلا ہے اور وہاں اس کے پاس بقدر ضرورت مال نہیں، اگرچہ گھر میں مال دار ہو، دوسرے عامل صدقہ جو صدقہ وصول کرنے کی خدمت انجام دیتا ہو، تیسرے وہ شخص کہ اگرچہ اس کے پاس مال ہے مگر وہ موجود مال سے زیادہ کا مقروض ہے چوتھے وہ شخص جو صدقہ کا مال کسی غریب مسکین سے پیسے دے کر خرید لے پانچویں وہ شخص جس کو کسی غریب فقیر نے صدقہ کا حاصل شدہ مال بطور ہدیہ تحفہ پیش کردیا ہو۔

عاملین کی اجرت کا اصول:

رہا یہ مسئلہ کہ عاملین صدقہ کو اس میں سے کتنی رقم دی جائے سو اس کا حکم یہ ہے، کہ انکی محنت وعمل کی حیثیت کے مطابق دی جائے گی۔ (احکام القرآن جصاص قرطبی)

اسلامی مدارس کے سفیر:

فائدہ: آج کل جو اسلامی مدارس اور انجمنوں کے مہتمم یا ان کی طرف سے بھیجے ہوئے سفیر صدقات زکوۃ وغیرہ مدارس اور انجمنوں کیلئے وصول کرتے ہیں ان کا وہ حکم نہیں جو عاملین صدقہ کا اس آیت میں مذکور ہے۔ کہ زکوۃ کی رقم میں سے ان کی تنخواہ دی جاسکے، بلکہ ان کو مدارس اور انجمن کی طرف سے جداگانہ تنخواہ دینا ضروری ہے زکوۃ کی رقم سے ان کی تنخواہ نہیں دی جاسکتی، وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ فقراء کے وکیل نہیں، بلکہ اصحاب زکوۃ مال داروں کے وکیل ہیں ان کی طرف سے مال زکوۃ کو مصرف پر لگانے کا ان کو اختیار دیا گیا ہے اسی لئے ان کے قبضہ ہوجانے کے بعد بھی زکوۃ اس وقت تک ادا نہیں ہوتی جب تک یہ حضرات اس کو مصرف پر خرچ نہ کردیں۔

چار مدوں کیلئے چار بیت المال:

خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی حکومت میں چار بیت المال چار مدات کیلئے الگ الگ مقرر ہیں اور فقراء ومساکین کا حق چاروں میں رکھا گیا ہے ان میں سے پہلی تین مدوں کے مصارف خود قرآن کریم نے تفصیل کے ساتھ متعین فرما کر واضح طور پر بیان کردیئے ہیں، پہلی مد یعنی خمس غنائم کے مصارف کا بیان سورۂ انفال دسویں پارہ کے شروع میں مذکور ہے۔ اور دوسری مد یعنی

صدقات کے مصارف کا بیان سورۂ توبہ کی مذکور الصدر ساٹھویں آیات میں آیا ہے، جس کی تفصیل اس وقت زیر بحث ہے، اور تیسری مد جس کو اصطلاح میں مال فئے سے تعبیر کیا جاتا ہے اس کا بیان سورۂ حشر میں تفصیل کے ساتھ آیا ہے اسلامی حکومت کی اکثر مدات فوجی اخراجات اور عمال حکومت کی تنخواہیں وغیرہ اسی مد سے خرچ کی جاتی ہیں چوتھی مد یعنی لاوارث مال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات اور خلفائے راشدین کے تعامل سے اپاج محتاجوں اور لاوارث بچوں کیلئے مخصوص ہے۔ (شامی، کتاب الزکوۃ)

فی سبیل اللہ:

فی سبیل اللہ سے مراد وہ غازی اور مجاہد ہے جس کے پاس اسلحہ اور جنگ کا ضروری سامان خریدنے کیلئے مال نہ ہو، یا وہ شخص جس کے ذمہ حج فرض ہو چکا ہو مگر اس کے پاس اب مال نہیں رہا جس سے وہ حج فرض ادا کرے، یہ دونوں کام خالص دینی خدمت اور عبادت ہیں اس لئے مال زکوۃ کو ان پر خرچ کرنے میں ایک مفلس کی امداد بھی ہے اور ایک عبادت کی ادائیگی میں تعاون بھی اسی طرح حضرات فقہاء نے طالب علموں کو بھی اس میں شامل کیا ہے کہ وہ بھی ایک عبادت کی ادائیگی کیلئے لیتے ہیں۔ (روح بحوالہ ظہیریہ)

اور صاحب بدائع نے فرمایا کہ ہر وہ شخص جو کوئی نیک کام یا عبادت کرنا چاہتا ہے اور اس کی ادائیگی میں مال کی ضرورت ہے تو وہ بھی فی سبیل اللہ میں داخل ہے بشرطیکہ اس کے پاس اتنا مال نہ ہو جس سے اس کام کو پورا کر سکے، جیسے دین کی تعلیم اور تبلیغ اور ان کیلئے نشر واشاعت، کہ اگر کوئی مستحق زکوۃ یہ کام کرنا چاہے تو اس کی امداد مال زکوۃ سے کردی جائے مگر مالدار صاحب نصاب کو نہیں دیا جاسکتا۔

مقروض:

جس شخص کے ذمہ دس ہزار روپیہ قرض ہے اور پانچ ہزار روپیہ اس کے پاس موجود ہے تو اس کو بقدر پانچ ہزار کے زکوۃ دی جاسکتی ہے کیونکہ جو مال اس کے پاس موجود ہے وہ قرض کی وجہ سے نہ ہونے کے حکم میں ہے۔

رفاہِ عام پر زکوۃ نہیں لگتی:

ائمہ اربعہ اور فقہاء امت میں سے یہ کسی نے نہیں کہا کہ رفاہ عام کے اداروں اور مساجد و مدارس کی تعمیر اور ان کی جملہ ضروریات مصارف زکوۃ میں داخل ہیں، بلکہ اس کے خلاف اس کی تصریحات فرمائی ہیں کہ مال زکوۃ ان چیزوں میں صرف کرنا جائز نہیں۔

مسئلہ تملیک

جمہور فقہاء اس پر متفق ہیں کہ زکوۃ کے معینہ آٹھ مصارف میں بھی زکوۃ کی ادائیگی کیلئے یہ شرط ہے کہ ان مصارف میں سے کسی مستحق کو مال زکوۃ پر مالکانہ قبضہ دیدیا جائے بغیر مالکانہ قبضہ دیئے اگر کوئی مال انہی لوگوں کے فائدے کیلئے خرچ کردیا گیا تو زکوۃ ادا نہیں ہوگی۔ اسی وجہ سے ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء امت اس پر متفق ہیں کہ رقم زکوۃ کو مساجد یا مدارس یا شفاخانے یتیم خانے کی تعمیر میں یا ان کی دوسری ضروریات میں صرف کرنا جائز نہیں، اگرچہ ان تمام چیزوں سے فائدہ ان فقراء اور دوسرے حضرات کو پہنچتا ہے جو مصرف زکوۃ ہیں، مگر ان کا مالکانہ قبضہ ان چیزوں پر نہ ہونے کے سبب زکوۃ اس سے ادا نہیں ہوتی۔

البتہ یتیم خانوں میں اگر یتیموں کا کھانا کپڑا وغیرہ مالکانہ حیثیت سے دیا جاتا ہے تو صرف اس خرچ کی حد تک رقم زکوۃ صرف ہوسکتی ہے، اسی طرح شفاخانوں میں جو دوا حاجت مند غرباء کو مالکانہ حیثیت سے دیدی جائے اس کی قیمت رقم زکوۃ میں محسوب ہوسکتی ہے اسی طرح فقہاء امت کی تصریحات ہیں کہ لاوارث میت کا کفن رقم زکوۃ سے نہیں لگایا جاسکتا۔ کیونکہ میت میں مالک ہونے کی صلاحیت نہیں، ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ رقم زکوۃ کسی غریب مستحق کو دیدی جائے اور وہ اپنی خوشی سے اس رقم کو لاوارث میت کے کفن پر خرچ کردے، اسی طرح اگر میت کے ذمہ قرض ہے تو اس قرض کو رقم زکوۃ سے براہ راست ادا نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں اس کے وارث غریب مستحق زکوۃ ہوں، تو ان کا مالکانہ طور سے دیا جاسکتا ہے وہ اس رقم کے مالک ہو کر اپنی رضامندی کے ساتھ اس رقم سے میت کا قرض ادا کرسکتے ہیں، اسی طرح رفاہ عام کے سب کام جیسے کنواں یا پل یا سڑک وغیرہ کی تعمیر اگرچہ ان کا فائدہ مستحقین زکوۃ کو بھی پہنچتا ہے مگر ان کا مالکانہ قبضہ نہ ہونے کے سبب اس سے زکوۃ کی ادائیگی نہیں ہوتی۔

ان مسائل میں چاروں ائمہ مجتہدین ابوحنیفہ، شافعی، مالک، احمد بن حنبل رحمہم اللہ اور جمہور فقہاء امت متفق ہیں شمس الائمہ سرخی نے اس مسئلہ کو امام محمدؒ کی کتابوں کی شرح مبسوط اور شرح سیر میں پوری تحقیق اور تفصیل کے ساتھ لکھا ہے اور فقہاء شافعیہ، مالکیہ حنابلہ کی عام کتابوں میں اسکی تصریحات موجود ہیں۔

مسئلہ: مال زکوۃ اپنے عزیز رشتہ داروں کو دینا زیادہ ثواب ہے مگر میاں بی بی اور والدین واولاد آپس میں ایک دوسرے کو نہیں دے سکتے، وجہ یہ ہے کہ ان کو دینا ایک حیثیت سے اپنی ہی پاس رکھنا ہے کیونکہ ان لوگوں کے مصارف عموماً مشترک ہوتے ہیں۔ شوہر نے اگر بیوی کو یا بیوی نے شوہر کو اپنی زکوۃ دیدی، تو درحقیقت وہ اپنے ہی استعمال میں رہی، اسی طرح والدین اور اولاد کا معاملہ ہے اولاد کی اولاد اور دادا پردادا کا بھی یہی حکم ہے کہ ان کو زکوۃ دینا جائز نہیں۔

مسئلہ: اگر اپنے عزیز غریب لوگ مستحق زکوۃ ہوں تو ان کو زکوۃ وصدقات دینا زیادہ بہتر اور دوہرا ثواب ہے، ایک ثواب صدقہ کا دوسرا صلہ رحمی کا، اس میں یہ بھی ضروری نہیں کہ ان کو یہ جتلا کردے کہ صدقہ یا زکوۃ دے رہا ہوں کسی تحفہ یا ہدیہ کے عنوان سے بھی دیا جاسکتا ہے تاکہ لینے والے شریف آدمی

کو اپنی خفت محسوس نہ ہو۔

مسئلہ: جو شخص اپنے آپ کو اپنے قول یا عمل سے مستحق زکوۃ حاجت مند ظاہر کرے اور صدقات وغیرہ کا سوال کرے کیا دینے والوں کیلئے یہ ضروری ہے کہ اس کے حقیقی حالات کی تحقیق کریں اور بغیر اس کے صدقہ نہ دیں، اس کے متعلق روایات حدیث اور اقوال فقہاء یہ ہیں کہ اس کی ضرورت نہیں بلکہ اس کے ظاہری حال سے اگر یہ گمان غالب ہو کہ یہ شخص حقیقت میں فقیر حاجت مند ہے تو اس کو زکوۃ دی جاسکتی ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کچھ لوگ نہایت شکستہ حال آئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کیلئے لوگوں سے صدقات جمع کرنے کیلئے فرمایا کافی مقدار جمع ہوگئی تو وہ ان کو دیدی گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی کہ ان لوگوں کے اندرونی حالات کی تحقیق فرماتے (قرطبی) (معارف مفتی اعظم)

والغارمین:

غارمین سے وہ مفلس قرضدار مراد ہیں جنہوں نے جائز ضرورت کے لئے قرض لیا تھا۔ مگر بعد میں ادا نہ کر سکے ایسے قرضداروں کی زکوۃ وصدقات کے پیسہ سے امداد کرنی چاہیے۔ مگر جس نے معصیت کے کاموں کیلئے قرض لیا ہو، اس کو صدقات میں سے کچھ نہ دیا جائے اور فتاویٰ ظہیریہ میں ہے کہ قرضدار کو زکوۃ دینا بہ نسبت فقیر کے زیادہ بہتر ہے۔

وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ

اور بعضے اُن میں بدگوئی کرتے ہیں نبی کی اور کہتے ہیں کہ یہ شخص

هُوَ اُذُنٌ ۭ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ

تو کان ہے تو کہہ کان ہے تمہارے بھلے کے واسطے یقین رکھتا ہے

بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ

اللہ پر اور یقین کرتا ہے مسلمانوں کی بات کا اور رحمت ہے

اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۭ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ

ایمان والوں کے حق میں تم میں سے اور جو لوگ بدگوئی کرتے ہیں اللہ کے رسول کی

لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٦١﴾

اُن کے لئے عذاب ہے دردناک

منافقین کی بدتمیزی:

منافقین آپس میں بیٹھ کر اسلام و پیغمبر اسلام کے متعلق بدگوئی کرتے۔ جب کوئی کہتا کہ ہماری یہ باتیں پیغمبر علیہ السلام تک پہنچ جائینگی تو کہتے کیا پرواہ ہے۔ ان کے سامنے ہم جھوٹی تاویلیں کر کے اپنی برأت کا یقین دلا دینگے۔ کیونکہ وہ تو کان ہی کان ہیں جو سنتے ہیں فوراً تسلیم کر لیتے ہیں۔ ان کو باتوں میں لے آنا کچھ مشکل نہیں۔ بات یہ تھی کہ حضرت اپنے حیاء ووقار اور کریم النفسی سے جھوٹے کا جھوٹ پہچانتے تب بھی نہ پکڑتے۔ خلق عظیم کی بناء پر مسامحت اور تغافل برتتے۔ وہ بیوقوف جانتے کہ آپ نے سمجھا ہی نہیں۔ حق تعالیٰ نے اس کا جواب دیا کہ اگر وہ کان ہی ہیں تو تمہارے بھلے کے واسطے ہیں۔ نبی کی یہ خو تمہارے حق میں بہتر ہے، نہیں تو اول تم پکڑے جاؤ گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس چشم پوشی اور خلق عظیم پر کسی وقت مطلع ہو کر تمہیں ہدایت ہو جائے۔ تمہاری جھوٹی باتوں پر نبی علیہ السلام کا سکوت اس لئے نہیں کہ انہیں واقعی تمہارا یقین آ جاتا ہے۔ یقین تو ان کو اللہ پر ہے اور ایمانداروں کی بات پر۔ ہاں تم میں سے جو ایمان رکھتے ہیں، ان کے حق میں آپ کی خاموشی واغماض ایک طرح کی رحمت ہے کہ فی الحال منہ توڑ تکذیب کر کے ان کو رسوا نہیں کیا جاتا۔ باقی منافقین کی حرکات شنیعہ خدا سے پوشیدہ نہیں۔ رسول کی پیٹھ پیچھے جو بدگوئی کرتے ہیں یا "هواذن" کہہ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچاتے ہیں اس پر سزائے سخت کے منتظر رہیں۔ (تفسیر عثمانی)

بتل شیطان:

محمد بن اسحاق نے لکھا ہے کہ بتل کالا لمبا پراگندہ مو سرخ چشم، چپکے گالوں والا بدرو آدمی تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا جو شیطان کو دیکھنا چاہتا ہو تو اس کو دیکھ لے یہ شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں جا کر منافقوں سے چپکے چپکے کہتا تھا اس سے کہا گیا ایسا نہ کر کہنے لگا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو سراسر کان ہیں جو ان سے کچھ جا کر کہہ دیتا ہے اس کو مان لیتے ہیں ہم جو کچھ چاہیں گے پھر جا کر جھوٹی قسمیں کھالیں گے (اور کہے ہوئے سے منکر ہو جائیں گے) تو وہ ہم کو سچا جان لیں گے اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور اللہ نے ان کے جواب میں فرمایا:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چشم پوشی بہتر ہے:

قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ آپ کہہ دیجئے کہ وہ کان دے کر وہی بات سنتے ہیں جو تمہارے حق میں سراسر خیر ہے۔ اذن کی خیر کی طرف اضافت ہے جیسے رجل صدق (بھلائی کے کان سچائی کا آدمی) گویا یوں کہا گیا کہ وہ بیشک کان ہیں مگر ان کا کان ہونا تمہارے لئے بہتر ہے یا یہ معنی ہے کہ وہ تمہاری بھلائی اور بہتری کی بات کان لگا کر سنتے ہیں۔ شر اور بگاڑ کی بات نہیں سنتے۔ غیبت اور چغلی کی بات نہیں سنتے۔ عذر کرنے والے کی معذرت سن لیتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مومن بھولا شریف ہوتا ہے اور کافر خبیث کمینہ، رواہ ابوداؤد والترمذی والحاکم عن ابی ہریرۃ۔ حاکم نے اس حدیث کو صحیح

کہا ہے یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ وہ خیر حق اور ہر واجب القبول بات کو سنتے ہیں اور ان کے خلاف باتوں کو نہیں سنتے۔ (تفسیر مظہری)

نکتہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دو شانیں:

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ اپنے ایک وعظ میں فرماتے ہیں۔ جاننا چاہیے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں دو شانیں تھیں ایک شان سلطنت اور دوسری شان نبوت اور محبوبیت حق۔ پس منافقین اپنی جھوٹی قسموں سے حضور پرنور کو اور آپ کے صحابہ کو بحیثیت شان سلطنت راضی کرنا چاہتے تھے۔ بحیثیت شان نبوت و رسالت آپ کو راضی کرنے کی فکر نہ تھی اور اس حیثیت سے آپ کو راضی کرنا عین حق تعالیٰ کو راضی کرنا ہے اور بعثت کا اصل مقصد شان نبوت و رسالت تھی شان سلطنت مقصود نہ تھی بلکہ شان نبوت کے تابع تھی کہ احکام خداوندی کے اجراء میں سہولت ہو۔ منافقین حضور پرنور کو بہ حیثیت سلطنت راضی رکھنا چاہتے تھے تاکہ ان کے جان و مال محفوظ رہیں اور ان کی ساتھ کافروں جیسا معاملہ نہ کیا جائے اور ظاہر ہے کہ یہ غرض سلطنت کی حیثیت سے متعلق ہے حضور پرنور کو نبوت و رسالت اور مظہر حق ہونے کی حیثیت سے راضی کرنے کی ان کو کوئی فکر اور پرواہ نہ تھی حالانکہ حضور پرنور کی رضا نائب حق ہونے کی حیثیت سے مطلوب ہے۔ اور اس آیت میں اسی کا ذکر ہے اور جس حیثیت سے تم حضور کو راضی کرنا چاہتے ہو وہ مطلوب نہیں اور جس حیثیت سے حضور کو راضی کرنا مطلوب ہے اس حیثیت سے تم حضور کو راضی کرنا نہیں چاہتے اور نہ تمہیں اس کی پرواہ ہے۔ ابوطالب کو حضور سے بہت محبت تھی مگر وہ صرف اس حیثیت سے تھی کہ حضور آپ کے چہیتے تھے یا بعض کفار کو آپ سے اس لئے محبت تھی کہ آپ بڑے عاقل کامل یا بڑے سخی اور مہمان نواز تھے اور اب بھی بعض مصنفین یورپ آپ کی عقل اور فہم و فراست کی اور ہمت اور شجاعت کی اور آپ کے قانون شریعت کی بڑی تعریف کرتے ہیں مگر ان تمام حیثیتوں سے آپ کی محبت اور رضا شرعاً نجات کیلئے کافی نہیں بلکہ نجات کے لئے یہ ضروری ہے کہ نبی اور رسول اور نائب حق ہونے کی حیثیت سے آپ سے محبت کی جائے اور اسی حیثیت سے آپ کو راضی کیا جائے۔ انتہیٰ کلامہ ماخوذ از ارضاء الحق ص ۲۰ ج ۱، و ص ۱۲ ج ۲ وعظ ششم و ہفتم از سلسلہ البلاغ۔ (معارف کاندھلویؒ)

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ ۚ
قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی تمہارے آگے تاکہ تم کو راضی کریں
وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ
اور اللہ کو اور اُس کے رسول کو بہت ضرور ہے راضی کرنا اگر

كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۲﴾
وہ ایمان رکھتے ہیں

منافقوں کے حیلے:

حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ''کسی وقت حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی دغا بازی پکڑتے تو مسلمانوں کے روبرو قسمیں کھاتے کہ ہمارے دل میں بری نیت نہ تھی۔ تاکہ ان کو راضی کر کے اپنی طرف کر لیں۔ نہ سمجھے کہ یہ فریب بازی خدا اور رسول کے ساتھ کام نہیں آتی''۔ اگر دعوائے ایمان میں واقعی سچے ہیں تو دوسروں کو چھوڑ کر خدا اور رسول کو راضی کرنے کی فکر کریں۔

اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ
کیا وہ جان نہیں چکے کہ جو کوئی مقابلہ کرے اللہ سے اور اس کے رسول
فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيْهَا ۭ ذٰلِكَ
سے، تو اُس کیواسطے ہے دوزخ کی آگ سدا رہے
الْخِزْيُ الْعَظِيْمُ ﴿۶۳﴾
اُس میں یہی ہے بڑی رسوائی

یعنی جس رسوائی سے بچنے کیلئے نفاق اختیار کیا ہے اس سے بڑی رسوائی یہ ہے۔ (تفسیر عثمانی)

اللہ اور رسول سے مقابلہ کرنیوالے کا انجام:

یزید بن ہارون کی روایت ہے کہ حضرت ابوبکر نے ایک دن خطبہ دیا اور خطبہ میں فرمایا ایک بندہ کو لا کر اللہ کے سامنے کھڑا کیا جائے گا۔ اللہ نے دنیا میں اس کو اپنی نعمتوں سے نوازا ہوگا اس کے رزق میں کشادگی عطا فرمائی ہوگی اور تندرستی بھی مرحمت کی ہوگی۔ اللہ کی پیشی ہوگی۔ تو اس سے پوچھا جائے گا تو نے اس دن کیلئے کیا عمل کیے تھے اور اپنے لئے پہلے سے کیا بھیجا تھا اس شخص کو اس وقت کوئی بھلائی نظر نہ آئے گی کیونکہ اس نے کچھ بھیجا ہی نہ ہوگا وہ رونے لگے گا کہ آنسو بہنے لگیں گے پھر اس کو عار دلائی جائیگی اور رسوا کیا جائے گا۔ اتنا کہ آخر وہ کہہ اٹھے گا اے میرے رب مجھے دوزخ میں بھیج دے اس جگہ سے تو مجھے رہائی دے۔ یہی مفہوم ہے اللہ کے قول مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ الخ کا۔ (تفسیر مظہری)

يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ
ڈرا کرتے ہیں منافق اس بات سے کہ نازل ہو مسلمانوں پر

سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ط

ایسی سورت کہ جتا دے اُن کو جو اُن کے دل میں ہے

قُلِ اسْتَهْزِءُوْا ج اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا

تو کہہ دے ٹھٹھے کرتے رہو اللہ کھول کر رہیگا اُس چیز کو جس کا

تَحْذَرُوْنَ ﴿۶۴﴾

تم کو ڈر ہے

منافقوں کی پریشان حالی:

منافقین اپنی مجلسوں میں اسلام و پیغمبر اسلام کی بدگوئی کرتے، مومنین صادقین پر آوازے کستے، مہمات دین کا مذاق اڑاتے، پھر جب خیال آتا کہ ممکن ہے یہ باتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جائیں تو کہتے کیا مضائقہ ہے وہ تو کان ہی کان ہیں۔ ہم ان کے سامنے جو تاویل وتلمیع کر دیں گے سن کر اسی کو قبول کر لینگے۔ مگر چونکہ بسا اوقات وحی الٰہی کے ذریعہ سے ان کے نفاق وبدباطنی کی قلعی کھلتی رہتی تھی، اس لئے یہ ڈر بھی لگا رہتا تھا کہ کوئی سورت قرآن میں ایسی نازل نہ ہوجائے جو ہمارے مخاطبات سریہ ونیات خفیہ کا پردہ فاش کردے۔ اصل یہ ہے کہ منافقین کا قلب جبن وکمزوری سے کسی ایک طرف قائم نہ ہوتا تھا۔ ان کے دل ہر وقت دگدا میں رہتے تھے کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اغماض وکریم النفسی کو دیکھ کر کچھ تسلی حاصل کرتے مگر صاعقہ قرآنی کی گرج سے پھر دہلنے لگتے تھے۔ اسی لئے فرمایا کہ بہتر ہے تم ٹھٹھے کرتے رہو اور استہزاء وتمسخر کا عمل جاری رکھو اور پیغمبر کی نسبت ''ھواذن'' کہہ کر تسلی کر لو۔ لیکن خدا اس چیز کو ضرور کھول کر رہیگا جس کا تم کو ڈر لگا ہوا ہے وہ تمہارے مکر وخداع کا تار تار بکھیر کر رکھ دیگا۔ (تفسیر عثمانی)

منافقوں کی سازش کی ناکامی اور رسوائی:

امام احمد نے حضرت ابوطفیل کی روایت سے بیہقی نے حضرت حذیفہ کی روایت سے اور ابن سعد نے حضرت جبیر بن مطعم کی روایت سے بیان کیا۔ نیز ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے ضحاک (تابع) کے حوالہ سے بیہقی نے عروہ اور ابن اسحاق کی وساطت سے اور محمد بن عمر نے اپنے مشائخ روایت کی سند سے بیان کیا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی سفر میں تھے اور کسی راستے میں گزر رہے تھے کہ منافقوں میں سے کچھ لوگوں نے باہم مشورہ کر کے یہ طے کر لیا کہ گھاٹی کے اوپر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گرا کر قتل کر دیں۔ مشورہ طے کرنے کے بعد موقع کی تلاش میں رہے چنانچہ (سفر مذکور میں) جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی گھاٹی پر چلنے کا ارادہ کیا تو منافق بھی آپ کے ساتھ ہو لئے تاکہ جس وقت آپ گھاٹی پر چڑھیں تو منافق آپ کو اونٹنی سے اٹھا کر وادی میں پھینک دیں اللہ نے ان کی اس مکاری کی اطلاع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دی چنانچہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھاٹی پر چڑھنے لگے تو آپ کی طرف سے ایک منادی نے ندا کر دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھاٹی کے راستہ میں جا رہے ہیں خبردار کوئی بھی گھاٹی کے راستہ سے نہ جائے سب وادی کے اندر سے جائیں تم لوگوں کیلئے وادی کے اندر سے جانا آسان بھی ہے (اوپر چڑھنے سے بچ جاؤ گے) حسب الحکم سب لوگوں نے بطن وادی کی راہ اختیار کی مگر جن منافقوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کی تدبیر کی تھی۔ انہوں نے جب یہ حکم سنا تو (اپنے ارادہ سے باز نہ آئے اور اپنے منصوبہ کی تکمیل کیلئے) تیار ہوگئے اور چہروں پر کپڑا باندھ لیا (اور گھاٹی پر جا چھپے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب گھاٹی پر اس شان سے چلنا شروع کیا کہ حسب الحکم آگے آگے حضرت عمارؓ بن یاسر اونٹنی کی مہار پکڑے جا رہے تھے اور پیچھے پیچھے حضرت حذیفہؓ بن یمان ہنکار رہے تھے اچانک (چھپے ہوئے لوگوں کی) کچھ آہٹ محسوس ہوئی ساتھیوں نے نیزے تان لیے اور اونٹنی کو زور سے بھگایا اونٹنی اتنی تیزی سے بھاگی کہ کچھ سامان بھی گر پڑا رات اندھیری تھی حضرت حمزہ بن عمرو اسلمی بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گھاٹی میں پہنچ گئے۔ حضرت حمزہؓ کا بیان ہے کہ (گھاٹی کے اندر مشعل کی طرح) میری پانچوں انگلیاں روشن ہوگئیں جن کی روشنی میں ہم نے کوڑا رسی اور دوسرا گرا پڑا سامان جمع کر لیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حذیفہؓ کو حکم دیا کہ (آنے والے) لوگوں کو واپس لوٹا دیں حضرت حذیفہؓ کے پاس ایک ٹیڑھی موٹھ کی برچھی دار لاٹھی تھی آپ اس لاٹھی سے آنے والے لوگوں کی سواریوں کے رخ لوٹانے لگے اور فرمایا اے اللہ کے دشمنو! ادھر ہی جاؤ ادھر ہی رہو ان لوگوں کو معلوم ہوگیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارے ارادے کی اطلاع مل گئی اس لئے فوراً تیزی کے ساتھ گھاٹی سے اتر کر دوسرے لوگوں میں جا ملے۔ حضرت حذیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حذیفہؓ اونٹنی کو مارو اور عمار تم پیدل چلو سب لوگ تیزی سے چلے یہاں تک کہ یہ دونوں بزرگ گھاٹی کے اوپر پہنچ گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھاٹی سے باہر نکل گئے اور لوگوں کا انتظار کرنے لگے۔ پھر حذیفہؓ سے فرمایا جن لوگوں کو تم نے لوٹایا تھا کیا ان میں سے کسی کو پہچانا بھی۔ حضرت حذیفہؓ نے عرض کیا حضور رات کا اندھیرا تھا اور ان کے چہروں پر کپڑے بندھے تھے میں نے نہیں پہچانا ہاں ان کی اونٹنیوں کو پہچان لیا فرمایا تم سمجھے بھی کہ ان کا ارادہ کیا تھا۔ حضرت حذیفہؓ نے عرض کیا خدا کی قسم حضور! مجھے تو کچھ علم نہیں فرمایا انہوں نے داؤ کیا تھا کہ میرے ساتھ ساتھ چلیں اور جب میں گھاٹی پر چڑھوں تو پتھر مار مار کر مجھے گھاٹی سے نیچے پھینک دیں اللہ نے مجھے ان کے نام اور ان کے باپوں کے نام بتا دیئے میں ان شاء اللہ تم کو ان کی اطلاع دے دوں گا۔ حضرت حذیفہؓ نے عرض

کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب لوگ آ جائیں تو آپ حکم دے دیجئے کہ ان (بے ایمانوں) کی گردنیں ماردی جائیں، فرمایا نہیں۔لوگ باتیں بنائیں گے اور کہیں گے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھیوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ (بغوی کی روایت کے الفاظ میں کچھ اختلاف ہے مگر مطلب ایک ہی ہے) ہمارے لیے اللہ کافی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حذیفہؓ اور حضرت عمارکو ان منافقوں کے نام بتادیئے تھے مگر فرمادیا تھا ان کو پوشیدہ رکھنا۔غرض صبح ہوئی تو حضرت اسید بن حضیر نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم !رات آپ وادی کے اندر کی راہ سے کیوں نہ چلے یہ راستہ تو گھاٹی کے راستے سے آسان تھا۔ فرمایا ابویحییٰ! کیا تم جانتے ہو کہ منافقوں کا میرے متعلق کیا ارادہ تھا اور انہوں نے کیا طے کیا تھا ان کا خیال تھا کہ میرے پیچھے پیچھے آئیں گے اور رات کے تاریکی میں میری اونٹنی کا سینہ بند اور تسمے کاٹ کر اونٹنی کے آر چبھودیں گے (چنانچہ ایسا ہی ہوا) قریب تھا کہ اونٹنی سے مجھے نیچے پھینک دیں۔ حضرت اسیدؓ نے عرض کیا یارسول اللہ !اب سب لوگ جمع ہیں اور اتر پڑے ہیں (یعنی فروکش ہو گئے ہیں اور پڑاؤ ڈال لیا ہے) آپ ہر خاندان کو حکم دے دیں کہ اس خاندان کے جس شخص نے یہ ارادہ کیا ہو خاندان والے ہی اس کو قتل کر دیں اور اگر آپ کی رائے میں مناسب ہو تو مجھے (ان کے نام) بتادیجئے قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے میں اس جگہ سے ہٹوں گا بھی نہیں کہ ان کے سر آپ کی خدمت میں لا کر حاضر کر دوں گا۔فرمایا مجھے یہ بات پسند نہیں کہ لوگ باتیں بنائیں اور کہیں جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی لڑائی مشرکوں سے ختم ہو گئی تو وہ اپنے ساتھیوں پر ہاتھ صاف کرنے لگا۔حضرت اسیدؓ نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم !وہ تو آپ کے ساتھی نہیں ہیں۔فرمایا کیا وہ لا الہ الا اللہ کی شہادت کا اظہار نہیں کرتے۔حضرت اسید نے عرض کیا جی کرتے تو ہیں، فرمایا اسی وجہ سے میں ان کے قتل سے باز رہا۔

بارہ سربرآوردہ منافقوں کی طلبی:

محمد بن اسحاق کی روایت ہے کہ صبح ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حذیفہؓ کو حکم دیا کہ عبداللہ بن سعد بن ابی السرح اور ابو حاضر اعرابی اور عامر ابو عامر اور حلاس بن سوید بن صامت اور مجمع بن حارثہ اور ملیح تمیمی اور حصیر بن نمیر اور طعمہ بن ابیرق اور عبداللہ بن عیینہ اور مرہ بن ربیع کو بلا لاؤ۔ حلاس ہی وہ شخص تھا جس نے کہا تھا جب تک آج رات گھاٹی سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم پھینک نہ دیں گے باز نہ رہیں گے اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے ساتھی ہم سے بہتر ہیں تو ہم پھر بکریاں ہوں گے اور وہ چرواہے، ہم بے عقل ہوں گے اور وہ عقل والے۔ملیح تمیمی وہ شخص تھا جس نے کعبہ کی خوشبو چرائی تھی اور مرتد ہو کر بھاگ گیا تھا مگر سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کہاں جائے ملک میں مارا مارا پھرتا تھا۔حصیر بن نمیر وہ ہے جس نے زکوۃ کی چیزیں چرائی ہیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا کمبخت یہ حرکت تو نے کیوں کی کہنے لگا مجھے اس حرکت پر اس خیال نے آمادہ کیا کہ اللہ آپ کو اس بات پر مطلع نہیں کرے گا (کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول نہیں ہیں) لیکن اب جبکہ اللہ نے آپ کو آگاہ کر دیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اب میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اس وقت سے پہلے میں آپ پر ایمان نہیں لایا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات سن کر اس سے درگذر فرمائی اور معاف کر دیا۔عبداللہ بن عیینہ وہی شخص تھا جس نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا۔آج رات کو جاگ لو ہمیشہ کیلئے نجات پالو گے خدا کی قسم اس شخص کو قتل کر دینے کے سوا تمہارا کوئی کام نہیں۔ (اس کے بغیر تمہارا کام نہ ہوگا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بلوا کر فرمایا کم بخت اگر میں مارا جاتا تو تجھے کیا فائدہ پہنچتا۔دشمن خدا کہنے لگا اے اللہ کے نبی! خدا کی قسم جب سے اللہ نے آپ کو فتح عنایت کی ہے، ہم برابر خیریت کے ساتھ ہیں ہم تو بس اللہ اور آپ کی ذات کے سبب سے (خیریت اور آسائش میں) ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو چھوڑ دیا۔مرہ بن ربیع وہ شخص تھا جس نے عبداللہ بن ابی کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا تھا۔اس رکاوٹ کو دور کر دو۔اس ایک اکیلے شخص کے قتل کے بعد تو ہمارے لئے چین ہی چین ہے عام لوگ اس کے قتل سے مطمئن ہوں گے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بلوا کر فرمایا ارے تو نے ایسی باتیں کیوں کہیں اس نے جواب دیا، یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نے تو ان میں سے کوئی بات نہیں کہی اگر کہی ہوتی تو آپ کو معلوم ہی ہوتی۔غرض ان بارہ منافقوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دینے کا ارادہ کیا تھا۔سب کو ان کی کہی ہوئی باتیں ان کی گفتگو اور ان کے ظاہر و باطن کی حالت بتائی اور آپ کو ان چیزوں کا علم وحی سے ہوا تھا۔آیت وَهَمُّوا بِمَا لَمْ يَنَالُوا سے اسی طرف اشارہ ہے۔ یہ بارہ آدمی نفاق اور اللہ اور اللہ کے رسول سے جنگ کے ارادہ ہی کی حالت میں مر گئے۔

بیہقی نے حضرت حذیفہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کیلئے بددعا کی تھی اور فرمایا تھا الٰہی ان کو دبیل میں مبتلا کر یعنی آگ کی ایک چنگاری میں جو ان کے دلوں کی رگ پر لگے اور وہ ہلاک ہو جائیں۔

مسلم کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے ساتھیوں میں بارہ آدمی منافق ہیں یہ اس وقت تک جنت میں نہیں جائیں گے جب تک اونٹ سوئی کے ناکہ میں داخل نہ ہو جائے (اور سوئی کے ناکہ میں اونٹ کا داخل ہونا محال ہے لہٰذا ان کا جنت میں داخل ہونا بھی محال ہے) آٹھ کا کام تمام تو دبیل کر دے گا۔یعنی آگ کا ایک چراغ جو ان کے شانوں کے درمیان پیدا ہوگا اور سینوں سے پار ہو جائے گا۔

بیہقی نے کہا ہم کو حضرت حذیفہؓ کی روایت پہنچی ہے کہ یہ لوگ چودہ یا پندرہ تھے۔یہ واقعہ اس زمانہ کا ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک

سے واپس آ رہے تھے۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا

اور اگر تو اُن سے پوچھے تو وہ کہیں گے ہم تو بات چیت

نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ ؕ

کرتے تھے اور دل لگی

منافقوں کی بیہودگی:

''تبوک'' میں جاتے ہوئے بعض منافقین نے ازراہ تمسخر کیا۔ اس شخص (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو دیکھو کہ شام کے محلات اور روم کے شہروں کو فتح کر لینے کا خواب دیکھتا ہے۔ انہوں نے رومیوں کی جنگ کو عربوں کی باہمی جنگ پر قیاس کر رکھا ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ کل ہم سب رومیوں کے سامنے رسیوں میں بندھے ہوئے کھڑے ہونگے۔ یہ ہمارے قراء صحابہ (رضی اللہ عنہم) پیٹو، جھوٹے اور نامردے کیا روم کی باقاعدہ فوجوں سے جنگ کرینگے، وغیر ذلک من الھفوات۔ اس قسم کے مقولے جو مسلمانوں کو روم سے مرعوب و ہیبت زدہ کرنے اور شکستہ خاطر بنانے کیلئے کہہ رہے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نقل ہوئے۔ آپ نے بلا کر باز پرس کی تو کہنے لگے کہ حضرت! ہم کہیں سچ مچ ایسا اعتقاد تھوڑا ہی رکھتے ہیں، محض خوش وقتی و دل لگی کے طور پر کچھ کہہ رہے تھے کہ باتوں میں بآسانی سفر کٹ جائے۔ (تفسیر عثمانی)

میں کہتا ہوں منافقوں کا یہ قول انما کنا نخوض ونلعب جو بجائے خود استہزاء کا ان کی طرف سے اعتراف ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم جو کچھ کہہ رہے تھے اس کا مقصد استہزاء کرنا نہ تھا بلکہ تفریحی کلام تھا راستہ طے کرنے کیلئے ہم بطور مذاق ایسی باتیں کر رہے تھے۔

شان نزول:

ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عمر کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ایک مجلس میں ایک شخص نے کہا ہم نے اپنے قرآن پڑھنے والوں کی طرح کسی شخص کو نہیں دیکھا جوان کی طرح کھانے کا حریص زبان کا جھوٹا اور دشمن سے مقابلہ کے وقت بزدل ہو ایک اور شخص یہ بات سن کر بولا تو نے جھوٹ کہا تو منافق ہے میں تیری اس بات کی اطلاع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ضرور دوں گا چنانچہ یہ خبر رسول اللہ تک پہنچ گئی اور قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوگئی۔

شریح بن عبید کا بیان ہے کہ ایک شخص نے حضرت ابودرداء سے کہا اے قرآن خوانوں کے گروہ کیا وجہ کہ تم لوگ ہم سے زیادہ ڈرپوک ہو تم سے کچھ مانگا جاتا ہے تو بڑی کنجوسی کرتے ہو اور کھاتے وقت بڑے بڑے لقمے نگلتے ہو

حضرت ابودرداء نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا اور کوئی جواب نہیں دیا اور جا کر حضرت عمر کو اطلاع دے دی۔ حضرت عمرؓ اس شخص کے پاس گئے اور اس کا کپڑا پکڑ کر گلے میں ڈال کر کھینچتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے وہ شخص کہنے لگا انما کنا نخوض ونلعب اس پر اللہ نے اپنے نبی کی پاس وحی بھیجی اور فرمایا وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ

محمد بن اسحاق اور محمد بن عمر کا بیان ہے کہ کچھ منافقوں کی ایک جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب تبوک کو جا رہی تھی یہ لوگ صرف مال غنیمت کی طمع میں نکلے تھے۔ ان میں بنی عمرو بن عوف کا ودیعہ بن ثابت اور حلاس بن ثابت اور بنی اشجع کا مخشی بن حمیر بھی تھے۔ محمد بن عمر نے ثعلبہ بن حاطب کا نام بھی ذکر کیا ہے ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا کل اسی جگہ یہ لوگ رسیوں میں بندھے ہوئے ہوں گے۔ اس کہنے کا مقصد تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق سنسنی پیدا کر دینا اور مسلمانوں کے دلوں میں خوف و ہراس ڈال دینا۔ حلاس بن عمر نے عمیر کی ماں سے نکاح کر لیا تھا عمیر اس کے زیر پرورش تھے اس نے کہا اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچے ہیں تو پھر خدا کی قسم ہم گدھوں سے بھی بدتر ہیں۔ اگر اس بات کی وجہ سے واپسی کے بعد ہم میں سے ہر ایک کے سو کوڑے مارے جائیں تو خدا کی قسم یہ ضرب مجھے پسند ہے بہ نسبت اس کے کہ ہمارے اندر قرآن نازل ہو (یعنی قرآن کا نزول مجھے اتنا ناگوار ہے کہ سو کوڑے کھانا آسان ہے مگر قرآن کا نزول پسند نہیں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمار بن یاسر سے فرمایا، یہ لوگ جل گئے جلد ان کے پاس پہنچو اور جو کچھ انہوں نے کہا ہے اس کو دریافت کرو اگر انکار کریں تو ان سے کہنا تم نے ضرور ایسی ایسی باتیں کہی ہیں (یعنی تفصیل بتا دینا) حضرت عمار ان کے پاس گئے اور ان سے ان کی باتیں بیان کیں (جب ان کو معلوم ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہماری باتوں کی خبر ہوگئی ہے تو) وہ عذر کرنے کیلئے حاضر خدمت ہوئے۔ ودیعہ بن ثابت نے آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی کے کجاوہ کا پچھلا حصہ پکڑ لیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اونٹنی پر سوار تھے (وہ کجاوہ پکڑے لٹکا ہوا تھا اور) اس کی دونوں ٹانگوں پر کنکریاں لگ رہی تھیں اسی حالت میں کہہ رہا تھا یا رسول اللہ انما کنا نخوض ونلعب۔ (تفسیر مظہری)

قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ

تو کہہ کیا اللہ سے اور اُس کے حکموں سے اور اُسکے رسول سے تم

تَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۶۵﴾

ٹھٹھے کرتے تھے

اللہ اور رسول استہزاء کی جگہ نہیں ہے:

یعنی کیا دل لگی اور خوش وقتی کا موقع ومحل یہ ہے کہ اللہ ورسول اور ان کے احکام کے ساتھ ٹھٹھا کیا جائے؟ خدا ورسول کا استہزا اور احکام الٰہیہ کا استخفاف تو وہ چیز ہے کہ اگر محض زبان سے دل لگی کے طور پر کیا جائے، وہ بھی کفر عظیم ہے چہ جائیکہ منافقین کی طرح از راہ شرارت وبد باطنی ایسی حرکت سرزد ہو۔ (تفسیر عثمانی)

لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ؕ
بہانے مت بناؤ تم تو کافر ہو گئے اظہار ایمان کے پیچھے
اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ
اگر ہم معاف کر دینگے تم میں سے بعضوں کو تو البتہ عذاب بھی
طَآئِفَةًۢ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿٦٦﴾
دیں گے بعضوں کو اس سبب سے کہ وہ گنہگار تھے

جھوٹے بہانے بے فائدہ ہیں:

یعنی جھوٹے عذر تراشنے اور حیلے حوالوں سے کچھ فائدہ نہیں جن کو نفاق واستہزاء کی سزا ملنی ہے مل کر رہے گی۔ ہاں جواب بھی صدق دل سے توبہ کر کے اپنے جرائم سے باز آجائیں گے، انہیں خدا معاف کر دیگا جو پہلے ہی سے باوجود کفر ونفاق کے اس طرح کی فتنہ انگیزی اور استہزا سے علیحدہ رہے ہیں، انہیں استہزاء وتمسخر کی سزا یہاں نہ ملے گی۔ (تفسیر عثمانی)

ایک توبہ کرنے والے صاحب:

محمد بن اسحاق نے بیان کیا ہے کہ صرف ایک شخص مخشی بن حمیر اشجعی کا جرم معاف کیا گیا (ابن اسحاق کی مراد شاید یہ ہے کہ عن طائفۃ سے مراد صرف ایک شخص ہے یا یہ مراد ہے کہ روایۃ صرف ایک شخص کا قصور معاف ہونا ثابت ہے باقی لوگوں کا علم نہیں) مخشی منافقوں کے ساتھ ہنستا تو تھا مگر زبان سے اس نے کچھ نہیں کہا تھا اور سب سے الگ الگ راستہ میں چل رہا تھا بلکہ منافقوں کی بعض باتوں کو پسند بھی نہ کرتا تھا جب یہ آیت نازل ہوئی تو اس نے نفاق سے توبہ کی اور دعا کی اے اللہ میں ایسی آیت سن رہا ہوں جس سے میری آنکھوں کو ٹھنڈک مل رہی ہے اس کے سننے سے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور دل لرز جاتے ہیں، اے اللہ میری موت اپنی راہ میں قتل کی شکل میں مقدر کر دے (اور یہ بھی) کوئی نہ کہے کہ میں غسل دیا میں نے دفن کیا (یعنی مجھے کوئی غسل نہ دے نہ دفن کرے) چنانچہ جنگ یمامہ میں یہ شہید ہو گئے اور سوائے ان کے کسی مسلمان کو معلوم بھی نہ ہوا کہ وہ کہاں شہید ہوئے (اور جنازہ کہاں گیا) مخشی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرا نام اور ولدیت بدل دیجئے (گویا کفر کے زمانہ کے نام سے بھی ان کو نفرت ہوگئی تھی) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نام عبدالرحمٰن یا عبداللہ رکھ دیا۔ (تفسیر مظہری)

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ
منافق مرد اور منافق عورتیں سب کی
مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَ
ایک چال ہے سکھائیں بات بُری اور
يَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ
چھڑائیں بات بھلی اور بند رکھیں اپنی مٹھی
اَيْدِيَهُمْ ؕ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ؕ اِنَّ
بھول گئے اللہ کو سو وہ بھول گیا اُنکو تحقیق
الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿٦٧﴾
منافق وہی ہیں نافرمان

خدا نے منافقوں کو چھوڑ دیا:

یعنی سب سے بڑے نافرمان یہ ہی بدباطن منافق ہیں جن کے مرد وعورت زبانی اقرار واظہار اسلام کے باوجود شب وروز اسی تگ ودو میں لگے رہتے ہیں کہ ہر قسم کے حیلے اور فریب کر کے لوگوں کو اچھی باتوں سے بیزار اور برے کاموں پر آمادہ کریں۔ خرچ کرنے کی اصلی موقعوں پر مٹھی بند رکھیں۔ غرض کلمہ پڑھتے رہیں۔ لیکن نہ ان کی زبان سے کسی کو بھلائی پہنچے نہ مال سے۔ جب یہ خدا کو ایسا چھوڑ بیٹھے تو خدا نے بھی ان کو چھوڑ دیا۔ چھوڑ کر کہاں گرایا؟ اس کا ذکر اگلی آیت میں ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ
وعدہ دیا ہے اللہ نے منافق مرد اور منافق عورتوں کو اور کافروں کو
نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ هِيَ حَسْبُهُمْ ۚ
دوزخ کی آگ کا پڑے رہینگے اُس میں وہی بس ہے اُن کو

یعنی یہ ایسی کافی سزا ہے جس کے بعد دوسری سزا کی ضرورت نہیں رہتی۔

وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۶۸﴾
اور اللہ نے اُنکو پھٹکار دیا اور اُنکے لئے عذاب ہے برقرار رہنے والا

شاید یہ مطلب ہو کہ دنیا میں بھی خدا کی پھٹکار (لعنت) کا اثر برابر پہنچتا رہے گا۔ یا پہلے جملہ کی تاکید ہے۔ واللہ اعلم۔

كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْكُمْ
جس طرح تم سے اگلے لوگ زیادہ تھے تم سے
قُوَّةً وَّاَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ۭ فَاسْتَمْتَعُوْا
زور میں اور زیادہ رکھتے تھے مال اور اولاد پھر فائدہ اُٹھا گئے
بِخَلَاقِهِمْ
اپنے حصہ سے

یعنی دنیوی لذائذ کا جو حصہ ان کیلئے مقدر تھا، اس سے فائدہ اٹھا گئے اور آخری انجام کا خیال نہ کیا۔ (تفسیر عثمانی)

بنی اسرائیل سے مشابہت:

اسی آیت کی تفسیر میں حضرت ابوہریرہؓ نے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم بھی وہی طریقے اختیار کرو گے جو تم سے پہلی امتیں کر چکی ہیں، ہاتھ در ہاتھ اور بالشت در بالشت یعنی ہو بہو ان کی نقل اتارو گے، یہاں تک کہ اگر ان میں سے کوئی گوہ کے بل میں گھسا ہے تو تم بھی گھسو گے، حضرت ابوہریرہؓ نے یہ روایت نقل کر کے فرمایا کہ اس حدیث کی تصدیق کیلئے تمہارا جی چاہے تو قرآن کی یہ آیت پڑھ لو، كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے یہ سن کر فرمایا: ما اشبہ اللیلۃ بالبارحۃ، یعنی آج کی رات گذشتہ شب سے کیسی ملتی جلتی اور مشابہ ہے یہ بنی اسرائیل ہیں ہمیں ان کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ (قرطبی) (معارف القرآن مفتی اعظم)

فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ
پھر فائدہ اٹھایا تم نے اپنے حصہ سے جیسے فائدہ اٹھا گئے
الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَخُضْتُمْ
تم سے اگلے اپنے حصہ سے اور تم بھی چلتے ہو

كَالَّذِيْ خَاضُوْا ۭ
اُنہی کی سی چال

تمہارا انجام انہیں جیسا ہوسکتا ہے:

یعنی تم بھی ان کی طرح آخری انجام کے تصور سے غافل ہو کر دنیا کی متاع فانی سے جتنا مقدر ہے حصہ پا رہے ہو اور ساری چال ڈھال انہی کی سی رکھتے ہو، تو سمجھ لو جو حشر ان کا ہوا وہ ہی تمہارا بھی ہوسکتا ہے ان کے پاس مال و اولاد اور جسمانی قوتیں تم سے زائد تھیں۔ پھر انتقام الٰہی کی گرفت سے نہ بچ سکے تو تم کو کا ہے پر بھروسہ ہے جو خدائی سزا سے اس قدر بے فکر ہو بیٹھے ہو۔ (تفسیر عثمانی)

اُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا
وہ لوگ مٹ گئے اُن کے عمل دنیا میں
وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۶۹﴾
اور آخرت میں اور وہی لوگ پڑے نقصان میں

ان کے اعمال بے کار ہوئے:

یعنی کوئی دنیوی و اخروی برکت و کرامت انہیں نصیب نہ ہوئی باقی دنیوی لذائذ کا جو حصہ بظاہر ملا وہ فی الحقیقت ان کے حق میں استدراج اور عذاب تھا، جیسا کہ دو رکوع پہلے فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ "الخ کے فوائد میں گذر چکا اور اس سے پیشتر بھی کئی مواقع میں لکھا جا چکا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

حاصل مراد یہ ہے کہ جس طرح ان کے اعمال اکارت گئے اور وہ خسران مال ہوئے اسی طرح تمہارے اعمال بھی اکارت جائیں گے اور تم بھی دونوں جہاں میں خسران نصیب ہو گے۔

حضرت ابوسعید خدری کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم بھی اپنے سے پہلوں کے پیچھے چلو گے بالشت بہ بالشت اور دست بدست (یعنی قدم بقدم ان کی پیروی کرو گے) یہاں تک کہ اگر وہ گوہ کے بھٹ میں گھسے ہوں گے تو تم بھی ان کے پیچھے گھسو گے (یعنی کامل پیروی کرو گے جو برے سے برے کام انہوں نے کیے تھے ویسے ہی تم کرو گے) ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا (پہلے لوگوں سے مراد) یہود و نصاریٰ ہیں، فرمایا اور کون۔ حضرت ابوہریرہ کی روایت کے یہ الفاظ ہیں پس لوگ نہیں ہوں گے مگر وہی (یہودی و نصاریٰ) رواہ البخاری۔

حاکم نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم اپنے سے اگلوں کی راہ پر بالشت بہ بالشت اور ہاتھ بہ ہاتھ

ضرور چلو گے یہاں تک کہ اگر ان میں سے کوئی گوہ کے سوراخ میں گھسا تھا تو تم بھی گھسو گے اگر ان میں سے کسی نے اپنی بیوی سے سرراہ جماع کیا ہوگا (یعنی لوگوں کے سامنے بے حیائی کے ساتھ) تو تم بھی ایسا ہی کرو گے۔ (تفسیر مظہری)

أَلَمْ يَأْتِهِمْ نَبَأُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ
کیا پہنچی نہیں اُن کو خبر اُن لوگوں کی جو اُن سے پہلے تھے
قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ وَقَوْمِ
قوم نوح کی اور عاد کی اور ثمود کی اور قوم
إِبْرَاهِيمَ وَأَصْحَابِ مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكَاتِ ۚ
ابراہیم کی اور مدین والوں کی اور اُن بستیوں کی خبر جو اُلٹ دی گئیں تھیں

گذشتہ اقوام کی تباہی:

قوم نوح طوفان سے "عاد" آندھی سے، "ثمود" صیحہ (چیخ) سے ہلاک ہوئے۔ ابراہیم علیہ السلام کی حق تعالیٰ نے عجیب وغریب خارق عادت طریقہ سے تائید فرمائی۔ جنہیں دیکھ کر ان کی قوم ذلیل و ناکام ہوئی ان کا بادشاہ نمرود نہایت بدحالی کی موت مارا گیا۔ اصحاب مدین صیحہ (چیخ) رجفہ (زلزلہ) وغیرہ سے تباہ ہوئے۔ قوم لوط کی بستیاں الٹ دی گئی اور اوپر سے پتھروں کی بارش ہوئی۔ ان سب اقوام کا قصہ (بجز قوم ابراہیم) سورۂ اعراف میں گذر چکا۔

أَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ ۖ فَمَا كَانَ
پہنچے اُنکے پاس اُنکے رسول صاف حکم لے کر سو
اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَٰكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ
اللہ تو ایسا نہ تھا کہ اُن پر ظلم کرتا لیکن وہ اپنے اوپر آپ
يَظْلِمُونَ ﴿٧٠﴾
ظلم کرتے تھے

قومیں اپنی ہلاکت کا سامان خود آپ کرتی ہیں:

یعنی خدا کسی کو بلاوجہ اور بے موقع سزا نہیں دیتا۔ لوگ خود ایسے جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ جن کے بعد عذاب الٰہی کا آنا ناگزیر ہے۔

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ
اور ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں ایک دوسرے کی مددگار ہیں

بَعْضٍ ۚ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ
سکھلاتے ہیں نیک بات اور منع کرتے ہیں
عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ
بُری بات سے اور قائم رکھتے ہیں نماز
وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَيُطِيعُونَ اللَّهَ
اور دیتے ہیں زکوٰۃ اور حکم پر چلتے ہیں اللہ کے
وَرَسُولَهُ ۚ أُولَٰئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ ۗ إِنَّ
اور اُسکے رسول کے وہی لوگ ہیں جن پر رحم کریگا اللہ بیشک
اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٧١﴾
اللہ زبردست ہے حکمت والا

مؤمنوں اور منافقوں کا تقابل:

ابتدائے رکوع میں منافقین کے اوصاف بیان ہوئے تھے۔ یہاں بطور مقابلہ مومنین کی صفات ذکر کی گئیں۔ یعنی جبکہ منافقین لوگوں کو بھلائی سے روک کر برائی کی ترغیب دیتے ہیں۔ مومنین بدی کو چھڑا کر نیکی کی طرف آمادہ کرتے ہیں۔ منافقین کی مٹھی بند ہے۔ مومنین کا ہاتھ کھلا ہوا ہے۔ وہ بخل کی وجہ سے خرچ کرنا نہیں جانتے۔ یہ اموال میں سے باقاعدہ حقوق (زکوۃ وغیرہ) ادا کرتے ہیں۔ انہوں نے خدا کو بالکل بھلا دیا۔ یہ پانچ وقت خدا کو یاد کرتے اور تمام معاملات میں خدا اور رسول کے احکام پر چلتے ہیں۔ اسی لئے وہ مستحق لعنت ہوئے اور یہ رحمت خصوصی کے امیدوار ٹھہرے۔ (تفسیر عثمانی)

مؤمن دوسرے مؤمن کا خیرخواہ ہے:

صحیح حدیث میں ہے کہ مومن مومن کے لئے مثل دیوار کے ہے جس کا ایک حصہ دوسرے حصے کو تقویت پہنچاتا اور مضبوط کرتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرماتے ہوئے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسری میں ڈال کر دکھا بھی دیا۔ اور صحیح حدیث میں ہے کہ مومن اپنی دوستیوں اور سلوکوں میں مثل ایک جسم کے ہیں کہ ایک حصے کو بھی اگر تکلیف ہوتو سارا جسم بیماری اور بیداری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ پاک نفس لوگ اوروں کی تربیت سے بھی غافل نہیں رہتے۔ سب کو بھلائیاں سکھاتے ہیں اچھی باتیں بتاتے ہیں برے کاموں سے بری باتوں سے امکان بھر روکتے ہیں۔

وَعَدَ اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ
وعدہ دیا ہے اللہ نے ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو باغوں

تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ

کا کہ بہتی ہیں نیچے اُن کے نہریں رہا کریں انہی میں

فِیْهَا وَمَسٰكِنَ طَیِّبَةً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ

اور ستھرے مکانوں کا رہنے کے باغوں میں

وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ذٰلِكَ هُوَ

اور رضا مندی اللہ کی ان سب سے بڑی ہے یہی ہے

الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ﴿۷۲﴾

بڑی کامیابی

مؤمنوں کیلئے جنت اور رضاء کا وعدہ:

یعنی تمام نعمائے دنیوی واخروی سے بڑھ کرحق تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی ہے۔ جنت بھی اس لئے مطلوب ہے کہ وہ رضائے الٰہی کا مقام ہے۔ حق تعالیٰ مومنین کو جنت میں ہرقسم کی جسمانی وروحانی نعمتیں اور مسرتیں عطا فرمائیگا۔ مگرسب سے بڑی نعمت محبوب حقیقی کی دائمی رضا ہوگی۔ حدیث صحیح میں ہے کہ حق تعالیٰ اہل جنت کو پکاریگا جنتی ''لبیک'' کہیں گے۔ دریافت فرمائے گا ''ھل رضیتم'' یعنی اب تم خوش ہوگئے۔ جواب دینگے کہ پروردگار! خوش نہ ہونے کی کیا وجہ؟ جبکہ آپ نے ہم پر انتہائی انعام فرمایا ہے۔ ارشاد ہوگا ''ھل اعطیکم افضل من ذلک'' یعنی جو کچھ اب تک دیا گیا ہے کیا اس سب سے بڑھ کر ایک چیز لینا چاہتے ہو، جنتی سوال کرینگے کہ اے پروردگار! اس سے افضل اور کیا چیز ہوگی؟ اس وقت فرمائینگے احل علیکم رضوا نی فلا اسخط علیکم بعدہ ابداً اپنی دائمی رضا اور خوشنودی تم پر اتارتا ہوں، جس کے بعد کبھی خفگی اور ناخوشی نہ ہوگی رزقنا اللہ وسائر المؤمنین ھذہ الکرامة العظیمة الباھرة۔ (تفسیر عثمانی)

عالی شان محلات:

ابن مبارک طبرانی اور ابوالشیخ نے حضرت عمران بن حصین اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا کہ آیت وَمَسٰكِنَ طَیِّبَةً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ موتی کا ایک محل ہوگا جس میں یاقوت سرخ کے ستر مکان ہوں گے ہر مکان میں سبز زمرد کی ستر کوٹھریاں ہوں گی۔ ہر کوٹھری میں ایک تخت ہوگا ہر تخت پر رنگارنگ کے ستر بستر ہوں گے۔ ہر بستر پر ایک فراخ چشم حور ہوگی جو جنتی کی بی بی ہوگی۔ ہر گھر میں ستر خادم اور خادمائیں بھی مامور ہوں گی مومن کے پاس روزانہ ہر صبح کے وقت کھانے پینے کی چیزیں آئینگی جو ہر کوٹھری میں ملیں گی۔

چار چیزیں جو اللہ نے دست خاص سے بنائیں:

ابوالشیخ نے کتاب العظمة میں حضرت ابن عمر کی روایت سے لکھا ہے کہ اللہ نے چار چیزوں کو اپنے دست خاص سے بنایا عرش، قلم، آدم، عدن پھر فرمایا ہوجا (ظاہر) وہ چیز ہوگئی (یعنی عالم ظہور میں آگئی) بزار ابن جریر ابن مردویہ اور المؤتلف والمختلف میں دار قطنی نے حضرت ابودرداء کی روایت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان نقل کیا ہے کہ عدن اللہ کا (قائم کیا ہوا) ایک ایسا مکان ہے جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی انسان کے دل میں اس کا تصور گذرا اس میں صرف تین (گروہوں کے) لوگ رہیں گے انبیاء صدیق اور شہید۔ اللہ فرمائے گا خوشی ہو اس کیلئے جو تیرے اندر داخل ہوا۔

سونے اور چاندی کی جنتیں:

صحیحین میں حضرت ابوموسیٰ اشعری کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دو جنتیں چاندی کی ہیں جن کے برتن اور تمام چیزیں چاندی کی ہیں اور دو جنتیں سونے کی ہیں جن کے برتن اور تمام چیزیں سونے کی ہیں اور جنت عدن کے اندر اہل جنت اور ان کے رب کے درمیان کوئی حجاب نہ ہوگا۔ صرف (اللہ کی) کبریائی کی چادر ہوگی جو اللہ کے چہرے پر پڑی ہوگی۔

امام احمد ابوداؤد وطیالسی اور بیہقی نے یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ بیان کی ہے کہ فردوس کی جنتیں چار ہوں گی۔ دو جنتیں سونے کی ہوں گی الخ بیہقی نے کبریائی کی چادر کی تشریح میں کہا کہ اللہ کی کبریائی اور عظمت کی وجہ سے کوئی بھی اذن کے بغیر اس کو نہ دیکھ سکے گا تو گویا اللہ کی کبریائی اور عظمت اس کو (اہل جنت کی نظروں سے) پوشیدہ رکھنے کا ذریعہ ہوگی۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن مسعود نے فرمایا وہ یعنی عدن کے باغات جنت کے وسط میں ہیں۔

عدن کا محل: حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص نے فرمایا جنت کے اندر ایک محل ہے جس کو عدن کہا جاتا ہے اس کے گرداگرد برج اور سبزہ زار ہیں اس کے پانچ ہزار دروازے ہیں جن میں سوائے نبی اور صدیق اور شہید کے کوئی اور داخل نہ ہوگا۔

حسن بصری نے فرمایا وہ سونے کا قصر ہے جس کے اندر سوائے نبی یا صدیق یا شہید یا منصف حاکم کے اور کوئی داخل نہ ہوگا۔

عطاء بن سائب کا قول ہے عدن جنت میں ایک نہر ہے جس کے دونوں کناروں پر باغ ہیں۔

رضاءِ خداوندی:

طبرانی نے الاوسط میں صحیح سند کے ساتھ حضرت جابر کی روایت سے مرفوع

حدیث نقل کی ہے کہ جب اہل جنت جنت میں داخل ہوچکیں گے تو اللہ فرمائے گا کیا تم کو کسی اور چیز کی طلب ہے جو میں عطا کردوں جنتی عرض کریں گے اے ہمارے مالک جو کچھ تو نے ہم کو عطا فرمادیا اس سے بڑھ کر اور کیا چیز ہے۔ اللہ فرمائے گا اللہ کی (تھوڑی) رضامندی ان سب سے بڑھ کر ہے۔ (تفسیر مظہری)

رضا خداوندی کا درجہ بہشت سے بھی بڑھ کر ہے اور صحابہ کرام کے متعلق دنیا ہی میں اعلان کردیا گیا۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ اس سے بڑھ کر کیا سعادت اور کرامت ہوگی کہ مرنے سے پہلے ہی صحابہ کرام نے اپنے لئے رضاء خداوندی کا مژدہ جانفزا سن لیا اور قرآن میں تصریح ہے۔ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ اللہ فاسقوں سے راضی نہیں ہوتا معلوم ہوا کہ صحابہ کرام فاسق نہ تھے۔ بلکہ صحابہ سے ناراض ہونے والا فاسق ہے۔ (معارف کاندھلویؒ)

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ

اے نبی لڑائی کر کافروں سے اور منافقوں سے

وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۚ وَمَاْوٰىهُمْ

اور تند خوئی کر ان پر اور ان کا ٹھکانا

جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿٧٣﴾

دوزخ ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے

جہاد کا مفہوم:

"جہاد" کے معنی ہیں کسی ناپسندیدہ چیز کے دفع کرنے میں انتہائی کوشش کرنا۔ یہ کوشش کبھی ہتھیار سے ہوتی ہے۔ کبھی زبان سے، کبھی قلم سے، کبھی کسی اور طریق سے، منافقین جو زبان سے اسلام کا اظہار کریں اور دل سے مسلمان نہ ہوں ان کے مقابلہ میں جہاد بالسیف جمہور امت کے نزدیک مشروع نہیں، نہ عہد نبوت میں ایسا واقع ہوا۔ اسی لئے جہاد کا لفظ اس آیت میں عام رکھا گیا ہے یعنی تلوار سے زبان سے قلم سے جس وقت جس کے مقابلہ میں جس طرح مصلحت ہو جہاد کیا جائے۔ بعض علماء کی یہ رائے ہے کہ اگر منافقین کا نفاق بالکل عیاں ہوجائے تو ان پر بھی جہاد بالسیف کیا جاسکتا ہے۔ بہرحال غزوہ تبوک نے چونکہ منافقین کا نفاق بہت آشکارا کردیا تھا۔ اس لئے اس آیت میں ان کی نسبت ذرا سخت رویہ اختیار کرنے کی ہدایت کی گئی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فطری طور پر نہایت نرم خو واقع ہوئے تھے۔ "فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ" (آل عمران۔ رکوع ۱۷) پھر حق تعالیٰ کی طرف سے حکم تھا "وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ" (شعراء۔ رکوع ۱۱) چونکہ منافقین بھی بظاہر مومنین کے زمرہ میں شامل رہتے تھے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ بھی درگذر، چشم پوشی اور نرم خوئی کا معاملہ فرماتے تھے۔ تبوک کے موقع پر جب منافقین نے کھلم کھلا بے حیائی، عناد اور دشمنی کا انداز اختیار کرلیا تو حکم ہوا کہ اب ان کے معاملہ میں سختی اختیار کیجئے، یہ شریر خوش اخلاقی اور نرمی سے ماننے والے نہیں ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

امام محمد بن اسحٰق نے ان میں سے بہت سے لوگوں کے نام بھی گنوائے ہیں واللہ اعلم۔

منافقوں کی تعداد اور نام:

صحیح مسلم میں ہے کہ اہل عقبہ میں سے ایک شخص کے ساتھ حضرت عمارؓ کا کچھ تعلق تھا تو اس سے آپ نے قسم دے کر اصحاب عقبہ کی گنتی دریافت کی۔ لوگوں نے بھی اس سے کہا کہ ہاں بتلا دو اس نے کہا کہ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ وہ چودہ تھے اگر مجھے بھی شامل کیا جائے تو پندرہ ہوئے۔ ان میں سے بارہ تو دشمن خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھے اور تین شخصوں کی اس قسم پر کہ نہ ہم نے منادی کی ندا سنی نہ ہمیں جانے والوں کے ارادے کا علم، اس لئے معذور رکھا گیا۔ آپ کا فرمان ہے کہ میرے ساتھیوں میں بارہ منافق ہیں جو نہ جنت میں جائیں گے نہ اس کی خوشبو پائیں گے آٹھ کے مونڈھوں پر آتشی پھوڑا ہوگا جو سینے تک پہنچے گا اور انہیں ہلاک کردے گا۔ اسی باعث حضرت حذیفہؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا راز دار کہا جاتا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف انہی کو ان منافقوں کے نام بتلائے تھے واللہ اعلم۔ طبرانی میں ان کے نام یہ ہیں: معتب بن قشیر، ودیعہ بن ثابت، جد بن قیس، عبداللہ بن نبتل بن حارث جو عمرو ابن عوف کے قبیلے کا تھا اور حارث بن یزید طائی اور اوس ابن قیظی اور حارث بن سوید اور سعد بن زرارہ اور قیس بن فہد اور سوید اور داعس قبیلہ بنو حبلی کے اور قیس ابن عمرو بن سہل اور زید بن لصیت اور سلسلہ بن برہام یہ دونوں قبیلہ قینقاع کے ہیں یہ سب بظاہر مسلمان بنے ہوئے تھے۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

کافروں اور منافقوں پر سختی کا معنیٰ:

امام قرطبی نے فرمایا کہ اس جگہ غلظت استعمال کرنے سے عملی غلظت مراد ہے کہ ان پر احکام شرعیہ جاری کرنے میں کوئی رعایت اور نرمی نہ برتی جائے زبان اور کلام میں غلظت اختیار کرنا مراد نہیں، کیونکہ وہ سنت انبیاء کے خلاف ہے۔ وہ کسی سے سخت کلامی اور سب وشتم نہیں کرتے ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اذا زنت امة احدکم فلیجلدها الحد ولا یثرب علیها

"اگر تمہاری کوئی کنیز زنا کی مرتکب ہو تو اس کی سزا حد شرعی اس پر جاری کردو مگر زبانی ملامت اور طعن وتشنیع نہ کرو" (قرطبی)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حال میں خود حق تعالیٰ نے فرمایا

وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَا نْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ''یعنی اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سخت کلام سخت دل ہوتے تو لوگ آپ کے پاس سے بھاگ جاتے''، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تعامل میں بھی کہیں یہ ثابت نہیں کہ کفار ومنافقین سے گفتگو اور خطاب میں کبھی غلظت اختیار فرمائی ہو۔

آج کی قابلِ افسوس حالت:

افسوس کہ خطاب اور کلام میں غلظت جس کو کفار کے مقابلہ میں بھی اسلام نے اختیار نہیں کیا آج کل کے مسلمان دوسرے مسلمانوں کے بارے میں بے دھڑک استعمال کرتے ہیں اور بہت سے لوگ تو اس کو دین کی خدمت سمجھ کر خوش ہوتے ہیں۔ اناللہ (معارف مفتی اعظم)

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ؕ وَلَقَدْ قَالُوْا
قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی کہ ہم نے نہیں کہا اور بیشک کہا ہے
كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ
انہوں نے لفظ کفر کا اور منکر ہو گئے مسلمان ہو کر

منافقوں کی تکذیب:

منافقین پیچھے بیٹھ کر پیغمبر اسلام کی اور دین اسلام کی اہانت کرتے، جیسا کہ سورۂ منافقون میں آئیگا، جب کوئی مسلمان حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک ان کی باتیں پہنچا دیتا تو اس کی تکذیب کرتے اور قسمیں کھالیتے کہ ہم نے فلاں بات نہیں کی۔ حق تعالیٰ نے مسلمان راویوں کی تصدیق فرمائی کہ بیشک انہوں نے وہ باتیں زبان سے نکالی ہیں۔ اور دعوائے اسلام کے بعد مذہب اسلام اور پیغمبر اسلام کی نسبت وہ کلمات کہے ہیں جو صرف منکرین کی زبان سے نکل سکتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

شانِ نزول:

ابن جریر نے حضرت ابن عباس کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک درخت کے سایہ میں تشریف فرما تھے، بیٹھے بیٹھے فرمایا ابھی ایک شخص آئے گا جو شیطان کی آنکھوں سے دیکھتا ہے یہ کہتے ہی نیلی آنکھوں والا ایک شخص سامنے سے نمودار ہو گیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بلایا اور فرمایا تو اور تیرے ساتھی مجھے کیوں برا کہتے ہیں یہ کلام سن کر وہ شخص چلا گیا اور اپنے ساتھیوں کو لے کر حاضر ہوا اور سب نے اللہ کی قسم کھا کر کہا ہم نے (آپ کے متعلق کوئی بری بات) نہیں کہی، اس قول کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں سے درگذر فرمائی اس پر آیت ذیل کا نزول ہوا۔

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا وہ لوگ قسمیں کھا جاتے ہیں کہ ہم نے فلانی بات نہیں کہی۔

جلاس منافق اور اس کی توبہ:

ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا ہے کہ جلاس بن سوید بن صامت ان لوگوں میں سے تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ تبوک کو نہیں گئے تھے۔ جلاس نے کہا تھا کہ اگر یہ شخص سچا ہے تو ہم گدھوں سے بھی بدتر ہیں (کہ اس کی سچائی بھی نہیں سمجھتے یا یہ مطلب کہ ہم گدھوں سے بھی زیادہ ذلیل ہیں) حضرت عمیر بن سعد نے یہ اطلاع رسول اللہ کو جا کر دے دی جلاس قسم کھا گیا کہ میں نے تو یہ بات نہیں کہی اس پر آیت مذکورنازل ہوئی۔

لوگوں کا خیال ہے کہ آیت کے نزول کے بعد جلاس نے سچے دل سے توبہ کر لی تھی اور اس کی توبہ اچھی ثابت ہوئی۔ ابن ابی حاتم نے حضرت کعب بن مالک کی روایت سے بھی یہی بیان کیا ہے ابن اسحاق نے بھی حضرت کعب کا بیان یونہی نقل کیا ہے اور ابن سعد نے طبقات میں عروہ کی روایت سے اسی طرح بیان کیا ہے۔ بغوی نے کلبی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس آیت کا نزول جلاس بن سوید کے بارے میں ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز تبوک میں خطبہ دیا تھا جس میں منافقوں کا ذکر کیا تھا ان کو برا کہا تھا اور گندگی قرار دیا تھا (یعنی فرمایا تھا کہ منافق رجس ہیں) جلاس (کو اس قول کی اطلاع پہنچی تو اس) نے کہا اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچے ہیں تو ہم گدھوں سے بدتر ہیں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے مدینے کو واپس تشریف لائے تو حضرت عامر بن قیس نے حاضر ہو کر جلاس کے قول کی اطلاع آپ کو دے دی۔ جلاس نے کہا یا رسول اللہ یہ مجھ پر دروغ بندی کر رہا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو منبر کے پاس جا کر قسم کھانے کا حکم دیا۔ جلاس نے عصر کے بعد منبر کے پاس جا کر قسم کھائی اور کہا قسم ہے اس اللہ کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں، میں نے یہ بات نہیں کہی۔ اور اس نے مجھ پر جھوٹ باندھا ہے پھر عامر کھڑے ہوئے اور انہوں نے کہا قسم ہے اس اللہ کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں اس نے یہ بات کہی اور میں نے اس پر دروغ بندی نہیں کی۔ پھر حضرت عامر نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر دعا کی اے اللہ اپنے سچے نبی پر سچی بات نازل فرمادے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مومن امین ہوتا ہے اس کے بعد دونوں الگ الگ نہ ہونے پائے تھے کہ جبرئیل یہ آیت فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ تک لے کر نازل ہوئے جلاس آیت سن کر فوراً کھڑا ہو گیا اور عرض کیا یا رسول اللہ میں سن رہا ہوں کہ اللہ نے توبہ کی پیش کش فرمائی ہے عامر بن قیس اپنے قول میں سچے ہیں میں نے یہ بات کہی تھی اب میں اللہ سے معافی چاہتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں رسول اللہ نے جلاس کی توبہ قبول فرمالی جلاس نے توبہ کر لی اور ان کی توبہ صحیح ثابت ہوئی۔ (تفسیر مظہری)

وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا

اور قصد کیا تھا اُس چیز کا جو اُن کو نہ ملی

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف منافقوں کی سازش:

غزوہ تبوک سے واپسی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لشکر سے علیحدہ ہوکر ایک پہاڑی راستہ کو تشریف لے جارہے تھے۔ تقریباً بارہ منافقین نے چہرے چھپا کر رات کی تاریکی میں چاہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہاتھ چلائیں اور معاذ اللہ پہاڑی سے گرادیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حذیفہ اور عمار تھے۔ عمار کو انہوں نے گھیر لیا تھا، مگر حذیفہ نے مار مار کران کی اونٹنیوں کے منہ پھیر دیئے۔ چونکہ چہرے چھپائے ہوئے تھے۔ حذیفہ وغیرہ نے ان کو نہیں پہچانا۔ بعدہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حذیفہ وعمار رضی اللہ عنہما کو نام بنام ان کے پتے بتادیے۔ مگر منع فرمایا کہ کسی پر ظاہر نہ کریں۔ اسی واقعہ کی طرف وھموا بمالم ینالوا میں اشارہ ہے کہ جو ناپاک قصد انہوں نے کیا خدا کے فضل سے پورا نہ ہوا بعض علماء نے لکھا ہے کہ کسی موقع پر لشکر اسلام میں کچھ خانہ جنگی ہوگئی تھی منافقین نے اغوا کر کے مہاجرین وانصار میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اصلاح فرمادی جیسا کہ سورۂ منافقون میں آئیگا۔

وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ

اور یہ سب کچھ اسی کا بدلہ تھا کہ دولتمند کر دیا اُن کو اللہ نے

وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ

اور اُسکے رسول نے اپنے فضل سے سو اگر توبہ کر لیں

خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ

تو بھلا ہے اُن کے حق میں اور اگر نہ مانیں گے تو عذاب دیگا

اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ

اُن کو اللہ عذاب دردناک دنیا اور آخرت میں

وَمَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۷۴﴾

اور نہیں اُن کا روئے زمین پر کوئی حمایتی اور نہ مددگار

منافقوں کی نمک حرامی:

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے خدا نے انہیں دولت مند کر دیا، قرضوں کے بار سے سبکدوش ہوئے مسلمانوں کے ساتھ ملے جلے رہنے کی وجہ سے غنائم میں حصہ ملتا رہا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے پیداوار اچھی ہوئی، ان احسانات کا بدلہ یہ دیا کہ خدا اور رسول کے ساتھ دغابازی کرنے لگے اور ہر طرح پیغمبر علیہ السلام اور مسلمانوں کو ستانے پر کمر باندھ لی۔ اب بھی اگر توبہ کر کے شرارتوں اور احسان فراموشیوں سے باز آجائیں تو ان کے حق میں بہتر ہے۔ ورنہ خدا دنیا وآخرت میں وہ سزا دیگا جس سے بچانے والا روئے زمین پر کوئی نہ ملے گا۔ بعض روایات میں ہے کہ ''جلاس'' نامی ایک شخص یہ آیات سن کر صدق دل سے تائب ہوا اور آئندہ اپنی زندگی خدمت اسلام میں قربان کردی۔ (تفسیر عثمانی)

ابن جریر اور ابوالشیخ نے عکرمہ کی روایت سے بیان کیا کہ ابن عدی بن کعب کے غلام نے کسی انصاری کو قتل کر دیا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے خوں بہا میں بارہ ہزار (درہم) ادا کرنے کا فیصلہ کیا بغوی نے لکھا ہے کہ جلاس کا غلام مارا گیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی دیت میں بارہ ہزار درہم جلاس کو دلوائے جس سے وہ مالدار ہوگیا اسی کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

کلبی نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ میں رونق افروز ہونے سے پہلے اہل مدینہ بڑے تنگ حال تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد اموال غنیمت کی وجہ سے خوش حال ہوگئے۔ (تفسیر مظہری)

وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا

اور بعضے اُن میں وہ ہیں کہ عہد کیا تھا اللہ سے

مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ

اگر دیوے ہم کو اپنے فضل سے تو ہم ضرور خیرات کریں اور ہو رہیں

مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۷۵﴾ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ

ہم نیکی والوں میں پھر جب دیا اُن کو اپنے فضل سے

بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۷۶﴾

تو اُس میں بخل کیا اور پھر گئے ٹلا کر

ایک آدمی کیلئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعاء اور اس کی ناشکری

ایک شخص ثعلبہ بن حاطب انصاری نے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میرے حق میں دولت مند ہوجانے کی دعا فرمادیجئے۔ آپ نے فرمایا کہ ثعلبہ! تھوڑی چیز جس پر تو خدا کا شکر ادا کرے۔ اس بہت چیز سے

اچھی ہے جس کے حقوق ادا نہ کر سکے۔ اس نے پھر وہی درخواست کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے ثعلبہ! کیا تجھے پسند نہیں کہ میرے نقش قدم پر چلے۔ آپ کے انکار پر اصرار بڑھتا رہا۔ اس نے وعدہ کیا کہ اگر خدا مجھ کو مال دیگا۔ میں پوری طرح حقوق ادا کرونگا۔ آخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی، اس کی بکریوں میں اس قدر برکت ہوئی کہ مدینہ سے باہر ایک گاؤں میں رہنے کی ضرورت پڑی اور اتنا پھیلا وا ہوا کہ ان میں مشغول ہوکر رفتہ رفتہ جمعہ و جماعات بھی ترک کرنے لگا۔ کچھ دنوں بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے زکوۃ وصول کرنے والے ''محصل'' پہنچے تو کہنے لگا کہ زکوٰۃ تو جزیہ کی بہن معلوم ہوتی ہے۔ دوایک دفعہ ٹلا کر آخر زکوۃ دینے سے انکار کردیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ فرمایا، ''ویح ثعلبہ، اور یہ آیات نازل ہوئیں جب اس کے بعض اقارب نے اس کی خبر پہنچائی تو بادل ناخواستہ زکوۃ لے کر حاضر ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا نے مجھ کو تیری زکوۃ قبول کرنے سے منع فرما دیا ہے۔ یہ سن کر اس نے بہت ہائے واویلا کی کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا زکوۃ قبول نہ کرنا اس کیلئے بڑی عار کی بات تھی۔ بدنامی کے تصور سے سر پر خاک ڈالتا تھا۔ مگر دل میں نفاق چھپا ہوا تھا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابوبکر صدیقؓ کی خدمت میں زکوۃ لے کر حاضر ہوا۔ انہوں نے بھی قبول کرنے سے انکار فرمایا۔ پھر حضرت عمرؓ اوران کے بعد حضرت عثمانؓ کی خدمت میں زکوۃ پیش کی، دونوں نے انکار کردیا۔ ہر ایک یہ ہی کہتے تھے کہ جو چیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رد کردی۔ ہم اس کو قبول نہیں کرسکتے۔ آخر اسی حالت نفاق پر حضرت عثمانؓ کے عہد میں اس کا خاتمہ ہوا۔ (تفسیر عثمانی)

واقعہ کی تفصیل:

بغوی، ابن جریر ابن ابی حاتم، ابن مردویہ اور طبرانی نے نیز بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت ابوامامہ باہلی کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ثعلبہ بن حاطب انصاری نے خدمت گرامی میں حاضر ہوکر عرض کیا یارسول اللہ دعا کر دیجئے کہ اللہ مجھے مال (کثیر) عطا فرمادے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا اللہ کے رسول کا طریقہ تمہارے لئے لائق پیروی نہیں ہے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر میں چاہتا کہ سونے کے پہاڑ میرے ساتھ چلیں (جہاں میں جاؤں میرے ساتھ جائیں) تو وہ ضرور چلتے (ثعلبہ خاموش ہوگیا) پھر کچھ مدت کے بعد حاضر خدمت ہوکر اس نے درخواست کی یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ سے دعا فرما دیجئے کہ وہ مجھے مال نصیب کردے۔ قسم ہے اس کی جس نے آپ کو برحق نبی بنا کر بھیجا ہے اگر اللہ نے مجھے مال نصیب کردیا تو میں ہر حق دار کو حق ضرور ضرور ادا کروں گا۔ حضور نے دعا فرمائی اے اللہ ثعلبہ کو مال عطا فرمادے۔ راوی کا بیان ہے کہ اس دعا کے بعد ثعلبہ نے کچھ بکریاں پالیں اور ان میں اتنی بڑھوتری ہوئی کہ مدینہ میں ان کے رہنے کی گنجائش نہیں رہی۔ مجبورا ثعلبہ بکریاں لے کر مدینہ کی کسی وادی میں جابسا اور بکریوں میں کیڑوں کی طرح بڑھوتری ہوتی رہی (اب یہ نوبت آگئی کہ) ثعلبہ ظہر اور عصر کی نمازیں تو رسول اللہ کے ساتھ پڑھتا تھا۔ باقی نمازیں اپنی بکریوں کے مسکن میں پڑھتا تھا اس کے بعد بھی بکریوں میں اضافہ اور کثرت ہوتی رہی اور اتنی تعداد بڑھی کہ مدینہ سے دوران کو لے کر رہنا پڑا صرف جمعہ کی نماز کیلئے مدینہ میں آنے کا موقع ملتا (باقی نمازیں بکریوں کی قیام گاہ پر پڑھتا تھا) اور ترقی ہوئی تو مدینہ سے اور دور اس کو بکریاں لیکر رہنا پڑا، اب جمعہ اور جماعت سے کامل طور پر غیر حاضری ہوگئی۔ جمعہ کے دن صرف اتنا کرتا تھا کہ (راستہ میں جاکر کھڑا ہو جاتا اور) لوگوں سے ملاقات کر کے خبریں دریافت کرلیتا۔ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ثعلبہ کا کیا ہوا۔ صحابہ نے عرض کیا اس نے بکریاں پال لی ہیں اور بکریاں اتنی ہیں کہ ایک وادی (ہی) میں سماتی ہیں (اس لئے جماعت سے غیر حاضر رہتا ہے) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، یا ثعلبہ ہلاک ہوگیا یہ لفظ حضود نے تین مرتبہ فرمایا۔ اس کے بعد جب وصولی زکوۃ کا حکم نازل ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصول صدقات کے لئے دو آدمی مقرر کیے ایک بنی سلیم کا اور ایک جہینہ کا دونوں کو ایک تحریر دیدی جس میں (قابل زکوۃ جانوروں کی) عمریں لکھوادیں اور یہ بھی ہدایت کردی کہ کس طرح وصول کریں اور زبانی حکم دے دیا کہ ثعلبہ بن حاطب اور بنی سلیم کے فلاں شخص کے پاس جاکر ان سے زکوۃ (کے جانور) وصول کرنا حسب الحکم دونوں (پہلے) ثعلبہ کے پاس گئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریر پڑھوا کر سنائی اور زکوۃ کے جانور طلب کیے ثعلبہ بولا یہ کیسے ٹیکس ہیں یہ تو (کافروں پر لگائے گئے) ٹیکسوں کی طرح ہیں اب تو تم کو جہاں جانا ہے جاؤ جب اور جگہ سے فارغ ہوجاؤ تو لوٹ کر میرے پاس آنا دونوں حضرات چلے گئے بنی سلیم والے شخص نے جب ان بزرگوں کی آمد کی خبر سنی تو اپنے جانوروں میں سے بہترین عمر والے جانور چھانٹ کر زکوۃ میں پیش کیے۔ ان محصلوں نے کہا ایسے (بہترین) جانور دینا تو تم پر لازم نہیں ہیں سلمی نے کہا لے لیجئے میں اپنی خوشی سے دے رہا ہوں، ان حضرات نے لے لیے پھر دوسرے مالداروں کے پاس گئے اور ان سے زکوۃ وصول کی آخر میں ثعلبہ کے پاس لوٹ کر آئے ثعلبہ نے کہا ذرا مجھے اپنی تحریر تو دکھاؤ تحریر پڑھنے کے بعد بولا یہ کیا ٹیکس لگائے ہیں۔ یہ تو (غیر مسلموں کے) ٹیکسوں کے بھائی ہیں تم دونوں (اب تو) چلے جاؤ میں سوچ لوں رائے قائم کرلوں دونوں حضرات چلے گئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو کچھ کہنے نہ پائے تھے کہ حضور نے تین بار فرمایا، ثعلبہ

ہلاک ہوگیا۔ پھر سلمی شخص کیلئے دعا خیر فرمائی۔ ثعلبہ نے جو جواب دیا تھا ان حضرات نے وہ بعد کو بتایا۔ اس پر آیت ذیل ثعلبہ کے حق میں نازل ہوئی۔

ومنهم من عهد الله لئن اتنا من فضله لنصدقن.

فَأَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِي قُلُوبِهِمْ إِلَىٰ يَوْمِ

پھر اُس کا اثر رکھ دیا نفاق اُنکے دلوں میں جس دن تک

يَلْقَوْنَهُ بِمَا أَخْلَفُوا اللَّهَ مَا وَعَدُوهُ

کہ وہ اس سے ملیں گے اس وجہ سے کہ انہوں نے خلاف کیا اللہ سے جو وعدہ

وَبِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ ﴿٧٧﴾

اُس سے کیا تھا' اور اس وجہ سے کہ بولتے تھے جھوٹ

وعدہ خلافی اور جھوٹ کی سزا:

یعنی خدا سے صریح وعدہ خلافی کرنے اور جھوٹ بولتے رہنے کی سزا میں ان کے بخل واعراض کا اثر یہ ہوا کہ ہمیشہ کے لئے نفاق کی جڑ ان کے دلوں میں قائم ہوگئی جو موت تک نکلنے والی نہیں۔ اور یہ ہی ''سنۃ اللہ'' ہے کہ جب کوئی شخص اچھی یا بری خصلت خود اختیار کرلیتا ہے تو کثرت مزاولت وممارست سے وہ دائمی بن جاتی ہے۔ بری خصلت کے اسی دوام واستحکام کو کبھی کبھی ختم وطبع (مہر لگانے) سے تعبیر کردیتے ہیں۔ (تفسیر مظہری)

یعنی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے یا بخل نے ان کی دلوں میں بداعتقادی پیدا کردی، انہوں نے اللہ کے ادائے زکوۃ کے حکم کی تعمیل واجب نہ سمجھی اور وجوب زکوۃ کا انکار کردیا اور اس کو جزیہ کی طرح قرار دیا۔ اور یہ بداعتقادی ان کے دلوں میں مرتے دم تک رہے گی، یا قیامت کے دن تک رہے گی جبکہ کرتوت کی سزا ان کے سامنے آئے گی یا قبر میں (عذاب سامنے) آنے تک رہے گی مقصد یہ ہے کہ اللہ نے توبہ سے ان کو محروم کردیا ان کی موت نفاق پر ہوگی۔

نفاق کی نشانیاں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (عملی) منافق کی تین نشانیاں ہیں بات کرے تو جھوٹ بولے وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔ متفق علیہ من حدیث ابی ہریرۃ۔

مسلم کی روایت میں حدیث کے الفاظ اتنے زائد ہیں خواہ وہ روزے رکھتا اور نماز پڑھتا ہو اور مسلمان ہونے کا دعوے دار ہو۔ (تفسیر مظہری)

ایک سوال اور جواب: یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ثعلبہ تائب ہوکر حاضر ہوگیا تو اس کی توبہ کیوں قبول نہ کی گئی، وجہ ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی معلوم ہوگیا تھا کہ یہ اب بھی اخلاص کے ساتھ توبہ نہیں کررہا ہے اس کے دل میں نفاق موجود ہے۔ محض وقتی مصلحت سے مسلمانوں کو دھوکہ دے کر راضی کرنا چاہتا ہے اس لئے قبول نہیں، اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو منافق قرار دے دیا، تو بعد کے خلفاء کو اس کا صدقہ قبول کرنے کا حق نہیں رہا، کیونکہ زکوۃ کے لئے مسلمان ہونا شرط ہے۔

أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ

کیا وہ جان نہیں چکے کہ اللہ جانتا ہے اُن کا بھید

وَنَجْوَاهُمْ وَأَنَّ اللَّهَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ﴿٧٨﴾

اور اُن کا مشورہ اور یہ کہ اللہ خوب جانتا ہے سب چھپی باتوں کو

اللہ دلوں کو جانتا ہے: یعنی خواہ کیسے ہی وعدے کریں باتیں بنائیں یا مجبور ہوکر مال پیش کریں۔ خدا ان کے ارادوں اور نیتوں کو خوب جانتا ہے اور اپنے ہم مشربوں کے ساتھ بیٹھ کر جو مشورے کرتے ہیں، ان سے پوری طرح آگاہ ہے۔ وہ جانتا ہے کہ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُونَنَّ مِنَ الصَّالِحِينَ کا وعدہ اور گھبرا کر زکوۃ حاضر کرنا کس دل اور کیسی نیت سے تھا۔ (تفسیر عثمانی)

پھر خلافت حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سپرد ہوئی تو یہ ازلی منافق پھر آیا اور لگا منت سماجت کرنے لیکن آپ نے بھی یہی جواب دیا کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ کے دونوں خلیفہ نے تیرا صدقہ قبول نہیں فرمایا تو میں کیسے قبول کرلوں۔ چنانچہ قبول نہیں کیا اسی اثناء میں یہ شخص ہلاک ہوگیا الغرض پہلے تو وعدے کئے تھے سخاوت کے اور وہ بھی قسمیں کھا کھا کر، پھر پھر گیا اور سخاوت کے عوض بخیلی کرگیا۔ اور وعدہ شکنی کرلی۔ اس جھوٹ اور عہد شکنی کے بدلے اس کے دل میں نفاق پیوست ہوگیا جو اس وقت سے اس کی پوری زندگی تک اس کے ساتھ ہی رہا۔ (تفسیر ابن کثیر)

کم مال اور زیادہ عبادت والے:

ایک مرتبہ آپ نے بقیع میں فرمایا کہ جو صدقہ دے گا میں اس کی بابت قیامت کے دن خدا کے سامنے گواہی دوں گا۔ اس وقت ایک صحابی نے اپنے عمامے میں سے کچھ دینا چاہا، لیکن پھر لپیٹ لیا، اتنے میں ایک صاحب جو سیاہ رنگ اور چھوٹے قد کے تھے ایک اونٹنی لے کر آگے بڑھے جس سے زیادہ اچھی اونٹنی بقیع بھر میں نہ تھی۔ کہنے لگے یارسول اللہ! یہ اللہ کے نام پر خیرات ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بہت اچھا، اس نے کہا لیجئے سنبھال لیجئے۔ اس پر کسی نے کہا کہ اس سے تو اونٹنی ہی اچھی ہے آپ نے سن لیا اور فرمایا تو جھوٹا ہے یہ تجھ سے اور اس سے تین گنا اچھا ہے افسوس! سینکڑوں اونٹ رکھنے والے تجھ جیسوں پر افسوس! تین مرتبہ یہی فرمایا، مگر وہ جو اپنے مال کو اس طرح اس طرح کرے،

اورلپیں بھر بھر کر آپ نے اپنے ہاتھوں سے دائیں بائیں اشارہ کیا، یعنی راہ اللہ ہر نیک کام میں خرچ کرے۔ پھر فرمایا انہوں نے فلاح پالی جو کم مال والے ہوں اور زیادہ عبادت والے ہوں۔ (تفسیر ابن کثیر)

اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ
وہ لوگ جو طعن کرتے ہیں اُن
الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ وَالَّذِيْنَ لَا
مسلمانوں پر جو دل کھول کر خیرات کرتے ہیں اور اُن پر جو نہیں
يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ
رکھتے مگر اپنی محنت کا پھر اُن پر ٹھٹھے کرتے ہیں اللہ نے
سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٧٩﴾
اُن سے ٹھٹھا کیا ہے اور اُن کے لئے عذاب دردناک ہے

منافق خواہ مخواہ طعنے مارتے تھے:

ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو صدقہ کرن کی ترغیب دی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے چار ہزار (دینار یا درہم) حاضر کردے۔ عاصم بن عدی نے ایک سووسق کھجوریں (جن کی قیمت چاہزار درہم ہوتی تھی) پیش کیں۔ منافقین کہنے لگے کہ ان دونوں نے دکھلاوے اور نام ونمود کو اتنا دیا ہے۔ ایک غریب صحابی ابوعقیل حجاب نے جو محنت ومشقت سے تھوڑا سا کما کر لائے۔ اس میں سے ایک صاع تمر صدقہ کیا تو مذاق اڑانے لگے کہ یہ خواہ مخواہ زور آوری سے لہولگا کر شہیدوں میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ بھلا اس کی ایک صاع کھجوریں کیا پکار کریں گی۔ غرض تھوڑا دینے والا اور بہت خرچ کرنے والا کوئی ان کی زبان سے بچتا نہ تھا۔ کسی پر طعن کسی سے ٹھٹھا کرتے تھے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ (اللہ نے ان سے ٹھٹھا کیا ہے) یعنی ان کے طعن وتمسخر کا بدلہ دیا بظاہر تو وہ چند روز کے لئے مسخرا پن کرنے کیلئے آزاد چھوڑ دیئے گئے ہیں لیکن فی الحقیقت اندر ہی اندر ان کی جڑیں کٹتی چلی جارہی ہیں۔ اور عذاب الیم ان کے لئے تیار ہے۔ (تفسیر عثمانی)

صحیح بخاری وصحیح مسلم میں آیا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا آیت صدقہ نازل ہوئی تو اس زمانہ میں ہم اپنی پشت پر (مزدوری کا) بوجھ اٹھایا کرتے تھے (یعنی بار برداری کی مزدوری کرتے تھے مگر آیت صدقہ نازل ہونے کا یہ اثر پڑا کہ) فوراً بعض آدمیوں نے بہت سامال لاکر خیرات کیا اور بعض نے صرف ایک صاع دیا اس پر منافق زیادہ خیرات کرنے والے کے متعلق کہنے لگے اس نے دکھاوٹ کیلئے دیا ہے۔ اور ایک صاع دینے والے کے متعلق کہا اس کے دینے کی اللہ کو ضرورت نہیں (اس حقیر مال کا کیا ثواب) اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔ اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ

المطوعین (بخوشی دینے والے) اپنی دلی رغبت سے دینے والے۔ فی الصدقات سے مراد خیرات زیادہ دینا یعنی اپنی خوشی سے خیرات میں زیادہ مال دینے والے۔ جہد کا معنی ہے طاقت یعنی اپنے قابو اور استطاعت کے مطابق تھوڑا سا مال دیتے ہیں (زیادہ مال ان کے پاس نہیں ہوتا)

حضرت عبدالرحمٰن کیلئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعاء:

بغوی نے لکھا ہے اہل تفسیر کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو خیرات کرنے کی ترغیب دی حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے چار ہزار درہم لاکر پیش کئے اور عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس آٹھ ہزار درہم تھے چار ہزار خدمت گرامی میں لاکر حاضر کردیئے آپ ان کو اللہ کی راہ میں خرچ کردیجئے۔ چار ہزار اپنی اہل وعیال کے لئے چھوڑ آیا ہوں، فرمایا جو کچھ تم نے دیا اور جو کچھ روک لیا اللہ (سب میں) تم کو برکت دے اس دعا کا اثر تھا کہ اللہ نے حضرت عبدالرحمٰن کے مال میں اتنی برکت دی کہ وفات کے وقت آپ کی دو بیبیاں تھیں جن کا میراثی حصہ حضرت عبدالرحمٰن کے کل ترکہ کا آٹھواں حصہ تھا اس آٹھویں حصہ میں دو بیبیوں کو ایک لاکھ ساٹھ ہزار درہم ملے۔ (تفسیر مظہری)

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ
تو اُن کے لئے بخشش مانگ یا نہ مانگ اگر
تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ
اُن کے لئے ستر بار بخشش مانگے تو بھی ہر گز نہ
يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ
بخشے گا اُن کو اللہ یہ اس واسطے کہ وہ منکر ہوئے اللہ سے
وَرَسُوْلِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ
اور اس کے رسول سے اور اللہ راستہ نہیں دیتا
الْفٰسِقِيْنَ ﴿٨٠﴾
نافرمان لوگوں کو

منافقوں کو معاف نہ کیا جائے گا:

یعنی منافقین کے لئے آپ کتنی ہی مرتبہ استغفار کیجئے ان کے حق میں بالکل

بیکار اور بے فائدہ ہے۔ خدا ان بدبخت کافروں اور نافرمانوں کو کبھی معاف نہ کریگا۔ واقعہ یہ پیش آیا کہ مدینہ میں رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کا انتقال ہوا۔ آپ نے قمیص مبارک کفن میں دیا۔ لعاب مبارک اس کے منہ میں ڈالا۔ نماز جنازہ پڑھی اور دعائے مغفرت کی، حضرت عمرؓ اس معاملہ میں آڑے آتے تھے، اور کہتے تھے کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ وہ ہی خبیث تو ہے جس نے فلاں فلاں وقت ایسی ایسی نالائق حرکات کیں۔ ہمیشہ کفر ونفاق کا علمبردار رہا۔ کیا حق تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا" اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اے عمر! مجھ کو استغفار سے منع نہیں کیا گیا۔ بلکہ آزاد رکھا گیا ہے کہ استغفار کروں یا نہ کروں۔ یہ خدا کا فعل ہے۔ کہ ان کو معاف نہ کرے۔ یعنی ان کے حق میں میرا استغفار نافع نہ ہو (سوان کے حق میں نہ سہی، ممکن ہے دوسروں کے حق میں میرا یہ طرز عمل نافع ہو جائے دوسرے لوگ سب سے بڑے موذی دشمن کے حق میں نبی کے اس وسعت اخلاق اور وفور رحمت وشفقت کو دیکھ کر اسلام وپیغمبر اسلام کے گرویدہ ہو جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ صحیح بخاری کی ایک روایت میں آپ نے فرمایا کہ اگر میں جانتا کہ ستر مرتبہ سے زائد استغفار کرنے سے اس کی مغفرت ہوسکتی ہے تو میں ستر مرتبہ سے زائد استغفار کرتا، گویا اس جملہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے متنبہ فرمادیا کہ حضرت عمر کی طرح آپ بھی اس کے حق میں استغفار کو غیر مفید تصور فرمارہے تھے۔ فرق اس قدر ہے کہ حضرت عمرؓ کی نظر بغض فی اللہ کے جوش میں صرف اسی نقطہ پر مقصود تھی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میت کے فائدہ سے قطع نظر فرما کر عام پیغمبرانہ شفقت کا اظہار اور احیاء کے فائدہ کا خیال فرمارہے تھے۔ لیکن آخر کار وحی الٰہی وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ" نے صریح طور پر منافقین کا جنازہ پڑھنے یا ان کے اہتمام دفن وکفن وغیرہ میں حصہ لینے کی ممانعت کردی۔ کیونکہ اس طرز عمل سے منافقین کی ہمت افزائی اور مومنین کی دل شکستگی کا احتمال تھا۔ اس وقت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی منافق کے جنازہ کی نماز نہیں پڑھی۔ (تفسیر عثمانی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت:

بیضاوی نے لکھا ہے کہ لفظ سبعین سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ستر کا معین عدد سمجھ لیا اسی لئے خیال کیا کہ ستر بار سے زیادہ استغفار کرنے کا حکم ستر بار استغفار کرنے سے الگ ہوگا (ستر بار استغفار کرنے سے مغفرت نہ ہوگی ستر بار سے زیادہ دعا کی جائے تو مغفرت ہوسکتی ہے۔ حقیقت میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت اور رحمت تھی، آپ دل سے خواستگار تھے کہ کسی صورت سے منافقوں کی مغفرت ہو جائے چونکہ اللہ کے کلام میں لفظی اعتبار سے گنجائش تھی کہ ستر سے محدود عدد مراد لے لیا جائے اس لئے ستر بار سے زیادہ استغفار کرنے کا جواز نکال لیا) لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتادیا گیا کہ سبعین سے محدود عدد مراد نہیں بلکہ کثرت مراد ہے، سات ستر اور سات سو کا لفظ عربی زبان میں کثیر عدد کیلئے عام طور پر مستعمل ہوتا ہے۔ سات کا لفظ دونوں قسم کے عددوں کو مشتمل ہے، تین سے کم قلیل اور کم سے کم تین کو کثیر کہا جاتا ہے، زیادہ کی کوئی حد نہیں۔ (تفسیر مظہری)

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ
خوش ہو گئے پیچھے رہنے والے اپنے بیٹھ رہنے سے جُدا ہو کر رسول
اللّٰهِ وَكَرِهُوْۤا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ
اللہ سے اور گھبرائے اس سے کہ لڑیں اپنے مال سے
وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
اور جان سے اللہ کی راہ میں

نیکی سے گھبرانا برائی پر خوش ہونا منافقت کی علامت ہے:

یہ ان منافقین کے متعلق ہے جو غزوہ تبوک کی وجہ کی شرکت سے علیحدہ رہے۔ یعنی منافقین کا حال یہ ہے کہ برائی اور عیب کا کام کر کے خوش ہوتے ہیں نیکی سے گھبرا کر دور بھاگتے ہیں۔ اور جیسا کہ پہلے گذرا نیکی کرنیوالوں پر طعن کرتے اور آواز کستے ہیں۔ ایسی قوم کو نبی کے استغفار سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

گناہ اور بداعتقادی کا فرق:

یہاں سے گنہگار اور بداعتقاد کا فرق نکلتا ہے۔ گناہ ایسا کرن ساہے جو پیغمبر کے بخشوانے سے نہ بخشا جائے۔ "وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا (نساء، رکوع ۹)
لیکن بداعتقاد کو پیغمبر کا ستر مرتبہ استغفار فائدہ نہ دے۔ (تفسیر عثمانی)

وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِى الْحَرِّ
اور بولے کہ مت کوچ کرو گرمی میں

یا تو منافقین آپس میں ایک دوسرے کو کہتے تھے اور یا بعض مومنین سے کہتے ہونگے کہ ان کی ہمتیں سست ہو جائیں۔ (تفسیر عثمانی)

قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ؕ لَوْ كَانُوْا
تو کہہ دوزخ کی آگ سخت گرم ہے اگر

يَفْقَهُوْنَ ﴿٨١﴾

اُن کو سمجھ ہوتی

جہنم کی آگ دنیا کی گرمی سے بہت سخت ہے:

یعنی اگر سمجھ ہوتی تو خیال کرتے کہ یہاں کی گرمی سے بچ کر جس گرمی کی طرف جارہے ہیں وہ کہیں زیادہ سخت ہے۔ یہ تو وہی مثال ہوئی کہ دھوپ سے بھاگ کر آگ کی پناہ لی جائے۔ حدیث میں ہے کہ جہنم کی آگ دنیا کی آگ سے انہتر درجہ زیادہ تیز ہے نعوذ باللہ منہا۔ (تفسیر عثمانی)

صحیحین کی حدیث میں ہے۔ اور روایت میں ہے کہ تمہاری یہ آگ آتش دوزخ کے ستر اجزاء میں سے ایک جز ہے پھر بھی یہ سمندر کے پانی میں دو دفعہ بجھائی ہوئی ہے ورنہ تم اس سے کوئی فائدہ حاصل نہ کر سکتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ایک ہزار سال تک آتش دوزخ دھونکی گئی تو سرخ ہوگئی پھر ایک ہزار سال تک جلائی گئی تو سفید ہوگئی پھر ایک ہزار سال تک دھونکی گئی تو سیاہ ہوگئی۔ پس وہ اندھیری رات جیسی سخت سیاہ ہے۔ ایک بار آپ نے آیت وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ کی تلاوت کی اور فرمایا ایک ہزار سال تک جلائے جانے سے وہ سفید پڑ گئی پھر ایک ہزار سال تک دھونکے جانے سے سیاہ ہوگئی پس وہ سیاہ رات جیسی ہے اس کے شعلوں میں بھی چمک نہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ اگر دوزخ کی آگ کی ایک چنگاری مشرق میں ہو تو اس کی حرارت مغرب تک پہنچ جائے۔ (تفسیر ابن کثیر)

فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا ۚ جَزَآءً

سو وہ ہنس لیویں تھوڑا اور رو دیں بہت سا بدلہ

بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿٨٢﴾

اُس کا جو وہ کماتے تھے

دوزخی بہت روئیں گے:

یعنی چند روز اپنی حرکات پر خوش ہو لو اور ہنس لو پھر ان کرتوتوں کی سزا میں ہمیشہ کو رونا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

حاکم نے صحیح سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن قیس کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، دوزخی اتنا روئیں گے کہ اگر ان کے آنسوؤں میں کشتیاں چلائی جائیں تو چل جائیں پھر وہ خون کے آنسو بہائیں گے۔

نکتہ: میں کہتا ہوں آیت کا تفسیری مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سب لوگوں کو دنیا میں کم ہنسنا چاہیے یہ امر استحبابی ہے زیادہ ہنسا مکروہ ہے۔ ہنسنے کی زیادتی دل کو مردہ کر دیتی ہے اور دنیا میں ہی اللہ کے خوف سے خوب روئیں تاکہ جو گناہ ہو گیا ہے اس کی تلافی کی جائے۔

قیامت کے خوف سے:

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کچھ میں جانتا ہوں اگر تم جانتے تو کم ہنستے اور زیادہ روتے۔ رواہ احمد والشیخان فی الصحیحین والترمذی والنسائی وابن ماجہ۔ بخاری نے یہ حدیث حضرت ابوہریرۃ کی روایت سے بھی بیان کی ہے۔ حاکم نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابوذر کی روایت سے اس کو بیان کیا ہے اس میں اتنا زائد بھی ہے اور تم کو کھانا گوارا ہوتا نہ پیتا۔

طبرانی حاکم اور بیہقی نے حضرت ابودرداء کی روایت سے حسب ذیل الفاظ کے ساتھ حدیث مذکور نقل کی ہے کہ جو کچھ میں جانتا ہوں اگر تم جانتے تو بہت روتے، کم ہنستے اور میدانوں میں نکل کر اللہ کے سامنے گڑگڑاتے۔ تم کو واقفیت نہ ہوتی کہ تمہاری نجات ہوگی یا نہ ہوگی، حاکم نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابوہریرۃ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کچھ میں جانتا ہوں اگر تم جانتے تو زیادہ روتے کم ہنستے۔ نفاق ظاہر ہو جائے گا۔ امانت اٹھ جائے گی۔ رحمت سمیٹ لی جائیگی۔ امانت دار پر (خیانت کی) تہمت لگائی جائے گی جو امانت دار نہ ہوگا اس کو امین قرار دے لیا جائے گا۔ کالی رات کی طرح بڑے بڑے تاریک فتنے تم پر آپڑیں گے۔

بغوی نے اپنی سند سے لکھا ہے کہ حضرت انس نے بیان کیا، میں نے خود سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے، لوگو! اگر یہ کرو! اگر رونا نہ آئے تو رونی شکل اختیار کر لو کیونکہ دوزخی دوزخ میں اتنا روئیں گے کہ ان کے چہروں پر آنسو چھوٹی نہروں کی طرح بہیں گے، آخر آنسو ختم ہو جائیں گے تو خون بہے گا یعنی خون کے آنسو بہنے لگیں گے) اور چشمے پھوٹ نکلیں گے یہاں تک کہ اگر ان میں کشتیاں چلائی جائیں تو چل جائیں۔

امام احمد، اور ترمذی کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کچھ میں جانتا ہوں اگر تم جانتے تو ہنستے کم روتے زیادہ اور بستروں پر عورتوں سے لذت اندوز نہ ہوتے اور میدانوں میں نکل کر اللہ سے زاری کرتے۔

ابن ماجہ نے حضرت ابن مسعود کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو مومن بندہ اللہ کے خوف سے اپنی آنکھوں سے آنسو نکالتا ہے خواہ وہ آنسو مکھی کے سر کے برابر ہوں پھر آنسو نکلنے سے اس کو دکھ پہنچتا ہے تو اللہ اس کو دوزخ پر حرام کر دیتا ہے۔ (تفسیر مظہری)

فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا الآیۃ جس کے لفظی معنی یہ ہیں کہ ہنسو تھوڑا روؤ زیادہ، یہ لفظ اگرچہ بصیغۂ امر لایا گیا مگر حضرات مفسرین نے اس کو خبر کے معنی

میں قرار دیا ہے اور بصیغۂ امر ذکر کرنے کی یہ حکمت بیان کی ہے کہ ایسا ہونا حتمی اور یقینی ہے، یعنی یہ بات یقینی طور پر ہونے والی ہے کہ ان لوگوں کی یہ خوشی و ہنسی صرف چندروزکی ہے۔ اس کے بعد آخرت میں ہمیشہ کیلئے رونا ہی رونا ہوگا۔

ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ:

''دنیا چندروزہ ہے اس میں جتنا چاہو ہنس لو، پھر جب دنیا ختم ہوگی اور اللہ کے پاس حاضر ہوگے تو رونا شروع ہوگا جو کبھی ختم نہ ہوگا۔ (مظہری، معارف مفتی اعظم)

فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ
سو اگر پھر لیجائے تجھ کو اللہ کسی فرقہ کی طرف اُن میں سے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم تبوک میں تھے اور منافقین مدینہ میں۔ ممکن تھا کہ بعض منافقین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی واپسی سے قبل مرجائیں۔ اس لئے ''اِلٰى طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ'' فرمایا۔

فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ
پھر اجازت چاہیں تجھ سے نکلنے کی تو تو کہہ دینا کہ تم ہرگز
تَخْرُجُوْا مَعِىَ اَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِىَ
نہ نکلو گے میرے ساتھ کبھی اور نہ لڑو گے میرے ساتھ ہوکر
عَدُوًّا ؕ اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ
کسی دشمن سے تم کو پسند آیا بیٹھ رہنا
اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِيْنَ ﴿۸۳﴾
پہلی بار سو بیٹھے رہو پیچھے رہنے والوں کے ساتھ

آئندہ منافقوں کو غزوات میں جانے کی اجازت نہ دیں:

یعنی اب اگر یہ لوگ کسی دوسرے غزوہ میں ساتھ چلنے کی اجازت مانگیں تو فرما دیجئے کہ بس! تمہاری ہمت و شجاعت کا بھانڈا پھوٹ چکا اور تمہارے دلوں کا حال پہلی مرتبہ کھل چکا، نہ تم کبھی ہمارے ساتھ نکل سکتے ہو اور نہ دشمنان اسلام کے مقابلہ میں بہادری دکھا سکتے ہو، لہٰذا اب تم کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔ عورتوں، بچوں، اپاہج اور ناتواں بڈھوں کے ساتھ گھر میں گھسے بیٹھے رہو، اور جس چیز کو پہلی دفعہ تم نے اپنے لئے پسند کرلیا ہے مناسب ہے کہ اسی حالت پر مرو۔ تاکہ اچھی طرح عذاب الٰہی کا مزہ چکھو۔

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا
اور نماز نہ پڑھ اُن میں سے کسی پر جو مر جائے

وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ؕ
اور کبھی نہ کھڑا ہو اُس کی قبر پر

یعنی دعاء واستغفار کے لئے یا اہتمام دفن کیلئے۔ (تفسیر عثمانی)

عبداللہ بن ابی کا جنازہ:

شیخین نے صحیحین میں حضرت عبداللہ بن عمر کی روایت سے لکھا ہے کہ عبداللہ بن ابی کا جب انتقال ہوگیا تو اس کے بیٹے حضرت عبداللہ بن عبداللہ بن ابی نے خدمت گرامی میں حاضر ہوکر باپ کے کفن کیلئے ایک کرتہ عطا فرمانے کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمادیا پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز جنازہ پڑھا دینے کی خواہش کی آپ نماز پڑھانے کیلئے کھڑے ہوئے حضرت عمرؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کپڑا پکڑ لیا اور عرض کیا یارسول اللہ اللہ نے منافقوں کی نماز پڑھانے سے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو منع فرمادیا ہے۔ فرمایا اللہ نے مجھے اختیار دیا ہے اور فرمایا ہے اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً الخ اور میں ستر بار سے زیادہ اس کیلئے دعائے مغفرت کروں گا۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا یہ تو منافق تھا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی جنازہ کی نماز پڑھا دی اس پر اللہ نے آیت ذیل نازل فرمائی۔

بخاری نے حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عبداللہ کے جنازہ پر اس وقت پہنچے جب کہ اس کو قبر کے گڑھے میں داخل کیا جا چکا تھا آپ نے جنازہ باہر نکلوایا اور اپنے زانو پر اس (کے سر) کو رکھ کر اپنا لعاب دہن اس کے منہ میں ڈالا اور اپنا کرتہ اس کو پہنایا۔

صحیحین میں حضرت ابن عمر کی روایت سے آیا ہے کہ عبداللہ بن ابی کے بیٹے حضرت عبداللہ نیک مخلص لوگوں سے تھے انہوں نے اپنے باپ کی مرض موت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے باپ کیلئے دعائے مغفرت کرنے کی درخواست کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کردی اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

عبداللہ بن اُبی کی خواہش:

حاکم نے صحیح سند سے اور دلائل میں بیہقی نے حضرت اسامہ بن زید کی روایت سے بیان کیا ہے کہ مرض موت کی حالت میں ابن ابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلوا کر درخواست کی کہ آپ میرے لئے دعائے مغفرت کردیجئے اور اپنے اس کپڑے کا مجھے کفن دلوا دیجئے جو آپ کے بدن سے لگا ہو اور میرے جنازہ کی نماز پڑھ دیجئے۔ چنانچہ اس کے انتقال کے بعد کفن دینے کیلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا کرتہ عنایت فرمادیا اور نماز پڑھنے کیلئے کھڑے ہوئے تھے کہ یہ آیت نازل ہوئی۔

ابن ابی نے بدر کے دن حضرت عباس کو کرتہ دیا:

بخاری نے حضرت جابرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ بدر کے دن (قیدیوں میں) جب حضرت عباس کو لایا گیا تو اس وقت آپ کے بدن پر کرتہ نہ تھا (اور کسی کا کرتہ آپ کے جسم پر آ بھی نہیں سکتا تھا) عبداللہ بن ابی نے اپنا کرتہ حضرت عباس کو دے دیا وہ آپ کے بدن پر ٹھیک تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی کرتہ آپ کو پہنا دیا پھر اس کے بدلہ میں وہ کرتہ ابن ابی کے مرنے کے بعد عنایت فرمایا تھا جس کا اس کو کفن دیا گیا۔

ایک ہزار آدمی کا مسلمان ہونا:

بغوی نے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن ابی سے (اس کے مرنے کے بعد) جو سلوک کیا (یعنی قمیض مبارک اس کو پہنایا اور اس کے جنازہ کی نماز پڑھی) اس کے متعلق صحابہ نے آپ سے کچھ کلام کیا (یعنی مودبانہ شکایت کی)۔ حضور نے فرمایا میرا کرتہ اور میری نماز اللہ (کے عذاب) سے اس کو نہیں بچائے گی۔ خدا کی قسم میری خواہش تو یہ تھی کہ اس کی وجہ سے اس کی قوم کے ایک ہزار آدمی مسلمان ہو جائیں۔ راوی کا بیان ہے کہ ابن ابی کی قوم والوں نے جب دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قمیص سے اس نے تبرک حاصل کیا تو ایک ہزار آدمی مسلمان ہو گئے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی منافق کی نماز نہیں پڑھی اور وقت وفات تک کسی منافق کی قبر پر دعا کرنے نہیں کھڑے ہوئے۔ (تفسیر مظہری)

منافقوں سے رویہ:

امام رازی فرماتے ہیں کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب آدمی کسی سے مکر اور فریب اور نفاق دیکھے تو اس سے قطع تعلق کر دے اور اس کی معاونت اور مجالست اور مصاحبت سے بھی احتراز کرے ایسے لوگوں کو جہاد میں ساتھ نہ لے جائے اور اگر مر جائیں تو ان کی نماز جنازہ نہ پڑھے اور نہ ان کی قبر پر جا کر کھڑا ہو۔ لعنة الله عليهم اجمعين. (معارف کاندھلوی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ:

مسند احمد میں ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی جنازے کی طرف بلایا جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پوچھ لیتے اگر لوگوں سے اس کی بھلائیاں معلوم ہوتیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم جا کر اس کے جنازے کی نماز پڑھاتے اور اگر کوئی ایسی ویسی بات کان میں پڑتی تو صاف انکار کر دیتے۔ حضرت عمرؓ کا طریقہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ رہا کہ جس کے جنازے کی نماز حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پڑھتے اس کی جنازے کی نماز آپ بھی پڑھتے جس کی حضرت حذیفہؓ نہ پڑھتے آپ بھی نہ پڑھتے اس لئے کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقوں کے نام گنوا دیئے تھے اور صرف انہی کو یہ نام معلوم تھے اسی بناء پر انہیں راز دار رسول صلی اللہ علیہ وسلم کہا جاتا تھا۔ بلکہ ایک مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ حضرت عمرؓ ایک شخص کے جنازے کی نماز کے لئے کھڑے ہونے لگے تو حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے چٹکی لے کر انہیں روک دیا۔

نماز جنازہ کا ثواب:

جنازے کی نماز اور استغفار ان دونوں چیزوں سے منافقوں کے بارے میں مسلمانوں کو روک دینا یہ دلیل ہے اس امر کی کہ مسلمانوں کے بارے میں ان دونوں چیزوں کی پوری تاکید ہے، ان میں مردوں کے لئے بھی پورا نفع ہے اور زندوں کے لئے بھی کامل اجر و ثواب ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جو جنازے میں جائے اور نماز پڑھی جانے تک ساتھ رہے اسے ایک قیراط ثواب ملتا ہے اور جو دفن تک ساتھ رہے اسے دو قیراط ملتے ہیں۔ پوچھا گیا کہ قیراط کیا ہے؟ فرمایا سب سے چھوٹا قیراط احد پہاڑ کے برابر ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارک تھی کہ میت کے دفن سے فارغ ہو کر وہیں اس کی قبر کے پاس ٹھہر کر حکم فرماتے کہ اپنے ساتھی کیلئے استغفار کرو اس کے لئے ثابت قدمی کی دعا کرو اس سے اس وقت سوال و جواب ہو رہا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دانائی:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ میرے قمیص سے یا نماز پڑھانے سے اس کی تو مغفرت نہیں ہوگی، مگر اس سے دوسری مصالح اسلامیہ حاصل ہونے کی توقع تھی کہ اس کے خاندان کے لوگ اور دوسرے کفار پر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معاملہ اس کے ساتھ دیکھیں گے تو وہ اسلام کے قریب آ جائیں گے اور مسلمان ہو جائیں گے اور ممانعت صریح نماز پڑھنے کی اس وقت تک موجود نہ تھی اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھ لی۔

مسئلہ: اس آیت سے معلوم ہوا کہ کسی کافر کے جنازہ کی نماز اور اس کے لئے دعاء مغفرت جائز نہیں۔

مسئلہ: اسی آیت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ کسی کافر کے اعزاز و اکرام کے لئے اس کی قبر پر کھڑا ہونا یا اس کی زیارت کیلئے جانا حرام ہے، عبرت حاصل کرنے کیلئے ہو یا کسی مجبوری کیلئے تو وہ اس کے منافی نہیں، جیسا کہ ہدایہ میں ہے کہ اگر کسی مسلمان کا کافر رشتہ دار مر جائے اور اس کا کوئی ولی وارث نہیں تو مسلمان رشتہ دار اس کو اسی طرح بغیر رعایت طریق مسنون کے گڑھے میں دبا سکتا ہے۔ بیان القرآن (معارف مفتی اعظم)

اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ مَاتُوْا

وہ منکر ہوئے اللہ سے اور اُس کے رسول سے

وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۸۴﴾

اور وہ مر گئے نافرمان

یہ آیت عبداللہ بن ابی کے واقعہ کے بعد نازل ہوئی، جیسا کہ چند آیات پہلے ہم مفصل بیان کر چکے ہیں، اس آیت کے نزول کے بعد منافقین کا جنازہ پڑھنا قطعاً ممنوع ہو گیا۔ امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ احتیاطاً ایسے شخص کا جنازہ نہ پڑھتے تھے جس کی نماز میں حضرت حذیفہ شریک نہ ہوں۔ کیونکہ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے منافقین کا نام بنام علم کرا دیا تھا۔ اسی لئے ان کا لقب ''صاحب سر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم'' ہوا۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَ اَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا

اور تعجب نہ کر اُن کے مال اور اولاد سے

يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِى الدُّنْيَا

اللہ تو یہی چاہتا ہے کہ عذاب میں رکھے اُن کو اُن چیزوں کے باعث دنیا میں

وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۸۵﴾

اور نکلے اُن کی جان اور وہ اُس وقت تک کافر ہی رہیں

چار رکوع پہلے اسی مضمون کی آیت گذر چکی، اُس کا فائدہ ملاحظہ کر لیا جائے۔

وَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ

اور جب نازل ہوتی ہے کوئی سورت کہ ایمان لاؤ اللہ پر اور لڑائی کرو

وَجَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهِ اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا

اُس کے رسول کے ساتھ ہو کر تو تجھ سے رخصت مانگتے ہیں مقدور

الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَ قَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ

والے اُن کے اور کہتے ہیں ہم کو چھوڑ دے کہ رہ جائیں ساتھ بیٹھنے

الْقٰعِدِيْنَ ﴿۸۶﴾ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ

والوں کے خوش ہوئے کہ رہ جائیں پیچھے رہنے والی عورتوں کے ساتھ

منافق کام چور ہیں: یعنی قرآن کی کسی سورت پر جب تنبیہ کی جاتی ہے کہ پوری طرح خلوص و پختگی سے ایمان لاؤ، جس کا بڑا اثر یہ ظاہر ہونا چاہیے کہ پیغمبر علیہ السلام کے ساتھ ہو کر خدا کے راستہ میں جہاد کریں۔ تو یہ منافقین جان چرانے لگتے ہیں اور ان میں کے استطاعت و مقدور والے بھی جھوٹے عذر تراش کر اجازت طلب کرنے آتے ہیں کہ حضرت! ہمیں تو یہیں مدینہ میں رہنے دیجئے۔ گویا کمال بے غیرتی اور نامردی سے اس پر راضی ہیں کہ لڑائی یا خطرہ کا نام سنتے ہی خانہ نشین عورتوں کے ساتھ گھروں میں گھس کر بیٹھ رہیں۔ ہاں جس وقت جنگ وغیرہ کا خطرہ نہ رہے اور امن و اطمینان کا زمانہ ہو تو باتیں بنانے اور قینچی کی طرح زبان چلانے میں سب سے پیش پیش ہوتے ہیں فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِىْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۚ فَاِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ (الاحزاب۔ رکوع ۲) (تفسیر عثمانی)

وَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴿۸۷﴾

اور مُہر کر دی گئی اُن کے دل پر، سو وہ نہیں سمجھتے

دلوں پر مہر لگا دی گئی: یعنی کذب و نفاق، نکول عن الجہاد، اور تخلف عن الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شامت سے ان کے دلوں پر مہر کر دی گئی کہ اب موٹے موٹے عیب بھی ان کو عیب نظر نہیں آتے اور انتہائی بے غیرتی و بزدلی پر بجائے شرمانے کے نازاں و فرحاں ہوتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

شانِ نزول: ابن مردویہ نے حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جد بن قیس کو جہاد کیلئے ساتھ نہ چلنے کی اجازت دیدی تو کچھ اور منافق طلب اذن کیلئے حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ ہم کو بھی اجازت دے دیجئے ہم اس گرمی میں جہاد کو نہیں نکل سکتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اجازت دیدی اور منہ پھیر لیا اور یہ آیت نازل ہوئی اور اللہ نے ان کو معذور نہیں قرار دیا۔ ابن اسحاق نے لکھا ہے وہ قبیلہ بنی غفار کی ایک جماعت تھی (جن کی تعداد دس سے کم تھی۔ نفر دس سے کم تعداد کی جماعت کو کہتے ہیں) محمد بن عمر نے کہا وہ بیاسی آدمی تھے جن میں خفاف بن ایما بھی تھا انہی کے متعلق آیت وَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ تک نازل ہوئی۔ (تفسیر مظہری)

لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ

لیکن رسول اور جو لوگ ایمان لائے ہیں ساتھ

جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ

اُسکے وہ لڑے ہیں اپنے مال اور جان سے

وَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ ۡ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ

اور انہی کے لئے ہیں خوبیاں اور وہی ہیں

الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۸۸﴾ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ

مراد کو پہنچنے والے تیار کر رکھے ہیں اللہ نے اُنکے واسطے باغ

مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ

کہ بہتی ہیں نیچے اُن کے نہریں رہا کریں

ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۸۹﴾

اُن میں یہی ہے بڑی کامیابی

مؤمنوں کو دیکھو کیسے جاں نثار ہیں:

منافقین کے بالمقابل مخلصین کا بیان فرمایا کہ دیکھو! یہ ہیں خدا کے وفادار بندے۔ جو اس کے راستہ میں نہ جان سے ہٹتے ہیں نہ مال سے۔ کیسا ہی خطرہ کا موقع ہو، اسلام کی حمایت اور پیغمبر اسلام کی معیت میں ہر قربانی کے لئے تیار رہتے ہیں۔ پھر ایسوں کے لئے فلاح وکامیابی نہ ہوگی تو اور کس کیلئے ہوگی۔

وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ

اور آئے بہانے کرنے والے گنوار تا کہ اُن کو رخصت

لَهُمْ وَقَعَدَ الَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ

مل جائے اور بیٹھ رہے جنہوں نے جھوٹ بولا تھا اللہ سے اور اُسکے رسول سے

سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ

اب پہنچے گا اُن کو جو کافر ہیں اُن میں عذاب

اَلِيْمٌ ﴿۹۰﴾

دردناک

دو قسم کے دیہاتی: یعنی جس طرح مدینہ کے رہنے والوں میں منافقین بھی ہیں اور مخلصین بھی۔ اسی طرح دیہاتی گنواروں میں ہر قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے یہاں دو قسموں کا ذکر فرمایا۔ مخلص دیہاتیوں کا ذکر اس رکوع کے خاتمہ پر وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ الخ میں آئیگا۔ یہاں دیہاتیوں کی جن دو جماعتوں کا ذکر ہے (معذرون اور قاعدون) ان میں سے پہلی جماعت (معذرون) کے مصداق میں مفسرین سلف کا اختلاف ہے کہ آیا اس سے مراد جھوٹے بہانے بنانے والے منافق ہیں (جیسا کہ ترجمہ سے ظاہر ہوتا ہے) یا سچے عذر کرنیوالے مسلمان جو واقعی جہاد کی شرکت سے معذور تھے اگر پہلی شق اختیار کی جائے تو آیت میں منافقین کی دو قسموں کا بیان ہوگا۔ ''معذرون'' تو وہ ہوئے جو باوجود نفاق کے محض رسم ظاہر داری نباہنے کیلئے جھوٹے حیلے بنا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کرتے تھے۔ اور ''قاعدون'' سے وہ منافقین مراد ہوں گے جنہوں نے اول دعوائے ایمان میں جھوٹ بولا۔ پھر ظاہر داری کی بھی پروا نہیں کی۔ جہاد کا نام سن کر گھروں میں بیٹھ رہے، بالکل بے باک وبے حیا ہو کر عذر کرنے بھی نہ آئے۔ اس تقدیر پر ''سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ'' دونوں جماعتوں کو شامل ہوگا۔ اور معنی یہ ہونگے کہ جو لوگ دونوں جماعتوں میں سے اپنے کفر پر اخیر تک قائم رہینگے ان کے لیے عذاب دردناک ہے جن کو توبہ کی توفیق ہو جائیگی، وہ اس وعید کے نیچے داخل نہیں۔ اور اگر ''معذرون'' سے مراد مومنین مخلصین لئے جائیں جو واقعی معذور تھے تو ''قاعدون'' سے مراد منافقین ہونگے اور ''سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ'' کی وعید صرف ان ہی کے حق میں ہوگی پہلی جماعت کا ذکر گویا قبول عذر کے طور پر ہوگا۔ (تفسیر عثمانی)

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى

نہیں ہے ضعیفوں پر اور نہ مریضوں پر

وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ

اور نہ اُن لوگوں پر جن کے پاس نہیں ہے

حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ مَا عَلَى

خرچ کرنے کو کچھ گناہ جبکہ دل سے صاف ہوں اللہ اور اُسکے رسول

الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ؕ

کے ساتھ نہیں ہے نیکی والوں پر الزام کی کوئی راہ

واقعی معذور لوگ:

جھوٹے عذر کرنیوالوں کے بعد سچے معذورین کا بیان فرماتے ہیں حاصل یہ ہے کہ عذر کبھی تو شخصی طور پر لازم ذات ہوتا ہے مثلاً بڑھاپے کی کمزوری جو عادۃً کسی طرح آدمی سے جدا نہیں ہوسکتی، اور کبھی عارضی ہوتا ہے۔ پھر ''عارضی'' یا بدنی ہے جیسے بیماری وغیرہ، یا مالی، جیسے افلاس وفقدان اسباب سفر۔ چونکہ غزوہ تبوک میں مجاہدین کو بہت دور دراز مسافت طے کر کے پہنچنا تھا، اس لئے سواری نہ ہونے کا عذر بھی معتبر ومقبول سمجھا گیا، جیسے آگے آتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

شانِ نزول:

ابن ابی حاتم نے بیان کیا کہ حضرت زید بن ثابت نے فرمایا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کاتب تھا اور سورۂ برأت لکھ رہا تھا اور قلم کو اپنے کان پر رکھے ہوئے تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم وحی کے منتظر تھے کہ آگے کیا اترتا ہے اتنے میں ایک نابینا آیا اور عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اندھا ہوں میرے متعلق کیا حکم ہے، اس پر آیت نازل ہوئی۔ (تفسیر مظہری)

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٩١﴾
اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے

یعنی جولوگ واقعی معذور ہیں اگر ان کے دل صاف ہوں اور خدا اور رسول کے ساتھ ٹھیک معاملہ رکھیں (مثلاً خود نہ جاسکتے ہوں تو جانے والوں کی ہمتیں پست نہ کریں) بلکہ اپنے مقدور کے موافق نیکی کرنے اور اخلاص کا ثبوت دینے کیلئے مستعد رہیں، ان پر جہاد کی عدم شرکت سے کچھ الزام نہیں۔ ایسے مخلصین سے اگر مقتضائے بشریت کوئی کوتاہی ہوجائے تو حق تعالیٰ کی بخشش ومہربانی سے توقع ہے کہ وہ درگذر فرمائیگا۔ (تفسیر عثمانی)

وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ
اور نہ اُن لوگوں پر کہ جب تیرے پاس آئے تو انکو تو سواری
قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا
دے تو نے کہا میری پاس کوئی چیز نہیں کہ تم کو
وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا
اُس پر سوار کردوں تو اُلٹے پھرے اور اُن کی آنکھوں سے بہتے تھے
اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ﴿٩٢﴾
آنسو اس غم میں کہ نہیں پاتے وہ چیز جو خرچ کریں

صحابہ کرام کا جذبہ:

سبحان اللہ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نے صحابہ رضی اللہ عنہم کی دلوں میں عشق الٰہی کا وہ نشہ پیدا کیا تھا جس کی مثال کسی قوم وملت کی تاریخ میں موجود نہیں۔ مستطیع اور مقدور والے صحابہ کو دیکھو تو جان ومال سب کچھ خدا کے راستہ میں لٹانے کو تیار ہیں اور سخت سے سخت قربانی کے وقت بڑے ولولہ اشتیاق سے آگے بڑھتے ہیں جن کو مقدور نہیں وہ اس غم میں رورو کر جان کھوئے لیتے ہیں کہ ہم میں اتنی استطاعت کیوں نہ ہوئی کہ اس محبوب حقیقی کی راہ میں قربان ہونے کیلئے اپنے کو پیش کرسکتے۔ حدیث صحیح میں آپ نے مجاہدین کو خطاب کرکے فرمایا کہ تم مدینہ میں ایک ایسی قوم کو اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہو جو ہرقدم پر تمہارے اجر میں شریک ہے۔ تم جو قدم خدا کے راستہ میں اٹھاتے ہو یا کوئی جنگل قطع کرتے ہو یا کسی پگڈنڈی پر چلتے ہو وہ قوم برابر ہر موقع پر تمہارے ساتھ ساتھ ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں واقعی مجبوریوں نے تمہارے ہمراہ چلنے سے روکا۔ حسنؒ کے "مرسل" میں ہے کہ یہ مضمون بیان فرما کر آپ نے یہی آیت " وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ " الخ تلاوت فرمائی۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت علیہ کا عجیب صدقہ:

ابن اسحاق نے یونس اور ابن عمر کے حوالہ سے لکھا ہے کہ علیہ بن زید کو جب خود کوئی سواری نہیں ملی اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی (زائد) سواری ایسی تھی کہ علیہ کو سواری کیلئے مل جاتی تو وہ رات سے نکل کھڑے ہوتے انہوں نے جتنی نماز چاہی پڑھی پھر رونے لگے اور دعا کی اے اللہ تو نے جہاد کا حکم دیا اور ترغیب دی (اور میرے پاس جہاد میں جانے کیلئے سواری نہیں ہے اب) میں ہر مسلمان پر (اپنی ہر چیز) تصدق کردوں گا اس حق کے عوض جو مسلمان پر عائد ہوتا ہو خواہ مجھے مال دینا پڑے یا جسم یا آبرو۔ جب صبح ہوئی اور لوگوں کے ساتھ علیہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آج رات صدقہ دینے (کا وعدہ کرنے) والا کہاں ہے۔ سب لوگ خاموش رہے۔ کوئی نہیں کھڑا ہوا۔ علیہ کھڑے ہوگئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے قول کی اطلاع دے دی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تجھ کو بشارت ہو قسم اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے (تیرا) صدقہ مقبول زکوۃ میں لکھ لیا گیا۔

حضرت ابویعلی اور حضرت عبداللہ کی حسرت اور کامیابی:

ابن اسحاق اور محمد بن عمر کا بیان ہے کہ جب سواری کے طلبگاروں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سواریاں نہ دے سکے، اور لوگ روتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے لوٹے تو ان رونے والوں میں ابویعلی اور عبداللہ بن مغفل بھی تھے (راستہ میں) ان کی ملاقات یامین بن عمر ونضری سے ہوئی۔ یامین نے دونوں کو روتا دیکھ کر رونے کی وجہ دریافت کی، دونوں بزرگوں نے کہا، ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سواریاں مانگنے حاضر ہوئے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی ایسی سواری ہی نہ تھی جو آپ ہم کو دے دیتے، اور ہمارے پاس کوئی ایسی چیز نہیں کہ ہم جہاد کو

جاسکیں اور رسول اللہ کے ہمرکاب جہاد پر نہ جانا بھی ہم کو گوارا نہیں۔
(رونے کی بس یہ وجہ ہے) وجہ گریہ سن کر یامین نے ان کو پانی سینچنے والا ایک اونٹ اور زادراہ کیلئے ہر ایک کو دو صاع (تقریباً آٹھ سیر) چھوارے دیدیئے۔ محمد بن عمرو نے اتنا زائد بھی بیان کیا ہے کہ حضرت عباس بن مطلب نے بھی دو آدمیوں کے لئے سواری کا انتظام کر دیا اور حضرت عثمان بن عفان نے لشکر کی تیاری کے علاوہ مزید تین آدمیوں کو سواریاں دے دیں۔
میں کہتا ہوں، سواری سے محروم کل سولہ آدمی تھے (جو جہاد میں شریک ہونے کے لئے بے تاب تھے) جن میں سے سات کا تو اس طرح انتظام ہو گیا اور راوی کا شک کی وجہ سے دو آدمیوں کو ان میں سے اور کم کر دیا جائے تو سات آدمی رہ جاتے ہیں (جو سواری سے محروم رہے اور جانے کے لئے روتے تھے) انہی کے متعلق اللہ نے وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ الخ فرمایا۔

حضرت ابوموسیٰ کی درخواست اور کامیابی:

بخاری و مسلم نے صحیحین میں لکھا ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری نے فرمایا، میں اشعر قبیلہ کے چند آدمیوں کے سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ درخواست کرنے کیلئے کہ ان لوگوں کو سواری کی ضرورت ہے ان کو سواریاں عطا فرمادی جائیں حاضر ہوا دوسری روایت میں آیا ہے میرے ساتھیوں نے مجھے خدمت گرامی میں سواریاں طلب کرنے کیلئے بھیجا میں نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے ساتھیوں نے مجھے خدمت گرامی میں یہ عرض کرنے کیلئے بھیجا ہے کہ آپ ان کو سواریاں عنایت فرمادیجئے۔ میری اس حاضری اور گذارش کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم غصہ میں تھے اور مجھے پتہ نہ تھا فرمایا میں تم کو کوئی سواری نہیں دوں گا اور نہ میرے پاس کوئی (زائد) سواری ہے کہ تم کو دے سکوں۔ انکاری جواب سن کر میں غمگین حالت میں لوٹ آیا اور یہ اندیشہ بھی ہوا کہ میرے خلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ دل میں احساس (نہ) کر لیا ہو واپس آ کر اپنے ساتھیوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب نقل کر دیا کچھ وقفہ کے بعد ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس غنیمت کے کچھ اونٹ آئے اور ذرا سی دیر کے بعد ہی میں نے بلال کو ندا سنی جو پکار رہے تھے عبداللہ بن قیس کہاں ہے میں نے فوراً جواب دیا بلال نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم کو بلا رہے ہیں۔ حکم کی تعمیل کرو۔ میں خدمت گرامی میں حاضر ہو گیا فرمایا یہ ایک جٹ (دو دو اونٹ ایک رسی سے بندھے ہوئے) اور یہ جٹ میں نے اسی وقت سعد سے چھ اونٹوں کے بدلے میں خرید ے ہیں تم ان کو اپنے ساتھیوں کے پاس لے جاؤ اور ان سے کہہ دو کہ اللہ یا فرمایا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تم کو سواری کیلئے دیئے ہیں ان پر سوار ہو جانا۔ حضرت ابوموسیٰ کا بیان ہے میں اونٹ لے کر اپنے ساتھیوں کے پاس آیا اور ان سے کہا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اونٹ سوار ہونے کیلئے تم کو دے دیے ہیں لیکن تم یہ خیال نہ کرنا کہ میں نے پہلے جو بات تم سے کہی تھی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمائی تھی۔ جب میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلی بار تمہارے لئے درخواست کی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمادیا تھا پھر اس کے بعد اب عنایت فرمادیئے (اس واقعہ کے گواہ موجود ہیں) تم میں سے کوئی میرے ساتھ ان لوگوں کے پاس چلے جنہوں نے میرا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام سنا تھا میں اس (تحقیقات) کے بغیر تم کو نہیں چھوڑوں گا ساتھیوں نے کہا خدا کی قسم آپ ہمارے نزدیک سچے ہیں اور جو آپ کی خواہش ہے ہم ایسا بھی کر دینگے چنانچہ میں اپنے ساتھیوں میں سے چند آدمیوں کو لے کر ان لوگوں کے پاس پہنچا جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان اور ابتدائی انکار پھر عطا کا حکم سنا تھا گواہوں نے وہ بات ان لوگوں کے سامنے بیان کر دی۔ جو میں نے اپنے ساتھیوں سے بیان کی تھی۔ پھر ہم نے (یعنی میں نے اور میرے ساتھیوں نے) کہا خدا کی قسم اس میں ہم کو برکت حاصل نہ ہوگی (کیونکہ معلوم ہوتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناراضگی کے ساتھ یہ اونٹ عنایت فرمائے ہیں) حسب مشورہ ہم لوٹ کر خدامت گرامی میں حاضر ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے (از خود) تم کو یہ سواریاں نہیں دی ہیں بلکہ اللہ نے دی ہیں۔ پھر فرمایا، آئندہ اگر میں کسی بات پر قسم کھاؤں گا اور اس سے بہتر (قسم کے خلاف) اگر کوئی معاملہ سامنے آیا تو ان شاء اللہ میں قسم کا کفارہ دے دوں گا اور بہتر بات کو اختیار کر لوں گا۔ (تفسیر مظہری)

اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ

راہ الزام کی تو اُن پر ہے جو رخصت مانگتے ہیں تجھ سے اور وہ

وَهُمْ اَغْنِيَآءُ ۚ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ ۙ

مالدار ہیں خوش ہوئے اس بات سے کہ رہ جائیں ساتھ پیچھے رہنے

وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۳﴾

والیوں کے اور مہر کر دی اللہ نے اُن کے دلوں پر سو وہ نہیں جانتے

الزام کے مستحق لوگ: یعنی باوجود قدرت واستطاعت جہاد سے پہلی تہی کرتے ہیں اور نہایت بے حمیتی سے یہ عار گوارا کرتے ہیں کہ عورتوں کی طرح گھروں میں چوڑیاں پہن کر بیٹھ جائیں۔ گناہ کی ممارست (پریکٹس) سے آدمی کا قلب ایسا مسخ اور سیاہ ہو جاتا ہے کہ اسے بھلے برے اور عیب و ہنر کی تمیز بھی باقی نہیں رہتی۔ جب بے غیرتی کرتے کرتے کوئی شخص اس قدر پاگل ہو جائے کہ نادم و متاسف ہونے کی جگہ اس پر الٹا نازاں اور خوش ہو تو سمجھ لو کہ اس کے دل میں خدائی مہر لگ چکی ہے العیاذ باللہ!

يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ

بہانے لائیں گے تمہارے پاس جب تم پھر کر جاؤ گے ان کی طرف

قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ

تو کہہ بہانے مت بناؤ ہم ہرگز نہ مانیں گے تمہاری

نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ وَسَيَرَى اللّٰهُ

بات ہم کو بتا چکا ہے اللہ تمہارے احوال اور ابھی دیکھے گا اللہ

عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ

تمہارے کام اور اس کا رسول پھر تم لوٹائے جاؤ گے

الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ

طرف اس جاننے والے چھپے اور کھلے کی سو وہ بتائیگا تم کو

تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۴﴾

جو تم کر رہے تھے

تمہارے کرتوت کھل گئے ہیں آگے کی سوچو:

یعنی جیسے تبوک کی طرف روانہ ہونے کے وقت منافقین نے طرح طرح کے حیلے بہانے بنائے جب تم مدینہ واپس آؤ گے، اس وقت بھی یہ لوگ اعذار باطلہ پیش کر کے تم کو مطمئن بنانا چاہینگے اور قسمیں کھائینگے کہ حضرت ہمارا قصد مصمم تھا کہ آپ کے ساتھ چلیں، مگر فلاں فلاں موانع وعوائق پیش آ جانے کی وجہ سے مجبور رہے۔ آپ کہہ دیجئے کہ جھوٹی باتیں بنانے سے کچھ فائدہ نہیں۔ تمہارے سب اعذار لغو اور بیکار ہیں۔ ہم کو حق تعالیٰ تمہارے کذب ونفاق پر مطلع کر چکا۔ پھر کس طرح ہم تمہاری لغویات کو باور کر سکتے ہیں۔ اب پچھلے قصہ کو چھوڑو، آئندہ تمہارا طرز عمل دیکھا جائیگا کہ اپنے دعوے کو کہاں تک نباہتے ہو، سب جھوٹ سچ ظاہر ہو کر رہیگا اور بہرحال اس "عالم الغیب والشہادۃ" سے تو کوئی راز اور عمل یا نیت پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ اسی کے یہاں سب کو جانا ہے وہ جزاء دینے کے وقت تمہارا ہر چھوٹا بڑا، ظاہری وباطنی عمل کھول کر رکھ دے گا اور اسی کے موافق بدلہ دیا جائیگا۔

سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ

اب قسمیں کھائیں گے اللہ کی تمہارے سامنے جب تم پھر کر جاؤ گے

اِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ

ان کی طرف تاکہ تم ان سے درگزر کرو سو تم درگزر کرو

اِنَّهُمْ رِجْسٌ وَّمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ جَزَآءً

ان سے بیشک وہ لوگ پلید ہیں اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے بدلہ

بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۹۵﴾

ان کے کاموں کا

منافقوں کی جھوٹی قسموں کا مقصد:

تبوک سے واپسی کے بعد منافقین جھوٹی قسمیں کھا کر جو عذر پیش کرتے تھے اس کی غرض یہ تھی کہ پیغمبر علیہ السلام اور مسلمانوں کو اپنی قسموں اور ملمع سازیوں سے راضی ومطمئن کر دیں تاکہ بارگاہ رسالت سے ان پر کوئی عتاب وملامت اور داروگیر نہ ہو۔ سابق کی طرح یوں ہی معاملہ ابہام میں رہے مسلمان ان سے کچھ تعرض نہ کریں۔ حق تعالیٰ نے فرمادیا کہ بہتر ہے تم ان سے تعرض مت کرو لیکن یہ اغماض وتغافل (تعرض نہ کرنا) راضی ومطمئن ہونے کی بناء پر نہیں، بلکہ ان کے نہایت پلید اور شریر ہونے کی وجہ سے ہے، یہ لوگ اس قدر گندے واقع ہوئے ہیں کہ ان کے پاک وصاف ہونے کی کوئی توقع نہیں رہی۔ لہٰذا اس غلاظت کی پوٹ کو دور پھینک دینا اور اس سے علیحدہ رہنا ہی بہتر ہے خدا خود ان کو ٹھکانے لگا دے گا۔

يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنْ تَرْضَوْا

وہ لوگ قسمیں کھائیں گے تمہارے سامنے تاکہ تم ان سے راضی

عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ

ہو جاؤ سو اگر تم راضی ہوگئے ان سے تو اللہ راضی نہیں ہوتا

الْفٰسِقِيْنَ ﴿۹۶﴾

نافرمان لوگوں سے

خدا کے آگے تو کوئی چالاکی نہیں چل سکتی:

بڑی کوشش یہ ہے کہ مکروفریب اور کذب ودروغ سے مسلمانوں کو خوش کر لیں۔ فرض کیجئے اگر چکنی چپڑی باتوں سے مخلوق راضی ہو جائے تو کیا نفع پہنچ سکتا ہے جبکہ خدا ان سے راضی نہ ہو۔ خدا کے آگے تو کوئی چالاکی اور دغابازی

نہیں چل سکتی۔ گویا متنبہ فرمادیا کہ جس قوم سے خدا راضی نہ ہو، کوئی مومن قانت کیسے راضی ہوسکتا ہے۔ لہذا جھوٹی باتوں سے پیغمبر اوران کے ساتھیوں کو خوش کرلینے کا خبط انہیں دماغوں سے نکال دینا چاہیے۔ اگران کے ساتھ تغافل واعراض کا معاملہ رکھا گیا ہے تو یہ اس کی دلیل نہیں کہ مسلمان ان سے خوش اور مطمئن ہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں ''جس شخص کا حال معلوم ہو کہ منافق ہے اس کی طرف تغافل روا ہے۔ لیکن دوستی اور محبت و یگانگت روا نہیں۔''

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا
گنوار بہت سخت ہیں کفر میں اور نفاق میں اور اسی لائق ہیں کہ نہ
يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ
سیکھیں وہ قاعدے جو نازل کئے اللہ نے اپنے رسول پر

دیہاتیوں کی خصلتیں:

یہاں تک مدینہ کے منافقین اور مومنین مخلصین کے احوال بیان ہوئے تھے۔ اب کچھ حال، یہاتی بدوؤں کا ذکر کرتے ہیں کہ ان میں بھی کئی طرح کے آدمی ہیں، کفار منافقین اور مخلص مسلمان چونکہ دیہاتی لوگ قدرتی طور پر عموما تندخو اور سخت مزاج ہوتے ہیں (جیسا کہ حدیث میں ہے۔ (''من سکن البادیة جفا'') اور مجالس علم وحکمت سے دور رہنے کی وجہ سے تہذیب وشائستگی کا اثر اور علم وعرفان کی روشنی بہت کم قبول کرتے ہیں، اس لئے ان کا کفر نفاق شہری کفار ومنافقین سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ ان کو ایسے مواقع دستیاب نہیں ہوتے کہ اہل علم وصلاح کی صحبت میں رہ کر دیانت وتہذیب کے وہ قانون اور قاعدے معلوم کریں جو خدا تعالیٰ نے پیغمبر علیہ السلام پر نازل کئے۔ علم ومعرفت ہی وہ چیز ہے جو انسان کے دل کو نرم کرتی اور مہذب بناتی ہے۔ جو لوگ اس قدر جہالت میں غرق ہیں، ضرور ہے کہ ان کے دل سخت ہوں اور کفر ونفاق کے جس راستہ پر پڑجائیں بہائم اور درندوں کی طرح اندھادھند بڑھے چلے جائیں۔ اعراب کی سنگدلی کا ذکر متعدد احادیث میں ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ کسی اعرابی نے حضور سے عرض کیا کہ آپ لوگ اپنے بچوں کا پیار لیتے ہیں، خدا کی قسم میں نے کبھی اپنی اولاد کا پیار نہیں لیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں کیا کروں اگر خدا نے تیرے دل میں سے اپنی رحمت کو نکال لیا ہے۔ (تفسیر عثانی)

چونکہ ان خانہ بدوشوں صحرانشینوں کا اہل علم سے اختلاط کم ہے اور قرآن وحدیث سننے کا موقع ان کو کم ملتا ہے اوران کے دلوں میں سختی اور مزاج میں وحشت وکرختگی بہت ہے اس لئے شہر میں رہنے والوں سے کفر ونفاق میں یہ آگے بڑھے ہوئے ہیں اور اللہ کے نازل کردہ ضوابط واحکام سے ناواقف رہنے کے زیادہ مستحق ہیں ما انزل اللہ سے مراد ہیں تمام فرائض واجبات سنن مباحات ممنوعات مکروہات۔ (تفسیر مظہری)

امام احمدؒ نے بالا سناد ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو صحرانشین ہووہ گویا جلاوطن ہے اور جو شکار کے پیچھے دوڑا دوڑا پھرتا ہے بڑا ہی بے سمجھ ہے اور جس نے کسی بادشاہ کی ہمنشینی اختیار کی وہ فتنہ سے دوچار ہوگیا۔ ابوداؤد اور ترمذی اور نسائی میں بھی سفیان ثوریؒ سے یہ حدیث مروی ہے۔ ترمذیؒ نے اسے حسن غریب بتایا ہے۔ ثوری سے روایت کے سوا اور کسی سے اور روایت کا ہمیں علم نہیں۔ بدویوں میں چونکہ بدمزاجی اجڈ پن اور بدتمیزی ہوتی ہے اس لئے اللہ نے ان میں سے اپنا رسول نہیں پیدا کیا۔ بعثت نبوت ہمیشہ شہری اور مہذب لوگوں میں ہوا کرتی ہے۔

جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے کہ: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى یعنی ہم نے تم سے پہلے بھی جتنے رسولوں کو انسانوں کی طرف بھیجا وہ سب شہری اور متمدن تھے۔

ایک مرتبہ ایک اعرابی نے اپنا ہدیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھیجا تو اس وقت تک اس کا دل خوش نہ ہوا جب تک کہ اس سے کئی گنا زیادہ آپ نے اس کے پاس نہ بھیج دیا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب میں نے ارادہ کرلیا ہے کہ قرشی، ثقفی، انصاری اور دوسی کے سوا اور کسی کا ہدیہ قبول نہ کروں گا۔ کیونکہ یہ لوگ متمدن شہری ہیں مکہ طائف، مدینہ اور یمن میں رہتے ہیں اخلاق میں یہ بدویوں سے، بہت اچھے ہوتے ہیں۔ کیونکہ اعرابی اجڈ بہت ہوتے ہیں۔

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿٩٧﴾
اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے

اللہ ہر طبقہ کے مطابق حکم دیتا ہے:

یعنی اس کا علم بنی آدم کے تمام طبقات پر محیط ہے وہ اپنی حکمت سے ہر ایک طبقہ کے ساتھ اس کی استعداد وقابلیت کے موافق معاملہ کرتا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ''اعراب کی طبیعت میں بے حکمی، غرض پرستی، اور جہالت شدید ہوتی ہے سو اللہ حکمت والا ہے ان سے وہ مشکل بھی نہیں چاہتا اور درجے بلند بھی نہیں دیتا۔

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا
اور بعضے گنوار ایسے ہیں کہ شمار کرتے ہیں اپنے خرچ کرنے کو
وَّيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ ۭ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ
تاوان اور انتظار کرتے ہیں تم پر زمانہ کی گردشوں کا ان ہی پر آئے

السَّوْءِ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۞

گردش بری اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے

منافق اپنی خیر منائیں:

یعنی اعراب منافقین میں وہ لوگ بھی ہیں جنہیں اگر کسی وقت خدا کے راستہ میں کچھ خرچ کرنا پڑ جاتا ہے۔ تو ایسی کراہت سے خرچ کرتے ہیں جیسے کوئی جرمانہ اور تاوان ادا کرتا ہو۔ وہ ابھی تک اس کے منتظر ہیں کہ مسلمان حوادث دہر سے کسی گردش اور آفت سے پھنس جائیں تو ہم خوب شادیانے بجائیں۔ یہ خبر نہیں کہ انہیں کی قسمت گردش میں آ رہی ہے۔ اسلام تو غالب وفائق ہو کر رہیگا اور یہ منافقین سخت ذلیل ورسوا ہونگے۔ خدا ہر ایک کی باتیں اور دعائیں سنتا ہے اور جانتا ہے کہ کون عزت وکامیابی کا اہل ہے اور کون لوگ ذلت ورسوائی کے مستحق ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ

اور بعضے گنوار وہ ہیں کہ ایمان لاتے ہیں اللہ پر اور قیامت کے

الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ

دن پر اور شمار کرتے ہیں اپنے خرچ کرنے کو نزدیک ہونا اللہ سے

وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ۭ اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ۭ

اور دعا لینی رسول کی سنتا ہے وہ ان کے حق میں نزدیکی ہے

سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ

داخل کریگا ان کو اللہ اپنی رحمت میں بیشک اللہ بخشنے

غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۞

والا مہربان ہے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا معجزہ:

یہاں قرآن کریم کی معجزانہ تاثیر اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا حیرت انگیز کرشمہ دکھلایا ہے کہ ان ہی درست مزاج، سنگدل، تندخو گنواروں میں جو کفر ونفاق اور جہل وطغیان کی وجہ سے اس لائق ہی نہ تھے کہ خدا کے بتلائے ہوئے ادب اور قاعدے سمجھ سکیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور قرآن کریم کی آواز نے ایسے عارف اور مخلص افراد پیدا کر دیئے جو مبدا ومعاد سب چیزوں پر ایمان رکھتے ہیں اور خدا کی راہ میں جو کچھ خرچ کرتے ہیں، خالص قرب الٰہی حاصل کرنے اور پیغمبر علیہ السلام کی دعا لینے کی غرض سے کرتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے ان کو بشارت دی کہ بیشک وہ اپنی امیدوں میں حق بجانب ہیں۔ یقیناً ان کو وہ چیز مل کر رہیگی جس کی نیت کی ہے (یعنی قرب الٰہی اور خدا ضرور ان کو اپنی رحمت میں جگہ دیگا۔ رہی پیغمبر علیہ السلام کی دعا اسے تو وہ اپنے کانوں سے سنتے اور آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ جب کوئی شخص صدقہ وغیرہ لے کر حاضر ہوتا ہے تو حضور اس کو دعائیں دیتے ہیں۔ حضور کی اس دعاء کا ثمرہ بھی وہ ہی رحمت الٰہی ہے جس کا وعدہ پہلے ہو چکا۔ (تفسیر عثمانی)

صحیحین میں حضرت ابن عمر کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (قبیلہ) غفار کو اللہ نے بخش دیا (یا اللہ مغفرت کرے) اور قبیلہ اسلم کو اللہ نے محفوظ رکھا (یا محفوظ رکھے) اور عصیہ نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی، حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قریش، انصار، جہینہ، مزینہ اسلم، غفار اشجع (سب) دوست اور بھائی ہیں اور ان کا دوست سوائے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی نہیں۔

ابو ہریرہ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسلم غفار اور کچھ جہینہ اور مزینہ والے اللہ کے نزدیک قیامت کے دن تمیم اور اسد بن خزیمہ اور ہوازن اور غطفان سے بہتر ہوں گے۔

ترمذی کے علاوہ باقی اہل صحاح نے خود حضرت عبداللہ بن ابی اوفی کی روایت نقل کی ہے کہ جب حضرت عبداللہ نے اپنی زکوۃ (یا خیرات) کا مال خدمت گرامی میں پیش کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی اے اللہ ابواوفی کی اولاد پر رحمت نازل فرما۔ (تفسیر مظہری)

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ

اور جو لوگ قدیم ہیں سب سے پہلے ہجرت کرنیوالے اور مدد کرنے والے

وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ

اور جو ان کے پیرو ہوئے نیکی کے ساتھ اللہ راضی ہوا ان سے

وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ

اور وہ راضی ہوئے اس سے اور تیار کر رکھے ہیں واسطے ان کے باغ

تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ

کہ بہتی ہیں نیچے ان کے نہریں رہا کریں انہی میں ہمیشہ یہی ہے

الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۞

بڑی کامیابی

درجہ بدرجہ اوّلیت رکھنے والے حضرات:

''اعراب مومنین'' کے بعد مناسب معلوم ہوا کہ زعماء واعیان مومنین کا کچھ ذکر کیا جائے۔ یعنی جن مہاجرین نے ہجرت میں سبقت واولیت کا شرف حاصل کیا، اور جن انصار نے نصرت واعانت میں پہل کی، غرض جن لوگوں نے قبول حق اور خدمت اسلام میں جس قدر آگے بڑھ بڑھ کر حصے لئے، پھر جولوگ نکوکاری اور حسن نیت سے ان پیش روان اسلام کی پیروی کرتے رہے، ان سب کو درجہ بدرجہ خدا کی خوشنودی اور حقیقی کامیابی حاصل ہو چکی۔ جیسے انہوں نے پوری خوشدلی اور انشراح قلب کے ساتھ حق تعالیٰ کے احکام تشریعی اور قضاء تکوینی کے سامنے گردنیں جھکادیں۔ اسی طرح خدا نے ان کو اپنی رضاوخوشنودی کا پروانہ دے کر غیر محدود انعام واکرام سے سرفراز فرمایا۔
تنبیہ: مفسرین سلف کے اقوال ''السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ'' کی تعیین میں مختلف ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ مہاجرین وانصار مراد ہیں، جو ہجرت سے پہلے مشرف باسلام ہوئے۔ بعض کے نزدیک وہ مراد ہیں جنہوں نے دونوں قبلوں (کعبہ وبیت المقدس) کی طرف نماز پڑھی۔ بعض کہتے ہیں کہ جنگ بدر تک کے مسلمان ''سابقین اولین'' ہیں۔ بعض حدیبیہ تک اسلام لانے والے کو اس کا مصداق قرار دیتے ہیں۔ اور بعض مفسرین کی رائے ہے کہ تمام مہاجرین وانصار اطراف کے مسلمانوں اور پیچھے آنے والی نسلوں کے اعتبار سے ''سابقین اولین'' ہیں۔ ہمارے نزدیک ان اقوال میں چنداں تعارض نہیں۔ ''سبقت'' اولیت اضافی چیزیں ہیں۔ ایک ہی شخص یا جماعت کسی کے اعتبار سے سابق اور دوسرے کی نسبت سے لاحق بن سکتی ہے جیسا کہ ہم نے ''فائدہ'' میں اشارہ کیا ہے۔ جو شخص یا جماعت جس درجہ میں سابق واول ہوگی اسی قدر رضائے الٰہی اور حقیقی کامیابی سے حصہ پائیگی۔ کیونکہ سبقت واولیت کی طرح رضاء وکامیابی کے بھی مدارج بہت سے ہو سکتے ہیں واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت خدیجہؓ اور حضرت علیؓ:

بغوی نے لکھا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی حضرت خدیجہ کا سب سے اول ایمان لانا تو مسلم الثبوت اور اجماعی قول ہے۔ آپ کے بعد کون سب سے پہلے مسلمان ہوا اس میں علماء کا اختلاف ہے حضرت جابر بن عبداللہ نے حضرت خدیجہ کے بعد حضرت علیؓ کو مومن اول فرمایا ہے اس کی تائید میں خود حضرت علیؓ کا یہ شعر پیش کیا جاتا ہے۔

سبقتكم الى الاسلام طرا غلاما مابلغت اوان حلم

(میں لڑکا ہی تھا بلوغ کی عمر کو نہیں پہنچا تھا کہ تم سب سے پہلے میں اسلام کی طرف سبقت کی)

مجاہد اور ابن اسحاق کے قول پر دس سال کی عمر میں حضرت علیؓ مسلمان ہوئے تھے بعض کے نزدیک حضرت خدیجہ کے بعد سب سے پہلے حضرت ابوبکر ایمان لائے یہ قول حضرت ابن عباس ابراہیم نخعی اور عامر شعبی کا ہے۔ اس قول کی تائید حضرت حسان کے ان اشعار سے ہوتی ہے جو حضرت ابوبکر کی مدح میں آپ نے کہے تھے اور رسول اللہ نے ان کو تسلیم کیا تھا۔

زہری اور عروہ بن زبیر کے نزدیک حضرت خدیجہ کے بعد سابق الاسلام حضرت زید بن حارثہ تھے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ اسلام لانے کے بعد حضرت ابوبکر نے اپنے اسلام کا اظہار کردیا (چھپا کر نہ رکھا) اور دوسروں کو اللہ اور رسول کی طرف آنے کی دعوت دی۔ آپ ہردلعزیز بااخلاق آدمی تھے قریش کے نسب اور حالات کو سب سے زیادہ جانتے تھے۔ تاجر تھے بڑے بااخلاق اور مخیّر، قوم کے لوگ آپ کی دانائی اور اچھی صحبت کی وجہ سے مختلف کاموں کیلئے آپ کے پاس آتے اور انسیت رکھتے تھے۔ آپ بھی اپنی قوم میں سے جس پر اعتماد رکھتے تھے اس کو اسلام کی دعوت دیتے تھے چنانچہ میری اطلاع کے بموجب حضرت عثمان حضرت زبیر بن عوام حضرت عبدالرحمٰن بن عوف حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت طلحہ بن عبیداللہ آپ ہی کی ترغیب سے ایمان لائے تھے جب یہ حضرات مسلمان ہوگئے تو آپؓ ان کو لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سب نے نماز ادا کی۔ پھر دوسرے لوگ مسلمان ہوئے یہاں تک کہ مسلمان مردوں اور عورتوں کی تعداد سات سال میں انتالیس ہوگئی پھر حضرت عمر مسلمان ہوئے۔ آپ چالیسویں مسلمان تھے۔ حضرت عمر کے مسلمان ہونے کے بعد مشرکوں نے کہا آج ہماری طاقت آدھی ہوگئی۔ سات سال کے بعد حضرت عمر کے مسلمان ہونے سے اسلام میں قوت آگئی اور اس کا پھیلاؤ ہونے لگا۔ اسی بنیاد پر حضرت علیؓ نے فرمایا تھا کہ اور لوگوں سے سات برس پہلے میں نے نمازیں پڑھیں۔

گھاٹی میں بیعت کرنے والے:

سابقین انصار سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے لیلۃ العقبہ (گھاٹی والی اول رات) میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی۔ یہ چھ سات آدمی تھے پھر (دوسرے سال) دوسری گھاٹی کے موقع پر بارہ آدمی تھے (جنہوں نے بیعت کی) اور (تیسرے سال) تیسری گھاٹی میں ستر تھے۔ (جنہوں نے بیعت کی) ان ایمان لانے والوں میں ابوزرارہ، اور مصعب بن عمیر بھی تھے ان بزرگوں نے (مدینہ پہنچ کر تبلیغ کی اور) قرآن سکھایا، ان کی کوشش سے مردوں اور عورتوں اور بچوں کی ایک بڑی تعداد مسلمان ہوگئی۔

پہلے اور دوسرے دور کے مسلمان:

ممکن ہے کہ سابقین سے مراد ہوں مقربین جن کے متعلق اللہ نے فرمایا ہے وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ (ثلۃ ایک گروہ) ثلۃ سے مراد ہیں صحابہ تابعین اور تبع تابعین امت اسلامیہ میں تقدم انہی کو حاصل ہے، اسکے بعد قَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ فرمایا یعنی ایک ہزار برس کے بعد جو تھوڑے آدمی کمالات نبوت کے حامل ہوں گے ابتدائی دور میں تو کمالات نبوت کے حاملین کی تعداد بہت زیادہ تھی لیکن پچھلے دور میں یعنی ہزار برس کے بعد باکمال لوگوں کی تعداد بہت کم ہوگئی۔ حضرت مجدد الف ثانی نے فرمایا، تمام صحابہ اکثر تابعین اور تھوڑے تبع تابعین کمالات نبوت کے حامل تھے۔ میں کہتا ہوں اس صورت میں من المہاجرین والانصار میں من تبعیضہ نہ ہوگا بلکہ بیانیہ ہوگا اور یہ السابقین الاولین کا بیان ہوگا۔ اور الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ سے مراد سابقین آخرین اور اصحاب الیمین ہیں جن کو ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ فرمایا ہے وہ پہلے قرن سے شروع ہوکر ہزار برس پر ختم ہوجائیں گے اور ثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ سے مراد وہ ارباب کمال ہیں جو ہزار برس کے بعد آئے اور جن کی انتہا روز قیامت پر ہوگی۔ عطاء نے کہا الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ سے وہ لوگ مراد ہیں جو صحابہ کے ذکر کے وقت ان کے لئے دعاء رحمت کرتے ہیں۔

تمام صحابہ جنتی ہیں:

ابوصخر حمید بن زیاد کا بیان ہے میں محمد بن کعب قرظی کے پاس گیا اور دریافت کیا صحابہ کے متعلق آپ کا خیال ہے فرمایا تمام صحابہ جنتی ہیں، اچھے نیکوکار ہوں، یا برے (گناہ گار) میں نے کہا، آپ یہ کہاں سے کہتے ہیں، فرمایا کلام مجید میں آیا ہے۔ وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ (اس میں کوئی شرط نہیں کہ نیک ہوں یا برے) سب کے متعلق فرمایا رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔ اس کے بعد فرمایا وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ۔ اس میں تابعین کے لئے شرط لگادی کہ بھلائیوں میں صحابہ کے تابع ہوں برائیوں میں تابع نہ ہوں۔ ابوصخر نے کہا یہ آیت سن کر مجھے محسوس ہوا کہ گویا یہ آیت میں نے پہلے پڑھی ہی نہ تھی نہ اس کی تفسیر کا مجھے علم تھا محمد بن کعب کے پڑھنے سے مجھے معلوم ہوا کہ یہ بھی قرآن کی آیت ہے۔

میں کہتا ہوں تمام صحابہ کے جنتی ہونے کی دلیل میں اگر ذیل کی آیت پیش کی جائے تو زیادہ مناسب ہے فرمایا ہے

لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى

جن لوگوں نے فتح مکہ سے پہلے اپنا مال راہ خدا میں صرف کیا اور جہاد کیا ان کے برابر وہ لوگ نہیں ہیں جنہوں نے اپنا مال راہ خدا میں فتح مکہ کے بعد صرف کیا اور جہاد کیا اول گروہ دوسرے گروہ سے اونچا درجہ رکھتا ہے (لیکن) اللہ نے بھلائی یعنی جنت کا وعدہ دونوں گروہوں سے کرلیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ (آپس میں فرق مراتب کے باوجود) تمام صحابہ جنتی ہیں۔ اللہ نے سب سے جنت کا وعدہ کرلیا ہے۔

صحابہ کرام کی برتری:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے صحابہ کو برا نہ کہو قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر تم میں سے کوئی (کوہ) احد کے برابر سونا راہ خدا میں خرچ کرے گا تو وہ (ثواب میں) صحابہ کے ایک سیر بلکہ آدھے سیر (غلہ کھجور وغیرہ) کے برابر نہ ہوگا۔ متفق علیہ من حدیث ابی سعید الخدری۔ (مظہری)

ترمذی نے حضرت جابر کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اس مسلمان کو آگ نہیں چھوئے گی جس نے مجھے دیکھا یا میرے دیکھنے والے کو (ایمان کی نظر سے) دیکھا۔

ترمذی نے حضرت بریدہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے صحابہ میں سے جب کوئی شخص کسی سرزمین (گاؤں، قصبہ، شہر وغیرہ) میں مرجائے گا تو قیامت کے دن وہ اس زمین کے رہنے والوں کے لئے پیشوا اور نور بنا کر اٹھایا جائے گا۔ رزین نے حضرت عمر بن خطاب کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے صحابہ ستاروں کی طرح ہیں، جس کی پیروی کروگے ہدایت یاب ہوگے۔

ہجرت اور نصرت میں اوّل لوگ:

امام فخرالدین رازی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ اس جگہ سابقین اولین سے وہ لوگ مراد ہیں جو ہجرت اور نصرت میں سابق اور اول ہیں کیونکہ سابقین اولین کا لفظ مجمل ہے جس میں یہ نہیں فرمایا کہ کس چیز میں سابق اور اول ہیں پھر ان کو مہاجرین اور انصار کے ساتھ موصوف فرمایا معلوم ہوا کہ صفت ہجرت اور صفت نصرت میں سبقت اور اولیت مراد ہے۔

اہلسنت والجماعت:

اور وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ سے وہ لوگ مراد ہیں جو سابقین اولین کے بعد آئے اور ان کے نقش قدم پر چلے خواہ وہ صحابہ ہوں یا تابعین ہوں یا تبع تابعین یا ان سے بھی بعد۔ غرض یہ کہ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ سے تمام وہ لوگ مراد ہیں جو مہاجرین اور انصار کی پیروی کریں۔ خواہ وہ کسی زمانے میں ہوں۔ وہ سب جنت کے مستحق ہیں اور خدا ان سے خوش اور وہ خدا سے خوش پس یہ آیت قیامت تک جملہ مسلمانوں کو شامل ہے جو صحابہ کے طریقہ پر ہوں اور اقوال وافعال میں ان کے پیرو ہوں بغیر صحابہ کے اتباع اور پیروی کے خدا

کی رضا اور جنت نہیں مل سکتی اور اہل سنت والجماعت کا یہی طریقہ ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی سنت اور جماعت صحابہ کرام کے طریقہ پر چلتے ہیں، اس لئے ان کو اہل سنت والجماعت کہا جاتا ہے۔

آیت کا خلاصہ:

اس آیت سے صحابہ کا مومن کامل ہونا معلوم ہوا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کافر اور منافق سے راضی نہیں ہوتا۔ کما قال تعالیٰ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الکافرین. اِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ معلوم ہوا کہ صحابہ کرام نہ کافر تھے اور نہ فاسق۔ الغرض اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مہاجرین اور انصار کی مدح فرمائی اور انہیں جنت کی خوشخبری دی اور ان کو اپنی خوشنودی کا پروانہ عطا کیا کہ اللہ ان سے راضی ہوا۔ یہ وہ عظیم فائز المرامی ہے کہ اس کے بعد کامیابی کا کوئی درجہ باقی نہیں رہتا۔

فرقہ امامیہ کی تردید:

اس آیت نے منکرین صحابہ کے لئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔ اس آیت نے تمام مہاجرین اور انصار کا ایمان ثابت کر کے فرقہ امامیہ کے عقیدہ کو خاک میں ملا دیا ہے۔ اس لئے کہ آیت میں جس قدر وعدے ہیں وہ سبقت ہجرت پر اور نصرت پر موقوف ہیں ایمان اور اعمال صالحہ کا ذکر نہیں۔

اس آیت میں حق جل شانہ نے صحابہ کرام کیلئے بلا کسی شرط کے اپنی رضا اور مغفرت اور جنت کا وعدہ فرمایا بخلاف تابعین کے یعنی بعد میں آنے والوں کے لئے یہ قید لگادی کہ بشرطیکہ وہ مہاجرین اور انصار کا اتباع کریں اور اعمال اور افعال میں ان کے طریقہ پر چلیں۔ (ازالۃ الخفاء) (معارف کاندھلویؒ)

صحابہ کے باہمی اختلافات میں احتیاط ضروری ہے:

تنبیہ: جو لوگ صحابہ کرام کے باہمی مشاجرات اور ان میں پیش آنے والے واقعات کی بناء پر بعض صحابہ کرام کے متعلق ایسی تنقیدات کرتے ہیں۔ جن کو پڑھنے والوں کے قلوب ان کی طرف سے بدگمانی میں مبتلا ہو سکیں، وہ اپنے آپ کو ایک خطرناک راستہ پر ڈال رہے ہیں، نعوذ باللہ منہ (معارف مفتی اعظم)

وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۛ
اور بعضے تمہارے گرد کے گنوار منافق ہیں
وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ۛ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ ۟
اور بعضے لوگ مدینے والے اڑ رہے ہیں نفاق پر تو ان کو
لَا تَعْلَمُهُمْ ؕ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ؕ
نہیں جانتا ہم کو وہ معلوم ہیں

مدینہ اور ارد گرد کے منافقین:

پہلے سے دیہاتی عربوں کا ذکر چلا آرہا تھا۔ درمیان میں اعراب مومنین کے تذکرہ سے مہاجرین وانصار کی طرف کلام منتقل ہو گیا۔ اب اس آیت میں خاص "مدینہ" اور اس کے آس پاس رہنے والوں کا بیان ہے یعنی بعض اہل مدینہ اور گرد و پیش کے رہنے والے نفاق کے خوگر ہو چکے اور اسی پر اڑے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ نفاق اس قدر عریق وعمیق ہے کہ ان کے قرب مکانی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کمال فطانت وفراست کے باوجود آپ بھی بالتعیین اور قطعی طور پر محض علامات وقرائن سے ان کے نفاق پر مطلع نہیں ہو سکے ان کا ٹھیک ٹھیک تعین صرف خدا کے علم میں ہے۔ جس طرح عام منافقین کا پتہ چہرہ لب ولہجہ اور بات چیت سے لگ جاتا تھا۔ (وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ؕ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ) ان کا نفاق اتنا گہرا ہے کہ اس قسم کی ظاہری علامات ان کا پردہ فاش نہیں کرتیں۔

سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى
ان کو ہم عذاب دینگے ۲ دو بار پھر وہ لوٹائے جائینگے
عَذَابٍ عَظِيْمٍ ۚ ۝۱۰۱
بڑے عذاب کی طرف

منافقین کو دوگناہ عذاب:

بڑا عذاب دوزخ کا ہے۔ ان المنافقین فی الدرک الاسفل من النار (نساء۔ رکوع ۲۱) اس سے قبل کم از کم دو بار ضرور عذاب میں مبتلا کئے جائینگے۔ ایک عذاب قبر دوسرا وہ عذاب جو اسی دنیوی زندگی میں پہنچ کر رہیگا۔ مثلاً ابن عباس کی ایک روایت کے موافق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کے روز منبر پر کھڑے ہو کر تقریباً چھتیس آدمیوں کو نام بنام پکار کر فرمایا۔ "اخرج فانک منافق۔" یعنی تو منافق ہے مسجد سے نکل جا۔ یہ رسوائی ایک قسم عذاب کی تھی۔ یا پہلے اسی سورت میں گذرا کہ ان کے اموال واولاد کو حق تعالیٰ نے ان کے حق میں عذاب بنا دیا۔

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا الخ)

یا ان میں کے بعض بھوک وغیرہ آفات ارضی وسماوی میں مبتلا ہو کر ذلت کی موت مرے یا اسلام کی ترقی وعروج کو دیکھ کر غیظ کھانا اور دانت پیسنا یہ بھی ان کے حق میں سوہان روح تھا۔ میرے نزدیک یہ سب قسم کے عذاب "مرتین" کے احاطہ میں داخل ہیں۔ اور دو کا عدد یا تو مطلق تعدد کے لئے ہے۔ جیسے "ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ" میں۔ اور یا دو بار سے مراد نوعی اثنینیت ہے

یعنی ''عذاب قبر'' اور ''عذاب قبل الموت''۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانی)

نام لے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقوں کو نکال دیا

کلبی اور سدی نے کہا (ایک روز) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دینے کھڑے ہوئے اور (الگ الگ نام لے لے کر مختلف لوگوں کو خطاب کرکے) فرمایا اے فلاں شخص نکل جا تو قطعا منافق ہے اے فلاں شخص تو بھی نکل جا تو بھی بلاشبہ منافق ہے اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف لوگوں کو مسجد سے نکال دیا اور ان کو رسوا کردیا۔ یہ رسوائی اور مجلس نبوی سے نکالا جانا پہلا عذاب ہوا اور دوسرے عذاب سے مراد ہے عذاب قبر۔

ان تمام اقوال کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلا عذاب دنیوی مراد ہے جس کی شکل کوئی ہو اور دوسرا عذاب قبر کا مراد ہے۔ (تفسیر مظہری)

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا

اور بعضے لوگ ہیں کہ اقرار کیا انہوں نے اپنے

عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ۭ عَسَى اللّٰهُ

گناہوں کا ملایا انہوں نے ایک کام نیک اور دوسرا بد قریب ہے کہ اللہ

اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۰۲﴾

معاف کرے ان کو بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے

مسلمان جنہوں نے سچی توبہ کر لی:

اہل مدینہ میں اگر ایک طرف یہ منافقین متمردین ہیں جو اپنی شرارتوں اور جرموں کو پردہ نفاق میں چھپاتے اور ان پر سختی سے اڑے رہتے ہیں تو دوسری جانب بعض وہ مسلمان ہیں جن سے بمقتضائے بشریت کوئی خطا و قصور سرزد ہو جائے تو نادم ہوکر بے تامل اپنے گناہوں کا اقرار کرتے ہیں۔ ان کی بھلائی اور برائی مخلوط (رلی ملی) ہے۔ برائی تو مثلا یہی کہ نفیر عام کے باوجود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر ''غزوہ تبوک'' میں حاضر نہ ہوئے۔ بعدہ اس غیر حاضری پر دل سے پشیمان ومتاسف ہونا اور ظاہراً و باطنا توبہ کرنا اور دوسری اعمال صالحہ (نماز، روزہ، زکوۃ، حج یا دوسرے غزوات کی شرکت وغیرہ) بجالانا یہ سب ان کی بھلائیوں کی فہرست میں داخل ہیں۔ ایسے حضرات کو حق تعالی نے معافی کی امید دلائی ہے۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ آیت حضرت ابولبابہ اور ان کے چند ہمراہیوں کے حق میں نازل ہوئی۔ جو محض کسل اور تن آسانی کی وجہ سے ''تبوک'' میں حاضر نہ ہوئے۔ لیکن جب تبوک سے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی واپسی معلوم ہوئی تو غایت ندامت سے ان سب نے اپنے کو مسجد کے ستونوں سے باندھ لیا اور قسم کھائی کہ جب تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ان مجرموں اور قیدیوں کو معاف کرکے اپنے ہاتھ سے نہ کھولیں گے، اسی طرح بندھے کھڑے رہینگے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حال دیکھ کر فرمایا واللہ جب تک خدا ان کے کھولنے کا حکم نہ دے میں ان کو نہیں کھول سکتا۔ آخر یہ آیات نازل ہوئیں۔ تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھولا اور قبول توبہ کی بشارت دی۔ کہتے ہیں کہ یہ لوگ کھلنے کے بعد تکمیل توبہ کے طور پر کچھ مال لے کر حاضر ہوئے کہ خدا کی راہ میں تصدق کریں، اس پر اگلی آیت نازل ہوئی۔ (تفسیر عثمانی)

سعید بن مسیبؒ کی روایت میں ہے کہ جب ابولبابہ کو کھولنے کا ارادہ کیا گیا تو انہوں نے انکار کیا، اور کہا کہ جب تک خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم راضی ہوکر مجھے اپنے ہاتھ سے نہ کھولیں گے میں بندھا رہوں گا، چنانچہ صبح کی نماز میں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو دست مبارک سے ان کو کھولا۔ (معارف القرآن مفتی اعظم)

غزوۂ تبوک میں پیچھے رہ جانے والے حضرت ابولبابہ اور ساتھیوں کی پشیمانی

ابن مردویہ اور ابن ابی حاتم نے بروایت عوفی حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ایک) جہاد پر تشریف لے گئے مگر ابولبابہ اور ان کے ساتھ پانچ دوسرے آدمی پیچھے رہ گئے (جہاد پر نہ جاسکے) پھر ابولبابہ نے اور پانچ میں سے دو آدمیوں نے غور کیا۔ پشیمان ہوئے اور ان لوگوں کو اپنی تباہی (یعنی دین کی بربادی) کا یقین ہوگیا۔ کہنے لگے ہم تو (ٹھنڈے) سایہ میں عورتوں کے ساتھ چین کریں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب (دوسرے) مسلمان جہاد میں شریک ہوں (یہ بڑا گناہ ہے) خدا کی قسم ہم ستونوں سے خود اپنے کو باندھ دیں گے اور اس وقت تک نہ کھولیں گے جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود نہ کھولیں۔ چنانچہ ان لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ تین آدمی رہ گئے جنہوں نے اپنے آپ کو نہیں بندھوایا تھا۔ (الحدیث)

ابن جریر ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ اور بیہقی نے دلائل میں حضرت ابن عباس کی روایت سے نیز بیہقی نے اس آیت کے ذیل میں سعید بن مسیّب کے حوالہ سے بیان کیا ہے، حضرت ابن عباس نے فرمایا، یہ لوگ دس تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب ہوکر غزوہ تبوک پر نہیں گئے تھے انہیں میں سے ابولبابہ بھی تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لے آئے تو ان میں سے سات آدمیوں نے مسجد کے ستونوں سے خود اپنے کو بندھوادیا۔ مسجد سے واپسی کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گذرگاہ اسی

طرف تھی۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیکھا تو فرمایا یہ خود بندھے ہوئے لوگ کون ہیں۔ صحابہ نے عرض کیا یہ ابولبابہ اور ان کے ساتھی ہیں جو آپ کے ساتھ نہیں گئے تھے۔ اس لئے انہوں نے اللہ سے عہد کر رکھا ہے کہ جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے راضی نہ ہو جائینگے اور اپنے دست خاص سے ان کو نہ کھولیں گے یہ خود کھلنے پر تیار نہ ہوں گے انہوں نے اپنے قصور کا اعتراف بھی کرلیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میں بھی اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ ان کو خود نہیں کھولونگا اور ان کا عذر نہیں قبول کروں گا تاوقتیکہ اللہ ہی ان کو نہ کھولے یہ مجھ سے منحرف ہو کر مسلمانوں کے ساتھ مل کر جہاد پر نہیں گئے۔ ان حضرات کو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان پہنچا تو بولے ہم بھی اپنے کو نہیں کھولیں گے تاوقتیکہ اللہ ہی نہ کھولے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی (اس آیت میں لفظ عسی آیا ہے جس کا معنی ہے امید۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے قطعی حکم ان کی توبہ قبول کرنے کا نہیں دیا تھا۔ صرف امید کا اظہار فرمایا ہے، لیکن) اللہ کی طرف سے امید کا اظہار چونکہ وجوب پر دلالت کرتا ہے اس لئے اس جگہ عسی کا معنی وجوب کا ہے اسی بناء پر اس آیت کا نزول کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توبہ قبول ہونے کی خبر ان لوگوں کے پاس بھیج دی اور ان کا عذر قبول فرمالیا اور ان کو رہا کرادیا۔ (تفسیر مظہری)

امید دلانے والی آیت:

ابوعثمانؒ نے فرمایا کہ قرآن کریم کی یہ آیت اس امت کے لئے بڑی امید دلانے والی ہے اور صحیح بخاری میں بروایت سمرہ بن جندبؓ معراج نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک تفصیلی حدیث میں ہے کہ ساتویں آسمان پر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ہوئی تو ان کے پاس کچھ لوگ دیکھے جن کے چہرے سفید تھے، اور کچھ ایسے کہ ان کے چہروں میں کچھ داغ دھبے تھے یہ دوسری قسم کے لوگ ایک نہر میں داخل ہوئے اور غسل کر کے واپس آئے تو ان کے چہرے بھی بالکل صاف سفید ہوگئے تھے جبرئیل علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلایا کہ یہ سفید چہرے والے وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور پھر گناہوں سے پاک صاف رہے، الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اور دوسرے وہ لوگ ہیں جنہوں نے ملے جلے اچھے برے سب طرح کے کام کئے پھر توبہ کرلی، اللہ نے ان کی توبہ قبول فرمالی اور گناہ معاف ہوگئے۔ (قرطبی) (معارف القرآن)

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً
لے ان کے مال میں سے زکوٰۃ

''صدقہ'' کا ترجمہ مترجم محققؒ نے ''زکوٰۃ'' کیا ہے۔ لیکن اگر لفظ ''صدقہ'' کو عام رکھا جاتا جو زکوٰۃ و صدقات نافلہ سب کو شامل ہوتو بہتر تھا۔ کیونکہ اکثر روایات کے موافق یہ آیت اور ان ہی لوگوں کے حق میں نازل ہوئی ہے جو بعد میں معافی تکمیل توبہ کے طور پر صدقہ لے کر حاضر ہوئے تھے۔ جیسا کہ ابھی پچھلے فائدہ میں نقل کیا جاچکا ہے۔ ہاں عموم الفاظ کو دیکھتے ہوئے حکم کو مورد نص پر مقصود رکھنے کی ضرورت نہیں اسی لئے سلف رضی اللہ عنہم مسئلہ زکوٰۃ میں بھی اس آیت کو پیش کرتے رہے ہیں۔

تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ
کہ پاک کرے تو ان کو اور بابرکت کرے تو ان کو اس کی وجہ سے
اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ
اور دعا دے ان کو بیشک تیری دعا ان کیلئے تسکین ہے اور اللہ سب کچھ سنتا
عَلِيْمٌ ﴿۱۰۳﴾
جانتا ہے

صدقہ کی اہمیت:

توبہ سے گناہ معاف ہوجاتا ہے یعنی اس پر مواخذہ باقی نہیں رہتا۔ لیکن ایک قسم کی روحانی کدورت وظلمت وغیرہ جو گناہ کا طبعی اثر ہے وہ ممکن ہے باقی رہ جاتی ہو جو بالخصوص صدقہ اور عموماً حسنات کی مباشرت سے زائل ہوتی ہے۔ بایں لحاظ کہہ سکتے ہیں کہ صدقہ گناہوں کے اثرات سے پاک وصاف کرتا اور اموال کی برکت بڑھاتا ہے (''زکوٰۃ'' کے لغوی معنی نماء یعنی بڑھنے کے ہیں) اور ایک بڑا فائدہ صدقہ کرنے میں یہ تھا کہ صدقہ کرنے والوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم دعائیں دیتے تھے۔ جن سے دینے والے کا دل بڑھتا اور سکون حاصل کرتا تھا۔ بلکہ آپ کی دعاء کی برکت دینے والے کی اولاد در اولاد تک پہنچتی تھی۔ اب بھی ائمہ کے نزدیک مشروع ہے کہ جو شخص صدقہ لائے امام مسلمین بحیثیت وارث نبی ہونے کے اس کیلئے دعا کرے۔ البتہ جمہور کے نزدیک لفظ ''صلوٰۃ'' کا استعمال نہ کرے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مخصوص حق تھا۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت ابولبابہ کی توبہ کی قبولیت:

ابن مردویہ نے واقدی کے سلسلہ والی سند سے حضرت ام سلمہ کا بیان نقل کیا ہے کہ ابولبابہ کی توبہ (قبول ہونے) کی آیت میرے گھر میں اتری تھی۔ سحر کے وقت میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہنستے سنا عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہنسی کی کیا وجہ ہے۔ فرمایا ابولبابہ کی توبہ قبول ہوگئی۔ میں نے عرض کیا کیا میں ان کو اس کی اطلاع دے دوں فرمایا تمہاری مرضی میں

نے حجرہ کے دروازہ پر کھڑے ہو کر آواز دی ابولبابہ تم کو بشارت ہو اللہ نے تمہاری توبہ قبول فرمالی یہ پردہ کا حکم نازل ہونے سے پہلے کا واقعہ ہے آواز سنتے ہی لوگ ابولبابہ کو کھولنے کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے ابولبابہ نے کہا (ابھی نہیں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئیں وہ ہی مجھے کھولیں گے۔ صبح کو جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے برآمد ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جا کر کھولا اور آیت وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا الخ نازل ہوئی۔

حضرت ام سلمہ کی اس حدیث سے ثابت ہو رہا ہے کہ جس قصور کی معافی نازل ہوئی تھی وہ وہی قصور تھا جو بنی قریظہ کے متعلق حضرت ابولبابہ سے صادر ہو گیا تھا کیونکہ تبوک کا جہاد تو پردہ کی آیت نازل ہونے کے بعد ہوا تھا۔ لہذا اولیٰ یہ ہے کہ ستون سے بندش کا واقعہ دونوں قصوں کے نتیجہ میں قرار دیا جائے کیوں کہ روایتیں دونوں صحیح ہیں۔

وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اوران کے لئے دعائے مغفرت کرو۔ بغوی نے لکھا ہے کہ صدقہ کا مال لیتے وقت کیا امام پر واجب ہے کہ دینے والے کے لئے دعا کرے۔ بعض علماء کے نزدیک واجب ہے، بعض کے نزدیک مستحب۔ بعض کے نزدیک واجب زکوۃ وصول کرتے وقت تو دعا دینی واجب ہے اور نفل صدقہ کے وصول کرتے وقت مستحب۔ بعض کا قول ہے کہ امام پر واجب ہے مگر فقیر اگر مالدار سے لے تو دینے والے کو دعا دینی مستحب ہے۔

بخاری کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن ابی اوفی نے فرمایا (حضرت ابواوفی ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے حدیبیہ کے موقع پر درخت کے نیچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر (تجدید) بیعت کی تھی۔) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جب لوگ صدقہ کا مال پیش کرتے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم (دعا دیتے اور) فرماتے اے اللہ ان پر رحمت نازل فرما۔ چنانچہ میرے باپ نے بھی جب اپنے صدقہ کا مال پیش کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے اللہ آل ابی اوفی پر رحمت نازل فرما۔

حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ ایک عورت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ میرے شوہر کیلئے صلوۃ کر دیجئے یعنی دعائے مغفرت فرما دیجئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کر دی۔ اخرجہ احمد

ابوداؤد اور نسائی نے حضرت قیس بن سعد کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے اللہ اپنی صلوۃ اور رحمت سعد بن عبادہ کی آل پر کر دے۔ اس روایت کی سند عمدہ ہے۔

حضرت ابوہریرہ کی مرفوع روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ملائکہ مومن کی روح سے کہتے ہیں تجھ پر اور تیرے بدن پر اللہ کی رحمت ہو۔

امام ابوحنیفہ اور ایک جماعت علماء کا قول ہے کہ انبیاء کے علاوہ دوسروں کے لئے لفظ صلوٰۃ کا استعمال مستقل طور پر (یعنی تنہا غیر انبیاء کیلئے) درست نہیں ذیلی طور پر (یعنی انبیاء کے بعد اگر دوسروں کا ذکر آیا ہو تو بالتبع) درست ہے کیونکہ اہل شریعت کی اصطلاح میں انبیاء خصوصاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کے اظہار کے لئے لفظ صلوۃ خاص کر لیا گیا ہے۔ لہذا انبیاء کے علاوہ دوسروں کے لئے اس کا استعمال جائز نہیں۔ اللہ نے فرمایا: لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا اسی بناء پر حضرت ابن عباس نے فرمایا کسی کی طرف سے سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی اور پر صلوۃ بھیجنا (یعنی لفظ صلوۃ سے دعا کرنا) مناسب نہیں۔ رواہ ابن ابی شیبہ من طریق عثمان بن حکیم عکرمۃ وہذا اسند صحیح۔

اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ بیشک تمہاری دعا ان کیلئے رحمت ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے سکن کا ترجمہ درست کیا ہے ابوعبیدہ نے سکون خاطر اور طمانیت قلب ترجمہ کیا ہے یعنی تمہاری دعا ان کے سکون خاطر اور دل کے ٹھیراؤ کا ذریعہ ہے ان کو اطمینان ہو جائے گا کہ اللہ نے ان کی توبہ قبول کر لی۔

میں کہتا ہوں پاک باطن اور صاف قلب رکھنے والوں سے اگر کوئی گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو گناہ کی ظلمت ان کے دل پر چھا جاتی ہے اور اندر کچھ تاریکی محسوس ہونے لگتی ہے۔ لیکن جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لئے دعائے مغفرت کر دیتے ہیں اور اللہ ان کو معاف کر دیتا ہے تو دل کی تاریکی اور گھٹن دور ہو جاتی ہے یا دل کے اندر گناہ کی تاریکی اور گھٹن ایسی ہوتی ہے جیسے معدہ سے بخارات چڑھنے اور اطراف قلب میں جمع ہو کر دل پر دباؤ ڈالنے سے خفقان پیدا ہو جاتا ہے اور جب بخارات کا دباؤ معدہ کی اصلاح سے ختم ہو جاتا ہے تو خفقان جاتا رہتا ہے یہی حالت گناہ سے پیدا ہونے والی تاریکی کی وجہ سے دل کی بے چینی کی ہوتی ہے اور مغفرت کی وجہ سے اس کا زوال ہو کر سکون واطمینان پیدا ہو جاتا ہے۔ سچ فرمایا ہے کہ اللہ کی یاد سے دلوں کو سکون ہو جاتا ہے۔ (تفسیر مظہری)

امام احمدؒ کہتے ہیں کہ وکیع نے بالاسناد روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی کیلئے دعا فرماتے تھے تو وہ اس کے اور اس کے بیٹوں اور پوتوں کے حق میں قبول ہو جاتی تھی۔

اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ

کیا وہ جان نہیں چکے کہ اللہ آپ قبول کرتا ہے توبہ

عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ

اپنے بندوں سے اور لیتا ہے زکوتیں اور یہ کہ اللہ ہی

التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۴﴾

توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے

قبولیت فقط اللہ کے اختیار میں ہے:

یعنی توبہ اور صدقات کا قبول کرنا صرف خدا کے اختیار میں ہے کیونکہ وہ ہی جانتا ہے کہ کس نے اخلاص قلب اور شرائط قبول کی رعایت کے ساتھ توبہ کی یا صدقہ دیا۔ چنانچہ پہلے بعضوں پر عتاب ہو چکا کہ ہمیشہ کیلئے ان کی زکوۃ لینی موقوف ہوئی اور منافقین کے صدقات کو مردود ٹھہرایا گیا اور ان کے حق میں دعاء واستغفار کو بھی بے سود بتلایا۔ بلکہ جنازہ پڑھنے کی ممانعت کر دی۔ جن لوگوں کا یہاں ذکر ہے ان کی توبہ قبول کی اور صدقات قبول کرنے کا حکم دیا اور یہ بھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے حق میں (حیاو میتا) دعا کریں۔ (تفسیر عثمانی)

پاک کمائی کا صدقہ:

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے جو بندہ پاک کمائی سے خیرات کرتا ہے اور اللہ صرف پاک (کمائی کی خیرات) کو ہی قبول فرماتا ہے اور آسمان کی طرف پاک (کلام۔عمل خیرات) کو ہی عروج نصیب ہوتا ہے تو وہ گویا اس خیرات کو اللہ کے ہاتھ میں رکھتا ہے اللہ اپنے ہاتھ میں اس کو (اس طرح) بڑھاتا ہے جس طرح تم اپنے بچے کو (اس کی پشت پر ہاتھ پھیر کر) پرورش کرتے ہو یہاں تک کہ ایک لقمہ قیامت کے دن بڑے پہاڑ کی برابر ہو کر سامنے آئے گا۔ یہ فرمانے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ تلاوت فرمائی۔ رواہ الشافعی۔

صحیحین کی روایت بھی اسی روایت کی ہم معنی ہے اس میں اتنا اور ہے کہ جو شخص پاک کمائی سے ایک چھوارے برابر خیرات کرتا ہے اور اللہ پاک ہی قبول کرتا ہے تو اللہ اپنے دائیں ہاتھ سے اس کو قبول فرمالیتا ہے الخ۔ (تفسیر مظہری)

توبہ کا عجیب واقعہ:

ابن عساکرؒ نے اپنی تاریخ بہ ضمن تاریخ عبداللہ بن الشاعر السکسکی (دمشقی تھے لیکن اصل وطن حمص تھا اور فقہاء میں سے تھے) بیان کیا ہے کہ معاویہؓ کے زمانہ میں لوگوں نے جہاد کیا جن کے سردار عبدالرحمٰن بن خالد بن ولیدؓ تھے۔ تو ایک مسلمان نے مال غنیمت میں سے سو دینار رومی غبن کر لئے اور جب لشکر واپس ہو گیا اور لوگ گھروں کو چلے گئے تو اس کو ندامت نے آگھیرا۔ اس نے یہ دینار اب امیر لشکر کے پاس پہنچائے، اس نے ان کے لینے سے انکار کر دیا کہ وہ سب لوگ تو اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے جن میں یہ تقسیم کیا جا سکتا تھا۔ اب میں تو اس کو لے نہیں سکتا اب تم قیامت کے روز اس کو خدا کے سامنے پیش کر دینا۔ اب یہ آدمی صحابہؓ میں سے ہر ایک سے پوچھتا رہا لیکن سب یہی کہتے رہے۔ پھر وہ دمشق آیا اور معاویہؓ کو قبول کرنے کیلئے کہا لیکن وہ بھی انکار کر گئے۔ وہ وہاں سے اپنی حالت پر روتا ہوا نکلا اور عبداللہ بن الشاعر السکسکی کے پاس سے گزرا۔ اس نے پوچھا، کیوں روتا ہے؟ اس نے سارا واقعہ کہہ سنایا کہ کوئی امیر بھی ان کو نہیں لیتا، تو عبداللہ نے کہا کیا تم میری بات سنو گے اس نے کہا ضرور۔ تو کہا تم معاویہؓ کے پاس جاؤ اور کہو کہ پانچواں حصہ جو بیت المال کا حق ہے لے لو۔ چنانچہ بیس دینار ان کے حوالے کر دو اور باقی اسی دینار ان لشکریوں کی طرف سے خیرات کر دو جو ان کے حقدار ہو سکتے تھے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ ان کے ناموں اور مقامات وغیرہ سے بھی واقف ہے وہ انہیں اس کا ثواب پہنچا دے گا۔ تو اس آدمی نے ایسا ہی کیا۔ تو معاویہؓ نے کہا کہ اگر میں نے اس کو ایسا فتویٰ دیا ہوتا تو مجھے یہ بات اپنی تمام مملکت سے زیادہ محبوب تھی۔ اس نے بہت اچھی تدبیر بتائی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ

اور کہہ کہ عمل کئے جاؤ پھر آگے دیکھ لے گا اللہ تمہارے کام کو اور اس کا رسول

وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ

اور مسلمان اور تم جلد لوٹائے جاؤ گے اس کے پاس جو تمام چھپی اور کھلی

الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۱۰۵

چیزوں سے واقف ہے، پھر وہ جتادے گا تم کو جو کچھ تم کرتے تھے

توبہ کے بعد بھی عمل درست رکھو:

یعنی توبہ وغیرہ سے گذشتہ تقصیرات معاف ہو گئیں۔ لیکن آگے دیکھا جائے گا کہ تم کہاں تک صدق واستقامت کا عملی ثبوت پیش کرتے ہو۔ اس جہاد میں قصور ہوا تو آئندہ اور جہاد ہونگے۔ پیغمبر علیہ السلام کے یا خلفاء کے روبرو ان میں امتحان ہوگا کہ کیسا عمل کرتے ہو۔ پھر خدا کے یہاں جا کر ہر عمل کا پورا بدلہ مل جائیگا کیونکہ وہ ہی تمام کھلی چھپی چیزوں اور ظاہری عمل اور باطنی نیتوں پر مطلع ہے ہر ایک کے ساتھ اس کی واقعی حالت کے موافق معاملہ کریگا (آیت کی یہ تقریر حضرت شاہ صاحبؒ کے مذاق پر کی گئی ہے کیونکہ اوفق بالسیاق ہے واللہ اعلم)۔ (تفسیر عثمانی)

مُردوں پر اعمال کا پیش ہونا:

اور حدیث میں وارد ہے کہ زندوں کے اعمال ان اموات پر پیش کئے جاتے ہیں جو ان کے عزیز واقارب ہیں یا ان کے قبائل ہیں اور جو اس وقت عالم برزخ میں ہیں۔ جیسا کہ ابوداؤد الطیالسی نے کہا ہے۔

صلت بن دینار نے حدیث بیان کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے اعمال تمہارے مردہ اقرباء اور عشائر پر ان کی قبروں میں پیش کئے

جاتے ہیں۔ اگر اعمال خیر ہوتے ہیں تو وہ خوش ہو جاتے ہیں اور اگر بد ہوں تو دعا کرتے ہیں کہ اے خدا تو اپنی طاعت کی انہیں توفیق عطا فرما۔

امام احمدؒ کہتے ہیں کہ عبدالرزاق نے ہمیں خبر دی کہ سفیان نے ایک شخص کو کہتے سنا کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ تمہارے اعمال تمہارے مردہ اقارب وعشائر پر پیش کئے جاتے ہیں اگر وہ اچھے عمل ہوں تو وہ مردے خوش ہو جاتے ہیں، اور اچھے نہ ہوں تو کہتے ہیں کہ اے اللہ! تو انہیں موت نہ دے جب تک تو انہیں بھی ایسی ہدایت نہ دے جیسی تو نے ہمیں دی تھی۔

خاتمہ قابل اعتبار ہے:

بخاریؒ سے مروی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ جب کسی مسلمان کا عمل نیک تمہیں پسند خاطر ہو تو کہو کئے جاؤ، اللہ تمہارے عمل کو دیکھ رہا ہے اور اس کا رسول اور مومنین بھی اس سے واقف ہو رہے ہیں۔ اسی قسم کی ایک اور حدیث میں وارد ہے کہ امام احمدؒ نے کہا کہ بالا سناد انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی کے اچھے عمل کو دیکھ کر خوش نہ ہو جاؤ، انتظار کرو کہ اس کا خاتمہ بھی اس عمل نیک پر ہوتا ہے یا نہیں۔ اس لئے کہ عامل ایک زمانہ طویل تک نیک عمل کرتا رہتا ہے اور وہ اس نیک عمل پر مرجائے تو جنت میں داخل ہو جائے لیکن ناگہاں اس کے حالات بدل جاتے ہیں اور وہ برے اعمال کرنے لگتا ہے۔ اور ایک بندہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک زمانے تک برے اعمال کرتا رہتا ہے کہ اگر اسی پر مرجائے تو دوزخ میں چلا جائے، لیکن یکا یک کایا پلٹ ہو جاتی ہے اور وہ نیک عمل کرنے لگتا ہے۔ اللہ جب اپنے کسی بندے کے ساتھ خیر کا ارادہ فرمائے تو موت سے پہلے اس کو نیکی کی توفیق دے دیتا ہے اور وہ نیکی پر مرتا ہے۔ لوگوں نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ کیسے ہوتا ہے؟ تو فرمایا کہ قبض روح کے وقت وہ عمل صالح کے ساتھ ہوتا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ

اور بعضے اور لوگ ہیں کہ انکا کام ڈھیل میں ہے حکم پر اللہ کے یا وہ ان کو عذاب

وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۱۰۶

دے اور یا ان کو معاف کرے اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے

غزوہ تبوک سے پیچھے رہ جانے والے تین قسم کے لوگ:

اہل مدینہ میں سے یہاں ایک اور چھوٹی سی جماعت کا ذکر فرمایا ہے اصل یہ ہے کہ متخلفین عن تبوک (یعنی تبوک میں نہ شریک ہونیوالے) تین قسم کے تھے۔ ایک منافقین جو از راہ شک ونفاق علیحدہ رہے۔ دوسرے بعض مومنین جو محض سستی اور تن آسانی کی بدولت شریک جہاد نہ ہوئے۔ پھر ان میں دو قسمیں تھیں۔ اکثر وہ تھے جنہوں نے واپسی کی اطلاع پا کر اپنے کو مسجد کے ستونوں سے باندھ دیا ان کا ذکر پچھلی آیات میں گذر چکا۔ صرف تین شخصوں کی جماعت وہ تھی جنہوں نے نہ اپنے کو ستونوں سے بندھوایا نہ کوئی عذر تراشا۔ بس جو واقعہ تھا اور جو قصور تھا صاف صاف بلا کم وکاست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے عرض کر دیا۔ ان کے بارہ میں یہ آیت وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ الخ نازل ہوئی۔ یعنی ان کا معاملہ ابھی ڈھیل میں ہے۔ چند روز خدا کے حکم کا انتظار کرو۔ خواہ ان کو سزا دے یا معاف کرے۔ جو اس کے علم و حکمت کا اقتضاء ہوگا کیا جائیگا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تا نزول حکم الٰہی ادب دینے کیلئے مسلمانوں کے تعلقات ان تینوں سے منقطع کر دیئے۔ پچاس دن تک یہی معاملہ رہا۔ پھر معافی ہوئی۔ ان واقعات کی اور تینوں کے ناموں کی تفصیل اگلے رکوع کے خاتمہ پر بیان ہوگی۔ (تفسیر عثمانی)

شیخین نے حضرت کعب بن مالک کی روایت سے ایک طویل حدیث نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ سے مراد کعب بن مالک، ہلال بن امیہ اور مرارہ بن ربیع ہیں یہ ان دس آدمیوں میں سے تھے جو تبوک میں شریک نہیں ہوئے تھے اور مسجد کے ستونوں سے بھی انہوں نے اپنے آپ کو بندھوایا نہ تھا (مگر اپنے جرم کا کھل کر اقرار کر لیا تھا کوئی بہانہ نہیں کیا تھا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو حکم دے دیا تھا کہ ان تینوں حضرات سے سلام کلام ترک کر دیں ان حضرات نے جب یہ سلوک دیکھا تو خلوص نیت کے ساتھ تائب ہو گئے اور اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا آخر اللہ نے ان پر رحم کیا (اور ان کا قصور بھی معاف کر دیا گیا) ہم ان کا قصہ آگے لکھیں گے۔ (تفسیر مظہری)

وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ دس حضرات مومنین جو بلا عذر کے غزوہ تبوک سے پیچھے رہ گئے تھے ان میں سے سات نے تو اپنی ندامت وافسوس کا پورا اظہار اپنے آپ کو مسجد کے ستونوں سے باندھ کر کر دیا تھا ان کا حکم پہلی آیت میں آچکا، وَاٰخَرُوْنَ اعترفوا، اس آیت سے باقی وہ تین حضرات مراد ہیں جنہوں نے یہ عمل مسجد میں قید ہونے کا نہیں کیا تھا، اور اس طرح کھلے طور پر اعتراف نہیں کیا، ان کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو حکم دے دیا کہ مسلمان ان کا مقاطعہ کریں، ان سے سلام کلام بند کر دیں یہ معاملہ ہونے کے بعد ان کی حالت درست ہوگئی، اور اخلاص کے ساتھ اعتراف جرم کر کے تائب ہو گئے تو ان کیلئے بھی معافی کے احکام دیدیئے گئے۔ (صحیح بخاری ومسلم) (معارف مفتی اعظم)

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا

اور جنہوں نے بنائی ہے ایک مسجد ضد پر اور کفر پر

وَتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ
اور پھوٹ ڈالنے کو مسلمانوں میں اور گھات لگانے کو اس شخص کی
حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَيَحْلِفُنَّ
جو لڑ رہا ہے اللہ سے اور اس کے رسول سے پہلے سے
اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ
اور وہ قسمیں کھائیں گے کہ ہم نے تو بھلائی ہی چاہی تھی اور اللہ
لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۷﴾
گواہ ہے کہ وہ جھوٹے ہیں

مسجد ضرار:

پہلے ان لوگوں کا ذکر تھا جن سے بظاہر ایک برا کام ہوگیا۔ (تخلف عن الجھاد) مگر صحت اعتقاد اور اعتراف خطا کی بدولت معافی مل گئی۔ یہاں ایسی جماعت کا بیان ہے جنہوں نے بظاہر اچھا کام کیا (تعمیر مسجد) لیکن بداعتقادی کی وجہ سے وبال بن گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کر آئے تو اول مدینہ سے باہر ''بنی عمرو بن عوف'' کے محلّہ میں فروکش ہوئے۔ پھر چند روز بعد شہر ''مدینہ'' میں تشریف لے گئے اور مسجد نبوی تعمیر کی، اس محلّہ میں جہاں آپ پیشتر نماز پڑھتے تھے وہاں کے لوگوں نے مسجد تیار کر لی جو مسجد قبا کے نام سے مشہور ہے۔ حضرت اکثر ہفتہ کے روز وہاں جا کر دو رکعت نماز پڑھتے اور بڑی فضیلت اس کی بیان فرماتے تھے بعض منافقین نے چاہا کہ پہلوں کی ضد پر اسی کے قریب ایک اور مکان مسجد کے نام سے تعمیر کریں۔ اپنی جماعت جدا ٹھہرائیں اور بعض سادہ دل مسلمانوں کو مسجد قبا سے ہٹا کر ادھر لے آئیں۔

منصوبہ بنانے والا:

فی الحقیقت اس ناپاک تجویز کا محرک اصلی ایک شخص ابو عامر راہب خزرجی تھا۔ ہجرت سے پہلے اس شخص نے نصرانی بن کر راہبانہ زندگی اختیار کر لی تھی۔ مدینہ اور آس پاس کے لوگ خصوصاً قبیلہ خزرج اس کے زہد و درویشی کے معتقد تھے اور بڑی تعظیم کرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدوم میمنت لزوم سے جب مدینہ میں ایمان و عرفان کا آفتاب چمکا تو اس طرح کے درویشوں کا بھرم کھلنے لگا۔ بھلا نور آفتاب کے سامنے چراغ مردہ کو کون پوچھتا۔ ابو عامر یہ دیکھ کر چراغ پا ہوگیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اسلام کی دعوت دی اور فرمایا کہ میں ٹھیٹ ملت ابراہیمی لے کر آیا ہوں۔ کہنے لگا کہ میں پہلے سے اسی پر قائم ہوں لیکن تم نے اپنی طرف سے ملت ابراہیمی میں اس کی خلاف چیزیں داخل کر دی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت زور سے اس کی تردید فرمائی۔ آخر اس کی زبان سے نکلا کہ جو ہم میں سے جھوٹا ہو خدا اس کو وطن سے دور یکہ و تنہا غربت و بیکسی کی موت مارے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ''امین'' خدا ایسا ہی کرے۔ جنگ بدر کے بعد جب اسلام کی جڑیں مضبوط ہوگئیں اور مسلمانوں کا عروج و فروغ حاسدوں کی نگاہوں کو خیرہ کرنے لگا۔ ابو عامر کو تاب نہ رہی۔ بھاگ کر مکہ پہنچا۔ تاکفار مکہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں چڑھا کر لائے چنانچہ معرکہ احد میں قریش کے ساتھ خود آیا۔ مبارزہ شروع ہونے سے پہلے آگے بڑھ کر انصار مدینہ کو جو عہد جاہلیت میں اس کے بڑے معتقد تھے خطاب کر کے اپنی طرف مائل کرنا چاہا۔ احمق یہ نہ سمجھا کہ پیغمبرانہ تصرف کے سامنے اب وہ پرانا جادو کہاں چل سکتا ہے۔ آخر انصار نے جو اسے پہلے راہب کہہ کر پکارتے تھے جواب دیا کہ او فاسق دشمن خدا! تیری آنکھ خدا کبھی ٹھنڈی نہ کرے۔ کیا رسول خدا کے مقابلہ میں ہم تیرا ساتھ دینگے؟ انصار کا مایوس کن جواب سن کر کچھ حواس درست ہوئے اور غیظ میں آکر کہنے لگا کہ اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) آئندہ جو قوم بھی تیرے مقابلہ کیلئے اٹھے گی میں برابر اس کے ساتھ رہونگا۔ چنانچہ جنگ حنین تک ہر معرکہ میں کفار کے ساتھ ہو کر مسلمانوں سے لڑتا رہا۔ احد میں اسی کی شرارت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چشم زخم پہنچا۔ دونوں صفوں کے درمیان اس نے پوشیدہ طور پر کچھ گڑھے کھدوا دیئے تھے۔ وہیں چہرہ مبارک کے زخمی ہونے اور دندان مبارک شہید ہونیکا واقعہ پیش آیا۔ حنین کے بعد جب ابو عامر نے محسوس کر لیا کہ اب عرب کی کوئی طاقت اسلام کو کچلنے میں کامیاب نہیں ہوسکتی تو بھاگ کر ملک شام پہنچا۔ اور منافقین مدینہ کو خط لکھا کہ میں قیصر روم سے مل کر ایک لشکر جرار محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں لانے والا ہوں جو چشم زدن میں ان کے سارے منصوبے خاک میں ملا دیگا اور مسلمانوں کو بالکل پامال کر کے چھوڑیگا۔ (العیاذ باللہ) تم فی الحال ایک عمارت مسجد کے نام سے بنالو۔ جہاں نماز کے بہانے سے جمع ہو کر اسلام کے خلاف ہر قسم کے سازشی مشورے ہوسکیں۔ اور قاصد تم کو وہیں میرے خطوط وغیرہ پہنچا دیا کرے اور میں بذات خود آؤں تو ایک موزوں جگہ ٹھہرنے اور ملنے کی ہو یہ خبیث مقاصد تھے جن کے لئے مسجد ضرار تعمیر ہوئی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مکر:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو بہانہ یہ کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! خدا کی قسم ہماری نیت بری نہیں بلکہ بارش اور سردی وغیرہ میں بالخصوص بیماروں، ناتوانوں اور ارباب حوائج کو مسجد قبا تک جانا دشوار ہوتا ہے۔ اس لئے یہ مسجد بنائی گئی ہے تا نمازیوں کو سہولت ہو اور مسجد قبا میں تنگی مکان کی شکایت نہ رہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ وہاں چل کر نماز پڑھ لیں

تو ہمارے لئے موجب برکت وسعادت ہو۔ یہ اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل دیکھ کر بعض سادہ دل مسلمان حسن ظن کی بناء پر ان کے جال میں پھنس جائیں۔ آپ اس وقت تبوک جانے کیلئے پابہ رکاب تھے۔ فرمایا کہ اللہ نے چاہا تو واپسی پر ایسا ہو سکے گا۔

مسجد ضرار کا پول کھل گیا:

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے واپس ہو کر بالکل مدینہ کے نزدیک پہنچ گئے، تب جبرئیل یہ آیات لے کر آئے جن میں منافقین کی ناپاک اغراض پر مطلع کر کے مسجد ضرار کو پول کھول دیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مالک بن خشم اور معن بن عدی کا حکم دیا کہ اس مکان کو (جس کا نام ازراہ خداع وفریب مسجد رکھا تھا) گرا کر پیوند زمین بنادو۔ انہوں نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور جلا کر خاک سیاہ کر دیا۔ اس طرح منافقین اور ابو عامر فاسق کے سب ارمان دل کے دل میں رہ گئے اور ابو عامر اپنی دعاء اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آمین کے موافق قنسرین (ملک شام) میں تنہا سخت بے کسی کی موت مرا فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ'' آیت میں'' لِمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ '' سے یہی ابو عامر فاسق مراد ہے۔

ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ اور بیہقی نے دلائل میں حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا ہے نیز ابن المنذر نے سعید بن جبیر کی روایت سے اور محمد بن عمر نے یزید بن رومان کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ عمرو بن عوف کے قبیلہ نے ایک مسجد تعمیر کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آدمی کو بھیجا کہ حضور تشریف لا کر اس مسجد میں نماز پڑھیں۔ غنم بن عوف کے قبیلہ نے جب یہ بات دیکھی تو ان کو حسد ہوا اور انہوں نے کہا ہم بھی ایک مسجد بنائیں گے جیسی انہوں نے بنائی ہے (بات یہ ہوئی تھی کہ) شام کو روانہ ہونے سے پہلے ابو عامر فاسق نے ان سے کہا تھا تم لوگ ایک مسجد تعمیر کرواور جتنے اسلحہ ممکن ہوں اس میں (پوشیدہ طور پر) جمع کرلوں میں قیصر روم کے پاس جارہا ہوں وہاں سے رومیوں کا ایک لشکر لا کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں کو یہاں سے نکال باہر کردوں گا۔ ابو عامر فاسق اللہ اور رسول کے خلاف بغاوت کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑنے کے ارادہ سے مدینہ سے گیا تھا چنانچہ یہ لوگ ابو عامر کے آنے (اور رومیوں کا لشکر ساتھ لانے) کے انتظار میں تھے۔ مسجد تیار ہوگئی تو انہوں نے چاہا کہ رسول اللہ اس میں نماز پڑھیں تا کہ ان کا جو مقصد تھا یعنی فساد کفر اور اسلام سے عناد اس کو کامیاب ہونے کا موقع مل جائے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک کو روانہ ہونے کی تیاری کر رہے تھے کہ ان کی طرف سے کچھ لوگوں نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے ایک مسجد بنائی ہے مقصد تعمیر یہ ہے کہ جو بیمار یا حاجت مند مسجد گرامی میں حاضر نہیں ہو سکتے۔ یا سخت سردی کی رات ہو یا بارش کی رات ہو اور لوگ وہاں سے یہاں حاضر نہ ہو سکیں تو وہ اس مسجد میں نماز پڑھ لیں ہماری خواہش ہے کہ حضور تشریف لا کر اس مسجد میں نماز پڑھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اب تو میں برسر سفر ہوں اور کام میں مشغول ہوں جب ہم ان شاء اللہ واپس آئیں گے تو تمہاری مسجد میں نماز پڑھیں گے چنانچہ آپ جب تبوک سے واپس ہو کر مقام ذی اوان میں اترے تو مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی یہ مقام مدینہ سے ایک گھنٹہ کی راہ کے فاصلہ پر تھا۔

مسجد ضرار کی تعمیر کرنے والے:

ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ بارہ آدمیوں نے اس مسجد کی تعمیر کی تھی۔ (۱) قبیلہ بنی عبید بن زید کا حذام بن خالد یہ بنی عمرو بن عوف کا ایک فرد تھا (۲) قبیلہ بنی امیہ بن زید کا ثعلبہ بن حاطب (۳) بنی صبیعہ بن زید کا معتب بن قشیر اور (۴) حبیبہ بن ازعر اور (۵) نبتل بن حارث اور نجاد بن عثمان اور قبیلہ بن عمرو بن عوف کا عباد بن حنیف جو سہل بن حنیف کا بھائی تھا اور حارثہ بن عامر اور اس کے دونوں بیٹے مجمع بن حارثہ اور زید بن حارثہ اور ودیعہ بن ثابت اور ایک اور شخص جس کو بخرج کہا جاتا تھا۔ ان سب اس مسجد کی تعمیر مسجد قبا کو ضرر پہنچانے کیلئے کی تھی۔

ابو عامر کی رہبانیت ناکام ہوگئی:

بغوی نے لکھا ہے کہ من حارب اللہ سے مراد ابو عامر راہب ہے جو حضرت حنظلہ غسیل الملائکہ کا باپ تھا اور قبیلہ بنی عمرو بن عوف کا ایک فرد تھا اسلام آنے سے پہلے یہ شخص کمبل پوش عیسائی راہب ہو گیا تھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو ابو عامر نے پوچھا آپ یہ کیا مذہب لے کر آئے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ خالص دین توحید ہے جو ابراہیم کا دین تھا۔ ابو عامر نے کہا دین حفیت پر تو میں ہوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم دین حنیفیت (دین ابراہیمی) پر نہیں ہو۔ ابو عامر نے کہا کیوں نہیں (میں یقیناً دین ابراہیمی پر ہوں) آپ نے حفیت کے اندر دوسری چیزوں کو شامل کر لیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے ایسا نہیں کیا میں تو خالص نکھری ہوئی روشن شریعت لے کر آیا ہوں ابو عامر نے کہا تو ہم میں سے جو جھوٹا ہو خدا کرے وہ یکہ تنہا خانہ بدر مسافرت کی حالت میں مرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ ایسا ہی کرے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے (بجائے راہب کے) اس کا نام ابو عامر فاسق رکھ دیا۔ احد کی لڑائی کے دن ابو عامر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا جو قوم بھی آپ سے لڑے گی میں اس کے ساتھ مل کر آپ سے لڑوں گا چنانچہ جنگ حنین تک وہ برابر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف دوسری قوموں سے مل کر لڑتا رہا ہوازن کی شکست کے بعد شام بھاگ گیا اور منافقوں کو یہ پیام بھیج گیا کہ تم

لوگ تیار رہنا ایک مسجد بنا کر جس قدر اسلحہ ہو سکے اس میں جمع کر رکھنا میں قیصر روم کے پاس جا رہا ہوں وہاں سے رومیوں کا ایک لشکر لا کا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اوران کے ساتھیوں کو نکال باہر کردوں گا۔ ابو عامر کے مشورہ کے موافق ان لوگوں نے مسجد قبا کر برابرا ایک مسجد بنالی۔ من قبل سے مراد یا تو یہ معنی ہیں کہ مسجد بنانے سے پہلے اس شخص نے اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بغاوت اور جنگ کی تھی یا یہ مطلب ہے کہ تبوک کے جہاد سے غیر حاضر ہونے سے پہلے ہی انہوں نے مسجد بنالی تھی۔ اول مطلب پر من قبل کا تعلق حارب سے اور دوسری صورت میں اتخذ واسے ہوگا۔ (تفسیر مظہری)

مسجد کے مقاصد:

اس مجموعہ سے یہ ثابت ہوگیا کہ جس مسجد کو قرآن کریم نے مسجد ضرار قرار دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے اس کو ڈھایا گیا اور آگ لگائی گئی، درحقیقت نہ وہ مسجد تھی نہ اس کا مقصد نماز پڑھنے کے لئے تھا بلکہ مقاصد وہ تین تھے جن کا ذکر اوپر آیا ہے، اس سے معلوم ہوگیا کہ آجکل اگر کسی مسجد کے مقابلہ میں اس کے قریب کوئی دوسری مسجد کچھ مسلمان بنالیں، اور بنانے کا مقصد یہی باہمی تفرقہ اور پہلی مسجد کی جماعت توڑنا وغیرہ اغراض فاسدہ ہوں، تو اگرچہ ایسی مسجد بنانے والے کو ثواب تو نہ ملے گا بلکہ تفریق بین المومنین کی وجہ سے گناہ گار ہوگا لیکن باایں ہمہ اس جگہ کو شرعی حیثیت سے مسجد ہی کہا جائے گا اور تمام آداب اور احکام مساجد کے اس پر جاری ہوں گے، اس کا ڈھانا آگ لگانا جائز نہیں ہوگا، اور جو لوگ اس میں نماز پڑھیں گے ان کی نماز بھی ادا ہو جائے گی اگرچہ ایسا کرنا فی نفسہٖ گناہ رہے گا۔

ریاء کاری والی مسجد:

اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اس طرح ریاء ونمود کے لئے یا ضد وعناد کی وجہ سے جو مسلمان کوئی مسجد بنالے اگرچہ بنانے والے کو مسجد کا ثواب نہ ملے گا، بلکہ گناہ ہوگا، مگر اس کو اصطلاح قرآن والی مسجد ضرار نہیں کہا جائے گا بعض لوگ جو اس طرح کی مسجد کو مسجد ضرار کہہ دیتے ہیں یہ درست نہیں، البتہ اس کو مسجد ضرار کے مشابہ کہہ سکتے ہیں، اس لئے اس کے بنانے کو روکا بھی جاسکتا ہے جیسا کہ حضرت فاروقؓ نے ایک فرمان جاری فرمایا تھا جس میں ہدایت کی گئی تھی کہ ایک مسجد کے قریب دوسری مسجد نہ بنائی جائے جس سے پہلی مسجد کی جماعت اور رونق متاثر ہو (تفسیر کشاف)

مسئلہ: اس سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ آج بھی اگر کوئی نئی مسجد پہلی مسجد کے متصل بلا کسی ضرورت کے محض ریاء ونمود کے لئے یا ضد وعناد کی وجہ سے بنائی جائے تو اس میں نماز پڑھنا بہتر نہیں، اگرچہ نماز ہو جاتی ہے۔ (معارف القرآن مفتی اعظم)

لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ؕ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى
تو نہ کھڑا ہو اس میں کبھی البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد دھری گئی
التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ
پرہیزگاری پر اوّل دن سے وہ لائق ہے کہ تو کھڑا ہو اس میں اس
فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ
میں ایسے لوگ ہیں جو دوست رکھتے ہیں پاک رہنے کو اور اللہ
يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾
دوست رکھتا ہے پاک رہنے والوں کو

مسجد قباء کی فضیلت:

یعنی اس مسجد میں جس کی بنیاد محض ضد، کفر ونفاق عداوت اسلام اور مخالفت خدا اور رسول پر رکھی گئی۔ آپ کبھی نماز کیلئے کھڑے نہ ہوں۔ آپ کی نماز کے لائق وہ مسجد ہے جس کی بنیاد اول دن سے تقویٰ اور پرہیزگاری پر قائم ہوئی (خواہ مسجد نبوی یا مسجد قبا) اس کے نمازی گناہوں اور شرارتوں اور ہر قسم کی نجاستوں سے اپنا ظاہر وباطن پاک وصاف رکھنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ اسی لئے خدائے پاک ان کو محبوب رکھتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل قبا سے دریافت کیا کہ تم طہارت وپاکیزگی کا کیا خاص اہتمام کرتے ہو، جو حق تعالیٰ نے تمہاری تطہیر کی مدح فرمائی۔ انہوں نے کہا کہ ڈھیلے کے بعد پانی سے استنجا کرتے ہیں۔ یعنی عام طہارت ظاہری وباطنی کے علاوہ وہ لوگ اس چیز کا معتاد سے زائد اہتمام رکھتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آیت میں مسجد قبا کا ذکر ہے۔ لیکن بعض روایات صریح ہیں کہ لمسجد اسس علی التقویٰ سے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہے۔ علماء نے اس پر بہت کچھ کلام کیا ہے ہم نے شرح صحیح مسلم میں اس کے متعلق اپنا ناقص خیال ظاہر کر کے روایات میں تطبیق دی ہے یہاں اس کے بیان کا موقع نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

مسجد ضرار کی بربادی:

ابن اسحاق نے بسلسلہ زہری حضرت ابورہم کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی سالم بن عوف کے مالک بن دخشم کو اور قبیلہ عاصم بن عدی کے معن بن عدی کو طلب فرمایا، بغوی نے مالک بن دخشم کے ساتھ عامر بن اسکن اور حضرت حمزہ کے قاتل وحشی کا بھی ذکر کیا ہے عاصم کا ذکر نہیں کیا اور ذہبی نے التجرید میں سوید بن عباس انصاری کا نام بھی بیان کیا ہے اور فرمایا حق ناشناس لوگوں کی بنائی ہوئی اس مسجد کو جا کر ڈھادو اور جلادو حسب الحکم

یہ حضرات تیزی کے ساتھ چلے گئے اور سالم بن عوف کے محلّہ میں پہنچ کر مالک نے اپنے دونوں ساتھیوں سے کہا آپ لوگ میرا انتظار کریں میں آتا ہوں یہ کہہ کر اپنے گھر جا کر کھجور کی کچھ خشک ٹہنیاں لے کر ان میں آگ لگائی پھر سب حضرات دوڑ کر مغرب وعشاء کے درمیان مسجد میں پہنچے، اس وقت مسجد والے مسجد میں موجود تھے، ان حضرات نے مسجد کو آگ لگا دی اور ڈھا کر زمین کے برابر کر دیا اہل مسجد ادھر ادھر منتشر ہو گئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا اس جگہ کوڑا گھر بنا دیا جائے جہاں مردار جانور اور غلاظتیں ڈالی جائیں۔ ابو عامر فاسق ملک شام میں یکہ تنہا خانہ برباد مسافرت کی حالت میں مر گیا۔

مسجد نبوی:

حضرت ابوسعید خدری نے فرمایا میں امہات المومنین میں سے کسی کے گھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ کونسی مسجد ہے (جس کے متعلق فرمایا گیا ہے) کہ اس کی تاسیس تقوی پر کی گئی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مٹھی کنکریاں لے کر زمین پر ماریں اور فرمایا یہ ہی تمہاری مسجد مدینہ کی مسجد۔

طبرانی اور ضیاء مقدسی نے المختارہ میں حضرت زید بن ثابت کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس مسجد کے متعلق دریافت کیا گیا جس کی بناء تقوی پر رکھی گئی تھی فرمایا وہ میری یہ ہی مسجد ہے۔

ابن ابی شیبہ اور ابن مردویہ کی روایت ہے کہ حضرت ابن عمر سے دریافت کیا گیا جس مسجد کی تاسیس تقوی پر ہوئی وہ کونسی مسجد ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد۔

مسجد نبوی کی فضیلت میں وہ حدیث آئی ہے جس کو شیخین نے صحیحین میں حضرت ابوہریرہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے اور میرا منبر میرے حوض پر ہے (یا یوں ترجمہ کیا جائے کہ میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہوگا اور میرا ممبر میرے حوض پر ہوگا واللہ اعلم۔

بغوی کی روایت میں بجائے گھر کے، قبر کا لفظ آیا ہے۔

ریاض الجنۃ:

شیخین اور احمد اور نسائی نے حضرت عبداللہ بن زید مازنی کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے گھر اور میرے ممبر کے درمیان ایک باغ ہے جنت کے باغوں میں سے۔ ترمذی نے بھی حضرت علی کی روایت سے یہی بیان کیا ہے۔

ہزار نماز کا ثواب:

حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری اس مسجد میں ایک نماز دوسری مسجدوں میں سوائے مسجد حرام (کعبہ) کے ہزار نمازوں سے بہتر ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد قبا میں تشریف لے جانا:

بخاری نے عبداللہ بن دینار کی وساطت سے حضرت ابن عمر کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر شنبہ کو پیدل یا سوار ہو کر مسجد قبا کو تشریف لے جاتے تھے حضرت ابن عمر بھی ایسا ہی کرتے تھے۔ نافع نے حضرت ابن عمر کا قول اتنا زائد نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں دو رکعت نماز پڑھتے تھے۔ داؤدی سہیلی اور حافظ ابن حجر۔ نے کہا یہ (تفسیری) اختلاف نہیں ہے کیونکہ دونوں میں سے ہر مسجد کی تاسیس تقوی پر ہوئی تھی۔

ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مہاجرین کو ساتھ لے کر پیدل روانہ ہوئے اور مسجد قبا کے درواز ے پر پہنچ کر کھڑے ہو گئے اندر انصار بیٹھے ہوئے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم لوگ مومن ہو انصار خاموش رہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر یہی فرمایا اس پر حضرت عمر نے عرض کیا یہ یقیناً مومن ہیں اور میں بھی ان کے ساتھ ہوں فرمایا کیا تم قضاء (خداوندی) پر راضی ہو انہوں نے کہا جی ہاں فرمایا کیا تم مصیبت پر صبر کرتے ہو انہوں نے کہا جی ہاں فرمایا کیا تم راحت پر شکر کرتے ہو، انہوں نے کہا جی ہاں، فرمایا قسم ہے مالک کعبہ کی تم مومن ہو، پھر آپ (ان کے پاس) بیٹھ گئے اور فرمایا اے گروہ انصار اللہ نے تمہاری تعریف فرمائی ہے تم وضو اور رفع حاجت کے وقت کیا کرتے ہو انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رفع حاجت کے بعد ہم تین پتھروں کا استعمال کرتے ہیں اور پتھروں کے بعد پانی کا استعمال کرتے ہیں اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت فِيۡهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوۡنَ اَنۡ يَّتَطَهَّرُوۡا تلاوت فرمائی۔

ابن خزیمہ نے صحیح میں حضرت عویمر بن ساعدہ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اہل قبا کے پاس مسجد قبا میں تشریف لے گئے اور فرمایا تمہاری مسجد کے قصہ میں تمہاری پاکی کی اللہ نے بہت اچھی تعریف کی ہے تم لوگ طہارت کیسے کرتے ہو (جس کی اللہ نے تعریف کی ہے) انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی قسم اور کچھ تو ہمیں معلوم نہیں صرف اتنی بات تھی کہ ہمارے پڑوس میں جو یہودی رہتے تھے وہ رفع حاجت کے بعد پانی سے استنجا کرتے تھے سو ہم نے بھی پانی سے استنجا کرنا شروع کر دیا دوسری روایت میں آیا کہ ہم پتھروں کے استعمال کے بعد پانی سے استنجا کرتے ہیں فرمایا وہ یہی ہے تم ایسا ضرور کیا کرو۔

عمر بن شبیہ نے اخبار المدینہ میں ولید بن ابی منذر کی وساطت سے یحیٰ بن سہل انصاری کا بیان نقل کیا ہے کہ حضرت سہل انصاری نے فرمایا یہ آیت اہل

قبا کے حق میں نازل ہوئی جو رفع حاجت کے بعد پانی سے استنجا کرتے تھے۔

مسجد قباء والوں کی طہارت:

ابن جریر نے عطاء کا قول نقل کیا ہے کہ اہل قبا میں سے کچھ لوگوں نے پانی سے طہارت کرنیکی ایجاد کی، ان ہی کے متعلق آیت فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا نازل ہوئی۔ (تفسیر مظہری)

امام احمد بن حنبلؒ (بالاسناد) روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسجد قبا میں آئے اور کہا کہ اللہ نے تمہاری طہارت کی بہت اچھی تعریف کی ہے وہ کیا ہے؟ تو کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم نے تو آیت میں پانی سے طہارت کے احکام پائے ہیں (اس میں ایک راوی عبداللہ بن سلام تھے جو اہل توریت تھے۔ (تفسیر ابن کثیر)

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ
بھلا جس نے بنیاد رکھی اپنی عمارت کی اللہ سے ڈرنے پر
اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ
اور اس کی رضامندی پر وہ بہتر یا جس نے بنیاد رکھی اپنی عمارت کی
بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ
کنارہ پر ایک کھائی کے جو گرنے کو ہے پھر اس کو لے کر ڈھے پڑا
بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ ؕ
دوزخ کی آگ میں

تقوی والا کام مستحکم ہے:

یعنی جس کام کی بنیاد تقویٰ، یقین واخلاص اور خدا کی رضا جوئی پر ہو، وہ نہایت مستحکم اور پائدار ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے جس کام کی بناء شک ونفاق اور مکر وخداع پر ہو، وہ اپنی ناپائداری، بودے پن اور انجام بد کے لحاظ سے ایسا ہے جیسے کوئی عمارت ایک کھائی کے کنارہ پر کھڑی کی جائے کہ ذرا زمین سرکی یا پانی کی تھپیڑ کنارہ کو لگی، ساری عمارت دھڑام سے نیچے آ رہی اور آخر کار دوزخ کے گڑھے میں جا پہنچی۔

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾
اور اللہ راہ نہیں دیتا ظالموں کو

یعنی بظاہر کوئی نیک عمل بھی کریں (جیسے مسجد بنانا) ظلم و ناانصافی کی شامت سے بن نہیں پڑتا۔ (تفسیر عثمانی)

مسجد ضرار کی جگہ سے دھواں:

ابن المنذر نے سعید بن جبیر اور قتادہ اور جریج کا قول نقل کیا ہے نیز ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے قتادہ کی روایت بیان کی ہے ان تینوں حضرات کا بیان ہے ہم سے ذکر کیا گیا تھا کہ مسجد ضرار میں جب ایک جگہ کھودی گئی تو لوگوں نے وہاں سے دھواں نکلتا دیکھا۔ بغوی نے حضرت جابر بن عبداللہ کا بیان نقل کیا ہے آپ نے فرمایا میں نے مسجد ضرار سے دھواں نکلتے دیکھا۔ (تفسیر مظہری)

لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِىْ بَنَوْا رِيْبَةً فِىْ
ہمیشہ رہے گا اس عمارت سے جو انہوں نے بنائی تھی شبہ ان کے
قُلُوْبِهِمْ اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاللّٰهُ
دلوں میں مگر جب ٹکڑے ہو جائیں ان کے دل کے اور اللہ
عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۱۰﴾
سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے

مسجد ضرار والوں کی سزا:

"ریبہ" ترجمہ کیا ہے "شبہ" جس سے مراد نفاق ہے یعنی اس عمل بد کا اثر یہ ہوا کہ ہمیشہ ان کے دلوں میں (جب تک موت انہیں پارہ پارہ نہ کر ڈالے) نفاق قائم رہیگا۔ جیسے اسی سورۃ میں پہلے گذر چکا۔ " فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِىْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ "

بعض مترجمین نے "ریبہ" کے معنی کیے ہیں "کھٹکنا"۔ یعنی جو عمارت انہوں نے ناپاک مقصد کیلئے بنائی تھی۔ مگر حق تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو مطلع کر کے ان کے تمام پلید مقاصد کا خاتمہ کر دیا، اس کا خیال ہمیشہ ان کے دلوں میں کانٹا سا کھٹکتا رہیگا۔ والراجح عند السلف هو الاول كما حكى ابن كثيرؒ۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ
اللہ نے خرید لی مسلمانوں سے انکی جان
وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ
اور ان کا مال اس قیمت پر کہ ان کیلئے جنت ہے لڑتے ہیں
فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۫
اللہ کی راہ میں پھر مارتے ہیں اور مرتے ہیں

وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ

وعدہ ہوچکا اس کے ذمہ پر سچا توریت اور انجیل

وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ

اور قرآن میں اور کون ہے قول کا پورا اللہ سے زیادہ

فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِىْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ

سو خوشیاں کرو اس معاملہ پر جو تم نے کیا ہے اس سے

وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۱﴾

اور یہی ہے بڑی کامیابی

سب سے زیادہ نفع والی تجارت:

اس سے زیادہ سودمند اور تجارت اور عظیم الشان کامیابی کیا ہوگی کہ ہماری حقیری جانوں اور فانی اموال کا خداوند قدوس خریدار بنا۔ ہماری جان و مال جو فی الحقیقت اسی کی مملوک و مخلوق ہے محض ادنیٰ ملابست سے ہماری طرف نسبت کر کے ''مبیع'' قرار دیا جو ''عقد بیع'' میں مقصود بالذات ہوتی ہے۔ اور جنت جیسے اعلیٰ ترین مقام کو اس کا ''ثمن'' بتلایا جو مبیع تک پہنچنے کا وسیلہ ہے۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''جنت'' میں وہ نعمتیں ہونگی جن کو نہ آنکھوں نے دیکھا نہ کانوں نے سنا اور نہ کسی بشر کے قلب پر ان کی کیفیات کا خطور ہوا اب خیال کرو کہ جان و مال جو برائے نام ہمارے کہلاتے ہیں، انہیں جنت کا ثمن نہیں بنایا نہ یہ کہا کہ حق تعالیٰ ''بائع'' اور ہم مشتری ہوتے، تلطف و نوازش کی حد ہوگئی کہ اس ذرا سی چیز کے (حالانکہ وہ بھی فی الحقیقت اسی کی ہے) معاوضہ میں جنت جیسی لازوال اور قیمتی چیز کو ہمارے لئے مخصوص کر دیا، جیسا کہ ''بالجنۃ'' کی جگہ ''بان لھم الجنۃ'' فرمانے سے ظاہر ہوتا ہے

نیم جاں بستا ند وصد جاں دہد آنچہ درہمت نیاید آں دہد

پھر یہ نہیں کہ ہمارے جان و مال خرید لئے گئے تو فوراً ہمارے قبضہ سے نکال لئے جائیں صرف اس قدر مطلوب ہے کہ جب موقع پیش آئے جان و مال خدا کے راستہ میں پیش کرنے کیلئے تیار رہیں۔ دینے سے بخل نہ کریں خواہ وہ لیں یا نہ لیں۔ اسی کے پاس چھوڑے رکھیں۔ اسی لئے فرمایا يُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ '' یعنی مقصود خدا کی راہ میں جان و مال حاضر کر دینا ہے بعدہ ماریں یا مارے جائیں۔ دونوں صورتوں میں عقد بیع پورا ہوگیا اور یقینی طور پر ثمن کے مستحق ٹھہر گئے ممکن ہے کسی کو وسوسہ گذر

تا کہ معاملہ تو بیشک بہت سودمند اور فائدہ بخش ہے لیکن ثمن نقد نہیں ملتا۔ اس کا جواب دیا۔ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ '' یعنی زرثمن کے مارے جانے کا کوئی خطرہ نہیں۔ خدا تعالیٰ نے بہت تاکید و اہتمام سے پختہ دستاویز لکھ دی ہے جس کا خلاف ناممکن ہے۔ کیا خدا سے بڑھ کر صادق القول راست باز اور وعدہ کا پکا کوئی دوسرا ہوسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ لہذا اس کا ادھار بھی دوسروں کے نقد سے ہزاروں درجہ پختہ اور بہتر ہوگا پھر مومنین کے لئے خوش ہونے اور اپنی قسمت پر نازاں ہونے کا اس سے بہتر کونسا موقع ہوگا کہ خود رب العزت ان کا خریدار بنے، اور اس شان سے بنے۔ سچ فرمایا عبداللہ بن رواحہ نے کہ یہ وہ بیع ہے جس کے بعد اقالت کی کوئی صورت ہم باقی رکھنا نہیں چاہتے۔ حق تعالیٰ اپنے فضل سے ہم ناتوانوں کو ان مومنین کے زمرہ میں محشور فرمائے۔ آمین۔

اللہ تعالیٰ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حق:

ابن جریر نے بروایت محمد بن کعب قرظی نیز بغوی نے ذکر کیا ہے کہ عبداللہ بن رواحہ نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ جو چاہیں اپنے رب کے اور اپنے لئے ہم سے شرطیں لے لیجئے (ہم سب کچھ ماننے کو تیار ہیں) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں اپنے رب کے متعلق تو یہ شرط پیش کرتا ہوں کہ تم اس کی عبادت کرنا کسی چیز کو اس کا شریک نہ قرار دینا (یعنی کسی چیز کو پوجا نہ کرنا) اور اپنے لئے یہ شرط پیش کرتا ہوں کہ جس چیز سے تم اپنی جانوں اور مالوں کی حفاظت کرو اس سے میری بھی حفاظت کرنا (یعنی اپنی جان و مال کی طرح میری حفاظت کرنا) انصار نے کہا اگر ہم نے ایسا کرلیا تو ہم کو کیا ملے گا فرمایا، جنت انصار نے کہا یہ نفع کا سودا ہے اب ہم اس سودے کو نہ پھیریں گے نہ پھیرنے دیں گے (یا نہ پھیرنے کی خواہش کریں گے) اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ

سب سے پہلے بیعت کرنے والے:

اہل سیر نے لکھا ہے کہ سب سے پہلے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر اپنا ہاتھ مارا وہ براء بن معرور یا ابوالہیثم یا اسعد تھے اور یہ شرط کی کہ جس (مصیبت) سے وہ اپنے اہل و عیال کی حفاظت کریں گے اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی حفاظت کریں گے اور ہر گورے کالے (یعنی تمام انسانوں) کے مقابل آپ کی حمایت کریں گے۔ سب سے پہلے قتال و جہاد کے بارے میں یہی آیت نازل ہوئی اس کے بعد اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ الخ۔

سب سے پہلا مہاجر مدنی:

تیسری گھاٹی کی بیعت سے ایک سال پہلے حضرت ابوسلمہ بن عبدالاسد جوحبشہ سے آئے تھے اور مکہ والوں نے ان کو بڑی تکلیفیں دی تھیں جب ان کو انصار کے مسلمان ہو جانے کی اطلاع ملی تو مدینہ کو ہجرت کر گئے آپ کا نمبر مدنی مہاجرین میں سے سب سے پہلا تھا پھر عامر بن ربیعہ اور ان کی بیوی لیلیٰ نے ہجرت کی پھر عبداللہ بن جحش نے پھر پے در پے دوسرے مسلمانوں نے پھر عمر بن خطاب اور آپ کے بھائی زید نے اور بیس سواروں کے ساتھ عباس بن ربیعہ نے ان سب نے (مدینہ پہنچ کر) حوالی مدینہ میں پڑاؤ کیا۔ پھر عثمان بن عفان نے ہجرت کی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بار ہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہجرت کی درخواست کی مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے رہے جلدی نہ کرو۔ شاید اللہ کسی کو تمہارا ساتھی کر دے خیال یہ تھا کہ شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے ساتھ ہی ہجرت کریں۔ اس کے بعد چوپال میں قریش کا اجتماع ہو ا (اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کر دینے کی انہوں نے خفیہ سازش کی) سورۂ انفال میں قریش کی سازش کا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت کرنے کا بیان آ چکا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت مکی ہے۔ (تفسیر مظہری)

جہاد کی فضیلت:

اسی لئے صحیحین میں آیا ہے کہ جو خدا کی راہ میں نکلا اور اس نکلنے سے اس کی غرض سوائے اس کے اور کچھ نہ ہو کہ میری راہ میں جہاد کرے یا میرے رسولوں کی تصدیق کرے حتیٰ کہ اسے موت آ جائے تو خدا اس بات کا ذمہ دار ہے کہ اس کو جنت میں داخل کرے اور اگر نہ مرے تو خدا کے ذمہ ہے کہ جہاں سے وہ چلا ہے اسے وہاں پہنچائے اور اجر مال غنیمت کے ساتھ بامراد پہنچائے۔ (تفسیر ابن کثیر)

گھاٹی میں مدینہ والوں کی تین بیعتیں:

عقبہ پہاڑ کے حصہ کو کہا جاتا ہے اس جگہ وہ عقبہ مراد ہے جو منیٰ میں جمرہ عقبہ کے ساتھ پہاڑ کا حصہ ہے۔ (آجکل حجاج کی کثرت کے سبب پہاڑ کا یہ حصہ صاف کر کے میدان بنا دیا گیا ہے صرف جمرہ رہ گیا ہے) اس عقبہ پر مدینہ طیبہ کے حضرات سے تین مرتبہ بیعت لی گئی ہے پہلی بیعت بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے گیارہویں سال میں ہوئی، جس میں چھ حضرات مسلمان ہو کر بیعت کر کے مدینہ واپس ہوئے، تو مدینہ کے گھر گھر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کا چرچا ہونے لگا، اگلے سال موسم حج میں بارہ حضرات اسی جگہ جمع ہوئے، جن میں پانچ پہلے اور سات نئے تھے، سب نے بیعت کی، اب مدینہ میں مسلمانوں کی خاصی تعداد ہوگئی، جو چالیس نفر سے زائد تھی، انہوں نے درخواست کی کہ ہمیں قرآن پڑھانے کیلئے کسی کو بھیج دیا جائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو بھیج دیا، انہوں نے موجودہ مسلمانوں کو قرآن بھی پڑھایا، اور اسلام کی تبلیغ بھی کی، جس کے نتیجہ میں مدینہ کی بڑی جماعتیں اسلام کے حلقہ بگوش ہوگئیں۔

اس کے بعد بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے تیرہویں سال میں ستر مرد دو عورتیں اسی جگہ جمع ہوئے یہ تیسری بیعت عقبہ ہے جو آخری ہے اور عموماً بیعت عقبہ سے یہی بیعت مراد ہوتی ہے۔ یہ بیعت اسلام کے اصولی عقائد و اعمال کے ساتھ خصوصی طور پر کفار سے جہاد اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ پہنچیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت و حمایت پر لی گئی اس میں حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت معاہدہ ہو رہا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو شرائط اپنے رب کے متعلق یا اپنے متعلق کرنا چاہیں وہ واضح کر دی جائیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ کے لئے تو یہ شرط رکھتا ہوں کہ آپ سب اس کی عبادت کریں گے، اس کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے، اور اپنے لئے یہ شرط ہے کہ میری حفاظت اس طرح کریں گے جیسے اپنی جانوں اور اپنے اموال و اولاد کی حفاظت کرتے ہو، ان لوگوں نے دریافت کیا کہ اگر ہم یہ دونوں شرطیں پوری کر دیں تو ہمیں اس کے بدلے میں کیا ملے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنت ملے گی، ان سب حضرات نے خوش ہو کر کہا کہ ہم اس سودے پر راضی ہیں، اور ایسے راضی ہیں کہ اب اس کو نہ خود فسخ کرنے کی درخواست کریں گے، نہ اس کے فسخ کرنے کو پسند کریں گے۔

اس جگہ چونکہ اس بیعت میں ظاہرا صورت ایک لین دین کے معاملے کی بن گئی تو اس پر یہ آیت بہ لفظ بیع و شراء نازل ہوئی،

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ

یہ آیت سن کر سب سے پہلے حضرت براء بن معرور اور ابوالہیثم اور اسعد رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر اپنا ہاتھ رکھ دیا کہ ہم اس معاملہ پر تیار ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت اپنی عورتوں بچوں کی طرح کریں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ پر اگر دنیا کے کالے اور گورے سب جمع ہو جائیں تو ہم سب کا مقابلہ کریں گے۔

جب سب مسلمان ہو گئے تو مدینہ کو لوٹ گئے مدینہ پہنچ کر اسعد بن زرارہ ان تمام لوگوں کو مدینہ میں جمع کرنے لگے جو مسلمان ہوتے گئے، قبائل اوس وخزرج نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عرضداشت بھیجی کہ اب کوئی ایسا آدمی ہمارے پاس بھیج دیجئے جو ہم کو قرآن پڑھا دے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مصعب بن عمیر کو بھیج دیا، اس وقت تک مدینہ میں چالیس مسلمان تھے حضرت مصعبؓ کی کوشش سے بہت لوگ مسلمان ہو گئے۔ سعد بن معاذ اور اسید بن

حضیر بھی مسلمان ہو گئے اور ان دونوں بزرگوں کے مسلمان ہونے سے بنی عبد الاشہل کے تمام آدمی کیا مرد کیا عورتیں سب کے سب مسلمان ہو گئے پھر بعثت کے تیرہویں سال تیسری گھاٹی کے موقع پر ایام تشریق میں مدینہ والے حاضر ہوئے اور ستر یا تہتر مردوں اور دو عورتوں نے بیعت کی حاکم نے پچھتر آدمی ہونے کی صراحت کی ہے۔ (تفسیر مظہری)

عجیب خریدار:

حضرت فاروق اعظمؓ نے فرمایا کہ یہ عجیب بیع ہے کہ مال اور قیمت دونوں تمہیں ہی دیدیئے۔

حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ سنو! یہ کیسی نفع کی تجارت ہے جو اللہ نے ہر مومن کیلئے کھول دی ہے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہی تمہیں مال بخشا ہے تم اس میں تھوڑا خرچ کر کے جنت خرید لو (مظہری) (معارف مفتی اعظمؒ)

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ
وہ توبہ کرنیوالے ہیں بندگی کرنے والے شکر کرنیوالے بے تعلق رہنے والے

روزہ دار و مہاجر، مجاہد اور طالب علم:

بعض نے ''سائحون'' سے مراد روزہ دار لئے ہیں، کیونکہ روزہ دار کھانے پینے وغیرہ لذائذ مرغوبات سے بے تعلق ہو کر روحانی مدارج اور ملکوتی مقامات کی سیر کرتا ہے بعض کے نزدیک اس لفظ کا مصداق مہاجرین ہیں جو گھر بار سے بے تعلق ہو کر ''دارالاسلام'' میں سکونت پذیر ہوتے ہیں بعض نے ''مجاہدین'' کا ارادہ کیا ہے کہ مجاہد اپنی جان تک سے بے تعلق ہو کر خدا کے راستہ میں قربان ہونے کیلئے نکلتا ہے۔ بعض کی رائے میں یہ لفظ طلبہ علوم کیلئے ہے جو وطن کنبہ، راحت و آسائش وغیرہ سب کو خیر باد کہہ کر طلب علم کیلئے نکل کھڑے ہوتے ہیں بہرحال مترجم محققؒ نے جو ترجمہ کیا، اس میں ان سب اقوال کی گنجائش ہے مگر اکثر سلف کے نزدیک پہلی تفسیر مختار ہے۔ واللہ اعلم۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ شاید بے تعلق رہنے سے مراد یہ ہو کہ دنیا میں دل نہ لگائے۔ (تفسیر عثمانی)

روزہ کا اجر: حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آدم زاد کے ہر نیک عمل کا اجر دس گنے سے سات سو گنے تک بڑھا دیا جاتا ہے۔ سوائے روزہ کے جس کے متعلق اللہ نے فرمایا ہے کہ روزہ میرے لئے ہے میں ہی اس کی جزا دوں گا۔ بندہ میرے لئے اپنی خواہش صنفی اور کھانا ترک کرتا ہے۔ الحدیث متفق علیہ۔

طالب علم کے فضائل

عکرمہ نے کہا ہے سیاحت کرنے والوں سے مراد طالب علم ہیں، جو علم کی طلب میں ملکوں میں پھرتے ہیں حضرت ابودرداءؓ کا بیان ہے میں نے خود سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے جو طلب علم کی راہ میں چلتا ہے اللہ اس کو جنت کے راستہ پر چلائے جائے گا اور فرشتے طالب علم کیلئے اپنے پر بچھا دیتے ہیں اور عالم کے لئے دعائے مغفرت کرتے ہیں وہ (ملائکہ) جو آسمانوں میں ہیں اور وہ (ملائکہ اور انس وجن) جو زمین میں ہیں اور پانی کے اندر مچھلیاں۔ عالم کی برتری عابد پر ایسی ہے جیسی چودھویں رات کے چاند کی فضیلت دوسرے ستاروں پر علماء انبیاء کے (علم کے) وارث ہیں اور انبیاء نے کوئی درہم و دینار میراث میں نہیں چھوڑا بلکہ علم کی میراث چھوڑی اب جو اس ترکہ کا وارث ہوا وہ بڑا خوش نصیب ہے۔ رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ وابوداؤد۔ (تفسیر مظہری)

اَلرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ
رکوع کرنیوالے سجدہ کرنے والے حکم کرنے والے نیک بات کا
وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ
اور منع کرنے والے بری بات سے

یعنی خود درست ہونے کے ساتھ دوسروں کو بھی درست کرتے ہیں۔ گویا ان کا کام ہے عبادت حق اور خیر خواہی خلق۔ (تفسیر عثمانی)

افضل عمل:

حضرت ابن مسعود کا بیان ہے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کونسا عمل اللہ کو سب سے زیادہ پسند ہے فرمایا وقت پر نماز۔ میں نے عرض کیا اس کے بعد کونسا۔ فرمایا ماں باپ کی فرماں برداری کرنی۔ میں نے عرض کیا اس کے بعد کونسا۔ فرمایا اللہ کی راہ میں جہاد۔ صحیح بخاری وصحیح مسلم۔ ابونعیم نے فضل بن وکین کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، نماز دین کا ستون ہے۔

نماز کے فضائل:

ابن عساکر نے حضرت انس کی روایت سے بیان کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نماز مومن کا نور ہے۔ قضاعی نے حضرت علیؓ کی روایت سے بیان کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر تقویٰ والے کیلئے نماز (اللہ کے) قرب کا ذریعہ ہے۔ مسلم ابوداؤد اور نسائی نے حضرت ابوہریرہ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سجدہ کی حالت میں بندہ اپنے رب سے سب حالتوں سے زیادہ قریب ہوتا ہے پس تم دعا زیادہ کیا کرو۔ (تفسیر مظہری)

وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾
اور حفاظت کرنیوالے ان حدود کی جو باندھی اللہ نے اور خوشخبری سنا دے ایمان والوں کو

حد سے نہ بڑھو: یعنی نیکی بدی کی جو حدود حق تعالیٰ نے معین فرمادی ہیں، ان سے تجاوز نہ کرے۔ خلاصہ یہ کہ بے حکم شرع کوئی قدم نہ اٹھائے۔ یہ سب صفات ان مومنین کی ہوئیں جو جان ومال سے خدا کے ہاتھ پر بک چکے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

صحیح بخاری میں ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عنقریب وہ زمانہ آنے والا ہے جب کہ کسی کا بہترین مال اس کی بکریاں ہوں گی، جن کو وہ پہاڑیوں میں اور بارش گاہوں میں ہانکے لئے پھرتا ہوگا اور فتنوں سے بچنے کے لئے اپنے دین کو لئے بھاگتا ہوگا۔ (تفسیر ابن کثیر)

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ
لایق نہیں نبی کو اور مسلمانوں کو
يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى
کہ بخشش چاہیں مشرکوں کی اور اگرچہ وہ ہوں قرابت والے
مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۳﴾
جبکہ کھل چکا ان پر کہ وہ ہیں دوزخ والے

مشرکین کیلئے دُعاء استغفار منع ہے:

مومنین جب جان ومال سے خدا کے ہاتھ بیع ہو چکے تو ضروری ہے کہ تنہا اسی کے ہوکر رہیں۔ اعداء اللہ سے جن کا دشمن خدا اور جہنمی ہونا معلوم ہو چکا ہو۔ محبت ومہربانی کا واسطہ نہ رکھیں۔ خواہ یہ دشمنان خدا ان کے ماں باپ، چچا، تایا اور خاص بھائی بند ہی کیوں نہ ہوں۔ جو خدا کا باغی اور دشمن ہے وہ ان کا دوست کیسے ہوسکتا ہے پس جس شخص کی بابت پتہ چل جائے کہ بالیقین دوزخی ہے خواہ وحی الٰہی کے ذریعہ سے یا اس طرح کہ علانیہ کفر وشرک پر اس کو موت آ چکی ہو، اس کے حق میں استغفار کرنا اور بخشش مانگنا ممنوع ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ حضرت آمنہ کے بارہ میں نازل ہوئی۔ بعض احادیث میں مذکور ہے کہ آپ کے چچا ابوطالب کے حق میں اتری۔ اور بعض نے نقل کیا ہے کہ مسلمانوں نے چاہا کہ اپنے آباء مشرکین کیلئے جو مر چکے تھے استغفار کریں۔ اس آیت میں ان کو منع کیا گیا۔ بہرحال شان نزول کچھ ہو حکم یہ ہے کہ کفار ومشرکین کے حق میں جن کا خاتمہ کفر وشرک پر معلوم ہو جائے، استغفار جائز نہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین محترمین:

(تنبیہ): حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کے بارہ میں علمائے اسلام کے اقوال بہت مختلف ہیں۔ بعض نے ان کو مومن وناجی ثابت کرنے کیلئے مستقل رسائل لکھے ہیں۔ اور شراح حدیث نے محدثانہ ومتکلمانہ بحثیں کی ہیں۔ احتیاط وسلامت روی کا طریقہ اس مسئلہ میں یہ ہے کہ زبان بند رکھی جائے۔ اور ایسے نازک مباحث میں خوض کرنے سے احتراز کیا جائے۔ حقیقت حال کو خدا ہی جانتا ہے اور وہ ہی تمام مسائل کا ٹھیک ٹھیک فیصلہ کرنے والا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت ابوطالب:

شیخین نے صحیحین میں سعید بن مسیّب کے باپ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ابوطالب کے مرنے کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے ابوجہل اور عبداللہ بن ابی امیہ بن مغیرہ کو وہاں موجود پایا۔ آپ نے ابوطالب سے فرمایا چچا لا الہ الا اللہ ایک بار کہہ دیجئے تاکہ اللہ کے سامنے میں آپ کی طرف سے اس کو دلیل کے طور پر پیش کرسکوں ابوجہل اور عبداللہ بولے ابوطالب کیا تم عبدالمطلب کے دین سے پھر جاؤ گے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (بار بار) کلمہ توحید پیش کرتے رہے اور ابوجہل وعبداللہ اپنی بات برابر کہتے رہے آخر ابوطالب نے کہا عبدالمطلب کے مذہب پر۔ ایک روایت میں اتنا اور بھی آیا ہے کہ ابوطالب نے لا الہ الا اللہ کہنے سے انکار کردیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا واللہ جب تک مجھے ممانعت نہیں کردی جائیگی میں آپ کی مغفرت کیلئے دعا کرتا رہوں گا۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ

زندہ مشرکین کیلئے دُعاء:

اس آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ زندہ مشرکوں کیلئے دعائے مغفرت جائز ہے کیونکہ ایسی دعاء کا معنی ہے مشرکوں کو توفیق ایمان ملنے کی درخواست (اور اس میں کوئی حرج نہیں بلکہ مستحسن ہے)

مسلم نے حضرت ابوہریرہؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا سے فرمایا تھا لا الہ الا اللہ کہہ دیجئے میں قیامت کے دن آپ کے لئے اس کی شہادت دوں گا چچا نے کہا اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ قریش عار دلائیں گے اور کہیں گے کہ ابوطالب نے ڈر کر ایسا اقرار کرلیا تو میں یہ کلمہ کہہ کر تمہاری آنکھیں ٹھنڈی کردیتا اس پر اللہ نے آیت اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ نازل فرمائی۔

ابوطالب کیلئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت:

بخاری نے حضرت ابوسعید خدری کا قول نقل کیا ہے۔ حضرت ابوسعید نے فرمایا میں نے خود سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا کا تذکرہ آنے کے وقت فرمایا شاید قیامت کے دن ان کو میری شفاعت (کچھ) فائدہ پہنچائے اور ان کو ٹخنوں ٹخنوں تک آگ میں کردیا جائے جس سے ان کا دماغ

ابلنے لگے۔ ابوہریرہ کی روایت کردہ حدیث سے ثابت ہو رہا ہے کہ آیت مندرجہ بالا مکہ میں ابوطالب کے حق میں نازل ہوئی۔

ترمذی اور حاکم نے بیان کیا اور ترمذی نے اس روایت کو حسن بھی کہا ہے کہ حضرت علی نے فرمایا، میں نے ایک شخص کو اپنے مشرک ماں باپ کے لئے دعائے مغفرت کرتے سنا تو میں نے کہا کیا تو اپنے ماں باپ کیلئے دعائے مغفرت کر رہا ہے باوجودیکہ وہ مشرک تھے اس نے جواب دیا حضرت ابراہیمؑ نے بھی تو اپنے مشرک باپ کے لئے دعائے مغفرت کی تھی میں نے اس بات کا تذکرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کیا، اس پر آیت ماکان للنبی الخ نازل ہوئی۔

ممکن ہے یہ قصہ بھی ابوطالب کی موت کے واقعہ ہی کے زمانہ میں ہوا ہو (اور دونوں واقعات آیت مذکورہ کے نزول کا سبب ہوں)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کو مومن ثابت کرنے کیلئے سیوطی نے چند رسائل لکھے ہیں بلکہ آدمؑ تک آپ کے تمام آباء واجداد وامہات کے ایمان کو ثابت کیا ہے۔ میں نے ان سب کا خلاصہ کر کے اس موضوع پر ایک رسالہ تقدیس آباء النبی صلی اللہ علیہ وسلم تالیف کر دیا ہے اس جگہ اس موضوع پر زیادہ تفصیل سے بحث کرنے کی گنجائش نہیں۔ (تفسیر مظہری)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی والدہ محترمہ کیلئے دُعاء کی اجازت مانگنا:

مسند امام احمد میں ہے کہ بریدہؓ نے روایت کی کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے اور سفر میں تھے کہ ایک جگہ اترے اور ہم تقریباً ایک ہزار سوار تھے۔ آپ نے یہاں دو رکعتیں پڑھیں، پھر ہماری طرف متوجہ ہوئے تو ہم نے دیکھا کہ آپ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ عمر بن خطابؓ آپ کے پاس آئے اور کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میرے ماں باپ آپ پر قربان آپ کیوں رو رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے خدا سے درخواست کی تھی کہ میری ماں کیلئے استغفار کی مجھے اجازت دے لیکن اللہ تعالیٰ نے اجازت نہیں دی، تو آگ کے خوف سے ماں پر میرا دل بڑا دکھا اور میری آنکھیں اشک آلود ہو گئیں میں نے قبل ازیں تم کو تین باتوں سے منع کیا تھا، زیارت قبور، سے لیکن اب قبور کی زیارت کر سکتے ہو صرف اس غرض سے کہ گورستان جانے سے تمہیں اپنی موت یاد آ جائے اور تم نیکیوں کی طرف مائل ہونے لگو۔ میں نے قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ اٹھا رکھنے پر منع کیا تھا، اب چاہے جتنا کھاؤ اور جتنا ذخیرہ کر رکھو۔ اور برتنوں سے پینے کے بارے میں میری ممانعت تھی، اب چاہے جس برتن سے پیو لیکن کوئی نشہ والی چیز نہ پینا۔ (تفسیر ابن کثیر)

ابوطالب کیلئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کوششیں:

واقعہ نزول اس آیت کا صحیح بخاری ومسلم کی روایت کے مطابق یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابوطالب اگرچہ مسلمان نہ ہوئے تھے مگر عمر بھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت وحفاظت کرتے رہے، اور اس معاملہ میں برادری کے کسی فرد کا کہنا نہیں مانا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کا بڑا اہتمام تھا کہ کسی طرح یہ کلمہ اسلام پڑھ لیں، اور ایمان لے آئیں تو شفاعت کا موقع مل جائے گا اور یہ جہنم کے عذاب سے بچ جائیں گے مرض وفات میں جب ان کا آخری وقت ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑی فکر تھی کہ اس وقت بھی کلمہ شریف پڑھ لیں تو کام ہو جائے، چنانچہ اس حالت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس پہنچے، مگر ابوجہل، عبداللہ بن امیہ پہلے سے وہاں موجود تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے چچا کلمہ لا الہ الا اللہ پڑھ لیں، تو میں آپ کی بخشش کیلئے کوشش کروں گا، مگر ابوجہل بول اٹھا کہ کیا آپ عبدالمطلب کے دین کو چھوڑ دیں گے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی مرتبہ پھر اپنا کلام دہرایا، مگر ہر مرتبہ ابوجہل یہی بات کہہ دیتا، یہاں تک کہ آخری کلام میں ابوطالب نے یہی کہا کہ میں عبدالمطلب کے دین پر ہوں، اسی حالت میں وفات ہو گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھائی کہ میں آپ کے لئے برابر استغفار کرتا رہوں گا۔ جب تک مجھے اس سے منع نہ کر دیا جائے۔ اس پر یہ آیت ممانعت کی نازل ہوئی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سب مسلمانوں کو کفار ومشرکین کے لئے دعاء مغفرت کرنے سے منع فرما دیا، اگرچہ وہ قریبی رشتہ دار ہی ہوں۔

قوم کیلئے دُعاء مغفرت:

غزوہ احد میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک کو کفار نے زخمی کر دیا تو آپ چہرہ سے خون صاف کرتے ہوئے یہ دعاء فرما رہے تھے، اللھم اغفر لقومی انھم لایعلمون ''یعنی یا اللہ میری قوم کی مغفرت فرما دے وہ نادان ہیں''، کفار کے لئے اس دعاء مغفرت کا حاصل بھی یہی ہے کہ ان کو ایمان واسلام کی توفیق عطا فرما دے کہ یہ مغفرت کے قابل ہو جائیں۔ (معارف مفتی اعظم)

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرٰهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا

اور بخشش مانگنا ابراہیم کا اپنے باپ کے واسطے سو نہ تھا مگر

عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ إِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ

وعدہ کے سبب کہ وعدہ کر چکا تھا اس سے پھر جب کھل گیا

أَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ ۚ إِنَّ إِبْرٰهِيمَ

ابراہیم پر کہ وہ دشمن ہے اللہ کا تو اس سے بیزار ہو گیا بیشک ابراہیم

لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾

بڑا نرم دل تھا تحمل کرنے والا

حضرت ابراہیمؑ کی اپنے والد کیلئے دُعاء:

سورۂ مریم میں ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ نے قبول حق سے اعراض کیا اور ضد وعناد سے حضرت ابراہیمؑ کو قتل کی دھمکیاں دینے لگا، تو آپ نے والدین کا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے فرمایا، " سَلٰمٌ عَلَيْكَ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا "، یعنی میں خدا سے تیرے لئے استغفار کرونگا۔ اس وعدہ کے موافق آپ برابر استغفار کرتے رہے چنانچہ دوسری جگہ "واغفر لابی" فرمانے کی تصریح ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ابراہیم علیہ السلام ایک مشرک کی حالت شرک پر قائم رہتے ہوئے مغفرت چاہتے تھے، غرض یہ تھی کہ اس کو توفیق دے کہ حالت شرک سے نکل کر آغوش اسلام میں آجائے اور قبول اسلام اس کی خطاؤں کے معاف ہونے کا سبب بنے۔ "ان الاسلام یهدم ما کان قبله" ابراہیم علیہ السلام کے استغفار کو قرآن میں پڑھ کر بعض صحابہ کے دلوں میں خیال آیا کہ ہم بھی اپنے مشرک والدین کے حق میں استغفار کریں اس کا جواب حق تعالیٰ نے دیا کہ ابراہیمؑ نے وعدہ کی بناء پر صرف اس وقت تک اپنے باپ کے لئے استغفار کیا۔ جب تک یقینی طور سے یہ واضح نہیں ہوا تھا کہ اسے کفر وشرک اور خدا کی دشمنی پر مرنا ہے۔ کیونکہ مرنے سے پہلے احتمال تھا کہ توبہ کر کے مسلمان ہو جائے اور بخشا جائے پھر جب کفر وشرک پر خاتمہ ہونے سے صاف کھل گیا کہ وہ حق کی دشمنی سے باز آنے والا نہ تھا تو ابراہیم علیہ السلام اس سے بالکلیہ بیزار ہو گئے۔ اور دعاء واستغفار وغیرہ ترک کر دیا پہلے نرم دلی اور شفقت سے دعا کرتے تھے۔ جب توبہ ورجوع کے احتمالات منقطع ہو گئے، تو آپ نے اس کی خیر خواہی سے ہاتھ اٹھالیا۔ اور اس حادثہ کو پیغمبرانہ صبر وتحمل سے برداشت کیا۔ حدیث میں ہے کہ محشر میں ابراہیم علیہ السلام عرض کرینگے کہ خداوندا! تیرا وعدہ ہے کہ مجھے رسوا نہ کریگا۔ مگر اس سے زیادہ کیا رسوائی ہوگی کہ آج میرا باپ سب کے سامنے دوزخ میں پھینکا جائے۔ اسی وقت ان کے باپ کی صورت مسخ ہو کر ضبع (کفتار) کی سی ہو جائیگی اور فرشتے گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دینگے۔ شاید یہ اس لئے ہے کہ لوگ اسے پہچان نہ سکیں۔ کیونکہ رسوائی کا دارومدار شناخت پر ہے۔ جب شناخت نہ رہے گی کہ کیا چیز دوزخ میں پھینکی گئی۔ پھر بیٹے کی رسوائی کا کچھ مطلب نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

تحمل کرنے والا:

عقبہ بن عامرؓ سے مروی ہے کہ ذوالنجادین نامی ایک شخص کے بارے میں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ اواہ ہے۔ جہاں کہیں قرآن میں اللہ کا نام آجاتا تو یہ شخص دعا کا ایک نعرہ بلند کرتا۔ ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ صبح کے وقت تسبیح کی جو پابندی کرتا ہے اس کو اواہ کہتے ہیں۔ ابوایوب کہتے ہیں کہ اواہ وہ ہے جو اپنے خطایا کو یاد کر کے استغفار کرتا رہے۔ مسلم بن بیان کہتے ہیں کہ ایک آدمی کثرت سے ذکر وتسبیح کرتا تھا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو 'اواہ' کہا۔ (تفسیر ابن کثیر)

کعب احبار نے کہا اواہ وہ شخص ہے جو اللہ کے خوف کی وجہ سے بہت زیادہ آہیں کھینچے (آہ آہ کرے) حضرت ابراہیم اپنی زندگی میں دوزخ کے خوف سے بکثرت آہیں بھرتے تھے۔ بعض نے کہا کہ گناہوں کی وجہ سے آہیں بھرنے والے کو آہ آہ کہا جاتا ہے۔ مال اور حاصل دونوں قولوں کا ایک ہی ہے (کہ بکثرت آہیں کھینچنے والے کو اواہ کہا جاتا ہے خواہ اللہ کے خوف اور دوزخ کے ڈر سے ہو یا اپنے گناہوں کے اندیشہ سے)

زجاج نے کہا ابوعبیدہ کا قول ان تمام معانی کو جامع ہے جو اواہ کے بیان کیے جاتے ہیں۔ حلیم کا معنی ہے دوسروں کی ضرررساں حرکتوں سے درگذر کرنے والا (بردبار) حضرت ابراہیم حلیم تھے باوجودیکہ باپ نے ان سے کہا تھا کہ اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے پتھر مار مار کر ہلاک کر دوں گا۔ لیکن حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا آپ کو (دوزخ سے) سلامتی نصیب ہو میں اپنے رب سے آپ کیلئے دعائے مغفرت کروں گا۔ (تفسیر مظہری)

حضرت عبدالمطلب کا دین:

ابن سعد نے طبقات میں اپنی خصوصی سندوں سے بیان کیا ہے کہ عبدالمطلب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کھلائی ام ایمن سے کہا اے برکت میرے بیٹے کی طرف سے غفلت نہ کر میں نے بیری کے درخت کے پاس اس کو دیکھا تھا۔ اور اہل کتاب کہتے ہیں کہ میرا یہ بیٹا اس امت کا پیغمبر ہے۔ بات یہ ہے کہ عبدالمطلب دور جاہلیت میں تھے، آسمانی شریعتوں سے ناواقف تھے وہ زمانہ فترت کا تھا اور فترت کے زمانہ میں صرف توحید کا اقرار کافی ہے (فترت اس مدت کو کہتے ہیں جس میں گزشتہ پیغمبر کی شریعت مٹ چکی ہو کالعدم ہو۔ اصل شریعت گم ہو چکی ہو اور نیا پیغمبر ابھی آیا نہ ہو) تمام شرائع سے عبدالمطلب کی ناواقفیت ابوجہل کو معلوم تھی اس کی وجہ سے اس کو اور ابوطالب کو یہ خیال قائم کرنے کا موقع ملا کہ عبدالمطلب کے مذہب کے خلاف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی نیا مذہب پیش کر رہے ہیں اور ان کا جدید دین عبدالمطلب کے دین سے ٹکراتا ہے اس لئے ابوطالب نے کہہ دیا کہ میں عبدالمطلب کے دین پر ہوں۔

صحیح حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اولاد آدمؑ کے

جتنے قرون (صدیاں) گذرے ان سب میں سے بہترین دور میں میں مبعوث ہوا (یعنی میرے آباؤ اجداد بہترین قرون میں قرن درقرن گذرتے گئے آخری قرن جو سب سے بہتر قرن ہے میری بعثت کا قرن ہے) اس حدیث کے صحیح ہوتے ہوئے کیسے کہا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ آباؤ اجداد میں کوئی کافر گذرا ہے۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ
اور اللہ ایسا نہیں کہ گمراہ کرے کسی قوم کو جبکہ ان کو راہ پر لا چکا
حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ
جب تک کھول نہ دے ان پر جس سے ان کو بچنا چاہئے بیشک اللہ ہر
شَیْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾
چیز سے واقف ہے

یعنی اتمام حجت اور اظہار حق سے پہلے خدا کسی کو گمراہ نہیں کرتا۔ گمراہی یہ ہے کہ جب خدا اپنے احکام صاف کھول کر بیان کر چکا پھر امتثال نہ کیا جائے۔ گویا اشارہ کر دیا کہ جو لوگ ممانعت سے قبل مشرکین کیلئے استغفار کر چکے ہیں ان پر مواخذہ نہیں۔ لیکن اب اطلاع پانے کے بعد ایسا کرنا گمراہی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يُحْيٖ
اللہ ہی کی سلطنت ہے آسمانوں اور زمین میں جلاتا ہے
وَيُمِيْتُ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ
اور مارتا ہے اور تمہارا کوئی نہیں اللہ کے
وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۱۶﴾
سوا حمایتی اور نہ مددگار

حکم خدا ہی کا چلے گا:

جب اس کی سلطنت ہے تو اسی کا حکم چلنا چاہیے وہ علم محیط اور قدرت کاملہ سے جو احکام نافذ کرے بندوں کا کام ہے کہ بے خوف وخطر تعمیل کریں۔ کسی کی رورعایت کو دخل نہ دیں، کیونکہ خدا کے سوا کوئی کام آنے والا نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

فرشتوں کا عبادت کرنا:

حکیم بن حزامؓ سے مروی ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ نے فرمایا کیا تم وہ سنتے ہو جو میں سنتا ہوں تو لوگوں نے کہا کہ ہم تو کچھ نہیں سن رہے ہیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں آسمان کا چرچرانا سن رہا ہوں اور وہ بوجھوں کیوں نہ دبے اور کیوں نہ چرچرائے آسمان میں بالشت بھر جگہ بھی تو ایسی نہیں جہاں کوئی نہ کوئی فرشتہ سجدہ یا قیام میں موجود نہ ہو۔ کعب الاحبارؒ کہتے ہیں کہ سوئی کی نوک برابر بھی کوئی جگہ زمین میں ایسی نہیں جہاں کوئی فرشتہ تسبیح خدا میں مصروف نہ ہو اور آسمان کے فرشتے ذرات زمین سے زیادہ تعداد میں ہیں اور عرش کے حامل فرشتوں کے ٹخنے سے ساق تک کی مسافت ایک سو برس کی مسافت ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ
اللہ مہربان ہوا نبی پر اور مہاجرین
وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ
اور انصار پر جو ساتھ رہے نبی کے مشکل کی
الْعُسْرَةِ
گھڑی میں

غزوہ تبوک کی مشکلات:

مشکل کی گھڑی سے مراد ''غزوہ تبوک'' کا زمانہ ہے۔ جس میں کئی طرح کی مشکلات جمع تھیں۔ سخت گرمی، طویل مسافت، کھجور کا موسم، اس زمانہ کی عظیم الشان سلطنت کے مقابلہ پر فوج کشی، پھر ظاہری بے سروسامانی ایسی کہ ایک ایک کھجور روزانہ دو دو سپاہیوں پر تقسیم ہوتی تھی۔ اخیر میں یہ نوبت پہنچ گئی کہ بہت سے مجاہدین ایک ہی کھجور کو یکے بعد دیگرے چوس کر پانی پی لیتے تھے۔ پھر پانی کے فقدان سے اونٹوں کی آلائش نچوڑ کر پینے کی نوبت آ گئی۔ سواری کا اتنا قحط تھا کہ دس دس آدمی ایک ایک اونٹ پر اترتے چڑھتے چلے جارہے تھے۔ یہ ہی وہ جذبہ ایثار وفدا کاری تھا جس نے مٹھی بھر جماعت کو تمام دنیا کی قوموں پر غالب کر دیا۔ فللہ الحمد والمنہ۔ (تفسیر عثمانی)

ساعت سے مراد ہے وقت۔ عسرت، سختی۔ اس غزوہ میں مسلمانوں کے لئے سواری زادراہ اور پانی کی بہت تنگی اور دشواری تھی۔ اس لئے غزوہ تبوک کو غزوہ العسر یا غزوہ جیش العسرت کہا جاتا ہے۔ غزوۃ الجیش بھی اسی کو کہتے ہیں۔ کذا قال البغوی۔

سواریوں اور غذاء کی قلت:

حسن نے کہا دس دس آدمیوں کے لئے صرف ایک ایک اونٹ تھا، باری باری سے دس آدمی ایک ہی اونٹ پر سوار ہوجاتے تھے۔ ایک اترتا تھا تو دوسرا

چڑھتا تھا، زادراہ کے لئے گھنے ہوئے چھوارے اور خراب قسم کے جو تھے جو کچھ ساتھ تھا لوگ اس کو باہم تقسیم کرلیا کرتے تھے پھر نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ بعض لوگ انتہائی بھوک کی وجہ سے ایک چھوارہ لے کر منہ میں گھماتے اور جب مزہ لے لیتے تو اپنے ساتھی کو دیدیتے اور وہ اس کو چوستا پھر ایک گھونٹ اوپر سے پانی پی لیتا، اس طرح ایک ہی چھوارہ سب لوگ باری باری سے چوستے اور چوسنے میں ہی چھوارہ ختم ہوجاتا صرف گٹھلی رہ جاتی لیکن ایمان ویقین کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلے جاتے تھے۔

امام احمد، ابن خزیمہ، ابن حبان اور حاکم نے حضرت عمرؓ بن خطاب کی روایت سے بیان کیا حضرت عمر نے فرمایا ہم سخت گرمی کے دنوں میں (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب) تبوک کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔ ایک پڑاؤ پر اترے اور اتنی پیاس لگی کہ ہم نے خیال کیا اب ہماری گردنیں ٹوٹ جائیں گی بعض لوگ پانی کی تلاش میں جاتے اور خیال ہوتا کہ یہ زندہ لوٹ کر نہ آئے گا۔ بعض لوگ اپنا اونٹ ذبح کرکے اس کے اوجھ سے پانی نکال کر نچوڑ کر پی لیتے اور جو کچھ باقی رہتا اس کو اپنے کلیجے پر رکھ لیتے۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ نے دعائے خیر کا آپ کو عادی بنادیا ہے (یعنی آپ دعائے خیر کرتے ہی ہیں اور اللہ آپ کی دعا قبول فرماتا ہے) اللہ سے ہمارے لئے دعا کردیجئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، کیا تم اس کو پسند کرتے ہو، حضرت ابوبکر نے عرض کیا جی ہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھادیئے اور لوٹا کر نیچے نہ لانے پائے تھے کہ بادل اٹھ کر (لشکر پر) چھا گیا پھر اتنی بارش ہوئی کہ لوگوں کے پاس جو برتن تھے وہ سب نے بھر لئے۔ اس کے بعد جو ہم دیکھنے چلے (کہ کہاں کہاں بارش ہوئی) تو معلوم ہوا لشکر سے آگے کہیں بارش نہیں ہوئی۔

دُعاء سے بارش برسنا:

ابن ابی حاتم نے حضرت ابوحرزہ انصاری کی روایت سے بیان کیا کہ لوگ (تبوک کے راستہ میں) حجر میں اترے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا یہاں کا پانی کوئی نہ لے پھر (وہاں سے) کوچ کرنے کے بعد دوسرے پڑاؤ پر اترے پانی کسی کے پاس نہ تھا لوگوں نے پانی نہ ہونے کی شکایت کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعت نماز پڑھ کر دعا کی اللہ نے فوراً ایک بادل بھیج دیا جس سے اتنی بارش ہوئی کہ سب سیراب ہوگئے۔ ایک انصاری نے اپنے ساتھی سے جس کو لوگ منافق سمجھتے تھے کہا ارے دیکھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعا کرنے سے اللہ نے ہم پر بارش کردی وہ کہنے لگا۔ بارش تو فلاں فلاں ستاروں (کے طلوع اور گردش) کی وجہ سے ہوئی ہے۔

حضرت ابوذرؓ کی شرکت اور بشارت:

محمد بن عمر کا بیان ہے ابوذر فرماتے تھے میں غزوہ تبوک میں اپنے اونٹ کی وجہ سے پیچھے رہ گیا تھا (ساتھ نہ جاسکا تھا) اونٹ بہت کمزور اور دبلا تھا میں نے خیال کیا کہ اس کو چند روز چارہ گوت (یعنی خوراک) دیدوں پھر پیچھے سے (تیزی کے ساتھ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جاملوں گا چنانچہ میں چندروز تک اس کو چارہ دیتا رہا پھر روانہ ہوکر ذی المودہ میں پہنچا تھا کہ اونٹ اڑ گیا میں نے دن بھر اس پر محنت کی مگر وہ اپنی جگہ سے نہ ہلا آخر میں نے اپنا سامان اپنے اوپر لادا اور (چل دیا)۔ دوپہر کو ایسے مقام پر پہنچ گیا جہاں سے رسول اللہ پر نظر پڑ رہی تھی (جانے والے) مسلمانوں میں سے کسی مسلمان نے مجھے دیکھ لیا اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ شخص تنہا پیدل چل رہا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابوذر ہو (تو اچھا ہے) لوگوں نے میری طرف غور سے دیکھا اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی قسم یہ ابوذر ہی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابوذر پر اللہ کی رحمت ہو تنہا جارہا ہے اکیلا مرے گا اور اکیلا اٹھایا جائے گا۔ محمد بن یوسف صالحی نے کہا ہوا بھی ایسا ہی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ گئے اور اپنی سرگزشت بتائی تو فرمایا ابوذر میرے پاس پہنچنے تک تو نے جو قدم اٹھایا، اللہ نے اس کے عوض تیرا ایک گناہ معاف کیا۔ (تفسیر مظہری)

تین پیچھے رہ جانے والے حضرات کی توبہ کی قبولیت:

مسند عبدالرزاق کی روایت میں ہے کہ اس وقت ہماری توبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک تہائی رات گذرنے کے وقت نازل ہوئی، ام المومنین حضرت ام سلمہؓ جو اس وقت حاضر تھیں انہوں نے عرض کیا کہ اجازت ہو تو کعب بن مالکؓ کو اسی وقت اس کی خبر کردی جائے آپ نے فرمایا کہ ایسا ہوا تو ابھی لوگوں کا ہجوم ہوجائیگا۔ رات کی نیند مشکل ہوجائیگی۔

کعب بن مالکؓ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کیلئے نکلا تو لوگ جوق در جوق مجھے مبارکباد دینے کیلئے آرہے تھے، کعبؓ فرماتے ہیں کہ میں مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں داخل ہوا تو دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں آپ کے گرد صحابہ کرام کا مجمع ہے مجھے دیکھ کر سب سے پہلے طلحہ بن عبیداللہ کھڑے ہوکر میری طرف لپکے اور مجھ سے مصافحہ کرکے قبول توبہ پر مبارک باد دی، طلحہؓ کا یہ احسان میں کبھی نہیں بھولتا، جب میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک خوشی کی وجہ سے چمک رہا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے کعبؓ! بشارت ہو تمہیں ایسے مبارک دن کی جو تمہاری عمر میں پیدائش سے لے کر آج تک سب سے زیادہ بہتر دن ہے، میں نے

عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ حکم آپ کی طرف سے یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے؟ آپ نے فرمایا کہ نہیں، یہ حکم اللہ تعالیٰ کا ہے، تم نے سچ بولا تھا اللہ تعالیٰ نے تمہاری سچائی کو ظاہر فرما دیا۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

بوقت تنگدستی آشنا بیگانہ می گردد
صراحی چون شود خالی جدا پیمانہ می گردد

ایسے مشکل وقت میں جہاں ہر طرف سے مشقتوں اور صعوبتوں کا ہجوم ہو ضعف بشری کے بناء پر دل میں وساوس کا آجانا اگرچہ گناہ نہیں مگر محبین صادقین کے شایان شان نہیں قانون محبت کے لحاظ سے ان پر گرفت ہوسکتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے خیالات اور خطرات سے درگزر فرمایا بلکہ اس تنگدستی اور سختی کے وقت میں ساتھ دینے کی وجہ سے ان کی تمام لغزشوں اور خطاؤں کو معاف کر دیا جیسا کہ اہل بدر کے بارہ میں فرمایا تھا اعملوا ماشئتم فقد غفرت لکم۔ بدر پہلا غزوہ تھا اور تبوک آخری غزوہ تھا جو عسرت اور شدت میں غزوہ بدر سے کہیں زیادہ تھا اس لئے اس آخری غزوہ میں شریک ہونے والے حق تعالیٰ کی خاص الخاص عنایات اور توجہات کے مورد بنے۔ (معارف القرآن کاندھلوی رحمہ اللہ)

مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ

بعد اس کے کہ قریب تھا کہ دل پھر جائیں بعضوں کے ان میں سے

ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ

پھر مہربان ہوا ان پر بیشک وہ ان پر مہربان ہے رحم کرنے والا

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ پر اللہ کی مہربانیاں

خدا کی مہربانیاں پیغمبر علیہ السلام پر بے شمار ہیں اور آپ کی برکت سے مہاجرین وانصار پر بھی حق تعالیٰ کی مخصوص توجہ اور مہربانی رہی ہے کہ ان کو ایمان وعرفان سے مشرف فرمایا، اتباع نبوی، جہاد فی سبیل اللہ اور عزائم امور کے سرانجام دینے کی ہمت وتوفیق بخشی۔ پھر ایسے مشکل وقت میں جبکہ بعض مومنین کے قلوب بھی مشکلات اور صعوبتوں کا ہجوم دیکھ کر ڈگمگانے لگے تھے قریب تھا کہ رفاقت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے ہٹ جائیں۔ حق تعالیٰ نے دوبارہ مہربانی اور دستگیری فرمائی کہ ان کو اس قسم کے خطرات ووساوس پر عمل کرنے سے محفوظ رکھا اور مومنین کی ہمتوں کو مضبوط اور ارادوں کو بلند کیا۔

وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ۭ

اور ان تین شخصوں پر جن کو پیچھے رکھا تھا

غزوۂ تبوک میں تین پیچھے رہ جانے والے:

یہ تین شخص کعب بن مالک، ہلال بن امیہ اور مرارہ بن الربیع ہیں۔ جو باوجود مومن مخلص ہونے کے محض تن آسانی اور سہل انگاری کی بناء پر بدون عذر شرعی کے تبوک کی شرکت سے محروم رہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لائے تو نہ انہوں نے منافقین کی طرح جھوٹے عذر پیش کئے اور نہ بعض صحابہ کی طرح اپنے کو ستونوں سے باندھا جو واقعہ تھا صاف صاف عرض کر دیا، اور اپنی کوتاہی اور تقصیر کا علانیہ اعتراف کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ منافقین کی طرف سے بظاہر اغماض کر کے ان کے بواطن کو خدا کے سپرد کیا گیا۔ ''اصحاب سواری'' کی (یعنی جو مسجد کے ستونوں سے بندھے ہوئے تھے) توبہ قبول کر لی گئی۔ اور ان تینوں کا فیصلہ تادیباً کچھ مدت کے لئے ملتوی رکھا گیا۔ پچاس دن گذرنے کے بعد ان کی توبہ قبول ہوئی پیچھے رکھے جانے کا یہی مطلب ہے جیسا کہ بخاری میں خود کعب بن مالک سے نقل کیا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

واقعہ کی تفصیل

حضرت کعب کی فضیلت:

شیخین نے صحیحین میں اور امام احمد وابن ابی شیبہ ابن اسحاق اور عبدالرزاق نے حضرت کعب بن مالک کا بیان نقل کیا ہے حضرت کعب نے فرمایا جس غزوہ پر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے میں کسی غزوہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سوائے غزوہ تبوک کے پیچھے نہیں رہا، ہاں غزوہ بدر میں ساتھ نہیں گیا تھا (اور بدر میں میرا شریک نہ ہونا قابل مواخذہ بھی نہ تھا کیونکہ) جو لوگ بدر کو نہ جاسکے ان میں سے کسی پر اللہ نے عتاب نہیں کیا وجہ یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے قافلہ کے ارادہ سے نکلے تھے (لڑائی کا ارادہ ہی نہ تھا) لیکن بغیر کسی مقررہ وعدہ کے دشمن سے بحکم خدا مڈبھیڑ ہوگئی۔ میں عقبہ والی رات میں بھی حاضر تھا (یعنی تیسرے عقبہ کے موقع پر جب انصار نے بیعت کی تھی میں بھی موجود تھا) وہاں ہم سب نے اسلام پر مضبوط عہد وپیمان کیا تھا، اگرچہ لوگوں میں بدر کی شہرت زیادہ ہے لیکن شب عقبہ کی حاضری کے مقابلہ میں بدر کی شرکت میرے خیال میں افضل نہیں ہے۔

حضرت کعب کے رہ جانے کی وجہ:

میرا واقعہ یہ ہوا کہ غزوہ تبوک کے زمانہ میں میں بڑا طاقت ور اور فراخ حال تھا۔ اس سے پہلے کبھی میں اتنا مرفہ الحال اور طاقت ور نہیں ہوا اس زمانہ میں پہلی ہی مرتبہ میرے پاس سواری کی دو اونٹنیاں ہوئیں اس سے پہلے میرے پاس کبھی دو سواریاں نہیں ہوئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قاعدہ تھا کہ جب کسی جہاد کا ارادہ کرتے تھے تو بطور توریہ کسی دوسرے جہاد کا نام لے

دیتے تھے اور فرماتے تھے لڑائی خفیہ تدبیر (کا نام) ہے۔ جب تبوک کے جہاد کا موقع آیا تو گرمی سخت تھی سفر طویل تھا راستہ میں بیابان تھے دشمنوں کی تعداد بہت تھی اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی تعداد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بہت تھی بقول مسلم دس ہزار مسلمان ساتھ تھے۔ حاکم نے اکلیل میں حضرت معاذ کی روایت سے لکھا ہے کہ غزوہ تبوک کو جانے کے وقت ہماری تعداد تیس ہزار سے بھی زائد تھی۔ ابوزرعہ نے کہا کسی کتاب میں ان کے نام محفوظ نہ تھے۔ زہری نے کہا کتاب سے مراد رجسٹر ہے جو آدمی بھی غیر حاضر ہونا چاہتا تھا وہ یہی سمجھتا تھا کہ جب تک میرے بارے میں اللہ کی طرف سے وحی نہ آئے میرا معاملہ پوشیدہ رہے گا (کسی کو پتہ نہ چلے گا) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ تبوک کا ارادہ ایسے وقت کیا جب پھل اور (درختوں کے) سایے خوشگوار ہو گئے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھ مسلمانوں نے تیاریاں کرلیں اور جمعرات کے دن روانہ ہو گئے آپ سفر میں خواہ جہاد کا ہو یا کسی اور غرض سے جمعرات کو روانہ ہونا ہی پسند فرماتے تھے میں بھی (روزانہ) صبح کو تیاری کرنے کے ارادہ سے گھر سے نکلتا تھا مگر بغیر کچھ کئے واپس آجاتا تھا اور دل میں کہتا تھا مجھ میں استطاعت ہے جب چاہوں گا فوراً کرلوں گا یونہی وقت ملتا رہا یہاں تک کہ گرمی سخت ہو گئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو ساتھ لے کر روانہ ہو گئے۔ اور میں اپنی کچھ بھی تیاری نہ کر سکا اور دل میں خیال کرلیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایک دو روز میں تیاری مکمل کر کے پیچھے سے جا پہنچوں گا۔ مسلمانوں کی روانگی کے بعد میں تیاری کرنے کیلئے صبح کو نکلا مگر بغیر کچھ کئے لوٹ آیا پھر دوسرے روز صبح کو نکلا تب بھی کچھ نہیں کیا۔ اسی طرح مدت بڑھتی گئی یہاں تک کہ لوگ اور دور چلے گئے اور تیزی کے ساتھ جہاد کی طرف بڑھ گئے اور میں ارادہ ہی کرتا رہا کہ (جلد) کوچ کر کے ان کو پیچھے سے جا لوں گا۔ کاش میں نے ایسا کرلیا ہوتا مگر میرے مقدر میں ہی نہیں تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روانگی کے بعد جب میں باہر نکل کر لوگوں کو دیکھتا تھا تو گھومنے کے بعد مجھے یا تو صرف وہ لوگ نظر آتے تھے جو منافق کہے جاتے تھے یا وہ کمزور لوگ دکھائی دیتے تھے جن کو اللہ نے معذور بنا دیا تھا اور کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ تبوک پہنچنے تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا تذکرہ نہیں کیا تبوک پہنچ کر ایک روز آپ صحابہ میں بیٹھے ہوئے تھے کہ دریافت فرمایا کعب بن مالک کو کیا ہو گیا بنی سلمہ کے یا میری قوم کے ایک آدمی نے (جس کا نام حسب روایت محمد بن عمر عبداللہ بن انیس سلمی تھا) کہا یارسول اللہ اس کو اس کی دو چادروں نے اور (غرور فخر کے ساتھ) اپنے دونوں پہلوؤں پر دیکھنے نے نہیں آنے دیا (یعنی آجکل وہ مرفہ الحال ہے ایک چادر باندھتا ہے ایک اوڑھتا ہے اور دونوں طرف گردن موڑ موڑ کر اپنے مونڈھوں کو دیکھتا ہے اسی وجہ سے وہ نہ آسکا) معاذ بن جبل یا ابوقتادہ نے کہا تم نے بری بات کہی (ایسا نہیں ہے) یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی قسم میں نے اس کے اندر سوائے اچھائی کے اور کچھ نہیں پایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی واپسی کی اطلاع:

کعب بن مالک کا بیان ہے جب مجھے اطلاع ملی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس آنے کیلئے چل پڑے ہیں تو مجھے بڑی فکر ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کرنے کیلئے عذر بنانے لگا اور ایسی بات کی تیاری کرنے لگا کہ کل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی سے میں کس طرح بچ سکوں گا۔ مختلف اہل الرائے اور گھر والوں سے میں نے اس معاملہ میں مدد بھی لی پھر جب مجھ سے کہا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قریب ہی آپہنچے ہیں تو میرے دل سے تمام غلط خیالات جاتے رہے اور میں سمجھ گیا کہ جس بات میں جھوٹ کی آمیزش ہوگی اس کے ذریعہ سے میں ناراضگی سے کبھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ میں نے سچ بولنے کا پختہ ارادہ کرلیا اور یقین کرلیا کہ سچائی ہی مجھے نجات دے سکتی ہے۔ صبح کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے۔

ابن سعد نے کہا رمضان میں (واپس پہنچے) کعب نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب (سفر سے واپس) آتے تھے تو دن چڑھے مدینہ میں پہنچتے تھے اور سب سے پہلے مسجد میں پہنچ کر دو رکعت نماز پڑھتے تھے پھر وہیں بیٹھ جاتے تھے پھر وہاں سے حضرت فاطمہؓ کے پاس تشریف لے جاتے تھے اس کے بعد امہات المومنین کے ہاں جاتے تھے۔ حسب دستور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے مسجد میں پہنچ کر دو رکعت نماز پڑھی پھر وہیں لوگوں کے (معاملات سننے کے) لئے بیٹھ گئے اب تبوک کی شرکت سے رہنے والے لوگ آنے لگے اور (اپنے اپنے) عذر پیش کرنے اور قسمیں کھانے لگے یہ سب لوگ کچھ اوپر اسی تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ظاہری عذر کو قبول کرلیا۔ ان سے بیعت لے لی اور ان کے لئے دعائے مغفرت کی اور ان کے باطن کو اللہ کے سپرد کر دیا۔

خدمتِ اقدس میں حاضری:

جب میں خدمت گرامی میں حاضر ہوا اور سلام کیا تو آپ مسکرا دیے مگر مسکراہٹ غصہ آلود تھی اور فرمایا آؤ۔ میں چلتا چلتا سامنے پہنچ کر بیٹھ گیا ابن عابد کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کعب کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ کعب نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میری طرف سے کیوں منہ پھیر لیا واللہ میں منافق نہیں ہوں، نہ مجھے (اسلام کی صداقت میں) کوئی شک ہے نہ میں (عقیدہ اسلام سے) بدل گیا ہوں فرمایا پھر تم (ساتھ جانے سے) کیوں رہ گئے کیا تم نے سواری نہیں خریدی تھی۔ میں نے عرض کیا بیشک (میں نے سواری بھی خرید لی تھی) یارسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر میں کسی اور دنیادار کے پاس اس وقت بیٹھا ہوتا تو خدا کی قسم کوئی عذر معذرت کر کے اس کی ناراضگی سے بچ جاتا کیونکہ مجھ میں قوت کلامیہ (اور دلیل کی طاقت) موجود ہے۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ اگر میں آپ کے سامنے جھوٹ بنا بھی دوں گا اور آپ راضی بھی ہو جائینگے تب بھی عنقریب اللہ آپ کو مجھ سے ناراض کر دے گا اور اگر سچ سچ کہدوں گا تو گو آپ ناراض ہو جائیں گے مگر امید ہے کہ اللہ مجھے معاف فرما دے گا۔ بخدا مجھے کوئی عذر نہ تھا، نہ اس سے پہلے میں اتنا طاقت ور اور فراخ حال (کبھی ہوا) تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس نے سچی بات کہدی اب تم اٹھ جاؤ اور اللہ جو کچھ چاہے گا تمہارے متعلق فیصلہ کر دے گا۔

بنی سلمہ کی ترغیب:

میرے سچ بولنے کی وجہ سے بنی سلمہ کے کچھ لوگ برانگیختہ ہو گئے اور کہنے لگے، تو نے اس سے پہلے تو کوئی جرم کیا نہ تھا نہ اتنا کمزور تھا کہ جس طرح دوسرے شرکت نہ کرنے والوں نے اپنی عدم شرکت کے عذر کئے (اور عتاب سے بچ گئے) تو کوئی عذر نہ پیش کر سکتا (آئندہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائے مغفرت تیرے (اس) گناہ کے معاف ہونے کے لئے کافی تھی۔ غرض وہ برابر مجھے ڈانٹتے اور سرزنش کرتے رہے اور اتنی سرزنش کی کہ میرا ارادہ ہو گیا کہ دوبارہ خدمت گرامی میں حاضر ہو کر اپنے پہلے قول کی تکذیب کر دوں لیکن میں نے کہہ دیا مجھ سے دو جرم یکجا نہیں ہو سکتے۔ جہاد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی نہیں گیا اور اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جھوٹ بھی بولوں۔

دو دوسرے حضرات:

پھر میں نے لوگوں سے دریافت کیا کیا میرے ساتھ ایسا کوئی اور بھی ہے جو تبوک کو نہیں گیا ہو (اور اس نے کوئی عذر تراشی بھی نہ کی ہو) لوگوں نے کہا ہاں دو آدمی اور بھی ہیں جنہوں نے اسی طرح کی بات کہی تھی جیسی تو نے کی تھی اور ان کو بھی وہی ہدایت کی گئی جو تجھے کی گئی میں نے پوچھا وہ دونوں کون ہیں لوگوں نے کہا مرارہ بن ربیع عمری اور ہلال بن امیہ واقفی۔

ابن ابی حاتم نے حسن تابعی کی مرسل روایت سے بیان کیا ہے کہ اول الذکر کے نہ جانے کی وجہ تو یہ ہوئی کہ ان کا ایک باغ تھا جو کھل چکا تھا (یعنی اس میں خوشے لٹک رہے تھے) انہوں نے اپنے دل میں کہا اس سے پہلے میں (بہت) جہاد کر چکا ہوں۔ اگر اس سال اپنے گھر ٹھہرا رہوں تو کیا ہرج ہے۔ لیکن جب ان کو اپنے جرم کا احساس ہوا تو کہنے لگے اے اللہ میں تجھے گواہ بناتا ہوں کہ اس کو تیری راہ میں خیرات کرتا ہوں (اسی نے مجھے جانے سے روکا ہے) اور دوسرے صاحب کا واقعہ یہ ہوا کہ ان کے گھر والے کہیں (سفر میں) منتشر تھے لوٹ کر آئے تو کہنے لگے اس سال (جہاد کو) نہ جاؤ ہمارے پاس رہو (تو کوئی ہرج نہیں) ان کو بھی اپنے جرم کا احساس ہوا تو انہوں نے (اللہ سے عہد کیا اور) کہا اے اللہ مجھ پر لازم ہے کہ میں اپنے گھر والوں کے اور مال کے پاس لوٹ کر نہ جاؤں گا (تاوقتیکہ تیرا جدید حکم نہ ہو)

کعب کا بیان ہے لوگوں نے میرے سامنے دو نیک آدمیوں کا نام لیا جو بدر میں شریک ہو چکے تھے اور جن کی پیروی کی جا سکتی تھی ان کا نام سن کر میں اپنی سابق بات پر قائم رہا۔

ان سے بولنے کی ممانعت:

جو لوگ تبوک کو نہیں گئے تھے ان میں سے صرف ہم تینوں سے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو کلام کرنے کی ممانعت فرما دی لوگ اس فرمان کے بعد ہمارے لئے بالکل بدل گئے۔ ابن ابی شیبہ کی روایت میں آیا ہے ہم صبح کو لوگوں میں نکلتے تھے مگر کوئی ہم سے سلام کلام نہیں کرتا تھا۔ نہ ہمارے سلام کا جواب دیتا تھا۔ عبدالرزاق کی روایت ہے۔ لوگ ایسے بدل گئے کہ گویا وہ ہم کو جانتے ہی نہیں ہیں در و دیوار اجنبی ہو گئے وہ در و دیوار ہی نہ رہے جن کو ہم پہچانتے تھے۔ میرے لئے سب سے زیادہ رنج آفرین یہ خیال تھا کہ اگر میں اسی حالت میں مر گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے جنازہ کی نماز بھی نہیں پڑھیں گے اور اگر اسی دوران میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی تو میری یہی حالت قائم رہے گی نہ کوئی مجھ سے کلام کرے گا نہ میرے جنازہ کی نماز پڑھے گا یہاں تک نوبت پہنچی کہ وہ سرزمین ہی میرے لئے اجنبی ہو گئی وہ بستی وہ نہ رہی جو میری شناسا تھی یہ حالت پچاس رات قائم رہی میرے دونوں ساتھی تو کمزور تھے وہ گھروں میں بیٹھ رہے مگر میں طاقت ور اور جوان تھا گھر سے نکل کر مسلمانوں کے ساتھ نماز میں شریک ہوتا تھا اور بازاروں میں گھومتا تھا مگر کوئی مجھ سے کلام سلام نہیں کرتا تھا۔ نماز کے بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے جلسہ میں بیٹھے ہوتے تو میں حاضر ہو کر سلام کرتا اور دل میں کہتا کیا حضور نے سلام کا جواب دینے کیلئے لب مبارک ہلائے یا نہیں پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ کر (دانستہ) نماز پڑھتا اور کن انکھیوں سے دیکھتا رہتا (کہ حضور کی توجہ میری طرف ہوئی یا نہیں) جب میں نماز کی طرف متوجہ ہوتا تو حضور میری طرف منہ کر لیتے لیکن جب میں التفات نظر کرتا تو آپ منہ پھیر لیتے جب مدت تک لوگ مجھ سے یونہی دور دور رہے تو ایک روز دیوار پھلانگ کر میں ابوقتادہ کے پاس ان کے باغ میں پہنچ گیا ابوقتادہ میرے چچا زاد تھے۔ یعنی قبیلہ بنی سلمہ سے تھے میرے باپ کے بھائی کے بیٹے نہ تھے مجھے ان سے بڑی شفقت تھی میں نے ان کو سلام کیا مگر خدا کی قسم انہوں نے سلام کا جواب نہیں دیا۔ میں نے کہا ابوقتادہ یہ تو تم کو معلوم ہی ہے کہ میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہوں ابوقتادہ خاموش رہے میں نے پھر اپنی بات دہرائی وہ خاموش رہے کوئی بات نہیں کی تیسری یا چوتھی بار کہنے کے بعد کہا اللہ اور اس کے رسول ہی کو خوب معلوم ہے۔ یہ سن

کر میری آنکھوں سے آنسو بہ نکلے اور لوٹ کر دیوار پھلانگ کر میں آ گیا۔

شاہ غسان کا خط:

ایک روز بازار میں جا رہا تھا کہ علاقہ شام کا رہنے والا ایک دیہاتی نظر پڑا یہ شخص غلہ لے کر مدینہ میں بیچنے آیا تھا کسی سے اس نے پوچھا مجھے کعب بن مالک کا پتہ بتا دے لوگوں نے میری طرف اشارہ کر دیا وہ میرے پاس آیا اور ایک خط مجھے دیا جو شاہ غسان کی طرف سے تھا (یعنی بادشاہ شام کی طرف سے) ابن ابی شیبہ کی روایت میں ہے کہ میرے قبیلہ کا کوئی آدمی شام میں تھا اس نے بھیجا تھا خط ریشمی کپڑے کے ایک ٹکڑے میں لپٹا ہوا تھا اور اس میں لکھا تھا مجھے اطلاع ملی ہے کہ تمہارے ساتھی نے تم کو دور کر دیا ہے اور پرے پھینک دیا ہے اور اللہ نے تم کو ایسا نہیں بنایا کہ ذلت کے مقام میں رہو اور تمہارا حق ضائع کیا جاتا رہے اس لئے اگر تم سکونت منتقل کرنا چاہتے ہو تو ہم سے آملو ہم تمہاری ہمدردی کریں گے خط پڑھ کر میں نے کہا یہ بھی (اللہ کی طرف سے) آزمائش ہے کہ کافر بھی میرا لالچ کرنے لگے (میری ذات کافروں کے لالچ کی جولان گاہ بن گئی) پھر میں نے تحریر کو تنور میں جھونک دیا ابن عابد کی روایت میں آیا ہے کہ حضرت کعب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی حالت کا شکوہ کیا اور عرض کیا، آپ کی مجھ سے روگردانی اب اس حد تک پہنچ گئی کہ مشرک میرا لالچ کرتے لگے۔

بیویوں سے الگ ہونے کا حکم:

جب پچاس راتوں میں سے چالیس راتیں گذر گئیں تو اچانک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک قاصد میرے پاس پہنچا محمد بن عمر نے اس قاصد کا نام خزیمہ بن ثابت بتایا ہے یہی قاصد مرارہ اور ہلال کے پاس بھی گیا۔ قاصد نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم کو حکم دیا ہے کہ اپنی بیوی سے الگ ہو جاؤ میں نے کہا کیا طلاق دے دوں یا کچھ اور۔ اس نے کہا طلاق کا حکم نہیں ہے اس سے الگ رہو قربت نہ کرو میرے دونوں ساتھیوں کے پاس بھی یہی حکم پہنچا حسب الحکم میں نے اپنی بیوی سے کہا اپنے گھر چلی جا اور فیصلہ قطعی ہونے تک وہیں رہ۔ ہلال بن امیہ کی بیوی یعنی خولہ بنت عاصم نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہلال بن امیہ بوڑھا آدمی ہے اپنا کام خود نہیں کر سکتا اور اس کا کوئی خادم بھی نہیں ہے۔ کیا اگر میں اس کا کام کر دیا کروں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ناگواری کا باعث ہوگا۔ ابن ابی شیبہ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں، وہ بوڑھا ہے نظر بہت کمزور ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں (کام کر دینے کی ممانعت نہیں ہے) مگر وہ تجھ سے قربت نہ کرے۔ عورت نے کہا خدا کی قسم اس کو تو کسی بات کی حس ہی نہیں ہے جب سے اس کا یہ واقعہ ہوا ہے برابر آج تک رونے میں مشغول ہے۔ کعب کا بیان ہے مجھ سے بھی میرے کسی گھر والے نے کہا اگر ہلال بن امیہ کی بیوی کی طرح تم بھی اپنی بیوی کے لئے رسول اللہ سے اجازت لے لو کہ وہ تمہاری خدمت کر دیا کرے تو مناسب ہے۔ میں نے کہا خدا کی قسم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت نہیں مانگوں گا۔ کیا معلوم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیا فرمائیں اور میں تو جوان آدمی ہوں (مجھے دوسرے سے کام لینے کی ضرورت نہیں ہے) اسی حالت میں دس راتیں اور گذر گئیں اور پچاس راتیں پوری ہو گئیں۔

توبہ کی قبولیت:

عبدالرزاق کی روایت میں کعب کا قول آیا ہے ایک تہائی رات کے وقت ہماری توبہ قبول ہونے کی آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر آیت نازل ہوئی۔ حضرت ام سلمہ نے عرض کیا یا نبی اللہ کیا کعب بن مالک کو ہم بشارت دیدیں۔ فرمایا (اس وقت قبول توبہ کی اطلاع دوگی) تو لوگ تم پر ٹوٹ پڑیں گے اور باقی رات میں سونے نہ دیں گے۔ (فجر کو اطلاع دیدینا)

کعب کا بیان ہے پچاسویں رات کی صبح کو میں فجر کی نماز پڑھنے کے بعد اپنے گھر کی چھت پر (بیٹھا) تھا اور میری حالت وہ تھی جو اللہ نے بیان فرمائی ہے (ضاقت علیھم الارض بما رحبت) زمین باوجود فراخ ہونے کے میرے لئے تنگ ہو گئی تھی یکدم ایک چیخنے والے کی آواز سنائی دی جو کوہ سلع پر چڑھ کر انتہائی اونچی آواز سے چیختا تھا اے کعب بن مالک تجھے خوش خبری ہو۔ محمد بن عمر کی روایت ہے کہ کوہ سلع پر چڑھنے والے حضرت ابوبکر تھے آپ نے ہی پکار کر کہا اللہ نے کعب پر رحم فرما دیا۔ اے کعب خوش ہو جا۔ عقبہ کی روایت ہے کہ دو آدمی دوڑے ہوئے کعب کو بشارت دینے کیلئے گئے ایک آگے بڑھ گیا جو پیچھے رہ گیا وہ کوہ سلع پر چڑھ گیا اور وہیں سے اس نے ندا کی اے کعب توبہ قبول ہونے کی تجھے بشارت ہو۔ اللہ نے تم لوگوں کے بارے میں قرآن نازل فرما دیا۔

اہل تاریخ کا خیال ہے کہ بشارت دینے کیلئے دوڑنے والے یہ دونوں حضرات حضرت ابوبکر و حضرت عمر تھے۔

کعب کا بیان ہے آواز سنتے ہی میں سجدہ میں گر پڑا اور خوشی سے رونے لگا اور سمجھ گیا کہ کشائش کا وقت آ گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز فجر ادا کرنے کے بعد ہماری توبہ قبول ہونے کا اعلان فرمایا لوگ ہم کو بشارت دینے کیلئے آ گئے کچھ اور لوگ میرے دونوں ساتھیوں کو خوشخبری دینے کیلئے پہنچے ایک شخص گھوڑا دوڑاتا میرے پاس آیا محمد بن عمر نے کہا یہ زبیر بن عوام تھے قبیلہ اسلم کا ایک اور شخص بھی دوڑ پڑا مگر گھوڑے کے پہنچنے سے پہلے مجھے آواز پہنچ گئی تھی اس لئے جب وہ شخص آیا جس کی آواز میں نے سنی تھی یعنی حمزہ اسلمی تو میں نے اپنے دونوں کپڑے اتار کر اس کو پہنا دیئے خدا کی قسم میرے پاس ان دو کپڑوں کے سوا اور کپڑے ہی نہ تھے ابوقتادہ (بروایت محمد بن عمر) سے دو کپڑے عاریۃً لے کر میں نے پہنے۔ ہلال

بن امیہ کو قبول توبہ کی خوش خبری دینے سعد بن زید گئے تھے ہلال نے کھانا پینا چھوڑ دیا تھا مسلسل روزے رکھ رہے تھے اور برابر رونے میں مشغول تھے میرا خیال تھا کہ وہ سر بھی نہیں اٹھا سکتے ان کی جان نکل جائے گی حرارہ بن ربیع کو بشارت سلکان بن سلامہ نے دی یہ سلامہ بن وقش کے باپ تھے۔

خدمت نبوی میں حاضری:

کعب بن مالک کا بیان ہے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے کیلئے روانہ ہوا۔ راستہ میں لوگوں کے گروہ در گروہ مبارک باد دینے کیلئے مجھ سے ملتے رہے۔ آخر میں مسجد میں داخل ہوا رسول اللہ بیٹھے ہوئے تھے گرداگرد لوگ بھی موجود تھے مجھے دیکھ کر طلحہ بن عبید اللہ اٹھے اور لپک کر میری طرف بڑھے مجھ سے مصافحہ کیا اور مبارک باد دی مہاجرین میں سے سوائے طلحہ کے اور کوئی نہیں اٹھا۔ میں طلحہ کی یہ بات نہیں بھولوں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک خوشی سے چمک رہا تھا۔ میں نے سلام کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب سے تو ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے اس وقت سے آج تک ہر دن سے بہتر دن کی تجھے بشارت ہو، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا یہ آپ کی طرف سے ہے یا اللہ کی طرف سے فرمایا نہیں، اللہ کی طرف سے ہے۔ تم لوگوں نے اللہ سے سچا معاملہ کیا اللہ نے بھی تم کو سچا قرار دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ خوشی کے وقت آپ کا چہرہ چمکنے لگتا تھا معلوم ہوتا تھا چاند کا ٹکڑا ہے ہم دیکھ کر پہچان لیتے تھے (کہ حضور اس وقت خوش ہیں)

توبہ کی تکمیل:

جب میں سامنے بیٹھا تو عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری توبہ کا تتمہ یہ ہے کہ اپنے کل مال سے دست بردار ہو جاؤں اور بطور صدقہ اللہ اور اس کے رسول کی خدمت میں پیش کر دوں، فرمایا کچھ مال اپنے لئے بھی روک رکھو تمہارے لئے یہی بہتر ہے میں نے عرض کیا اچھا نصف مال (سے دست بردار ہوتا ہوں) فرمایا نہیں، میں نے عرض کیا تو ایک تہائی (قبول فرما لیجئے) فرمایا اچھا، میں نے عرض کیا تو خیبر میں جو میرا حصہ ہے میں اس کو روکے رکھتا ہوں پھر میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ نے سچ بولنے کی وجہ سے مجھے نجات دی ہے لہٰذا میری توبہ کا تتمہ یہ بھی ہے کہ جب تک زندہ رہوں گا سچ ہی بولوں گا خدا کی قسم میں نہیں جانتا کہ سچ بولنے کی وجہ سے جو کرم اللہ نے مجھ پر کیا ہے کسی اور پر اس سے بہتر احسان کیا ہو گا چنانچہ اس عہد کے بعد آج تک میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا اور امید ہے کہ جب تک زندہ رہوں گا اللہ جھوٹ بولنے سے مجھے محفوظ رکھے گا۔

اللہ نے توبہ قبول فرمانے کے سلسلہ میں

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ سے وکونوا مع الصادقین، تک آیات نازل فرمائیں۔ خدا کی قسم جب سے اللہ نے مجھے اسلام کی توفیق عطاء فرمائی اس کے بعد سے کوئی اس نعمت سے بھی نہیں عنایت کی جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم سچ کہنے سے مجھے ملی اگر میں جھوٹ بول دیتا تو میں بھی ان لوگوں کی طرح تباہ ہو جاتا جنہوں نے جھوٹ بولا تھا اور اللہ نے بدترین الفاظ میں انکا ذکر کیا فرمایا سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ. (تفسیر مظہری)

حَتّٰٓى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا
یہاں تک کہ جب تنگ ہوگئی ان پر زمین باوجود
رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ
کشادہ ہونے کے اور تنگ ہوگئیں ان پر ان کی جانیں
وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ
اور سمجھ گئے کہ کہیں پناہ نہیں اللہ سے مگر اسی کی طرف
ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ
پھر مہربان ہوا ان پر تاکہ وہ پھر آئیں بے شک اللہ ہی ہے
التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿١١٨﴾
مہربان رحم والا

واقعہ کے بعض اہم اجزاء:

ان تین میں سے حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے اپنا واقعہ نہایت شرح وبسط سے عجیب موثر طرز میں بیان فرمایا ہے۔ صحیح بخاری وغیرہ میں ملاحظہ کیا جائے۔ یہاں اس کے بعض اجزاء نقل کئے جاتے ہیں۔

سفر تبوک کی تیاری کا اعلان:

کعب بن مالک فرماتے ہیں کہ تبوک کی مہم چونکہ بہت سخت اور دشوار گذار تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو عام حکم تیاری کا دیا۔ لوگ مقدور استطاعت کے موافق سامان سفر درست کرنے میں مشغول تھے مگر میں بے فکر تھا کہ جب چاہوں گا فوراً تیار ہو کر ساتھ چلا جاؤں گا۔ کیونکہ بفضل ایزدی اس وقت ہر طرح کا سامان مجھ کو میسر تھا۔ ایک چھوڑ دو سواریاں میرے پاس موجود تھیں۔ میں اسی غفلت کے نشہ میں رہا۔ ادھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیس ہزار مجاہدین اسلام کو کوچ کا حکم دیدیا۔ مجھے اب بھی یہ خیال تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم روانہ ہو گئے تو کیا ہے، اگلی منزل پر آپ صلی اللہ علیہ

وسلم سے جاملوں گا۔ آج چلوں کل چلوں اسی (مروز وفردا) میں وقت نکل گیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت کعب کے متعلق پوچھنا:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تبوک پہنچ کر فرمایا "مافعل کعب بن مالک" (کعب بن مالک کو کیا ہوا) بنی سلمہ کا ایک شخص بولا کہ یارسول اللہ! اس کی عیش پسندی اور اعجاب وغرور نے نکلنے کی اجازت نہ دی۔ معاذ بن جبل نے کہا کہ تو نے بری بات کہی۔ خدا کی قسم ہم نے اس میں بھلائی کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ گفتگو سن کر خاموش رہے۔

روانگی کے بعد کی حالت:

کعب کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد بہت زیادہ وحشت اس سے ہوتی تھی کہ سارے مدینہ میں پکے منافق یا معذور مسلمان کے سوا مجھے کوئی مرد نظر نہ پڑتا تھا۔ بہر حال اب دل میں طرح طرح کے جھوٹے منصوبے گانٹھنے شروع کئے کہ آپ سے واپسی پر فلاں فلاں عذر کر کے جان بچا لونگا۔ مگر جس وقت معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خیر وعافیت سے واپس تشریف لے آئے، دل سے سارے جھوٹ فریب محو ہوگئے اور طے کر لیا کہ سچ کے سوا کوئی چیز اس بارگاہ میں نجات دلانیوالی نہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سچی بات عرض کردی:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں رونق افروز تھے، اصحاب کا مجمع تھا، منافقین جھوٹے حیلے بہانے بنا کر ظاہری گرفت سے چھوٹ رہے تھے کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آیا۔ میرے سلام کرنے پر آپ نے غضب آمیز تبسم فرمایا اور غیر حاضری کی وجہ دریافت کی۔ میں نے عرض کیا۔ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اگر اس وقت میں دنیا والوں میں سے کسی دوسرے کے سامنے ہوتا تو آپ دیکھتے کہ کس طرح زبان زوری اور چرب لسانی سے جھوٹے حیلے حوالے کر کے اپنے کو صاف بچالیتا۔ مگر یہاں تو معاملہ ایک ایسی ذات مقدس سے ہے جسے جھوٹ بول کر اگر میں راضی بھی کرلوں تو تھوڑی دیر کے بعد خدا اس کو سچی بات پر مطلع کر کے مجھ سے ناراض کر دیگا۔ برخلاف اس کے سچ بولنے میں گو تھوڑی دیر کیلئے آپ کی خفگی برداشت کرنی پڑیگی۔ لیکن امید کرتا ہوں کہ خدا کی طرف سے اس کا انجام بہتر ہوگا۔ اور آخر کار سچ بولنا ہی مجھے خدا اور رسول کے غصہ سے نجات دلائیگا۔ یارسول اللہ واقعہ یہ ہے۔ کہ میرے پاس غیر حاضری کا کوئی عذر نہیں، جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی کے شرف سے محروم ہوا، اس وقت سے زیادہ فراخی اور مقدرت کبھی مجھ کو حاصل نہ ہوئی تھی، میں مجرم ہوں، آپ کو اختیار ہے جو فیصلہ چاہیں میرے حق میں دیں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ شخص ہے جس نے سچی بات کہی۔

اچھا جاؤ اور خدائی فیصلہ کا انتظار کرو۔ میں اٹھا اور تحقیق سے معلوم ہوا کہ (ہلال بن امیہ اور مرارہ بن الربیع) یہ دو شخص بھی میرے ہی جیسے ہیں۔

پہلا حکم: ہم تینوں کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیدیا کہ کوئی ہم سے بات نہ کرے، سب علیحدہ رہیں چنانچہ کوئی مسلمان ہم سے بات نہ کرتا تھا نہ سلام کا جواب دیتا تھا۔ وہ دونوں تو خانہ نشین ہوگئے، شب وروز گھر میں وقف گریہ وبکار رہتے تھے، میں ذرا سخت اور قوی تھا۔ مسجد میں نماز کیلئے حاضر ہوتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کر کے دیکھتا تھا کہ جواب میں لب مبارک کو حرکت ہوئی یا نہیں۔ جب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دیکھتا۔ آپ میری طرف سے منہ پھیر لیتے تھے مخصوص اقارب اور محبوب ترین اعزہ بھی مجھ سے بیگانہ ہوگئے تھے۔

میرا امتحان: اسی اثناء میں ایک روز ایک شخص نے بادشاہ "غسان" کا خط مجھے دیا۔ جس میں میری مصیبت پر اظہار ہمدردی کرنے کے بعد دعوت دی تھی کہ میں اس کے ملک میں آجاؤں وہاں میری بہت آؤ بھگت ہوگی۔ میں نے پڑھ کر کہا کہ یہ بھی ایک مستقل امتحان ہے۔ آخر وہ خط میں نے نذر آتش کردیا۔

دوسرا حکم: چالیس دن گذرنے کے بعد بارگاہ رسالت سے جدید حکم پہنچا کہ میں اپنی عورت سے بھی علیحدہ رہوں، چنانچہ اپنی بیوی کو کہہ دیا کہ اپنے میکے چلی جائے۔ اور جب تک خدا کے یہاں سے میرا کوئی فیصلہ ہو وہیں ٹھہری رہے۔ سب سے بڑی فکر یہ تھی کہ اگر اسی حالت میں موت آگئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم میرا جنازہ نہ پڑھیں گے۔ اور فرض کیجئے ان دنوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی تو مسلمان ہمیشہ یہی معاملہ مجھ سے رکھیں گے۔ میری میت کے قریب بھی کوئی نہ آئیگا۔

مشکل کے پچاس دن: غرض پچاس دن اسی حالت میں گذرے کہ خدا کی زمین مجھ پر باوجود فراخی کے تنگ تھی بلکہ عرصہ حیات تنگ ہوگیا تھا، زندگی موت سے زیادہ سخت معلوم ہوتی تھی۔

خوشخبری: یکا یک جبل سلع سے آواز آئی "یا کعب بن مالک! ابشر" (اے کعب بن مالک خوش ہوجا) میں سنتے ہی سجدہ میں گر پڑا۔ معلوم ہوا کہ اخیر شب میں حق تعالی کی طرف سے پیغمبر علیہ السلام کو خبر دی گئی کہ ہماری توبہ قبول ہے۔ آپ نے بعد نماز فجر صحابہ کو مطلع فرمایا، ایک سوار میری طرف دوڑا کہ بشارت سنائے۔ مگر دوسرے شخص نے پہاڑ پر زور سے للکارا۔ اس کی آواز سوار سے پہلے پہنچی۔ اور میں نے اپنے بدن کے کپڑے اتار کر آواز لگانیوالے کو دیئے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ لوگ جوق در جوق آتے اور مجھے مبارکباد دیتے تھے مہاجرین میں سے حضرت طلحہؓ نے کھڑے ہو کر مصافحہ کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ خوشی سے چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، خدا نے تیری توبہ قبول فرمائی۔ میں نے عرض کیا کہ اس توبہ کا تتمہ ہے کہ

اپنا کل مال وجائداد خدا کی راہ میں صدقہ کرتا ہوں۔آپ نے فرمایا کہ سب نہیں کچھ اپنے لئے روکنا چاہئے۔ چنانچہ میں نے خیبر کا حصہ الگ کر کے باقی مال صدقہ کر دیا۔ چونکہ محض سچ بولنے سے مجھ کو نجات ملی تھی، اس لئے عہد کیا کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، آئندہ کبھی جھوٹ نہ بولوں گا، اس عہد کے بعد بڑے سخت امتحانات پیش آئے۔ مگر الحمدللہ میں سچ کہنے سے کبھی نہیں ہٹا۔ اور نہ ان شاء اللہ تازیست ہٹونگا۔ یہ واقعہ ہے جس کی طرف ان آیات میں اشارہ کیا گیا ہے۔ گویا ان تینوں پر خدا کی پہلی مہربانی تو یہ ہی تھی کہ ایمان واخلاص بخشا، نفاق سے بچایا۔ اب نئی مہربانی یہ ہوئی کہ توبہ نصوح کی توفیق دیکر پھر اپنی طرف کھینچ لیا اور کوتاہیوں کو معاف فرمادیا۔

سچی توبہ: ابوبکر وراق نے کہا خالص سچی توبہ یہ ہے کہ اگر گناہ سرزد ہو جائے تو اس پر یہ لمبی چوڑی زمین تنگ ہو جائے اور دل میں سخت بے چینی اور گھبراہٹ پیدا ہو جائے جیسے ان تینوں حضرات کی توبہ تھی۔

توبہ کے مواقع: حضرت ابوموسیٰ اشعری کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ رات میں (توبہ قبول فرمانے کیلئے) اپنا ہاتھ پھیلاتا ہے تاکہ دن کو گناہ کرنے والا (رات کو) توبہ کرلے اور دن میں اپنا ہاتھ پھیلاتا ہے تاکہ رات میں گناہ کرنے والا (دن میں) توبہ کرلے یہ سلسلہ اس وقت تک قائم رہے گا جب سورج مغرب سے برآمد ہوگا (یعنی قیامت تک توبہ کا دروازہ کھلا رہے گا جب سورج مغرب سے نکلے گا تو توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا) رواہ مسلم۔

توبہ سے اللہ خوش ہوتا ہے:

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر کسی بیابان صحراء میں (سفر کی حالت میں) تم میں سے کسی کی سواری کی اونٹنی گم ہو جائے اور اونٹنی پر ہی اس مسافر کے کھانے پینے کا سب سامان ہو اور ڈھونڈ کر ناامید ہو کر یہ شخص کسی درخت کے سایہ میں لیٹ کر سو جائے پھر اچانک اس کی آنکھ کھل جائے تو اونٹنی کو اپنے پاس کھڑا پائے اور فوراً اونٹنی کی نکیل پکڑ لے اور انتہائی خوشی کی وجہ سے (زبان بے قابو ہو جائے اور) بول اٹھے اے اللہ تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا رب ہوں۔ اس مسافر کو اونٹنی کے دست یاب ہونے سے جتنی خوشی ہوتی ہے اس سے زیادہ خوشی اللہ کو بندہ کے توبہ کرنے سے ہوتی ہے جب بندہ اللہ کے سامنے توبہ کرتا ہے۔ رواہ مسلم۔ (تفسیر مظہری)

مسئلہ: اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ کسی گناہ کی سزا میں مسلمانوں کے امیر کو یہ بھی حق ہے کہ کسی شخص سے سلام وکلام قطع کر دینے کا حکم دیدے جیسے اس واقعہ میں ان تین بزرگوں کے متعلق پیش آیا۔

صحابہ کی محبت: اس واقعہ سے صحابہ کرام کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ انتہائی محبت معلوم ہوئی کہ اس ناراضی اور مقاطعہ سلام وکلام کے زمانہ میں بھی غایت محبت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری بھی نہیں چھوڑی اور کن انکھیوں سے دیکھ کر آپکی توجہ اور تعلق کا حال معلوم کرنے کی فکر رہی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قانون کا اثر:

کعب بن مالکؓ کے گہرے دوست قتادہؓ کا معاملہ کہ ان کے سلام کا جواب نہ دیا اور کوئی کلام نہ کیا، یہ ظاہر ہے کہ یہ کسی دشمنی یا مخالفت یا بغض سے نہیں بلکہ حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی وجہ سے تھا، اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بنایا ہوا قانون صرف لوگوں کے ظاہر پر نافذ نہ ہوتا تھا بلکہ دلوں پر بھی اس کی حکومت ہوتی تھی اور حاضر و غائب کسی حال میں اس کے خلاف نہ کرتے تھے اگر چہ اس میں کسی بڑے سے بڑے دوست عزیز کے خلاف ہی ہو۔

صحابہ کے ایمان کی پختگی:

حضرت کعبؓ کے پاس بادشاہ غسان کا خط آنے اور اس کو تنور میں ڈالنے کے واقعہ سے صحابہ کرام کے ایمان کی انتہائی پختگی معلوم ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام مسلمانوں کے مقاطعہ سے سخت پریشان ہونے کے عالم میں بھی ایک بڑے بادشاہ کے لالچ دلانے سے ان کے دل میں کوئی میلان پیدا نہیں ہوا۔

قبول توبہ نازل ہونے کے بعد صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ اور عام صحابہ کرامؓ کا کعب بن مالکؓ کو بشارت دینے کیلئے دوڑنا اور اس سے پہلے سب کا سلام وکلام تک سے سخت پرہیز کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ مقاطعہ کے زمانے میں ان سب کے دلوں میں حضرت کعبؓ سے محبت اور تعلق تھا، مگر حکم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سب کچھ چھوڑا ہوا تھا، جب آیت توبہ نازل ہوئی تو ان کے گہرے تعلق کا انداز ہوا۔

مبارک باد دینا: صحابہ کرام کا حضرت کعبؓ کو خوشخبری دینے اور مبارکباد کیلئے جانے سے معلوم ہوا کہ کسی خوشی کے موقع پر اپنے دوست احباب کو مبارک باد دینا سنت سے ثابت ہے۔

توبہ اور مال کا صدقہ: کسی گناہ سے توبہ کے وقت مال کا صدقہ کرنا گناہ کے اثر کو زائل کرنے کیلئے بہتر ہے مگر تمام مال خیرات کر دینا اچھا نہیں، ایک تہائی مال سے زائد صدقہ کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند نہیں فرمایا۔ (معارف القرآن مفتی اعظم)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا
اے ایمان والو ڈرتے رہو اللہ سے اور رہو
مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴿۱۹﴾
ساتھ سچوں کے

سچوں کی صحبت:

یعنی سچوں کی صحبت رکھو اور انہی جیسے کام کرو۔ دیکھو لو یہ تین شخص سچ کی بدولت بخشے گئے اور مقبول ٹھہرے منافقین نے جھوٹ بولا اور خدا کا ڈر دل سے نکال دیا تو ''درک اسفل'' کے مستحق بنے۔ (تفسیر عثمانی)

فائدہ: اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایمان کے بعد تقویٰ ضروری ہے اور پھر صادقین اور صالحین کی معیت یعنی صحبت بھی ضروری ہے۔ کیونکہ اتقوا اللہ کے بعد وَكُونُوا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ کا حکم دیا جو وجوب اور لزوم کیلئے ہے کوئی کمال بدون کامل کی صحبت کے حاصل نہیں ہوسکتا محض مطالعہ کتب کافی نہیں جب تک کسی عالم کی صحبت میں اور خدمت میں رہ کر علم حاصل نہ کیا جائے صحابیت کی حقیقت ہی شرف صحبت ہے اور روافض اس کے منکر ہوئے خوافض ہو گئے۔

مجلس کا اثر:

صحبت اور مرافقت کا اثر تمام عقلاء کے نزدیک مسلم ہے طبیعت میں سرقہ (چوری) کا مادہ موجود ہے ایک ساتھی کی طبیعت دوسرے ساتھی کے اخلاق اور عادات کو چراتی ہے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ظالموں اور فاسقوں سے دوستی اور ان کے پاس بیٹھنے سے منع کیا ہے فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ تاکہ ہمنشین کے ظلم اور فسق کے جراثیم اس تک متعدی نہ ہوں۔ مجذوم خواہ جسمانی ہو یا روحانی شرعاً و طبعاً اس سے اجتناب ضروری ہے۔

شیخ سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں اور کیا خوب فرماتے ہیں:

گل خوشبوئے درحمام روزے	رسید از دست محبوبے بدستم
بدوگفتم کہ مشکی یا عبیری	کہ از بوئے دلآویز تو مستم
بگفتا من گلے ناچیز بودم	ولیکن مدتے باگل نشستم
جمال ہمنشیں درمن اثر کرد	وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

(معارف القرآن کاندھلویؒ)

تقویٰ حاصل کرنے کا طریقہ:

سابقہ آیات میں جو واقعہ تخلف عن الجہاد کا بعض مخلصین سے پیش آیا پھر ان کی توبہ قبول ہوئی یہ سب نتیجہ ان کے تقویٰ اور خوف خدا کا تھا، اس لئے اس آیت میں عام مسلمانوں کو تقویٰ کیلئے ہدایت فرمائی گئی، اور وَكُونُوا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ میں اس طرف اشارہ فرمایا گیا کہ صفت تقویٰ حاصل ہونیکا طریقہ صالحین وصادقین کی صحبت اور عمل میں ان کی موافقت ہے، اس میں شاید یہ اشارہ بھی ہو کہ جن حضرات سے یہ لغزش ہوئی، اس میں منافقین کی صحبت و مجالست اور ان کے مشورہ کو بھی دخل تھا۔ اللہ کے نافرمانوں کی صحبت سے بچنا چاہیے اور صادقین کی صحبت اختیار کرنا چاہیے۔

عالم وصالح کی پہچان: اس جگہ قرآن حکیم نے علماء صلحاء کے بجائے صادقین کا لفظ اختیار فرما کر عالم وصالح کی پہچان بھی بتلا دی ہے کہ صالح صرف وہی شخص ہوسکتا ہے جس کا ظاہر و باطن یکساں ہو۔ نیت وارادے کا بھی سچا ہو قول کا بھی سچا ہو، عمل کا بھی سچا ہو۔ (معارف مفتی اعظم)

مَاكَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ
نہ چاہیے مدینہ والوں کو اور ان کے گرد کے
مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ
گنواروں کو کہ پیچھے رہ جائیں رسول
اللّٰهِ وَلَا يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ ط
اللہ کے ساتھ سے اور نہ یہ کہ اپنی جان کو چاہیں زیادہ رسول کی جان سے

حضرت خیثمہ کی حضور سے محبت:

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو تکلیفیں اٹھائیں اور ہم آرام سے بیٹھے رہیں ایسا نہیں چاہیے حدیث میں ہے کہ ابوخیثمہ رضی اللہ عنہ بھی غزوہ تبوک میں پیچھے رہ گئے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روانگی کے بعد باغ میں گئے وہاں خوشگوار سایہ تھا، حسین وجمیل بیوی سامنے تھی اس نے پانی چھڑک کر زمین کو خوب ٹھنڈا کر دیا، چٹائی کا فرش کیا، تازہ کھجور کے خوشے سامنے رکھے۔ اور سرد وشیریں پانی حاضر کیا۔ یہ سامان عیش دیکھ کر دفعتہ ابوخیثمہ کے دل میں ایک بجلی سی دوڑ گئی۔ بولے تف ہے اس زندگی پر کہ میں تو خوشگوار سائے، ٹھنڈے پانی اور باغ و بہار کے مزے لوٹ رہا ہوں، اور خدا کا محبوب پیغمبر ایسی سخت لو اور گرمی و تشنگی کے عالم میں کوہ و بیابان طے کر رہا ہے۔ یہ خیال آتے ہی سواری منگائی تلوار حمائل کی نیزہ سنبھالا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چل نکلے۔ اونٹنی تیز ہوا کی طرح چل رہی تھی آخر لشکر کو جا پکڑا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دور سے دیکھ کر کہ کوئی اونٹنی سوار ریت کے ٹیلے قطع کرتا چلا آرہا ہے، فرمایا ''کن اباخیثمہ'' (ہوجا ابوخیثمہ) تھوڑی دیر میں سب نے دیکھ لیا کہ وہ ابوخیثمہ ہی تھے۔ رضی اللہ عنہ وعن سائر الصحابۃ ورضوا عنہ۔ (تفسیر عثمانی)

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ
یہ اس واسطے کہ جہاد کرنے والے نہیں پہنچتی ان کو پیاس
وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَـُٔوْنَ
اور نہ محنت اور نہ بھوک اللہ کی راہ میں اور نہیں قدم رکھتے

مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ

کہیں جس سے کہ خفا ہوں کافر اور نہ چھینتے ہیں دشمن سے

عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ

کوئی چیز مگر لکھا جاتا ہے ان کے واسطے اس کے بدلے نیک عمل

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾

بیشک اللہ نہیں ضائع کرتا حق نیکی کرنے والوں کا

یعنی باوجودیکہ ان میں سے اکثر چیزیں (مثلاً بھوک، پیاس لگنا، یا تکلیف پہنچنا، اختیاری کام نہیں، تاہم نیت جہاد کی برکت سے ان غیر اختیاری چیزوں کے مقابلہ میں اعمال صالحہ ان کی فرد حسنات میں درج کردیے جائینگے جن پر خدا اجر نیک مرحمت فرمائیگا۔ (تفسیر عثمانی)

جہاد کی برکتیں:

جہاد ایک بھلائی ہے (سب انسانوں کے حق میں) کافروں کے حق میں جہاد کا بھلائی ہونا تو اس وجہ سے ہے کہ کافروں کو دوزخ سے رہا کرانے اور ان کی انسانیت کو مکمل کرنے کی یہ انتہائی کوشش ہے جیسے پاگل کو مارنا (کبھی اس کیلئے علاج ہوتا ہے) اور بچہ کو ادب سکھانے کے لئے مارنا (اس کے حق میں بھلائی ہوتا ہے) مومنوں کے حق میں جہاد کی بھلائی یہ ہے کہ جہاد ہی کے ذریعے سے اہل ایمان کافروں کی چیرہ دستی اقتدار اور تسلط سے محفوظ رہتے ہیں حضرت ابوعبس کی روایت ہے انہوں نے فرمایا میں نے خود رسول اللہ کو یہ فرماتے سنا کہ اللہ کی راہ میں جس کے قدم گرد آلود ہوں گے اللہ نے اس کیلئے دوزخ حرام کردی ہے۔ رواہ البخاری فی الصحیح واحمد فی المسند والترمذی والنسائی۔

حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا جب تک جہاد سے واپس نہیں آتا اس کی حالت ایسی ہوتی ہے جیسے (ہر روز) روزہ رکھنے والا (رات کو) نماز پڑھنے والا اللہ کی آیات کی تلاوت کرنے والا جو روزہ نماز سے سست نہیں پڑتا ہو (چستی کے ساتھ برابر مشغول رہتا ہو)

یعنی ان کے اچھے اعمال کی جزا اچھے عمل سے مراد ہے جہاد۔ یا ان کے اعمال کی اچھی جزا۔ حضرت ابومسعود انصاری کی روایت ہے کہ ایک آدمی نکیل پڑی اونٹنی لے کر حاضر ہوا اور عرض کیا یہ اللہ کی راہ میں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، قیامت کے دن اس کے عوض تجھے سات سو نکیل پڑی اونٹنیاں ملیں گے۔ رواہ مسلم۔

حضرت زید بن خالد راوی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کیلئے سامان تیار کرکے دیا، اس نے بھی جہاد کیا اور جس نے مجاہد کے بیوی بچوں کی اس کے بعد خبر گیری کی اس نے بھی جہاد کیا۔ رواہ البخاری ومسلم فی صحیحہما۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر مظہری)

وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً

اور نہ خرچ کرتے ہیں کوئی خرچ چھوٹا اور نہ بڑا

وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ

اور نہ طے کرتے ہیں کوئی میدان مگر لکھ لیا جاتا ہے ان کے واسطے

خرچ کرنا یا میدان طے کرنا، خود عمل صالح اور اختیاری افعال ہیں۔ اسی لئے یہاں "اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ" فرمایا۔ گذشتہ آیت کی طرح اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ" نہیں ارشاد ہوا۔ نبہ علیہ ابن کثیرؒ

لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

تاکہ بدلہ دے ان کو اللہ بہتر اس کام کا جو کرتے تھے

یعنی بہترین عمل کی بہترین جزاء دیگا۔

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً

اور ایسے تو نہیں مسلمان کہ کوچ کریں سارے

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ

سو کیوں نہ نکلا ہر فرقہ میں سے ان کا ایک حصہ

لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ

تاکہ سمجھ پیدا کریں دین میں اور تاکہ خبر پہنچائیں اپنی قوم کو

اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

جب کہ لوٹ کر آئیں ان کی طرف تاکہ وہ بچتے رہیں

ہر جہاد میں سب کا نکلنا فرض عین نہیں ہے:

گذشتہ رکوعات میں "جہاد" میں نکلنے کی فضیلت اور نہ نکلنے پر ملامت تھی۔ ممکن تھا کوئی یہ سمجھ بیٹھے کہ ہمیشہ ہر جہاد میں تمام مسلمانوں پر نکلنا فرض عین ہے۔ اس آیت میں فرمادیا کہ نہ ہمیشہ یہ ضروری ہے نہ مصلحت ہے کہ سب مسلمان ایک دم جہاد کیلئے نکل کھڑے ہوں۔ مناسب یہ ہے کہ ہر قبیلہ اور قوم میں سے ایک جماعت نکلے، باقی لوگ دوسری ضروریات میں مشغول ہوں۔ اب اگر

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس جہاد کیلئے تشریف لے جارہے ہوں تو ہر قوم میں سے جو جماعت آپ کے ہمراہ نکلے گی وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہ کر اور سیکڑوں حوادث وواقعات میں سے گذر کر دین اور احکام دینیہ کی سمجھ حاصل کریگی اور واپس آکر اپنی باقی ماندہ قوم کو مزید علم وتجربہ کی بناء پر بھلے برے سے آگاہ کریگی اور فرض کیجئے اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود مدینہ میں رونق افروز رہے تو باقی ماندہ لوگ جو جہاد میں نہیں گئے حضور کی خدمت سے مستفید ہوکر دین کی باتیں سیکھیں گے۔اور مجاہدین کی غیبت میں جو وحی ومعرفت کی باتیں سنیں گے ان سے واپسی کے بعد مجاہدین کو خبردار کرینگے۔ آیت کے الفاظ میں عربی ترکیب کے اعتبار سے دونوں احتمال ہیں۔کمافی ''روح المعانی'' وغیرہ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ'' ہر قوم میں سے چاہیے بعضے لوگ پیغمبر کی صحبت میں رہیں تا علم دین سیکھیں اور پچھلوں کو سکھائیں۔ اب پیغمبر اس دنیا میں موجود نہیں لیکن علم دین اور علماء موجود ہیں۔طلب علم فرض کفایہ ہے اور جہاد بھی فرض کفایہ ہے۔البتہ اگر کسی وقت امام کی طرف سے نفیر عام ہوجائے تو''فرض عین'' ہوجاتا ہے۔تبوک میں یہی صورت تھی اس لئے پیچھے رہنے والوں سے باز پرس ہوئی۔ واللہ اعلم۔ابوحیان کے نزدیک یہ آیت جہاد کے لئے نہیں،طلب علم کے بارہ میں ہے۔جہاد اور طلب علم کی آیات میں مناسبت یہ ہے کہ دونوں میں خروج فی سبیل اللہ ہے اور دونوں کی غرض احیاء واعلائے دین ہے۔ایک میں تلوار سے دوسرے میں زبان وغیرہ سے۔(تفسیر عثمانی)

جہاد فرض کفایہ ہے:

تمام اماموں کا اتفاق ہے کہ جہاد فرض کفایہ ہے اگر بقدر ضرورت مسلمانوں کی جماعت جہاد کرے گی تو باقی مسلمانوں کے سروں سے فرض اتر جائے گا۔

سعید بن مسیّب کے نزدیک جہاد فرض عین ہے کیونکہ جہاد کے احکام عمومی ہیں اور جو لوگ تبوک کے جہاد کو نہیں گئے تھے ان کے معاملہ میں سخت احکام نازل کیے گئے ہم کہتے ہیں جب جہاد کا اعلان عام ہو تو باتفاق علماء ہر شخص پر جہاد کرنا فرض ہوجاتا ہے جیسے غزوہ تبوک کے موقع پر ہوا ورنہ فرض کفایہ ہے کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے۔ لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ الخ اس آیت کے آخر میں ہے وکلا وعد اللہ الحسنیٰ ہر فریق سے اللہ نے بھلائی کا وعدہ کرلیا ہے۔(لیکن بھلائی کے مراتب میں تفاوت ہے)

فقہ کا علم: امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا نفس کے ضرر رساں اور فائدہ بخش امور کو جاننا فقہ ہے (خواہ فکر وعقیدہ کے لحاظ سے ہو یا قول وعمل کے اعتبار سے۔ اصول کا علم ہو یا فروع کا) فروع دین کے علم کو خصوصیت کے ساتھ فقہ کہنا اصطلاح جدید ہے۔(قرن اول میں یہ خصوصیت نہیں تھی)

ظاہر یہ ہے کہ لفظ فقہ کے اندر مقلد کا علم بھی داخل ہے مجتہد سے یا مجتہد کی کتاب سے علم حاصل کرنے سے اس فرض کی ادائیگی ہوجاتی ہے۔

طبرانی نے حضرت ابن مسعود کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آدمی (بس) دو ہیں عالم اور متعلم ان کے سوا باقی (آدمیوں) میں کوئی خیر نہیں۔

خبر احاد: آیت دلالت کررہی ہے کہ خبر آحاد (شرعی) حجت ہے (یعنی کسی مسئلہ کو جاننے کے لئے خبر آحاد کو بشرطیکہ وہ قابل وثوق روایت سے پہنچی ہو ماننا ضروری ہے) کیونکہ آیت میں ''کل فرقۃ'' کا لفظ عام ہے جس سے معلوم ہورہا ہے کہ اگر کسی بستی میں تین ہی آدمی ہوں تو ان میں سے بھی کسی ایک کو علم حاصل کرنے کے لئے جانا اور سیکھ کر واپس آکر دوسروں کو بتانا ضروری ہے اگر تواتر کے بغیر کوئی خبر قابل تسلیم نہ ہو تو کل فرقہ کے لفظ کا کوئی معنی نہیں ہوگا۔

علم حاصل کرنے کی حیثیت:

فقہ کا کچھ حصہ تو فرض عین ہے کچھ فرض کفایہ۔صحیح عقائد اور ضروری اعمال جیسے طہارت نماز روزہ زکوۃ حج اور تمام فرائض کا علم فرض عین ہے عبادات کے علاوہ وہ معاملات جو سامنے آتے رہتے ہیں اور جن سے واسطہ پڑتا رہتا ہے ان کو جاننا بھی فرض عین ہے مثلاً تاجروں کے لئے بیع صحیح بیع فاسد۔سود وغیرہ کے احکام جاننا لازم ہے جو ٹھیکہ یا مزدوری یا نوکری وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں ان کیلئے ان کے احکام کو حاصل کرنا ضروری ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا علم کی طلب ہر مسلمان مرد پر فرض ہے یہ حدیث حضرت انس کی روایت سے ابن عدی اور بیہقی نے اور حضرت امام حسن بن علی کی روایت سے خطیب نے اور طبرانی نے صغیر میں نیز طبرانی نے الاوسط میں حضرت ابن عباس کی روایت سے اور الکبیر میں حضرت ابن مسعود کی روایت سے اور خطیب نے حضرت علی کی روایت سے اور طبرانی نے الاوسط میں نیز بیہقی نے حضرت ابوسعید کی روایت سے بیان کی ہے۔حضرت انس کی روایت میں حسب نقل ابن عبدالبر اتنا زائد بھی آیا ہے کہ طالب علم کیلئے ہر چیز دعائے مغفرت کرتی ہے یہاں تک کہ سمندر کے اندر مچھلیاں بھی (دعا مغفرت کرتی ہیں) ایک روایت میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں اور اللہ مصیبت زدوں کی فریادرسی کو پسند فرماتا ہے۔

فرض کفایہ یہ ہے کہ ہر موضوع کے مسائل سے واقفیت حاصل کی جائے یہاں تک کہ فتویٰ دینے کے مقام پر پہنچ جائے۔اگر کسی شہر کا کوئی آدمی ایسا عالم نہ ہوگا اور ایک شخص بھی اس درجہ پر فائز نہ ہوگا اور سب بیٹھ رہیں گے تو سب گناہ گار ہوں گے اور اگر ایک بھی تکمیل علمی کیلئے تیار ہوجائے گا تو سب کے سر سے فرض ساقط ہوجائے گا اور سب پر اس کی تقلید لازم ہوگی جو واقعات پیش آئیں ان کے فیصلے کیلئے اس عالم کی طرف سب بستی والے رجوع کریں۔

تحصیل علم ہر نفلی عبادت سے افضل ہے حضرت ابن عباس کی روایت سے

مؤلف سنہ الفردوس نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا علم کی طلب اللہ کے نزدیک نماز روز حج اور راہ خدا میں جہاد کرنے سے افضل ہے یہ بھی حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں آیا ہے کہ ایک گھڑی علم کی تحصیل ایک رات کے قیام (نماز) سے اور ایک دن علم کی طلب تین دن کے روزے رکھنے سے افضل ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، عابد پر عالم کی فضیلت ایسی ہے جیسے میری فضیلت تم میں سے ادنیٰ آدمی پر۔ بلاشبہ اللہ (رحمت کرتا ہے) اور اللہ کے فرشتے اور آسمانوں والے اور زمینوں والے یہاں تک کہ سوراخوں کے اندر چیونٹیاں اور پانی کے اندر مچھلیاں اس شخص کے لئے دعائے رحمت کرتی ہیں جو لوگوں کو بھلائی کی تعلیم دیتا ہے رواہ الترمذی بسند صحیح عن ابی امامۃؓ۔ ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہزار عابدوں سے ایک عالم شیطان پر زیادہ بھاری ہوتا ہے۔ یہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب آدمی مرجاتا ہے تو اس کا عمل ختم ہو جاتا ہے مگر تین اعمال (کا فائدہ جاری رہتا ہے) صدقہ جاریہ۔ یا وہ علم جس سے لوگ نفع حاصل کریں۔ یا نیک اولاد جو اس کیلئے دعا کرے۔

علم لدنی:

علم لدنی جس کے حامل صوفیہ کرام ہوتے ہیں فرض عین ہے کیونکہ اس باطنی علم کے دو مقصد ہوتے ہیں۔

(۱) اللہ کے سوا ہر چیز کی رغبت کو دل سے نکال دینا ہر دم اللہ کے سامنے اپنے کو حاضر سمجھنا خود پسندی، غرور حسد دنیا کی محبت، عبادات میں سستی، خواہشات نفس ریا کاری شہرت طلبی اور دوسرے اخلاقی باطنی عیوب سے نفس کو پاک رکھنا۔

(۲) گناہوں سے توبہ، رضا بالقضا مصائب پر صبر نعمتوں کا شکر اور دوسرے اچھے خصائل و مکارم اخلاق سے اپنے نفس کو آراستہ کرنا۔ اور ظاہر ہے کہ ہر شخص کے لئے ان ممنوعات سے پرہیز اور فرائض کی پابندی سے زیادہ اہم اور ضروری ہے، جن کا تعلق اعضاء جسمانی سے اگر اخلاص اور نیت کی صحت نہ ہو تو نماز روزہ اور دوسری عبادتیں نا قابل اعتبار ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ صرف اسی عمل کو قبول فرماتا ہے جو خالص ہو اور محض خوشنودی خدا حاصل کرنے کیلئے کیا گیا ہو۔ رواہ النسائی عن ابی امامۃؓ۔ مسلم نے حضرت ابوہریرہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تمہاری صورتوں اور مالوں پر نظر نہیں کرتا بلکہ تمہارے دلوں کو دیکھتا ہے۔

اور یہ بات ظاہر ہے کہ جس چیز پر فرض عین کا مدار ہو وہ خود فرض عین ہوگی لہٰذا علم لدنی جس کے حامل صوفیہ کرام ہیں فرض عین ہے۔

سببِ نزول:

آیت کے نزول کا ایک اور سبب بھی بیان کیا گیا ہے بغوی نے بروایت کلبی اور ابن ابی حاتم نے بروایت عکرمہ و عبداللہ بن عمیر حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ جب غزوہ تبوک کے سلسلہ میں منافقوں کے عیوب اللہ نے بیان فرمائے اور آیت اِلَّا تَنْفِرُوْا یُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا نازل ہوگئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جہادی دستے (مختلف اطراف میں) بھیجنے لگے تو سب مسلمان جہاد کو نکلنے لگے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تنہا چھوڑ کر جانے لگے۔ عکرمہ کی روایت میں آیا ہے کہ کچھ دیہاتی صحرا نشین جہاد کو نہیں گئے منافق کہنے لگے یہ بدوی تباہ ہوگئے (انہوں نے حکم جہاد کی پابندی نہیں کی) اس پر آیت وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِیَنْفِرُوْا (یعنی الی الغزو) كَآفَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ (یعنی عظیمۃ) طَآئِفَةٌ (یعنی الی الغزو وبقی طائفۃ مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم) لِّیَتَفَقَّهُوْا (ای القاعدون) فِی الدِّیْنِ (ای القران والسنن والفرائض والاحکام) نازل ہوئی مطلب یہ کہ تمام مسلمانوں کو جہاد پر نہ چلا جانا چاہیے بلکہ بڑے گروہ میں سے ایک چھوٹی جماعت کو جہاد پر جانا لازم ہے اور ایک جماعت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں قرآن، سنت، فرائض اور احکام سیکھنے کیلئے رہنا چاہیے تاکہ فوجی دستے جب واپس آئیں تو ان کو یہ لوگ بتاسکیں کہ ان کے جانے کے بعد کیا احکام نازل ہوئے۔ چنانچہ (اس آیت کے نزول کے بعد) ایسا ہی ہونے لگا۔ کچھ جماعتیں رسول اللہ کے پاس رکی رہتیں اور کچھ دستے چلے جاتے اس طرح دینی تعلیم کا سلسلہ منقطع نہ ہونے پاتا۔

بعثت کی غرض:

دینی تفقہ جہاد اکبر ہے بعثت کی اصل غرض ہی یہ ہے کہ دلائل کے ساتھ اسلامی احکام کو پیش کیا جائے (تلوار سے جہاد کا درجہ تو دفاعی ہے تبلیغی جہاد کا درجہ اعلیٰ ہے) اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ علماء انبیاء کے جانشین ہیں اس شان نزول اور اس مطلب کی صورت میں لیتفقھوا اور لینذروا کی ضمیریں ان لوگوں کی طرف راجع ہوں گی جو جہادی دستوں کی روانگی کے بعد تحصیل علم کیلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہتے تھے اور رجعوا کی ضمیر جہاد پر جانے والے دستوں کی طرف راجع ہوگی۔

سیوطی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا اس آیت کا حکم اس صورت کے لئے مخصوص ہوگا جب (بغیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے) جہاد پر مسلمانوں کے دستے گئے ہوں اور ترک جہاد کی ممانعت کا حکم اس صورت میں ہوگا جب رسول اللہ خود تشریف لے جائیں۔

حسن کا قول ہے کہ لیتفقھوا اور لینذروا کی ضمیریں ان مسلمانوں کے دستوں کی طرف راجع ہیں جو جہاد پر گئے ہوں آیت کا مطلب یہ ہے کہ ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ ایک فرقہ (ہر گروہ میں سے) جہاد پر چلا جائے اور دین

کی نصرت اور مشرکوں پر غالب ہونے کا خودمشاہدہ کرے اور سمجھے اور پھر جہاد سے واپس آنے کے بعد اپنی قوم کے کافروں کو بتائے کہ اللہ نے اپنے رسول کو اور مومنوں کو فتح عنایت فرمائی اور اس اطلاع دینے کا مقصد یہ ہو کہ ان کی قوم کے کافر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ کرنے سے باز رہیں اور ڈرتے رہیں کہ جو دوسرے کافروں کا حال ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کر کے ہمارا بھی وہی حال ہوگا۔

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاد فرض کفایہ ہے اگر ایک جماعت اس فرض کو ادا کر دے گی تو سب کے سروں سے فرض ساقط ہو جائے گا۔ ہاں اگر جہاد کو عام نداء کر دی جائے اور سب کو جہاد کیلئے آ جانے کا حکم دیدیا گیا ہو تو پھر ہر شخص پر جہاد عینی فرض ہو جاتا ہے۔ (تفسیر مظہری)

اگر جہاد میں شریک ہونیوالی جماعت کافی نہ ہو وہ مغلوب ہونے لگے تو آس پاس کے مسلمانوں پر ان کی تقویت کیلئے نکلنا اور جہاد میں شریک ہونا فرض ہو جاتا ہے، وہ بھی کافی نہ ہو تو ان کے قریب کے لوگوں پر اور وہ بھی کافی نہ ہوں تو ان کے متصل جو مسلمان ہیں ان پر یہاں تک کہ سارے عالم کے مسلمانوں پر ایسی حالت میں جہاد فرض عین ہو جاتا ہے جس سے تخلف حرام ہے۔ اسی طرح فرض ہونے کی ایک صورت یہ ہے کہ مسلمانوں کا امیر ضرورت سمجھ کر نفیر عام کرے اور سب مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دے، تو اس وقت بھی جہاد کی شرکت فرض اور تخلف حرام ہو جاتا ہے جیسا واقعہ غزوہ تبوک میں نفیر عام کی وجہ سے پیش آیا۔ مذکور الصدر آیت میں اسی حکم کو واضح کیا گیا ہے کہ یہ غزوہ تبوک میں نفیر عام کی وجہ سے خصوصی حکم تھا، عام حالات میں جہاد فرض عین نہیں کہ سب مسلمانوں پر جہاد میں جانا فرض ہو۔

علم دین کے فرض عین اور فرض کفایہ کی تفصیل:

ابن عدی اور بیہقی نے بسند صحیح حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ طلب العلم فريضة على كل مسلم (از مظہری) "یعنی علم حاصل کرنا فرض ہے ہر ایک مسلمان پر" یہ ظاہر ہے کہ اس حدیث اور مذکورہ سابقہ احادیث میں علم سے مراد علم دین ہی ہے۔

فرض عین:

ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے کہ اسلام کے عقائد صحیحہ کا علم حاصل کرے اور طہارت، نجاست کے احکام سیکھے، نماز روزہ اور تمام عبادات جو شریعت نے فرض و واجب قرار دی ہیں ان کا علم حاصل کرے جن چیزوں کو حرام یا مکروہ قرار دیا ہے ان کا علم حاصل کرے جس شخص کے پاس بقدر نصاب مال ہو اس پر فرض ہے کہ زکوۃ کے مسائل واحکام معلوم کرے جس کو حج پر قدرت ہے اس کیلئے فرض عین ہے کہ حج کے احکام و مسائل معلوم کرے جس کو بیع و شراء کرنا پڑے یا تجارت وصنعت یا مزدوری واجرت کے کام کرنے پڑیں اس پر فرض عین ہے کہ بیع و اجارہ وغیرہ کے مسائل واحکام سیکھے، جب نکاح کرے تو نکاح کے احکام و مسائل اور طلاق کے احکام و مسائل معلوم کرے، غرض جو کام شریعت نے ہر انسان کے ذمہ فرض و واجب کئے ہیں ان کے احکام و مسائل کا علم حاصل کرنا بھی ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے۔

علم تصوف بھی فرض عین میں داخل ہے:

احکام ظاہرہ نماز، روزے کو تو سبھی جانتے ہیں کہ فرض عین ہیں، اور ان کا علم حاصل کرنا بھی فرض عین ہے حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر مظہری میں اسی آیت کے تحت لکھا ہے کہ اعمال باطنہ اور محرمات باطنہ کا علم جس کو عرف میں علم تصوف کہا جاتا ہے چونکہ یہ باطنی اعمال بھی ہر شخص پر فرض عین ہیں تو ان کا علم بھی سب پر فرض عین ہے۔

فرض کفایہ:

پورے قرآن مجید کے معانی و مسائل کو سمجھنا تمام احادیث کو سمجھنا اور ان میں معتبر اور غیر معتبر کی پہچان پیدا کرنا، قرآن وسنت سے جو احکام و مسائل نکلتے ہیں ان سب کا علم حاصل کرنا، اس میں صحابہ وتابعین اور ائمہ مجتہدین کے اقوال و آثار سے واقف ہونا یہ اتنا بڑا کام ہے کہ پوری عمر اور سارا وقت اس میں خرچ کر کے بھی پورا حاصل ہونا آسان نہیں، اس لئے شریعت نے اس علم کو فرض کفایہ قرار دیا ہے کہ بقدر ضرورت۔ کچھ لوگ یہ سب علوم حاصل کرلیں تو باقی مسلمان سبکدوش ہو جائیں گے۔

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ آجکل جو عموماً وعظ وتبلیغ بہت کم موثر ہوتی ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس میں انذار کے آداب نہیں ہوتے جس کے طرز بیان اور لب ولہجے سے شفقت ورحمت اور خیر خواہی مترشح ہو، مخاطب کو یقین ہو کہ اس کے کلام کا مقصد نہ مجھے رسوا کرنا ہے نہ بدنام کرنا نہ اپنے دل کا غبار نکالنا، بلکہ یہ جس چیز کو میرے لئے مفید اور ضروری سمجھتا ہے وہ محبت کی وجہ سے بتلا رہا ہے اگر آج ہماری تبلیغ اور خلاف شرع امور کے مرتکب لوگوں کو اصلاح کی دعوت کا یہ طرز ہو جائے تو اس کا ایک نتیجہ تو قطعاً لازم ہی ہے کہ مخاطب کو ہماری گفتگو سے ضد پیدا نہیں ہوگی وہ جواب دہی کی فکر میں پڑنے کے بجائے اپنے اعمال کا جائزہ لینے اور انجام سوچنے کی طرف متوجہ ہو جائیگا اور اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو کبھی نہ کبھی اس کو قبول بھی کریگا اور دوسرا نتیجہ یہ لازمی ہے کہ کم از کم اس سے باہمی منافرت اور لڑائی جھگڑا پیدا نہیں ہوگا جس میں آجکل ہماری پوری قوم مبتلا ہے۔

آخر میں لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ فرما کر اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ عالم کا کام اتنا ہی نہیں کہ عذاب سے ڈرا دیا بلکہ اس پر نظر رکھنا بھی ہے کہ اس تبلیغ ودعوت

کا اثر کتنا اور کیا ہوا، ایک دفعہ موثر نہیں ہوئی تو بار بار کرتا ہے تا کہ اس کا نتیجہ یحذرون برآمد ہو سکے یعنی قوم کا گناہوں سے بچنا، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

کما قال تعالیٰ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ

فقہاء اور محدثین:

شریعت کی حفاظت امت پر فرض ہے حضرات محدثین نے الفاظ شریعت کی حفاظت کی اور حضرات فقہاء نے معانی شریعت کی حفاظت کی دونوں ہی اللہ کے مقبول گروہ ہیں، جس طرح انبیاء کرام میں درجات اور مراتب کا فرق ہے۔ کما قال تعالیٰ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ اسی طرح وارثین انبیاء یعنی علماء میں بھی درجات اور مراتب کا فرق ہے۔

حضرات محدثین اور حضرات فقہاء میں اتنا ہی فرق ہے جتنا کہ لفظ اور معنی میں ہیں درجہ اور مراتب کا فرق ہے۔ حافظ قرآن الفاظ قرآنی کا حافظ ہے اور ایک مفسر قرآن، معانی قرآن کا عالم اور فاہم ہے۔

عالم کی تقلید فرض ہے:

بہر حال اس آیت سے طلب علم دین اور تفقہ فی الدین کی کمال فضیلت ثابت ہوتی ہے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ عالموں پر بے علموں کو عذاب الٰہی سے ڈرانا فرض ہے اور بے علموں پر عالموں کی تقلید فرض ہے ناقص پر کامل کی تقلید عقلاً فرض ہے جو شخص درجہ اجتہاد کو نہ پہنچا ہو اس پر کسی مجتہد کامل کی تقلید فرض ہے۔ (معارف کاندھلویؒ)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ
اے ایمان والو لڑتے جاؤ اپنے نزدیک کے
مِّنَ الْكُفَّارِ
کافروں سے

جہاد کی ترتیب: جہاد فرض کفایہ ہے جو ترتیب طبعی کے موافق اول ان کفار سے ہونا چاہیے جو مسلمانوں سے قریب تر ہوں بعدہ ان کے قریب رہنے والوں سے اسی طرح درجہ بدرجہ حلقہ جہاد کو وسیع کرنا چاہیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے جہاد اسی ترتیب سے ہوئے "دفاعی جہاد" میں بھی فقہاء نے یہ ہی ترتیب رکھی ہے کہ جس اسلامی ملک پر کفار حملہ آور ہوں وہاں کے مسلمانوں پر دفاع واجب ہے اگر وہ کافی نہ ہوں یا سستی کریں تو ان کے متصل رہنے والوں پر۔ وہ کافی نہ ہوں تو پھر جو ان سے متصل ہیں۔ اسی طرح اگر ضرورت پڑے تو درجہ بدرجہ مشرق سے مغرب تک جہاد فرض ہوتا چلا جائیگا۔ (تفسیر عثمانی)

قریبی دشمن:

حضرات صوفیہ فرماتے ہیں کہ مومن کا قریبی دشمن اس کا نفس امارہ ہے جو کفران نعمت میں سب سے آگے ہے اور تمام دشمنوں میں سب سے زیادہ یہی قریب ہے اس لئے نفس امارہ سے جہاد وقتال جہاد اکبر ہے۔

جیسا کہ حدیث میں آیا ہے المهاجر من هجر ما [illegible] الله عنه والمجاهد من جاهد نفسه یعنی اصل مہاجر وہ ہے کہ جو معصیت سے ہجرت کر کے طاعت کی طرف آجائے اور اصل مجاہد وہ ہے کہ جو اپنے قریبی دشمن نفس سے جہاد کرے۔

ازو خوہ یاری کہ یاری دہ اوست بدو التجا کن کہ اینہا از وست
کسے را کہ او آورد در پناہ چہ غم دارد از فتنہ کینہ خواہ

(الحمد للہ معارف مفتی اعظم)

اس آیت کے مقتضا کا لحاظ کرتے ہوئے علماء فقہ نے صراحت کی ہے کہ کفار کی سرحد کے قریب جو مسلمان رہتے ہوں ان پر سرحدی کافروں سے جہاد کرنا واجب ہے اگر وہ کافی نہ ہوں اور زیادہ طاقت کی ضرورت ہو یا وہ سستی کریں اور حکم جہاد کی پرواہ نہ کریں تو ان سرحدی مسلمانوں کے متصل جو مسلمان رہتے ہوں ان پر سرحدی کافروں سے جہاد کرنا واجب ہو جاتا ہے اور ان میں بھی اگر بقدر ضرورت طاقت نہ ہو یا سستی کی وجہ سے وہ جہاد ترک کر بیٹھیں تو ان سے پیچھے والے مسلمانوں کا وہی فریضہ ہو جاتا ہے جو سستی کرنے والوں کا تھا اس ترتیب کے ساتھ مشرق و مغرب کے تمام مسلمانوں پر جہاد کی فرضیت ہو جاتی ہے۔ میت کی تجہیز و تکفین کا سامان مہیا کرنا اور میت کی نماز پڑھنے کا بھی یہی حکم ہے۔

زید بن یعیب کا واقعہ:

محمد بن عمر اور محمد بن اسحاق کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی کھو گئی لوگ اس کی تلاش میں نکلے زید بن یعیب قبیلہ بنی قینقاع کا ایک یہودی تھا جو مسلمان ہو گیا تھا مگر تھا دل میں منافق اور حضرت عمارہ بن حزم کے پڑاؤ پر رہتا تھا یہ کہنے لگا محمد نبی ہونے کا اور آسمانی خبریں دینے کا تو دعویٰ کرتے ہیں لیکن خود اتنا بھی نہیں جانتے کہ اونٹنی کہاں گئی، حضرت عمارہ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھے (منافق نے یہ بات ان کی غیر موجودگی میں کہی تھی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا منافق نے ایسی بات کہی ہے۔ خدا کی قسم میں تو اتنا ہی جانتا ہوں جتنا اللہ نے مجھے بتا دیا ہے۔ اب مجھے اللہ نے اطلاع دی ہے کہ اونٹنی وادی کے اندر فلاں گھاٹی میں ہے، حسب فرمان لوگ وہاں گئے اونٹنی مل گئی اس کو لے آئے اب عمارہ زید کے پاس پہنچے اور اس کا گلا دباتے ہوئے کہا اللہ کے دشمن میرے پڑاؤ سے نکل جا، میرے ساتھ نہ رہ۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ بعض

لوگوں کا خیال ہے کہ زید نے (اس کے بعد سچے دل سے) توبہ کرلی تھی کچھ کہتے ہیں وہ منافق ہی رہا اور اسی حالت میں مرا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت عبدالرحمٰن کے پیچھے نماز پڑھنا

اسی غزوہ میں وہ واقعہ بھی ہوا تھا جو مسلم نے حضرت مغیرہ بن شعبہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فجر سے پہلے رفع حاجت کیلئے گئے (لوگ نماز کا انتظار کرتے رہے) جب اجالا زیادہ ہوگیا اور سورج نکلنے کا اندیشہ ہوگیا تو انہوں نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کو آگے بڑھادیا اور آپ نماز پڑھانے کھڑے ہوگئے رفع حاجت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور وضو کرنا چاہا مگر کرتہ کی آستینیں تنگ تھیں (اوپر نہ چڑھ سکیں) آپ نے اندر سے آستینوں سے ہاتھ نکال کر وضو کیا اور موزوں پر مسح کیا پھر ایک رکعت جماعت کے ساتھ پڑھی اور ایک رکعت (فوت شدہ) ادا کی پھر سلام پھیرا اور فرمایا تم نے اچھا کیا، نماز کو وقت پر پڑھا کرو۔ کسی نبی کی وفات اس وقت تک نہیں ہوئی جب تک اس نے اپنی امت کے کسی نیک آدمی کے پیچھے کوئی نماز نہ پڑھ لی ہو (یعنی میں نے عبدالرحمٰن کے پیچھے جو نماز پڑھی یہ کوئی نئی بات نہیں نہ اس سے میری توہین ہوئی ہر نبی کی یہی سنت ہے ہر نبی نے اپنی وفات سے پہلے اپنی امت کے کسی مرد صالح کے پیچھے نماز ضرور پڑھی ہے)

احمد اور طبرانی کا بیان ہے کہ حضرت سہیل بن بیضاء کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اونٹنی پر اپنے پیچھے بٹھالیا اور بلند آواز سے فرمایا سہیل، سہیل نے عرض کیا میں حاضر ہوں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ لفظ تین مرتبہ فرمایا اور ہر بار سہیل نے جواب میں لبیک کہا اس سے لوگ سمجھے کہ حضور کا مقصد ہم کو خطاب کرنا ہے چنانچہ سب جمع ہوگئے جب سب آگئے تو ارشاد ہوا جس نے شہادت دی کہ اللہ واحد کے سوا کوئی معبود نہیں اس کا کوئی شریک نہیں تو اللہ نے اس کیلئے دوزخ کو حرام کردیا۔

جنوں کا قرآن سننا:

محمد بن عمر نے اور دلائل میں ابونعیم نے بیان کیا ہے کہ ایک بڑا سانپ (ایک بار) لوگوں کے راستہ میں آپڑا۔ راوی نے سانپ کی بڑائی اور موٹائی کا ذکر کیا ہے (یعنی بڑا موٹا سانپ تھا) پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وہ سانپ بڑھا اور آکر کھڑا ہوگیا آپ اس وقت اونٹنی پر سوار تھے لوگ حضور کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اونٹنی کھڑی ہوگئی فرمایا یہ سانپ آٹھ جنات کی اس جماعت میں سے ایک ہے جو قرآن سننے میرے پاس آئے ہیں یہ تم کو سلام کہہ رہا ہے سب حاضرین نے جواب دیا وعلیہ السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

تبوک کا چشمہ:

امام احمد نے صحیح سند سے حضرت حذیفہ کے حوالہ سے حضرت معاذ کا بیان نقل کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا ان شاء اللہ کل تم تبوک کے چشمہ پر پہنچ جاؤ گے اور دن چڑھے پہنچوں گے جو شخص (پہلے) پہنچ جائے وہ میرے پہنچنے تک پانی کو ہاتھ نہ لگائے چنانچہ (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے کے مطابق) ہم وہاں پہنچ گئے مگر ہم سے پہلے دو آدمی وہاں پہنچ چکے تھے چشمہ سے پانی (پتلی دھار سے) چمڑے کے تسمے کی طرح بہہ رہا تھا حضور نے ان دونوں آدمیوں سے دریافت فرمایا کیا تم نے پانی کو چھوا ہے انہوں نے جواب دیا جی ہاں آپ نے ان کو سخت سست کہا اور جو کچھ اللہ نے چاہا ان کو فرمایا پھر لوگوں نے چلوؤں سے تھوڑا تھوڑا پانی لیکر ایک مشکیزہ میں بھرا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں اپنے ہاتھ بھی دھوئے اور منہ بھی اور کلی بھی (اس میں) کی اس کے بعد لوٹا کر پانی کو چشمہ میں ڈالدیا۔ ڈالتے ہی پانی بکثرت بہنے لگا۔ ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ پانی (زمین پھٹ کر نکلا اور اس) سے ایسا تڑاکا ہوا کہ سننے والے کہنے لگے یہ آواز تو بجلی کڑکنے کی طرح ہے تبوک میں اسی پانی کا فوارہ موجود ہے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا معاذ اگر تمہاری زندگی کچھ طویل ہوئی تو دیکھ لوگے کہ یہاں آس پاس باغ ہوجائیں گے۔ بیہقی اور ابونعیم نے عروہ کی روایت سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں کہ تبوک کا چشمہ فوراً اچھلنے لگا یہاں تک کہ بھر گیا اور اب تک اسی طرح ہے۔

اچھا اور برا آدمی:

امام احمد اور نسائی نے حضرت ابوسعید خدری کی روایت سے بیان کیا ہے کہ تبوک کے سال ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اس وقت کھجور کے ایک درخت سے آپ پشت کا سہارا لگائے ہوئے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بلند آواز سے فرمایا کیا میں تم کو بتاؤں کہ سب سے اچھا آدمی کون ہے اور سب سے برا کون ہے سب سے اچھے آدمیوں میں سے تو وہ شخص ہے جو گھوڑے یا اونٹ کی پشت پر سوار ہوکر یا پیدل سامان اٹھائے ہوئے مرتے دم تک راہ خدا میں جہاد میں مشغول رہتا ہے اور بدترین آدمیوں میں سے وہ شخص ہے جو اللہ کی کتاب (تو) پڑھتا ہے (مگر) اس کے احکام کی طرف متوجہ ہوکر (اپنی کسی خواہش سے) باز نہیں آتا۔

مؤمن اور کافر کا کھانا:

محمد بن عمر نے بنی سعد کے ایک آدمی کی روایت سے بیان کیا کہ تبوک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چند آدمیوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے میں خدمت گرامی میں حاضر ہوا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بلال ہم کو کھانا کھلاؤ بلال نے کئی بار اپنے ہاتھ سے گھی اور پنیر میں گوندھی ہوئی کھجوریں نکالیں ہم سب نے وہ کھائیں اور سب شکم سیر ہوگئے۔ میں نے عرض کیا

یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے تو میں اکیلا اتنا کھالیا کرتا تھا فرمایا کافر سات آنتوں میں کھاتا ہے اور مومن ایک آنت میں کھاتا ہے پھر دوسرے روز جب میں خدمت گرامی میں پہنچا تو آپ کے آس پاس دس آدمی بیٹھے ہوئے تھے بلال سے فرمایا ہم کو کھانے کو دو۔ بلال تھیلی سے مٹھی بھر بھر کر چھوارے نکالنے لگے فرمایا نکالو اور مالک عرش کے نادار ہونے کا اندیشہ نہ کرو (یعنی اللہ کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں وہ کل کو پھر دے گا) حضرت بلال نے پوری تھیلی لاکر بکھیر دی میرے اندازہ میں کل چھوارے دو سیر ہوں گے رسول اللہ نے دست مبارک چھواروں پر رکھ دیا اور فرمایا بسم اللہ پڑھ کر کھاؤ سب نے کھایا میں نے بھی ان کے ساتھ کھایا کھاچکنے کے بعد چمڑے کے دسترخوان پر اتنے ہی چھوارے معلوم ہوتے تھے جتنے بلال لائے تھے معلوم ہوتا تھا ہم نے ایک چھوارہ بھی نہیں کھایا (تیسرے روز) صبح کو میں پھر گیا اور گزشتہ دن والی جماعت بھی دوبارہ آگئی۔ وہ دس تھے یا ایک دوزیادہ تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال سے فرمایا بلال کھانا کھلاؤ بلال وہی تھیلی لے آئے میں اس کو پہچانتا تھا لاکر انہوں نے تھیلی بکھیر دی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور فرمایا اللہ کا نام لے کر کھاؤ ہم نے کھایا سب سیر ہوگئے پھر چھوارے اتنے ہی ہوگئے جتنے بکھیرے تھے ایسا تین روز ہوا۔

چھواروں میں برکت:

ایک اور قصہ میں محمد بن عمر ابونعیم اور ابن عساکر نے حضرت عرباض بن ساریہ کی روایت سے بیان کیا ہے۔ حضرت عرباض کا کہنا ہے کہ ہم تین آدمی تھے، میں اور جعال بن سراقہ اور عبداللہ بن مغفل مزنی ہم سب بھوکے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر پڑے زندگی کے دن گذارتے تھے ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خیمہ میں داخل ہوئے ساتھ میں آپ کی بی بی حضرت ام سلمہ بھی تھیں اندر جاکر کچھ کھانے کو ڈھونڈھا مگر کچھ نہیں ملا باہر نکل کر حضرت بلال کو آواز دی اور فرمایا ان لوگوں کے طعام شب کیلئے کچھ ہے۔ حضرت بلال نے تھیلیاں لے کر ایک ایک تھیلی جھاڑنی شروع کی اور تھیلیوں میں سے ایک ایک دودو چھوارے گرنے لگے۔ کل سات چھوارے گرے ان کو ایک پلیٹ میں رکھ دیا گیا، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور بسم اللہ کی اور فرمایا بسم اللہ کرکے کھاؤ، ہم نے کھایا، میں نے گن کر ۵۴ چھوارے کھائے، میں گنتا جارہا تھا اور ان کی گٹھلیاں دوسرے ہاتھ میں رکھ رہا تھا۔ میرے دونوں ساتھی بھی وہی کررہے تھے جو میں کررہا تھا (اوسطا) ہم میں سے ہر ایک نے پچاس چھوارے کھائے آخر ہاتھ کھینچ لئے لیکن وہ سات چھوارے ویسے کے ویسے ہی رہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بلال ان کو اٹھالو سب کا پیٹ بھر گیا اب کوئی نہیں کھاتا جب صبح ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر کی نماز پڑھ لی تو خیمہ کی طرف جاکر خیمہ کے آگے صحن میں بیٹھ گئے ہم بھی گرداگرد بیٹھ گئے ہم دس آدمی تھے فرمایا کیا تم لوگوں کیلئے صبح کا کھانا ہے (انکار کرنے کے بعد) آپ نے چھواروں سمیت بلال کو طلب فرمایا اور دست مبارک چھواروں کی پلیٹ پر رکھ دیا پھر فرمایا بسم اللہ کرکے کھاؤ حسب الحکم ہم نے کھایا قسم ہے اس کی جس نے حضور کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا تھا ہم دس تھے سب کے پیٹ بھر گئے سیر ہونے کے بعد سب نے ہاتھ اٹھالئے مگر چھوارے ویسے ہی رہے جیسے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اب مجھے اللہ سے (مزید دعا کرتے) شرم آتی ہے اگر یہ بات نہ ہوتی تو مدینہ پہنچنے تک ہم انہی چھواروں کو کھاتے رہتے۔ اتفاقاً شہر کا ایک چھوٹا لڑکا سامنے سے آگیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھوارے دست مبارک میں لے کر اس کو دے دیئے وہ چھوارے چباتا پشت پھیر کر چلا گیا۔

منافق کی موت:

محمد بن عمر کا بیان ہے کہ تبوک میں ایک تیز ہوا چلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک بڑے منافق کی موت کیلئے (یہ ہوا چلی ہے) چنانچہ لوگ مدینہ میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ایک بہت بڑا منافق مرگیا۔

پانی کا کنواں ابل پڑا:

محمد بن عمر کا بیان ہے کہ بنی سعد کے کچھ شکستہ حال لوگ خدمت گرامی میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم خدمت گرامی میں حاضر ہوئے ہیں اور بال بچوں کو ایک ایسے کنویں پر چھوڑ آئے ہیں جس میں پانی کم ہے اور یہ سخت گرمی ہے اگر ہم وہاں کی سکونت ترک کردیں تو اندیشہ ہے کہ ہم کو کاٹ دیا جائیگا کیونکہ ہمارے اطراف میں ابھی اسلام نہیں پہنچا ہے آپ ہمارے پانی کیلئے اللہ سے دعا فرمائیں اگر ہم (بقدرضرورت) سیراب ہوگئے تو ہم سے زیادہ باعزت (وہاں) کوئی قوم نہ ہوگی ہمارے دین کا کوئی مخالف ہمارے پاس پھٹکنے بھی نہ پائے گا۔ فرمایا چند پتھریاں لاکر مجھے دیدو ایک شخص نے تین پتھریاں لاکر دیدیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پتھریوں کو ہاتھ میں لے کر ملا اور فرمایا ان کو لے جاکر ایک ایک کرکے بسم اللہ کرکے کنویں میں ڈال دو۔ لوگ واپس چلے گئے اور حسب ہدایت عمل کیا فوراً کنواں ابل پڑا پھر ان لوگوں نے اپنے مخالف مشرکوں کو وہاں سے نکال دیا اور روند ڈالا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب لوٹ کر مدینہ پہنچے تو بنی سعد والے آس پاس کے سب لوگوں کو اسلام پر متفق کرچکے تھے اور سب مسلمان ہوکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطیع ہوچکے تھے۔

حضرت معاویہ بن معاویہ کا انتقال:

طبرانی نے حضرت ابن عمر و معاویہ بن ابی سفیان کی روایت سے اور بیہقی

وابن سعد نے حضرت انس کی روایت سے بیان کیا، راوی کا بیان ہے (ایک روز) طلوع کے وقت سورج میں ایسی چمک نور اور شعاعیں دکھائی دیں کہ گذشتہ ایام میں میں نے کبھی نہیں دیکھی تھیں حضرت جبرئیل آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے اس کا سبب دریافت کیا حضرت جبرئیل نے کہا آج مدینہ میں معاویہ بن معاویہ مزنی کا انتقال ہوگیا اس (شعاعی تغیر) کی یہی وجہ ہے اللہ نے ستر ہزار فرشتے ان کے جنازہ کی نماز پڑھنے بھیجے ہیں کیا آپ بھی ان کی نماز پڑھیں گے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے (غائبانہ) نماز جنازہ پڑھی اور ملائکہ نے آپ کے پیچھے دو صفیں بنالیں نماز سے فارغ ہوکر حضرت جبرئیل سے فرمایا معاویہ اس مرتبہ کا مستحق کس سبب سے قرار پایا، حضرت جبرئیل نے جواب دیا وہ قل ہو اللہ احد سے محبت رکھتا تھا اٹھتے بیٹھتے سوار پیدل ہر حالت میں قل ہو اللہ پڑھا کرتا تھا۔ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے، یہ حدیث دوسری سندوں سے بھی مروی ہے اور ایک سند دوسری سند کی تائید کرتی ہے۔

گھی میں برکت

طبرانی اور ابونعیم نے عمرو اسلمی کے دادا کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوہ تبوک کیلئے نکلے تو اس سفر میں حضور کی خدمت پر تھا میں نے دیکھا کہ کپی میں گھی کم رہ گیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے مجھے کھانا تیار کرنا تھا اس لئے کپی کو دھوپ میں رکھ دیا (تاکہ گھی پگھل کر یکجا ہو جائے تو نکالا جاسکے) کپی کو دھوپ میں رکھ کر میں سو گیا، کپی میں ابال آیا اور گھی کے جوش مارنے کی آواز سے میں بیدار ہو گیا، میں نے فوراً اپنے ہاتھ سے کپی کا منہ بند کرلیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تو اس کو چھوڑ دیتا تو وادی گھی سے بہ نکلتی (یعنی پانی کی طرح وادی میں گھی کا سیلاب آجاتا)

قیصر کی طرف خط:

حارث بن اسامہ نے حضرت بکر بن عبداللہ مزنی کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص یہ خط قیصر کے پاس لے جائے گا اس کے لئے جنت ہے ایک شخص نے عرض کیا خواہ قیصر خط کو قبول نہ کرے (فرمایا ہاں) وہ شخص خط لے کر قیصر کے پاس پہنچا قیصر نے خط پڑھ کر کہا تم اپنے نبی سے جاکر کہہ دو کہ میں ان کا تابعدار ہوں مگر میں اپنی حکومت نہیں چھوڑنا چاہتا قیصر نے اس شخص کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کچھ اشرفیاں بھی بھیجیں قاصد نے لوٹ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قیصر کا پیام عرض کر دیا، حضور نے فرمایا، اس نے جھوٹ کہا پھر اشرفیاں آپ نے تقسیم کر دیں۔

ہرقل کی طرف خط:

امام احمد اور ابویعلی نے حسن سند کے ساتھ سعید بن ابی راشد کی روایت سے ہرقل کے قاصد تنوخی کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبوک پہنچ کر دحیہ کلبی کو ہرقل کے پاس (خط دیکر) بھیجا ہرقل کے پاس نامہ مبارک پہنچ گیا تو اس نے روم کے عیسائی علماء اور پادریوں کو بلوایا جب سب آگئے تو کمرہ کا بیرونی دروازہ بند کرا دیا، پھر حاضرین سے کہا تم دیکھ رہے ہو کہ یہ شخص (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) تبوک میں فروکش ہے اور اس نے تین باتوں کی مجھے اجازت دی ہے کہ ان تین میں سے ایک بات کو اختیار کرلوں۔ (۱) یا تو مذہب میں میں اس کا اتباع کرلوں (یعنی عیسائیت چھوڑ کر مسلمان ہو جاؤں)۔

(۲) یا ہم اپنے ملک پر قابض رہیں اور ملک کی پیداوار کا کچھ حصہ (بطور جزیہ) میں اس کو دیدوں۔ (۳) یا ہم اس سے جنگ کریں تم کتابوں میں جو کچھ پڑھتے ہو اس سے واقف ہو اس لئے آؤ ہم اس کے دین کا اتباع کرلیں یا اپنی زمین پر قابض رہتے ہوئے اپنا مال (بطور جزیہ) اس کو ادا کر دیں (لڑنے میں تو کامیابی ممکن نہیں) یہ سن کر سب غضبناک ہوکر ایک آواز ہوگئے اور غصہ کا جواب دیا پھر اٹھ کر نکل چلے اور بولے تم ہم کو نصرانیت چھوڑ دینے یا حجاز کے ایک اعرابی کے غلام بن جانے کا مشورہ دے رہے ہو۔ ہرقل نے خیال کیا کہ اگر یہاں سے یہ یونہی چلے گئے تو رومیوں کو میرے خلاف بگاڑیں گے اس لئے فوراً اوپر چڑھ کر اس نے کہا میں نے تو یہ بات صرف تمہاری دینی حمیت و پختگی کو جانچنے کیلئے کہی تھی (سب لوگ واپس آگئے)

خط کا جواب:

ایک شخص تجیب تھا جو عرب تھا اور عرب کے عیسائیوں کا سرگروہ اس کو مقرر کیا گیا تھا، ہرقل نے اس کو بلایا اور اس کو حکم دیا کہ کسی ایسے شخص کو لاؤ جو بات یاد رکھ سکے اور جس کی زبان عربی ہو، میں اس کو اس (مدعی نبوت) کے خط کا جواب دیکر بھیجنا چاہتا ہوں چنانچہ (تجیب کی معرفت) مجھے بلوایا گیا اور ہرقل نے مجھے ایک خط دیکر کہا میرا یہ خط اس شخص کے پاس لے جاؤ اور جو بات تم اس سے سنو اس کو یاد رکھنا تین چیزیں یاد رکھنے کے قابل ہیں (۱) اس نے جو خط بھیجا ہے اس کا کچھ تذکرہ کرتا ہے یا نہیں۔ (۲) یہ بھی غور کرنا کہ میرے اس خط کو پڑھ کر وہ رات کا (لفظ اپنے کلام) ذکر کرتا ہے یا نہیں۔ (۳) اس کی پشت کو دیکھنا کہ پشت پر کوئی چیز تمہارے لئے شک آفریں ہے یا نہیں۔ (تفسیر مظہری)

قاصد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں:

میں ہرقل کا خط لے کر تبوک پہنچا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابیوں کے ساتھ پانی (یعنی چشمہ) پر گوٹ مار کر بیٹھے ہوئے تھے میں نے حاضرین سے پوچھا تمہارا سردار کہاں ہے؟ لوگوں نے کہا یہ موجود ہیں میں چل کر ان کی طرف گیا اور سامنے جا کر بیٹھ گیا اور ان کو وہ خط دیدیا انہوں نے خط کو گودی میں رکھ لیا اور فرمایا تم کس قبیلہ سے ہو۔ میں نے کہا تنوخ سے فرمایا کیا تم

کواسلام کی رغبت ہے جوخالص توحید کامسلک اورتمہارے باپ ابراہیم کادین ہے میں نے کہا میں ایک قوم کا قاصد ہوں اور ایک قوم کے مذہب پرہوں اورواپس پہنچنے تک اسی مذہب پر رہوں گا آپ ہنس دیئے اور فرمایا:

اِنَّكَ لَاتَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ

اے تنوخی میں نے ایک خط کسریٰ کو بھیجا تھا اس نے خط کو پارہ پارہ کر دیا اللہ اس کواوراس کے ملک کو پارہ پارہ کر دیگا۔ اور میں نے تیرے آقا کو بھی خط لکھا تھا اس نے میرے خط کو (تھام لیا) روک لیا (نہیں پھاڑا) اس لئے جب تک اس کی زندگی میں بہتری ہوگی لوگ اس کا رعب محسوس کرتے رہیں گے (یعنی اس کی حکومت باقی رہیگی) میں نے کہا میرے آقا نے جن تین باتوں کو یاد رکھنے کی ہدایت کی تھی ان میں سے ایک تو یہ ہے چنانچہ تیردان سے میں نے ایک تیر نکال کر (اس کی نوک سے) تلوار کی نیام پر یہ بات لکھ لی۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا دیا ہوا خط اپنے بائیں ہاتھ پر بیٹھے ہوئے آدمی کو دے دیا میں نے کہا یہ خط پڑھنے والا کون ہے لوگوں نے کہا معاویہ

بات کا جواب:

میرے آقا کے خط میں لکھا ہوا تھا۔ آپ مجھے جنت کی طرف بلا رہے ہیں جس کی پہنائی آسمان وزمین (کے برابر) ہے اور وہ مومنوں کے لئے تیار کی گئی ہے تو بتایئے دوزخ کہاں ہے (کیا اس سارے جہان سے باہر ہے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سبحان اللہ رات (سارے جہان میں یا کسی ملک میں) آجاتی ہے تو دن کہاں چلا جاتا ہے، میں نے فوراً ترکش سے تیر نکال کر (اس کی نوک سے) تلوار کی نیام پر یہ بات لکھ لی۔

قاصد کا انعام اور مہمان نوازی:

خط پڑھنے سے فارغ ہو کر فرمایا تمہارا حق ہے تم قاصد ہو اگر ہمارے پاس کچھ انعام دینے کو ہوتا تو ہم تم کو دیتے مگر ہم نادار مسافر ہیں، فوراً جماعت میں سے ایک آدمی نے پکار کر کہا میں اس کو انعام دوں گا چنانچہ اس نے اپنا سامان کھولا اور ایک زرد رنگ کا جوڑا کپڑوں کا نکال کر میری گود میں رکھ دیا۔ میں نے پوچھا یہ انعام دینے والا کون ہے لوگوں نے کہا عثمان، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس شخص کو مہمان کون رکھے گا ایک انصاری جوان بولا میں چنانچہ انصاری اٹھ کھڑا ہوا میں بھی اسکے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ جب مجلس سے میں نکل گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پکار کر فرمایا تنوخی ادھر آؤ میں تیزی کے ساتھ لپکتا پہنچا اور اسی جگہ پر بیٹھ گیا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پشت سے گوٹ کھولدی اور فرمایا ادھر جاؤ (یعنی پشت کی طرف بیٹھو) میں پشت کی طرف جا کر بیٹھ گیا تو مجھے ایک موٹی سینگی کی طرح مہر نبوت دکھائی دی جو شانہ کے موڑ کی جگہ پر تھی۔

قاصد کی واپسی:

محمد بن عمر کا بیان ہے پھر یہ شخص واپس چلا گیا اور جا کر ہرقل سے ساری روئیداد کہہ دی ہرقل نے اپنی قوم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی دعوت دی لیکن انہوں نے انکار کیا یہاں تک کہ اس کو اپنی حکومت کے زوال کا اندیشہ ہو گیا اس وقت وہ حمص میں تھا اس نے کوئی حرکت نہیں کی نہ اپنی جگہ سے سرکا جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی تھی کہ ہرقل اپنے ساتھیوں کو تیار کر کے سب کو لے کر وادی شام کے قریب آ گیا ہے اس کی یہ اطلاع غلط تھی ہرقل نے تو اس کا ارادہ بھی نہیں کیا نہ اس کا یہ مقصد تھا۔

ہرقل کا ایمان جھوٹا:

سہیلی نے ذکر کیا ہے کہ ہرقل نے کچھ تحفے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو قبول فرمالیا اور مسلمانوں کو بانٹ دیا۔ ہرقل نے ایک منادی کو حکم دیا کہ لوگوں میں یہ ندا کر دے کہ ہرقل محمد پر ایمان لے آیا اور ان کا تابعدار ہو گیا۔ یہ اعلان سن کر مسلح فوجیں گھس آئیں اور ہرقل کو قتل کرنے کے ارادے سے قصر کا محاصرہ کر لیا۔ ہرقل نے ان کے پاس پیام بھیجا کہ میں تو تمہاری دینی پختگی کی جانچ کرنی چاہتا تھا۔ تمہارا یہ جوش دیکھ کر میں خوش ہو گیا (اب جاؤ) فوجی یہ بات سن کر ہرقل سے راضی ہو گئے۔ (اور واپس چلے گئے) اس کے بعد ہرقل نے ایک خط لکھ کر دحیہ کے ہاتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیج دیا خط میں لکھا تھا میں بلاشبہ مسلم ہوں مگر بے بس ہوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خط پڑھ کر فرمایا اللہ کے دشمن نے جھوٹ کہا اللہ کی قسم وہ مسلمان نہیں ہے عیسائیت پر قائم ہے۔

دومۃ الجندل پر چڑھائی اکیدر کی گرفتاری

بیہقی نے بحوالہ ابن اسحاق یزید بن رومان اور عبداللہ بن بکر کا بیان نقل کیا ہے۔ نیز بیہقی نے خود عروہ بن زبیر کا قول بیان کیا ہے کہ جب تبوک سے واپسی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کا رخ کیا تو رجب ۹ھ میں خالد بن ولید کو ۴۲۰ سواروں کے ساتھ دومۃ الجندل کی طرف اکیدر بن عبدالملک (حاکم دومۃ الجندل) کو گرفتار کرنے کیلئے بھیج دیا، اکیدر ایک کندی عیسائی تھا۔ حضرت خالد نے عرض کیا میرے ساتھ تھوڑے آدمی ہیں بنی کلاب کی بستیوں کے اندر پہنچ کر اکیدر کو گرفتار کرنا کیسے ممکن ہوگا، فرمایا تم اس کو شکار کھیلتے ہوئے پاؤ گے گرفتار کر لینا، پھر اللہ دومۃ الجندل کی فتح عنایت فرما دے گا۔ جب تم اس کو پکڑ لو تو قتل نہ کرنا میرے پاس لے آنا۔ حسب الحکم خالد چلے گئے اور اس کے قلعہ سے اتنی دور رہ گئے جتنی دور صاف چاندنی رات میں نگاہ پہنچ سکتی ہے

(یعنی بقدر حدنظر) اکیدر اس وقت مکان کی چھت پر اپنی بی بی رباب بنت انیف بن عامر کندی کے ساتھ موجود تھا (سخت گرمی تھی) گرمی کی وجہ سے ایک مغنیہ باندی کو لیکر وہ قلعہ کے اوپر چڑھ گیا پھر اس نے شراب (یا شربت) منگوا کر پی اتفاقاً کسی نیل گائے نے قلعہ کے پاس آ کر قلعہ کے دروازہ سے سینگ رگڑنا شروع کر دیئے۔ نیل گائے کو دیکھ کر اکیدر نیچے اتر کر (شکار کے ارادہ سے) گھوڑے پر سوار ہو گیا اس کے ساتھ اس کے چند گھر والے بھی سوار ہو گئے ایک تو اس کا بھائی حسان تھا اور دو غلام تھے یہ سب چھوٹے بھالے لے کر قلعہ سے نکل پڑے۔ جب قلعہ سے کچھ فاصلے پر پہنچ گئے تو خالد کے آدمیوں نے اکیدر کو پکڑ لیا اکیدر قیدی ہو گیا حسان نے قیدی ہونا قبول نہیں کیا اور لڑ کر مارا گیا۔ دونوں غلام اور دوسرے ساتھی بھاگ کر قلعہ میں پہنچ گئے۔ حسان کے بدن پر اس وقت زربفت کی قبا تھی اس کی قباء اتار لی گئی۔ پھر خالد نے اکیدر سے کہا، میں تم کو قتل سے امن دیکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے جا سکتا ہوں بشرطیکہ تم دومہ کو فتح کرا دو۔ اکیدر نے کہا اچھا! خالد اکیدر کو لے کر قلعہ کے پاس پہنچے اکیدر نے قلعہ والوں کو آواز دی کہ دروازہ کھول دو۔ اہل قلعہ نے دروازہ کھولنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اکیدر کے بھائی مصاد نے دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا، اکیدر نے خالد سے کہا تم کو معلوم ہو جانا چاہئے کہ قلعہ والوں نے جب مجھے تمہاری قید میں دیکھ لیا ہے تو اب میرے کہنے سے بھی وہ دروازہ نہیں کھولیں گے اس لئے مجھے آزاد کر دو، میں خدا کو اور اپنے وعدہ کی پختگی کو ضامن دیتا ہوں، کہ اگر میرے اہل وعیال کی امان کی شرط پر تم مجھ سے صلح کرلو گے تو میں قلعہ کھول دوں گا، خالد نے کہا میں (ان شرطوں پر) تم سے صلح کرتا ہوں، اکیدر نے کہا اگر تم چاہو تو (مقدار مال کی تعیین کا) فیصلہ خود کر دو اور اگر چاہو تو مجھے (مقدار مال کی تعیین کے) فیصلہ کا اختیار دے دو۔ خالد نے کہا تم جو چاہو دے دینا، ہم لے لیں گے، چنانچہ دو ہزار اونٹ چار سو خود، چار سو زرہیں اور چار سو نیزے بدل صلح قرار پائے اور یہ شرط بھی ضروری قرار پائی کہ حضرت خالد اکیدر اور اس کے بھائی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے جائیں گے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو فیصلہ ان کا چاہیں گے کر دیں گے۔ اس کے بعد خالد نے اکیدر کو رہا کر دیا اکیدر نے جا کر قلعہ کا دروازہ کھول دیا۔ خالد نے اندر داخل ہو کر اکیدر کے بھائی مصاد کو گرفتار کر لیا اور بدل صلح وصول کرنے کے بعد عمرو بن امیہ ضمری کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بشارت دینے کے لئے بھیج دیا اور ضمری کے ساتھ حسان کی قباء بھی روانہ کر دی۔

اکیدر کے بھائی کی قباء:

حضرت انس اور حضرت جابر کا بیان ہے کہ اکیدر کے بھائی حسان کی قباء جب خدمت گرامی میں پیش ہوئی تو مسلمان ہاتھوں سے چھو کر (اس کی نرمی اور بناوٹ کو) دیکھنے اور تعجب کرنے لگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم کو اس (کی صنعت اور خوبصورتی) سے تعجب ہو رہا ہے۔ قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے جنت کے اندر سعد بن معاذ کے رومال اس سے زیادہ خوبصورت ہوں گے۔

خالد نے مال صلح پر قبضہ کرنے کے بعد کچھ انتخابی مال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نکال لیا پھر مال غنیمت کا پانچواں حصہ نکالا اور باقی اموال غنیمت (یعنی پانچ حصوں میں سے چار حصے) ساتھیوں کو بانٹ دیئے۔ حضرت ابو سعید خدری کا بیان ہے میرے حصہ میں ایک زرہ آئی۔ ایک خود اور دس اونٹ حضرت واثلہ کا قول ہے مجھے دس سہام ملے، حضرت عبداللہ بن عمرو بن عوف کا بیان ہے قبیلہ مزینہ کے ہم سب چالیس آدمی تھے ہم میں سے ہر شخص کو مع اسلحہ زرہ اور نیزوں کے پانچ سہام ملے۔

پانچ سہام اور چھ سہام کے (روایتی) اختلاف کی وجہ قیمت کا تفاوت تھا (زیادہ قیمت کے لحاظ سے پانچ اور کم قیمت کے لحاظ سے چھ سہام) اس کے بعد حضرت خالد اکیدر اور مصاد کو لیکر مدینہ کی طرف چل پڑے۔

محمد بن عمر نے حضرت جابر کا قول نقل کیا ہے میں نے دیکھا کہ جب خالد اکیدر کو لے کر آئے۔ اس وقت وہ سونے کی صلیب اور ریشمین دریائی کے کپڑے پہنے تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے ہی اس نے سجدہ کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ ہاتھ کے اشارہ سے نہیں نہیں کہا۔ اکیدر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کچھ ہدیہ بھی پیش کیا۔ جس میں کپڑے تھے۔ ابن اثیر نے لکھا ہے ایک خچر بھی تھا۔ اکیدر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ادائے جزیہ کی شرط پر صلح کر لی اکیدر اور اس کے بھائی کی جان محفوظ کر دی۔ (یعنی جان کی معافی دیدی) کل جزیہ مبلغ تین سو دینار قرار پایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اکیدر کی قوم کے لئے ایک امان نامہ بھی لکھ دیا۔

امیر ایلہ کی حاضری:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت خالد بن ولید کو اکیدر کی طرف دومۃ الجندل بھیجا تھا۔ اور یہ خبر یحنہ بن روبہ امیر ایلہ کو پہنچی تھی۔ تو اسی وقت سے اس کو بھی اندیشہ ہو گیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری طرف بھی کوئی لشکر بھیجیں گے اس خوف کی وجہ سے ہی امیر ایلہ خدمت گرامی میں خود حاضر ہو گیا اس کے ساتھ جربا اور اذرح کے باشندے بھی حاضر ہوئے۔ ابو حمید ساعدی کا بیان ہے کہ حاضری کے وقت شاہ ایلہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک سفید خچر بطور ہدیہ پیش کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کو ایک چادر عطا فرمائی اور ایک تحریر لکھ دی۔ یہ روایت ابن ابی شیبہ اور بخاری کی ہے۔ محمد بن عمر نے

حضرت جابر کا قول نقل کیا ہے کہ میں نے خود دیکھا جس وقت یحنہ بن روبہ رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا اس وقت وہ سونے کی صلیب پہنے ہوئے تھا اور پیشانی کے بال اس نے باندھ رکھے تھے، آتے ہی اس نے سر جھکا دیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ کر دیا کہ سر اوپر اٹھاؤ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شاہ ایلہ سے اس وقت مصالحت کر لی اور ایک یمنی چادر اس کو مرحمت فرمادی۔ یہ چادر ابوالعباس عبداللہ بن محمد نے تین سو دینار میں خرید لی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شاہ ایلہ کو بلال کے پاس ٹھہرانے کا حکم بھی دیا تھا۔ (تفسیر مظہری)

اہل جربا وغیرہ سے معاہدہ:

اہل سیر نے لکھا ہے کہ اہل جربا پر جن کی تعداد تین سو تھی تین سو دینار سالانہ بطور جزیہ مقرر فرما دیئے اور ان کی اس کی تحریر بھی دے دی گئی۔ اور اہل اذرح کو بھی ایک تحریر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمادی۔ اور اہل مقنا سے چوتھائی پھلوں کی ادائیگی کی شرط پر صلح کر لی۔

ابن ابی شیبہ، احمد اور مسلم نے حضرت ابوحمید ساعدی کی روایت سے لکھا ہے کہ حاکم ایلہ کی طرف سے ابن العلماء ایک خط لیکر حاضر خدمت ہوا اور ایک سفید خچر ہدیہ میں پیش کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کیلئے ایک تحریر لکھ دی اور ایک چادر ہدیہ کے طور پر اس کو بھیج دی۔

تبوک میں قیام: امام احمد نے حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت سے اور ابن سعد نے یحییٰ بن کثیر کے حوالہ سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک میں بیس روز رہے اور نماز میں قصر کرتے رہے۔ محمد بن عمر ابن سعد اور ابن حزم کی روایات بھی اسی کی موید ہیں لیکن ابن عقبہ اور ابن اسحاق نے بیان کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں کچھ اوپر دس روز قیام فرمایا۔

شام کی طرف جانے کے بارے مشورہ:

محمد بن عمر کا بیان ہے کہ آگے بڑھنے یعنی تبوک سے شام کی طرف جانے کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے مشورہ طلب کیا۔ حضرت عمر بن خطاب نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر آپ کو (اللہ کی طرف سے اس کا) حکم دیا گیا ہے تو چلئے ورنہ سمجھ لیجئے کہ وہاں رومیوں کی بکثرت تعداد موجود ہے اور مسلمان وہاں کوئی ہے نہیں۔ ہم ان کے قریب تو پہنچ ہی گئے ہیں آپ کے اتنے قریب جانے نے ان کو خوف زدہ بھی کر دیا ہے لہذا اگر ہم اس سال لوٹ جائیں اور مستقبل کے احوال کو دیکھیں یا انتظار کریں کہ اللہ کیا امر ظاہر فرماتا ہے تو مناسب ہے۔

طاعون والی سرزمین:

احمد، طبرانی اور طحاوی کی روایت میں ہے کہ غزوہ تبوک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر کسی زمین پر طاعون ہو اور تم وہاں ہو تم وہاں سے (ڈر کر) نہ نکلو، اور اگر تم کسی دوسری جگہ ہو تو وہاں سے آ کر طاعون والی زمین میں نہ گھسو۔

حافظ نے بدل الماعون میں لکھا ہے شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع ملی ہوگی کہ جس جگہ آپ کے جانے کا ارادہ تھا وہاں طاعون ہے اسی اطلاع کی وجہ سے آپ بغیر لڑے واپس ہو گئے۔

یہودیوں کی رائے:

ابن ابی حاتم نے اور دلائل میں بیہقی نے ضعیف سند کے ساتھ بیان کیا ہے کہ یہودیوں نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا اگر آپ نبی ہیں تو شام پہنچئے۔ شام انبیاء کی سرزمین اور ارض محشر ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تصدیق کی اور تبوک کے جہاد پر تشریف لے گئے۔ جب تبوک میں پہنچ گئے تو اللہ نے بنی اسرائیل کے متعلق یہ آیات نازل فرمائیں کہ وہ آپ کو اس جگہ سے نکالنے کیلئے ابھار دے رہے تھے۔ یہاں پر پہنچنے کے بعد (یہودیوں کی سازش کو ناکام بنانے کیلئے) آپ کو مدینہ واپس جانے کا حکم دیا گیا۔

غذا کی کمی کا مسئلہ اور اس کا حل:

اسحاق بن راہویہ نے حضرت ابوہریرہ کی روایت سے، ابویعلیٰ ابونعیم اور ابن عساکر نے حضرت عمر کے حوالے سے اور محمد بن عمر نے اپنے بزرگوں کی سند سے بیان کیا کہ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ اگر آپ اجازت دیں تو ہم اپنے اونٹ ذبح کر کے (خوراک کا مسئلہ حل کر لیں اور) کھالیں اتنے میں حضرت عمر آگئے اور لوگوں کو اونٹوں کے ذبح کرنے سے روک دیا اور خدمت گرامی میں عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو سواری کے اونٹ ذبح کرنے اور کھانے کی اجازت دیدی ہے، فرمایا انہوں نے (غذا نہ ملنے اور) بھوکے ہونے کی مجھ سے شکایت کی تھی، میں نے ان کو ایک دو اونٹ ذبح کرنے کی اجازت دے دی (کہ کچھ اب کھالیں اور) جو کچھ باقی رہے اس کو باری باری سے کھالیا کریں اور اس طرح گھر واپس پہنچ جائیں۔ حضرت عمر نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا کرنے سے تو سواریاں کم ہو جائیں گی آپ ایسا کیجئے کہ جو کچھ کھانے کی چیز ان کے پاس باقی ہو وہ منگوا لیجئے پھر اللہ سے اس میں برکت ہونے کی دعا فرمادیجئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اچھا (ایسا ہی کرلو) چنانچہ چمڑے کا ایک دسترخوان منگوا کر بچھایا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایک منادی نے ندا لگائی جس کے پاس کھانے کی کوئی چیز باقی رہ گئی ہو وہ لے کر حاضر ہو۔ لوگ لانے لگے۔ کوئی ایک مٹھی جوار لایا۔ کوئی روٹی کا ٹکڑا لایا۔ کوئی سیر بھر آٹا یا ستو یا چھوارے لے آیا۔ غرض مجموعی مقدار ۲۷ صاع ہوگئی (یعنی ۱۰۸ سیر) پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اٹھ کر وضو کیا۔ دو رکعت نماز پڑھی اور نماز کے بعد برکت کے لئے دعا کی۔ حضرت ابوہریرہ

کا بیان ہے اتنی برکت ہوئی کہ سب نے سیر ہوکر کھالیا اور لشکر میں جو برتن موجود تھے، سب بھر لئے کوئی برتن بغیر بھرے نہیں رہا اور اس کے بعد بھی کچھ بچ رہا۔ حضرت عمر نے فرمایا انتہا یہ ہوئی کہ جب لوگ (کھا کر اور برتن بھر کر) واپس گئے تو سابق اندازے کے مطابق کھانے کی چیزیں بدستور باقی تھیں۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اس کا رسول ہوں ایسا نہیں ہوسکتا کہ کوئی بندہ اس شہادت کو بغیر شک کے ادا کرے اور پھر اس کو جنت سے روک دیا جائے۔

صبح کی نماز کا قضاء ہونا:

ابونعیم اور محمد بن عمر کے بیان کے بموجب حضرت ابوقتادہ کی روایت میں آیا ہے کہ تبوک سے واپسی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رات آخر شب میں ایک جگہ پڑاؤ کیا۔ وہاں ہم (سب) سو گئے اور اس وقت بیدار ہوئے جب سورج کی گرمی محسوس ہوئی ہم نے کہا (انا للہ وانا الیہ راجعون) ہماری صبح کی نماز جاتی رہی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس طرح شیطان نے ہم کو رنج پہنچایا ہم بھی اب اس کو اسی طرح رنجیدہ کریں گے، میرے پاس پانی کا لوٹا تھا۔ آپ نے اس سے وضو کیا۔ کچھ پانی لوٹے میں بچ رہا فرمایا ابوقتادہ لوٹے کے اندر جو پانی ہے اس کو محفوظ رکھنا غرض سورج نکلنے کے بعد فجر کی نماز پڑھی اور نماز میں سورۂ مائدہ کی قرأت کی۔ پھر نماز سے فارغ ہوکر فرمایا سنو اگر لوگ ابوبکر اور عمر کا مشورہ مان لیتے تو ہدایت پا لیتے۔ بات یہ ہوئی تھی کہ حضرت ابوبکر وحضرت عمر نے مشورہ دیا کہ (اس جگہ پانی نہیں ہے، یہاں لشکر کو اترنا نہ چاہیے) پانی پر پہنچ کر قیام کرنا چاہیے مگر مسلمانوں نے نہیں مانا اور بیابان میں جہاں پانی بھی نہ تھا اتر پڑے۔ غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سوار ہوکر روانہ ہوگئے اور لشکر سے زوال کے وقت آملے ہم بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے سب کو پیاس کی اتنی شدت تھی کہ گھوڑوں اونٹوں اور آدمیوں کی گردنیں پیاس کی وجہ سے اکڑی جارہی تھیں۔

مبارک انگلیوں سے پانی کا چشمہ:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چمڑے کا پیالہ منگوایا اور لوٹے سے اس میں پانی لوٹا پھر اپنی انگلیاں اس پر رکھ دیں، انگلیاں رکھتے ہی انگلیوں میں سے پانی کا چشمہ پھوٹ نکلا۔ سب لوگ آئے اور پی کر سیراب ہونے لگے۔ پانی برابر ابلتا رہا اور یہاں تک کہ سب سیراب ہوگئے اور گھوڑوں اور اونٹوں کو بھی خوب پلا دیا۔ لشکر میں تیس ہزار آدمی، بارہ ہزار اونٹ اور بارہ ہزار گھوڑے تھے۔

مشکیزے میں برکت

محمد بن عمر اور ابونعیم نے اہل مغازی کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ٹیلے سے اتر کر نشیب کی طرف جارہے تھے اور سخت گرمی کا زمانہ تھا، لشکر سخت پیاسا ہوگیا اور وادی میں پانی بالکل نہ تھا، نہ کم نہ زیادہ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس دکھ کا اظہار کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسید بن حضیر کو بھیجا کہ جاکر (کہیں) پانی تلاش کرو۔ امید ہے کہ کچھ پانی تم کو مل جائے گا حضرت اسید کو کسی عورت کے مشکیزہ میں کچھ پانی مل گیا۔ آپ وہ پانی خدمت گرامی میں لے آئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پانی میں برکت ہوجانے کی دعا کی اور فرمایا (لوگو) آؤ میں تم کو پانی پلاؤں پھر تو یہ حالت ہوئی کہ جس کے پاس پانی کو جو برتن تھا اس نے بھر لیا پھر اونٹوں کو طلب فرمایا اور اونٹوں کو پانی پلانے کی اجازت دیدی۔ حسب الحکم سب اونٹوں کو بھی پلا دیا گیا۔ روایت میں آیا ہے کہ حضرت اسید جو پانی لیکر آئے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ پانی ایک بڑے پیالے میں ڈلوایا اور دست مبارک اس پیالہ میں ڈال کر ہاتھ بھی اس کے اندر دھوئے اور منہ بھی اور دونوں پاؤں بھی پھر دو رکعت نماز پڑھی پھر (دعا کیلئے) دونوں ہاتھ اٹھا کر پھیلائے۔ دعا ختم ہوتے ہی پیالے سے پانی اچھلنے لگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے فرمایا، خوب سیر ہوکر پیو، پانی پھیل گیا اور اتنا پھیلا کہ سو سو دو دو سو آدمی آکر قطار لگا کر اس پر آتے، پیتے اور چلے جاتے غرض سب سیراب ہوگئے اور پیالے کا پانی اچھلتا ہی رہا۔

اونٹوں کی کمزوری:

طبرانی نے صحیح سند کے ساتھ بوساطت فضالہ، حضرت عبید کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تبوک کے جہاد پر تشریف لے گئے تو (طول مسافت، شدت گرما، خوراک کی کمی اور پانی کی نایابی کی وجہ سے) اونٹوں کو سخت تکلیف ہوئی اور وہ کمزور ہوگئے۔ لوگوں نے اس دکھ کا اظہار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ملاحظہ فرمایا کہ لوگ اونٹوں کو (مار مار کر) ہنکار رہے ہیں (اور اونٹ چلنے کو نہیں پاتے) یہ دیکھ کر آپ ایک تنگ مقام پر کھڑے ہوگئے۔ لوگ اسی تنگ مقام سے گزرنے لگے جو لوگ گزرتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان پر (اور ان کے اونٹوں پر) کچھ دم کرتے اور فرماتے اے اللہ! ان پر ان کو سوار کردے۔ تو قوی وکمزور کو تر خشک اور بر و بحر میں سوار کرت (سکتا) ہے۔ (تفسیر مظہری)

مدینہ منورہ:

راوی کا بیان ہے کہ قافلہ برابر جاتا رہا اور مدینہ پہنچنے سے پہلے اونٹوں کا یہ حال ہوگیا کہ وہ مہاروں میں کھینچا تانی کرنے لگے (یعنی روکے سے نہ رکتے تھے) جب مدینہ سامنے دکھائی دیا تو فرمایا یہ طابہ ہے۔ رواہ الشیخان فی الصحیحین عن جابر وابی حمید الساعدی وغیرہم۔

اُحد پہاڑ:

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر کوہ احد پر پڑی تو فرمایا یہ احد ہے یہ ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔

بیہقی نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو عورتیں اور بچے (گا گاکر) کہنے لگے:

''وداع کی گھاٹیوں سے چودھویں کا چاند نکل آیا ہم پر شکر واجب ہے جب تک دعا کرنیوالا اللہ سے دعا کرے''

ابن سعد کا بیان ہے کہ (تبوک کے بعد) لوگ اپنے اسلحہ فروخت کرنے لگے، اور کہنے لگے اب جہاد ختم ہوگیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع پہنچی تو اسلحہ فروخت کرنے سے منع فرمایا۔ (تفسیر مظہری)

وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ؕ
اور چاہئے کہ ان پر معلوم ہو تمہارے اندر سختی

مؤمن کی شان:

مؤمن کی شان یہ ہے کہ اپنے بھائی کے حق میں نرم اور دشمنان خدا اور سول کے معاملہ میں سخت و شدید ہو۔ تاکہ اس کی نرمی اور ڈھیلا پن دیکھ کر دشمن جری نہ ہو جائے اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (مائدہ۔ رکوع ۸) وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (الفتح رکوع ۴) جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ (توبہ رکوع ۱۰) وفی الحديث انه صلعم قال انا الضحوک القتال۔

وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۲۳﴾
اور جانو کہ اللہ ساتھ ہے ڈر والوں کے

خدا سے ڈرتے رہو:

یعنی خدا سے ڈرنے والے کو کسی کافر قوم سے ڈرنے اور دبنے کی کوئی وجہ نہیں۔ جب تک اور جس قدر مسلمان خدا سے ڈرتے رہے اسی وقت تک اور اسی قدر ان کو کفار پر غلبہ حاصل ہوتا رہا۔ حق تعالیٰ ہمارے دلوں میں اپنا ڈر پیدا کردے۔

وَاِذَا مَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ
اور جب نازل ہوتی ہے کوئی سورت تو بعضے ان میں کہتے ہیں کس کا تم
زَادَتْهُ هٰذِهٖۤ اِيْمَانًا ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
میں سے زیادہ کر دیا اس سورت نے ایمان سو جو لوگ ایمان رکھتے ہیں
فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۱۲۴﴾
ان کا زیادہ کر دیا اس سورۃ نے ایمان، اور وہ خوشوقت ہوتے ہیں
وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ
اور جن کے دل میں مرض ہے
فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا
سو ان کے لئے بڑھادی گندگی پر گندگی
وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۲۵﴾
اور وہ مرنے تک کافر ہی رہے

منافقوں کی بیماری:

جب کوئی سورۃ قرآنی نازل ہوتی تو منافقین آپس میں ایک دوسرے سے یا بعض سادہ دل مسلمانوں سے ازراہ استہزاو تمسخر کہتے کہ کیوں صاحب تم میں سے کس کس کا ایمان اس سورت نے بڑھایا۔ مطلب یہ تھا کہ (معاذ اللہ) اس سورت میں رکھا ہی کیا ہے۔ کون سے حقائق و معارف ہیں جو ایمان و یقین کی ترقی کا موجب ہوں حق تعالیٰ نے جواب دیا کہ بیشک کلام الٰہی سن کر مومنین کے ایمان میں تازگی اور ترقی ہوتی ہے اور قلوب مسرور و منشرح ہوتے ہیں۔ ہاں جن کے دلوں میں کفر و نفاق کی بیماری اور گندگی ہے ان کی بیماری و گندگی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ یہ بیماری ان کی جان ہی لیکر چھوڑتی ہے

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست　　در باغ لالہ روید در شورہ بوم خس

حضرت شاہ صاحبؒ نے دوسری طرح آیت کی تقریر کی ہے۔ یعنی کلام الٰہی جس مسلمان کے دل کے خطرہ سے موافق پڑا تو وہ خوش ہو کر بول اٹھتا کہ سبحان اللہ۔ اس آیت نے میرا ایمان یقین اور زیادہ کر دیا۔ اسی طرح جب کسی سورت میں منافقین کے پوشیدہ عیوب ظاہر کئے جاتے تو وہ بھی شرمندگی سے کھسیانے ہو کر کہتے کہ بیشک اس کلام نے ہمارے یقین وایمان کو بڑھا دیا۔ لیکن یہ کہنا چونکہ خوشی اور انشراح سے نہ تھا۔ محض رفع خجالت کے لئے کہہ دیتے تھے اس لئے یہ توفیق نہ ہوتی تھی کہ آئندہ توبہ کر کے سچے دل سے حق کی پیروی کریں۔ بلکہ پہلے سے زیادہ اپنے عیب چھپانے کی فکر و تدبیر کرتے تھے۔ یہ ہی ہے گندگی پر گندگی۔ عیب دار کہ نصیحت سن کر اپنی اصلاح کرے نہ یہ کہ الٹا ناصح سے چھپانے لگے۔ (تفسیر عثمانی)

مرض سے مراد ہے شک و نفاق رجس گندگی سے مراد کفر۔ یعنی پہلے وہ سابق میں نازل شدہ آیات و سور کے منکر تھے۔ اب اس جدید سورت کے بھی

منکر ہو جاتے ہیں۔اس طرح کفر بالائے کفر ہو جاتا ہے۔

ایمان بڑھتا:

کفر کی حالت پر مرنے کی صراحت اس لئے فرمائی کہ ایمان ایک خداداد چیز ہے آیات کا کام ایمان بخشی نہیں۔اللہ ایمان نہ دے تو آیات غیر مفید ہوتی ہیں۔مجاہد نے کہا اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ ایمان میں کمی بیشی ہوتی ہے (یعنی ایمان مرکب ہے اس کے اجزاء میں کمی بیشی ہوتی ہے) حضرت عمرا اپنے ساتھیوں میں سے کسی ایک یا دو آدمیوں کا ہاتھ پکڑ کر فرماتے تھے آؤ ہم اپنا ایمان بڑھائیں (یعنی اگر کوئی جدید آیت یا سورت نازل ہوئی ہو تو اس کو چل کر سنیں تا کہ ہمارے ایمان میں اضافہ ہو) حضرت علی نے فرمایا دل کے اندر ایمان ایک سفید نقطہ کی شکل میں نمودار ہوتا ہے جتنا ایمان بڑھتا ہے اتنی ہی سفیدی بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ پورا دل سفید ہو جاتا ہے اور نفاق دل میں سیاہ نقطہ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ پھر جتنا نفاق بڑھتا ہے سیاہی بھی بڑھتی ہے یہاں تک کہ پورا دل کالا ہو جاتا ہے۔خدا کی قسم اگر تم مومن کا دل چیر کر دیکھو گے تو اس کو سفید پاؤ گے اور اگر منافق کا دل چیر کر دیکھو گے تو اس کو سیاہ پاؤ گے۔(تفسیر عثمانی)

آیت سے معلوم ہوا کہ آیات قرآنیہ کی تلاوت ان میں غور و فکر اور مقتضی پر عمل کرنے سے ایمان میں ترقی اور زیادتی پیدا ہوتی ہے یہ زیادتی نور ایمان اور حلاوت ایمان کی ہوتی ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان کو اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت آسان نظر آنے لگتی ہے عبادت میں لذت محسوس کرنے لگتا ہے گناہوں سے طبعی نفرت پیدا ہو جاتی ہے اور ان سے کلفت محسوس ہونے لگتی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ ایمان جب قلب میں آتا ہے تو ایک سفید نورانی نقطہ جیسا ہوتا ہے، پھر جوں جوں ایمان میں ترقی ہوتی ہے تو یہ سفیدی بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ سارا قلب نورانی ہو جاتا ہے اسی طرح کفر و نفاق شروع میں ایک سیاہ داغ کی طرح قلب پر لگتا ہے پھر جوں جوں معاصی کا ارتکاب اور کفر کی شدت بڑھتی جاتی ہے یہ نقطہ بڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ پورا قلب سیاہ ہو جاتا ہے۔(مظہری)

اسی لئے صحابہ کرامؓ ایک دوسرے کو کہا کرتے تھے کہ کچھ دیر مل کر بیٹھو دین اور آخرت کی باتوں کا مذاکرہ کرو تا کہ ہمارا ایمان بڑھے۔(معارف القرآن مفتی اعظمؒ)

اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِىْ كُلِّ عَامٍ
کیا نہیں دیکھتے کہ وہ آزمائے جاتے ہیں
مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ
ہر برس میں ایک بار یا دوبار پھر بھی توبہ نہیں کرتے اور نہ

يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾
وہ نصیحت پکڑتے ہیں

منافقوں کی رسوائی:

یعنی ہر سال کم از کم ایک دومرتبہ ان منافقین کو فتنہ اور آزمائش میں ڈالا جاتا ہے مثلاً قحط بیماری وغیرہ کسی آفت ارضی وسماوی میں مبتلا ہوتے ہیں یا پیغمبر علیہ السلام کی زبانی ان کا نفاق علانیہ ظاہر کر کے رسوا کیا جاتا ہے یا جنگ وجہاد کے وقت ان کی بزدلی اور تیرہ باطنی بے نقاب کر دیجاتی ہے مگر وہ ایسے بے حیا اور بد باطن واقع ہوئے ہیں کہ تازیانے کھا کر بھی ٹس سے مس نہیں ہوتے نہ پچھلی خطاؤں سے توبہ کرتے ہیں نہ آئندہ کو نصیحت پکڑتے ہیں۔

وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى
اور جب نازل ہوتی ہے کوئی سورت تو دیکھنے لگتا ہے ان میں ایک
بَعْضٍ هَلْ يَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا
دوسرے کی طرف کہ کیا دیکھتا ہے تم کو کوئی مسلمان پھر چل دیتے ہیں

جس وقت وحی نازل ہوتی اور منافقین مجلس میں موجود ہوتے تو کلام الٰہی کا سننا ان پر بہت شاق گذرتا تھا خصوصاً وہ آیات جن میں ان کے عیوب کھولے جاتے تھے۔ اس وقت ایک دوسرے کی طرف کن انکھیوں سے اشارے کرتے اور ادھر ادھر دیکھتے کہ مجلس میں کسی مسلمان نے ہم کو پرکھا نہ ہو۔پھر نظر بچا کر شتاب مجلس سے کھسک جاتے تھے

صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا
پھیر دیے ہیں اللہ نے دل انکے اس واسطے کہ وہ لوگ ہیں
يَفْقَهُوْنَ ﴿۱۲۷﴾
کہ سمجھ نہیں رکھتے

یعنی مجلس نبوی سے کیا پھرے خدا نے ان کے دلوں کو پھیر دیا کہ وہ اپنی جہل وحماقت سے ایمان وعرفان کی باتوں کو سمجھنا اور قبول کرنا نہیں چاہتے۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ
آیا ہے تمہارے پاس رسول تم میں کا

جس کے حسب ونسب اخلاق واطوار اور دیانت وامانت سے تم خوب واقف ہو۔(تفسیر عثمانی)

اونٹنی مامور من اللہ ہے:

طبرانی نے حضرت عبداللہ بن سلام کا بیان نقل کیا ہے۔ حضرت عبداللہ نے فرمایا تبوک کو جاتے ہوئے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر خلیجہ کی طرف سے ہوا تو صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (اونٹوں کے) پڑاؤ کیلئے یہی جگہ (مناسب معلوم ہوتی ہے) یہاں سایہ بھی ہے اور پانی بھی یعنی یہاں گوگل کے بڑے بڑے درختوں کا سایہ بھی ہے اور پانی (کے چشمے) بھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ کھیتی کی زمین ہے اونٹنی کو جانے دو (یہ خود جہاں ٹھہرنا ہوگا ٹھہر جائیگی) یہ مامور (من اللہ) ہے، چنانچہ اونٹنی آگے بڑھی اور دومہ کے پاس جا کر بیٹھ گئی ذی المروہ کی مسجد میں۔

محمد بن عمر کا بیان ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وادی قریٰ میں فروکش ہوئے تو بنی عریض کے یہودیوں نے ہریس (حلیم یا حلیم نما کوئی کھانا) پیش کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو تناول فرمایا اور چالیس یہودیوں کو بھی کھلایا پلایا (یعنی ان کی دعوت کی) چنانچہ یہ سلسلہ قیامت کے دن تک ان کے لئے جاری رہے گا (یعنی بنی عریض کے لئے یہ دوامی پٹہ اور وثیقہ ہوگیا)

قوم ثمود کے کھنڈرات:

امام مالک امام احمد اور بخاری و مسلم نے صحیحین میں حضرت ابن عمر کی روایت سے اور امام احمد نے حضرت جابر حضرت ابو کبشہ انماری اور حضرت ابوحمید ساعدی کے حوالے سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مقام حجر (قوم ثمود کے مسکن قدیم) کی طرف سے گذرے تو آپ نے چادر مبارک بطور نقاب کے اپنے چہرہ پر ڈال لی آپ اس وقت کجاوہ پر سوار تھے اور اونٹنی کو تیز دوڑایا کہ قوم ثمود کے گھر پیچھے رہ گئے (آپ ان سے آگے بڑھ گئے) اور (آگے بڑھ کر) اترے ساتھ والے حجر کے باشندوں کی طرف لپکے اور انہوں نے ان کنوؤں سے پانی کھینچا جن سے قوم ثمود پانی پیتی تھی اسی پانی سے لوگوں نے آٹا گوندھا اور گوشت کی ہانڈیاں چڑھائیں جب یہ اطلاع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپ نے نماز کیلئے ندا کرائی۔ جب سب لوگ جمع ہو گئے تو فرمایا ان لوگوں کے مکانوں میں تم لوگ نہ داخل ہو جنہوں نے اپنے اوپر خود ظلم کیا تھا کہیں تم پر بھی وہ عذاب نہ آجائے جو ان پر آیا تھا ہاں روتے ہوئے (وہاں جاسکتے ہو) ان کے کنوؤں کا پانی بھی نہ پیو اور نماز کے لئے اس پانی سے وضو بھی نہ کرو ہانڈیوں کو الٹ دو اور گوندھا ہوا آٹا اونٹوں کو کھلا دو۔

معجزات طلب نہ کرو:

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہاں سے روانہ ہو کر اس کنویں پر پہنچے جس کا پانی (حضرت صالح کی) اونٹنی پیا کرتی تھی اور فرمایا معجزات طلب نہ کرو قوم صالح نے معجزات طلب کئے تھے انہوں نے اپنے پیغمبر سے درخواست کی تھی کہ معجزہ پیش کریں، چنانچہ اللہ نے (پہاڑ کے اندر سے) اونٹنی بطور معجزہ برآمد کردی تھی اونٹنی اس گھاٹی سے (پانی پر) اتر آتی تھی اور اس گھاٹی سے نکل کر جاتی تھی اونٹنی ایک دن ان کا سارا پانی پی جاتی تھی (اور قوم کے جانوروں کو اور آدمیوں کو اس روز پانی نہیں ملتا تھا) ایک دن لوگ اس اونٹنی کا دودھ پی کر گذارا کرتے تھے آخر انہوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں (اور اس کو قتل کر دیا) نتیجہ یہ ہوا کہ ایک چیخ سب پر ایسی پڑی جس کی وجہ سے اس آسمان تلے ان میں کا کوئی شخص سوائے ایک آدمی کے زندہ نہ بچا۔ سب کو اللہ نے ٹھنڈا کر دیا۔

من انفسکم کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری ہی جنس سے ہیں اسمٰعیلی نسل سے ہیں تم ان کے حسب نسب کو جانتے ہو۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا عرب کے ہر قبیلہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نسبی تعلق تھا۔ امام جعفر صادق نے فرمایا حضرت آدم سے لے کر آخری دور تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (کے سارے آباء اجداد) جاہلیت کے نکاح کے طریقوں سے پاک رہے۔ بغوی نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں جاہلیت کے طریق زناء سے نہیں پیدا ہوا بلکہ اسی نکاح کے ذریعے سے پیدا ہوا جیسا اسلامی نکاح ہوتا ہے۔

جاہلیت کے نکاح:

جاہلیت کے نکاح کے مختلف طریقے ہوتے تھے طلعت حرب نے دول العرب والاسلام میں دور جاہلیت کے نکاح کے بیان میں ان کو مفصل لکھا ہے ایک طریقہ تو یہی تھا جو اسلام میں رائج تھا دوسرا طریقہ نکاح سفاح کا تھا تیسرا طریقہ نکاح بغایا کا تھا۔ یہ بھی دستور تھا کہ سوتیلا بڑا بیٹا اپنی سوتیلی بیوہ ماں پر چادر ڈال دیتا تھا یا اپنے کسی چھوٹے بھائی کے حق میں دست بردار ہوجاتا تھا اس کو بھی ازدواج کا ایک طریقہ مانا جاتا تھا۔ (تفسیر مظہری)

عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ
بھاری ہے اس پر جو تم کو تکلیف پہنچے

امت کی فکر:

جس چیز سے تم کو تکلیف یا سختی پہنچے وہ ان پر بہت بھاری ہے۔ ہر ممکن طریقہ سے آپ یہی چاہتے ہیں کہ امت پر آسانی ہو اور دنیوی و اخروی عذاب سے محفوظ رہے۔ اس لئے جو دین آپ لائے وہ بھی سہل اور نرم ہے۔ اور عمال کو آپ یہی نصیحت فرماتے تھے "یسروا ولا تعسروا" (آسانی کرو سختی مت کرو)

حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ
حریص ہے تمہاری بھلائی پر

یعنی تمہاری خیر خواہی اور نفع رسانی کی خاص تڑپ ان کے دل میں ہے۔لوگ دوزخ کی طرف بھاگتے ہیں آپ ان کی کمریں پکڑ پکڑ کر ادھر سے ہٹاتے ہیں آپ کی بڑی کوشش اور آرزو یہ ہے کہ خدا کے بندے اصلی بھلائی اور حقیقی کامیابی سے ہمکنار ہوں۔ جہاد وغیرہ کا مقصد بھی خونریزی نہیں بلکہ بحالت مجبوری سخت آپریشن کے ذریعہ سے بنی نوع انسان کے فاسد ومسموم اعضاء کو کاٹ کر اور خراب جراثیم کو تباہ کر کے امت کے مزاج عمومی کو صحت واعتدال پر رکھنا ہے۔

بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾
ایمان والوں پر نہایت شفیق مہربان ہے

جب آپ تمام جہان کے اس قدر خیر خواہ ہیں تو خاص ایمانداروں کے حال پر ظاہر ہے کس قدر شفیق ومہربان ہوں گے۔ (تفسیر عثمانی)

خیر الامم کی مثال:

ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دو فرشتے آئے جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سو رہے تھے ایک پائینتی بیٹھ گیا اور ایک سرہانے۔ پائینتی والے فرشتے نے سرہانے والے سے کہا کہ ان کی اور ان کی امت کی کوئی مطابق حال مثال بیان کرو۔ تو وہ کہتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال امت کے ساتھ ایسی ہے جیسے لوگ سفر کرتے ہوئے ایک لق ودق جنگل میں پہنچ گئے ہوں، زادراہ توشہ وغیرہ کچھ باقی نہ رہا ہو، نہ آگے سفر جاری رکھ سکتے ہیں نہ ہی واپس ہونے کی کوئی صورت ہے۔ایسے ہی ایک مرد خوش پوش ان کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے کہ کیا میں تمہیں یہاں سے نکل کر ایسے باغوں میں لے چلوں جو سرسبز وشاداب ہوں، نہریں اور حوض ہوں، کیا میرے ساتھ چلو گے؟ وہ بڑی خوشی سے راضی ہو جاتے ہیں، وہ انہیں لے چلتا ہے وہ انہیں سرسبز وشاداب باغ میں لے آتا ہے وہ خوب میوے کھاتے ہیں، پانی سے سیراب ہوتے ہیں اور خوب پھلتے پھولتے ہیں پھر ان سے کہتا ہے کیا میں نے تمہارے ساتھ خیر خواہی کا حق ادا نہیں کیا اور کیا تمہیں ایسے سرسبز وشاداب جگہ پر نہیں پہنچایا؟ اب سنو آگے اور باغات ایسے ہیں جو اس سے بھی زیادہ پر بہار ہیں، اس سے بھی کہیں زیادہ شاداب حوض ہیں۔آؤ تمہیں اب وہاں لے چلوں۔تو بعض نے کہا تم نے پہلے بھی سچ کہا تھا اور اب بھی سچ کہہ رہے ہو ہم ضرور تمہارے ساتھ ہیں اور بعض نے کہا ہم تو یہیں اچھے ہیں، ہمیں یہی بس ہے آگے کے تمتعات کی ضرورت نہیں۔یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا کے پیچھے ہی دیوانے ہو گئے ہیں عاقبت کی خبر نہیں لیتے۔ حالانکہ یہاں سے کہیں زیادہ وہاں خوش عیشیاں ہیں۔

بے مثال سخاوت:

ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ ایک اعرابی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مالی مدد مانگی۔عکرمہؒ کہتے ہیں کہ میں سمجھتا ہوں کہ خون بہا ادا کرنے کیلئے مدد چاہی تھی۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کچھ دیا اور فرمایا، لو میں نے تمہارا کام نکال دیا، اور تمہارے ساتھ سلوک کیا۔اس نے کہا نہیں کوئی احسان نہیں کیا، یہ سن کر بعض صحابہ غضبناک ہو گئے اور اس پر دست درازی کا ارادہ کیا۔تو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ سے انہیں منع کر دیا۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ کر اپنے ٹھکانے پر گئے اور اعرابی کو بلا بھیجا، اور کہا تم نے مانگا اور میں نے دیا اور خیر تم نے جو کہا سو کہا۔ اچھا یہ اور بھی لو۔اور پھر پوچھا اب بھی میرا سلوک تمہارے ساتھ اچھا رہا یا نہیں۔ اعرابی نے کہا ہاں اللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جزائے خیر دے۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے اصحاب تمہاری طرف سے برگشتہ بنے ہوئے ہیں اب تم ان کے سامنے جاؤ تو اس وقت تم نے جو مجھ سے کہا تھا ان کے سامنے بھی تصدیق کر دو تا کہ ان کے دل کی گرفت نکل جائے۔کہا اچھا۔پس جب اعرابی آیا تو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس نے آ کر سوال کیا تھا، میں نے دیا لیکن اس نے جو کہا تھا تم جانتے ہو، میں نے اسے بلا کر اور دیا ہے اب وہ راضی ہے، کیوں اے بدوی! یہ بات ٹھیک ہے؟ بدوی نے کہا ہاں خدا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جزا دے۔ (تفسیر ابن کثیر رحمہ اللہ)

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ۖ لَآ اِلٰهَ
پھر بھی اگر منہ پھیریں تو کہہ دے کہ کافی ہے مجھ کو اللہ کسی کی بندگی
اِلَّا هُوَ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ
نہیں اس کے سوا اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور وہی مالک ہے
الْعَظِيْمِ ﴿۱۲۹﴾
عرش عظیم کا

اللہ کافی ہے:

اگر آپ کی عظیم الشان شفقت، خیر خواہی اور دل سوزی کی لوگ قدر نہ کریں تو کچھ پروا نہیں۔ اگر فرض کیجئے ساری دنیا آپ سے منہ پھیر لے تو تنہا خدا آپ کو کافی ہے جس کے سوا نہ کسی کی بندگی ہے نہ کسی پر بھروسہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ زمین وآسمان کی سلطنت اور ''عرش عظیم'' تخت شہنشاہی) کا مالک وہی ہے۔سب نفع وضرر، ہدایت وضلالت اسی کے ہاتھ میں ہے۔

غموں کا علاج:

ابوداؤد میں ابوالدرداء سے روایت کی ہے کہ جو شخص صبح وشام سات سات مرتبہ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ پڑھا کرے خدا اس کے تمام ہموم وغموم کو کافی ہوجائیگا۔ باقی عرش کی عظمت کے متعلق اگر تفصیل دیکھنا ہوتو "روح المعانی" میں زیر آیت حاضرہ ملاحظہ کیجئے۔ تم سورۃ التوبہ بفضل اللہ وحسن توفیقہ۔ اللھم تب علی واجعل لی براءۃ من لنار انک انت التواب الرحیم۔ (تفسیر عثمانی)

آخری دو آیتیں:

آخری دو آیتیں حضرت ابی کعبؓ کے قول کے مطابق قرآن کی آخری آیتیں ہیں ان کے بعد کوئی آیت نازل نہیں ہوئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی یہی قول حضرت ابن عباسؓ کا ہے (قرطبی)

ان دو آیتوں کے بڑے فضائل حدیث میں مذکور ہیں، حضرت ابوالدرداءؓ فرماتے ہیں کہ جو شخص صبح وشام یہ آیتیں سات مرتبہ پڑھ لیا کرے تو اللہ تعالیٰ اسکے تمام کام آسان فرمادیتے ہیں (قرطبی) واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔ (معارف القرآن مفتی اعظم)

یحییٰ بن عبدالرحمٰن بن حاطب کا بیان ہے کہ حضرت عمر نے قرآن کو یکجا کرنے کا ارادہ کیا اور لوگوں سے فرمایا جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآن کا کوئی حصہ سیکھا ہو وہ ہمارے پاس لے کر آجائے لوگوں نے قرآن مجید کی آیات کاغذوں پر تختیوں پر اور درختوں کے پوست پر لکھ رکھی تھیں، حسب الحکم لوگ لانے لگے لیکن آپ کسی کی لائی ہوئی کوئی آیت قبول نہیں کرتے تھے۔ جب تک دو شاہد شہادت نہیں دیتے تھے (کہ یہ قرآن کی آیات ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تعلیم دی تھی) آپ جمع ہی کر رہے تھے کہ آپ کو شہید کر دیا گیا اس کے بعد حضرت عثمان بن عفان آپ کی جگہ ہوگئے اور حضرت عثمان نے فرمایا جس کے پاس قرآن کا کوئی حصہ ہو وہ میرے پاس لے آئے آپ بھی کوئی آیت بغیر دو شاہدوں کے شہادت دیئے بغیر نہیں قبول کرتے تھے۔ حضرت خزیمہ بن ثابت نے فرمایا، میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ لوگوں نے دو آیتیں نہیں لکھیں حضرت عثمان نے فرمایا وہ کون سی ہیں حضرت خزیمہ نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دو آیتیں سیکھی تھیں۔ لقد جآءکم رسول من انفسکم آخر تک۔

حضرت عثمانؓ نے فرمایا میں شہادت دیتا ہوں کہ یہ دونوں آیات اللہ کی طرف سے (آئی) ہیں اب بتایئے آپ کی رائے ہیں ان کو کہاں رکھنا چاہیے؟

حضرت خزیمہؓ نے جواب دیا، قرآن کا جو حصہ آخر میں نازل ہوا تھا اس کے خاتمہ پر ان کو رکھیے چنانچہ سورۂ برأت کے خاتمہ پر ان آیات کو لکھ دیا گیا۔

سورة یونس

جو شخص خواب میں اس کی تلاوت کرے پوری یا کچھ تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ اس کے مال پر کچھ آفت آئے گی اور بعض یہ کہتے ہیں کہ اس کی تعبیر یہ ہے کہ اسکا پڑھنے والا خوشخبری دینے اور بھلائی کرنے میں مستعد رہے گا۔ (ابن سیرینؒ)

سُوْرَةُ يُوْنُسَ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ مِائَةٌ وَّتِسْعُ اٰيَاتٍ وَّاَحَدَ عَشَرَ رُكُوْعًا
سورہ یونس مکہ میں نازل ہوئی اور اسکی ایک سو نو آیتیں ہیں اور گیارہ رکوع ہیں
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے
الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ﴿۱﴾
یہ آیتیں ہیں پکی کتاب کی

قرآن ہر لحاظ سے محکم ہے:

یہ آیتیں ایسی مضبوط ومحکم کتاب کی ہیں جس کی ہر بات پکی ہے۔ الفاظ اس لئے کہ ہمیشہ تبدیل وتحریف سے محفوظ رہیں گے علوم اس لئے کہ تمام تر عقل وحکمت کے موافق ہیں۔ احکام اس وجہ سے کہ آئندہ کوئی دوسری ناسخ کتاب آنے والی نہیں۔ اخبار وقصص اس طرح کہ ٹھیک ٹھیک واقع کے مطابق ہیں۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا جب کہ خدائے علیم وحکیم نے اس کو اپنے علم کامل کے زور سے اتارا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

سورۃ کے مضامین:

سورۂ یونس مکی سورتوں میں سے ہے، بعض حضرات نے اس کی صرف تین آیتوں کو مدنی کہا ہے جو ہجرت مدینہ کے بعد نازل ہوئی ہیں۔ اس سورت میں بھی قرآن اور اسلام کے بنیادی مقاصد توحید، رسالت، آخرت وغیرہ کو کائنات عالم اور اس میں ہونے والے تغیرات ومشاہدات سے استدلال کر کے ذہن نشین کیا گیا ہے، اس کے ساتھ کچھ عبرت خیز تاریخی واقعات وقصص کے ذریعہ ان لوگوں کو ڈرایا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ کی ان کھلی نشانیوں پر نظر نہیں کرتے اور اس کے ضمن میں شرک کا ابطال اور اس سے

متعلق بعض شبہات کا جواب ارشاد ہوا ہے یہ خلاصہ ہے مضامین سورت کا۔

پچھلی سورۃ کے ساتھ ربط:

سورت کے ان مضامین پر غور کرنے سے یہ بھی باسانی سمجھ میں آ سکتا ہے کہ پچھلی سورت یعنی توبہ اور اس سورت میں باہمی کیا ربط ہے سورۂ توبہ میں انہی مقاصد کے لئے منکرین و کفار کے ساتھ جہاد اور کفر و شرک کی طاقت کو مادی اسباب کے ذریعہ توڑنے کا بیان تھا، اور یہ سورت چونکہ احکام جہاد کے نازل ہونے سے پہلے مکہ میں نازل ہوئی اس میں مذکورہ مقاصد کو مکی دور کے قانون کے مطابق صرف دلائل و براھین کے ذریعہ ثابت کیا گیا ہے۔ (معارف القرآن مفتی اعظمؒ)

اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى
کیا لوگوں کو تعجب ہوا کہ وحی بھیجی ہم نے
رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ
ایک مرد پر ان میں سے یہ کہ ڈر سنا دے لوگوں کو اور خوشخبری سنا دے
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ
ایمان لانیوالوں کو کہ ان کے لئے پایہ سچا ہے اپنے
رَبِّهِمْ ؕ
رب کے یہاں

پیغمبر کا آنا قابل تعجب نہیں ہے:

یعنی اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ انسانوں کی اصلاح وہدایت کے لئے حق تعالیٰ ایک انسان ہی کو مامور فرما دے اور اس کی طرف وہ پیغام بھیجے جس کی دوسروں کو بلا واسطہ خبر نہ ہو۔ وہ تمام لوگوں کو خدا کی نافرمانی کے مہلک نتائج و عواقب سے آگاہ کرے۔ اور خدا کی بات ماننے والوں کو بشارت پہنچائے کہ رب العزت کے یہاں اعمال صالحہ کی بدولت ان کا کتنا اونچا مرتبہ اور کیسا بلند پایہ ہے۔ اور کیسی سعادت وفلاح ازل سے ان کے لئے لکھی جا چکی ہے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

عمل ضروری ہے:

بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ اس جگہ لفظ صدق لانے میں اس کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جنت کے یہ درجات عالیہ صرف صدق و سچائی اور اخلاص ہی کے ذریعہ حاصل ہو سکتے ہیں نرا زبانی جمع خرچ اور صرف زبان سے کلمۂ ایمان پڑھ لینا کافی نہیں جب تک دل اور زبان دونوں سے سچائی کے ساتھ ایمان اختیار نہ کر لیا جائے جس کا لازمی نتیجہ اعمال صالحہ کی پابندی اور برے اعمال سے پرہیز ہے۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

لوگوں کے تعجب کو آیت میں جو تعجب آفریں قرار دیا گیا ہے اور ان کے تعجب کو واجب الانکار بتایا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کا پیغمبر بنایا جانا کوئی انوکھا واقعہ نہیں ہے تخلیق آدمؑ کے وقت سے ہی اللہ کا معمول رہا ہے کہ ہمیشہ انسانوں کو ہی پیغمبر بنایا گیا ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا ہم نے آپ سے پہلے بھی ہمیشہ مردوں کو پیغمبر بنایا۔

انسان کو پیغمبر بنانے کی حکمت:

بادشاہوں کا یہی قاعدہ ہے کہ تحریر وتقریر کی زبان وہی اختیار کرتے ہیں جس کو مخاطب جانتا ہو اور قاصد بھی اسی کو بنا کر بھیجا جاتا ہے جو ان لوگوں کی جنس سے ہو جن کے پاس بھیجا گیا ہو فائدہ اندوزی اور فائدہ رسانی بغیر مناسبت کے ممکن نہیں اللہ تعالیٰ نے اسی لئے فرمایا ہے قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا اگر زمین پر ملائکہ چلتے پھرتے اور رہتے ہوتے تو ہم ان پر آسمان سے کسی فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتے۔

بخاری نے لکھا ہے کہ زید بن اسلم نے کہا، ان کے لئے قدم صدق ہے۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (کی شفاعت)۔ (تفسیر مظہریؒ)

(ربط) سورۂ توبہ میں مشرکین سے برأت اور منافقین کی فضیحت کا بیان ہوا یہ دونوں گروہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت اور نزول وحی کے منکر تھے اور توحید کے بھی قائل نہ تھے اس لئے اس سورت میں زیادہ تر توحید اور رسالت اور قیامت کا اثبات فرمایا اور اس ضمن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کے متعلق اور خدا تعالیٰ کی وحدانیت اور قیامت کے متعلق جو منکرین کے شبہات ہیں ان کا ازالہ فرمایا کیونکہ منافقین اور مشرکین کتب الٰہیہ کی تکذیب میں اور انکار وحی میں ایک دوسرے کے شریک تھے اور شکوک وشبہات میں ایک دوسرے کے ہم خیال تھے اس لئے سب کا رد فرمایا۔ (معارف کاندھلویؒ)

قدم صدق کا معنیٰ:

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ قدم صدق سے مراد یہ ہے کہ پہلے ہی بیان پر تصدیق کرنا اور سعادت حاصل کر لینا ہے اور اپنے اعمال کا اجر حسن پانا ہے۔ حسانؓ کا شعر ہے ۔

لنا القدم العليا اليک وخلفنا　　لا و لنا فی طاعة الله تابع

''ہمارے اعمال اور ہمارے طور طریق تمہارے ساتھ سچے ہیں اور طاعت خداوندی کے بارے میں ہمارے خلاف اپنے اسلاف کے تابع ہیں۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ۝

کہنے لگے منکر بیشک یہ تو جادو گر ہے صریح

یعنی وحی قرآنی کو فوق العادت مؤثر و بلیغ ہونے کی وجہ سے جادو اور اس کے لانے والے کو جادوگر کہتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں نبوت کی کامل صفات موجود ہیں:

ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو ہدایت کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول بنا کر بھیجا تو اہل عرب نے اس کو ایک تعجب انگیز امر سمجھا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ کی شان اس سے بالا اور برتر ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسے انسان کو رسول بنا کر بھیجے اس پر حق تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی بشر اور تمہارے ہم جنس انسان پر وحی کا نازل ہونا قابل تعجب نہیں اور نہ یتیم اور فقیر ہونے کے اعتبار سے قابل تعجب ہے اس لئے کہ نبوت کے لئے مال دار ہونا شرط نہیں بلکہ مکارم اخلاق اور محاسن اعمال کے اعتبار سے چیدہ اور برگزیدہ ہونا شرط ہے اور یہ صفت آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں علیٰ وجہ الکمال موجود ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات مکارم اخلاق اور محاسن کا منبع اور سرچشمہ ہے اور انبیاء سابقین کی طرح آپ بھی خدا کی طرف سے بشیر و نذیر بن کر آئے ہیں اور تمام انبیاء سابقین جنس بشر سے تھے۔ فرشتہ نہ تھے۔ (معارف کاندھلوی)

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ

تحقیق تمہارا رب اللہ ہے جس نے بنائے آسمان

وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ

اور زمین چھ دن میں

زمین وآسمان کی پیدائش کا وقت:

یعنی اتنے وقت میں جو چھ دن کے برابر تھا۔ اور ایک دن ابن عباس کی تفسیر کے موافق ایک ہزار سال کا لیا جائے گا۔ گویا چھ ہزار سال میں زمین و آسمان وغیرہ تیار ہوئے۔ بلاشبہ حق تعالیٰ قادر تھا کہ آن واحد میں ساری مخلوق کو پیدا کر دیتا۔ لیکن حکمت اس کو مقتضی ہوئی کہ تدریجاً پیدا کیا جائے۔ شاید بندوں کو سبق دینا ہو کہ قدرت کے باوجود ہر کام سوچ سمجھ کر تأنی اور متانت سے کیا کریں۔ نیز تدریجی تخلیق میں بہ نسبت دفعۃً پیدا کرنے کے اس بات کا زیادہ اظہار ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ فاعل بالاضطرار نہیں۔ بلکہ ہر چیز کا وجود بالکلیہ اس کی مشیت و اختیار سے وابستہ ہے جب چاہے، جس طرح چاہے پیدا کرے۔ (تفسیر عثمانی)

قدرت کا کرشمہ:

چھ دن کے تھوڑے سے وقت میں اتنے بڑے جہان کو جو آسمانوں اور زمین اور سیارات اور تمام کائنات عالم پر مشتمل ہے، بنا کر تیار کر دینا اسی ذات قدوس کا مقام ہے جو قادر مطلق ہے اس کی تخلیق کے لئے نہ پہلے سے خام اجناس کا موجود ہونا ضروری ہے اور نہ بنانے کے لئے کسی عملہ اور خدام کی ضرورت ہے بلکہ اس کی قدرت کاملہ کا یہ مقام ہے کہ جب وہ کسی چیز کو پیدا فرمانا چاہیں تو بغیر کسی سامان اور کسی کی امداد کے ایک آن میں پیدا فرما دیں، یہ چھ دن کی مہلت بھی خاص حکمت و مصلحت کی بناء پر اختیار کی گئی ہے ورنہ ان کی قدرت میں یہ بھی تھا کہ تمام آسمان و زمین اور اس کی کائنات کو ایک آن میں پیدا فرما دیتے۔

ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ

پھر قائم ہوا عرش پر

سورہ ''اعراف'' کے ساتویں رکوع کے شروع میں اسی طرح کی آیت گزر چکی اس کا فائدہ ملاحظہ کیا جاوے۔ (تفسیر عثمانی)

ایسے معاملات جن میں اجمالی ایمان کافی ہے:

تمام معاملات میں جن میں حق تعالیٰ کی نسبت کسی مکان یا جہت کی طرف کی گئی ہے یا جن میں حق تعالیٰ کے لئے اعضاء ید، وجہ، ساق وغیرہ کے الفاظ قرآن میں وارد ہوئے، عقیدہ جمہور علمائے امت کا یہ ہے کہ اس بات پر ایمان لایا جائے کہ یہ کلمات اپنی جگہ برحق ہیں اور ان سے جو مراد حق تعالیٰ کی ہے وہ صحیح ہے اور اس کی کیفیت وحقیقت کے جاننے کی فکر کو اپنی عقل سے بالاتر ہونے کی بناء پر چھوڑ دیا جائے۔

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن   کہ جاہا سپر باید انداختن

اور جن متاخرین علماء نے ان چیزوں کے کوئی معنیٰ بیان فرمائے ہیں ان کے نزدیک بھی وہ محض ایک احتمال کے درجہ میں ہیں کہ شاید یہ معنیٰ ہوں، اس معنیٰ کو یقینی وہ نہیں فرماتے اور نرے احتمالات ظاہر ہے کہ کسی حقیقت کا انکشاف نہیں کر سکتے۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ پھر عرش (تخت شاہی) پر وہ قائم ہوا سلف سے خلف تک تمام اہل سنت کا باتفاق عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام جسمانی صفات اور حدوث کے عوارض سے پاک ہے۔

ایک علمی شبہ اور اس کا جواب:

لیکن آیت مذکورۃ الصدر اور اس جیسی دوسری آیات (جن میں صفات جسم کے ساتھ اللہ کا (اتصاف ظاہر کیا گیا ہے) بظاہر اہل سنت کے مسلک وعقیدے کے

خلاف نظر آتی ہیں، اس شبہ کو دور کرنے کے لئے دو جواب دیئے گئے ہیں:

(۱) تاویل کا مسلک اختیار کیا گیا ہے یعنی ظاہری الفاظ کے وہ (مجازی) معنی لئے گئے ہیں جو شان خداوندی کے مناسب ہیں کیونکہ آیت وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ میں الرَّاسِخُونَ کا عطف اللہ پر ہے مطلب یہ ہے کہ متشابہات کا صحیح علم اللہ کو اور مضبوط علم رکھنے والوں کو ہی ہے (اس سے معلوم ہوا کہ متشابہات کی حقیقی مراد اور تاویل سے علماء ربانیین بھی واقف ہیں)

صفاتِ الٰہی پر ایمان:

امام محمد بن حسن نے فرمایا تھا کہ پورب سے پچھم تک تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ قرآن اور صحیح احادیث میں اللہ کی جو صفات آئی ہیں ان کو (یونہی) بغیر تشریح و تنقیح و توضیح کے ماننا اور ان پر ایمان لانا واجب ہے جو شخص ان کی توضیح کرتا ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماع سلف کے خلاف عمل کرتا ہے۔ اس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین اور جماعت مسلمین کے اختیار کردہ مسلک سے تعلق نہیں۔ امام مالک بن انس نے فرمایا استواء (کا حقیقی ترجمہ) مجہول نہیں (استواء کی) کیفیت معلوم نہیں۔ اور کیفیت استواء کو دریافت کرنا بدعت ہے۔

عرش پر تشریف فرما ہونا:

سلف صالحین، تنزیہ باری تعالیٰ کے قائل تھے، اسی کے ساتھ استواء علی العرش کو (بغیر تاویل کے) مانتے تھے۔ امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا اللہ آسمان میں یقیناً ہے، زمین میں نہیں۔ رواہ البیہقی۔ اس قول کی نسبت بھی امام ابوحنیفہؒ کی طرف کی گئی ہے، کہ جس نے کہا مجھے نہیں معلوم کہ میرا رب آسمان میں ہے یا زمین میں وہ کافر ہوگیا کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى اور عرش آسمانوں کے ادھر ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کا ایک قول یہ آیا ہے کہ جس نے اللہ کے آسمان میں ہونے کا انکار کیا وہ کافر ہوگیا۔ امام شافعی نے فرمایا اللہ اپنے عرش پر اپنے آسمان میں ہے۔ وہ جیسا چاہتا ہے اپنی مخلوق کے قریب بھی ہوتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے اترتا ہے (یعنی اللہ کا عرش پر ہونا مخلوق کے قریب ہونے اور نیچے اترنا تینوں قول صحیح ہیں لیکن عرش پر موجود ہونے مخلوق کے قریب ہونے اور نیچے اترنے کی کیفیت معلوم نہیں) ایسا ہی قول امام احمد بن حنبل کا بھی مروی ہے۔ اسحاق بن راہویہ کا بیان ہے تمام اہل علم کا اجماع ہے کہ اللہ عرش کے اوپر مستوی ہے اور ہر چیز کو جانتا ہے، مزنی، ذہبی، بخاری، ابوداؤد و ترمذی، ابن ماجہ ابن ابی شیبہ، ابویعلی، بیہقی اور دوسرے ائمہ حدیث کا یہی قول ہے۔ ابوزرعہ رازی کے قول سے پتہ چلتا ہے کہ اسی قول پر اہل سنت کا اجماع ہے حافظ عثمان بن سعید دارمی نے لکھا ہے کہ تمام مسلمان اس قول پر متفق ہیں کہ اللہ اپنے عرش پر آسمانوں کے اوپر ہے۔ سہل بن عبداللہ تستری نے فرمایا یہ کہنا جائز نہیں کہ جس نے استواء کو پیدا کیا وہ کیسے مستوی ہوسکتا ہے۔ ہمارے لئے (استواء کو) ماننا اور تسلیم کرنا لازم ہے کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ عرش پر ہے۔ محمد بن جریر طبری نے لکھا ہے، مسلمان کے لئے اتنا جان لینا کافی ہے کہ اس کا رب عرش پر مستوی ہے۔ جو اس سے آگے بڑھے گا وہ نامراد اور خسران مآب ہوگا۔ محمد بن خزیمہ نے کہا، جو شخص اللہ کو عرش پر ساتوں آسمانوں کے اوپر مستوی اور سب مخلوق سے جدا نہیں کہتا وہ کافر ہے۔ اس سے توبہ کرائی جائے توبہ کرلے تو خیر، ورنہ اس کی گردن ماردی جائے۔

مختلف علماء وصوفیاء کے اقوال:

طحاوی نے لکھا ہے کہ عرش و کرسی ویسے ہی ہیں جیسے اللہ نے اپنی کتاب میں ان کو بیان کیا ہے اللہ عرش سے بے نیاز ہے اور عرش کے نیچے والی چیزوں سے بھی۔ وہ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے اور ہر چیز سے اوپر ہے۔

شیخ ابوالحسن اشعری بصری نے کتاب ''اختلاف المصلین و مقالات الاسلامیین'' میں اہل سنت اور اصحاب حدیث کا ایک قول لکھا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کا، اللہ کے فرشتوں، کتابوں اور پیغمبروں کا ماننا اور جو کلام اللہ کی طرف سے آیا ہے اور جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیثوں میں مذکور ہے سب کا اقرار کرنا ضروری ہے۔ ان میں سے کسی چیز کو رد نہیں کیا جا سکتا ہے اور یہ بھی ماننا لازم ہے کہ اللہ اپنے عرش پر ہے، جیسا کہ اس نے خود آیت الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى میں فرمایا ہے اور اللہ کے دو ہاتھ بھی ہیں مگر بغیر کیفیت (مخلوقیہ) کے اس نے خود فرمایا ہے: خَلَقْتُ بِيَدَيَّ۔

ابونعیم نے حلیہ میں لکھا ہے، ہمارا طریقہ سلف کے طریقے کے موافق ہے، جو کتاب اللہ، احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماع کے پیرو تھے اور اس بات کا اعتقاد رکھتے تھے کہ اللہ ہمیشہ سے اپنی تمام صفات میں کامل ہے...... آخر میں ابونعیم نے کہا، جن احادیث میں اللہ کے عرش پر مستوی ہونے کا ذکر ہے سلف ان کو مانتے تھے اور اللہ کو عرش پر بغیر کسی (مخلوقی) کیفیت اور تشبیہ کے مستوی مانتے تھے اور اس امر کے بھی قائل تھے کہ اللہ اپنی مخلوق سے جدا ہے۔

ابن عبدالبر نے لکھا ہے کہ اللہ آسمان میں عرش پر سات آسمانوں کے اوپر ہے جیسا کہ اہل سنت کا قول ہے۔

امام الحرمین نے کہا، عقیدۂ سلف کا اتباع ہی پسندیدہ اعتقاد اور دین اللہ ہے ائمۂ سلف نے تاویل سے اجتناب کیا ہے الفاظ کے ظاہری معنی کو اختیار کیا ہے اور معانی (کی وضاحت و تفصیل) کو اللہ کے سپرد کیا ہے۔

بغوی نے لکھا ہے، اہلسنت قائل ہیں کہ استوائے علی العرش اللہ کی صفت ہے بلا کیف۔ اس پر ایمان واجب ہے۔ بیضاوی نے لکھا، اس کا مطلب یہ ہے کہ استواء علی العرش اللہ کے لئے ویسا ہے جیسا اس کے مناسب ہے۔ استقرار اور

مکانیت کی آمیزش سے پاک ہے۔

ابوبکر علی بن عیسیٰ شبلی جو اپنے زمانے کے صوفیا میں سب سے بڑے عالم تھے، کہتے ہیں: رب آسمان میں ہے حکم دیتا ہے اور فیصلہ نافذ کرتا ہے۔ شیخ الاسلام عبداللہ انصاری نے اخبار شتیٰ میں لکھا ہے کہ اللہ ساتویں آسمان میں عرش پر ہے۔

شیخ عبدالقادر جیلانی نے ''غنیۃ الطالبین میں لکھا ہے اور اس موضوع پر بہت تفصیلی بحث کی ہے (جس کا خلاصہ وہی ہے جو علمائے سلف سے منقول ہے کہ معانی معلوم ہیں کیفیت نامعلوم اور ہر تشبیہ سے پاک)۔

یہ تمام اقوال ذہبی نے کتاب العلو'' میں نقل کیئے ہیں۔ صحابہؓ تابعین، محدثین، فقہاء اور صوفیہ کی کثیر جماعت (تقریباً کل) کا یہی مسلک ہے۔ میں نے مختصراً سورۂ اعراف کی آیت ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ اور سورۂ بقرہ کی آیت يَأْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِي ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ کی تفسیر میں بیان کر دیا ہے کہ اصحاب قلوب کے نزدیک ذات باری تعالیٰ کی خصوصی تجلی اور خاص پرتو بعض مخلوق پر پڑتا ہے وہ مخلوق نورانی لہروں سے نورچیں ہوتی ہے۔

(یعنی بعض مخلوق تجلی الٰہی کی خصوصی جولانگاہ ہے خصوصیت کے ساتھ وہ جلوۂ خداوندی سے نورچیں ہوتی ہے اس پر خاص چمکارا اور پرتو پڑتا ہے اس سے جلوہ ریزی اور نورپاشی کرنے والی ذات کا محتاج مکان وزمان اور حامل کیف وکم ہونا لازم نہیں آتا ہے۔ وہ جلوۂ قدیم بے کیف ہے، بے مکان ہے، بے زمان ہے، اور ہر حادث مقدار وعوارض سے پاک ہے) (تفسیر مظہریؒ)

خلاصۂ کلام:

غرض یہ کہ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ سے ظاہری اور حسی معنی یعنی تخت پر بیٹھنا مراد نہیں بلکہ حکمرانی اور تدبیر سے کنایہ ہے۔ اور چونکہ عرش آسمانوں اور زمینوں کو محیط ہے اس لئے حکمرانی سے کنایہ کے لئے استواء کے ساتھ علی العرش کا لفظ ذکر کیا امام ابو الحسن فرماتے ہیں کہ استواء سے اللہ کا کوئی خاص فعل مراد ہے جو اس نے عرش میں کیا۔ اور صوفیائے کرام یہ فرماتے ہیں کہ استواء سے اللہ تعالیٰ کی کوئی خاص تجلی مراد ہے اور امام ابوبکر بن فورک کہتے ہیں کہ استواء سے علو اور رفعت کے معنی مراد ہیں اور امام بخاری نے بھی اس معنی کو اختیار فرمایا ہے۔ (معارف کاندھلویؒ)

انسان کی بے بسی:

اتنی بات قرآن وحدیث سے ثابت ہے کہ عرش رحمٰن کوئی ایسی مخلوق ہے جو تمام آسمانوں اور زمین اور تمام کائنات عالم پر محیط ہے سارا جہاں اس کے اندر سمایا ہوا ہے، اس سے زائد اس کی حقیقت کا معلوم کرنا انسان کے بس کی بات نہیں، جو انسان اپنی سائنس کی انتہائی ترقی کے زمانہ میں بھی صرف نیچے کے سیاروں تک پہنچنے کی تیاری میں ہے اور وہ بھی ابھی نصیب نہیں اور اس کا یہ اقرار ہے کہ اوپر کے سیارے ہم سے اتنے دور ہیں کہ آلات رصدیہ کے ذریعہ بھی ان کی معلومات تخمینہ اور اندازہ سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتی اور بہت سے ستارے ایسے بھی ہیں جس کی شعاعیں ابھی تک زمین پر نہیں پہنچیں، حالانکہ شعاع نوری کی حرکت ایک منٹ میں لاکھوں میل بتائی جاتی ہے، جب سیاروں اور ستاروں تک انسان کی رسائی کا یہ حال ہے تو آسمان جو ان سب ستاروں اور سیاروں سے اوپر ہے اس کا یہ مسکین انسان کیا حال معلوم کر سکتا ہے، اور پھر جو ساتوں آسمانوں سے بھی اوپر اور سب پر حاوی اور محیط عرش رحمٰن ہے اس کی حقیقت تک انسان کی رسائی معلوم، آیت مذکورہ سے اتنا معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ نے چھ دن میں آسمان وزمین اور تمام کائنات بنائی اور اس کے بعد عرش پر قیام فرمایا۔

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ
تدبیر کرتا ہے کام کی

یعنی مخلوق کے تمام کاموں کی تدبیر وانتظام اسی کے ہاتھ میں ہے۔

مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ
کوئی سفارش نہیں کر سکتا مگر اس کی اجازت کے بعد

کوئی اللہ کی اجازت کے بغیر لب بھی نہیں ہلا سکتا:

یعنی شریک اور حصہ دار تو اس کی خدائی میں کیا ہوتا، سفارش کے لئے بھی اس کی اجازت کے بدون لب نہیں ہلا سکتا۔ (تفسیر عثمانیؒ)

اس آیت کا نزول نضر بن حارث کے متعلق ہوا جس نے کہا تھا کہ اگر قیامت کا دن ہوا تو لات وعزیٰ میری سفارش کر دیں گے لات اور عزیٰ عورت کی شکل کے دو بت تھے جن کی پوجا کی جاتی تھی) آیت میں اشارہ ہے کہ قیامت کے دن شفاعت ضرور ہوگی مگر اللہ کی اجازت کے بعد ہوگی۔ (تفسیر مظہریؒ)

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ اَفَلَا
وہ اللہ ہے رب تمہارا سو اس کی بندگی کرو کیا تم
تَذَكَّرُوْنَ ﴿۳﴾
دھیان نہیں کرتے

بس اللہ ہی عبادت کا مستحق ہے:

یعنی دھیان کرو کہ ایسے رب کے سوا جس کی صفات اوپر بیان ہوئیں دوسرا کون ہے جس کی بندگی اور پرستش کی جا سکے۔ پھر تم کو کیسے جرأت ہوتی ہے کہ اس خالق و مالک شہنشاہ مطلق اور حکیم برحق کے پیغاموں اور پیغامبروں کو محض اوہام وظنون کی بناء پر جھٹلانے لگو۔

اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا ۭ

اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے تم سب کو

یعنی اسی سے تم سب کا آغاز ہوا، اور اسی کی طرف انجام کار سب کو جانا ہے۔ پھر اس کے احکام وسفراء سے سرتابی کرنا کیسے روا ہوسکتا ہے۔

وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ

وعدہ ہے اللہ کا سچا وہی پیدا کرتا ہے اول بار پھر

يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا

دوبارہ کریگا اس کو تاکہ بدلہ دے ان کو جو ایمان لائے تھے اور کئے

الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ۭ

تھے کام نیک انصاف کے ساتھ

یعنی چھوٹی سے چھوٹی نیکی بھی ضائع نہ ہو۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ

اور جو کافر ہوئے ان کو پینا ہے کھولتا پانی

وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۝ هُوَ

اور عذاب ہے دردناک اسلئے کہ کفر کرتے تھے وہی ہے

الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاۗءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا

جس نے بنایا سورج کو چمک اور چاند کو چاندنا

نور اور روشنی:

بعض کے نزدیک "نور" عام ہے "ضیاء" خاص اس نور کو کہتے ہیں جو زیادہ تیز اور چمکدار ہو۔ بعض نے کہا کہ جس کی روشنی ذاتی ہو، وہ ضیاء اور جس کی دوسرے سے مستفاد ہو) وہ "نور" ہے۔ سورج کی روشنی عالم اسباب میں کسی دوسرے کرہ سے حاصل نہیں ہوئی۔ چاند کی روشنی البتہ سورج سے مستفاد ہے۔ اور بعض محققین نے دونوں میں یہ فرق بتلایا ہے کہ "نور" مطلق روشنی کو کہتے ہیں۔ "ضیاء" اور "ضوء" اس کے انتشار (پھیلاؤ) کا نام ہے۔ سورج کی روشنی کا پھیلاؤ چونکہ زیادہ ہے۔ اس لئے "ضیاء" سے تعبیر فرمایا۔ واللہ اعلم بمراد۔ (تفسیر عثمانی)

وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ

اور مقرر کیں اس کیلئے منزلیں

چاند کی منزلیں:

یعنی روزانہ بتدریج گھٹتا بڑھتا ہے۔ " وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ " (یٰس۔ رکوع ۳) علمائے ہیئت نے اس کے دورے کی تقسیم کر کے اٹھائیس منزلیں مقرر کی ہیں۔ جو بارہ بروج پر منقسم ہیں۔ قرآن میں خاص ان کی مصطلحات مراد نہیں، مطلق سیر و مسافت کے مدارج مراد ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

روشنی کے رنگ:

زجاج نے لفظ ضیاء کو جمع قرار دیا ہے، اس رو سے شاید اس طرف اشارہ ہو کہ روشنی کے سات مشہور رنگ اور قسمیں جو دنیا میں پائی جاتی ہیں آفتاب ان تمام اقسام کا جامع ہے جو بارش کے بعد قوس قزح میں ظاہر ہوتے ہیں (منار)

چونکہ ہر مہینہ میں چاند کم از کم ایک دن غائب رہتا ہے اس لیے عموما چاند کی منزلیں اٹھائیس کہی جاتی ہیں، اور آفتاب کا دورہ سال بھر میں پورا ہوتا ہے اس کی منزلیں تین سو ساٹھ یا پینسٹھ ہوتی ہیں، قدیم جاہلیت عرب میں بھی اور اہل ہیئت و ریاضی کے نزدیک بھی ان منزلوں کے خاص خاص نام ان ستاروں کی مناسبت سے رکھ دیئے گئے ہیں جو ان منازل کی محاذات میں پائے جاتے ہیں، قرآن کریم ان اصطلاحی ناموں سے بالاتر ہے، اس کی مراد صرف وہ فاصلے ہیں جن کو شمس و قمر خاص خاص دنوں میں طے کرتے ہیں۔ (معارف القرآن مفتی اعظمؒ)

لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ۭ

تاکہ پہچانو گنتی برسوں کی اور حساب

اوقات کا حساب:

یعنی برسوں کی گنتی اور مہینوں اور دنوں کے چھوٹے موٹے حساب سب چاند سورج کی رفتار سے وابستہ کر دیے ہیں اگر چاند سورج نہ ہوں تو دن رات قمری اور شمسی مہینے اور سال وغیرہ کیسے متعین ہوں۔ حالانکہ علاوہ دنیوی زندگی اور شمسی مہینے، اور سال وغیرہ کیسے متعین ہوں حالانکہ علاوہ دنیوی زندگی اور معاشی کاروبار کے بہت سے احکام شرعیہ میں بھی تعین اوقات کی ضرورت ہے۔

مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ

یوں ہی نہیں بنایا اللہ نے یہ سب کچھ مگر تدبیر سے

یعنی فلکیات کا سلسلہ یوں ہی کیف ما اتفق نہیں۔ بلکہ بڑے عظیم الشان نظام و تدبیر کے ماتحت اور ہزارہا فوائد وحکم پر مشتمل ہے۔

يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ⑤

ظاہر کرتا ہے نشانیاں ان لوگوں کیلئے جن کو سمجھ ہے

عقلمندوں کا کام:

یعنی سمجھدار لوگ مصنوعات کے اس نظام کو دیکھ کر خداوند قادر و حکیم کی ہستی کا سراغ پاتے ہیں۔ اور مادیات کے انتظام سے روحانیات کے متعلق بھی اندازہ کر لیتے ہیں کہ وہاں کی دنیا میں کیسے کیسے چاند سورج خدا نے پیدا کئے ہوں گے۔ انہی سمجھدار لوگوں کو انبیاء و مرسلین کہہ لیجئے۔

اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ

البتہ بدلنے میں رات اور دن کے اور جو کچھ پیدا کیا ہے

اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ

اللہ نے آسمانوں اور زمین میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کو

يَّتَّقُوْنَ ⑥

جو ڈرتے ہیں

ہر چیز خالق پر دلیل ہے:

بلاشبہ دنیا کی ہر چھوٹی بڑی چیز میں خدا کی ہستی اور وحدانیت کے دلائل موجود ہیں۔

وفي كل شيء له اٰية　　تدل على انه واحد

سورۂ بقرہ میں پارہ سیقول کے ربع کے قریب ایک آیت گزر چکی جس میں زیادہ بسط و تفصیل سے ان نشانہائے قدرت کا بیان ہوا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا

البتہ جو لوگ امید نہیں رکھتے ہمارے ملنے کی اور خوش ہوئے

بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ

دنیا کی زندگی پر اور اسی پر مطمئن ہوگئے

هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ⑦

اور جو لوگ ہماری نشانیوں سے بے خبر ہیں

غافل لوگ:

یعنی دنیا میں ایسا دل لگایا کہ آخرت کی اور خدا کے پاس جانے کی کچھ خبر ہی نہ رہی۔ اسی چند روزہ حیات کو مقصود و معبود بنا لیا۔ اور قدرت کی جو نشانیاں اوپر بیان ہوئیں، ان میں کبھی غور و تامل نہ کیا کہ ایسا مضبوط اور حکیمانہ نظام یوں ہی بیکار نہیں بنایا گیا۔ ضرور اس سارے کارخانہ کا کوئی خاص مقصد ہوگا۔ پھر جس نے پہلی مرتبہ ایسی عجیب و غریب مخلوقات پیدا کر دی، اس کو دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے۔

اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ⑧

ایسوں کا ٹھکانا ہے آگ بدلہ اسکا جو کماتے تھے

ان کی کمائی دوزخ ہے:

یعنی دل و دماغ سے زبان سے، ہاتھ پاؤں سے، جو کچھ انہوں نے کمائی کی اس کا بدلہ دوزخ کی آگ ہے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

البتہ جو لوگ ایمان لائے اور کام کئے اچھے

يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ

ہدایت کریگا ان کو رب ان کا ان کے ایمان سے

ایمان و عمل کا پھل:

یعنی ایمان کی بدولت اور اس کی روشنی میں حق تعالیٰ مومنین کو مقصد اصلی (جنت) تک پہنچائے گا۔ (تفسیر عثمانیؒ)

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جس نے جانی چیز پر عمل کیا اللہ اس کو انجانی چیز کا علم عطا فرما دے گا۔ رواہ ابو نعیم۔ الحلیۃ۔ (تفسیر مظہریؒ)

تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِيْ جَنّٰتِ

بہتی ہیں ان کے نیچے نہریں باغوں میں آرام کے

النَّعِيْمِ ⑨ دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ

ان کی دعا اس جگہ یہ کہ پاک ذات ہے تیری یا اللہ

جنتیوں کی ٹھاٹھ: جنتی جنت کی نعمتوں اور خدا کے فضل و احسان کو دیکھ کر ''سبحان اللہ'' پکاریں گے۔ اور جب خدا سے کچھ مانگنے کی خواہش ہوگی، مثلاً کوئی پرندہ یا پھل دیکھا اور ادھر رغبت ہوئی تو سبحانک اللھم کہیں گے۔ اتنا سنتے ہی فرشتے وہ چیز فوراً حاضر کر دیں گے۔ گویا یہ ہی ایک لفظ تمام

دعاؤں کے قائم مقام ہوگا۔ دنیا میں بھی بڑے آدمیوں کے یہاں دستور ہے کہ مہمان اگر کسی چیز کو پسند کر کے صرف تعریف کر دے تو غیور میزبان کوشش کرتا ہے کہ وہ چیز مہمان کے لئے مہیا کرے۔ (تفسیر عثمانی)

وَتَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلٰمٌ
اور ملاقات ان کی سلام

جنتیوں کا سلام:

جنتی ملاقات کے وقت ایک دوسرے کو سلام کریں گے۔ جیسے دنیا میں مسلمانوں کا دستور ہے، نیز فرشتوں کا جنتیوں کو سلام کرنا، بلکہ خود خداوند رب العزت کی طرف سے تحفۂ سلام کا آنا قرآن میں منصوص ہے۔ سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ (یٰس۔ رکوع۴)

وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ

(الرعد۔ رکوع۳) (تفسیر عثمانی)

اللہ تعالیٰ کا سلام:

ابن ماجہ، ابن ابی الدنیا و دارقطنی اور اجری نے جابر کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب اہل جنت اپنی راحتوں میں مشغول ہوں گے کہ اچانک ان پر اوپر سے ایک نور چمکے گا۔ سر اٹھا کر دیکھیں گے تو (نظر آئے گا کہ) اللہ اوپر سے ان پر جلوہ پاش ہے، اللہ فرمائے گا " السلام علیکم یا اھل الجنة " یہی ہے معنی سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ کا۔

مہاجرین کو سلام:

امام احمد بزار اور ابن حبان نے حضرت ابن عمر کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ کی مخلوق میں سے جنت کے اندر سب سے پہلے فقراء مہاجرین داخل ہوں گے جن سے (اسلام کی) سرحدوں کا انتظام ہوتا ہے اور انہی کے ذریعے سے ناگوار امور سے حفاظت کی جاتی ہے لیکن (اتنی اہم شخصیت کے حامل ہونے کے باوجود) ان میں سے جب کوئی مرتا ہے تو دل کی خواہش دل ہی میں لیکر جاتا ہے۔ پورا کرنے کی توفیق ہی اس کو نہیں ملتی۔ اللہ اپنے ملائکہ میں سے جس کو چاہے گا حکم دے گا کہ مہاجرین کے پاس جاؤ اور ان کو میرا سلام پہنچاؤ۔ فرشتے عرض کریں گے، اے ہمارے مالک ہم تیرے آسمان کے باشندے ہیں۔ مخلوق میں تیرے برگزیدہ بندے ہیں۔ کیا تو ہم کو حکم دے رہا ہے کہ ہم ان کے پاس جائیں اور ان کو سلام کریں۔ اللہ فرمائے گا، یہ میرے ایسے بندے تھے کہ میرے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے تھے۔ کسی کو میرا شریک نہیں قرار دیتے تھے انہی کو سرحدوں پر بھیجا جاتا تھا اور انہی کے ذریعہ سے ناگوار امور سے حفاظت ہوتی تھی اور جب ان میں سے کوئی مرتا تھا تو اپنا ارمان اپنے دل میں ہی لے کر مرتا تھا۔ پورا کرنے کی اس کو توفیق ہی نہ ہوتی تھی۔ حسب الحکم فرشتے ان کے پاس جنت کے ہر دروازہ سے آئیں گے اور کہیں گے سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ۔ (تفسیر مظہریؒ)

فرشتوں کا سلام:

اہل جنت کا یہ حال ہوگا کہ ان کا خطاب سبحانک اللّٰھُمَّ ہوگا۔ ابن جریجؒ کہتے ہیں کہ جب ان کے پاس سے کوئی پرندہ اڑتا گزرے گا جس کی خواہش انہیں پیدا ہوگی تو مذکورہ بالا کلمہ زبان پر لائیں گے یہی ان کا بلاوا ہوگا تو ایک فرشتہ ان کے مرغوبات لے کر حاضر ہو جائے گا سلام کرے گا۔ وہ جواب سلام دیں گے۔ چنانچہ فرمایا تَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلٰمٌ. وہ جب کھا چکیں گے تو اللہ کا شکر اور حمد کیا کریں گے۔ اسی لئے کہا کہ اٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (ابن کثیرؒ)

وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ
اور خاتمہ ان کی دعا کا اس پر کہ سب خوبی اللہ کو جو پروردگار
الْعٰلَمِيْنَ ۝
سارے جہان کا

جنتیوں کا آخر کلام:

جنت میں پہنچ کر جب دنیوی تفکرات وکدورات کا خاتمہ ہو جائے گا اور محض سبحانک اللّٰھُمَّ کہنے پر ہر چیز حسب خواہش ملتی رہے گی تو ان کی ہر دعا کا خاتمہ " الحمد للہ رب العالمین " پر ہوگا اور طبعاً ایسا ہی ہونا چاہئے۔ (تفسیر عثمانی)

آخری بات ہوگی اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. شاید اس سے مراد یہ ہے کہ جب اہل جنت، جنت میں داخل ہو کر اللہ کی عظمت کا معائنہ کریں گے تو اس کی بزرگی بیان کریں گے اور صفات جلالیہ کا اظہار کریں گے۔ پھر اللہ کی طرف سے فرشتے حاضر ہو کر ان کو تمام آفتوں سے سالم رہنے اور عزت و کرامت پر فائز ہونے کی دعاء دیں گے۔ اس وقت وہ اللہ کی حمد وثناء کریں گے اور اللہ کی صفت اکرام کو بیان کریں گے۔ (تفسیر مظہریؒ)

قطعہ

ذوق نامش عاشق مشتاق را — از بہشت جاودانی خوش تر است
گرچہ در فردوس نعمتہائے است — وصل او از ہر چہ دانی خوش تر است

زجاج کہتے ہیں کہ اہل جنت کے کلام کا آغاز تسبیح و تعظیم سے ہوگا اور اس کا اختتام خدا کے شکر اور ثناء پر ہوگا۔

کھانے پینے کے آداب:

قرطبی نے احکام القرآن میں فرمایا کہ کھانے پینے اور تمام کاموں میں سنت اہل جنت کے اس عمل کے مطابق یہ ہے کہ بسم اللہ سے شروع کرے اور الحمدللہ پر ختم کرے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو یہ پسند ہے کہ بندہ جب کوئی چیز کھائے پئے تو بسم اللہ سے شروع کرے اور فارغ ہو کر الحمدللہ کہے۔

دُعاء کا ادب:

مستحب ہے کہ دعا کرنے والا آخر میں یہ کہا کرے وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ اور قرطبی نے فرمایا کہ اس کے ساتھ بہتر یہ ہے کہ سورۂ صٰفّت کی آخری آیتیں بھی پڑھے یعنی سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ

اور اگر جلدی پہنچادے اللہ لوگوں کو برائی جیسے کہ جلدی مانگتے ہیں

بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ ؕ فَنَذَرُ الَّذِيْنَ

وہ بھلائی تو ختم کردی جائے ان کی عمر سو ہم چھوڑے رکھتے ہیں

لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۱﴾

ان کو جن کو امید نہیں ہماری ملاقات کی ان کی شرارت میں سرگرداں

اللہ مجرموں کو مہلت دیتا ہے:

دو آیت پہلے فرمایا تھا کہ جو لوگ غفلت میں پڑے ہیں اور ہمارے ملنے کی امید نہیں رکھتے۔ ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ یہاں یہ بتلانا ہے کہ خدا ایسے مجرموں کو دنیا میں فوراً نہیں پکڑتا بلکہ مہلت دیتا ہے۔ حالانکہ لوگوں کا حال یہ ہے کبھی بیباک و بے حیا بن کر خود اپنے اوپر جلد عذاب آنے کا مطالبہ کرتے ہی۔ مثلاً کہتے ہیں:

اللھم ان کان ھٰذا ھو الحق من عندک فامطر علینا حجارۃ من السماء (انفال۔ رکوع ۴) کبھی دنیوی حوادث سے تنگ آکر اپنے یا اپنی اولاد وغیرہ کے حق میں بددُعائیں کرنے لگتے ہیں جیسا کہ تجربہ سے ظاہر ہے اب اگر خدا تعالیٰ ان کی درخواست دُعاء کے موافق فوراً ہاتھوں ہاتھ کوئی عذاب یا برائی اس قدر جلد ان کو پہنچادے جتنی جلد وہ بھلائی کے پہنچنے کی خواہش رکھتے ہیں تو بدی کے وبال سے ایک منٹ بھی فرصت نہ پائیں اور رشتۂ حیات اسی وقت منقطع ہو جائے مگر خدا کے یہاں نیکی و بدی دونوں میں حسب مصلحت تاخیر و تحمل ہوتا ہے، تا نیک لوگ تربیت پائیں گو بدکار غفلت میں پڑے رہ کر پیمانہ شرارت لبریز کریں۔ (تفسیر عثمانی)

عزیزوں کے حق میں بددُعاء:

امام ابن جریر طبریؒ نے بروایت قتادہؒ اور بخاریؒ و مسلم نے بروایت مجاہدؒ نقل کیا ہے کہ اس جگہ بددعاء سے مراد یہ ہے کہ بعض اوقات کوئی انسان غصہ کی حالت میں اپنی اولاد یا مال و دولت کے تباہ ہونے کی بددعاء کر بیٹھتا یا ان چیزوں پر لعنت کے الفاظ کہہ ڈالتا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے لطف و کرم سے ایسی دعاء قبول کرنے میں جلدی نہیں فرماتے، امام قرطبیؒ نے اس جگہ ایک روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے اللہ جل شانہ سے دعاء کی ہے کہ وہ کسی دوست عزیز کی بددعاء اس کے دوست عزیز کے متعلق قبول نہ فرماویں، اور شہر بن حوشبؒ فرماتے ہیں کہ میں نے بعض کتابوں میں پڑھا ہے کہ جو فرشتے انسانوں کی حاجت روائی پر مقرر ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ان کو یہ ہدایت کر رکھی ہے کہ میرا بندہ جو رنج و غصہ میں کچھ بات کہے اس کو نہ لکھو۔ (قرطبی)

اس کے باوجود بعض اوقات کوئی قبولیت کی گھڑی آتی ہے جس میں انسان کی زبان سے جو بات نکلے وہ فوراً قبول ہو جاتی ہے اس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنی اولاد اور مال کے لئے کبھی بددعاء نہ کرو، ایسا نہ ہو کہ وہ وقت قبولیت دعاء کا ہو، اور یہ بددعاء فوراً قبول ہو جائے (اور تمہیں بعد میں پچھتانا پڑے) صحیح مسلم میں یہ حدیث حضرت جابرؓ کی روایت سے غزوۂ بواط کے واقعہ کے تحت نقل کی گئی ہے۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ

اور جب پہنچے انسان کو تکلیف پکارے ہم کو پڑا ہوا

اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ

یا بیٹھا یا کھڑا پھر جب ہم کھول دیں اس سے وہ تکلیف چلا جائے

مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ؕ كَذٰلِكَ

گویا کبھی نہ پکارا تھا ہم کو کسی تکلیف پہنچنے پر اسی طرح

زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲﴾

پسند آیا ہے بیباک لوگوں کو جو کچھ کر رہے ہیں

انسان کی بیباکی اور کمزوری:

یعنی انسان اول بیباکی سے خود عذاب طلب کرتا اور برائی اپنی زبان سے مانگتا ہے۔ مگر کمزور اور بودا اتنا ہے کہ جہاں ذرا تکلیف پہنچی گھبرا کر ہمیں پکارنا شروع کر دیا۔ جب تک مصیبت رہی کھڑے، بیٹھے لیٹے ہر حالت میں خدا کو پکارتا رہا۔ پھر

جہاں تکلیف ہٹالی گئی، سب کہا سنا بھول گیا۔ گویا خدا سے کبھی کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہ ہی غرور وغفلت کا نشہ، وہ ہی اکڑفوں رہ گئی۔ جس میں پہلے مبتلا تھا۔

عیش وآرام میں خدا کو یاد رکھو:

حدیث میں ہے کہ تو خدا کو اپنے عیش وآرام میں یاد رکھ، خدا تجھ کو تیری سختی اور مصیبت میں یاد رکھے گا۔ مؤمن کی شان یہ ہے کہ کسی وقت خدا کو نہ بھولے۔ سختی پر صبر اور فراخی پر خدا کا شکر ادا کرتا رہے۔ یہ ہی وہ چیز ہے جس کی توفیق مؤمن کے سوا کسی کو نہیں ملتی۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا

اور البتہ ہم ہلاک کر چکے ہیں جماعتوں کو تم سے پہلے

ظَلَمُوْا ۙ وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ

جب ظالم ہوگئے حالانکہ لائے تھے ان کے پاس رسول ان کے کھلی

وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِی

نشانیاں اور ہرگز نہ تھے ایمان لانے والے یوں ہی سزا دیتے ہیں

الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۳﴾

ہم قوم گنہگاروں کو

ظلم وکفر کی سزا آخر مل کر رہتی ہے:

یعنی اگر ان کی درخواست کے موافق جلدی عذاب نہ آئے یا تکلیف و مصیبت آ کر ٹل جائے تو بے فکر نہیں ہونا چاہئے۔ ظلم وشرارت اور بے ایمانی کی سزا جلد یا بدیر مل کر رہے گی۔ سنت اللہ قدیم سے یہ ہی ہے کہ جب لوگ انبیاء ومرسلین کے کھلے نشان دیکھنے کے بعد بھی ظلم وتکذیب پر کمر بستہ رہے اور کسی طرح ایمان وتسلیم کی طرف نہ جھکے تو آسمانی عذاب نے ان کو ہلاک کر ڈالا۔ ہمیشہ مجرموں کو کسی نہ کسی رنگ میں سزا ملتی رہی۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ مِنْ

پھر تم کو ہم نے نائب کیا زمین میں ان کے بعد

بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾

تاکہ دیکھیں تم کیا کرتے ہو

انسانوں کا امتحان: یعنی پہلوں کی جگہ اب تم کو زمین پر بسایا تاکہ دیکھا جائے کہ تم کہاں تک خالق ومخلوق کے حقوق پہچانتے ہو۔ اور خدا کے پیغمبروں کے ساتھ کیا معاملہ کرتے ہو۔ نیک وبد جیسے عمل کرو گے اسی کے مناسب تم سے برتاؤ کیا جائے گا۔ آگے اس معاملہ کا ذکر ہے جو قرآن کریم یا پیغمبر علیہ السلام یا خداوند قدوس کے ساتھ انہوں نے کیا۔ (تفسیر عثمانی)

لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ: تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسے عمل کرتے ہو اچھے یا برے اور گزشتہ اقوام کے احوال سے عبرت اندوز ہو کر پیغمبروں کی تصدیق کرتے ہو یا نہیں کرتے۔ یہ آیت بتارہی ہے کہ اعمال وافعال بذات خود نہ اچھے ہوتے ہیں نہ برے افعال کی اچھائی برائی کیفیت جہت کے اختلاف پر مبنی ہے۔ ایک ہی عمل مختلف وجوہ کے تحت اچھا بھی ہو جاتا ہے اور برا بھی۔

حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دنیا میٹھی اور سبز ہے۔ اللہ تم کو یہاں (گزشتہ اقوام کا) جانشین بنائے گا اور دیکھے گا کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔ (تفسیر مظہری)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء کے بارے میں خواب:

ایک دفعہ عوف بن مالکؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے اپنا خواب بیان کیا کہ گویا ایک رسی آسمان سے لٹکی ہوئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کھینچ لیا۔ پھر وہ آسمان سے معلق ہوگئی تو اب ابوبکرؓ نے کھینچ لیا۔ پھر لوگ منبر کے اطراف اس کو ناپنے لگے اور عمرؓ کے ناپ میں وہ منبر سے تین ہاتھ لمبی نکل آئی۔ وہاں عمرؓ بھی تھے۔ عمرؓ نے سن کر کہا "ارے تمہارا خواب چھوڑو بھی' کہاں کا خواب اور ہمیں اس سے کیا واسطہ۔" لیکن جب عمرؓ خلیفہ ہوئے تو عوفؓ سے کہنے لگے 'عوفؓ! تم اپنا خواب تو سناؤ' عوفؓ نے کہا اب خواب کی کیا پڑی ہے تم نے تو مجھے اس کے سنانے پر جھڑک دیا تھا۔ عمرؓ نے کہا خدا تمہارا بھلا کرے میں ہرگز یہ نہیں چاہتا تھا کہ تم نفس صدیقؓ خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر مرگ سناؤ۔ پھر عوفؓ نے خواب بیان کیا حتیٰ کہ جب یہاں تک پہنچے کہ لوگ منبر تک تین تین ہاتھ اسے ناپنے لگے۔ تو عمرؓ نے کہا کہ ایک تو ان تین میں سے خلیفہ تھا یعنی ابوبکرؓ اور دوسرا وہ جو خدا کے معاملہ میں کسی کی ملامت و ناراضی کی پرواہ نہیں کرتا اور تیسرے ہاتھ پر اختتام کا مطلب یہ ہے کہ وہ شہید ہوگا۔

لومۃ لائم سے نہ ڈرنے کا ذکر جو عمرؓ نے کیا وہ احکام خداوندی کے بارے میں تھا۔ اور لفظ شہید سے حضرت عمرؓ کی مراد یہ تھی کہ میرے لئے شہادت مقدر ہے اور اس وقت ہے کہ سارے لوگ میرے فرمانبردار ہونگے۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ

اور جب پڑھی جاتی ہیں ان کے سامنے آیتیں ہماری واضح کہتے ہیں

لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ

وہ لوگ جن کو امید نہیں ہم سے ملاقات کی لے آ کوئی قرآن اس کے

اَوْ بَدِّلْهُ ؕ
سوایا اس کو بدل ڈال

مشرکوں کی بے ہودہ فرمائش:

قرآن کی عام پند ونصیحت تو بہت سے پسند کرتے لیکن بت پرستی یا ان کے مخصوص عقائد و رسوم کا رد ہوتا تو وحشت کھاتے اور ناک بھوں چڑھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے کہ اپنے خدا سے کہہ کر یا تو دوسرا قرآن لے آیئے جس میں یہ مضامین نہ ہوں اگر یہی قرآن رہے تو اتنے حصہ میں ترمیم کر دیجئے جو بت پرستی وغیرہ سے متعلق ہے۔ جن لوگوں نے پتھر کی مورتیوں پر خدائی اختیارات تقسیم کر رکھے تھے، ان کی ذہنیت سے کچھ مستبعد نہیں کہ ایک پیغمبر کو اس طرح کے تصرفات واختیارات کا مالک فرض کر لیں۔ یا یہ کہنا بھی محض الزام و استہزاء کے طور پر ہوگا۔ بہرحال اس کا تحقیقی جواب آگے مذکور ہے۔ (تفسیر عثمانی)

قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ
تو کہہ دے میرا کام نہیں کہ اس کو بدل ڈالوں
نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْٓ
اپنی طرف سے میں تابعداری کرتا ہوں اس کی جو حکم آئے
اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ
میری طرف میں ڈرتا ہوں اگر نافرمانی کروں اپنے رب کی بڑے
عَظِيْمٍ ﴿۱۵﴾
دن کے عذاب سے

فرمائش کی تردید:

یعنی کسی فرشتہ یا پیغمبر کا یہ کام نہیں کہ اپنی طرف سے کلام الٰہی میں ترمیم کر کے ایک شوشہ بھی تبدیل کر سکے۔ پیغمبر کا فرض یہ ہے کہ جو وحی خدا کی طرف سے آئے بلاکم وکاست اس کے حکم کے موافق چلتا رہے۔ وہ خدا کی وحی کا تابع ہوتا ہے۔ خدا اس کا تابع نہیں ہوتا کہ جیسا کلام تم چاہو، خدا کے یہاں سے لا کر پیش کر دے۔ وحی الٰہی میں ادنیٰ سے ادنیٰ تصرف اور قطع و برید کرنا بڑی بھاری معصیت ہے، پھر جو معصوم بندے سب سے زیادہ خدا کا ڈر رکھتے ہیں (انبیاء علیہم السلام) وہ ایسی معصیت ونافرمانی کے قریب کہاں جا سکتے ہیں۔ "اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ" میں گویا ان بیہودہ فرمائش کرنے والوں پر تعریض ہوگئی کہ ایسی سخت نافرمانی کرتے ہوئے تم کو بڑے دن کے عذاب سے ڈرنا چاہئے۔ (تفسیر عثمانی)

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ
کہہ دے اگر اللہ چاہتا تو میں نہ پڑھتا اس کو تمہارے سامنے
بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ
اور نہ وہ تم کو خبر کرتا اس کی کیونکہ میں رہ چکا ہوں تم میں ایک عمر اس
اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶﴾
سے پہلے کیا پھر تم نہیں سوچتے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چالیس سالہ زندگی سچائی کی دلیل ہے:

یعنی جو خدا چاہتا ہے وہ ہی میں تمہارے سامنے پڑھتا ہوں اور جتنا وہ چاہتا ہے میرے ذریعہ سے تم کو خبردار کرتا ہے۔ اگر وہ اس کے خلاف چاہتا تو میری کیا طاقت تھی کہ خود اپنی طرف سے ایک کلام بنا کر اس کی طرف منسوب کر دیتا۔ آخر میری عمر کے چالیس سال تمہاری آنکھوں کے سامنے گزرے، اس قدر طویل مدت میں تم کو میرے حالات کے متعلق ہر قسم کا تجربہ ہو چکا۔ میرا صدق وعفاف، امانت و دیانت وغیرہ اخلاق حسنہ تم میں ضرب المثل رہے۔ میرا اُمی ہونا اور کسی ظاہری معلم کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہ کرنا ایک معروف و مسلم واقعہ ہے۔ پھر چالیس برس تک جس نے نہ کوئی قصیدہ لکھا ہو، نہ مشاعروں میں شریک ہوا ہو، نہ کبھی کتاب کھولی ہو نہ قلم ہاتھ میں لیا ہو، نہ کسی درسگاہ میں بیٹھا ہو دفعۃً ایسا کلام بنا لائے جو اپنی فصاحت و بلاغت، شوکت و جزالت، جدتِ اسلوب اور سلاست وروانی سے جن وانس کو عاجز کر دے، اس کے علوم وحقائق کے سامنے تمام دنیا کے معارف ماند پڑ جائیں۔ ایسا مکمل اور عالمگیر قانون ہدایت نوع انسان کے ہاتھوں میں پہنچائے جس کے آگے سب پچھلے قانون ردی ہو جائیں بڑی بڑی قوموں اور ملکوں کے مردہ قالب میں روح تازہ پھونک کر ابدی حیات اور نئی زندگی کا سامان بہم پہنچائے۔ یہ بات کس کی سمجھ میں آ سکتی ہے۔ تم کو سوچنا چاہئے کہ جس پاک سرشت انسان نے چالیس برس تک کسی انسان پر جھوٹ نہ لگایا ہو، کیا وہ ایک دم ایسی جسارت کر سکتا ہے کہ معاذ اللہ خداوند قدوس پر جھوٹ باندھنے اور افتراء کرنے لگے؟ ناچار ماننا پڑے گا کہ جو کلام الٰہی تم کو سناتا ہوں اس کے بنانے یا پہنچانے میں مجھے اصلاً اختیار نہیں۔ خدا جو کچھ چاہتا ہے میری زبان سے تم کو سناتا ہے۔ ایک

نقطہ یا زیر زبر تبدیل کرنے کا کسی مخلوق کو حق حاصل نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

کھرے کھوٹے کی پہچان کا اصول:

قرآن کریم کی اس دلیل نے صرف قرآن کے کلام حق ہونے پر ہی مکمل ثبوت پیش نہیں کیا بلکہ عام معاملات میں کھرے کھوٹے اور حق و باطل کی پہچان کا ایک اصول بھی بتا دیا کہ کسی شخص کو کوئی عہدہ یا منصب سپرد کرنا ہو تو اس کی قابلیت اور صلاحیت کو جانچنے کا بہترین اصول یہ ہے کہ اس کی پچھلی زندگی کا جائزہ لیا جائے، اگر اس میں صدق و امانت داری موجود ہے تو آئندہ بھی اس کی توقع کی جا سکتی ہے، اور اگر پچھلی زندگی میں اس کی دیانت و امانت اور صدق و سچائی کی شہادت موجود نہیں تو آئندہ کے لئے محض اس کے کہنے اور دعویٰ کی وجہ سے اس پر اعتماد کرنا کوئی دانشمندی نہیں، آج عہدوں کی تقسیم اور ذمہ داریوں کی سپردگی میں جس قدر غلطیاں اور ان کی وجہ سے عظیم مفاسد پیدا ہو رہے ہیں۔ ان سب کی اصلی وجہ اسی اصول فطرت کو چھوڑ کر رسمی چیزوں کے پیچھے پڑ جانا ہے۔ (معارف مفتی اعظم)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک:

بغویؒ نے لکھا ہے کہ اول روایت (یعنی ۶۳ سال کی عمر میں وفات ہونا اور نبوت کے بعد مکہ میں ۱۳ سال قیام پذیر رہنا، زیادہ مشہور بھی ہے اور واضح بھی۔ مسلم نے حضرت انسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ۶۳ سال کی عمر میں ہوئی اور حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کی بھی یہی عمر ہوئی۔

ابوداؤد طیالسیؒ اور مسلم نے معاویہ بن ابی سفیان کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کی وفات ۶۳ سال کی عمر میں ہوئی۔ شیخین نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ۶۳ سال کی عمر میں ہوئی۔ نووی نے اسی کو صحیح مشہور اور علماء کا متفق علیہ قول قرار دیا ہے۔

احمد اور مسلم نے لکھا ہے کہ عمار بن ابی عمار نے بیان کیا میں نے حضرت ابن عباسؓ سے دریافت کیا وفات کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا عمر تھی۔ فرمایا کیا تم گنتی لگا لوگے۔ میں نے عرض کیا جی ہاں۔ فرمایا چالیس۔ جس میں بعثت ہوئی پندرہ تک مکہ میں امن و خوف کی حالت میں قیام رکھا اور دس ہجرت کے بعد مدینہ میں گزارے۔ (تفسیر مظہری)

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ
پھر اس سے بڑا ظالم کون جو باندھے اللہ پر
كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ
بہتان یا جھٹلائے اس کی آیتوں کو بیشک بھلا نہیں

الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۷﴾
ہوتا گنہگاروں کا

ظالم کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا:

یعنی گنہگاروں اور مجرموں کو حقیقی کامیابی اور بھلائی حاصل نہیں ہوسکتی۔ اب تم خود فیصلہ کرلو کہ ظالم و مجرم کون ہے اگر (بفرض محال) میں جھوٹ بنا کر خدا کی طرف منسوب کرتا ہوں تو مجھ سا ظالم کوئی نہیں ہوسکتا۔ لیکن گزشتہ آیت میں جو دلیل بیان کی گئی، اس سے ثابت ہو چکا کہ یہ احتمال بالکل باطل ہے۔ پس جب میرا سچا ہونا ثابت ہے اور تم جہل یا عناد سے خدا کے کلام کو جھٹلا رہے ہو تو اب زمین کے پردہ پر تم سے بڑا ظالم کوئی نہیں ہوسکتا۔ (تفسیر عثمانی)

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ
اور پرستش کرتے ہیں اللہ کے سوا اس چیز کی جو
وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَاۗءِ شُفَعَاۗؤُنَا
نہ نقصان پہنچا سکے ان کو نہ نفع اور کہتے ہیں یہ تو ہمارے سفارشی ہیں
عِنْدَ اللّٰهِ
اللہ کے پاس

خدا کے ساتھ مشرکوں کا معاملہ:

وہ معاملہ تو خدا اور پیغمبر کے ساتھ تھا۔ اب ان کی خدا پرستی کا حال سنئے کہ خدا کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جن کے قبضۂ قدرت میں نفع و ضرر کوئی نہیں۔ جب پوچھا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ بیشک بڑا خدا تو ایک ہے۔ جس نے آسمان زمین پیدا کئے، مگر ان اصنام (بتوں) وغیرہ کو خوش رکھنا اس لئے ضروری ہے کہ یہ سفارش کر کے بڑے خدا سے دنیا میں ہمارے اہم کام درست کرا دینگے اور اگر موت کے بعد دوسری زندگی کا سلسلہ ہوا تو وہاں بھی ہماری سفارش کرینگے۔ باقی چھوٹے موٹے کام جو خود ان کے حدود و اختیار میں ہیں ان کا تعلق تو صرف ان ہی سے ہے۔ بناء علیہ ہم کو ان کی عبادت کرنی چاہئے۔ (تفسیر عثمانی)

قُلْ اَتُنَبِّـــُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ
تو کہہ کیا تم اللہ کو بتلاتے ہو جو اس کو معلوم نہیں آسمانوں میں
وَلَا فِي الْاَرْضِ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا
اور نہ زمین میں وہ پاک ہے اور برتر ہے اس سے جس کو

يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۸﴾

شریک کرتے ہیں

بُت نہ سفارش کر سکتے ہیں اور نہ معبود ہیں:

یعنی بتوں کا شفیع ہونا اور شفیع کا مستحق عبادت ہونا دونوں دعوے غلط اور بے اصل ہیں اور ظاہر ہے کہ خدا کے علم میں وہ ہی چیز ہوگی جو واقعی ہو۔ لہٰذا تعلیم الٰہی کے خلاف ان غیر واقعی اور خود تراشیدہ اصول کو حق بجانب ثابت کرنا۔ گویا خدا تعالیٰ کو ایسی چیزوں کے واقعی ہونے کی خبر دینا ہے جن کا وقوع آسمان وزمین میں کہیں بھی اسے معلوم نہیں۔ یعنی کہیں ان کا وجود نہیں۔ ہوتا تو اس کے علم میں ضرور ہوتا۔ پھر اس سے منع کیوں کرتا۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً

اور لوگ جو ہیں سو ایک ہی امت ہیں پیچھے جدا جدا ہو گئے،

فَاخْتَلَفُوْا ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ

اور اگر نہ ایک بات پہلے ہو چکتی تیرے رب کی

لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۹﴾

تو فیصلہ ہو جاتا ان میں جس بات میں کہ اختلاف کر رہے ہیں

کسی دین میں شرک جائز نہیں ہے:

ممکن تھا مشرکین کہتے کہ خدا نے تمہارے دین میں منع کیا ہوگا ہمارے دین میں منع نہیں کیا۔ اس کا جواب دیدیا کہ اللہ کا دین ہمیشہ سے ایک ہے۔ اعتقادات حقہ میں کوئی فرق نہیں۔ درمیان میں جب لوگ بہک کر جدا جدا ہو گئے۔ خدا نے ان کے سمجھانے اور دین حق پر لانے کو انبیاء بھیجے۔ کسی زمانہ اور کسی ملت میں خدا نے شرک کو جائز نہیں رکھا۔ باقی لوگوں کے باہمی اختلافات کو زبردستی اس لئے نہیں مٹایا گیا کہ پہلے سے خدا کے علم میں یہ بات طے شدہ تھی کہ یہ دنیا دار العمل (موقع واردات) ہے۔ قطعی اور آخری فیصلہ کی جگہ نہیں۔ یہاں انسانوں کو کسب واختیار دے کر قدرے آزاد چھوڑا گیا ہے کہ وہ جو راہ عمل چاہیں اختیار کریں۔ اگر یہ بات پیشتر طے نہ ہو چکی ہوتی تو سارے اختلافات کا فیصلہ ایک دم کر دیا جاتا۔ (تفسیر عثمانی)

فیصلے کا دن قیامت ہے:

حسن نے کہا اللہ کا ازلی فیصلہ ہو چکا تھا کہ قیامت سے پہلے دنیا میں عذاب وثواب کی شکل میں ان کے اختلاف کا فیصلہ نہیں کیا جائے گا کہ دنیا میں ہی جنت یا دوزخ میں داخل کر دیا جائے بلکہ اللہ کی طرف سے جنت و دوزخ میں داخلہ کا وقت روزِ قیامت کو مقرر کر دیا گیا ہے۔ (تفسیر مظہری)

وَيَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ

اور کہتے ہیں کیوں نہ اتری اس پر ایک نشانی اسکے رب سے

فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا اِنِّيْ مَعَكُمْ

سو تو کہدے کہ غیب کی بات اللہ ہی جانے، سو منتظر رہو میں بھی

مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۲۰﴾

تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں

پیغمبر کیلئے فرمائشی نشان دکھانا ضروری نہیں:

یعنی جن نشانیوں کی وہ فرمائش کرتے تھے، ان میں سے کوئی نشانی کیوں نہ اتری؟ جواب کا حاصل یہ ہے کہ صداقت کے نشان پہلے بہتر دیکھ چکے ہو، فرمائشی نشان دکھلانا ضروری نہیں نہ چنداں مفید ہے۔ آئندہ جو خدا کی مصلحت ہوگی وہ نشان دکھلائے گا۔ اس کا علم خدا ہی کو ہے کہ مستقبل میں کس شان اور نوعیت کے نشان ظاہر کرے گا۔ سو تم منتظر رہو، ہم بھی انتظار کرتے ہیں۔ "موضح القرآن" میں ہے "یعنی اگر کہیں کہ ہم کاہے سے جانیں کہ تمہاری بات سچ ہے، فرمایا کہ آگے دیکھو حق تعالیٰ اس دین کو روشن کریگا اور مخالف ذلیل ہونگے برباد ہو جائیں گے سو ویسا ہی ہوا۔ سچ کی نشانی ایک بار کافی ہے اور ہر بار مخالف ذلیل ہوں تو فیصلہ ہو جائے۔ حالانکہ فیصلہ کا دن دنیا میں نہیں۔

وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْ بَعْدِ ضَرَّآءَ

اور جب چکھائیں ہم لوگوں کو مزا اپنی رحمت کا بعد ایک تکلیف کے

مَسَّتْهُمْ اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِيْٓ اٰيَاتِنَا ؕ قُلِ

جو ان کو پہنچی تھی اسی وقت بنانے لگیں حیلے ہماری قدرتوں میں، کہدے

اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا ؕ اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا

کہ اللہ سب سے جلد بنا سکتا ہے حیلے تحقیق ہمارے فرشتے لکھتے ہیں

تَمْكُرُوْنَ ﴿۲۱﴾

حیلہ بازی تمہاری

مشرکین کی حیلہ بازی:

اہل مکہ پر حق تعالیٰ نے سات سال کا قحط مسلط کیا۔ جب ہلاکت کے

قریب پہنچ گئے تو گھبرا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دعاء کی درخواست کی اور وعدہ کیا کہ یہ عذاب اٹھ جائے تو ہم ایمان لے آئیں گے۔ آپ کی دعاء سے خدا نے سماں کر دیا، قحط کی بلاء دور ہوئی۔ تو پھر وہی شرارتیں کرنے لگے، خدا کی آیتوں کو جھٹلاتے اور اس کی قدرت ورحمت پر نظر نہ رکھتے۔ بلکہ انعامات الٰہیہ کو ظاہری اسباب وحیل اور محض بے اصل خیالات واوہام کی طرف نسبت کرنے لگتے۔ اس کا جواب دیا کہ اچھا تم خوب مکروفریب اور حیلہ بازی کرلو۔ مگر یہ یاد رہے کہ تمہاری حیلہ بازیاں ایک ایک کرکے لکھی جارہی ہیں۔ وہ سارا دفتر قیامت کے دن تمہارے سامنے رکھ دیا جائے گا۔ پھر جب تمہاری کوئی حیلہ بازی فرشتوں سے مخفی نہیں، خدا کے علم محیط سے کہاں باہر رہ سکتی ہے۔ تم اپنے مکروحیلہ سازی پر مغرور ہو، حالانکہ خدا کا جوابی مکر (تدبیر خفی) تمہارے مکر وتدبیر سے کہیں تیز اور سریع الاثر ہے۔ وہ مجرم کی باگ اتنی ڈھیلی چھوڑ دیتا ہے کہ مجرم کو نشۂ غفلت میں چور ہوکر سزا کا تصور بھی نہیں آتا۔ جب پیمانۂ شقاوت لبریز ہوجاتا ہے تو دفعۃً پکڑ کر ٹینٹوا دبا دیتا ہے۔ لہٰذا عاقل کو چاہئے کہ خدا کی نرمی، بردباری اور خوش کن حالات کو دیکھ کر مغرور نہ ہو، نہ معلوم نرمی کے بعد کیسی سختی آنے والی ہے۔ جیسے آگے بحری سفر کی مثال میں بیان فرمایا۔ حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ "سختی کے وقت آدمی کی نظر اسباب سے اٹھ کر صرف اللہ پر رہتی ہے" جہاں سخت گھڑی گزری اور کام بن گیا پھر خدا کو بھول کر اسباب پر آرہتا ہے۔ ڈرتا نہیں کہ خدا پھر ویسی ہی تکلیف اور سختی کا ایک سبب کھڑا کردے۔ اسی کے ہاتھ میں سب اسباب کی باگ ہے چنانچہ آگے دریائی سفر کی مثال میں اس کی ایک صورت بیان فرمائی۔ (تفسیر عثمانیؒ)

وہ اعمال جن کا بدلہ جلدی مل جاتا ہے:

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کہ اللہ تعالیٰ صلہ رحمی اور لوگوں پر احسان کرنے کا بدلہ بھی جلد دیتا ہے (کہ آخرت سے پہلے دنیا میں اس کی برکات نظر آنے لگتی ہیں) اور ظلم اور قطع رحمی کا بدلہ بھی جلد دیتا ہے (کہ دنیا میں بھگتنا پڑتا ہے) (رواہ الترمذی وابن ماجہ بسند حسن) اور ایک حدیث میں بروایت حضرت عائشہؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین گناہ ایسے ہیں کہ ان کا وبال اپنے کرنے والے ہی پر پڑتا ہے ظلم، بدعہدی، اور دھوکہ فریب (رواہ ابوالشیخ وابن مردویہ فی التفسیر) (معارف القرآن از مظہریؒ)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بددُعاء:

بخاری کی روایت میں آیا ہے کہ کافروں کی بے رخی اور روگردانی دیکھ کر رسول اللہ نے بددعا کی اور فرمایا اے اللہ! یوسفؑ کے سات سالوں کی طرح ان کو ہفت سالہ قحط میں مبتلا کرکے میری مدد فرما، بددعا کے نتیجہ میں اہل مکہ پر قحط مسلط ہوگیا کہ ہر چیز (یعنی کھیتی سبزی پھل وغیرہ) تباہ ہوگئی کھالیں اور مردار جانور تک کھانے کی نوبت آگئی۔ ابوسفیان نے خدمت گرامی میں حاضر ہوکر عرض کیا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری قوم والے ہلاک ہوگئے۔ تم اللہ کی اطاعت اور صلۃ الرحم (قرابتداروں سے حسن سلوک) کا ہم کو حکم دیتے ہو اللہ سے ان کے لئے دعا کردو کہ خدا ان کی مصیبت کو دور کردے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمادی۔

اللہ تعالیٰ کی تدبیر ہی کامیاب ہے:

بعض لوگوں نے سرعت مکر کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ حق کو دفع کرنے کی جو تدبیریں کافر کرتے ہیں ان سے زیادہ سرعت کے ساتھ اللہ ان کو ہلاک کر دینے کی تدبیر کر دیتا ہے۔ اللہ کا عذاب ان پر بہت جلد آجاتا ہے۔ اللہ چونکہ قدرت رکھتا ہے اس لئے وہ جو کچھ چاہتا ہے وہ ضرور آکر رہتا ہے اور کافر دفع حق کی قدرت نہیں رکھتے۔ (تفسیر مظہریؒ)

هُوَ الَّذِىْ يُسَيِّرُكُمْ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ حَتّٰٓى اِذَا

وہی تم کو پھراتا ہے جنگل اور دریا میں یہاں تک کہ

كُنْتُمْ فِى الْفُلْكِ ۚ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ

جب تم بیٹھے کشتیوں میں اور لے کر چلیں وہ لوگوں کو

طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَاۗءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ

اچھی ہوا سے اور خوش ہوئے اس سے، آئی کشتیوں پر ہوا تند

وَّجَاۗءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْٓا

اور آئی ان پر موج ہر جگہ سے اور جان لیا انہوں نے کہ وہ گھر گئے

اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ

پکارنے لگے اللہ کو خالص ہوکر اس کی بندگی میں

لَهُ الدِّيْنَ ڬ لَىِٕنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ

اگر تو نے بچالیا ہم کو اس سے تو بیشک ہم رہیں گے

مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿٢٢﴾ فَلَمَّآ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ

شکر گذار پھر جب بچادیا ان کو اللہ نے لگے شرارت کرنے

فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ

اسی وقت زمین میں ناحق کی

مشرکین کی موقع پرستی:

یعنی ابتداء میں ہوا خوشگوار اور موافق تھی۔ مسافر ہنستے کھیلتے آرام سے چلے جا رہے تھے کہ یکا یک ایک زور کا طوفانی جھکڑ چلنے لگا اور چاروں طرف سے پانی کے پہاڑ اٹھ کر کشتی (یا جہاز) سے ٹکرانے لگے۔ جب سمجھ لیا کہ ہر طرف سے موت کے منہ میں گھرے ہوئے ہیں، بھاگنے اور نکلنے کی سبیل نہیں، تو سارے فرضی معبودوں کو چھوڑ کر خدائے واحد کو پکارنے لگے جو اصل فطرت انسانی کا تقاضا تھا، ہر چیز سے مایوس ہو کر خالص خدا کی بندگی اختیار کی اور بڑے پکے عہد و پیمان باندھے کہ اگر اس مصیبت سے خدا نے نجات دی تو ہمیشہ اس کے شکر گزار رہیں گے۔ کوئی بات کفرانِ نعمت کی نہ کرینگے لیکن جہاں ذرا امن نصیب ہوا ساحل پر قدم رکھتے ہی شرارتیں اور ملک میں اودھم مچانا شروع کر دیا، تھوڑی دیر بھی عہد پر قائم نہ رہے۔ (تنبیہ) اس آیت میں ان مدعیانِ اسلام کے لئے بڑی عبرت ہے جو جہاز کے طوفان میں گھر جانے کے وقت بھی خدائے واحد کو چھوڑ کر غیر اللہ کو مدد کے لئے پکارتے ہیں۔

حضرت عکرمہ کا مسلمان ہونا:

فتح مکہ کے بعد ابوجہل کا بیٹا عکرمہ مسلمان نہ ہوا تھا۔ مکہ سے بھاگ کر بحری سفر اختیار کیا، تھوڑی دور جا کر کشتی کو طوفانی ہواؤں نے گھیر لیا، ناخدا نے مسافروں سے کہا کہ ایک خدا کو پکارو۔ یہاں تمہارے معبود کچھ کام نہ دینگے۔ عکرمہ نے کہا کہ یہ ہی تو وہ خدا ہے جس کی طرف محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم کو بلاتے ہیں۔ اگر دریا میں رب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بدون نجات نہیں مل سکتی تو خشکی میں بھی اس کی دستگیری اور اعانت کے بغیر نجات پانا محال ہے۔ اے خدا! اگر تو نے اس مصیبت سے نکال دیا تو میں واپس ہو کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہاتھ میں ہاتھ دونگا۔ مجھے امید ہے کہ وہ اپنے اخلاق کریمہ سے میری تقصیرات کو معاف فرمائینگے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف باسلام ہوئے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ (تفسیر عثانیؒ)

يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلَىٰ أَنفُسِكُم مَّتَاعَ

سنو لوگو تمہاری شرارت ہے تمہی پر نفع اٹھالو

الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُم

دنیا کی زندگانی کا پھر ہمارے پاس ہے تم کو لوٹ کر آنا پھر ہم بتلا دینگے

بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۲۳﴾

جو کچھ کہ تم کرتے تھے

تمہیں اپنی شرارتیں لے ڈوبیں گی:

یعنی تمہاری شرارت کا وبال تمہیں پر پڑے گا۔ اگر چند روز شرارتیں کر کے فرض کرو کچھ دنیا کا نفع حاصل کر ہی لیا تو انجام کار پھر خدا کی طرف لوٹنا ہے۔ وہاں تمہارا سب کیا دھرا آگے آئے گا۔ خداوند رب العزت سزا دے کر بتلا دے گا کہ تمہارے کرتوت کیسے تھے۔ (تفسیر عثانیؒ)

لوٹ پڑنے والی چیزیں:

ابو الشیخ خطیب اور ابن مردویہ نے تفسیر میں حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، یہ تین چیزیں اپنے کرنے والے پر ہی لوٹ پڑتی ہیں، ظلم، فریب، دغا۔

ابن ابی الی نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اگر پہاڑ پہاڑ پر ظلم کرے تو ظلم کرنے والا (پہاڑ) پھٹ کر ٹکڑے ہو جائے گا۔ (تفسیر مظہری)

اللہ تعالیٰ کے وجود کی دلیل:

امام جعفر صادقؒ سے کسی نے سوال کیا کہ میرے لئے اثبات صانع کی کوئی دلیل ذکر کیجئے۔ تو فرمایا کہ بتلاتو کیا پیشہ کرتا ہے۔ اس نے کہا میں بحری تجارت کرتا ہوں۔ کشتیوں پر سامان لادتا ہوں اور لے جاتا ہوں۔ فرمایا کبھی ایسی صورت بھی پیش آئی ہے کہ کشتی ٹوٹ گئی ہو اور تو ایک تختہ پر بیٹھا رہ گیا ہو اور ہر طرف سے تیز ہوائیں آ رہی ہوں۔ اس نے کہا ہاں ایک مرتبہ ایسا بھی پیش آیا ہے تو امام جعفرؒ نے کہا اس وقت تو نے کیا کیا۔ اس نے کہا گریہ وزاری کی اور دعا مانگی۔ امام جعفرؒ نے فرمایا، پس تیرا خدا وہ ہے جس سے تو اس وقت دعا مانگ رہا تھا۔ (دیکھو تفسیر کبیر صفحہ ۵۷۶ ج ۴) (معارف کاندھلویؒ)

مؤمن اور کافر بندے:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن صبح کی نماز پڑھائی وہ برسات کی رات تھی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے لگے کیا تم جانتے ہو کہ آج کی رات خدا تعالیٰ نے کیا فرمایا ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا، خدا اور خدا کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ تو فرمایا کہ خدا ارشاد فرماتا ہے کہ آج میرے مومن بندے بھی صبح اٹھے اور کافر بندے بھی لیکن جس نے یہ کہا کہ یہ بارش خدا کے فضل اور رحمت کے سبب ہے تو وہ مجھ پر ایمان لایا ہوا ہے اور ستاروں کے اثرات کا منکر ہے اور جو یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ یہ بارش نچھتروں کے سبب ہوتی ہے تو وہ مجھ سے تو کفر کر رہا ہے اور نچھتروں پر ایمان لا رہا ہے۔ کہہ دو! اے پیغمبر! میری حکمت عملی بڑی کارگر ہوتی ہے ایسے مجرم گمان کرتے ہیں کہ ہم کو کوئی عذاب کفر کی بنا پر نہیں دیا لیکن در حقیقت ان کے ساتھ ڈھیل روا رکھی گئی ہے۔ اور جب وہ اپنی انتہائی غفلت میں

ہو جائیں گے تو ایک دم سے دھر لئے جائیں گے۔ ہمارے فرشتے ان کے اعمال لکھ رہے ہیں پھر وہ عالم الغیب کے پاس پیش کر دیئے جاتے ہیں پھر وہ ہر بڑے اور چھوٹے گناہ کی سزا پاتے ہیں۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ

دنیا کی زندگانی کی وہی مثل ہے جیسے ہم نے پانی اتارا

مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ

آسمان سے پھر رلا ملا نکلا اس سے سبزہ زمین کا

مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ ؕ

جو کہ کھائیں آدمی اور جانور

دُنیاوی زندگی کی مثال:

بعض نے فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ کے معنی کثرت پیداوار کے لئے ہیں۔ کیونکہ جب زمین کی پیداوار زیادہ قوی ہوتی ہے تو گنجان ہو کر ایک جزو دوسرے سے مل جاتا اور لپٹ جاتا ہے۔ بعض نے "بہ" کی "باء" کو مصاحبت کے لئے لے کر یہ معنی کئے ہیں کہ زمین کا سبزہ پانی کے ساتھ رل مل جاتا ہے کیونکہ نباتات اجزائے مائیہ کو اپنے اندر جذب کرتے ہیں، جس طرح کھانا انسان کا جزوِ بدن بنتا ہے۔ ایسے ہی پانی، گویا نباتات کی غذا بنتی ہے۔ مترجم رحمہ اللہ کے صنیع سے مترشح ہوتا ہے کہ اختلاط سے یہ مراد لے رہے ہیں کہ زمین اور پانی کے ملنے سے سوسبزہ نکلتا ہے اس میں آدمی کی اور جانوروں کی خوراک مخلوط (رلی ملی) ہوتی ہے۔ مثلاً گیہوں کے درخت میں دانہ ہے جو انسان کی غذا بنتی ہے اور بھوسہ بھی ہے جو جانوروں کی خوراک ہے۔ اسی طرح درختوں میں پھل اور پتے لگتے ہیں جن میں سے ہر ایک کے کھانے والے علیحدہ ہیں۔ (تفسیر عثمانیؒ)

حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ

یہاں تک کہ جب پکڑی زمین نے رونق اور مزین ہوگئی

وَظَنَّ اَهْلُهَاۤ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَاۤ

اور خیال کیا زمین والوں نے کہ یہ ہمارے ہاتھ لگے گی

کھیتی تیار ہوگئی:

یعنی مختلف الوان واشکال کی نباتات میں زمین کو پر رونق اور مزین کر دیا اور کھیتی وغیرہ ایسی تیار ہوگئی کہ مالکوں کو کامل بھروسہ ہوگیا کہ اب اس سے پورا فائدہ اٹھانے کا وقت آ گیا ہے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

اَتٰىهَاۤ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا

ناگاہ پہنچا اس پر ہمارا حکم رات کو یا دن کو پھر کر ڈالا اس کو کاٹ کر ڈھیر گویا کل

كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ

یہاں نہ تھی آبادی اسی طرح ہم کھول کر بیان کرتے ہیں نشانیوں کو

الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾

ان لوگوں کے سامنے جو غور کرتے ہیں

پھر اچانک آفت نے انہیں کو ختم کر دیا:

یعنی ناگہاں خدا کے حکم سے دن میں یا رات میں کوئی آفت پہنچتی (مثلاً بگولا آ گیا، یا اولے پڑ گئے یا ٹڈی دل پہنچ گیا۔ وعلیٰ ہذا القیاس) اس نے تمام زراعت کا ایسا صفایا کر ڈالا، گویا کبھی یہاں ایک تنکا بھی نہ اگا تھا۔ ٹھیک اسی طرح حیات دنیا کی مثال سمجھ لو کہ خواہ کتنی ہی حسین اور تروتازہ نظر آئے، حتیٰ کہ بیوقوف لوگ اس کی رونق و دلربائی پر مفتون ہو کر اصل حقیقت کو فراموش کر دیں لیکن اس کی یہ شادابی اور زینت و بہجت محض چند روزہ ہے جو بہت جلد زوال و فناء کے ہاتھوں نسیاً منسیا ہو جائے گی۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اس مثال کو نہایت لطیف طرز میں خاص انسانی حیات پر منطبق کیا ہے۔ یعنی پانی کی طرح روح آسمان (عالم بالا) سے آئی، کالبد خاکی میں مل کر قوت پکڑی، دونوں کے ملنے سے آدمی بنا، پھر کام کئے انسانی اور حیوانی دونوں طرح کے۔ جب ہر ہنر میں پورا ہوا اور اس کے متعلقین کو اس پر بھروسہ ہو گیا، ناگہاں موت آ پہنچی جس نے ایک دم میں سارا بنا بنایا کھیل ختم کر دیا۔ پھر ایسا بے نام ونشان ہوا گویا کبھی زمین پر آباد ہی نہ ہوا تھا (فائدہ) لیلاً او نھاراً (رات کو یا دن کو) شاید اس لئے فرمایا کہ رات کا وقت غفلت کا ہے اور دن میں لوگ عموماً بیدار ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب خدا کا حکم آ پہنچے، پھر سوتا ہو یا جاگتا، غافل ہو یا بیدار، کوئی شخص کسی حالت میں اس کو روک نہیں سکتا۔ (تفسیر عثمانیؒ)

وَاللّٰهُ يَدْعُوْۤا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ؕ وَيَهْدِىْ مَنْ

اور اللہ بلاتا ہے سلامتی کے گھر کی طرف اور دکھلاتا ہے

يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۵﴾

جس کو چاہے راستہ سیدھا

جنت کی طرف آؤ:

یعنی دنیا کی زائل وفانی زندگی پر مت ریجھو۔ دارالسلام (جنت) کی طرف

آؤ۔ خدا تم کو سلامتی کے گھر کی طرف بلا رہا ہے اور وہاں تک پہنچنے کا راستہ بھی دکھلا تا رہا ہے۔ وہ ہی گھر ہے جہاں کے رہنے والے ہر قسم کے رنج و غم، پریشانی، تکلیف، نقصان، آفت اور فنا و زوال وغیرہ سے صحیح و سالم رہیں گے۔ فرشتے ان کو سلام کرینگے۔ خود رب العزت کی طرف سے تحفۂ سلام پہنچے گا۔ (تفسیر عثمانیؒ)

جنت کو دار السلام کہنے کی وجہ:

دار السلام سے مراد جنت ہے، اس کو دار السلام کہنے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس میں ہر طرح کی سلامتی اور امن و سکون ہر شخص کو حاصل ہوگا، دوسری وجہ بعض روایات میں ہے کہ جنت کا نام دار السلام اس لئے بھی رکھا گیا ہے کہ اس میں بسنے والوں کو ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیز فرشتوں کی طرف سے سلام پہنچتا رہے گا، بلکہ لفظ سلام اہلِ جنت کی اصطلاح ہوگی، جس کے ذریعہ وہ اپنی خواہشات کا اظہار کرینگے اور فرشتے ان کو مہیا کرینگے، جیسا کہ اس سے پہلی آیات میں گزر چکا ہے۔

حضرت یحییٰ بن معاذؒ کا خطاب:

حضرت یحییٰ بن معاذؒ نے اس آیت کی تفسیر میں بطور نصیحت عوام کو خطاب کر کے فرمایا کہ اے آدم کے بیٹے! تجھ کو اللہ تعالیٰ نے دار السلام کی طرف بلایا، تو اس دعوتِ الٰہیہ کی طرف کب اور کہاں سے قدم اٹھائے گا، خوب سمجھ لے کہ اس دعوت کو قبول کرنے کے لئے اگر تو نے دنیا ہی سے کوشش شروع کر دی تو وہ کامیاب ہوگی اور تو دار السلام میں پہنچ جائے گا اور اگر تو نے اس دنیا کی عمر کو ضائع کرنے کے بعد یہ چاہا کہ قبر میں پہنچ کر اس دعوت کی طرف چلونگا تو تیرا راستہ روک دیا جائے گا، تو وہاں ایک قدم آگے نہ بڑھ سکے گا، کیونکہ وہ دار العمل نہیں۔

کسی گھر کا نام دار السلام رکھنا:

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ دار السلام جنت کے سات ناموں میں سے ایک نام ہے۔ (تفسیر قرطبی)

اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں کسی گھر کا نام دار السلام رکھنا مناسب نہیں، جیسے جنت یا فردوس وغیرہ نام رکھنا بھی درست نہیں۔

توفیق اللہ دیتا ہے:

اس کے بعد آیتِ مذکورہ میں ارشاد فرمایا،

وَيَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

یعنی پہنچا دیتا ہے اللہ تعالیٰ جس کو چاہے سیدھے راستہ پر۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دار السلام کی دعوت تو سارے انسانوں کے لئے عام ہے اور اسی معنی کے اعتبار سے سب کے لئے ہدایت عام ہے لیکن ہدایت کی خاص قسم کہ سیدھے راستہ پر کھڑا کر دیا جائے اور چلنے کی توفیق دی جائے یہ خاص خاص ہی لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال:

حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سو رہے تھے کچھ فرشتے آئے اور آپس میں کہنے لگے، تمہارے اس ساتھی کی ایک خاص حالت ہے۔ مثال دے کر اس کی حالت بیان کرو۔ کسی فرشتے نے کہا، یہ سو رہا ہے۔ دوسرے نے کہا اس کی آنکھ سو رہی ہے دل بیدار ہے۔ پھر فرشتوں نے کہا اس کی حالت ایسی ہے جیسے کسی شخص نے کوئی مکان بنایا، اور (مہمانوں کو کھلانے کے لئے) دستر خوان بچھایا اور لوگوں کو بلانے کے لئے ایک آدمی کو بھیجا جن لوگوں نے دعوت قبول کر لی وہ اس کے گھر میں آ گئے اور دستر خوان پر کچھ کھا لیا اور جس نے دعوت قبول نہیں کی وہ گھر کے اندر نہیں آیا اور نہ دستر خوان سے کچھ کھایا (دوسرے فرشتوں نے کہا، اس مثال کی تشریح کرو تا کہ یہ شخص سمجھ جائے ایک فرشتے نے کہا، یہ سو رہا ہے، دوسرے نے کہا اس کی آنکھ سو رہی ہے، دل بیدار ہے۔ فرشتوں نے کہا اس کی تشریح یہ ہے کہ) مکان جنت ہے اور لوگوں کو بلانے والا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کہا مانا، اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ لوگوں کے مختلف فرقے ہیں۔ (رواہ البخاری)

دارمی نے حضرت ربیعہ جرشی کی روایت سے بھی یہ حدیث نقل کی ہے لیکن اس روایت کے یہ الفاظ ہیں، مجھ سے کہا گیا (قوم کے) سردار نے ایک مکان بنایا اور دستر خوان تیار کیا اور ایک آدمی کو (عام لوگوں کے کھانے کے لئے) بلانے کے لئے بھیجا۔ پس جس شخص نے دعوت قبول کر لی وہ گھر کے اندر آ گیا اور دستر خوان پر اس نے (کھانا) کھا لیا اور (میزبان) سردار اس سے خوش ہو گیا اور جس نے دعوت قبول نہیں کی وہ گھر کے اندر نہیں آیا۔ اس نے دستر خوان سے کچھ نہیں کھایا اور سردار اس سے ناخوش ہو گیا۔ فرمایا پس اللہ سردار ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم بلانے والا ہے اور مکان اسلام ہے اور دستر خوان جنت ہے۔

صراطِ مستقیم:

امام قرطبی فرماتے ہیں کہ صراطِ مستقیم سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو بکرؓ و عمرؓ کا طریقہ اور راستہ مراد ہے۔ (دیکھو تفسیر قرطبی ص ۳۲۹ جلد ۸)

خلافِ پیمبر کسے رہ گزید ۔۔۔ کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

(معارف القرآن)

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ
جنہوں نے کی بھلائی ان کیلئے ہے بھلائی اور زیادتی

بھلائی اور زیادتی:

بھلے کام کرنے والوں کو وہاں بھلی جگہ ملے گی (یعنی جنت) اور اس سے

زیادہ بھی کچھ ملے گا۔ یعنی حق تعالیٰ کی رضاء اور اس کا دیدار۔ ''زیادۃ'' کی تفسیر ''دیدار مبارک'' سے کئی احادیث صحیحہ میں وارد ہوئی ہے اور بہت سے صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم سے منقول ہے۔ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی اور فرمایا کہ جب جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں داخل ہوچکیں گے تو ایک پکارنے والا پکارے گا، ''اے اہل جنت! تمہارے لئے ایک وعدہ خدا کا باقی ہے جواب پورا کرنا چاہتا ہے۔ جنتی کہیں گے کہ وہ کیا ہے؟ کیا خدا نے اپنے فضل سے ہماری حسنات کا پلہ بھاری نہیں کر دیا۔ کیا اس نے ہمارے چہروں کو سفید اور نورانی نہیں بنایا؟ کیا اس نے ہم کو دوزخ سے بچا کر جنت جیسے مقام میں نہیں پہنچایا؟ (یہ سب کچھ تو ہو چکا، آگے کونسی چیز باقی رہی، اس پر حجاب اٹھا دیا جائے گا۔ اور جنتی حق تعالیٰ کی طرف نظر کرلیں گے۔ پس خدا کی قسم کوئی نعمت جو ان کو عطا ہوئی ہے دولتِ دیدار سے زیادہ محبوب نہ ہوگی نہ اس سے بڑھ کر کوئی چیز ان کی آنکھیں ٹھنڈی کر سکے گی۔ رزقنا اللّٰہ سبحانہ و تعالیٰ بمنہ و فضلہ. (تفسیر عثمانیؒ)

ابن جریر اور ابن مردویہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کی روایت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یہی نقل کیا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، قیامت کے دن اللہ ایک منادی مقرر فرمائے گا، جو اتنی آواز سے ندا کرے گا کہ اگلے پچھلے سب سن لیں گے۔ اے اہلِ جنت! اللہ نے تم سے اچھے ثواب کا وعدہ کیا تھا اور زیارت کا بھی۔ اچھا ثواب جنت ہے اور مزید (انعام) رحمٰن کا دیدار حاصل ہونا۔

سب سے بڑی نعمت:

صحیح مسلم میں حضرت صہیبؓ کی روایت سے منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اہلِ جنت جنت میں داخل ہوچکیں گے تو حق تعالیٰ ان سے خطاب فرمائیں گے کہ کیا تمہیں کسی اور چیز کی ضرورت ہے؟ اگر ہو تو بتلاؤ ہم اس کو پورا کرینگے، اہلِ جنت جواب دینگے کہ آپ نے ہمارے چہرے روشن کئے، ہمیں جنت میں داخل فرمایا، جہنم سے نجات دی، اس سے زیادہ اور کیا چیز طلب کریں، اس وقت درمیان سے حجاب اٹھا دیا جائے گا اور سب اہلِ جنت حق تعالیٰ کی زیارت کرینگے''۔ تو معلوم ہوگا کہ جنت کی ساری نعمتوں سے بڑھ کر یہ نعمت تھی جس کی طرف ان کا دھیان بھی نہ گیا تھا، جو رب العالمین نے محض اپنے کرم سے بے مانگے عطا فرمائی، بقول مولانا رومیؒ ؎

ما نبودیم و تقاضہ ما نبود لطف تو نا گفتۂ ما می شنود

(معارف مفتی اعظمؒ)

وَلَا يَرْهَقُ وُجُوهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ ؕ اُولٰٓئِكَ

اور نہ چڑھے گی ان کے منہ پر سیاہی اور نہ رسوائی وہ ہیں

اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۶﴾

جنت والے وہ اسی میں رہا کریں گے

جنتیوں کے چہرے: یعنی عرصاتِ محشر میں جس طرح کفار فجار کے چہروں پر سخت ذلت و ظلمت چھائی ہوگی، جنتیوں کے چہرے اس کے خلاف ہونگے۔ سیاہی اور رسوائی کیسی وہاں تو نور ہی نور اور رونق ہوگی۔ (تفسیر عثمانیؒ)

وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍۢ بِمِثْلِهَا ۙ

اور جنہوں نے کمائیں برائیاں بدلہ ملے برائی کا اس کے برابر

یعنی بدی سے زائد نہ ہوگا۔ کم سزا دیں یا بعض برائیوں کو بالکل معاف کر دیں ان کو اختیار ہے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

صحابہ سب عادل تھے:

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اَلَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ سے وہ بدکار مراد ہوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھے۔ کیونکہ مؤمن جو رسول اللہ کے زمانہ میں تھے وہ سب صحابی تھے اور صحابہ کا عدول (غیر فاسق) ہونا بالاجماع ثابت ہے۔ اگر کسی صحابی سے کسی گناہ کا صدور ہو بھی جاتا تھا تو وہ فوراً توبہ کر لیتا تھا جس کی وجہ سے گناہ معاف ہوجاتا تھا گناہ سے توبہ کرنے والا بے گناہ کی طرح ہوجاتا ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ بدکار گناہ گار اس زمانہ میں صرف کافر تھے اور الذین کسبوا سے وہی لوگ مراد ہیں۔ (تفسیر مظہریؒ)

وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ

اور ڈھانک لے گی ان کو رسوائی کوئی نہیں ان کو اللہ سے

عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوهُهُمْ قِطَعًا

بچانے والا گویا کہ ڈھانک دیئے گئے ان کے چہرے اندھیری

مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا ؕ

رات کے ٹکڑوں سے

جہنمیوں کے چہرے:

یعنی ان کے چہرے اس قدر سیاہ و تاریک ہوں گے گویا اندھیری رات کی تہیں ان پر جمادی گئی ہیں (اعاذنا اللّٰہ منہا)

اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷﴾

وہ ہیں دوزخ والے وہ اسی میں رہا کریں گے

وَیَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِیْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا

اور جس دن جمع کریں گے ہم ان سب کو پھر کہیں گے شرک کرنے

مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَشُرَكَآؤُكُمْ

والوں کو کھڑے ہو اپنی اپنی جگہ تم اور تمہارے شریک

فرضی معبودوں کی بے بسی:

یعنی جن کو تم نے اپنے خیال میں خدا کا شریک ٹھہرا رکھا تھا، یا جن کو خدا کے بیٹے بیٹیاں کہتے تھے، مثلاً مسیح علیہ السلام جو نصاریٰ کے نزدیک "ابن اللہ" بلکہ عین اللہ" تھے یا "ملائکۃ اللہ" یا "احبار و رہبان" کہ انہیں بھی ایک حیثیت سے خدائی کا منصب دے رکھا تھا، یا اصنام و اوثان جن پر مشرکین مکہ نے خدائی کے اختیارات تقسیم کر رکھے تھے، سب کو حسب مراتب اپنی اپنی جگہ کھڑے ہونے کا حکم ہوگا۔

فَزَیَّلْنَا بَیْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَآؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ

پھر تڑا دیں گے ہم آپس میں انکو اور کہیں گے انکے شریک تم

اِیَّانَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۲۸﴾ فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِیْدًا بَیْنَنَا

ہماری تو بندگی نہ کرتے تھے سو اللہ کافی ہے شاہد ہمارے

وَبَیْنَكُمْ اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِیْنَ ﴿۲۹﴾

اور تمہارے بیچ میں ہم کو تمہاری بندگی کی خبر نہ تھی

یعنی اس وقت عجیب افراتفری اور نفسی نفسی ہوگی۔ عابدین و معبودین میں جدائی پڑ جائے گی اور دنیا میں اپنے اوہام و خیالات کے موافق جو رشتے جوڑ رکھے تھے، سب توڑ دیے جائیں گے اس ہولناک وقت میں جب کہ مشرکین کو اپنے فرضی معبودوں سے بہت کچھ توقعات تھیں، وہ صاف جواب دے دیں گے کہ تمہارا ہم سے کیا تعلق۔ تم جھوٹ بکتے ہو کہ ہماری بندگی کرتے تھے۔ (تم اپنے عقیدہ کے موافق جس چیز کو پوجتے تھے اس کے لئے وہ خدائی صفات تجویز کرتے تھے، جو فی الواقع اس میں موجود نہیں تھیں۔ تو حقیقت میں وہ عبادت اور بندگی واقعی "مسیح" یا "ملائکہ" کی نہ ہوئی اور نہ حقیقت میں بے جان مورتیوں کی پوجا تھی محض اپنے خیال اور وہم یا شیطان لعین کی پرستش کو فرشتے یا نبی یا نیک انسان یا کسی تصویر وغیرہ کے نامزد کر دیتے تھے) خدا گواہ ہے کہ ہماری رضاء یا اذن سے تم نے یہ حرکت نہیں کی۔ ہم کو کیا خبر تھی کہ انتہائی حماقت و سفاہت سے خدا کے مقابلہ میں ہمیں معبود بنا ڈالو گے۔ (تنبیہ) یہ گفتگو اگر حضرت "مسیح" وغیرہ ذوی العقول مخلوق کی طرف سے مانی جائے تو کوئی اشکال نہیں۔ اور "اصنام" (بتوں) کی جانب سے ہو تو کچھ بعید نہیں کہ حق تعالیٰ مشرکین کی انتہائی مایوسی اور حسرت ناک درماندگی کے اظہار کے لئے اپنی قدرت کاملہ سے پتھر کی مورتوں کو گویا کر دے۔" قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِیْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَیْءٍ " (حم السجدہ۔ رکوع ۳)

هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ وَرُدُّوْٓا

وہاں جانچ لے گا ہر کوئی جو اس نے پہلے کیا تھا اور رجوع کریں گے

اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا

اللہ کی طرف جو سچا مالک ہے انکا اور جاتا رہے گا انکے پاس سے جو

یَفْتَرُوْنَ ﴿۳۰﴾

جھوٹ باندھا کرتے تھے

سب توہمات ختم ہو جائیں گے:

یعنی جھوٹے اور بے اصل توہمات سب رفو چکر ہو جائیں گے۔ ہر شخص بہ رائ العین مشاہدہ کر لے گا کہ اس سچے مالک کے سواء رجوع کرنے کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ اور ہر ایک انسان کو اپنے تمام برے بھلے اعمال کا اندازہ ہو جائے گا کہ کتنا وزن رکھتے ہیں۔

قُلْ مَنْ یَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ

تو پوچھ کون روزی دیتا ہے تم کو آسمان سے اور زمین سے

سب کچھ اللہ نے دیا ہے:

آسمان کی طرف سے بارش اور حرارت شمس وغیرہ پہنچتی ہے اور زمینی مواد اس کے ساتھ ملتے ہیں تب انسان کی روزی مہیا ہوتی ہے۔

اَمَّنْ یَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ

یا کون مالک ہے کان اور آنکھوں کا

یعنی ایسے عجیب وغیرب محیر العقول طریقہ سے کس نے کان اور آنکھ پیدا کی۔ پھر ان کی حفاظت کا سامان کیا۔ کون ہے جو ان تمام قوائے انسانی کا حقیقی مالک ہے کہ جب چاہے عطا فرما دے اور جب چاہے چھین لے۔

وَمَنْ یُّخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَیُخْرِجُ الْمَیِّتَ

اور کون نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور نکالتا ہے مردہ

مِنَ الْحَیِّ

کو زندہ سے

مثلاً ''نطفہ'' یا ''بیضہ'' سے جاندار کو پھر جاندار سے نطفہ اور بیضہ کو نکالتا ہے۔ یا روحانی اور معنوی طور پر جو شخص یا قوم مردہ ہو چکی اس میں سے زندہ دل افراد پیدا کرتا ہے اور زندہ قوموں کے اخلاف پر ان کی بدبختی سے موت طاری کر دیتا ہے۔

وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ

اور کون تدبیر کرتا ہے کاموں کی

یعنی دنیا کے تمام کاموں کی تدبیر وانتظام کون کرتا ہے۔

فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۱﴾

سو بول اٹھیں گے کہ اللہ تو تو کہہ پھر ڈرتے نہیں ہو

فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ

سو یہ اللہ ہے رب تمہارا سچا پھر کیا رہ گیا سچ کے پیچھے

الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ﴿۳۲﴾

مگر بھٹکنا سو کہاں سے لوٹے جاتے ہو

مالک کا اقرار کرتے ہو اس کی عبادت کرو:

مشرکین کو بھی اعتراف تھا کہ یہ امور کلیہ اور عظیم الشان کام اللہ کے سوا کوئی نہیں کرسکتا۔ اس لئے فرمایا کہ جب اصلی خالق ومالک اور تمام عالم کا مدبر اسی کو مانتے ہو، پھر ڈرتے نہیں کہ اس کے سوا دوسروں کو معبود بناؤ۔ معبود تو وہ ہی ہونا چاہئے جو خالق کل، مالک الملک، رب مطلق اور متصرف علی الاطلاق ہو۔ اس کا اقرار کر کے کہاں الٹے پاؤں واپس جارہے ہو۔ جب سچا وہ ہی ہے تو سچ کے بعد بجز جھوٹ کے کیا رہ گیا۔ سچ کو چھوڑ کر جھوٹے اوہام میں بھٹکنا عاقل کا کام نہیں ہوسکتا۔

كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى

اسی طرح ٹھیک آئی بات تیرے رب کی

الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾

ان نافرمانوں پر کہ یہ ایمان نہ لائیں گے

یعنی اللہ نے ازل سے ان متمرد سرکشوں کی قسمت میں ایمان نہیں لکھا۔ جس کا سبب علم الٰہی میں ان کی سرکشی اور نافرمانی ہے۔ اس طرح خدا کی لکھی ہوئی بات ان پر فسق ونافرمانی کی وجہ سے راست آئی۔

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ

پوچھ کوئی ہے تمہارے شریکوں میں جو پیدا کرے خلق کو

ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ۚ قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ

پھر دوبارہ زندہ کرے تو کہہ اللہ پہلے پیدا کرتا ہے پھر اس کو دہرائیگا

فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۳۴﴾

سو کہاں سے پلٹے جاتے ہو

اب آخرت کو بھی تسلیم کرلو:

یہاں تک ''مبدا'' کا ثبوت تھا۔ اب ''معاد'' کا ذکر ہے۔ یعنی جب اعتراف کر چکے کہ زمین، آسمان، سمع وبصر، موت وحیات، سب کا پیدا کرنے والا اور تھامنے والا وہ ہی ہے تو ظاہر ہے کہ مخلوق کو مرنے کے بعد دوبارہ پیدا کرنا اور دہرا دینا بھی اسی کا فعل ہوسکتا ہے پھر انبیاء علیہم السلام کی زبانی جب وہ خود اس دہرانے کی خبر دیتا ہے تو اس کی تسلیم میں کیا عذر ہے۔ ''مبدا'' اقرار کر کے ''معاد'' کی طرف سے کہاں پلٹے جاتے ہو۔

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى

پوچھ کوئی ہے تمہارے شریکوں میں جو راہ بتلائے صحیح تو کہہ اللہ راہ

الْحَقِّ ۚ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ ۭ اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ

بتلاتا ہے صحیح تو اب جو کوئی راہ بتائے صحیح اُس کی بات ماننی چاہئے

اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْٓ

یا اس کی جو آپ نہ پائے راہ مگر جب کوئی اور اس کو

اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى ۚ فَمَا لَكُمْ ۣ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۵﴾

راہ بتلائے سو کیا ہوگیا تم کو کیسا انصاف کرتے ہو

راہنما بھی اللہ ہی ہے:

''مبدا'' و ''معاد'' کے بعد درمیانی وسائط ذکر کرتے ہیں۔ یعنی جس طرح اول پیدا کرنے والا اور دوبارہ جلانے والا وہ ہی خدا ہے، ایسے ہی ''معاد'' کی صحیح راہ بتلانے والا بھی کوئی دوسرا نہیں۔ خدا ہی بندوں کی صحیح اور سچی رہنمائی کر سکتا ہے۔ مخلوق میں کوئی بڑا ہو یا چھوٹا، سب اسی کی رہنمائی کے محتاج ہیں۔ اسی کی ہدایت ورہنمائی پر سب کو چلنا چاہئے۔ بت مسکین تو کس شمار میں ہیں جو کسی کی رہنمائی سے بھی چلنے کی قدرت نہیں رکھتے۔ بڑے بڑے مقربین (انبیاء و ملائکہ علیہم السلام) بھی برابر یہ اقرار کرتے آئے ہیں کہ خدا کی ہدایت ودستگیری کے بدون ہم ایک قدم نہیں اٹھا سکتے۔ ان کی رہنمائی بھی اسی لئے بندوں کے حق

میں قابل قبول ہے کہ خدا بلا واسطہ ان کی رہنمائی فرماتا ہے۔ پھر یہ کس قدر ناانصافی ہے کہ انسان اس ہادئ مطلق کو چھوڑ کر باطل اور کمزور سہارے ڈھونڈے یا مثلاً احبار و رہبان، برہمنوں اور مہنتوں کی رہنمائی پر اندھا دھند چلنے لگے۔

وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ۭ اِنَّ الظَّنَّ لَا
اور وہ اکثر چلتے ہیں محض اٹکل پر سو اٹکل کام نہیں دیتی حق بات میں کچھ بھی
يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـــًٔا ۭ

مشرکوں کے پاس تو وہم کے سوا کچھ نہیں:

جب معلوم ہو چکا کہ ''مبدیٔ'' ''معید'' اور ''ہادی'' وہی اللہ ہے تو اس کے خلاف شرک کی راہ اختیار کرنے والوں کو سوچنا چاہئے کہ ان کے ہاتھ میں کونسی دلیل و برہان ہے۔ جس کی بناء پر ''توحید'' کے مسلک قویم وقدیم کو چھوڑ کر ضلالت کے گڑھے میں گرے جا رہے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کے پاس سوائے ظنون و اوہام اور اٹکل پچو باتوں کے کوئی چیز نہیں۔ بھلا اٹکل کے تیر، حق وصداقت کی بحث میں کیا کام دے سکتے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ۝۳۶ وَمَا كَانَ
اللہ کو خوب معلوم ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں اور وہ نہیں
هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰي مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ
یہ قرآن کہ کوئی بنالے اللہ کے سوا

صحیح راستہ بتانے والا صرف قرآن ہے:

پچھلی آیات میں فرمایا تھا کہ مشرکین محض ظن و تخمین کی پیروی کرتے ہیں۔ حالانکہ پیروی کے قابل اس کی بات ہے جو صحیح راستہ بتلائے۔ اسی مناسبت سے یہاں قرآن کریم کا ذکر شروع کیا کہ آج دنیا میں وہ ہی ایک کتاب صحیح راستہ بتلانے والی اور ظنون و اوہام کے مقابلہ میں سچے حقائق پیش کرنے والی ہے۔ اس کے علوم و معارف، احکام و قوانین اور معجزانہ فصاحت و جزالت پر نظر کر کے کہنا پڑتا ہے کہ یہ قرآن وہ کتاب نہیں جو خداوند قدوس کے سوا کوئی دوسرا شخص بنا کر پیش کر سکے۔ پورا قرآن تو بجائے خود رہا اس کی ایک سورۃ کا مثل لانے سے بھی تمام جن وانس عاجز ہیں جیسا کہ آگے آتا ہے۔

وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ
اور لیکن تصدیق کرتا ہے اگلے کلام کی

سچائی کی دلیل:

قرآن کا کلام الٰہی ہونا اس سے ظاہر ہے کہ وہ تمام کتب سماویہ سابقہ کی سچائی پر مہر تصدیق ثبت کرتا، ان کے اصل مضامین کی حفاظت اور ان کی پیشین گوئیوں کی صداقت کا علانیہ اظہار کرتا ہے۔

وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ
اور بیان کرتا ہے ان چیزوں کو جو تم پر لکھی گئیں جس میں کوئی شبہ نہیں پروردگار عالم کی طرف سے
الْعٰلَمِيْنَ ۝۳۷ قف

یعنی احکام الٰہیہ اور ان حقائق و معارف کو جو پچھلی کتابوں میں نہایت اجمالی طور پر مذکور تھیں کافی تفصیل سے بیان کرتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کتاب میں عاقل کے لئے شک و شبہ کی قطعاً گنجائش نہیں۔ ایسا جامع، بلیغ پر حکمت اور نور صداقت سے بھرا ہوا کلام رب العالمین ہی کا ہوسکتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ
کیا لوگ کہتے ہیں کہ یہ بنا لایا ہے تو کہہ دے تم لے آؤ
وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ
ایک ہی سورت ایسی اور بلا لو جس کو بلا سکو اللہ کے سوا
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۳۸
اگر تم سچے ہو

منکروں کو چیلنج:

یعنی اگر میں بنا لایا ہوں تو تم بھی میری طرح بشر ہو سب مل کر ایک سورت جیسی سورت بنا لاؤ۔ ساری مخلوق کو دعوت دو، جن وانس کو جمع کر لو، تمام جہاں کے فصیح و بلیغ پڑھے لکھے اور ان پڑھ اکٹھے ہو کر ایک چھوٹا سا کلام قرآن کی مانند پیش کر دو تو سمجھ لیا جائے گا کہ قرآن بھی کسی بشر کا کلام ہے۔ جس کا مثل دوسرے لوگ لا سکتے ہیں۔ مگر محال ہے کہ ابد الآباد تک کوئی مخلوق ایسا حوصلہ کر سکے۔

قرآن ہر لحاظ سے کامل ہے:

قرآن کریم ہی وہ کتاب ہے جس میں تہذیب اخلاق، تمدن ومعاشرت، حکومت وسیاست، معرفت وروحانیت، تزکیہ نفوس، تنویر قلوب، غرضیکہ وصول الی اللہ اور تنظیم ورفاہیۃ خلائق کے وہ تمام قوانین وطرق موجود ہیں، جن سے آفرینش عالم کی غرض پوری ہوتی ہے۔ اور جن کی ترتیب وتدوین کی ایک امی قوم کے امی فرد سے کبھی امید نہیں ہوسکتی تھی۔ پھر ان تمام علوم وہدایات کا تکفل کرنے کے ساتھ اس کتاب کی غلغلہ انداز فصاحت وبلاغت، جامع وموثر اور دلربا طرز بیان، دریا کا سا تموج، سہل ممتنع سلاست وروانی، اسالیب کلام کا تفنن اور اس کی لذت وحلاوت اور شہنشاہانہ شان وشکوہ یہ سب چیزیں ایسی ہیں جنہوں نے بڑے زور شور اور بلند آہنگی سے سارے جہاں کو مقابلہ کا چیلنج دے دیا ہے۔

قرآن کا دعویٰ:

جس وقت سے قرآن کے جمال جہاں آراء نے غیب کی نقاب الٹی اور اولادِ آدم کو اپنے سے روشناس کیا، اس کا برابر یہ ہی دعویٰ رہا کہ میں خدائے قدوس کا کلام ہوں۔ اور جس طرح خدا کی زمین جیسی زمین، خدا کے سورج جیسا سورج، اور خدا کے آسمان جیسا آسمان پیدا کرنے سے دنیا عاجز ہے، اسی طرح خدا کے قرآن جیسا قرآن بنانے سے بھی دنیا عاجز رہے گی۔ قرآن کے مٹانے کی لوگ شازشیں کرینگے، مکر گانٹھیں گے، مقابلہ کے جوش میں کٹ مرینگے۔ اپنی مدد کے لئے دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں کو دعوت دینگے۔ کوئی حیلہ، کوئی تدبیر، کوئی داؤ پیچ اٹھا نہ رکھیں گے، اپنے کو اور دوسروں کو مصیبت میں ڈالیں گے۔ سارے مصائب ودواہی کا تحمل ان کے لئے ممکن ہوگا مگر قرآن کی چھوٹی سی سورت کا مثل لانا ممکن نہ ہوگا۔ ''قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا'' (بنی اسرائیل رکوع ۱۰) اس مسئلہ پر ہم نے ''اعجاز القرآن'' کے نام سے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جسے شوق ہو ملاحظہ کرے۔ (تفسیر عثمانی)

بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ یُحِیْطُوْا بِعِلْمِهٖ
بات یہ ہے کہ جھٹلانے لگے جس کے سمجھنے پر انہوں نے قابو نہ پایا

انکار کی بنیاد تعصب ہے:

یعنی قرآن کو ''مفتریٰ'' کہنا سمجھ کر نہیں، محض جہل وسفاہت اور قلت تدبر سے ہے۔ تعصب وعناد انہیں اجازت نہیں دیتا کہ ٹھنڈے دل سے قرآن کے حقائق اور وجوہ اعجاز میں غور کریں۔ بدفہمی یا قوائے فکریہ کے ٹھیک استعمال نہ کرنے کی وجہ سے جب قرآن پاک کے دلائل وعجائب کو پوری طرح نہیں سمجھ سکے، تو جھٹلانا شروع کردیا۔ (تفسیر عثمانی)

یعنی ان کا کلام اور قرآن کی حقانیت سے انکار کسی غور وتحقیق پر مبنی نہیں ہے بلکہ قرآن کی حقیقت کو جانے بغیر اور بلا غور وفکر کے فقط سنتے ہی انہوں نے قرآن کو اللہ کا کلام ماننے سے انکار کردیا۔ انہوں نے ابھی سوچا ہی نہیں کہ یہ کلام انسانی طاقت سے باہر ہے۔ قرآن نے جو غیب کی خبریں بتائی ہیں مبدء اور معاد سے آگاہی اور ثواب وعذاب کی اطلاع دی ہے ابھی تک اس کے ظہور کا موقع ہی نہیں آیا ہے ان پر لازم تھا کہ کتب سابقہ کے عالموں سے پوچھتے کہ یہ باتیں جو قرآن بیان کررہا ہے ان کی کتابوں میں بھی ہیں یا نہیں۔ اس تحقیق سے یقیناً قرآن کی سچائی ان پر واضح ہوجاتی۔ قرآن کی عبارت اور تعلیم ومعانی کا معجز ہونا ان لوگوں پر ظاہر ہوسکتا ہے جو غور کریں، سوچیں اور قرآنی علوم کی تحقیق کریں۔ انھوں نے تو نہ الفاظ قرآن پر غور کیا نہ معنی کی تفتیش کی اور لگے فوراً انکار کرنے۔

وَلَمَّا یَاْتِهِمْ تَاْوِیْلُهٗ ؕ
اور ابھی آئی نہیں اس کی حقیقت

انکار کی ایک وجہ جہالت بھی ہے:

بعض مفسرین نے ''تاویل'' کے معنی ''تفسیر'' کے لئے ہیں۔ یعنی مطالب قرآن ان کے دماغ میں نہیں اترے اور بعض نے قرآنی پیشینگوئیاں مراد لی ہیں۔ یعنی تکذیب کی ایک وجہ بعض سادہ لوحوں کے حق میں یہ بھی ہے کہ مستقبل کے متعلق قرآن نے جو خبریں دی ہیں ان کے وقوع کا ابھی وقت نہیں آیا۔ لہٰذا وہ منتظر ہیں کہ ان کا ظہور کب ہوتا ہے۔ مگر سوچنا چاہئے کہ یہ وجہ تکذیب کی کیسے ہوسکتی ہے؟ زائد از زائد توقف کی وجہ ہوتو ہو۔ (تفسیر عثمانی)

اسی طرح قرآن کی دی ہوئی خبریں بار بار سامنے آگئیں اور سچی ثابت ہوگئیں جیسے غلبت الروم الخ میں ہے کہ رومی مغلوب ہوگئے لیکن عنقریب غالب ہوجائیں گے۔ چنانچہ آئندہ رومی، ایرانیوں پر غالب ہوگئے۔ یا جیسے تَبَّتْ یَدَاۤ اَبِیْ لَهَبٍ وَّتَبَّ میں ابولہب کی ہلاکت کی پیشین گوئی کی گئی اور وہ پوری ہوکر رہی۔ اس تجربہ کے بعد کچھ لوگ ایمان لے آئے اور کچھ جذبۂ عناد کے زیر اثر کافر رہے۔ (تفسیر مظہری)

كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ
اسی طرح جھٹلاتے رہے ان سے اگلے سو دیکھ لے
كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۳۹﴾ وَمِنْهُمْ
کیسا ہوا انجام گنہگاروں کا اور بعضے ان میں یقین کریں گے

مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ

قرآن کا اور بعضے یقین نہ کریں گے اور تیرا رب

بِهٖ ۭ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿٤٠﴾

خوب جانتا ہے شرارت والوں کو

منکرین کو ضرور سزا ملے گی:

یعنی آگے چل کر ان میں کچھ لوگ مسلمان ہونے والے ہیں۔ انہیں چھوڑ کر جو باقی لوگ شرارت پر قائم رہیں گے، خدا سب کو خوب جانتا ہے۔ موقع پر مناسب سزا دے گا۔ (تفسیر عثمانیؒ)

وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ

اور اگر تجھ کو جھٹلائیں تو کہہ میرے لئے میرا کام

عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِيْٓـــُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْۗءٌ

اور تمہارے لئے تمہارا کام تم پر ذمہ نہیں میرے کام کا اور مجھ پر

مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿٤١﴾

ذمہ نہیں جو تم کرتے ہو

ہر ایک کو اپنے عمل کا پھل ملے گا:

یعنی اگر ایسے دلائل و براہین سننے کے بعد بھی یہ لوگ آپ کی تکذیب کریں تو کہہ دیجئے کہ ہم اپنا فرض ادا کر چکے، تم سمجھانے پر نہیں مانتے تو اب میرا تمہارا راستہ الگ الگ ہے۔ تم اپنے عمل کے ذمہ دار ہو میں اپنے عمل کا۔ ہر ایک کو اس کے عمل کا ثمرہ مل کر رہے گا۔ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ (معاذ اللہ) ''اگر اللہ کا حکم غلط پہنچاؤں تو میں گنہگار ہوں، اور میں سچ لاؤں تم نہ مانو تو گناہ تم پر ہے۔ بہر حال ماننے میں کسی طرح تمہارا نقصان نہیں''۔ (تفسیر عثمانیؒ)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور امت کی مثال:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، جو چیز مجھے دے کر اللہ نے بھیجا ہے اس کی اور میری حالت اس شخص کی طرح ہے جس نے قوم والوں سے کہا ہو کہ (اس پہاڑ کے اس طرف) میں نے اپنی آنکھوں سے (دشمن کی) فوج دیکھی ہے (جو تم پر آخر رات میں حملہ کر دے گی اور تم کو قتل و غارت کر دے گی) میں تم کو اس خطرہ سے آگاہ کئے دیتا ہوں بہت جلد (یہاں سے) نکل جاؤ اور بھاگ کر چلے جاؤ۔ اس شخص کے قول کو کچھ لوگوں نے مان لیا اور فرصت کو غنیمت سمجھ کر رات ہی کو چل دیئے۔ اس طرح دشمن کے حملہ سے بچ گئے اور کچھ لوگوں نے اس شخص کو جھوٹا سمجھا اور صبح تک اپنی جگہ پر ڈٹے رہے۔ صبح کو دشمن کی فوج نے ان پر حملہ کر دیا، سب کو تباہ کر دیا اور ان کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا۔ یہی حالت ان لوگوں کی ہے جنہوں نے میری لائی ہوئی تعلیم کو مانا اور میری تصدیق کی یا تکذیب کی اور میری لائی ہوئی صداقت کو نہ مانا۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم من حدیث ابی موسیٰؓ۔ (تفسیر مظہریؒ)

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ۭ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ

اور بعضے ان میں کان رکھتے ہیں تیری طرف کیا

الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿٤٢﴾ وَمِنْهُمْ

تو سنائے گا بہروں کو اگرچہ ان کو سمجھ نہ ہو اور بعضے

مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ۭ اَفَاَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ

ان میں نگاہ کرتے ہیں تیری طرف کیا تو راہ دکھائیگا اندھوں

وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿٤٣﴾

کو اگرچہ وہ سوجھ نہ رکھتے ہوں

عقل کے اندھوں کو آپ نہیں منوا سکتے:

بعض لوگ بظاہر قرآن شریف اور آپ کا کلام مبارک سنتے ہیں اور آپ کے معجزات و کمالات دیکھتے ہیں مگر دیکھنا سننا وہ نافع ہے جو دل کے کانوں اور دل کی آنکھوں سے ہو۔ یہ آپ کے اختیار میں نہیں کہ آپ دل کے بہروں کو اپنی بات سنا دیں۔ بحالیکہ وہ سخت بہرہ پن کی وجہ سے قطعاً کسی کلام کو نہ سمجھ سکتے ہوں یا دل کے اندھوں کو راہِ حق دکھلا دیں جبکہ انہیں کچھ بھی نہ سوجھتا ہو۔ ''موضح القرآن'' میں ہے ''یعنی کان رکھتے ہیں یا نگاہ کرتے ہیں اس توقع پر کہ آپ ہمارے دل پر تصرف کر دیں جیسا بعضوں پر ہو گیا، سو یہ بات اللہ کے ہاتھ ہے''۔ بعض مفسرین نے لا یعقلون سے مطلق عقل کی اور لا یبصرون سے بصیرت کی نفی مراد لی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے اندھے، بہرے جو علاوہ نہ سننے اور نہ دیکھنے کے ہر قسم کی سمجھ بوجھ سے محروم ہیں۔ ان کو آپ کس طرح سنا اور دکھا کر منوا سکتے ہیں۔ (تفسیر عثمانیؒ)

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـــًٔا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ

اللہ ظلم نہیں کرتا لوگوں پر کچھ بھی لیکن لوگ

اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۴۴﴾

اپنے اوپر آپ ظلم کرتے ہیں

انہوں نے خود ظلم کیا:

یعنی جن کے دل میں اثر نہیں ہوتا، یہ ان ہی کی تقصیر ہے۔ خود اپنی بے اعتدالیوں اور غلط کاریوں سے انہوں نے قوائے ادراکیہ کو تباہ کرلیا ہے۔ ورنہ اصل فطرت سے ہر آدمی کو خدا نے سمجھنے اور قبول کرنے کی استعداد بخشی ہے۔ (تفسیر عثمانی)

دین اور لوگوں کی مثال:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو ہدایات (اور دینی تعلیم) اللہ نے مجھے دے کر بھیجا اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی زمین پر خوب بارش ہو تو زمین کا جو ٹکڑا اچھا ہوتا ہے وہ پانی کو لے لیتا ہے پھر اس میں سبزہ گھاس چارہ بکثرت ہو جاتا ہے اور زمین کا کچھ ٹکڑا پتھریلا سخت ہوتا ہے وہ پانی کو اپنے اندر روک لیتا ہے (اس پانی سے اس زمین کے ٹکڑے میں تو روئیدگی نہیں ہوتی مگر) اللہ اس کے ذریعے سے لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ لوگ پیتے پلاتے ہیں اور کھیتیاں سینچتے ہیں لیکن زمین کا ایک ٹکڑا وہ بھی ہوتا ہے جو چٹیل میدان ہوتا ہے (پانی اس پر برستا ہے اور برس کر بہ جاتا ہے) وہ نہ پانی کو اپنے اندر روکتا ہے نہ سبزہ پیدا کرتا ہے۔ یہی حالت اس دین کی ہے کچھ لوگ دین کو سمجھتے ہیں۔ اللہ نے جو تعلیم مجھے دے کر بھیجا ہے ان کو اس تعلیم سے فائدہ ہوتا ہے وہ خود بھی سیکھتے ہیں، دوسروں کو بھی سکھاتے ہیں اور کچھ لوگ دین کی طرف قطعاً توجہ نہیں کرتے۔ سر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے اور جو ہدایت مجھے دے کر بھیجا گیا ہے اس کو قبول نہیں کرتے۔ (متفق علیہ من حدیث ابی موسیٰؓ) (تفسیر مظہریؒ)

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً

اور جس دن ان کو جمع کرے گا گویا وہ نہ رہے تھے مگر

مِّنَ النَّهَارِ

ایک گھڑی دن

قیامت آئے گی تو آنکھیں کھلیں گی:

یعنی محشر کے ہولناک احوال وحوادث کو دیکھ کر عمر بھر کا عیش وآرام اس قدر حقیر وقلیل نظر آئے گا گویا دنیا میں ایک گھڑی سے زیادہ ٹھہرے ہی نہ تھے۔ اور افسوس کرینگے کہ ساری عمر کیسی فضول اور بیکار گزری، جیسے آدمی گھنٹہ دو گھنٹہ یوں ہی گپ شپ میں بیکار گزار دیتا ہے۔ نیز وہاں کی زہرہ گداز مصائب کو دیکھ کر خیال کرینگے کہ گویا دنیا میں کچھ مدت قیام ہی نہ ہوا جو یہ وقت آلیا۔ گھڑی دو گھڑی ٹھہرے اور یہاں آ پھنسے۔ کاش وہاں کی مدت قیام کچھ طویل ہوتی تو یہ دن اس قدر جلد نہ دیکھنا پڑتا۔ بعض مفسرین نے کہا کہ برزخ (قبر) میں ٹھہرنے کی مدت کو ایک گھڑی کے برابر سمجھیں گے۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانی)

يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ ؕ

ایک دوسرے کو پہچانیں گے

کوئی کچھ مدد نہ کرسکے گا:

مگر کچھ مدد نہ کرسکیں گے۔ نفسی نفسی پڑی ہوگی۔ بھائی بھائی کے اور بیٹا باپ کے کام نہ آئیگا۔ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ (المومنون رکوع ۶)
يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ
(سورہ عبس۔ رکوع ۱) (تفسیر عثمانی)

یتعارفون بینهم. باہم ایک دوسرے کو پہچان لینگے جیسے دنیا میں ان کا باہمی تعارف تھا۔ گویا تھوڑی دیر کو جدا ہوئے تھے پھر جمع ہو گئے (اور کوئی کسی کو نہیں بھولا۔ بغوی نے لکھا ہے، یہ باہمی شناخت قبروں سے اٹھنے کے وقت تو ہوگی پھر قیامت کی ہولناکی کی وجہ سے باہم تعارف جاتا رہے گا۔ بعض آثار میں آیا ہے کہ آدمی اپنے برابر والے کو پہچان تو لے گا مگر ہیبت اور خوف کی وجہ سے اس سے بات نہیں کرے گا۔ (تفسیر مظہریؒ)

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ

بیشک خسارے میں پڑے جنہوں نے جھٹلایا

وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۴۵﴾

اللہ سے ملنے کو اور نہ آئے وہ راہ پر

باقی جنہوں نے لقاء اللہ کی تصدیق کی اور سیدھی راہ پر چلے وہ سراسر فائدہ میں ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ

اور اگر ہم دکھائیں گے تجھ کو کوئی چیز ان وعدوں میں سے جو کئے ہیں ہم

اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ

نے ان سے، یا وفات دیں تجھ کو، سو ہماری ہی طرف ہے ان کو لوٹنا پھر

عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۴۶﴾

اللہ شاہد ہے ان کاموں پر جو کرتے ہیں

غلبۂ اسلام کے وعدے پورے ہو کر رہے:

یعنی ہم نے کفار کو عذاب دینے اور اسلام کو غالب و منصور کرنے کے جو وعدے کئے ہیں، خواہ ان میں سے بعض وعدے کسی حد تک آپ کی موجودگی میں پورے کر کے دکھلا دئے جائیں، جیسے "بدر" وغیرہ میں دکھلا دیا۔ یا آپ کی وفات ہو جائے۔ اس لئے آپ کے سامنے ان میں سے بعض کا ظہور نہ ہو۔ بہر صورت یہ یقینی ہے کہ وہ سب پورے ہو کر رہیں گے۔ اگر کسی مصلحت سے دنیا میں ان کفار کو سزا نہ دی گئی تو آخرت میں ملے گی۔ ہم سے بچ کر کہاں بھاگ سکتے ہیں۔ سب کو ہماری طرف لوٹ کر آنا ہے اور ان کے تمام اعمال ہمارے سامنے ہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ "غلبۂ اسلام کچھ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو ہوا، اور باقی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلفاء کے ہاتھوں سے"۔ گویا نتوفینک میں اس طرف اشارہ ہے۔ واللہ اعلم۔

مجاہد نے کہا عذاب کا جو حصہ اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو آنکھوں سے دکھا دیا اس سے بدر کے دن کا عذاب (سرداران کفر کا قتل اور کافروں کی دوامی شکست) مراد ہے، باقی انواع عذاب کا مرنے کے بعد وقوع ہوگا۔ (تفسیر عثمانی)

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ ۖ فَإِذَا جَاءَ رَسُولُهُمْ
اور ہر فرقہ کا ایک رسول ہے پھر جب پہنچا ان کے پاس رسول
قُضِيَ بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٤٧﴾
ان کا فیصلہ ہوا ان میں انصاف سے اور ان پر ظلم نہیں ہوتا

امتوں کے متعلق اصول:

پہلے اس امت اور اس کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر تھا۔ اب عام اقوام و امم کا ضابطہ بتلاتے ہیں کہ ہر جماعت اور فرقہ کے پاس خدا کے احکام پہنچانے والے بھیجے گئے ہیں جن کو "رسول" کہیئے، تاکہ خدا کی حجت تمام ہو، اتمام حجت سے پہلے کسی کو عذاب نہیں دیا جاتا۔ لوگ عمل پہلے سے کرتے ہیں، مگر دنیا میں ان کی سزا رسول پہنچنے اور حجت تمام کرنے کے بعد دی جاتی ہے۔ خدا کے یہاں یہ ظلم اور اندھیر نہیں کہ بدون پیشتر سے آگاہ کرنے اور لزوم نہ ثابت ہونے کے مجرموں کو فیصلہ سنا دیا جائے۔ قیامت میں بھی باقاعدہ پیشی ہوگی، فرد جرم لگائیں گے،، گواہ پیش ہوں گے، ہر قوم کے ساتھ ان کے پیغمبر موجود ہوں گے۔ ان کے بیانات وغیرہ کے بعد نہایت انصاف سے فیصلہ ہوگا۔ "وَأَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا وَوُضِعَ الْكِتَابُ وَجِيءَ بِالنَّبِيِّينَ وَالشُّهَدَاءِ وَقُضِيَ بَيْنَهُم بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ"۔ (الزمر۔ رکوع ۷)۔ مجاہد وغیرہ نے آیت کو قیامت کے احوال پر حمل کیا ہے۔

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ
اور کہتے ہیں کب ہے یہ وعدہ اگر تم سچے ہو
صَادِقِينَ ﴿٤٨﴾

یعنی عذاب آنے کی جو دھمکیاں دیتے ہو، محض جھوٹ اور بے اصل ہیں۔ اگر واقعی تم سچے ہو تو لے کیوں نہیں آتے۔ آخر یہ وعدہ کب پورا ہوگا۔

قُل لَّا أَمْلِكُ لِنَفْسِي ضَرًّا وَلَا نَفْعًا إِلَّا مَا
تو کہہ میں مالک نہیں اپنے واسطے برے کا نہ بھلے کا مگر جو چاہے
شَاءَ اللَّهُ ۗ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۚ إِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ
اللہ ہر فرقہ کا ایک وعدہ ہے جب آ پہنچے گا ان کا وعدہ
فَلَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً ۖ وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ﴿٤٩﴾
پھر نہ پیچھے سرک سکیں گے ایک گھڑی اور نہ آگے سرک سکیں گے

مقررہ وقت پر عذاب آئے گا:

یعنی عذاب وغیرہ بھیجنا خدا کا کام ہے، میرے قبضہ و اختیار میں نہیں۔ میں خود اپنے نفع نقصان کا صرف اسی قدر مالک ہوں جتنا اللہ چاہے۔ پھر دوسروں پر کوئی بھلائی برائی وارد کرنے کا مستقل اختیار مجھے کہاں سے ہوتا۔ ہر قوم کی ایک مدت اور میعاد خدا کے علم میں مقرر ہے۔ جب میعاد پوری ہو کر اس کا وقت پہنچ جائے گا، ایک سیکنڈ کا تخلف نہ ہو سکے گا۔ غرض عذاب کے لئے جلدی مچانے سے کچھ فائدہ نہیں۔ خدا کے علم میں جو وقت طے شدہ ہے اس سے ایک منٹ آگے پیچھے نہیں سرک سکتے۔ زمخشری کے نزدیک لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ اس سے کنایہ ہے کہ عذاب کا اپنے وقت معین پر آنا اٹل ہے۔ کنایہ میں حقیقت تقدم و تأخر کا نفیاً یا اثباتاً اعتبار نہیں۔ فتنبہ لہ۔ (تفسیر عثمانی)

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَتَاكُمْ عَذَابُهُ بَيَاتًا
تو کہہ بھلا دیکھو تو اگر آ پہنچے تم پر عذاب اس کا راتوں رات
أَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُونَ ﴿٥٠﴾
یا دن کو تو کیا کر لیں گے اس سے پہلے گنہگار

کیا تم عذاب سے بچاؤ کر سکتے ہو:

یعنی رات کو سوتے ہوئے یا دن میں جب تم دنیا کے دھندوں میں مشغول ہو، اگر اچانک خدا کا عذاب آ دبائے تو مجرم جلدی کر کے کیا بچاؤ کر سکیں گے؟ جب بچاؤ نہیں کر سکتے پھر وقت پوچھنے سے کیا فائدہ؟ مترجم رحمہ اللہ نے مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ کا یہ ترجمہ حضرت شاہ صاحبؒ کے مذاق کے موافق کیا ہے۔ عموماً مفسرین نے یہ مطلب لیا ہے کہ عذاب الٰہی کے آنے میں کونسی ایسی خوشی اور مزے کی بات ہے جس کی وجہ سے مجرمین جلدی طلب کر رہے ہیں۔ یا یہ کہ تعجب کا مقام ہے کہ مجرمین کیسی سخت خوفناک چیز کے لئے جلدی مچا رہے ہیں۔ حالانکہ ایک مجرم کے لائق تو یہ تھا کہ وہ آنے والی سزا کے تصور سے کانپ اٹھتا اور ڈر کے مارے ہلاک ہو جاتا۔ (البحر المحیط)۔ (تفسیر عثمانی)

عذاب کی جلدی کیوں مچاتے ہیں؟

بغوی نے لکھا ہے، کفار عذاب جلد آ جانے کے طلب گار تھے۔ ایک شخص نے کہا تھا، اے اللہ اگر یہ حق ہے، تیری طرف سے ہے کہ تو ہمارے اوپر آسمان سے پتھر برسا یا کوئی اور دردناک عذاب ہم پر لے آ۔ اللہ اس کے جواب میں فرما رہا ہے، یہ کون سے عذاب کے آنے کی جلدی مچا رہے ہیں۔ عذاب تو ہر ایک کے لئے ناگواری کی چیز ہے۔

میں کہتا ہوں، ما ذا یستعجل الخ شرط کی جزا ہو سکتی ہے۔ مطلب یہ ہو گا کہ اگر اللہ کا عذاب تم پر آ گیا تو اس وقت کس چیز کی طلب میں عجلت کرو گے کیا اسی قسم کا دوسرا عذاب مانگو گے اور عذاب میں رہنا پسند کرو گے یا رہائی کے طلب گار ہو گے۔ ظاہر ہے کہ عذاب کے خواستگار نہ ہو گے۔ (تفسیر مظہریؒ)

أَثُمَّ إِذَا مَا وَقَعَ آمَنْتُم بِهِ ۚ آلْآنَ وَقَدْ
کیا پھر جب عذاب واقع ہو چکے گا تب اس پر یقین کرو گے اب
كُنتُم بِهِ تَسْتَعْجِلُونَ ﴿٥١﴾
قائل ہوئے اور تم اسی کا تقاضہ کرتے تھے

دراصل تمہیں یقین نہیں ہے:

یعنی عذاب کے لئے جلدی کرنا اس بناء پر ہے کہ انہیں اس کے آنے کا یقین نہیں۔ اس وقت یقین ہوتا تو فائدہ ہو سکتا تھا کہ بچنے کی کوشش کرتے۔ عذاب آ چکنے کے بعد یقین آیا تو کیا فائدہ ہو گا۔ اس وقت خدا کی طرف سے کہہ دیا جائے گا کہ اچھا اب قائل ہوتے ہو، اور پہلے سے جھٹلاتے رہے۔ کیونکہ تقاضا کرنا بھی جھٹلانے اور مذاق اڑانے کی نیت سے تھا۔ اس وقت اقرار کرنے سے کچھ نفع نہیں۔ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ۭ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ (المومن۔ رکوع ۹)

ثُمَّ قِيلَ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا ذُوقُوا عَذَابَ
پھر کہیں گے گنہگاروں کو چکھتے رہو عذاب
الْخُلْدِ هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا بِمَا كُنتُمْ تَكْسِبُونَ ﴿٥٢﴾
ہمیشگی کا وہی بدلہ ملتا ہے جو کچھ کماتے تھے

کفر و شرک کا مزا:

جو کفر و شرک اور تکذیب کرتے رہے تھے، اب ہمیشہ اس کا مزا چکھتے رہو۔ یہ قیامت میں کہا جائے گا۔

وَيَسْتَنْبِئُونَكَ أَحَقٌّ هُوَ ۖ قُلْ إِي وَرَبِّي
اور تجھ سے خبر پوچھتے ہیں کیا سچ ہے یہ بات تو کہہ البتہ قسم
إِنَّهُ لَحَقٌّ ۖ وَمَا أَنتُم بِمُعْجِزِينَ ﴿٥٣﴾
میرے رب کی یہ سچ ہے اور تم تھکا نہ سکو گے

موت کے بعد زندگی حق ہے:

یعنی غفلت کے نشہ میں چور ہو کر تعجب سے پوچھتے ہیں کہ کیا یہ سچ ہے کہ ہم موت کے بعد دوبارہ زندہ کئے جائیں گے اور دائمی عذاب کا مزہ چکھیں گے؟ کیا واقعی ریزہ ریزہ ہو کر اور خاک میں مل کر پھر از سر نو ہم کو موجود کیا جائے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیجئے کہ تعجب کی کیا بات ہے یہ چیز تو یقیناً ہونے والی ہے۔ تمہارا مٹی میں مل جانا اور پارہ پارہ ہو جانا خدا کو اس سے عاجز نہیں کر سکتا کہ پہلے کی طرح تمہیں دوبارہ پیدا کر دے اور شرارتوں کا مزہ چکھائے۔ ممکن نہیں کہ اس کے قبضہ سے نکل بھاگو اور فرار ہو کر (معاذ اللہ) اسے عاجز کر سکو۔ (تنبیہ) اس آیت کے مشابہ دو آیتیں قرآن کریم میں ہیں۔ ایک سورۂ ''سبا'' میں ''وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ ۭ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ'' دوسری ''تغابن'' میں ''زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ۭ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ۭ وَذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرٌ'' یہ دونوں قیامت اور معاد کے متعلق ہیں ان ہی کی مناسبت سے حافظ ابن کثیر نے آیت حاضرہ کو معاد کے متعلق رکھا ہے۔

وَلَوْ أَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي
اور اگر ہو ہر شخص گنہگار کے پاس جتنا کچھ ہے

الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ ؕ

زمین میں البتہ دے ڈالے اپنے بدلے میں

یعنی اگر روئے زمین کے خزانے فرض کرو اس کے قبضہ میں ہوں تو کوشش کرے کہ یہ سب دے کر خدا کے عذاب سے اپنے کو بچا لے۔

وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ

اور چھپے چھپے پچھتائیں گے جب دیکھیں گے عذاب

وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۵۴﴾

اور ان میں فیصلہ ہوگا انصاف سے اور ان پر ظلم نہ ہوگا

پھر بے فائدہ ندامت ہوگی:

دل میں اپنی حرکتوں پر پشیمان ہوں گے اور چاہیں گے کہ لوگوں پر پشیمان کا اظہار نہ ہو مگر تابکے۔ کچھ دیر آثار ندامت ظاہر نہ ہونے دیں گے۔ آخر بے اختیار ظاہر ہو کر رہیں گے۔ اس وقت کہیں گے۔ یٰحَسْرَتٰی عَلٰی مَا فَرَّطْتُّ فِیْ جَنْۢبِ اللّٰہِ اور یٰوَیْلَنَا قَدْ کُنَّا فِیْ غَفْلَةٍ مِّنْ ھٰذَا۔

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ

سن رکھو اللہ کا ہے جو کچھ ہے آسمان اور زمین میں

اَلَآ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ

سن رکھو وعدہ اللہ کا سچ ہے

اللہ انصاف کر کے رہے گا:

یعنی سارے جہان میں حکومت صرف اللہ کی ہے۔ انصاف ہو کر رہے گا۔ کوئی مجرم نہ کہیں بھاگ سکتا ہے، نہ رشوت دے کر چھوٹ سکتا ہے۔

وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۵﴾

پر بہت لوگ نہیں جانتے

یعنی سوء استعداد بدفہمی اور غفلت سے اکثر لوگ ان حقائق کو نہیں سمجھتے۔ اسی لئے جو زبان پر آئے بک دیتے ہیں اور جو جی میں آئے کرتے ہیں۔

هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۶﴾

وہی جلاتا ہے اور مارتا ہے اور اسی کی طرف پھر جاؤ گے

جلانا اور مارنا جب اسی کا فعل ہے تو دوبارہ زندہ کرنا کیا مشکل ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ

اے لوگو تمہارے پاس آئی ہے نصیحت

رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى

تمہارے رب سے اور شفاء دلوں کے روگ کی اور ہدایت

وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۷﴾

اور رحمت مسلمانوں کے واسطے

نسخۂ شفاء:

یہ سب صفات قرآن کریم کی ہیں۔ قرآن اول سے آخر تک نصیحت ہے جو لوگوں کو مہلک اور مضر باتوں سے روکتا ہے۔ دلوں کی بیماریوں کے لئے نسخۂ شفاء ہے۔ وصول الی اللہ اور رضائے خداوندی کا راستہ بتاتا ہے، اور اپنے ماننے والوں کو دنیا و آخرت میں رحمت الٰہیہ کا مستحق ٹھہراتا ہے۔

نفس انسانی کے مراتب:

بعض محققین کے نزدیک اس آیت میں نفس انسانی کے مراتب کمال کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی جو شخص قرآن کریم سے تمسک کرے ان تمام مراتب پر فائز ہوسکتا ہے۔ (۱) اپنے ظاہر کو نالائق افعال سے پاک کرنا۔ لفظ ''موعظۃ'' میں اس کی طرف اشارہ ہے (۲) باطن کو عقائد فاسدہ اور ملکات ردیہ سے خالی کرنا جو '' وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ '' سے مفہوم ہوتا ہے۔ (۳) نفس کو عقائد حقہ اور اخلاق فاضلہ سے آراستہ کرنا، جس کے لئے لفظ ''ہدیٰ'' زیادہ مناسب ہے، (۴) ظاہر و باطن کی درستی کے بعد انوار رحمت الٰہیہ کا نفس پر فائض ہونا، جو لفظ ''رحمت'' کا مدلول ہے۔ امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ نے جو تقریر کی ہے اس میں ان چار لفظوں سے شریعت، طریقت، حقیقت اور نبوت و خلافت کی طرف علی الترتیب اشارہ کیا ہے۔ یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں اور نہ اس قسم کے مضامین خالص تفسیر کی مد میں آسکتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

دلوں کی شفاء:

قرآن کریم کی دوسری صفت وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ارشاد فرمائی، شفاء کے معنیٰ بیماری دور ہونے کے ہیں، اور صدور، صدر کی جمع ہے۔ جس کے معنیٰ سینہ کے ہیں، مراد اس سے قلب ہے۔

معنیٰ یہ ہیں کہ قرآن کریم دلوں کی بیماریوں کا کامیاب علاج اور صحت و شفاء کا نسخۂ اکسیر ہے، حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ قرآن کی اس صفت سے معلوم ہوا کہ وہ خاص دلوں کی بیماری کے لئے شفاء ہے، جسمانی بیماریوں

کا علاج نہیں۔ (روح المعانی)

مگر دوسرے حضرات نے فرمایا کہ درحقیقت قرآن ہر بیماری کی شفاء ہے خواہ قلبی و روحانی ہو یا بدنی اور جسمانی، مگر روحانی بیماریوں کی تباہی انسان کے لئے جسمانی بیماریوں سے زیادہ شدید ہے اور اس کا علاج بھی ہر شخص کے بس کا نہیں، اس لئے اس جگہ ذکر صرف قلبی اور روحانی بیماریوں کا کیا گیا ہے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ جسمانی بیماریوں کے لئے شفاء نہیں ہے۔

جسمانی بیماریوں کا علاج:

روایات حدیث اور علمائے امت کے بے شمار تجربات اس پر شاہد ہیں کہ قرآن کریم جیسے قلبی امراض کے لئے اکسیر اعظم ہے اسی طرح وہ جسمانی بیماریوں کا بھی بہترین علاج ہے۔

حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کی کہ میرے سینے میں تکلیف ہے، آپ نے فرمایا کہ قرآن پڑھا کرو کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے وَشِفَآءٌ لِّمَا فِى الصُّدُوْرِ یعنی قرآن شفاء ہے ان تمام بیماریوں کی جو سینوں میں ہوتی ہیں۔ (روح المعانی از ابن مردویہ)

اسی طرح حضرت واثلہ بن اسقعؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور بیان کیا کہ میرے حلق میں تکلیف ہے، آپ نے اس کو بھی یہی فرمایا کہ قرآن پڑھا کرو۔

امام غزالیؒ کی تالیف:

علماء امت نے کچھ روایات و آثار سے اور کچھ اپنے تجربوں سے آیات قرآنی کے خواص و فوائد مستقل کتابوں میں جمع کر دیئے ہیں، امام غزالیؒ کی کتاب خواص قرآنی اس کے بیان میں مشہور و معروف ہے جس کی تلخیص حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ نے اعمال قرآنی کے نام سے فرمائی ہے، اور مشاہدات و تجربات اتنے ہیں کہ ان کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قرآن کریم کی مختلف آیتیں مختلف امراض جسمانی کے لئے بھی شفاء کلی ثابت ہوتی ہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ نزول قرآن کا اصلی مقصد قلب و روح کی بیماری کو ہی دور کرنا ہے اور ضمنی طور پر جسمانی بیماریوں کا بھی بہترین علاج ہے۔

لوگوں کی نادانی:

اس سے ان لوگوں کی بے وقوفی اور کجروی بھی ظاہر ہوگئی جو قرآن کریم کو صرف جسمانی بیماریوں کے علاج یا دنیوی حاجات ہی کے لئے پڑھتے پڑھاتے ہیں، نہ روحانی امراض کی اصلاح کی طرف دھیان دیتے ہیں نہ قرآن کی ہدایات پر عمل کرنے کی طرف توجہ کرتے ہیں، ایسے ہی لوگوں کے لئے علامہ اقبال مرحوم نے فرمایا ہے۔

ترا حاصل زیٰس اش جزیں نیست کہ از ہم خواندنش آسان بمیری

یعنی تم نے قرآن کی سورۂ یٰسٓ سے صرف اتنا ہی فائدہ حاصل کیا کہ اس کے پڑھنے سے موت آسان ہو جائے، حالانکہ اس سورت کے معانی اور حقائق و معارف میں غور کرتے تو اس سے کہیں زیادہ فوائد و برکات حاصل کر سکتے تھے۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

بیداری کا پیغام:

یایھا الناس قد جائتکم موعظة من ربکم اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک عظیم الشان نصیحت آ گئی یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی قرآن مجید تم کو پہنچ گیا۔ قرآن پیام بیداری ہے اور ایک نصیحت ہے جو اچھی باتوں کی دعوت دے رہا ہے اور بری باتوں سے باز داشت کر رہا ہے کیونکہ یہ اوامر و نواہی اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہیں اور اللہ حکیم ہے۔ جس کام کو کرنے کا حکم دے رہا ہے وہ یقیناً برا ہے اور اس کا نتیجہ برا ہوگا اچھا کام قابل رغبت اور برا کام قابل نفرت ہوتا ہے۔

غلط عقائد کا علاج:

وَشِفَآءٌ لِّمَا فِى الصُّدُوْرِ اور دلوں کی بیماری کے لئے شفا بخش دوا ہے۔ امراض قلبی سے مراد ہیں غلط عقائد اور اللہ کے سوا دوسری چیزوں سے دلوں کا لگاؤ اور وابستگی۔

وھدًی اور راہنما ہے۔ صحیح عقائد و اذکار کا، جنت کا اور اللہ کے قرب کے درجات کا راستہ بتاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، (قیامت کے دن) قرآن پڑھنے والے سے کہا جائے گا پڑھ اور چڑھتا چلا جا اور جس طرح دنیا میں ترتیل کرتا تھا اسی طرح ترتیل کر کیونکہ تیرا درجہ وہاں ہے جہاں تک تو آخری آیت پڑھنے پر پہنچے گا۔ رواہ احمد والترمذی وابوداؤد و النسائی عن عبداللہ بن عمروؓ۔ (تفسیر مظہریؒ)

زہے کلام تو محض ہدایت و حکمت زہے پیام تو عین عنایت و رحمت

کشد کمند کلام تو اہل عرفان را زشور رخساست بہ گلشن ہمت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طبیب روحانی ہونے کی دلیل

قانون شیخ بوعلی سینا کے طبیب ہونے کی دلیل ہے اسی طرح یہ قرآن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طبیب روحانی ہونے کی دلیل ہے غرض یہ کہ قرآن کریم کی صفت اور فضیلت بیان کرنے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا اثبات ہے اور لوگوں کو اس طب روحانی کے طرف رجوع کرنے کی

دعوت اور ترغیب دیتا ہے۔ (معارف کاندھلویؒ)

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ
کہہ اللہ کے فضل سے اور اس کی مہربانی سے سو اسی پر ان کو خوش ہونا چاہئے
فَلْيَفْرَحُوْا ؕ

خوش ہونا:

''فرح'' (خوش ہونا) محمود بھی ہے اور مذموم بھی۔ کسی نعمت پر اس حیثیت سے خوش ہونا کہ اللہ کے فضل و رحمت سے ملی ہے، محمود ہے۔ جیسے یہاں فرمایا۔ ''فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا'' اور حطام دنیا پر خوش ہونا اور اکڑنا خصوصاً یہ خیال کر کے کہ ہم کو اپنی لیاقت سے حاصل ہوئی ہے، سخت مذموم ہے۔ قارون اپنے مال و دولت کی نسبت کہتا تھا'' اِنَّمَاۤ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِیْ '' اس کو فرمایا لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ۝ وَابْتَغِ فِيْمَاۤ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا الخ۔ (تفسیر عثمانیؒ)

اللہ کا فضل اور رحمت:

مجاہد اور قتادہ کا قول ہے، اللہ کا فضل ایمان ہے اور اللہ کی رحمت قرآن۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا اللہ کا فضل ایمان ہے اور اللہ کی رحمت یہ ہے کہ اللہ نے ہم کو اہل قرآن بنایا۔

ابوالشیخ وغیرہ نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ان کو خوش ہونا چاہئے اللہ کے فضل سے یعنی قرآن سے اور اللہ کی رحمت سے یعنی اس بات سے کہ اللہ نے ان کو اہل قرآن میں سے بنایا۔

حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ اللہ کا فضل اسلام ہے اور اللہ کی رحمت یہ ہے کہ اللہ نے اسلام کو ہمارے دلوں میں محبوب بنا دیا۔

حضرت خالد بن معدان نے فرمایا اللہ کا فضل اسلام ہے اور اللہ کی رحمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت۔ (تفسیر مظہریؒ)

هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝۵۸
یہ بہتر ہے ان چیزوں سے جو جمع کرتے ہیں

اصل چیز فضل و رحمت ہے:

یعنی اصلی چیز خدا کا فضل و رحمت ہے، انسان کو اسی کی تلاش کرنی چاہئے۔ مال و دولت جاہ و حشم، سب اس کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔ (تفسیر عثمانیؒ)

عراق کا خراج:

جب عراق کا خراج حضرت عمرؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آیا تو حضرت عمرؓ اسے دیکھنے کے لئے نکل آئے ان کا خادم بھی ان کے ساتھ تھا۔ حضرت عمرؓ خراج میں آئے ہوئے اونٹوں کو گننے لگے لیکن کہاں تک گنتے۔ گنتے گنتے تھک گئے تو کہنے لگے خدا تعالیٰ کا شکر ہے۔ ان کا خادم کہنے لگا کہ خدا تعالیٰ کی قسم یہ بھی اللہ تعالیٰ کا فضل اور رحمت ہے۔ تو حضرت عمرؓ نے کہا ایسا نہیں، اللہ تعالیٰ نے بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ کہہ کر قرآن اور اس سے استفادہ مراد لیا ہے اس لئے اس کو فضل و رحمت نہیں بلکہ مما یجمعون سمجھنا چاہئے کیونکہ یہ ہمارا جمع کردہ ہے۔ فضل و رحمت کی تو بہت بڑی شان ہے۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ
تو کہہ بھلا دیکھو تو اللہ نے جو اتاری تمہارے واسطے روزی
فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّ حَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰهُ
پھر تم نے ٹھہرائی اس میں سے کوئی حرام اور کوئی حلال کہہ کیا اللہ نے
اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ۝۵۹
حکم دیا تم کو یا اللہ پر افتراء کرتے ہو

حلال و حرام قرآن بتلاتا ہے:

یعنی قرآن جو نصیحت، شفاء، اور ہدایت و رحمت بن کر آیا ہے وہ ہی استناد اور تمسک رکھنے کے لائق ہے۔ احکام الٰہیہ کی معرفت اور حلال وحرام کی تمیز اسی سے ہوسکتی ہے۔ یہ کیا واہیات ہے کہ خدا نے تو تمہارے انتفاع کے لئے ہر قسم کی روزی پیدا کی۔ پھر تم نے محض اپنی آراء و ہوا سے اس میں سے کسی چیز کو حلال، کسی کو حرام ٹھہرالیا۔ بھلا تحلیل و تحریم کا تم کو کیا حق ہے؟ کیا تم یہ کہنے کی جرأت کر سکتے ہو کہ خدا تعالیٰ نے ایسا حکم دیا، یا یوں ہی خدا پر افتراء کررہے ہو۔ اگلی آیت میں صاف اشارہ کردیا کہ بجز افتراء علی اللہ کے اور کچھ نہیں۔ (تنبیہ) جن چیزوں کو حلال وحرام کیا تھا، ان کا مفصل تذکرہ سورۂ ''مائدہ'' اور ''انعام'' میں گزر چکا۔ (تفسیر عثمانیؒ)

رزق لوح محفوظ سے اترتا ہے:

انزل اتارا، یعنی پیدا کیا۔ تخلیق کو اتارنا فرمایا کیونکہ ان چیزوں کی تخلیق بالائی ذریعہ یعنی بارش سے ہوتی ہے اور بارش اوپر ہی سے اترتی ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ تخلیقِ کائنات سے پہلے اللہ نے پیدا کی جانے والی چیزوں کو لوح

محفوظ میں لکھ دیا ہے۔ اب تحریرِ لوح کے مطابق تخلیق رزق ہوتی ہے گویا رزق لوحِ محفوظ سے اترتا ہے۔ رزق سے مراد ہے کھیتی یا مویشی دودھ والے۔ لکم کے لفظ سے معلوم ہو رہا ہے کہ اللہ نے یہ چیزیں تمہارے لئے حلال بنائی تھی مگر تم نے (از خود) ان میں سے کسی کو حلال بنالیا اور کسی کو حرام۔ (تفسیر مظہریؒ)

وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ
اور کیا خیال ہے جھوٹ باندھنے والوں کا
الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
اللہ پر قیامت کے دن

سزا ٹل نہیں سکتی:

یعنی یہ لوگ روزِ قیامت کے متعلق کیا خیال کر رہے ہیں کہ کیا معاملہ ان کے ساتھ ہوگا۔ سخت پکڑے جائیں گے، یا سستے چھوٹ جائیں گے۔ عذاب بھگتنا پڑے گا یا نہیں۔ کن خیالات میں پڑے ہیں۔ یاد رکھیں جو دردناک سزا ملنے والی ہے وہ ٹل نہیں سکتی۔ (تفسیر عثمانیؒ)

إِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ
اللہ تو فضل کرتا ہے لوگوں پر اور لیکن
أَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿٦٠﴾
بہت لوگ حق نہیں مانتے

بہت کم لوگ قدر دان ہوتے ہیں:

یعنی خدا اپنے فضل سے دنیا میں بہت کچھ مہلت دیتا ہے۔ بہت سی تقصیرات سے درگزر کرتا ہے لیکن بہت لوگ نرمی اور اغماض کو دیکھ کر بجائے شکر گزار ہونے کے اور زیادہ دلیر اور بے خوف ہو جاتے ہیں۔ آخر سزا دینی پڑتی ہے۔

حلمِ حق با تو مواسا ہا کند چونکہ از حد بگزری رسوا کند

(تفسیر عثمانیؒ)

وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَأْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ
اور نہیں ہوتا تو کسی حال میں اور نہ پڑھتا ہے اس میں سے کچھ
قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ إِلَّا كُنَّا
قرآن اور نہیں کرتے ہو تم لوگ کچھ کام کہ

عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا إِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ۚ وَمَا
ہم نہیں ہوتے حاضر تمہارے پاس جب تم مصروف ہوتے ہو
يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي
اس میں اور غائب نہیں رہتا تیرے رب سے ایک ذرہ بھر
الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاۗءِ وَلَآ أَصْغَرَ مِنْ
زمین میں اور نہ آسمان میں اور نہ چھوٹا اس سے
ذٰلِكَ وَلَآ أَكْبَرَ إِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿٦١﴾
اور نہ بڑا جو نہیں ہے کھلی ہوئی کتاب میں

ہر عمل اللہ کے سامنے ہے:

پہلے قرآن کریم کے اوصاف بیان کئے تھے کہ وہ سراپا نور ہدایت، شفائے قلوب، نعمتِ عظمیٰ کبریٰ ہے۔ پھر اشارہ کیا کہ ہدایت وبصیرت کی ایسی صاف روشنی کو چھوڑ کر لوگ اپنے اوہام وخیالات کے اندھیرے میں بھٹکتے پھرتے ہیں اور خدا پر افتراء کر کے اس کے فضل وانعام کی ناقدری کرتے ہیں۔ اس آیت میں متنبہ کیا کہ لوگ کس حال میں ہیں اور پیغمبر علیہ السلام کی کیا شان ہے۔ آپ شب وروز مالک حقیقی کی وفاداری، اور ہمدردیٔ خلائق کی جن شؤن عظیمہ کے مظہر بنتے ہیں، خصوصاً آپ کی جو امتیازی شان قرآن کریم پڑھنے پڑھانے کے وقت ظاہر ہوتی ہے یعنی قرآن کے ذریعہ سے جو جہاد آپ کر رہے ہیں وہ سب خدا کے حضور میں اور لوگ جو کچھ اچھا یا برا معاملہ کرتے ہیں وہ سب بھی خدا کی نظر کے سامنے ہے، جس وقت مخلوق کوئی کام شروع کرتی اور اس میں مشغول ومنہمک ہو جاتی ہے، خواہ اسے خدا کا تصور نہ آئے، لیکن خدا اس کو برابر دیکھ رہا ہے۔ فان لم تكن تراه فانه يراك زمین وآسمان میں کہیں ایک ذرہ برابر یا اس سے چھوٹی بڑی چیز نہیں جو خدا تعالیٰ کے علم محیط سے غائب ہو۔ بلکہ علمِ الٰہی سے نیچے اتر کر تمام "ما كان و ما يكون" کا حال "کتابِ مبین" (لوحِ محفوظ) میں ثبت ہے۔ جسے "عالمِ تدبیر" میں "صحیفۂ علمِ الٰہی" کہنا چاہئے جب حق تعالیٰ پر کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز پوشیدہ نہیں تو ان مکذبین ومعاندین کے معاملات واحوال کیسے مخفی رہ سکتے ہیں، پھر روزِ جزاء کی کارروائی کے متعلق یہ کیا خیال کر رہے ہیں۔ وہ خوب سمجھ لیں کہ ان کی ہر چھوٹی بڑی حرکت خدا کے سامنے ہے وہاں کوئی خیانت اور چوری نہیں چل سکے گی۔ ہر عمل کی سزا مل کر رہے گی۔ اور جس طرح دشمنوں کے معاملات اس کے سامنے ہیں، ان کے بالمقابل دوستوں کا ذرہ ذرہ حال بھی اس کے علم میں ہے، اگلی آیات میں ان کو بشارت سنائی گئی۔ (تفسیر عثمانیؒ)

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ

یاد رکھو جو لوگ اللہ کے دوست ہیں نہ ڈر ہے ان پر اور نہ وہ

يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾

غمگین ہوں گے

اولیاء بے خوف ہوں گے:

ابن کثیر نے روایاتِ حدیثیہ کی بناء پر اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ "اولیاء اللہ" (خدا کے دوستوں) کو آخرت میں احوال محشر کا کوئی خوف نہیں ہوگا اور نہ دنیا کے چھوٹ جانے پر غمگین ہونگے۔ بعض مفسرین نے آیت کو کچھ عام رکھا ہے یعنی ان پر اندیشہ ناک حوادث کا وقوع نہ دنیا میں ہوگا نہ آخرت میں۔ اور نہ کسی مطلوب کے فوت ہونے پر وہ مغموم ہوتے ہیں۔ گویا خوف سے خوفِ حق یا غم سے غمِ آخرت کی نفی مراد نہیں، بلکہ دنیا میں دنیوی خوف وغم کی نفی مراد ہے جس کا احتمال مخالفت اعداء وغیرہ سے ہوسکتا ہے، وہ مؤمنین کاملین کو نہیں ہوتا۔ ہر وقت ان کا اعتماد اللہ پر رہتا ہے اور تمام واقعات تکوینیہ کے خالی از حکمت نہ ہونے کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ اس اعتماد و اعتقاد کے استحضار سے انہیں خوف وغم نہیں ستاتا۔ میرے نزدیک " لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ " کا مطلب یہ لیا جائے کہ "اولیاء اللہ" پر کوئی خوفناک چیز (ہلاکت یا معتد بہ نقصان) دنیا و آخرت میں واقع ہونے والی نہیں۔ اگر فرض کیجئے دنیا میں صورتاً کوئی نقصان پیش بھی آئے تو چونکہ نتیجۃً وہ ان کے حق میں نفع عظیم کا ذریعہ بنتا ہے اس لئے اس کو معتد بہ نقصان نہیں کہا جاسکتا۔ رہا کسی سبب دنیوی یا اخروی کی وجہ سے ان کو کسی وقت خوف لاحق ہونا، وہ آیت کی اس تقریر کے منافی نہ ہوگا کیونکہ آیت نے صرف یہ خبر دی ہے کہ ان پر کوئی خوفناک چیز نہ پڑے گی، یہ نہیں کہا کہ انہیں کسی وقت خوف لاحق نہ ہوگا۔ شاید لا یحزنون کے مناسب لا یخافون نہ فرمانے اور لاخوف علیھم کی تعبیر اختیار کرنے میں یہی نکتہ ہو۔ باقی لا یحزنون کا تعلق میرے خیال میں مستقبل سے ہے۔ یعنی موت کے وقت اور موت کے بعد غمگین نہ ہونگے جیسا فرمایا، تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا (حم السجدہ۔ رکوع۴) اور فرمایا لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ (الانبیاء۔ رکوع۷) واللہ تعالیٰ اعلم بمرادہ۔ (تفسیر عثمانی)

اولیاء اللہ کون ہیں:

عبداللہ ابن مسعودؓ اور ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ اولیاء اللہ وہ لوگ ہیں جو ہر وقت ذکر وفکر خداوندی میں دیکھے جاتے ہیں۔ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے پوچھا یارسول اللہ! اولیاء اللہ کون ہیں؟ تو فرمایا کہ وہ لوگ کہ جب دیکھو یاد خدا میں مصروف۔ ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا تعالیٰ کے بندوں میں ایسے بھی بندے ہیں کہ انبیاء و شہداء بھی ان پر رشک کرتے ہیں۔ پوچھا گیا یارسول اللہ! وہ کون لوگ ہیں؟ ہم بھی ان سے محبت رکھیں گے۔ فرمایا انبیاء کے لئے بھی قابل رشک لوگ ہیں کہ نہ مال کا کوئی تعلق نہ نسب کا لگاؤ مگر صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ ان کے چہرے نورانی ہیں وہ نور کے منبروں پر ہیں۔ لوگ جہاں خوف سے تھرا جائیں، وہاں ان پر ذرا بھی آثار خوف نہیں۔ لوگوں پر رنج وغم طاری ہے اور ان کو رنج سے کوئی واسطہ نہیں۔ ابو مالک اشعریؓ سے روایت ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مختلف قبائل سے اور چاروں طرف سے جمع ہوں گے اور ان میں کوئی رشتہ داری نہ ہوگی لیکن وہ محض اللہ تعالیٰ کی خاطر آپس میں ایک دوسرے کو دوست رکھتے ہوں گے اور خلوص ومحبت ہوگی۔ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ان کے لئے نور کے منبر قائم کرے گا جس پر وہ بیٹھے ہوں گے۔ لوگ قیامت میں پریشان پھر رہے ہوں گے، لیکن وہ مطمئن۔ اللہ تعالیٰ کے اولیاءؑ یہی لوگ ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

ولایت کے درجات:

ولایت خاصہ کے درجات بیشمار اور غیر متناہی ہیں، اس کا اعلیٰ درجہ انبیاء علیہم السلام کا حصہ ہے، کیونکہ ہر نبی کا ولی اللہ ہونا لازمی ہے، اور اس میں سب سے اونچا مقام سید الانبیاء نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، اور ادنیٰ درجہ اس ولایت کا وہ ہے جس کو صوفیائے کرامؒ کی اصطلاح میں درجہ فناء کہا جاتا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ آدمی کا قلب اللہ تعالیٰ کی یاد میں ایسا مستغرق ہو کہ دنیا میں کسی کی محبت اس پر غالب نہ آئے، جس سے محبت کرتا ہے تو اللہ کے لئے کرتا ہے، جس سے نفرت کرتا ہے تو اللہ کے لئے کرتا ہے، اس کے حب وبغض اور محبت وعداوت میں اپنی ذات کا کوئی حصہ نہیں ہوتا، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا ظاہر و باطن اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں مشغول رہتا ہے اور وہ ہر ایسی چیز سے پرہیز کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسند ہو، اسی حالت کی علامت ہے کثرت ذکر اور دوام طاعت، یعنی اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرنا اور ہمیشہ ہر حال میں اس کے احکام کی اطاعت کرنا، یہ دو وصف جس شخص میں موجود ہوں وہ ولی اللہ کہلاتا ہے جس میں ان دونوں میں سے کوئی ایک نہ ہو وہ اس فہرست میں داخل نہیں، پھر جس میں یہ دونوں موجود ہوں اس کے درجات ادنیٰ واعلیٰ کی کوئی حد نہیں، انہیں درجات کے اعتبار سے اولیاء اللہ کے درجات متفاضل اور کم وبیش ہوتے ہیں۔

ایک حدیث میں بروایت حضرت ابو ہریرہؓ مذکور ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ اس آیت میں اولیاء اللہ سے کون لوگ مراد ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ وہ لوگ جو خالص اللہ کے لئے آپس میں محبت کرتے

ہیں، کوئی دنیاوی غرض درمیان میں نہیں ہوتی، (مظہری از ابن مردویہ) اور ظاہر ہے کہ یہ حالت انہیں لوگوں کی ہو سکتی ہے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

ولایت حاصل کرنے کا طریقہ:

یہاں ایک سوال اور بھی پیدا ہوتا ہے کہ اس درجہ ولایت کے حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر مظہری میں فرمایا کہ امت کے افراد کو یہ درجۂ ولایت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے فیض صحبت سے حاصل ہو سکتا ہے، اسی سے تعلق مع اللہ کا وہ رنگ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھا اپنے حوصلہ کے مطابق اس کا کوئی حصہ امت کے اولیاء کو ملتا ہے، پھر یہ فیض صحبت صحابۂ کرامؓ کو بلا واسطہ حاصل تھا، اسی وجہ سے ان کا درجۂ ولایت تمام امت کے اولیاء واقطاب سے بالاتر تھا، بعد کے لوگوں کو یہی فیض ایک واسطہ یا چند واسطوں سے حاصل ہوتا ہے جتنے وسائط بڑھتے جاتے ہیں اتنا ہی اس میں فرق پڑتا ہے، یہ واسطہ صرف وہی لوگ بن سکتے ہیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رنگ میں رنگے ہوئے آپ کی سنت کے پیرو ہیں ایسے لوگوں کی کثرت سے مجالست اور صحبت جب کہ اس کے ساتھ ان کے ارشادات کی پیروی اور اطاعت اور ذکر اللہ کی کثرت بھی ہو، یہی نسخہ ہے درجۂ ولایت حاصل کرنے کا، جو تین جزء سے مرکب ہے، کسی ولی اللہ کی صحبت، اس کی اطاعت اور ذکر اللہ کی کثرت، بشرطیکہ یہ کثرت ذکر مسنون طریقہ پر ہو، کیونکہ کثرت ذکر سے آئینۂ قلب کو جلا ہوتی ہے تو وہ نور ولایت کے انعکاس کے قابل بن جاتا ہے، حدیث میں ہے کہ ہر چیز کے لئے صیقل اور صفائی کا کوئی طریقہ ہوتا ہے، قلب کی صیقل ذکر اللہ سے ہوتی ہے، اس کو بیہقی نے بروایت ابن عمرؓ نقل فرمایا ہے۔ (مظہری)

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ ایک شخص نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ آپ اس شخص کے بارے میں کیا فرماتے ہیں جو کسی بزرگ سے محبت کرتا ہے مگر عمل کے اعتبار سے ان کے درجہ تک نہیں پہنچتا؟ آپ نے فرمایا المرء مع من احب یعنی ہر شخص اسی کے ساتھ ہوگا جس سے اس کو محبت ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اولیاء اللہ کی محبت وصحبت انسان کے لئے حصول ولایت کا ذریعہ ہے، اور بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت رزینؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت رزینؓ سے فرمایا کہ میں تمہیں دین کا ایسا اصول بتلاتا ہوں جس سے تم دنیا وآخرت کی فلاح وکامیابی حاصل کر سکتے ہو، وہ یہ ہے کہ اہلِ ذکر کی مجلس وصحبت کو لازم پکڑو اور جب تنہائی میں جاؤ تو جتنا زیادہ ہو سکے اللہ کے ذکر سے اپنی زبان کو حرکت دو، جس سے محبت کرو اللہ کے لئے کرو، جس سے نفرت کرو تو اللہ کے لئے کرو۔ (مظہریؒ)

مگر یہ صحبت ومجالست انہیں لوگوں کی مفید ہے جو خود ولی اللہ متبع سنت ہوں اور جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے تابع نہیں وہ خود درجۂ ولایت سے محروم ہیں، چاہے کشف وکرامات ان سے کتنے ہی صادر ہوں۔ اور جو شخص مذکورہ صفات کے اعتبار سے ولی ہوا گرچہ اس سے کبھی کوئی کشف و کرامت ظاہر نہ ہوئی ہو وہ اللہ کا ولی ہے۔ (مظہریؒ)

اولیاء کی پہچان:

اولیاء اللہ کی علامت اور پہچان تفسیر مظہری میں ایک حدیثِ قدسی کے حوالہ سے یہ نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے اولیاء میرے بندوں میں سے وہ لوگ ہیں جو میری یاد کے ساتھ یاد آویں اور جن کی یاد کے ساتھ میں یاد آؤں، اور ابن ماجہ میں بروایت حضرت اسماءؓ بنت یزید مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولیاء اللہ کی یہ پہچان بتلائی، الذین اذا رؤا ذکر اللّٰہ یعنی جن کو دیکھ کر خدا یاد آئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن لوگوں کی صحبت میں بیٹھ کر انسان کو اللہ کے ذکر کی توفیق اور دنیاوی فکروں کی کمی محسوس ہو، یہ علامت اس کے ولی اللہ ہونے کی ہے۔

کشف وکرامت ضرورت نہیں:

تفسیر مظہری میں فرمایا کہ عوام نے جو اولیاء اللہ کی علامت کشف وکرامت یا غیب کی چیزیں معلوم ہونے کو سمجھ رکھا ہے یہ غلط اور دھوکہ ہے، ہزاروں اولیاء اللہ ہیں جن سے اس طرح کی کوئی چیز ثابت نہیں اور اس کے خلاف ایسے لوگوں سے کشف اور غیب کی خبریں منقول ہیں جن کا ایمان بھی درست نہیں۔

خوف اور غم نہ ہونے کا مطلب:

بہت سے مفسرین نے فرمایا کہ اولیاء اللہ پر خوف وغم نہ ہونا دنیا وآخرت دونوں کے لئے عام ہے اور اولیاء اللہ کی خصوصیت یہی ہے کہ دنیا میں بھی وہ خوف وغم سے محفوظ ہیں اور آخرت میں ان پر خوف وغم نہ ہونا تو سب ہی جانتے ہیں، اور اس میں سب اہلِ جنت داخل ہیں۔

صحابۂ کرامؓ میں سب سے افضل حضرت صدیق وفاروق رضی اللہ عنہما اور تمام صحابہؓ وتابعین اور اولیاء اللہ کی گریہ وزاری اور خوفِ آخرت کے واقعات بیشمار ہیں۔

اس لئے روح المعانی میں علامہ آلوسی نے یہ فرمایا کہ حضرات اولیاء اللہ کا دنیا میں خوف وغم سے محفوظ ہونا اس اعتبار سے ہے کہ جن چیزوں کے خوف و غم میں عام طور سے اہلِ دنیا مبتلاء رہتے ہیں کہ دنیوی مقاصد آرام وراحت عزت ودولت میں ذرا سی کمی ہو جانے پر مرنے لگتے ہیں اور ذرا ذرا تکلیف وا پریشانی کے خوف سے ان سے بچنے کی تدبیروں میں رات دن کھوئے رہتے ہیں، اولیاء اللہ کا مقام ان سب سے بالا وبلند ہوتا ہے۔ ان کی نظر میں نہ دنیا

کی فانی عزت و دولت، راحت و آرام کوئی چیز ہے جس کے حاصل کرنے میں سرگرداں ہوں، اور نہ یہاں کی محنت و کلفت اور رنج کچھ قابلِ التفات ہے جس کی مدافعت میں پریشان ہوں بلکہ ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ

نہ شادی داد سامانے نہ غم آورد نقصانے
بہ پیش ہمت ما ہرچہ آمد بود مہمانے

اللہ جل شانہ کی عظمت و محبت اور خوف و خشیت ان حضرات پر ایسی چھائی ہوتی ہے کہ اس کے مقابلہ میں دنیا کی رنج و راحت، سود و زیاں پر کاہ کی بھی حیثیت نہیں رکھتے، بقول بعض

یہ ننگ عاشقی ہیں سود و حاصل دیکھنے والے
یہاں گمراہ کہلاتے ہیں منزل دیکھنے والے

قربِ محبت:

مگر لفظ اولیاء اللہ میں یہ درجہ ولایت کا مراد نہیں بلکہ ولایت و محبت اور قرب کا ایک دوسرا درجہ بھی ہے جو اللہ تعالیٰ کے مخصوص بندوں کے ساتھ خاص ہے۔ یہ قرب محبت کہلاتا ہے جن لوگوں کو یہ قرب خاص حاصل ہو وہ اولیاء اللہ کہلاتے ہیں، جیسا کہ ایک حدیثِ قدسی میں ہے، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میرا بندہ نفلی عبادات کے ذریعہ میرا قرب خاص حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں بھی اس سے محبت کرنے لگتا ہوں اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو پھر میں ہی اس کے کان بن جاتا ہوں۔ وہ جو کچھ سنتا ہے میرے ذریعہ سنتا ہے، میں ہی اس کی آنکھ بن جاتا ہوں، وہ جو کچھ دیکھتا ہے مجھ سے دیکھتا ہے۔ میں ہی اس کے ہاتھ پاؤں بن جاتا ہوں، وہ جو کچھ کرتا ہے مجھ سے کرتا ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ اس کی کوئی حرکت و سکون اور کوئی کام میری رضاء کے خلاف نہیں ہوتا۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

قربِ محبت اور قربِ خلقی:

یوں تو ہر شخص بلکہ ہر چیز کا اللہ سے قرب ہے جس کی کیفیت نہیں جانی جا سکتی۔ اللہ نے فرمایا ہے: نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ رگ جان سے بھی زیادہ ہم بندہ کے قریب ہیں۔ اسی قرب کی وجہ سے یہ کائنات جامۂ ہستی پہنتی اور دائرۂ وجود میں آتی ہے۔ اگر یہ قرب نہ ہوتا تو کوئی وجود کی بو بھی نہیں سونگھ سکتا۔ اصل ذات کے اعتبار سے ہر چیز نیست ہے۔ سب کی اصل عدم ہے لیکن خاص بندوں کو ایک بے کیف قرب اور بھی حاصل ہے۔ یہ قرب محبت ہے عالم مثال میں اہلِ کشف کو یہ بے کیف محبت قربِ جسمانی کی شکل میں نظر آتی ہے۔ لفظ قرب کا قربِ خلقی اور قربِ محبت دونوں پر اطلاق بطور اشتراک لفظی کے ہوتا ہے۔ حقیقت قرب دونوں جگہ جدا جدا ہے۔ مؤخر الذکر قرب کے ان گنت غیر محدود درجات ہیں۔ ایک حدیث قدسی ہے (اللہ نے فرمایا) میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے پیار کرنے لگتا ہوں۔ جب میں اس کو پیار کرتا ہوں تو پھر میں اس کے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے اور میں اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے۔ الی آخر الحدیث (یعنی اس وقت وہ جو کام کرتا ہے وہ گویا میرا عمل ہوتا ہے) رواہ البخاری عن ابی ہریرہؓ۔

قرب کا ابتدائی درجہ:

اس قرب کا ابتدائی درجہ صرف ایمان سے حاصل ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اور آخری انتہائی درجہ انبیاء کا خصوصی حصہ ہے جن کے سردار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درجات ترقی پذیر ہیں جن کی کوئی انتہا نہیں۔

کم سے کم درجہ:

صوفیہ کی اصطلاح میں کم سے کم وہ درجہ جس پر لفظ ولی کا اطلاق ہو سکتا ہے، اس شخص کا ہے جس کا دل اللہ کی یاد میں ہر وقت ڈوبا رہتا ہے۔ وہ صبح شام اللہ کی پاکی بیان کرنے میں مشغول رہتا ہے۔ اللہ کی محبت سے سرشار رہتا ہے۔ کسی اور کی محبت کی اس میں گنجائش نہیں ہوتی خواہ باپ ہو یا بیٹا یا بھائی یا بیوی یا دوسرے کنبہ والے کسی سے اس کو محبت نہیں ہوتی۔ اگر کسی سے محبت ہوتی ہے تو محض اللہ کے لئے اور نفرت ہوتی ہے تب بھی خوشنودئ مولیٰ کے حصول کے لئے وہ کسی کو کچھ دیتا ہے تو صرف اللہ کے لئے اور نہیں دیتا ہے تب بھی اللہ کی مرضی کے لئے۔ اس گروہ کی آپس میں محبت لوجہ اللہ ہوتی ہے۔

فناء قلب کا درجہ:

صوفیہ کی اصطلاح میں اس صفت کو فناء قلب کہا جاتا ہے۔ ولی کا ظاہر و باطن تقویٰ سے آراستہ ہوتا ہے۔ جو اعمال و اخلاق اللہ کو ناپسند ہیں ان سے وہ پرہیز رکھتا ہے۔ شرک خفی و جلی سے پاک رہتا ہے۔ بلکہ وہ شرک جو چیونٹی کی رفتار کی آواز سے بھی زیادہ خفی ہوتا ہے اس سے بچتا ہے۔ غرور، کینہ حسد حرص اور ہوس سے منزہ ہوتا ہے اور انہی کے ساتھ عمدہ اخلاق و اعمال سے متصف ہوتا ہے۔ اس مرتبہ کو صوفیہ فناء نفس کا مرتبہ کہتے ہیں۔ صوفیہ کا قول ہے کہ اس درجہ پر جب ولی پہنچ جاتا ہے تو اس کا شیطان اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا ہے اور فرماں بردار بن جاتا ہے۔

ہر کس کہ ترا شناخت جاں راچہ کند فرزند و عیال و خان و ماں راچہ کند
دیوانہ کنی ہر دو جہانش بخشی دیوانہ تو ہر دو جہاں راچہ کند

جس نے تجھے پہچان لیا اس کا جان۔ اہل و عیال اور خاندان سے کیا تعلق وہ ان کو لے کر کیا کرے گا۔ اپنی محبت کا دیوانہ کرنے کے بعد اگر دونوں جہان دیوانہ محبت کو دیدے تو اسکے کس کام کے۔ (تفسیر مظہری)

حضرت ابن عمر نے فرمایا تقویٰ یہ ہے کہ تم اپنے کو کسی سے بہتر نہ سمجھو حضرت مجدد الف ثانی نے فرمایا جو شخص اپنی جان کو فرنگی کافر سے بھی بہتر خیال کرتا ہو اس کیلئے اللہ کی معرفت حرام ہے۔ (تفسیر مظہری)

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا یَتَّقُوْنَ ؕ﴿۶۳﴾
جولوگ کہ ایمان لائے اور ڈرتے رہے

اولیاء اللہ کی تعریف:

یہ ''اولیاء اللہ'' کی تعریف فرمائی یعنی مؤمن متقی خدا کا ولی ہوتا ہے پہلے کئی مواقع میں معلوم ہو چکا ہے کہ ایمان وتقویٰ کے بہت سے مدارج ہیں۔ پس جس درجہ کا ایمان وتقویٰ کسی میں موجود ہوگا۔ اسی درجہ میں ولایت کا ایک حصہ اس کے لئے ثابت ہوگا۔ پھر جس طرح مثلاً دس بیس روپیہ بھی مال ہے اور پچاس، سو، ہزار دو ہزار، لاکھ دو لاکھ روپیہ بھی۔ لیکن عرف عام میں دس بیس روپے کے مالک کو مالدار نہیں کہا جاتا۔ جب تک معتدبہ مقدار مال و دولت موجود نہ ہو اسی طرح سمجھ لیجئے کہ ایمان وتقویٰ کسی مرتبہ میں ہو، وہ ولایت کا شعبہ ہے اور اس حیثیت سے سب مومنین فی الجملہ ''ولی'' کہلائے جاسکتے ہیں۔ لیکن عرف میں ''ولی'' اسی کو کہا جاتا ہے۔ جس میں ایک خاص اور ممتاز درجہ ایمان وتقویٰ کا پایا جاتا ہو، احادیث میں کچھ علامات و آثار اس ولایت کے ذکر کئے گئے ہیں۔ مثلاً ان کو دیکھنے سے خدا یاد آنے لگے یا مخلوق خدا سے ان کو بے لوث محبت ہو، عارفین نے اپنے اپنے مذاق کے موافق ''ولی'' کی تعریفیں کی ہیں جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

قابل رشک مرتبہ والے لوگ:

ابوداؤد نے حضرت عمر بن خطاب کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کے بندوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو نہ انبیاء ہیں نہ شہداء لیکن قیامت کے دن ان کے مرتبہ قرب کو دیکھ کر انبیاء اور شہداء ان پر رشک کریں گے۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ کون لوگ ہیں۔ فرمایا جو بندگان خدا سے محض اللہ کے لئے محبت رکھتے ہیں۔ آپس میں نہ ان کی باہم رشتہ داریاں ہیں نہ مالی لین دین (کہ قرابت یا مالی لالچ کی وجہ سے ایک کو دوسرے سے محبت ہو) خدا کی قسم ان کے چہرے (قیامت کے دن مجسم) نور ہوں گے بالائے نور۔ جب اور لوگوں کو (عذاب) کا خوف ہوگا ان کو خوف نہ ہوگا جب اور لوگ غم میں مبتلا ہوں گے وہ غمگین نہیں ہوں گے پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ

حصول ولایت کے ذرائع:

مرتبہ ولایت کا حصول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پرتو اندازی سے ہوتا ہے خواہ عکس رسالت براہ راست پڑے، یا کسی ایک واسطہ سے یا چند واسطوں سے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے نائبوں سے محبت اور ان کی ہم نشینی و اطاعت حصول ولایت کے لئے ضروری ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب، نفس اور جسم کا رنگ ولی کے قلب، قالب اور جسم پر ان ہی دونوں اوصاف کی وجہ سے چڑھ جاتا ہے اور یہی صبغۃ اللہ ہے۔ جس کے متعلق فرمایا صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً طریق مسنون کے مطابق ذکر اللہ کی کثرت عکس پذیری کے لئے مددگار ہوتی ہے اس سے دل کا میل دور ہو جاتا ہے اور آئینہ قلب کی صفائی ہو کر عکس پذیری کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر چیز کی منجھائی ہوتی ہے اور دل کو مانجھنے والا اللہ کا ذکر ہے۔ (رواہ البیہقی) عن عبداللہ بن عمرو بن العاص۔

امام مالک، امام احمد اور بیہقی نے حضرت معاذ بن جبل کی روایت سے بیان کیا۔ حضرت معاذ نے فرمایا میں نے خود، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ اللہ نے فرمایا، جو دو آدمی میرے لئے باہم محبت کرتے ہیں میرے لئے مل کر بیٹھتے ہیں میرے لئے خرچ کرتے ہیں ان سے میری محبت واجب ہو جاتی ہے۔

محبت کا فائدہ:

صحیحین میں حضرت ابن مسعود کی روایت سے آیا ہے کہ ایک شخص نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اس شخص کے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں جو کسی قوم سے محبت رکھتا ہے مگر اس قوم کے عمل تک اس کی رسائی نہیں ہوئی۔ فرمایا آدمی کا شمار انہی لوگوں کے ساتھ ہوگا جن سے اس کو محبت ہوگی۔ رسائی نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کے عمل اس قوم کے اعمال کی طرح نہ ہو سکے ہوں۔ صحیحین میں حضرت انسؓ کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث آئی ہے۔

اللہ والوں کی صحبت:

بیہقی نے شعب الایمان میں لکھا ہے کہ حضرت ابورزین نے بیان کیا مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں تجھے بتاؤں کہ اس کام کا مدار کس چیز پر ہے جس سے تجھے دنیا اور آخرت کی بھلائی مل جائے (مدار خیر یہ ہے کہ) اہل ذکر کی مجلسوں میں حاضری کی پابندی کر اور تنہائی ہو تو جہاں تک ہو سکے اللہ کے ذکر سے زبان کو ہلاتا رہ اور اللہ کے واسطے محبت اور اللہ کے واسطے نفرت کر (یعنی اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے لوگوں سے محبت و عداوت رکھ، ذاتی غرض کوئی نہ ہو۔

امام احمد اور ابوداؤد نے حضرت ابوذر کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کے نزدیک سب سے پیارا عمل یہ ہے کہ اللہ کی خوشنودی کے لئے محبت اور بغض کیا جائے۔ (تفسیر مظہری)

اللہ کا محبوب کون ہے:

اولیاء میں ایک جماعت اللہ کی محبوبیت کے درجہ پر بھی فائز ہو جاتی ہے۔ مسلم نے حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ جب کسی بندہ سے محبت کرتا ہے تو جبرئیل کو طلب فرما کر حکم دیتا ہے، میں فلاں بندہ سے محبت کرتا ہوں تو بھی اس سے محبت کر۔ حسب الحکم جبرئیلؑ اس بندے سے پیار کرنے لگتے ہیں پھر جبرئیلؑ آسمان پر (اہل سموات) کو ندا دیتے ہیں کہ اللہ فلاں بندے سے محبت کرتا ہے تم بھی اس سے محبت کرو۔ حسب الارشاد اہل سماء اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔

پھر زمین والوں میں اس کو مقبولیت عطا کر دی جاتی ہے۔ اور جب اللہ کسی بندہ سے نفرت کرتا ہے تو جبرئیلؑ کو طلب فرما کر حکم دیتا ہے، میں فلاں شخص سے نفرت کرتا ہوں تو بھی اس سے نفرت کر۔ حسب الحکم جبرئیل اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ پھر آسمان والوں کو جبرئیلؑ ندا کرتے اور کہتے ہیں: اللہ فلاں شخص سے نفرت کرتا ہے تم بھی اس سے نفرت کرو۔ لوگ اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں، پھر زمین والوں میں اس سے نفرت پیدا کر دی جاتی ہے اور زمین والے اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔

اولیاء اللہ کی علامات کیا ہیں؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا اولیاء اللہ کون ہوتے ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ نے ارشاد فرمایا میرے بندوں میں میرے اولیاء وہ ہیں جن کی یاد میرے ذکر سے اور میری یاد ان کا ذکر کرنے سے ہوتی ہے۔ (بغوی)

حضرت اسماء بنت یزید نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا سنو، کیا میں تم کو نہ بتاؤں کہ تم میں سب سے اچھے کون لوگ ہیں؟ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضرور فرمائیے، فرمایا جن کو دیکھنے سے اللہ کی یاد ہوتی ہے۔ (رواہ ابن ماجہ)

اولیاء کی ہمنشینی اللہ کی ہمنشینی ہے:

اس کا گر یہ ہے کہ اولیاء اللہ کو اللہ سے قرب اور بے کیف مصاحبت حاصل ہوتی ہے اسی وجہ سے ان کی ہم نشینی گویا اللہ کی ہم نشینی اور ان کا دیدار اللہ کی یاد دلانے والا اور ان کا ذکر اللہ کے ذکر کا موجب ہوتا ہے۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسے سورج کے سامنے رکھا ہوا آئینہ جو سورج کی شعاعوں سے جگمگا جاتا ہے اور اس آئینہ کے سامنے جو چیز رکھی جاتی ہے آئینہ کی عکس ریزی سے وہ چیز بھی روشن ہو جاتی ہے بلکہ اگر روئی کو اس آئینے کے سامنے زیادہ قریب رکھا جائے تو آئینہ کے قرب کی وجہ سے روئی جل جاتی ہے اور سورج چونکہ دور ہوتا ہے اس لئے دھوپ میں روئی نہیں جلتی۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ اللہ نے اولیاء کے اندر اثر پذیری اور اثر اندازی کی قوی طاقت رکھی ہے اللہ سے قرب اور بے کیف مناسبت رکھنے کی وجہ سے اولیاء میں اثر پذیری کی صلاحیت زیادہ قوی ہوتی ہے اور جنسیت نوعیت اور شخصیت کے اشتراک کی وجہ سے دوسرے ہم جنس ہم نوع اور مناسب، بالتخصص افراد پر اثر اندازی کی استعداد بھی ان میں قوی ہوتی ہے یہی تاثر و تاثیر کا تعلق اس امر کا باعث ہوتا ہے کہ ان کا حضور، اللہ کے سامنے حضور کا ذریعہ اور ان کو دیکھنا اور ان کے ساتھ بیٹھنا اللہ کی یاد کا موجب ہوتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ دیکھنے والے اور بیٹھنے والے کے دل میں انکار نہ ہو۔ (منکروں کو کوئی فیض حاصل نہیں ہوتا) وَ اللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ۔ اللہ ایمان و اطاعت کی حدود سے باہر نکل جانے والوں کو ہدایت نہیں کرتا۔

اللہ والوں سے دشمنی اللہ سے دشمنی ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ نے فرمایا جس نے میرے ولی سے دشمنی کی میں نے اس کو (اپنی طرف سے) جنگ کا الٹی میٹم دے دیا ہے۔ رواہ البخاری عن ابی ہریرہؓ۔

ہر وقت حالت ایک جیسی نہیں رہتی:

حضرت حنظلہؓ نے عرض کیا تھا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! جب ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں موجود ہوتے ہیں اور آپ (دوزخ اور جنت کی ہم کو یاد دلاتے ہیں تو گویا ہم اپنی آنکھوں سے جنت و دوزخ کو دیکھ لیتے ہیں لیکن جب آپ کے پاس سے نکل کر ہم باہر جاتے ہیں اور بیویوں، بچوں اور زمینوں کے جھگڑوں میں مشغول ہو جاتے ہیں تو بہت کچھ (جنت و دوزخ کو) بھول جاتے ہیں، فرمایا، قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ اگر ہر وقت تم اسی حالت پر رہو، جس حالت پر میرے پاس اور میرے نصیحت کرنے کے وقت ہو تو فرشتے تمہارے بستروں پر اور تمہارے راستوں میں تم سے مصافحہ کریں مگر حنظلہ وقت وقت ہوتا ہے (ایک حضور کا وقت ایک غیبوبیت کا وقت) یہ الفاظ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ فرمائے۔ رواہ مسلم۔

کشف و کرامت:

عام لوگ کشف و کرامت کو ولایت کی خصوصی نشانی سمجھتے ہیں مگر یہ غلط ہے۔ بہت سے اولیاء کشف و کرامت سے خالی ہوتے ہیں اور کبھی بطور استدراج دوسرے لوگوں میں اولیاء کے علاوہ بھی خرق عادت اور انکشاف غیبی پایا جاتا ہے۔ (اس لئے کشف و کرامت معیار ولایت نہیں ہے اگر بعض اولیاء سے اتفاقاً کشف و کرامت کا ظہور ہو جائے تو اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ کشف و کرامت معیار ولایت ہے۔ اللہ نے اپنے رسول مکرم کو

خطاب کر کے فرمایا: قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ ، آپ کہہ دیجئے کہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں تم جیسا انسان ہوں (مگر مجھے یہ امتیاز ہے) میرے پاس وحی آتی ہے۔ دوسری جگہ خطاب کر کے فرمایا: لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ اگر میں غیب داں ہوتا تو کثیر بھلائی سمیٹ لیتا اور برائی مجھے چھو بھی نہ جاتی۔ ایک جگہ اور خطاب فرمایا ہے **قل انما الایت عند اللہ** آپ کہہ دیجئے کہ معجزات تو اللہ کے قبضہ میں ہیں۔

صوفیاء کرام کا قول ہے، کرامت تو مردوں کا حیض ہے، اس کو چھپانا ہی ضروری ہے۔ کرامت کی وجہ سے ایک ولی کو دوسرے ولی پر فضیلت نہیں ہوتی اسی لئے جن اولیاء کے ہاتھوں سے کرامات کا ظہور زیادہ ہوا ان کو اپنے اس فعل پر ندامت ہوئی۔

لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي
ان کیلئے ہے خوشخبری دنیا کی زندگانی میں اور آخرت میں
الْاٰخِرَةِ

اولیاء کیلئے بشارتیں:

اولیاء اللہ کے لئے دنیا میں کئی طرح کی بشارتیں ہیں مثلاً حق تعالیٰ نے انبیاء کی زبانی جو لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وغیرہ کی بشارت دی ہے، یا فرشتے موت کے قریب ان کو کہتے ہیں۔ اَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (حم سجدہ رکوع ۴) یا کثرت سے سچے اور مبارک خواب انہیں نظر آتے ہیں یا ان کی نسبت دوسرے بندگان خدا کو دکھائی دیتے ہیں جو حدیث صحیح کے موافق نبوۃ کے چھیالیس اجزاء میں سے ایک جزو ہے۔ یا ان کے معاملات میں خدا کی طرف سے خاص قسم کی تائید و امداد ہوتی ہے یا خواص میں اور کبھی خواص سے گزر کر عوام میں بھی ان کو مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ اور لوگ ان کی مدح و ثناء اور ذکر خیر کرتے ہیں۔ یہ سب چیزیں دنیوی بشارت کے تحت میں درجہ بدرجہ آسکتی ہیں۔ مگر اکثر روایات میں لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا کی تفسیر رویائے صالحہ سے کی گئی ہے۔ واللہ اعلم۔ رہی بشارت اخروی، وہ خود قرآن میں منصوص ہے۔ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ اور حدیث میں بھی یہ ہی تفسیر منقول ہے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

اچھا خواب بشارت ہے:

حدیث میں ہے کہ نبوت تو ختم ہوئی البتہ نبوت کا ایک جزء یعنی رویائے صالحہ باقی رہ گیا ہے کہ آپ کے بعد قیامت تک کوئی نبی تو نہیں مگر خدا کے دوستوں کے لئے وحی کا ایک نمونہ یعنی سچا خواب باقی رہ گیا ہے کہ قیامت تک آنے والے مومنین صالحین کو سچے خوابوں سے بشارتیں ملتی رہیں گی۔

مرزا قادیانی کی جہالت:

مرزا غلام احمد قادیانی اس آیت سے یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی نبوت کا یہ سلسلہ باقی ہے اس لئے کہ رؤیائے صالحہ نبوت کا ایک جزو ہے جو ہنوز باقی ہے۔ تو معلوم ہوا کہ نبوت الٰہی باقی ہے۔ مگر مرزائے قادیان کا یہ گمان استدلال نہیں بلکہ صریح جہالت اور ہذیان ہے حدیث میں ہے کہ رؤیائے صالحہ نبوت کا چالیسواں جزء ہے۔ معلوم ہوا کہ نبوت چالیس اجزاء کا نام ہے۔ لہٰذا ایک جزء کے پائے جانے سے کیسے نبوت حاصل ہوسکتی ہے۔

شریعت کی نظر میں دوسو درہم کا مالک ہونے سے غنی اور صاحب نصاب ہوتا ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے۔ اگر دوسو درہم میں سے ایک درہم بھی کم ہو جائے تو وہ غنی نہیں رہتا۔ چہ جائے کہ کسی کے پاس دوسو درہم کا چھیالیسواں حصہ یعنی چار درہم پورے ہوں تو شریعت کی نظر میں وہ غنی نہیں بلکہ فقیر اور مفلس ہے۔ نیز مرزائے غلام احمد کے قول پر لازم آتا ہے کہ جس فاسق و فاجر کو رویائے صالحہ نظر آجائے وہ نبی ہو جائے کیونکہ مرزا لکھتا ہے کہ

جبرئیلی نور یعنی نبوت کا چھیالیسواں حصہ یعنی سچا خواب تمام جہان میں پھیلا ہوا ہے جس سے کوئی فاسق و فاجر اور پرلے درجہ کا بدکار بھی باہر نہیں بلکہ یہاں تک مانتا ہوں کہ تجربہ میں آچکا ہے۔ بعض اوقات ایک نہایت درجہ کی فاسقہ عورت جو کنجریوں کے گروہ میں سے ہو جس کی تمام جوانی بدکاری میں گزری ہے کبھی سچا خواب دیکھ لیتی ہے۔ (توضیح المرام ۳۸، ۳۷)

پس مرزا کے اس قول کی بناء پر کہ سچا خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے اور جس کو یہ چھیالیسواں حصہ حاصل ہو وہ نبی ہے تو اب تمام فاسق و فاجر اور پرلے درجہ کی بدکار رنڈیوں کا مرزا کے قول پر نبی ہونا جائز ہوگا۔ اور مرزائے غلام احمد اور اس کی امت پر اس کنجری کی نبوت پر ایمان لانا فرض ہوگا جس کو کوئی سچا خواب نظر آ گیا۔ **لا حول ولا قوۃ الا باللہ**۔

نیز مرزائے قادیان کے بہت سے پیروؤں نے مرزا کے بعد رویائے صالحہ اور نبوت کا دعویٰ کیا ہے مگر مرزانے ان کی نبوت کو تسلیم نہیں کیا۔ اور نبی کی نبوت کو نہ تسلیم کرنا یہ کفر ہے۔ پس مرزا صاحب خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے انکار سے بھی کافر ہوئے اور اپنے بعد کے مدعیان نبوت کی نبوت کے انکار سے بھی کافر ہوئے۔ (معارف کاندھلویؒ)

عالم مثال کا انکشاف:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد دنیوی بشارت ہے جو اللہ نے اپنے اولیاء کو خواب یا بیداری کی حالت میں عالم مثال کا انکشاف کر کے دیتا ہے رویائے صالحہ (اچھے خواب) سے یہی عالم مثال کا انکشاف مراد ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، سوائے مبشرات (بشارتوں) کے

نبوت کا کوئی جز باقی نہیں رہا (یعنی میرے بعد لوگوں کو سوائے بشارتوں کے اللہ کے کسی قول کی اطلاع براہ راست یا ملائکہ کی معرفت آئندہ نہ ہوگی۔ نبوت کا دروازہ بند ہو گیا) صحابہ نے عرض کیا مبشرات کیا ہیں۔ فرمایا سچے خواب۔ (رواہ البخاری عن ابی ہریرۃ)

حضرت عبادہ بن صامت راوی ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آیت لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا کی تشریح دریافت کی۔ فرمایا (بشریٰ سے مراد) سچا خواب ہے جو آدمی کو دکھایا جاتا ہے۔ (بغوی)

حضرت ابو درداءؓ سے لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا کا معنی دریافت کیا گیا، فرمایا، جب سے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کی تفسیر دریافت کی اب تک سوائے تیرے کسی نے مجھ سے اس کی تفسیر دریافت نہیں کی۔ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا جب سے یہ آیت نازل ہوئی کسی نے تیرے سوا اس کی مراد نہیں دریافت کی۔ (بشریٰ سے مراد) سچا خواب ہے جو مومن کو دکھایا جاتا ہے۔ دنیوی زندگی میں بھی اس کے لئے بشارت ہے اور آخرت میں جنت بشارت ہوگی (امام احمد وسعید بن منصور) یہ حدیث بہت سندوں سے آئی ہے۔

تین قسم کے خواب:

سچے خواب سے مراد عوام کے خواب نہیں بلکہ اولیاء اور صالحین کے خواب مراد ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خواب تین ہوتے ہیں (ایک) اللہ کی طرف سے بشارت (دوسرا) حدیث نفس (یعنی دماغی تخیلات یا تحت الشعور تصورات) (تیسرا) شیطان کی طرف سے ڈراوا (یعنی ہیبت ناک بے سروپا خواب) ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور ترمذی نے اس کو صحیح کہا ہے۔

سچا خواب نبوت کا چھیالیسواں جزو ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا نبوت کے ۴۶ اجزاء میں سے ایک جزء سچا خواب ہے۔ یہ حدیث بخاری نے حضرت ابوسعید کی روایت سے اور مسلم نے حضرت ابن عمر اور حضرت ابو ہریرۃ کی روایت سے بیان کی ہے اسی کی مثل ابن ماجہ نے حضرت عوف بن مالک کی روایت سے بھی بیان کیا ہے۔ (تفسیر مظہری)

امام احمد نے حضرت ابن عمر و حضرت ابن عباس کی روایت سے اور ابن ماجہ نے حضرت ابن عمر کی روایت سے بیان کیا ہے کہ سچا خواب نبوت کے ستر اجزاء میں سے ایک ہے۔

ابن النجار نے حضرت ابن عمر کا قول بیان کیا ہے کہ سچا خواب نبوت کے پچیس اجزاء میں سے ایک جزء ہے۔ البشریٰ سے وہ عمومی بشارت مراد ہے جس کا تعلق جنت اور ثواب سے ہے یہ بشارت ضرور تمام مومنوں کو دی گئی ہے مگر اس کا ظہور اس وقت ہوگا جب ایمان پر خاتمہ ہوا اور ایمان پر خاتمہ کیا معلوم ہو یا نہ ہو۔

لوگوں کی تعریف بھی بشارت ہے:

بعض علماء کے نزدیک البشریٰ سے مراد لوگوں کی طرف سے ستائش ہے۔ بغوی نے عبداللہ بن صامت کی روایت سے بیان کیا ہے کہ حضرت ابوذر نے عرض کیا، یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آدمی! (اچھے) کام تو اپنے لئے کرتا ہے مگر لوگ اس سے محبت کرنے لگتے ہیں فرمایا مؤمن کیلئے یہ بشارت (دنیوی) ہے مسلم کی روایت میں دی بجائے محبت کرنے کے) لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں آیا ہے۔

فرشتوں کی بشارت:

زہری اور قتادہ نے کہا مرنے کے وقت اللہ کی طرف سے ملائکہ بشارت لے کر نازل ہوتے ہیں، البشریٰ سے یہی مراد ہے۔ اللہ نے فرمایا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ عطاء کی روایت میں حضرت ابن عباس کا بھی یہی قول ہے۔

موت کے وقت بشارت:

وفي الآخرة. اور آخرت میں۔ یعنی جان نکلنے کے وقت مومن کی روح کو قرب الٰہی کی طرف لے جایا جاتا ہے اور اللہ کی خوشنودی کی بشارت دی جاتی ہے اور قیامت کے دن قبر سے نکلنے کے وقت بھی اس کو بشارت دی جائیگی۔

حضرت عبادہ بن صامت کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص اللہ سے ملنا پسند کرتا ہے اللہ بھی اس سے ملنا پسند کرتا ہے اور جو شخص اللہ سے ملنے کو ناپسند کرتا ہے اللہ بھی اس کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے۔ حضرت عائشہؓ یا کسی اور بی بی نے عرض کیا، یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم کو تو موت پسند نہیں۔ فرمایا یہ مطلب نہیں ہے، بلکہ مؤمن کے مرنے کا جب وقت آتا ہے تو اس کو اللہ کی خوشنودی اور رحمت کی بشارت دی جاتی ہے۔ پس وہ اللہ سے ملنے کا خواستگار ہو جاتا ہے اور کافر کی موت سامنے آتی ہے تو اس کو اللہ کے عذاب اور سزا کی اطلاع دی جاتی ہے۔ اس کو اپنے سامنے آنے والے عذاب سے زیادہ ناگوار اور کوئی چیز نہیں ہوتی اس لئے اللہ سے ملنے کو پسند نہیں کرتا اور اللہ بھی اس سے ملنا ناپسند کرتا ہے۔ (رواہ البخاری ومسلم فی الصحیحین)

حضرت ابن عمر کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، لا اله الا الله والوں کو نہ موت کے وقت وحشت ہوگی نہ قبروں میں نہ قبروں سے اٹھنے کے وقت گویا وہ منظر میرے سامنے ہے کہ چیخ (صور کی آواز) کے وقت وہ (اہل ایمان) سروں سے مٹی جھاڑتے ہوئے کہہ رہے ہیں: الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ سزاوار ستائش ہے وہ اللہ جس نے ہم سے سختی کو دور کیا۔ رواہ الطبرانی۔ ثعلبی نے دیباچ میں حضرت ابن عباس کا مرفوع قول بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔ (تفسیر مظہریؒ)

صحابہؓ کیلئے بشارتیں:

لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا دنیوی زندگی میں انہی کے لئے بشارت ہے۔ یہ بشارت وہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو عموماً اور بعض مخصوص صحابہ کو خصوصاً دی تھی۔

ترمذی نے حضرت عبدالرحمن بن عوف کی روایت سے اور ابن ماجہ نے حضرت سعید بن زید کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابوبکرؓ جنت میں (یعنی جنتی) ہے، عمرؓ جنتی ہے، عثمانؓ جنتی ہے، علیؓ جنتی ہے، طلحہؓ جنتی ہے، زبیرؓ جنتی ہے، عبدالرحمن بن عوفؓ جنتی ہے، سعد بن ابی وقاصؓ جنتی ہے، سعید بن زیدؓ جنتی ہے، ابوعبیدہ بن جراحؓ جنتی ہے۔

ابوداؤد نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میری امت میں سب سے پہلے اے ابوبکر تم جنت میں جاؤ گے۔ ترمذی نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، سب سے پہلے زمین پھٹ کر میں برآمد ہوں گا پھر ابوبکرؓ پھر عمرؓ۔ ترمذی نے حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر نبی کا ایک رفیق ہوگا اور میرا رفیق جنت کے اندر عثمانؓ ہوگا۔

حضرت سعد بن ابی وقاص کی روایت سے بخاری ومسلم نے صحیحین میں بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا، تم مجھ سے اس جگہ پر ہو جس جگہ پر ہارونؑ موسیٰؑ سے تھے (یعنی جو قرب درجہ یا قرب نسب یا قرب محبت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے ہارونؑ کو حاصل تھا وہی قرب تم کو مجھ سے حاصل ہے) میرے بعد کوئی نبی نہیں۔

حضرت زید بن ارقم کی روایت سے امام احمد اور ترمذی نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جس کا مولیٰ، (آقا، سردار، دوست) میں ہوں، علیؓ بھی اس کا مولیٰ ہے۔

حضرت مسور بن مخرمہ کی روایت سے صحیحین میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، فاطمہ میرا ٹکڑا ہے، جس نے اس کو ناراض کیا اس نے مجھے ناراض کیا۔

ترمذی نے حضرت ابوسعید خدری کی روایت سے بیان کیا، حسن اور حسین جنتی جوانوں کے سردار ہیں۔ یہ بھی فرمایا، جنت کی عورتوں میں سب سے بہتر مریم بنت عمران اور خدیجہ بنت خویلدہ ہیں۔ اور فرمایا عورتوں پر عائشہؓ کی برتری ایسی ہے جیسے ثرید کی فضیلت (باقی) کھانوں پر۔ اور یہ بھی فرمایا کہ عبداللہ یعنی ابن عمر صالح آدمی ہے (رواہ البخاری ومسلم فی الصحیحین عن ابن عمر) حضرت عبداللہ بن سلام کے متعلق فرمایا کہ وہ اہل جنت میں سے ہے (متفق علیہ عن سعد بن ابی وقاص) اور فرمایا انصار سے محبت نہیں رکھتا مگر مؤمن اور ان سے بغض نہیں رکھتا مگر منافق (یعنی انصار سے محبت رکھنا ایمان کی علامت اور ان سے بغض رکھنا نفاق کی نشانی ہے) جو ان سے محبت کرے گا اللہ اس سے محبت کرے گا اور جو ان سے بغض رکھے گا اللہ اس سے نفرت کرے گا۔ اور فرمایا اسید بن حضیر کیسا اچھا آدمی ہے۔ معاذ بن جبل کیسا اچھا آدمی ہے معاذ بن جموح کیسا اچھا آدمی ہے۔

اور فرمایا، جنت تین شخصوں کی مشتاق ہے، علیؓ۔ عمارؓ۔ سلمانؓ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح بکثرت صحابہ کو تفصیل کے ساتھ بشارتیں دی تھیں۔ اور اللہ نے سب صحابہ کو بشارت دیتے ہوئے فرمایا ہے، وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى اور اللہ نے ہر ایک (مخلص صحابی) سے جنت کا وعدہ کر رکھا ہے۔ دوسری آیت میں بھی عمومی بشارت دی ہے۔ فرمایا ہے، مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ الخ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میرے اصحاب کو برا بھلا نہ کہو کیونکہ اگر تم میں سے کوئی (کوہ) احد کے برابر سونا راہ خدا میں صرف کرے تو ان کے ایک لپ بلکہ آدھ سیر (راہ خدا میں صرف کرنے) کو نہیں پہنچے گا۔ رواہ البخاری ومسلم فی الصحیحین عن ابی سعید الخدری۔

رزین نے حضرت عمر کی روایت سے بیان کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے اصحاب ستاروں کی طرح ہیں۔ جس کی (روشنی کی) پیروی کرو گے ہدایت پالو گے۔

اور فرمایا، میری امت میں سب سے بہتر لوگ میرے زمانہ کے ہیں پھر وہ لوگ جو ان سے متصل آئیں گے اور پھر وہ لوگ جو ان کے متصل آئیں گے۔ (متفق علیہ عن عمران بن حصین) (تفسیر مظہری)

لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ
بدلتی نہیں اللہ کی باتیں

یعنی اللہ کی باتیں اور اس کے وعدے سب پختہ اور اٹل ہیں۔ جو بشارتیں دی ہیں ضرور پہنچ کر رہیں گی۔

ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۶۴﴾ وَلَا يَحْزُنْكَ
یہی ہے بڑی کامیابی اور رنج مت کر
قَوْلُهُمْ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا هُوَ السَّمِيْعُ
ان کی بات سے، اصل میں سب زور اللہ کیلئے ہے وہی ہے سننے والا
الْعَلِيْمُ ﴿۶۵﴾
جاننے والا

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی:

اوپر سے اعدائے مکذبین کا ذکر چلا آتا تھا ان کے بالمقابل دوسروں کا

تذکرہ فرمایا اور ان کو دارین میں محفوظ رہنے کی بشارت سنائی۔ اسی سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جاتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم احمقوں اور شریروں کی باتوں سے رنجیدہ نہ ہوں، غلبہ اور زور سب خدا کے لئے ہے وہ اپنے زور تائید سے حق کو غالب و منصور اور مخالفین کو ذلیل و رسوا کر کے چھوڑے گا وہ ان کی سب باتیں سنتا اور سب حالات جانتا ہے۔

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي
سنتا ہے اللہ کا ہے جو کوئی ہے آسمانوں میں اور جو کوئی ہے
الْاَرْضِ ؕ وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ
زمین میں اور یہ جو پیچھے پڑے ہیں اللہ کے سوا شریکوں کو
دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ
پکارنے والے سو یہ کچھ نہیں مگر پیچھے پڑے ہیں اپنے خیال کے
وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۶۶﴾
اور کچھ نہیں مگر اٹکلیں دوڑاتے ہیں

مشرکوں کے ہاتھ میں کوئی حقیقت نہیں:

یعنی کل زمین و آسمان میں خدائے واحد کی سلطنت ہے سب جن وانس اور فرشتے اسی کے مملوک و مخلوق ہیں۔ مشرکین کا غیر اللہ کو پکارنا اور انہیں خدائی کا حصہ دار بنانا، محض اٹکل کے تیر اور واہی تباہی خیالات ہیں۔ ان کے ہاتھ میں نہ کوئی حقیقت ہے نہ حجت و برہان، خالی اوہام وظنون کی اندھیریوں میں پڑے ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ (تفسیر عثمانیؒ)

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ خوب سن لو کہ آسمانوں اور زمین میں جو لوگ (ملائکہ۔ جن۔ انس) ہیں وہ اللہ کے (پیدا کئے ہوئے اور مملوک ومقبوض اور بندے) ہیں۔ اور جب وہ ہستیاں جو تمام مخلوق میں اعلیٰ ہیں اللہ کی محکوم و پرستار ہیں ان میں کوئی بھی رب ہونے کے قابل نہیں تو جو مخلوق نادان، بے جان، بے عقل ہے وہ اللہ کی شریک اور مثل کیسے ہوسکتی ہے۔ (تفسیر مظہریؒ)

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ
وہی ہے جس نے بنایا تمہارے واسطے رات کو کہ چین حاصل کرو
وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ
اس میں اور دن دیا دکھلانیوالا بیشک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں

يَّسْمَعُوْنَ ﴿۶۷﴾
کیلئے جو سنتے ہیں

مجوسیوں کا رد: دن رات اور اندھرے اجالے کا پیدا کرنیوالا وہی ایک خدا ہے۔ اسی سے خیر وشر اور تمام متقابل اشیاء کی پیدائش کو سمجھ لو۔ اس میں "مجوس" کے شرک کا رد ہوگیا۔

شرک کے اندھیرے کا علاج:

ادھر بھی لطیف اشارہ کر دیا کہ جس طرح رات کی تاریکی کے بعد خدا روز روشن کو لاتا ہے اور دن کے اجالے میں وہ چیزیں نظر آتی ہیں جو شب کی ظلمت میں دکھائی نہ دیتی تھیں۔ ایسے ہی مشرکین کے اوہام وظنون کی اندھیریوں کا پردہ چاک کرنے کے لئے اس نے قرآن کریم کا آفتاب چمکایا جو لوگوں کو وصول الی اللہ کا ٹھیک راستہ دکھانے والا ہے۔

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ الْغَنِيُّ ؕ
کہتے ہیں ٹھہرالیا اللہ نے بیٹا وہ پاک ہے وہ بے نیاز ہے
لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ اِنْ
اسی کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں نہیں
عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۭ بِهٰذَا ؕ اَتَقُوْلُوْنَ
ہے تمہارے پاس کوئی سند اس کی کیوں جھوٹ کہتے ہو
عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾
اللہ پر جس بات کی تم کو خبر نہیں

عیسائیت کا رد: اس میں عیسائیوں کے شرک کا رد ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے تھے سمجھنے کی بات یہ کہ اگر وہ واقعی طور پر "مسیح" کو خدا کا (معاذ اللہ) صلبی بیٹا سمجھتے ہیں تو اس سے بڑھ کر کیا گستاخی ہوگی خداوند قدوس بالبداہتہ بیوی بچوں سے پاک ہے۔ اور اگر بیٹے سے مراد متبنیٰ ہے تو خدا کو اس کی ضرورت کیا پیش آئی کہ ایک مخلوق کو متبنیٰ بنائے۔ کیا معاذ اللہ اسے اولاد کی حسرت اور بیٹا نہ ہونے کا غم تھا؟ یا یہ فکر تھی کہ اس کے بعد مال و دولت کا وارث اور اس کا نام روشن کرنے والا کون ہوگا؟ یا یہ کہ بڑھاپے اور حرج مرج میں کس سے سہارا ملے گا؟ (العیاذ باللہ) وہ تو سب سے بے نیاز ہے اور سب ہر وقت اس کے محتاج ہیں۔ اسے بیٹے پوتے یا متبنیٰ وغیرہ کی احتیاج کہاں ہوسکتی ہے؟ سب چیزیں اس کی مملوک و مخلوق ہیں۔ پھر مالک و مملوک اور خالق و مخلوق کے درمیان ان نسبی رشتوں کی کہاں گنجائش ہے۔ یہ بڑی سخت بات ہے کہ خدا کی

نسبت محض جہالت سے ایسی جھوٹی اور بے سند باتیں کہی جائیں۔ (تفسیر عثمانیؒ)

سبحٰنہٗ اللّٰہ (اس تہمت سے) پاک ہے۔ یعنی کسی کا باپ بننے سے منزہ ہے۔ یہ فقرۂ تنزیہیہ سنزیہیہ بھی ہے اور احمقوں کے کلام پر تعجب کا اظہار بھی ہے کہ یہ لوگ ایسی بات کہہ رہے ہیں جس کا وقوع بھی ناممکن اور تصور بھی (یعنی سبحان اللہ کیسی سخت بات کہہ رہے ہیں)

ھو الغنی ،وہ ہی بے نیاز ہے کسی چیز کا حاجت مند نہیں، کسی کی اس کو احتیاج نہیں، اس کے سوا ہر چیز ممکن ہے، اپنے وجود، بقاء وجود اور تمام حالات و صفات میں اسی کی محتاج ہے۔ بے نیاز اللہ اور محتاج ممکن میں کوئی مناسبت نہیں۔ پھر کس طرح اللہ والد اور کوئی مخلوق اس کی اولاد ہو سکتی ہے۔ اولاد کو تو اپنے والد کا ہم جنس ہونا چاہئے۔ یا یوں کہا جائے کہ اولاد کی ضرورت وہاں ہوتی ہے جہاں باپ کمزور ہو اور بیٹے کی وجہ سے طاقت حاصل کرنا چاہتا ہو یا مفلس ہو اور بیٹے سے مالی مدد کا خواستگار ہو یا اس کو عزت حاصل نہ ہو اور قابل بیٹا اس کے لئے باعث عزت ہو جائے یا باپ مر جانے والا ہو اور اپنی نسل قائم رکھنا چاہتا ہو (بہر حال باپ کو بیٹے کی ضرورت کسی غرض اور حاجت کے زیر اثر ہوتی ہے) اور مذکورہ بالا کسی قسم کی حاجتمندی سے اللہ بے نیاز ہے وہ غنی اور قدیم ہے۔ (تفسیر مظہریؒ)

قُلْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ
کہہ جو لوگ باندھتے ہیں اللہ پر جھوٹ بھلائی
لَا يُفْلِحُوْنَ ۝٦٩ مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا
نہیں پاتے تھوڑا سا نفع اٹھا لینا دنیا میں پھر ہماری
مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيْدَ
طرف ہے ان کو لوٹنا پھر چکھائیں گے ہم ان کو سخت
بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۝٧٠
عذاب بدلہ ان کے کفر کا

جھوٹے کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے:

یعنی خدا پر جھوٹ باندھنے والے خواہ دنیا میں کیسی ہی طاقت رکھتے ہوں اور اپنے ساز و سامان پر مغرور ہوں لیکن انہیں حقیقی بھلائی اور کامیابی ہرگز نصیب نہیں ہو سکتی۔ تھوڑے دن دنیا کے مزے اڑا لیں، انجام کار ان کا معاملہ خدا کی طرف رجوع ہوگا۔ جہاں سے اپنے جرائم کی پاداش میں نہایت سخت عذاب کا مزہ چکھیں گے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ
اور سنا ان کو حال نوح کا

قوم نوح سے سبق حاصل کرو:

یعنی اہل مکہ کو نوحؑ اور اس کی قوم کا حال سناؤ تا کہ معلوم ہو کہ مکذبین و مفترین کو حقیقی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ ان کی اچھل کود اور چمک دمک محض چند روزہ ہے جو انجام کار ہلاکت ابدی پر منتہی ہوتی ہے۔ اہل مکہ کو قوم نوح کا قصہ سن کر عبرت حاصل کرنا چاہئے کہ اگر وہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب و عداوت اور اپنی شرکیات سے باز نہ آئے تو ان کا انجام بھی وہی ہو سکتا ہے جو نوحؑ کی تکذیب کرنے والوں کا ہوا۔ نیز اس واقعہ کے بیان کرنے میں پیغمبر علیہ السلام کو تسلی دینا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کی دشمنی اور شرارت سے زیادہ دلگیر نہ ہوں۔ ہر نبی کو اس قسم کے حالات کا مقابلہ کرنا پڑا ہے۔ پھر آخر میں حق ہی غالب ہو کر رہا اور حق و صداقت کے دشمن تباہ و برباد کر دیئے گئے۔

ان واقعات کا سبق:

عام سامعین کو ان واقعات کے ایسے مفصل بیان سے سبق ملتا ہے کہ نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم باوجود امی ہونے اور کسی مخلوق کے سامنے ایک منٹ کے لئے بھی زانوئے تلمذ تہ نہ کرنے کے پچھلی قوموں کے اس قدر صحیح اور پختہ احوال بیان فرماتے ہیں جو بظاہر بدون تعلیم اور طویل استفادہ کے ممکن نہیں، ناچار ماننا پڑے گا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معلم کوئی انسان نہیں، بلکہ سب انسانوں کا پیدا کرنے والا ہے۔ یہ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کی ایک دلیل ہوگی۔ (تفسیر عثمانیؒ)

اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ
جب کہا اپنی قوم کو اے قوم اگر بھاری ہوا ہے
عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ
تم پر میرا کھڑا ہونا اور نصیحت کرنا اللہ کی آیتوں سے
فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْا اَمْرَكُمْ
تو میں نے اللہ پر بھروسہ کیا اب تم سب مل کر مقرر کرو اپنا کام
وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ
اور جمع کرو اپنے شریکوں کو پھر نہ رہے تم کو اپنے کام میں
غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ ۝٧١

شبہ پھر کر گزرو میرے ساتھ اور مجھ کو مہلت نہ دو

پیغمبر کا مقابلہ کوئی نہیں کرسکتا:

یعنی تمہاری خوشی ناخوشی یا موافقت ومخالفت کی مجھے ذرہ برابر پروا نہیں تمام پیغمبروں کی طرح میرا بھروسہ صرف خدائے واحد پر ہے اگر تم میری نصیحت وفہمائش سے برا مانو تو مانا کرو۔ میں اپنے فرائض منصبی کے ادا کرنے میں قصور نہیں کرسکتا۔ تم برا مان کر مجھ سے دشمنی کرو اور نقصان پہنچانا چاہو تو یہ چیز میرے ارادوں پر قطعاً اثر ڈالنے والی نہیں۔ جو کچھ تمہارے امکان میں ہے شوق سے کر گزرو، میرے خلاف مشورہ کر کے کوئی تجویز پختہ کرلو۔ اپنے رفقائے کار بلکہ فرضی معبودوں کو بھی جمع کر کے ایک غیر مشکوک اور غیر مشتبہ رائے پر قائم ہو جاؤ۔ پھر متفقہ طاقت سے اسے جاری کر ڈالو۔ ایک منٹ کی مہلت بھی مجھ کو نہ دو۔ پھر دیکھ لو کہ پیغمبرانہ استقامت وتوکل کا پہاڑ تمام دنیا کی طاقتوں اور تدبیروں کو کچل کر کس طرح پاش پاش کر ڈالتا ہے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ
پھر اگر منہ پھیروگے تو میں نے نہیں چاہی تم سے
اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۙ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ
مزدوری میری مزدوری ہے اللہ پر اور مجھ کو حکم ہے کہ رہوں
مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۷۲﴾
فرماں بردار

پیغمبر کسی تکلیف سے نہیں ڈرتا:

یعنی تمہارے مقابلہ میں نہ جانی وبدنی تکالیف سے گھبراتا ہوں اور نہ مالی نقصان کی کوئی فکر ہے کیونکہ میں نے خدمت تبلیغ ودعوت کا کچھ معاوضہ تم سے طلب نہیں کیا جو یہ اندیشہ ہو کہ تمہاری ناخوشی سے میری تنخواہ بند ہو جائیگی۔ یا کم از کم تم کو یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ میری ساری جدوجہد مال کی حرص اور روپیہ کے لالچ سے تھی میں جس کا کام کر رہا اور حکم بجا لا رہا ہوں اسی کے ذمہ میری اجرت ہے، جب میں اس کا فرمانبردار ہوں اور خدمتِ مفوضہ بے خوف وخطر انجام دیتا ہوں تو کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنے فضل ورحمت کے دروازے مجھ پر نہ کھولے رکھے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

وعظ نصیحت سے پیغمبر کا کوئی ذاتی مفاد نہیں ہوتا:

اصل مطلب (تشریحی) اس طرح ہے کہ اگر تم میرے وعظ ونصیحت سے اب بھی روگردانی کروگے اور میری بات نہیں مانوگے تو ہلاک ہو جاؤ گے یا اللہ تم کو عذاب دے گا کیونکہ تمہاری روگردانی کی کوئی معقول وجہ نہیں۔ قبولِ حق سے کوئی امر مانع نہیں۔ اس وعظ وتذکیر میں میرا کوئی مقصد نہیں۔ میں اس دعوت کا معاوضہ تم سے نہیں چاہتا کہ تم معاوضہ ادا کرنے سے قاصر ہو اور اس لیے روگردانی کر رہے ہو یا مجھے (دنیا طلبی کی تہمت سے) متہم کرسکو۔ یا یہ مطلب ہے کہ روگردانی کروگے تو خود اپنا نقصان کروگے، میرا کچھ بگاڑ نہ ہوگا۔ میں تم سے معاوضہ کا طلبگار نہیں کہ تمہاری روگردانی سے مجھے معاوضہ نہ ملے تمہارا ہی بگاڑ ہوگا تم ہی ہدایت سے محروم ہوگے۔ (تفسیر مظہریؒ)

فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِى الْفُلْكِ
پھر اس کو جھٹلایا سو ہم نے بچالیا اس کو
وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ
اور جو اس کے ساتھ تھے کشتی میں اور ان کو قائم کر دیا جگہ پر اور ڈبا دیا
كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
ان کو جو جھٹلاتے تھے ہماری باتوں کو سو دیکھ لے کیسا ہوا انجام ان کا
الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۷۳﴾
جن کو ڈرایا تھا

جھٹلانے والوں کا انجام:

یعنی جس کے پاس عبرت ہو وہ دیکھ لے کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا۔ ان لوگوں کو سینکڑوں برس نوح علیہ السلام نے نصیحت کی، نفع وضرر سے آگاہ کیا، جب کوئی بات مؤثر نہ ہوئی بلکہ الٹا عناد وفرار بڑھتا گیا۔ اس وقت خدا نے سخت طوفان پانی کا بھیجا۔ سب مکذبین غرقاب کر دیئے گئے۔ صرف نوح علیہ السلام اور چند نفوس جو ان کے ساتھ کشتی پر سوار تھے، محفوظ رہے۔ ان ہی سے آگے نسلِ انسانی چلی۔ اور ڈوبنے والوں کی جگہ یہی آباد ہوئے۔ نوح علیہ السلام کا کچھ قصہ سورۂ "اعراف" میں گزر چکا۔ (تفسیر عثمانیؒ)

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ
پھر بھیجے ہم نے نوح کے بعد کتنے پیغمبر ان کی قوم کی طرف
فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا
پھر لائے ان کے پاس کھلی دلیلیں سو ان سے یہ نہ ہوا کہ ایمان لے
بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ؕ
آئیں اس بات پر جسکو جھٹلا چکے تھے پہلے سے

جھوٹی قومیں: یعنی نوحؑ کے بعد ہودؑ، صالحؑ، لوطؑ، ابراہیمؑ، شعیبؑ وغیرہ انبیاء کو اپنی اپنی قوم کی طرف کھلے ہوئے نشانات دے کر بھیجا، لیکن جس جہالت اور کفر کی حالت میں وہ لوگ اپنے اپنے پیغمبر کی بعثت سے پہلے تھے اور جن چیزوں کو پیشتر سے جھٹلاتے چلے آ رہے تھے، یہ توفیق نہ ہوئی کہ انبیاء کے تشریف لانے اور سمجھانے کے بعد ان کو مان لیتے۔ بلکہ جن اصول صحیحہ کی تکذیب پہلے قوم نوحؑ کر چکی تھی، ان سبھوں نے بھی ان کے ماننے سے انکار کر دیا۔ اور جب پہلی مرتبہ منہ سے ''نہ'' نکل گئی، ممکن نہ تھا کہ پھر کبھی ''ہاں'' نکل سکے، اسی بے ایمانی اور تکذیبِ حق پر آخر تک اڑے رہے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۷۴﴾
اسی طرح ہم مہر لگا دیتے ہیں دلوں پر حد سے نکل جانیوالوں کے

انکار کی نحوست:

جو لوگ تکذیب و عداوتِ حق میں حد سے نکل جاتے ہیں ان کے دلوں پر مہر لگنے کی یہ ہی صورت ہوتی ہے کہ اول تکذیب کرتے ہیں، پھر اس پر ضد اور اصرار کرتے کرتے محض دشمنی اور عناد کی روش اختیار کر لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ دل کی کلیں بگڑ جاتی ہیں اور قبولِ حق کی استعداد باقی نہیں رہتی۔ (تفسیر عثمانیؒ)

امت محمدیہ کے منکر:

یعنی جس طرح ہم نے قومِ نوحؑ اور نوحؑ کے بعد آنے والے کی امتوں کے دلوں پر مہر لگا دی تھی (بے مدد چھوڑ دیا تھا) اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے جو لوگ حکمِ خداوندی سے تجاوز کرنے والے ہیں ان کے دلوں پر بھی مہر لگا دیتے ہیں۔ اور چونکہ وہ خود گمراہی میں غرق ہیں اور خواہشاتِ نفس کو نہیں چھوڑتے اس لئے ہم بھی ان کو بے مدد چھوڑ دیتے ہیں۔ (تفسیر مظہریؒ)

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَهٰرُوْنَ
پھر بھیجا ہم نے ان کے پیچھے موسیٰ اور ہارون کو
اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا
فرعون اور اسکے سرداروں کے پاس اپنی نشانیاں دیکر پھر تکبر کرنے
وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۷۵﴾
لگے اور وہ تھے لوگ گنہگار

فرعونیوں کا تکبر:

یعنی جرائم پیشہ لوگ تھے۔ نافرمانی کی خو قبولِ حق کی اجازت کہاں دیتی۔ تکبر مانع ہوا کہ خدا کی نشانیوں کو دیکھ کر اس کے سفراء کے سامنے گردن جھکائیں۔ ''وجحدوا بها واستيقنتها انفسهم ظلماً و علوا'' (النمل رکوع۱) یہ ہی تکبر تھا جس نے فرعون سے یہ الفاظ کہلوائے۔ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ (شعراء رکوع۲)

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا
پھر جب پہنچی ان کو سچی بات ہمارے پاس سے کہنے لگے یہ
لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷۶﴾
تو جادو ہے کھلا

فرعونیوں کا انکار:

یعنی ''عصا'' اور ''ید بیضا'' وغیرہ کے معجزات دیکھ کر اور موسیٰ علیہ السلام کی نہایت پر تاثیر باتیں سن کر کہنے لگے کہ یہ سب کھلا ہوا جادو ہے۔ کیونکہ انکے خیال میں تمام فوق العادۃ چیزوں کا آخری درجہ ''جادو'' ہی ہو سکتا تھا۔ (تفسیر عثمانی)

قَالَ مُوْسٰٓى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ
کہا موسیٰ نے کیا تم یہ کہتے ہو حق بات کو جب وہ پہنچے تمہارے پاس
اَسِحْرٌ هٰذَا ؕ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ﴿۷۷﴾
کیا یہ جادو ہے اور نجات نہیں پاتے جادو کرنیوالے

فرعونیوں کی کم عقلی:

یعنی حق کو جادو کہتے ہو، کیا جادو ایسا ہوتا ہے؟ اور کیا جادو کرنے والے نبوت کا دعویٰ کر کے حق و باطل کی کشمکش سے کامیاب نکل سکتے ہیں۔ سحر اور معجزہ میں تمیز نہ کر سکنا ان کوتاہ فہموں کا کام ہے جو سونے اور پیتل میں تمیز نہ کر سکیں۔ پیغمبر کے روشن چہرے، پاکیزہ اخلاق، نور، تقویٰ، پر شوکت و عظمت احوال میں بدیہی شہادت اس کی موجود ہوتی ہے کہ جادوگری اور شعبدہ بازی سے انہیں کوئی دور کی نسبت بھی نہیں۔ پیغمبر کو ''ساحر'' کہنا کس درجہ بے حیائی یا دیوانگی ہے۔

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ
بولے کیا تو آیا ہے کہ ہم کو پھیر دے اس رستہ سے جس پر پایا ہم نے
اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِى الْاَرْضِ ؕ
اپنے باپ دادوں کو اور تم دونوں کو سرداری مل جائے اس ملک میں

وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۸﴾
اور ہم نہیں ہیں تم کو ماننے والے

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر الزام:

یعنی معاذ اللہ تم دنیا کے حریص اور بدنیت ہو، ایک سیاسی تحریک کو مذہبی رنگ میں پیش کرتے ہو۔ تمہاری غرض یہ معلوم ہوتی ہے کہ مذہبی حیثیت سے ایک انقلاب عظیم برپا کر کے اس ملک میں اپنی حکومت اور سرداری جماؤ۔ اور یہاں کے قدیم سرداروں (قبطیوں) کو برطرف کر دو۔ سو یاد رہے کہ یہ خواہش پوری ہونے والی نہیں۔ ہم لوگ ہرگز تمہاری بات نہ مانیں گے نہ تمہاری بزرگی کبھی تسلیم کریں گے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِىْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿۷۹﴾
اور بولا فرعون لاؤ میرے پاس جو جادوگر ہو پڑھا ہوا

فرعون کی تدبیر:

یہ موسیٰ علیہ السلام کی تقریر کا جواب تھا۔ یعنی رہا سحر اور معجزہ کا جھگڑا، اس کا ہم عملاً تصفیہ کئے دیتے ہیں کہ اس ملک کے بڑے بڑے ماہر جادوگر اکٹھے کئے جائیں، پھر آپ ان کے خوارق کے مقابل اپنے معجزات دکھلائیں۔ دنیا مشاہدہ کر لے گی کہ تم پیغمبر ہو یا (معاذ اللہ) جادوگر ہو۔ اس کے لئے فرعون نے تمام ملک میں گشتی جاری کر دی اور آدمی بھیج دیئے کہ مشاق اور ماہر جادوگر جہاں کہیں ہوں فوراً حاضر کئے جائیں۔ اس کا مفصل واقعہ سورۂ اعراف میں گذر چکا، وہاں ملاحظہ کر لیا جائے۔

فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا
پھر جب آئے جادوگر کہا ان کو موسیٰ نے ڈالو جو تم ڈالتے ہو
مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿۸۰﴾

جادوگروں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا آمنا سامنا:

دوسری جگہ مذکور ہے کہ ساحرین نے موسیٰ علیہ السلام سے دریافت کیا تھا کہ اپنا کرتب دکھلانے میں تم پہل کرتے ہو یا ہم کریں۔ اس کے جواب میں موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ جو تم کو دکھلانا ہے دکھلاؤ کیونکہ باطل کی پوری زور آزمائی اور نمائش کے بعد حق کا آنا اور باطل کو نیچا دکھا کر ملیا میٹ کر دینا زیادہ موثر اور غلبۂ حق کو زیادہ واضح کرنے والا ہے۔

فَلَمَّآ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ
پھر جب انہوں نے ڈالا موسیٰ بولا کہ جو تم لائے ہو سو جادو ہے
السِّحْرُ ؕ

جادوگروں کا کرتب:

ساحرین نے اپنی لاٹھیاں اور رسیاں زمین پر پھینک دیں اور تخیل و نظر بندی سے دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہونے لگا گویا تمام میدان زندہ سانپوں سے بھرا ہوا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ "جادو" یہ ہے وہ جادو نہ تھا جسے فرعون اور اس کے خوشامدیوں نے جادو کہا تھا۔

اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ
اب اللہ اس کو بگاڑتا ہے بیشک اللہ نہیں سنوارتا شریروں کے کام
عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۸۱﴾

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تقریر:

یعنی بس تم اپنی قوت صرف کر چکے، اب سنبھل جانا کہ خدا اپنی قدرت و رحمت سے یہ سب بنا بنایا کھیل بگاڑتا ہے جو میرے مقابلہ میں پھر کبھی نہیں سنور سکے گا۔ کیونکہ خدا کی عادت و حکمت کے خلاف ہے کہ مصلح و مفسد کے مقابلہ کے وقت جبکہ اس سے مقصود خالص اتمام حجت ہو مفسدوں اور شریروں کی بات سنوار دے اور کلمۂ حق کو پست و مغلوب کر دے۔

وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ
اور اللہ سچا کرتا ہے حق بات کو اپنے حکم سے اور پڑے برا مانیں
الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ
گنہگار پھر کوئی ایمان نہ لایا موسیٰ پر مگر کچھ لڑکے اس کی
قَوْمِهٖ
قوم کے

بنی اسرائیلی نوجوانوں کا ایمان لے آنا:

"بنی اسرائیل" فرعونیوں کے ہاتھوں سخت مصیبت اور ذلت اٹھا رہے

تھے اور پرانی پیشین گوئیوں کے مطابق منتظر تھے کہ فرعون کے مظالم کا خاتمہ کرنے اور اس کی سلطنت کا تختہ الٹنے والا ''اسرائیلی'' پیغمبر مبعوث ہو۔ موسیٰ علیہ السلام ٹھیک اسی شان سے تشریف لائے جس کا انہیں انتظار تھا۔ اس لئے تمام بنی اسرائیل قدرتی طور پر موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کو نعمت عظمیٰ سمجھتے تھے، وہ دل سے حضرت موسیٰ کو سچا جانتے اور ان کی عزت کرتے تھے۔ مگر اکثر آدمی فرعون اور فرعونی سرداروں سے خوفزدہ تھے، اسی لئے ابتداء میں شرعی طور پر ایمان نہیں لائے وقت کے منتظر رہے کہ جس وقت حق کا غلبہ ہوگا مسلمان ہو جائیں گے۔ بنی اسرائیل کے تھوڑے سے نوجوانوں نے ہمت کر کے باوجود فرعونیوں سے خائف ہونے کے اپنے اسلام کا اظہار واعلان کر دیا۔ چند گنے چنے قبطی بھی جو فرعون کی قوم سے تھے۔ مشرف بایمان ہوئے۔ اخیر میں جب موسیٰ علیہ السلام کا اثر اور حق کا غلغلہ بڑھتا گیا، تب پوری قوم بنی اسرائیل کی جو تقریباً چھ لاکھ بالغ مردوں پر مشتمل تھی مسلمان ہوگئی۔ یہاں ابتداء کا قصہ بیان ہوا ہے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

جادو کا علاج:

ابن ابی سلیمؒ سے روایت ہے کہ یہ آیتیں بحکم خدا تعالیٰ سحر سے شفا کا کام دیں گی، اس آیت کو پڑھ کر پانی پر پھونکو پھر مسحور کے سر پر انڈیل دو۔ یہ سورۂ یونس کی آیت ہے۔ وہ یہ ہے فَلَمَّآ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى الىٰ اخرہ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ۔ دوسری آیت ہے فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ الخ اور اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُ حَيْثُ اَتٰى۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ
ڈرتے ہوئے فرعون سے اور ان کے سرداروں سے کہ کہیں
اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ؕ
ان کو بچلا نہ دے

سرداروں کا خوف:

ان کے سرداروں سے مراد یا تو فرعون کے حکام وعمال ہیں، یا بنی اسرائیل کے وہ سردار مراد ہیں جو خوف یا طمع وغیرہ کی وجہ سے اپنے ہم قوموں کو فرعون کی مخالفت سے ڈراتے دھمکاتے تھے اور بچلا دینے کا مطلب یہ ہے کہ فرعون ایمان لانے کی خبر سن کر سخت ایذائیں پہنچائے جن سے گھبرا کر ممکن ہے بعض ضعیف القلب راہ حق سے بچل جائیں۔

وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِى الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ
اور فرعون چڑھ رہا ہے ملک میں اور اس نے

لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۸۳﴾
ہاتھ چھوڑ رکھا ہے

واقعۂ فرعون ظالم وجابر تھا:

یعنی ان کا خوف کھانا بھی کچھ بے جا نہ تھا، کیونکہ اس وقت ملک میں فرعون کی مادی طاقت بہت بڑھ چڑھ کر تھی اور اس کا ظلم وعدوان اور کفر وطغیان حد سے متجاوز ہو چکا تھا۔ کمزوروں کو ستانے کے لئے اس نے بالکل ہاتھ چھوڑ رکھا تھا۔

وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ
اور کہا موسیٰ نے اے میری قوم اگر تم ایمان لائے ہو
بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ﴿۸۴﴾
اللہ پر تو اسی پر بھروسہ کرو اگر ہو تم فرمانبردار

مؤمنین کو تسلی:

یعنی گھبرانے اور خوف کھانے کی ضرورت نہیں۔ ایک فرمان بردار مومن کا کام اپنے مالک کی طاقت پر بھروسہ کرنا ہے جسے خدا کی لامحدود قدرت و رحمت پر یقین ہوگا، وہ یقیناً ہر معاملہ میں خدا پر اعتماد کرے گا اور اس اعتماد کا اظہار جب ہی ہو سکتا ہے کہ بندہ اپنے کو بالکلیہ خدا کے سپرد کر دے، اسی کے حکم پر چلے اور تمامی جد وجہد میں صرف اسی پر نظر رکھے۔ (تفسیر عثمانی)

زندہ کنی عطائے تو — در بکشی خدائے تو
جان شدہ مبتلائے تو — ہر چہ کنی رضائے تو

ایمان واسلام اور توکل صادق اگر جمع ہو گئے تو دیکھ لینا کہ تمہاری ذلت مبدل بہ عزت ہو جائے گی اور فرعون کی عزت مبدل بہ ذلت ہو جائے گی، ایمان کے معنی تصدیق اور یقین کے ہیں اور توکل کے معنی اعتماد اور بھروسہ کے ہیں اور اسلام کے معنی سپرد کر دینے کے ہیں۔

سپردم بتو مایۂ خویش را — تو دانی حساب کم وبیش را

(معارف کاندھلویؒ)

فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا
تب وہ بولے ہم نے اللہ پر بھروسہ کیا اے رب ہمارے
فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۵﴾
نہ آزما ہم پر زور اس ظالم قوم کا

ایمان لانے والوں کا اخلاص اور استقامت:

موسیٰ علیہ السلام کی نصیحت پر انہوں نے اخلاص کا اظہار کیا کہ بیشک ہمارا بھروسہ خالص خدا پر ہے۔ اسی سے دعا کرتے ہیں کہ ہم کو ان ظالموں کا تختہ مشق نہ بنائے اس طرح کہ یہ ہم پر اپنے زور و طاقت سے ظلم ڈھاتے رہیں۔ اور ہم ان کا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔ ایسی صورت میں ہمارا دین بھی خطرہ میں ہے۔ اور ان ظالموں یا دوسرے دیکھنے والوں کو یہ ڈینگ مارنے کا موقع ملے گا کہ اگر ہم حق پر نہ ہوتے تو تم پر ایسا تسلط وتفوق کیوں حاصل نہ ہوتا اور تم اس قدر پست و ذلیل کیوں ہوتے۔ یہ خیال ان گمراہوں کو اور زیادہ گمراہ کر دے گا۔ گویا ایک حیثیت سے ہمارا وجود ان کے لئے فتنہ بن جائے گا۔

وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٨٦﴾

اور چھڑا دے ہم کو مہربانی فرما کر ان کافر لوگوں سے

یعنی انکی غلامی اور محکومی سے ہم کو نجات دے اور دولت آزادی سے مالا مال فرما۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ

اور حکم بھیجا ہم نے موسیٰ کو اور اس کے بھائی کو کہ مقرر کرو

لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا

اپنی قوم کے واسطے مصر میں سے گھر

بنی اسرائیل کیلئے خصوصی حکم:

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں۔ ''جب فرعون کی ہلاکت کا وقت قریب آیا تو حکم ہوا کہ اپنی قوم بنی اسرائیل کو ان میں شامل نہ رکھو اپنا محلہ جدا بساؤ کہ آگے ان پر آفتیں آنے والی ہیں۔ اس وقت تمہاری قوم ظاہری طور پر بھی آفتوں سے الگ تھلگ رہے۔'' مفسرین نے تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا'' سے مراد یہ لی ہے کہ اپنے مکانوں میں ٹھہرے رہو اور ان میں سے بعض کو عبادت کے لئے مخصوص کر لو۔ (تفسیر عثمانی)

وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ

اور بناؤ اپنے گھر قبلہ رو اور قائم کرو نماز

نماز ہر حال میں قائم رکھو:

فرعون نے مسجدیں اور عبادت گاہیں خراب کر دی تھیں کوئی باہر نکل کر خدا کی عبادت نہ کر سکتا تھا۔ بحالت مجبوری حکم ہوا کہ مکان میں کوئی جگہ نماز کے لئے رکھو جو قبلہ رو ہو۔ نماز ترک مت کرو کہ اسی کی برکت سے خدا کی مدد آتی ہے۔ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ہجرت سے پہلے مکہ میں ایسا ہی حال مسلمانوں کا تھا۔ (تفسیر عثمانی)

بغویؒ نے لکھا ہے اکثر مفسرین کا بیان ہے کہ پہلے بنی اسرائیل صرف گرجوں اور خانقاہوں میں نماز پڑھا کرتے تھے، لیکن حضرت موسیٰ کی بعثت کے بعد فرعون کے حکم سے تمام عبادت خانے ڈھا دیئے گئے اور بنی اسرائیل کو وہاں نماز پڑھنے کی ممانعت ہوگئی تو اللہ نے بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ اپنے گھروں کے اندر ہی مسجدیں بنا لو اور وہیں نماز پڑھا کرو۔ ابراہیم نخعی کا یہی قول ہے اور عکرمہ کی روایت میں حضرت ابن عباس کا بھی یہی قول آیا ہے۔ (تفسیر مظہریؒ)

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چھ خصوصیات میں سے ایک یہ بھی فرمائی ہے کہ میرے لئے ساری زمین کو مسجد بنا دیا گیا ہے کہ نماز ہر جگہ ادا ہو جاتی ہے، یہ دوسری بات ہے کہ فرض نمازوں کا مسجدوں میں ہی ادا کرنا جماعت کے ساتھ سنت مؤکدہ قرار دیا گیا ہے۔ اور نفلی نمازوں کا گھروں میں ادا کرنا افضل ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اسی پر تھا کہ مسجد میں صرف فرض نماز پڑھتے تھے، سنن اور نوافل گھر میں جا کر ادا فرماتے تھے۔ بنی اسرائیل اپنے مذہب کے مطابق اس کے پابند تھے کہ نماز صرف اپنے عبادت خانوں میں ادا کریں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد کعبہ ہے اور کعبہ ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے اصحاب کا قبلہ تھا، (قرطبی وروح) بلکہ بعض علماء نے فرمایا کہ تمام انبیاء سابقین کا قبلہ اصل میں کعبہ ہی تھا۔ (معارف القرآن مفتی اعظمؒ)

بحالتِ مجبوری مسجد کی حاضری معاف کر دی گئی:

ابن عباس اور مجاہد اور قتادہ سے مروی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام خانہ کعبہ کی طرف نماز پڑھا کرتے تھے اور انہی گھروں میں نماز قائم رکھو۔ خوف کی وجہ سے مسجد کی حاضری معاف کر دی گئی۔ لہٰذا اپنے گھروں ہی میں خفیہ نماز پڑھ لیا کرو۔ جیسے ابتداء اسلام میں مومنوں کو حکم ہوا۔ فرعونی بنی اسرائیل کو مساجد میں نماز پڑھنے سے روکتے تھے اس لئے بحالت مجبوری ان کو حکم دیا گیا کہ اپنے گھروں کو قبلہ کے رخ بنا لو اور انہی میں نماز پڑھ لیا کرو تا کہ فرعونیوں کو تمہاری نماز اور عبادت کی خبر نہ ہو اور جب بنی اسرائیل کو فرعونیوں کی طرف سے سخت بلائیں پہنچیں تو حکم ہوا کہ کثرت سے نمازیں پڑھا کرو۔ اللہ تعالیٰ نماز کی برکت سے تمہاری یہ بلا اور مصیبت دور کر دے گا کما قال تعالیٰ وَقَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا وقال اللہ تعالیٰ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۔

پریشانیوں کا علاج:

اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی پریشانی

پیش آتی تو نماز پڑھتے (رواہ ابو داؤد) کثرت سے نمازیں پڑھنے سے بلائیں دور ہوتی ہیں۔ (معارف کاندھلویؒ)

وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۷﴾
اور خوشخبری دے ایمان والوں کو

دنیا میں فتح و نصرت کی اور آخرت میں نجات و رضائے الٰہی کی۔

وَقَالَ مُوْسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَ
اور کہا موسیٰ نے اے رب ہمارے تو نے دی ہے فرعون کو اور
مَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا
اس کے سرداروں کو رونق اور مال دنیا کی زندگی میں

فرعون کا ساز و سامان اور اس کا مقصد:

یعنی ہر قسم کا سامان رونق و آسائش کا دیا۔ مثلاً حسن صورت سواری، عمدہ پوشاک، اثاث البیت وغیرہ اور مال و دولت کے خزانے، سونے یا چاندی وغیرہ کی کانیں عطا فرمائیں۔

رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ
اے رب اس واسطے کہ بہکائیں تیری راہ سے

اگر لیضلوا میں لام تعلیل لیا جائے تو مطلب یہ ہے کہ تکوینی طور پر یہ سامان ان نابکاروں کو اس لئے دیا گیا کہ مغرور ہو کر خود گمراہ ہوں اور دوسروں کو گمراہ کرنے میں خرچ کریں۔ بڑی آزادی سے دل کھول کر زور لگالیں۔ آخر میں دیکھ لیں گے کہ وہ کچھ بھی کام نہ آیا۔ جب خالق خیر و شر کا اللہ ہے اور ظاہر ہے کہ اس کا کوئی فعل خالی از حکمت نہیں ہوسکتا۔ لامحالہ "خلق شر" میں بھی مجموعہ عالم کے اعتبار سے کوئی حکمت ضرور ہوگی۔ وہ ہی حکمت شریروں کو اس قدر سامان دیے جانے میں سمجھ لیجئے۔ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ (بنی اسرائیل رکوع ۲) اِنَّمَا نُمْلِىْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا (آل عمران رکوع ۱۸)

بعض مفسرین نے "لیضلو" میں "لام عاقبۃ" لیا ہے جیسے فَالْتَقَطَهٗٓ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا میں "لام عاقبۃ" ہے۔ اس وقت مطلب یہ ہوگا کہ یہ سامان دیا تو اس لئے تھا کہ امور خیر میں خرچ کریں اور نعمتوں کو لے کر منعم حقیقی کو پہچانیں۔ اس کے شکر گزار بندے بنیں مگر اس کے برخلاف انہوں نے اپنی بدبختی سے خدا کی نعمتوں کو لوگوں کے بہکانے اور گمراہ کرنے میں ایسا بے دریغ خرچ کیا گویا وہ اسی کام کے لئے ان کو دی گئی تھیں، اس تفسیر پر کوئی اشکال وارد نہیں ہوتا۔ (تفسیر عثمانیؒ)

رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ
اے رب مٹادے ان کے مال اور سخت کردے
عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا
ان کے دل کہ نہ ایمان لائیں جب تک دیکھ لیں
الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۸۸﴾
عذاب دردناک

فرعونیوں کیلئے بددعاء:

جب موسیٰ علیہ السلام مدت دراز تک ہر طرح ہدایت کر چکے اور عظیم الشان معجزات دکھلا چکے مگر معاندین کا جحود و عناد بڑھتا ہی رہا حتیٰ کہ تجربہ اور طول صحبت یا وحی الٰہی سے پوری طرح ثابت ہوگیا کہ یہ لوگ کبھی ایمان لانے والے نہیں، تب ان کی ہلاکت کی دعاء فرمائی، تا ان کی گندگی سے دنیا جلد پاک ہو اور دوسروں کے لئے ان کی بدانجامی درس عبرت بنے۔ آپ نے بددعاء کی کہ خداوندا! ان کے اموال کو تباہ اور ملیا میٹ کردے اور ان کے دلوں پر سخت گرہ لگادے جن میں کبھی ایمان و یقین نفوذ نہ کرے۔ بس اسی وقت یقین حاصل ہو جب اپنی آنکھوں سے عذاب الیم کا مشاہدہ کرلیں۔ یہ دعاء ان کے حق میں ایسی سمجھو جیسے ابلیس کو "لعنۃ اللہ" یا کفار کو "خذلھم اللہ" کہا جاتا ہے۔ حالانکہ ان کی ملعونیت و خذلان کا قطعی فیصلہ پیشتر سے کیا جاچکا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے آیت کی تقریر دوسری طرز سے کی ہے۔ فرماتے ہیں "سچے ایمان کی ان سے امید نہ تھی مگر جب کچھ آفت پڑتی تو جھوٹی زبان سے کہتے کہ اب ہم مانیں گے اس میں عذاب تھم جاتا کام فیصل نہ ہوتا۔ دعاء اس واسطے مانگی کہ یہ جھوٹا ایمان نہ لائیں دل ان کے سخت رہیں تا عذاب پڑ چکے اور کام فیصل ہو"۔ (تفسیر عثمانیؒ)

بددعاء کا اثر:

حضرت قتادہ کا بیان ہے کہ اس دعا کا اثر یہ ظاہر ہوا کہ قوم فرعون کے تمام زر و جواہر اور نقد سکے اور باغوں کھیتوں کی سب پیداوار پتھروں کی شکل میں تبدیل ہو گئے، حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ میں ایک تھیلہ پایا گیا جس میں فرعون کے زمانہ کی چیزیں تھیں۔ ان میں انڈے اور بادام بھی دیکھے گئے جو بالکل پتھر تھے۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ. اے ہمارے رب ان کے مالوں کو (تباہ کر کے) مٹادے۔ (مجاہد) بعض اہل علم نے کہا، طمس سے مراد ہے صورت مسخ کر دینا، ہیئت بگاڑ دینا۔ قتادہ کا قول ہے کہ ان کا سارا مال کھیتیاں اور جواہر پتھر بنا

دیئے گئے۔نقوش اور شکل وہی تھی جو اصلی چیزوں کی تھی مگر سب چیزیں پتھر کی ہوگئی تھیں اور پھٹ کر کسی کے دو اور کسی کے تین ٹکڑے ہوگئے تھے۔عمر بن عبدالعزیز نے ایک تھیلا منگوایا اس میں فرعون والوں کی کچھ باقی ماندہ چیزیں تھیں۔انڈا نکالا تو وہ بھی شگافتہ اور اخروٹ نکالا تو وہ بھی پھٹا ہوا اور سب چیزیں پتھر کی۔(تفسیر مظہریؒ)

قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا
فرمایا قبول ہو چکی دعاء تمہاری

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ دعا کرتے تھے اور ہارون علیہ السلام آمین کہتے جاتے تھے۔اس لحاظ سے ''دعوتکما'' فرمایا۔(تفسیر عثمانیؒ)

فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ
سو تم دونوں ثابت رہو اور مت چلو راہ ان کی
لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٨٩﴾
جو ناواقف ہیں

ثابت قدم رہو اور جلدی نہ مچاؤ:

اور ثابت قدمی سے انجام دیتے رہو۔اگر قبول دعاء کی آثار دیر سے ظاہر ہوں تو نادان لوگوں کی طرح شتابی مت کرو، وقت مقدر پر یہ ہی ہو کر رہے گا۔گھبرانے سے کچھ حاصل نہیں۔(تفسیر عثمانیؒ)

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ
اور پار کر دیا ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے اور پھر پیچھا کیا ان کا
فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْيًا وَّعَدْوًا ۭ حَتّٰٓي اِذَآ
فرعون نے اور اس کے لشکر نے شرارت سے اور تعدی سے یہاں تک کہ
اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ
جب ڈوبنے لگا بولا یقین کر لیا میں نے کہ کوئی معبود نہیں
اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا
مگر جس پر کہ ایمان لائے بنی اسرائیل اور میں ہوں
مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿٩٠﴾ آٰلْئٰنَ وَقَدْ عَصَيْتَ
فرمانبرداروں میں اب یہ کہتا ہے اور تو نافرمانی کرتا رہا
قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿٩١﴾
اس سے پہلے اور رہا گمراہوں میں

فرعون کا غرق ہونا:

موسیٰ علیہ السلام کئی لاکھ بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکلے،فرعون کو خبر ہوئی تو ایک لشکر جرار لے کر تعاقب کیا۔تاکہ اس کے پنجۂ ظلم سے چھوٹنے نہ پائیں۔بنی اسرائیل جب بحر قلزم کے کنارے پہنچے،تو سخت پریشان ہوئے،آگے سمندر اور پیچھے فرعون کا لشکر دباتا چلا آرہا تھا۔موسیٰ علیہ السلام نے تسلی دی اور حق تعالیٰ کے حکم سے لاٹھی دریا پر ماری،سمندر کا پانی ادھر ادھر کھڑا ہوگیا اور درمیان میں خدا نے بارہ راستے خشک بنادیئے۔یہ پار ہوئے،ادھر فرعون لشکر سمیت سمندر کے کنارے پہنچ گیا۔خشک راستے دیکھ کر سب نے اسی میں گھوڑے ڈال دیئے۔جب ایک ایک کر کے تمام فوج دریا کے وسط میں پہنچی،پانی کو حکم ہوا کہ مل جائے۔فوراً پانی کے طبقات مل گئے،سب لشکر اور سامان موجوں کی نذر ہوگیا۔

ڈوبتے وقت ایمان کا کلمہ:

فرعون نے دیکھا کہ اب ڈوبتا ہوں،اس وقت گھبرا کر ایمان واسلام کا لفظ زبان پر لایا کہ شاید بنی اسرائیل کا خدا ''ایمان'' کا لفظ سن کر دریا کی موجوں سے باہر نکال دے۔اس پر خدا کی طرف سے ارشاد ہوا آلئٰن و قد عصیت قبل الخ یعنی ساری عمر مخالف ہو کر گمراہی پھیلاتا اور شرارتیں کرتا رہا،اب عذاب دیکھ کر یقین لایا۔اس وقت کا یقین کیا معتبر ہے۔ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ۭ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ (المؤمن۔رکوع۹)

فتوحات مکیہ کی عبارت:

(تنبیہ) قبض روح اور معائنہ عذاب کے وقت ایمان لانا ''ایمان غرغرہ'' یا ''ایمان باس'' یا ''ایمان یاس'' کہلاتا ہے۔جو ''اہل سنت والجماعت'' کے نزدیک نافع نہیں۔شیخ عبدالوہاب شعرانی نے ''کتاب الیواقیت والجواہر'' میں ''فتوحات مکیہ'' سے عبارت نقل کی ہے۔جس میں ایمان فرعون کی بابت یہ ہی تصریح ہے اور دیباچہ میں لکھا ہے کہ ''فتوحات کے'' نسخوں میں ملحدین وزنادقہ نے بہت سی عبارتیں مدسوس کر دی ہیں میرے پاس جو نہایت مستند و معتبر نسخہ ''فتوحات'' کا ہے اس میں ان عبارتوں کا پتہ نہیں واللہ اعلم (فائدہ) اخیر وقت میں فرعون سے لفظ ''آمنت'' کہلا کر حضرت موسیٰ کی دعاء فلا یؤمنوا حتیٰ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ کی مقبولیت کا خدا نے مشاہدہ کرادیا۔(تفسیر عثمانیؒ)

نزع کے وقت کا کلمۂ کفر:

اسی طرح اگر خدانخواستہ ایسی ہی نزع روح کی حالت میں کسی شخص کی زبان سے کلمۂ کفر نکل جائے تو اس کو کافر بھی نہ کہا جائے گا بلکہ اس کے جنازہ کی نماز پڑھ کر مسلمانوں کی طرح دفن کیا جائے گا اور اس کے کلمۂ کفر کی تاویل کی جائے گی جیسا کہ بعض اولیاء اللہ کے حالات سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ جو کلمہ ان کی زبان سے نکل رہا تھا لوگ اس کو کلمۂ کفر سمجھ کر پریشان تھے بعد میں کچھ ہوش آیا اور اپنا مطلب بتلایا تو سب کو اطمینان ہو گیا کہ وہ عین ایمان کا کلمہ تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس وقت روح نکل رہی ہو اور نزع کا عالم ہو وہ وقت دنیا کی زندگی میں شمار نہیں، اس وقت کا کوئی عمل بھی شرعاً معتبر نہیں، اس سے پہلے پہلے ہر عمل معتبر ہے، مگر دیکھنے والوں کو اس میں بڑی احتیاط لازم ہے کیونکہ اس کا صحیح اندازہ کرنے میں غلطی ہو سکتی ہے کہ یہ وقت نزعِ روح کا اور غرغرۂ موت کا ہے یا اس سے پہلے کا۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

جبریلؑ نے فرعون کے منہ میں کیچڑ ٹھونس دیا:

بغویؒ نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب اللہ فرعون کو غرق کرنے لگا (یعنی بحکم خدا فرعون ڈوبنے لگا) بولا اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِیْلَ حضرت جبرئیلؑ نے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے) کہا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کاش آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہ منظر دیکھتے کہ میں اس کے منہ میں سمندر کی کیچڑ ٹھونس رہا تھا کہ کہیں اللہ کی رحمت اس کو پہنچ جائے (اور مرنے سے پہلے اس کی توبہ قبول ہو جائے)

جلال الدین دوانی کا قول:

جلال الدین دوانی کا قول ہے کہ فرعون نے چونکہ کلمۂ توحید زندگی میں پڑھ لیا تھا اس لئے (اسکی توبہ قبول ہو گئی اور) وہ مسلمان مرا دوانی نے اس قول میں حضرت شیخ محی الدین ابن عربی کی پیروی کی ہے۔ ابن عربی کا بھی یہی قول ہے کہ فرعون پاک مرا۔ حق یہ ہے کہ شیخ کا قول ظاہر نصوص کے خلاف ہے آپ کے سکر کی حالت کے بکثرت الفاظ شرع کے مطابق نہیں ہیں شیخ کا فرعون کے متعلق یہ قول بھی اجماع علماء کے خلاف ہے۔ اور صحیح احادیث سے بھی مطابقت نہیں رکھتا۔

فرعون کا فتویٰ:

ایک مرتبہ جبریلؑ امین فرعون کے پاس ایک استفتاء لے کر آئے جس کا مضمون یہ تھا کہ امیر کا اس غلام کے بارے میں کیا فتویٰ ہے جو آقا کے مال و نعمت میں پلا پھر اس غلام نے اپنے آقا کی نعمت کا کفران کیا اور اس کا حق نہ مانا اور خود آقا ہونے کا دعویٰ کیا۔ تو ایسے غلام کا کیا حکم ہے۔ فرعون نے اپنے ہاتھ سے اس کا جواب لکھا کہ ایسے غلام کی سزا یہ ہے کہ اس کو سمندر میں ڈبو دیا جائے اور اس فتویٰ پر جبریلؑ امین نے فرعون سے دستخط بھی لے لئے فرعون نے اپنے قلم سے لکھ دیا کہ یہ وہ جواب ہے کہ جو ابو العباس ولید بن مصعب یعنی فرعون نے لکھا ہے جب فرعون غرق ہونے لگا اور ایمان ظاہر کرنے لگا تو جبریلؑ امین نے اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا فتویٰ اس کو دکھلایا اور کہا کہ فتوے کے بموجب تیرے ساتھ یہ ہو رہا ہے۔ (معارف کاندھلویؒ)

فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ
سو آج بچائے دیتے ہیں ہم تیرے بدن کو تا کہ
خَلْفَكَ اٰیَةً ؕ وَ اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ
ہووے تو اپنے پچھلوں کے واسطے نشانی اور بیشک بہت لوگ ہماری
اٰیٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ﴿۹۲﴾
قدرتوں پر توجہ نہیں کرتے

فرعون کی نعش آج تک عبرت کا نشان ہے:

''موضح القرآن'' میں ہے کہ جیسا بے وقت ایمان لایا، بے فائدہ، ویسا ہی اللہ نے مرے پیچھے اس کا بدن دریا میں سے نکال کر ٹیلے پر ڈال دیا کہ ''بنی اسرائیل'' دیکھ کر شکر کریں اور پیچھے آنیوالے اسکے حال سے عبرت پکڑیں۔ ورنہ اس کو بدن کے بچنے سے کیا فائدہ۔ جیسا بے فائدہ ایمان تھا ویسی ہی بے فائدہ نجات مل گئی۔ جدید تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ فرعون کی لاش آج تک محفوظ چلی آتی ہے لیکن الفاظ قرآنی کی صحت اسکے ثبوت پر موقوف نہیں (اتفاق) بنی اسرائیل کے نجات پانے اور فرعون کے غرق ہونے کا واقعہ ''عاشورہ'' کے دن ہوا۔ اور اتفاق سے آج بھی جب بندہ یہ سطریں لکھ رہا ہے ''یوم عاشوراہ ۱۳۴۸ ہجری'' ہے۔ خدا ہم کو دنیا و آخرت میں اپنے عذاب سے محفوظ رکھے اور دشمنان دین کا بیڑا غرق کرے۔ آمین۔ (تفسیر عثمانی)

دریا کی ایک موج کے ذریعہ فرعون کی مردہ لاش کو ساحل پر ڈال دیا جس کو سب نے دیکھا اور اس کے ہلاک ہونے کا یقین آیا، اور اس کی یہ لاش سب کے لئے نمونہ عبرت بن گئی، پھر معلوم نہیں کہ اس لاش کا کیا انجام ہوا، جس جگہ فرعون کی لاش پائی گئی تھی آج تک وہ جگہ جبل فرعون کے نام سے معروف ہے۔ کچھ عرصہ ہوا اخباروں میں یہ خبر چھپی تھی کہ فرعون کی لاش صحیح سالم برآمد ہوئی اور عام لوگوں نے اس کا مشاہدہ کیا، اور وہ آج تک قاہرہ کے عجائب گھر میں محفوظ ہے، مگر یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ وہی فرعون ہے جس کا مقابلہ حضرت موسیٰ علیہ

السلام سے ہوا تھا یا کوئی دوسرا فرعون ہے کیونکہ لفظ فرعون کسی ایک شخص کا نام نہیں ،اس زمانے میں مصر کے ہر بادشاہ کو فرعون کا لقب دیا جاتا تھا۔

مگر کچھ عجب نہیں کہ قدرت نے جس طرح غرق شدہ لاش کو عبرت کے لئے کنارہ پر ڈال دیا تھا اسی طرح آئندہ نسلوں کی عبرت کے لئے اس کو گلنے سڑنے سے بھی محفوظ رکھا ہو، اور اب تک موجود ہو۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ
اور جگہ دی ہم نے بنی اسرائیل کو پسندیدہ جگہ
وَّرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ۚ
اور کھانے کو دیں ستھری چیزیں

بنی اسرائیل کو حکومت دی گئی:

یعنی فرعونیوں کو ہلاک کر کے اول ملک مصر دیا۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد عمالقہ کو نکال کر ملک شام دیا گیا۔ دونوں ملک سرسبز و شاداب ہیں جہاں ستھری اور لذیذ چیزوں کی افراط ہے۔ غرض یکہ بنی اسرائیل حلال وطیب نعمتوں سے مالا مال کر دیے گئے۔

فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰی جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ
سو ان میں پھوٹ نہیں پڑی یہاں تک کہ پہنچی ان کو خبر بیشک تیرا رب
یَقْضِیْ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْمَا كَانُوْا
ان میں فیصلہ کریگا قیامت کے دن جس بات میں
فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۳﴾
کہ ان میں پھوٹ پڑی

بنی اسرائیل میں فرقہ بندی:

یعنی مادی انعام واکرام کے ساتھ دینی وروحانی نعمت سے سرفراز فرمایا۔ کہ تورات شریف کا علم دیا۔ جس میں دین کے اصول وفروع بیان ہوئے تھے۔ اور اگلے پچھلوں کے متعلق خبریں تھیں ان واضح حقائق سے خبردار ہونے کے بعد لائق نہ تھا کہ ایسی صاف چیزوں میں اختلاف کر کے آپس میں پھوٹ ڈالیں اور فرقہ بندی کی نحوست میں گرفتار ہوں۔ مگر باوجود علم صحیح اور خبر صادق پہنچ جانے کے طرح طرح کے اختلافات پیدا کیے اور پھوٹ ڈال کر رہے۔ بعض احکام میں اپنے پیغمبر (موسیٰ علیہ السلام) سے بھی کٹ حجتی کی جیسا کہ ذبح بقر کے واقعہ میں گزرا۔ بعد میں آنے والے پیغمبروں خصوصاً خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض نے تصدیق اور اکثروں نے تکذیب کی، حالانکہ ان کے متعلق بہت سی پیشینگوئیوں پر مطلع ہو چکے تھے۔ بلکہ بعثت محمدی سے پہلے نبی آخر الزماں کی آمد کے منتظر تھے اور مشرکین سے کہتے تھے کہ ہم پیغمبر آخر الزماں کے ساتھ ہو کر تمہاری خبریں لیں گے۔ نہ صرف اسی مسئلہ میں اختلاف ہوا بلکہ خود اپنے مذہب میں تحریف کر کے اصول وفروع بدل ڈالے اور رفتہ رفتہ بیسیوں فرقے پیدا ہو گئے۔

قسطنطین اعظم:

مسیح علیہ السلام سے تین سو برس بعد قسطنطین اعظم جو ایک فلسفی مزاج بادشاہ تھا، از راہ نفاق دین نصرانیت میں داخل ہوا تو پادریوں نے اس کی خاطر جدید قوانین وضع کئے اور نئی شریعت بنائی۔ اس نے ان کے لئے بڑے بڑے گرجا اور معابد و مشاہد تعمیر کرائے اور اس نئے دین مسیحی کی جو اصلی مسیحیت کو بگاڑ کر تیار کیا گیا تھا خوب اشاعت ہوئی۔ بجز چند تارک الدنیا راہبوں کے جو بستیوں سے الگ جنگلوں اور پہاڑوں میں جا رہے تھے۔ کوئی شخص اصلی دین مسیحی پر قائم نہ رہا تھا۔ صلیب کی پرستش، مشرق کی طرف نماز پڑھنا کلیساؤں میں مسیح و مریم وغیر کی تصاویر پوجنا، خنزیر وغیرہ کو حلال کرنا اور اسی طرح کی تحریفات نے حقیقی مسیحیت کو بالکل مسخ کر ڈالا۔ اور یہ ہی مسخ شدہ مسیحیت ساری دنیا میں پھیل گئی۔ یہ زمانہ تھا جب، ملک شام، بیت المقدس، جزیرہ اور بلاد روم پر ''نصاریٰ'' کا تسلط تھا، تا آنکہ فاروق اعظمؓ کے عہد میں صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان ممالک کو نصاریٰ کے قبضہ سے نکالا۔ وللہ الحمد والمنہ۔

فَاِنْ كُنْتَ فِیْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ
سو اگر تو ہے شک میں اس چیز سے کہ اتاری
فَسْـَٔلِ الَّذِیْنَ یَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ
ہم نے تیری طرف تو پوچھ ان سے جو پڑھتے ہیں کتاب تجھ سے پہلے
لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ
بیشک آئی ہے تیرے پاس حق بات تیرے رب سے سو تو ہرگز
مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ ﴿۹۴﴾ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِیْنَ
مت ہو شک کرنے والا اور مت ہو ان میں جنہوں نے
كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۹۵﴾
جھٹلایا اللہ کی باتوں کو پھر تو بھی ہو جائے خرابی میں پڑنے والا

إِنَّ الَّذِينَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا

جن پر ثابت ہو چکی بات تیرے رب کی وہ

يُؤْمِنُونَ ﴿٩٦﴾ وَلَوْ جَاءَتْهُمْ كُلُّ آيَةٍ حَتَّىٰ

ایمان نہ لائیں گے اگرچہ پہنچیں ان کو ساری نشانیاں جب تک

يَرَوُا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ﴿٩٧﴾

نہ دیکھ لیں عذاب دردناک

عوام الناس سے خطاب کہ اپنا شک دُور کرلو:

بظاہر یہ خطاب پیغمبر علیہ السلام کو ہے لیکن حقیقت میں آپ کو مخاطب بنا کر دوسروں کو سنانا مقصود ہے جوامی کی زبان سے ایسے عظیم الشان حقائق و واقعات سن کر حیرت زدہ۔

رہ جاتے تھے اور جہل وتعصب کی وجہ سے ان کی واقعیت میں شک و تردد کا اظہار کرنے لگتے تھے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ آپ خود اپنی لائی ہوئی چیزوں میں کیسے شک وشبہ کر سکتے تھے اور جس کی طرف تمام دنیا کو دعوت دیتے اور پہاڑ سے زیادہ مضبوط یقین سننے والوں کے قلوب میں پیدا کر دیتے تھے، اس کو خود اپنی زبان سے کیسے جھٹلاتے۔ چند آیات کے بعد صاف فرما دیا گیا قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنْ كُنْتُمْ فِي شَكٍّ مِنْ دِينِي الخ یہ آیت صاف بتلا رہی ہے کہ شک کرنے والے دوسرے لوگ تھے جن کے مقابلہ میں آپ اپنے غیر متزلزل اور اٹل عقیدہ کا اعلان کر رہے ہیں۔ بہرحال ان آیات میں پیغمبر کی زبان سے قرآن کے ہر ایک مخاطب کو متنبہ کیا کہ کفر وتکذیب کی بیماری شک سے شروع ہوتی ہے۔ اگر تم کو قرآن کے بیان کردہ واقعات میں شک وشبہ پیدا ہو تو اس کا فوراً علاج کرو۔ یعنی جو لوگ کتب سابقہ کا علم رکھتے ہیں، ان سے تحقیق کرلو۔ آخر ان میں کچھ آدمی سچے اور انصاف پسند بھی ہیں۔ وہ بتائیں گے کہ نبی امی نے جو کچھ بیان فرمایا کہاں تک درست ہے۔ بلاشبہ جو کچھ آپ لائے وہ سچ کے سوا کچھ نہیں، وہ پروردگار کا اتارا ہوا ہے جس میں شک وتردد کی قطعاً گنجائش نہیں اگر بے ہودہ شکوک کا علاج نہ کیا جائے تو چند روز میں شک ترقی کرکے امتراء (جدل) اور ''امتراء'' ترقی کرکے تکذیب کی حد تک جا پہنچائے گا۔ جس کا نتیجہ خسران وخرابی کے سوا کچھ نہیں۔ تکذیب، کے بعد ایک اور درجہ ہے۔ جہاں پہنچ کر دل پر مہر لگ جاتی ہے تکذیب کرتے کرتے قبول حق کی استعداد بھی برباد ہو جاتی ہے۔ ایسا شخص اگر دنیا میں جہان کے سارے نشان دیکھ لے تب بھی ایمان نہ لائے۔ اسے عذاب الیم دیکھ کر ہی یقین آئے گا۔ جب کہ اس یقین سے کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ (فائدہ)

کلمة ربک (رب کی بات) سے مراد غالباً وہ ہے جو دوسری جگہ فرمایا۔ "لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ"، یعنی دوزخ کو جن وانس سے بھروں گا جن لوگوں پر بدبختی، سوء استعداد اور شامت اعمال سے یہ بات علم الٰہی میں ثابت ہو چکی۔ یہاں ان کا ذکر ہے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

تکوینی فیصلہ:

حقت واجب ہو گیا۔ کلمۂ رب سے مراد ہے ازلی فیصلہ کہ وہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔ مالک، ترمذی اور ابوداؤد نے مسلم بن یسار کی روایت سے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب سے آیت وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ کا معنی دریافت کیا گیا آپ نے جواب دیا، میں نے خود سنا کہ جب اس آیت کا (مرادی اور تشریحی) معنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ نے آدم کو پیدا کیا پھر ان کی پشت پر اپنا دایاں ہاتھ پھیر کر ان کی کچھ نسل باہر نکالی اور فرمایا، ان کو میں نے جنت کے لئے پیدا کیا اور یہ جنت والوں ہی کے کام کریں گے پھر پشت پر ہاتھ پھیر کر کچھ نسل برآمد کی اور فرمایا ان کو میں نے دوزخ کیلئے پیدا کیا ہے اور یہ دوزخیوں ہی کے کام کریں گے۔ امام احمد نے بوساطت ابونضرہ حضرت ابوعبداللہ صحابی کا بیان نقل کیا ہے، ابوعبداللہ نے فرمایا، میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ اللہ نے اپنے دائیں ہاتھ کی ایک مٹھی لی اور دوسرے ہاتھ کی دوسری مٹھی (اول کے متعلق فرمایا) یہ اس کے لئے ہیں یعنی جنت کے لئے۔ اور یہ اس کے لیے ہیں یعنی دوزخ کے لئے اور مجھے (کسی کی) پرواہ نہیں۔

ایمان نہیں لائیں گے کیونکہ اللہ کا فیصلہ ناقابل شکست ہے۔ (تفسیر مظہریؒ)

حضرت ابن عمر راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ اپنے بندہ کی توبہ قبول کرتا ہے جب تک غرغرہ نہ لگنے لگے۔ رواہ الترمذی وابن ماجہ وابن حبان، والحاکم والبیہقی

حضرت ابوذر کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ بلاشک اپنے بندہ کی مغفرت کر دیتا ہے جب تک پردہ نہ پڑ جائے۔ صحابہ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! پردہ کیا۔ فرمایا شرک کی حالت میں مرنا۔ رواہ احمد والبیہقی، فی کتاب البعث والنشور۔ (تفسیر مظہریؒ)

قتادہؒ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ عذاب آچکنے کے بعد کوئی قوم ایمان لائے تو نہیں چھوڑا جاتا ہے لیکن جب یونسؑ نے اپنی قوم کو چھوڑ دیا اور لوگ سمجھ گئے کہ اب عذاب سے نجات نہیں تو ان کے دلوں میں توبہ کے جذبات پیدا ہوئے۔ انھوں نے خراب کپڑے پہن کر اپنے کو بدحال بنا لیا۔ مویشیوں کا گروہ اور ان کے بچوں کا گروہ الگ الگ کیا۔ اپنے ساتھ بچوں جانوروں تک کو لے گئے چالیس دن تک فریاد وزاری کی۔ اللہ نے ان کے خلوص نیت اور توبہ کی صداقت کو دیکھ کر آ کھڑا ہوا عذاب ان پر سے ہٹا دیا۔ قوم

یونس ارض موصل میں نینویٰ کی رہنے والی تھی۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ

سو کیوں نہ ہوئی کوئی بستی کہ ایمان لاتی پھر کام آتا

اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ؕ لَمَّآ اٰمَنُوْا

ان کو ایمان لانا مگر یونس کی قوم جب وہ ایمان لائی

كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ

اٹھالیا ہم نے ان پر سے ذلت کا عذاب دنیا کی زندگانی میں

الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ۝۹۸

اور فائدہ پہنچایا ہم نے ان کو ایک وقت تک

قوم یونسؑ کی توبہ:

یعنی جتنی بستیاں تکذیب انبیاء اور شرارتوں کی وجہ سے مستوجب عذاب ٹھہریں، ان میں سے کسی کو ایسی طرح ایمان لانے کی نوبت نہ آئی جو عذاب الٰہی سے نجات دیتا۔ صرف یونس علیہ السلام کی قوم کی ایک مثال ہے۔ جس نے ایمان لا کر اپنے کو آسمانی عذاب سے بال بال بچالیا جو بالکل ان کے سروں پر منڈلا رہا تھا۔ خدا نے ایمان کی بدولت دنیوی زندگی میں ان پر سے آنے والی بلا ٹال دی اور جس وقت تک انہیں دنیا میں رہنا تھا یہاں کے فوائد و برکات سے متمتع کیا۔ مفسرین نے نقل کیا ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام سرزمین موصل میں اہل نینوا کی طرف مبعوث ہوئے۔ وہاں کے لوگ بت پرست تھے۔ یونس علیہ السلام لگاتار سات سال تک پند و نصیحت کرتے رہے انہوں نے ایک نہ سنی یوماً فیوماً انکار و تکذیب بڑھتا رہا آخر حضرت یونس نے تنگ آکر ان کو آگاہ کیا کہ (باز نہ آئے تو) تین دن کے اندر عذاب آنے والا ہے۔ جب تیسری شب آئی یونس علیہ السلام آدھی رات گزرنے پر بستی سے نکل کھڑے ہوئے صبح ہوتے ہی آثار عذاب کے نظر آنے لگے آسمان پر نہایت ہولناک اور سیاہ بادل چھا گیا جس سے سخت دھواں نکلتا تھا۔ وہ ان کے مکانوں سے قریب ہوتا جاتا تھا حتیٰ کہ ان کی چھتیں بالکل تاریک ہوگئیں۔ یہ آثار دیکھ کر جب انہیں ہلاکت کا یقین ہوگیا تو یونس کی تلاش ہوئی وہ نہ ملے تو سب لوگ عورتوں بچوں سمیت بلکہ مواشی اور جانوروں کو بھی ساتھ لیکر جنگل میں نکل آئے اور سچے دل سے خدا کی طرف رجوع ہوئے۔ خوف سے چیخیں مارتے تھے اور بڑے اخلاص و تضرع سے خدا کو پکار رہے تھے۔ چاروں طرف آہ و بکاء کی آوازیں بلند ہورہی تھیں اور کہتے جاتے تھے کہ "امنا بما جاء به یونس" جو کچھ یونس علیہ السلام لائے ہم اس پر ایمان لاتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے ان کو تضرع و بکاء پر رحم فرمایا اور آثار عذاب جو ہویدا ہو چکے تھے اٹھالئے گئے۔

علماء کے اقوال:

یہاں پہنچ کر علمائے سلف کے دو قول ہیں۔ اکثر علماء کہتے ہیں کہ ابھی اصلی عذاب کا معائنہ ان کو نہ ہوا تھا۔ صرف علامات و آثار نظر آئے تھے۔ ایسے وقت کا ایمان شرعاً معتبر اور نافع ہے۔ "ایمان بأس" جو معتبر و مقبول نہیں اس سے مراد یہ ہے کہ عین عذاب کو دیکھ کر اور اس میں پھنس کر ایمان لائے جیسے فرعون نے سمندر کی موجوں میں پھنس کر اقرار کیا تھا۔ بعض علماء کے نزدیک قوم یونس کا ایمان بھی فرعون کی طرح "ایمان" تھا جو عام ضابطہ کے موافق نافع نہ ہونا چاہئے تھا۔ لیکن حق تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے خلاف قاعدہ بطور استثناء اس قوم کا یہ ایمان معتبر رکھا۔ فرعون کے ایمان کی طرح رد نہیں فرمایا۔ پھر اختلاف ہوا ہے کہ آیا ان کے ایمان کا معتبر ہونا صرف دنیوی زندگی تک محدود تھا کہ دنیا میں آنے والا عذاب ٹل گیا۔ یا آخرت میں بھی موجب نجات ہوگا۔ "ابن کثیرؒ" نے دوسرے احتمال کو ترجیح دی ہے یعنی دنیا و آخرت دونوں جگہ مفید و معتبر ہوگا۔ واللہ اعلم۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے نہایت لطیف و دقیق طرز میں آیت کی تفسیر کی ہے۔ یعنی دنیا میں عذاب دیکھ کر یقین لانا کسی کو کام نہیں آیا، مگر قوم یونس کو، اس واسطے کہ ان پر حکم عذاب کا نہ پہنچا تھا۔ حضرت یونس کی شتابی سے محض صورت عذاب کی نمودار ہوئی تھی (تا ان کی نظر میں حضرت یونس کی بات جھوٹی نہ ہو) وہ ایمان لائے پھر بچ گئے اور صورت عذاب ہٹالی گئی۔ اسی طرح مشرکین مکہ کہ فتح مکہ میں فوج اسلام ان پر پہنچی قتل و غارت کے لئے۔ لیکن ان کا ایمان قبول ہوگیا۔ اور امان ملی۔" حضرت یونس کے قصہ کا بقیہ سورۂ "صافات" وغیرہ میں آئے گا۔ (تفسیر عثمانیؒ)

قوم یونسؑ کی توبہ کا قبول ہونا ضابطہ کے خلاف نہیں ہے

اس تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ دنیا کا عذاب سامنے آجانے پر بھی توبہ کا دروازہ بند نہیں ہوتا بلکہ توبہ قبول ہوسکتی ہے، البتہ آخرت کا عذاب سامنے آجانے کے وقت توبہ قبول نہیں ہوتی، اور عذاب آخرت کا سامنے آنا یا قیامت کے دن ہوگا یا موت کے وقت، خواہ وہ طبعی موت ہو یا کسی دنیوی عذاب میں مبتلا ہو کر ہو جیسے فرعون کو پیش آیا۔

اس لئے قوم یونس علیہ السلام کی توبہ قبول ہو جانا عام ضابطۂ الٰہیہ کے خلاف نہیں بلکہ اس کے ماتحت ہے کیونکہ انہوں نے اگرچہ عذاب آتا ہوا دیکھ کر توبہ کی مگر عذاب میں مبتلا ہونے اور موت سے پہلے کرلی، بخلاف فرعون نے اور دوسرے لوگوں کے جنہوں نے عذاب میں مبتلا ہونے کے بعد اور غرغرۂ موت کے وقت توبہ کی اور ایمان کا اقرار کیا اس لئے ان کا ایمان معتبر نہ ہوا اور توبہ قبول نہ ہوئی۔

حضرت یونس علیہ السلام کا قصہ

حضرت یونسؑ کی دعوت اور قوم کا انکار:

بغوی نے حضرت ابن مسعود اور سعید بن جبیر اور وہب بن منبہ وغیرہ کی روایات سے حسب ذیل بیان کیا ہے۔

قوم یونس نینوا علاقۂ موصل کی رہنے والی تھی۔ اللہ نے ان کی ہدایت کے لئے حضرت یونسؑ کو مامور فرمایا۔ حضرت یونسؑ نے ان کو ایمان کی دعوت دی۔ انھوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اللہ کی طرف سے حضرت یونسؑ کو حکم دیا گیا، ان سے کہہ دو کہ تین روز تک صبح کے وقت ان پر عذاب آئے گا، حضرت یونسؑ نے اطلاع دے دی، قوم والوں نے کہا، تجربہ سے ثابت ہے کہ یہ شخص کبھی جھوٹ نہیں بولا اس لئے انتظار کرو اور دیکھو اگر یہ آج رات تمہارے ساتھ رہے تو سمجھ لو صبح کو کچھ نہیں ہوگا اور اگر رات کو تمہارے ساتھ نہ رہے تو سمجھ لو کہ صبح.......... کو عذاب ضرور آئے گا۔ وسط شب میں حضرت یونسؑ قوم کے پاس سے باہر چلے گئے۔

عذاب کی علامات:

صبح ہوئی تو لوگوں کے سروں سے ایک میل اوپر عذاب آ گیا۔ وہب کا بیان ہے، عذاب ایک سیاہ گھٹا کی شکل میں سخت دھواں اڑتا آ گیا پھر نیچے اتر کر شہر پر چھا گیا جس سے گھروں کی چھتیں کالی ہوگئیں یہ دیکھ کر لوگوں کو ہلاک ہو جانے کا یقین ہوگیا۔ حضرت یونسؑ کو تلاش کیا تو ان کا بھی کہیں پتہ نہ چلا،

توبہ کا خیال:

آخر اللہ نے ان کے دلوں میں توبہ کرنے کا خیال ڈال دیا اور بڑے، بچے، عورت، مرد اور چوپائے سب شہر کے باہر میدان میں جمع ہو گئے۔ سبھوں نے کمبل کا (فقیرانہ) لباس پہن لیا اور لگے توبہ کرنے اور صحیح نیت کے ساتھ ایمان کا اظہار کرنے ہر ماں کو بچے سے علیحدہ کر دیا گیا تھا یہاں تک کہ چوپایوں کے بچے بھی ماؤں سے جدا کر دیئے گئے تھے۔ اس علحدگی کی وجہ سے آدمیوں اور جانوروں کے بچوں نے چیخنا شروع کر دیا، مائیں بھی (جذبۂ محبت کے زیر اثر) چیخنے لگیں (ایک کہرام مچ گیا) بیتابی سے سب چیخ پڑے اور اللہ کے سامنے گڑگڑائے، آخر اللہ نے رحم فرمایا دعا قبول فرمائی چھایا ہوا عذاب دور کر دیا۔ یہ واقعہ ۱۰ محرم کا تھا۔

حضرت یونسؑ کا سفر:

ابن ابی حاتم نے حضرت علیؓ سے بیان نقل کیا ہے کہ قوم یونسؑ کی توبہ عاشورہ کے دن قبول ہوئی تھی۔ حضرت یونسؑ قوم کی بستی سے باہر چلے گئے اور عذاب نازل ہونے اور قوم کے ہلاک ہونے کا انتظار کرتے رہے لیکن آپ نے عذاب آتا نہ دیکھا (اس زمانہ کا قومی ضابطہ تھا کہ) اگر کوئی شخص بلاثبوت جھوٹ بولتا تھا تو اس کو قتل کر دیا جاتا تھا، حضرت یونسؑ نے کہا، میں نے قوم سے جھوٹی بات کہی (یعنی میرا جھوٹ ثابت ہوگیا) اب کیسے ان کے پاس لوٹ کر جا سکتا ہوں۔ یہ خیال کر کے قوم سے ناراض اور اپنے رب سے کشیدہ ہو کر چل دیئے۔ دریا پر پہنچے تو کچھ لوگ کشتی میں سوار ہو رہے تھے۔ لوگوں نے پہچان لیا اور بلا کرایہ سوار کر لیا۔ کشتی جب آپ کو لے کر بیچ سمندر میں پہنچی تو رک گئی۔ نہ آگے بڑھ سکتی تھی نہ پیچھے ہٹتی تھی، کشتی والوں نے کہا، اس کشتی کے اڑ جانے کی کوئی خاص وجہ ہے، یونسؑ نے کہا مجھے اس کی وجہ معلوم ہے۔ اس میں کوئی بڑا گناہ گار سوار ہے۔ لوگوں نے کہا وہ کون ہے۔ یونسؑ نے کہا میں ہوں، مجھے دریا میں پھینک دو۔ لوگوں نے کہا جب تک ہمارے نزدیک کوئی خاص وجہ نہ ہو ہم تو آپ کو پھینکنے والے نہیں۔ آخر قرعہ اندازی کی اور تینوں بار حضرت یونسؑ ہی کا نام قرعہ میں نکلا۔

حضرت یونسؑ پانی میں:

حضرت نے فرمایا، یا تو تم مجھے پانی میں پھینک دو ورنہ سب ہلاک ہو جاؤ گے۔ مجبوراً کشتی والوں نے آپ کو پھینک دیا پھینکتے ہی کشتی روانہ ہوگئی۔ کشتی کے نچلے حصہ کے پاس ایک مچھلی منہ کھولے اللہ کے حکم کی منتظر تھی، جونہی یونسؑ پانی میں گرے مچھلی نے اپنے منہ میں لے لیا۔

یہ بھی روایت میں ہے کہ اللہ نے ایک بڑی مچھلی کو حکم دیا اس نے کشتی کی طرف رخ کیا۔ کشتی والوں نے جو اس کو منہ کھولے ہوئے کشتی کی طرف رخ کئے ہوئے دیکھا جو بڑے پہاڑ جیسی تھی تو انھوں نے محسوس کیا کہ وہ کشتی کے اندر کسی کی جستجو کر رہی ہے۔ حضرت یونسؑ نے یہ دیکھتے ہی پانی میں چھلانگ لگا دی (اور مچھلی نے ان کو پکڑ لیا)

حضرت ابن عباس کا بیان ہے کہ حضرت یونسؑ اپنی قوم سے ناراض ہو کر نکل کھڑے ہوئے اور بحر روم پر پہنچے۔ وہاں ایک کشتی مسافروں سے بھری کھڑی تھی۔ آپ اس میں سوار ہو گئے۔ جب کشتی روانہ ہو کر وسط میں پہنچی تو رک کر کھڑی ہوگئی۔ قریب تھا کہ سب لوگ ڈوب جائیں۔ ملاح بولے ہماری کشتی میں کوئی گناہ گار آدمی یا بھاگا ہوا غلام سوار ہو گیا ہے جس کی وجہ سے کشتی اڑ گئی ہے، ہمارا طریقہ ہے کہ ایسے موقع پر ہم قرعہ اندازی کرتے ہیں جس کے نام پر قرعہ نکل آتا ہے اس کو سمندر میں پھینک دیتے ہیں (کشتی چل نکلتی ہے۔) ایک آدمی کو ڈبو دینا تو پوری کشتی کے مع سواریوں کے ڈوب جانے سے بہتر ہوتا ہے، چنانچہ لوگوں نے تین بار قرعہ ڈالا، ہر بار یونسؑ کے نام پر نکلا یونسؑ فوراً کھڑے ہوئے اور بولے میں ہی گناہ گار آدمی اور بھاگا ہوا غلام ہوں،

مچھلی کے پیٹ میں:

اس کے بعد آپ نے خود اپنے کو پانی میں پھینک دیا فوراً ایک مچھلی نے نگل لیا پھر اس مچھلی سے بڑی مچھلی نے آ کر اس مچھلی کو نگل لیا اللہ نے مچھلی کو حکم دیا کہ یونسؑ کو بال برابر تکلیف نہ ہونے پائے۔ میں نے تیرے پیٹ کو اس کے لئے قید خانہ بنایا ہے اس کو تیری غذا نہیں بنایا۔ حضرت ابن عباس کی روایت میں آیا ہے کہ مچھلی کو

ندا دی گئی کہ ہم نے یونسؑ کو تیری روزی نہیں بنایا بلکہ تیرے پیٹ کو اس کی حفاظت کا مقام اور عبادت خانہ بنایا ہے۔ یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ قرعہ ڈالنے سے پہلے ہی حضرت یونسؑ کھڑے ہو گئے اور فرمایا میں ہی گنہگار بھاگا ہوا غلام ہوں۔ کشتی والوں نے پوچھا تم کون ہو۔ فرمایا یونسؑ بن متی لوگ پہچان گئے اور بولے، اے اللہ کے رسول ہم آپ کو نہیں پھینکیں گے بلکہ قرعہ اندازی کریں گے۔ قرعہ اندازی کی گئی اور حضرت کے نام کا قرعہ نکل آیا اور آپ نے خود اپنے آپ کو پانی میں پھینک دیا۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا، جس مچھلی نے آپ کو نگلا تھا وہ آپ کو ساتویں زمین کی گہرائی میں لے گئی اور چالیس رات تک آپ مچھلی کے پیٹ میں رہے۔

تسبیح اور پھر باہر آنا:

وہاں آپ نے سنگریزوں کے تسبیح کرنے کی آواز سنی تو تاریکیوں میں ہی پکار اٹھے لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ۔ اللہ نے آپ کی دعا قبول فرمالی اور بحکم خداوندی مچھلی نے لاکر آپ کو سمندر کے کنارے پھینک دیا اس وقت آپکی ہیئت ایسی تھی جیسے پروبال نوچا ہوا چوزہ۔ اللہ نے فوراً کدو کا درخت پیدا کر دیا جس کے سایہ میں آپ نے آرام لیا اور ایک پہاڑی بکری یا پاڑی کو مامور کر دیا۔ آپ اس کا دودھ پیتے رہے جب درخت سوکھ گیا تو آپ نے درخت پر رو دیئے۔ اللہ نے وحی بھیجی، تو ایک درخت کے خشک ہو جانے پر تو رو دیا اور ایک لاکھ یا اس سے بھی زیادہ آدمیوں پر نہیں رویا اور ان کو ہلاک کرا دینا چاہا۔

غلام کو بادشاہی مل گئی:

یہاں سے حضرت یونسؑ چل دیئے اور ایک غلام سے ملاقات ہوئی جو جانور چرا رہا تھا، اس سے پوچھا غلام تو کون ہے؟ اس نے کہا یونسؑ کی قوم کا ہوں۔ حضرت نے فرمایا جب تو اپنی قوم والوں سے جا کر ملے تو ان سے کہہ دینا کہ میری ملاقات یونسؑ سے ہوئی تھی۔ غلام نے کہا آپ واقف ہیں کہ اگر میرے پاس گواہ نہ ہوں گے تو (مجھے جھوٹی اطلاع دینے پر) قتل کر دیا جائے گا۔ حضرت یونسؑ نے فرمایا یہ زمین کا ٹکڑا اور یہ درخت تیری گواہی دے گا۔ غلام نے کہا تو شہادت دینے کا ان کو حکم دے دیجئے۔ حضرت نے فرمایا، جب یہ غلام تمہارے پاس آئے تو تم دونوں اس کی گواہی دینا۔ زمین، اور درخت نے کہا بہت اچھا۔ اس غلام نے جا کر اپنے بادشاہ کو اطلاع دے دی کہ یونسؑ سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ بادشاہ نے غلام کو قتل کر دینے کا حکم دے دیا۔ غلام نے کہا، میرے پاس (اس بات کی سچائی کے) گواہ ہیں۔ میرے ساتھ کسی کو بھیجو غرض غلام لوگوں کو ساتھ لے کر اس جگہ اور اس درخت کے پاس پہنچا اور کہا میں تم دونوں کو خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا یونسؑ نے تم دونوں کو گواہ بنایا تھا، دونوں نے کہا ہاں، یہ سنتے ہی لوگ خوف زدہ ہو کر لوٹ آئے اور بادشاہ سے آکر کہہ دیا کہ درخت اور زمین نے اس غلام کی گواہی دی۔ بادشاہ نے غلام کا ہاتھ پکڑ کر اس کو اپنی جگہ بٹھا دیا اور کہا تو اس جگہ کا مجھ سے زیادہ حقدار ہے۔ غلام نے ان لوگوں کا انتظام چالیس سال تک کیا۔ (تفسیر مظہریؒ)

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ
اور اگر تیرا رب چاہتا بیشک ایمان لے آتے جتنے لوگ کہ زمین میں
كُلُّهُمْ جَمِیْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰی
ہیں سارے تمام اب کیا تو زبردستی کریگا لوگوں پر
یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ ﴿۹۹﴾
کہ ہو جائیں با ایمان

کسی کو زبردستی مؤمن نہیں بنایا جا سکتا:

یعنی آپ کو یہ قدرت نہیں کہ زبردستی کسی کے دل میں ایمان اتار دیں۔ خدا چاہتا تو بیشک سب آدمیوں کے دلوں میں ایمان ڈال سکتا تھا۔ مگر جیسا کہ پہلے متعدد مواضع میں تقریر کی جا چکی ہے، ایسا کرنا اس کی تکوینی حکمت و مصلحت کے خلاف تھا، اس لئے نہیں کیا۔ (تفسیر عثمانیؒ)

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِیْعًا اور (اے محمد) اگر آپ کے رب کو منظور ہوتا تو زمین پر رہنے والے سب کے سب ایمان لے آتے کوئی بغیر ایمان لاتے نہ بچتا اور کوئی ایمان سے اختلاف نہ کرتا۔ سب ایمان پر متفق ہو جاتے۔

فرقہ قدریہ کا مذہب:

فرقۂ قدریہ قائل ہے کہ اللہ تو سب لوگوں کا مومن ہو جانا چاہتا ہے لیکن لوگ خود اپنے اختیار سے ایمان لانا نہیں چاہتے (اس فرقہ کے نزدیک مشیت اور رضا میں فرق نہیں ہے چاہنے کا معنی ہے پسند کرنا۔ اشاعرہ کہتے ہیں کہ اللہ کو ایمان تو سب کا پسند ہے مگر مشیت نہیں کہ مومن ہو جائیں رضائے الٰہی سے تخلف تو ہو سکتا ہے مگر مشیت سے تخلف نہیں ہو سکتا قدریہ کے نزدیک جو رضا ہے وہی مشیت رضا عام ہے مشیت بھی عام ہے، رضا کے خلاف ہونا ممکن ہے اور ہوتا ہے، مشیت کے خلاف بھی ہو سکتا ہے۔ اور ہوتا ہے) آیت بتا رہی ہے کہ اللہ نے سب لوگوں کو مومن بنانا چاہا ہی نہیں اگر اس کی مشیت ہوتی تو سب مومن ہو جاتے (ہاں سب کا مومن ہو جانا اس کو پسند ہے)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے تسکین:

بات یہ ہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت زیادہ خواہشمند تھے کہ سب لوگ مؤمن ہو جائیں (حالانکہ آپ کا کام صرف ترغیب دینا تھا جبر کرنے کا تو اختیار

ہی نہ تھا اور جو کام جبر سے بھی پورا نہ ہو سکے وہ محض ترغیب سے کیسے پورا ہو سکتا ہے) پس اللہ نے بتا دیا ہے کہ جس کے نصیب میں سعادت ہوگی وہی ایمان لائے گا اور جو اللہ کے علم میں شقی ہے وہ ایمان نہیں لا سکتا۔ آپ اس کی کچھ پرواہ نہ کیجئے گویا اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تسکین ہے۔ (تفسیر مظہریؒ)

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ
اور کسی سے نہیں ہو سکتا کہ ایمان لائے
اللّٰهِ ۭ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ
مگر اللہ کے حکم سے اور وہ ڈالتا ہے گندگی ان پر
لَا يَعْقِلُوْنَ ۝۱۰۰
جو نہیں سوچتے

غور و فکر سے توفیق ملتی ہے:

خدا کی مشیت و توفیق اور حکم تکوینی کے بدون کوئی ایمان نہیں لا سکتا۔ اور یہ حکم و توفیق ان ہی کے حق میں ہوتی ہے جو خدا کے نشانات میں غور کریں اور عقل و فہم سے کام لیں۔ جو لوگ سوچنے سمجھنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے انہیں خدا تعالیٰ کفر و شرک کی گندگی میں پڑا رہنے دیتا ہے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

درکارخانہ عشق از کفر ناگزیر است دوزخ کرا بسوزد گر بولہب نباشد
(کاندھلویؒ)

رجس سے مراد ہے، عذاب یا اللہ کی مدد سے محرومی کیونکہ یہ محرومی ہی عذاب کا سبب ہے۔ نہ سمجھنے سے مراد ہے حق و باطل میں تمیز نہ کرنا یعنی کافروں کے دلوں پر چونکہ مہر لگی ہوئی ہے اور اللہ نہیں چاہتا کہ وہ حق و باطل میں امتیاز کر سکیں اس لئے ان کو حق کا باطل سے امتیاز نہیں۔ (تفسیر مظہری)

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ
تو کہہ دیکھو تو کیا کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں
وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ
اور کچھ کام نہیں آتیں نشانیاں اور ڈرانیوالے
لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝۱۰۱
ان لوگوں کو جو نہیں مانتے

غور و فکر کا سامان:

یعنی سوچنے اور غور کرنے والوں کے لئے آسمان و زمین میں خدا کی قدرت و حکمت اور توحید و تفرید کے کیا کچھ نشان موجود ہیں۔ بلکہ ذرہ ذرہ اور پتہ پتہ اس کی توحید پر دلالت کرتا ہے۔ لیکن جو کسی بات کو ماننا اور تسلیم کرنا نہیں چاہتے ان کے لئے یہ سب نشانات و دلائل بیکار ہیں اور ڈرانے والے پیغمبروں کی تنبیہ و تخویف بھی غیر مؤثر ہے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (اے محمد) آپ کہہ دیجئے کہ دیکھو۔ غور کرو سوچو۔ آسمانوں اور زمین میں کیسی عجیب نشانیاں ہیں۔ چاند، سورج، ستارے، ان کی بناوٹ، مربوط رفتار، پہاڑ ان کی استقامت، سمندر، دریا، درخت اور کائنات نباتی و حیوانی، ان تمام چیزوں کے اندر ایک صانع و قادر و دانا و یگانہ کی قدرت و صنعت جھلک رہی ہے۔ اس کی ذات کی عظمت اور صفات کے کمال کا ان سے ظہور ہو رہا ہے۔ (تفسیر مظہریؒ)

فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ
سو اب کچھ نہیں جس کا انتظار کریں مگر انہیں کے سے
خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّىْ
دن جو گزر چکے ہیں ان سے پہلے تو کہہ اب راہ دیکھو میں بھی
مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ۝۱۰۲
تمہارے ساتھ راہ دیکھتا ہوں

یہ ضدی بھی عذاب کا انتظار کریں:

ایسی ضدی اور معاند قوم کے لئے جو کسی دلیل اور نشان کو نہ مانے، اور کچھ باقی نہیں بجز اس کے کہ گزشتہ مکذبین پر جو آفات و حوادث نازل ہوئے ہیں، ان کا یہ بھی انتظار کریں۔ سو بہتر ہے تم اور ہم دونوں مل کر اس وقت کا انتظار کرتے ہیں تاکہ صادق و کاذب کا آخری فیصلہ سامنے آجائے۔

ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ
پھر ہم بچا لیتے ہیں اپنے رسولوں کو اور ان کو جو ایمان لائے
حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۰۳
اسی طرح ذمہ ہے ہمارا بچا لینگے ایمان والوں کو

اب بھی سچے مومنوں کو نجات ملے گی:

یعنی جیسے پہلی قوموں کے ساتھ ہماری عادت رہی ہے کہ مکذبین کو ہلاک کر کے پیغمبروں اور مومنین کو بچایا۔ اسی طرح موجودہ اور آئندہ مومنین کی نسبت ہمارا وعدہ ہے کہ ان کو نجات دیں گے آخرت میں عذاب الیم سے اور دنیا میں کفار کے

مظالم اور سختیوں سے۔ ہاں شرط یہ ہے کہ مؤمنین مؤمنین ہوں۔ یعنی وہ صفات و خصال رکھتے ہوں جو قرآن وحدیث میں مؤمنین کی بیان ہوئی ہیں۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِىْ شَكٍّ
کہہ دے اے لوگو اگر تم شک میں ہو میرے دین سے
مِّنْ دِيْنِىْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ
تو میں عبادت نہیں کرتا جس کی تم عبادت کرتے ہو
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِىْ
اللہ کے سوا اور لیکن میں عبادت کرتا ہوں اللہ کی
يَتَوَفّٰىكُمْ ۖۚ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۴﴾
جو کھینچ لیتا ہے تم کو اور مجھ کو حکم ہے کہ رہوں ایمان والوں میں
وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَلَا
اور یہ کہ سیدھا کر منہ اپنا دین پر حنیف ہو کر اور مت ہو شرک والوں
تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۵﴾ وَلَا تَدْعُ مِنْ
میں اور مت پکار اللہ کے سوا ایسے کو کہ نہ
دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ
بھلا کرے تیرا اور نہ برا پھر اگر تو ایسا کرے تو تو بھی
فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۶﴾
اس وقت ہو ظالموں میں

عقیدۂ توحید کی وضاحت:

یعنی اگر میرا طریقہ اور مسلک دینی تمہاری سمجھ میں نہیں آیا۔ اس لئے اس کی نسبت شکوک وشبہات میں پھنسے ہوئے ہو، تو میں تمہیں اپنے دین کا اصل اصول (جو توحید خالص ہے) سمجھائے دیتا ہوں۔ خلاصہ یہ ہے کہ میں تمہارے ان فرضی معبودوں کی عبادت سے سخت نفور اور بیزار ہوں جس کے اختیار کرنے کا امکان بھی کبھی میری طرف سے دل میں نہ لانا۔ میری عبادت خالص اس خداوند قدوس کے لئے ہے جس کے قبضہ میں تمہاری سب کی جانیں ہیں کہ جب تک چاہے انہیں جسموں میں چھوڑے رکھے اور جب چاہے ایک دم میں کھینچ لے گویا موت وحیات کا رشتہ جس کے ہاتھ میں ہے بندگی اسی کی ہو سکتی ہے۔ نہ صرف یہ کہ جوارح سے اس کی بندگی کی جائے، ضروری ہے کہ دل میں اس کی توحید وتفرید پر پورا یقین وایمان ہو اور ظاہر و باطن میں اسی دین حنیف پر جو ابراہیم خلیل اللہ کا دین ہے پوری ہمت اور توجہ سے مستقیم رہ کر شرک جلی وخفی کا تسمہ نہ لگا رہنے دیا جائے۔ جس طرح عبادت صرف اسی کی کریں، استعانت کے لئے بھی اسی کو پکاریں، کیونکہ ہر قسم کا نفع نقصان اور بھلائی برائی تنہا اسی کے قبضہ میں ہے۔ مشرکین کی طرح ایسی چیزوں کو مدد کے لئے پکارنا جو کسی نفع نقصان کے مالک نہ ہوں سخت بے موقع بات بلکہ ظلم عظیم (یعنی شرک) کا ایک شعبہ ہے۔ اگر بفرض محال نبی سے ایسی حرکت صادر ہو تو ان کی عظیم الشان شخصیت کو لحاظ کرتے ہوئے ظلم اعظم ہوگا۔

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ
اور اگر پہنچا دیوے تجھ کو اللہ کچھ تکلیف تو کوئی نہیں
اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ۭ
اُس کو ہٹانیوالا اُسکے سوا اور اگر پہنچانا چاہے تجھ کو کچھ بھلائی
يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَهُوَ
تو کوئی پھیرنے والا نہیں اس کے فضل کو پہنچائے اپنا فضل جس پر چاہے
الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۷﴾
اپنے بندوں میں اور وہی ہے بخشنے والا مہربان

دکھ سکھ دینے والا اللہ ہے:

جب ان چیزوں کے پکارنے سے منع کیا جن کے قبضہ میں تمہارا بھلا برا کچھ نہیں تو مناسب ہوا کہ اس کے بالمقابل مالک علی الاطلاق کا ذکر کیا جائے جو تکلیف وراحت اور بھلائی برائی کے پورے سلسلہ پر کامل اختیار اور قبضہ رکھتا ہے۔ جس کی بھیجی ہوئی تکلیف کو دنیا میں کوئی نہیں ہٹا سکتا۔ اور جس پر فضل ورحمت فرمانا چاہے، کسی کی طاقت نہیں کہ اسے محروم کر سکے۔ (تفسیر عثمانی)

اعمال پر بھروسہ نہ کرو:

ابونعیم نے حضرت علی کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ نے اسرائیلی انبیاء میں سے ایک نبی کے پاس وحی بھیجی کہ تمہاری امت میں جو طاعت گزار لوگ ہوں ان سے کہہ دو کہ اپنے اعمال پر بھروسہ نہ کر بیٹھیں۔ قیامت کے دن حساب کے لئے جب میں بندوں کو کھڑا کروں گا تو جس کو عذاب دینا چاہوں گا (اس کی حساب فہمی خوردہ گیری کے ساتھ کروں گا اور) اس کو عذاب دوں گا اور اپنی امت کے گنہگاروں سے کہہ دو کہ خود اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو (ناامید نہ ہو) اگر میں چاہوں گا تو بڑے

بڑے گناہ معاف کردوں گا اور مجھے پروا بھی نہ ہوگی۔

مذکورۂ بالا آیت نازل فرما کر اللہ نے اپنے سوا دوسروں سے ڈرنے یا امید رکھنے کا راستہ ہی بند کر دیا۔ اللہ غفور ورحیم ہے یعنی اس کی رحمت غضب پر غالب ہے۔

انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، عمر بھر خیر کے طالب رہو اور خدا کے نعمات کو درپیش رکھو۔ خدا کی رحمتوں کی ہوائیں جس خوش نصیب کو پہنچ گئیں تو پہنچ گئیں۔ وہ جس کو چاہے رحمت سے سرفراز فرمائے اور اللہ پاک سے درخواست کرو کہ تمہاری عیب پوشی کرتا رہے اور تمہیں آفات زمانہ اور آفات نفس سے امن میں رکھے، وہ غفور الرحیم ہے، کیسا ہی گناہ کیوں نہ ہو، توبہ کرلو حتیٰ کہ شرک کر کے بھی توبہ کرلو تو وہ قبول کرلے۔

قریشیوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خطاب:

حدیث صحیح میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صفا پہاڑی پر چڑھ کر قریش کے قبیلوں کو آواز دی۔ تھوڑی ہی دیر میں یکے بعد دیگرے سب جمع ہو گئے۔ آپ نے فرمایا کہ اے قبیلۂ قریش اگر میں تمہیں خبر دوں کہ صبح ہوتے ہوتے دشمن تم پر حملہ کرنے کے لئے آ پہنچنے والا ہے، تو میری بات تم سچ مانوں گے کہ نہیں؟ سب نے یک زبان ہو کر کہا، ہمیں تو کبھی تجربہ نہیں ہوا کہ تم نے کوئی بات جھوٹ موٹ کہہ دی ہو تو آپ نے فرمایا تو سنو! میں خدا کے عذاب شدید سے تمہیں آگاہ کر دیتا ہوں کہ وہ تمہیں آ لینے والا ہی ہے، اب بھی خدا سے معافی مانگ لو، توبہ کرلو۔ وہ خدا تمہارے ساتھ اچھا برتاؤ کرے گا اور ہر صاحب فضل کو اپنے فضل سے بہرہ ور فرمائے گا وہ دنیا میں تمہارے ساتھ اچھا سلوک کرے گا، اور دار آخرت میں بھی۔ جو بھی مرد وعورت بشرطیکہ ایمان لے آئے ہم اسے مرنے کے بعد حیات طیبہ کے ساتھ اٹھائیں گے۔

نیت صحیح ہو تو ہر عمل کا اجر ملے گا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سعدؓ سے کہا کہ اگر تم کسی پر کچھ خرچ کرو اور تمہاری نیت خالص لوجہ اللہ ہے تو یقیناً اس کا اجر پاؤ گے۔ حتیٰ کہ جو اپنی عورت کو کھلاتے ہو اس کا بھی اجر تمہیں ملے گا۔ جس نے برا عمل کیا اس پر ایک گناہ لکھ دیا گیا اور جس نے ایک نیکی کی اس پر دس اجر لکھ دیئے گئے۔ اگر دنیا میں ایک عمل بد کی اس کو سزا دی گئی ہو، تو اس کے دس حسنات اس کے حق میں اپنے ہیں میں سے ایک نیکی سوخت ہو جاتی ہے اور اس کے نو حسنات اس کے حق میں رہتے ہیں۔

نقصان والا آدمی:

پھر فرمایا کہ وہ شخص بڑے خسارے میں رہا کہ اس کی اکائیاں اس کے ہر عشرہ پر غالب آ جاتی ہوں۔ اگر تم روگردانی کرو گے تو مجھے تم پر عذاب قیامت کا خوف ہے۔ یہ اس شخص کے لئے جو اوامر الٰہی سے منہ پھیرتا ہے رسولوں کی تکذیب کرتا ہے۔ تو یقیناً قیامت کے روز عذاب سے دوچار ہوگا۔ تمہاری بازگشت خدا کی طرف ہے وہ اپنے اولیاء پر احسان کرنے اور اعداء کو سزا دینے پر قادر ہے اور اعادۂ خلق پر قادر ہے۔ یہ

زبردست تنبیہ ہے جیسا کہ اس سے پہلے ترغیب دی گئی تھی۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ

کہہ دے اے لوگو پہنچ چکا حق تم کو تمہارے رب سے

رَبِّكُمْ ۖ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي

اب جو کوئی راہ پر آئے سو وہ راہ پاتا ہے اپنے بھلے کو

لِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۖ

اور جو کوئی بہکا پھرے سو بہکا پھرے گا اپنے برے کو

وَمَا أَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيلٍ ﴿١٠٨﴾

اور میں تم پر نہیں ہوں مختار

ہر ایک نفع نقصان اپنا ہے:

یعنی حق واضح طور پر دلائل و براہین کے ساتھ پہنچ چکا، جس کے قبول نہ کرنے کا کوئی معقول عذر کسی کے پاس نہیں خدا کی آخری حجت بندوں پر تمام ہوگئی۔ اب ہر ایک اپنا نفع نقصان سوچ لے۔ جو خدا کی بتلائی ہوئی راہ پر چلے گا دنیا و آخرت میں کامیاب ہوگا۔ جو اسے چھوڑ کر ادھر ادھر بھٹکتا پھرے گا خود پریشان اور ذلیل وخوار رہے گا۔ اپنے بھلے برے کو خوب سمجھ کر ہر شخص اپنے مستقبل کا انتظام کرلے اور جو راستہ پسند ہو اختیار کرے۔ پیغمبر کوئی مختار بنا کر نہیں بھیجے گئے جو تمہارے افعال کے ذمہ دار اور جوابدہ ہوں۔ ان کا کام صرف آگاہ کر دینے اور راستہ بتلا دینے کا ہے۔ اس پر چلنا، چلنے والے کے اختیار میں ہے۔

وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتَّىٰ

اور تو چل اسی پر جو حکم پہنچے تیری طرف اور صبر کر جب تک

يَحْكُمَ اللَّهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ ﴿١٠٩﴾

فیصلہ کرے اللہ اور وہ ہے سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی:

اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ اگر یہ لوگ حق کو قبول نہ کریں تو اپنے کو ان کے غم میں نہ گھلائیں۔ آپ خدا تعالیٰ کے احکام کی پیروی کرتے رہئے اور تبلیغ وغیرہ کے کام میں لگے رہئے۔ اور جو شدائد اس راستہ میں پہنچیں ان پر صبر کیجئے۔ مخالفین کی ایذاء رسانیوں کا تحمل کرتے رہنا چاہئے۔ یہاں تک کہ خدا آپ کے اور ان کے درمیان بہترین فیصلہ کر دے یعنی حسب وعدہ آپ کو منصور و غالب کرے یا جہاد کا حکم بھیج دے۔ تم سورۃ یونس علیہ السلام بمنہ تعالیٰ وفضلہ۔ فللہ الحمد علی ذلک۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورة هود

جو شخص اس کو خواب میں پڑھے اس کی تعبیر یہ ہے کہ اس کے دشمن بہت ہوں گے اور مسافرت کو ترجیح دے گا۔ (حضرت ابن سیرینؒ)

سُوۡرَةُ هُوۡدٍ مَّكِّيَّةٌ وَّهِيَ مِائَةٌ وَّثَلٰثٌ وَّعِشۡرُوۡنَ اٰيَةً وَّعَشۡرُ رُكُوۡعَاتٍ
سورۃ ھود مکہ میں نازل ہوئی اور اسکی ایک سوتیئس آیتیں اور دس رکوع ہیں
بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ
شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے
الٓرٰ كِتٰبٌ اُحۡكِمَتۡ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتۡ مِنۡ
یہ کتاب ہے کہ جانچ لیا ہے اس کی باتوں کو پھر کھولی گئی ہیں ایک
لَّدُنۡ حَكِيۡمٍ خَبِيۡرٍ ۙ﴿۱﴾
حکمت والے خبردار کے پاس سے

ہر لحاظ سے بے مثال کتاب:

یعنی یہ قرآن کریم وہ عظیم الشان اور جلیل القدر کتاب ہے، جس کی آیتیں لفظی ومعنوی ہر حیثیت سے نہایت جچی تلی باون تولہ پاؤ رتی ہیں۔ نہ ان میں تناقض ہے نہ کوئی مضمون حکمت یا واقع کے خلاف ہے نہ باعتبار معجزانہ فصاحت و بلاغت کے ایک حرف پر نکتہ چینی ہوسکتی ہے جس مضمون کو جس عبارت میں ادا کیا ہے محال ہے کہ اس سے بہتر تعبیر ہو سکے۔ الفاظ کی قبا معانی کی قامت پر ذرا بھی نہ ڈھیلی ہے نہ تنگ۔ جن اصول و فروع، اخلاق و اعمال اور قیمتی پند و نصیحت پر یہ آیات مشتمل ہیں اور جو دلائل و براہین اثبات دعاوی کے لئے استعمال کی گئی ہیں۔ وہ سب علم وحکمت کے کانٹے میں تلی ہوئی ہیں۔ قرآنی حقائق و دلائل ایسی مضبوط و محکم ہیں کہ زمانہ کتنی ہی پلٹیاں کھائے ان کے بدلنے یا غلط ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ عالم کے مزاج کی پوری تشخیص کر کے اور قیامت تک پیش آنے والے تغیرات وحوادث کو من کل الوجوہ جانچ تول کر ایسی معتدل اور ابدی غذائے روح، مائدہ قرآنی کے ذریعہ سے پیش کی گئی ہے جو تناول کرنے والوں کے لئے ہر وقت اور ہر حالت میں مناسب و ملائم ہو۔ ان تمام حکیمانہ خوبیوں کے باوجود یہ نہیں کہ اجمال و ابہام کی وجہ سے کتاب معمہ اور چیستان بن کر رہ جاتی بلکہ معاش و معاد کی تمام مہمات کو خوب کھول کر سمجھایا ہے اور موقع بہ موقع دلائل توحید، احکام، مواعظ، قصص، ہر چیز بڑی خوبصورتی اور قرینہ سے الگ الگ رکھی ہے۔ اور تمام ضروریات کا کافی تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ نزولی حیثیت میں بھی یہ حکمت مرعی رہی ہے کہ پورا قرآن ایک دم نہیں اتارا بلکہ وقتا فوقتا موقع و مصلحت کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ آیات کا نزول ہوتا رہا۔ قرآن میں ان تمام باریکیوں کو مجتمع دیکھ کر آدمی حیران ہو جاتا ہے۔ مگر حیرت کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر حکیم مطلق اور کبیر برحق کے کلام میں سب حکمتیں اور خوبیاں جمع نہ ہوں گی تو اور کس کلام میں توقع کی جاسکتی ہے۔ (تفسیر عثمانی)

الٓرٰ كِتٰبٌ اُحۡكِمَتۡ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتۡ مِنۡ لَّدُنۡ حَكِيۡمٍ خَبِيۡرٍ

الر۔ یہ (قرآن) ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں دلائل سے محکم کی گئی ہیں پھر (اس کے ساتھ) صاف صاف بیان بھی کی گئی ہیں، یہ ایک حکیم باخبر کی طرف سے ہے۔

احکمت یعنی اس کی آیات موتیوں کی طرح پروئی ہوئی ہیں ان کی ساخت پرداخت مضبوط ہے نہ اس کے الفاظ میں کوئی نقص ہے نہ معنی میں کوئی عیب۔ یا یہ مطلب ہے کہ اس کی آیات غیر منسوخ ہیں یہ مطلب اس وقت صحیح ہوگا جب آیات کتاب سے صرف اس سورت کی آیات مراد ہوں کیونکہ اس سورت کی کوئی آیت منسوخ نہیں۔ احکمت کا مطلب ہے پر حکمت بنائی ہوئی یعنی علمی اور عملی حکمتیں اس کے اندر بھری ہوئی ہیں حکم ضمہ کے ساتھ حکیم ہوگیا۔ فصلت یعنی جس طرح ہار کے درمیان جگہ جگہ دریکدانہ پروئے جاتے ہیں اسی طرح اس کی آیات الگ الگ کردی گئیں ہیں۔ کہیں اعتقادات، کہیں عملی احکام، کہیں مواعظ کہیں واقعات کی اطلاع یا فصل کر دینے سے مراد ہے الگ الگ سورتیں مقرر کر دینا یا تھوڑا تھوڑا حسب ضرورت دنیا میں) بھیجنا مراد ہے۔

بخاری نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ کچھ لوگ یعنی کچھ مسلمان خلوت میں بھی برہنہ ہونے اور کھلی جگہ میں عورتوں سے صنفی قربت کرنے سے شرماتے تھے ان کے بارہ میں یہ آیت نازل ہوئی۔

بغوی نے حضرت ابن عباس کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ آیت اخنس بن شریق کے متعلق نازل ہوئی یہ شخص بڑا شیریں کلام اور خوش رو تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آتا تھا تو وہی بات کہتا تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند ہوتی تھی مگر دل میں اس کے خلاف پوشیدہ رکھتا تھا، اس وقت یَثۡنُوۡنَ صُدُوۡرَهُمۡ سے مراد یہ ہوگی کہ وہ سینوں کے غلاف کے اندر کفر، کینہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دشمنی چھپائے رکھتے ہیں۔

اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰهَ
کہ عبادت نہ کرو مگر اللہ کی

یعنی اس محکم و مفصل کتاب کے نازل کرنے کا بڑا مقصد یہ ہے کہ دنیا کو صرف خدائے واحد کی عبادت کی طرف دعوت دی جائے۔ اور اسکے طریقے سکھائے جائیں۔ اسی عظیم وجلیل مقصد کے لئے پہلے انبیاء تشریف لائے تھے۔

''وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْٓ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ'' (الانبیاء رکوع ۲)

''وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ'' (النحل رکوع ۵)

اِنَّنِیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ وَّ بَشِیْرٌ ۝۲

میں تم کو اسی کی طرف سے ڈر اور خوشخبری سناتا ہوں

یعنی جو کتاب کو مانے اور شرک چھوڑ کر خدائے واحد کی عبادت کرے اسے فلاح دارین کی خوشخبری سناتے ہیں۔ جو نہ مانے اور کفر و شرک اختیار کرے اس کو عذاب الٰہی سے ڈراتے ہیں۔

وَّ اَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا

اور یہ کہ گناہ بخشواؤ اپنے رب سے پھر رجوع کرو

اِلَیْهِ یُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى

اس کی طرف کہ فائدہ پہنچائے تم کو اچھا فائدہ ایک

اَجَلٍ مُّسَمًّى

وقت مقرر تک

جو پچھلی تقصیرات معاف کرائے اور آئندہ کے لئے خدا کی طرف دل سے رجوع ہو تو دنیا کی زندگی اچھی طرح گزرے کیونکہ مومن قانت خواہ کسی حال میں ہو مگر خدا کے فضل و کرم کی بڑی بڑی امیدیں رکھتا ہے وہ حق تعالیٰ کی رضا جوئی اور مستقبل کی عظیم الشان خوشحالی کے تصور میں اس قدر مگن رہتا ہے کہ یہاں کی بڑی بڑی سختیوں کو خاطر میں نہیں لاتا وہ جب خیال کرتا ہے کہ میں اپنی زندگی کے فرائض صحیح طور پر انجام دے رہا ہوں جسکا صلہ مجھ کو ضرور ایک دن عرش والی سرکار سے ملنے والا ہے تو اپنی کامیابی اور حق تعالیٰ کے وعدوں پر اعتماد کرکے اس کا دل جوش مسرت سے اچھلنے لگتا ہے۔ اسے دنیا کی تھوڑی سی پونجی میں وہ سکون قلبی اور راحت باطنی نصیب ہوتی ہے جو بادشاہوں کو بے شمار سامانوں اور اموال و خزائن سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ بلکہ بعض اوقات یہاں کی چندروزہ تکلیفوں اور سختیوں میں وہ لذت پاتے ہیں جو اغنیاء وملوک اپنے عیش و تنعم میں محسوس نہیں کرتے۔ ایک محب وطن سیاسی قیدی کو اگر فرض کیجئے یقین ہوجائے کہ میری اسیری سے ملک اجنبیوں کی غلامی سے آزاد ہوجائے گا اور مجھے قید سے نکلتے ہی ملک کی جمہوریہ کا صدر بنادیا جائے گا۔ تو کیا اسے جیل خانہ کی بند کوٹھڑی میں سرور واطمینان کی کیفیت اس بادشاہ سے زیادہ حاصل نہ ہوگی جسکے لئے ہر قسم کے سامان عیش وطرب فراہم ہیں مگر اندیشہ لگا ہوا ہے کہ وہ ایک ہفتہ کے اندر نہایت ذلت کے ساتھ تخت شاہی سے اتارا جانے والا ہے؟ اسی پر دنیا کے جیل خانہ میں ایک مومن قانت کی زندگی کو قیاس کرلو۔

اہمیت وفضیلت:

سورۂ ہود ان سورتوں میں سے ہے جن میں پچھلی قوموں پر نازل ہونے والے قہر الٰہی اور مختلف قسم کے عذابوں کا اور پھر قیامت کے ہولناک واقعات اور اجزاء وسزا کا ذکر خاص انداز میں آیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک میں کچھ بال سفید ہوگئے تو حضرت صدیق اکبرؓ نے بطور اظہار رنج کے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ بوڑھے ہوگئے، تو آپ نے فرمایا کہ ہاں! مجھے سورۂ ہود نے بوڑھا کردیا، اور بعض روایات میں سورۂ ہود کے ساتھ سورۂ واقعہ اور مرسلات اور عم یتساءلون اور سورۂ تکویر کا بھی ذکر ہے۔ (رواہ الحاکم والترمذی)

مطلب یہ تھا کہ ان واقعات کے خوف و دہشت کی وجہ سے بڑھاپے کے آثار ظاہر ہوگئے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ محکم اس جگہ منسوخ کے مقابلہ میں ہے اور مراد یہ ہے کہ اس کتاب یعنی قرآن کی آیات کو اللہ تعالیٰ نے مجموعی حیثیت سے محکم غیر منسوخ بنایا ہے یعنی جس طرح پچھلی کتابیں تورات و انجیل وغیرہ نزول قرآن کے بعد منسوخ ہوگئیں، اس کتاب کے نازل ہونے کے بعد چونکہ سلسلہ نبوت ووحی ہی ختم ہوگیا اس لئے یہ کتاب تاقیامت منسوخ نہ ہوگی۔ (قرطبی) اور قرآن کی بعض آیات کا خود قرآن ہی کے ذریعہ منسوخ ہوجانا اس کے منافی نہیں۔ (معارف القرآن)

وَّ یُؤْتِ كُلَّ ذِیْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ؕ

اور دیوے ہر زیادتی والے کو زیادتی اپنی

جو جس قدر زیادہ بڑھ کر عمل کرے گا اسی قدر خدا کے فضل سے زیادہ حصہ پائے گا۔ آخرت میں اجر وثواب اور دنیا میں مزید طمانیت حاصل ہوگی۔ (تفسیر عثمانی)

وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْكُمْ

اور اگر تم پھر جاؤ گے تو میں ڈرتا ہوں تم پر

عَذَابَ یَوْمٍ كَبِیْرٍ ۝۳

ایک بڑے دن کے عذاب سے

یعنی میری بات نہ مانو گے قیامت کا عذاب یقینی ہے، باقی یہ فرمانا کہ ''میں

ڈرتا ہوں'' اس سے مقصود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عام شفقت و ہمدردیٔ خلائق کا اظہار کرنا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ
اللہ کی طرف ہے تم کو لوٹ کر جانا اور وہ ہر ہر چیز پر
قَدِیْرٌ ۝ اَلَآ اِنَّهُمْ یَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ
قادر ہے سنتاہے وہ دوہرے کرتے ہیں اپنے سینے تاکہ
لِیَسْتَخْفُوْا مِنْهُ ؕ اَلَا حِیْنَ یَسْتَغْشُوْنَ
چھپائیں اس سے سنتاہے جس وقت اوڑھتے ہیں
ثِیَابَهُمْ ۙ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَمَا یُعْلِنُوْنَ ۚ
اپنے کپڑے جانتا ہے جو کچھ چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں وہ
اِنَّهٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝
تو جاننے والا ہے دلوں کی بات

اللہ کی قدرت کامل ہے:

سزا دینے کے لئے ضروری ہے کہ مجرم حاضر ہو، حاکم سزا دینے کی پوری قدرت اور کامل اختیار رکھتا ہو۔ مجرمین کی کل کارروائیاں اس کے علم میں ہوں۔ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ '' میں بتلادیا کہ مجرم وغیر مجرم سب کو خدا کے یہاں حاضر ہونا ہے۔ '' وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ '' میں قدرت و اختیار کا عموم بیان فرمایا اور اَلَآ اِنَّهُمْ یَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ '' سے بِذَاتِ الصُّدُوْرِ تک اس کے علم محیط کی وسعت کو ظاہر کیا کہ خدا ہر کھلی چھپی چیز کو یکساں جانتا ہے حتیٰ کہ دلوں کی تہہ میں جو خیالات، ارادے اور نیتیں پوشیدہ ہوتی ہیں ان پر بھی مطلع ہے۔ پھر کوئی مجرم اپنے جرم کو کس طرح اس سے مخفی رکھ کر نجات پا سکتا ہے۔

شانِ نزول:

(تنبیہ) اس آیات کی شان نزول میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ صحیح ترین روایت ابن عباسؓ کی بخاری میں ہے کہ بعض مسلمانوں پر حیاء کا اس قدر حد سے زیادہ غلبہ ہوا کہ استنجا یا جماع وغیرہ ضروریات بشری کے وقت کسی حصۂ بدن کو برہنہ کرنے سے شرماتے تھے کہ آسمان والا ہم کو دیکھتا ہے۔ برہنہ ہونا پڑتا تو غلبۂ حیاء سے جھکے جاتے اور شرمگاہ کو چھپانے کے لئے سینہ کو دہرا کئے لیتے تھے۔ اس طرح کے آثار کبھی کبھی غایت تادب مع اللہ اور غلبہ حیاء سے ناشی ہو سکتے ہیں۔ اور ایسے لوگ ''صوفیہ'' کی اصطلاح میں ''مغلوب الحال'' کہلاتے ہیں چونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا کسی مسئلہ میں ایسا غلو اور تعمق آئندہ امت کو ضیق میں مبتلا کر سکتا تھا اس لئے قرآن نے اَلَا حِیْنَ یَسْتَغْشُوْنَ ثِیَابَهُمْ '' الخ سے ان کی اصلاح فرمادی یعنی اگر بوقت ضرورت بدن کھولنے میں خدا سے حیاء آتی ہے اس لئے جھکے جاتے ہو تو غور کرو کہ کپڑے پہننے کی حالت میں تمہارا ظاہر و باطن کیا خدا کے سامنے نہیں ہے؟ جب انسان اس سے کسی وقت نہیں چھپ سکتا۔ پھر ضروریات بشریہ کے متعلق اس قدر غلو سے کام لینا ٹھیک نہیں۔ واضح ہو کہ ربط آیات کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ ایک آیت کا مضمون دوسری کے مضمون سے مناسبت رکھتا ہو، سبب نزول سے مناسبت رکھنا ضروری نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

اِنَّهٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ: یقیناً اللہ سینوں یا دلوں کے اندرونی رازوں کو خوب جانتا ہے۔ اور جب اللہ سے کوئی بات پوشیدہ نہیں تو اپنے رسول اور مؤمنوں کو جن باتوں سے واقف کرنا چاہتا ہے کر دیتا ہے اور آئندہ جس بات سے آگاہ کرنا ہوگا کر دے گا۔ (تفسیر مظہری)

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى
اور کوئی نہیں چلنے والا زمین پر مگر اللہ پر ہے
اللّٰهِ رِزْقُهَا
اُس کی روزی

روزی کا مالک اللہ ہے:

پہلے علم الٰہی کی وسعت بیان ہوئی تھی۔ یہ اسی مضمون کا تکملہ ہے یعنی زمین پر چلنے والا ہر جاندار جسے رزق کی احتیاج لاحق ہو، اس کو روزی پہنچانا خدا نے محض اپنے فضل سے اپنے ذمہ لازم کرلیا ہے۔ جس قدر روزی جس کے لئے مقدر ہے یقیناً پہنچ کر رہے گی۔ جو وسائل و اسباب بندہ اختیار کرتا ہے، وہ روزی پہنچنے کے دروازے ہیں۔ اگر آدمی کی نظر اسباب و تدابیر اختیار کرتے وقت مسبب الاسباب پر ہو، تو یہ توکل کے منافی نہیں البتہ خدا کی قدرت کو ان اسباب عادیہ میں محصور و مقید نہ سمجھا جائے۔ وہ گاہ بگاہ سلسلۂ اسباب کو چھوڑ کر بھی روزی پہنچاتا یا اور کوئی کام کر دیتا ہے۔ بہر حال جب تمام جانداروں کی حسب استعداد غذاء اور معاش مہیا کرنا حق تعالیٰ کا کام ہے تو ضرور ہے کہ اس کا علم ان سب پر محیط ہو ورنہ ان کی روزی کی خبر گیری کیسے کر سکے گا۔ (تفسیر عثمانی)

رزق کا معنیٰ:

رزق لغت میں اس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے جاندار اپنی غذا حاصل کرے اور جس کے ذریعہ اس کی روح کی بقاء اور جسم میں نما یعنی فربہی اور بڑھوتری ہوتی ہے۔

رزق کے لئے یہ ضروری نہیں کہ جس کا رزق ہے وہ اس کا مالک بھی ہو، کیونکہ تمام جانوروں کو رزق دیا جاتا ہے مگر وہ اس کے مالک نہیں ہوتے ان میں مالکیت کی صلاحیت ہی نہیں، اسی طرح چھوٹے بچے اپنے رزق کے مالک نہیں ہوتے۔ مگر ان کو رزق ملتا ہے۔

رزق کے اس عام معنی کے اعتبار سے علماء نے فرمایا کہ رزق حلال بھی ہوسکتا ہے حرام بھی کیونکہ جو شخص کسی دوسرے کا مال ناجائز طور پر لے کر کھالے تو یہ مال غذا تو اس شخص کی بن گیا مگر حرام طور پر بنا، اگر یہ اپنی حرص میں اندھا ہو کر ناجائز طریقے استعمال نہ کرتا تو جو رزق اسکے لئے مقرر تھا وہ جائز طور پر اس کو ملتا۔

سوال: یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ہر جاندار کا رزق اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے لیا ہے تو پھر ایسے واقعات کیوں پیش آتے ہیں کہ بہت سے جانور اور انسان غذا نہ ملنے کے سبب بھوکے پیاسے مرجاتے ہیں، اس کے جواب علماء نے متعدد لکھے ہیں۔

جواب: ایک جواب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ رزق کی ذمہ داری اسی وقت تک ہے جب تک اس کی اجلِ مقرر یعنی عمر پوری نہیں ہوجاتی، جب یہ عمر پوری ہوگئی تو اس کو بہر حال مرنا ہے اور اس جہان سے گزرنا ہے جس کا عام سبب امراض ہوتے ہیں کبھی جلنا یا غرق ہونا یا چوٹ اور زخم بھی سبب ہوتا ہے، اسی طرح ایک سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کا رزق بند کر دیا گیا، اس سے موت واقع ہوئی۔

رزق ملنے کا عجیب واقعہ:

امام قرطبیؒ نے اس آیت کے تحت ابوموسیٰ اور ابو مالک وغیرہ قبیلہ اشعریین کا ایک واقعہ ذکر کیا ہے کہ یہ لوگ ہجرت کر کے مدینہ طیبہ پہنچے تو جو کچھ توشہ اور کھانے پینے کا سامان ان کے پاس تھا وہ ختم ہوگیا، انہوں نے اپنا ایک آدمی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس غرض کے لئے بھیجا کہ ان کے کھانے وغیرہ کا کچھ انتظام فرمادیں، یہ شخص جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر پہنچا تو اندر سے آواز آئی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ آیت پڑھ رہے ہیں وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِى الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا اس شخص کو یہ آیت سن کر خیال آیا کہ جب اللہ نے سب جانداروں کا رزق اپنے ذمہ لے لیا ہے تو پھر ہم اشعری بھی اللہ کے نزدیک دوسرے جانوروں سے گئے گزرے نہیں وہ ضرور ہمیں بھی رزق دیں گے، یہ خیال کر کے وہیں سے واپس ہوگیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا کچھ حال نہیں بتلایا، واپس جا کر اپنے ساتھیوں سے کہا کہ خوش ہو جاؤ، تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کی مدد آرہی ہے، اس کے اشعری ساتھیوں نے اس کا یہ مطلب سمجھا کہ ان کے قاصد نے حسب قرارداد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی حاجت کا ذکر کیا ہے اور آپ نے انتظام کرنے کا وعدہ فرمالیا ہے وہ یہ سمجھ کر مطمئن بیٹھ گئے، وہ ابھی بیٹھے ہی تھے کہ دیکھا کہ دو آدمی ایک (قصعہ) گوشت اور روٹیوں سے بھرا ہوا اٹھائے لا رہے ہیں، قصعہ ایک بڑا برتن ہوتا ہے جیسے تشلہ یا سینی، لانے والوں نے یہ کھانا اشعریین کو دے دیا، انہوں نے خوب شکم سیر ہو کر کھایا پھر بھی بچ رہا تو ان لوگوں نے یہ مناسب سمجھا کہ باقی کھانا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیج دیں تاکہ اس کو آپ اپنی ضرورت میں صرف فرمادیں، اپنے دو آدمیوں کو یہ کھانا دے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیج دیا۔

اس کے بعد یہ سب حضرات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ کا بھیجا ہوا کھانا بہت زیادہ اور بہت نفیس ولذیذ تھا، آپ نے فرمایا میں نے تو کوئی کھانا نہیں بھیجا۔

تب انہوں نے پورا واقعہ عرض کیا کہ ہم نے اپنے فلاں آدمی کو آپ کے پاس بھیجا تھا، اس نے یہ جواب دیا، جس سے ہم نے یہ سمجھا کہ آپ نے کھانا بھیجا ہے، یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ میں نے نہیں اُس ذات قدوس نے بھیجا ہے جس نے ہر جاندار کا رزق اپنے ذمہ لے لیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خیال کی اصلاح:

بعض روایات میں ہے کہ جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام آگ کی تلاش میں کوہِ طور پر پہنچے اور وہاں آگ کے بجائے تجلیات الٰہی سامنے آگئی اور ان کو نبوت و رسالت عطا ہو کر فرعون اور اس کی قوم کی ہدایت کے لئے مصر جانے کا حکم ملا تو خیال آیا کہ میں اپنی زوجہ کو جنگل میں تنہا چھوڑ کر آیا ہوں اس کا کون متکفل ہوگا، اس خیال کی اصلاح کے لئے حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ سامنے پڑی ہوئی پتھر کی چٹان پر لکڑی ماریں، انہوں نے تعمیل حکم کی تو یہ چٹان پھٹ کر اس کے اندر سے ایک دوسرا پتھر برآمد ہوا، حکم ہوا اس پر بھی لکڑی ماریں، ایسا کیا تو وہ پتھر پھٹا اور اندر سے تیسرا پتھر برآمد ہوا، اس پر بھی لکڑی مارنے کا حکم ہوا تو یہ شق ہوا اور اندر سے ایک جانور برآمد ہوا جس کے منہ میں ہرا پتہ تھا۔

حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا یقین تو موسیٰ علیہ السلام کو پہلے بھی تھا مگر مشاہدہ کا اثر کچھ اور ہی ہوتا ہے، یہ دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام وہیں سے سیدھے مصر کو روانہ ہوگئے۔ زوجۂ محترمہ کو یہ بتلانے بھی نہ گئے کہ مجھے مصر جانے کا حکم ہوا ہے وہاں جا رہا ہوں۔

وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ط
اور جانتا ہے جہاں وہ ٹھہرتا ہے اور جہاں سونپا جاتا ہے

ٹھہرنے اور سونپے جانے کا مطلب:

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں "مستقر" جہاں ٹھہرتا ہے بہشت و دوزخ اور مستودع (جہاں سونپا جاتا ہے) اس کی قبر ہے۔ پہلے پہلے "وما من دابة" الخ میں دنیوی زندگی کا بیان تھا۔ یہاں برزخ اور آخرت کا بیان ہوا۔ مطلب یہ ہوا کہ خدا ابتداء سے انتہاء تک تمہاری ہستی کے تمام درجات کا علم رکھتا ہے "مستقر" و "مستودع" کی تعیین میں مفسرین کے بہت اقوال ہیں۔ پہلے سورۂ "انعام" میں بھی ہم لکھ چکے ہیں۔ ابن کثیرؒ نے کہا کہ زمین میں جہاں تک چلے پھرے اس کے منتہائے سیر کو مستقر اور پھر پھرا کر جس ٹھکانے پر آئے اسے "مستودع" کہتے ہیں۔ ابن عباسؓ کے نزدیک اس زندگی میں جہاں رہے وہ "مستقر" اور موت کے بعد جہاں دفن کیا جائے وہ "مستودع" ہے، مجاہد نے "مستقر" سے رحمِ مادر اور "مستودع" صلبِ پدر مراد لی ہے۔ عطاء نے اس کے عکس کا دعویٰ کیا۔ بعض متفلسفین کا خیال ہے کہ زمین میں حیوانات کا جو مسکن بالفعل ہے اسے "مستقر" اور وجودِ فعلی سے پہلے جن مواد و مقار میں رہ کر آئے انہیں "مستودع" کہا گیا ہے۔ یعنی حق تعالیٰ ان تمام مختلف مواد اور اطوار و ادوار کا عالم ہے۔ جن میں سے کوئی حیوان گزر کر اپنی موجودہ ہیئت کذائی تک پہنچا ہے وہ ہی اپنے علم محیط سے ہر مرتبہ وجود میں اس کی استعداد کے مناسب وجود و کمالات وجود فائض کرتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

بغوی نے ابن مقسم کا قول نقل کیا ہے اور یہی قول ایک روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا بھی آیا ہے کہ مستقر سے مراد ہے وہ جگہ جہاں رات دن جاندار رہتا اور ادھر ادھر گھوم پھر کر اسی جگہ آ کر قرار پکڑتا ہے اور مستودع سے مراد ہے دفن ہونے کی جگہ۔ حضرت ابن مسعودؓ کے نزدیک مستقر سے مراد ماں کا پیٹ اور مستودع سے مراد باپ کی پشت ہے۔ سعید بن جبیر علی بن طلحہ اور عکرمہ کی روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا بھی یہی قول آیا ہے۔ بعض علماء کے نزدیک مستقر سے مراد جنت یا دوزخ اور مستودع سے مراد قبر ہے کیونکہ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا جنت کے لئے اور سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا دوزخ کے لئے فرمایا ہے۔ (تفسیر مظہری)

كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝
سب کچھ موجود ہے کھلی کتاب میں

لوحِ محفوظ میں رکھا ہوا ریکارڈ:

یعنی "لوحِ محفوظ" میں جو صحیفۂ علمِ الٰہی ہے پھر علمِ الٰہی میں ہر چیز کیسے موجود نہ ہوگی۔ (تفسیر عثمانی)

اہلِ سنت کا مسلمہ عقیدہ ہے کہ اللہ پر کوئی عمل واجب نہیں، لیکن اللہ اگر اپنی رحمت سے خود کسی بات کا وعدہ فرمالے تو تکمیلِ وعدہ واجب ہے جیسے نیکوں کا جنت میں داخلہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے سے پچاس ہزار برس پہلے اللہ نے مخلوقات کی قسمیں لکھ دی تھیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ (اس وقت) اللہ کا تخت پانی پر تھا۔ (رواہ مسلم)

حضرت ابنِ مسعودؓ کا بیان ہے کہ اللہ کے سچے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے فرمایا کہ تم میں سے (ہر) ایک کا مادۂ تخلیق ماں کے پیٹ میں چالیس روز بصورت نطفہ جمع رہتا ہے، پھر اتنی ہی مدت میں بصورت علقہ (بستہ خون یا جونک) ہوتا ہے، پھر اتنی ہی مدت میں بوٹی (بے جان لوتھڑا)۔ پھر اللہ ایک فرشتہ کو چار باتیں لکھنے کے لئے مامور فرماتا ہے۔ وہ فرشتہ اس کا عمل اس کی مدتِ زندگی (یا وقتِ موت) اور اس کو رزق اور اس کا سعید یا شقی (نیک بخت مؤمن یا بدنصیب کافر) ہونا لکھ دیتا ہے۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

حضرت ابو درداءؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ ہر بندے کی پانچ باتیں لکھنے سے فارغ ہو چکا ہے۔ مدتِ زندگی، اعمال مقامِ موت، آثار، رزق۔ رواہ احمد۔

واضح کتاب میں لکھا ہوا ہے، اس واضح کتاب سے مراد لوح محفوظ ہے جس میں تمام کائنات کی روزی، عمر، عمل وغیرہ کی پوری تفصیلات لکھی ہوئی ہیں جو حسبِ موقع وضرورت متعلقہ فرشتوں کے سپرد کی جاتی ہیں۔

صحیح مسلم میں بروایت حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق کی تقدیریں آسمان اور زمین کی پیدائش سے بھی پچاس ہزار سال پہلے لکھ دی تھیں۔

اور بخاری و مسلم میں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طویل حدیث میں فرمایا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان اپنی پیدائش سے پہلے مختلف دور سے گزرتا ہے، جب اس کے اعضاء کی تکمیل ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ کو حکم کرتے ہیں جو اس کے متعلق چار چیزیں لکھ لیتا ہے، اول اس کا عمل جو کچھ وہ کرے گا، دوسرے اس کی عمر کے سال، مہینہ دن اور منٹ اور سانس تک لکھ لئے جاتے ہیں، تیسرے اس کو کہاں مرنا اور کہاں دفن ہونا ہے، چوتھے اس کا رزق کتنا اور کس کس طریقے سے پہنچنا ہے، (اور لوحِ محفوظ میں آسمان زمین کی پیدائش سے بھی پہلے لکھا ہونا اس کے منافی نہیں)

ابن عباسؓ نے یثنون کو تثنونی پڑھا ہے تو ابن جعفر نے کہا کہ تثنونی صدورھم کا کیا مطلب ہے؟ تو آپ نے کہا کہ وہ آدمی جو کہ صحبت کرتے وقت شرم اختیار کرتا ہے یا خلوت کرنے میں بھی اس کو شرم دامن گیر ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ آیت اتری۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ لوگ کھلے آسمان کے نیچے خلوت کرنے، اور صحبت کرنے سے شرم کرتے تھے اور اپنے رخ پھیر لیتے تھے، خصوصاً اس وقت جب کہ رات بستر اوڑھ کر لیٹ جاتے، اور اپنے سر ڈھانک لیتے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اگر ہم مکان میں رہ کر یا کپڑا اوڑھ کر کسی

برے کام کا ارتکاب کریں تو خدا سے اپنے گناہ کو چھپا سکتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ خبر دیتا ہے کہ وہ رات کی تاریکی میں سوتے وقت کپڑا اوڑھ لیتے ہیں لیکن کوئی چھپائے کہ ظاہر کرے، اللہ تعالیٰ واقف رہتا ہے، حتیٰ کہ انسان کے دل کی نیت اور ضمیر کے ارادوں اور بھیدوں کو بھی جانتا ہے "سبعہ معلقات" کا مشہور شاعر زہیر کہتا ہے:

فلا تکتمن اللہ ما فی قلوبکم ۔۔۔ لیخفی و مھما یکتم اللہ یعلم

یؤخر فیوضع فی کتاب فیدخر ۔۔۔ لیوم الحساب او یعجل فینقم

تم اپنے دلوں کی مخفی بات کو خدا سے چھپانے کی کوشش نہ کرو خدا ضرور جان لیتا ہے وہ عمل جمع رہے گا اور نامۂ اعمال میں یوم قیامت کے لئے محفوظ رہے گا ورنہ جلدی سزادی گئی تو دنیا ہی میں سزادی جائے گی۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

اللہ کا علم کامل ہے:

گویا اس آیت میں اللہ کا عالمِ کل ہونا اور آئندہ آیت میں اللہ کا قادرِ مطلق ہونا توحید کو ثابت کرنے اور مندرجہ بالا وعدہ و وعید کو پختہ کرنے کے لئے بیان کیا گیا ہے۔ (اس آیت سے اللہ کے علم کا ہمہ گیر ہونا اور اگلی آیت و ھو الذی الخ سے اللہ کی قدرت کا محیطِ کل ہونا ظاہر کیا جارہا ہے تاکہ گزشتہ آیت میں جس توحید کا اور وعدہ وعید کا ذکر کیا گیا تھا اس کا اثبات اور تقریر ہو جائے) (تفسیر مظہری)

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ
اور وہی ہے جس نے بنائے آسمان اور زمین
سِتَّةِ اَیَّامٍ
چھ دن میں

قدرتِ الٰہی کا کمال:

یہ علم کے بعد قدرت کا بیان ہے۔ اس کی تفسیر سورۂ "اعراف" کے ساتویں رکوع میں گزر چکی۔ (تفسیر عثمانی)

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ اور وہ اللہ وہی تو ہے، جس نے آسمانوں کو اور زمین کو مع ان کی تمام موجودات کے چھ روز میں اندازہ کے مطابق پیدا کیا۔ آسمانوں سے مراد ہیں بالائی چیزیں اور زمین سے مراد نشیبی چیزیں، یعنی کائناتِ بالا و پست، آسمانوں کو بصیغۂ جمع اور زمین کو بصیغۂ واحد ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ کائنات علویہ میں سے ہر ایک کی ذات دوسرے کی ذات سے جدا ہے اور ہر ایک دوسرے سے اصل کے اعتبار سے مختلف ہے اور کائنات سفلیہ کی اصل و ذات ایک ہے۔ (تفسیر مظہری)

وَّ کَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ
اور تھا اُس کا تخت پانی پر

عرشِ الٰہی:

یعنی آسمان و زمین کی پیدائش سے پہلے پانی مخلوق ہوا جو آئندہ اشیاء کا مادۂ حیات بننے والا تھا۔ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ " (الانبیاء رکوع ۳) اس وقت عرشِ خداوندی اس کے اوپر تھا جیسے اب سماوات کے اوپر ہے۔ گویا یہ ایک صورت تھی جو اس حقیقت کو ظاہر کر رہی تھی کہ کائنات کا مادہ اور ذریعۂ حیات بالکلیہ رب العرش کے تسلط و تصرف اور قیومیت مطلقہ کے ماتحت ہے۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانی)

وَّ کَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ اور (آسمان و زمین کی پیدائش سے پہلے) اس کا تخت پانی پر تھا۔ بغوی نے لکھا ہے کہ پانی ہوا کی پشت پر تھا، کعب احبار کا قول ہے کہ اللہ نے ایک یاقوت سبز پیدا کیا اور اس پر نظر جلال ڈالی تو وہ آبِ لرزاں بن گیا۔ پھر اللہ نے ہوا کو پیدا کیا اور اس کی پشت پر پانی کو قائم کیا، پھر عرش کو پانی پر قائم کیا۔ ضمرہ نے کہا اللہ کا تخت پانی پر تھا، پھر اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور قلم کو پیدا کیا پھر اس سے وہ تمام چیزیں لکھ دیں جو ہونے والی تھیں اور جن کو وہ آئندہ پیدا کرنے والا تھا اور ہر مخلوق کو پیدا کرنے سے پہلے ہزار برس تک قلم نے اللہ کی تسبیح و تحمید کی تھی۔

حضرت عمران بن حصین کی روایت سے بخاری نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس سے پہلے کوئی چیز نہ تھی اور اس کا تخت پانی پر تھا۔ پھر اس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور یادداشت (غالباً لوحِ محفوظ) میں ہر چیز لکھ دی (الحدیث)

عرش کے متعلق جو اخبار و احادیث آئی ہیں ان کا کچھ حصہ سورۂ بقرہ کی آیت الکرسی کی تفسیر کے ذیل میں ہم لکھ چکے ہیں۔ (تفسیر مظہری)

لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ
تاکہ آزمائے تم کو کہ کون تم میں اچھا کرتا ہے کام

نظامِ کائنات کا مقصد:

یعنی اس سارے نظام کی تخلیق و ترتیب سے مقصود تمہارا یہاں بسانا اور امتحان کرنا ہے کہ کہاں تم اس عجیب و غریب نظام اور سلسلۂ مصنوعات میں غور کر کے خالق و مالک کی صحیح معرفت حاصل کرتے اور مخلوقات ارضی و سماوی سے متمتع ہو کر محسن شناسی اور سپاس گزاری کا فطری فرض بجالاتے ہو۔ یہ مقام تمہاری سخت آزمائش کا ہے۔ مالک حقیقی دیکھتا ہے کہ تم میں سے کونسا غلام صدق و اخلاص اور سلیقہ مندی سے اچھا کام کرتا اور فرائض بندگی انجام دیتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۔ تاکہ تم کو آزمائے کہ تم میں سے اچھے عمل کرنے والا کون ہے۔ یعنی باوجود عالمِ کل ہونے کے پھر بھی جانچ

کرنے والے ممتحن کی طرح تمہارے ساتھ معاملہ کرے تا کہ تمہارا استحقاق ثواب وعذاب ظاہر ہو جائے کیونکہ آسمان وزمین اوران کی موجودات تمہاری ہستی اور معاش کے اسباب و ذرائع اور اصول ہیں ان سے تمہارے تمام احوال واعمال وابستہ ہیں ان کا تقاضا ہے کہ تم اپنے رب کا شکرادا کرو۔ پھر یہ ساری کائنات وجود صانع کی دلیل اور (توحید صانع کی) خصوصی نشانی ہے اس سے تم معرفت الٰہیہ حاصل کر سکتے ہو۔

اَحْسَنُ عَمَلاً میں عمل کا لفظ عقیدہ اور افعال اعضاء جسمانی دونوں کو شامل ہے۔ ابن المنذر، ابن ابی حاتم، حاکم اور ابن مردویہ نے کمزور سند سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یا اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ **احسن عملاً** (سے مراد ہے) سب سے اچھی سمجھ والا ممنوعات الٰہیہ سے سب سے زیادہ پرہیز رکھنے والا اور اوامر کی تعمیل میں تیزی کرنے والا۔ بلاشبہ سب سے اچھے اعمال دلوں کے اعمال (عقائد و میلانات) ہیں اور قلبی اعمال میں سے بھی سب سے اچھا عمل اللہ کی محبت اور اس کی یاد میں ڈوب جانا ہے۔

خلاصہ یہ کہ آسمان وزمین کو پیدا کرنے کا مقصدی نقطہ اہل اللہ کا وجود ہے۔ لفظ احسن تعلیم دے رہا ہے اس بات کی کہ علم وعمل کے درجات پر زیادہ سے زیادہ چڑھنا چاہئے۔ (تفسیر مظہری)

مخلوقات کی پیدائش کی ترتیب:

مطلب یہ ہے کہ اللہ کو ہر چیز پر قدرت ہے اس نے اپنی قدرت سے آسمان اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا اور اس سے پہلے اللہ کا عرش پانی پر تھا۔ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے پانی کو پیدا کیا اور پھر عرش کو پیدا کیا۔ پھر قلم کو پھر لوح محفوظ کو اور پھر پچاس ہزار سال بعد آسمان اور زمین پیدا کئے۔ اور عمران بن حصینؓ کی حدیث میں ہے، کان اللہ ولم یکن شیء غیرہ. یعنی ایک وقت ایسا تھا کہ صرف اللہ کی ذات پاک تھی۔ اور اس کے سوا کوئی چیز نہ تھی۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، **بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ**، اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین کو بلا مادہ اور بلا کسی اصل کے محض اپنی قدرت سے پیدا کیا تا کہ بندوں کا امتحان کرے کہ وہ خدا کے آثار قدرت کو دیکھ کر اس کو مانتے ہیں یا نہیں۔ اس قسم کی آیات اور احادیث اس امر کی صریح دلیل ہیں کہ دیگر کائنات کی طرح مادہ بھی مخلوق اور احادث ہے اللہ ہر چیز کا خالق ہے مادہ ہو یا صورت سب اس کی مخلوق ہے۔

دہریوں کا عقیدہ:

فلاسفر اور دہریہ کہتے ہیں کہ مادہ قدیم اور غیر مخلوق ہے یہ گروہ خدا تعالیٰ کی ہستی کا قائل نہیں ان کا قول یہ ہے کہ دنیا کے تمام کام مادہ قدیمہ کی حرکت سے اور موجودات کی باہمی کششوں اور طبعی خواص سے چل رہے ہیں۔ اور یہ لوگ اپنے اس قول کی دلیل یہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے کسی چیز کو معدوم محض ہوتے ہوئے نہیں دیکھا اور نہ کسی چیز کو نیست سے ہست ہوتے دیکھا صرف صورتوں کا اختلاف دیکھا۔ لکڑی اور مٹی کی صورتیں بدلتی رہتی ہیں مگر مادہ بحالہ باقی رہتا ہے اور کبھی کہتے ہیں کہ ہماری قدرت میں صرف اتنا ہے کہ صورت تبدیل کر سکتے ہیں۔ ایجاد محض یا اعدام محض نہیں کر سکتے۔ (معارف کاندھلویؒ)

مخلوق کی ابتداء:

مسند احمد میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے بنو تمیم تم خوش خبری قبول کرو۔ انہوں نے کہا خوش خبریاں تو آپ نے سنا دیں، اب کچھ دلوائیے۔ آپ نے فرمایا اے اہل یمن تم قبول کرو۔ انہوں نے کہا ہاں ہمیں قبول ہے۔ مخلوق کی ابتداء تو ہمیں سنائیے کہ کس طرح ہوئی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سب سے پہلے اللہ تھا اس کا عرش پانی کے اوپر تھا۔ اس نے لوح محفوظ میں ہر چیز کا تذکرہ لکھا۔ راوی حدیث حضرت عمرانؓ کہتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنا ہی فرمایا تھا جو کسی نے آکر مجھے خبر دی کہ تیری اونٹنی زانو کھلوا کر بھاگ گئی، میں اسے ڈھونڈھنے چلا گیا۔ پھر مجھے معلوم نہیں کہ کیا بات ہوئی؟ یہ حدیث بخاری ومسلم میں بھی ہے۔ ایک روایت میں ہے اللہ تھا اور اس سے پہلے کچھ نہ تھا۔ ایک روایت میں ہے اس کے ساتھ کچھ نہ تھا اس کا عرش پانی پر تھا۔ اس نے ہر چیز کا تذکرہ لکھا پھر آسمان وزمین کو پیدا کیا۔ مسلم کی حدیث میں ہے زمین وآسمان کی پیدائش سے پچاس ہزار سال پہلے اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کی تقدیر لکھی اس کا عرش پانی پر تھا۔ صحیح بخاری میں اس آیت کی تفسیر کے موقع پر ایک قدسی حدیث لاتے ہیں کہ اے انسان تو میری راہ میں خرچ کر میں تجھے دوں گا، اور فرمایا اللہ کا ہاتھ پُر ہے۔ دن رات کا خرچ اس میں کوئی کمی نہیں لاتا خیال تو کرو کہ آسمان وزمین کی پیدائش سے اب تک کتنا خرچ کیا ہوگا لیکن تاہم اس کے داہنے ہاتھ میں جو تھا وہ کم نہیں ہوتا۔ اس کا عرش پانی پر تھا اس کے ہاتھ میں میزان ہے جھکاتا ہے اور اونچا کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کہاں تھا:

مسند میں ہے ابورزین لقیط بن عامر بن منفق عقیلی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ مخلوق کی پیدائش کرنے سے پہلے ہمارا پروردگار کہاں تھا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عماء میں، نیچے بھی ہوا اور پر بھی ہوا پھر عرش کو اس کے بعد پیدا کیا یہ روایت ترمذی کتاب التفسیر میں بھی ہے سنن ابن ماجہ میں بھی ہے۔ امام ترمذیؒ اسے حسن کہتے ہیں۔ مجاہدؒ کا قول ہے کہ کسی چیز کو پیدا کرے اس سے پہلے عرش خداوندی پانی پر تھا۔ وہب ضمرہ قتادہ ابن جریر وغیرہ بھی یہی کہتے ہیں۔ قتادہؒ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ بتلاتا ہے کہ آسمان وزمین کی پیدائش سے پہلے ابتداء مخلوق کس طرح ہوئی۔ ربیع ابن انس کہتے ہیں اس کا عرش پانی پر تھا جب آسمان وزمین کو پیدا کیا تو اس پانی کے دو حصے کر دیئے۔ نصف عرش کے نیچے، یہی بحر مسجور ہے۔

ابن عباسؓ فرماتے ہیں بوجہ بلندی کے عرش کو عرش کہا جاتا ہے۔ سعد طائیؒ فرماتے ہیں کہ عرش سرخ یاقوت کا ہے۔ محمد بن اسحاقؒ فرماتے ہیں اللہ اسی طرح تھا جس طرح اس نے اپنے نفس کریم کا وصف کیا اس لئے کہ کچھ نہ تھا پانی تھا اس پر عرش تھا۔ عرش پر ذوالجلال والاکرام ذوالعزت والسلطان ذوالملک والقدرة ذوالعلم والرحمة والنعمة تھا، جو چاہے کر گزرنے والا ہے۔ ابن عباسؓ سے اس آیت کے بارے میں سوال ہوا کہ پانی کس چیز پر تھا۔ آپ نے فرمایا کہ ہوا کی پیٹھ پر۔ پھر فرماتا ہے کہ آسمان وزمین کی پیدائش تمہارے نفع کے لئے ہے اور تم اس لئے ہو کہ اسی ایک خالق کی عبادت کرو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ یاد رکھو تم بے کار پیدا نہیں کئے گئے۔ آسمان وزمین اور ان کے درمیان کی چیزیں باطل پیدا نہیں کیں۔ یہ گمان تو کافروں کا ہے اور کافروں کے لئے آگ کی ویل ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَلَئِنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْ بَعْدِ

اور اگر تو کہے کہ تم اُٹھو گے مرنے کے بعد

الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ

تو البتہ کافر کہنے لگیں یہ کچھ نہیں

اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷﴾

مگر جادو ہے کھلا ہوا

کافروں کی بے یقینی:

جب یہ دنیا امتحان وآزمائش کی جگہ ہے تو ضرور ہے کہ اس کے بعد مجازات انعام وانتقام کا سلسلہ ہوتا شاکرین وکافرین کو اپنے اپنے کئے کا پھل ملے۔ اسی لئے یہاں بعث بعد الموت کا ذکر کیا گیا۔ یعنی کفار مکہ کو یقین نہیں آتا کہ موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جائینگے اور اپنے جرائم کی سزا بھگتیں گے۔ جب وہ قرآن میں یا حضور کی زبان سے بعث بعد الموت کا نہایت مؤثر بیان سنتے ہیں تو کہتے ہیں کہ آپ کا یہ بیان کھلا ہوا جادو ہے۔ جس نے بہت سے لوگوں کو مرعوب ومسحور کر لیا۔ مگر یاد رکھئے ہم پر یہ جادو چلنے والا نہیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ

اور اگر ہم روکے رکھیں اُن سے عذاب کو ایک مدت معلوم

مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ ؕ اَلَا يَوْمَ

تک تو کہنے لگیں کس چیز نے روک دیا عذاب کو، سنتا ہے جس دن

يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ

آئیگا اُن پر نہ پھیرا جائیگا اُن سے اور گھیر لے گی اُن کو

بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۸﴾

وہ چیز جس پر ٹھٹھے کیا کرتے تھے

عذاب اپنے وقت پر آئے گا:

یعنی جب ان کی شرارتوں پر عذاب الٰہی سے ڈرایا جاتا ہے، مگر خدا کی حکمت ایک مدت معین تک عذاب کو روکے رکھتی ہے تو تکذیب واستہزاء کے طور پر کہتے ہیں کہ وہ عذاب کہاں ہے آخر آتا کیوں نہیں؟ کس چیز نے اسے پکڑ رکھا ہے؟ فرماتے ہیں کیا مذاق کرتے ہو، وقت معین پر جب عذاب آئے گا کسی کے ٹالے نہ ٹلے گا۔ اور ہر طرف سے گھیر کر تباہ وبرباد کر کے چھوڑے گا۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا

اور اگر ہم چکھاویں آدمی کو اپنی طرف سے رحمت پھر وہ چھین لیں

مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ ﴿۹﴾

اُس سے تو وہ ناامید ناشکر ہوتا ہے

انسان بالکل کمزور ہے:

یعنی اب تو کہتے ہیں عذاب کہاں ہے، کیوں نہیں آتا، لیکن آدمی بودا اور تھڑ دلا اتنا ہے کہ اگر خدا چندروز اپنی مہربانی سے عیش وآرام میں رکھنے کے بعد تکلیف میں مبتلا کر دے تو پچھلی مہربانیاں بھی بھلا دیتا ہے اور ناامید ہو کر آئندہ کے لئے آس توڑ بیٹھتا ہے۔ گذشتہ پر ناشکری اور آئندہ سے مایوسی، یہ ہی اس کی زندگی کا حاصل ہے۔ (تفسیر عثمانی)

الانسان (میں الف لام جنسی ہے) یعنی عام انسان "یؤس" بالکل نراس، ناامید، نعمت کے زوال کے بعد چونکہ اس کو صبر نہیں رہتا اور اللہ پر اس کا اعتماد نہیں ہوتا اور حکم خداوندی پر وہ رضامند نہیں ہوتا، اس لئے قطعاً حصول نعمت سے ناامید ہو جاتا ہے اور اللہ کی سابق اور موجود نعمتوں کو بھی بھول جاتا ہے، پچھلی نعمتوں کی بھی ناشکری کرنے لگتا ہے اور جو نعمتیں بالفعل اس کو حاصل ہوتی ہیں ہستی بقاء ہستی زندگی اور اس کے باقی رکھنے کے اسباب سب کو بھول جاتا ہے بالکل ناسپاس ہو جاتا ہے۔

مؤمن کا حال:

حدیث شریف میں ہے اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ مومن کو کوئی سختی کوئی مصیبت کوئی دکھ کوئی غم ایسا نہیں پہنچتا جس کی وجہ سے اللہ

تعالیٰ اس کی خطائیں معاف نہ فرماتا ہو یہاں تک کہ کانٹا لگنے پر بھی۔ صحیحین کی اور حدیث میں ہے مومن کے لئے خدائے تعالیٰ کا ہر فیصلہ سراسر بہتر ہی بہتر ہوتا ہے۔ یہ راحت پا کر شکر کرتا ہے اور بھلائی سمیٹتا ہے اور تکلیف اٹھا کر صبر کرتا ہے نیکی پاتا ہے۔ یہ حال مومن کے سوا اور کسی کا نہیں ہوتا۔ تفسیر ابن کثیر۔

وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ
اور اگر ہم چکھاویں اُس کو آرام بعد تکلیف کے جو پہنچی تھی اُس کو تو بول
ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ؕ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ۙ﴿۱۰﴾
اُٹھے دُور ہوئیں برائیاں مجھ سے وہ تو اترانے والا شیخی خورا ہے

انسان کی غفلت:

یعنی مصیبت کے بعد اگر خدا آرام و آسائش نصیب کرے تو سمجھتا ہے کہ گویا اب ہمیشہ کے لئے مصائب و تکالیف کا خاتمہ ہو چکا پچھلی کیفیت کبھی لوٹ کر آنے والی نہیں۔ اس وقت غافل و مغرور ہو کر شیخیاں مارتا اور اتراتا پھرتا ہے حالانکہ چاہئے تھا کہ پچھلی حالت یاد کر کے خدا کا شکر ادا کرتا اور اس کے احسان کے سامنے جھک جاتا۔ (تفسیر عثمانی)

بعد حصول مقصد کے دل میں جو لذت پیدا ہوتی ہے اس کو فرح (یا فرحت) کہتے ہیں۔ فرح سے مراد ہے نعمت پر مغرور اترانے والا۔ فخور بڑا شیخی باز جو اپنے کو نعمت کا حقدار قرار دیتے ہوئے لوگوں پر اپنی فوقیت جتاتا ہے اور یہی اکڑ اور غرور اس کو ادائے شکر سے روکتے ہیں۔ (تفسیر مظہری)

مطلب یہ ہے کہ انسان فطرتاً عاجل پسند اور موجودہ حالت کو سب کچھ سمجھنے کا عادی ہوتا ہے اگلے پچھلے حالات و واقعات میں غور و فکر اور ان کو یاد رکھنے کا خوگر نہیں ہوتا اسی لئے نعمت کے بعد تکلیف آجائے تو رحمت سے ناامید ہو کر ناشکری کرنے لگتا ہے۔ یہ خیال نہیں کرتا کہ جس ذات حق نے پہلے نعمت دی تھی وہ پھر بھی دے سکتا ہے، اسی طرح اگر اس کو تکلیف و مصیبت کے بعد کوئی راحت و نعمت مل جائے تو بجائے اس کے کہ پچھلی حالت میں غور کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہوتا اس کا شکر کرتا، اور زیادہ اکڑنے اترانے لگتا ہے۔ اور پچھلی حالت کو بھول کر یوں سمجھنے لگتا ہے کہ یہ نعمت تو میرا حق ہے مجھے ملنا ہی چاہئے اور میں ہمیشہ اسی طرح رہوں گا۔ غافل یہ خیال نہیں کرتا کہ جس طرح پہلی حالت باقی نہیں رہی، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ نعمت و راحت کی حالت بھی باقی نہ رہے

؎ چنان نماند چنین نیز ہم نخواہد ماند

انسان کی موجود پرستی اور ماضی و مستقبل کو بھول جانے کا یہ عالم ہے کہ ایک صاحب اقتدار کے خاک و خون پر دوسرا شخص اپنے اقتدار کی بنیاد استوار کرتا ہے اور کبھی نیچے کی طرف نظر نہیں کرتا کہ اس سے پہلا صاحب اقتدار بھی اسی طرح رہا کرتا تھا، اس کے انجام سے بے خبر ہو کر نشۂ اقتدار کے مزے لیتا ہے۔

انسان کی بیماری کا علاج:

اسی موجود پرستی اور حال مستی کی اصلاح کے لئے اللہ تعالیٰ کی کتابیں اور رسول آتے ہیں جو انسان کو ماضی کے عبرتناک واقعات یاد دلا کر مستقبل کی فکر سامنے کر دیتے ہیں اور یہ سبق سکھاتے ہیں کہ کائنات کے بدلتے ہوئے حالات و تغیرات میں غور کرو کہ کونسی طاقت ان کے پردے میں کام کر رہی ہے، بقول حضرت شیخ الہندؒ

انقلابات جہاں واعظ رب ہیں دیکھو   ہر تغیر سے صدا آتی ہے فافہم، فافہم

مومن کامل بلکہ انسان کامل وہی ہے جو ہر تغیر و انقلاب اور ہر رنج و راحت میں دست قدرت کی مستور طاقت کا مشاہدہ کرے۔ آنی فانی راحت و رنج اور اس کے صرف مادی اسباب پر دل نہ لگائے عقلمند کا کام یہ ہے کہ اسباب سے زیادہ مسبب الاسباب کی طرف نظر کرے، اسی سے اپنا رشتہ مضبوط باندھے۔ (معارف القرآن)

مؤمن کی عجیب حالت:

حضرت صہیب راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مومن کا بھی عجیب معاملہ ہے اس کی ہر بات اچھی ہے اور یہ خصوصیت صرف مومن ہی کی ہے اگر اس کو سکھ ملتا ہے تو شکر کرتا ہے اور یہ اس کے لئے خیر ہو جاتا ہے اور دکھ پہنچتا ہے تو صبر کرتا ہے اور یہ اس کے لئے خیر ہو جاتا ہے۔ (رواہ مسلم)

فخر نہ کرو:

حضرت عیاض بن حمار اشجعی راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ نے میرے پاس وحی بھیجی ہے کہ تواضع کرو کوئی کسی پر فخر نہ کرے اور کوئی کسی پر زیادتی نہ کرے۔ رواہ مسلم (تفسیر مظہری)

اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ
مگر جو لوگ صابر ہیں اور کرتے ہیں نیکیاں
اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ﴿۱۱﴾
اُن کے واسطے بخشش ہے اور ثواب بڑا

خاص بندے:

یعنی جو حال اوپر عام انسانوں کا بیان ہوا، اس سے اللہ کے وہ بندے مستثنیٰ ہیں جو تکلیف و مصیبت کا مقابلہ صبر و استقامت سے کرتے ہیں اور امن و راحت کے وقت شکر گزاری کے ساتھ عمل صالح میں مستعدی دکھاتے

ہیں۔ ایسے اولوالعزم وفاداروں کی جماعت ہی عظیم الشان بخشش وانعام کی مستحق ہے۔ (تفسیر عثمانی)

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ

سو کہیں تو چھوڑ بیٹھے گا کچھ چیز اُس میں سے جو وحی آئی

وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ

تیری طرف اور تنگ ہوگا اُس سے تیرا جی اس بات پر کہ وہ کہتے ہیں

عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ؕ اِنَّمَآ اَنْتَ نَذِيْرٌ ؕ

کیوں نہ اُترا اُس پر خزانہ یا کیوں نہ آیا اُسکے ساتھ فرشتہ تو تُو ڈرانیوالا ہے

وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ؕ ﴿۱۲﴾

اور اللہ ہے ہر چیز کا ذمہ دار

مشرکوں کے فضول مطالبے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دلگیر ہونا:

مشرکین مکہ شرک و بُت پرستی کی تردید سے بہت غیظ کھاتے تھے۔ مشرکانہ خرافات پر جس قدر ان کی تحمیق وتجہیل کی جاتی اسی قدر ان کے غصہ کی آگ بھڑکتی تھی۔ کبھی کوشش کرتے تھے کہ آپ کو اس معاملہ میں ذرا ڈھیلا کر دیں اور اس سب سے بڑے اور بنیادی مسئلہ کی تبلیغ میں نرمی اور تساہل برتنے پر آمادہ کریں جب ادھر سے مایوس ہوتے تو محض دق کرنے کو عجیب بیہودہ فرمائشیں کرنے لگتے مثلاً یہ کہتے کہ آپ سچے ہیں اور منصب رسالت پر مامور ہو کر آئے ہیں تو آپ کے ساتھ خدا کے یہاں سے مال ودولت کا بڑا خزانہ آنا چاہئے تھے۔ یا آسمان سے ایک فرشتہ آتا جو آپ کے ہمراہ تصدیق کے لئے ہر طرف جایا کرتا۔ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ (ھود رکوع ۲) گویا جب آپ کی بات منوانے کے لئے نہ مادی طاقت ساتھ ہے نہ روحانی پھر ہم کس طرح تسلیم کر سکتے ہیں۔ آپ ان بیہودہ شبہات اور فرمائشوں سے سخت مغموم اور دلگیر ہوتے تھے۔ ممکن ہے کبھی ایسا خیال بھی دل میں گزرتا ہو کہ ان کے معبودوں کے معاملہ میں اگر خدا کی جانب سے اس قدر سختی اختیار کرنے کا حکم نہ رہے، تردید کی جائے مگر فی الحال قدرے نرمی اور رواداری کے ساتھ تو شاید زیادہ مؤثر اور مفید ہو، یا جو فرمائشیں یہ لوگ کرتے ہیں، ان کی یہ ضد بھی کسی حد تک پوری کر دی جائے تو کیا عجب ہے مسلمان ہو جائیں بہر حال وہ ایسا نازک اور پُر خطر وقت تھا کہ تمام دنیا باطل پرستی کے شور سے گونج رہی تھی صرف ایک مقدس ہستی تھی جس کے حلقوم سے حق کی آواز نکل کر باطل کے قلعوں میں زلزلہ ڈالتی تھی۔ آپ چاروں طرف سے موذی دشمنوں کے نرغہ میں گھر رہے تھے۔ کوئی جھٹلاتا کوئی طعن کرتا کوئی مذاق اڑاتا تھا۔ اس ماحول کا تصور کرو اور اس مبلغ اعظم کی قوت قلب اور ہمت مردانہ کا اندازہ لگاؤ، جس کا تمام تر اعتماد واتکال ظاہری اسباب سے ہٹ کر خداوند قدوس کے وعدوں پر تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی:

آپ جب محزون ودلگیر ہوتے تو صرف اپنے پروردگار کی آواز سے ہی تسلی پاتے اور دنیا کے مقابلہ میں تازہ دم ہو کر کھڑے ہو جاتے تھے اسی سلسلہ میں یہ آیتیں نازل ہوئیں جن کا حاصل یہ ہے کہ آپ ان لوگوں کی بیہودہ خرافات اور فرمائشوں کی وجہ سے اس قدر فکرمند اور غمگین نہ ہوں نہ اپنے دل میں ان لوگوں کی مراعات کا خیال لائیں کہیں ایسا ہو سکتا ہے کہ وحی الٰہی نے جو چیزیں آپ کو سکھلائی ہیں اور جس بے خوف وخطر تبلیغ کا حکم دیا ہے اس کے بعض حصہ کو ان لوگوں کی خرافات سے تنگ دل ہو کر چھوڑ بیٹھیں جب یہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ پیغمبرانہ عصمت اور اولوالعزمی مانع ہے تو تنگدل ہونے سے کیا فائدہ۔ آپ کا کام صرف بھلے بُرے سے آگاہ کر دینا ہے ان کی ہدایت کی ذمہ داری آپ پر نہیں، خدا تعالیٰ جس کے سپرد ہر چیز ہے، ان کا معاملہ بھی اسی کے سپرد کیجئے اور صبر واستقامت کے ساتھ فرائض تبلیغ کی انجام دہی میں ثابت قدم رہئے۔ (تفسیر عثمانی)

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ

کیا کہتے ہیں کہ بنالایا ہے تو قرآن کو کہہ دے تم بھی لے

مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ

آؤ ایک دس سورتیں ایسی بنا کر اور بُلالو

مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۳﴾ فَاِلَّمْ

جس کو بُلا سکو اللہ کے سوا اگر ہو تم سچے پھر اگر نہ پورا

يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ

کریں تمہارا کہنا تو جان لو کہ قرآن تو اُترا ہے

اللّٰهِ وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ

اللہ کی وحی سے اور یہ کہ کوئی حاکم نہیں اُسکے سوا پھر اب تم حکم

مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۴﴾

مانتے ہو

مشرکوں کو منہ توڑ جواب:

یعنی فرمائشی معجزے طلب کرتے ہیں، جن کا دیا جانا مصلحت نہیں۔ اور جو

سب سے بڑا معجزہ (قرآن) ان کے سامنے ہے، اسے مانتے نہیں، کہتے ہیں یہ تو (معاذ اللہ) تمہاری بنائی ہوئی گھڑت ہے۔ اس کا جواب دیا کہ تم بھی آخر عرب ہو، فصاحت و بلاغت کا دعویٰ رکھتے ہو، سب مل کر ایسی ہی دس سورتیں گھڑ کر پیش کردو اور اس کام میں مدد دینے کے لئے تمام مخلوق کو بلکہ اپنے ان معبودوں کو بھی بلا لاؤ جنہیں خدائی کا شریک سمجھتے ہو، اگر نہ کر سکو اور کبھی نہ کر سکو گے تو سمجھ لو کہ ایسا کلام خالق ہی کا ہو سکتا ہے۔ جس کا مثل لانے سے تمام مخلوق عاجز رہ جائے۔ تو یقیناً یہ وہ کلام ہے جو خدا نے اپنے علم کامل سے پیغمبر پر اتارا ہے۔ بیشک جس کے کلام کا مثل نہیں ہو سکتا اس کی ذات و صفات میں کون شریک ہو سکتا ہے۔ ایسا بے مثال کلام اسی بے مثال خدا کا ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ کیا ایسے واضح دلائل کے بعد بھی مسلمان ہونے اور خدا کا حکم بردار بننے میں کسی چیز کا انتظار ہے (تنبیہ) اعجاز قرآن کی کچھ تفصیل سورۂ یونس میں گذر چکی۔ ابتداء میں پورے قرآن سے تحدی کی گئی تھی۔ پھر دس سورتوں سے ہوئی۔ پھر ایک سورۃ سے جیسا کہ ''بقرہ'' اور ''یونس'' میں گزرا۔ گویا ان کا عجز بتدریج نمایاں کیا گیا۔ (تفسیر عثمانیؒ)

قرآن کے بے مثال ہونے کے دلائل:

اعجاز قرآن پر دلائل تو بے شمار ہیں جس پر علماء دین نے مستقل، کتابیں لکھی ہیں اس وقت اجمال اور اختصار کے ساتھ چند حرف ہدیہ ناظرین ہیں۔

(۱) قرآن کریم۔ اصول دین یعنی توحید اور رسالت اور قیامت کی ایسی تفصیل اور تحقیق پر مشتمل ہے کہ توریت، انجیل، اور زبور میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں۔

(۲) پھر یہ کہ قرآن کریم اثبات الوہیت و وحدانیت اور اثبات نبوت و رسالت اور اثبات قیامت کے ایسے دلائل عقلیہ اور براہین قطعیہ پر مشتمل ہے کہ جس کے جواب سے روئے زمین کے فلاسفہ عاجز اور درماندہ ہیں اور بڑے بڑے دہری اور مادہ پرست ان دلائل کے سامنے لاجواب ہیں۔

(۳) حرام وحلال کی تفصیل کرتا ہے۔

(۴) قرآن کریم، انبیاء سابقین کی نصیحتوں اور ان کے کلمات حکمت و موعظمت کا جامع ہے۔

(۵) عقل معاش اور عقل معاد دین اور دنیا کی رہنمائی کرتا ہے۔

(۶) گذشتہ امتوں کے عبرت آمیز واقعات بیان کرتا ہے۔ اور آئندہ کے لئے اہل ایمان کو بشارت دیتا ہے کہ اللہ تم کو کافروں کے مقابلہ میں غلبہ عطا فرمائے گا۔

(۷) اور قیامت تک آنے والے حوادث کلیہ کی تم کو خبر دیتا ہے کہ زمانہ کس رفتار سے جائے گا اور کس حال میں اس کی بساط پلٹی جائے گی اور کس طرح قیامت قائم ہوگی یہ تو قرآن کریم کے معنوی اعجاز کے چند وجوہ ہیں اور فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے اس کے دلائل اعجاز اور اسرار بلاغت کی کوئی حد نہیں۔

قادیانی دہقان کی گستاخی:

مگر قادیان کے ایک دہقان کی دیدہ دلیری کو دیکھو کہ وہ اپنے ہذیان اور تک بندیوں کے متعلق یہ کہتا ہے کہ یہ میری وحی بھی قرآن کی طرح معجزہ ہے آیات قرآنیہ کا سرقہ کرتا ہے۔ اور اس میں ایک دو لفظ کا ردوبدل کر کے بے حیائی سے کہتا ہے کہ یہ میری وحی ہے قرآن کی طرح اس پر بھی ایمان لانا فرض ہے۔ لا حول ولا قوة الا باللہ۔ اے مسلمانو! ذرا غور تو کرو کہ جب اہل لسان کے نزدیک مقامات حریری اور مقامات بدیعی معجزہ نہیں تو قادیان کے ایک دہقان کا ہذیان کہاں سے معجزہ ہو جائے گا۔ (معارف کاندھلویؒ)

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا
جو کوئی چاہے دنیا کی زندگانی اور اُس کی زینت بھگتا دینگے
نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا
ہم اُن کو اُن کے عمل دنیا میں اور اُن کو اس میں
لَا يُبْخَسُوْنَ ⑮
کچھ نقصان نہیں

دنیا پرستوں کو دنیا ہی ملتی ہے:

یعنی ایسے واضح ثبوت کے بعد جو شخص قرآن پر ایمان نہیں لاتا، یا اس کے بتلائے ہوئے راستہ پر نہیں چلتا بلکہ دنیا کی چندروزہ زندگی اور فانی ٹیپ ٹاپ ہی کو قبلہ مقصود ٹھہرا کر عملی جدوجہد کرتا ہے۔ اگر بظاہر کوئی نیک کام مثلاً خیرات وغیرہ کرتا ہے، تو اس سے بھی آخرت کی بہتری اور خدا کی خوشنودی مقصود نہیں ہوتی محض دنیوی فوائد کا حاصل کر لینا پیش نظر ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کی بابت خواہ وہ یہود و نصاریٰ ہوں یا مشرکین یا منافقین یا دنیا پرست ریاکار مسلمان بتلا دیا کہ دنیا ہی میں ان کا بھگتان کر دیا جائے گا۔ جو اعمال اور کوششیں وہ حصول دنیا کے لئے کرینگے ان کے کم و کیف کو ملحوظ رکھتے ہوئے خدا تعالیٰ اپنے علم و حکمت سے جس قدر مناسب جانے گا اور دینا چاہے گا یہیں عطا فرما دے گا۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر جو خیرات وغیرہ کے کام کرے اس کی یہ فانی اور صوری حسنات جو روح ایمان سے یکسر خالی ہیں دنیا میں رائیگاں نہیں جاتیں۔

ان کے بدلہ میں خدا تعالیٰ تندرستی، مال، اولاد، عزت و حکومت وغیرہ دے کر سب کھاتہ بے باق کر دیتا ہے۔ مرنے کے بعد دوسری زندگی میں کوئی چیز اس کے کام آنے والی نہیں۔ جس کافر کے لئے جس درجہ کی سزا تجویز ہو

چکی ہے وہ کبھی اس سے ٹلنے یا کم ہونے والی نہیں۔ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا (بنی اسرائیل رکوع ۲)

ریاء کار اور دنیا پرست عالم، متصدق اور مجاہد کے حق میں جو وعید آئی ہے، اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ ان سے محشر میں کہا جائے گا کہ جس غرض کے لئے تو نے علم سکھلایا، یا صدقہ و جہاد کیا وہ دنیا میں حاصل ہو چکی اب ہمارے پاس تیرے لئے کچھ نہیں۔ فرشتوں کو حکم ہوگا کہ اسے جہنم میں لے جاؤ۔ (اعاذنا الله منها) (تفسیر عثمانیؒ)

یعنی جو لوگ اپنے عمل اور نیکی کے عوض محض دنیوی زندگی کی درازی، صحت، مال و اولاد کی کثرت، حسین بیویاں اور نوکر چاکر خدمت گار حاصل کرنا چاہتے ہیں، ہم دنیا میں ان کو یہ چیزیں ان کے اچھے اعمال کے بدلہ میں پوری پوری دیدیتے ہیں کسی قسم کی حق تلفی اور ادائے عوض میں کمی نہیں کرتے مگر آخرت میں ان کے اچھے عمل کا کوئی اچھا بدلہ نہیں دیا جائے گا۔ وہاں سوائے دوزخ کے ان کو اور کچھ نہیں ملے گا کیونکہ اچھے کاموں کا اچھا بدلہ تو ان کو دنیا میں دے دیا جاتا ہے اور برے کام رہ جاتے ہیں سو ان کا برا بدلہ آخرت میں ملے گا۔ (تفسیر مظہری)

کافروں کے اچھے اعمال کی حقیقت:

مخالفین اسلام کو جب عذاب کی وعیدیں سنائی جاتیں تو وہ اپنی خیرات و صدقات اور خدمت خلق و رفاہِ عام کے کاموں کو سند میں پیش کرتے تھے کہ ہم ایسے نیک کام کرتے ہیں پھر ہم کو عذاب کیسا؟ اور آج تو بہت ناواقف مسلمان بھی اس شبہ میں گرفتار نظر آتے ہیں کہ جو کافر ظاہری اعمال و اخلاق درست رکھتے ہیں، خلق خدا کی خدمت اور خیرات وصدقات کرتے ہیں، سڑکیں، پل شفاخانے، پانی کی سبیلیں بناتے ہیں اور چلاتے ہیں ان کو مسلمانوں سے اچھا جانتے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث **انما الاعمال بالنیات** سے بھی اسی معنی کی تائید ہوتی ہے کہ جو شخص اپنے عمل میں جس چیز کی نیت کرتا ہے، اس کو وہی ملتی ہے، جو دنیا کی نیت کرتا ہے اس کو دنیا ملتی ہے، جو آخرت کی نیت کرتا ہے آخرت ملتی ہے، جو دونوں کی نیت کرتا ہے اس کو دونوں ملتی ہیں، تمام اعمال کا مدار نیت پر ہونا ایک ایسا اصول ہے جو ہر ملت و مذہب میں تسلیم کیا گیا ہے۔ (قرطبی)

ریاء کاری والا عمل:

ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے روز ان لوگوں کو لایا جائے گا جو دنیا میں عبادت اس لئے کرتے تھے کہ لوگوں کی نظر میں ان کی عزت ہو، ان سے کہا جائے گا کہ تم نے نماز پڑھی، صدقہ خیرات کیا، جہاد کیا، قرآن کی تلاوت کی مگر یہ سب اس نیت سے کیا کہ تم نمازی اور سخی اور غازی اور قاری کہلاؤ تو جو تم چاہتے تھے وہ تمہیں مل گیا، دنیا میں تمہیں یہ خطابات مل چکے اب یہاں تمہارے ان اعمال کا کوئی بدلہ نہیں اور سب سے پہلے جہنم میں ان لوگوں کو ڈالا جائے گا۔

حضرت ابو ہریرہؓ یہ حدیث نقل کر کے رو پڑے اور فرمایا کہ قرآن کریم کی آیت مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا سے اس حدیث کی تصدیق ہوئی۔

کافر آخرت میں عمل سے خالی ہوگا:

صحیح مسلم میں بروایت انسؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتے، مومن جو نیک کام کرتا ہے اس کو دنیا میں بھی کچھ بدلہ ملتا ہے اور آخرت میں ثواب ملتا ہے۔ اور کافر چونکہ آخرت کی فکر ہی نہیں رکھتا اس لئے اس کا حساب دنیا میں ہی بھگتا دیا جاتا ہے، اس کے نیک اعمال کے بدلہ میں دنیا کی دولت، عزت، صحت، راحت اس کو دیدی جاتی ہے یہاں تک کہ جب وہ آخرت میں پہنچتا ہے تو اس کے پاس کچھ نہیں ہوتا جس کا معاوضہ وہاں پائے۔

تفسیر مظہری میں ہے کہ مؤمن اگرچہ دنیا کی فلاح کا بھی خواہش مند ہوتا ہے مگر آخرت کا ارادہ غالب رہتا ہے اس لئے اس کو دنیا میں بقدر ضرورت ہی ملتا ہے اور بڑا معاوضہ آخرت میں پاتا ہے۔

حضرت فاروق اعظمؓ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان پر حاضر ہوئے تو سارے گھر میں چند گنی چنی چیزوں کے سوا کچھ نہ دیکھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ دعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی امت کو بھی دنیا کی وسعت عطا فرماویں، کیونکہ ہم فارس وروم کو دیکھتے ہیں وہ دنیا میں بڑی وسعت اور فراخی میں ہیں حالانکہ وہ خدا تعالیٰ کی عبادت نہیں کرتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تکیہ سے کمر لگائے ہوئے تھے، حضرت عمرؓ کے یہ الفاظ سن کر سیدھے بیٹھے گئے۔ اور فرمایا، اے عمر! تم اب تک اسی خیال میں پڑے ہو، یہ تو وہ لوگ ہیں جن کی نیکیوں کا بدلہ انہیں دنیا ہی میں دے دیا گیا ہے۔ (مظہری)

حرص وہوس کا نتیجہ:

جامع ترمذی اور مسند احمد میں بروایت انسؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کی نیت اپنے اعمال میں طلب آخرت کی ہوتی ہے اللہ تعالیٰ دنیا میں اس کے دل کو غنی کر دیتے ہیں اور اس کی ضروریات کو پورا فرما دیتے ہیں اور دنیا اس کے پاس ذلیل ہو کر آتی ہے، اور جس شخص کی نیت طلب دنیا کی ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ محتاجی اس کے سامنے کر دیتے ہیں کہ اس کی حاجت کبھی پوری ہی نہیں ہوتی کیونکہ ہوس دنیا اس کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتی ایک حاجت پوری ہونے سے پہلے دوسری حاجت سامنے آ جاتی ہے اور بے شمار فکریں اس کو لگ جاتی ہیں اور ملتا صرف وہی ہے جو اللہ اس کے لئے لکھ دیتا ہے۔ (معارف القرآن)

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ
یہی ہے جن کے واسطے کچھ نہیں آخرت میں

اِلَّا النَّارُ ۖ
آگ کے سوا

یعنی ان اعمال پر دوزخ کے سوا اور کسی چیز کے مستحق نہیں، کفار ابدی طور پر اور ریاءکار مسلمان محدود مدت کے لئے۔ ہاں خدا تعالیٰ بعض مؤمنین کو محض اپنے فضل وکرم سے معاف فرمادے، وہ الگ بات ہے۔ (تفسیر عثمانی)

وَحَبِطَ مَا صَنَعُوا فِيهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوا
اور برباد ہوا جو کچھ کیا تھا یہاں اور خراب گیا
يَعْمَلُونَ ﴿١٦﴾
جو کمایا تھا

یعنی دنیا میں جو کام دنیوی اغراض کے لئے کئے گئے تھے۔ آخرت میں پہنچ کر ظاہر ہوگا کہ وہ سب برباد ہوئے اور ریاکاری یا دنیا پرستی کے سلسلہ میں بظاہر جو نیکیاں کمائی تھیں، سب یونہی خراب گئیں، یہاں کوئی کام نہ آئی۔ (تفسیر عثمانی)

مؤمن کا مقصد:

بخاری نے ایک طویل حدیث حضرت عمرؓ کی روایت کردہ بیان کی ہے اس میں حضرت عمرؓ کا یہ بیان مذکور ہے میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو خُدا کی قسم مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں سوائے تین کچے چمڑوں کے اور کچھ دکھائی نہ دیا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ دعا فرمایئے کہ اللہ آپ کی امت کو فراخی عنایت فرمادے۔ اہل فارس اور اہل روم کو تو اللہ نے وسعت مالی عطا فرمائی ہے اور باوجودیکہ وہ اللہ کی عبادت نہیں کرتے مگر ان کو دنیا دیدی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تکیہ لگائے ہوئے تھے یہ سن کر بیٹھ گئے اور فرمایا ابن خطاب کیا تم اس خیال میں ہو (یہ لوگ تو دنیا کے طالب ہیں پس) ان کو دنیوی زندگی میں ان کی لذتیں دے دی گئی ہیں اور مؤمن کا مقصد دنیا اور آخرت دونوں ہیں اور ارادۂ آخرت غالب ہے اس لئے اس کو نیکیوں کا بدلہ دنیا میں بھی دے دیا جاتا ہے اور آخرت میں بھی نیکیوں کا ثواب دیا جائے گا۔

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ مؤمن پر ظلم نہیں کرتا (اس کی) نیکی کا اجر دنیا میں بھی اس کو دے دیا جاتا ہے اور آخرت میں اس کو ثواب دیا جائے گا رہا کافر کہ اس کی نیکیوں کے عوض دنیا میں اس کو کھانے کو دیا جاتا ہے پھر جب آخرت میں پہنچے گا تو اس کی کوئی نیکی ہی نہ ہوگی جس کی وجہ سے اس کو کوئی بھلائی دی جائے۔ (رواہ مسلم واحمد)

جس کیلئے عمل کیا اسی سے اجر مانگو:

میں کہتا ہوں آیت لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ میں خود قرینہ ہے کہ اس کا نزول کافروں کے حق میں ہوا کیونکہ باجماع علماء اہل ایمان کا آخرکار جنت میں جانا ثابت ہے بعض علماء کا کہنا ہے کہ آیت کا نزول ریاکاروں (دکھانے کے لئے نیکی کرنیوالوں) کے حق میں ہوا حضرت ابوسعید بن فضالہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب قیامت کے دن (یعنی ایسے دن) جس کے آنے میں کوئی شک نہیں، اللہ سب لوگوں کو جمع کرے گا تو ایک منادی ندا دے گا جس نے کوئی عمل اللہ کے لئے کیا ہو مگر اس میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو بھی شریک کرلیا ہو تو وہ اپنے عمل کا اجر اسی شریک سے طلب کرے اللہ تو ہر شرک سے بے نیاز ہے۔ رواہ احمد۔

میں کہتا ہوں اگر آیت کا حکم ریاکاروں کے متعلق ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ جو اعمال انہوں نے دکھاوٹ کے لئے کئے ہوں گے ان کا بدلہ سوائے دوزخ کے اور کچھ نہ ہوگا۔ (تفسیر مظہری)

ابن عباسؓ فرماتے ہیں ریاکاروں کی نیکیوں کا بدلہ سب کچھ اسی دنیا میں مل جاتا ہے ذرا سی بھی کمی نہیں ہوتی۔ پس جو شخص دنیا دکھاوے کے لئے نماز پڑھے یا روزے رکھے یا تہجد گزاری کرے اس کا اجر اسے دنیا میں ہی مل جاتا ہے۔ آخرت میں وہ خالی ہاتھ اور محض بے عمل اٹھتا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ
بھلا ایک شخص جو ہے صاف رستہ پر اپنے رب کے اور اُسکے ساتھ ساتھ
شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰى
ہے ایک گواہ اللہ کی طرف سے اور اُس سے پہلے گواہ تھی موسیٰ کی
اِمَامًا وَّرَحْمَةً ۭ
کتاب رستہ بتلاتی اور بخشواتی (اوروں کی برابر ہے)

مخلص مؤمن:

یعنی یہ شخص اور وہ ریاءکار دنیا پرست جن کا ذکر پہلے ہوا، کیا برابر ہو سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ "بینۃ" (صاف رستہ) سے مراد وہ رستہ ہے جس پر انسان اپنی اصلی اور صحیح فطرت کے موافق چلنا چاہتا ہے۔ بشرطیکہ گردوپیش کے حالات وخیالات سے متاثر نہ ہو، اور وہ توحید، اسلام اور قرآن کا راستہ ہے۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (روم۔ رکوع۴)

وفی الحدیث "کل مولود یولد علی الفطرة فابواه یهود انه او ینصرانه او یجسانه" الخ اور

گواہ سے کیا مراد ہے:

"شاھد منه. (گواہ اللہ کی طرف سے) قرآن عظیم ہے جو گواہی دیتا ہے کہ "دین فطرت" (توحید واسلام) پر چلنے والا بیشک ٹھیک راستہ پر چل رہا ہے اور وہ قرآن اپنی حقانیت کا بھی خود گواہ ہے

آفتاب آمد دلیل آفتاب

چونکہ قرآن کے لانیوالے جبریل امین اور لینے والے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس اعتبار سے ان کو بھی شاہد کہہ سکتے ہیں۔ بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو یہ ہے کہ آپ کے اخلاق وعادات، معجزات، زبان مبارک، چہرۂ نورانی، ہر چیز سے شہادت ملتی ہے کہ جس دین کے آپ حامل ہیں وہ بالکل سچا دین ہے۔ آگے وَمِنۡ قَبۡلِهٖ كِتٰبُ مُوۡسٰٓى اِمَامًا وَّرَحۡمَةً کا مطلب یہ ہے کہ قرآن سے پہلے جو وحی کسی نبی پر نازل کی گئی وہ بھی "دین فطرت کی صداقت پر گواہ تھی۔ خصوصاً موسیٰ علیہ السلام پر جو عظیم الشان کتاب (تورات) اتاری گئی قرآن سے پیشتر اسے ایک بڑا بھاری شاہد ان لوگوں کی حقانیت کا کہنا چاہئے جو دین فطرت کے صاف راستہ پر چلتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

بقول ابوالشیخ ابوالعالیہ اور ابراہیم نخعی کے نزدیک مَنۡ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی مراد ہے۔ ابن مردویہ اور ابن ابی حاتم نے حضرت علیؓ کی طرف بھی اس تفسیر کی نسبت کی ہے ابوالنعیم نے المعرفۃ میں بھی اس قول کو نقل کیا ہے۔ بینۃ سے مراد قرآن مجید ہے۔

ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، طبرانی اور ابوالشیخ نے حضرت محمد بن علی بن ابی طالب (یعنی محمد بن حنیفہ) کا بیان نقل کیا ہے۔ محمد نے فرمایا: میں نے اپنے والد (حضرت علی) سے عرض کیا، لوگوں کا خیال ہے کہ آیت وَيَتۡلُوۡهُ شَاهِدٌ مِّنۡهُ میں شاہد سے مراد آپ ہیں، فرمایا کاش وہ میں ہوتا مگر (ایسا نہیں ہے) وہ شاہد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک تھی، ابوالشیخ نے ابونجیح کی سند سے مجاہد کا بھی یہی قول نقل کیا ہے (کہ شاہد سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں، بعض علماء کا قول ہے یتلو (تلاوت سے مشتق نہیں ہے بلکہ) تلو سے مشتق ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا قریش کے ہر آدمی کے متعلق کوئی نہ کوئی آیت ضرور نازل ہوئی ہے کسی نے عرض کیا آپ کے متعلق کیا نازل ہوا؟ فرمایا (آیت) ویتلو شاہد منہ میرے متعلق نازل ہوئی۔

حضرت علیؓ کے شاہد ہونے کی وجہ:

میرے نزدیک سب سے زیادہ قوی وجہ آپ کو شاہد کہنے کی یہ ہے کہ آپ تمام کمالات ولایت کے مرکزی نکتہ تھے، قطب ولایت تھے، تمام اولیاء بلکہ تمام صحابہ بھی مقام ولایت میں آپ کے پیچھے اور تابع ہیں خلفاء ثلاثہ (حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمانؓ، ضرور آپ سے افضل تھے مگر ان کی فضیلت کی وجہ دوسری ہے جس کی تشریح حضرت مجدد صاحب نے اپنے مکتوبات کے آخر میں کی ہے۔

اس صورت میں آیت کا تشریحی مطلب اس طرح ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف سے ایک قطعی دلیل اور روشن حجت لے کر آئے ہیں جو آپ کی رسالت کو یقینی طور پر ثابت کر رہی ہے یہ روشن دلیل کیا ہے۔ آپ کے معجزات کثیرہ جن میں سے سب سے بڑا معجزہ قرآن مجید اور وہ علوم ہیں جو وحی کے ذریعے سے آپ کو حاصل ہوئے پھر آپ کے پیچھے اور آپ کے تابع حضرت علی اور دوسرے اولیاء جو حضرت علی سے مشابہت رکھنے والے ہیں آئے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے شاہد ہیں، اولیاء کی کرامتیں حقیقت میں رسول اللہ کے معجزات ہیں اور اولیاء کے الہامی اور کشفی علوم بھی وہی علوم ہیں جو رسول اللہ کو وحی کے ذریعہ سے حاصل ہوئے تھے، پس اولیاء کی کرامات اور الہامی علوم سے رسول اللہ کی رسالت کی صداقت ثابت ہوتی ہے۔

حضرت علیؓ کے مناقب:

ترمذی نے صحیح سند سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا انا دار الحکمة وعلی بابها. اور میں علم کا شہر ہوں اور علی اس شہر کا دروازہ ہیں۔ فمن اراد العم فلیات الباب پس جو علم کا خواستگار ہو اس کو دروازہ پر آنا چاہئے۔ (تاکہ علم کے شہر میں داخل ہو سکے) اس حدیث کو ابن صدی نے الکامل میں اور عقیلی نے الضعفاء میں اور طبرانی و حاکم نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا ہے، نیز ابن حدی اور حاکم نے حضرت جابر کی روایت سے بھی بیان کیا ہے۔ اس حدیث میں حکمت وعلم سے علوم اولیاء کی طرف اشارہ نہیں ہے علوم فقہیہ کا مدار تو صرف علی پر نہیں ہے۔ علم فقہ کے متعلق تو رسول اللہ کا ارشاد ہے میرے صحابی ستاروں کی طرح ہیں جس کی بھی پیروی کرو گے ہدایت یاب ہو جاؤ گے۔ (تفسیر مظہری)

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تحقیق:

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی فرماتے ہیں کہ اس آیت (یعنی)

اَفَمَنۡ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنۡ رَّبِّهٖ وَيَتۡلُوۡهُ شَاهِدٌ مِّنۡهُ وَمِنۡ قَبۡلِهٖ كِتٰبُ مُوۡسٰٓى اِمَامًا وَّرَحۡمَةً ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤۡمِنُوۡنَ

کی تفسیر میں غور وفکر کے بعد میرے نزدیک جو تحقیق ہے وہ درج کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں شک نہیں کہ بعض افراد نے بعثت نبوی سے قلب سلیم کی شہادت اور ذکاوت سے کچھ اصول شریعت کو پہچان لیا تھا۔ کہ وہ بت پرستی اور شراب خوری اور زنا کاری کو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور خواب اور رویائے صادقہ اور مناجات صالح کے ذریعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کو بھی جانتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے منتظر تھے اس اجمالی علم کو جوان

کے قلوب میں مرکوز تھا اس کو حق تعالیٰ نے بینہ اور دلیل سے تعبیر فرمایا ہے پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور اپنی آنکھوں سے اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھ لی اور اپنے اس علم اجمالی کی شہادت کا آنکھوں سے مشاہدہ کرلیا تو ان کا علم اجمالی۔ علم تفصیلی سے اور ظن اور گمان، یقین اور مشاہدہ سے تبدیل ہو گیا۔ اسی علم تفصیلی اور مشاہدہ کو حق تعالیٰ نے شَاهِدٌ مِّنْهُ اور نزول قرآن پہلے توریت۔ اہل دین وملت کے پیشوا اور رہنما تھے اور اب ان کا امام اور پیشوا قرآن ہو گیا صحابہ کرام میں کی ایک اعلیٰ جماعت ان اوصاف سے جو اوپر مذکور ہوئے موصوف تھے جن کے سر دفتر حضرت صدیق اکبر تھے اور باطنی مناسبت اور قلبی ذکاوت اور سلامت کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قبول اسلام میں کوئی تامل نہیں ہوا بلا تامل اور بدون طلب معجزہ ایمان لے آئے اس آیت میں اسی طرف اشارہ ہے (ازالۃ الخفاء) (معارف کاندھلویؒ)

أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ ۚ وَمَن يَكْفُرْ بِهِ
یہی لوگ مانتے ہیں قرآن کو اور جو کوئی منکر ہو اُس سے سب
مِنَ الْأَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهُ ۚ
فرقوں میں سے سو دوزخ ہے ٹھکانا اُس کا

قرآن کو ماننا ضروری ہے:

یعنی یہود، انصاری، بت پرست، مجوس، عرب، عجم، یورپ ایشیا کسی فرقہ جماعت اور ملک وملت سے تعلق رکھتا ہو جب تک قرآن کو نہ مانے گا نجات نہیں ہوسکتی۔ جیسا کہ صحیح مسلم وغیرہ کی بعض احادیث میں آپ نے بہت تصریح وتعمیم کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

الاحزاب (گروہ) سے مراد (مسلمانوں کے علاوہ) تمام مذاہب والے ہیں، حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے اس امت (دعوت) میں سے جو کوئی کافر ومشرک اور یہودی اور عیسائی ایسی حالت میں مرے گا کہ جس (ہدایت) کو مجھے دیکر بھیجا گیا ہے وہ اس پر ایمان نہ لایا ہوگا تو وہ ضرور دوزخیوں میں سے ہوگا۔ (رواہ مسلم) (قیامت کے دن) شہادت دیں گے۔

قتادہ کے نزدیک ساری مخلوق مراد ہے۔ صحیحین میں حضرت ابن عمر کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (قیامت کے دن) اللہ مؤمن کو (اپنے) قریب کر کے اپنا ہاتھ اس کے شانہ پر رکھ دے گا اور پوشیدہ طور پر فرمائے گا کیا تو اپنا (فلاں) گناہ جانتا ہے مؤمن عرض کرے گا۔ جی ہاں اے میرے رب، یہاں تک کہ مؤمن کے (سب) گناہوں کا اس سے اقرار کرا لے گا اور مومن اپنے دل میں خیال کرے گا کہ میں تباہ ہو گیا (اس کے بعد) اللہ فرمائے گا میں نے دنیا میں گناہوں پر پردہ ڈالے رکھا آج میں تیرے وہ گناہ معاف کرتا ہوں پھر نیکیوں کی تحریر اس کو دے دی جائے گی۔ رہے کافر اور منافق ان کو سب مخلوق کے سامنے پکارا جائے گا اور کہا جائے گا۔ (تفسیر مظہریؒ)

فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۚ إِنَّهُ الْحَقُّ مِن
سو تو مت رہ شبہ میں اُس سے بیشک وہ حق ہے تیرے
رَّبِّكَ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٧﴾
رب کی طرف سے اور پر بہت سے لوگ یقین نہیں کرتے

قرآن شک وشبہ سے پاک ہے:

یہ خطاب ہر شخص کو ہے۔ جو قرآن سنے یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب بنا کر دوسروں کو سنانا مقصود ہے کہ قرآن کی صداقت اور "من اللہ" ہونے میں قطعاً شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ جو لوگ نہیں مانتے وہ احمق ہیں یا معاند۔ (تفسیر عثمانیؒ)

صحیح مسلم میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اس امت سے جو بھی مجھے سن لے اور پھر مجھ پر ایمان نہ لائے وہ جہنمی ہے۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا ۚ
اور اُس سے بڑھ کر ظالم کون جو باندھے اللہ پر جھوٹ

قرآن کو جھٹلانا سب سے بڑا ظلم ہے:

یعنی قرآن جھوٹ اور افتراء نہیں۔ خدا کا سچا پیغام ہے۔ جس کو قبول کرنا ضروری ہے خوب سمجھ لو کہ اس شخص سے زیادہ ظالم کوئی نہیں ہوسکتا جو خدا پر جھوٹ باندھے مثلاً اس کا کلام نہ ہو اور کہدے کہ اس کا کلام ہے یا واقعی اس کا ہو اور خدا بار بار فرمائے کہ میرا کلام ہے مگر باوجود روشن دلائل کے جھٹلاتا رہے اور کہتا رہے کہ اس کا نہیں۔ (تفسیر عثمانیؒ)

أُولَٰئِكَ يُعْرَضُونَ عَلَىٰ رَبِّهِمْ وَيَقُولُ
وہ لوگ روبرو آئیں گے اپنے رب کے اور کہیں گے
الْأَشْهَادُ هَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ كَذَبُوا عَلَىٰ رَبِّهِمْ ۚ
گواہی دینے والے یہی ہیں جنہوں نے جھوٹ کہا تھا اپنے رب پر

ظالموں کے خلاف گواہی:

یعنی محشر میں جب خدا کے سامنے اعلیٰ رؤس الاشہاد پیش ہونگے اور ان

کی شرارتوں کے دفتر کھولے جائینگے اس وقت گواہی دینے والے (ملائکہ) صالحین بلکہ خود ان کے ہاتھ پاؤں کہیں گے کہ یہ ہی وہ بدبخت ظالم ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کی نسبت جھوٹ بکا تھا۔ (تفسیر عثمانی)

گواہ:

میں کہتا ہوں اشہاد (شہادت دینے والے) صرف وہی نہیں ہونگے جن کا ذکر (مختلف علماء کے اقوال میں) کیا گیا ہے۔ بلکہ انسان کے جسمانی اعضاء بھی شہادت دینگے، اللہ نے فرمایا اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓی اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَیْدِیْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ دوسری آیت میں آیا ہے قَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَیْنَا الخ۔ ایک اور آیت ہے یَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَیْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَیْدِیْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ الخ۔

مسلم نے حضرت انسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ اللہ نے فرمایا

كَفٰى بِنَفْسِكَ الْیَوْمَ عَلَیْكَ حَسِیْبًا و بالكرام الكاتبين شهيداً۔

یعنی منہ پر مہر لگادی جائے گی اور اعضاء سے کہا جائے گا تم بولو۔

منجملہ دوسرے شاہدوں کے زمانہ اور مقام بھی شہادت دے گا۔ ہم نے سورہ اذا زلزلت کی آیت یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا کی تفصیل کے ذیل میں لکھ دیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زمین شہادت دے گی کہ کس بندے اور کس بندی نے اس کی پشت پر کیا کیا، کیا۔

بخاری نے حضرت ابوسعیدؓ خدری کی روایت سے بیان کیا ہے کہ مؤذن کی آواز جتنی مسافت پر پہنچے گی اور جہاں تک جن وانس اس کو سنیں گے، قیامت کے دن اس کی شہادت دینگے۔

ابن خزیمہ کی روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ مؤذن کی آواز جو پتھر، ڈھیلا، جن وانس سنے گا، مؤذن کے لئے شہادت دے گا۔ ابوداؤد اور ابن خزیمہ نے حضرت ابوہریرہؓ کی مرفوع روایت نقل کی ہے کہ مؤذن کی آواز جہاں تک پہنچے گی (اسی کے مطابق) اس کی مغفرت کی جائے گی اور ہر تر وخشک اس کی شہادت دے گا۔

ابن المبارک نے حضرت عمرؓ کا قول نقل کیا ہے کہ جو شخص جس مقام کے قریب سجدہ کرے گا، وہاں درخت ہو یا پتھر، قیامت کے دن وہ شہادت دے گا۔ عطاء خراسانی کی روایت سے بھی یہ اثر منقول ہے۔

ابونعیم نے حضرت معقل بن یسار کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو دن ابن آدم پر آتا ہے اس میں آواز دی جاتی ہے (یعنی دن خود آواز دیتا ہے) اے آدم زاد میں نیا ہوں تو جو کچھ کرے گا کل میں تیرے لئے شہادت دوں گا، اس لئے میرے اندر تو نیکی کرنا تا کہ کل کو میں تیرے لئے (اچھی) شہادت دوں۔ میں اگر گزر گیا تو پھر مجھے کبھی نہیں دیکھے گا۔ رات بھی اسی طرح کہتی ہے۔ مسلم نے حضرت ابوسعید خدری کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، یہ مال بڑا سبز اور شیریں ہے اور مسلمان کا اچھا ساتھی ہے اور جو مال قیدی اور یتیم اور (ضرورت مند) مسافر کو دیا جائے گا، خود (وہ مال) اس کی گواہی دے گا۔ اور جو شخص بغیر حق کے مال لیتا ہے وہ اس شخص کی طرح ہے جو کھاتا تو ہو اور سیر نہ ہوتا ہو۔ قیامت کے دن یہ مال اس شخص کے خلاف شہادت دے گا۔ ابونعیم نے طاؤس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ قیامت کے دن مال اور صاحبِ مال دونوں کو لایا جائے گا، اور دونوں باہم جھگڑا کرینگے۔ (الحدیث) (تفسیر مظہریؒ)

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۸﴾ الَّذِیْنَ

سن لو پھٹکار ہے اللہ کی نا انصاف لوگوں پر

یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَیَبْغُوْنَهَا

جو کہ روکتے ہیں اللہ کی راہ سے اور ڈھونڈتے ہیں

عِوَجًا ؕ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۹﴾

اُس میں کجی اور وہی ہیں آخرت سے منکر

ظالموں پر لعنت:

ارشاد ہے یعنی جو لوگ ظلم اور نا انصافی سے خدا کے کلام کو جھوٹا بتلاتے ہیں اور سب سے بڑھ کر آخرت کے منکر ہیں دوسروں کو خدا کی راہ پر چلنے سے روکتے ہیں اور اس تلاش میں رہتے ہیں کہ سیدھے راستہ کو ٹیڑھا ثابت کریں۔ ایسے ظالموں پر خدا کی خصوصی لعنت ہے۔ (تفسیر عثمانی)

اُولٰٓئِكَ لَمْ یَكُوْنُوْا مُعْجِزِیْنَ فِی الْاَرْضِ

وہ لوگ نہیں تھکانے والے زمین میں بھاگ کر

وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِیَآءَ ۘ

اور نہیں اُن کے واسطے اللہ کے سوا کوئی حمایتی

یعنی اتنی وسیع زمین میں نہ کہیں بھاگ کر خدا سے چھپ سکتے ہیں اور نہ کوئی مددگار اور حمایتی مل سکتا ہے جو خدا کے عذاب سے بچاوے۔ (تفسیر عثمانی)

یُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ؕ

دونا ہے اُن کے لئے عذاب

کیونکہ خود گمراہ ہوئے اور دوسروں کو گمراہ کیا۔

مَا كَانُوْا یَسْتَطِیْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا

نہ طاقت رکھتے تھے سننے کی اور نہ

يُبْصِرُوْنَ ﴿۲۰﴾

دیکھتے تھے

یہ ظالم بہرے اور اندھے ہیں:

یعنی دنیا میں ایسے اندھے بہرے بنے کہ نہ حق بات سننے کی تاب تھی نہ خدا کے نشانوں کو دیکھ سکتے تھے جنہیں دیکھ کر ممکن تھا راہ ہدایت پا لیتے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ اللہ جھوٹ بولا بے اصل اور غلط باتیں اس کی طرف منسوب کیں۔ کہاں سے لائے؟ غیب سن نہ آتے تھے غیب کو دیکھتے نہ تھے پھر ان کا ماخذ کیا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ

وہی ہیں جو کھو بیٹھے اپنی جان اور گم ہو گیا

عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۱﴾

اُن سے جو جھوٹ باندھا تھا

جان کا کھو بیٹھنا، یہی کہ ابدی عذاب میں گرفتار ہوئے اور سب جھوٹے دعوے وہاں پہنچ کر گم ہو گئے۔

لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ﴿۲۲﴾

اس میں شک نہیں کہ یہ لوگ آخرت میں یہی ہیں سب سے زیادہ نقصان

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

میں البتہ جو لوگ ایمان لائے اور کام کئے نیک

وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ

اور عاجزی کی اپنے رب کے سامنے وہ ہیں جنت کے رہنے والے

هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۳﴾

وہ اُسی میں رہا کریں گے

مؤمن کا اچھا انجام:

منکرین کی بدانجامی کے بالمقابل مؤمنین کا انجام نیک بیان فرمایا۔ ان کی عاجزی خدا کو پسند آئی اس لئے اپنی دائمی خوشنودی کا مقام عطا فرمایا۔ (تفسیر عثمانی)

صفوان بن محرز کہتے ہیں کہ میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا ہاتھ تھامے ہوئے تھا کہ ایک شخص آپ کے پاس آیا اور پوچھنے لگا کہ آپ نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے قیامت کے دن کی سرگوشی کے بارے میں کیا سنا ہے؟ آپ نے فرمایا میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اللہ عز وجل مؤمن کو اپنے سے قریب کرے گا یہاں تک کہ اپنا بازو اس پر رکھ دے گا اور اسے لوگوں کی نگاہوں سے چھپا لے گا اور اس سے اس کے گناہوں کا اقرار کرائے گا کہ کیا تجھے اپنا فلاں گناہ یاد ہے؟ اور فلاں بھی؟ اور فلاں بھی۔ یہ اقرار کرتا جائے گا یہاں تک کہ سمجھ لے گا کہ بس اب ہلاک ہوا۔ اس وقت ارحم الراحمین فرمائے گا کہ میرے بندے! میں دنیا میں ان پر پردہ ڈالتا رہا، سن آج بھی انہیں بخشتا ہوں۔ پھر اس کی نیکیوں کا عمل نامہ اسے دے دیا جائے گا۔ اور کفار اور منافقین پر تو گواہ پیش ہوں گے جو کہیں گے کہ یہی وہ ہیں جو اللہ پر جھوٹ بولتے تھے یاد رہے کہ ان ظالموں پر خدا کی لعنت ہے الخ۔ یہ حدیث بخاری و مسلم میں بھی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَالْاَصَمِّ

مثال ان دونوں فرقوں کی جیسے ایک تو اندھا

وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ ۭ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ۭ

اور بہرا اور دوسرا دیکھتا ہے اور سنتا کیا برابر ہے دونوں کا حال پھر

اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾

کیا تم غور نہیں کرتے

مؤمن و منکر برابر نہیں:

یعنی منکرین تو اندھے بہرے ہیں جیسا کہ دو تین آیت پہلے فرمایا تھا۔ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ" پھر جسے نہ خود نظر آئے نہ دوسرے کی سن سکے، اس کا آغاز انجام کیسے ان روشن ضمیر ایمانداروں کے برابر ہو سکتا ہے جو بصیرت کی آنکھوں سے حق و باطل اور بھلے برے میں تمیز کرتے اور اپنے ہادیوں کی باتیں بگوش ہوش سنتے ہیں۔ غور کرو کہ دونوں کا انجام یکساں کس طرح ہو سکتا ہے؟ آگے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کا قصہ اسی مضمون کی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ اِنِّىْ لَكُمْ

اور ہم نے بھیجا نوح کو اس کی قوم کی طرف کہ میں تم کو ڈر کی بات

نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۲۵﴾

سُناتا ہوں کھول کر

حضرت نوحؑ کا قوم سے خطاب:

یعنی نہایت وضاحت کے ساتھ وہ چیزیں بتلاتا ہوں جن کے ارتکاب پر مہلک عذاب نازل ہونے کا اندیشہ ہے۔ یا جو اس عذاب سے محفوظ رہنے کے ذرائع ہیں۔

اَنۡ لَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ
کہ نہ پرستش کرو اللہ کے سوا

یعنی ود، سواع، یغوث، یعوق، نسر کی جن کا ذکر سورۂ نوح میں آئے گا۔

اِنِّىۡۤ اَخَافُ عَلَيۡكُمۡ عَذَابَ يَوۡمٍ اَلِيۡمٍ ﴿۲۶﴾
میں ڈرتا ہوں تم پر دردناک دن کے عذاب سے

یعنی غیر اللہ کی پرستش سے باز نہ آنے کی صورت میں سخت عذاب آنے کا ڈر ہے۔ ''دردناک دن'' سے وہ دن مراد ہے جس میں المناک اور دردانگیز حوادث کا وقوع ہو۔ مثلاً قیامت کا دن یا وہ دن جس میں قوم نوح غرقاب کی گئی۔

فَقَالَ الۡمَلَاُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ قَوۡمِهٖ مَا
پھر بولے سردار جو کافر تھے اُس کی قوم کے
نَرٰٮكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثۡلَنَا وَمَا نَرٰٮكَ اتَّبَعَكَ
ہم کو تو تُو نظر نہیں آتا مگر ایک آدمی ہم جیسا، اور دیکھتے نہیں
اِلَّا الَّذِيۡنَ هُمۡ اَرَاذِلُنَا بَادِىَ الرَّاۡىِ ۚ وَمَا
کوئی تابع ہوا ہو تیرا، مگر جو ہم میں نیچ قوم ہیں بلا تامل اور
نَرٰى لَـكُمۡ عَلَيۡنَا مِنۡ فَضۡلٍۢ بَلۡ نَظُنُّكُمۡ
ہم نہیں دیکھتے تم کو اُوپر اپنے کچھ بڑائی بلکہ ہم کو تو خیال ہے کہ تم
كٰذِبِيۡنَ ﴿۲۷﴾
سب جھوٹے ہو

قوم کے سرداروں کا جواب:

یعنی رسول کو تمام قوم کے مقابلہ میں کوئی نمایاں امتیاز ہونا چاہئے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ تم ہماری طرح جنس بشر سے ہو، آسمان کے فرشتے نہیں۔ جس کے سامنے خواہ مخواہ انسانوں کی گردنیں جھک جائیں پھر بشر بھی ایسے نہیں جسے کوئی خاص تفوق اور بڑائی ہم پر حاصل ہوتی مثلاً بڑے دولتمند یا جاہ وحکومت کے مالک ہوتے، جو لوگ تمہارے پیرو ہوئے وہ بھی ماشاء اللہ سب کے سب مفلس، رذیل، پست اور ادنیٰ طبقہ کے لوگ ہیں جن کے ساتھ بیٹھنا بھی ہم جیسے شریفوں کے لئے ننگ وعار کا موجب ہے تو کیا ساری خدائی میں سے تم ہی ملے تھے جنہیں خدا نے اپنے منصب سفارت پر مامور فرمایا۔ آخر ہم تم سے حسب نسب، مال ودولت، خلق وخلق کس بات میں کم تھے؟ جو ہمارا انتخاب اس عہدہ کے لئے نہ ہوگیا۔ کم از کم آپ کا اتباع کرنے والے ہی کوئی معزز اور بڑے آدمی ہوتے۔ بھلا ان موچیوں اور حجاموں کا تابع ہو جانا آپ کے لئے کیا موجب فضل وشرف ہوسکتا ہے؟ اور کس طرح صداقت کی دلیل بن سکتی ہے؟ ایسے سطحی لوگوں کا جن کی پستی اور رذالت بالکل عیاں ہے۔ بے سوچے سمجھے اور بدون غور وتامل کے ظاہری اور سرسری طور پر ایمان لے آنا آپ کا کونسا کمال ہے؟ بلکہ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ تم اور تمہارے ساتھی سب جھوٹے ہو۔ تم نے ایک بات بنائی اور چند بیوقوفوں نے ہاں میں ہاں ملا دی، تاکہ اس طرح ایک نئی تحریک اٹھا کر کر کوئی امتیاز اور بزرگی حاصل کرلیں۔ یہ ان ملعونوں کی تقریر کا ماحصل تھا۔ نوح علیہ السلام نے جو جواب دیا آگے آتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت ابوبکرؓ کی فضیلتیں:

حدیث شریف میں ہے کہ میں نے جسے بھی اسلام کی طرف بلایا اس میں کچھ نہ کچھ جھجک ضرور پائی سوائے ابوبکرؓ کے کہ انہوں نے کوئی تردد وتامل نہ کیا۔ واضح چیز کو دیکھتے ہی فوراً بلا جھجک قبول کرلیا۔ (تفسیر ابن کثیر)

قَالَ يٰقَوۡمِ اَرَءَيۡتُمۡ اِنۡ كُنۡتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ
بولا اے قوم دیکھو تو اگر میں ہوں صاف راستہ پر اپنے
مِّنۡ رَّبِّىۡ وَاٰتٰٮنِىۡ رَحۡمَةً مِّنۡ عِنۡدِهٖ
رب کے اور اُس نے بھیجی مجھ پر رحمت اپنے پاس سے
فَعُمِّيَتۡ عَلَيۡكُمۡ ؕ اَنُلۡزِمُكُمُوۡهَا وَاَنۡتُمۡ لَهَا
پھر اُس کو تمہاری آنکھ سے مخفی رکھا، تو کیا ہم تم کو مجبور کر سکتے ہیں اُس
كٰرِهُوۡنَ ﴿۲۸﴾
پر اور تم اُس سے بیزار ہو

پیغمبر اخلاق واعمال میں بلند ہوتا ہے نہ مال میں:

یعنی یہ صحیح ہے کہ پیغمبر کو عام انسانوں سے بالکل ممتاز ہونا چاہئے لیکن وہ امتیاز مال ودولت، ملک وحکومت اور دنیا کی ٹیپ ٹاپ میں نہیں، بلکہ اعلیٰ اخلاق، بہترین ملکات، تقویٰ خدا ترسی، حق پرستی، دردمندئ خلائق اور ان

صریح آیات ونشانات پیش کرنے سے ان کو امتیاز حاصل ہوتا ہے جو حق تعالیٰ بطور اتمام حجت واکمالِ نعمت ان کے اندر قائم کرتا یا ان کے ذریعہ سے ظاہر فرماتا ہے وہ وحی الٰہی اور ربانی دلائل و براہین کی روشنی میں صاف راستہ پر چلتے ہیں اور دن رات خدا کی خصوصی رحمتیں ان پر بارش کی طرح برستی ہیں۔

تم دل کے اندھے ہو:

نوح علیہ السلام نے فرمایا اگر یہ سب چیزیں مجھ میں کھلے طور پر موجود ہوں اور یقیناً موجود ہیں لیکن جس طرح اندھے کو سورج کی روشنی نظر نہیں آتی، تمہاری آنکھیں بھی اس نورِ الٰہی کے دیکھنے سے قاصر رہیں، تو کیا ہم زبردستی مجبور کر کے تم سے اس نور اور رحمت کا اقرار کرا سکتے ہیں جس سے تم اس قدر نفور و بیزار ہو کہ آنکھ کھول کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ میری بزرگی و برتری جو تم کو نظر نہیں آتی، یہ اس لئے ہے کہ تمہارے دل کی آنکھیں اندھی ہیں یا بند ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

قتادہ نے کہا اگر انبیاء میں یہ قدرت ہوتی کہ تجیر لوگوں کو مومن بنا سکتے تو وہ ایسا بھی کر لیتے مگر ان میں یہ قدرت ہی نہیں تھی۔ (تفسیر مظہری)

وَيٰقَوْمِ لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ۭ اِنْ اَجْرِيَ
اور اے میری قوم نہیں مانگتا میں تم سے اس پر کچھ مال، میری مزدوری نہیں
اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ
مگر اللہ پر اور میں نہیں ہانکنے والا ایمان والوں کو
اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ
اُن کو ملنا ہے اپنے رب سے

میں غریب مؤمنوں کو دھتکار نہیں سکتا:

یعنی میں تبلیغ کے کام کی کوئی تنخواہ تم سے نہیں مانگتا، جو مالی خود غرضی کا شبہ ہو۔ میں اپنے پروردگار کا نوکر ہوں اسی کے یہاں سے مزدوری ملے گی بحمد اللہ نہ مجھے تمہارے مال کی طلب ہے نہ ضرورت۔ پھر غریبوں کو چھوڑ کر مالداروں کی طرف کیوں جھکوں۔ اگر تم میرے اتباع کو محض ان کی افلاس یا پیشہ کی وجہ سے حقیر و ذلیل سمجھتے ہو تو خوب سمجھ لو کہ میں وہ نہیں جو دولت ایمان کے سرمایہ داروں کو ظاہری خستہ حالی کی بناء پر جانوروں کی طرح دھکے دیکر نکال دوں انہیں ایک روز اپنے پروردگار سے ملنا ہے۔ وہ میری شکایت اس کے دربار میں کرینگے کہ آپ کے پیغمبر نے متکبر دنیاداروں کی خاطر ہم غریب وفاداروں کو نکال دیا تھا۔ میں ظاہر حال کے خلاف یہ کیونکر سمجھ لوں کہ ان کا ایمان محض ظاہری اور سرسری ہے۔ دلوں کو چیر کر دیکھنا میرا کام نہیں۔ یہ پروردگار کے یہاں پتہ چلے گا کہ ان کے دلوں کی کیا حالت تھی۔ (تفسیر عثمانی)

وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ﴿۲۹﴾
لیکن میں دیکھتا ہوں تم لوگ جاہل ہو

غربت کوئی عیب نہیں ہے:

یعنی جہل وحماقت سے انجام پر نظر نہیں کرتے، صرف ان کی ظاہری شکستگی دیکھ کر حقیر سمجھتے ہو۔ اور ایسی مہمل درخواست کرتے ہو کہ ان کو ہٹا دیا جائے تو ہم تمہارے پاس آئیں۔ کیا غربت اور کسب حلال کوئی عیب ہے؟ یہی چیز تو ہے جو حق کے قبول کرنے میں مزاحم نہیں ہوتی۔ عموماً دولت و جاہ کا نشہ انسان کو قبول حق سے محروم رکھتا ہے اسی لئے ہرقل کی حدیث میں آیا ہے کہ انبیاء کے متبعین ضعفاء ہوتے ہیں بہر حال تم نہیں جانتے کہ سب کو خدا کے پاس جمع ہونا ہے، وہاں پہنچ کر ظاہر ہوگا کہ اپنے کو ان سے بہتر سمجھنا تمہارا غرور تھا۔ (تفسیر عثمانی)

وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ
اور اے قوم کون چھڑائے مجھ کو اللہ سے اگر اُن کو
طَرَدْتُّهُمْ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۳۰﴾
ہانک دوں کیا تم دھیان نہیں کرتے

مخلص لوگوں کو چھوڑا نہیں جا سکتا:

یعنی میں تمہارے کبر وغرور اور جہالت سے متاثر ہو کر اپنا نقصان کیسے کروں۔ اگر تمہاری رعایت سے میں نے خدا کے مخلص بندوں کو دھکے دے دیئے تو اس کی سزا اور گرفت سے مجھ کو کون بچا سکے گا۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَاۗىِٕنُ اللّٰهِ وَلَآ
اور میں نہیں کہتا تم کو کہ میرے پاس ہیں خزانے اللہ کے اور نہ
اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّىْ مَلَكٌ وَّلَآ
میں خبر رکھوں غیب کی اور نہ کہوں کہ میں فرشتہ ہوں اور نہ
اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْٓ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ
کہوں گا کہ جو لوگ تمہاری آنکھ میں حقیر ہیں نہ دیگا اُن کو
اللّٰهُ خَيْرًا ۭ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ښ
اللہ بھلائی اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ اُن کے جی میں ہے

إِنِّىٓ إِذًا لَّمِنَ ٱلظَّٰلِمِينَ ﴿۳۱﴾

یہ کہوں تو میں بے انصاف ہوں

دولت کے خزانے نہیں مگر خیر سے خالی بھی نہیں:

کفار نے نوح علیہ السلام کو کہا تھا کہ تم ہمارے جیسے بشر ہو، جتھے اور دولت کے اعتبار سے بھی کچھ امتیاز نہیں رکھتے، اس کا جواب نہایت متانت وانصاف کے ساتھ دیتے ہیں کہ بیشک جیسا امتیاز تم دیکھنا چاہتے ہو اس کا ہم دعویٰ نہیں رکھتے، بلاشبہ میں ایک بشر ہوں، فرشتہ نہیں۔ نہ خدا نے اپنے سارے خزانے میرے تصرف واختیار میں دے دیئے ہیں، نہ تمام غیب کی باتوں پر مطلع کیا گیا ہوں، لیکن ان تمام باتوں کے اعتراف کے ساتھ تمہاری طرح یہ بھی نہ کہونگا کہ جو لوگ تمہاری نگاہ میں معیوب وحقیر ہیں (یعنی میں اور میرے رفقاء) ان کو خدا ہرگز کوئی خیر (بھلائی) نہیں دے سکتا۔ مثلاً ان میں سے کسی کو نبوت و حکمت عطا فرمادے اور باقیوں کو ایمان وعرفان کی دولت سے بہرہ ور کرے۔ خوب سمجھ لو حق تعالیٰ ان کے دلوں کی استعدادات وکیفیات کو پوری طرح جانتا ہے ہر ایک کی استعداد کے مناسب فیض پہنچاتا اور باطنی احوال وکیفیات کے موافق برتاؤ کرتا ہے۔ اس نے جو خاص مہربانی مجھ پر یا میرے ساتھیوں پر کی ہے، وہ تمہاری آنکھ سے پوشیدہ ہے۔ اگر میں یہ کہنے لگوں کہ جو تمہیں بظاہر شکستہ حال اور حقیر دکھائی دیتے ہیں، خدا تعالیٰ نے بھی جو بواطن کا جاننے والا ہے انہیں کوئی عزت وشرف نہیں بخشا تو نہایت بے اصول اور ناانصافی کی بات ہوگی۔ (تنبیہ) اس آیت کے ابتدائی تین جملے سورۂ ''انعام'' میں گزر چکے ہیں۔ وہاں کے فوائد دیکھ لئے جائیں۔ (تفسیر عثمانیؒ)

غریب ہیں مگر ایمان کی دولت رکھتے ہیں:

یعنی جن لوگوں کو ان کی مفلسی کی وجہ سے تم حقیر سمجھتے ہو اور ان کو رذیل کہتے ہو، چونکہ ظاہری ناداری اور مفلسی کو آنکھوں سے دیکھ کر وہ حقیر جانتے تھے۔ ان کے کمالات اور خصائل فاضلہ پر غور نہیں کرتے تھے۔ اس لئے حقیر جاننے کی نسبت آنکھوں کی طرف کلام کو پرزور بنانے کے لئے کردی (ورنہ آنکھوں کا کام حقیر جاننا نہیں۔ تحقیر ہو یا اعزاز اس کو جاننا انسان کے دماغ کا کام ہے) بلکہ دنیا میں اللہ نے ان کو ایمان و ہدایت کی جو توفیق عطا فرمادی اور آخرت میں جو بلندیٔ مرتبہ اور جنت عطا فرمائے گا وہ تمہارے اس دنیوی مال وجاہ سے بہتر ہے (پھر میں کیسے کہہ دوں کہ اللہ ان کو بھلائی نہیں عطا فرمائے گا)۔ (تفسیر مظہریؒ)

فرشتہ کیسے نبی ہوسکتا ہے:

اگر فرشتہ کو رسول بنا کر بھیج دیا جاتا تو انسانوں کو اس سے دین سیکھنا سخت مشکل ہو جاتا، کیونکہ فرشتہ کو تو نہ بھوک لگتی ہے نہ پیاس، نہ نیند آتی ہے نہ تکان ہوتا ہے، نہ اس کو انسانی ضروریات وحوائج پیش آتی ہیں وہ انسانوں کی اس کمزوری کا احساس کیسے کرتا، اور بغیر اس احساس کے انسان عمل میں اس کا اتباع کیسے کر سکتے۔

ہمیشہ غریب پیغمبروں کے پیروکار رہوئے ہیں:

زمان قدیم سے عادۃ اللہ یہی رہی ہے کہ پیغمبروں پر اوّل ایمان لانیوالے غرباء فقراء ہی ہوتے ہیں، اور پچھلی آسمانی کتابوں میں اس کی تصریحات بھی موجود ہیں، اسی وجہ سے جب ہرقل شاہِ روم کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نامۂ مبارک دعوتِ ایمان کے لئے پہنچا اور اس کو یہ فکر ہوئی کہ معاملہ کی تحقیق کرنے چونکہ اس نے تورات وانجیل میں انبیاء علیہم السلام کی علامات پڑھی ہوئی تھیں۔ اس لئے اس وقت عرب کے جو لوگ ملک شام میں آئے ہوئے تھے ان کو جمع کر کے ان علامات کے متعلق چند سوالات کئے۔

ان سوالات میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ان کا اتباع کرنے والے قوم کے کمزور اور غریب لوگ ہیں یا وہ جو قوم کے بڑے کہلاتے ہیں؟ ان لوگوں نے بتلایا کہ کمزور اور غریب لوگ ہیں۔ اس پر ہرقل نے اقرار کیا کہ یہ علامت تو سچے نبی ہونے کی ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کا اول اول اتباع کرنے والے یہی کمزور غریب لوگ ہوتے ہیں۔

حقیقی کمینہ کون ہے:

خلاصہ یہ ہے کہ غرباء وفقراء کو رذیل سمجھنا ان کی جہالت تھی، حقیقت میں رذیل تو وہ ہے جو اپنے پیدا کرنے والے اور پالنے والے مالک کو نہ پہچانے، اس کے احکام سے روگردانی کرے، اسی لئے سفیانِ ثوری رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ کمینہ اور رذیل کون ہے؟ تو فرمایا وہ لوگ جو بادشاہوں اور افسروں کی خوشامد میں لگے رہیں، اور ابن الاعرابی نے فرمایا کہ کمینہ وہ آدمی ہے جو اپنا دین بیچ کر دنیا کمائے۔ کسی نے پوچھا کہ سب سے زیادہ کمینہ کون ہے تو فرمایا وہ شخص جو اپنا دین برباد کر کے کسی دوسرے کی دنیا سنوارے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ کمینہ وہ شخص ہے جو صحابۂ کرامؓ کو برا کہے کیونکہ وہ پوری امت کے سب سے بڑے محسن ہیں جن کے ذریعہ دولتِ ایمان وشریعت ان کو پہنچی ہے۔ (معارف القرآن)

قَالُوا يَٰنُوحُ قَدْ جَٰدَلْتَنَا فَأَكْثَرْتَ جِدَٰلَنَا

بولے اے نوح تُو نے ہم سے جھگڑا کیا اور بہت جھگڑ چکا

فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ إِن كُنتَ مِنَ ٱلصَّٰدِقِينَ ﴿۳۲﴾

اب لے آ جو تو وعدہ کرتا ہے ہم سے اگر تو سچا ہے

کافروں کے پاس کوئی دلیل نہ رہی:

حضرت نوحؑ قبل از طوفان ساڑھے نو سو برس ان میں رہے۔ شب وروز

سراً و علانیۃً انہیں نصیحت کرتے ہر شبہ کا جواب دیتے، تبلیغ و تفہیم اور بحث و مناظرہ کا سلسلہ جاری رہتا۔ اسی جھگڑے میں صدیاں گزر گئیں کفار نے ان کی حقانی بحثوں اور شب و روز کی روک ٹوک سے عاجز ہو کر کہا کہ اب یہ سلسلہ بند کیجئے۔ بس اگر آپ سچے ہیں تو جس عذاب کی دھمکیاں دیتے رہے ہو، وہ فوراً لے آؤ تا کہ روز روز کا جھگڑا ختم ہو۔ (تفسیر عثمانی)

قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَمَآ
کہا کہ لائے گا تو اُس کو اللہ ہی اگر چاہے گا اور
اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿٣٣﴾
تم نہ تھکا سکو گے بھاگ کر

عذاب اللہ کے قبضہ میں ہے:

یعنی یہ چیز میرے قبضۂ قدرت میں نہیں۔ خدا جس وقت اپنی حکمت کے موافق چاہے گا عذاب نازل کر دے گا۔ ہمارا فرض صرف آگاہ کر دینا تھا۔ باقی عذاب تو ایسی ہولناک اور عظیم الشان چیز ہے، جس کا لے آنا اور دفع کرنا دونوں پہلو تو ائے بشریہ کے دائرہ سے خارج ہیں۔ جب مشیت الٰہی ہوگی تو کہیں بھاگ کر پناہ نہ لے سکو گے۔ ایسا کون ہے جو خدا کو (معاذ اللہ) تھکا کر عاجز کر سکے۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ
اور نہ کارگر ہوگی تم کو میری نصیحت جو چاہوں کہ تم کو نصیحت
لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ؕ
کروں اگر اللہ چاہتا ہو گا کہ تم کو گمراہ کرے وہی ہے رب
هُوَ رَبُّكُمْ ۫ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٣٤﴾ ؕ
تمہارا اور اُسی کی طرف لوٹ جاؤ گے

تم گواہی کے شیدائی ہو:

یعنی کفر پر اس قدر اصرار وضد اور انتہائی شوخ چشمی سے نزول عذاب کی استدعاء پتہ دیتی ہے کہ خدا کا ارادہ یہ ہی ہے کہ تم کو گمراہی میں پڑا رہنے دے اور آخر کار ہلاک کر دے۔ پس اگر تمہاری بدکرداری کے سبب سے خدا نے یہ ہی چاہا تو میں کتنا ہی نصیحت و خیر خواہی کر کے تم کو نفع پہنچانا چاہوں، کچھ نافع اور مؤثر نہ ہوگا۔ تمہارا رب وہ ہی ہے، جس کے ملک و تصرف میں ہر چیز ہے۔ جیسا جس کے ساتھ معاملہ کرے، کوئی روک نہیں سکتا۔ سب کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے وہ ہی سب کے اعمال کی جزاء و سزا دینے والا ہے (ربط)

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں "یہاں تک جتنے سوالات و اعتراضات اس قوم کے تھے، وہ ہی تھے حضرت کی قوم کے۔ گویا یہ سب جواب ان کو ملے۔ ایک ان کا نیا دعویٰ تھا، اسے آگے قصہ کے درمیان بیان فرماتے ہیں"۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ
کیا کہتے ہیں کہ بنا لایا قرآن کو

اہل مکہ کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر الزام:

یہ گفتگو کفار مکہ کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کہ قرآن آپ خود بنا لائے ہیں۔ خدا کا کلام نہیں ہے۔ حضرت نوح کتاب نہ لائے تھے جو ان کی قوم یہ بات کہتی۔ (کذافی الموضح) لیکن بعض مفسرین نے اس آیت کو بھی نوح کے قصہ کا جزو بتلایا ہے یعنی ان کی قوم نے کہا کہ جن باتوں کو نوح خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں وہ خود ان کی گھڑنت ہیں۔ بعض نے کہا کہ گفتگو تو اہل مکہ کی حضور سے ہے مگر اس کا تعلق خاص نوحؑ قصہ سے تھا۔ گویا وہ کہتے تھے کہ یہ داستان آپ نے جھوٹ بنالی ہے۔ واقع میں ان قصوں کی کوئی اصل نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَعَلَيَّ اِجْرَامِيْ وَاَنَا
کہدے اگر میں بنا لایا ہوں تو مجھ پر ہے میرا گناہ اور میرا
بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ ﴿٣٥﴾ ع
ذمہ نہیں جو تم گناہ کرتے ہو

الزام کا جواب:

قرآن کو "مفتریٰ" کہنے کا تحقیقی جواب اسی سورت میں ایک رکوع پہلے گزر چکا۔ یہاں آخری بات فرمائی یعنی قرآن کا کلام الٰہی ہونا نہایت واضح و محکم دلائل سے بار بار ثابت کیا جا چکا ہے۔ ایسی روشن چیز کی تکذیب کر کے جو گناہ تم سمیٹ رہے ہو اس کا وبال تم ہی پر پڑیگا۔ اس کی فکر کرو۔ میں کافی تبلیغ کر کے بری الذمہ ہو چکا ہوں۔ اب جو غلطیاں تم کرو اس کا میں ذمہ دار نہیں۔ ہاں بفرضِ محال اگر میں نے افتراء کیا ہو تو اس کا گناہ مجھ پر پڑ سکتا ہے۔ سو بحمد اللہ ایسا ہوا نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

لطائف و معارف

عارفِ رومی قدس سرہ السامی فرماتے ہیں:

اشقیاء را دیدہ بینا نبود نیک و بد در دیدہ شان یکساں نمود

بد بخت لوگ دل کی آنکھوں سے محروم تھے۔ اس لئے ان کی نظر میں نیک و بد یکساں دکھائی دیتے تھے۔

ہمسری با انبیاء برداشتند اولیاء را ہمچو خود پنداشتند

انبیاء کرام کی ہمسری کے مدعی تھے اور اولیاء کو اپنے برابر سمجھتے تھے۔

گفتہ اینک مابشر ایشان بشر ماوٗ ایشان بستۂ خوابیم و خور

اور یہ کہتے تھے کہ ہم بھی انسان ہیں اور انبیاء بھی انسان ہیں کھانے اور سونے کے دونوں پابند ہیں۔ پھر ہم میں اور ان میں فرق کیا رہا۔

ایں ندانستند ایشاں از عمیٰ ہست فرقے درمیان بے منتہی

اور کور باطنی سے یہ نہ سمجھا کہ دونوں میں بے انتہاء فرق ہے۔

ہر دو گون زنبور خوردند از محل لیک شدزاں نیش وزاں دیگر عسل

دونوں قسم کے زنبور (بھڑ) ایک ہی جگہ سے پھلوں کا رس چوستی ہیں مگر ایک زنبور سے ڈنک پیدا ہوتا ہے اور دوسرے زنبور سے شہد پیدا ہوتا ہے۔

ہر دو گون آہو گیا خوردند آب زیں یکے سرگین شدوزاں مشکناب

اس شعر میں ایک مثال ذکر کرتے ہیں کہ دونوں قسم کے ہرن ایک ہی قسم کے گھاس چرتے ہیں اور ایک ہی گھاٹ سے پانی پیتے ہیں لیکن ایک سے تو مینگنیاں بنتی ہیں اور دوسرے سے خالص مشک نکلتی ہے۔

ہر دو نے خوردند از یک آب خورد آں یکے خالی و آں پر از شکر

یہ تیسری مثال ہے کہ دونوں قسم کی نے ایک ہی گھاٹ سے سیراب ہوتے ہیں لیکن ایک کھوکھلی ہے اور دوسری شکر اور رس سے پر ہے۔

قوم یہ بات کہتی ہے، اس لئے یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ہے بطور جملۂ معترضہ کفار مکہ کے کلام کو درمیان قصۂ نوحؑ ذکر فرمایا یہاں تک جتنے سوالات اور جوابات ذکر کئے وہ سب قوم نوحؑ کے متعلق تھے۔ مگر کفار مکہ بھی یہی کہتے تھے اس لئے درمیان قصہ بطور جملۂ معترضہ کفار مکہ کا کلام ذکر کر دیا گیا۔ اب آگے پھر نوحؑ کا باقی قصہ ذکر ہوتا ہے۔ (معارف کاندھلویؒ)

وَاُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ
اور حکم ہوا طرف نوح کی کہ اب ایمان نہ لائے گا
قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ
تیری قوم میں مگر جو ایمان لا چکا سو غمگین نہ رہ اُن کاموں پر
بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿٣٦﴾
جو کر رہے ہیں

قومِ نوح کا آخری انجام:

جب قوم کی ایذائیں حد سے گزر گئیں تو نوح علیہ السلام نے سینکڑوں برس ظالموں کی زہرہ گداز جفائیں جھیلنے کے بعد خدا کے آگے شکوہ کیا "اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ" کہ میں مغلوب وضعیف ہوں، آپ ان سے بدلہ لیجئے۔ ارشاد ہوا کہ جن گنے چنے افراد کی قسمت میں ایمان لانا تھا، لا چکے۔ آئندہ ان میں کوئی ایمان لانیوالا نہیں ہے، لہٰذا اب آپ ان کی عداوت وتکذیب اور ایذاء رسانی سے زیادہ غمگین نہ رہیں۔ عنقریب خدا کی شمشیر انتقام بے نیام ہونے والی ہے جو سب شرارتوں اور شریروں کا خاتمہ کر ڈالے گی۔ (تفسیر عثمانی)

قوم کی طرف سے تکالیف:

محمد بن اسحاق نے عبید بن عمیر لیثی کی روایت سے لکھا ہے کہ قوم نوحؑ والے حضرت نوحؑ کو پکڑ کر پچھاڑ کر اتنا گلا گھونٹتے تھے کہ آپؑ بے ہوش ہو جاتے تھے۔ جب آپؑ کو ہوش آتا تو دعا کرتے الٰہی میری قوم کو معاف کر دے وہ نادان ہیں، جب قوم کی نافرمانی بڑھتی چلی گئی اور قوم کے ہاتھوں سے دکھ اور اذیت میں اضافہ مسلسل ہوتا رہا تو آپ ناامید ہو گئے۔ اور آئندہ نسل کا انتظار کرنے لگے کہ شاید ان کی اگلی نسل ہدایت یاب ہو جائے یونہی نسل درنسل چلتی گئی اور ہر پچھلا اگلے سے زیادہ خبیث ہوتا رہا اور پچھلے لوگ کہنے لگے یہ دیوانہ تو ہمارے باپ دادا کے زمانے سے چلا آتا ہے پاگل ہے وہ اس کو منہ نہیں لگاتے تھے۔ آخر حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ سے اپنا دکھ عرض کیا اور دعاء کی رَبِّ اِنِّيْ دَعَوْتُ قَوْمِيْ لَيْلًا وَّنَهَارًا اسی کلام کے آخر میں عرض کیا رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا اس وقت وحی آئی: وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا (تفسیر مظہریؒ)

بغوی نے بروایت ضحاک حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ نوحؑ کی قوم والے آپؑ کو اتنا مارتے تھے کہ آپؑ گر پڑتے تھے اور مردہ سمجھ کر لوگ لبادہ لپیٹ کر گھر ڈال جاتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ نوحؑ مر گئے لیکن دوسرے روز آپؑ پھر باہر آ کر لوگوں کو اللہ کی طرف آنے کی دعوت دیتے تھے۔ یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ ایک بوڑھا آدمی لاٹھی کے سہارے سے جا رہا تھا اس کا بیٹا ساتھ تھا۔ بیٹے سے اس نے کہا، میرے بیٹے اس دیوانے بوڑھے کے دھوکے میں نہ آ جانا، بیٹے نے کہا باپ مجھے لاٹھی دے دیجئے، باپ نے لاٹھی دے دی۔ بیٹے نے لاٹھی لے کر حضرت نوحؑ کے سر پر ماری اور آپؑ کو سخت زخمی کر دیا، اس پر حضرت نوحؑ کے پاس مندرجہ ذیل وحی آئی: وَاُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ اور نوحؑ کے پاس وحی بھیجی گئی کہ تمہاری قوم کے جو لوگ ایمان لا چکے (لا چکے) اور کوئی ایمان نہیں لائے گا۔ (تفسیر مظہریؒ)

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا
اور بنا کشتی رو برو ہمارے اور ہمارے حکم سے اور نہ

تُخَاطِبۡنِیۡ فِی الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا ۚ اِنَّہُمۡ
بات کر مجھ سے ظالموں کے حق میں یہ بیشک
مُّغۡرَقُوۡنَ ﴿۳۷﴾
غرق ہونگے

عذاب کی تیاری:

حق تعالیٰ نے نوح علیہ السلام سے فرمایا کہ ایک کشتی ہمارے روبرو (یعنی ہماری حفاظت ونگرانی میں) ہمارے حکم اور تعلیم والہام کے موافق تیار کرو۔ کیونکہ عنقریب پانی کا سخت خوفناک طوفان آنے والا ہے۔ جس میں یہ سب ظالمین ومکذبین یقیناً غرق کئے جائیںگے۔ ان کے حق میں اب یہ فیصلہ نافذ ہوکر رہے گا۔ آپ کسی ظالم کی سفارش وغیرہ کے لئے ہم سے کوئی بات نہ کریں۔ آنے والا عذاب بالکل اٹل ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب قوم لوط کے حق میں جھگڑنا شروع کیا تھا ان کو بھی اسی طرح کا ارشاد ہوا تھا۔ ''یٰۤاِبۡرٰہِیۡمُ اَعۡرِضۡ عَنۡ ہٰذَا ۚ اِنَّہٗ قَدۡ جَآءَ اَمۡرُ رَبِّکَ ۚ وَ اِنَّہُمۡ اٰتِیۡہِمۡ عَذَابٌ غَیۡرُ مَرۡدُوۡدٍ'' (ہود۔ رکوع ۷) (تفسیر عثمانی)

حضرت ابن عباس نے اعین کا ترجمہ کیا ہے نظر، آنکھ کو نگرانی اور حفاظت میں دوسرے تمام حواس سے زیادہ دخل ہے اس لئے نگرانی کو اعین (چشم) کے لفظ سے تعبیر کیا۔

کشتی بنانے کا حکم:

بغوی نے اس قصہ کے ذیل میں لکھا ہے کہ حضرت جبرئیلؑ نے حضرت نوحؑ سے آکر کہا آپ کا رب آپ کو کشتی بنانے کا حکم دے رہا ہے۔ نوحؑ نے کہا میں تو نجار (بڑھئی) نہیں ہوں کیسے بناؤں؟ جبرئیلؑ نے کہا آپ کا رب فرماتا ہے تو میری آنکھوں کے سامنے سے کشتی بنا (غلطی نہ ہوگی)۔ نوحؑ بنانے لگے اور ٹھیک بنانے لگے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ نے کشتی پرندہ کے سینہ کی شکل کی (یعنی سینہ ابھری ہوئی) بنائی۔

بغوی نے لکھا ہے اہل تورات کا خیال ہے کہ اللہ نے نوحؑ کو حکم دیا تھا کہ ساگوان یا سار کی لکڑی کی کشتی بنائیں جس کا سینہ آگے کو نکلا ہوا ہو اور کشتی کے اندر باہر ہر طرف روغن قار کا پالش کردیں، کشتی کی لمبائی اسی ہاتھ (یعنی آدھا گز مراد نہیں ہے) اور تین منزلیں بنائیں، نچلی، درمیانی اور بالائی اور بالائی منزل میں دریچے رکھیں۔ حضرت نوحؑ نے حکم کے مطابق کشتی بنائی۔ اسحاق بن بشر اور ابن عساکر نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ اللہ نے جب نوحؑ کو کشتی بنانے کا حکم دیا تو نوحؑ نے عرض کیا، میرے مالک تختے کہاں ہیں، اللہ نے فرمایا ساگوان یا سار کا درخت لگاؤ، نوحؑ نے سار کا درخت بویا۔ بیس برس تک وہ درخت پرورش پاتا رہا۔ اس مدت میں نہ حضرت نوحؑ نے تبلیغ کی نہ قوم والوں نے کوئی استہزاء کیا۔ جب درخت بھرپور ہوگیا تو اللہ کے حکم سے نوحؑ نے اس کو کاٹ کر خشک کیا اور عرض کیا اے میرے رب میں گھر (یعنی کشتی کی شکل) کیسے بناؤں؟ حکم ہوا اس کی تین شکلیں رکھو۔ اگلا سرا تو مرغ کے سر طرح ہو اور پچھلا حصہ بھی مرغ کی دم کی طرح اور سینہ پرندے کے سینہ کی طرح (آگے کو نکلا ہو) اور دونوں پہلوؤں پر دریچے ہوں اور لوہے کی کیلوں سے اس کو مضبوط کردیا گیا ہو، اللہ نے جبرئیلؑ کے ذریعہ نوحؑ کو کشتی بنانا سکھادی۔

ابن عساکر نے سعید بن مسیّب کی وساطت سے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص اور حضرت کعب کا بیان بھی یہی نقل کیا ہے۔

کشتی کی لمبائی چوڑائی:

عبد بن حمید اور ابن المنذر اور ابوالشیخ نے قتادہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ کشتی کی لمبائی تین سو ہاتھ اور چوڑائی پچاس ہاتھ اور اونچائی میں لمبائی تیس ہاتھ تھی۔ اس روایت میں اتنا زائد ہے۔ کہ عرض میں اس کا دروازہ تھا۔

شامی نے لکھا ہے کہ کشتی کا طول اسی ہاتھ اور عرض پچاس ہاتھ اور بلندی اوپر کو تیس ہاتھ۔ اور ہاتھ سے مراد (پنجہ سے) مونڈھے تک۔

کشتی بنانے کی مدت:

زید بن اسلم کا قول ہے کہ حضرت نوحؑ سو برس تک درخت بوتے اور (لکڑی) کاٹتے رہے اور سو برس تک کشتی بناتے رہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ چالیس برس تک درخت بوئے اور چالیس برس تک (ان کی لکڑی کو) خشک کرتے رہے۔ کعب احبار کا قول آیا ہے کہ نوحؑ نے تیس برس میں کشتی بنائی۔

کشتی کے درجے:

یہ بھی منقول ہے کہ کشتی کی تین منزلیں تھیں، نچلا درجہ چوپایوں اور جنگلی جانوروں کے لئے تھا، درمیانی منزل میں آدمی تھے اور بالائی طبقے میں پرندے، جب جانوروں کا گوبر زیادہ ہوگیا تو نوحؑ کے پاس وحی آئی ہاتھی کی دم دباؤ۔ دم دباتے ہیں ہاتھی کے اندر سے ایک سور اور سورنی نکل پڑی اور دونوں نے گوبر (کھاکر) صاف کردیا۔ چوہوں نے جب کشتی کو نقصان پہنچایا اور رسیاں کاٹنے لگے تو اللہ کی طرف سے نوحؑ کو حکم ہوا شیر کی دونوں آنکھوں کے درمیان ضرب لگاؤ، ضرب لگاتے ہی شیر کی ناک کے سوراخوں سے ایک بلی اور ایک بلا نکل پڑے اور دونوں چوہوں پر دوڑ پڑے۔ (تفسیر مظہری)

مؤمنین اور تمام ضروریات کشتی میں سوار کیں:

حضرت نوح علیہ السلام نے حکم کے مطابق کشتی بنائی، پھر جب طوفان کی ابتداء

کی علامات سامنے آگئیں کہ زمین سے پانی ابلنے لگا تو نوح علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ خود مع اپنے اہل وعیال کے اوران لوگوں کے جو آپ پر ایمان لائے ہیں اس کشتی میں سوار ہوجائیں۔اورانسانوں کی ضروریات جن جانوروں سے متعلق ہیں جیسے گائے ،بیل ،بکری ،گھوڑا ،گدھا وغیرہ ان کا بھی ایک ایک جوڑا کشتی میں سوار کرلیں ،حضرت نوح علیہ السلام نے حکم کے مطابق سب کو سوار کرلیا۔

تمام صنعتوں کی ابتداء:

تمام ضروری صنعتوں کی ابتداء وحی کے ذریعہ ہوئی۔

حافظ شمس الدین ذہبی کی الطب النبوی مین بعض سلف سے نقل کیا گیا ہے کہ انسان کے لئے جتنی صنعتوں کی ضرورت ہے ان سب کی ابتداء بذریعہ وحی الٰہی کسی پیغمبر کے ذریعہ عمل میں آئی ہے۔ پھر حسب ضرورت اس میں اضافے اور سہولتیں مختلف زمانوں میں ہوتی رہیں ،سب سے پہلے پیغمبر آدم علیہ السلام کی طرف جو وحی آئی ہے اس کا بیشتر حصہ زمین کی آبادکاری اور مختلف صنعتوں سے متعلق ہے ،بوجھ اٹھانے کے لئے پہیوں کے ذریعہ چلنے والی گاڑی کی ایجاد بھی اسی سلسلہ کی ایجادات میں سے ہے۔

کسی نے خوب کہا ہے کہ زمانے نے طرح طرح کی گاڑیاں ایجاد کرلیں لیکن مدارِ کار ہر قسم کی گاڑیوں کا دھرے اور پہیے پر ہی رہا۔وہ بیل گاڑی اور گدھا گاڑی سے لے کر ریلوں اور بہترین قسم کی موٹر گاڑیوں تک سب میں مشترک ہے۔اس لئے سب سے بڑا موجد گاڑیون کا وہ شخص ہے جس نے پہیہ ایجاد کیا کہ دنیا بھر کی ساری مشینری کی روح پہیہ ہی ہے۔اور معلوم ہو چکا کہ یہ ایجاد پیغمبر اول حضرت آدم علیہ السلام کے ہاتھوں بذریعہ وحی الٰہی عمل میں آئی ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا ہے اشیاء ضرورت کی صنعت کاری اتنی اہمیت رکھتی ہے کہ بطور وحی انبیاء علیہم السلام کو سکھائی گئی ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کو سفینہ سازی کی ہدایت دینے کے ساتھ یہ بھی فرمادیا کہ آپ کی قوم پر طوفان آئے گا ،وہ غرق ہونگے ،اس وقت آپ اپنی شفقت کی بناء پر ان کے بارے میں کوئی سفارش نہ کریں۔(معارف مفتی اعظمؒ)

وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ ۖ
اور وہ کشتی بناتا تھا

کہتے ہیں کشتی سالہا سال میں تیار کی۔ کشتی کیا تھی بڑا جہاز تھا ،جس میں الگ الگ درجے تھے۔مفسرین نے اس کی تفاصیل میں بہت سی مبالغہ آمیز اور عجیب و غریب روایات بیان کی ہیں جن میں اکثر اسرائیلیات ہیں۔(تفسیر عثمانیؒ)

وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَأٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا
اور جب گذرتے اُس پر سردار اُس کی قوم کے

مِنْهُ ۭ
ہنسی کرتے اُس سے

قوم کی مذاق بازی:

کہ دیکھو! پیغمبر سے بڑھئی بن گئے۔کبھی ایک عجیب سی چیز دیکھ کر نوح علیہ السلام سے پوچھتے کہ یہ کیا بناتے ہو؟ آپ فرمادیتے کہ ایک گھر بناتا ہوں جو پانی پر چلے گا اور ڈوبنے سے بچائے گا۔وہ سن کر ہنسی اڑاتے کہ خشک زمین پر ڈوبنے کا بچاؤ کر رہے ہیں۔(تفسیر عثمانیؒ)

قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ
بولا اگر تم ہنستے ہو ہم سے تو ہم ہنستے ہیں
كَمَا تَسْخَرُوْنَ ۝۳۸ ۭ
تم سے جیسے تم ہنستے ہو

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں ،’’ وہ ہنستے تھے کہ خشک زمین پر غرق کا بچاؤ کرتا ہے۔ یہ ہنستے تھے اس پر کہ موت سر پر کھڑی ہے اور یہ ہنستے ہیں‘‘۔اسی تفسیر کے موافق مترجم محققؒ نے فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ الخ کا ترجمہ بصیغۂ حال کیا ہے۔ابن کثیرؒ وغیرہ نَسْخَرُ مِنْكُمْ ‘‘ میں استقبال کے معنی مراد لیتے ہیں۔یعنی آج تم ہمیں احمق بناتے اور ہنستے ہو ،لیکن وہ زمانہ قریب ہے کہ اس کے جواب میں تمہاری حماقت وسفاہت پر ہم کو ہنسنے کا موقع ملے گا۔ جب تم اپنے جرائم کی پاداش میں سزایاب ہوگے۔(تفسیر عثمانیؒ)

فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ
اب جلد جان لو گے کہ کس پر آتا ہے عذاب
يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۝۳۹
کہ رسوا کرے اُس کو اور اُترتا ہے اُس پر عذاب دائمی

عذاب آنے والا ہے:

یعنی اب زیادہ تاخیر نہیں۔جلد آشکارا ہوجائے گا ،کہ دنیا کا رسوا کن اور آخرت کا دائمی عذاب کس پر نازل ہوتا ہے؟(تفسیر عثمانیؒ)

قوم نوحؑ نے جب عذابوں کی جلدی مچائی تو آپ نے خدا سے دعا کی کہ خدایا زمین پر کسی کافر کو رہتا بستا نہ چھوڑ۔ پروردگار میں عاجز آ گیا ہوں تو میری مدد کر۔اسی وقت وحی آئی کہ جو ایمان لاچکے ہیں ان کے سوا اور کوئی اب ایمان نہ لائے گا۔تو ان پر افسوس نہ کر ،نہ ان کا کوئی ایسا خاص خیال کر۔ ہمارے

دیکھتے ہماری تعلیم کے مطابق ایک کشتی تیار کر اور اب ظالموں کے بارے میں ہم سے کوئی بات چیت نہ کر۔ ہم ان کا ڈبو دینا مقرر کر چکے۔ بعض سلف کہتے ہیں حکم ہوا کہ لکڑیاں کاٹ کر سکھا کر تختے بنا لو اس میں ایک سو سال گزر گئے پھر مکمل تیاری میں سو سال اور نکل گئے۔ ایک قول ہے چالیس سال لگے، واللہ اعلم۔ امام محمد بن اسحاق توراۃ سے نقل کرتے ہیں کہ ساگ کی لکڑی کی یہ کشتی تیار ہوئی۔ اس کا طول اسی ہاتھ تھا اور عرض پچاس ہاتھ کا تھا۔ اندر باہر سے روغن کیا گیا تھا۔ پانی کاٹنے کے پر پرزے بھی تھے۔ قتادہؒ کا قول ہے کہ لمبائی تین سو ہاتھ کی تھی۔ ابن عباسؓ کا فرمان ہے کہ طول بارہ سو ہاتھ کا تھا اور چوڑائی چھ سو ہاتھ کی تھی۔ واللہ اعلم۔ اس کی اندرونی اونچائی تیس ہاتھ کی تھی اس میں تین درجے تھے۔ ہر درجہ دس ہاتھ اونچا تھا۔ سب سے نیچے کے حصے میں چوپائے اور جنگلی جانور تھے۔ درمیان کے حصے میں انسان تھے۔ اوپر کے حصے میں پرندے تھے۔ دروازہ چوڑان میں تھا، اوپر سے بالکل بند تھی۔

کشتی کے بارے میں مُردوں کے بیانات:

ابن جریرؒ نے ایک غریب اثر عبداللہ بن عباسؓ سے ذکر کیا ہے کہ حواریوں نے حضرت عیسیٰ بن مریمؑ سے درخواست کی کہ اگر آپ بحکم خدا کسی ایسے مردے کو جلاتے جس نے کشتی نوحؑ دیکھی ہو تو ہمیں اس سے معلومات حاصل ہوتیں۔ آپؑ انہیں لے کر چلے، ایک ٹیلے پر پہنچ کر وہاں کی مٹی اٹھائی اور فرمایا جانتے ہو یہ کون ہے؟ انہوں نے کہا کہ اللہ اور اس کے رسول کی ہی علم ہے۔ آپؑ نے فرمایا یہ پنڈلی ہے حام بن نوحؑ کی۔ پھر آپؑ نے اپنی لکڑی اس ٹیلے پر مار کر فرمایا اللہ تعالیٰ کے حکم سے اٹھ کھڑا ہو۔ اسی وقت ایک بڈھا سا آدمی اپنے سر سے مٹی جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ آپؑ نے اس سے پوچھا کیا تو بڑھاپے میں مرا تھا۔ اس نے کہا نہیں مرا تو تھا جوانی میں لیکن اب دل پر یہ دہشت بیٹھی کہ قیامت قائم ہوگئی اس دہشت نے بوڑھا کر دیا۔ آپؑ نے فرمایا کہ اچھا (حضرت) نوحؑ کی کشتی کی بابت اپنی معلومات بیان کرو۔ اس نے کہا وہ بارہ سو ہاتھ لمبی اور چھ سو ہاتھ چوڑی تھی۔ تین درجوں کی تھی ایک میں جانور اور چوپائے تھے، دوسرے میں انسان، تیسرے میں پرند۔ جب جانوروں کا گوبر پھیل گیا تو اللہ تعالیٰ نے (حضرت) نوحؑ کی طرف وحی بھیجی کہ ہاتھی کی دم ہلاؤ۔ آپؑ کے ہلاتے ہی اس سے خنزیر نر مادہ نکل آئے اور میلا کھانے لگے۔ چوہوں نے جب اس کے تختے کترنے شروع کئے تو حکم ہوا کہ شیر کی پیشانی پر انگلی لگا۔ اس سے بلی کا جوڑا نکلا اور چوہوں کی طرف لپکا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے سوال کیا کہ (حضرت) نوح علیہ السلام کو شہروں کے غرقِ آب ہونے کا علم کیسے ہوگیا۔ آپ نے فرمایا کہ انہوں نے کوے کو خبر لینے کے لئے بھیجا لیکن وہ ایک لاش پر بیٹھ گیا۔ دیر تک نہ آیا۔ آپؑ نے اس کے لئے ہمیشہ ڈرتے رہنے کی بددعا کی۔ اسی لئے وہ گھروں سے مانوس نہیں ہوتا۔ پھر آپؑ نے کبوتر کو بھیجا وہ اپنی چونچ میں زیتون کے درخت کا پتہ لے کر آیا اور اپنے پنجوں میں خشک مٹی لایا، اس سے معلوم ہوگیا کہ شہر ڈوب چکے ہیں۔ آپؑ نے اس کی گردن میں خصرہ کا طوق ڈال دیا اور اس کے لئے امن وانس کی دعا کی۔ پس وہ گھروں میں رہتا سہتا ہے۔ حواریوں نے کہا کہ اے رسول اللہ! آپ انہیں ہمارے ہاں لے چلئے کہ ہم میں بیٹھ کر اور بھی باتیں ہمیں سنائیں۔ آپؑ نے فرمایا یہ تمہارے ساتھ کیسے آسکتا ہے جب کہ اس کی روزی نہیں۔ پھر فرمایا اللہ کے حکم سے جیسا تھا ویسا ہی ہو جا۔ وہ اسی وقت مٹی ہوگیا۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ
یہاں تک کہ جب پہنچا حکم ہمارا اور جوش مارا تنور نے

عذاب کی ابتداء:

یعنی نوح علیہ السلام کشتی تیار کرتے رہے یہاں تک کہ وعدہ کے موافق خدا کا حکم پہنچ گیا "بادلوں" کو کہ برس پڑیں اور زمین کو کہ ابل پڑے، اور فرشتوں کو کہ تعذیب وغیرہ کے متعلق اپنے فرائض منصبی کا سرانجام کریں۔ آخر اوپر سے بارش آئی اور نیچے زمین کی سطح سے چشموں کی طرح جوش مار کر پانی ابلنے لگا۔ حتیٰ کہ روٹی پکانے کے تنوروں میں بھی جہاں آگ بھری ہوتی ہے، پانی ابل پڑا۔

تنور کہاں ہے اور کہاں تھا:

(تنبیہ) "تنور" کے معنی میں اختلاف ہے۔ بعض مطلق روٹی پکانے کا تنور مراد لیتے ہیں، بعض کہتے ہیں کہ ایک تنور حضرت حواء سے منتقل ہوتے ہوتے حضرت نوح علیہ السلام کے پاس پہنچا تھا، وہ ان کے گھر میں طوفان کا نشان ٹھہرایا گیا تھا۔ کہ جب اس سے پانی ابلے کشتی میں سوار ہو جاؤ۔ بعض کے نزدیک تنور کوئی خاص چشمہ "کوفہ" یا "جزیرہ" میں تھا۔ بعض نے دعویٰ کیا ہے کہ "تنور" صبح کے اجالے اور روشنی کو کہا ہے۔ یعنی صبح کی روشنی خوب چمکنے لگے۔ ابوحیان کہتے ہیں کہ "فَارَ التَّنُّوْرُ" ممکن ہے "ظہور عذاب" اور "شدتِ ہول" سے کنایہ ہو۔ جیسے "حمی الوطیس" "شدتِ حرب کنایہ ہے۔ ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ "تنور" کے معنی وجہ ارض (سطح زمین) کے ہیں۔ ہم نے اوپر جو تفسیر کی مقدم اسی معنی کو رکھا گیا ہے، اشارہ بعض دوسرے معانی کی طرف بھی کر دیا۔ حافظ ابن کثیر یہ ہی تفسیر لکھنے کے بعد فرماتے ہیں، وہذا قول جمہور السلف وعلماء الخلف۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانیؒ)

صورت اس طرح ہوئی کہ حضرت نوحؑ سے کہا گیا جب تم روئے زمین پر پانی ابلتا دیکھو تو کشتی میں سوار ہو جانا۔ عبد بن حمید، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے قتادہ کا قول نقل کیا ہے کہ آیت میں تنور سے مراد ہے زمین کا اونچا بلند

حصہ۔ ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ کی طرف اس قول کی نسبت کی ہے کہ آیت میں عین الوردہ مراد ہے جو جزیرہ میں ایک چشمہ تھا۔

ایک روایت میں حضرت علی کا قول آیا ہے کہ فار التنور کا مطلب یہ ہے کہ فجر نکل گئی اور صبح کی روشنی ہوگئی۔ حسن مجاہد اور شعبی نے تنور سے مراد یہی تنور بتائی ہے جس میں روٹی پکائی جاتی ہے۔ اکثر مفسرین کا یہی قول ہے۔ بروایت عطیہ حضرت ابن عباسؓ کا بھی یہی قول آیا ہے۔

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عباس نے آیت کا مطلب اس طرح فرمایا جب تم اپنے گھر کے تنور سے پانی نکلتا دیکھو تو سمجھ لو یہ تمہاری قوم کا پیامِ ہلاکت ہے۔ حسن نے کہا پتھروں سے بنا ہوا ایک تنور تھا جس میں حضرت حواء روٹی پکایا کرتی تھی۔ (وراثۃً) وہ حضرت نوحؑ کے پاس پہنچ گیا اور آپ کو حکم ہوا کہ جب تنور سے پانی ابلتا دیکھو تو تم اپنے ساتھیوں کو لے کر سوار ہو جانا۔

یہ تنور کہاں تھا۔ مجاہد اور شعبی نے کہا کہ کوفہ کے ایک کنارہ پر تھا۔ شعبی نے اللہ کی قسم کھا کر کہا تنور کوفہ کے کنارہ سے ہی جوش زن ہوا تھا۔ نوحؑ نے کوفہ کی مسجد کے اندر ہی کشتی تیار کی تھی اور باب کندہ کی جانب سے مسجد میں داخل ہو نے والے کے دائیں جانب وہ تنور تھا اور تنور سے پانی کا ابلنا حضرت نوحؑ کے لئے (طوفان آب کی) کی علامت تھی۔

ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے حضرت علی بن ابی طالب کا قول نقل کیا ہے کہ مسجد کوفہ کے اندر باب کندہ کی جانب سے تنور ابلا تھا۔ ابوالشیخ نے باسناد شعبی نقل کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا قسم ہے اس کی جس نے دانہ کو چیرا اور جاندار کو پیدا کیا کہ یہ مسجد مسلمانوں کی چار مسجدوں میں چوتھی مسجد ہے اور سوائے مسجد حرام (کعبہ) اور مسجد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسری کسی مسجد میں دس رکعت نماز پڑھنے سے اس مسجد میں دو رکعت پڑھنا مجھے زیادہ عزیز ہے۔ اسی کے دائیں جانب قبلہ کی طرف تنور ابلا تھا۔

مقاتل نے کہا یہ حضرت آدم والا تنور تھا اور شام میں اسی جگہ واقع تھا جس کو عَیْنُ وردہ کہا جاتا ہے۔ ایک روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا قول آیا ہے کہ یہ تنور ہند میں تھا (معلوم نہیں ہند سے مراد ہندوستان ہے یا وہ مقام جو عراق میں ہے)۔ یہ قول ابن جریر اور ابن المنذر اور ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ اور حاکم نے نقل کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔

بعض نے فرمایا کہ حضرت آدم علیہ السلام کا تنور مقام ''عین وردہ'' ملکِ شام میں تھا وہ مراد ہے، اس سے پانی نکلنے لگا، بعض نے فرمایا حضرت نوح علیہ السلام کا اپنا تنور کوفہ میں تھا، وہ مراد ہے۔ اکثر مفسرین حضرت حسنؒ، مجاہدؒ، شعبیؒ حضرت عبداللہ بن عباسؓ وغیرہم نے اسی کو اختیار فرمایا ہے۔

اور شعبیؒ تو قسم کھا کر کہا کرتے تھے کہ یہ تنور شہر کوفہ کے ایک گوشہ میں تھا اور یہ کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی کشتی مسجد کوفہ کے اندر بنائی تھی، اسی مسجد کے دروازہ پر یہ تنور تھا، حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام سے فرمایا تھا کہ آپ یہ دیکھیں کہ آپ کے گھر کے تنور سے پانی ابلنے لگا تو سمجھ لیں کہ طوفان آ گیا۔ (قرطبی، مظہری، معارف مفتی اعظمؒ)

قُلْنَا احْمِلْ فِيهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ
کہا ہم نے چڑھا لے کشتی میں ہر قسم سے
اثْنَيْنِ
جوڑا دو عدد

ہر چیز کا ایک جوڑا لے لو:

یعنی جن جانوروں کی ضرورت ہے، اور نسل باقی رہنی مقدر ہے ان میں سے ایک ایک جوڑا (نر اور مادہ دونوں) لے کر کشتی پر سوار کر لو۔ (تفسیر عثمانی)

بغوی نے اسی قصے کے ذیل میں بیان کیا ہے کہ حضرت نوحؑ نے عرض کیا پروردگار میں ہر ایک کا جوڑا کس طرح لوں، اللہ نے آپ کے سامنے درندوں اور پرندوں کو جمع کر دیا اور آپ نے اپنے دونوں ہاتھ ان پر مارے، دایاں ہاتھ نر پر پڑا اور بایاں ہاتھ مادہ پر اس طرح ایک نر اور ایک مادہ آپ کے ہاتھ میں آ گیا اور آپ نے ان کو کشتی میں سوار کر لیا۔

ایک روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا قول آیا ہے کہ کشتی میں کل اسی مرد تھے جن میں سے ایک جرہم بھی تھا۔ ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابو الشیخ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ نوحؑ نے اپنے ساتھ اسی آدمیوں کو سوار کر لیا تھا اور آپ کی زبان عربی تھی۔

کشتی میں شیطان کا داخلہ:

یہ بھی حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ سب سے پہلے حضرت نوحؑ نے کشتی میں چھوٹی چیونٹی کو لیا اور سب سے آخر میں گدھے کو۔ گدھا داخل ہونے لگا اور اس کا سینہ اندر آ گیا تو ابلیس اس کی دم سے لٹک گیا جس کی وجہ سے اس کی ٹانگیں اٹھ نہ سکیں۔ حضرت نوحؑ نے فرمایا ارے اندر آ جا، گدھا اٹھا مگر اٹھ نہ سکا۔ حضرت نے فرمایا ارے اندر آ جا خواہ شیطان ہی تیرے ساتھ ہو۔ یہ لفظ بیساختگی میں آپ کی زبان سے نکل گیا۔ ان الفاظ کو سنتے ہی شیطان نے گدھے کا راستہ چھوڑ دیا۔ گدھا اندر آ گیا اور شیطان بھی اس کے ساتھ ہی داخل ہو گیا۔ حضرت نوحؑ نے فرمایا دشمن خدا تجھے کس نے داخل کیا۔ شیطان نے کہا آپ نے (گدھے سے) نہیں فرمایا تھا کہ اندر آ جا خواہ شیطان ہی تیرے ساتھ ہو۔ آپ نے فرمایا دشمنِ خدا نکل جا۔ شیطان نے کہا اب تو مجھے اپنے ساتھ سوار کرنے کے بغیر آپ کے لئے کوئی

چارہ نہیں۔لوگوں کا خیال ہے شیطان کشتی کی پشت پر تھا۔

سانپ اور بچھو:

بعض اہل روایت کا خیال ہے کہ سانپ اور بچھو حضرت نوحؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا ہمیں بھی چڑھا لیجئے۔حضرت نے فرمایا تم ضرر رساں اور سبب مصیبت ہو، میں تم کو نہیں چڑھاؤں گا، کہنے لگے آپ ہمیں چڑھا لیجئے ہم ذمہ دار ہیں کہ جو بھی آپ کا ذکر کرے گا ہم اس کو ضرر نہیں پہنچائیں گے۔چنانچہ جس نے سانپ بچھو کے ضرر کے خوف سے سَلٰمٌ عَلٰی نُوْحٍ فِی الْعٰلَمِیْنَ پڑھا اس کو سانپ اور بچھو نے کوئی ضرر نہیں پہنچایا۔

کشتی میں تمام جانور نہیں تھے:

حسن کا قول ہے کہ حضرت نوحؑ نے کشتی میں صرف ان جانوروں کو چڑھایا تھا جو بچہ یا انڈا دیتے ہیں جو کیچڑ سے پیدا ہیں جیسے مچھر، پسو وغیرہ ان کو کشتی میں سوار نہیں کیا تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ کشتی نوحؑ میں ساری دنیا بھر کے جانور جمع نہیں کیے گئے تھے بلکہ صرف وہ جانور جو نر و مادہ کے جوڑے سے پیدا ہوتے ہیں اور پانی میں زندہ نہیں رہ سکتے۔اس لئے تمام دریائی جانور اس سے نکل گئے اور خشکی کے جانوروں میں بھی بغیر نر و مادہ کے پیدا ہونے والے حشرات الارض سب نکل گئے صرف پالتو جانور گائے، بیل بھینس، بکری وغیرہ رہ گئے۔(تفسیر مظہری)

کشتی والوں کی تعداد:

کشتی والوں کی صحیح تعداد قرآن وحدیث میں متعین نہیں کی گئی، حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے منقول ہے کہ تعداد کل اسی آدمیوں کی تھی جن میں حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹے سام، حام، یافث اور ان کی تین بیبیاں تھیں، چوتھا بیٹا کفار کے ساتھ رہ کر طوفان میں غرق ہوا۔(معارف القرآن)

وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ
اور اپنے گھر کے لوگ مگر جس پر پہلے ہو چکا ہے حکم

یعنی مقدر ہو چکا ہے کہ وہ ظالموں کے زمرہ میں داخل ہونے کی وجہ سے غرق کئے جائینگے۔ "وَلَا تُخَاطِبْنِیْ فِی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ" اس سے مراد ہے نوحؑ کا بیٹا "یام" جس کا لقب کنعان تھا اور کنعان کی والدہ "واعلہ" گھر والوں میں سے یہ دونوں علیحدہ رہے اور غرق ہوئے۔(تفسیر عثمانی)

وَمَنْ اٰمَنَ ؕ وَمَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴿۴۰﴾
اور سب ایمان والوں کو اور ایمان نہ لائے تھے اُس کے ساتھ مگر تھوڑے

یعنی اسی مرد کم وبیش۔(تفسیر عثمانی)

حضرت نوحؑ کی بیوی اور بیٹا:

حضرت نوحؑ کو حکم ہوا کہ اپنے گھر والوں کو بھی اپنے ساتھ کشتی میں بٹھا لو مگر ان میں سے جو ایمان نہیں لائے انہیں ساتھ نہ لینا۔آپؑ کا لڑکا یام بھی انہی کافروں میں تھا، وہ الگ ہو گیا یا آپؑ کی بیوی کہ وہ بھی اللہ کے رسولؑ کی منکر تھی۔ اور تیری قوم کے تمام مسلمانوں کو بھی اپنے ساتھ بٹھا لے۔لیکن ان مسلمانوں کی تعداد بہت ہی کم تھی۔ساڑھے نو سو سال کے قیام کی طویل مدت میں آپؑ پر بہت ہی کم لوگ ایمان لائے تھے۔ابن عباسؓ فرماتے ہیں کل اسی آدمی تھے جن میں عورتیں بھی تھیں۔کعب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں بہتر ۷۲ شخص تھے۔(تفسیر ابن کثیر)

وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا
اور بولا سوار ہو جاؤ اس میں اللہ کے نام سے ہے
وَمُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّیْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۴۱﴾
اُس کا چلنا اور ٹھہرنا تحقیق میرا رب ہے بخشنے والا مہربان

کشتی پر سوار ہونے کا ادب:

نوح علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں کو فرمایا کہ بنام خدا کشتی پر سوار ہو جاؤ، کچھ فکر مت کرو اس کا چلنا اور ٹھہرنا سب خدا کے اذن وحکم اور اس کے نام کی برکت سے ہے۔غرقابی کا کوئی اندیشہ نہیں۔میرا پروردگار مومنین کی کوتاہیوں کو معاف کرنے والا اور ان پر بے حد مہربان ہے۔وہ اپنے فضل سے ہم کو صحیح سلامت اتارے گا۔اس آیت سے نکلتا ہے کہ کشتی وغیرہ پر سوار ہوتے وقت "بسم اللہ" کہنا چاہئے۔(تفسیر عثمانی)

بغوی نے ضحاک کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے جب ارادہ کیا کہ کشتی روانہ ہو جائے تو بسم اللہ کہا کشتی چل دی اور جب کشتی کو ٹھیرانا چاہا تو بسم اللہ کہا کشتی ٹھیر گئی۔(تفسیر مظہری)

ہر سواری کا چلنا،ٹھہرنا اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہے:

انسان اگر ذرا بھی غور سے کام لے تو اسے معلوم ہوگا کہ کشتی ہو یا خشکی پر چلنے والی کوئی سواری، نہ اس کا پیدا کرنا بنانا اس کی قدرت میں ہے نہ چلانا اور ٹھہرنا اس کے بس کا ہے، انسان اپنی سطحی اور سرسری نظر کی بناء پر سمجھتا ہے کہ میں نے اس کو بنایا اور چلایا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ نہ اس نے وہ لوہا، لکڑی پیتل، المونیم وغیرہ پیدا کئے ہیں جو ان تمام سواریوں کا خام مادہ ہے اور نہ اس کے بس میں ہے کہ ایک تولہ لوہا یا ایک فٹ لکڑی پیدا کر سکے، پھر ان خام اجناس (میٹریل) سے طرح طرح کے کل پرزے بنانے کی عقل وفہم کس نے دی؟ کیا یہ عقل وفہم انسان نے خود پیدا کر لی ہے؟ اگر خود پیدا کر لینا انسان کے

بس میں ہوتا تو دنیا میں کوئی بے وقوف کم عقل نہ رہنا، ہر شخص افلاطون وارسطو ہی بن کر رہتا، کہیں کی لکڑی، کہیں کا لوہا، کہیں کے آلات واوزار استعمال کر کے سواری کا ڈھانچہ بھی بن گیا، اب اس منوں اورٹنوں کیھاری بوجھ کو لے کر زمین پر دوڑنے یا ہوا پراڑنے کے لئے جس طاقت (پاور) کی ضرورت ہے وہ خواہ پیٹرول سے حاصل کی جائے یا ہوا اور پانی کے ٹکراؤ سے برقی صورت میں حاصل کی جائے، بہر حال سوچنے کی بات یہ ہے کہ ان میں سے انسان نے کس چیز کو پیدا کیا ہے، پیٹرول اس نے پیدا کیا یا ہوا، پانی اس نے بنایا، ان میں آکسیجن، ہائیڈروجن کی طاقتیں اس نے پیدا کیں؟

انسان کی غفلت:

اگر انسان ذرا بھی عقل سے کام لے تو اس کو سائنس کی اعجوبہ کاری اور عروج کے اس زمانہ میں بھی اپنی بے بسی اور عاجزی ہی کا مشاہدہ ہوگا، اور اس اقرار کے بغیر نہ رہ سکے گا کہ ہر سواری کا چلنا اور رکنا سب خالق کائنات حق تعالیٰ کے قبضہ میں ہے۔

غافل انسان اپنے ظاہری جوڑ توڑ کے تصرفات جن کا دوسرا نام سائنسی ایجادات ہے ان پر فخر وغرور کے نشہ میں ایسا مست ہو جاتا ہے کہ اصل حقیقت نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کے ذریعہ اس غفلت کا پردہ چاک کرتے ہیں اور بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا کی اصل حقیت سامنے کر دیتے ہیں، دیکھنے میں تو یہ ایک دو لفظی فقرہ ہے مگر غور کیجئے تو یہ کلید اور کنجی ہے ایک ایسے دروازہ کی جہاں سے انسان اس مادہ دنیا میں رہتے ہوئے روحانی عالم کا باشندہ بن جاتا ہے، اور کائنات کے ذرہ ذرہ میں جمال حق تعالیٰ کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے۔

یہیں سے مومن کی دنیا اور کافر کی دنیا میں فرق نمایاں ہو جاتا ہے، سواری پر دونوں سوار ہوتے ہیں لیکن مومن کا قدم جو سواری پر آتا ہے وہ اس کو صرف زمین کی مسافت قطع نہیں کراتا، بلکہ عالم بالا سے بھی روشناس کر دیتا ہے۔ (معارف القرآن)

وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ
اور وہ لئے جا رہی تھی اُن کو لہروں میں جیسے پہاڑ
وَنَادٰى نُوْحُ ِابْنَهٗ وَكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ
اور پکارا نوح نے اپنے بیٹے کو اور وہ ہو رہا تھا کنارے اے بیٹے
ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٤٢﴾
سوار ہو جا ساتھ ہمارے اور مت رہ ساتھ کافروں کے

حضرت نوحؑ نے بیٹے کو دعوت دی:

یعنی کشتی پہاڑ جیسی موجوں کو چیرتی پھاڑتی بے خوف وخطر چلی جا رہی تھی۔ سوار ہونے کے بعد نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے ''یام'' (کنعان) کو جو اپنے باپ بھائی وغیرہ سارے کنبہ سے کنارے ہو کر کافروں کی صحبت میں تھا، آواز دی کہ ان بدبخت کافروں کی معیت چھوڑ کر ہمارے ساتھ سوار ہو جا! تا اس مصیبت عظمیٰ سے نجات پا سکے۔ (تنبیہ) یا تو نوح علیہ السلام اسے مومن خیال کرتے تھے، اس لئے آواز دی خواہ واقع میں مومن نہ ہو یا کافر جانتے ہو مگر یہ توقع ہوگی کہ ان ہولناک نشانات کو دیکھ کر مسلمان ہو جائے گا۔ یا ''واھلک'' کے عموم میں داخل سمجھ کر شفقت پدری کے جوش میں سے ایسا کیا ہو، اور '' اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ '' کو مجمل ہونے کی وجہ سے اس پر منطبق نہ سمجھتے ہوں۔ واللہ اعلم

قَالَ سَاٰوِيْٓ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ
بولا جا لگوں گا کسی پہاڑ کو جو بچالے گا
الْمَآءِ ؕ
مجھ کو پانی سے

بیٹے کی نادانی:

وہ اپنے جہل وغباوت سے ابھی یہ خیال کر رہا تھا کہ جس طرح معمولی سیلابوں میں بعض اوقات کسی بلندی پر چڑھ کر آدمی جان بچالیتا ہے، میں بھی کسی اونچے پہاڑ پر چڑھ کر جان بچالوں گا۔ (تفسیر عثمانی)

قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا
کہا کوئی بچانے والا نہیں آج اللہ کے حکم سے
مَنْ رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ
مگر جس پر وہی رحم کرے اور حائل ہوگئی دونوں میں موج
مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ﴿٤٣﴾
پھر ہو گیا ڈوبنے والوں میں

کوئی پہاڑ عذاب سے نہیں بچا سکتا:

یعنی کس خبط میں پڑا ہے۔ یہ معمولی سیلاب نہیں۔ عذاب الٰہی کا طوفان ہے۔ پہاڑ کی کیا حقیقت کوئی چیز آج عذاب سے نہیں بچا سکتی ہاں خدا ہی کسی

پر رحم کرے تو بچ سکتا ہے مگر اس ہنگامہ دار و گیر اور مقام انتقام میں کٹر مجرموں پر رحم کیسا؟ باپ بیٹے کی یہ گفتگو پوری نہ ہوئی تھی کہ پانی کی ایک موج نے درمیان میں حائل ہو کر ہمیشہ کے لئے دونوں کو جدا کر دیا۔ (تفسیر عثمانی)

ڈوبنے سے بچنے کی دُعاء:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں میری امت کے لئے ڈوبنے سے بچاؤ انکے اس قول میں ہے کہ سوار ہوتے ہوئے کہہ لیں، بسم الله الملك وما قدروا الله حق قدره اور بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا اِنَّ رَبِّىْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ اس دعا کے آخر میں خدا کا وصف غفور رحیم اسلئے لائے کہ کافروں کی سزا کے مقابلہ میں مؤمنوں پر رحمت وشفقت کا اظہار ہو۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

وَقِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِىْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ
اور حکم آیا اے زمین نگل جا اپنا پانی اور اے
اَقْلِعِىْ وَغِيْضَ الْمَآءُ وَقُضِىَ الْاَمْرُ
آسمان تھم جا اور سُکھا دیا گیا پانی اور ہو چکا کام
وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِىِّ وَقِيْلَ بُعْدًا
اور کشتی ٹھہری جودی پہاڑ پر اور حکم ہوا کہ
لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾
دُور ہو قوم ظالم

زمین وآسمان کو تھم جانے کا حکم:

ایک مدت تک اس قدر پانی برسا گویا آسمان کے دہانے کھل گئے اور زمین کے پردے پھٹ پڑے۔ درخت اور پہاڑیاں تک پانی میں چھپ گئیں۔ اصحاب سفینہ کے سوا تمام لوگ جن کے حق میں نوح علیہ السلام نے دعا کی کی تھی، "رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا" (نوح، رکوع ۲) اس وقت خداوند قدوس نے زمین کو حکم دیا کہ اپنا پانی نگل جا! اور بادل کو فرمایا کہ تھم جا! پھر کیا مجال تھی کہ دونوں اس کے امتثال حکم میں ایک لحہ کی تاخیر کرتے۔ چنانچہ پانی خشک ہونا شروع ہو گیا۔ کشتی "جودی" پہاڑ پر جا لگی جو بعض کے نزدیک موصل میں تھا۔ اور جو کام خدا نے چاہا (یعنی مجرمین کو سزا دینا) وہ پورا ہو چکا۔ ظالموں کے حق میں کہہ دیا گیا کہ خدا کی رحمت سے دور ہو کر ہمیشہ کے لئے مصیبت و ہلاکت کے غار میں پڑے رہو۔

طوفان نوح تمام دنیا میں آیا یا خاص علاقوں میں:

(تنبیہ) اس میں اختلاف ہے کہ "طوفانِ نوح" تمام دنیا میں آیا یا خاص ملکوں میں۔ اس کے فیصلہ کا یہاں موقع نہیں۔ مگر یاد رہے کہ "دائرۃ المعارف" میں بعض محققین یورپ کے ایسے اقوال و دلائل نقل کئے ہیں جو عموم طوفان کی تائید کرتے ہیں۔ جو لوگ عام طوفان کے قائل ہیں، ان میں سے اکثر کے نزدیک موجودہ دنیا کے کل انسان نوح علیہ السلام کے تین بیٹوں "سام" "حام" "یافث" کی اولاد ہیں۔ وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ" طوفان سے جو بچے اور حیوانات ہلاک ہوئے، ان کا اہلاک بطور تعذیب نہ تھا بلکہ جیسے خدا دوسرے اسباب طبیعہ کے ذریعہ سے ان پر موت وارد کرتا ہے اور وہ ظلم نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہاں ان کی موت اس ذریعہ سے واقع ہوئی آخر اب بھی جو سیلاب اور طوفان آتے ہیں ان میں کتنے جانور اور بچے ہلاک ہو جاتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت شاہ عبدالعزیز قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ سلف اور خلف میں سے کسی کا یہ قول نہیں کہ طوفان صرف حضرت نوحؑ کی قوم کے حق میں تھا اور یہود کے باطل اقوال کا اعتبار نہیں۔ اور نوح علیہ السلام کی بعثت اگرچہ عام نہ تھی صرف اپنی قوم کے ساتھ مخصوص تھی، مگر اس وقت ان کی قوم اور ان کی امت ہی کل اہل زمین اور اہل جہاں کا مصداق تھی اور ان کی امت ہی سارا جہاں اور ساری دنیا تھی۔ موجودہ دنیا کی طرح ساری زمین آباد نہ تھی جیسے آدم علیہ السلام کی ذریت تھی وہی ان کی امت تھی۔ اس طرح تمام اہل زمین حضرت نوحؑ کی قوم تھی۔ مطلب یہ ہوا کہ اس زمانہ مین جہاں تک دنیا آباد تھی وہاں تک طوفان آیا جو سب کو عام اور شامل تھا۔ جس سے سوائے نوح علیہ السلام کے اور اہلِ ایمان کے کوئی نہیں بچا۔ غرض کہ تمام زمین کی چیزیں غرق ہوگئیں اور صرف نوح علیہ السلام اور وہ لوگ جو کشتی میں ان کے ساتھ سوار تھے زندہ رہے اور طوفان کے بعد دنیا از سرِ نو آباد ہوئی۔ آج کل کے مدعیان تحقیق یہ کہتے ہیں کہ اسی آدمیوں سے دنیا کا آباد ہونا محال نظر آتا ہے، ان نادانوں کو یہ خبر نہیں کہ یہ ساری دنیا صرف حضرت آدم اور حوا سے آباد ہوئی ہے۔ کبھی یہ کہتے ہیں کہ ایسے عظیم انقلاب کا دنیا کی تاریخوں میں ذکر نہیں۔ ان نادانوں کو یہ معلوم نہیں کہ تاریخ میں جن واقعات کا ذکر ہے، وہ نہایت قلیل ہے۔ اور جو واقعات پیش آئے وہ لاکھوں اور کروڑوں ہیں جن کے ذکر سے تاریخ خالی ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ نوح علیہ السلام کی بعثت عام تھی اور تمام اہلِ زمین کے لئے تھی۔ تو جاننا چاہئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت تمام اہلِ زمین کے لئے ہر زمانہ میں ہے اور قیامت تک رہے گی۔ اور حضرت نوح علیہ السلام کی دعوتِ اسلام سب اہلِ زمین کے لئے صرف ان کے زمانہ تک محدود تھی۔ بعد میں باقی نہ رہی اور ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ

وسلم کی نبوت اور بعثت اور دعوت تمام اہلِ زمین کے لئے ہے۔ ہر زمان میں ہر مکان میں اور اسی طرح تا قیامت باقی رہے گی۔ (فتاویٰ عزیزی ص ۲۷ جلد ۴)

الغرض جمہور مفسرین اس طرف گئے ہیں کہ یہ طوفان عام اور عالمگیر تھا سوائے اہلِ کشتی کے کوئی متنفس اس جانکاہ عذاب سے جانبر نہیں ہوا۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

در بیان و در فصاحت کے بود یکساں سخن
گرچہ گوینده بود چوں حافظ و چوں اصمعی،
در کلام ایزد بے چون کہ وحی منزل است
کے بود تبت یدا مانند یا ارض ابلعی،

(معارف کاندھلویؒ)

کوا اور کبوتر:

بغوی نے لکھا ہے روایت میں آیا ہے کہ حضرت نوحؑ نے زمین کی خبر لانے کے لئے کوے کو بھیجا وہ کسی مردار پر جا پڑا اور لوٹ کر نہیں آیا۔ تو آپؑ نے کبوتر کو بھیجا، کبوتر واپس آیا تو اس کی چونچ میں زیتوں کا ایک پتہ تھا اور پاؤں کیچڑ میں آلودہ تھے، یہ حالت دیکھ کر حضرت نوحؑ سمجھ گئے کہ پانی خشک ہو گیا۔ کہا گیا ہے کہ آپؑ نے کوے کو بد دعا دی کہ (ہمیشہ) ڈرتا رہے۔ اسی بد دعا کا اثر ہے کہ کوا گھروں میں نہیں رہتا۔ اور کبوتر کی گردن میں ایک سبز کنٹھا ڈال دیا اور اس کو امن کی دعا دی، اس لئے وہ گھروں میں رہنے کا عادی ہے۔

کشتی کہاں ٹھہری:

چوتھی آیت کے آخر میں فرمایا کہ زمین و آسمان نے احکام کی تعمیل کی تو طوفان کا قصہ ختم ہو گیا، اور سفینہ نوح علیہ السلام جُودی پہاڑ پر ٹھہر گیا، اور ظالموں کو ہمیشہ کے لئے رحمت سے دور کر دیا گیا۔

جودی پہاڑ آج بھی اس نام سے قائم ہے اس کا محل وقوع حضرت نوح علیہ السلام کے وطن اصلی عراق، موصل کے شمال میں جزیرہ ابن عمر کے قریب آرمینیہ کی سرحد پر ہے، یہ ایک کوہستانی سلسلہ ہے جس کے ایک حصہ کا نام جودی ہے، اسی کے ایک حصہ کو اراراط کہا جاتا ہے، موجودہ تورات میں کشتی ٹھہرنے کا مقام کوہِ اراراط کو بتلایا ہے، ان دونوں روایتوں میں کوئی ایسا تضاد نہیں، مگر مشہور قدیم تاریخوں میں بھی یہی ہے کہ نوح علیہ السلام کی کشتی جودی پہاڑ پر آ کر ٹھہری تھی، قدیم تاریخوں میں یہ بھی مذکور ہے کہ عراق کے بہت سے مقامات میں اس کشتی کے ٹکڑے اب تک موجود ہیں جن کو تبرک کے طور پر رکھا اور استعمال کیا جاتا ہے۔

کشتی کتنی مدت چلتی رہی:

تفسیر طبری اور بغوی میں ہے کہ نوح علیہ السلام ۱۰ ماہ رجب کو کشتی میں سوار ہوئے تھے، چھ مہینہ تک یہ کشتی طوفان کے اوپر چلتی رہی، جب بیت اللہ شریف کے مقام پر پہنچی تو سات مرتبہ طواف کیا، اللہ تعالیٰ نے اپنے بیت کو بلند کر کے غرق سے بچا لیا تھا۔ پھر ۱۰ محرم یوم عاشورا میں طوفان ختم ہو کر کشتی جبل جودی پر ٹھہری، حضرت نوح علیہ السلام نے اس روز شکرانہ کے طور پر روزہ رکھا اور کشتی میں جتنے آدمی ساتھ تھے سب کو روزہ رکھنے کا حکم دیا، بعض روایتوں میں ہے کہ کشتی کے شریک سب جانوروں نے بھی اس دن روزہ رکھا، (مظہری وقرطبی) (معارف القرآن)

عبد بن حمید، ابن المنذر اور ابوالشیخ نے بیان کیا کہ قتادہؒ نے کہا ہم سے ذکر کیا گیا تھا کہ دس رجب کو کشتی سب کو لے کر اٹھی اور ایک سو پچاس روز پانی میں رہی۔ پھر دس محرم کو جودی پر ٹھہری اور لوگ زمین پر اترے۔ ابن عساکر نے خالد زیات کی کی روایت سے اتنا زائد نقل کیا ہے کی عاشورہ کے دن کشتی ٹھہری۔ حضرت نوحؑ نے اپنے ساتھ والے جن وانس سے فرمایا آج روزہ رکھو۔ بغوی نے بھی لکھا ہے کہ نوحؑ ۱۰ رجب کو کشتی میں سوار ہوئے اور چھ مہینہ تک کشتی چلتی رہی اور بیت اللہ (کعبہ) کی طرف سے گذری تو اس کے گرداگرد سات چکر لگائے۔ کعبے کا اللہ نے اوپر اٹھا دیا تھا۔ اس کی جگہ (ڈوبنے سے) باقی رہ گئی تھی۔ ۱۰ محرم کو کشتی سے اترے۔ حضرت نوحؑ نے شکرانہ کا روزہ خود بھی رکھا اور ساتھ والوں کو بھی حکم دیا۔

حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں مہینے بھر تک یہیں لگی رہی اور سب اتر گئے۔ اور کشتی لوگوں کی عبرت کے لئے ثابت وسالم رکھی رہی یہاں تک کہ اس امت کے اول لوگوں نے بھی اسے دیکھ لیا۔ حالانکہ اس کے بعد کی بہترین اور مضبوط سینکڑوں کشتیاں بنیں بگڑیں بلکہ راکھ اور خاک ہو گئیں۔ ضحاکؒ فرماتے جودی نام کا پہاڑ موصل میں ہے۔ بعض کہتے ہیں طور پہاڑ کو ہی جودی بھی کہتے ہیں۔ زر بن حبیشؒ کو ابواب کندہ سے داخل ہو کر دائیں طرف کے زاویہ میں نماز بکثرت پڑھتے ہوئے دیکھ کر نوبہ بن سالم نے پوچھا کہ آپ جو جمعہ کے دن برابر یہاں اکثر نماز پڑھا کرتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟ تو آپ نے جواب دیا کہ کشتی نوحؑ یہیں لگی تھی۔ ابنِ عباسؓ کا قول ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں بال بچوں سمیت کل اسی آدمی تھے۔ ایک سو پچاس دن تک وہ کشتی میں ہی رہے۔ اللہ تعالیٰ نے کشتی کا منہ مکہ شریف کی طرف کر دیا۔ یہاں وہ چالیس دن تک بیت اللہ شریف کا طواف کرتی رہی۔ پھر اسے اللہ تعالیٰ نے جودی کی طرف روانہ کر دیا، وہاں وہ ٹھہر گئی۔

خشکی کی خبر:

حضرت نوح علیہ السلام نے کوے کو بھیجا کہ وہ خشکی کی کبر لائے، وہ ایک مردار کے کھانے میں لگ گیا اور دیر لگا دی۔ آپؑ نے ایک کبوتر کو بھیجا وہ اپنی چونچ میں زیتون کے درخت کا پتہ اور پنجوں میں مٹی لے کر واپس آیا۔ اس سے حضرت نوح علیہ السلام نے سمجھ لیا کہ پانی سوکھ گیا ہے اور زمین ظاہر ہو گئی ہے۔

پس آپؑ جودی کے نیچے اترے اور وہیں ایک بستی کی بناء ڈال دی جسے ثمانین کہتے ہیں۔ ایک دن صبح کو جب لوگ جاگے تو ہر ایک کی زبان بدلی ہوئی تھی۔

زبانوں کا بدلنا:

اسی زبانیں بولنے لگے جن میں سب سے اعلیٰ اور بہتر عربی زبان تھی۔ ایک کو دوسرے کا کلام سمجھنا محال ہو پڑا۔ نوح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے سب زبانیں معلوم کرا دیں۔ آپؑ ان سب کے درمیان مترجم تھے۔ ایک کا مطلب دوسرے کو سمجھا دیتے تھے۔ حضرت کعب احبارؒ فرماتے ہیں کہ کشتیٔ نوحؑ مشرق و مغرب کے درمیان چل پھر رہی تھی۔ پھر جودی پر ٹھہر گئی۔ حضرت قتادہؓ وغیرہ فرماتے ہیں رجب کی دسویں تاریخ مسلمان اس میں سوار ہوئے تھے۔ پانچ ماہ تک اسی میں رہے۔ انہیں لے کر کشتی جودی پر مہینے بھر تک ٹھہری رہی۔ آخر محرم کے عاشورے کے دن وہ سب اس میں سے اترے۔ اسی قسم کی ایک مرفوع حدیث بھی ابن جریر میں ہے، انہوں نے اس دن روزہ بھی رکھا۔ واللہ اعلم۔

عاشوراء کا روزہ:

مسند احمد میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چند یہودیوں کو عاشورے کے دن روزہ رکھے ہوئے دیکھ کر ان سے اس کا سبب دریافت فرمایا تو انہوں نے کہا کہ اسی دن اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو دریا سے پار اتارا تھا۔ اور فرعون اور اس کی قوم کو ڈبو دیا تھا۔ اور اسی دن کشتیٔ نوحؑ جودی پر لگی تھی۔ پس ان دونوں پیغمبروں نے شکرِ خدا کا روزہ اس دن رکھا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا پھر موسیٰ علیہ السلام کا سب سے زیادہ حق دار میں ہوں اور اس دن کے روزے کا میں زیادہ مستحق ہوں۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دن روزہ رکھا اور اپنے اصحابؓ سے فرمایا کہ تم میں سے جو آج روزے سے ہو، وہ تو اپنا روزہ پورا کرے اور جو ناشتہ کر چکا ہو وہ بھی باقی دن کچھ نہ کھائے۔ یہ روایت اس سند سے تو غریب ہے لیکن اس کے بعض حصے کے شاہد صحیح حدیث میں بھی موجود ہیں۔

ماں اور اس کے بچے کا غرق ہونا:

تفسیر ابن جریر اور تفسیر ابن ابی حاتم میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر اللہ تعالیٰ قوم نوحؑ میں سے کسی پر بھی رحم کرنے والا ہوتا تو اس بچے کی ماں پر رحم کرتا۔ حضرت نوحؑ اپنی قوم میں ساڑھے نو سو سال تک ٹھہرے رہے۔ آپؑ نے ایک درخت بویا تھا جو سو سال تک بڑھتا رہا اور بڑا ہوتا رہا۔ پھر اسے کاٹ کر تختے بنا کر کشتی بنانی شروع کی۔ کافر لوگ مذاق اڑاتے کہ یہ اس خشکی میں کشتی کیسے چلائیں گے۔ آپؑ جواب دیتے تھے کہ عنقریب اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے۔ جب آپؑ بنا چکے اور پانی زمین سے ابلنے اور آسمان سے برسنے لگا اور گلیاں اور راستے پانی میں ڈوبنے لگے تو اس بچے کی ماں جسے اپنے اس بچے سے غایت درجے کی محبت تھی وہ اسے لے پہاڑ کی طرف چلی گئی اور جلدی جلدی اس پر چڑھنا شروع کیا تہائی حصے پر چڑھ گئی لیکن جب اس نے دیکھا کہ پانی وہاں بھی پہنچا تو اور اوپر کو چڑھی، دو تہائی تک پہنچی جب وہاں بھی پانی پہنچا تو اس نے چوٹی پر جا کر دم لیا لیکن پانی وہاں بھی پہنچ گیا۔ جب گردن گردن پانی چڑھ گیا تو اس نے اپنے بچے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اونچا اٹھا لیا لیکن پانی وہاں بھی پہنچا، اور ماں بچہ دونوں غرق ہوگئے۔ پس اگر اس دن کوئی کافر بھی بچنے والا ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس بچے کی ماں پر رحم کرتا۔ یہ حدیث اس سند سے غریب ہے۔ کعب احبار اور مجاہدین جبیر سے بھی اس بچے اور اس کی ماں کا یہی قصہ مروی ہے۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

ہر چیز میں عقل و شعور ہے:

قرآن مجید کی بہت سی آیتیں اس پر شاہد ہیں جیسے وان من شیٔ الا یسبح بحمدہ یعنی کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ تعالیٰ کی حمد و تسبیح نہ پڑھتی ہو، اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اس کی معرفت پر موقوف ہے اور معرفت عقل و شعور پر، اس سے معلوم ہوا کہ ہر چیز میں عقل و شعور اپنے اپنے حوصلہ کے مطابق موجود ہے اسی عقل و شعور سے وہ اپنے خالق کو پہچانتی ہے اور جس کام پر اس کو اس کے پیدا کرنے والے نے لگا دیا ہے اس کام کو ہر چیز خوب سمجھتی ہے اور اس کی ادائیگی میں بڑی مضبوطی سے لگی ہوئی ہے، آیت قرآن اعطی کل شیٔ خلقہ ثم ھدی کا یہی مطلب ہے، اس لئے اس آیت میں اگر آسمان و زمین کے خطاب کو حقیقی معنی میں خطاب قرار دیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں، کیونکہ بقول رومیؒ

خاک و باد و آب و آتش زندہ اند　　ما من و تو مردہ با حق زندہ اند

وَنَادٰی نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ

اور پکارا نوح نے اپنے رب کو کہا اے رب میرا بیٹا ہے

مِنْ اَهْلِیْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ

میرے گھر والوں میں اور بیشک تیرا وعدہ سچا ہے

الْحٰكِمِیْنَ ۝۴۵ قَالَ یٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ

اور تو سب سے بڑا حاکم ہے فرمایا اے نوح

اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا

وہ نہیں تیرے گھر والوں میں اس کے کام ہیں خراب سو مت

لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنِّیْۤ اَعِظُكَ اَنْ

پوچھ (طلب کر) مجھ سے جو تجھ کو معلوم نہیں میں نصیحت کرتا ہوں تجھ

تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ ﴿۴۶﴾

کو کہ نہ ہو جائے تو جاہلوں میں

حضرت نوحؑ کی درخواست اوراس کا جواب:

نوح علیہ السلام نے یہ کس وقت عرض کیا، کنعان کے غرق ہونے سے پہلے یا غرق ہونے کے بعد، دونوں احتمال ہیں۔ نیز کنعان کو اس کی منافقانہ اوضاع واطوار دیکھ کر غلط فہمی سے مومن سمجھ رہے تھے یا کافر سمجھتے ہوئے بارگاہِ رب العزت میں یہ گزارش کی۔ دونوں باتون کا امکان ہے۔ اگر مومن سمجھ کر غرقابی سے پہلے عرض کیا تھا تو مقصود اپنی اضطراری کیفیت کا اظہار اور خدا سے کہہ کر اس کے بچاؤ کا انتظام کرنا تھا۔ اور اگر غرقابی کے بعد گفتگو ہوئی تو محض معاملہ کی اصل حقیقت معلوم کرنے کی غرض سے اپنا خلجان یا اشکال پیش کیا۔ یعنی خداوندا! تو نے میرے گھر والون کو بچانے کا وعدہ کیا تھا۔ اور کنعان مومن ہونے کی وجہ سے "اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ" کے استثناء میں بظاہر داخل نہیں۔ پھر اس کی غرقابی کا راز کیا ہے؟ بلا شبہ آپ کا وعدہ سچا ہے۔ کسی کو یہ خیال نہیں گذر سکتا کہ معاذ اللہ وعدہ خلافی کی ہو۔ آپ احکم الحاکمین اور شہنشاہ مطلق ہیں۔ سمجھ میں آئے یا نہ آئے کوکسی حق نہیں کہ آپ کے فیصلہ کے سامنے دم مار سکے، یا آپ کو وعدہ خلافی پر مجبور کر دے، نہ کسی کا یہ منصب ہے کہ آپ کے حکم ناطق کے متعلق کسی قسم کی نکتہ چینی کر سکے۔ فقط قلبی اطمینان کے لئے بطریق استعلام واستفسار اس واقعہ کا راز معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ جواب ملا یہ ان گھر والوں میں سے نہیں جن کے بچانے کا وعدہ تھا۔ بلکہ "اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ" میں شامل ہے۔ کیونکہ اس کے عمل خراب ہیں۔ تم کو اس کے کفر وشرک کی خبر نہیں۔ مقام تعجب ہے کہ پیغمبرانہ فراست کی روشنی میں صریح آثار کفر کے باوجود ایک کافر کا حال مشتبہ رہے۔ جس شخص کا واقعی حال تمہیں معلوم نہیں اس کے بارہ میں ہم سے ایسی نا مناسب رعایت یا اس طرح کی کیفیت مت طلب کرو۔ مقربین کو لائق نہیں کہ وہ بے سوچے سمجھے ادب ناشناس جاہلوں کی سی باتیں کرنے لگیں۔ آیت کی یہ تقریر اس صورت میں ہے کہ نوح علیہ السلام کنعان کو مومن سمجھتے ہوں اور اگر کافر سمجھتے تھے تو شاید اس درخواست یا سوال کا منشاء یہ ہو کہ "انجاء" کے ذکر میں "اہل" کو چونکہ عام مومنین سے الگ کر کے بیان فرمایا تھا۔ اس سے نوح علیہ السلام نے یہ خیال کیا کہ میرے اہل کو اس دنیوی عذاب سے محفوظ رکھنے کے لئے ایمان شرط نہیں اور "اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ" مجمل تھا۔ اس لئے اس کے مصداق کی تعیین نہیں کر سکے۔ بناءً علیہ شفقت پدری کے جوش میں عرض کیا کہ الٰہ العالمین! میرا بیٹا یقیناً میرے اہل میں داخل ہے جس کے بچانے کا آپ وعدہ فرما چکے ہیں۔ پھر یہ کیوں غرق کیا جا رہا ہے یا غرق کر دیا گیا ہے۔ جواب ملا کہ تمہارا پہلا ہی مقدمہ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ غلط ہے جس اہل کے بچانے کا وعدہ تھا اس میں یہ داخل نہیں۔ کیونکہ اس کے کرتوت بہت خراب ہیں۔ نیز "اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ" کے مصداق کا تم کو کچھ علم نہیں کہ وہ کون لوگ ہیں۔ پھر جس چیز کا علم تم نہیں رکھتے اس کی نسبت ایسے محاجہ کے رنگ میں سوال یا درخواست کرنا تمہارے لئے زیبا نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت نوحؑ کی بیوی کی خیانت:

حضرت ابن عباسؓ سے سوال ہوا کہ فَخَانَتٰهُمَا کا کیا مطلب ہے؟ آپ نے فرمایا اس سے مراد زنا نہیں بلکہ حضرت نوحؑ کی بیوی کی خیانت تو یہ تھی کہ لوگوں سے کہتی تھی یہ مجنون ہے۔ اور حضرت لوطؑ کی بیوی کی خیانت یہ تھی کہ جو مہمان آپؑ کے ہاں آتے اپنی قوم کو خبر کر دیتی، پھر آپؑ نے آیت اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ پڑھی۔ حضرت سعید بن جبیرؒ سے جب حضرت نوحؑ کے لڑکے کے بارے میں سوال ہوا تو آپ نے فرمایا کہ خدا سچا ہے۔ اس نے اسے حضرت نوحؑ کا لڑکا فرمادیا ہے۔ پس وہ یقیناً حضرت نوحؑ کا ثابت النسب لڑکا ہی تھا۔ دیکھو خدا فرماتا ہے وَنَادٰی نُوْحُ ابْنَهٗ اور یہ بھی یاد رہے کہ بعض علماء کا قول ہے کہ کسی نبی کی بیوی نے کبھی زناکاری نہیں کی۔ ایسا ہی حضرت مجاہدؒ سے مروی ہے۔ اور یہی ابن جریرؒ کا پسندیدہ ہے اور فی الواقع ٹھیک اور صحیح بات بھی یہی ہے۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

امام ابوجعفر باقر رحمہ اللہ نے فرمایا وہ حضرت نوحؑ کی بیوی کا بیٹا تھا حضرت نوحؑ کا بیٹا نہ تھا، اسی لئے آپ نے من اہلی (یعنی میری بیوی کا) کہا تھا، "منی" (میرا) نہیں کہا۔ (تفسیر مظہریؒ)

کافر اور ظالم کے لئے دعاء جائز نہیں:

اس سے ایک مسئلہ یہ بھی معلوم ہوا کہ دعاء کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ دعاء کرنے والا پہلے یہ معلوم کرلے کہ جس کام کی دعاء کر رہا ہے وہ جائز و حلال ہے یا نہیں، مشتبہ حالت میں دعاء کرنے سے منع فرمایا گیا ہے، تفسیر روح المعانی میں بحوالہ قاضی بیضاوی نقل کیا ہے کہ جب اس آیت سے مشتبہ الحال کے لئے دعاء کرنے کی ممانعت معلوم ہوئی تو جس معاملہ کا ناجائز وحرام ہونا معلوم ہو اس کے لئے دعاء کا ناجائز ہونا بدرجۂ اولیٰ ثابت ہو گیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ آج کل کے مشائخ میں جو یہ عام رواج ہو گیا ہے کہ جو شخص کسی دعاء کے لئے آیا اس کے واسطے ہاتھ اٹھا دیئے اور دعا کر دی حالانکہ اکثر ان کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے جس مقدمہ کے لئے یہ دعاء کرا رہا ہے

اس میں یہ خود ناحق پر ہے یا ظالم ہے، یا کسی ایسے مقصد کے لئے دعاء کر رہا ہے جو اس کے لئے حلال نہیں کوئی ایسی ملازمت اور منصب ہے جس میں یہ حرام میں مبتلاء ہوگا یا کسی کی حق تلفی کر کے اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکے گا۔

ایسی دعائیں حالت معلوم ہونے کی صورت میں تو حرام و نا جائز ہیں ہی، اگر حالت اشتباہ کی حالت بھی ہو تو حقیقتِ حال اور معاملہ کے جائز ہونے کا علم حاصل کئے بغیر دعاء کے لئے اقدام کرنا بھی مناسب نہیں۔

وطنی یا نسی بنیاد پر قومیت کی تعمیر:

دوسرا مسئلہ اس سے یہ معلوم ہوا کہ مؤمن اور کافر کے درمیان اگرچہ رشتہ قرابت کا ہو، مگر دینی اور اجتماعی معاملات میں اس رشتہ داری کا کوئی اثر نہیں ہوگا، کوئی شخص کتنا ہی عالی نسب ہو، کتنے ہی بڑے بزرگ کی اولاد ہو، یہاں تک کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں داخل ہونے کا شرف رکھتا ہو، اگر وہ مؤمن نہیں ہے تو دینی معاملات میں تو مدار کار ایمان اور اصلاح وتقویٰ پر ہے، جو صالح و متقی ہے وہ اپنا ہے جو ایسا نہیں وہ بیگانہ ہے۔

ہزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد فدائے یک تن بیگانہ کا شنا باشد

اگر دینی معاملات میں بھی ان رشتہ داریوں کی رعایت ہوتی تو بدر و احد کے میدانوں میں بھائی کی تلوار بھائی پر نہ چلتی، بدر و احد اور احزاب کے معرکے تو سب کے سب ایک ہی خاندانوں کے افراد کے درمیان پیش آئے ہیں، جس نے واضح کر دیا کہ اسلامی قومیت اور برادری نسبی تعلقات یا وطنی وحدتوں پر دائر نہیں ہوتی بلکہ ایمان و عمل پر دائر ہوتی ہے۔ (معارف القرآن)

قَالَ رَبِّ إِنِّیٓ أَعُوذُ بِكَ أَنْ أَسْـَٔلَكَ مَا لَيْسَ

بولا اے رب میں پناہ لیتا ہوں تیری اس سے کہ پوچھوں (مانگوں)

لِی بِهٖ عِلْمٌ ؕ

تجھ سے جو معلوم نہ ہو مجھ کو

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ "آدمی وہی پوچھتا ہے جو معلوم نہ ہو۔ لیکن مرضی معلوم ہونی چاہئے یہ کام جاہل کا ہے کہ بڑے کی مرضی پوچھنے کی نہ دیکھے، پھر پوچھے۔ مرضی کیوں نہ تھی؟" اسے ہم فائدہ گزشتہ میں بیان کر چکے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَإِلَّا تَغْفِرْ لِی وَتَرْحَمْنِیٓ أَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِينَ ﴿۴۷﴾

اور اگر تو نہ بخشے مجھ کو اور رحم نہ کرے تو میں ہوں نقصان والوں میں

توبہ کا ادب: حضرت نوحؑ کانپ اٹھے اور توبہ کی، لیکن یہ نہ کہا کہ پھر ایسا نہ کروں گا کہ اس میں دعویٰ نکلتا ہے۔ بندہ کو کیا مقدور ہے۔ چاہئے اسی کی پناہ مانگے کہ مجھ سے پھر نہ ہو اور دل میں عزم نہ کرنے کا رکھے۔ حضرت آدم علیہ السلام اور یونس علیہ السلام وغیرہ کی توبہ کے جو الفاظ قرآن میں نقل ہوئے ہیں ان میں یہی ادب ملحوظ رہا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

قِيلَ يٰنُوحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيْكَ

حکم ہوا اے نوح اُتر سلامتی کے ساتھ ہماری طرف سے اور برکتوں کے

وَعَلٰٓى أُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ؕ وَأُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ

ساتھ تجھ پر اور اُن فرقوں پر جو تیرے ساتھ ہیں اور دوسرے فرقے ہیں کہ

يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۴۸﴾

ہم فائدہ دینگے اُن کو پھر پہنچے گا اُن کو ہماری طرف سے عذاب دردناک

حضرت نوحؑ کو اترنے کا حکم اور برکت کی بشارت:

یعنی کشتی سے "جودی" پر پھر "جودی" سے زمین پر اترے۔ برکتیں اور سلامتی آئندہ تم پر اور ان اقوام پر رہے گی جو تمہارے ساتھیوں سے پیدا ہونے والی ہیں۔ فی الحال جو زمین طوفان سے بالکل اجڑ گئی ہے خدا دوبارہ آباد کرے گا اور اس کی رونق و برکت پھر عود کر آئے گی۔ "سلامت" کے لفظ سے گویا حق تعالیٰ نے تسلی فرما دی کہ پھر ساری نوع انسانی پر قیامت سے پہلے ایسی عام ہلاکت نہ آئیگی، مگر بعضے فرقے ہلاک ہونگے۔ (تفسیر عثمانی)

طوفان کا خاتمہ:

امام ابن اسحاق کا بیان ہے کہ جب جناب باری جل شانہ نے طوفان بند کرنے کا ارادہ فرمالیا تو روئے زمین پر ایک ہوا بھیج دی جس نے پانی کو ساکن کر دیا اور اس کا ابلنا بند ہوگیا۔ ساتھ ہی آسمان کے دروازے بھی جو اب تک پانی برسا رہے تھے بند کر دیئے گئے۔ زمین کو پانی کے جذب کر لینے کا حکم ہوگیا۔ اسی وقت پانی کم ہونا شروع ہوگیا اور بقول اہلِ توراۃ کے ساتویں مہینے کی سترہویں تاریخ کشتیٔ نوح جودی پر لگی۔ دسویں مہینے کی پہلی تاریخ کو پہاڑوں کی چوٹیاں کھل گئیں۔ اس کے چالیس دن کے بعد کشتی کے روزن پانی کے اوپر دکھائی دینے لگے۔ پھر آپؑ نے کوے کو پانی کی تحقیق کے لئے بھیجا لیکن وہ پلٹ کر نہ آیا۔ آپؑ نے کبوتر کو بھیجا جو واپس آیا اپنے پاؤں رکھنے کو جگہ نہ ملی۔ آپؑ نے اپنے ہاتھ پر لے کر اسے اندر لے لیا۔ پھر سات دن کے بعد اسے دوبارہ بھیجا شام کو وہ واپس آیا اپنی چونچ میں زیتون کا پتہ لئے ہوئے تھا۔ اس سے اللہ کے نبیؑ نے معلوم کر لیا کہ پانی زمین سے کچھ ہی اونچا رہ گیا ہے۔ پھر سات دن کے بعد بھیجا اب کی مرتبہ وہ نہ لوٹا تو آپؑ نے سمجھ لیا کہ زمین بالکل خشک ہو چکی۔ الغرض پورے ایک سال کے

بعد حضرت نوح علیہ السلام نے کشتی کا سر پوش اٹھایا اور آواز آئی کہ اے نوحؑ! ہماری نازل کردہ سلامتی کے ساتھ اب اتر آؤ۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

تِلْكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا
یہ باتیں منجملہ غیب کی خبروں کے ہیں کہ ہم بھیجتے ہیں
كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛ
تیری طرف نہ تجھ کو اُن کی خبر تھی اور نہ تیری قوم کو اس سے پہلے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کی دلیل:

یعنی یہ دلائلِ نبوت میں سے ہے کہ ایک امی کی زبان سے امم سابقہ کے ایسے مستند ومفصل واقعات سنوائے جائیں۔ (تفسیر عثمانیؒ)

فَاصْبِرْ ۛ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۹﴾
سوتو صبر کر البتہ انجام بھلا ہے ڈرنے والوں کا

آخر کار آپ کا غلبہ ہوگا: جیسے نوح اور ان کے رفقاء کا انجام بھلا ہوا آپ کے ساتھیوں کا مستقبل بھی نہایت تابناک اور کامیاب ہے۔ آپ کفار کی ایذاؤں پر صبر کریں، گھبرا کر تنگدل نہ ہوں۔ جیسے نوح علیہ السلام نے ساڑھے نوسو برس صبر کیا۔ (تفسیر عثمانیؒ)

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۗ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا
اور عاد کی طرف ہم نے بھیجا اُن کے بھائی
اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۗ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا
ہُود کو بولا اے قوم بندگی کرو اللہ کی کوئی تمہارا حاکم نہیں سوائے اُسکے
مُفْتَرُوْنَ ﴿۵۰﴾
تم سب جھوٹ کہتے ہو

کہ پتھر کے "بت" بھی بااختیار حاکم بلکہ معبود ہیں۔ سورہ "اعراف" میں قوم "ہود" کا قصہ گزر چکا۔ (تفسیر عثمانیؒ)

يٰقَوْمِ لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۗ اِنْ اَجْرِيَ
اے قوم میں تم سے نہیں مانگتا اُس پر مزدوری میری مزدوری
اِلَّا عَلَى الَّذِيْ فَطَرَنِيْ ۗ
اُسی پر ہے جس نے مجھ کو پیدا کیا

پیغمبروں کی ایک مشترکہ صفت:

یعنی تمہارے مال کی مجھے ضرورت نہیں۔ میرا پیدا کرنے والا ہی تمام دنیوی ضروریات اور اخروی اجر وثواب کا کفیل ہے۔ یہ بات ہر ایک پیغمبر نے اپنی قوم سے کہی تاکہ نصیحت بے لوث اور موثر ہو۔ لوگ ان کی محنت کو دنیوی طمع پر محمول نہ کریں۔ (تفسیر عثمانیؒ)

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۵۱﴾
پھر کیا تم نہیں سمجھتے

مخلص جھوٹا نہیں ہوتا:

یعنی اس قدر غبی ہو، اتنی موٹی بات بھی نہیں سمجھتے کہ ایک شخص بے طمع نے غرض محض دردمندی اور خیر خواہی سے تمہاری فلاح دارین کی بات کہتا ہے۔ تم اسے اور بدخواہ سمجھ کر دست وگریبان ہوتے ہو۔ (تفسیر عثمانیؒ)

وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ
اور اے قوم گناہ بخشواؤ اپنے رب سے پھر رجوع کرو اُسی کی طرف

اسی سورت کے شروع میں اس جملہ کی تفسیر گزر چکی۔ (تفسیر عثمانیؒ)

يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا
چھوڑے گا تم پر آسمان سے دھاریں

قوم کو استغفار کی ترغیب:

یعنی موقع بہ موقع خوب بارشیں دے گا۔ وہ قوم چونکہ کھیتی، باغ لگانے سے بڑی دلچسپی رکھتی تھی۔ اس لئے ایمان لانے کے ظاہری فوائد وبرکات وہ بیان کئے جو ان کے حق میں خصوصی طور پر موجب ترغیب ہوں۔ لکھتے ہیں کہ وہ لوگ تین سال سے خشک سالی اور امساکِ باراں کی مصیبت میں گرفتار تھے۔ ہود علیہ السلام نے وعدہ کیا کہ ایمان لا کر خدا کی طرف رجوع ہوگے تو یہ مصیبت دور ہوجائے گی۔ (تفسیر عثمانیؒ)

وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا
اور زیادہ دے گا تم کو زور پر زور اور رُد گردانی
مُجْرِمِيْنَ ﴿۵۲﴾
نہ کرو گنہگار ہو کر

یعنی مالی اور بدنی قوت بڑھائے گا، اولاد میں برکت دے گا، خوشحالی

میں ترقی ہوگی، اور مادی قوت کے ساتھ روحانی وایمانی قوت کا اضافہ کر دیا جائے گا، بشرطیکہ خداتعالیٰ کی طرف رجوع ہوکر اس کی اطاعت سے مجرموں کی طرح روگردانی نہ کرو۔ (تفسیر عثمانی)

قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ

بولے اے ہود تو ہمارے پاس کوئی سند لے کر نہیں آیا اور ہم نہیں

بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ

چھوڑنے والے اپنے ٹھاکروں (معبودوں) کو تیرے کہنے سے اور

بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۳﴾

ہم نہیں تجھ کو ماننے والے

قومِ عاد کی ہٹ دھرمی:

یہ ان کی کھلی ہٹ دھرمی تھی جو کہتے تھے کہ آپ کوئی واضح سند اور دلیل اپنی صداقت کی نہیں لائے۔ خدا جسے پیغمبری کے عہدہ پر فائز کرے، ضرور ہے کہ اس کو تقرر کی سند اور پروانہ عطا فرمائے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ جو نبی مبعوث ہوا اس کے ساتھ ایسے واضح نشان بھیجے گئے جس پر آدمی ایمان لانا چاہیں تو لا سکتے ہیں۔ اس لئے بالیقین کہا جاسکتا ہے کہ ہود علیہ السلام نے نشان پیش کئے ہونگے، مگر وہ لوگ ہٹ دھرمی اور بیحیائی سے یہی کہتے رہے کہ آپ کوئی کھلا ہو انشان نہیں لائے (شاید یہ مراد ہو کہ ایسا نشان نہ لائے جو سب کی گردنیں پکڑ کر ایمان لانے پر مجبور کردے) بہر حال ہم محض تیرے کہنے سے اپنے معبودوں کو نہیں چھوڑ سکتے۔ نہ کبھی تیری رسالت پر ایمان لا سکتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ؕ

ہم تو یہی کہتے ہیں کہ تجھ کو آسیب پہنچایا ہے کسی ہمارے ٹھاکروں (معبودوں) نے بُری طرح

یعنی یہ جو تم بہکی بہکی باتیں کرتے ہو اور سارے جہان کو بیوقوف بتلا کر اپنا دشمن بنا رہے ہو، ہمارا خیال یہ ہے کہ ہمارے دیوتاؤں میں سے کسی نے آسیب پہنچا کر تمہیں مجنون اور پاگل کر دیا ہے (العیاذ باللہ) تم جو ان کی عبادت سے روکتے ہو اور برا بھلا کہتے تھے، انہوں نے اس گستاخی کی سزا دی کہ اب تم بالکل دیوانوں کی سی باتیں کرنے لگے۔ (تفسیر عثمانی)

قَالَ اِنِّيْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا اَنِّيْ بَرِيْٓءٌ

بولا میں گواہ کرتا ہوں اللہ کو اور تم گواہ رہو کہ میں بیزار ہوں اُن سے

مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ

جن کو تم شریک کرتے ہو اُس کے سوا، سو برائی کرو میرے حق میں تم

جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۵۵﴾ اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى

سب مل کر پھر مجھ کو مہلت نہ دو میں نے بھروسہ کیا اللہ پر جو رب ہے میرا

اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ ؕ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ

اور تمہارا کوئی نہیں زمین پر پاؤں دھرنے والا مگر اللہ کے

اٰخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۶﴾

ہاتھ میں ہے چوٹی اُس کی بیشک میرا رب ہے سیدھی راہ پر

بُت کچھ نہیں بگاڑ سکتے:

یعنی وہ بیچاری پتھر کی مورتیں تو مجھے کیا گزند پہنچا سکتیں، تم سب جو بڑے شہ زور، تنومند اور طاقتور نظر آتے ہو اپنے دیوتاؤں کی فوج میں بھرتی ہوکر اور مجھ جیسے یکہ وتنہا پر پوری قوت سے بیک وقت ناگہاں حملہ کر کے بھی میرا بال بیکا نہیں کر سکتے۔ سنو میں خدا کو گواہ بنا کر اعلان کرتا ہوں اور تم سب بھی اس پر گواہ رہو کہ میں تمہارے جھوٹے دیوتاؤں سے قطعاً بیزار ہوں۔ تم سب جمع ہوکر جو برائی مجھے پہنچا سکتے ہو پہنچاؤ نہ ذرا کوئی کوتاہی کرو نہ ایک منٹ کی مجھے مہلت دو۔

میرا بھروسہ فقط اللہ پر ہے:

اور خوب سمجھ لو کہ میرا بھروسہ خدائے وحدہ لاشریک لہ پر ہے جو میرا رب ہے اور وہ ہی تمہارا بھی مالک وحاکم ہے۔ گو بدفہمی سے تم نہیں سمجھتے۔ نہ صرف میں اور تم بلکہ ہر چھوٹی بڑی چیز جو زمین پر چلتی ہے خالص اس کے قبضہ اور تصرف میں ہے گویا ان کے سر کے بال اس کے ہاتھ میں ہیں۔ جدھر چاہے پکڑ کر کھینچے اور پھیر دے۔ کسی کی مجال نہیں کہ اس کے قبضۂ اختیار سے نکل کر بھاگ جائے۔ نہ ظالم اس کی گرفت سے چھوٹ سکتے ہیں نہ سچے اس کی پناہ میں رہ کر رسوا ہو سکتے ہیں۔ بلاشبہ میرا پروردگار عدل وانصاف کی سیدھی راہ پر ہے اس کے یہاں نہ ظلم ہے نہ بے موقع انعام، اپنے بندوں کو نیکی اور خیر کی جو سیدھی راہ اس نے بتلائی، بیشک اسی پر چلنے سے وہ ملتا ہے اور اس پر چلنے والوں کی حفاظت کرنے کے لئے خود ہر وقت وہاں موجود ہے (تفسیر عثمانی)

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ

پھر اگر تم منہ پھیرو گے تو میں پہنچا چکا تم کو

اِلَيْكُمْ ۭ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۚ وَلَا

جو میرے ہاتھ بھیجا تھا تمہاری طرف اور قائم مقام کریگا میرا

تَضُرُّوْنَهٗ شَيْـًٔـا ۭ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰي كُلِّ

رب کوئی اور لوگ اور نہ بگاڑ سکو گے اللہ کا کچھ تحقیق میرا رب ہے

شَيْءٍ حَفِيْظٌ ﴿۵۷﴾

ہر چیز پر نگہبان

میرا کوئی نقصان نہیں تم اپنی فکر کرو:

یعنی ایسی صاف اور کھری کھری سی باتیں سن کر بھی نہ مانو گے تو اب میرا کچھ نقصان نہیں۔ میں فرض تبلیغ پوری طرح ادا کر چکا۔ تم اپنی فکر کرلو۔ ضرور ہے کہ اس قسم کی ہٹ دھرمی اور تعصب وعناد پر آسمان سے عذاب آئے جو تم کو ہلاک کر ڈالے۔ خدا کی زمین تمہاری تباہی سے ویران نہ ہوگی۔ وہ دوسرے لوگوں کو تمہارے اموال وغیرہ کا وارث بنا دے گا۔ تمہارا قصہ ختم کر دینے سے یاد رکھو خدا کا یا اس کے پیغمبروں کا کچھ نہیں بگڑتا نہ اس کا ملک خراب ہوتا ہے۔ جب وہ ہر چیز کا محافظ ونگہبان ہے تو ہر قابلِ حفاظت چیز کی حفاظت کے سامان اپنی قدرت کاملہ سے کر دے گا۔ (تفسیر عثمانیؒ)

وَلَمَّا جَاۗءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّالَّذِيْنَ

اور جب پہنچا ہمارا حکم بچا دیا ہم نے ہود کو اور

اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ

جو لوگ ایمان لائے تھے اسکے ساتھ اپنی رحمت سے اور بچا دیا اُن کو

عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴿۵۸﴾

ایک بھاری عذاب سے

قوم عاد پر آندھی کا عذاب:

یعنی سات رات اور آٹھ دن مسلسل آندھی کا طوفان آیا جیسا کہ سورۂ ''اعراف'' میں ہم ذکر کر چکے ہیں۔ مکان گر گئے، چھتیں اڑ گئیں، درخت جڑ سے اکھڑ کر کہیں کے کہیں جا پڑے۔ ہوا ایسی مسموم تھی کہ آدمیوں کی ناک میں داخل ہو کر نیچے سے نکل جاتی اور جسم کو پارہ پارہ کر ڈالتی تھی۔ اس ہولناک عذاب سے ہم نے ہود علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو جو آخر میں چار ہزار تک پہنچ گئے تھے بالکل محفوظ رکھا اور ایمان وعمل صالح کی بدولت آخرت کے بھاری عذاب سے بھی ان کو نجات دے دی۔ (تفسیر عثمانیؒ)

وَتِلْكَ عَادٌ ڱ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا

اور یہ تھے عاد کہ منکر ہوئے اپنے رب کی باتوں سے اور نہ مانا

رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿۵۹﴾

اُس کے رسولوں کو اور مانا حکم اُن کا جو سرکش تھے مخالف

عاد سے عبرت پکڑو:

یعنی ان کے کھنڈرات کو چشم عبرت سے دیکھو کہ یہ وہ قوم ''عاد'' تھی جن کے بڑوں نے بہت طمطراق سے اپنے پروردگار کی باتوں کا مقابلہ کیا اور اس کے پیغمبروں کی نافرمانی کی۔ اور چھوٹوں نے بڑے شیطانوں کی پیروی کی۔ آخر دونوں تباہ وبرباد ہوئے۔ (تنبیہ) ''رسلہ'' شاید اس لئے فرمایا کہ ایک نبی کی تکذیب سب پیغمبروں کی تکذیب ہے کیونکہ توحید وغیرہ اصول دین میں سب متفق اور ایک دوسرے کے مصدق ہیں۔ (تفسیر عثمانیؒ)

وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّيَوْمَ

اور پیچھے سے آئی اُن کو اس دنیا میں پھٹکار اور

الْقِيٰمَةِ ۭ

قیامت کے دن بھی

ان کو دنیا وآخرت کی لعنت ملی:

یعنی خدا کی لعنت (پھٹکار) دنیا میں ان کے پیچھے لگا دی گئی کہ جہاں جائیں ساتھ جائے۔ اور قیامت تک جہاں ان کا ذکر ہو لعنت کے ساتھ ہو، بلکہ قیامت کے بعد بھی وہ ان کا پیچھا نہ چھوڑے گی۔ لعنت کا طوق ہمیشہ ان کے گلے میں پڑا رہے گا۔ (تفسیر عثمانیؒ)

اَلَآ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ۭ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ

سن لو عاد منکر ہوئے اپنے رب سے سن لو پھٹکار ہے عاد کو

قَوْمِ هُوْدٍ ﴿۶۰﴾

جو قوم تھی ہود کی

بعض مفسرین نے کہا کہ قیامت کے دن یوں پکار اجائے گا، اَلَآ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا الخ (تنبیہ) ''عاد'' کے ساتھ ''قوم ہود'' کا لفظ یا تو اس لئے بڑھا دیا کہ دونوں کا تصور سننے والے کے دماغ میں ساتھ ساتھ

آئے۔ یعنی ''ہود'' کا کیا حال تھا، اور یہ اسی کی قوم تھی جس کا حشر یہ ہوا۔ اور ممکن ہے اس پر تنبیہ کرنا ہو کہ ''عاد'' دو ہیں، ''اولی'' اور ''اخری'' اسی لئے ایک جگہ فرمایا، '' وَاَنَّهٗٓ اَهْلَكَ عَادَاۨ الْاُوْلٰى '' (النجم رکوع ۳) یہاں ''عاد اولی'' مراد ہے جس کی طرف ''ہود'' مبعوث ہوئے تھے۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانی)

وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ

اور ثمود کی طرف بھیجا اُن کا بھائی صالح

ان کا قصہ ''اعراف'' میں گزر چکا۔ (تفسیر عثمانی)

قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ

بولا اے قوم بندگی کرو اللہ کی کوئی حاکم نہیں تمہارا

غَيْرُهٗ ۭ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ

اُس کے سوا اُسی نے بنایا تم کو زمین سے

یعنی اول آدم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر زمین سے غذائیں پیدا کیں جن سے نطفہ وغیرہ بنتا ہے جو مادہ ہے آدمی کی پیدائش کا۔ (تفسیر عثمانی)

وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْٓا

اور بسایا تم کو اس میں سو گناہ بخشواؤ اُس سے اور رجوع کرو اُس کی

اِلَيْهِ ۭ اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ ؀

طرف تحقیق میرا رب نزدیک ہے قبول کرنیوالا

حضرت صالح علیہ السلام کی دعوت:

یعنی پیدا کر کے باقی رکھا۔ بقاء کا سامان کیا۔ زمین کے آباد کرنے کی ترکیبیں بتلائیں۔ تدابیر الہام فرمائیں، جب وہ ایسا منعم ومحسن ہے تو چاہئے آدمی اسی کی طرف ایمان وطاعت کے ساتھ رجوع کرے اور کفر وشرک وغیرہ جو گناہ کر چکا ہے ان کی معافی چاہے، وہ ہم سے بالکل نزدیک ہے، ہر بات خود سنتا ہے اور جو توبہ واستغفار صدق دل سے کیا جائے اسے سن کر قبول کرتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ

بولے اے صالح تجھ سے تو ہم کو امید تھی اس سے پہلے کیا تو ہم کو منع کرتا

اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِيْ

ہے کہ پرستش کریں جن کی پرستش کرتے رہے ہمارے باپ دادے اور ہم

شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ؀

کو تو شبہ ہے اس میں جس کی طرف تو بلاتا ہے ایسا کہ دل نہیں مانتا

قوم کا جواب:

یعنی تجھ سے امید تھی کی آگے چل کر بڑا فاضل اور نیک مرد ہوگا جس کو معزز بزرگوں کا جانشین سمجھ کر قوم سر پر بٹھائے گی۔ تیری پیشانی سے رشد وصلاح کے آثار ہویدا تھے۔ سب کو توقع تھی، کہ مستقبل قریب میں بڑا فائدہ تجھ سے پہنچے گا۔ رائے وتدبیر، صلاح مشورہ سے اپنی قومی بھائیوں کی رہنمائی اور نہایت قوت قلب کے ساتھ آبائی مذہب کی حمایت وتائید کرے گا۔ یہ درست ہے کہ ابتداء سے تجھ کو بت پرستی مبغوض تھی اور عام قومی مذہب سے الگ تھلگ رہتا تھا، تاہم تیری سمجھ اور فطری قابلیت پر اعتماد کر کے ہم کو امید رہی کہ آگے چل کر عقل وتجربہ کی پختگی کے بعد یہ روش نہ رہے گی۔ لیکن افسوس یک بیک تو ایسی باتیں کرنے لگا جس نے تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ تو نے ہمارے آباء واجداد کے قدیم مذہب کے خلاف علانیہ جہاد شروع کر کے سب توقعات خاک میں ملا دیں۔ کیا تو چاہتا ہے کہ ہم ایک خدا کو لے کر سارے پرانے دیوتاؤں کو چھوڑ بیٹھیں۔ ہمارے نزدیک بزرگوں کی روش کے خلاف ایسا مسلک اختیار کرنا سخت شبہ کی چیز ہے جسے ہمارا دل کسی طرح نہیں مانتا۔ ''موضح القرآن'' میں ہے، ''یعنی ہونہار لگتا تھا کہ باپ دادے کی راہ روشن کرے گا۔ تو لگا مٹانے''۔ (تفسیر عثمانی)

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰي بَيِّنَةٍ

بولا اے قوم بھلا دیکھو تو اگر مجھ کو سمجھ مل گئی اپنے رب کی

مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ

طرف سے اور اُس نے مجھ کو دی رحمت اپنی طرف سے، پھر کون بچائے

مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ ۣ

مجھ کو اُس سے اگر اُسکی نافرمانی کروں

میں تمہاری وجہ سے حق کو نہیں چھوڑ سکتا:

یعنی تمہارے شک وشبہ کی وجہ سے میں ایک صاف راستہ کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ خدا نے مجھ کو سمجھ دی اور اپنی رحمت عظیمہ سے منصب پیغمبری عطا کیا۔ اب اگر فرض کیجئے میں اس کی نافرمانی کرنے لگوں اور جن چیزوں کے پہنچانے کا حکم ہے نہ پہنچاؤں تو مجھ کو اس کی سزا سے کون بچائے گا۔ (تفسیر عثمانی)

فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ﴿۶۳﴾

سو تم کچھ نہیں بڑھاتے میرا سوائے نقصان کے

تم مجھے نقصان پہنچانا چاہتے ہو:

یعنی بجائے اس کے کہ اپنے سچے خیر خواہ اور محسن کی قدر کرتے مجھے فرائض دعوت و تبلیغ سے رک جانے کا مشورہ دے کر ناقابل تلافی نقصان پہنچانا چاہتے ہو۔ بعض سلف نے اس جملہ کا مطلب یہ لیا ہے کہ تمہاری گفتگو سے مجھ میں کوئی چیز نہیں بڑھتی بجز اس یقین کے کہ تم اپنا سخت نقصان کر رہے ہو۔ مگر سیاق کے مناسب پہلے معنی ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَيٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا

اور اے قوم یہ اونٹنی ہے اللہ کی تمہارے لئے نشانی

تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ

سو چھوڑ دو اُس کو کھاتی پھرے اللہ کی زمین میں

فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ﴿۶۴﴾ فَعَقَرُوْهَا

اور مت ہاتھ لگاؤ اُسکو بری طرح پھر تو آ پکڑے گا تم کو عذاب بہت

فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ

جلد پھر اُسکے پاؤں کاٹے، تب کہا فائدہ اُٹھالو اپنے

ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ﴿۶۵﴾

گھروں میں تین دن یہ وعدہ ہے جو جھوٹا نہ ہوگا

صالح علیہ السلام کا معجزہ:

حضرت صالح علیہ السلام سے قوم نے معجزہ طلب کیا تھا۔ وہ انہیں دکھلا دیا۔ اس واقعہ کی پوری تفصیل اور الفاظ کی تشریح سورۂ ''اعراف'' میں آٹھویں پارہ کے ختم پر گزر چکی ہے۔ وہاں ملاحظہ کرلی جائے۔ (تفسیر عثمانی)

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

پھر جب پہنچا حکم ہمارا بچا دیا ہم نے صالح کو اور جو ایمان لائے

مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ

اُسکے ساتھ اپنی رحمت سے اور اُس دن کی رسوائی سے

قوم ثمود پر عذاب:

یعنی جب حکم عذاب پہنچا تو ہم نے ''صالح'' اور ان کے ساتھیوں کو بچا دیا۔ اور کاہے سے بچا دیا؟ اس دن کی رسوائی سے، '' وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ '' '' نجینا'' کی شرح و تفصیل ہے؟ (تفسیر عثمانی)

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ﴿۶۶﴾

بیشک تیرا رب وہی ہے زور والا زبردست

یعنی جسے چاہے ہلاک کر دے اور جسے چاہے بچا دے۔ (تفسیر عثمانی)

وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ

اور پکڑ لیا اُن ظالموں کو ہولناک آواز نے پھر صبح کو رہ گئے اپنے

دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۶۷﴾ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا

گھروں میں اوندھے پڑے ہوئے جیسے کبھی رہے ہی نہ تھے وہاں

بے نام و نشان کر دیئے گئے:

یعنی بے نام و نشان ہو گئے۔ حضرت شاہ صاحب'' لکھتے ہیں ان پر عذاب آیا اس طرح کہ رات کو پڑے سوتے تھے فرشتہ نے چنگھاڑ ماری سب کے جگر پھٹ گئے۔ بعض آیات میں رجفتہ کا لفظ آیا ہے۔ یعنی ''زلزلہ'' یا ''کپکپی'' سے ہلاک ہوئے۔ سورۂ اعراف میں ہم اس کے متعلق تطبیق کی صورت لکھ چکے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

اَلَآ اِنَّ ثَمُوْدَا۟ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ﴿۶۸﴾

سن لو ثمود منکر ہوئے اپنے رب سے سن لو پھٹکار ہے ثمود کو

منکروں کا یہی انجام ہوتا ہے:

یعنی جو اپنے پروردگار کی آیت و احکام سے منکر ہو اس کی یہ گت بنتی ہے اور ایسی پھٹکار پڑتی ہے۔ سن کر عبرت حاصل کرو۔ (تفسیر عثمانی)

سورۂ ہود کے گذشتہ مضامین کا خلاصہ:

سورۂ ہود کی مذکورہ پہلی گیارہ آیتوں میں اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ پیغمبر حضرت ہود علیہ السلام کا ذکر ہے جن کے نام سے یہ سورت موسوم ہے، اس صورت میں نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام تک قرآن کریم کے خاص طرز میں سات انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں کے واقعات مذکور ہیں، جن میں عبرت و موعظت کے ایسے مظاہر موجود ہیں کہ جس دل میں ذرا بھی حیات اور شعور باقی ہو وہ ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، عبرت کے علاوہ ایمان اور عمل صالح کے بہت سے اُصول و فروع اور

انسان کے لئے بہترین ہدایات موجود ہیں۔

قصص وواقعات تو اس میں سات پیغمبروں کے درج ہیں مگر سورت کا نام حضرت ہُود علیہ السلام کے نام سے منسوب کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں حضرت ہُود علیہ السلام کے قصہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

ان لوگوں نے ان باتوں میں سے کسی چیز پر کان نہ دھرا اور اپنی سرکشی پر قائم رہے تو خدا تعالیٰ کا عذاب ہوا کے طوفان کی صورت میں ان پر نازل ہوا جس نے مکانات اور درختوں کو جڑوں سے اکھاڑ دیا، آدم اور جانور ہوا میں اڑ کر آسمانی فضاء تک جاتے اور وہاں سے اوندھے گرتے تھے آسمان کی طرف سے انسانوں کی چیخ و پکار سنائی دیتی تھی، یہانتک کہ یہ بےمثال قوت اور ڈیل ڈول رکھنے والی قوم پوری کی پوری ہلاک و برباد ہوگئی۔

جب اس قوم پر عذاب الٰہی کا حکم نافذ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے سنت الٰہیہ کے مطابق اپنے پیغمبرؑ اور ان کے ساتھیوں کو اس سخت عذاب سے بچا لیا کہ عذاب آنے سے پہلے ان کو اس جگہ سے نکل جانے کا حکم دیدیا گیا۔

قوم عاد کے واقعہ اور عذاب کا ذکر کرنے کے بعد دوسروں کو عبرت حاصل کرنے کی تلقین کرنے کے لئے ارشاد فرمایا کہ یہ ہے وہ قوم عاد جنھوں نے اپنے رب کی نشانیوں کو جھٹلایا اور اپنے رسولوں کی نافرمانی کی اور ایسے لوگوں کے کہنے پر چلتے رہے جو ظالم اور ضدی تھے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا میں بھی لعنت یعنی رحمت سے دوری ان کے ساتھ ساتھ لگی رہی اور قیامت میں بھی اسی طرح ساتھ لگی رہے گی۔

حضرت جبرئیل علیہ السلام کی آواز:

جس میں ساری دنیا کی بجلیوں کی کڑک سے زیادہ ہیبت ناک آواز تھی جس کو انسانی قلب و دماغ برداشت نہیں کر سکا، ہیبت سے سب کے دل پھٹ گئے اور سب کے سب ہلاک ہوگئے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ قوم صالح سخت آواز کے ذریعہ ہلاک کی گئی ہے لیکن سورۂ اعراف میں ان کے متعلق یہ آیات ہے فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ یعنی پکڑ لیا ان کو زلزلہ نے۔۔۔اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ ان پر عذاب زلزلہ کا آیا تھا، قرطبی نے فرمایا کہ اس میں کوئی تضاد نہیں، ہوسکتا ہے کہ پہلے زلزلہ آیا ہو پھر سخت آواز سے سب ہلاک کر دیئے گئے ہوں۔ واللہ اعلم۔ (معارف القرآن)

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى

اور البتہ آچکے ہیں ہمارے بھیجے ہوئے ابراہیم کے

قَالُوْا سَلٰمًا ۭ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ

پاس خوشخبری لے کر بولے سلام وہ بولا سلام ہے پھر دیر نہ کی

جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ﴿٦٩﴾

کہ لے آیا ایک بچھڑا تلا ہوا

حضرت ابراہیم اور حضرت لوط اور ان کی قوم:

اس سورت کے قصص کی ترتیب ''اعراف'' کی ترتیب کے موافق ہے۔ صرف قوم لوط کے قصہ سے پہلے یہاں ابراہیم علیہ السلام کا تھوڑا سا قصہ بیان فرمایا ہے۔ مگر تعبیر ایسی رکھی جو ظاہر کرتی ہے کہ مقصود اصلی لوط علیہ السلام کا قصہ بیان کرنا ہے چونکہ اس میں اور ابراہیمؑ کے قصہ میں کوئی طرح کی مناسبت اور تعلق پایا جاتا تھا اس لئے بطور تمہید اور توطیہ ابراہیم کا قصہ مذکور ہوا۔ لوط علیہ السلام حضرت ابراہیمؑ کے خالہ زاد بھائی ہیں جو آپ کے ہمراہ عراق سے ہجرت کر کے آئے۔ ایک ہی جماعت فرشتوں کی دونوں کے پاس بھیجی گئی۔ حضرت ابراہیمؑ نے قوم لوط کی ہلاکت کے مسئلہ میں فرشتوں سے بحث کی جو آگے آتی ہے۔ یہ فرشتے نہایت حسین وجمیل نوجوانوں کی شکل میں لوط علیہ السلام کی طرف جاتے ہوئے حضرت ابراہیم کے پاس خوشخبری لے کر آئے کہ حق تعالیٰ نے ان کو اپنا خلیل بنایا ہے اور اس بڑھاپے میں حضرت ''سارہ'' کے بطن سے بیٹا عطا کرنے والا ہے۔ نیز یہ کہ قوم لوطؑ کے بدمعاشوں اور ظالموں کے وجود سے عنقریب دنیا پاک کر دی جائے گی جس میں حضرت ابراہیمؑ و حضرت لوطؑ کے متبعین کو کسی قسم کا ضرر نہ پہنچے گا۔ فرشتوں نے ابراہیمؑ کو سلام کیا۔ آپ نے جواب دیا۔ مگر اول وہلہ میں پہچان نہ سکے۔ جیسے ابتداء حضرت لوطؑ نے بھی ان کو نہیں پہچانا (بلکہ صحیحین کی حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ جبرئیلؑ آدمی کی شکل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال و جواب کرتے رہے، جب اٹھ کر چلے گئے تب آپ کو بتلایا گیا کہ یہ جبرئیلؑ تھے) گویا متنبہ کر دیا کہ نبی کو بھی فرشتہ وغیرہ کا علم ضروری خدا کے دینے سے ہوتا ہے۔ وہ کسی وقت مخفی رکھنا چاہے تو کسی کی قدرت نہیں کہ معلوم کر سکے۔ بہر حال ابراہیم علیہ السلام انہیں آدمی سمجھ کر مہمان نوازی کے لئے اٹھے اور نہایت فربہ بچھڑا بھون تل کر سامنے حاضر کیا۔ (تفسیر عثمانی)

تین مہمان:

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ تین فرشتے، جبرئیل، میکائیل اور اسرافیل تھے (قرطبی) انہوں نے بشکل انسانی آکر ابراہیم علیہ السلام کو سلام کیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سلام کا جواب دیا اور ان کو انسان سمجھ کر مہمان نوازی شروع کی۔

حضرت ابراہیم کی مہمان نوازی:

حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے وہ انسان ہیں جنہوں نے دنیا میں مہمان نوازی کی

رسم جاری فرمائی (قرطبی) ان کا معمول یہ تھا یہ کبھی تنہا کھانا نہ کھاتے بلکہ ہر کھانے کے وقت تلاش کرتے تھے کہ کوئی مہمان آجائے تو اس کے ساتھ کھائیں۔

قرطبی نے بعض اسرائیلی روایات سے نقل کیا ہے کہ ایک روز کھانے کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مہمان کی تلاش شروع کی تو ایک اجنبی آدمی ملا جب وہ کھانے پر بیٹھا تو ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ بسم اللہ کہو، اس نے کہا میں جانتا نہیں اللہ کون اور کیا ہے؟ ابراہیم علیہ السلام نے اس کو دسترخوان سے اٹھا دیا، جب وہ باہر چلا گیا تو جبرئیل امین آئے اور کہا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "ہم نے تو اس کے کفر کے باوجود ساری عمر اس کو رزق دیا اور آپ نے ایک لقمہ دینے میں بھی بخل کیا" یہ سنتے ہی ابراہیم علیہ السلام اس کے پیچھے دوڑے اور اس کو واپس بلایا، اس نے کہا کہ جب تک آپ اس کی وجہ نہ بتلائیں کہ پہلے کیوں مجھے نکالا تھا اور پھر کیوں بلا رہے ہیں میں اس وقت تک آپ کے ساتھ نہ جاؤں گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے واقعہ بتلا دیا تو یہی واقعہ اس کے مسلمان ہونے کا سبب بن گیا، اس نے کہا کہ وہ رب جس نے یہ حکم بھیجا ہے بڑا کریم ہے میں اس پر ایمان لاتا ہوں، پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ گیا اور مومن ہو کر باقاعدہ بسم اللہ پڑھ کر کھانا کھایا۔

فرشتوں کی میزبانی:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی عادتِ مہمان نوازی کے مطابق بشکل انسانی آنے والے فرشتوں کو انسان اور مہمان سمجھ کر مہمان نوازی شروع کی اور فوراً ہی ایک تلا ہوا بچھڑا سامنے لا کر رکھ دیا۔

حضرت ابراہیم کے خوف کی وجہ:

دوسری آیت میں بتلایا گیا کہ آنے والے فرشتے اگرچہ بشکل انسانی آئے تھے اور یہ بھی ممکن تھا کہ اس وقت ان کو بشری خواص کھانے پینے کے بھی عطا کر دیئے جاتے مگر حکمت اسی میں تھی کہ یہ کھانا نہ کھائیں تاکہ ان کے فرشتے ہونے کا راز کھلے اس لئے شکل انسانی میں بھی ان کے ملکی خواص کو باقی رکھا گیا جس کی وجہ سے انہوں نے کھانے پر ہاتھ نہ بڑھایا۔

بعض روایات میں ہے کہ ان کے ہاتھ میں کچھ تیر تھے ان کی نوک اس تلے ہوئے گوشت میں لگانے لگے، ان کیا اس عمل سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے عُرف کے مطابق یہ خطرہ لاحق ہو گیا کہ شاید یہ کوئی دشمن ہوں کیونکہ ان کے عرف میں کسی مہمان کا کھانے سے انکار کرنا ایسے ہی شر و فساد کی علامت ہوتا تھا، (قرطبی) فرشتوں نے بات کھول دی کہ ہم فرشتے ہیں، اس لئے نہیں کھاتے، آپ کوئی خطرہ محسوس نہ کریں۔

سنت سلام: قال سلما ؕ قال سلام اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے لئے سنت ہے کہ جب آپس میں ملیں تو سلام کریں، آنے والے مہمان کو اس میں پیشقدمی کرنا چاہئے اور دوسروں کو جواب دینا چاہئے۔

یہ رسم تو ہر قوم و ملت میں پائی جاتی ہے کہ ملاقات کے وقت ایک دوسروں کو خوش کرنے کے لئے کچھ کلمات بولتے ہیں مگر اسلام کی تعلیم اس معاملہ میں بھی بے نظیر اور بہترین ہے کیونکہ سلام کا مسنون لفظ السلام علیکم اللہ کے نام پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ذکر اللہ بھی ہے اور مخاطب کے لئے اللہ تعالیٰ سے سلامتی کی دعاء بھی اور اپنی طرف سے اُس کی جان و مال آبرو کیلئے سلامتی کی ضمانت بھی۔

مہمان داری کے چند اصول:

فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ یعنی نہیں ٹھہرے ابراہیم علیہ السلام مگر صرف اس قدر کہ لے آئے تلا ہوا بچھڑا۔

اس سے چند باتیں معلوم ہوئیں، اول یہ کہ مہمان نوازی کے آداب میں سے یہ ہے کہ مہمان کے آتے جو کچھ کھانے پینے کی چیز میسر ہو اور جلدی سے مہیا ہو سکے وہ لا رکھے، پھر اگر صاحب وسعت ہے تو مزید مہمانی کا انتظام بعد میں کرے۔ (قرطبی)

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ مہمان کے لئے بہت زیادہ تکلفات کی فکر میں نہ پڑے، آسانی سے جو اچھی چیز میسر ہو جائے وہ مہمان کی خدمت میں پیش کر دے، حضرت ابراہیم کے یہاں گائے بیل رہتے تھے، اس لئے بچھڑا ذبح کر کے فوری طور پر اس کا گوشت تل کر سامنے لا رکھا۔ (قرطبی)

تیسرے یہ کہ آنے والوں کی مہمانی کرنا آداب اسلام اور مکارم اخلاق میں سے ہے، انبیاء و صلحاء کی عادت ہے، اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ مہمانی کرنا واجب ہے یا نہیں؟ جمہور علماء اس پر ہیں کہ واجب نہیں، سنت اور مستحسن ہے۔ بعض نے فرمایا کہ گاؤں والوں پر واجب ہے کہ جو شخص ان کے گاؤں میں ٹھہرے اس کی مہمانی کریں کیونکہ وہاں کھانے کا کوئی دوسرا انتظام نہیں ہو سکتا اور شہر میں ہوٹل وغیرہ سے اس کا انتظام ہو سکتا ہے۔ اس لئے شہر والوں پر واجب نہیں۔ (معارف القرآن)

میزبان کو چاہئے کہ صرف کھانا سامنے رکھ کر فارغ نہ ہو جائے بلکہ اس پر نظر رکھے کہ مہمان کھا رہا ہے یا نہیں، جیسا ابراہیم علیہ السلام نے کیا کہ فرشتوں کے کھانا نہ کھانے کو محسوس کیا۔

مگر یہ نظر رکھنا اس طرح ہو کہ مہمان کے کھانے کو تکتا نہ رہے، سرسری نظر سے دیکھ لے کیونکہ مہمان کے لقموں کو دیکھنا آدابِ ضیافت کے خلاف اور مدعو کے لئے باعثِ شرمندگی ہوتا ہے۔ جیسا ہشام ابن عبدالملک کے دستر خوان پر ایک روز ایک اعرابی کو یہ واقعہ پیش آیا کہ اعرابی کے لقمہ میں بال تھا، امیر المومنین ہشام نے دیکھا تو بتلایا، اعرابی فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ ہم

ایسے شخص کے پاس کھانا نہیں کھاتے جو ہمارے لقموں کو دیکھتا ہے۔

کھانے کی قیمت:

امام طبری نے اس جگہ نقل کیا ہے کہ اول جب فرشتوں نے کھانے سے انکار کیا تو یہ کہا تھا کہ ہم مفت کا کھانا نہیں کھاتے۔ اگر آپ قیمت لے لیں تو کھائیں گے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب میں فرمایا کہ ہاں اس کھانے کی ایک قیمت ہے وہ ادا کر دو، وہ قیمت یہ ہے کہ شروع میں اللہ کا نام لو اور آخر میں اس کی حمد کرو، جبریل امین نے یہ سن کر اپنے ساتھیوں کو بتلایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جو خلیل بنایا ہے یہ اسی کے مستحق ہیں۔

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ کھانے کے شروع میں بسم اللہ اور آخر میں الحمد للہ کہنا سنت ہے۔ (معارف القرآن)

فَلَمَّا رَاٰۤ اَیْدِیَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَیْهِ نَكِرَهُمْ
پھر جب دیکھا اُن کے ہاتھ نہیں آتے کھانے پر
وَ اَوْجَسَ مِنْهُمْ خِیْفَةً
تو کھٹکا اور دل میں اُن سے ڈرا

حضرت ابراہیمؑ کا خوف:

کہ آخر یہ کون ہیں، کس غرض سے آئے ہیں؟ ہم کھانا پیش کرتے ہیں، یہ اسے ہاتھ نہیں لگاتے۔ اس وقت کے دستور کے موافق جو مہمان کھانے سے انکار کرتا، سمجھا جاتا تھا کہ یہ کسی اچھے خیال سے نہیں آیا۔ ابراہیم علیہ السلام گھبرائے کہ اگر آدمی ہیں تو کھانے سے انکار کرنا ضرور کچھ معنی رکھتا ہے۔ اور فرشتے ہیں تو نہ معلوم کس مطلب کے لئے بھیجے گئے ہیں، آیا مجھ سے کوئی غلطی ہوئی یا میری قوم کے حق میں کوئی ناخوشگوار چیز لے کر آئے۔ اسی حیص وبیص میں زبان سے اظہار بھی کر دیا۔ " اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ " (حجر۔ رکوع ۴) یعنی ہم کو تم سے اندیشہ ہے۔ عموماً مفسرین نے ابرہیمؑ کے خوف کی یہی توجیہات کی ہیں۔ مگر حضرت شاہ صاحبؒ نے میرے نزدیک نہایت لطیف توجیہ کی۔ "کہ فرشتوں کے ساتھ جو عذاب الٰہی تھا اور شان غضب وانتقام کے مظہر بن کر قوم لوط کی طرف جا رہے تھے کہ اس کا طبعی اثر یہ تھا کہ ابراہیم علیہ السلام کے قلب پر ایک طرح کے خوف و خشیت کی کیفیت طاری ہوئی، جس کا اظہار انہوں نے " اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ " کہہ کر کیا۔ یعنی ہم کو تم سے ڈر لگتا ہے۔ واللہ اعلم

قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ﴿۷۰﴾
وہ بولے مت ڈر ہم بھیجے ہوئے آئے ہیں طرف قوم لوط کی

فرشتوں کا تسلی دینا:

یعنی ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہم فرشتے ہیں جو "قوم لوط" کو تباہ کرنے کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ آپ کچھ اندیشہ ضرر کا نہ کیجئے۔ (تفسیر عثمانی)

صحیح ظاہر مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو یہ تو معلوم ہو گیا کہ وہ ملائکہ ہیں کیونکہ انہوں نے کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھائے (مگر آپ کو یہ خوف ہوا کہ کہیں اللہ کو میری کوئی حرکت پسند نہ آئی ہو اور فرشتے کوئی مصیبت ڈالنے کے لئے بھیجے گئے ہوں یا ان کی قوم پر عذاب نازل کرنے کے لئے مقرر کئے گئے ہوں۔ (تفسیر مظہریؒ)

اب ابراہیم علیہ السلام کا قصہ بیان کرتے ہیں جس میں فرشتوں کی تولد فرزند کی بشارت کا ذکر ہے کہ تمہارے یہاں ایک بیٹا ہوگا جس کا نام اسحاق ہوگا پھر اس بیٹے کے ایک بیٹا ہوگا جس کا نام یعقوب ہوگا۔ اس بشارت کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر ایک سو بیس برس کی تھی۔ اور حضرت سارہ کو تمنا تھی کہ ان کے بھی کوئی بیٹا ہو۔ لیکن کبرسنی کی وجہ سے ناامید ہو چکی تھیں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی زبانی یہ بشارت بھیجی۔ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ بشارت دینے کے لئے تین فرشتے آئے تھے۔ جبرائیل اور میکائیل اور اسرافیل علیہم السلام اور بعض کہتے ہیں کہ آٹھ یا نو فرشتے آئے تھے۔

(دیکھو تفسیر قرطبی صفحہ ۶۲ ج ۹ وزاد المسیر الابن الجوزی صفحہ ۱۳۷ ج ۴)

وَامْرَاَتُهٗ قَآىِٕمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ
اور اسکی عورت کھڑی تھی تب وہ ہنس پڑی پھر ہم نے خوشخبری دی
وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ یَعْقُوْبَ ﴿۷۱﴾
اُس کو اسحٰق کے پیدا ہونیکی اور اسحٰق کے پیچھے یعقوب کی

حضرت اسحٰق کی ولادت کی خوشخبری:

یعنی حضرت سارہ جو مہمانوں کی خدمت گزاری یا اور کسی کام کے لئے وہاں کھڑی تھیں اس ڈر کے رفع ہونے سے خوش ہو کر ہنس پڑیں۔ حق تعالیٰ نے خوشی پر اور خوشیاں سنائیں کہ تجھ کو اس عمر میں بیٹا ملے گا۔ (اسحٰق علیہ السلام) اور اس کی نسل سے ایک پوتا یعقوب علیہ السلام عطا ہوگا۔ جس سے ایک بڑی بھاری قوم بنی اسرائیل اٹھنے والی ہے۔ یہ بشارت حضرت سارہ کو شاید اس لئے سنائی گئی کہ حضرت ابراہیمؑ کے ایک بیٹا (اسمٰعیل علیہ السلام) حضرت ہاجرہ کے بطن سے پہلے ہی موجود تھا۔ سارہ کو تمنا تھی کہ مجھے بھی بیٹا ملے۔ مگر بوڑھی ہو کر مایوس ہو چکی تھی۔ اس وقت یہ بشارت ملی۔ بعض علماء نے

حضرت سارہ کے ہنسنے کی اور بھی توجیہات کی ہیں مگر ظاہر وہ ہی ہے جو ہم نے بیان کیا۔ علماء نے "ومن وراء اسحق یعقوب" سے استدلال کیا ہے کہ حضرت اسحٰق "ذبیح" نہ تھے۔ اسمٰعیل علیہ السلام تھے۔ (راجع ابن کثیر) (تفسیر عثمانی)

حضرت سارہ کی ہنسی کی وجہ:

سدی نے کہا ہنسی کا سبب تعجب تھا، حضرت ابراہیمؑ نے کھانا پیش کیا۔ مہمانوں نے نہیں کھایا۔ ابراہیمؑ کو ان کی طرف سے خوف ہوا۔ خیال کیا کہیں یہ چور نہ ہوں، پوچھا کیوں نہیں کھاتے۔ مہمانوں نے کہا ہم بغیر قیمت (ادا کئے) نہیں کھاتے۔ ابراہیمؑ نے کہا تو اس کی قیمت دے دو۔ مہمانوں نے پوچھا قیمت کیا ہے؟ ابراہیمؑ نے کہا کھانے سے پہلے بسم اللہ کہنا اور کھانے کے بعد الحمدللہ کہنا۔ یہ جواب سن کر جبرئیلؑ نے میکائیلؑ کی طرف دیکھا اور کہا اس شخص کو حق ہے کہ اللہ اس کو اپنا خلیل بنا لے۔ اس کے بعد بھی حضرت ابراہیمؑ اور سارہ نے مہمانوں کے ہاتھ کھانے کی طرف بڑھتے نہ دیکھے تو سارہ تعجب سے ہنس دیں۔ اور بطور تعجب کہا ہم ان مہمانوں کی خدمت کر رہے ہیں ان کے اعزاز میں کھانا پیش کر رہے ہیں، تعجب ہے کہ یہ نہیں کھاتے۔ (تفسیر مظہری)

قالت یویلتی ءالد وانا عجوز وھذا
بولی اے خرابی کیا میں بچہ جنوں گی، اور میں بڑھیا ہوں، اور یہ خاوند
بعلی شیخا
میرا ہے بوڑھا

حضرت سارہ کا تعجب:

یہاں "یویلتی" کا لفظ ایسا ہے جیسے ہمارے محاورات میں عورتیں کہہ دیتی ہیں کہ میں "نگوڑی" کیا اس بڑھاپے میں اولاد جنوں گی۔ حضرت سارہ کی عمر کہتے ہیں اس وقت ننانوے سال تھی اور حضرت ابراہیمؑ سو سال یا اس سے بھی متجاوز تھے۔ (تفسیر عثمانی)

یویلتی کلمۂ تعجب ہے اصل لغت میں یہ کلمۂ نوحہ ہے (جو کسی کے مرنے پر کہا جاتا ہے) پھر ہر مصیبت اور قابلِ تعجب چیز میں اس کا استعمال کیا جانے لگا۔ حضرت ابراہیمؑ کی بیوی کی عمر اس وقت بقول ابن اسحاق ۹۰ سال اور بقول مجاہد ۹۹ سال تھی۔

بعل. شوہر، اصل میں کسی کام کے منتظم کو بعل کہا جاتا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کی عمر اس وقت بقول ابن اسحاق ۱۲۰ برس اور بقول مجاہد ۱۰۰ سال تھی، اور بشارت سے ایک سال بعد بچہ پیدا ہو گیا تھا۔ (تفسیر مظہری)

ان ھذا لشیء عجیب ﴿۷۲﴾
یہ تو ایک عجیب بات ہے

یعنی ایسا ہو تو بالکل انوکھی اور عجیب و غریب بات ہو گی۔ (تفسیر عثمانی)

قالوا اتعجبین من امر اللہ رحمت
وہ بولے کیا تو تعجب کرتی ہے اللہ کے حکم سے
اللہ وبرکتہ علیکم اھل البیت انہ
اللہ کی رحمت ہے اور برکتیں تم پر اے گھر والو تحقیق اللہ ہے تعریف
حمید مجید ﴿۷۳﴾
کیا گیا بڑائیوں والا

فرشتوں نے کہا تعجب کی ضرورت نہیں:

یعنی جس گھرانے پر خدا کی اس قدر رحمتیں اور برکتیں نازل رہی ہیں اور جنہیں ہمیشہ معجزات و خوارق دیکھنے کا اتفاق ہوتا رہا، کیا ان کے لئے یہ کوئی تعجب کا مقام ہے؟ ان کا تعجب کرنا خود قابل تعجب ہے۔ انہیں لائق ہے کہ بشارت سن کر تعجب کی جگہ خدا کی تحمید و تمجید کریں کہ سب بڑائیاں اور خوبیاں اسی کی ذات میں جمع ہیں۔ (تنبیہ) بعض محققین نے لکھا ہے کہ نمازوں میں جو درود شریف پڑھتے ہیں۔ اس کے الفاظ میں اس آیت سے اقتباس کیا گیا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

ازواج اہل بیت میں شامل ہیں:

شیعہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات اہل بیت میں شامل نہ تھیں آیۃ میں شیعہ کے اس قول کی تردید ہے، حضرت سارہ کو اہلبیت کے الفاظ سے مخاطب کیا گیا ہے) لغت کے الفاظ سے اہل خانہ تو بیویاں ہی حقیقت میں ہوتی ہیں، دوسرے لوگوں کو تو تبعاً اہل بیت کہا جاتا ہے۔ (تفسیر مظہری)

یہ آیت اس امر کی قطعی دلیل ہے کہ زوجۂ رجل بھی اس کے اہل بیت میں سے ہے اس لئے کہ: اتعجبین من امر اللہ رحمت اللہ وبرکتہ علیکم اھل البیت یہ خطاب حضرت سارہ کو ہے جو حضرت ابراہیمؑ کی زوجہ محترمہ تھیں۔ اس طرح حق تعالیٰ کے اس ارشاد انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا کو سمجھو کہ یہ خطاب دراصل ازواج مطہرات کو ہے اس لئے کہ اوپر سے تمام سلسلہ کلام نساءِ نبی کریم یعنی ازواج مطہرات کے بارے میں

چلا آرہا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بمقتضائے شفقت دیگر اہل خانہ کو بھی کمبل اڑھا کر اس دعا میں شامل فرمالیا۔ اور جس طرح اس آیت میں اہل بیت کے لئے جمع مذکر کا صیغہ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ واحد مونث کے لئے بطور تعظیم وتکریم استعمال کیا گیا۔ اسی طرح آیت تطہیر میں یہی خطاب جمع مذکر کے صیغے جمع مونث کے لئے بطور تعظیم وتکریم استعمال کئے گئے۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ نمازوں میں جو درود شریف پڑھا جاتا ہے اس کے الفاظ اسی آیت سے ماخوذ اور مقبس ہیں۔ (معارف کاندھلویؒ)

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ
پھر جب جاتا رہا ابراہیم سے ڈر اور آئی اُس کو
الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِىْ قَوْمِ لُوْطٍ ﴿۷۴﴾ اِنَّ
خوشخبری، جھگڑنے لگا ہم سے قوم لُوط کے حق میں
اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ﴿۷۵﴾ يٰاِبْرٰهِيْمُ
البتہ ابراہیم تحمل والا نرم دل ہے رجوع رہنے والا اے ابراہیم
اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ
چھوڑ یہ خیال وہ تو آچکا حکم تیرے رب کا
وَاِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ ﴿۷۶﴾
اور اُن پر آتا ہے عذاب جو لوٹا یا نہیں جاتا

حضرت ابراہیم کی شفقت بھری کوشش:

یعنی ادھر سے مطمئن ہوئے تو فوراً قوم لوط کے مسئلہ میں فرشتوں سے بحث شروع کر دی۔ جس کا خلاصہ سورۂ ''عنکبوت'' میں بیان فرمایا کہ فرشتوں نے ابراہیمؑ کو مطلع کیا کہ ہم ان بستیوں کو ہلاک کرنے آئے ہیں۔ ابراہیمؑ بولے کہ ان میں تو خود لوط علیہ السلام موجود ہیں۔ (پھر ایک پیغمبر کے ان میں موجود ہوتے ہوئے کیسے ہلاک کئے جاسکتے ہیں؟) فرشتوں نے کہا ہم سب کو جانتے ہیں جو وہاں رہتے ہیں۔ لوطؑ اور اس کے متعلقین کو وہاں سے علیحدہ کر کے عذاب نازل کیا جائے گا۔ تفاسیر میں اس بحث کی جو تفاصیل بیان ہوئی ہیں اللہ جانے کہاں تک صحیح ہیں۔ بہر حال اسی بحث کو مبالغۃً لفظ ''یجادلنا'' سے تعبیر فرمایا۔ جس سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اپنی فطری شفقت، نرم خوئی اور رحمدلی سے اس قوم پر ترس کھا کر حق تعالیٰ کی جناب میں کچھ سفارش کرنا چاہتے تھے اسی کا جواب دیا کہ اس خیال کو چھوڑیئے ان ظالموں کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے اب خدا کا حکم واپس نہیں ہوسکتا۔ عذاب آکر رہے گا جو کسی سفارش یا دعاء وغیرہ سے نہیں ٹل سکتا۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت ابراہیمؑ نے قوم لوط کو ہلاک نہ کرنے کے متعلق جو ملائکہ سے جھگڑا کیا اس کی وجہ آپ کے یہ تین اوصاف تھے، آپ کا دل نرم تھا، آپ کے دل میں بڑا جذبہ رحم تھا۔ آپ مجرم سے انتقام لینے میں عجلت کو پسند نہیں کرتے تھے۔ (تفسیر مظہری)

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِیْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ
اور جب پہنچے ہمارے بھیجے ہوئے لوط کے پاس غمگین ہوا اُن کے
بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالَ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ ﴿۷۷﴾
آنے سے اور تنگ ہوا دل میں اور بولا آج دن بڑا سخت ہے

حضرت لوطؑ کے پاس فرشتوں کی آمد:

فرشتے نہایت حسین وجمیل بے ریش و بروت نوجوانوں کی شکل میں تھے۔ ابتداء حضرت لوطؑ نے نہ پہچانا کہ فرشتے ہیں۔ معمولی مہمان سمجھے۔ ادھر اس قوم کی بے حیائی اور خوئے بد معلوم تھی۔ سخت فکر مند اور تند دل ہوئے۔ کہ یہ بدمعاش ان مہمانوں کا پیچھا کریں گے۔ مہمانوں کو چھوڑنا بھی مشکل اور ان خبیثوں کے ہاتھوں سے چھڑانا بھی دشوار ہو گیا، گویا ساری قوم سے لڑائی مول لینا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ ؕ وَمِنْ قَبْلُ
اور آئی اُسکے پاس قوم اُسکی دوڑتی بے اختیار اور آگے
كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ
سے کر رہے تھے برے کام

قوم والوں کا بھاگ کر آنا:

یعنی اس قوم کو نامعقول حرکتوں اور خلاف فطرت فواحش کی جو عادت پڑی ہوئی تھی کہاں چین سے بیٹھنے دیتی، وہ ایسے خوبصورت لڑکوں کی خبر پاتے ہی نہایت بے حیائی کے ساتھ لوط علیہ السلام کے مکان پر اندھا دھند چڑھ دوڑے اور پوری قوت وشدت سے مطالبہ کیا کہ مہمان ان کے حوالے کر دیئے جائیں کیونکہ ہم پہلے ہی منع کر چکے ہیں کہ تم کسی مرد کو اپنا مہمان نہ بنایا کرو۔ یہاں آنے والے مہمانوں کو ہم پر چھوڑ دو ہم جو چاہیں کریں۔ (تفسیر عثمانی)

قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ

بولا اے قوم یہ میری بیٹیاں حاضر ہیں یہ پاک ہیں تم کو اُن سے

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ ط

سوڑ رو تم اللہ سے اور مت رسوا کرو مجھ کو میرے مہمانوں

اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ﴿۷۸﴾

میں کیا تم میں ایک مرد بھی نہیں نیک چلن

مہمانوں کی آبرو بچانے کی کوشش:

حضرت لوط نے مہمانوں کی آبرو بچانے کے لئے ہر قسم کی کوشش کی۔ آخری بات اس شہوت پرست قوم سے یہ کہی کہ ظالمو! یہ میری بیٹیاں تمہارے لئے حاضر ہیں۔ نکاح ہو جانے پر ان سے بطریق حلال تمتع کر سکتے ہو جو نہایت پاکیزہ اور شائستہ طریقہ ہے۔ خدا سے ڈرنا چاہئے کہ پاک اور مشروع طریقہ کو چھوڑ کر ایسے خلاف فطرت گندے کاموں میں مبتلا ہوتے ہو کم از کم میری ہی رعایت کرو کہ میں ان مقدس مہمانوں کے سامنے شرمندہ اور رسوا نہ ہوں۔ مہمان کی بے عزتی میزبان کی بے عزتی ہے۔ کیا تم میں ایک شخص بھی نہیں جو سیدھی سیدھی باتوں کو سمجھ کر نیکی اور تقویٰ کی راہ اختیار کرے (تنبیہ) "هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ" سے مراد عام طور پر اس قوم کی لڑکیاں ہیں جن کو تجوزاً "بیٹیاں" کہا گیا ہے۔ کیونکہ پیغمبر امت کے حق میں روحانی باپ ہوتا ہے، ویسے بھی محاورات میں قوم کے بڑے بوڑھے سب کی لڑکیوں کو اپنی بیٹیاں کہہ کر پکار سکتے ہیں۔ اور اگر خاص لوط علیہ السلام کی بیٹیاں مراد ہوں تو شاید ان میں سے بعض ممتاز لوگوں کے نکاح کے لئے پیش کی ہونگی اس وقت کافر کا نکاح مسلمان عورت سے جائز تھا۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ لوط علیہ السلام کا مقصود اس قول سے نکاح وغیرہ کچھ نہ تھا۔ بلکہ ان کی زیادتیوں سے عاجز ہو کر مہمانوں کی آبرو بچانے کی دھن میں انتہائی تواضع سے یہ لفظ کہے۔ تاکہ ان میں غیرت و حیاء کا کچھ شائبہ اور آدمیت کا کوئی ذرہ بھی موجود ہو تو یہ لفظ سن کر جھینپ جائیں۔ اور نرمی اختیار کر لیں، مگر وہ ایسے حیادار کا ہے کو تھے؟ کان پر جوں بھی نہ رینگی۔ پہلے سے زیادہ بے باک ہو کر بے غیرتی کا مظاہرہ کرنے لگے۔

قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ مِنْ

بولے تو تو جانتا ہے ہم کو تیری بیٹیوں سے کچھ غرض نہیں

حَقٍّ ۚ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ ﴿۷۹﴾

اور تجھ کو تو معلوم ہے جو ہم چاہتے ہیں

پھر اتنی حجت و تکرار کیوں کر رہا ہے۔ ہم اپنا ناپاک ارادہ پورا کئے بدون نہ ہٹیں گے۔ (تفسیر عثمانی)

قَالَ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْٓ اِلٰى رُكْنٍ

کہنے لگا کاش مجھ کو تمہارے مقابلہ میں زور ہوتا، یا جا بیٹھتا

شَدِيْدٍ ﴿۸۰﴾

کسی مستحکم پناہ میں

حضرت لوط علیہ السلام کی پریشانی:

لوط علیہ السلام کی زبان سے انتہائی گھبراہٹ اور پریشانی میں بے ساختہ یہ الفاظ نکلے کہ کاش مجھ میں بذات خود تم سب سے لڑنے اور مقابلہ کرنے کی طاقت ہوتی یا کوئی طاقتور اور مضبوط پناہ دینے والا ہوتا۔ یعنی میرا کنبہ اور جتھا یہاں ہوتا۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یرحم الله لوطاً لقد کان یاوی الیٰ رکن شدید" خدا نے لوط پر رحم فرمایا، بیشک وہ مضبوط و مستحکم پناہ حاصل کر رہے تھے۔ یعنی خداوند قدوس کی۔ مگر اس وقت سخت گھبراہٹ اور بے حد ضیق کی وجہ سے ادھر خیال نہ گیا۔ بے ساختہ ظاہری اسباب پر نظر گئی۔ لوطؑ کے بعد جو انبیاء مبعوث ہوئے سب بڑے جتھے اور قبیلے والے تھے۔ (تفسیر عثمانی)

بخاری و مسلم نے صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ میرے بھائی لوطؑ پر رحم فرمائے وہ رکن شدید کی پناہ لینے کے خواستگار ہوئے تھے۔ دوسری روایت میں رحم فرمائے کی جگہ معاف فرمائے کا لفظ آیا ہے۔ (مظہری)

صحیح بخاری کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے لوطؑ پر رحم فرماویں وہ کسی مضبوط جماعت کی پناہ لینے پر مجبور ہو گئے، اور ترمذی میں اس کے ساتھ یہ جملہ بھی ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کے بعد اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا جس کا کنبہ قبیلہ اس کا حمایتی نہ ہو (قرطبی) خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کفار قریش نے ہزار طرح کی تدبیریں کیں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پورے خاندان نے آپ کی حمایت کی، اگرچہ مذہب میں وہ سب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق نہ تھے، اسی وجہ سے پورے بنی ہاشم اس مقاطعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک رہے جس میں کفار قریش نے ان پر دانا پانی بند کر دیا تھا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے کہ اس واقعہ میں جب قوم لوط ان کے گھر پر چڑھ آئی تو لوط علیہ السلام نے اپنے گھر کا دروازہ بند کر لیا تھا اور یہ گفتگو اس شریر قوم سے پس پردہ ہو رہی تھی فرشتے بھی مکان کے اندر تھے، ان لوگوں نے دیوار پھاند کر اندر گھسنے کا اور دروازہ توڑنے کا ارادہ کیا اس پر حضرت لوط علیہ السلام کی زبان پر یہ کلمات آئے، جب فرشتوں نے حضرت لوط علیہ السلام کا یہ اضطراب دیکھا تو حقیقت کھول دی اور کہہ دیا کہ آپ دروازہ کھول دیں، اب ہم ان کو عذاب کا مزہ چکھاتے ہیں، دروازہ کھولا تو جبریل امین نے اپنے پر کا اشارہ ان کی آنکھوں کی طرف کیا جس سے سب اندھے ہو گئے اور بھاگنے لگے۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ
مہمان بولے اے لوط ہم بھیجے ہوئے ہیں تیرے رب کے ہرگز نہ پہنچ سکیں گے تجھ تک

فرشتوں نے حقیقت ظاہر کر دی:

جب لوط علیہ السلام کے اضطراب و قلق کی حد ہو گئی، تب مہمانوں نے کہا کہ حضرت آپ کس فکر میں ہیں مطلق پریشان نہ ہوں، ہم خدا کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں جو ان کو تباہ و ہلاک کرنے کے لئے آئے ہیں۔ یہ خبیث ہمارا تو کیا بگاڑ سکتے آپ تک بھی نہیں پہنچ سکیں گے۔ تفاسیر میں ہے کہ وہ شریر لوگ دروازتوڑ کر یا دیوار پھاند کر اندر گھسے جاتے تھے، تب جبرئیل علیہ السلام نے خدا سے اجازت لے کر لوط علیہ السلام کو علیحدہ بٹھا دیا اور ایک ذرا بازو ان ملعونوں کی طرف ہلایا۔ جو سب کے سب نپٹ اندھے ہو گئے اور کہنے لگے کہ بھاگو! لوطؑ کے مہمان تو بڑے جادوگر معلوم ہوتے ہیں۔ (تفسیر عثمانیؒ)

سب قوم والے اندھے ہو کر بھاگنے لگے:

انہوں نے کہا لوطؑ ہم آپ کے رب کے فرستادہ ہیں ان لوگوں کی دسترس آپ تک ہرگز نہیں ہو سکے گی دروازہ کھول دیجئے اور ہم کو ان سے نبٹنے دیجئے حضرت لوطؑ نے دروازکھول دیا، وہ لوگ اندر گھس آئے جبرئیل نے اپنے رب سے عذاب نازل کرنے کی اجازت طلب کی اجازت مل گئی تو انہوں نے اپنی وہی صورت اختیار کر لی۔ جو ان کی (عموماً اور معمولاً) ہوتی ہے پر پھیلا دیئے موتیوں کا ہار پہنے چمکدار دانت جھلکتی پیشانی، سر کے بال گھنگریالے برف کی طرح سفید اور دونوں پاؤں مائل بہ سبزی (یہ شکل تھی حضرت جبرئیلؑ کی) پھر جبرئیل نے اپنا ایک پر ان لوگوں کے منہ پر مارا جس کی وجہ سے ان کی آنکھیں پٹ نابینا ہو گئیں، گھروں کا راستہ بھی سجھائی نہیں دیتا فوراً یہ کہتے ہوئے پلٹ پڑے بھاگو بھاگو لوطؑ کے گھر میں روئے زمین کے سب سے بڑے جادوگر آئے ہیں جنہوں نے ہم پر جادو کر دیا پھر حضرت لوط سے کہنے لگے ذرا ٹھہرو صبح ہونے دو کل صبح ہم تم سے سمجھیں گے صبح کو تم کو پتہ چل جائے گا۔ لوطؑ نے فرشتوں سے قوم والوں کے ہلاک ہونے کی میعاد دریافت کی، فرشتوں نے کہا صبح کو۔ لوطؑ نے کہا میں اس سے بھی جلد چاہتا ہوں۔ ابھی ان کو ہلاک کر دو تو بہتر ہے۔ فرشتوں نے کہا کیا صبح قریب نہیں ہے۔ (تفسیر مظہری)

فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ
سو لے نکل اپنے لوگوں کو کچھ رات سے اور مڑ کر نہ دیکھے
مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ ؕ اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا مَآ
تم میں کوئی مگر عورت تیری کہ اُس کو پہنچ کر رہیگا جو
اَصَابَهُمْ ؕ
اُن کو پہنچے گا

مؤمنین کو بچا کر لے جانا:

یعنی صبح کو عذاب آنے والا ہے۔ تھوڑی رات رہے آپ اپنے متعلقین کو لے کر یہاں سے تشریف لے جائیے اور اپنے ہمراہیوں کو ہدایت کر دیجئے کہ جلدی کریں اور کوئی پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھے، ہاں تیری عورت کہ وہ ساتھ نہ جائے گی یا پیچھے پھر کر دیکھے گی۔ اس طرح اس عذاب کی لپیٹ میں آ جائے گی۔ جو سب قوم کو پہنچنے والا ہے۔ کہتے ہیں کہ اسی عورت نے قوم کو مہمانوں کی آمد سے مطلع کیا تھا۔

اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ؕ اَلَيْسَ الصُّبْحُ
اُن کے وعدہ کا وقت ہے صبح کیا صبح نہیں ہے
بِقَرِيْبٍ ﴿۸۱﴾
نزدیک

عذاب کی آمد:

یعنی خوش ہو جا۔ یہ اب ان ظالموں کے ہلاک ہونے میں کچھ دیر نہیں ہے صبح ہوتے ہی سب کا صفایا ہو جائے گا۔ (تفسیر عثمانیؒ)

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ خود حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی ان لوگوں کے پاس آتے انہیں سمجھاتے کہ دیکھو عذاب خدا نہ خریدو مگر انہوں نے خلیل خدا کی بھی نہ مان کر دی۔ یہاں تک کہ عذابوں کے آنے کا قدرتی وقت آ پہنچا۔ فرشتے حضرت لوط علیہ السلام کے پاس آئے۔ آپؑ اس وقت اپنے کھیت میں کام کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ آج کی رات ہم آپ کے مہمان

ہیں۔ حضرت جبرئیلؑ فرمانِ خُدا ہو چکا تھا کہ جب تک حضرت لوط علیہ السلام تین مرتبہ ان کی بدچلنی کی شہادت نہ دے لیں ان پر عذاب نہ کیا جائے۔ آپؑ جب انہیں لے کر چلے تو چلتے ہی خبر دی کہ یہاں کے لوگ بڑے بد ہیں۔ یہ یہ برائی ان میں گھسی ہوئی ہے، کچھ دور اور جانے کے بعد دوبارہ کہا کہ کیا تمہیں اس بستی کے لوگوں کی برائی کی خبر نہیں؟ میرے علم میں تو اسروئے زمین پر ان سے زیادہ برے لوگ نہیں۔ آہ میں تمہیں کہاں لے جاؤں؟ میری قوم تو تمام مخلوق سے بدتر ہے۔ اس وقت جبرئیلؑ نے فرشتوں سے کہا دیکھو دو مرتبہ یہ کہہ چکے۔ جب انہیں لے کر آپؑ اپنے گھر کے دروازے پر پہنچے تو رنج وافسوس سے رو دیئے اور کہنے لگے میری قوم تمام مخلوق سے بدتر ہے۔ تمہیں کیا معلوم نہیں کہ یہ کس بدی میں مبتلا ہیں، روئے زمین پر کوئی بستی اس بستی سے بُری نہیں۔ اس وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام نے پھر فرشتوں سے فرمایا دیکھو تین مرتبہ یہ اپنی قوم کی بدچلنی کی شہادت دے چکے یاد رکھنا۔ اب عذاب ثابت ہو چکا۔ گھر میں گئے اور یہاں سے آپؑ کی بڑھیا بیوی اونچی جگہ پر چڑھ کر کپڑا ہلانے لگی جسے دیکھتے ہی بستی کے بد اکر دوڑ پڑے۔ پوچھا کیا بات ہے۔ اس نے کہا لوطؑ کے ہاں مہمان آئے ہیں میں نے تو ان سے زیادہ خوب صورت اور ان سے زیادہ خوشبو والے لوگ کبھی دیکھے ہی نہیں۔ اب کیا تھا یہ خوشی خوشی مٹھیاں بن کئے دوڑتے بھاگتے حضرت لوطؑ کے گھر گئے۔ چوطرف سے آپؑ کے گھر کو گھیر لیا۔ آپؑ نے انہیں قسمیں دیں نصیحتیں کیں فرمایا کہ عورتیں بہت ہیں لیکن وہ اپنی شرارت اور اپنے بدارادے سے باز نہ آئے۔ اس وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے ان کے عذاب کی اجازت چاہی، خدا کی جانب سے اجازت مل گئی۔ آپ نے اصلی صورت کا پر کھول دیا، آپکے دو پر ہیں جن پر موتیوں کا جڑاؤ ہے۔ آپ کے دانت صاف چمکتے ہوئے ہیں۔ آپ کی پیشانی اونچی اور بڑی ہے۔ مرجان کی طرح کے دانے ہیں جو لُولُو ہیں اور آپ کے پاؤں سبزی کی طرف ہیں۔ حضرت لوط علیہ السلام سے آپ نے فرمایا کہ ہم تو تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں یہ لوگ تجھ تک پہنچ نہیں سکتے آپ اس دروازے سے نکل جائیے۔ یہ کہہ کر ان کے منہ پر اپنا پر مارا جس سے وہ اندھے ہو گئے راستوں تک کو نہیں پہچان سکتے تھے۔ حضرت لوُط علیہ السلام اپنی اہل کو لے کر راتوں رات چل دیئے یہی خدا کا حکم بھی تھا۔ محمد بن کعب، قتادہ، سدی وغیرہ کا یہی بیان ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا
پھر جب پہنچا حکم ہمارا کر ڈالی ہم نے وہ بستی
وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ
اُوپر نیچے اور برسائے ہم نے اس پر پتھر کنکر کے

بستیوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی:

جبرئیل علیہ السلام نے ان بستیوں کو اٹھا کر آسمان کے قریب سے نیچے پٹک دیا۔ اس طرح سب بستیاں تہ و بالا ہو گئیں۔ پھر ان کی نکایت اور ذلت ورسوائی کی پوری تکمیل کے لئے اوپر سے جھانوے اور پتھر برسائے گئے۔ شہر کی آبادی سے الگ جو افراد اس قوم کے جس جگہ تھے وہ بھی پتھروں سے ہلاک ہو گئے۔ (العیاذ باللہ) (تنبیہ) جو سزا اس قوم کو اوپر نیچے کرنے کی ملی وہ ان کی شرمناک حرکت سے ظاہری مناسبت رکھتی ہے۔ (تفسیر عثمانی)

بغوی نے لکھا ہے قوم لوط کی پانچ بستیاں تھیں حضرت جبرئیل نے بستیوں کے نیچے اپنا ایک بازو ڈال کر اتنا اٹھالیا کہ اوپر والوں نے مرغ کی بانگ کی اور کتوں کے بھونکنے کی آواز سنی اور کسی کا کوئی برتن بھی نہ الٹا نہ کوئی سویا ہوا شخص بیدار ہوا پر بالکل الٹ دیا۔ سب زیر وزبر ہو گئے۔ ان پانچوں شہروں کی آبادی چار لاکھ یا چار کروڑ تھی۔ ان بستیوں کو مؤتفکات (الٹی ہوئی بستیاں) کہا جاتا ہے۔ (تفسیر مظہری)

روایات میں ہے کہ یہ چار بڑے بڑے شہر تھے جن میں یہ لوگ بستے تھے، انہیں بستیوں کو قرآن کریم میں دوسری جگہ موتفکات کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا تو جبرئیل امین نے اپنا پر ان سب شہروں کی زمین کے نیچے پہنچا کر سب کو اس طرح اوپر اٹھالیا کہ ہر چیز اپنی جگہ رہی، پانی کے برتن سے پانی بھی نہیں گرا، آسمان کی طرف سے کتوں اور جانوروں اور انسانوں کی آوازیں آرہی تھیں ان سب بستیوں کو آسمان کی طرف سیدھا اٹھانے کے بعد اوندھا کر کے پلٹ دیا، جو ان کے عملِ خبیث کے مناسب حال تھا۔ (معارف القرآن)

مَّنْضُوْدٍ
تہہ بہ تہہ

''منضود'' کے معنی مترجم محققؒ نے ''تہ بہ تہ'' کئے ہیں۔ بعض نے یہ معنی لئے کہ پتھر مسلسل یکے بعد دیگرے برس رہے تھے۔

مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ
نشان کئے ہوئے تیرے رب کے پاس

مخصوص پتھر برسے:

یعنی کوئی خاص علامت ان پر تھی جو عام پتھروں سے ممتاز کر کے ظاہر کرتی تھی کہ یہ عذاب الٰہی کے پتھر ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ہر پتھر پر اس کا نام درج تھا جس کی ہلاکت کا وہ سبب بنا۔ واللہ اعلم (تفسیر عثمانی)

صحیح بخاری شریف میں ہے سجین سجیل دونوں ایک ہی ہیں۔ منضود سے

مراد پے بہ پے تہ بہ تہ ایک کے بعد ایک کے ہیں۔ ان پتھروں پر قدرتی طور پر ان لوگوں کے نام لکھے ہوئے تھے۔ جس کے نام کا پتھر تھا اسی پر گرتا تھا۔ وہ مثل طوق کے تھے جو سرخی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ یہ ان شہریوں پر بھی برسے اور یہاں کے جو لوگ اور گاؤں گوٹھ میں تھے ان پر بھی وہیں گرے۔ ان میں سے جو جہاں تھا وہیں پتھر سے ہلاک کیا گیا۔ کوئی کھڑا ہوا کسی جگہ کسی سے باتیں کر رہا ہے وہیں پتھر آسمان سے آیا اور اسے ہلاک کر گیا۔ غرض ان میں سے ایک بھی نہ بچا۔ حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں حضرت جبرئیل علیہ السلام نے انہی سب کو جمع کر کرے ان کے مکانات اور مویشیوں سمیت اونچا اٹھا لیا یہاں تک کہ ان کے کتوں کے بھونکنے کی آواز ین آسمان کے فرشتوں نے سن لیں۔ آپ اپنے داہنے پر کے کنارے پر ان کی بستی کو اٹھائے ہوئے تھے پھر انہیں زمین پر الٹ دیا۔ ایک کو دوسرے سے ٹکرا دیا اور سب ایک ساتھ غارت ہو گئے۔ اکے دکے جورہ گئے تھے ان کے بھیجے آسمانی پتھروں نے پھوڑ دیئے اور محض بے نام و نشان کر دیئے گئے۔ مذکور ہے کہ ان کی چار بستیاں تھیں۔ ہر بستی میں ایک لاکھ آدمیوں کی آبادی تھی۔ ایک روایت میں ہے تین بستیاں تھیں۔ بڑی بستی کا نام سدوم تھا۔ یہاں کبھی کبھی خلیل اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی آ کر وعظ و نصیحت فرمایا کرتے تھے۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۳﴾

اور نہیں ہے وہ بستی ان ظالموں سے کچھ دور

عبرت پکڑو:

یعنی باعتبار زمانہ کے بھی قریب ہے کیونکہ ''عاد'' و ''ثمود'' اور قوم نوح وغیرہ کے بعد یہ واقعہ ہوا۔ اور باعتبار مکان کے بھی کیونکہ ان کی بستیاں مدینہ اور شام کے درمیان میں تھیں۔ گذرنے والے قافلے وہاں کھنڈرات مشاہدہ کرتے تھے۔ یا اس جملہ '' وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ '' کا مطلب یہ ہے کہ اس طرح کا عذاب ایسے ظالموں سے اب بھی کچھ دور نہیں۔ ہمیشہ خدا کے غضب سے ڈرتے رہنا چاہئے۔ (تنبیہ) اس قصہ کے بعض اجزاء ''اعراف'' میں گزر چکے ہیں وہاں ملاحظہ کئے جائیں۔ (تفسیر عثمانیؒ)

اب بھی ظالم تباہ ہوں گے:

ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے بھی قتادہ کی طرف اس قول کی نسبت کی ہے۔ یعنی اس امت کے ظالم بھی اس امر کے مستحق ہیں کہ ان پر سنگباری کی جائے۔ قتادہ اور عکرمہ نے کہا اللہ نے کسی ظالم کو ان پتھروں سے محفوظ نہیں رکھا۔ بغوی نے لکھا ہے کہ بعض آثار میں آیا ہے کوئی ظالم ایسا نہیں کہ وہ پتھر کے نشانے پر نہ ہو۔ ہر ظالم پر ہر وقت پتھر گر سکتا ہے۔ بیضاوی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دریافت کرنے کے بعد حضرت جبرئیلؑ نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی کے ظالم مراد ہیں۔ کوئی ظالم ایسا نہیں کہ وہ پتھر کے نشانے پر نہ ہو۔ ہر وقت پتھر اس پر گر سکتا ہے۔ سیوطی نے لکھا ہے ثعلبی نے اس کو بغیر سند کے نقل کیا ہے اور مجھے اس کی سند معلوم نہیں۔ درمنثور میں ہے کہ ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے آیت مذکورہ کے ذیل میں ربیع کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ ہم نے جو کچھ سنا ہے وہ یہ ہے کہ ہر ظالم کی سیدھ میں ایک پتھر موجود ہے جو اس بات کا منتظر ہے کہ کب اس کو (ظالم پر) گرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔

بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ ھی ضمیر ان بستیوں کی طرف راجع ہے جو شام کو جاتے ہوئے کفار مکہ کے راستہ میں ادھر ادھر پڑتی تھیں۔ (تفسیر مظہریؒ)

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۚ قَالَ يٰقَوْمِ

اور مدین کی طرف بھیجا اُن کے بھائی شعیب کو بولا اے میری قوم

اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۖ وَلَا تَنْقُصُوا

بندگی کرو اللہ کی کوئی نہیں تمہارا معبود اُسکے سوائے

الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ

اور نہ گھٹاؤ ماپ اور تول کو

یہ قصہ بھی سورۂ ''اعراف'' میں گزر چکا۔ (تفسیر عثمانیؒ)

اِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ

میں دیکھتا ہوں تم کو آسودہ حال اور ڈرتا ہوں تم پر

عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ ﴿۸۴﴾

عذاب سے ایک گھیر لینے والے دن کے

حضرت شعیب کی دعوت:

یعنی خدا نے فراغت اور آسودگی عنایت کی تو ڈرتے رہو کہیں نافرمانی سے چھن نہ جائے اور آسائش و خوشحالی سلب ہو کر دنیوی یا اخروی عذاب مسلط نہ کر دیا جائے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ

اور اے قوم پورا کرو ماپ اور تول کو انصاف سے

یعنی اب تک جو ظلم و عدوان کا معیار و قانون تھا، اس کی اصلاح کرو۔

(تفسیر عثمانیؒ)

ناپ تول کا نظام درست رکھو:

اس جملہ میں صراحۃً پورا ناپنے تولنے کا حکم دیا۔ اس صریح حکم سے اس امر پر بھی تنبیہ ہوگئی کہ قصداً ناپ تول میں کمی سے اجتناب کرنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ پور پورا دینے کی کوشش کرنا بھی ضروری ہے۔ اگرچہ کچھ زیادہ ہی دینا پڑے، جس کے بغیر پورا پورا ادا کرنا مقصود نہ ہو۔ اسی لئے امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ اگر کوئی پیمائشی یا وزنی چیز کسی نے ماپ تول کر خریدی ہو اور بائع نے ناپ تول کر دی ہو تو جب تک خریدار خود دوبارہ اس کی ناپ تول نہ کر لے نہ خود (اس کو استعمال کر سکتا ہے نہ فروخت کر سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (خریدے ہوئے) غلہ کو فروخت کرنے سے اس وقت تک روکا ہے جب تک دوبار (ایک بار بائع نے اور ایک بار مشتری نے) اپنے اپنے پیمانوں سے اس کی ناپ تول نہ کر لی ہو۔ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں غلہ پیمانوں سے ناپ کر فروخت کیا جاتا تھا صاع یا فرق یا وسق وغیرہ غلہ ناپنے کے پیمانے تھے تول کر نہیں بیچا جاتا تھا۔ یہ حدیث حضرت جابر کی روایت سے ابن ماجہ اور اسحٰق بن ابی شیبہ نے نقل کی لیکن اس کی سند میں ایک راوی عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ ہے جس کی وجہ سے محدثین نے اس روایت کو معلل کر قرار دیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث آئی ہے۔ حضرت انسؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے یہ حدیث منقول ہے لیکن یہ روایت بھی ضعیف ہے ابن ہمام نے لکھا ہے کہ یہ حدیث بہت سندوں سے آئی ہے اور ائمہ نے اس کو قبول کیا ہے۔ اس لئے قابلِ استدلال ہے۔ امام مالک، امام شافعی، اور امام احمد بھی اسی کے قائل ہیں۔

یہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا وزن کر کے ذرا جھکتا ہوا دو۔ کیونکہ ہم گروہ انبیاء اسی طرح تولتے ہیں۔ رواہ احمد وابوداؤد والترمذی و النسائی وابن ماجہ والحاکم وابن حبان من حدیث سوید بن قیس، حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے۔ (تفسیر مظہریؒ)

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ
اور نہ گھٹا دو لوگوں کو اُن کی چیزیں

یعنی صرف ماپ تول میں نہیں بلکہ کسی چیز میں بھی لوگوں کے حقوق تلف مت کرو۔ (تفسیر عثمانیؒ)

وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۸۵﴾
اور مت مچاؤ زمین میں فساد

فساد نہ پھیلاؤ:

یعنی شرک و کفر سے یا کم ناپنے تولنے سے یا دوسری طرح اتلاف حقوق اور ظلم و ستم کر کے زمین میں فساد مت مچاؤ کہتے ہیں وہ لوگ ڈکیتی ڈالتے تھے اور امانت میں خیانت کرتے تھے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ
جو بچ رہے اللہ کا دیا وہ بہتر ہے تم کو اگر ہو تم ایمان والے

حلال کی کمائی میں خیر ہے:

ایک ایماندار کے لئے اللہ کا دیا ہو جو ٹھیک ٹھیک حقوق ادا کر کے بچ رہے گو قلیل ہو، اس کثیر سے بہتر ہے جو حرام طریقہ سے حاصل کیا جائے یا جس میں لوگوں کے حقوق مارے جائیں۔ مال حلال میں جو ٹھیک ماپ تول کر لیا دیا جائے فی الحال برکت ہوتی ہے اور خدا کے یہاں اجر ملتا ہے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ یعنی لوگوں کے حقوق ناپ تول پورا کر کے ادا کرنے کے بعد جو کچھ بچ رہے تمہارے لئے وہی بہتر ہے اگر تم میری بات مانو، اور اگر میری نہ مانو گے تو یاد رکھو میں اس کا ذمہ دار نہیں کہ تم پر کوئی عذاب آ جائے۔

حضرت شعیب نے دعوت میں انتہاء کردی:

حضرت شعیب علیہ السلام کے بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ خطیب الانبیاء ہیں، آپؑ نے اپنے حسنِ بیان سے اپنی قوم کو سمجھانے اور ہدایت پر لانے کی پوری کوشش میں انتہا کردی، مگر یہ سب کچھ سننے کے بعد قوم نے وہی جواب دیا جو جاہل قومیں اپنے مصلحین کو دیا کرتی ہیں۔ ان پر پھبتیاں کسیں، استہزاء کیا۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿۸۶﴾
اور میں نہیں ہوں تم پر نگہبان

یعنی میں نے تم کو نصیحت کر دی۔ آگے اس کا ذمہ دار نہیں کہ تم سے زبردستی عمل کرا کے چھوڑوں۔ (تفسیر عثمانیؒ)

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ
بولے اے شعیب کیا تیرے نماز پڑھنے نے تجھ کو یہ سکھایا
نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِىْٓ
کہ ہم چھوڑ دیں جن کو پوجتے رہے ہمارے باپ دادے یا چھوڑ
اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ۭ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ
دیں کرنا جو کچھ کہ کرتے ہیں اپنے مالوں میں تو ہی بڑا باوقار ہے

الرَّشِيدُ ﴿۸۷﴾

نیک چلن

حضرت شعیبؑ کا قوم نے مذاق اڑایا:

یہ بطور استہزاء و تمسخر کہہ رہے تھے، کہ بس زیادہ بزرگ نہ بنئے کیا ساری قوم میں ایک آپ ہی بڑے عقلمند، باوقار اور نیک چلن رہ گئے ہیں؟ باقی ہم اور ہمارے بزرگ سب جاہل اور احمق ہی رہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نماز بہت کثرت سے پڑھتے تھے، کہنے لگے کہ شاید آپ کی نماز یہ حکم دیتی ہے کہ ہم سے باپ دادوں کا پرانا دین چھڑوا دیں اور ہمارے اموال میں ہمارا مالکانہ اختیار نہ رہنے دیں۔ بس آپ اپنی نماز پڑھے جائیے، ہمارے مذہبی و دنیاوی معاملات اور ماپ تول کے قصوں میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں، ''جاہلوں کا دستور ہے کہ نیکوں کے کام آپ نہ کرسکیں تو انہیں کو چڑانے لگیں۔ یہ ہی خصلت ہے کفر کی''۔ بعض مفسرین نے '' اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ '' کو استہزاء پر نہیں، واقعیت پر حمل کیا ہے یعنی تو ایک سمجھدار، باوقار، اور نیک چلن آدمی ہے۔ پھر ایسی بے موقع باتیں کیوں کرنے لگا جیسے صالح علیہ السلام کو کہا تھا، ''قد كنت فينا مرجوا قبل هذا، اتنهانا ان نعبد ما يعبد اباؤنا الخ'' (تفسیر عثمانی)

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ

بولا اے قوم دیکھو تو اگر مجھ کو سمجھ آ گئی اپنے

مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ

رب کی طرف سے اور اُس نے روزی دی مجھ کو نیک روزی

حضرت شعیبؑ نے کہا ہدایت کی ناشکری نہیں ہوسکتی:

یا تو ظاہری روزی مراد ہے یعنی ماپ تول میں کمی بیشی کئے بدون حلال و طیب طریق سے روزی مرحمت فرمائی یا باطنی روزی یعنی علم و حکمت اور نبوت عطا کی، خلاصہ یہ ہے کہ اگر حق تعالیٰ نے مجھ کو فہم و بصیرت دے کر وہ صاف راستہ دکھلا دیا جو تم کو نظر نہیں آتا اور اس دولت سے مالا مال کیا جس سے تمہیں حصہ نہیں ملا تو کیا اس کا حق یہ ہے کہ میں ''معاذ اللہ'' تمہاری طرح اندھا بن جاؤں اور خدا کے احکام سے روگردانی کرنے لگوں، یا تمہارے استہزاء و تمسخر سے گھبرا کر نصیحت کرنا اور سمجھانا چھوڑ دوں؟ ہرگز نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰكُمْ عَنْهُ ؕ

اور میں یہ نہیں چاہتا کہ بعد کو خود کروں وہ کام جو تم سے چھڑاؤں

اپنی نصیحت کا پہلے خود پابند بنوں:

یعنی جن بری باتوں سے تم کو روکتا ہوں میری یہ خواہش نہیں کہ تم سے علیحدہ ہوکر خود ان کا ارتکاب کروں مثلاً تمہیں تارک الدنیا بناؤں اور خود دنیا سمیٹ کر گھر میں بھرلوں، نہیں جو نصیحت تم کو کرتا ہوں میں تم سے پہلے اس کا پابند ہوں، تم یہ الزام مجھ پر نہیں رکھ سکتے کہ میری نصیحت کسی خود غرضی اور ہوا پرستی پر محمول ہے۔ (تفسیر عثمانی)

وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰكُمْ عَنْهُ یعنی یہ بھی تو سمجھو کہ میں جس چیز سے تمہیں روکتا ہوں خود بھی تو اس کے پاس نہیں جاتا، اگر میں تمہیں منع کرتا اور خود اس کا ارتکاب کرتا تو تمہارے لئے کہنے کی گنجائش تھی۔

واعظ کیلئے عمل ضروری ہے:

اس سے معلوم ہوا کہ داعی اور واعظ و مبلغ کے عمل کو اس کے وعظ و نصیحت میں بڑا دخل ہوتا ہے۔ جس چیز پر واعظ خود عامل نہ ہو اس کی بات کا دوسروں پر کوئی اثر نہیں ہوتا، پھر فرمایا، اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ یعنی میرا مقصد اس ساری جد و جہد اور تمہیں بار بار کی فہمائش سے بجز اس کے کچھ نہیں کہ مقدور بھر اصلاح کی کوشش کروں، اور پھر فرمایا کہ یہ کوشش بھی درحقیقت میرے اپنے اختیار سے نہیں بلکہ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ یعنی میں جو کچھ کرتا ہوں وہ سب اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق سے کرتا ہوں، ورنہ میرے بس میں کچھ نہ تھا، اسی پر اسی پر میرا بھروسہ ہے اور اسی کی طرف ہر کام میں، میں رجوع کرتا ہوں۔ (معارف القرآن)

اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَمَا

میں تو چاہتا ہوں سنوارنا جہاں تک ہوسکے اور بن آنا ہے اللہ کی مدد

تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ﴿۸۸﴾

سے اُسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے اور اسی کی طرف میرا رجوع ہے

میں تو فقط تمہاری اصلاح چاہتا ہوں:

میری تمام تر کوشش یہ ہے کہ تمہاری دین و دنیوی حالت درست ہو جائے۔ موجودہ ردی حالت سے نکل کر ایمان و عرفان پر چڑھنے کی کوشش کرو۔ اس مقصد اصلاح کے سوا دوسرا مقصد نہیں جسے میں اپنے مقدور و استطاعت کے موافق کسی حال نہیں چھوڑ سکتا۔ باقی یہ کہ میری بات بن آئے اور اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاؤں، یہ سب خداوند قدوس کے قبضہ میں ہے۔ اسی کی امداد و توفیق سے سب کام انجام پا سکتے ہیں۔ میرا بھروسہ اسی پر ہے اور ہر معاملہ میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ (تفسیر عثمانی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قیدیوں کو رہا کر دیا:

مسندِ امام احمد میں ہے حکیم ابن معاویہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ اس کے بھائی مالک نے کہا کہ اے معاویہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے پڑوسیوں کو گرفتار کر رکھا ہے تم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے تمہاری بات چیت بھی ہو چکی ہے اور تمہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہچانتے بھی ہیں۔ پس میں اس کے ساتھ چلا، اس نے کہا کہ میرے پڑوسیوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم رہا کر دیجئے وہ مسلمان ہو چکے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منہ پھیر لیا۔ وہ غضبناک ہو کر اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا واللہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہا تو لوگ تو کہتے ہیں کہ تو ہمیں کسی امر کا حکم دیتا ہے اور تو آپ اس کا خلاف کرتا ہے۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا لوگوں نے ایسی بات زبان سے نکالی ہے؟ اگر میں ایسا کروں تو اس کا وبال مجھ پر ہی ہے۔ ان پر تو کوئی چیز نہیں، جاؤ اس کے پڑوسیوں کو چھوڑ دو۔ اور روایت میں ہے کہ اس کی قوم کے چند لوگ کسی شبہ میں گرفتار تھے۔ اس پر قوم کا ایک آدمی حاضر ہوا اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ فرما رہے تھے۔ اس نے کہا کہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی چیز سے روکتے ہیں اور خود اسے کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھا نہیں۔ اس لئے پوچھا کہ لوگ کیا کہتے ہیں۔

حضرت بہز بن حکیم کے دادا کہتے ہیں میں نے بیچ میں بولنا شروع کر دیا کہ اچھا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کان میں یہ الفاظ نہ پڑیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے میری قوم کے لئے کوئی بد دعا نکل جائے کہ پھر انہیں فلاح نہ ملے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برابر اسی کوشش میں رہے یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بات سمجھ لی اور فرمانے لگے کیا انہوں نے ایس بات زبان سے نکال دی! یا ان میں سے کوئی اس کا قائل ہے؟ واللہ اگر میں ایسا کروں تو اس کا بوجھ بار میرے ذمے ہے۔ ان پر کچھ نہیں۔ اس کے پڑوسیوں کو چھوڑ دو۔ اسی قبیل سے وہ حدیث بھی ہے جسے مسند احمد میں لائے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میری جانب سے کوئی ایسی حدیث سنو کہ تمہارے دل اس کا انکار کریں اور تمہارے بدن اور بال اس سے علیحدگی کریں اور تم سمجھ لو کہ وہ تم سے بہت دور ہے تو مکی ۹و اس سے اس سے بھی زیادہ دور ہوں۔ اس کی اسناد صحیح ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ارشاد:

حضرت مسروقؒ کہتے ہیں کہ ایک عورت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس آئی اور کہنے لگی کیا آپؓ بالوں میں بال ملانے کو منع کرتے ہیں؟ آپؓ نے فرمایا ہاں۔ اس نئے کہا آپؓ کے گھر کی بعض عورتیں تو ایسا کرتی ہیں۔ آپؓ نے فرمایا اگر ایسا ہو تو میں نے خدا کے نیک بندے کی وصیت کی حفاظت نہیں کی۔ میرا ارادہ نہیں کہ جس چیز سے تمہیں روکوں اس کے برعکس خود آپ کروں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کا واقعہ:

حضرت ابوسلیمان ضبی کہتے ہیں کہ ہمارے پاس امیر المؤمنین حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے رسالے آتے تھے جن میں حکم احکام اور ممانعت لکھے ہوئے ہوتے تھے اور آخر میں یہ ہوا کرتا تھا کہ میں بھی اس میں وہی ہوں جو خدا کے نیک بندے نے فرمایا کہ میری توفیق اللہ ہی کے فضل سے ہے اسی پر میرا توکل ہے اور اسی کی طرف میں رجوع ہوتا ہوں۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ
اور اے قوم نہ کمائیو میری ضد کر کے یہ کہ پڑے
مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ
تم پر جیسا کچھ کہ پڑ چکا قوم نوح پر یا قوم ہود پر
اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ؕ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ
یا قوم صالح پر اور قوم لوط تو تم سے
بِبَعِيْدٍ ﴿۸۹﴾
کچھ دور ہی نہیں

اے قوم! پچھلی امتوں سے عبرت پکڑو:

یعنی میری ضد اور عداوت کے جوش میں ایسی حرکتیں مت کرنا جو تم کو گزشتہ اقوام کی طرح سخت تباہ کن عذاب کا مستحق بنا دیں۔ نوح، ہود اور صالح علیہم السلام کی امتوں پر تکذیب وعداوت کی بدولت جو عذاب آئے وہ پوشیدہ نہیں، اور لوط علیہ السلام کی قوم کا قصہ تو ان سب کے بعد ماضی قریب میں ہوا ہے۔ اس کی یاد تمہارے حافظہ میں تازہ ہوگی۔ ان نظائر کو فراموش مت کرو۔ (تفسیر عثمانیؒ)

وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ
اور گناہ بخشواؤ اپنے رب سے اور رجوع کرو اُسکی طرف البتہ میرا
رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ﴿۹۰﴾
رب ہے مہربان محبت والا

توبہ واستغفار کرو:

کیسا ہی پرانا اور کٹر مجرم ہو جب صدقِ دل سے اس کی بارگاہ میں رجوع

ہو کر معافی چاہے وہ اپنی مہربانی سے معاف کر دیتا ہے۔ بلکہ اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ

بولے اے شعیب ہم نہیں سمجھتے بہت باتیں جو تو کہتا ہے

قوم کی بے پرواہی:

سمجھتے سب کچھ تھے لیکن عناد اور حق پوشی سے ایسا کہتے تھے کہ تیری بات کچھ نہیں سمجھتے، نہ معلوم کیا مجذوبوں کی بڑ ہانک رہا ہے (العیاذ باللہ) اور اگر واقعی وہ ایسی سیدھی اور صاف باتیں نے توجہی یا غباوت کی وجہ سے سمجھتے نہ تھے تو یہ کلام اپنے ظاہر پر محمول ہوگا۔ (تفسیر عثمانی)

وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا

اور ہم تو دیکھتے ہیں کہ تو ہم میں کمزور ہے

قوم نے کہا تم تو کمزور ہو:

یعنی ایک کمزور اور بے حقیقت آدمی کو خواہ مخواہ سارے جہان کو اپنا دشمن بنا رہا اسے چاہئے اپنے حال پر رحم کھائے، بیٹھے بٹھائے اپنے کو موت کے منہ میں ڈالنے سے کیا فائدہ ہے۔

حضرت شعیب کا رُونا:

(تنبیہ) بعض سلف سے "ضعیف" کے معنی "ضریر البصر" (نابینا) کے منقول ہیں۔ شاید کسی خاص وقت میں عارضی طور پر ظاہری بینائی جاتی رہی ہو۔ جیسے یوسف علیہ السلام کے فراق میں حضرت یعقوبؑ کا حال ہوا تھا۔ مفسرین نے بعض روایات نقل کی ہیں کہ حضرت شعیب علیہ السلام روتے بہت تھے، حتیٰ کہ نگاہ جاتی رہی۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ شعیب! اس قدر کیوں روتا ہے؟ جنت کے شوق میں یا دوزخ کے ڈر سے؟ عرض کیا، پروردگار! تیری لقاء کا خیال کر کے روتا ہوں کہ جس وقت آپ کا دیدار ہوگا نہ معلوم میرے ساتھ کیا برتاؤ کریں گے؟ ارشاد ہوا تجھ کو ہماری لقاء (دیدار) مبارک ہو، اے شعیب! اسی لئے میں نے اپنے کلیم موسیٰ ابن عمران کو تیری خدمت کے لئے کھڑا کر دیا ہے، کہتے ہیں خدا نے ان کی بینائی واپس کر دی۔ واللہ تعالیٰ اعلم بصحتہ۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۖ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا

اور اگر نہ ہوتے تیرے بھائی بند تو تجھ کو تو ہم سنگسار کر ڈالتے اور ہماری

بِعَزِيْزٍ ﴿۹۱﴾

نگاہ میں تیری کچھ عزت نہیں

قوم نے کہا: ہم تیرے کنبہ کا لحاظ کرتے ہیں:

یعنی تیرے کنبہ کے لوگ جو ہمارے ساتھ ہیں ان کا خیال آتا ہے ورنہ اب تک تجھے سنگسار کر ڈالتے۔ (تفسیر عثمانی)

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت شعیب کی قوم طاقت ور تھی اور آپ ان کی حفاظت میں تھے۔ بیضاوی نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ تمہاری قوم چونکہ ہماری ہم مذہب ہے اس لئے ان کی عزت ہماری نظر میں ہے اگر تمہاری قوم کی عزت ہماری نظر میں نہ ہوتی تو ہم تم کو سنگسار کر دیتے۔ (تفسیر مظہریؒ)

نظام مالیات میں شریعت کی تعلیمات:

شریعت یہ کہتی ہے کہ بے شک تم اپنے مالوں کے مالک ہو مگر ہم تمہارے وجود کے اور تمہارے مالوں کے مالک مطلق اور مالک حقیقی ہیں تم سب ہمارے بندے اور غلام ہو تم اپنی تجارت اور زراعت میں ہمارے نازل کردہ قانون کے پابند ہو جس طرح تمہارا وجود ہمارا عطیہ ہے اسی طرح تمہارے اموال ہمارے عطا کردہ اعضاء اور جورح سے اور ہمارے عطا کردہ قدرت اور اختیار سے تم نے یہ دولت کمائی ہے تم ہمارے بندے اور غلام ہو تمہیں ہمارے حکم کے سامنے دم مارنے کی مجال نہیں ہم نے اپنی رحمت اور مہربانی سے یہ کہہ دیا ہے کہ تم ان اموال کے مالک ہو مگر ہماری اس عنایت اور مرحمت کا یہ مطلب نہیں کہ تم ہمارے نازل کردہ قانون شریعت کی حدود و قیود اور اوامر ونواہی سے آزاد ہو کہ خلاف قانون جو چاہو تصرف کرو شریعت شخصی اور انفرادی ملکیت کو برقرار رکھتی ہے۔ اشتراکیت کی طرح شریعت شخصی اور انفرادی ملکیت کی منکر نہیں البتہ اس کی آزادی اور مطلق العنانی کی منکر ہے جس طرح ایک مجازی غلام اور خادم کا تصرف اور تجارتی کاروبار مجازی آقا کے ماتحت ہے۔ اسی طرح سمجھو کہ بندوں کے تمام مالی تصرفات مالک حقیقی اور خداوند احکم الحاکمین کے حکم اور قانون کے ماتحت ہیں۔ ملک کی رعایا حکومت اور صدر مملکت اور وزرائے سلطنت کی مخلوق نہیں اور اپنی ذاتی قدرت اور اختیار میں اور تجارتی کاروبار میں حکومت کے محتاج نہیں مگر بایں ہمہ ملک کی رعایا۔ قانون حکومت کے ماتحت تصرف کر سکتی ہے۔ اس کے خلاف تصرف نہیں کر سکتی۔ پس جب کہ مجازی اور قانونی حکومت میں رعایا کا تصرف قانون حکومت کے ماتحت ہونا تہذیب اور تمدن کے خلاف نہیں۔ تو خدا کی مخلوق کے تصرف کو خدا کے نازل کردہ قانون شریعت کے ماتحت قرار دینا کیسے خلاف تمدن ہو سکتا ہے۔ آج کل کے سرمایہ داروں کی طرح قوم شعیب بھی یہی کہتی تھی کہ کیا آپ کی نماز ہم کو یہ حکم دیتی ہے۔ کہ ناپ تول میں کمی کرنا چھوڑ دیں اور اپنے مالوں میں حسب منشا تصرف کرنا چھوڑ دیں۔ ان مغرورین اور متکبرین کا جواب یہ ہے کہ وہاں نماز ایسی ہی باتوں کا حکم دیتی

ہے۔ إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ تحقیق نماز فحشاء اور منکرات سے روکتی ہے۔اس لئے شعیب علیہ السلام کی نماز ان کو آمادہ کرتی تھی کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کریں۔(معارف کاندھلویؒ)

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ

بولا اے قوم کیا میرے بھائی بندوں کا دباؤ تم پر زیادہ ہے اللہ سے

وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا ۭ اِنَّ رَبِّيْ بِمَا

اور اُسکو ڈال رکھا تم نے پیٹھ پیچھے بھلا کر تحقیق میرے رب کے قابو

تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۹۲﴾

میں ہے جو کچھ کرتے ہو

اے قوم! تم خدا کا لحاظ نہیں کرتے؟

یعنی افسوس اور تعجب ہے کہ خاندان کی وجہ سے میری رعایت کرتے وہ اس وجہ سے نہیں کرتے کہ میں خدا کا بھیجا ہوا ہوں اور صاف وصریح نشانات اپنی سچائی کے دکھلا رہا ہوں۔ گویا تمہاری نگاہ میں میرے خاندان کی عزت اور اس کا دباؤ خداوند قدوس سے زیادہ ہے۔ خدا کی عظمت وجلال کو ایسا بھلا دیا کہ کبھی تمہیں تصور بھی نہیں آیا۔ جو قوم خداتعالیٰ کو بھلا کر (معاذ اللہ) پس پشت ڈال دے اسے یاد رکھنا چاہئے کہ اس کے تمامی افعال واعمال خداتعالیٰ کے علم وقدرت کے احاطہ میں ہیں۔ تم کوئی کام کرو اور کسی حالت میں ہو، ایک آن کے لئے بھی اس کے قابو سے باہر نہیں۔

وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۭ

اور اے میری قوم کام کئے جاؤ اپنی جگہ میں بھی کام

سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ

کرتا ہوں آگے معلوم کر لو گے کس پر آتا ہے عذاب رسوا کرنیوالا

وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ۭ وَارْتَقِبُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ

اور کون ہے جھوٹا اور تاکتے رہو میں بھی تمہارے ساتھ تاک

رَقِيْبٌ ﴿۹۳﴾

رہا ہوں

تو پھر فیصلہ ہونے والا ہے:

یعنی اچھا، تم اپنی ضد اور ہٹ پر جمے رہو، میں خدا کی توفیق سے راہ ہدایت پر ثابت قدم ہوں عنقریب پتہ چل جائے گا کہ ہم میں سے کس کو خدا کا عذاب فضیحت کرتا ہے اور کون جھوٹا ثابت ہوتا ہے۔ اب ہم اور تم دونوں آسمانی فیصلہ کا انتظار کرتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ

اور جب پہنچا ہمارا حکم بچا دیا ہم نے شعیب کو اور

اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ

جو ایمان لائے تھے اسکے ساتھ اپنی مہربانی سے

ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ

اور آ پکڑا اُن ظالموں کو کڑک نے پھر صبح کو رہ گئے اپنے گھروں میں

جٰثِمِيْنَ ﴿۹۴﴾ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۭ

اوندھے پڑے ہوئے گویا کبھی وہاں بسے ہی نہ تھے

قوم شعیب کی ہلاکت:

یہاں قوم شعیب کا کڑک (فرشتہ کی چیخ) سے ہلاک ہونا مذکور ہے اور ''اعراف'' میں ''رجفہ'' کا لفظ آیا ہے یعنی زلزلہ سے ہلاک ہوئے۔ اور سورۂ شعراء میں عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ'' آیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ عذاب کے بادل سائبان کی طرح ان پر محیط ہو گئے۔ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ یہ تینوں قسم کے عذاب اس قوم کے حق میں جمع کر دیئے گئے تھے، پھر ہر صورت میں وہاں کے سیاق کے مناسب عذاب کا ذکر کیا گیا۔ ''اعراف'' میں تھا کہ ان لوگوں نے شعیب سے کہا کہ ہم تم کو اور تمہارے ساتھیوں کو اپنی سرزمین سے نکال دیں گے۔ وہاں بتلا دیا گیا کہ جس زمین سے نکالنا چاہتے تھے، اسی کے زلزلہ سے ہلاک ہوئے یہاں ان کے تحت گستاخانہ مقالات کا ذکر تھا، اس لئے بالمقابل آسمانی ''صیحہ'' (کڑک) میں ان کی سب آوازیں گم ہو گئیں۔ سورۂ شعراء میں ان کا یہ قول نقل کیا ہے۔'' فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ'' یعنی اگر تو سچا ہے تو ہم پر آسمان کا ایک ٹکڑا گرا دے۔ اس کے مقابلہ میں 'عذاب یوم الظلۃ'' کا تذکرہ فرمایا۔ (تفسیر عثمانی)

سکوں کو توڑنا حرام ہے:

حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسلامی سلطنت کے سکوں کا توڑنا حرام قرار دیا ہے، اور آیت تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ کی تفسیر میں امام تفسیر حضرت زید بن

اسلم نے یہی فرمایا ہے کہ یہ لوگ درہم و دینار کو توڑ کر اپنا فائدہ حاصل کر لیا کرتے تھے جس کو قرآن نے فسادِ عظیم قرار دیا ہے۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی خلافت کے زمانہ میں ایک شخص کو اس جرم میں گرفتار کیا گیا کہ وہ درہم کو کاٹ رہا تھا، موصوف نے اس کو کوڑوں کی سزا دی اور سر مونڈھوا کر شہر میں گشت کرایا۔ (تفسیر قرطبی) (معارف القرآن)

اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ﴿٩٥﴾
سن لو پھٹکار ہے مدین کو جیسے پھٹکار ہوئی تھی ثمود کو

یعنی دونوں "صیحہ" سے ہلاک ہوئے۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ
اور البتہ بھیج چکے ہیں ہم موسیٰ کو اپنی نشانیاں اور واضح
مُّبِيْنٍ ﴿٩٦﴾
سند دے کر

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نشانیاں:

نشانیوں سے غالباً معجزات اور وہ نو آیتیں مراد ہیں، جن کا ذکر "وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍ" میں ہوا ہے۔ ان میں سے معجزۂ عصا کو جو نہایت ظاہر و قاہر تھا شاید "سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ" (واضح سند) فرمایا "سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ" سے وہ روشن دلائل مراد ہوں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے سامنے خدا تعالیٰ کے وجود و توحید وغیرہ کے متعلق پیش کئے جن کا ذکر دوسرے مقامات میں آئے گا۔ اور ممکن ہے سلطان مبین سے اس کے لغوی معنی (یعنی کھلا ہوا غلبہ) مراد لئے گئے ہوں، کیونکہ فرعونیوں کے مقابلہ پر بار بار حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نمایاں غلبہ اور فتح مبین حاصل ہوتی رہی۔ (تفسیر عثمانی)

اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۠ئِهٖ فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ
فرعون اور اُس کے سرداروں کے پاس پھر وہ چلے حکم پر
فِرْعَوْنَ ۚ وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ﴿٩٧﴾
فرعون کے اور نہیں بات فرعون کی کچھ کام کی

فرعون اور وزیروں کی جہالت:

یعنی کھلے کھلے نشان دیکھ کر بھی فرعونیوں نے پیغمبر خدا کی بات نہ مانی، اسی دشمنِ خدا کے حکم پر چلتے رہے۔ حالانکہ اس کی کوئی بات ٹھکانے کی نہ تھی، جسے مان کر انسان بھلائی حاصل کر سکتا۔ (تفسیر عثمانی)

آیت میں فرعون کے گروہ کی جہالت و حماقت کا اظہار ہے کہ فرعون الوہیت کا مدعی تھا باوجودیکہ اپنے مصاحبین کی طرح معمولی انسان تھا علی الاعلان کفر و شرک اور ظلم کرتا تھا اور موسیٰ ہادیٔ برحق تھے۔ آپ کا قول مبنی برحق تھا۔ عقل و نقل کی شہادت اور معجزات کی تائید آپ کے قول کو ثابت کر رہی تھی پھر بھی فرعون کے ساتھی ایسے کودن تھے کہ موسیٰ جیسے ہادیٔ برحق کے اتباع سے روگرداں اور فرعون جیسے باطل پرست کے پیرو تھے۔ (تفسیر مظہریؒ)

يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ۖ
آگے ہوگا اپنی قوم کے قیامت کے دن پھر پہنچائے گا اُن کو آگ پر
وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ﴿٩٨﴾
اور بُرا گھاٹ ہے جس پر پہنچے

فرعون قیامت میں جہنمیوں کا امام ہوگا:

جس طرح یہاں کفر و تکذیب میں ان کا امام تھا، قیامت کے دن بھی امام رہیگا۔ جو لوگ دنیا میں اس کی اندھی تقلید کر رہے تھے وہ اس کے پیچھے پیچھے آخری منزل (جہنم) تک پہنچ جائیں گے۔ یہی وہ گھاٹ ہے جہاں ٹھنڈے پانی کی جگہ بھسم کر دینے والی آگ ملے گی۔ (تفسیر عثمانی)

ورود کا معنی ہے چشمہ وغیرہ میں اترنا دوزخ کو پانی فرض کر کے اس میں داخل ہونے کو ورود قرار دیا (گویا دوزخ ایک چشمہ یا تالاب ہوگا جس میں فرعون آگے آگے اور اس کے اتباع جو جانوروں کی طرح جاہل ناسمجھ تھے پیچھے پیچھے اس میں اتریں گے۔ (تفسیر مظہریؒ)

وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ
اور پیچھے سے ملتی رہی اس جہان میں لعنت اور دن قیامت کے
بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ﴿٩٩﴾
بھی بُرا انعام ہے جو اُن کو ملا

ان پر ہمیشہ کی لعنت ہے:

یعنی رہتی دنیا تک لوگ فرعون اور فرعونیوں پر لعنت بھیجتے رہیں گے۔ پھر قیامت میں ملائکۃ اللہ اور اہل موقف کی طرف سے لعنت پڑے گی۔ غرض لعنت کا سلسلہ لگاتار ان کے ساتھ ساتھ چلتا رہے گا۔ گویا یہ انعام ہے جو ان کے کارناموں پر دیا گیا۔ (تفسیر عثمانی)

جاہلیت کے شاعروں کا امام:

مسند میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن

جاہلیت کے شاعروں کا جھنڈا امراؤالقیس کے ہاتھ میں ہوگا اور وہ انہیں لے کر جہنم کی طرف جائے گا۔ اس عذاب آگ پر یہ اور زیادتی ہے کہ یہاں اور وہاں دونوں جگہ یہ لوگ ابدی لعنت میں پڑے۔ قیامت کے دن کی لعنت مل کر ان پر دو لعنتیں پڑ گئیں۔ یہ اور لوگوں کو جہنم کی دعوت دینے والے امام تھے۔ اس لئے ان پر دوسری لعنت پڑی۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

ذٰلِكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيۡكَ
یہ تھوڑے سے حالات ہیں بستیوں کے کہ ہم سناتے ہیں تجھ کو بعض
مِنۡهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيۡدٌ ﴿۱۰۰﴾
اُن میں سے ابتک قائم ہیں اور بعض کی جڑ کٹ گئی

پچھلی قوموں کے یہ قصے قابل غور ہیں:

یعنی پچھلی قوموں کے قصے جو تم کو سنائے گئے کہ کس طرح انہوں نے پیغمبروں کی تکذیب اور گستاخیاں کیں، پھر کس طرح تباہ ہوئے ان میں سے بعض کی بستیاں ابھی آباد ہیں جیسے ''مصر'' جو فرعون کا مقام تھا اور بعض اجڑ گئیں مگر ان کے کچھ کھنڈر باقی ہیں۔ جیسے قوم لوط کی بستیاں، اور بعض کا نشان بھی صفحۂ ہستی پر باقی نہ رہا۔ (تفسیر عثمانیؒ)

وَمَا ظَلَمۡنٰهُمۡ وَلٰـكِنۡ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ فَمَاۤ
اور ہم نے اُن پر ظلم نہیں کیا لیکن ظلم کر گئے وہی
اَغۡنَتۡ عَنۡهُمۡ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِىۡ يَدۡعُوۡنَ
اپنی جان پر پھر کچھ کام نہ آئے اُن کے ٹھاکر (معبود)
مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مِنۡ شَىۡءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمۡرُ
جن کو پکارتے تھے سوائے اللہ کے کسی چیز میں جس وقت پہنچا حکم
رَبِّكَ‌ؕ
تیرے رب کا

انہیں اپنے ظلم نے ہلاک کیا:

یعنی خدا نے کسی کو بے قصور نہیں پکڑا جو ظلم کا وہم ہو سکے، جب وہ جرائم کے ارتکاب میں حد سے آگے نکل گئے اور اس طرح اپنے کو کھلم کھلا سزا کا مستحق ٹھہرا دیا۔ تب خدا کا عذاب آیا۔ پھر دیکھ لو جن معبودوں (دیوتاؤں کا) انہیں بڑا سہارا تھا اور جن سے بڑی بڑی توقعات قائم کر رکھی تھیں وہ ایسی سخت مصیبت کے وقت کچھ بھی کام نہ آئے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

وَمَا زَادُوۡهُمۡ غَيۡرَ تَتۡبِيۡبٍ ﴿۱۰۱﴾
اور نہیں بڑھایا اُن کے حق میں سوائے ہلاک کرنیکے

اور باطل معبودوں نے ہلاک کیا:

باطل معبود کام کیا آتے؟ الٹے ہلاکت کا سبب بنے۔ جب انہیں نفع و ضرر کا مالک سمجھا، امیدیں قائم کیں، چڑھاوے چڑھائے تعظیم اور ڈنڈوت کی، تو یہ روز بد دیکھنا پڑا۔ تکذیب انبیاء وغیرہ کا جو عذاب ہوتا شرک و بت پرستی کا عذاب اس پر مزید رہا۔ (تفسیر عثمانیؒ)

وَكَذٰلِكَ اَخۡذُ رَبِّكَ اِذَاۤ اَخَذَ الۡقُرٰى وَهِىَ
اور ایسی ہی ہے پکڑ تیرے رب کی جب پکڑتا ہے بستیوں کو اور وہ ظلم
ظَالِمَةٌ‌ ؕ اِنَّ اَخۡذَهٗۤ اَلِيۡمٌ شَدِيۡدٌ ﴿۱۰۲﴾
کرتے ہوتے ہیں بیشک اُسکی پکڑ دردناک ہے شدت (زور) کی

خدا کی پکڑ بہت سخت ہے:

یعنی ظالموں کو بڑی حد تک مہلت دی جاتی ہے جب کسی طرح باز نہیں آتے تو پکڑ کر گلا دبا دیا جاتا ہے۔ مجرم چاہے تکلیف کم ہو، یا اس کی پکڑ سے چھوٹ کر بھاگ نکلے، ایں خیال است ومحال است وجنوں۔ (تفسیر عثمانیؒ)

بیشک اللہ کی پکڑ سخت دکھ پہنچانے والی ہے جس سے رہائی ناممکن ہے۔ حضرت ابوموسیٰ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ ظالم کو ڈھیل دیتا رہتا ہے آخر اس کی گرفت کرتا ہے تو ایسی کرتا ہے کہ پھر وہ چھوٹ نہیں سکتا۔ یہ فرمانے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت كَذٰلِكَ اَخۡذُ رَبِّكَ اِذَاۤ اَخَذَ الۡقُرٰى وَهِىَ ظَالِمَةٌ تلاوت فرمائی، رواہ الشیخان فی الصحیحین والترمذی (فی السنن) وابن ماجۃ۔ (تفسیر مظہریؒ)

صحیحین میں ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا تعالیٰ ظالم کو مہلت دیتا ہے۔ پھر جب اس کو پکڑتا ہے تو چھوڑتا نہیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی

وَكَذٰلِكَ اَخۡذُ رَبِّكَ اِذَاۤ اَخَذَ الۡقُرٰى وَهِىَ ظَالِمَةٌ‌ ؕ اِنَّ اَخۡذَهٗۤ اَلِيۡمٌ شَدِيۡدٌ (معارف کاندھلویؒ)

اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنۡ خَافَ عَذَابَ
اس بات میں نشانی ہے اس کو جو ڈرتا ہے آخرت کے

الْاٰخِرَةِ
عذاب سے

دنیا کا عذاب آخرت کی یاددہانی ہے:

یعنی دنیا جو "دار عمل" جب اس میں شرک و کفر اور تکذیب انبیاء پر سزائیں ملتی ہیں اور اس قدر سخت ملتی ہیں تو یہ ایک نشان اس بات کا معلوم کرنے کا ہے کہ آخرت میں جو خالص "دار جزاء" ہے کیا کچھ سزا ان جرائم پر ملے گی؟ اور کیا صورت رستگاری کی ہوگی۔ عقلمند آدمی کے لئے جو اپنے انجام کو سوچ کر ڈرتا رہتا ہے، اس چیز میں بڑی عبرت و نصیحت ہے۔ (تفسیر عثمانی)

ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ
وہ ایک دن ہے جس میں جمع ہونگے سب لوگ اور وہ دن ہے سب
مَّشْهُوْدٌ ﴿۱۰۳﴾
کے پیش ہونے کا

جب سب کا فیصلہ ہوگا:

یعنی تمام دنیا کا بیک وقت فیصلہ اسی دن ہوگا جب سارے اولین و آخرین اکٹھے کئے جائیں گے اور کوئی شخص غیر حاضر نہ رہ سکے گا، گویا خدائی عدالت کی سب سے بڑی پیشی کا دن وہ ہی ہوگا۔ (تفسیر عثمانی)

وَمَا نُؤَخِّرُهٗٓ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ﴿۱۰۴﴾
اور اُس کو ہم دیر جو کرتے ہیں سو ایک وعدہ کے لئے جو مقرر ہے

بس میعاد پوری ہونے کی دیر ہے:

یعنی اللہ کے علم میں جو میعاد مقرر ہے وہ پوری ہو جائے گی تب وہ دن آئے گا، تاخیر سے یہ گمان مت کرو کہ یہ محض فرضی اور وہمی باتیں ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ
جس دن وہ آئے گا بات نہ کر سکے گا کوئی جاندار مگر اسکے حکم سے سو
شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ ﴿۱۰۵﴾
اُن میں بعضے بدبخت ہیں اور بعضے نیک بخت

اس دن کوئی بول نہ سکے گا:

یعنی کوئی شخص ایسی بات جو مقبول و نافع ہو بدون حکم الٰہی کے نہ کر سکے گا اور محشر کے بعض مواقف میں تو مطلقاً ایک حرف بھی اذن و اجازت کے بدون منہ سے نہ نکال سکیں گے۔ (تفسیر عثمانی)

عمل کئے جاؤ:

حضرت علی بن ابی طالب نے فرمایا ہم ایک جنازہ کے ساتھ نکلے بقیع میں پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی (چھڑی ہاتھ میں لئے سامنے سے آتے) نظر آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لا کر بیٹھ گئے تھوڑی دیر چھڑی سے زمین کو کریدتے رہے، پھر فرمایا کوئی جان (کسی بدن میں پھونکی ہوئی) ایسی نہیں کہ جنت یا دوزخ میں اس کی جگہ (پہلے سے) لکھ نہ دی گئی ہو یا اس کا شقی و سعید ہونا نہ لکھ دیا گیا ہو۔ یہ سن کر ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو پھر اپنے (مقدر میں) لکھے پر بھروسہ کیوں نہ کروں اور عمل کو ترک کیوں نہ کر دوں۔ فرمایا نہیں۔ عمل کئے جاؤ ہر ایک کو (تقدیر میں لکھے ہوئے عمل کی) توفیق دی جاتی ہے۔ شقاوت والوں کو اہل شقاوت کے عمل کی توفیق دی جاتی ہے اور اہل سعادت کو سعادت مندوں کے عمل کی توفیق دی جاتی ہے۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى الخ تلاوت فرمائی۔ رواہ البغوی، بخاری و مسلم میں بھی اسی طرح کی حدیث آئی ہے۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ سو جو لوگ شقی ہیں وہ دوزخ میں ہونگے دوزخ میں ان کی چیخ و پکار ہوگی۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا
سو جو لوگ بدبخت ہیں وہ تو آگ میں ہیں اُن کو وہاں
زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ ﴿۱۰۶﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ
چیخنا ہے اور دھاڑنا ہمیشہ رہیں اُس میں جب تک رہے
السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ۭ اِنَّ
آسمان اور زمین مگر جو چاہے تیرا رب بیشک
رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ﴿۱۰۷﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ
تیرا رب کر ڈالتا ہے جو چاہے اور جو لوگ
سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا
نیک بخت ہیں سو جنت میں ہیں ہمیشہ رہیں اُس میں

دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَاشَآءَ

جب تک رہے آسمان اور زمین مگر جو چاہے

رَبُّكَ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ﴿۱۰۸﴾

تیرا رب بخشش ہے بے انتہا

آیت کے دو مطلب:

ان آیات کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ جس قدر مدت آسمان وزمین دنیا میں باقی رہے اتنی مدت تک اشقیاء دوزخ میں اور سعداء جنت میں رہیں گے۔ مگر جو اور زیادہ چاہے تیرا رب، وہ اسی کو معلوم ہے۔ کیونکہ ہم جب طویل سے طویل زمانہ کا تصور کرتے ہیں تو اپنے ماحول کے اعتبار سے بڑی مدت یہ ہی خیال میں آتی ہے۔ اسی لئے "مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ" وغیرہ الفاظ محاورات عرب میں دوام کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے بولے جاتے ہیں۔ باقی دوام وابدیت کا اصلی مدلول جسے لامحدود زمانہ کہنا چاہئے وہ حق تعالیٰ کے علم غیر متناہی کے ساتھ مختص ہے جس کو "مَاشَآءَ رَبُّكَ" سے ادا کیا۔ دوسرے معنی آیت کے یہ ہو سکتے ہیں کہ لفظ مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ کو کنایہ دوام سے مانا جائے۔ یا آسمان وزمین سے آخرت کا زمین و آسمان مراد لیا جائے۔ جیسے فرمایا يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ (ابراہیم۔ رکوع ۷) مطلب یہ ہوا کہ اشقیاء دوزخ اور سعداء جنت میں اس وقت تک رہیں گے۔ جب تک آخرت کے زمین و آسمان باقی رہیں، یعنی ہمیشہ۔ مگر جو چاہے تیرا رب تو موقوف کر دے، وہاں ہمیشہ نہ رہنے دے۔ کیونکہ جنتیوں اور دوزخیوں کا خلود بھی اسی کی مشیت و اختیار سے ہے۔ لیکن وہ چاہ چکا کہ کفار ومشرکین کا عذاب اور اہل جنت کا ثواب کبھی موقوف نہ ہوگا۔ چنانچہ فرمادیا وَمَاهُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ (بقرہ۔ رکوع ۲۰) اور يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَاهُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا (مائدہ رکوع ۶) اور لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ (بقرہ رکوع ۱۹) اور اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (نساء رکوع ۱۸) اسی پر تمام اہل اسلام کا اجماع رہا ہے اور ہمارے زمانہ کے بعض نام نہاد مفسرین نے جو کچھ اس کے خلاف چیزیں پیش کی ہیں وہ یا روایات ضعیفہ وموضوعہ ہیں یا اقوال غریبہ ماولہ۔ یا بعض آیات واحادیث ہیں جن کا مطلب کوتاہ نظری یا بد فہمی سے غلط سمجھ لیا گیا ہے۔ اگر خدا کی توفیق سے مستقل تفسیر لکھنے کی نوبت آئی، اس میں مفصل کلام کیا جائے گا۔ اختصار کی وجہ سے یہاں گنجائش نہیں، رہا عصاۃ موحدین کا مسئلہ یعنی جو مسلمان گناہوں کی بدولت دوزخ میں ڈالے جائیں گے (العیاذ باللہ) ان کے متعلق احادیث صحیحہ نے ہم کو خدا کی مشیت پر مطلع کر دیا ہے کہ ایک دن ضرور ان کو نکال کر جنت میں پہنچائیں گے جہاں سے کسی جنتی کو کبھی نکلنا نہیں۔ شاید اسی لحاظ سے جنتیوں کے ذکر میں عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ اور اشقیاء کے ذکر میں اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ارشاد ہوا۔ تا معلوم ہو جائے کہ بعض اشقیاء دوزخ سے نکالے جائیں گے مگر سعید کوئی جنت سے خارج نہ کیا جائے گا۔

خدا کا ہمیشہ رہنا اور مخلوق کا ہمیشہ رہنا:

(تنبیہ) اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ سے متنبہ فرمادیا کہ خدا کے ہمیشہ رہنے اور مخلوق کے ہمیشہ رہنے میں فرق ہے، کسی مخلوق کا ہمیشہ رہنا بہمہ وجوہ خدا کی مشیت پر موقوف ہے۔ وہ جب چاہے فنا کر سکتا ہے، نیز یہ جتلا دیا کہ جزاء وسزا دینا اسکے اختیار ومشیت کے تابع ہے۔ آریہ سماج۔ وغیرہ کے عقیدہ کے موافق وہ اس پر مجبور نہیں۔ (تفسیر عثانی)

نکتہ: اس پیچ دار اسلوب عبارت کا فائدہ کیا ہے اور بیچ میں مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ذکر کرنے کا نتیجہ کیا اس نکتہ کو سمجھنے کیلئے دقت نظر کی ضرورت ہے پہلے طول مدت کو ذہن نشین کرنے کیلئے مدت بقائے سماء وارض کو ذکر کیا جس سے لوگ واقف تھے پھر اسکے بعد غیر متناہی اور ان گنت مدت کی طرف اشارہ کیا ہے تاکہ متناہی مدت کا طول سمجھ میں آجائے۔

اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ: بیشک آپ کا رب جو کچھ چاہے پورے طور پر اس کو کر سکتا ہے۔ یعنی اس کا اختیار کلی اور ہمہ گیر ارادہ اور محیط کل مشیت آزاد ہے وہ مجبور نہیں ہے کہ اہل جنت کو جنت اور اہل نار کو دوزخ کی سکونت دوامی دینے کے بعد بے اختیار ہو گیا ہو کہ کسی کو اس کے مسکن سے باہر نہ نکال سکے لیکن نکالے گا نہیں۔ بقول فراء یہ استثناء صحیح ہے۔

اللہ تعالیٰ جنت والوں کی طرف جھانکیں گے:

حضرت جابر راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اہل جنت اپنے عیش میں ہوں گے کہ اچانک اوپر سے ایک نور ان پر نمودار ہوگا وہ سر اٹھا کر دیکھیں گے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اوپر ان کو جھانکتا دکھائی دے گا اور خطاب فرمائے گا اے اہل جنت تم پر سلام ہو۔ آیت سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ کا یہی مطلب ہے غرض اللہ ان کی طرف دیکھے گا اور وہ اللہ کی طرف۔ اللہ کی جانب دیکھنے کے وقت وہ کسی اور نعمت کی طرف التفات بھی نہیں کریں گے۔ یہاں تک کہ اللہ حجاب کرلے گا اور اس کی چمک وبرکت اہل جنت کی گردن میں رہ جائے گی۔ (رواہ ابن ماجہ وابن ابی الدنیا ودار قطنی۔)

ہر شخص کی جنت:

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مکتوب نمبر ۱۰۰ جلد سوئم میں یعقوبؑ کی یوسفؑ کے ساتھ دلآویزی کی حقیقت کی تشریح کے ذیل میں لکھا ہے کہ اللہ کے اسماء میں سے جو اسم جس شخص کا مبدء تعین (مرکز ظہور) ہوتا ہے اس اسم کا ظہور (کسی جسم کے اندر) اس شخص کی جنت ہوتا ہے اور اس اسم کا ظہور تجلی درختوں نہروں، شاندار محلات اور حور و غلمان کی شکل میں ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت کی مٹی پاکیزہ ہے اور پانی شیریں ہے اور وہاں میدان ہیں اور اس کے پودے یہی ہیں یعنی **سبحان الله والحمد لله ولا اله الا الله** جنت کے پودے ہیں۔ حضرت مجدد نے فرمایا کبھی یہ درخت اور نہریں (چمکدار روشن) زجاجی اجسام (جیسے عینک کے آئینے) کی شکل اختیار کرلیں گے اور اللہ کے بے کیف دیدار کے حصول کا ذریعہ ہو جائیں گی (انہیں کے ذریعے سے اللہ کا دیدار حاصل ہو جائے گا مگر یہ رویت ہر کیفیت سے پاک ہوگی پھر اپنی اصلی (شجری یا نہری شکل کی طرف لوٹ آئیں گی اور مومن پھر انہیں سے (اسی شجری یا نہری شکل میں) تفریح کرے گا۔ اور اس طرح ہمیشہ ہوتا رہے گا، ہم نے اس مقام کی مزید توضیح سورۂ قیامت کی آیۂ رویت کی تفسیر کے ذیل میں کی ہے۔

اپنی قدرت کا اظہار مقصود ہے:

ابن زید نے کہا اہل جنت کے لئے تو اللہ نے اپنی غیر منقطع عطا کا ذکر کر دیا لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ دوزخیوں کے لئے کیا چاہے گا (کیا کبھی ان کا عذاب منقطع کرنا چاہے گا یا ان کا عذاب بھی لازوال ہوگا بلکہ دوزخیوں کے حق میں فرمایا اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ (تفسیر مظہری)

حضرت شاہ عبدالقادرؒ کے کلام سے مفہوم ہوتا ہے۔

اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ سے یہ بتلانا ہے کہ اہل جنت اور اہل جہنم کا خلود اور دوام مستقل نہیں بلکہ اللہ کی مشیت کے تابع ہے اور یہ مطلب ہرگز نہیں یہ ابدیت کسی وقت منقطع ہو جائے گی کیوں کہ دوسری نصوص صریحہ وقطعیہ سے یہ امر معلوم ہے کہ حق تعالیٰ کی مشیت جو اہل جنت اور اہل جہنم کے خلود کے متعلق ہے وہ کبھی منقطع نہ ہوگی اور اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ سے فقط اپنی قدرت کا ظاہر کرنا مقصود ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ خلود لازم نہیں بلکہ ہماری مشیت پر موقوف ہے ہم جب چاہیں اور جس کو چاہیں جہنم سے باہر نکال سکتے ہیں اور آیت کا خاتمہ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ بھی اسی طرف مشیر ہے۔

حضرت حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہٗ اپنے ایک وعظ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک صحیح اور لطیف جواب وہ ہے جو شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے دیا ہے جو ان کے اردو ترجمے سے معلوم ہوتا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ میں ما مصدریہ ہے اور یہ مع اپنے مدخول کے ظرف ہے۔ ای الا وقت مشیئته كما في قوله اتيک خفوق النجم ای وقت خفوقه والمعنى يخلدون فيها الا ان يشاء ربک عدم خلودهم فينقطع خلودهم اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ وہ مخلد فی النار ہوں گے مگر جس وقت خدا ان کے عدم خلود کو چاہے تو ان کا خلود اور دوام منقطع ہو جائے گا رہی یہ بات کہ اس قید کی کیا ضرورت تھی۔ سو اس کا جواب شاہ صاحب نے دیا ہے کہ اس میں توحید کی حفاظت کی گئی ہے کہ خلود واجب اور خلود ممکن کا فرق ظاہر کر دیا گیا تا کہ کوئی خلود کی خبر سن کر بقاء دائم میں واجب الوجود کے شریک ہونے کا گمان نہ کر بیٹھے کہ گو ہم جہنم میں جائیں گے مگر یہ فخر تو ہمارے لئے ثابت ہو گیا کہ ہم مثل واجب الوجود کے خلود اور بقاء کے ساتھ متصف ہو جائیں گے۔ اس لئے یہ قید لگا کر یہ بتلا دیا کہ واجب الوجود کا خلود کسی کے مشیت کے تابع نہیں۔ خلود واجب تو ذات واجب کا مقتضائے ذاتی ہے اور ہمارا اور تمہارا سب کا خلود اس کی مشیت کے تابع ہے جب چاہیں اس کو ختم کر سکتے ہیں۔ اور سب کو نکال سکتے ہیں۔ اور جب چاہیں فنا کر سکتے ہیں اس قید سے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کو ظاہر فرمایا دیکھو اجر الصیام من غیر انصرام حصہ دوم وعظ نمبر ۶۳ صفحہ ۱۸ غرض یہ کہ کلمہ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ محض اظہار قدرت ومشیت کے لئے خلود عذاب اور دوام عذاب کے انقطاع اور اختتام کے خبر دینے کے لئے نہیں۔

نیک بختی اور بدبختی کی پانچ نشانیاں:

امام بلخیؒ سے منقول ہے کہ سعادت کی پانچ نشانیاں ہیں۔ اول دل کی نرمی دوم اللہ کے خوف سے بہت رونا۔ سوم آرزو کا تھوڑا ہونا چہارم دنیا سے نفرت پنجم اللہ کے سامنے شرمندر ہنا اور علی ہذا شقاوت کی بھی پانچ نشانیاں ہیں۔ اول دل کی سختی۔ دوم آنکھوں کی خشکی۔ سوم دنیا کی رغبت چہارم آرزو کا زیادہ ہونا پنجم بے حیائی۔ (معارف کاندھلویؒ)

چیخ و پکار: حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا زفیر سخت آواز اور شہیق پست آواز۔ ضحاک اور مقاتل نے کہا گدھے کی آواز کی ابتدائی حالت کو زفیر کہتے ہیں اور آواز کی آخری حالت جب آواز لوٹ کر گدھے کے پیٹ میں گھومتی ہے شهيق کہلاتی ہے، قاموس میں بھی یہی ہے، ابوالعالیہ نے کہا حلق میں ہونے کی حالت میں آواز کو زفیر اور سینے میں (اترنے) کی حالت میں آواز کو شہیق کہا جاتا ہے۔

جنت اور جہنم کی زندگی ابدی ہے:

طبرانی، ابونعیم اور ابن مردویہ نے حضرت ابن مسعود کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر دوزخیوں سے کہہ دیا

جائے کہ تم کو دوزخ میں اتنے (برسوں) رہنا ہے جتنی سنگ ریزوں کی تعداد ہے تو وہ اس کو سن کر خوش ہو جائیں گے اور اگر اہلِ جنت سے کہہ دیا جائے کہ تم کو (جنت) میں اسقدر (مدت) رہنا ہے جتنی سنگ ریزوں کی گنتی ہے تو ان کو یہ سن کر غم پیدا ہو جائے گا۔ مگر (ایسا نہ ہوگا بلکہ) ان سب (دوزخیوں اور جنتیوں) کے لئے وہاں دوام سکونت مقرر کر دیا گیا ہے۔ طبرانی نے الکبیر میں اور حاکم نے حضرت معاذ بن جبلؓ کی روایت سے بیان کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح بھی کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کو یمن (کا حاکم بنا کر) بھیجا، حضرت معاذؓ وہاں پہنچے تو ایک تقریر میں فرمایا لوگو! میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد ہوں مجھے تمہارے پاس یہ اطلاع دینے کے لئے بھیجا گیا ہے کہ لوٹ کر اللہ کی طرف جانا ہے۔ جنت کی طرف یا دوزخ کی طرف۔ وہاں دوامی قیام ہوگا دوامی زندگی ہوگی، بغیر موت کے اور قیام ہوگا بغیر کوچ کے (یعنی کبھی وہاں سے کوچ نہیں کیا جائے گا) اور ایسے جسموں کے اندر ہوگا جو کبھی نہیں مریں گے۔ شیخین نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں چلے جائیں گے پھر ایک منادی (دونوں فریقوں کے درمیان) ندا کرے گا، اے دوزخ والو (آئندہ) موت نہیں اور اے جنت والو (آئندہ) موت نہیں۔ ہر شخص جس حالت میں ہے ہمیشہ اسی میں رہے گا۔ بخاری نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کہا جائے گا اے اہلِ جنت (تمہارے لئے) دوام ہے موت نہیں ہے اور اے اہلِ نار (دوزخ میں تمہارے لئے) دوام ہے موت نہیں ہے۔

ایک اور حدیث جس میں موت کو ذبح کر دینے کا ذکر ہے اس میں یہ بھی آیا ہے کہ ندا دی جائے گی، اے اہلِ جنت موت نہیں ہے اور دوزخ والو (آئندہ) موت نہیں ہے۔ یہ حدیث شیخین نے حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابو سعید کی روایت سے اور حاکم نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بیان کی ہے اور حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے۔

میرے نزدیک سب سے اچھا مطلب یہ ہے کہ کفار ہمیشہ جہنم میں رہیں گے مگر جب ان کو بھڑکتی آگ سے نکال کر کھولتے ابلتے پانی میں لے جا کر ڈالنا ہوگا تو جحیم سے کھینچ کر حمیم میں ڈال دیا جائے گا اور اس طرح ہمیشہ ہوتا رہے گا۔

بغوی نے آیۃ يَطُوفُونَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيمٍ آنٍ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ وہ حمیم و جحیم کے درمیان چکر لگاتے رہیں گے۔

دوزخ کے دو سانس:

شیخین نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ دوزخ نے اپنے رب سے شکایت کی اور عرض کیا اے میرے رب میرے ایک حصے کو (شدت گرمی کی سے) دوسرا حصہ کھائے جاتا ہے۔ اللہ نے اس کو (سال میں) دو سانسیں لینے کی اجازت دے دی۔ ایک سردی کے موسم میں اور ایک گرمی کے موسم میں۔ (موسم گرما میں (جو لوگ سخت ترین گرمی محسوس کرتے ہیں وہ دوزخ کی سانس کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اور سخت ترین سردی جو محسوس کرتے ہیں وہ بھی دوزخ کے سانس کے سبب سے ہوتا ہے۔ بزاز نے حضرت ابو سعید کی روایت سے اور حضرت ابو سعید نے حضرت انسؓ کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث بیان کی ہے۔

گناہ گار مسلمان جنت میں آجائیں گے:

بعض محققین کا خیال ہے کہ آیت فَأَمَّا الَّذِينَ شَقُوا میں استثناء کا رجوع (گناہ گار) مومنوں کی طرف ہے۔ بدبخت مومنوں کو گناہوں کی سزا میں اللہ دوزخ میں ڈال دے گا پھر ایک مدت کے بعد) وہاں سے رہا کر دے گا۔ حضرت انسؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کچھ لوگوں کو گناہوں کی سزا میں دوزخ کی لپٹ لگے گی، پھر اللہ اپنی رحمت سے ان کو جنت میں داخل فرما دے گا اور ان کو (اہلِ جنت کی طرف سے) جہنمی کہا جائے گا۔ رواہ البخاری

حضرت عمران بن حصین راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے دوزخ سے نکال لئے جائینگے۔ پھر ان کو جنت میں داخل کرا لیا جائے گا۔ لوگ ان کو جہنم والے کہیں گے۔ رواہ البخاری۔ طبرانی نے حضرت مغیرہ بن شعبہ کی روایت سے بھی ایسی حدیث نقل کی ہے۔ اس روایت میں اتنا زائد ہے کہ وہ لوگ اللہ سے دعا کریں گے کہ جہنمی کا نام اللہ ان سے مٹا دے۔ ان کی دعا پر اللہ یہ نام ان سے مٹا دے گا۔

حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت کے کچھ لوگوں کو ان کے گناہوں کی وجہ سے عذاب دیا جائے گا اور جتنی مدت اللہ چاہے گا وہ دوزخ میں رہیں گے۔ (دوزخ میں) مشرک ان کو عار دلائیں گے کہ تم کو تمہارے ایمان نے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا (ہماری طرح تم بھی دوزخ میں ہو) اس پر اللہ ہر موحد کو دوزخ سے نکال لے گا کوئی مؤحد وہاں باقی نہیں رہے گا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ اسی مفہوم کو (دوسرے الفاظ میں) ایک طویل حدیث کے ذیل میں طبرانی اور بیہقی اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابو موسیٰ کی روایت سے بیان کیا ہے اور طبرانی نے حضرت ابو سعید کی روایت سے بھی اس کو نقل کیا ہے۔ گناہ گار مومنوں کا دوزخ میں جانا پھر وہاں سے نکلنا اتنی احادیث میں آیا ہے جو حد تواتر تک پہنچ چکی ہیں۔ (تفسیر مظہری)

فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰۤؤُلَآءِ ؕ مَا

سو تو نہ رہ دھوکے میں اُن چیزوں سے جن کو پوجتے ہیں

يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ

یہ لوگ کچھ نہیں پوجتے مگر ویسا ہی جیسا کہ پوجتے تھے اُنکے باپ دادے

قَبْلُ ؕ وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ

اس سے پہلے اور ہم دینے والے ہیں اُن کو اُن کا حصہ یعنی عذاب

مَنْقُوْصٍ ﴿۱۰۹﴾

سے بلا نقصان

مہلت سے دھوکا نہ کھاؤ:

یعنی اتنی مخلوق کا شرک و بت پرستی کے راستہ پر پڑ لینا اور اب تک سزایاب نہ ہونا، کوئی ایسی چیز نہیں جس سے دھوکہ کھا کر آدمی شبہ میں پڑ جائے۔ یہ لوگ اپنے باپ دادوں کی کورانہ تقلید کر رہے ہیں۔ وہ جھوٹے معبود ان کے کیا کام آئے، جو ان کے کام آئیں گے؟ یقیناً ان سب کو آخرت میں عذاب کا پورا حصہ ملے گا۔ جس میں کوئی کمی نہ ہوگی یا کبھی کم نہ کیا جائے گا گویا لفظ "غَيْرَ مَنْقُوْصٍ" عطاء غَيْرَ مَجْذُوْذٍ کے مقابل ہوا۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ دنیا میں رزق وغیرہ کا جو حصہ مقدر ہے وہ پورا ملے گا پھر شرک کی پوری سزا بھگتیں گے۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ؕ

اور البتہ ہم نے دی تھی موسیٰ کو کتاب پھر اُس میں پھوٹ پڑ گئی

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ

اور اگر نہ ہوتا ایک لفظ کہ پہلے فرما چکا تھا تیرا رب تو فیصلہ ہو جاتا اُن

بَيْنَهُمْ ؕ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۱۱۰﴾

میں اور اُن کو اُس میں شبہ ہے کہ مطمئن نہیں ہونے دیتا

اختلاف کا فیصلہ قاعدے کے مطابق ہوگا:

موسیٰ علیہ السلام کو تورات دے کر بھیجا تو آپس میں پھوٹ پڑ گئی، کسی نے قبول کیا کسی نے نہ کیا۔ جس طرح آج قرآن عظیم کے متعلق یہی اختلاف ہو رہا ہے۔ بیشک خدا کو قدرت تھی کہ یہ اختلاف و تفریق پیدا نہ ہونے دیتا یا پیدا ہو چکنے کے بعد تمام مکذبین کا فوراً استیصال کر کے سارے جھگڑے ایک دم میں چکا دیتا۔ مگر اس کی حکمت تکوینی اس کو مقتضی نہ ہوئی۔ ایک بات اس کے یہاں پہلے سے طے شدہ ہے کہ انسان کو ایک خاص حد تک کسب و اختیار کی آزادی دے کر آزمائے کہ وہ کس راستہ پر چلتا ہے، آیا خالق و مخلوق کا ٹھیک ٹھیک حق پہچان کر خدا کی رحمت و کرامت کا مستحق بنتا ہے یا کجروی اور غلط کاری سے فطرت صحیحہ کی رہنمائی کو خیرباد کہہ کر اپنے کو غضب و سخط کا مظہر ٹھہراتا ہے۔ "لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا" اسی مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے انسان کی ساخت ایسی بنائی کہ وہ نیکی یا بدی کے اختیار کرنے میں بالکل مجبور و مضطر نہ ہو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ دنیا میں خیر و شر اور نیک و بد کی باہمی آویزش جاری رہے بعدہٗ مرحوم و مغضوب علیحدہ کئے جائیں۔ تا اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ کیساتھ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ والی بات بھی پوری ہو۔ غالباً یہی وہ کلمہ (لفظ) ہے جو اگر نہ فرما چکا ہوتا تو سب اختلافات کا ایک دم خاتمہ کر دیا جاتا۔ عام لوگ ان حکمتوں کو نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ کہ آئندہ بھی ان اختلافات کا فیصلہ ہوگا یا نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ؕ اِنَّهٗ

اور جتنے لوگ ہیں جب وقت آیا پورا (بھگتا دیگا) دیگا رب تیرا اُن کو

بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۱۱﴾

اُن کے اعمال اُس کو سب خبر ہے جو کچھ وہ کر رہے ہیں

وقت پر ذرہ ذرہ کا حساب ہوگا:

یعنی ابھی وقت نہیں آیا کہ ہر ایک کے عمل کا پورا بھگتان کیا جائے۔ لیکن جب وقت آئے گا تو یقیناً ذرہ ذرہ کا حساب کر دیا جائے گا۔ تاخیر عذاب سے یہ نہ سمجھو کہ اسے تمہارے اعمال کی خبر نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ؕ

سو تو سیدھا چلا جا جیسا تجھ کو حکم ہوا اور جس نے توبہ کی تیرے ساتھ

اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۲﴾

اور حد سے نہ بڑھو بیشک وہ دیکھتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو

آپ سیدھی راہ پر جمے رہیں:

آپ ان مشرکین کی جھنجھٹ میں نہ پڑیے۔ آپ کو اور ان لوگوں کو جنہوں

نے کفر وغیرہ سے توبہ کر کے آپ کی معیت اختیار کر لی اور اور حق تعالیٰ کی طرف رجوع کیا، احکام الٰہیہ پر نہایت پامردی اور استقلال کے ساتھ ہمیشہ جمے رہنا چاہئے۔عقائد، اخلاق، عبادات، معاملات، دعوت وتبلیغ وغیرہ، ہر چیز میں افراط وتفریط سے علیحدہ ہو کر توسط واستقامت کی راہ پر سیدھے چلے جاؤ، کسی معاملہ میں افراط یا تفریط کی جانب اختیار کر کے حد سے نہ نکلو، اور یقین رکھو کہ حق تعالیٰ ہر آن تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔(تفسیر عثانیؒ)

(۱) عقائد کی استقامت، یعنی اللہ کی ذات کو تمام صفات کمالیہ کا جامع سمجھنا (صفات خداوندی کا انکار نہ کرنا) مگر اس کی صفات کو مخلوق کی صفات کے مشابہ بھی نہ قرار دینا (یعنی یہ عقیدہ رکھنا کہ اللہ کی کوئی صفت مخلوق کی صفت.....کی طرح نہیں ہے۔اس کی صفات کامل ہیں) اور نہ بندوں کو بالکل مجبور سمجھ لینا نہ کامل مختار (یعنی انسان کو در و دیوار اور چرند پرند کی طرح بے اختیار بھی نہ سمجھنا اور نہ قادر مطلق بے لگام مختار کہ جیسا چاہے کر سکے اور جب چاہے جا سکے بلکہ درمیانی سیدھی راہ پر ہی چلنا)

(۲) اعمال کی استقامت یعنی وحی اور شریعت کو پورا پورا بیان کر دینا نہ اس میں زیادتی کرنا نہ کمی۔

(۳) عبادات اور معاملات کو ان کے حقوق کے موافق ادا کرنا نہ ان میں (جذبہ خیر کے زیر اثر) زیادتی کرنا (کہ پانچ وقت کی جگہ چھ وقت کی نماز فرض قرار دے دی جائے) نہ کمی کرنا (کہ چار رکعت فرض کی جگہ تین رکعتیں مقرر کر لی جائیں)

حضرت عمر بن خطاب نے فرمایا، استقامت سے مراد یہ ہے کہ اوامر نواہی پر قائم ہو جائے اور لومڑی کی طرح راہ مستقیم سے ادھر ادھر نہ مڑے۔

استقامت کی اہمیت:

استقامت بہت ہی سخت حکم ہے (یعنی اس پر عمل کرنا انتہائی دشوار ہے) اس لئے صوفیاء کا قول ہے کہ استقامت کا مرتبہ کرامت سے اونچا ہے۔ بغوی نے حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری نبوت کی مدت میں اس آیت سے زیادہ سخت آپ پر کوئی اور آیت نازل نہ ہوئی اس لئے حضور نے فرمایا تھا مجھے سورۂ ہود نے بوڑھا کر دیا، میں کہتا ہوں حضرت ابن عباس کے اس قول سے معلوم ہو رہا ہے کہ سورۂ ہود نے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بوڑھا کر دیا اس سے مراد پوری سورۃ نہیں بلکہ، اس سورۃ کی یہی آیت ہے جس میں استقامت کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فطرتاً اور تخلیقاً استقامت کے حامل تھے۔مگر آپ پر ایمان لانے والے اور آپ کا اتباع کرنے والی ساری امت تو ایسی نہ تھی اور امت پر آپ بڑے مہربان تھے اسی فکر نے آپ کو بوڑھا کر دیا کہ امت کے لئے استقامت سخت دشوار ہے اس کا کیا ہوگا۔

بظاہر فرمان نبوی شیبتنی سورۃ ہود کا یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ ہود میں گذشتہ امتوں کی نافرمانی اور ان کی ہلاکتوں کا بیان کیا گیا ہے جس سے اشارہ اس امر کی طرف بھی مستفاد ہوتا ہے کہ اس امت کے ظالموں کو بھی دنیا اور آخرت میں ایسے ہی عذاب میں مبتلا کیا جائے گا اس اندیشے نے حضور کو بوڑھا کر دیا۔

شدت اختیار نہ کرو:

حضرت ابو ہریرہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دین آسان ہے اس میں جو شدت اختیار کرے گا آخر تھک جائے گا، قوت جسمانی جواب دیدے گی، اور دینی شدت اس کو مغلوب کر دے گی۔لہٰذا تم سیدھی اور درمیانی چال چلو اور (کامیابی کی لوگوں کو) بشارت دو (سختی کر کے مایوس نہ بناؤ) اور رفتار صبح وشام اور کچھ سیر شب سے مدد حاصل کرو۔رواہ البخاری والنسائی۔

میں کہتا ہوں اس حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بوڑھا کر دینے والا بار استقامت تھا۔(تفسیر مظہری)

استقامت کا مفہوم:

''استقامت'' کے معنی سیدھا کھڑا رہنے کے ہیں، جس میں کسی طرف ذرا سا جھکاؤ نہ ہو، ظاہر ہے کہ یہ کام آسان نہیں، کسی لوہے، پتھر وغیرہ کے عمود کو ماہر انجینئر ایک مرتبہ اس طرح کھڑا سکتے ہیں کہ اس کے ہر طرف زاویہ قائمہ ہی رہے کسی طرف ادنیٰ میلان نہو، لیکن کسی متحرک چیز کا ہر وقت ہر حال میں اس حالت پر قائم رہنا کس قدر مشکل ہے وہ اہل بصیرت سے مخفی نہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام مسلمانوں کو اس آیت میں اپنے ہر کام میں ہر حال میں استقامت پر رہنے کا حکم فرمایا گیا ہے، استقامت لفظ تو چھوٹا سا ہے مگر مفہوم اس کا ایک عظیم الشان وسعت رکھتا ہے کیونکہ معنی اس کے یہ ہیں کہ انسان اپنے عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق، معاشرت، کسب معاش اور اس کی آمد و صرف کے تمام ابواب میں اللہ جل شانہ، کی قائم کردہ حدود کے اندر اُسکے بتلائے ہوئے راستہ پر سیدھا چلتا رہے، ان میں سے کسی باب کے کسی عمل اور کسی حال میں کسی ایک طرف جھکاؤ یا کمی، زیادتی ہو جائے تو استقامت باقی نہیں رہتی۔

تمام گمراہیوں کی بنیاد:

دنیا میں جتنی گمراہیاں اور عملی خرابیاں آتی ہیں وہ سب اسی استقامت سے ہٹ جانے کا نتیجہ ہوتی ہیں، عقائد میں استقامت نہ رہے تو بدعات سے شروع ہو کر کفر وشرک تک نوبت پہنچتی ہے، اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی ذات وصفات کے متعلق جو معتدل اور صحیح اصول رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلمنے بیان فرمائے اس میں افراط وتفریط یا کمی بیشی کرنے والے خواہ نیک نیتی ہی سے اس میں مبتلا ہوں گمراہ کہلائیں گے، انبیاء علیہم السلام کی عظمت ومحبت کی جو حدود مقرر کر دی گئی ہیں ان میں کمی کرنے والوں کا گمراہ وگستاخ ہونا تو سب ہی جانتے ہیں، ان میں زیادتی اور غُلو کر کے رسول کو خدائی صفات و اختیارات کا مالک بنا دینا بھی اسی طرح کی گمراہی ہے، یہود ونصاریٰ اسی

گمراہی میں کھوئے گئے، عبادات اور تقرب الی اللہ کے لئے جو طریقے قرآن عظیم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین فرما دیئے ہیں، ان میں ذراسی کمی کوتاہی جس طرح انسان کو استقامت سے گرا دیتی ہے اسی طرح ان میں اپنی طرف سے کوئی زیادتی بھی استقامت کو برباد کر کے انسان کو بدعات میں مبتلا کر دیتی ہے، وہ بڑی نیک نیتی سے یہ سمجھتا رہتا ہے کہ میں اپنے رب کو راضی کر رہا ہوں اور وہ عین ناراضگی کا سبب ہوتا ہے اسی لئے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو بدعات ومحدثات سے بڑی تاکید کے ساتھ منع فرمایا ہے اور اس کو شدید گمراہی قرار دیا ہے، اس لئے انسان پر لازم ہے کہ جب وہ کوئی کام عبادت اور اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاجوئی کے لئے کرے تو کرنے سے پہلے اس کی پوری تحقیق کرلے کہ یہ کام رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ سے اس کیفیت وصورت کے ساتھ ثابت ہے یا نہیں، اگر ثابت نہیں تو اس میں اپنا وقت اور توانائی ضائع نہ کرے۔

اسی طرح معاملات اور اخلاق ومعاشرت کے تمام ابواب میں قرآن کریم کے بتائے ہوئے اصول پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عملی تعلیم کے ذریعہ ایک معتدل اور صحیح راستہ قائم کر دیا ہے، جس میں دوستی، دشمنی، نرمی، گرمی، غصہ اور بُردباری، کنجوسی اور سخاوت، کسب معاش اور ترک دنیا، اللہ پر توکل اور امکانی تدبیر، اسباب ضروریہ کی فراہمی اور مسبب الاسباب پر نظر، ان سب چیزوں میں ایک ایسا معتدل صراط مستقیم مسلمانوں کو دیا ہے کہ اس کی نظر عالم میں نہیں مل سکتی، ان کو اختیار کرنے سے ہی انسان، انسان کامل بنتا ہے، اس میں استقامت سے ذرا گرنے ہی کے نتیجہ میں معاشرہ کے اندر خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ استقامت ایک ایسا جامع لفظ ہے کہ دین کے تمام اجزاء وارکان اور ان پر صحیح عمل اس کی تفسیر ہے۔

جامع عمل:

سفیان بن عبداللہ ثقفیؓ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے اسلام کے معاملہ میں کوئی ایسی جامع بات بتلا دیجئے کہ آپ کے بعد مجھے کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ رہے۔ آپ نے فرمایا قل امنت باللّٰہ ثم استقیم، یعنی اللہ پر ایمان لاؤ اور پھر اس پر مستقیم رہو، (رواہ مسلم، از قرطبی)

حضرت عبداللہ بن عباس کی نصیحت:

اور عثمانی بن حاضر ازدیؒ فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مجھے کوئی وصیت فرما دیجئے، آپ نے فرمایا علیک بتقویٰ اللہ والاستقامۃ اتبع ولا تبتدع (رواہ الدارمی فی مسندہ۔ از قرطبی) یعنی تم تقوی اور خوف خدا کو لازم پکڑو اور استقامت کو بھی، جس کا طریقہ یہ ہے کہ دین کے معاملہ میں شریعت کا اتباع کرو، اپنی طرف سے کوئی بدعت ایجاد نہ کرو۔

اس دنیا میں سب سے زیادہ دشوار کام استقامت ہی ہے اس لئے محققین صوفیاء نے فرمایا ہے کہ استقامت کا مقام کرامت سے بالاتر ہے، یعنی جو شخص دین کے کاموں میں استقامت اختیار کئے ہوئے ہے، اگرچہ عمر بھی اُس سے کوئی کرامت صادر نہ ہو، وہ اعلیٰ درجہ کا ولی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کس چیز نے بوڑھا کر دیا:

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ پورے قرآن میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس آیت سے زیادہ سخت اور شاق کوئی آیت نازل نہیں ہوئی، اور فرمایا کہ جب صحابۂ کرام نے ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لحیہ مبارک میں کچھ سفید بال دیکھ کر بطور حسرت وافسوس کے عرض کیا کہ اب تیزی سے بڑھاپا آپ کی طرف آ رہا ہے تو فرمایا کہ مجھے سورۂ ہودؔ نے بوڑھا کر دیا، سورۂ ہود کی جو پچھلی قوموں پر سخت وشدید عذاب کے واقعات مذکور ہیں وہ بھی اس کا سبب ہو سکتے ہیں مگر ابن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ آیت ہی اس کا سبب ہے۔

تفسیر قرطبی میں ابوعلی سری سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے خواب میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی تو عرض کیا کہ کیا آپ نے ایسا فرمایا ہے کہ مجھے سورۂ ہود نے بوڑھا کر دیا؟ آپ نے فرمایا ہاں! انہوں پھر دریافت کیا کہ اس سورت میں جو انبیاء علیہم السلام کے واقعات اور ان کی قوموں کے عذاب کا ذکر ہے اس نے آپ کو بوڑھا کیا؟ تو فرمایا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد نے فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ !

یہ ظاہر ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو انسان کامل کی مثالی صورت بن کر اس دنیا میں تشریف لائے تھے اور فطری طور پر استقامت آپکی عادت تھی مگر پھر اس قدر بار یا تو اس لئے محسوس فرمایا کہ آیت میں مطلق استقامت کا حکم نہیں بلکہ حکم یہ ہے کہ امر الٰہی کے مطابق استقامت ہونا چاہئے، انبیاء علیہم السلام پر جس قدر خوف وخشیت الٰہی کا غلبہ ہوتا ہے وہ سب کو معلوم ہے، اس خشیت ہی کا یہ اثر تھا کہ باوجود کامل استقامت کے یہ فکر لگ گئی کہ اللہ جل شانہٗ کو جیسی استقامت مطلوب ہے وہ پوری ہوئی یا نہیں۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کو اپنی استقامت کی تو زیادہ فکر نہ تھی کیونکہ وہ بحمد اللہ حاصل تھی مگر اس آیت میں پوری امت کو بھی یہی حکم دیا گیا ہے، امت کا استقامت پر قائم رہنا دشوار دیکھ کر یہ فکر وغم طاری ہوا۔

تاکیدی حکم:

حکم استقامت کے بعد فرمایا ولا تطغوا، یہ لفظ مصدر ''طغیان'' سے بنا ہے، اس کے معنی حد سے نکل جانے کے ہیں جو ضد ہے استقامت کی، آیت میں استقامت کا حکم مثبت انداز میں صادر فرمانے پر کفایت نہیں فرمایا بلکہ اس

کے منفی پہلو کی ممانعت بھی صراحۃً ذکر کر دی کہ عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق وغیرہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی مقرر کردہ حدود سے باہر نہ نکلو کہ یہ ہر فساد اور دینی و دنیوی خرابی کا راستہ ہے۔ (معارف القرآن)

وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ

اور مت جھکو اُن کی طرف جو ظالم ہیں پھر تم کو لگے گی

النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ

آگ اور کوئی نہیں تمہارا اللہ کے سوا مددگار

ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

پھر کہیں مدد نہ پاؤ گے

ظالموں سے ذرا بھی تعلق نہ رکھو:

پہلے ''لا تطغوا'' میں حد سے نکلنے کو منع کیا تھا اب بتلاتے ہیں کہ جو لوگ ظالم (حد سے نکلنے والے) ہیں، ان کی طرف تمہارا ذرا سا میلان اور جھکاؤ بھی نہ ہو۔ ان کی موالات، مصاحبت، تعظیم و تکریم، مدح و ثناء ظاہری تشبہ، اشتراک عمل، ہر بات سے حسب مقدور محترز رہو، مبادا آگ کی لپٹ تم کو نہ لگ جائے، پھر نہ خدا کے سوا تم کو کوئی مددگار ملے گا اور نہ خدا کی طرف سے کوئی مدد پہنچے گی۔ (تفسیر عثمانیؒ)

بیضاوی نے لکھا ہے جب ظالموں کی طرف ادنیٰ جھکاؤ کا نتیجہ دوزخ ہے تو سمجھو کہ خود ظلم کرنے اور ظلم میں منہمک رہنے کا نتیجہ کیا ہوگا۔ یہ ظلم سے باز داشت کرنے کا بلیغ ترین اسلوب بیان ہے۔

اس آیت کی اہمیت:

روایت میں آیا ہے کہ ایک شخص کسی امام کے پیچھے نماز پڑھ رہا تھا۔ امام نے یہ آیت پڑھی، یہ شخص سن کر بے ہوش ہو گیا، کچھ دیر کے بعد ہوش میں آیا اور بے ہوشی کی وجہ دریافت کی گئی تو بولا یہ سزا تو ظالم کی طرف مائل ہونے والے کی ہے ظالم کا کیا ہوگا۔ (اس تصور نے مجھے بے ہوش کر دیا)

حسن بصری کا قول منقول ہے کہ اللہ نے دین کو دو لا کے درمیان کر دیا ہے ایک لا تطغوا اور دوسرا لا ترکنوا (خود بھی حد سے تجاوز نہ کرو، اور ظالم کی طرف مائل بھی نہ ہو)۔

ناپسندیدہ عالم:

امام اوزاعی نے فرمایا اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض وہ عالم ہے جو ظالم کی ملاقات کو جاتا ہے۔

حضرت اوس کا بیان ہے میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ جو شخص ظالم کو ظالم جانتے ہوئے قوت پہنچانے کے لئے اس کے ساتھ جاتا ہے وہ اسلام سے نکل جاتا ہے۔

ظالم کی نحوست:

ایک شخص کہہ رہا تھا ظالم اپنا ہی نقصان کرتا ہے دوسرے کا نہیں کرتا۔ حضرت ابو ہریرہ نے یہ بات سن کر فرمایا کیوں نہیں، ظالم کے ظلم سے تو چڑیاں بھی اپنے آشیانے میں بھوکی مر جاتی ہیں یہ دونوں حدیثیں شعب الایمان میں مذکور ہیں۔

ظالموں سے دوستی نہ کرو:

حضرت قتادہؒ نے فرمایا کہ مراد یہ ہے کہ ظالموں سے دوستی نہ کرو اور ان کا کہنا نہ مانو، ابن جریجؒ نے فرمایا کہ ظالموں کی طرف کسی طرح کا بھی میلان نہ رکھو، ابو العالیہؒ نے فرمایا کہ ان کے اعمال افعال پر سکوت یا رضا کا اظہار نہ کرو، عکرمہؒ نے فرمایا کہ ظالموں کی صحبت میں نہ بیٹھو، قاضی بیضاویؒ نے فرمایا کہ شکل و صورت اور فیشن اور رہن سہن کے طریقوں میں ان کا اتباع کرنا یہ سب اسی ممانعت میں داخل ہے۔

قاضی بیضاویؒ نے فرمایا کہ ظلم و جور کی ممانعت اور حرمت کے لئے اس آیت میں وہ انتہائی شدت سے جو زیادہ تصور میں لائی جا سکتی ہے کیونکہ ظالموں کے ساتھ دوستی اور گہرے تعلق ہی کو نہیں بلکہ ان کی طرف ادنیٰ درجہ کے میلان اور جھکاؤ اور ان کے پاس بیٹھنے کو بھی اس میں ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

امام اوزاعیؒ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی شخص اس عالم سے زیادہ مبغوض نہیں جو اپنے دنیوی مفاد کی خاطر کسی ظالم سے ملنے کے لئے جائے۔ (مظہری)

تفسیر قرطبی میں ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اہل کفر اور اہل معصیت اور اہل بدعت کی صحبت سے اجتناب اور پرہیز واجب ہے، بجز اس کے کہ کسی مجبوری سے ان سے ملنا پڑے، اور حقیقت یہی ہے کہ انسان کی صلاح و فساد میں سب سے بڑا دخل صحبت اور ماحول کا ہوتا ہے اسی لئے حضرت حسن بصریؒ نے ان دونوں آیتوں کے دو لفظوں کے متعلق فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے پورے دین کو دو حرف لا کے اندر جمع کر دیا ہے، ایک پہلی آیت میں لا تطغوا اور دوسرا دوسری آیت میں لا ترکنوا، پہلے لفظ میں حدود شرعیہ سے نکلنے کی اور دوسرے لفظ میں بُرے لوگوں کی صحبت کی ممانعت ہے اور یہی سارے دین کا خلاصہ ہے۔ (معارف القرآن)

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا

اور قائم کر نماز کو دونوں طرف دن کے اور کچھ ٹکڑوں

مِّنَ الَّیْلِ ط
میں رات کے

اللہ کی طرف جھکو:

ظالموں کی طرف مت جھکو۔ بلکہ خدائے وحدہٗ لا شریک لہٗ کی طرف جھکو۔ یعنی صبح شام اور رات کی تاریکی میں خشوع وخضوع سے نمازیں ادا کرو یہ ہی بڑا ذریعہ خدا کی مدد حاصل کرنے کا ہے۔

(تنبیہ) دن کے دونوں طرف یعنی طلوع وغروب سے پہلے فجر اور عصر کی نمازیں مراد ہیں۔ یا ایک طرف فجر اور دوسری طرف مغرب کو رکھا جائے۔ کہ وہ بھی بالکل غروب کے متصل ہوتی ہے۔ اور بعض سلف کے نزدیک اس میں فجر اور ظہر وعصر تینوں نمازیں داخل ہیں۔ گویا دن کے دو حصے کر کے پہلے حصہ میں فجر کو اور دوسرے حصہ میں جو نصف النہار سے شروع ہو کر غروب پر ختم ہوتا ہے، دونوں نمازوں (ظہر وعصر) کو شمار کر لیا۔ اور "زُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ" سے فقط عشاء یا مغرب وعشاء دونوں مراد ہیں۔ ابن کثیر نے یہ احتمال بھی لکھا ہے کہ "طَرَفَیِ النَّهَارِ" سے فجر وعصر اور "زُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ" سے تہجد مراد ہو۔ کیونکہ ابتدائے اسلام میں یہ ہی تین نمازیں فرض ہوئی تھیں۔ بعدہٗ تہجد کی فرضیت منسوخ ہوئی اور باقی دو کے ساتھ تین کا اضافہ کیا گیا۔ (واللہ اعلم)

قرآن کریم کا اندازِ خطاب:

غور کیا جائے تو پورے قرآن میں عام طور پر یہی طرز استعمال ہوا ہے کہ امر کا مخاطب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بنایا گیا ہے اور نہی وممانعت کا مخاطب امتکو، جس میں رسولکریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت شان کا اظہار ہے کہ جو کام قابل ترک ہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی ان سے پرہیز کرتے ہیں۔ آپ کی فطرت سلیمہ اور طبیعت ہی اللہ تعالیٰ نے ایسی بنائی تھی کہ کسی بری خواہش اور بری چیز کی طرف میلان ہی نہ ہوتا تھا، یہاں تک کہ ایسی چیزیں جو ابتداء اسلام میں جائز وحلال تھیں مگر انجام کار ان کا حرام ہونا اللہ تعالیٰ کے علم میں طے شدہ تھا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے حلال ہونے کے زمانہ میں کبھی ان کے پاس نہیں گئے، جیسے شراب یا سود اور جوا وغیرہ۔

پوری امت کو نماز کی اقامت کا حکم:

اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے آپ کو اور آپ کی پوری امت کو اقامت صلوٰۃ کا حکم دیا گیا ہے، علماء تفسیر صحابہ وتابعین کا اس پر اتفاق ہے کہ "صلوٰۃ" سے مراد اس جگہ فرض نمازیں ہیں (بحر محیط، قرطبی) اور صلوٰۃ کی اقامت سے مراد اس کی پوری پابندی اور مداومت ہے، اور بعض حضرت نے فرمایا کہ نماز کو اس کے تمام آداب کے ساتھ ادا کرنا مراد ہے بعض نے فرمایا کہ نماز کو اس کے افضل وقت میں ادا کرنا مراد ہے یہی تین قول آیت وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ کی تفسیر میں منقول ہیں اور درحقیقت یہ کوئی اختلاف نہیں یہ سبھی چیزیں "اقامت الصلوٰۃ" کے مفہوم میں شامل ہیں۔

ایک وقت میں دو نمازیں جائز نہیں:

آیت ان الصلوٰۃ کانت علی المومنین کتابا موقوتا کی تشریح میں سورۂ نساء میں ہم نے امام ابو حنیفہ کے قول کی تائید میں مختلف احادیث نقل کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر نماز کا وقت دوسری نماز کے وقت دوسری نماز کے وقت سے جُدا ہے اس لئے امام صاحب کے نزدیک سفر، یا بیمار یا بارش کے عذر کی وجہ سے بھی ظہر وعصر اور مغرب وعشاء کو ملا کر ایک وقت میں پڑھنا درست نہیں اور بغیر عذر کے تو دو نمازوں کو ایک وقت میں ادا کرنا کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں۔

امام ابو حنیفہ نے ان تمام احادیث کے جواب میں فرمایا کہ ان احادیث میں ملا کر پڑھنے سے مراد جمع صوری یعنی ظہر کو آخر وقت میں پڑھنا اور عصر کو شروع وقت میں مغرب کو دیر کر کے آخر وقت میں پڑھنا اور عشاء کو جلدی کر کے آغاز وقت میں ادا کرنا اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر نماز اسی کے وقت میں ادا کی لیکن ایک میں تاخیر اور دوسری میں عجلت کرنے کی وجہ سے دونوں نمازیں ملی ہوئی (بیک وقت) نظر آنے لگیں اور حقیقت میں ہر نماز اپنے وقت میں ہوئی۔ حضرت حمنہ والی حدیث میں اس کی صراحت موجود ہے۔ اور اسی معنی پر وہ حدیث محمول ہے جو صحیحین میں حضرت ابن عباس کی روایت سے آئی ہے کہ مدینہ میں بغیر خوف اور بغیر سفر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو نمازیں جمع کر کے پڑھیں (یعنی ایک میں تاخیر کی اور دوسری میں عجلت) مسلم کی دوسری روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ بغیر خوف اور بغیر بارش کے ظہر کو عصر سے اور مغرب کو عشاء کے ساتھ ملا کر پڑھا۔ حضرت ابن عباس سے دریافت کیا گیا اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غرض کیا تھی فرمایا امت کو دشواری میں نہ رکھنا۔ طبرانی کی روایت ہے بغیر کسی وجہ کے مدینے میں دو نمازوں کو جمع کیا تھا۔ دریافت کیا گیا اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد کیا تھا فرمایا امت کے لئے سہولت پیدا کرنا۔ ظاہر ہے کہ اس حدیث میں جمع صوری (یعنی اول نماز کو آخر وقت میں اور دوسری کو اول وقت میں پڑھنا) ہی مراد ہے بلا وجہ دونوں نمازوں کو ایک نماز کے وقت میں پڑھنا تو بالا جمع درست نہیں۔ صحیح بخاری میں عمرو بن دینار کی روایت سے تو صریحاً یہی مضمون آیا ہے، الفاظ اس طرح ہیں میں نے کہا ابو الشعثاء میرا خیال ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کے وقت میں تاخیر اور عصر کی نماز میں عجلت کی ہوگی اور مغرب کو آخر وقت میں اور عشاء کو شروع وقت میں ادا کیا ہوگا۔ ابو الشعثاء نے جواب دیا میرا بھی یہی خیال ہے۔

امام ابوحنیفہ نے اپنے استدلال میں حضرت ابن مسعود کی وہ روایت پیش کی ہے جو صحیحین میں مذکور ہے حضرت عبداللہ نے فرمایا، میں نے نہیں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی نماز غیر وقت میں پڑھی ہو سوائے مزدلفہ کے، مزدلفہ میں تو حضور نے مغرب وعشاء کو جمع کر کے پڑھا تھا، اور دوسرے دن فجر کی نماز تڑکے سے وقت سے پہلے پڑھی تھی۔ شاید حضرت ابن مسعود کی مراد یہ ہے کہ معمولاً فجر کی نماز جس وقت پڑھتے تھے اس سے پہلے مزدلفہ میں پڑھ لی تھی۔ عرفہ میں دو نمازوں کو جمع کرنے کا مسئلہ چونکہ مشہور ہے اسی لئے شاید حضرت ابن مسعود نے عرض کا ذکر نہیں کیا (صرف مزدلفہ کا ذکر کیا)۔

لیلۃ التعریس والی (جب کہ پچھلی بات کو ایک جگہ سفر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑاؤ کیا تھا اور بلال کو جاگتے رہنے اور فجر کے لئے بیدار کرنے کا حکم دے کر خود سو گئے تھے اور صحابہ بھی سو گئے اور اتفاقاً بلال بھی سو گئے اور سب کی نماز قضا ہوگئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حدیث فرمائی۔ اس حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ سونے کی حالت میں (نماز قضا ہونے میں) کوئی قصور نہیں قصور تو اس بات میں ہے کہ بیداری کی حالت میں نماز میں اتنی تاخیر کر دی جائے کہ دوسری نماز کا وقت آ جائے۔ امام ابوحنیفہ نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے۔ (تفسیر مظہری)

اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ
البتہ نیکیاں دور کرتی ہیں برائیوں کو یہ یادگاری ہے
ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾
یادرکھنے والوں کو

نیکیاں برائیوں کو مٹاتی ہیں:

یعنی نمازوں کا قائم رکھنا، خدا کی یادگاری ہے، جیسے دوسری جگہ فرمایا۔ "اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ" یا یہ مطلب ہے کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ کا ضابطہ یادرکھنے والوں کے لئے یادرکھنے کی چیز ہے۔ جسے کبھی فراموش نہ کرنا چاہئے، کیونکہ اس سے مومن کو نیکیوں کی طرف خاص ترغیب ہوتی ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ نیکیاں دور کرتی ہیں برائیوں کو تین طرح، جو نیکیاں کرے اس کی برائیاں معاف ہوں، اور جو نیکیاں اختیار کرے اس سے خو برائیوں کی چھوٹے، اور جس ملک میں نیکیوں کا رواج ہو وہاں ہدایت آئے، اور گمراہی مٹے لیکن تینوں جگہ وزن غالب چاہئے۔ "جتنا میل اتنا صابون"۔ (تفسیر عثمانی)

سنن میں ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جس مسلمان سے کوئی گناہ ہو جائے پھر وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھ لے تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہ معاف فرما دیتا ہے۔ ایک مرتبہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وضو کیا پھر فرمایا اسی طرح میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وضو کرتے دیکھا ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو میرے اس وضو جیسا وضو کرے پھر دو رکعت نماز ادا کرے جس میں اپنے دل سے باتیں نہ کرے تو اس کے تمام اگلے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔ مسند میں ہے کہ آپؐ نے پانی منگوایا وضو کیا پھر فرمایا میرے اسی وضو کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وضو کیا کرتے تھے، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو میرے اس وضو جیسا وضو کرے اور کھڑا ہو کر ظہر کی نماز ادا کرے اس کی صبح سے لے کر اب تک کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ پھر عصر کی نماز پڑھے تو ظہر سے عصر تک کے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں پھر مغرب کی نماز ادا کرے تو عصر سے لے کر مغرب تک کے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔ پھر عشاء کی نماز سے مغرب سے عشاء تک کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ سوتا ہے لوٹ پوٹ ہوتا ہے پھر صبح اٹھ کر نماز فجر پڑھ لینے سے عشاء سے لے کر صبح کی نماز تک کے سب گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔ یہی ہیں وہ بھلائیاں جو برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔

پانچ نمازوں کی مثال:

صحیح حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں بتلاؤ تو اگر تم میں سے کسی کے مکان کے دروازے پر ہی نہر جاری ہوا اور وہ اس میں ہر دن پانچ مرتبہ غسل کرتا ہو تو کیا اس کے جسم پر ذرا سا بھی میل باقی رہ جائے گا؟ لوگوں نے کہا ہرگز نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بس یہی مثال پانچ نمازوں کی کہ ان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ خطائیں اور گناہ معاف فرما دیتا ہے۔ صحیح مسلم میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں پانچوں نمازیں اور جمعہ جمعہ تک اور رمضان رمضان تک کا کفارہ ہے جب تک کہ کبیرہ گناہوں سے پرہیز کیا جائے۔ مسند احمد میں ہے ہر نماز اپنے سے پہلے کی خطاؤں کو مٹا دیتی ہے۔

یہ اصول پوری امت کیلئے ہے:

بخاری میں ہے کہ کسی شخص نے ایک عورت کا بوسہ لے لیا پھر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے اس گناہ کی ندامت ظاہر کی اس پر یہ آیت اتری۔ اس نے کہا کیا میرے لئے ہی یہ مخصوص ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا نہیں بلکہ میری ساری امت کے لئے یہی حکم ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ اس نے کہا میں نے باغ میں اس عورت سے سب کچھ کیا ہاں جماع نہیں کیا، اب میں حاضر ہوں جو سزا میرے لئے آپ تجویز فرمائیں میں برداشت کرلوں گا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کوئی جواب نہ دیا اور وہ چلا گیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے اس کی پردہ پوشی کی تھی اگر یہ بھی اپنے نفس کی پردہ پوشی کرتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم برابر اسی شخص کی طرف دیکھتے رہے پھر

فرمایا اسے واپس بلالاؤ۔ جب وہ آ گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی آیت کی تلاوت فرمائی۔ اس پر حضرت معاذؓ نے دریافت کیا کہ کیا یہ اسی کے لئے ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں بلکہ سب لوگوں کے لئے ہے۔

حضرت ابوالیسر کا واقعہ:

مسند احمد میں ہے کہ ایک شخص حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا کہ ایک عورت سودا لینے کے لئے آئی تھی افسوس کہ میں اسے کوٹھڑی میں لے جا کر اس بجز جماع کے اور ہر طرح لطف اندوز ہوا۔ اب جو حکم خدا ہو وہ مجھ پر جاری کیا جائے۔ آپؓ نے فرمایا شاید اس کا خاوند غیر حاضر ہوگا؟ اس نے کہا جی ہاں یہی بات تھی۔ آپؓ نے فرمایا تم جاؤ، (حضرت) ابوبکر صدیقؓ سے یہ مسئلہ پوچھو۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے بھی یہی سوال کیا۔ پس آپؓ نے بھی حضرت عمرؓ کی طرح فرمایا پھر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی حالت بیان کی کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شاید اس کا خاوند راہِ خدا میں گیا ہوا ہوگا؟ پس قرآن کریم کی یہ آیت اتری، تو وہ کہنے لگا کیا یہ خاص میرے لئے ہی ہے؟ تو حضرت عمرؓ نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا نہیں اس طرح صرف تیری ہی آنکھیں ٹھنڈی نہیں ہو سکتیں بلکہ یہ سب لوگوں کے لئے عام ہے۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عمرؓ سچے ہیں۔

ابن جریر میں ہے کہ وہ عورت مجھ سے ایک درہم کی کھجوریں خریدنے آئی تھی تو میں نے اسے کہا کہ اندر کوٹھڑی میں اس سے بہت اچھی کھجوریں ہیں وہ اندر گئی، میں نے بھی اندر جا کر اسے چوم لیا۔ پھر وہ حضرت عمرؓ کے پاس گیا تو آپؓ نے فرمایا اللہ تعالیٰ سے ڈر اور اپنے نفس پر پردہ ڈالے رہ۔ لیکن ابوالیسر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں مجھ سے صبر نہ ہو سکا۔ میں نے جا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے واقعہ بیان کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا افسوس تو نے ایک غازی مرد کی اس کی غیر حاضری میں ایسی خیانت کی۔ میں نے تو یہ سن کر اپنے تئیں جہنمی سمجھ لیا اور میرے دل میں خیال آنے لگا کہ کاش کہ میرا اسلام اس کے بعد کا ہوتا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ذرا سی دیر اپنی گردن جھکالی۔ اسی وقت حضرت جبرئیلؑ یہ آیت لے اترے۔ ابن جریر میں ہے کہ ایک شخص نے آ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ خدا کی مقرر کردہ حد مجھ پر جاری کیجئے۔ ایک دو دفعہ اس نے یہ کہا لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز سے فارغ ہوئے تو دریافت فرمایا کہ وہ شخص کہاں ہے؟ اس نے کہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم! میں حاضر ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو نے اچھی طرح وضو کیا؟ اور ہمارے ساتھ نماز پڑھی؟ اس نے کہا جی ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بس تو ایسا ہی ہے جیسے اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔ خبردار اب کوئی ایسی حرکت نہ کرنا۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری۔

نمازوں سے گناہ جھڑ جاتے ہیں:

حضرت ابوعثمانؒ کا بیان ہے کہ میں حضرت سلمانؓ کے ساتھ تھا۔ انہوں نے ایک درخت کی خشک شاخ پکڑ کر اسے جھنجھوڑا تو تمام خشک پتے جھڑ گئے۔ پھر فرمایا ابوعثمان تم پوچھتے نہیں ہو کہ میں نے یہ کیوں کیا؟ میں نے کہا ہاں جناب ارشاد ہو۔ فرمایا اسی طرح میرے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا، پھر فرمایا جب بندہ مسلمان اچھی طرح وضو کر کے پانچوں نماز ادا کرتا ہے تو اس کے گناہ ایسے ہی جھڑ جاتے ہیں جیسے اس خشک شاخ کے پتے جھڑ گئے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی آیت کی تلاوت فرمائی۔ مسند میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں برائی اگر کوئی ہو جائے تو اس کے پیچھے ہی نیکی کر لو کہ اسے مٹا دے۔ اور لوگوں سے خوش اخلاقی سے ملا کرو۔ اور حدیث میں ہے جب تجھ سے کوئی گناہ ہو جائے تو اس کے پیچھے ہی نیکی کر لیا کر کہ اسے مٹا دے۔ میں نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا لا الہ الا اللہ پڑھنا بھی نیکی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ تو بہترین اور افضل نیکی ہے۔ ابویعلی میں ہے دن رات کے جس وقت میں کوئی لا الہ الا اللہ پڑھے اس کے نامۂ اعمال میں سے برائیاں مٹ جاتی ہیں یہاں تک کہ ان کی جگہ ویسی ہی نیکیاں ہو جاتی ہیں۔ اس کے راوی عثمان میں ضعف ہے۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

طبرانی نے ضعیف سند سے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نئی نیکی پرانی بدی کا جس طرح خوبی کے ساتھ پیچھا کرتی اور تیزی کے ساتھ اس کو پہنچ جاتی ہے اتنی پہنچ والی اور کوئی خبر میں نے نہیں دیکھی۔ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ

وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۱۵﴾

اور صبر کر البتہ اللہ ضائع نہیں کرتا ثواب نیکی کرنے والوں کا

اللہ کی امداد حاصل کرنے کا طریقہ:

قرآن کریم میں غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کی امداد و اعانت حاصل کرنے میں دو چیزوں کو خاص دخل ہے۔ صلوٰۃ اور وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (بقرۃ) یہاں بھی "صلوٰۃ" کے بعد "صبر" کا حکم فرمایا۔ مطلب یہ ہے کہ مومن خدا کی عبادت و فرمانبرداری میں ثابت قدم ہے اور کسی دکھ درد کی پروانہ کرے تب خدا کی مدد نصرت حاصل ہوتی ہے اس کے یہاں کسی نیکوکار کا اجر ضائع نہیں ہوتا، بلکہ اندازہ سے زائد ملتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

یعنی محسنین سے کلام حامل دلیل ہو گیا کہ چونکہ وہ نیکوکار ہیں اس لئے اللہ ان کے ثواب کو ضائع نہیں کرے گا۔ اس آیت میں ارشاد ہے اس امر کی جانب کہ صلوٰۃ اور صبر ہم زاد ہیں اور اخلاص نیت نہ ہو تو دونوں ناقابلِ اعتبار ہیں۔ (تفسیر مظہریؒ)

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ

سوکیوں نہ ہوئے اُن جماعتوں میں جو تم سے پہلے تھیں

اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ

ایسے لوگ جن میں اثر خیر رہا ہو کہ منع کرتے رہتے بگاڑ کرنے سے ملک میں مگر تھوڑے کہ

اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ

جن کو ہم نے بچا لیا اُن میں سے اور (اور پیچھے پڑے رہے ظالم اُسی چیز کے جس میں اُن کو

ظَلَمُوْا مَا اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۶﴾

عیش ملا) چلے وہ لوگ جو ظالم تھے وہی راہ جس میں عیش سے رہے تھے اور تھے گنہگار

نیکی کا حکم کرنا اور برائی سے روکنا ضروری ہے:

یہ پچھلوں کا حال سنا کر امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ابھارا گیا ہے کہ ان میں ''امر بالمعروف'' اور ''نہی عن المنکر'' کرنے والے بکثرت موجود رہنے چاہئیں۔ گزشتہ قومیں اس لئے تباہ ہوئیں کہ عام طور پر لوگ عیش وعشرت کے نشہ میں چور ہو کر جرائم کا ارتکاب کرتے رہے اور بڑے بااثر آدمی جن میں کوئی اثر خیر کا باقی تھا انہوں نے منع کرنا چھوڑ دیا، اس طرح کفر وعصیان اور ظلم وطغیان سے دنیا کی جو حالت بگڑ رہی تھی اس کا سنوارنے والا کوئی نہ رہا۔ چند گنتی کے آدمیوں نے ''امر بالمعروف'' کی کچھ آواز بلند کی مگر نقار خانہ میں طوطی کی صدا کون سنتا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ منع کرنے والے عذاب سے محفوظ رہے باقی سب قوم تباہ ہوگئی۔ شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں ''نیک لوگ غالب ہوتے تو قوم ہلاک نہ ہوتی۔ تھوڑے تھے سو آپ بچ گئے''۔ حدیث صحیح میں ہے جب ظالم کا ہاتھ پکڑ کر ظلم سے نہ روکا جائے اور لوگ'' امر بالمعروف'' و'' نهي عن المنكر'' ترک کر بیٹھیں، تو قریب ہے کہ خدا تعالیٰ ایسا عام عذاب بھیجے جو کسی کو نہ چھوڑے (العیاذ باللہ)

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا

اور تیرا رب ہرگز ایسا نہیں کہ ہلاک کرے بستیوں کو زبردستی سے اور

مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

لوگ وہاں کے نیک ہوں

اللہ خواہ مخواہ ہلاک نہیں کرتے:

یعنی جس بستی کے لوگ اپنی حالت درست کرنے کی طرف متوجہ ہوں، نیکی کو رواج دیں، ظلم وفساد کو روکیں تو خداوند قدوس کی یہ شان نہیں کہ خواہ مخواہ انہیں زبردستی پکڑ کر ہلاک کر دے۔ عذاب اسی وقت آتا ہے جب لوگ کفر وعصیان یا ظلم وطغیان میں حد سے نکل جائیں۔ (تفسیر عثمانیؒ)

نیک لوگ:

طبرانی اور ابوالشیخ نے حضرت جریر بن عبداللہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (مصلحون کی تشریح میں) فرمایا باہم انصاف کرتے ہوں (تو اللہ ان کو ہلاک نہیں کرتا)

شرک کی وجہ سے ہلاک نہ کرنے کی وجہ:

شرک کی وجہ سے ہلاک نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ بڑی رحمت والا ہے اپنے حقوق سے درگزر فرما دیتا ہے۔ اگر اللہ کے اور بندوں کے حقوق میں کہیں ٹکراؤ ہوتا ہو (کہ بندوں کے حقوق ادا کرنے سے اللہ کا حق فوت ہوتا ہو اور حق اللہ کی ادائیگی سے بندوں کی حق تلفی ہوتی ہو) تو فقہا نے حقوق العباد کی ادائیگی کو قابل ترجیح قرار دیا ہے، ایک مشہور مقولہ ہے کہ حکومت شرک کے ساتھ تو باقی رہ جاتی ہے، ظلم کے ساتھ باقی نہیں رہتی۔ (تفسیر مظہریؒ)

گزشتہ چند آیات کا خلاصہ:

تیسری اور چوتھی آیتوں میں پچھلی اقوام پر عذاب الٰہی نازل ہونے کی وجہ اور لوگوں کو اس سے بچنے کی ہدایت اس طرح دی گئی ہے کہ فرمایا:

''ان پچھلی قوموں میں افسوس ہے کہ ایسا نہ ہوا کہ ان میں کچھ بھی سمجھ دار نیک لوگ ہوتے جو اپنی قوم کو فساد کرنے سے باز رکھتے، بجز تھوڑے سے لوگوں کے جنہوں نے انبیاء علیہم السلام کا اتباع کیا، اور وہی عذاب سے محفوظ رہے، اور باقی پوری قوم دنیا کی لذتوں میں پھنس کر جرائم پیشہ بن گئی''۔

اس آیت میں اہل الرائے اور سمجھ دار لوگوں کو لفظ اولوبقیة سے تعبیر کیا ہے۔ بقیہ کا لفظ باقیماندہ چیز کے لئے بولا جاتا ہے، اور انسان کی عادت یہ ہے کہ جو چیز سب سے زیادہ عزیز ومحبوب ہوتی ہے اس کو ہر حال میں اپنے لئے محفوظ اور باقی رکھنے کا اہتمام کرتا ہے، ضرورت پڑنے پر دوسری ساری چیزیں قربان کر دیتا ہے مگر اس کو نہیں دیتا، اسی لئے عقل وبصیرت کو ''بقیہ'' کہا جاتا ہے کہ وہ سب سے زیادہ عزیز ہے۔

چوتھی آیت میں فرمایا کہ آپ کا رب شہروں اور بستیوں کو ظلم سے ہلاک نہیں کرتا جبکہ ان کے بسنے والے نیکوکار یعنی مسلمان ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے یہاں ظلم وجور کا کوئی امکان نہیں جن کو ہلاک کیا جاتا ہے وہ اسی کے مستحق ہوتے ہیں، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس آیت میں ظلم سے مراد شرک ہے اور مصلحون سے مراد وہ لوگ ہیں جو باوجود مشرک ہونے کے معاملات اور اخلاق اچھے رکھتے ہیں، کسی کو نقصان دوایذا نہیں پہنچاتے، جھوٹ نہیں بولتے، دھوکہ نہیں دیتے، اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ دنیا کا عذاب کسی قوم

پر محض ان کے مشرک ہونے کی وجہ سے نہیں آتا جب تک کہ وہ اعمال واخلاق میں بھی ایسے کام نہ کرنے لگیں جن سے زمین میں فساد پھیلتا ہے، پچھلی جتنی قوموں پر عذاب آئے ان کے خاص خاص اعمالِ بد اس کا سبب بنے، نوح علیہ السلام نے ناپ تول میں کمی کر کے فساد پھیلایا، قوم لوط علیہ السلام نے بدترین قسم کی بدکاری کو شیوہ بنایا، قوم موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام نے اپنے پیغمبروں پر ظلم ڈھائے، قرآن کریم نے دنیا میں ان پر عذاب آنے کا سبب انہی اعمال وافعال کو بتلایا ہے، نرے کفر وشرک کی وجہ سے دنیا میں عذاب نہیں آتا۔ اس کی سزا تو جہنم کی دائمی آگ ہے، اسی لئے بعض علماء نے فرمایا کہ ملک وسلطنت کفر وشرک کے ساتھ چل سکتے ہیں مگر ظلم وجور کے ساتھ نہیں چل سکتے۔

کون سا اختلاف برا ہے:

پانچویں آیت میں جو ارشاد فرمایا کہ اگر اللہ چاہتا تو سب انسانوں کو ایک ہی امت وملت بنا دیتا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتے تو تمام انسانوں کو زبردستی قبول اسلام پر مجبور کر ڈالتے، سب کے سب مسلمان ہی ہو جاتے ان میں کوئی اختلاف نہ رہتا مگر بتقاضائے حکمت اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کسی کو کسی عمل پر مجبور نہیں کرتے بلکہ اس نے انسان کو ایک قسم کا اختیار سپرد کر دیا ہے اس کے ماتحت وہ اچھا یا برا جو چاہے عمل کر سکتا ہے، اور انسان کی طبائع مختلف ہیں اس لئے راہیں مختلف ہوتی ہیں اور عمل مختلف ہوتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کچھ لوگ ہمیشہ دینِ حق سے اختلاف کرتے ہی رہیں گے بجز ان لوگوں کے جن پر اللہ تعالیٰ نے رحمت فرمائی، یعنی انبیاء علیہم السلام کا اتباع کرنے والے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اختلاف سے مراد اس جگہ دینِ حق اور تعلیمِ انبیاء کی مخالفت ہے، اجتہادی اختلاف جو ائمۂ دین اور فقہائے اسلام میں ہونا ناگزیر ہے اور عہد صحابہؓ سے ہوتا چلا آیا ہے، وہ اس میں داخل نہیں، نہ وہ رحمتِ الٰہی کے خلاف ہے بلکہ مقتضائے حکمت و رحمت ہے، جن حضرات نے ائمۂ مجتہدین کے اختلاف کو اس آیت کی رو سے غلط، خلافِ رحمت قرار دیا ہے، یہ خود سیاقِ آیت کے بھی خلاف ہے اور صحابہ و تابعین کے تعامل کے بھی۔ واللّٰہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔ (معارف القرآن مفتی اعظم)

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً

اور اگر چاہتا تیرا رب کر ڈالتا لوگوں کو ایک

وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ اِلَّا

رستہ پر اور ہمیشہ رہتے ہیں اختلاف میں مگر جن پر رحم

مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ؕ

کیا تیرے رب نے

تکوینی حکمت:

یعنی جیسا کہ بارہا پہلے لکھا جا چکا ہے خدا تعالیٰ کی حکمت تکوینی اس کو مقتضی نہیں ہوئی کہ ساری دنیا کو ایک ہی راستہ پر ڈال دیتا۔ اسی لئے حق کے قبول کرنے نہ کرنے میں ہمیشہ اختلاف رہتا ہے اور رہے گا۔ مگر فی الحقیقت اختلاف اور پھوٹ ڈالنے والے وہ لوگ ہیں جنہوں نے صاف و صریح فطرت کے خلاف حق کو جھٹلایا۔ اگر فطرت سلیمہ کے موافق سب چلتے تو کوئی اختلاف نہ ہوتا۔ اسی لئے "اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ" سے متنبہ فرما دیا کہ جن پر خدا نے ان کی حق پرستی کی بدولت رحم کیا وہ اختلاف کرنے والوں سے مستثنیٰ ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

اللہ کی مشیت اور حکم:

آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ اللہ کی مشیت الگ چیز ہے اور حکم جدا حیثیت رکھتا ہے اور دونوں ایک نہیں ہیں۔ اللہ نے ہر شخص کو مومن بنانے کا وعدہ نہیں کیا ہے اگر وہ چاہتا تو اس کی مشیت کے مطابق ضرور ہو جاتا۔

سیدھا راستہ:

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا ہمارے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سیدھی لکیر کھینچی اور فرمایا یہ اللہ کا راستہ ہے پھر دائیں بائیں کچھ خطوط (ترچھے) کھینچے اور فرمایا یہ (مختلف) راستے ہیں۔ ان میں سے ہر راستہ پر شیطان بیٹھا اپنی طرف بلا رہا ہے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (یہ آیت) تلاوت فرمائی،

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِىْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ

رواہ احمد والنسائی والدارمی۔ (تفسیر مظہری)

وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ

اور اسی واسطے اُن کو پیدا کیا ہے اور پوری ہوئی

لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ

بات تیرے رب کی کہ البتہ بھر دونگا دوزخ جنوں سے

اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

اور آدمیوں سے اکٹھے

دنیا کو پیدا کرنے کی غرض:

یعنی دنیا کی آفرینش سے غرض یہ ہی ہے کہ حق تعالیٰ کی ہر قسم کی ''صفات جمالیہ'' و ''قہریہ'' کا ظہور ہو، اس لئے مظاہر کا مختلف ہونا ضروری ہے۔ تاکہ ایک جماعت اپنے مالک کی وفاداری واطاعت دکھا کر رحمت وکرم اور رضوان وغفران کا مظہر بنے۔ جو اِلَّا مَنۡ رَّحِمَ رَبُّكَ کی مصداق ہے اور دوسری جماعت اپنی بغاوت وغداری سے اس کی صفت عدل وانتقام کا مظہر بن کر حبس دوام کی سزا بھگتے۔ جس پر خدا کی یہ بات پوری ہو۔ ''لَاَمۡلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الۡجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجۡمَعِيۡنَ'' بہر حال آفرینش عالم کا تشریعی مقصد عبادت ہے، وَمَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَالۡاِنۡسَ اِلَّا لِيَعۡبُدُوۡنِ (الذریات۔ رکوع۳) اور تکوینی غرض یہ ہے کہ تشریعی مقصد کو اپنے کسب واختیار سے پورا کرنے اور نہ کرنے والے دوگروہ ایسے موجود ہوں جو حق تعالیٰ کی صفات جلالیہ وجمالیہ یا بالفاظ دیگر لطف وقہر کے مورد ومظہر بن سکیں ؎

درکارخانۂ عشق از کفر ناگزیر است　　دوزخ کرا بسوزد گر بولہب نہ باشد

پھر لطف وکرم کے مظاہر بھی اپنے مدارج استعداد وعمل کے اعتبار سے مختلف ہونگے ؎

گلہائے رنگ رنگ سے ہے رونقِ چمن　　اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

(تفسیر عثمانیؒ)

جنت اور دوزخ کی گفتگو: صحیحین میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جنت ودوزخ میں گفتگو ہوئی۔ جنت نے کہا مجھ میں تو صرف ضعیف اور کمزور لوگ ہی داخل ہوتے ہیں۔ اور جہنم نے کہا میں تکبر اور تجبر کرنے والوں کے ساتھ مخصوص کی گئی ہوں۔ اس پر اللہ تعالیٰ عزوجل نے جنت سے فرمایا تو میری رحمت ہے جسے چاہوں تجھ سے نوازوں گا اور جہنم سے فرمایا تو میرا عذاب ہے۔ جس سے میں چاہوں تیرے عذابوں سے انتقام لوں گا۔ تم دونوں پُر ہو جاؤ گی۔ جنت میں تو برابر زیادتی رہے گی یہاں تک کہ اس کے لئے اللہ تعالیٰ ایک نئی مخلوق پیدا کرے گا اور اسے اس میں بسائے گا اور جہنم بھی برابر زیادتی طلب کرتی رہے گی یہاں تک کہ اس پر اللہ رب العزت اپنا قدم رکھ دے گا۔ تب وہ کہنے لگے گی تیری عزت کی قسم اب بس ہے بس ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيۡكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الرُّسُلِ

اور سب چیز بیان کرتے ہیں ہم تیرے پاس رسولوں کے

مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَآءَكَ فِىۡ هٰذِهِ

احوال سے جس سے تسلی دیں تیرے دل کو اور آئی تیرے پاس اس

الۡحَقُّ وَمَوۡعِظَةٌ وَّذِكۡرٰى لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۲۰﴾

سورت میں تحقیق بات اور نصیحت اور یادداشت ایمان والوں کو

بعض واقعات بیان کرنے کی حکمت:

اوپر بہت سے انبیاء ورسل کے قصص مذکور ہوئے تھے، اب ختم سورت پر ذکر قصص کی بعض حکمتوں پر تنبیہ فرماتے ہیں۔ یعنی گذشتہ اقوام ورسل کے واقعات سن کر پیغمبر علیہ السلام کا قلب بیش از بیش ساکن ومطمئن ہوتا ہے اور امت کو تحقیقی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ جن میں نصیحت وتذکیر کا بڑا سامان ہے۔ آدمی جب سنتا ہے کہ میرے ابنائے نوع پہلے فلاں فلاں جرائم کی پاداش میں ہلاک ہو چکے ہیں تو ان سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور جب دیکھتا ہے کہ فلاں راستہ اختیار کرنے سے پچھلوں کو نجات ملی تو طبعًا اس کی طرف دوڑتا ہے۔ فی الحقیقت قرآن کریم میں قصص کا حصہ اس قدر موثر ومذکر واقع ہوا ہے کہ کوئی شخص جس میں تھوڑا سا آدمیت کا جزء ہو اور خوف خدا کی ذراسی ٹیس دل میں رکھتا ہو انہیں سن کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ باقی قصص یا بعض دوسرے مضامین کی تکرار جو قرآن کریم میں پائی جاتی ہے اس پر ہم نے رسالہ ''القاسم'' کے ابتدائی دور میں ایک مستقل مضمون لکھا ہے اسے ملاحظہ کر لیا جائے۔ (تفسیر عثمانی)

وَقُلۡ لِّلَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ اعۡمَلُوۡا عَلٰى

اور کہدے اُن کو جو ایمان نہیں لاتے کام کئے جاؤ

مَكَانَتِكُمۡ ؕ اِنَّا عٰمِلُوۡنَ ﴿۱۲۱﴾ وَانۡتَظِرُوۡا ۚ اِنَّا

اپنی جگہ پر ہم بھی کام کرتے ہیں اور انتظار کرو

مُنۡتَظِرُوۡنَ ﴿۱۲۲﴾

ہم بھی منتظر ہیں

حق وباطل کا فیصلہ ہو جائے گا صبر کرو:

اس مضمون کی آیات پہلے اسی سورت میں گذر چکی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر میری بات نہیں مانتے تو بہتر ہے تم اپنی ضد پر جمے رہو، میں اپنے مقام پر مستقیم ہوں۔ نیز تم میرے لئے حوادث دہر کا انتظار کرتے رہو۔ میں تمہارے انجام بد کا منتظر ہوں۔ چند روز میں پتہ چل جائے گا کہ ظالموں کا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔

''يَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ ؕ عَلَيۡهِمۡ دَآئِرَةُ السَّوۡءِ''

وَلِلّٰهِ غَيۡبُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاِلَيۡهِ

اور اللہ کے پاس ہے چھپی بات آسمانوں کی اور زمین کی اور اسی کی

يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ؕ

طرف رجوع ہے سب کام کا سو اُسی کی بندگی کر اور

وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

اسی پر بھروسہ رکھ اور تیرا رب بیخبر نہیں جو کام تم کرتے ہو

اللہ پر بھروسہ رکھیں:

یعنی آپ ان کے کفر و شرارت سے دلگیر نہ ہوں اپنا کام کئے جائیں اور ان کا فیصلہ خدا کے حوالہ کریں، اس سے آسمان و زمین کی کوئی بات چھپی نہیں، سب معاملات ہر پھر کر اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ وہاں ان کو پتہ لگ جائے گا کہ وہ کس خبط میں پڑے ہوئے تھے۔ آپ تو دل و جان سے اپنے پروردگار کی بندگی اور فرمانبرداری میں لگے رہئے۔ اور تنہا اسی کی اعانت پر بھروسہ رکھئے۔ وہ تمہارے مخلصانہ اعمال سے بے خبر نہیں ان کے مناسب سب تم سے معاملہ کرے گا۔ حدیث میں ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے سوال کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ پر بڑھاپے کے آثار بہت جلد آ گئے؟ فرمایا شیبتنی ھود وا خواتھا سورۂ ھود اور اس کی بہنوں نے مجھے بوڑھا کر دیا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ سورۂ ہود کی جس آیت نے آپ کو بوڑھا کر دیا یہ تھی۔ فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۭ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ رزقنا اللّٰہ سبحانہٗ و تعالیٰ الاستقامتہ علی دینہ و سنۃ نبیہ صلعم. تم سورئہ "ھود" بفضلہ منہ. (تفسیر عثمانیؒ)

حضرت ابن عباس کی روایت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ پر بڑھاپا آ گیا فرمایا مجھے (سورۂ) ہود اور الواقعہ اور المرسلات اور عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ اور اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ نے بوڑھا کر دیا۔ رواہ الترمذی والحاکم، حاکم نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔ بغوی نے بھی اس کی تصحیح کی ہے۔

احادیث مبارکہ سے صراحتہً معلوم ہو رہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بڑھاپا روز قیامت کے تذکرے اور گذشتہ امتوں (پر ہونے والے عذاب) کے ذکر سے آیا۔ امر بالاستقامتہ کو بڑھاپا آنے میں دخل نہیں ورنہ صرف سورۃ ہود کا ذکر کیا جاتا۔ (کیونکہ استقامت کا حکم صرف اسی سورت میں ہے) (تفسیر مظہری)

سورۃ کا اختتام: بغوی نے کعب کا قول نقل کیا ہے کہ توریت کا خاتمہ جس آیت پر ہوا اسی پر سورۂ ہود کا خاتمہ ہوا۔

کعب احبار سے منقول ہے کہ توریت کا شروع وہ ہے کہ جو سورہ انعام کا شروع ہے اور توریت کا خاتمہ وہ ہے جو سورہ ہود کا خاتمہ ہے۔ یعنی وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الیٰ آخر السورۃ اخرجہ ابن جریر وغیرہ تفسیر قرطبی ص ۱۱۷ ج ۹ تفسیر ابن کثیر ص ۴۶۶ ج ۲۔ (معارف کاندھلویؒ)

سورۂ یوسف

جو شخص اس کو خواب میں پڑھے اس کی تعبیر یہ ہے کہ اس کے گھر والے اس کے دشمن ہوں گے اور مسافرت میں فائدہ وحظ پالے گا۔ (حضرت ابن سیرین رحمتہ اللہ علیہ)

معارف و مسائل

سورۃ کا تعارف:

سورۂ یوسف چار آیتوں کے سوا پوری سورت مکی ہے، اس سورۃ میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ تسلسل اور ترتیب کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ اور یہ قصہ صرف اسی سورۃ میں آیا ہے پورے قرآن میں دوبارہ اس کا کہیں ذکر نہیں، یہ خصوصیت صرف قصہ یوسف علیہ السلام ہی کی ہے ورنہ تمام انبیاء علیہم السلام کے قصص و واقعات پورے قرآن میں خاص حکمت کے تحت اجزاء اجزاء کر کے لائے گئے ہیں اور بار بار لائے گئے۔

اصلاح کا نسخہ:

حقیقت یہ ہے کہ تاریخ عالم اور ماضی کے تجربات میں انسان کی آئندہ زندگی کیلئے بڑے سبق ہوتے ہیں جن کی قدرتی تاثیر کا رنگ انسان کے قلب و دماغ پر عام تعلیمات سے بہت زیادہ گہرا اور بے محنت ہوتا ہے اسی لئے قرآن کریم جو تمام اقوام عالم کے لئے آخری ہدایت نامہ کی حیثیت سے بھیجا گیا ہے اس میں پوری اقوام عالم کی تاریخ کا وہ منتخب حصہ لے لیا گیا ہے جو انسان کے حال اور مال کی اصلاح کیلئے نسخۂ کیمیا ہے۔

اصل مقصود انشاء ہے:

بعض اہل تحقیق نے فرمایا کہ انسان کے کلام کی جو دو قسمیں خبر اور انشاء مشہور ہیں، ان دونوں قسموں میں سے مقصود اصلی انشاء ہی ہے خبر بحیثیت خبر کبھی مقصود نہیں ہوتی، بلکہ دانشمند انسان کا مقصد ہر خبر اور واقعہ کو سننے اور دیکھنے سے صرف اپنے حال اور عمل کی اصلاح ہونی چاہیے۔

مؤرخین کیلئے ہدایات:

حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ کو ترتیب کے ساتھ بیان کرنے کی ایک حکمت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ تاریخ نگاری بھی ایک مستقل فن ہے۔ اس میں

اس فن والوں کے لئے خاص ہدایات ہیں کہ بیان میں نہ اتنا اختصار ہونا چاہیے۔ جس سے بات ہی پوری نہ سمجھی جا سکے۔
اور نہ اتنا طول ہونا چاہیے کہ اس پڑھنا اور یاد رکھنا مشکل ہو جائے جیسا کہ اس قصہ کے قرآنی بیان سے واضح ہوتا ہے۔ (معارف مفتی اعظم)

سُوْرَةُ يُوْسُفَ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ مِائَةٌ وَّ اِحْدٰى عَشْرَةَ اٰيَةً وَّ اثْنَا عَشَرَ رُكُوْعًا

سورۂ یوسف مکہ میں نازل ہوئی اور اسکی ایک سو گیارہ آیتیں اور بارہ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿۱﴾

یہ آیتیں ہیں واضح کتاب کی

روشن احکام:

جس کا من عند اللہ ہونا بالکل واضح ہے اور جن احکام وشرائع یا مواعظ ونصائح پر وہ مشتمل ہے نہایت روشن اور صاف ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲﴾

ہم نے اُس کو اُتارا ہے قرآن عربی زبان کا تا کہ تم سمجھ لو

عربی قرآن:

یعنی عربی زبان میں جو تمام زبانوں میں زیادہ فصیح ووسیع اور منضبط وپرشوکت زبان ہے نزول قرآن کے لئے منتخب کی گئی۔ جب خود پیغمبر عربی ہیں تو ظاہر ہے کہ دنیا میں اس کے اولین مخاطب عرب ہونگے۔ پھر عرب کے ذریعہ سے چاروں طرف یہ روشنی پھیلے گی۔ اسی کی طرف لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ میں اشارہ فرمایا کہ تمہاری زبان میں اتارنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ تم جو پیغمبر علیہ السلام کی قوم ہو اول اس کے علوم ومعارف کا مزہ چکھو پھر دوسروں کو چکھاؤ، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ابن کثیر لکھتے ہیں۔ ''انزل اشرف الکتب باشرف اللغات علیٰ اشرف الرسل بسفارة اشرف الملائکة وکان ذلک فی اشرف بقاع الارض وابتداء انزاله فی اشرف شهور السنته وهو رمضان فکمل من کل الوجوۃ. (تفسیر عثمانی)

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ

ہم بیان کرتے ہیں تیرے پاس بہت اچھا بیان

بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ

اس واسطے کہ بھیجا ہم نے تیری طرف یہ قرآن اور تو تھا

مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴿۳﴾

اس سے پہلے البتہ بے خبروں میں

نہایت سبق آموز انداز بیان:

یعنی اس وحی کے ذریعہ جو قرآن کی صورت میں ہم پر نازل ہوتی ہے۔ ہم ایک نہایت اچھا بیان نہایت حسین طرز میں تم کو سناتے ہیں۔ جس سے اب تک اپنی قوم کی طرح تم بھی بے خبر تھے۔ گو یہ واقعہ کتب تاریخ اور بائبل میں پہلے سے مذکور تھا مگر محض ایک افسانہ کی صورت میں تھا۔ قرآن کریم نے اس کے ضروری اور مفید اجزاء کو ایسی عجیب ترتیب اور بلیغ ومؤثر انداز میں بیان فرمایا۔ جس نے نہ صرف پہلے تذکرہ نویسوں کی کوتاہیوں پر مطلع کیا بلکہ موقع بہ موقع نہایت ہی اعلیٰ نتائج کی طرف رہنمائی کی اور قصہ کے ضمن میں علوم و ہدایات کے ابواب مفتوح کر دیے یہ بات کہ خداوند قدوس کی تقدیر کو کوئی چیز نہیں روک سکتی، اور خدا جب کسی پر فضل کرنا چاہے تو سارا جہان مل کر بھی اپنی ساری امکانی تدابیر سے اسے محروم نہیں کر سکتا، صبر واستقامت دنیوی واخروی کامیابی کی کلید ہے، حسد وعداوت کا انجام خذلان ونقصان کے سوا کچھ نہیں، عقل انسانی بڑا شریف جوہر ہے جس کی بدولت آدمی بہت سی مشکلات پر غالب آتا اور اپنی زندگی کو کامیاب بنالیتا ہے، اخلاقی شرافت اور پاک دامنی انسان کو دشمنوں اور حاسدوں کی نظر میں بھی آخر کار معزز بنادیتی ہے۔ یہ اور اس قسم کے بیشمار حقائق ہیں جن پر اس احسن القصص کے ضمن میں متنبہ فرمایا ہے۔ مفسرین نے اس سورت کے شان نزول میں کئی روایتیں نقل کی ہیں، سب کے ملانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہود نے مشرکین مکہ کے ذریعہ سے امتحاناً یہ سوال کیا کہ حضرت ابراہیم اور ان کی اولاد تو شام میں رہتی تھی۔ پھر ''بنی اسرائیل'' مصر میں کیسے پہنچ گئے جو موسیٰ علیہ السلام کو فرعون سے مقابلہ کی نوبت آئی۔ شاید مسلمانوں کو بھی ایک مفصل تاریخی واقعہ جو بصائر وعبر سے مملو ہو سننے کا اشتیاق ہوا ہوگا۔ ادھر اس قصہ کے ضمن میں جن احوال وحوادث کا تذکرہ ہونے والا تھا وہ کئی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی قوم کے حالات سے مشابہت رکھتے تھے۔ اور ان کا ذکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں موجب تسکین خاطر اور آپ کی قوم کے حق میں موجب عبرت تھا۔ ان وجوہ سے یہ پورا واقعہ کافی بسط وتفصیل سے قرآن کریم میں بیان فرمایا۔ تا پوچھنے والوں کو معلوم ہو جائے کہ اسرائیل (یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام)

اوران کی اولاد کے شام سے مصر آنے کا سبب حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ ہوا ہے۔ پھر وہیں ان کی نسل پھیلی اور بڑھتی رہی تا آنکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آ کر فرعون اور قبطیوں کی غلامی سے انہیں نجات دلائی۔ (تفسیر عثمانی)

عجیب قصہ:

یعنی قصہ یوسف بیان کرتے ہیں جو بہترین قصہ ہے اس قصہ میں عجائبات قدرت ہیں عبرتیں اور حکمتیں ہیں دقائق اور فوائد ہیں جو دین و دنیا کے حالات کو درست کرنے والے ہیں۔ بادشاہوں اور رعایا کی سیرتیں اور علماء کی خصائل ہیں عورتوں کی مکاری کا اظہار ہے دشمنوں کی ایذاء پر صبر کرنے کا بیان ہے قابو پانے کے بعد بھی دشمنوں سے درگذر کرنے کی تعلیم ہے۔

جنت والے پڑھیں گے:

خالد بن معدان نے کہا سورۂ یوسف اور سورۂ مریم مزے لے لے کر اہل جنت جنت میں پڑھیں گے ابن عطاء نے کہا ہر غم رسیدہ سورۂ یوسف سن کر کچھ چین پاتا ہے۔ (تفسیر مظہری)

بہترین قصہ اور بہترین بات:

اور روایت میں ہے کہ ایک زمانے تک قرآن کریم نازل ہوتا گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کے سامنے تلاوت فرماتے رہے۔ پھر انہوں نے کہا حضور! کوئی واقعہ بھی بیان ہو جاتا تو اس پر یہ آیتیں اتریں۔ پھر کچھ وقت کے بعد کہا کاش کہ آپ کوئی بات بیان فرماتے، اس پر آیت اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ الخ اتری اور بات بیان ہوئی۔ روش کلام کی ایک ہی ڈھب دیکھ کر صحابہؓ نے کہا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بات سے اوپر کی اور قرآن سے نیچے کی کوئی چیز ہوتی یعنی واقعہ۔ اس پر یہ آیات اتریں۔ پھر انہوں نے حدیث کی خواہش کی اس پر آیت اللہ نزل الخ اتری۔ پس قصے کے ارادے پر بہترین قصہ اور بات کے ارادے پر بہترین بات نازل ہوئی۔

اب پچھلی کتابوں کے پیچھے کی ضرورت نہیں رہی:

مناسب ہے کہ ہم مسند احمد کی اس حدیث کو بھی بیان کر دیں جس میں ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو کسی اہل کتاب سے ایک کتاب ہاتھ لگ گئی تھی اسے لے کر آپ حاضر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اسے سنانے لگے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سخت غضبناک ہو گئے اور فرمانے لگے اے خطاب کے لڑکے کیا تم اس میں مشغول ہو کر بہک جانا چاہتے ہو؟ اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ میں اس سے نہایت روشن چمکیلی لے کر آیا ہوں، تم ان اہل کتاب سے کوئی بات نہ پوچھو ممکن ہے کہ وہ صحیح جواب دیں اور تم اسے جھٹلا دو اور ہو سکتا ہے کہ وہ غلط جواب دیں اور تم اسے سچا سمجھ لو سنو اس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اگر آج خود (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) بھی زندہ ہوتے تو انہیں بھی بجز میری تابعداری کے کوئی چارہ نہ تھا۔ اور روایت میں ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ بنو قریظہ قبیلہ کے میرے ایک دوست نے تورات میں سے چند جامع باتیں مجھے لکھ دی ہیں تو کیا میں انہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سناؤں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو چہرہ متغیر ہو گیا۔ حضرت عبداللہ بن ثابتؓ نے کہا کہ اے عمر! کیا تم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے کو نہیں دیکھ رہے! اب حضرت عمرؓ کی نگاہ پڑی تو آپ کہنے لگے ہم اللہ کے رب ہونے پر اسلام کے دین ہونے پر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے پر دل سے رضامند ہیں۔ تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ سے غصہ دور ہوا اور فرمایا اس ذات پاک کی قسم جس کے ہاتھ محمد کی جان ہے کہ اگر تم میں خود (حضرت) موسیٰ ہوتے پھر تم مجھے چھوڑ کر ان کی اتباع میں لگ جاتے تو تم سب گمراہ ہو جاتے۔ امتوں میں سے میرا حصہ تم ہو اور نبیوں میں سے تمہارا حصہ میں ہوں۔ ابو یعلیٰ میں ہے کہ سوس کا رہنے والا قبیلہ عبدالقیس کا ایک شخص جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے پاس آیا۔ آپ نے اس سے پوچھا کہ تیرا نام فلاں فلاں ہے؟ اس نے کہا ہاں۔ پوچھا تو سوس میں مقیم ہے؟ اس نے کہا ہاں۔ تو آپ کے ہاتھ میں جو خوشہ تھا اسے مارا۔ اس نے کہا امیر المؤمنین میرا کیا قصور ہے؟ آپ نے فرمایا بیٹھ جا میں بتاتا ہوں۔ پھر بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر اسی سورت کی آیتیں لمن الغافلین تک پڑھیں۔ تین مرتبہ ان آیتوں کی تلاوت کی اور تین مرتبہ اسے مارا۔ اس نے پھر پوچھا کہ امیر المؤمنین! میرا قصور کیا ہے؟ آپ نے فرمایا تو نے دانیال کی کتاب لکھی ہے۔ اس نے کہا پھر جو آپ فرمائیں میں کرنے کا تیار ہوں۔ آپ نے فرمایا جا اور گرم پانی اور سفید روئی سے اسے بالکل مٹا دے۔ خبردار آج کے بعد سے نہ اسے خود پڑھنا نہ کسی اور کو پڑھانا، اب اگر میں نے اس کے خلاف سنا کہ تو نے آپ اسے پڑھا یا کسی کو پڑھایا تو ایسی سخت سزا کروں گا کہ عبرت بنے۔ پھر فرمایا بیٹھ جا ایک بات سنتا جا، میں نے جا کر اہل کتاب کی ایک کتاب لکھی پھر اسے چمڑے میں لئے ہوئے حضور علیہ السلام کے پاس آیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے پوچھا تیرے ہاتھ میں یہ کیا ہے؟ میں نے کہا ایک کتاب ہے کہ ہم علم میں بڑھ جائیں۔ اس پر آپ اس قدر ناراض ہوئے کہ غصے کی وجہ سے آپ کے رخسار پر سرخی نمودار ہو گئی پھر منادی کی گئی کہ نماز جمع کرنے والی ہے۔ اسی وقت انصار نے ہتھیار سنبھال لئے کہ کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ناراض کر دیا ہے اور منبر نبوی کے چوطرف وہ لوگ ہتھیار بند بیٹھ گئے۔ اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگو! میں جامع کلمات دیا گیا ہوں اور کلمات کے خاتم دیا گیا ہوں اور پھر میرے لئے بہت ہی اختصار کیا گیا ہے۔ میں دین خدا کی باتیں بہت سفید چمکیلی لایا ہوں، خبردار تم بہک نہ

جانا گھبرے اترنے والے کہیں تمہیں بہکا نہ دیں۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ کھڑے ہوگئے اور کہنے لگے اللہ کے رب ہونے پر اسلام کے دین ہونے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہونے پر میں تو یا رسول اللہ دل سے راضی ہوں۔ اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم منبر سے اترے۔ اس کے ایک راوی عبدالرحمٰن بن اسحاق کو محدثین ضعیف کہتے ہیں۔ امام بخاریؒ ان کی حدیث کو صحیح نہیں لکھتے۔ میں کہتا ہوں اس کا ایک شاہد اور سند سے حافظ ابوبکر احمد بن ابراہیم اسماعیلی لائے ہیں کہ خلافت فاروقی کے زمانے میں آپ نے حمص کے چند آدمی بلائے ان میں دو شخص وہ تھے جنہوں نے یہودیوں سے چند باتیں منتخب کر کے لکھ لی تھیں وہ اس مجموعے کو بھی اپنے ساتھ لائے کہ حضرت عمرؓ سے دریافت کرلیں گے اگر آپ نے اجازت دی تو ہم اس میں اسی جیسی اور باتیں بھی بڑھالیں گے ورنہ اسے بھی پھینک دیں گے۔ یہاں آکر انہوں نے کہا کہ امیرالمؤمنین! یہودیوں سے ہم بعض ایسی باتیں سنتے ہیں کہ جن سے ہمارے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں تو کیا وہ باتیں ان سے لے لیں یا بالکل ہی نہ لیں؟ آپؓ نے فرمایا شاید تم نے ان کی کچھ باتیں لکھ رکھی ہیں؟ سنو میں اس میں فیصلہ کن واقعہ سناؤں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں خیبر گیا وہاں کے ایک یہودی کی باتیں مجھے بہت پسند آئیں۔ میں نے اس سے درخواست کی اور اس نے وہ باتیں مجھے لکھ دیں۔ میں نے واپس آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جاؤ وہ لے کر آؤ۔ میں خوشی خوشی چلا کہ شاید حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو میرا یہ کام پسند آگیا۔ لاکر میں نے اس کا پڑھنا شروع کیا اب جو ذرا سی دیر کے بعد میں نے نظر اٹھائی تو دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو سخت ناراض ہیں۔ میری زبان سے پھر تو ایک حرف بھی نہ نکلا اور مارے خوف کے میرا رواں کھڑا ہوگیا۔ میری یہ حالت دیکھ کر اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تحریروں کو اٹھالیا اور ان کا ایک ایک حرف مٹانا شروع کیا اور زبان مبارک سے ارشاد فرماتے جاتے تھے کہ دیکھو خبردار ان کی نہ ماننا یہ تو گمراہی کے گڑھے میں جاپڑے ہیں، اور یہ تو دوسروں کو بھی بہکا رہے ہیں۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ساری تحریر کا ایک حرف بھی باقی نہ رکھا۔ یہ سنا کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر تم نے بھی ان کی باتیں لکھی ہوئی ہوتیں تو میں تمہیں ایسی سزا کرتا کہ اوروں کیلئے عبرت ہوجائے۔ انہوں نے کہا واللہ ہم ہرگز ایک حرف بھی نہ لکھیں گے۔ باہر آتے ہی جنگل میں جاکر انہوں نے اپنی وہ تختیاں گڑھا کھود کر دفن کردیں۔ مراسیل ابی داؤد میں بھی حضرت عمرؓ سے ایسی ہی روایت ہے واللہ اعلم۔ (تفسیر ابن کثیر)

اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ

جس وقت کہا یوسف نے اپنے باپ سے اے باپ میں نے دیکھا

اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ

خواب میں گیارہ ستاروں کو اور سورج کو اور چاند کو دیکھا میں نے اُن

لِيْ سٰجِدِيْنَ ④

کو اپنے واسطے سجدہ کرتے ہوئے

یوسف علیہ السلام کا خواب:

یعنی گیارہ ستارے اور چاند سورج میرے آگے جھک رہے اور پست ہورہے ہیں۔ یہ خواب لڑکپن میں دیکھا تھا۔ سچ ہے "ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات"۔ (تفسیر عثمانیؒ)

امام احمد اور بخاری نے حضرت ابن عمر کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کریم بن کریم بن کریم، بن کریم، یوسف بن یعقوبؑ بن اسحاقؑ بن ابراہیمؑ تھے۔

خواب میں نظر آنے والے تارے:

سعید بن منصور نے سنن میں اور بزاء وابویعلی نے اپنی اپنی مسندوں میں اور ابن جریر و ابن المنذر و ابن ابی حاتم وابوالشیخ وابن مردویہ نے اپنی تفسیروں میں اور عقیلی و ابن حبان نے ضعفاء میں اور حاکم نے مستدرک میں اور ابونعیم وبیہقی نے دلائل النبوت میں حضرت جابرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے اور حاکم نے اس کو بشرط مسلم صحیح بھی قرار دیا ہے کہ ایک یہودی نے خدمت گرامی میں حاضر ہوکر عرض کیا (بیہقی نے اس یہودی کا نام بستان لکھا ہے) محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان ستاروں کے متعلق وضاحت کرو۔ جو یوسف علیہ السلام نے (خواب میں) دیکھے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے اور جبرئیل نے نازل ہوکر آپ کو اطلاع دی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میں تجھے بتادونگا تو کیا تو مان لے گا، یہودی نے جواب دیا جی ہاں، فرمایا (گیارہ ستارے) جرثان الطارق ،الذیال اورقالبس عمود ان، الفلیق، المصبح، الضروح، الفرغ وثاب اور ذوالکتفین تھے۔ ان کو اور سورج و چاند کو یوسف نے دیکھا تھا کہ اوپر سے اتر کر ان سب نے یوسفؑ کو سجدہ کیا، یہودی بولا ،بیشک خدا کی قسم ان کے یہی نام تھے۔ (تفسیر مظہری)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت یوسف علیہ السلام میں مشابہت

(ربط) گزشتہ سورت یعنی سورۂ ھود میں بھی اثبات نبوت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کیلئے انبیاء سابقین کے قصے ذکر کیے اسی طرح سورۂ یوسف میں بھی یوسف صدیق علیہ السلام کا قصہ تفصیل سے بیان کیا گیا کیونکہ یہ قصہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حال سے بہت مشابہت رکھتا ہے یوسف علیہ السلام کی طرح آپ

کی نبوت کا آغاز بھی رویائے صالحہ سے ہوا، جیسا کہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے اول مابدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من الوحی الرؤیا الصالحۃ فکان لایری رؤیا الاجاء ت مثل فلق الصبح ۔

پس جیسا کہ یوسف علیہ السلام کی نبوت آغاز رویائے صالحہ سے ہوا اِنِّیۡ رَاَیۡتُ اَحَدَ عَشَرَ کَوۡکَبًا وَّ الشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ رَاَیۡتُہُمۡ لِیۡ سٰجِدِیۡنَ ، اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا آغاز رویائے صالحہ سے ہوا۔ (معارف کاندھلویؒ)

قَالَ یٰبُنَیَّ لَا تَقۡصُصۡ رُءۡیَاکَ عَلٰۤی اِخۡوَتِکَ
کہا اے بیٹے مت بیان کرنا خواب اپنا اپنے بھائیوں کے آگے
فَیَکِیۡدُوۡا لَکَ کَیۡدًا ؕ اِنَّ الشَّیۡطٰنَ لِلۡاِنۡسَانِ
پھر وہ بنائیں گے تیرے واسطے کچھ فریب البتہ شیطان ہے انسان کا
عَدُوٌّ مُّبِیۡنٌ ﴿۵﴾
صریح دشمن

خواب کی تعبیر باپ کی نصیحت :

یعنی شیطان ہروقت انسان کی گھات میں لگا ہے۔ وسوسہ اندازی کر کے بھائیوں کو تیرے خلاف اکسا دے گا، کیونکہ خواب کی تعبیر بہت ظاہر تھی، اور یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کو جو بہرحال خاندان نبوت میں سے تھے، ایسے واضح خواب کا سمجھ لینا کچھ مشکل نہ تھا کہ گیارہ ستارے گیارہ بھائی ہیں اور چاند سورج ماں باپ ہیں گویا یہ سب کسی وقت یوسف علیہ السلام کی عظمت شان کے سامنے سر جھکائینگے چنانچہ آخر سورت میں "یٰۤاَبَتِ ہٰذَا تَاۡوِیۡلُ رُءۡیَایَ مِنۡ قَبۡلُ ۫ قَدۡ جَعَلَہَا رَبِّیۡ حَقًّا" کہہ کر اسی طرف اشارہ کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام خواب سے پیشتر ہی یہ محسوس کرتے تھے کہ یوسف کے ساتھ باپ کی خصوصی محبت کو دیکھ کر اس کے علاتی بھائی دل ہی دل میں کڑھتے ہیں۔ اب انہوں نے خیال کیا کہ اگر کہیں یہ خواب سن پائے تو شیطان حسد کی آگ ان کے دلوں میں بھڑکا دیگا اور جوش حسد میں آنکھیں بند کر کے ممکن ہے وہ کوئی ایسی حرکت کر گذریں جو یوسف کی اذیت اور خود ان کی رسوائی اور بدانجامی کا موجب ہو۔ اس لئے آپ نے یوسف علیہ السلام کو منع فرمادیا کہ اپنا خواب بھائیوں کے روبرو ظاہر نہ کریں یوسف کا ایک حقیقی بھائی "بنیامین" تھا، اس کے سامنے ذکر کرنے کی بھی اجازت نہیں دی، گو اس سے برائی کا کچھ اندیشہ نہ تھا، لیکن یہ ممکن تھا کہ وہ سن کر بے احتیاطی سے دوسروں کے سامنے تذکرہ کردے۔ اور اس طرح یہ خبر لوگوں میں شائع ہوجائے۔

(تنبیہ) حافظ ابن تیمیہؒ نے ایک مستقل رسالہ میں لکھا ہے کہ قرآن، لغت اور عقلی اعتبارات میں سے کوئی چیز اس خیال کی تائید نہیں کرتی کہ برادارن یوسفؑ انبیاء تھے، نہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی خبر دی نہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں کوئی اس کا قائل تھا۔ بھلا عقوق والدین، قطع رحم مسلمان بھائی کے قتل پر اقدام کرنا اس کو غلام بنا کر بیچ ڈالنا اور بلاد کفر کی طرف بھیج دینا، پھر صریح جھوٹ اور حیلے بنانا وغیرہ ایسی حرکات شنیعہ، کیا کسی نبی کی طرف (خواہ قبل از بعثت ہی سہی) منسوب کی جاسکتی ہیں (العیاذ باللہ) جن لوگوں نے برادران یوسف کی نبوت کا خیال ظاہر کیا ہے ان کے پاس لفظ "اسباط" کے سوا کوئی دلیل نہیں حالانکہ "اسباط" خاص صلبی اولاد کو نہیں بلکہ اقوام وامم کو کہتے ہیں اور "بنی اسرائیل" کی اسباط پر تقسیم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں ہوئی ہے۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت یوسفؑ کا یہ خواب سن کر اس کی تعبیر کو سامنے رکھ کر حضرت یعقوب علیہ السلام نے تاکید کردی کہ اسے بھائیوں کے سامنے نہ دوہرانا کیونکہ اس خواب کی تعبیر یہ ہے کہ اور بھائی آپ کے سامنے پست ہوں گے یہاں تک کہ وہ آپ کی عزت وتعظیم کیلئے آپ کے سامنے اپنی بہت ہی لاچاری اور عاجزی ظاہر کریں تو بہت ممکن ہے کہ اس خواب کو سن کر اس کی تعبیر کو سامنے رکھ کر شیطان کے بہکاوے میں آکر ابھی سے تمہاری دشمنی میں لگ جائیں، اور حسد کی وجہ سے کوئی نامعقول فریب کاری کرنے لگیں۔ اور کسی حیلے سے تجھے پست کرنے کی فکر میں لگ جائیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم بھی یہی ہے۔ فرماتے ہیں تم لوگ کوئی اچھا خواب دیکھو تو خیر اسے بیان کردو اور جو شخص کوئی ایسا براخواب دیکھو تو جس کروٹ پر ہو وہ کروٹ بدل دے اور بائیں طرف تین مرتبہ تھتکار دے اور اس کی برائی سے اللہ کی پناہ طلب کرے اور کسی سے اس کا ذکر نہ کرے تو وہ خواب اسے کوئی نقصان نہ دے گا۔

مسند احمد وغیرہ کی حدیث میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں خواب کی تعبیر جب تک نہ لی جائے وہ گویا پرند کے پاؤں پر ہے ہاں جب اس کی تعبیر بیان ہوگئی پھر وہ ہوجاتا ہے۔

اسی سے یہ حکم بھی لیا جاسکتا ہے کہ نعمت کو چھپانا چاہیے جب تک کہ وہ ازخود اچھی طرح حاصل نہ ہوجائے اور ظاہر نہ ہوجائے۔ جیسے کہ ایک حدیث میں ہے، ضرورتوں کے پورا کرنے پر ان کے چھپانے سے بھی مدد لیا کرو کیونکہ ہر وہ شخص جسے کوئی نعمت ملے لوگ اس کے حسد کے درپے ہوجاتے ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

خواب کیوں اور کیسے آتے ہیں :

بیضاوی نے لکھا ہے قوت خیالیہ سے اتر کر اگر کوئی صورت حس مشترک میں چھپ جاتی ہے تو اس کو رؤیا کہا جاتا ہے۔ نفس ناطقہ اور عالم ملکوت میں

(تجرد ذاتی کی) مناسبت ہے اس لیے نفس کو جب انتظام بدن سے (نیند وغیرہ میں) کسی قدر فرصت ملتی ہے تو اس کا رخ عالم ملکوت کی طرف ہو جاتا ہے۔ (اور چونکہ عالم ملکوت میں تمام غیر مادی حقائق و معانی کی غیر مادی صورتیں موجود ہیں اس لئے نفس) وہاں سے کچھ (غیر مادی) معانی کو (غیر مادی) صورتوں میں حاصل کرتا ہے (اور واپس لوٹ کر قوت خیالیہ کے سامنے رکھتا ہے) پھر قوت خیالیہ ان کو مناسب مادی شکلیں پہنا کر حس مشترک کے سامنے لاتی ہے اس طرح غیر محسوس حقائق محسوس ہو جاتے ہیں۔ اور یہ ہی سچا خواب ہوتا ہے۔ اب اگر غیر مادی اور مادی صورتوں میں گہری مناسبت ہوتی ہے کہ دونوں میں سوائے کلی اور جزئی ہونے کے اور کوئی فرق نہیں ہوتا (غیر مادی صورت کلی اور مادی شکل جزئی) تو تعبیر کی بھی ضرورت نہیں ہوتی اور گہری مناسبت نہیں ہوتی تو تعبیر کی حاجت ہوتی ہے۔

میں کہتا ہوں قوت متخیلہ سے جو صورتیں اتر کر حس مشترک میں چھپتی ہیں نفس ان کا مطالعہ اسی وقت کرتا ہے جب نیند یا استغراق کی حالت میں اس کو مطالعہ محسوسات (اور بیرونی انتظامات) سے فرصت ملتی ہے اس کی تین قسمیں ہیں دو غلط اور ایک صحیح اور صحیح بھی کبھی مختلف عوارض کی وجہ سے مخلوط ہو جاتی ہے غلطی بھی اس میں شامل ہو جاتی ہے اور کبھی تعبیر میں غلطی ہو جاتی ہے۔

خواب کی قسمیں:

(۱) بیداری میں دیکھی ہوئی صورتیں خواب میں دکھائی دیتی ہیں یا قوت خیالیہ از خود ان کو اختراع کر لیتی ہے واقع میں ان کی کوئی اصل نہیں ہوتی اس خواب کو حدیث نفس کہتے ہیں۔

(۲) انسان کے بدن کے اندر شیطان ان تمام مقامات میں تیر جاتا ہے جہاں جہاں خون دوڑتا ہے اس لئے بعض وقت قوت خیالیہ میں کوئی ہیبت آفریں ڈراؤنی شکل یا تفریح آگیں صورت ڈال دیتا ہے ایسے خواب کو بد خواب یا حلم یا تخویف الشیطان کہا جاتا ہے۔

(۳) اللہ کی طرف سے خزائن غیب میں سے کسی امر کا یا اپنی پوشیدہ صفات میں سے کسی خاص صفت کا یا مدارج قرب ذات میں سے کسی درجہ خاص کا الہام اور القاء ہونا ہے (یعنی قلبی فیضان یا روحانی تنویر) یہی الہام بندے کے لئے بشارت (غیبی) بن جاتا ہے۔ حضرت عبادہ بن صامت کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مومن کا خواب ایک کلام ہوتا ہے کہ بندے سے اس کا رب کلام کرتا ہے رواہ الطبرانی بسند صحیح۔ یہ خواب صحیح ہوتا ہے۔

صوفیاء کی تحقیق:

صوفیاء کے نزدیک خواب کی تحقیق یہ ہے کہ عالم کبیر تو یہ سارا عالم ہے اور عالم صغیر انسان ہے عالم کبیر ایک شخص معین کا نام ہے جس کا نفس بھی ہے روح بھی ہے اور مختلف قوتیں بھی ہیں اس کی شکل انسانی شکل کی طرح ہے اسی لیے اس کو انسان کبیر کہا جاتا ہے۔ گویا جس طرح انسان عالم صغیر ہے اسی طرح یہ سارا جہاں انسان کبیر ہے دونوں میں گہری اور کامل مشابہت ہے۔ جس طرح انسان میں قوت متخیلہ (اور اس کی کارفرمائی) ہے اسی طرح عالم کبیر کی بھی قوت متخیلہ ہے جس کے اندر تمام محسوسات اور غیر محسوسات۔ اعراض۔ جواہر مجردات اور معانی (حقائق غیر مادیہ) موجود ہیں تمام ممکنات خواہ مادی ہوں یا مادے سے خالی۔ یہاں تک کہ وہ چیزیں بھی جن کی خارج میں کوئی صورت نہیں مثلاً موت، زندگی، دن، سال، بیماری بلکہ اللہ کی ذات وصفات کی صورتیں بھی اللہ نے عالم کبیر کی قوت متخیلہ میں پیدا کر دی ہیں اور ہر چیز مصور ہو کر اس میں موجود ہے اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بخار کو سیاہ فام عورت کی شکل میں دیکھا تھا اور حضرت یوسف نے گائے اور گیہوں کی بالیوں کی تعبیر میں کہا تھا کہ یہ ارزانی اور قحط کے سال ہیں اب یہ ضروری نہیں کہ جو شکل عالم کبیر کی متخیلہ میں کسی چیز کی ہو وہ اسی طرح ہو جس طرح ہمارے دماغوں میں اس کی آتی ہے یعنی خواب کی شکل کا محکی عنہ (عالم کبیر کی متخیلہ والی شکل) سے مطابق اور اس کی جنس سے ہونا ضروری نہیں بلکہ دونوں میں قدرے مناسبت کافی ہے یہ مناسبت ظاہر ہو یا مخفی بہر حال اس مناسبت کی وجہ سے عالم کبیر کی متخیلہ میں اس چیز کی صورت آجاتی ہے اسی مناسبت کی وجہ سے حضرت یوسف نے اپنے ماں باپ اور بھائیوں کو چاند سورج اور ستاروں کی صورت میں دیکھا تھا۔

خواب چھ ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خواب چھ ہیں عورت (کو خواب میں دیکھا جائے تو اس سے مراد) بھلائی ہے اور اونٹ (سے مراد) لڑائی ہے۔ اور دودھ (سے مراد) فطرت ہے۔ اور سبزی (سے مراد) جنت ہے اور کشتی (سے مراد) نجات ہے اور چھوارے (سے مراد) رزق ہے۔ یہ روایت ابو یعلی نے معجم میں ضعیف سند سے بیان کی ہے۔

یہ حدیث بخاری و مسلم نے حضرت انس، حضرت ابو ہریرہ اور حضرت عبادہ بن صامت کی روایت سے اور امام احمد، ترمذی اور ابوداؤد نے صرف حضرت عبادہ کی روایت سے اور صرف بخاری نے حضرت ابوسعید کی روایت سے اور مسلم نے حضرت ابن عمر اور حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے اور امام احمد و ابن ماجہ نے حضرت ابورزین کی روایت سے اور طبرانی نے حضرت ابن مسعود کی روایت سے بیان کی ہے، صحیحین کی اول الذکر روایت کے علاوہ باقی روایات میں مؤمن کے خواب کی بجائے رؤیائے صالحہ کی لفظ آیا ہے۔

مؤمن کا خواب:

ابن ماجہ اور امام احمد نے صحیح سند سے حضرت ابوسعید کی روایت سے

بیان کیا ہے کہ نیک مسلمان کا خواب نبوت کے ستر جزاء میں سے ایک جزء ہے۔ ترمذی نے حضرت ابورزین کی روایت سے بیان کیا کہ مؤمن کا خواب نبوت کے چالیس اجزاء میں سے ایک جزء ہے، طبرانی نے حضرت عباس بن عبدالمطلب کی روایت سے حدیث کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں نیک مؤمن کا خواب اللہ کی طرف سے بشارت اور نبوت کے پچاس اجزاء میں سے ایک جزء ہوتا ہے۔ ابن النجار کی روایت میں حضرت ابن عمر کی (بیان کردہ) حدیث میں نبوت کے پچیس اجزاء میں سے ایک جزء فرمایا ہے۔

ترمذی نے صحیح سند سے حضرت ابورزین کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مؤمن کا خواب نبوت کے چالیس اجزاء میں سے ایک جزء ہے اور خواب جب تک بیان نہ کیا جائے پرندے کی ٹانگ پر (معلق) رہتا ہے جب بیان کردیا جاتا ہے تو گر پڑتا ہے تم سوائے دانش مند یا حبیب کے کسی سے اپنا خواب نہ بیان کرو بعض روایات میں حبیب کی جگہ من تحب کا لفظ آیا ہے۔

اچھا اور برا خواب:

مسلم نے حضرت ابوقتادہ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اچھا خواب اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور برا خواب شیطان کی طرف سے جو شخص برا ناگوار خواب دیکھے وہ بائیں طرف جانب تھوکدے اور شیطان سے اللہ کی پناہ کا خواستگار ہو اور کسی سے بیان نہ کرے خواب سے اس کو کچھ ضرر نہیں پہنچے گا اور اگر اچھا خواب دیکھے تو خوش ہو اور سوائے اس کے جس سے اس کو محبت ہو اور کسی سے بیان نہ کرے۔

بخاری و مسلم نے صحیحین میں اور ابوداؤد نے سنن اور ترمذی نے جامع میں حدیث ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے اچھا خواب اللہ کی طرف سے ہے اور برا خواب شیطان کی طرف سے اگر کوئی شخص کوئی برا خواب دیکھے تو بیدار ہونے کے بعد بائیں طرف تین بار تھتکار دے اور اللہ کی پناہ مانگے خواب سے اس کو ضرر نہ ہوگا۔

بات یہ ہے کہ خواب اگر شیطان کی طرف سے تخویف اور وسوسہ ہو تو اللہ کی پناہ مانگنے سے اس کا اثر زائل ہوجائے اور اگر عالم مثال کی عکاسی اور صورت کشی ہو تو یہ صورت کشی کبھی قضاء معلق کی ہوتی ہے (کہ اگر اس کا شرعی تدارک وتلافی نہ ہو تو اس کا وقوع ہوجائے گا اور تدارک ہوجائے تو وقوع نہ ہوگا) اللہ کی پناہ گیری قضاء معلق کو بھی رد کردیتی ہے (کیونکہ دعا اور تعوذ سے اس کا تدارک ہوجاتا ہے) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو برے خواب کو بیان کرنے کی ممانعت اور اٹھ کر نماز پڑھنے کی ہدایت فرمائی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی تعبیر سے خواہ مخواہ رنج ہوگا اس لئے مناسب یہ ہے کہ اٹھ کر نماز کی طرف رجوع کرے اور اللہ سے اس کو دفع کرنے کی دعا کرے۔

بُرا خواب بیان نہ کرنے کی حیثیت:

شیخین نے صحیحین میں حضرت سلمان کی روایت سے اور ابن حبان وحاکم نے حضرت ثوبان کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قضاء (معلق) کو سوائے دعا کے اور کوئی چیز رد نہیں کرتی برے خواب کو بیان کرنے کی ممانعت نہ تحریمی ہے نہ تنزیہی (بلکہ رنجیدگی اور غم سے بچانے کے لئے ہے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود احد کی جنگ (سے پہلے) کے متعلق فرمایا تھا میں نے خواب میں اپنی شمشیر ذوالفقار کی دھار ٹوٹی ہوئی دیکھی اور یہ مصیبت ہے اور میں نے گائے کو ذبح ہوتے دیکھا یہ بھی مصیبت ہے۔ آیت وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ سورۂ آل عمران کی تفسیر میں یہ حدیث ذکر کردی گئی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں اپنے منبر پر بنی امیہ کو چڑھے دیکھا اور حضور کو یہ امر ناگوار گذرا، مگر آپ نے یہ خواب بیان کردیا سورۂ قدر کی تفسیر میں ہم نے یہ حدیث ذکر کردی ہے۔

جس روز امام حسین کو شہید کیا گیا اسی روز حضرت ابن عباس نے آپ کو شہید ہوتے خواب میں دیکھ لیا اور آپ نے اس خواب کو بیان بھی کردیا۔ اس موضوع کی احادیث بکثرت آئی ہیں۔

خواب بیان نہ کرنے کی حکمت:

میں کہتا ہوں برے خواب کو بیان کرنے کی ممانعت ممکن ہے اس وجہ سے بھی ہو کہ دشمن اس کو سن کر خوش نہ ہوں۔ اور اچھے خواب کو سوائے دانشمند یا حبیب کے اور کسی سے بیان کرنے کی ممانعت کی یہ وجہ ہوسکتی ہے کہ کہیں اس کو سن کر دشمن حسد نہ کرنے لگیں اسی لیے حضرت یعقوبؑ نے حضرت یوسفؑ کو بھائیوں کے سامنے خواب بیان کرنے سے منع فرمادیا تھا۔ (تفسیر مظہری)

مؤمن کا خواب نبوت کا حصہ کیوں ہے:

جو شخص سچائی، امانت دیانت اور کمال ایمان کے ساتھ متصف ہے اس کا خواب نبوت کا چالیسواں جزء ہوگا، اور جو ان اوصاف میں کچھ کم ہے اس کا چھیالیسواں یا پچاسواں جز ہوگا اور جو اور کم ہے اس کا خواب نبوت کا سترواں جزء ہوگا۔

مثلاً یہ دیکھے کہ وہ آسمان پر اڑ رہا ہے یا غیب کی ایسی چیزیں دیکھے جن کا علم حاصل کرنا اس کی قدرت میں نہ تھا، تو اس کا ذریعہ بجز امداد والہام خداوندی کے اور کچھ نہیں ہوسکتا، جو اصل میں خاصہ نبوت ہے اس لئے اس کو ایک جزء نبوت قرار دیا گیا۔

قادیانی دجال کے ایک مغالطہ کی تردید:

یہاں کچھ لوگوں کو ایک عجیب مغالطہ لگا ہے کہ اس جزء نبوت کے دنیا میں

باقی رہنے اور جاری رہنے سے نبوت کا باقی اور جاری رہنا سمجھ بیٹھے، جو قرآن مجید کی نصوص قطعیہ اور بے شمار احادیث صحیحہ کے خلاف اور پوری امت کے اجماعی عقیدہ ختم نبوت کے منافی ہے اور یہ نہ سمجھے کہ کسی چیز کو ایک جزء موجود ہونے سے اس چیز کا موجود ہونا لازم نہیں آتا۔ اگر کسی شخص کا ایک ناخن یا ایک بال کہیں موجود ہو تو کوئی انسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہاں وہ شخص موجود ہے، مشین کے بہت سے کل پرزوں میں سے اگر کسی کے پاس ایک پرزہ یا ایک اسکرو موجود ہو اور وہ کہنے لگے کہ میرے پاس فلاں مشین موجود ہے تو دنیا بھر کے انسان اس کو یا جھوٹا سمجھیں گے یا بیوقوف۔

سچے خواب حسب تصریح حدیث بلاشبہ جزء نبوت ہیں مگر نبوت نہیں، نبوت تو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکی ہے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لم یبق من النبوۃ الا المبشرات، یعنی آئندہ نبوت کا کوئی جزء بجز مبشرات کے باقی نہ رہے گا، صحابہ کرام نے عرض کیا کہ مبشرات سے کیا مراد ہے؟ تو فرمایا کہ "سچے خواب" جس سے ثابت ہوا کہ نبوت کسی قسم یا کسی صورت سے باقی نہیں، صرف اس کا چھوٹا سا جز باقی ہے جس کو مبشرات یا سچے خواب کہا جاتا ہے۔

کبھی کافر فاسق آدمی کا خواب بھی سچا ہو سکتا ہے:

سورۂ یوسف ہی میں حضرت یوسف علیہ السلام کے جیل کے دو ساتھیوں کے خواب اور ان کا سچا ہونا، اسی طرح بادشاہ مصر کا خواب اور اس کا سچا ہونا قرآن مجید میں مذکور ہے۔ حالانکہ یہ تینوں مسلمان نہ تھے، حدیث میں کسریٰ کا خواب مذکور ہے جو اس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے متعلق دیکھا تھا، وہ خواب صحیح ہوا حالانکہ کسریٰ مسلمان نہ تھا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی عاتکہ نے بحالت کفر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں سچا خواب دیکھا تھا نیز کافر بادشاہ بخت نصر کے جس خواب کی تعبیر حضرت دانیال علیہ السلام نے دی وہ خواب سچا تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ محض اتنی بات کہ کسی کو کوئی سچا خواب نظر آ جائے اور واقعہ اس کے مطابق ہو جائے، اس کے نیک، صالح بلکہ مسلمان ہونے کی بھی دلیل نہیں ہو سکتی، ہاں یہ صحیح ہے کہ عام عادۃ اللہ یہی ہے کہ سچے اور نیک لوگوں کے خواب عموماً سچے ہوتے ہیں۔

خواب کی حیثیت:

بہر حال سچے خواب عام امت کے لئے حسب تصریح حدیث ایک بشارت یا تنبیہ سے زائد کوئی مقام نہیں رکھتے، نہ خود اس کیلئے کسی معاملہ میں حجت ہیں نہ دوسروں کیلئے بعض ناواقف لوگ ایسے خواب دیکھ کر طرح طرح کے وساوس میں مبتلا ہو جاتے ہیں کوئی ان کو اپنی ولایت کی علامت سمجھنے لگتا ہے، کوئی ان سے حاصل ہونے والی باتوں کو شرعی احکام کا درجہ دینے لگتا ہے یہ سب چیزیں بے بنیاد ہیں خصوصاً جب کہ یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ سچے خوابوں میں بکثرت نفسانی یا شیطانی یا دونوں قسم کے تصورات کی آمیزش کا احتمال ہے۔

خواب ہر شخص سے بیان کرنا درست نہیں:

مسئلہ: آیت قال یبنی الخ میں حضرت یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کو اپنا خواب بھائیوں کے سامنے بیان کرنے سے منع فرمایا اس سے معلوم ہوا کہ خواب ایسے شخص کے سامنے بیان نہ کرنا چاہیے جو اس کا خیر خواہ اور ہمدرد نہ ہو، اور نہ ایسے شخص کے سامنے جو تعبیر خواب میں ماہر نہ ہو۔

جامع ترمذی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سچا خواب نبوت کے چالیس اجزاء میں سے ایک جزء ہے اور خواب معلق رہتا ہے جب تک کسی سے بیان نہ کیا جائے جب بیان کر دیا گیا اور سننے والے نے کوئی تعبیر دیدی، تو تعبیر کے مطابق واقع ہو جاتا ہے اس لئے چاہیے کہ خواب کسی سے بیان نہ کرے، بجز اس شخص کے کہ جو عالم وعاقل ہو یا کم از کم اس کا دوست اور خیر خواہ ہو۔

تین طرح کا خواب:

نیز ترمذی اور ابن ماجہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خواب تین قسم کا ہوتا ہے، ایک اللہ کی طرف سے بشارت، دوسرے نفسانی خیالات، تیسرے شیطانی تصورات، اس لئے جو شخص کوئی خواب دیکھے اور اسے بھلا معلوم ہو تو اس کو اگر چاہے لوگوں سے بیان کر دے، اور اگر اس میں کوئی بری بات نظر آئے تو کسی سے نہ کہے، بلکہ اٹھ کر نماز پڑھ لے، اور صحیح مسلم کی حدیث میں یہ بھی ہے کہ برا خواب دیکھے تو بائیں طرف تین مرتبہ تھوک دے اور اللہ سے اس کی برائی سے پناہ مانگے، اور کسی سے ذکر نہ کرے تو یہ خواب اس کو کوئی نقصان نہ دے گا، وجہ یہ ہے کہ بعض خواب تو شیطانی تصورات ہوتے ہیں وہ اس عمل سے دفع ہو جائینگے اور اگر سچا خواب ہے تو اس عمل کے ذریعہ اس کی برائی دور ہو جانے کی بھی امید ہے۔

ترمذی کی حدیث مذکور میں ایسے شخص سے خواب بیان کرنے کی ممانعت کی گئی ہے جو عقلمند نہ ہو، یا اس کا خیر خواہ وہمدرد نہ ہو، اور یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ خواب کی کوئی بری تعبیر سن کر انسان کے دل میں یہی خیال جمتا ہے کہ اب مجھ پر مصیبت آنے والی ہے، اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، انا عندظن عبدی بی، یعنی بندہ میرے متعلق جیسا گمان کرتا ہے میں اس کے حق میں ویسا ہی ہو جاتا ہوں، جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مصیبت آنے پر یقین کر بیٹھا تو اس عادۃ اللہ کے مطابق اس پر مصیبت آنا ضروری ہو گیا۔

مسئلہ: اس آیت سے جو یہ معلوم ہوا کہ جس خواب میں کوئی بات تکلیف ومصیبت کی نظر آئے وہ کسی سے بیان نہ کرے روایات حدیث سے معلوم ہوتا

ہے کہ یہ ممانعت محض شفقت اور ہمدردی کی بناء پر ہے، شرعی حرام نہیں، اس لئے اگر کسی سے بیان کردے تو کوئی گناہ نہیں، کیونکہ احادیث صحیحہ میں ہے کہ غزوہ احد کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میری تلوار ذوالفقار ٹوٹ گئی، اور دیکھا کہ کچھ گائیں ذبح ہو رہی ہیں، جس کی تعبیر حضرت حمزہؓ کی شہادت اور بہت سے مسلمانوں کی شہادت تھی، جو بڑا حادثہ ہے مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خواب کو صحابہ سے بیان فرمادیا تھا۔ (قرطبی)

مسئلہ: اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلمان کو دوسرے کے شر سے بچانے کے لئے اس کی کسی بری خصلت یا نیت کا اظہار کردینا جائز ہے یہ غیبت میں داخل نہیں مثلاً کسی شخص کو معلوم ہوجائے کہ فلاں آدمی کسی دوسرے آدمی کے گھر میں چوری کرنے یا اس کو قتل کرنے کا منصوبہ بنارہا ہے تو اس کو چاہیے کہ اس شخص کو باخبر کردے، یہ غیبت حرام میں داخل نہیں، جیسا کہ یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام سے اس کا اظہار کردیا کہ بھائیوں سے ان کی جان کا خطرہ ہے۔

مسئلہ: اسی آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس شخص کے متعلق یہ احتمال ہو کہ ہماری خوش حالی اور نعمت کا ذکر سنے گا تو اس کو حسد ہوگا اور نقصان پہنچانے کی فکر کرے گا تو اس کے سامنے اپنی نعمت، دولت وعزت وغیرہ کا ذکر نہ کرے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

''اپنے مقاصد کو کامیاب بنانے کیلئے ان کو راز میں رکھنے سے مدد حاصل کرو، کیونکہ دنیا میں ہر صاحب نعمت سے حسد کیا جاتا ہے''۔

مسئلہ: تفسیر قرطبی میں ہے کہ شداد بن الہاد نے فرمایا کہ یوسف علیہ السلام کے اس خواب کی تعبیر چالیس سال بعد ظاہر ہوئی، اس سے معلوم ہوا کہ تعبیر کا فوراً ظاہر ہونا کوئی ضروری نہیں۔

یہودیوں کا سوال:

روایت ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ میں تشریف فرما تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر مدینہ طیبہ میں پہنچی، تو یہاں کے یہودیوں نے اپنے چند آدمی اس کام کیلئے مکہ معظمہ بھیجے کہ وہ جاکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آزمائش کریں۔ اسی لئے یہ سوال ایک مبہم انداز میں اس طرح کیا کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے سچے نبی ہیں تو یہ بتلایئے کہ وہ کونسا پیغمبر ہے جس کا ایک بیٹا ملک شام سے مصر لے جایا گیا اور باپ اس کے غم میں روتے روتے نابینا ہوگئے۔

یہ واقعہ یہودیوں نے اس لئے انتخاب کیا تھا کہ نہ اس کی کوئی عام شہرت تھی نہ مکہ میں کوئی اس واقعہ سے واقف تھا، اور اس وقت مکہ میں اہل کتاب میں سے بھی کوئی نہ تھا جس سے بحوالہ تورات وانجیل اس قصہ کا کوئی جزء معلوم ہوسکتا، ان کے اس سوال پر ہی پوری سورۂ یوسف نازل ہوئی۔

جس بچہ کو بھائیوں نے ہلاکت کے غار میں ڈال دیا تھا اللہ تعالیٰ کی قدرت نے اس کو کہاں سے کہاں پہنچایا، اور کس طرح اس کی حفاظت کی اور اپنے خاص بندوں کو اپنے احکام کی پابندی کا کس قدر گہرا رنگ عطا فرمایا، کہ نوجوانی کے زمانے میں تعیش کا بہترین موقع ملتا ہے، مگر وہ خدا تعالیٰ کے خوف سے نفس کی خواہشات پر کیسا قابو پاتے ہیں کہ صاف اس بلا سے نکل جاتے ہیں۔

بنی اسرائیل کی بنیاد:

اس آیت میں یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا ذکر ہے، ان کا واقعہ یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے یوسف علیہ السلام سمیت بارہ لڑکے تھے ان میں سے ہر لڑکا صاحب اولاد ہوا، سب کے خاندان پھیلے، چونکہ یعقوب علیہ السلام کا لقب اسرائیل تھا، اس لئے یہ سب بارہ خاندان بنی اسرائیل کہلائے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کا خطرہ:

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ایک روایت میں منقول ہے کہ یعقوب علیہ السلام کو اس خواب کی بناء پر خود ان بھائیوں سے خطرہ تھا انہی کو بھیڑیا کہا تھا مگر بمصلحت پوری بات ظاہر نہیں فرمائی۔ (قرطبی)

حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی پیغمبرانہ شان سے اولاد کے سامنے اس بات کو نہیں کھولا کہ مجھے خطرہ خود تم ہی سے ہے کہ اول تو اس سے سب اولاد کی دل شکنی تھی دوسرے باپ کے ایسا کہنے کے بعد خطرہ یہ تھا کہ بھائیوں کی دشمنی اور بڑھ جائے گی، اور اس وقت چھوڑ بھی دیا تو دوسرے کسی وقت کسی بہانہ سے قتل کردیں گے۔ اس لئے اجازت دیدی، مگر بھائیوں سے مکمل عہد وپیمان لیا کہ اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچنے دیں گے، اور بڑے بھائی روبیل یا یہودا کو خصوصیت سے سپرد کیا کہ تم ان کی بھوک پیاس اور دوسری ضرورتوں کی پوری طرح خبرگیری کرنا اور جلد واپس لانا، بھائیوں نے والد کے سامنے یوسف علیہ السلام کو اپنے مونڈھوں پر اٹھالیا، اور باری باری سب اٹھاتے رہے، کچھ دور تک حضرت یعقوب علیہ السلام بھی ان کو رخصت کرنے کیلئے باہر گئے۔

بھائیوں کی سخت دلی:

قرطبی نے تاریخی روایات کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ جب یہ لوگ حضرت یعقوب علیہ السلام کی نظروں سے اوجھل ہوگئے تو اس وقت یوسف علیہ السلام جس بھائی کے مونڈھے پر تھے اس نے ان کو زمین پر پٹک دیا یوسف علیہ السلام پیدل چلنے لگے مگر کم عمر تھے ان کے ساتھ دوڑنے سے عاجز ہوئے تو دوسرے بھائی کی پناہ لی، اس نے بھی کوئی ہمدردی نہ کی تو تیسرے چوتھے ہر بھائی سے امداد کو کہا مگر سب نے یہ جواب دیا کہ تو نے جو گیارہ ستارے اور چاند سورج اپنے آپ کو سجدہ کرتے ہوئے دیکھے تھے ان کو پکار وہ ہی تیری مدد کریں گے۔

قرطبی نے اسی وجہ سے فرمایا کہ اس سے معلوم ہوا کہ بھائیوں کو کسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب معلوم ہو گیا تھا وہ خواب ہی ان کی شدت غیظ وغضب کا سبب بنا۔

یہودا کی رحمدلی:

آخر میں یوسف علیہ السلام نے یہودا سے کہا کہ آپ بڑے ہیں آپ میری کمزوری اور صغرسنی اور اپنے والد ضعیف کے حال پر رحم کریں اور اس عہد کو یاد کریں جو والد سے آپ نے کئے ہیں، آپ نے کتنی جلدی اس عہد و پیمان کو بھلا دیا یہ سن کر یہودا کو رحم آیا اور ان سے کہا کہ جب تک میں زندہ ہوں یہ بھائی تجھے کوئی تکلیف نہ پہنچا سکیں گے۔

یہودا کے دل میں اللہ تعالیٰ نے رحمت اور صحیح عمل کی توفیق ڈال دی، تو یہودا نے اپنے دوسرے بھائیوں کو خطاب کیا کہ بے گناہ کا قتل انتہائی جرم عظیم ہے خدا سے ڈرو، اور اس بچہ کو اس کے والد کے پاس پہنچا دو، البتہ اس سے یہ عہد لے لو کہ باپ سے تمہاری کوئی شکایت نہ کرے۔

یوسف علیہ السلام کے بھائی انبیاء نہیں تھے:

بھائیوں نے جواب دیا کہ ہم جانتے ہیں تمہارا کیا مطلب ہے تم چاہتے ہو کہ باپ کے دل میں اپنا مرتبہ سب سے زیادہ کرلو، اس لئے سن لو کہ اگر تم نے ہمارے ارادہ میں مزاحمت کی تو ہم تمہیں بھی قتل کر دیں گے۔

یہ دلیل ہے اس بات کی یوسف علیہ السلام کے یہ بھائی انبیاء نہیں تھے کیونکہ انہوں نے اس واقعہ میں بہت سے کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کیا ایک بے گناہ کے قتل کا ارادہ باپ کی نافرمانی اور ایذا رسانی، معاہدہ کی خلاف ورزی پھر جھوٹی سازش وغیرہ انبیاء علیہم السلام سے قبل نبوت بھی جمہور کے عقیدہ کے مطابق ایسے گناہ سرزد نہیں ہو سکتے۔ (معارف مفتی اعظم)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دلیل:

یہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کی دلیل ہے کہ آپ وحی الٰہی سے صحیح صحیح واقعات بیان فرماتے ہیں جو آپ نے نہ دیکھے اور نہ کسی سے سنے اور نہ کہیں پڑھے اور بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ اس قصہ کو احسن القصص اس لئے فرمایا کہ یہ قصہ جن آدمیوں کا ہے وہ سب آدمیوں میں احسن اور اجمل تھے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ احسن القصص کے معانی اعجب القصص کے ہیں یعنی یہ قصہ بہت ہی عجیب ہے۔

اچھا خواب:

رویائے صالحہ ہے یعنی درست خواب کہ جو وساوس شیطانی اور ہوا جس نفسانی سے پاک ہوں ایسا ہی خواب حقیقتاً خواب ہوتا ہے اور محتاج تعبیر ہوتا ہے اور ایسے ہی خواب کو حدیث میں رویائے صالحہ اور جزء نبوت بتلایا گیا ہے اس قسم کا خواب القاء ربانی ہوتا ہے۔ اور مؤید بنور الٰہی ہوتا ہے جمہور متکلمین اور مفسرین اور محدثین اور اولیاء اور عارفین فرماتے ہیں کہ رویائے صالحہ ایک قسم کا روحانی مشاہدہ ہے کہ جب انسان سو جاتا ہے اور اس کے حواس ظاہرہ معطل ہو جاتے ہیں تو اس حالت میں روح عالم غیب کی چیزوں کو دیکھتی ہے اور سنتی ہے روح کبھی اللہ کا کلام سنتی ہے اور کبھی فرشتوں کا کلام سنتی ہے اور اس عالم کی چیزوں کو دیکھتی ہے اور یہ روحانی مشاہدہ کبھی اصل حقیقت کا ہوتا ہے اور کبھی صور مثالیہ کے ذریعہ ہوتا ہے جس سے آئندہ واقعات کی طرف برنگ تمثیل وتشبیہ اشارہ اور تنبیہ مقصود ہوتی ہے جیسے یوسف علیہ السلام کو گیارہ ستارے سجدہ کرتے ہوئے دکھلائے گئے برنگ تمثیل آئندہ پیش آنے والے واقعہ سے آگاہ کر دیا گیا۔

یونانیوں کی نادانی:

یونان کے نادانوں نے ایک ظاہری علامت کو جو انہیں کی پیدا کردہ تھی اس کو ادراک کی علت تامہ سمجھ لیا اور خواب کی حالت میں جب ان کو ادراک کی کوئی ظاہری علامت نظر نہ آئی تو خواب کی حقیقت ہی کا انکار کر بیٹھے اور کہہ دیا کہ خواب کی کوئی حقیقت واقعیہ نہیں بلکہ ایک وہمی اور خیالی چیز ہے خوب سمجھ لو کہ خواب تو بلاشبہ ایک حقیقت واقعیہ ہے مگر اس کا انکار وہم فاسد اور خیال کاسد ہے۔

یعقوب علیہ السلام کا خواب:

یعقوب علیہ السلام نے خواب میں دیکھا تھا کہ ایک بھیڑیئے نے یوسف علیہ السلام پر حملہ کیا۔ (تفسیر قرطبی، معارف کاندھلوی)

وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ
اور اسی طرح برگزیدہ کریگا تجھ کو تیرا رب

نبوت کی بشارت:

یعنی جس طرح ایسا اچھا خواب دکھلایا، اسی طرح محض جاذبہ رحمت سے اپنی بارگاہ قرب میں تجھ کو خصوصی مقام عطا فرمائیگا، چنانچہ نبوت عطاء فرمائی اور طرح طرح کی ظاہری و باطنی نوازشیں کیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ
اور سکھلائیگا تجھ کو ٹھکانے پر لگانا باتوں کا

علم وحکمت کی تعلیم:

مثلاً تعبیر رؤیا، یعنی خواب سن کر اس کے اجزاء کو ذہانت وفراست سے ٹھکانے پر لگا دینا، یا ہر بات کے موقع ومحل کو سمجھنا اور معاملات کے عواقب ونتائج

کوفوراً پرکھ لینا۔ یا خدا اور پیغمبروں کے ارشادات اقوام و امم کے قصص اور کتب منزلہ کے مضامین کی تہ تک پہنچ جانا یہ سب چیزیں "تاویل الاحادیث" کے تحت میں مندرج ہوسکتی ہیں۔

وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ
اور پورا کریگا اپنا انعام تجھ پر اور یعقوب کے گھر پر

اور بہت ساری نعمتیں ملیں گی:

یعنی اخروی نعمتوں کے ساتھ دنیوی نعمتیں عطا فرمائیگا۔ نبوت کے ساتھ بادشاہت میں حصہ دیگا اور شدائد ومحن سے نجات دیکر خوشحالی وفراغ بالی کی زندگی نصیب کرے گا۔ یعقوبؑ کے گھرانے کو دنیوی مکروہات اور مادی تکلیفوں سے رہائی دے گا اور آئندہ ان کی نسل سے بڑے بڑے پیغمبر اور بادشاہ پیدا کریگا۔

كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ
جیسا پورا کیا ہے تیرے دو باپ دادوں پر اس سے پہلے ابراہیم
وَاِسْحٰقَ
اور اسحٰق پر

جیسا کہ باپ دادوں کو ملیں:

حضرت یعقوبؑ نے تواضعاً اپنا نام نہیں لیا۔ اپنے والد حضرت اسحٰقؑ اور ان کے والد حضرت ابراہیمؑ کا ذکر فرمایا، حضرت ابراہیمؑ کو خدا نے اپنا خلیل اور نبی بنایا، ان کے دشمن نمرود کو ہلاک کیا، آگ کے شعلوں کو ان کے لئے گلزار بنا دیا۔ حضرت اسحٰق کو نبوت عطاء کی۔ پھر ان کے صلب سے حضرت یعقوب جیسا نبی پیدا کیا۔ جس سے تمام انبیائے بنی اسرائیل کا سلسلہ چلا۔ حدیث صحیح میں ہے۔ **الکریم ابن الکریم ابن الکریم ابن الکریم یوسف بن یعقوب بن اسحق بن ابراھیم۔**

(تنبیہ) حضرت یعقوب علیہ السلام نے جو پیشین گوئی کی اس کا کچھ حصہ تو غالباً حضرت یوسف کے خواب سے سمجھے اور اس سے کہ اتنی چھوٹی عمر میں ایسا موزوں و مبارک خواب دیکھا اور کچھ حضرت یوسف کے خصائل و شمائل سے یا وحی الٰہی کے ذریعہ سے مطلع ہوئے ہونگے۔

اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝
البتہ تیرا رب خبردار ہے حکمت والا

یعنی وہ ہر ایک کی مناسبت واستعداد سے باخبر ہے اپنی حکمت سے اسی کے مناسب فیض پہنچاتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

علم اور حکمت:

اصطلاح شریعت میں حکمت اس علم صحیح کو کہتے ہیں جس کے ساتھ عمل صالح بھی مقرون ہو ورنہ وہ علم نہیں، بلکہ جہالت ہے۔ (روح المعانی ص ۱۸۷ جلد ۱۲)

اور بعض کہتے ہیں کہ عالم وہ ہے جو جانتا ہو اور حکیم وہ ہے جو مقتضائے علم پر چلتا ہو اور اسی طرح ہم نیکو کاروں کا انعام اور جزاء دیتے ہیں۔ جو صدق اور اخلاص کے ساتھ اللہ کی اس طرح عبادت کرتے ہوں گویا کہ وہ اللہ کو دیکھ رہے ہیں یعنی جس طرح ہم نے یوسف علیہ السلام کو علم اور حکمت اور ظاہری عزت ورفعت سے نوازا اسی طرح ہم دیگر محسنین کو اپنی نعمتوں سے نوازتے ہیں معلوم ہوا کہ یوسف علیہ السلام کو اس وقت مقام احسان یعنی مقام ان تعبداللہ کانک تراہ حاصل تھا اور اللہ کا یہ احسان ان کے اس احسان کی جزاء تھی۔ (بعد ازاں ایک ابتلا پیش آیا) (معارف کاندھلویؒ)

لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖٓ اٰيٰتٌ
البتہ ہیں یوسف کے قصہ میں اور اسکے بھائیوں کے قصہ میں نشانیاں
لِّلسَّآئِلِيْنَ ۝
پوچھنے والوں کیلئے

ہدایت وعبرت کا سامان:

یعنی جو لوگ اس طرح کے واقعات دریافت کر کے کسی نتیجہ پر پہنچنا چاہتے ہیں ان کے لیے یوسف اور ان کے بھائیوں کی سرگذشت میں ہدایت وعبرت کی بہت سی نشانیاں موجود ہیں۔ اس قصہ کو سن کر قلوب میں حق تعالیٰ کی عظیم قدرت وحکمت کا نقش جم جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا بین ثبوت ملتا ہے کہ آپ باوجود اُمّی ہونے اور کسی کتاب یا معلم سے استفادہ نہ کرنے کے ایسے منقح ومنضبط تاریخی حقائق کا انکشاف فرما رہے ہیں جن کے بیان کی بجز اعلام ربانی کے کوئی توجیہ نہیں ہوسکتی۔ خصوصاً قریش مکہ کے لئے (جو یہود کے اکسانے سے اس قصہ کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کر رہے تھے) اس واقعہ میں بڑا عبرت آموز سبق ہے کہ جس طرح حضرت یوسفؑ کو بھائیوں نے گھر سے نکالا۔ ازراہ حسد قتل یا جلاوطن کرنے کے مشورے کئے۔ طرح طرح سے ایذائیں پہنچائیں۔ اہانت واستخفاف میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ آخر ایک دن آیا کہ یوسفؑ کی طرف نادم محتاج ہو کر آئے۔ یوسف علیہ السلام کو خدا نے دین ودنیا کے اعلیٰ مناصب پر فائز کیا اور انہوں نے اپنے عروج واقتدار کے وقت بھائیوں کے جرائم سے چشم پوشی کی اور نہایت دریا دلی سے سب کے قصور معاف کر دیے۔ ٹھیک اسی طرح حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کی برادری نے آپ کے متعلق ناپاک منصوبے باندھے، دکھ پہنچائے ،عزت وآبرو پر حملے کئے، حتیٰ کہ وطن چھوڑنے پر مجبور کیا۔ لیکن جلد وہ دن آنیوالا تھا جب وطن سے علیحدہ ہوکر آپ کی کامیابی اور رفعت شان کا آفتاب چمکا، اور چند سال کے بعد فتح مکہ کا وہ تاریخی دن آپہنچا، جبکہ آپ نے اپنے قومی اور وطنی بھائیوں کی گذشتہ تقصیرات پر بعینہ حضرت یوسف والے کلمات "لا تثریب علیکم الیوم"، فرما کر قلم عفو کھینچ دیا۔ (تفسیر عثانیؒ)

یعقوب علیہ السلام کی اولاد:

حضرت یعقوبؑ کے ماموں کی بیٹی لیا بنت لیان کے بطن سے آپ کے چھ بیٹے اور دینہ نام کی ایک بیٹی تھی۔ سب سے بڑا روبیل تھا دوسرا شمعون تیسرا لادی چوتھا یہودا پانچواں ریان، چھٹا یشحر اور چار بیٹے زلفہ اور بلہمہ دو باندیوں کے بطن سے تھے دان، نفتالی، جاد، آشر۔ کذا قال البغوی۔ بغوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ لیا کے مرنے کے بعد حضرت یعقوبؑ نے اس کی بہن راحیل سے نکاح کر لیا تھا جس کے بطن سے دو بیٹے یوسفؑ اور بنیامین پیدا ہوئے، اس طرح کل بارہ بیٹے ہوگئے۔

بیضاوی میں لکھا ہے کہ شریعت اسرائیل میں ایک وقت میں دو بہنوں سے نکاح درست تھا حضرت یعقوبؑ کے نکاح میں ایک ہی زمانے میں دو بہنیں (لیا اور راحیل) تھیں۔

سوال کرنے والے:

ایت للسائلین کی تشریح میں بغوی نے لکھا ہے کہ یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت یوسفؑ کا قصہ دریافت کیا تھا۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ کنعان سے مصر کو اولاد یعقوبؑ کے منتقل ہونے کی وجہ دریافت کی تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ قصہ بیان فرما دیا، تو یہودیوں نے اس بیان کو توریت کے بیان کے موافق پایا، بعض کے نزدیک سائلین سے مراد (صرف) یہودی ہی نہیں بلکہ جو بھی سوال کرے اس کیلئے اس قصہ میں توحید و نبوت کی نشانیاں ہیں۔ (تفسیر مظہری)

إِذْ قَالُوا لَيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَىٰ أَبِينَا

جب کہنے لگے البتہ یوسف اور اُن کا بھائی زیادہ پیارا ہے ہمارے

مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ ۚ إِنَّ أَبَانَا لَفِي ضَلَالٍ

باپ کو ہم سے اور ہم اُن سے قوت والے لوگ ہیں البتہ ہمارا باپ

مُّبِينٍ ﴿٨﴾

صریح خطا پر ہے

بھائیوں کی ناگواری:

حضرت یعقوب علیہ السلام یوسف اور ان کے عینی بھائی بنیامین سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے کیونکہ یہ دونوں اپنے علاتی بھائیوں سے چھوٹے تھے والدہ کا انتقال ہو چکا تھا اور خاص حضرت یوسفؑ کی نسبت اپنے نور فراست یا الہام ربانی سے سمجھ چکے تھے کہ ان کا مستقبل نہایت درخشاں ہے اور نبوت کا خاندانی سلسلہ ان کی ذات سے وابستہ ہونیوالا ہے۔ خود یوسف علیہ السلام کا حسن صورت و سیرت اور کمال ظاہری و باطنی پدر بزرگوار کی محبت خصوصی کو اپنی طرف جذب کرتا تھا۔ دوسرے بھائیوں کو یہ چیز ناگوار تھی۔ وہ کہتے تھے کہ وقت پر کام آنیوالے تو ہم ہیں ہمارا ایک طاقتور جتھا ہے جو باپ کی ضعیفی میں کام آسکتا ہے ان چھوٹے لڑکوں سے کیا امید ہوسکتی ہے؟ ان ہی خیالات کے ماتحت اپنے والد بزرگوار کی نسبت کہتے تھے کہ وہ اس معاملہ میں سخت غلطی اور صریح خطاء پر ہیں۔ اپنے نفع و نقصان کا صحیح موازنہ نہیں کرتے۔ (تفسیر عثانی)

یوسفؑ سے زیادہ محبت کی وجہ:

فائدہ: یعقوب علیہ السلام کا یوسف علیہ السلام سے زیادہ محبت کرنا معاذ اللہ محض حسن ظاہری کیوجہ سے نہ تھا بلکہ حسن صورت کے ساتھ حسن سیرت اور جمال نبوت و صدیقیت اور نور فہم و فراست اور نور عفت بھی اس کے ساتھ شامل تھا اور ان محاسن و شمائل اور کمالات و فضائل میں کوئی بھائی وغیرہ شریک نہ تھا۔ یوسف علیہ السلام ان فضائل و شمائل میں سب پر فوقیت رکھتے تھے اور یعقوب علیہ السلام نور نبوت اور چشم بصیرت سے ان باطنی محاسن کو بھی دیکھتے تھے اس لئے وہ ان کی نظر میں زیادہ محبوب تھے۔

نیز یوسف علیہ السلام کا حسن و جمال۔ بشری حسن و جمال کے جنس سے نہ تھا۔ اس لئے زنان مصر کی زبان سے بے اختیار یہ لفظ نکلا۔ مَا هٰذَا بَشَرًا ۖ إِنْ هٰذَآ إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ بلکہ یوسف علیہ السلام کا حسن و جمال اہل جنت کے حسن و جمال کی جنس سے تھا اور حور و غلمان کے حسن و جمال کی قسم سے تھا۔ غرض کہ یوسف علیہ السلام کا حسن و جمال اخروی حسن و جمال کا نمونہ تھا اور از قسم جمال اخروی تھا۔ اس لئے یعقوب علیہ السلام ان کی طرف زیادہ مائل تھے کیونکہ یوسف علیہ السلام کا باطنی حسن و جمال یعنی علم و حکمت اور ان کی بے مثال عصمت و عفت اور نور نبوت و صدیقیت یہ باطنی محاسن یعقوب علیہ السلام کے پیش نظر تھے اور دوسرے بھائی ان کی طرح ان کے محاسن سے متصف نہ تھے اور حسن سیرت اور حسن صورت دونوں سے آراستہ تھے نیز یوسف علیہ السلام کا حسن و جمال ملائکہ کے حسن و جمال کا ایک نمونہ تھا اس لئے وہ باپ کی نظر میں زیادہ محبوب تھے۔

یعقوبؑ نے کسی بیٹے سے زیادتی نہیں کی:

قرآن سے کہیں یہ ثابت نہیں کہ یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام

اور بنیامین کو دوسرے بھائیوں پر حقوق واجبہ میں یا کسی ایسے امر میں ترجیح دی ہو جوان کے اختیار میں ہو اور محبت جس کی حقیقت میلان طبعی ہے وہ امر اختیاری نہیں اس میں عدل اور مساوات ناممکن ہے اگر کوئی باپ اپنے کسی عالم اور متقی بیٹے کو بہ نسبت غیر عالم بیٹے کے زیادہ محبوب رکھے تو اس سے یہ کہنا کہ آپ اس سے زیادتی محبت میں غلطی اور خطا پر ہیں۔ یہی صریح غلطی اور ضلال مبین ہے خوب سمجھ لو اور اولاد میں اور بیبیوں میں طبعی میلان اور محبت کے اعتبار سے مساوات عادتاً ناممکن نظر آتی ہے الغرض جب بھائیوں نے یہ دیکھا کہ باپ کی نظر عنایت یوسف کی طرف زیادہ ہے تو بولے۔ اِنَّ اَبَانَا لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنِ کہ واقعی ہمارا باپ اس بارہ میں صریح گمراہی میں مبتلا ہے۔ اس لفظ سے ان کی دین خداوندی میں گمراہی مراد نہ تھی بلکہ دین محبت اور آئین شفقت میں گمراہی مراد تھی۔ (معارف کاندھلوی)

اِقْتُلُوْا یُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا یَّخْلُ لَكُمْ
مار ڈالو یوسف کو یا پھینک دو کسی ملک میں کہ خالص رہے تم پر توجہ
وَجْهُ اَبِیْكُمْ
تمہارے باپ کی

قتل کا پروگرام:

یعنی رشک وحسد کی آگ اندر ہی اندر سلگتی رہی۔ آخر آپس میں مشورہ کیا کہ یوسفؑ کی موجودگی میں ممکن نہیں کہ والد بزرگوار کی خصوصی محبت وتوجہ کو ہم اپنی طرف کھینچ سکیں، اس لئے یوسفؑ کا قصہ ہی یہاں سے ختم کر دینا چاہیے خواہ قتل کر دو یا کسی دور دراز ملک کی طرف پھینک دو جہاں سے واپس نہ آسکے۔ جب وہ نہ رہیں گے تو باپ کی ساری توجہات اور مہربانیوں کے ہم ہی تنہا حقدار رہ جائیں گے۔ بنیامین کے معاملہ کو غالباً ان کے یہاں کوئی اہمیت نہیں تھی۔ گویا اس کی محبت کو یوسف کی محبت کا ضمیمہ سمجھتے تھے۔ (تفسیر عثمانی)

وَتَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِیْنَ ⁽⁹⁾
اور ہو رہنا اس کے بعد نیک لوگ

بھائیوں کی خوش فہمی:

یعنی ایک مرتبہ قتل وغیرہ کا گناہ کرنا پڑیگا۔ اس سے فارغ ہو کر توبہ کر لینگے اور خوب نیک بن جائینگے گویا رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔ بعض مفسرین نے "وَتَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِیْنَ"۔ کے معنی یہ لئے ہے کہ یوسف کے بعد ہمارے سب کام ٹھیک اور درست ہو جائینگے کیونکہ پدر بزرگوار کا دست شفقت یوسف سے مایوس ہو کر صرف ہمارے ہی سروں پر رہا کریگا۔ (تفسیر عثمانی)

قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا یُوْسُفَ وَاَلْقُوْهُ
بولا ایک بولنے والا اُن میں مت مار ڈالو یوسف کو
فِیْ غَیٰبَتِ الْجُبِّ یَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّیَّارَةِ اِنْ
اور ڈال دو اُس کو گمنام کنویں میں کہ اُٹھالے جائے اُس کو کوئی مسافر
كُنْتُمْ فٰعِلِیْنَ ⁽¹⁰⁾
اگر تم کو کرنا ہے

یہودا کا مشورہ:

یہ کہنے والا ''یہودا'' تھا یعنی قتل کرنا بہت سخت بات ہے اور ہمارا مقصد بدون اس کے بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر تم یوسف کو یہاں سے علیحدہ کرنا چاہتے ہو تو آسان صورت یہ ہے کہ اس کو بستی سے دور کسی گمنام کنوئیں میں ڈال دو۔ ابوحیان نے بعض اہل لغت سے نقل کیا ہے کہ غَیٰبَتِ الْجُبِّ ''اس طاقچہ وغیرہ کو کہتے ہیں جو کنوئیں (باؤلی) میں پانی سے ذرا اوپر بنا ہوا ہو۔ غرض یہ تھی کہ ہم خواہی نہ خواہی عمداً ہلاک کرنے کا گناہ اپنے سر نہ لیں۔ ایسے کنوئیں میں ڈالدینے کے بعد بہت ممکن ہے کوئی مسافر ادھر سے گذرے اور خبر پا کر کنوئیں سے نکال لے جائے۔ اس صورت میں ہمارا مقصد حاصل ہو جائیگا اور خون ناحق میں ہاتھ رنگین نہ کرنے پڑینگے گویا سانپ مر جائیگا اور لاٹھی نہ ٹوٹے گی۔ (تفسیر عثمانی)

بھائیوں کے جرائم:

محمد بن اسحٰق نے لکھا ہے کہ برادران یوسف کی یہ حرکت مختلف جرائم کی حامل تھی۔ قطع رحم، باپ کی نافرمانی، بے گناہ بچے پر ظلم اور بے رحمی۔ امانت میں خیانت، وعدہ شکنی اور دروغ بافی اللہ نے ان کے تمام جرائم کو معاف فرما دیا، تاکہ کوئی اس کی رحمت سے ناامید نہ ہو میں کہتا ہوں شاید اس کا سبب یہ ہو کہ ان کو باپ سے بہت زیادہ محبت تھی اور اسی شدت محبت نے ان کو رشک وحسد تک پہنچا دیا۔ اور انہوں نے کوشش کی کہ باپ کی توجہ ان کی طرف خالص ہو جائے۔

اللہ نے بچالیا:

بعض اہل علم نے کہا برادران یوسف نے قتل کا ارادہ کر لیا تھا مگر اللہ نے اپنی رحمت سے ان کو جرم قتل سے محفوظ رکھا اگر وہ ایسا کر گذرتے تو سب کے سب ہلاک ہو جاتے۔ اکثر علماء کا قول ہے کہ برادران یوسف پیغمبر نہیں تھے۔ (تفسیر مظہری)

قَالُوْا یٰۤاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى یُوْسُفَ
بولے اے باپ کیا بات ہے کہ تو اعتبار نہیں کرتا ہمارا یوسف پر

وَ اِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ ﴿۱۱﴾
اور ہم تو اُسکے خیر خواہ ہیں

باپ سے اجازت:

یعنی ایسے خوبصورت بچے کے قویٰ گھر میں خالی پڑے رہنے سے بے کار ہوئے جاتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے بھی باپ سے اس قسم کی درخواست کر چکے تھے مگر ان کا دل ان کے ساتھ بھیجنے پر مطمئن نہیں ہوا۔ (تفسیر عثمانی)

اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَيَلْعَبْ وَاِنَّا لَهٗ
بھیج اُس کو ہمارے ساتھ کل کو خوب کھائے اور کھیلے اور ہم تو اُس
لَحٰفِظُوْنَ ﴿۱۲﴾
کے نگہبان ہیں

اجازت مانگنے کا عذر:

یعنی ایسے خوبصورت بچے کے قویٰ گھر میں خالی پڑے رہنے سے بے کار ہوئے جاتے ہیں مناسب ہے کہ ہمارے ساتھ اس کو بکریاں چرانے کیلئے جنگل بھیج دیجئے۔ وہاں جنگل کے پھل میوے خوب کھائیگا اور کھیل کود سے جسمانی ورزش بھی ہو جائیگی۔ کہتے ہیں ان کا کھیل بھاگ دوڑ اور تیر اندازی تھی۔ اور ویسے بھی بچوں کے لئے مناسب حد تک کھیلنا جیسا کہ ابو حیان نے کہا ہے نشاط شگفتگی کا موجب ہے غرض یعقوب علیہ السلام سے یوسف کو ساتھ لیجانے کی پرزور درخواست کی اور نہایت مؤکد طریقہ سے اطمینان دلایا کہ ہم برابر اس کی حفاظت کرینگے۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ خود یوسف کو بھی جدا گانہ طور پر ساتھ چلنے اور باپ سے اجازت لینے کی ترغیب دی۔ (تفسیر عثمانی)

اس آیت میں حضرت یعقوب علیہ السلام سے سیر و تفریح اور آزادی سے کھانے پینے کھیلنے کودنے کی اجازت مانگی گئی ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کو اس کی کوئی ممانعت نہیں فرمائی، صرف یوسف علیہ السلام کو ساتھ بھیجنے میں تردد کا اظہار کیا، جو اگلی آیت میں آئیگا اس سے معلوم ہوا کہ سیر و تفریح کھیل کود جائز حدود کے اندر جائز و مباح ہیں، احادیث صحیحہ سے بھی اس کا جواز معلوم ہوتا ہے، مگر یہ شرط ہے کہ اس کھیل کود میں شرعی حدود سے تجاوز نہ ہو، اور کسی ناجائز فعل کی اس میں آمیزش نہ ہو۔ (قرطبی وغیرہ)

یعقوب علیہ السلام کا جواب:

یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے جب والد سے یہ درخواست کی کہ یوسف کو کل ہمارے ساتھ تفریح کے لئے بھیج دیجئے، تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ ان کو بھیجنا دو وجہ سے پسند نہیں کرتا، اول تو مجھے اس نور نظر کے بغیر چین نہیں آتا، دوسرے یہ خطرہ ہے کہ جنگل میں کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری غفلت کے وقت اس کو بھیڑیا کھا جائے۔

یعقوب علیہ السلام کو بھیڑیئے کا خطرہ یا تو اس وجہ سے ہوا کہ کنعان میں بھیڑیوں کی کثرت تھی اور یا اس وجہ سے کہ انہوں نے خواب میں دیکھا تھا کہ وہ کسی پہاڑی کے اوپر ہیں اور یوسف علیہ السلام اس کے دامن میں نیچے ہیں اچانک دس بھیڑیوں نے ان کو گھیر لیا اور ان پر حملہ کرنا چاہا، مگر ایک بھیڑیئے ہی نے مدافعت کر کے چھڑا دیا، پھر یوسف علیہ السلام زمین کے اندر چھپ گئے۔

کسی شخص کا گم شدہ مال کسی کو مل جائے تو اس کی شرعی ذمہ داری صرف اتنی ہی نہیں کہ اس کو چرائے نہیں، بلکہ یہ بھی اس کے ذمہ ہے کہ اس کو حفاظت سے اٹھا کر رکھے اور اعلان کر کے مالک کی تلاش کرے وہ مل جائے، اور علامات وغیرہ بیان کرنے سے یہ اطمینان ہو جائے کہ یہ مال اسی کا ہے تو اس کو دیدے اور اعلان و تلاش کے باوجود مالک کا پتہ نہ چلے اور مال کی حیثیت کے مطابق یہ اندازہ ہو جائے کہ اب مالک اس کو تلاش نہ کرے گا اس وقت اگر خود غریب مفلس ہے تو اپنے صرف میں لے آئے ورنہ مساکین پر صدقہ کر دے، اور بہر دوصورت یہ مالک کی طرف سے صدقہ قرار دیا جائے گا، اس کا ثواب اس کو ملے گا گویا آسمانی بیت المال میں اس کے نام پر جمع کر دیا گیا۔ (معارف مفتی اعظم)

قَالَ اِنِّيْ لَيَحْزُنُنِيْٓ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَاَخَافُ
بولا مجھ کو غم ہوتا ہے اس سے کہ تم اُسکو لے جاؤ اور ڈرتا ہوں
اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَاَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳﴾
اس سے کہ کھا جائے اُسکو بھیڑیا اور تم اُس سے بیخبر رہو

تم غفلت کرو گے:

یعنی یوسف کی جدائی اور تمہارے ساتھ جانے کا تصور ہی مجھے غمگین بنائے دیتا ہے اس پر یہ خوف مزید رہا کہ بچہ ہے۔ تمہاری بے خبری اور غفلت میں بھیڑیا وغیرہ کوئی درندہ نہ پھاڑ کھائے۔ لکھا ہے کہ اس جنگل میں بھیڑیے کثرت سے تھے۔ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ "ان کو آگے چل کر بھیڑیے کا بہانہ کرنا تھا وہ ہی ان کے دل میں خوف آیا"۔ بعض محققین کا خیال یہ ہے کہ "اَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ" فرمانا حضرت یعقوب جیسے پیغمبر کے درجہ توکل و تفویض سے ذرا نازل بات تھی۔ اس کا جواب یہ ملا کہ لڑکوں نے گویا ان کے منہ میں سے بات پکڑ لی۔ جو اندیشہ ظاہر کیا تھا وہ ہی واقعہ بنا کر لے آئے۔ (تفسیر عثمانی)

قَالُوْا لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ

بولے اگر کھا گیا اُس کو بھیڑیا اور ہم ایک جماعت ہیں قوت ور تو تو

اِنَّآ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۱۴﴾

ہم نے سب کچھ گنوا دیا

بیٹوں کا جواب:

یعنی اگر ہماری جیسی طاقتور جماعت کی موجودگی میں چھوٹے بھائی کو بھیڑیا کھا جائے تو سمجھو کہ ہم بالکل ہی گئے گذرے ہوئے اس سے بڑھ کر کیا خسارہ ہوگا کہ دس گیارہ تنومند بھائیوں کی آنکھوں کے سامنے سے ایک کمزور بچہ بھیڑیے کے منہ میں پہنچ جائے۔ ایسا ہوا تو کہنا چاہیے کہ ہم نے اپنا سب کچھ گنوا دیا۔ (تفسیر عثانی)

فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَاَجْمَعُوْٓا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ

پھر جب لے کر چلے اُس کو اور متفق ہوئے کہ ڈالیں

غَيٰبَتِ الْجُبِّ ۚ وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ

اُسکو گمنام کنویں میں اور ہم نے اشارہ کر دیا اُس کو کہ تو جتائیگا

بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵﴾

اُن کو اُن کا یہ کام اور وہ تجھ کو نہ جانیں گے

قرآن کا انداز بیان:

مفسرین نے بہت سے درمیانی قصے نہایت دردانگیز اور رقت خیز پیرایہ میں نقل کئے ہیں جنہیں سن کر پتھر کا کلیجہ موم ہو جائے۔ خدا جانے وہ کہاں تک صحیح ہیں۔ قرآن کریم اپنے خاص نصب العین کے اعتبار سے اس قسم کی تفاصیل کو زیادہ درخور اعتناء اور لائق ذکر نہیں سمجھتا کیونکہ ان اجزاء سے کوئی مہم مقصد متعلق نہیں ہے۔ قرآن کریم اپنے سامعین کے دلوں میں وہ رقت پیدا کرنا چاہتا ہے۔ جس کا منشاء خاص ایمان وعرفان ہو۔ عام رقت جو ہر کافر ومومن بلکہ حیوانات تک میں طبعاً مشترک ہے اس پر عام خطباء کی طرح زور ڈالنا قرآن کی عادت نہیں۔

بھائی ساتھ لے گئے:

یہاں بھی اس نے درمیانی واقعات حذف کر کے آخری بات بتلا دی کہ برادران یوسف یوسف کو بلطائف الحیل باپ کے پاس سے لے گئے اور ٹھہری ہوئی قرارداد کے موافق کنوئیں میں ڈالنے کا تہیہ کر لیا۔ اس وقت ہم نے یوسف کو اشارہ کیا جس کی دوسروں کو مطلق خبر نہیں ہوئی کہ گھبراؤ نہیں، ایک وقت آیا چاہتا ہے کہ یہ سب کاروائیاں تم ان کو یاد دلاؤ گے اور اس وقت تم ایسے بلند مقام اور اعلیٰ مرتبہ پر ہو گے کہ یہ تم کو پہچان نہ سکیں گے یا طول عہد کی وجہ سے تم کو شناخت نہ کر سکیں گے۔ یہ خدائی اشارہ خواب میں ہوا یا بیداری میں بطریق الہام ہوا یا فرشتہ کے ذریعہ سے اس کی تفصیل قرآن میں نہیں۔ البتہ ظاہر الفاظ کو دیکھ کر کہا گیا ہے کہ وحی کا آنا چالیس برس کی عمر پر موقوف نہیں ہے کیونکہ حضرت یوسف اس وقت بہت کم عمر تھے واللہ اعلم۔ (تفسیر عثانی)

بھائیوں کا ظلم اور یوسف علیہ السلام کی فریاد:

بغوی نے وہب وغیرہ کے بیان سے اخذ کر کے لکھا ہے کہ باپ کے سامنے بھائیوں نے یوسف کو نہایت عزت کے ساتھ اپنے ہاتھوں پر لیا، اپنے اوپر سوار کر لیا لیکن آبادی سے باہر نکل کر ان کو پھینک دیا اور مار پیٹ کرنے لگے۔ ایک مارتا تھا تو یوسف دوسرے سے فریاد کرتے تھے مگر وہ بھی مارتا تھا تو تیسرے کی پناہ ڈھونڈتے تھے پر کوئی پناہ نہ دیتا تھا۔ سبھوں نے مارتے مارتے ادھ موا کر دیا۔ حضرت یوسف چیخ رہے تھے اور باپ کو پکار رہے تھے اور فرما رہے تھے ابا دیکھئے ان باندی بچوں نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا۔ آخر یہودا نے دیکھا کہ یہ لوگ یوسف کو قتل ہی کر ڈالیں گے تو بولا قتل نہ کرنے کا تم نے مجھ سے وعدہ کیا ہے اس لئے قتل نہیں کر سکتے۔

کنوئیں میں ڈال دیا:

غرض اس طرح ایک کنوئیں پر غیر معروف راستے سے لے گئے کنوئیں کا منھ تنگ تھا مگر اندر بہت وسیع تھا حضرت یعقوب کے مکان سے برقول مقاتل یہ کنواں تین فرسخ دور تھا۔ کعب نے کہا مدین اور مصر کے درمیان تھا۔ قتادہ نے کہا بیت المقدس کا کنواں تھا۔ حضرت یوسفؑ کی عمر اس وقت بارہ یا اٹھارہ برس تھی جب کنوئیں میں آپ کو لٹکانے لگے تو آپ نے کنویں کا کنارہ پکڑ لیا مگر انہوں نے آپ کے ہاتھ باندھ دیئے اور کرتہ اتار لیا حضرت یوسف نے کہا بھائیو کرتہ تو دیدو میں کنویں کے اندر اس کو پہن کر (سردی وغیرہ سے) بچاؤ کر لوں گا۔ بھائیوں نے کہا سورج اور چاند ستاروں کو پکارو وہی تیرا دل بہلائیں گے، آپ نے فرمایا میں نے کچھ نہیں دیکھا تھا۔ آخر آپ کو کنویں میں ڈال ہی دیا۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ ایک ڈول میں بٹھا کر ڈول کو کنویں میں لٹکا دیا جب ڈول آدھے کنویں تک پہنچا تو رسی چھوڑ دی تاکہ یوسف گر کر مر جائیں لیکن کنویں میں پانی تھا، آپ پانی میں گر پڑے وہاں ایک پتھر نظر آیا آپ اس پر کھڑے ہو گئے۔ (تفسیر مظہری)

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے سدی کی روایت سے ایک طویل بیان کے ذیل میں لکھا ہے کہ خاندان یعقوب کی سکونت شام میں تھی، حضرت یعقوب کی نظر میں ہر وقت یوسف اور بن یامین سمائے ہوئے تھے اس پر دوسرے

بھائیوں کو جلن پیدا ہوئی وہ یوسف کو آبادی کے باہر صحرا میں لے گئے اس روایت میں ہے کہ یوسف کو ڈول میں بٹھا کر ڈول کو کنویں میں لٹکا دیا، نصف کنویں تک ڈول پہنچا تو رسی ہاتھ سے چھوڑ دی، تاکہ یوسف گر کر مر جائیں، کنویں میں پانی تھا یوسف پانی میں گر گئے پھر ایک پتھر پر کھڑے ہو گئے اور روتے رہے فوراً جبرائیل وحی لے کر آ پہنچے جیسا کہ اللہ نے فرمایا ہے۔

امام احمد نے الزہد میں اور ابن عبدالحکم نے فتوح مصر میں اور ابن ابی شیبہ اور ابن جریر اور ابن المنذر راور ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ اور ابن مرودیہ نے حسن بصری کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ اس وقت حضرت یوسف کی عمر سترہ برس کی تھی بعض نے کہا جوان ہونے کے قریب تھے آپ کے پاس جوانی سے پہلے وحی آ گئی تھی۔ جیسی حضرت یحیٰ اور حضرت عیسیٰ کے پاس آئی تھی۔

ابراہیم علیہ السلام کا کرتہ:

قصہ یوسف کی بعض روایات میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو جب آگ میں ڈالا گیا تھا تو آپ کے کپڑے اتار لئے گئے تھے۔ حضرت جبرائیل نے جنت سے لا کر ایک ریشمی کرتہ آپ کو پہنا دیا تھا۔ حضرت ابراہیم سے وہ کرتہ حضرت اسحٰق کو پہنچا تھا اور حضرت اسحٰق سے حضرت یعقوب کو حضرت یعقوب نے اس کا تعویذ بنا کر حضرت یوسفؑ کے گلے میں ڈال دیا تھا، حضرت جبرائیل نے وہی کرتہ کھول کر حضرت یوسف کو پہنا دیا۔

وَجَآءُوْٓ اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ ؕ﴿۱۶﴾
اور آئے اپنے باپ کے پاس اندھیرا پڑے روتے ہوئے

بھائیوں کی واپسی:

یا تو گھر پہنچتے پہنچتے اندھیرا ہو گیا یا جان بوجھ کر اندھیرے سے آئے کہ دن کے اجالے میں باپ کو منہ دکھانا زیادہ مشکل تھا اور رات کی سیاہ چادر بے حیائی، سنگدلی اور جھوٹی آہ و بکاء کی کسی حد تک پردہ داری کر سکتی تھی۔ اعمش نے خوب فرمایا کہ برادران یوسف کا گریہ و بکاء سننے کے بعد ہم کسی شخص کو محض چشم اشکبار سے سچا نہیں سمجھ سکتے۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ مصر پہنچنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو بذریعہ وحی اس بات سے منع کر دیا تھا کہ وہ اپنے حال کی خبر اپنے گھر بھیجیں (قرطبی) یہی وجہ تھی کہ یوسف علیہ السلام جیسے پیغمبر خدا نے جیل سے رہائی اور ملک مصر کی حکومت ملنے کے بعد بھی کوئی ایسی صورت نہیں نکالی جس کے ذریعہ والد ضعیف کو اپنی سلامتی کی خبر دے کر مطمئن کر دیتے،

اللہ جل شانہٗ کی حکمتوں کو کون جان سکتا ہے جو اس طرز میں مخفی تھیں، شاید یہ بھی منظور ہو کہ یعقوب علیہ السلام کو غیر اللہ کے ساتھ اتنی محبت کے ناپسند ہونے پر متنبہ کیا جائے، اور یہ کہ بھائیوں کا حاجتمند بن کر یوسف علیہ السلام کے سامنے پیش کر کے ان کے عمل کی کچھ سزا تو ان کو بھی دینا مقصود ہو۔ (معارف مفتی اعظم)

قَالُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا
کہنے لگے اے باپ ہم لگے دوڑنے آگے نکلنے کو اور چھوڑا
يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ ۚ
یوسف کو اپنے اسباب کے پاس پھر اُس کو کھا گیا بھیڑیا

والد کے سامنے بیان:

یعنی ہم نے حفاظت میں کچھ کوتاہی نہیں کی، ہمارے کپڑے لتے وغیرہ قابل حفاظت چیزیں جہاں رکھی تھیں وہیں یوسف کو بٹھلایا اور ایک دوسرے سے آگے نکلنے کو بھاگ دوڑ شروع کی۔ بس ذرا آنکھ سے اوجھل ہونا تھا کہ بھیڑیے نے یوسف کو آ دبوچا۔ اس موقع پر اتنی ذرا سی دیر میں احتمال بھی نہ تھا کہ بھیڑیا پہنچ کر فوراً یوسف کو شکار کر لے گا۔ (تفسیر عثمانی)

دوڑ کا مقابلہ:

احکام القرآن میں فرمایا کہ باہمی مسابقت (دوڑ) شریعت میں مشروع اور اچھی خصلت ہے، جو جنگ و جہاد میں کام آتی ہے، اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بنفس نفیس خود بھی مسابقت کرنا احادیث صحیحہ میں ثابت ہے، اور گھوڑوں کی مسابقت کرانا (یعنی گھوڑ دوڑ) بھی ثابت ہے، صحابہ کرام میں سے سلمہ بن اکوع نے ایک شخص کے ساتھ دوڑ میں مسابقت کی تو سلمہ غالب آ گئے۔

آیت مذکورہ اور ان روایات سے اصل گھوڑ دوڑ کا جائز ہونا ثابت ہے اور گھوڑ دوڑ کے علاوہ دوڑ میں، تیر اندازی کے نشانے وغیرہ میں بھی باہمی مقابلہ اور مسابقت جائز ہے، اور اس مسابقت میں غالب آنے والے فریق کو کسی تیسرے کی طرف سے انعام دے دینا بھی جائز ہے، لیکن آپس میں ہار جیت کی کوئی رقم بطور شرط ٹھیرانا جوا اور قمار ہے، جس کو قرآن کرم نے حرام قرار دیا ہے، آج کل جتنی صورتیں گھوڑ دوڑ کی رائج ہیں وہ کوئی بھی جوے اور قمار سے خالی نہیں، اس لئے سب حرام و ناجائز ہیں۔ (معارف مفتی صاحب)

وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ ﴿۱۷﴾
اور تو باور نہ کریگا ہمارا کہنا اور اگرچہ ہم سچے ہوں

اپنے منہ میاں مٹھو:

یعنی یوسف کے معاملہ میں پہلے ہی سے آپ کو ہماری طرف بدگمانی ہے۔ اگر آپ کے نزدیک ہم بالکل سچے بھی ہوں تب بھی اس معاملہ خاص

میں کسی طرح ہماری بات کا یقین نہیں کر سکتے۔ (تفسیر عثمانی)

وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ؕ

اور لائے اُس کے کرتے پر لہو لگا کر جھوٹ

جھوٹا خون:

ایک بکری یا ہرن وغیرہ ذبح کر کے اس کا خون یوسف کی قمیض پر چھڑک لائے تھے وہ جھوٹا خون پیش کر کے باپ کو یقین دلانے لگے، کہ بھیڑیے کے زخمی کرنے سے یہ کرتہ خون آلود ہو گیا۔ (تفسیر عثمانی)

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ

بولا یہ ہرگز نہیں بلکہ بنادی ہے تم کو تمہارے جیوں نے ایک بات اب صبر ہی

جَمِيْلٌ ؕ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۸﴾

بہتر ہے اور اللہ ہی سے مدد مانگتا ہوں اس بات پر جو تم ظاہر کرتے ہو

یعقوب علیہ السلام کی دانائی اور صبر:

بھلا جس کو شام میں بیٹھ کر مصر سے یوسف کے کرتہ کی خوشبو آتی تھی وہ بکری کے خون پر یوسف کے خون کا گمان کب کر سکتا تھا۔ انہوں نے سنتے ہی جھٹلا دیا۔ اور جیسا کہ بعض تفاسیر میں ہے کہنے لگے کہ وہ بھیڑیا واقعی بڑا حلیم و متین ہوگا جو یوسف کو لے گیا اور خون آلود کرتہ کو نہایت احتیاط سے صحیح وسالم تار کر رکھ گیا سچ ہے "دروغگو را حافظہ نہ باشند" خون کے چھینٹے تو دیے مگر یہ خیال نہ رہا کہ قمیض کو بے ترتیبی سے نوچ کر اور پھاڑ کر پیش کرتے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے صاف طور پر فرما دیا کہ یہ سب تمہاری سازش اور اپنے دلوں سے تراشی ہوئی باتیں ہیں۔ بہرحال میں صبر جمیل اختیار کرتا ہوں جس میں نہ کسی غیر کے سامنے شکوہ ہوگا نہ تم سے انتقام کی کوشش۔ صرف اپنے خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اس صبر میں میری مدد فرمائے اور اپنی اعانت غیبی سے جو باتیں تم ظاہر کر رہے ہو، ان کی حقیقت اس طرح آشکارا کر دے کہ سلامتی کے ساتھ یوسف سے دوبارہ ملنا نصیب ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ یعقوب علیہ السلام کو مطلع کر دیا گیا تھا کہ جس امتحان میں وہ مبتلا کئے گئے ہیں وہ پورا ہو کر رہے گا اور ایک مدت معین کے بعد اس مصیبت سے نجات ملے گی۔ فی الحال ڈھونڈھنے یا انتقامی تدابیر اختیار کرنے سے کوئی فائدہ نہیں یوسف ابھی ملیں گے نہیں۔ ہاں دوسرے بیٹے ساری دنیا میں رسوا ہو جائیں گے اور ممکن ہے کہ طیش میں آ کر خود یعقوب علیہ السلام کو ایذا دینے کی کوشش کریں۔ کذا قال الامام الرازی فی الکبیر. واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانی)

فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ سو اب میں صبر ہی کروں گا، جس میں کسی شکایت کی آمیزش نہ ہوگی، بغوی نے لکھا ہے صبر جمیل (اچھا صبر) یعنی ایسا صبر جس میں مخلوق سے کوئی شکوہ نہ ہوگا اور جزع فزع نہ ہوگی۔ ابن جریر نے حبان بن جمیہ کی روایت سے مرسلاً بیان کیا ہے کہ صبر جمیل وہ ہے جس میں کوئی شکوہ نہ ہو۔ (تفسیر مظہری)

بھائیوں کی عقل پر پردہ:

وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ، یعنی یوسف علیہ السلام کے بھائی یوسفؑ کے کرتے پر جھوٹا خون لگا کر لائے تھے تاکہ والد کو بھیڑیئے کے کھانے کا یقین دلائیں۔

مگر اللہ تعالیٰ نے ان کا جھوٹ ظاہر کرنے کیلئے انکو اس سے غافل کر دیا کہ کرتے پر خون لگانے کے ساتھ اس کو پھاڑ بھی دیتے، جس سے بھیڑیئے کا کھانا ثابت ہوتا، انہوں نے صحیح سالم کرتے پر بکری کے بچے کا خون لگا کر باپ کو دھوکہ میں ڈالنا چاہا، یعقوب علیہ السلام نے کرتا صحیح سالم دیکھ کر فرمایا، میرے بیٹو! یہ بھیڑیا کیسا حکیم اور عقلمند تھا کہ یوسف کو اس طرح کھایا کہ کرتہ کہیں سے نہیں پھٹا۔

مسئلہ: یعقوب علیہ السلام نے کرتہ صحیح سالم ہونے سے برادرانِ یوسفؑ کے جھوٹ پر استدلال کیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ قاضی یا حاکم کو فریقین کے دعوے اور دلائل کے ساتھ حالات اور قرائن پر بھی نظر کرنا چاہئے۔ (معارف مفتی صاحب)

وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ فَاَدْلٰى

اور آیا ایک قافلہ پھر بھیجا اپنا پانی بھرنے والا اُس نے لٹکایا اپنا ڈول

دَلْوَهٗ ؕ قَالَ يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ ؕ

کہنے لگا کیا خوشی کی بات ہے یہ ہے ایک لڑکا

یوسف علیہ السلام قافلہ کے ہاتھ:

کہتے ہیں تین روز تک یوسف علیہ السلام کنوئیں میں رہے، قدرت الٰہی نے حفاظت کی۔ ایک بھائی یہودا کے دل میں ڈال دیا کہ وہ ہر روز کنوئیں میں کھانا پہنچا آتا تھا۔ ویسے بھی سب بھائی خبر رکھتے تھے کہ مرے نہیں۔ کسی دوسرے ملک کا مسافر نکال لے جائے تو ہمارے درمیان سے یہ کانٹا نکل جائے۔ سچ ہے گل است سعدی و در چشم دشمناں خار است۔ آخر مدین سے مصر کو جانیوالا ایک قافلہ ادھر سے گذرا۔ انہوں نے کنواں دیکھ کر اپنا آدمی پانی بھرنے کو بھیجا اس نے ڈول پھانسا تو حضرت یوسف چھوٹے تو تھے ہی ڈول میں ہو بیٹھے اور رسی ہاتھ سے پکڑلی کھینچنے والے نے ان کا حسن و جمال دیکھ کر بے ساختہ خوشی سے پکارا کہ یہ تو عجیب لڑکا ہے بڑی قیمت کو بکے گا۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت یوسفؑ رسی پکڑ کر لٹک گئے اور اوپر آ گئے۔ لوگوں نے دیکھا کہ ایک حسین ترین لڑکا برآمد ہوا تعجب میں پڑ گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یوسفؑ کو (سارے انسانوں کے) حسن کا آدھا حصہ دیا گیا تھا۔ رواہ ابن ابی شیبہ واحمد ابویعلی والحاکم عن انسؓ۔

یوسف علیہ السلام کا حُسن:

بغوی نے لکھا ہے یوسف میں یہ حسن ان کی دادی حضرت سارہ کا منتقل ہو کر آیا تھا، حضرت سارہ کو (کل) حسن کا چھٹا حصہ اللہ کی طرف سے ملا تھا، ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ یوسف اور ان کی والدہ کے حصے میں دو تہائی حسن آ گیا تھا۔ مالک بن وعر نے جب یوسف کو دیکھا تو۔

قافلہ والوں کی خوشی:

قَالَ يٰبُشْرٰى بولا اے (لوگوتم کو) بشارت ہو یا فرط مسرت میں اس نے بشارت کو پکارا۔ بعض علماء نے کہا بشری اس کے ساتھی کا نام تھا مدد کرنے کیلئے مالک نے بشری کو پکارا تھا۔

هٰذَا غُلٰمٌ یہ تو لڑکا ہے۔ مجاہد نے اپنے باپ کا قول بیان کیا کہ جب یوسف کنویں سے نکال لئے گئے تو کنواں رونے لگا۔ (تفسیر مظہری)

قافلہ: وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ سیارہ کے معنی قافلہ وارد سے مراد وہ لوگ ہیں جو قافلہ سے آگے رہتے ہیں، قافلہ کی ضروریات پانی وغیرہ مہیا کرنا ان کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ ادلاء کے معنی کنویں میں ڈول ڈالنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اتفاقاً ایک قافلہ اس سرزمین پر آ نکلا، تفسیر قرطبی میں ہے کہ یہ قافلہ ملک شام سے مصر جا رہا تھا راستہ بھول کر اس غیر آباد جنگل میں پہنچ گیا اور پانی لانے والوں کو کنوئیں پر بھیجا۔

لوگوں کی نظر میں یہ اتفاقی واقعہ تھا کہ شامی قافلہ راستہ بھول کر یہاں پہنچا اور اس غیر آباد کنویں سے سابقہ پڑا، لیکن راز کائنات کا جاننے والا جانتا ہے کہ یہ سب واقعات ایک مربوط اور مستحکم نظام کی ملی ہوئی کڑیاں ہیں یوسف کا پیدا کرنے والا اور اس کی حفاظت کرنے والا ہی قافلہ کو راستہ سے ہٹا کر یہاں لاتا ہے اور اس کے آدمیوں کو اس غیر آباد کنویں پر بھیجتا ہے یہی حال ہے

یوسف علیہ السلام کا کرتہ:

ماوردیؒ نے فرمایا کہ پیراہن یوسف بھی عجائب روزگار میں سے ہے، تین عظیم الشان وقائع اسی پیراہن یعنی کرتے سے وابستہ ہیں۔

پہلا واقعہ، خون آلود کر کے والد کو دھوکہ دینے اور کرتے کی شہادت سے جھوٹ ثابت ہونے کا ہے دوسرا واقعہ زلیخا کا کہ اس میں بھی یوسف علیہ السلام کا کرتہ ہی شہادت میں پیش ہوا ہے، تیسرا واقعہ یعقوب علیہ السلام کی بینائی واپس آنے کا۔ اس میں بھی ان کا کرتہ ہی اعجاز کا مظہر ثابت ہوا ہے۔ (معارف مفتی اعظم)

وَاَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً
اور چھپالیا اُسکو تجارت کا مال سمجھ کر

یوسف علیہ السلام غلام بن گئے:

یعنی کھینچنے والے نے اس واقعہ کو دوسرے ہمراہیوں سے چھپانا چاہا کہ اوروں کو خبر گئی تو سب شریک ہو جائیں گے۔ شاید یہ ظاہر کیا کہ یہ غلام اس کے مالکوں نے مجھ کو دیا ہے تا مصر کے بازار میں فروخت کروں۔ (تفسیر عثمانی)

وَاَسَرُّوْهُ اور انہوں نے یوسفؑ کو چھپائے رکھا یعنی مالک اور اس کے ساتھیوں نے دوسرے قافلے والوں سے یوسف کو چھپالیا۔ تا کہ وہ شرکت کے دعویدار نہ بن جائیں۔ یہ بھی مطلب بیان کیا گیا ہے کہ یوسف کے معاملے کو ان لوگوں نے چھپالیا اور دوسرے لوگوں سے کہا کنویں پر رہنے والوں نے ہم کو یہ لڑکا دیا ہے تا کہ ان کی طرف سے مصر میں لے جا کر اس کو فروخت کر دیں۔ بعض علماء نے کہا کہ برادران یوسف نے یوسف کی بات قافلہ والوں سے پوشیدہ رکھی (اور یوسف کو بھائی نہیں بتایا) بات یہ ہوئی کہ یہودا روز یوسف کا کھانا لاتا تھا ایک روز جو کھانا لایا اور یوسف کو کنویں میں نہ پایا تو بھائیوں کو جا کر اطلاع دی بھائی ڈھونڈنے نکلے تلاش کرتے کرتے مالک کے پاس یوسف دستیاب ہوئے، انہوں نے قافلے والوں سے اصل بات چھپالی اور یوسف کو اپنا بھائی ظاہر کرنے کے بجائے کہنے لگے یہ ہمارا بھاگا ہوا غلام ہے کہا جاتا ہے بھائیوں نے حضرت یوسفؑ کو بھی ڈرا دھمکا دیا تھا۔ بھائیوں کے ڈر سے یوسف بھی کچھ نہ بولے خاموش رہے۔ (تفسیر مظہری)

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۹﴾
اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں

ارادۂ خداوندی:

یعنی بھائی بے وطن کرنا چاہتے تھے اور قافلہ والے بیچ کر دام وصول کرنے کا ارادہ کر رہے تھے اور خدا تعالیٰ خزائن مصر کا مالک بنانا چاہتا تھا۔ وہ اگر چاہتا تو ان کارروائیوں کو ایک سیکنڈ میں روک دیتا، لیکن اس کی مصلحت تاخیر میں تھی، اس لئے سب چیزوں کو جانتے اور دیکھتے ہوئے انہیں ڈھیل دی گئی۔ (تفسیر عثمانی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے بشارت:

ابن کثیر نے فرمایا کہ اس جملہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی یہ ہدایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم جو کچھ آپ کے ساتھ کر رہی ہے یا کرے گی وہ سب ہمارے علم وقدرت سے باہر نہیں، اگر ہم چاہیں تو ایک آن میں سب

کو بدل ڈالیں، لیکن تقاضائے حکمت یہی ہے کہ ان لوگوں کو اس وقت اپنی قوت آزمائی کرنے دی جائے اور انجام کار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان پر غالب کر کے حق کو غالب کیا جائے گا۔ جیسا یوسف علیہ السلام کے ساتھ کیا گیا۔ (معارف مفتی اعظم)

یہ واقعات محض اتفاق نہ تھا:

ان تمام حالات وواقعات کا جن کو عام انسان اتفاقی حوادث سمجھتے ہیں، اور فلسفہ والے ان کو بخت واتفاق کہا کرتے ہیں، جو درحقیقت نظام کائنات سے ناواقفیت پر مبنی ہوتا ہے، ورنہ سلسلہ تکوین میں کوئی بخت واتفاق نہیں۔ حق سبحانہ وتعالیٰ جس کی شان فعال لمایرید ہے مخفی حکمتوں کے تحت ایسے حالات پیدا کر دیتے ہیں کہ ظاہری وقائع سے ان کا جوڑ سمجھ میں نہیں آتا تو انسان ان کو اتفاقی حوادث قرار دیتا ہے۔

بہر حال ان کا آدمی جس کا نام مالک بن دعبر بتلایا جاتا ہے اس کنویں پر پہنچا ڈول ڈالا یوسف علیہ السلام نے قدرت کی امداد کا مشاہدہ، کیا اس ڈول کی رسی پکڑلی، پانی کے بجائے ڈول کے ساتھ ایک ایسی ہستی کا چہرہ سامنے آ گیا جس کی آئندہ ہونے والے عظمت شان سے بھی قطع نظر کی جائے تو موجودہ حالت میں بھی اپنے حسن وجمال اور معنوی کمالات کے درخشاں نشانات ان کی عظمت کے لئے کچھ کم نہ تھے، ایک عجیب انداز سے کنویں کی گہرائی سے برآمد ہونے والے، اس کم سن حسین اور ہونہار بچہ کو دیکھ کر پکارا ٹھا۔ یبشریٰ ھذا غلام، ارے بڑی خوشی کی بات ہے یہ تو بڑا اچھا لڑکا نکل آیا ہے، صحیح مسلم میں شب معراج کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں یوسف علیہ السلام سے ملا تو دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے پورے عالم کے حسن وجمال میں سے آدھا ان کو عطا فرمایا ہے، اور باقی آدھا سارے جہان میں تقسیم ہوا ہے۔

و اسروہ بضاعۃ، یعنی چھپالیا اس کو ایک مال تجارت سمجھ کر، مطلب یہ ہے کہ شروع میں تو مالک بن دعبر یہ لڑکا دیکھ کر تعجب سے پکارا ٹھا، مگر پھر معاملہ پر غور کر کے یہ قرار دیا کہ اس کا چرچا نہ کیا جائے، اس کو چھپا کر رکھے، تاکہ اس کو فروخت کر کے رقم وصول کرے، اگر پورے قافلہ میں اس کا چرچا ہو گیا تو سارا قافلہ اس میں شریک ہو جائے گا۔

اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے حقیقت واقعہ کو چھپا کر ان کو ایک مال تجارت بنالیا۔ جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ یہودا روزانہ یوسف علیہ السلام کو کنوئیں میں کھانا پہنچانے کیلئے جاتے تھے، تیسرے روز جب ان کو کنوئیں میں نہ پایا، تو واپس آ کر بھائیوں سے واقعہ بیان کیا یہ سب بھائی جمع ہو کر وہاں پہنچے، تحقیق کرنے پر قافلہ والوں کے پاس یوسف علیہ السلام برآمد ہوئے، تو ان سے کہا کہ یہ لڑکا ہمارا غلام ہے، بھاگ کر یہاں آ گیا ہے، تم نے بہت برا کیا، کہ اس کو اپنے قبضہ میں رکھا، مالک بن دعبر اور ان کے ساتھی سہم گئے کہ ہم چور سمجھے جائیں گے، اس لئے بھائیوں سے ان کے خریدنے کی بات چیت ہونے لگی۔ (معارف مفتی صاحب)

وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۭ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ

اور بیچ آئے اُسکو بھائی ناقص قیمت کو گنتی کی چونیاں

بھائیوں نے بھائی کو بیچ ڈالا:

بھائیوں کو خبر ہوئی کہ قافلہ والے نکال لے گئے، وہاں پہنچے اور ظاہر کیا کہ یہ ہمارا غلام بھاگ آیا ہے چونکہ اسے بھاگنے کی عادت ہے، اس لئے ہم رکھنا نہیں چاہتے، تم خریدو تو خرید سکتے ہو۔ مگر بہت سخت نگرانی رکھنا کہیں بھاگ نہ جائے کہتے ہیں اٹھارہ درم یا کم وبیش میں بیچ ڈالا، اور نو بھائیوں نے دو دو درہم (تقریباً آٹھ آٹھ آنے) بانٹ لئے۔ ایک بھائی یہودا نے حصہ نہیں لیا۔ (تفسیر عثمانی)

معارف ومسائل

قرطبی نے فرمایا کہ عرب تجار کی عادت یہ تھی کہ بڑی رقموں کے معاملات وزن سے کیا کرتے تھے، اور چھوٹی رقمیں جو چالیس سے زیادہ نہ ہوں ان کے معاملات گنتی سے کیا کرتے تھے، اس لئے دراہم کے ساتھ معدودہ کے لفظ نے یہ بتلا دیا کہ دراہم کی مقدار چالیس سے کم تھی، ابن کثیر نے بروایت عبداللہ بن مسعودؓ لکھا ہے کہ بیس درہم کے بدلہ میں سودا ہوا اور دس بھائیوں نے دو دو درہم آپس میں تقسیم کر لئے، تعداد دراہم میں بائیس اور چالیس درہم کی بھی مختلف روایتیں منقول ہیں۔ (ابن کثیر)

امام تفسیر مجاہدؒ کی روایت کے مطابق یہ لوگ اس انتظار میں رہے کہ یہ قافلہ ان کو لے کر مصر کیلئے روانہ ہو جائے اور جب قافلہ روانہ ہوا تو کچھ دور تک قافلہ کے ساتھ چلے، اور ان لوگوں سے کہا دیکھو اس کو بھاگ جانے کی عادت ہے، کھلا نہ چھوڑو، بلکہ باندھ کر رکھو، اس درشہوار کی قدر وقیمت سے ناواقف قافلہ والے ان کو اسی طرح مصر تک لے گئے۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ

اور ہو رہے تھے اُس سے بیزار

وہ بھائی سے بیزار تھے:

یعنی اس قدر ارزاں بیچنے سے تعجب مت کرو۔ وہ اتنے بیزار تھے کہ مفت ہی دے ڈالتے تو مستبعد نہ تھا جو پیسے مل گئے غنیمت سمجھا، بعض مفسرین کہتے ہیں آیت میں اس بیع کا ذکر ہے جو قافلہ والوں نے مصر پہنچ کر کی۔ اگر ایسا ہو تو

کہا جائیگا کہ پڑی ہوئی چیز کی قدر نہ کی اور یہ اندیشہ رہا کہ پھر کوئی آ کر دعویٰ نہ کر بیٹھے۔ نیز آبق (بھگوڑا) ہونے کا عیب سن چکے تھے، اس لیے سستے داموں بیچ ڈالا۔ والظاہر ہوالاول۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانیؒ)

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اتنا سب کچھ کرنے پر بھی صبر نہ ہوا، قافلے کے پیچھے ہو لئے اور ان سے کہنے لگے دیکھو اس غلام میں بھاگ نکلنے کی عادت ہے اسے مضبوط باندھ دو کہیں تمہارے ہاتھوں سے بھی بھاگ نہ جائے۔ اسی طرح باندھے باندھے مصر تک پہنچے اور وہاں آپؑ کو بازار میں لے جا کر بیچنے لگے۔ اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا مجھے جو لے گا وہ خوش ہو جائے۔ پس عزیز مصر نے آپ کو خرید لیا وہ تھا بھی مسلمان۔ (تفسیر ابن کثیر)

زاہد کا معنیٰ: وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ زاہدین زاہد کی جمع ہے جو زہد سے مشتق ہے زہد کے لفظی معنی بے رغبتی اور بے توجہی کے آتے ہیں محاورات میں دنیا کی مال و دولت سے بے رغبتی اور اعراض کو کہا جاتا ہے معنی آیت کے یہ ہیں کہ برادران یوسف اس معاملہ میں دراصل مال کے خواہش مند نہ تھے ان کا اصل مقصد تو یوسف علیہ السلام کو باپ سے جدا کرنا تھا، اس لئے تھوڑے سے دراہم میں معاملہ کرلیا۔ (معارف مفتی اعظم)

وَقَالَ الَّذِى اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖۤ
اور کہا جس شخص نے خرید کیا اُس کو مصر سے اپنی عورت کو آبرو سے
اَكْرِمِىْ مَثْوٰىهُ عَسٰۤى اَنْ يَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ؕ
رکھ اُس کو شاید ہمارے کام آئے یا ہم کر لیں اُس کو بیٹا

مصر میں فروخت:

کہتے ہیں مصر پہنچ کر نیلام ہوا۔ عزیز مصر جو وہاں کا مدار المہام تھا، اس کی بولی پر معاملہ ختم ہوا۔ اس نے اپنی عورت (زلیخا یا راعیل) سے کہا کہ نہایت پیارا، مقبول صورت اور ہونہار لڑکا معلوم ہوتا ہے۔ اس کو پوری عزت و آبرو سے رکھو۔ غلاموں کا معاملہ مت کرو۔ شاید بڑا ہو کر ہمارے کام آئے۔ ہم اپنا کاروبار اس کے سپرد کردیں۔ یا جب اولاد نہیں ہے تو بیٹا بنالیں۔ (تفسیر عثمانیؒ)

مصر میں قیمت:

مطلب یہ ہے کہ قافلے والوں نے ان کو مصر لے جا کر فروخت کرنے کا اعلان کیا تو تفسیر قرطبی میں ہے کہ لوگوں نے بڑھ بڑھ کر قیمتیں لگانا شروع کیا۔ یہاں تک کہ یوسف علیہ السلام کے وزن کے برابر سونا اور اسی کی برابر مشک اور اسی وزن کے ریشمی کپڑے قیمت لگ گئی۔

یہ دولت اللہ تعالیٰ نے عزیز مصر کے مقدر کی تھی اس نے یہ سب چیزیں قیمت میں ادا کر کے یوسف علیہ السلام کو خرید لیا۔

مصری خریدار:

ابن کثیر نے فرمایا کہ یہ شخص جس نے مصر میں یوسف علیہ السلام کو خریدا وہ ملک مصر کا وزیر خزانہ تھا۔ جس کا نام قطفیر یا اطفیر بتلایا جاتا ہے۔ اور بادشاہ مصر اس زمانہ میں قوم عمالقہ کا ایک شخص ریان بن اسید تھا۔ (جو بعد میں حضرت یوسف علیہ السلام کے ہاتھ پر اسلام لایا اور مسلمان ہو کر یوسف علیہ السلام کی زندگی میں انتقال کر گیا (مظہری) اور عزیز مصر جس نے خریدا تھا اس کی بیوی کا نام راعیل یا زلیخا بتایا گیا ہے۔ عزیز مصر قطفیر نے یوسف علیہ السلام کے متعلق اپنی بیوی کو یہ ہدایت کی کہ ان کو اچھا ٹھکانا دے، عام غلاموں کی طرح نہ رکھے، ان کی ضروریات کا اچھا انتظام کرے۔

ابن عباسؓ، مجاہدؒ، قتادہؒ نے فرمایا کہ ۳۳ سال عمر تھی۔ یوسف علیہ السلام کو نبوت مصر پہنچنے کے بھی کافی عرصہ بعد ملی ہے۔ اور کنویں کی گہرائی میں جو وحی ان کو بھیجی گئی وہ وحی نبوت نہ تھی۔ بلکہ لغوی وحی تھی جو غیر انبیاء کو بھی بھیجی جاسکتی ہے، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ اور حضرت مریمؑ کے بارے میں وارد ہوا ہے۔ (معارف مفتی اعظم)

قافلہ والے یوسف علیہ السلام کو بھائیوں سے خرید کر مصر لے گئے اور فروخت کرنے کیلئے ان کو بازار میں کھڑا کر دیا۔ اس بے مثال حسن جمال کو دیکھ کر دنیا کی حیران رہ گئی۔

آراستہ آں ار بباز برآمد ٭ فریاد و فغاں از در و دیوار برآمد

خریدار قیمت بڑھانے لگے نوبت بانیجا رسید کو یوسف علیہ السلام کے برابر تول کر سونا اور چاندی اور مشک و دیباد ینے پر تیار ہوئے عزیز مصر نے بیش بہا قیمت دے کر ان کو خرید لیا یہ عزیز، مصر کے تمام خزانوں کا مالک تھا اور بادشاہ مصر کا بہت مقرب تھا اس کا نام قطفیر تھا اور اس کی بی بی کا نام زلیخا تھا یا اس کا نام راعیل تھا۔

یوسفؑ کو بیٹا بنالیا:

خرید کر یوسف علیہ السلام کو اپنے گھر لے گیا اور اہل مصر میں سے جس شخص نے ان کو خریدا یعنی عزیز مصر نے اس لئے ان کو اپنے ساتھ لا کر اپنی بیوی کے سپرد کیا اور اپنی بیوی سے کہا کہ اس کا ٹھکانا اچھا کرنا۔ یعنی عزت و حرمت کے ساتھ رکھنا۔ غلام کی طرح اس کو نہ رکھنا شاید یہ ہم کو نفع پہنچادے یا ہم اس کو اپنا بیٹا بنالیں یہ لڑکا بڑا ہونہار معلوم ہوتا ہے جب اولاد نہیں تو اس کو بیٹا بنالیں گے عزیز مصر لاولد تھا اس لئے یہ خواہش ظاہر کی کہ ہم یوسف کو اپنا بیٹا بنالیں گے اس لئے کہ فہم و فراست کے آثار یوسف علیہ السلام کے چہرے سے نمایاں تھے نفع پہنچانے سے مراد یہ ہے کہ امور سلطنت میں ہمارا معین اور مددگار بنے۔

دنیا کے ذہین شخص:

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ دنیا میں سب سے زیادہ صاحب فراست تین شخص گزرے اول عزیز مصر جس نے یوسف علیہ السلام کو دیکھتے ہی تاڑلیا اوران کی فہم وفراست کا اندازہ لگالیا۔ اوراپنی بیوی سے کہا اَكْرِمِيْ مَثْوٰىهُ عَسٰۤى اَنْ يَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا دوئم: حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی جس نے موسیٰ علیہ السلام کی قوت اورامانت کو دیکھ کراپنے باپ کو مشورہ دیا يٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ اے باپ ان کو نوکر رکھ لیجئے بہترین شخص جس کو نوکر رکھا جائے وہ وہ ہے کہ جوصاحب قوت اورصاحب امانت ہو۔ سوئم حضرت ابوبکر صدیقؓ جنہوں نے حضرت عمرؓ کی فہم وفراست کااندازہ لگالیا۔اوراپنے بعدان کواپناجانشین بنایا۔(معارف القرآن کاندھلویؒ)

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ

اوراسی طرح جگہ دی ہم نے یوسف کواُس ملک میں اوراس واسطے کہ اسکو

وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ

سکھائیں کچھ ٹھکانے (کل درست کرنی باتوں کی) پر بٹھانا باتوں کا

سر بلندیوں کے سامان:

یعنی ہم نے اپنی قدرت کاملہ اورتدبیر لطیف سے یوسف کو بھائیوں کی حاسدانہ سختیوں اورکنوئیں کی قید سے نکال کرعزیز مصر کے یہاں پہنچا دیا۔ پھراس کے دل میں یوسف کی محبت ووقعت القاء فرمائی اس طرح ہم نے ان کو مصر میں ایک معزز جگہ دی اوراہل مصر کی نظروں میں ان کو وجیہ ومحبوب بنادیا۔ تا یہ چیز آئندہ ترقیات اورسربلندیوں کا پیش خیمہ ہو۔اوربنی اسرائیل کومصر میں بسانے کا ذریعہ بنے۔ساتھ ہی یہ بھی منظور تھا کہ عزیز مصر کے یہاں رہ کر بڑے سرداروں کی صحبت دیکھیں تاسلطنت کے رموز واشارات سمجھنے اور تمام باتوں کوان کے ٹھکانے پر بٹھانے کا کامل سلیقہ اورتجربہ حاصل ہو۔

(تنبیہ) اسی سورت کے پہلے رکوع میں ''تاویل الاحادیث'' کالفظ گذر چکا ہے۔اس کی تفسیر وہاں ملاحظہ کرلی جائے۔(تفسیرعثمانی)

وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ

اور اللہ طاقتور رہتا ہے اپنے کام میں ولیکن اکثر لوگ

لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱﴾

نہیں جانتے

تدبیر الٰہی: یعنی بھائیوں نے یوسف کوگرانا چاہا۔ خدا نے ان کوآسمان رفعت پرپہنچادیا۔ اکثرلوگ کوتاہ نظری سے دیکھتے نہیں کہ انسانی تدبیروں کے مقابلہ میں کس طرح خدا کابندوبست غالب آتا ہے۔(تفسیرعثمانی)

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا

اور جب پہنچ گیا اپنی قوت کو دیا ہم نے اسکو حکم اور علم

علم وحکمت کا حصول:

یعنی جب یوسف کے تمام قویٰ حدکمال کو پہنچ گئے توخدا کے یہاں سے عظیم الشان علم وحکمت کا فیض پہنچا۔ نہایت مشکل عقدے اپنی فہم رسا سے حل کرتے ہیں، بڑی خوبی اوردانائی سےلوگوں کے نزاعات چکاتے ،دین کی باریکیاں سمجھتے، جوزبان سے کہتے وہ کرکے دکھاتے۔سفیہانہ اخلاق سے قطعاً پاک وصاف اورعلم شرائع کے پورے ماہر تھے۔تعبیر رؤیا کاعلم توان کامخصوص حصہ تھا۔(تفسیرعثمانی)

وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۲﴾

اور ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں ہم نیکی والوں کو

سلامتِ طبع: جولوگ فطرت کی رہنمائی یاتقلید صالحین اورتوفیق ازلی سے نوائب وحوادث پرصابررہ کرعمدہ اخلاق اورنیک چال چلن اختیار کرتے ہیں حق تعالیٰ ان پرایسے ہی انعام فرماتا ہے۔(تفسیرعثمانی)

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ

اور پھسلایا اُسکو اُس عورت نے جس کے گھر میں تھا

وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ

اپناجی تھامنے سے اور بند کردیئے دروازے اور بولی شتابی کر

امتحانِ یوسف: ادھرتوالطاف غیبیہ حضرت یوسف کی عجیب وغریب طریقہ سے تربیت فرمارہے تھے۔ادھرعزیز کی بیوی (زلیخا) نے ان کے سامنے ایک نہایت ہی مزلۃ الاقدام موقع امتحان کا کھڑا کردیا۔یعنی حضرت یوسف کے حسن وجمال پرزلیخا مفتون ہوگئی اوردل کشی وہوشربائی کے سارے سامان جمع کرکے چاہا کہ یوسف کے دل کوان کے قابو سے باہر کردے۔ایک طرف عیش ونشاط کے سامان،نفسانی جذبات پورے کرنے کیلئے ہرقسم کی سہولتیں، یوسف علیہ السلام کاہروقت زلیخا کے گھر میں موجودرہنا،اس کانہایت محبت،اورپیار سے رکھنا،تنہائی کے وقت خودعورت کی طرف سے ایک خواہش کابیتابانہ اظہار، کسی غیر کے آنے جانے کےسبب،دروازے بند،دوسری طرف۔جوانی کی عمر، قوت کازمانہ،مزاج کااعتدال،تجرد کی زندگی،یہ سب دواعی واسباب ایسے

تھے جن سے ٹکرا کر بڑے سے بڑے زاہد کا تقوی بھی پاش پاش ہو جاتا۔ مگر خدا نے جس کو محسن قرار دے کر علم و حکمت کے رنگ میں رنگین کیا اور پیغمبرانہ عصمت کے بلند مقام پر پہنچایا، اس پر کیا مجال تھی کہ شیطان کا قابو چل جاتا۔ اس نے ایک لفظ کہا ''معاذ اللہ'' (خدا کی پناہ) اور شیطانی جال کے سارے حلقہ توڑ ڈالے کیونکہ جس نے خدا کی پناہ لی اس پر کس کا وار چل سکتا ہے؟

ہیت لک کو بعض لوگ سریانی زبان کا لفظ کہتے ہیں بعض قبطی زبان کا بعض اسے غریب لفظ بتلاتے ہیں بعض حورانیہ کا لغت بتلاتے ہیں۔ کسائی اسی قرأت کو پسند کرتے تھے اور کہتے تھے اہل حوران کا یہ لغت ہے حجاز میں آ گیا ہے اہل حوران کے ایک عالم نے کہا ہے کہ یہ ہمارا لغت ہے۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ؕ
کہا خدا کی پناہ وہ عزیز مالک ہے میرا اچھی طرح رکھا ہے مجھ کو بیشک
اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾
بھلائی نہیں پاتے جو لوگ کہ بے انصاف ہوں

حضرت یوسفؑ کی کامیابی:

یعنی خدا کی پناہ میں ایسی قبیح حرکت کیسے کر سکتا ہوں؟ علاوہ بریں ''عزیز'' میرا مربی ہے جس نے مجھے ایسی عزت و راحت سے رکھا، کیا میں اپنے محسن کے ناموس پر حملہ کروں؟ ایسی محسن کشی اور بے انصافی کرنیوالے کبھی بھلائی اور کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکتے۔ نیز جب ظاہری مربی کا ہم کو اس قدر پاس ہے تو سمجھ لو کہ اس پروردگار حقیقی سے ہمیں کس قدر شرمانا اور حیا کرنا چاہیے جس نے محض اپنے فضل سے ہماری تربیت فرمائی اور اپنے بندوں کو ہماری خدمت و راحت رسانی کیلئے کھڑا کر دیا۔

(تنبیہ) بعض مفسرین نے ''انہ ربی'' کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع کی ہے۔ (تفسیر عثمانی)

زلیخا کا جال:

سدی اور ابن اسحاق نے بیان کیا کہ عزیز کی بیوی نے یوسف کو جب پھسلانا چاہا تو اس کی تدبیر یہ کی کہ یوسف کے حسن کی تعریف کرنی شروع کر دی، کہنے لگی یوسف تمہارے بال کیسے حسین ہیں، آپ نے جواب دیا (مرنے کے بعد) سب سے پہلے یہی میرے بدن سے منتشر ہوں گے۔ زلیخا نے آپ کی آنکھوں کی تعریف کی تو فرمایا چہرے پر بہ کر یہ سب سے پہلے آئیں گی۔ چہرے کی تعریف سن کر فرمایا اس کو مٹی کھا لے گی۔

اعمال نامہ کا اصول:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، اللہ نے فرمایا ہے کہ جب میرا بندہ کوئی نیکی کرنے کی بات (اپنے دل میں) کر لیتا ہے تو کیے بغیر میں اس کی ایک نیکی لکھ لیتا ہوں اور جب وہ نیکی کر بھی لیتا ہے تو اس جیسی دس نیکیاں اس کیلئے لکھ دیتا ہوں اگر میرا بندہ کوئی بدی کرنے کی بات (دل میں) کرتا ہے تو جب تک اس کا عملی اظہار نہ کرے میں معاف کر دیتا ہوں اور جب عملاً وہ کر ہی لیتا ہے تو میں اتنی ہی بدی (اس کے نامہ اعمال میں) لکھ دیتا ہوں۔ روہ البغوی من حدیث ابو ہریرۃ۔ صحیحین اور جامع ترمذی میں حدیث مذکور کے یہ الفاظ ہیں، جب میرا بندہ کسی نیکی کا ارادہ کر لیتا ہے اور کرتا نہیں تو میں اس کیلئے ایک نیکی لکھ دیتا ہوں پھر اگر وہ عملاً نیکی کر بھی لیتا ہے تو میں اس کیلئے دس سے سات سو تک نیکیاں لکھ دیتا ہوں اور اگر کسی بدی کا ارادہ کرتا ہے اور بدی عملاً نہیں کرتا تو میں اس کیلئے کچھ نہیں لکھتا اور اگر وہ بدی کر گذرتا ہے تو اس کا ایک گناہ لکھ دیتا ہوں۔

گناہ سے بچنے کا ذریعہ:

گناہ سے بچنے کا قوی ذریعہ خود اللہ سے پناہ مانگنا ہے۔ اور اس کا ظاہری سبب یہ ہوا کہ یوسف علیہ السلام نے جب اپنے آپ کو سب طرف سے گھرا ہوا پایا تو پیغمبرانہ انداز پر سب سے پہلے خدا کی پناہ مانگی قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ محض اپنے عزم و ارادہ پر بھروسہ نہیں کیا، اور یہ ظاہر ہے کہ جس کو خدا کی پناہ مل جائے اس کو کون صحیح راستہ سے ہٹا سکتا ہے، اس کے بعد پیغمبرانہ حکمت و موعظمت کے ساتھ خود زلیخا کو نصیحت کرنا شروع کیا۔ کہ وہ بھی خدا سے ڈرے، اور اپنے ارادہ سے باز آ جائے۔ فرمایا: اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ''وہ میرا پالنے والا ہے اس نے مجھے آرام کی جگہ دی، خوب سمجھ لو کہ ظلم کرنے والوں کو فلاح نہیں ہوتی۔''

زلیخا کو سبق:

بظاہر مراد یہ ہے کہ تیرے شوہر عزیز مصر نے میری پرورش کی اور مجھے اچھا ٹھکانا دیا۔

میرا محسن ہے میں اس کے حرم پر دست اندازی کروں؟ یہ بڑا ظلم ہے اور ظلم کرنے والے کبھی فلاح نہیں پاتے اس کے ضمن میں خود زلیخا کو بھی یہ سبق دیدیا کہ جب میں اس کی چند روزہ پرورش کا اتنا حق پہچانتا ہوں تو تجھے مجھ سے زیادہ پہچاننا چاہیے۔

لفظ ''رب'' کا اطلاق:

اس جگہ حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر کو اپنا رب فرمایا، حالانکہ

یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کیلئے استعمال کرنا جائز نہیں، وجہ یہ ہے کہ ایسے الفاظ موہم شرک اور مشرکین کے ساتھ مشابہت پیدا کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ اسی لئے شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ایسے الفاظ استعمال کرنا بھی ممنوع کردیا گیا۔ صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ ''کوئی غلام اپنے آقا کو اپنا رب نہ کہے، اور کوئی آقا اپنے غلام کو اپنا بندہ نہ کہے''۔ مگر یہ خصوصیت شریعت محمدیہ کی ہے'' جس میں شرک کی ممانعت کے ساتھ ایسی چیزوں کی بھی ممانعت کردی گئی ہے جن میں ذریعہ شرک بننے کا احتمال ہو، انبیاء سابقین کی شریعتوں میں شرک سے تو سختی کے ساتھ روکا گیا ہے مگر اسباب وذرائع پر کوئی پابندی نہ تھی، اسی وجہ سے پچھلی شریعتوں میں تصویر سازی ممنوع نہ تھی، مگر شریعت محمدیہ، چونکہ قیامت تک کیلئے آئی ہے۔ اس کو شرک سے پوری طرح محفوظ کرنے کیلئے ذرائع شرک، تصویر اور ایسے الفاظ سے بھی روک دیا گیا جو موہم شرک ہوسکیں۔ بہرحال یوسف علیہ السلام کا انہ ربی فرمانا اپنی جگہ درست تھا۔

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انہ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہو، اسی کو اپنا رب فرمایا اور اچھا ٹھکانا بھی درحقیقت اسی نے دیا، اس کی نافرمانی سب سے بڑا ظلم ہے، اور ظلم کرنے والوں کو فلاح نہیں۔

انبیاء گناہ سے محفوظ ہیں:

جمہور امت اس پر متفق ہے کہ انبیاء علیہم السلام صغیرہ اور کبیرہ ہر طرح کے گناہ سے معصوم ہوتے ہیں، کبیرہ گناہ تو نہ قصداً ہوسکتا ہے نہ سہواً خطا کی راہ سے ہوسکتا ہے البتہ صغیرہ گناہ سہواً خطاء کے طور پر سرزد ہوجانے کا امکان ہے۔ مگر اس پر بھی انبیاء علیہم السلام کو قائم نہیں رہنے دیا جاتا، بلکہ متنبہ کرکے اس سے ہٹا دیا جاتا ہے۔ (مسامرہ)

اور یہ مسئلہ عصمت قرآن وسنت سے ثابت ہونے کے علاوہ عقلاً بھی اس لئے ضروری ہے کہ اگر انبیاء علیہم السلام سے گناہ سرزد ہوجانے کا امکان واحتمال رہے تو ان کے لائے ہوئے دین اور وحی پر اعتماد کا کوئی راستہ نہیں رہتا۔ اور ان کی بعثت اور ان پر کتاب نازل کرنیکا کوئی فائدہ باقی نہیں رہتا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر پیغمبر کو ہر گناہ سے معصوم رکھا ہے۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا ج

اور البتہ عورت نے فکر کیا اُس کا اور اُس نے فکر کیا عورت کا'

توفیق الٰہی کے بغیر بچنا مشکل تھا:

یعنی عورت نے پھانسنے کی فکر کی اور اس نے فکر کی کہ عورت کا داؤ چلنے نہ پائے۔ اگر اپنے رب کی حجت وقدرت کا معائنہ نہ کرتا تو ثابت قدم رہنا مشکل تھا۔ بعض مفسرین نے ''وَهَمَّ بِهَا'' کو ''وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ'' سے علیحدہ کرکے ''لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ'' سے متعلق ہے۔ جیسے ''اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِيْ بِهٖ لَوْلَآ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا'' کی ترکیب ہے۔ اس وقت مقصود یوسف کے حق میں ''ھم'' کا ثابت کرنا نہیں، بلکہ نفی کرنا ہے۔ ترجمہ یوں ہوگا کہ عورت نے یوسف کا ارادہ کیا اور یوسف بھی عورت کا ارادہ کرتا اگر اپنے پروردگار کی قدرت وحجت نہ دیکھ لیتا۔ بعض نے ''وھم بھا'' میں لفظ ''ھم'' کو بمعنی میلان ورغبت کے لیا ہے۔ یعنی یوسف کے دل میں کچھ رغبت ومیلان بے اختیاری پیدا ہوا۔ جیسے روزہ دار کو گرمی میں ٹھنڈے پانی کی طرف طبعاً رغبت ہوتی ہے لیکن نہ وہ پینے کا ارادہ کرتا ہے نہ یہ بے اختیار رغبت کچھ مضر ہے۔ بلکہ باوجود رغبت طبعی کے اس سے قطعاً محترز رہنا مزید اجر وثواب کا موجب ہے۔ اسی طرح سمجھ لو کہ ایسے اسباب ودواعی قویہ کی موجودگی سے طبع بشری کے موافق بلا اختیار وارادہ یوسف علیہ السلام کے دل میں کسی قسم کی رغبت ومیلان کا پایا جانا نہ عصمت کے منافی ہے نہ ان کے مرتبہ کو گھٹاتا ہے۔ بلکہ صحیح مسلم میں ابوہریرہؓ کی حدیث ہے کہ اگر بندہ کا میلان کسی برائی کی طرف ہوا لیکن اس پر عمل نہ کیا تو اس کے فرد حسنات میں ایک نیکی لکھی جاتی ہے۔ خدا فرماتا ہے کہ اس نے (باوجود رغبت ومیلان) میرے خوف سے اس برائی کو ہاتھ نہ لگایا۔

زلیخا اور یوسف علیہ السلام کے قصد میں فرق تھا:

بہرحال باوجود اشتراک لفظی کے زلیخا کے ''ھم'' اور یوسف کے ''ھم'' میں زمین آسمان کا تفاوت ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے دونوں کے ''ھم'' کو ایک ہی لفظ میں جمع نہیں کیا اور نہ زلیخا کے ''ھم'' کی طرح یوسف کے ''ھم'' پر 'لام' اور 'قد' داخل کیا گیا۔ بلکہ سیاق ولحاق میں بہت کہ دلائل یوسف علیہ السلام کی طہارت ونزاہت پر قائم فرمائیں جو غور کرنے والوں پر پوشیدہ نہیں۔ تفصیل ''روح المعانی'' میں اور ''کبیر'' وغیرہ میں موجود ہے۔ (تفسیر عثمانی)

محض وسوسہ اور غیر اختیاری خیال آجائے، اور فعل کا ارادہ بالکل نہ ہو جیسے گرمی کے روزہ میں ٹھنڈے پانی کی طرف طبعی میلان غیر اختیاری سب کو ہوجاتا ہے حالانکہ روزہ میں پینے کا ارادہ بالکل ہی نہیں ہوتا۔ اس قسم کا خیال نہ انسان کے اختیار میں ہے نہ اس پر کوئی مواخذہ اور گناہ ہے۔

صحیح بخاری کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے میری امت کے لئے گناہ کے وسوسہ اور خیال کو معاف کردیا ہے جبکہ وہ اس پر عمل نہ کرے۔ (قرطبی)

اور صحیحین میں بروایت ابوہریرہؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ میرا بندہ جب کسی نیکی کا ارادہ کرے

توصرف ارادہ کرنے سے اس کے نامہ اعمال میں ایک نیکی لکھ دو، اور جب وہ یہ نیک عمل کرلے تو دس نیکیاں لکھو، اور اگر بندہ کسی گناہ کا ارادہ کرے مگر پھر خدا کے خوف سے چھوڑ دے تو گناہ کے بجائے اس کے نامہ اعمال میں ایک نیکی لکھ دو، اور اگر وہ گناہ کرہی گذرے تو صرف ایک ہی گناہ لکھو۔ (ابن کثیر)

تفسیر قرطبی میں لفظ ''هم'' کا ان دونوں معنی کے استعمال عرب کے محاورات اور خلاصہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں جو خیال یا میلان پیدا ہوا وہ محض غیر اختیاری وسوسہ کے درجہ میں تھا۔ جو گناہ میں داخل نہیں، پھر اس وسوسہ کے خلاف عمل کرنے سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کا درجہ اور زیادہ بلند ہو گیا۔ (معارف مفتی صاحب)

لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ

اگر نہ ہوتا یہ کہ دیکھے قدرت اپنے رب کی

خدائی برہان:

''برہان'' دلیل وحجت کو کہتے ہیں یعنی اگر یوسف علیہ السلام اس وقت اپنے رب کی دلیل نہ دیکھتے تو قلبی میلان پر چل پڑتے۔ دلیل کیا تھی؟ زنا کی حرمت وشناعت کا وہ عین الیقین جو حق تعالیٰ نے ان کو عطا فرمایا۔ یا وہ ہی دلیل جو خود انہوں نے زلیخا کے مقابلہ میں '' اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ '' کہہ کر پیش کی۔ بعض کہتے ہیں کہ خدا کی قدرت سے اس وقت حضرت یعقوب علیہ السلام نظر آئے کہ انگلی دانتوں میں دبائے سامنے کھڑے ہیں۔ بعض نے کہا کہ کوئی غیبی تحریر نظر پڑی جس میں اس فعل سے روکا گیا۔ واللہ اعلم! (تفسیر عثمانی)

حضرت یوسف علیہ السلام کی شان تقویٰ وطہارت اور زیادہ بلند ہو جاتی ہے کہ طبعی اور بشری تقاضہ کے باوجود وہ گناہ سے محفوظ رہے۔

برہان کیا تھی اور یوسف نے کیا دیکھ پایا تھا اس سلسلے میں علماء کے اقوال مختلف ہیں، حضرت جعفر صادق ۔نے فرمایا برہان وہ نبوت تھی جو اللہ نے یوسف کے سینہ میں ودیعت کر دی تھی، یہی نور نبوت اس عمل سے مانع ہو گیا جو اللہ کی ناراضگی کا موجب تھا۔ میرے نزدیک سب سے زیادہ صحیح قول یہی ہے۔ قتادہ اور اکثر اہل تفسیر کا قول ہے کہ حضرت یعقوبؑ کی صورت دیکھ لی تھی۔ حضرت یعقوب فرما رہے تھے یوسف نادانوں کا جیسا عمل کر رہا ہے۔ تیرا نام تو زمرہ انبیاء میں لکھا ہوا ہے، حسن اور سعید بن جبیر اور عکرمہ اور ضحاک نے کہا آپ نے چھت میں ایک شگاف دیکھا جس کے اندر حضرت یعقوب (افسوس کے ساتھ) اپنی انگلی دانت سے کاٹتے نظر آئے۔ (تفسیر مظہری)

كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْۗءَ وَالْفَحْشَاۗءَ ۭ

یوں ہی ہوا تا کہ ہٹائیں ہم اُس سے برائی اور بے حیائی البتہ

اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ (۲۴)

وہ ہے ہمارے برگزیدہ بندوں میں

یوسف علیہ السلام کی عظمت:

یعنی یہ برہان دکھانا اور ایسی طرح ثابت قدم رکھنا اس لئے تھا کہ یوسف ہمارے برگزیدہ بندوں میں ہیں۔ لہذا کوئی چھوٹی بڑی برائی خواہ ارادہ کے درجہ میں ہو یا عمل کے ان تک نہ پہنچ سکے۔ (تفسیر عثمانی)

لفظ مخلصین اس جگہ بفتح لام مخلص کی جمع ہے جس کے معنی منتخب کے ہیں، مراد یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے ان بندوں میں سے ہیں: جن کو خود حق تعالیٰ نے اپنے کار رسالت اور اصلاح خلق کیلئے انتخاب فرمایا ہے۔ ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظتی پہرہ ہوتا ہے کہ وہ کسی برائی میں مبتلا نہ ہو سکیں۔ خود شیطان نے بھی اپنے بیان میں اس کا اقرار کیا کہ اللہ کے منتخب بندوں پر اس کا بس نہیں چلتا۔ اس نے کہا فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ''یعنی قسم ہے تیری عزت وقوت کی کہ میں ان سب انسانوں کو گمراہ کروں گا بجز ان بندوں کے جن کو آپ نے منتخب فرما لیا ہے۔ (معارف مفتی صاحب)

برائی نے قصد کیا تھا یوسفؑ نے نہیں کیا تھا:

حق تعالیٰ شانہ کا یہ فرمانا لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْۗءَ وَالْفَحْشَاۗءَ تا کہ ہم یوسف سے سوء اور فحشاء کو دور رکھیں یہ اس امر کی دلیل ہے کہ سوء اور فحشاء یوسف کی طرف آنا چاہتے تھے۔ اللہ نے سوء کو دور رکھا اور یوسف کے پاس نہ آنے دیا۔ معاذ اللہ یوسف علیہ السلام سوء اور فحشاء کی طرف مائل نہ تھے ورنہ اس طرح فرماتے لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْۗءَ وَالْفَحْشَاۗءَ کہ ہم نے یوسف کو سوء اور فحشاء سے دور رکھا اور یوسف کو سوء اور فحشاء کے پاس جانے سے باز رکھا۔ پس یہ تعبیر اس امر کی صریح دلیل ہے کہ سوء اور فحشاء چل کر یوسف علیہ السلام کی طرف آنا چاہتے تھے معاذ اللہ یوسف علیہ السلام سوء اور فحشاء کی طرف نہیں جا رہے تھے۔ جو کسی کی طرف۔ ناجائز قدم اٹھائے اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اس کو آنے سے اور اندر داخل ہونے سے روک دیا گیا۔ پس خوب سمجھ لو کہ سوء اور فحشاء یوسف صدیق کو بارگاہ عفت وعصمت کی طرف قدم اٹھانا چاہتا تھا خداوند قدوس نے ان کو آنے سے روک دیا معاذ اللہ، معاذ اللہ اگر یوسف صدیق کے ارادہ میں کوئی حرکت نہ ہوتی تو یوں فرماتے کہ ہم نے یوسف کو سوء اور فحشاء کی طرف جانے سے روک دیا۔ پس یہ آیت اس امر کی قطعی دلیل ہے کہ یوسف علیہ

السلام نے کسی سوء اور فحشاء کا قصد نہیں کیا اس لئے کہ برے کام کا ہم اور قصد بھی سوء اور فحشاء ہے اور اس آیت میں یہ بتلا دیا کہ اللہ کریم نے سوء اور فحشاء کو یوسف علیہ السلام سے دور رکھا۔ اور علیٰ ہذا شروع آیت میں یہ فرمانا کہ وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهِ یہ بھی اس امر کی دلیل ہے کہ یوسف علیہ السلام کا ارادہ امراۃ العزیز کے ارادہ سے مختلف تھا۔

لہٰذا وهم بها کے معنی یہ ہوں گے کہ یوسف علیہ السلام نے اپنے نفس سے اس امر قبیح کے دفع کرنے کا ارادہ فرمایا۔ (دیکھو تفسیر کبیر ص ۱۲۲ جلد ۵)

وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيصَهُ مِنْ
اور دونوں دوڑے دروازے کو اور عورت نے چیر ڈالا اس کا کُرتہ پیچھے
دُبُرٍ وَّأَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ
سے اور دونوں مل گئے عورت کے خاوند سے دروازے کے پاس

یوسف علیہ السلام کا باہر نکلنا:

آگے یوسف تھے کہ جلدی دروازہ کھول کر نکل جائیں۔ اور پیچھے زلیخا انہیں روکنے کے لئے تعاقب کر رہی تھیں۔ اتفاقاً یوسف کے قمیص کا پچھلا حصہ زلیخا کے ہاتھ میں آ گیا۔

اس نے پکڑ کر کھینچنا چاہا۔ کھینچا تانی میں کرتہ پھٹ گیا۔ مگر یوسف جوں توں کر کے مکان سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ ادھر یہ دونوں آگے پیچھے دروازہ پر پہنچے۔ ادھر عورت کا خاوند عزیز مصر بھی پہنچ گیا۔ عورت نے فوراً بات بنانا شروع کی۔ (تفسیر عثمانی)

آیت مذکورہ میں یہ بتلایا ہے کہ یوسف علیہ السلام اس خلوت گاہ میں اس برھان ربی کا مشاہدہ کرتے ہی وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے، اور باہر نکلنے کیلئے دروازہ کی طرف دوڑے عزیز کی بیوی ان کو پکڑنے کیلئے پیچھے دوڑی، اور یوسف علیہ السلام کا کرتہ پکڑ کر ان کو باہر جانے سے روکنا چاہا، وہ عزم کے مطابق نہ رکے تو کرتہ پیچھے سے پھٹ گیا، مگر یوسف علیہ السلام دروازہ سے باہر نکل آئے اور ان کے پیچھے زلیخا بھی، تاریخی روایتوں میں مذکور ہے کہ دروازہ پر قفل لگا دیا تھا، جب یوسف علیہ السلام دوڑ کر دروازہ پر پہنچے تو خود بخود یہ قفل کھل کر گر گیا۔

زلیخا کی چالاکی:

جب یہ دونوں دروازے سے باہر آئے تو دیکھا کہ عزیز مصر سامنے کھڑے ہیں، ان کی بیوی سہم گئی اور بات یوں بنائی کہ الزام اور تہمت یوسف علیہ السلام پر ڈالنے کیلئے کہا کہ جو شخص آپ کی بیوی کے ساتھ برے کام کا ارادہ کرے اس کی سزا اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ اس کو قید میں ڈالا جائے یا کوئی دوسری جسمانی سخت سزا دی جائے۔

حضرت یوسف علیہ السلام اپنی پیغمبرانہ شرافت کی بناء پر غالباً اس کا راز فاش نہ فرماتے مگر جب اس نے پیش قدمی کر کے یوسف علیہ السلام پر تہمت رکھنے کا اشارہ کیا تو مجبور ہو کر انہوں نے حقیقت کا اظہار کیا کہ هِيَ رَاوَدَتْنِي عَنْ نَّفْسِي یعنی یہی مجھ سے اپنا مطلب نکالنے کیلئے مجھے پھسلا رہی تھی۔

معصوم بچے کی گواہی:

حضرت مریمؑ پر جب لوگ تہمت باندھنے لگے تو صرف ایک دن کے بچے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے گویائی عطا فرما کر ان کی زبان سے والدہ کی پاکی ظاہر فرما دی، اور قدرت خداوندی کا ایک خاص مظہر سامنے کر دیا، بنی اسرائیل کے ایک بزرگ جریج پر اسی طرح کی ایک تہمت ایک بڑی سازش کے ساتھ باندھی گئی تو نوزائیدہ بچہ نے ان کی براءت کیلئے شہادت دی، حضرت موسیٰ علیہ السلام پر فرعون کو شبہ پیدا ہوا تو فرعون کی بیوی کے بال سنوارنے والی عورت کی چھوٹی بچی کو گویائی عطا ہوئی اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بچپن میں فرعون کے ہاتھ سے بچایا۔

ٹھیک اسی طرح یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کے مطابق ایک چھوٹے بچہ کو حق تعالیٰ نے گویائی عطا فرما دی، اور وہ بھی نہایت عاقلانہ اور حکیمانہ انداز کی یہ چھوٹا بچہ اسی گھر میں گہوارہ کے اندر پڑا تھا یہ کس کو گمان ہو سکتا تھا کہ وہ ان حرکتوں کو دیکھے اور سمجھے گا اور پھر اس کو کسی انداز سے بیان بھی کر دے گا، مگر قادر مطلق اپنی اطاعت میں مجاہدہ کرنے والوں کی شان ظاہر کرنے کیلئے دنیا کو دکھلا دیتا ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی خفیہ پولیس (سی آئی ڈی) ہے جو مجرم کو خوب پہچانتی اور اس کے جرائم کا ریکارڈ رکھتی ہے اور ضرورت کے وقت اس کا اظہار کر دیتی ہے۔ (معارف القرآن مفتی صاحب)

قَالَتْ مَا جَزَاءُ مَنْ أَرَادَ بِأَهْلِكَ سُوءًا
بولی اور کچھ سزا نہیں ایسے شخص کی جو چاہے تیرے گھر میں بُرائی مگر
إِلَّا أَنْ يُسْجَنَ أَوْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٢٥﴾
یہی کہ قید میں ڈالا جائے یا عذاب دردناک

عورت نے الزام یوسف پر رکھا کہ اس نے مجھ سے برا ارادہ کیا، ایسے شخص کی سزا یہ ہونی چاہیے کہ جیل خانہ بھیجا جائے یا کوئی اور سخت مار پڑے۔ (تفسیر عثمانی)

قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِي عَنْ نَّفْسِي وَشَهِدَ
یوسف بولا اسی نے خواہش کی مجھ سے کہ نہ تھاموں اپنے جی کو اور

شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا

گواہی دی ایک گواہ نے عورت کے لوگوں میں سے

اب یوسف کو واقعہ ظاہر کرنا پڑا کہ عورت نے میرے نفس کو بے قابو کرنا چاہا، میں نے بھاگ کر جان بچائی۔ یہ جھگڑا ابھی چل رہا تھا کہ خود عورت کے خاندان کا ایک گواہ عجیب طریقہ سے یوسف کے حق میں گواہی دینے لگا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شیر خوار بچہ تھا، جو خدا کی قدرت سے حضرت یوسف کی براءت و وجاہت عنداللہ ظاہر کرنے کو بول پڑا۔ اور بعض علماء کہتے ہیں کہ بچہ نہیں کوئی مرد دانا تھا جس نے ایسی پتہ کی بات کہی۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانی)

چار بچے:

بغوی نے لکھا ہے عوفی کی روایت میں حضرت ابن عباس کا بیان بھی آیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا چار بچے بچپن میں بولے (۱) بنت فرعون کے بال بنانے والی خادمہ کا بچہ (۲) شاہد یوسف (۳) جریج والا بچہ (۴) عیسیٰ بن مریم۔ محمد بن محمد سعاف نے تخریج بیضاوی میں لکھا ہے کہ یہ حدیث امام احمد نے مسند میں اور ابن حبان نے صحیح میں اور حاکم نے مستدرک میں بیان کی ہے اور حاکم نے اس کو صحیح بھی کہا ہے حاکم نے حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے بھی اس کو بیان کیا ہے اور شرط شیخین کے موافق قرار دیا ہے۔ (تفسیر مظہری)

تین بچے:

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے صحیحین میں مذکور ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا پالنے کے اندر تین بچوں کے علاوہ کسی نے بات نہیں کی عیسیٰ بن مریم اور جریج والا بچہ اور ایک بچہ جس کی اس کی ماں دودھ پلا رہی تھی ایک خوب صورت سوار ادھر سے گذرا عورت نے کہا اے اللہ! میرے بیٹے کو اس کی طرح کر دے۔ بچہ بولا مجھے اس کی طرح نہ کرنا اگر اس موخر الذکر بچے کو بھی مذکورۃ الصدر چار بچوں کے ساتھ ملا دیا جائے تو پالنے میں بولنے والے پانچ بچے ہو جائیں گے۔

گیارہ بچے:

سیوطی نے لکھا ہے کہ شیر خوارگی میں بولنے والے گیارہ بچے ہوئے جن کو میں نے ان اشعار میں جمع کر دیا ہے:

تکلم فی المهد النبی محمد　　ومبری جریح ثم شاهد یوسف
وطفل علیه مبریا لامه　　وماشطة فی عهد فرعون طفلها
ویحییٰ وعیسیٰ والخلیل ومریم　　وطفل لذی الاخد ودیر ویه مسلم
التی یقال لها تذنی ولا تتکلم　　وفی زمن الهادی المبارک یختم

(تفسیر مظہری)

بچے کی حکیمانہ گواہی:

پھر یہ بچہ اگر صرف اتنا ہی کہہ دیتا کہ یوسف علیہ السلام بری ہیں زلیخا کا قصور ہے تو وہ بھی ایک معجزہ کی حیثیت سے حضرت یوسف علیہ السلام کے حق میں برأت کی بڑی شہادت ہوتی مگر اللہ تعالیٰ نے اس بچہ کی زبان پر ایک حکیمانہ بات کہلوائی کہ یوسف علیہ السلام کے کرتے کو دیکھو اگر وہ آگے سے پھٹا ہے تب تو زلیخا کا کہنا سچا اور یوسف علیہ السلام جھوٹے ہو سکتے ہیں اور اگر وہ پیچھے سے پھٹا ہے تو اس میں اس کے سوا کوئی دوسرا احتمال ہی نہیں کہ یوسف علیہ السلام بھاگ رہے تھے اور زلیخا ان کو روکنا چاہتی تھی۔

یہ ایک ایسی بات تھی کہ بچہ کی گویائی کے اعجاز کے علاوہ خود بھی ہر ایک کی سمجھ میں آسکتی تھی اور جب بتلائی ہوئی علامت کے مطابق کرتہ کا پیچھے سے شق ہونا مشاہدہ کیا گیا تو یوسف علیہ السلام کی براءت ظاہری علامت سے بھی ظاہر ہو گئی۔

شاہد یوسف کی جو تفسیر ہم نے بیان کی ہے کہ وہ ایک چھوٹا بچہ تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے بطور معجزہ گویائی عطا فرما دی یہ ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے جس کو امام احمدؒ نے اپنے مسند میں اور ابن حبانؒ نے اپنی کتاب صحیح میں اور حاکمؒ نے مستدرک میں نقل کر کے حدیث صحیح قرار دیا ہے۔ اس حدیث میں ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چار بچوں کو گہوارہ میں گویائی عطا فرمائی ہے یہ چاروں وہی جو ابھی ذکر کیے گئے ہیں (مظہری)۔ اور بعض روایات میں شاہد کی دوسری تفسیریں بھی نقل کی گئی ہیں مگر ابن جریر، ابن کثیر وغیرہ ائمہ تفسیر نے پہلی ہی تفسیر کو راجح قرار دیا ہے۔

احکام و مسائل

آیات مذکورہ سے چند اہم مسائل اور احکام نکلتے ہیں

اول: آیت وَاسْتَبَقَا الْبَابَ سے یہ معلوم ہوا کہ جس جگہ گناہ میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہو، اس جگہ ہی کو چھوڑ دینا چاہیے جیسا یوسف علیہ السلام نے وہاں سے بھاگ کر اس کا ثبوت دیا۔

دوسرا مسئلہ: یہ کہ احکام الہیہ کی اطاعت میں انسان پر لازم ہے کہ اپنی مقدور بھر کوشش میں کمی نہ کرے خواہ اس کا نتیجہ بظاہر کچھ برآمد ہونا نظر نہ آئے نتائج اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں انسان کا کام اپنی محنت اور مقدور کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں صرف کر کے اپنی بندگی کا ثبوت دینا ہے۔

مولانا رومی:

مولانا رومیؒ نے اسی مضمون پر ارشاد فرمایا ہے۔

گرچہ رخنہ نیست عالم راپدیر　　خیرہ یوسف وار می باید دوید

ایسی صورت میں اگر ظاہری کامیابی بھی حاصل نہ

ہوتو بندہ کیلئے یہ ناکامی بھی کامیابی سے کم نہیں۔

گر مرادت راندا ق شکرست ۔ نامرادی نے مراد دلبرست

ایک بزرگ عالم جیل میں تھے جمعہ کے روز اپنی قدرت کے مطابق غسل کرتے اور اپنے کپڑے دھو لیتے اور پھر جمعہ کیلئے تیار ہوکر جیل خانہ کے دروازے تک جاتے وہاں پہنچ کر عرض کرتے کہ یا اللہ میری قدرت میں اتنا ہی تھا آگے آپ کے اختیار میں ہے۔ (معارف مفتی اعظم)

اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ
اگر ہے کرتہ اُس کا پھٹا آگے سے
فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿٢٦﴾ وَاِنْ
تو عورت سچی ہے اور وہ ہے جھوٹا اور اگر ہے
كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ
کرتا اُس کا پھٹا پیچھے سے تو یہ جھوٹی ہے
وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿٢٧﴾ فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ
اور وہ سچا ہے پھر جب دیکھا عزیز نے کرتا
قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ ؕ اِنَّ
اُس کا پھٹا ہوا پیچھے سے کہا بیشک
كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ﴿٢٨﴾ يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ
یہ ایک فریب ہے تم عورتوں کا البتہ تمہارا فریب بڑا ہے
هٰذَا ٚ وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ۖۚ اِنَّكِ كُنْتِ
یوسف جانے دے اس ذکر کو اور عورت تو بخشوا اپنا گناہ بیشک تو ہی
مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ ﴿٢٩﴾
گنہگار تھی

غیر جانبدارانہ گواہی:

اگر گواہ شیر خوار بچہ تھا جیسا کہ بعض معتبر روایات میں ہے تب تو اس کا بولنا اور ایسی گواہی دینا جو انجام کار یوسف کے حق میں مفید ہو، خود مستقل دلیل یوسف کی سچائی کی تھی۔ کرتہ کا آگے یا پیچھے سے پھٹا ہونا شہادت سے زائد بطور ایک علامت اور قرینہ کے سمجھنا چاہیے۔ اور اگر گواہ کوئی مرد دانا تھا تو بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خارجی طریقہ سے حقیقت حال پر مطلع ہو چکا تھا مگر اس نے نہایت دانائی سے ایسی پیرایہ میں شہادت دی جو دفعۃً کسی کی جانبداری پر بھی محمول نہ ہو اور آخر کار یوسف کی برأت ثابت کردے۔ جو پیرایہ اظہار واقعہ کا اس نے اختیار کیا وہ غیر جانبداروں کے نزدیک نہایت معقول تھا۔ کیونکہ اگر عورت کے دعوے کے موافق یوسف نے (معاذ اللہ) اس کی طرف اقدام کیا تو ان کا چہرہ عورت کی طرف ہوگا تو ظاہر یہ ہے کہ کشمکش میں کرتہ بھی سامنے سے پھٹے اور اگر یوسف کا کہنا صحیح ہے کہ عورت مجھ کو اپنی طرف بلاتی تھی، میں دروازہ کی طرف بھاگا، اس نے پکڑنے کیلئے میرا تعاقب کیا تو کھلی ہوئی بات ہے کہ کرتہ پیچھے سے پھٹا ہوگا کیونکہ اس صورت میں یوسف اس کی طرف متوجہ نہیں تھے بلکہ ادھر سے پیٹھ پھیر کر بھاگ رہے تھے۔

عزیز کی معذرت:

بہر حال جب دیکھا گیا کہ کرتہ آگے سے نہیں پیچھے سے پھٹا ہے تو عزیز نے سمجھ لیا کہ یہ سب عورت کا مکروفریب ہے۔ یوسف قصوروار نہیں۔ چنانچہ اس نے صاف کہہ دیا کہ زلیخا کی پرفریب کاروائی اسی قسم کی ہے جو عموماً عورتیں کیا کرتی ہیں۔ اس نے یوسف سے استدعا کی کہ جو ہونا تھا ہو چکا آئندہ اس کا ذکر مت کرو کہ سخت رسوائی اور بدنامی کا موجب ہے۔ اور عورت کو کہا کہ یوسف سے یا خدا سے اپنے قصور کی معافی مانگ، یقیناً قصور تیرا ہی تھا۔ (تفسیر عثمانی)

فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ پس جب اس نے یوسف کا کرتہ پیچھے سے پھٹا دیکھا (تو سمجھ گیا کہ (یوسف پاکدامن اور سچا ہے۔ اور بیوی مکار قصوروار ہے)

عورتوں کی مکاری:

بولا بلا شبہ یہ (بدی یا یہ کام یا تیرا یہ قول ماجزاء من اراد باھلک الخ) تم عورتوں کی مکاری کی وجہ سے ہے۔ خطاب بصیغہ جمع زلیخا اور اس جیسی عورتوں کو ہے یا تمام عورتوں کو۔

اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ یقیناً تم عورتوں کا مکر بڑا ہے۔ عورتوں کا ظاہر تو کمزور نظر آتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بچی ہیں (بھولی بھالی سورت پر کون جھوٹا ہونے کا احتمال کر سکتا ہے) لیکن ان کا باطن ٹیڑھا اور گندا ہے ان کی تخلیق آدم کی (ٹیڑھی) پسلی ہوئی ہے ان کی عقلوں میں کمزوری اور دینداری میں نقصان ہے ان کے ساتھ شیطان ہوتا ہے جو مکر کا جال لے کر مردوں کے سامنے سے آتا ہے اور شیطان تو پھر چھپ کر چوری سے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عورتیں شیطان کا جال ہیں یہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم عورتوں میں سے کسی ایک سے بھی زیادہ کوئی ناقص العقل والدین شخص دانشمند مرد کی عقل و دانش کو زائل کرنے والا میں نے نہیں دیکھا۔ بعض

علماء کا قول ہے شیطان سے زیادہ مجھے عورتوں سے ڈرلگتا ہے۔ اللہ نے شیطان کے مکر کو تو ضعیف فرمایا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا اور عورتوں کے متعلق فرمایا ہے اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ تمہارا مکر بڑا ہے۔

يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا اے یوسف اس قصہ سے درگذر کرو۔ کسی سے اس کا تذکرہ نہ کرنا۔ کہیں یہ واقعہ پھیل نہ جائے۔

عزیز بردبار آدمی تھا غیرت کم تھی اس لیے زبانی سرزنش پر اکتفا کی۔ (تفسیر مظہری)

مسئلہ: اس میں یہ ہے کہ مقدمات اور خصومات کے فیصلوں میں قرائن اور علامات سے کام لیا جاسکتا ہے جیسا کہ اس شاہد نے کرتے کے پیچھے سے پھٹنے کو اس کی علامت قرار دیا کہ یوسف علیہ السلام بھاگ رہے تھے، زلیخا پکڑ رہی تھی۔

عورت کا اثر: پہلے تو زلیخا کو خطاب کر کے کہا اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ یعنی یہ سب تمہارا مکر وحیلہ ہے۔ کہ اپنی خطا دوسرے کے سر پر ڈالنا چاہتی ہو، پھر کہا کہ عورتوں کا مکر وحیلہ بہت بڑا ہے۔ کہ اس کو سمجھنا اور اس سے نکلنا آسان نہیں ہوتا، کیونکہ ظاہر ان کا نرم ونازک اور ضعیف ہوتا ہے، دیکھنے والے کو ان کی بات کا یقین جلد آجاتا ہے مگر عقل ودیانت کی کمی کے سبب بسا اوقات وہ فریب ہوتا ہے۔ (مظہری)

عزیز مصر نے زلیخا کو اس کی خطا بتلانے کے بعد یوسف علیہ السلام سے کہا يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا یعنی اے یوسف تم اس واقعہ کو نظرانداز کرو، اور کسی سے نہ کہو، تاکہ رسوائی نہ ہو، پھر زلیخا کو خطاب کر کے کہا وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ۚۖ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ یعنی خطا سراسر تمہاری ہے تم اپنی غلطی کی معافی مانگو، اس سے بظاہر یہ مراد ہے کہ وہ اپنے شوہر سے معافی مانگے، اور یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام سے معافی مانگے، کہ خود خطا کی اور تہمت ان کے سر ڈالی۔

فائدہ: یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ شوہر کے سامنے اپنی بیوی کی ایسی خیانت اور بیحیائی ثابت ہوجانے پر اس کا مشتعل نہ ہونا اور پورے سکون واطمینان سے باتیں کرنا انسانی فطرت سے بہت قابل تعجب ہے۔

عزیز مصر کو غصہ سے مشتعل نہیں ہونے دیا ورنہ عام عادت کے مطابق ایسے موقع پر انسان تحقیق وتفتیش کے بغیر ہی ہاتھ چھوڑ بیٹھتا ہے اور زبان سے گالی گلوچ تو معمولی بات ہے اگر عام انسانی عادت کے مطابق عزیز مصر کو اشتعال ہوجاتا تو ممکن ہے کہ اس کے ہاتھ سے یا زبان سے یوسف علیہ السلام کی شان کے خلاف کوئی بات سرزد ہوجاتی، یہ قدرت حق کے کرشمے ہیں کہ اطاعت حق پر قائم رہنے والے کی قدم قدم پر کس طرح حفاظت کی جاتی ہے۔ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ۔

مسئلہ: اس سے یہ ثابت ہوا کہ کسی شخص پر کوئی غلط تہمت باندھی تو اپنی صفائی پیش کرنا سنت انبیاء ہے یہ کوئی توکل یا بزرگی نہیں کہ اس وقت خاموش رہ کر اپنے آپ کو مجرم قرار دیدے۔ (معارف مفتی اعظم)

حضرت یوسفؑ اپنے تئیں بچانے کے لئے وہاں سے دروازے کی طرف دوڑے اور یہ عورت آپؑ کو پکڑنے کے ارادے سے آپؑ کے پیچھے بھاگی، پیچھے سے کرتا اس کے ہاتھ میں آگیا، زور سے اپنی طرف گھسیٹا جس سے حضرت یوسفؑ پیچھے کی طرف گرجانے کے قریب ہوگئے، لیکن آپؑ نے بھی آگے کو زور لگا کر دوڑ جاری رکھی، اس میں کرتا پیچھے سے بالکل بے طرح پھٹ گیا، اور دونوں دروازے پر پہنچ گئے، دیکھتے ہیں کہ عورت کا خاوند موجود ہے اسے دیکھتے ہی اس نے چال چلی اور فوراً ہی سارا الزام یوسفؑ کے سر چپک دیا اور آپ اپنی پاک دامنی بلکہ عصمت اور مظلومیت جتانے لگی۔ سوکھا سامنہ بنا کر اپنے خاوند سے اپنی بپتا اور پھر پاکیزگی بیان کرتے ہوئے کہتی ہے فرمایئے حضور آپ کی بیوی سے جو بدکاری کا ارادہ رکھے اس کی کیا سزا ہونی چاہیے؟ قید سخت یا بری مار سے کم تو ہرگز کوئی سزا اس جرم کی نہیں ہوسکتی۔ اب جب کہ حضرت یوسف نے اپنی آبرو کو خطرے میں دیکھا اور خیانت کی بدترین تہمت چڑھتی دیکھی تو اپنے اوپر سے الزام ہٹانے اور صاف اور سچی حقیقت کے ظاہر کردینے کے لئے فرمایا کہ حقیقت یہ ہے کہ یہی میرے پیچھے پڑی تھیں، میرے بھاگنے پر مجھے پکڑ رہی تھیں یہاں تک کہ میرا کرتا بھی پھاڑ دیا۔ اسی عورت کے قبیلے سے ایک گواہ نے گواہی دی اور مع ثبوت ودلیل ان سے کہا کہ پھٹے ہوئے پیراہن کو دیکھ لو اگر وہ سامنے کے رخ سے پھٹا ہوا ہے تو ظاہر ہے کہ عورت سچی ہے اور یہ جھوٹا ہے اس نے اسے اپنی طرف لانا چاہا اس نے اسے دھکے دیئے، روکا منع کیا ہٹایا، اس میں سامنے سے کرتا پھٹ گیا تو واقعی قصوروار مرد ہے عورت جو اپنی بے گناہی بیان کرتی ہے وہ سچی ہے فی الواقع اس صورت میں وہ سچی ہے اور اگر اس کا کرتا پیچھے سے پھٹا ہوا پاؤ تو عورت کے جھوٹ اور مرد کے سچ ہونے میں کلام نہیں۔ ظاہر ہے کہ عورت اس پر مائل تھی، یہ اس سے بھاگا وہ دوڑی پکڑا کرتا ہاتھ میں آگیا اس نے اپنی طرف گھسیٹا اس نے اپنی جانب کھینچا وہ پیچھے کی طرف سے پھٹ گیا۔

عزیز کی سمجھداری:

پھر حضرت یوسفؑ سے کہتا ہے کہ آپ اس واقعہ کو بھول جایئے جانے دیجئے اس نامراد واقعہ کا پھر سے ذکر ہی نہ کیجئے۔ پھر اپنی بیوی سے کہتا ہے کہ تم اپنے گناہ سے استغفار کرو۔ نرم آدمی تھا، نرم اخلاق تھے یا یوں سمجھو کہ وہ جان رہا تھا کہ عورت معذور سمجھے جانے کے لائق ہے۔ اس نے وہ دیکھا ہے جس پر صبر کرنا بہت مشکل ہے اس لئے اسے ہدایت کردی کہ اپنے برے ارادے سے توبہ کر، سراسر تو ہی خطا وار ہے، کیا خود پھر الزام دوسروں کے سر رکھا۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِيْنَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ
اور کہنے لگیں عورتیں اُس شہر میں عزیز کی

تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ؕ

عورت خواہش کرتی ہے اپنے غلام سے اُس کے جی کو فریفتہ ہو گیا

اِنَّا لَنَرٰىهَا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۳۰﴾

اُسکا دل اُسکی محبت میں، ہم تو دیکھتے ہیں اُس کو صریح خطا پر

شہر میں بدنامی: یعنی شدہ شدہ شہر کی عورتوں نے کہنا شروع کیا کہ عزیز کی عورت اپنے نوجوان غلام پر مفتون ہو گئی۔ چاہتی ہے کہ اس کے نفس کو بے قابو کر دے۔ غلام کی محبت اس کے دل کی تہ میں پیوست ہو چکی ہے۔ حالانکہ ایسے معزز عہدہ دار کی بیوی کیلئے یہ سخت شرمناک بات ہے کہ وہ ایک غلام پر گرنے لگے۔ ہمارے نزدیک اس معاملہ میں وہ علانیہ غلطی پر ہے۔ (تفسیر عثمانی)

فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ

پھر جب سُنا اُس نے اُن کا فریب

شہرت کیوں ہوئی:

عورتوں کی گفتگو کو مکر (فریب) اس لئے کہا کہ مکاروں کی طرح چھپ چھپ کر یہ باتیں کرتی تھیں۔ اور زلیخا پر طعن کر کے گویا اپنی پارسائی کا اظہار مقصود تھا۔ حالانکہ یوسف کے بیمثال حسن و جمال کا شہرہ جس عورت کے کان میں پڑتا تھا۔ اس کی دید کا اشتیاق دل میں چٹکیاں لینے لگتا تھا۔ کچھ بعید نہیں کہ زلیخا پر طعن و تشنیع اور نکتہ چینی کرنیوالیوں کے دلوں میں یہ ہی غرض پوشیدہ ہو کہ زلیخا کو غصہ دلا کر کسی ایسی حرکت پر آمادہ کر دیں جو یوسف کے دیدار کا سبب بن جائے۔ یا زلیخا کے دل میں اس کی نفرت بٹھا کر اپنی طرف مائل کرنے کا موقع نکالیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ زلیخا نے بعض عورتوں کو اس معاملہ میں اپنا راز دار بنایا ہو، اس نے رازداری کی جگہ پردہ دری اور خوردہ گیری شروع کر دی بہر حال ان کی گفتگو کو لفظ "مکر" سے ادا کرنے میں یہ سب احتمالات ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

اَرْسَلَتْ اِلَیْهِنَّ وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَـًٔا

بُلوا بھیجا اُن کو اور تیار کی اُن کے واسطے ایک مجلس

وَّاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّیْنًا وَّقَالَتِ

اور دی اُن کو ہر ایک کے ہاتھ میں ایک چھری

اخْرُجْ عَلَیْهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَیْنَهٗۤ اَكْبَرْنَهٗ

اور بولی یوسف نکل آ اُن کے سامنے پھر جب دیکھا اُس کو ششدر

وَقَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ

رہ گئیں اور کاٹ ڈالے اپنے ہاتھ

بدنامی ختم کرنے کی تدبیر:

یعنی دعوت کر کے ان عورتوں کو بلوا بھیجا اور کھانے پینے کی ایک مجلس ترتیب دی جس میں بعض چیزیں چاقو سے تراش کر کھانے کی تھیں۔ چنانچہ کھانے اور میوے وغیرہ ان کے سامنے چن کر ہر ایک عورت کے ہاتھ میں ایک چاقو دیدیا۔ تا تراشنے کے قابل چیزوں کے کھانے میں کسی کو کلفت انتظار اٹھانا نہ پڑے۔ یہ سب سامان درست کر کے اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو جو کہیں قریب ہی موجود تھے آواز دی کہ ادھر نکل آیئے۔ نکلنا تھا کہ بجلی سی کوند گئی تمام عورتیں یوسف کے حسن و جمال کا دفعۃً مشاہدہ کرنے سے ہوش و حواس کھو بیٹھیں۔ اور مدہوشی کے عالم میں چھریوں سے پھلوں کی جگہ ہاتھ کاٹ لیے۔ گویا قدرت نے یہ ایک مستقل دلیل یوسف علیہ السلام کی نزاہت وصداقت پر قائم فرما دی کہ جس کے جمال بیمثال کی ذرا سی جھلک نے دیکھنے والی عورتوں کے حواس گم کر دیے۔ بحالیکہ یوسف نے آنکھ اٹھا کر بھی ان کے حسن و خوبی کی طرف نہ دیکھا تو یقیناً واقعہ یوں ہی ہوا ہوگا کہ زلیخا اس کے جمال ہوشربا کو دیکھ کر ہوش و خرد کھو بیٹھی۔ اور وہ معصوم فرشتہ کی طرح اپنا دامن عفت بچاتا ہوا صاف نکل گیا۔ (تفسیر عثانی)

یوسف علیہ السلام کا حسن:

زلیخا نے یوسف کو ایک اور جگہ بٹھا دیا تھا وہاں سے آپ عورتوں کے سامنے برآمد ہوئے۔ عکرمہ کا قول ہے کہ حسن میں یوسف کی دوسرے لوگوں پر برتری ایسی تھی جیسی ستاروں پر چودھویں رات کے چاند کی ابن جریر حاکم اور ابن مردویہ نے حضرت ابوسعید خدری کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس رات مجھے آسمان کی طرف لے جایا گیا (یعنی شب معراج میں) میں نے دیکھا کہ یوسفؑ چودھویں کے چاند کی طرح تھے۔

ابوالشیخ نے اپنی تفسیر میں اسحاق بن عبداللہ ابی فردہ کا قول بیان کیا ہے کہ یوسف مصر کے گلی کوچوں سے گذرتے تو دیواریں آپ کے چہرے کی چمک سے جگمگا جاتیں جیسے سورج کی دھوپ جب دیواروں پڑ رہی ہوتو اس کے عکس سے پانی جگمگا جاتا ہے۔ (تفسیر مظہری)

عورتوں کے ہوش اڑ گئے:

دراصل حسن یوسفؑ کے دیدار کی تمنا تھی انہیں تو یہ تو صرف ایک حیلہ بنایا تھا۔ عزیز کی بیوی بھی ان کی چال سمجھ گئی اور پھر اسی میں اس نے اپنی معذوری کی مصلحت بھی دیکھی تو ان کے پاس اسی وقت بلاوا بھیج دیا کہ فلاں وقت آپ کی

میرے ہاں دعوت ہے اور ایک مجلس اور محفل اور بیٹھک درست کر لی جہاں پھل اور میوہ بہت تھا اس نے تراش تراش کر چھیل چھیل کر کھانے کیلئے ایک ایک تیز چاقو سب کے ہاتھ میں دیدیا۔ یہ تھا ان عورتوں کے دھوکے کا جواب انہوں نے اعتراض جڑ کر جمال یوسفؑ دیکھنا چاہا، اس نے اپنے تئیں معذور ظاہر کرنے اور ان کے مکر کو ظاہر کرنے کیلئے انہیں خود زخمی کر دیا۔ اور خود ان ہی کے ہاتھ سے۔ حضرت یوسف علیہ السلام سے کہا کہ آپ آیئے۔ انہیں اپنی مالکہ کا حکم ماننے سے کیسے انکار ہو سکتا تھا؟ اسی وقت جس کمرے میں تھے وہاں سے آ گئے، عورتوں کی نگاہ جو آپؑ کے چہرے پر پڑی تو سب کی سب دہشت زدہ رہ گئیں، ہیبت وجلال اور رعب حسن سے بے خود ہو گئیں۔ اور بجائے اس کے کہ ان تیز چلنے والی چھریوں سے پھل کٹتے ان کے ہاتھ اور انگلیاں کٹنے لگیں۔

حضرت زید بن اسلمؒ کہتے ہیں کہ ضیافت باقاعدہ پہلے ہو چکی تھی اب تو صرف میوے سے تواضع ہو رہی تھی بیٹھے ہاتھوں میں تھے چاقو چل رہے تھے جو اس نے کہا یوسف کو دیکھنا چاہتی ہو؟ سب یک زبان ہو کر بول اٹھیں ہاں ہاں ضرور۔ اسی وقت حضرت یوسفؑ سے کہلوا بھیجا کہ تشریف لایئے۔ آپؑ آئے، پھر اس نے کہا جایئے، آپؑ چلے گئے آتے جاتے سامنے سے پیچھے سے ان سب عورتوں نے پوری طرح آپ کو دیکھا، دیکھتے ہی سب سکتے میں آ گئیں، ہوش وحواس جاتے رہے۔ بجائے نیبو کاٹنے کے اپنے ہاتھ کاٹ لئے۔ اور کوئی احساس تک نہ ہوا۔ ہاں جب حضرت یوسفؑ چلے گئے تب ہوش آیا اور تکلیف محسوس ہوئی تب پتہ چلا کہ بجائے پھل کے ہاتھ کاٹ لیا ہے۔ اس پر عزیز کی بیوی نے کہا دیکھا ایک ہی مرتبہ کے جمال نے تمہیں ایسا از خود رفتہ کر دیا پھر بتلاؤ میرا کیا حال ہوگا؟ عورتوں نے کہا واللہ یہ انسان نہیں یہ تو فرشتہ ہے۔ اور فرشتہ بھی بڑے مرتبے والا۔ آج کے بعد ہم کبھی تمہیں ملامت نہ کریں گی۔ ان عورتوں نے حضرت یوسفؑ جیسا تو کہاں ان کے قریب، ان کے مشابہ بھی کوئی شخص نہیں دیکھا تھا۔ آپؑ کو آدھا حسن قدرت نے عطا فرما رکھا تھا۔ چنانچہ معراج کی حدیث میں ہے، تیسرے آسمان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات حضرت یوسف علیہ السلام سے ہوئی جنہیں آدھا حسن دیا گیا تھا۔ اور روایت میں ہے کہ حضرت یوسفؑ اور آپؑ کی والدہ صاحبہ کو آدھا حسن قدرت کی فیاضیوں نے عنایت فرمایا تھا۔

عرش کے سایہ میں جگہ پانے والے:

بخاری ومسلم میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں سات قسم کے لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ عز وجل اپنے سائے تلے سایہ دے گا۔ جس دن کوئی سایہ سوا اس کے سایے کے نہ ہوگا۔ مسلمان عادل بادشاہ، وہ جوان مرد وعورت جس نے اپنی جوانی خدا کی عبادت میں گزاری، وہ شخص جس کا دل مسجد میں لٹکا ہوا ہو جب مسجد سے نکلا مسجد کی دھن میں رہے یہاں تک کہ پھر وہاں جائے، وہ دو شخص جو آپس میں محض اللہ کے لئے محبت رکھتے ہیں اسی پر جمع ہوتے ہیں اور اسی پر جدا ہوتے ہیں، وہ شخص جو صدقہ دیتا ہے لیکن اس پوشیدگی سے کہ دائیں ہاتھ کے خرچ کی خبر بائیں ہاتھ کو نہیں ہوتی، وہ شخص جسے کوئی جاہ ومنصب والی جمال وصورت والی عورت اپنی طرف بلائے اور وہ کہہ دے کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں، وہ شخص جس نے تنہائی میں اللہ تعالیٰ کو یاد کیا پھر اس کی دونوں آنکھیں بہہ نکلیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ۭ اِنْ هٰذَآ
اور کہنے لگیں حاشا للہ نہیں یہ آدمی یہ تو کوئی
اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ﴿۳۱﴾
فرشتہ ہے بزرگ

یہ تو فرشتہ ہے:

یعنی حسن وجمال اور نورانی صورت کے اعتبار سے فرشتہ معلوم ہوتا ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے ۔

قوم اذا قو بلوا اکانوا ملائکۃ
حسنا وان قوتلوا کانوا عفاریتا

یا حیاء وعفت اور پاک دامنی جو چہرہ اور چال ڈھال سے ٹپک رہی تھی اسے دیکھ کر کہا کہ یہ آدمی نہیں کوئی معصوم فرشتہ معلوم ہوتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ ۭ
بولی یہ وہی ہے کہ طعنہ دیا تھا تم نے مجھ کو اُسکے واسطے

زلیخا نے اپنی براءت کر دی:

اب زلیخا کو موقع ملا کہ عورتوں کے طعن وتشنیع کا تیر ان ہی کی طرف لوٹا دے۔ گویا اس وقت فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ، کہہ کر وہ اس شعر کا خلاصہ ادا کر رہی تھی۔

ایں است کہ خون خوردہ ودل بردہ بسے را
بسم اللہ اگر تاب نظر ہست کسے را

(تفسیر عثمانی)

وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ۭ
اور میں نے لینا چاہا تھا اُس سے اُس کا جی پھر اُس نے تھام رکھا

زلیخا نے اصل بات بتادی:

مجمع کا رنگ دیکھ کر زلیخا بالکل ہی کھل پڑی اور واقعہ کا صاف صاف اظہار کردیا کہ بیشک میں نے ان کا دل لینا چاہا تھا مگر اس بندہ خدا نے ایسا مضبوط تھامے رکھا کہ کسی طرح نہ دیا۔ یہ خدا تعالیٰ نے شہر کی عورتوں کے مجمع میں حضرت یوسف علیہ السلام کی کمال عصمت وعفت اور غایت نزاہت وطہارت کا اقبالی ثبوت پیش کرادیا۔ زلیخا کا حال اس وقت وہ ہی تھا جو کسی نے کہا ہے

لاتخف ماصنعت بک الا شواق　　واشرح هواک فکلنا عشاق

(تفسیر عثانی)

وَلَئِنۡ لَّمۡ يَفۡعَلۡ مَآ اٰمُرُهٗ لَيُسۡجَنَنَّ

اور بیشک اگر نہ کریگا جو میں اُس کو کہتی ہوں

وَلَيَكُوۡنًا مِّنَ الصّٰغِرِيۡنَ ﴿۳۲﴾

تو قید میں پڑیگا اور ہوگا بے عزت

زلیخا کی دھمکی:

زلیخا کی اس گفتگو میں کچھ تو عورتوں پر اپنی معذوری اور نامرادی کا اظہار تھا، تا ان کی ہمدردی حاصل کر سکے۔ اور کچھ یوسف علیہ السلام کو تحکمانہ دھمکیوں سے مرعوب کرنا تھا کہ وہ خوفزدہ ہوکر آئندہ اس کی مطلب برآری پر آمادہ ہوجائیں۔ حالانکہ ؎

عنقا شکار کس نہ شود دام بارچیں　　کانجا ہمیشہ باد بدستست دام را

(تفسیر عثانی)

قَالَ رَبِّ السِّجۡنُ اَحَبُّ اِلَىَّ مِمَّا يَدۡعُوۡنَنِىۡۤ

یوسف بولا اے رب مجھ کو قید پسند ہے اُس بات سے

اِلَيۡهِ‌ ۚ وَاِلَّا تَصۡرِفۡ عَنِّىۡ كَيۡدَهُنَّ اَصۡبُ

جس کی طرف مجھ کو بلاتی ہیں اور اگر تو نہ دفع کریگا مجھ سے اُن کا فریب

اِلَيۡهِنَّ وَاَكُنۡ مِّنَ الۡجٰهِلِيۡنَ ﴿۳۳﴾

تو مائل ہو جاؤں گا ان کی طرف اور ہو جاؤں گا بے عقل

تمام عورتیں یوسفؑ کو بہلانے لگیں:

معلوم ہوتا ہے کہ زلیخا کا مایوسانہ غصہ اور مظلومانہ انداز بیان اس کی ہم جنسوں پر اثر کر گیا۔ یا پہلے ہی سے کچھ ملی بھگت ہوگی، بہرحال لکھا ہے کہ اب عورتوں نے یوسف کو سمجھانا شروع کیا کہ تم کو اپنی محسنہ اور سیدہ کا کہنا ماننا چاہیے۔ آخر اس غریب پر اتنا ظلم کیوں کرتے ہو۔ پھر یہ بھی سوچ لو کہ نافرمانی کا نتیجہ کیا ہوگا خواہ مخواہ مصیبت سر پر لینے سے کیا فائدہ۔ کہتے ہیں کہ بظاہر زبان سے وہ زلیخا کی سفارش کررہی تھیں مگر دل ہر ایک کا یوسف کو اپنی طرف کھینچنا چاہتا تھا۔

یوسفؑ کی پاکدامنی:

یوسف نے جب دیکھا کہ یہ عورت بے طرح پیچھے پڑی ہے اور شیطان ہر طرف اپنا جال بچھانے لگا ہے تو نہایت عزم واستقلال اور پیغمبرانہ استقامت سے بارگاہ احدیت میں درخواست کی کہ مجھے ان کے مکر وفریب سے بچایئے۔ اگر اس سلسلہ میں قید ہونا پڑے تو میں قید کو ارتکاب معصیت پر ترجیح دیتا ہوں۔ اگر آپ میری دستگیری نہ فرمائینگے تو ڈر ہے کہ بے عقل ہوکر ان کی ابلہ فریبیوں کی طرف نہ جھک پڑوں۔ یہاں یوسف علیہ السلام کی زبانی یہ جتلادیا کہ انبیاء کی عصمت بھی حق تعالیٰ کی دستگیری سے ہے اور یہ کہ وہ اپنی عصمت پر مغرور نہیں ہوتے۔ بلکہ عصمت کا جو منشاء ہے (حفاظت وصیانت الٰہی) اسی پر نظر رکھتے ہیں۔ (تفسیر عثانی)

قَالَ رَبِّ السِّجۡنُ اَحَبُّ اِلَىَّ مِمَّا يَدۡعُوۡنَنِىۡۤ اِلَيۡهِ یوسف نے کہا اے میرے رب جس چیز کی طرف وہ مجھے بلا رہی ہیں اس سے تو مجھے جیل خانہ زیادہ پسند ہے۔ یعنی زنا سے تو جیل اچھی۔ دعوت گناہ صراحۃً اگرچہ صرف زلیخا نے دی تھی لیکن اشارہ دوسری عورتوں کی طرف سے بھی تھا کہ یوسف مان لیں، اس لیے دعوت کی نسبت سب عورتوں کی طرف کردی یا اس وجہ سے دعوت کی نسبت سب عورتوں کی طرف کی کہ نافرمانی کے نتیجہ بد سے ان عورتوں نے یوسف کو ڈرایا تھا اور فرمان پذیری ہی کو یوسف کے حق میں بہتر قرار دیا تھا۔ بعض علماء کا قول ہے کہ ہر عورت نے یوسف کو اپنی طرف کھینچنا چاہا تھا۔

عافیت کی دُعاء کرنی چاہئے:

بعض علماء نے کہا اگر یوسف قید خانہ کو پسند نہ کرتے اور السجن احب الی نہ کہتے تو قید خانہ کی مصیبت میں مبتلا نہ ہوتے، آدمی کو چاہیے کہ عافیت کا طلبگار ہو اور اللہ سے عافیت ہی کی دعا کرے۔ ترمذی نے حضرت معاذ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو یہ دعا کرتے سنا الٰہی میں تجھ سے صبر کی درخواست کرتا ہوں (کہ مجھے مصائب پر صبر عطا کر) فرمایا تو مصیبت کا طلبگار ہوا عافیت کی دعا کر طبرانی نے حضرت عباس کا قول نقل کیا ہے حضرت عباس کا بیان ہے کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے کوئی ایسی بات بتایئے جس کی دعا میں اللہ سے کروں فرمایا اپنے رب سے عافیت کی دعا کرو۔ کچھ مدت کے بعد میں پھر خدمت میں حاضر ہوا

اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے کوئی ایسی دعا بتائیے جو میں اللہ سے مانگوں، فرمایا چچا اللہ سے دنیا اور آخرت میں عافیت کی طلب کرو۔

یوسفؑ کی التجاء:

وَاِلَّا تَصۡرِفۡ عَنِّیۡ كَیۡدَهُنَّ اَصۡبُ اِلَیۡهِنَّ وَاَكُنۡ مِّنَ الۡجٰهِلِیۡنَ اور اگر تو ان کی مکاریوں کا رخ میرے طرف سے نہیں پھیر دے گا۔ (اور مجھے عصمت پر ثابت قدم نہیں رکھے گا) تو میں ان کی (خواہش کو قبول کرنے کی) طرف جھک جاؤں گا اور (ارتکاب گناہ کی وجہ سے) نادانوں میں سے ہو جاؤں گا۔ یعنی طبعی میلان مجھ پر غالب آجائے گا صبوۃ خواہش نفس کی طرف جھکاؤ۔ بے حیائی کا کام کرنا نادانوں کا کام ہے، دانش مند برا کام نہیں کرتا یا جاہلوں سے مراد ہیں وہ جاننے والے جو جاننے کے باوجود علم کے مطابق عمل نہیں کرتے، ایسے لوگ جاہلوں کے حکم میں ہیں۔ بغوی نے کہا اس فقرہ سے ثابت ہو رہا ہے کہ مؤمن اگر کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو محض جہالت اور نادانی کی وجہ سے کرتا ہے۔ (تفسیر مظہری)

فَاسۡتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنۡهُ كَیۡدَهُنَّ ؕ

سو قبول کر لی اُسکی دُعا اُسکے رب نے پھر دفع کیا اُس سے اُن کا فریب

دُعا کی قبولیت:

یعنی ان کو عصمت و عفت پر پوری طرح ثابت قدم رکھا کسی کا فریب چلنے نہ دیا۔ (تفسیر عثمانی)

واقعہ یہ ہوا کہ جب یوسف علیہ السلام کی برأت اور پاکی بالکل واضح ہو جانے کے باوجود عزیز مصر اور اس کی بیوی نے بدنامی کا چرچا ختم کرنے کے لئے کچھ عرصہ کیلئے یوسف علیہ السلام کو جیل میں بھیج دینے کا فیصلہ کر لیا، جو درحقیقت یوسف علیہ السلام کی دعا اور خواہش کی تکمیل تھی کیونکہ عزیز مصر کے گھر میں رہ کر عصمت بچانا ایک سخت مشکل معاملہ ہو گیا تھا۔

یوسفؑ کا حسن خلق:

یوسف علیہ السلام جیل میں داخل ہوئے تو اپنے پیغمبرانہ اخلاق اور رحمت و شفقت کے سبب سب قیدیوں کی دلداری اور خبر گیری کرتے تھے جو بیمار ہو گیا اس کی عیادت اور خدمت کرتے جس کو غمگین و پریشان پایا اس کو تسلی دیتے، صبر کی تلقین اور رہائی کی امید سے اس کا دل بڑھاتے تھے خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو آرام دینے کی فکر کرتے اور رات بھر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہتے تھے ان کے یہ حالات دیکھ کر جیل کے سب قیدی آپ کی بزرگی کے معتقد ہو گئے جیل کا افسر بھی متاثر ہوا۔ اس نے کہا کہ اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں آپ کو چھوڑ دیتا، اب اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ آپ کو یہاں سے کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ (معارف مفتی اعظم)

اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۳۴﴾

البتہ وہی ہے سننے والا خبر دار

یعنی سب کی دعائیں سنتا ہے اور خبر رکھتا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں ''ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اپنے مانگنے سے قید میں پڑے لیکن اللہ تعالیٰ نے اتنا ہی قبول فرمایا کہ ان کا فریب دفع کر دیا باقی قید ہونا تھا قسمت میں۔ آدمی کو چاہیے کہ گھبرا کر اپنے حق میں برائی نہ مانگے پوری بھلائی مانگے گو ہوگا وہی جو قسمت میں ہے۔'' ترمذی میں ہے کہ ایک شخص کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا مانگتے سنا۔ اللهم انی اسالک الصبر (اے اللہ میں تجھ سے صبر مانگتا ہوں''۔) آپ نے فرمایا ''سالت الله البلاء فاسئله العافية'' (تو نے اللہ سے بلا طلب کی کیونکہ صبر تو بلا پر ہوگا۔ اب تو اس سے عافیت مانگ) (تفسیر عثمانی)

ثُمَّ بَدَا لَهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا رَاَوُا الۡاٰیٰتِ

پھر یوں سمجھ میں آیا لوگوں کی اُن نشانیوں کے دیکھنے پر کہ

لَیَسۡجُنُنَّهٗ حَتّٰی حِیۡنٍ ﴿۳۵﴾

قید رکھیں اُس کو ایک مدت

یوسفؑ کو جیل بھیجنے کی وجہ:

یعنی باوجود یہ کہ حضرت یوسفؑ کی برأت و نزاہت کے بہت سے نشان دیکھ چکے تھے۔ پھر بھی ان کی مصلحت یہ ہوئی کہ یوسفؑ کو ایک مدت تک قید میں رکھا جائے۔ تاکہ عام لوگ سمجھیں کہ قصور یوسفؑ ہی کا تھا، عورت بیچاری مفت میں بدنام ہوئی۔ گویا عورت نے قید کی جو دھمکی دی تھی اسے پورا کرا کے چھوڑا۔ ان لوگوں کی غرض تو یہ ہوگی کہ عورت سے یہ بدنامی زائل ہو، نیز ایک مدت تک یوسفؑ اس کی نظر سے دور رہیں۔ اور عورت کا مطلب یہ ہوگا کہ شاید قید کی سختیاں اٹھا کر یوسف کچھ نرم پڑ جائیں۔ اس طرح اپنا مطلب نکال سکوں۔ (تفسیر عثمانی)

مختلف نشانیاں دیکھنے کے بعد ان لوگوں کی یہی رائے ہوئی کہ یوسف کو ایک مدت کیلئے قید میں رکھیں۔ لھم یعنی عزیز اور اس کے ساتھیوں کی پھر یہ رائے ہوئی۔ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا رَاَوُا الۡاٰیٰتِ یعنی یوسف کی پاک دامنی اور برأت کی نشانیاں دیکھنے کے بعد۔ بچہ کا کلام اور قمیص کا پیچھے سے پھٹنا اور عورتوں کا ہاتھوں کو کاٹنا اور یوسف کا ان سے باعصمت رہنا، جب انہوں نے دیکھ لیا تو یہ رائے قرار پائی کہ کچھ مدت کے لئے یوسف کو قید کر دیا جائے۔ زلیخا کا شوہر زن پرست تھا شوہر کی لگام زلیخا کے ہاتھ میں تھی وہ جس طرف چاہتی موڑ دیتی، اس نے شوہر کو بازیچہ بنا رکھا تھا اس کو خیال تھا کہ یوسف قید کی سختی

سے تنگ ہو کر میرا ہو جائے گا۔ پھر راز فاش ہو جانے کی وجہ سے وہ لوگوں سے شرمندہ بھی ہوگی اور بدنامی کا دھبہ دھونا چاہتی ہوگی اس لئے اس نے یوسف کو قید کر دینا ہی مناسب سمجھا جب دیدار اور وصال سے وہ محروم ہوگئی تو سماع احوال پر ہی اس کو قناعت کرنی پڑی مجبوراً اس نے شوہر سے کہا کہ اس عبرانی غلام نے مجھے لوگوں میں رسوا کر دیا دنیا سے کہتا پھرتا ہے کہ میں نے اس کو ورغلا کر اپنی طرف کھینچنا چاہا تھا اب یا تو آپ مجھے اجازت دیں کہ میں گھر سے نکلوں اور لوگوں سے جا کر اپنی بے گناہی ظاہر کروں یا اس کو آپ قید کر دیں کہ لوگوں میں یہ چرچے ختم ہو جائیں۔ اور لوگ اسی کو مجرم قرار دیدیں۔ (تفسیر مظہری)

حضرت یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی کا راز سب پر کھل گیا، لیکن تاہم ان لوگوں نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ کچھ مدت تک حضرت یوسف علیہ السلام کو جیل خانہ میں ہی رکھیں۔ جب تک بادشاہ نے ہر طرح گواہ شاہدوں سے بلکہ خود عزیز کی بیوی سے پوری تحقیق نہ کر لی اور آپؑ کا بے قصور ہونا ساری دنیا پر نہ کھل گیا آپؑ جیل خانے سے باہر نہ نکلے۔ پھر آپ باہر آئے جب کہ ایک دل بھی ایسا نہ تھا جس میں صدیق اکبر نبی خدا پاک دامن اور معصوم رسول اللہ حضرت یوسف علیہ الصلوۃ والسلام کی طرف سے ذرا بھی بدگمانی ہو۔ قید کرنے کی بڑی وجہ یہی تھی کہ عزیز کی بیوی کی رسوائی نہ ہو۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ۭ قَالَ اَحَدُهُمَآ
اور داخل ہوئے قید خانہ میں اُس کے ساتھ دو جوان کہنے لگا
اِنِّىْٓ اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّىْٓ
اُن میں سے ایک میں دیکھتا ہوں کہ میں نچوڑتا ہوں
اَرٰىنِيْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ
شراب اور دوسرے نے کہا میں دیکھتا ہوں کہ اُٹھا رہا ہوں اپنے سر پر
الطَّيْرُ مِنْهُ ۭ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ
روٹی کہ جانور کھاتے ہیں اُس میں سے، بتلا ہم کو اس کی تعبیر ہم
الْمُحْسِنِيْنَ ۝
دیکھتے ہیں تجھ کو نیکی والا

دونو جوان قیدی:

یعنی اسی زمانہ میں دونو جوان قیدی جیل خانہ میں لائے گئے۔ جن میں ایک بادشاہ مصر (ریان بن الولید) کا نانبائی اور دوسرا ساقی (شراب پلانے والا) تھا۔ دونوں بادشاہ کو زہر دینے کے الزام میں ماخوذ تھے۔ قید خانہ میں یوسف علیہ السلام کی مروت وامانت، راست گوئی، حسن اخلاق، کثرت عبادت، معرفت تعبیر اور ہمدردی خلائق کا چرچا تھا۔ یہ دونوں قیدی حضرت یوسفؑ سے بہت مانوس ہو گئے اور بڑی محبت کا اظہار کرنے لگے۔ ایک روز دونوں نے اپنا اپنا خواب بیان کیا۔ ساقی نے کہا میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ بادشاہ کو شراب پلا رہا ہوں۔ نانبائی نے کہا کہ میرے سر پر کئی ٹوکرے ہیں جس میں سے پرندے نوچ کر کھا رہے ہیں۔ یوسف علیہ السلام کو بزرگ دیکھ کر تعبیر مانگی۔ (تفسیر عثمانی)

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ اور یوسف کے ساتھ قید خانہ میں دو جوان اور بھی داخل ہوئے تھے (ان کو بھی قید کر دیا گیا تھا) یہ دونوں ریان بن ولید بن ثروان شاہ مصر کے غلام تھے ایک باورچی یعنی منصرم باورچی خانہ تھا اور دوسرا ساقی یعنی منصرم آبدارخانہ۔ بادشاہ نے ناراض ہو کر ان کو بھی قید کر دیا تھا۔ اور اتفاقاً ان کی قید بھی یوسف ہی کے ساتھ ہوئی تھی۔ مع کے لفظ سے یہی معلوم ہو رہا ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ کچھ لوگوں نے بادشاہ کو ہلاک کرنے کی سازش کی اور بادشاہ کو زہر دینے کیلئے شاہی باورچی کو مالی لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا اقرار کے بعد ساقی نے تو سازش میں شریک ہونے سے انکار کر دیا۔ اور باورچی نے رشوت لے کر کھانے میں زہر ملا دیا کھانا بادشاہ کے سامنے آیا تو ساقی نے بادشاہ سے کہہ دیا کہ یہ کھانا زہر آمیز ہے۔ اس کو نہ کھایئے۔ باورچی نے (ضد میں آ کر) کہا حضور پانی میں زہر ملا ہوا ہے اس کو نہ پیجئے۔ بادشاہ نے ساقی کو حکم دیا، یہ پانی تجھے پینا ہوگا ساقی نے پی لیا اس کو کوئی ضرر نہ پہنچا اور باورچی کو حکم دیا یہ کھانا تجھے کھانا پڑے گا۔ اس کو کھا تو اس نے انکار کر دیا۔ بادشاہ نے کھانا کسی جانور کے سامنے ڈلوا دیا۔ جانور نے کھایا تو وہ مر گیا۔ بادشاہ نے دونوں کو جیل خانہ بھیج دینے کا حکم دے دیا (باورچی کو زہر دینے کی کوشش کی وجہ سے اور ساقی کو رازدار ہونے کی وجہ سے) یوسف جیل خانے میں پہنچے تو ان کے علم کی شہرت ہوگئی۔ آپ نے خود بھی اعلان کر دیا کہ میں خواب کی تعبیر دینا جانتا ہوں۔

قیدیوں کے خواب.

غرض ساتھ داخل ہونے والے دونوں قیدیوں نے مشورہ کیا ہم اس عبرانی غلام کے دعوے کی جانچ کرنا چاہتے ہیں۔ چلو تجربہ کریں خواب تو انہوں نے کوئی دیکھا نہ تھا۔ جھوٹ موٹ خواب بنا کر تجربہ کرنا چاہا۔ حضرت ابن مسعود۔ نے یہی فرمایا ہے، بعض علماء نے کہا انہوں نے واقعی خواب دیکھے تھے، حضرت یوسف نے ان کو غمگین پا کر وجہ دریافت کی تو انہوں نے کہا ہم دونوں بادشاہ کے مصاحب تھے، ہم نے خواب دیکھے ہیں جن کی وجہ سے پریشان ہیں۔ یوسف نے کہا جو کچھ دیکھا ہے بیان کر دو۔

قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّیْٓ اَرٰىنِیْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ایک نے یعنی ساقی نے کہا میں نے دیکھا کہ میں (انگور نچوڑ رہا ہوں اور ان کو (نچوڑ کر شراب بنا رہا ہوں، انگور سے شراب بنتی ہے۔ انگور مآل کار شراب ہو جاتے ہیں اس لئے انگور کی جگہ لفظ خمر ذکر کیا۔ خمر سے مراد انگور ہیں۔ فلاں شخص کھانا پکاتا ہے۔ یعنی وہ چیز پکاتا ہے جو پک کر کھانا بن جاتی ہے۔ بعض نے کہا اہل عمان کے محاورہ میں خمر انگوروں کو کہتے ہیں تفصیلی خواب اس نے اس طرح بیان کیا، میں نے دیکھا کہ میں ایک باغ میں درخت انگور کی جڑ کے پاس ہوں درخت میں تین خوشے لگے ہیں، میرے ہاتھ میں بادشاہ کا پیالہ ہے میں نے وہ انگور نچوڑ کر پیالے میں عرق بھرا اور بادشاہ کو پلایا۔ بادشاہ نے اس کو پی لیا۔

الطیر منہ اور دوسرے نے یعنی باورچی نے کہا میں نے دیکھا کہ میں اپنے سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے ہوں اور پرندے (اوپر سے جھپٹ کر) ان میں سے کھا رہے ہیں۔

اس نے خواب کی تفصیل اس طرح بیان کی تھی کہ میں نے دیکھا میرے سر پر تین ٹوکریاں ہیں جن میں روٹیاں اور طرح طرح کے کھانے ہیں اور شکاری پرندے ان کو نوچ کر لیے جا رہے ہیں۔

نَبِّئْنَا بِتَاْوِیْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ آپ ہم کو ہر ایک کے خواب کی تعبیر بتا دیجئے۔ ہمارے خیال میں آپ صحیح تعبیر دینے والوں میں سے ہیں یا آپ اہل علم میں سے ہیں، اس صورت میں احسان سے مراد ہو گا علم اور اول ترجمہ پر محسن سے مراد ہو گا اچھی تعبیر دینے والا یا یہ مطلب ہے کہ آپ قیدیوں سے اچھا سلوک کرتے ہیں۔ ہم پر بھی احسان کیجئے۔ اور صحیح تعبیر بتا دیجئے۔

قیدیوں پر یوسف علیہ السلام کا احسان:

ضحاک بن مزاحم سے پوچھا گیا کہ آیت اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ میں کس احسان کا اظہار ہے یوسف کیا بھلائی کرتے تھے؟ ضحاک نے جواب دیا کوئی قیدی بیمار ہو جاتا تو آپ اس کی عیادت اور نگہداشت کرتے تھے۔ اگر کسی قیدی کی جگہ تنگ ہوتی تو آپ اس کو کشادہ جگہ دیدیتے اگر کسی کو کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو وہ چیز فراہم کر دیتے اور ان تمام باتوں کے باوجود عبادت کی بہت زیادہ کوشش کرتے اور راتوں کو نماز میں کھڑے رہتے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب آپ قید خانہ میں داخل ہوئے تو لوگوں کو دیکھا کہ مصیبت میں مبتلا ہیں غمگین ہیں، ہر قسم کا سہارا ٹوٹ چکا ہے آپ ان کو تسلی دینے لگے، فرمایا لوگو پریشان نہ ہو صبر کرو اللہ اجر دیگا۔ قیدیوں نے کہا نوجوان اللہ تجھے برکت عطا فرمائے تیرا چہرہ کیسا حسین ہے۔ اخلاق کتنے اعلیٰ ہیں اور باتیں کتنی پیاری ہیں، تیرے ساتھ رہنے سے ہم کو برکت حاصل ہوگی۔ تیرا کیا نام ہے تو کون ہے۔ آپ نے کہا میں یوسف بن یعقوب صفی اللہ بن اسحٰق ذبیح اللہ بن ابراہیم خلیل اللہ ہوں (اس روایت میں اسحٰق کا خطاب ذبیح اللہ قرار دیا گیا ہے، مگر جمہور علماء کے نزدیک ذبیح اللہ حضرت اسمٰعیل کا لقب تھا۔ احادیث سے اسی کی تائید ہوتی ہے اور قرآنی آیات بھی شہادت دے رہی ہیں کہ حضرت اسمٰعیلؑ کو ذبح کرنے کا حکم حضرت ابراہیمؑ کو خواب میں دکھایا گیا تھا۔ مترجم۔

جیلر نے کہا نوجوان اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں تجھے آزاد کر دیتا (مگر میرا اختیار نہیں ہے) پھر بھی میں تیرا حق مصاحبت اچھی طرح ادا کروں گا تیرے ساتھ اچھا سلوک کروں گا جیل خانہ کی کوٹھڑیوں میں سے تو جہاں رہنا پسند کرے رہ سکتا ہے۔

روایت میں آیا ہے کہ دونوں (خواب دیکھنے والے) جوانوں نے یوسف کو دیکھ کر کہا، یوسف ہم کو تو اسی وقت سے تم سے محبت ہو گئی تھی جب ہم نے تم کو دیکھا تھا آپ نے فرمایا میں تم کو خدا کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ مجھ سے محبت نہ کرنا۔ خدا کی قسم جس نے مجھ سے محبت کی اس کی محبت سے مجھ پر مصیبت ہی آئی میری پھوپھی نے مجھ سے محبت کی تو مجھ پر مصیبت آئی، پھر میرے باپ نے مجھ سے محبت کی تو مجھے کنوئیں میں ڈالا گیا پھر عزیز کی بیوی نے مجھ سے محبت کی تو مجھے قید ہونا پڑا۔

غرض جب دونوں قیدیوں نے اپنا اپنا خواب یوسف سے بیان کیا تو حضرت کو تعبیر دینا مناسب معلوم نہیں ہوا کیونکہ ایک کی تعبیر تکلیف دہ تھی اس پر مصیبت آنے والی تھی اس لئے آپ نے تعبیر کی طرف کوئی توجہ نہیں کی اور بعض دوسرے معجزے ظاہر کرنے اور توحید کی دعوت دینے لگے۔ (تفسیر مظہری)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ خواب کچھ نہ تھا، محض یوسف علیہ السلام کی بزرگی اور سچائی کی آزمائش کے لئے خواب بنایا تھا۔

بہر حال ان میں سے ایک یعنی شاہی ساقی نے تو یہ کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں انگور سے شراب نکال رہا ہوں اور دوسرے یعنی باورچی نے کہا کہ میں نے دیکھا کہ میرے سر پر روٹیوں کا کوئی ٹوکرا ہے۔ اس میں سے جانور نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں۔ اور درخواست کی کہ ہمیں ان دونوں خوابوں کی تعبیر بتلائیے۔

پیغمبرانہ شفقت کی عجیب مثال:

ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ اگرچہ ان دونوں کے خواب الگ الگ تھے اور ہر ایک کی تعبیر متعین تھی اور یہ بھی متعین تھا کہ شاہی ساقی بری ہو کر اپنی ملازمت پر پھر فائز ہوگا اور باورچی کو سولی دی جائے گی مگر پیغمبرانہ شفقت ورافت کی وجہ سے متعین کر کے نہیں بتلایا کہ تم میں سے فلاں کی سولی دی جائے گی تا کہ وہ ابھی سے غم میں نہ گھلے، بلکہ اجمالی طور پر یوں فرمایا کہ تم میں سے ایک رہا ہو جائے گا اور دوسرے کو سولی دی جائے گی۔ (معارف، مفتی اعظم)

قَالَ لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهِ إِلَّا نَبَّأْتُكُمَا

بولا نہ آنے پائیگا تم کو کھانا جو ہر روز تم کو ملتا ہے مگر بتا چکونگا

بِتَأْوِيلِهِ قَبْلَ أَنْ يَأْتِيَكُمَا ۚ ذَٰلِكُمَا مِمَّا

تم کو اس کی تعبیر اُس کے آنے سے پہلے

عَلَّمَنِي رَبِّي ۚ إِنِّي تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ

یہ علم ہے کہ مجھ کو سکھایا میرے رب نے میں نے چھوڑا دین اُس قوم

لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ ﴿٣٧﴾

کا کہ ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور آخرت سے وہ لوگ منکر ہیں

پہلے یوسفؑ کی تسلی اور دعوت توحید:

یوسف علیہ السلام نے اول ان کو تسلی دی کہ بیشک خوابوں کی تعبیر تمہیں بہت جلد معلوم ہوا چاہتی ہے روزمرہ جو کھانا تم کو ملتا ہے اس کے آنے سے پیشتر میں تعبیر بتلا کر فارغ ہو جاؤ نگا۔ لیکن تعبیر خواب سے زیادہ ضروری اور مفید ایک چیز پہلے تم کو سناتا ہوں۔ وہ یہ کہ تعبیر وغیرہ کا یہ علم مجھ کو کہاں سے حاصل ہوا سو یاد رکھو کہ میں کوئی پیشہ ور کاہن یا منجم نہیں۔ بلکہ میرے علم کا سرچشمہ وحی اور الہام ربانی ہے جو مجھ کو حق تعالیٰ نے اس کی بدولت عطا فرمایا کہ میں نے ہمیشہ سے کافروں اور باطل پرستوں کی دین وملت کو چھوڑے رکھا اور اپنے مقدس آباء واجداد (حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحٰقؑ، حضرت یعقوبؑ) جیسے انبیاء ومرسلین کے دین توحید پر چلا اور ان کا اسوۂ حسنہ اختیار کیا۔ ہمارا سب سے بڑا اور مقدم مطمح نظر یہ ہی رہا کہ دنیا کی کسی چیز کو کسی درجہ میں بھی خدا کا شریک نہ بنائیں نہ ذات میں، نہ صفات میں، نہ افعال میں، نہ ربوبیت ومعبودیت میں۔ صرف اسی کے آگے جھکیں، اسی سے محبت کریں اسی پر بھروسہ رکھیں۔ اور اپنا جینا مرنا سب اسی ایک پروردگار کے حوالہ کر دیں بہر حال یوسف علیہ السلام۔ نے موقع مناسب دیکھ کر نہایت موثر طرز میں ان قیدیوں کو ایمان وتوحید کی طرف آنے کی ترغیب دی۔

پیغمبروں کا کام:

پیغمبروں کا کام یہ ہی ہوتا ہے کہ دعوت وتبلیغ حق کا کوئی مناسب موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں یوسف علیہ السلام نے دیکھا کہ ان قیدیوں کے دل میری طرف متوجہ اور مجھ سے مانوس ہیں۔ قید کی مصیبت میں گرفتار ہو کر شاید کچھ نرم بھی ہوئے ہونگے۔ لاؤ ان حالات سے فرض تبلیغ کے ادا کرنے میں فائدہ اٹھائیں۔ اول ان کو دین کی باتیں سکھلائیں۔ پھر تعبیر بھی بتلا دینگے۔ یہ تسلی پہلے کر دی کہ کھانے کے وقت تک تعبیر معلوم ہو جائیگی تا وہ نصیحت سے اکتائیں نہیں۔

"(تنبیہ): بہت سے مفسرین نے "لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهِ الخ" کے معنی یہ لئے ہیں کہ کبھی کھانا تمہارے پاس نہیں آتا ہے مگر میں آنے سے پہلے اس کی حقیقت پر تم کو مطلع کر دیا کرتا ہوں یعنی آج کیا کھانا آئیگا، کس قسم کا ہوگا، پھر تعبیر بتلانا کیا مشکل ہے۔ گویا اول حضرت یوسفؑ نے معجزہ کی طرف توجہ دلا کر انہیں اپنی نبوت کا یقین دلانا چاہا، تا کہ آئندہ جو نصیحت کریں زیادہ موثر واقع فی النفس ہو۔ اس تقدیر پر یوسفؑ کا یہ معجزہ ایسا ہی ہوگا جیسے حضرت مسیحؑ نے فرمایا تھا "وَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدَّخِرُونَ فِي بُيُوتِكُمْ"، مگر مترجم محقق نے پہلی تفسیر اختیار کی ہے واللہ اعلم۔ حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ لکھتے ہیں "حق تعالیٰ نے قید میں یہ حکمت رکھی کہ ان کا دل کافروں کی محبت سے (یعنی کافر جوان کی محبت ومدارات کرتے تھے، اس سے) ٹوٹا تو دل پر اللہ کا علم روشن ہوا۔ چاہا کہ اول ان کو دین کی بات سنا دیں پیچھے تعبیر خواب کہیں۔ اس واسطے تسلی کر دی، تا نہ گھبرائیں۔ کہا کہ کھانے کے وقت تک وہ بھی بتا دونگا۔ (تفسیر عثمانی)

(اکثر علماء کے نزدیک آیت کا مطلب اس طرح) بیان کیا گیا ہے کہ تمہارے گھروں سے جو کھانا کھانے کیلئے تمہارے پاس آتا ہے میں اسکے آنے سے پہلے اس کی مقدار، رنگ، قسم، وقت اور دوسری کیفیت بتا دیتا ہوں گویا آپ کا یہ معجزہ حضرت عیسیٰ کے معجزے کی طرح تھا، حضرت عیسیٰ نے بھی فرمایا تھا۔ وَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدَّخِرُونَ فِي بُيُوتِكُمْ کہنے لگے یہ کام تو غیبی خبریں بتانے والوں اور کاہنوں کا ہے تم کو یہ علم کہاں سے حاصل ہوا۔ حضرت نے فرمایا میں کاہن نہیں ہوں۔

بیضاوی نے لکھا ہے دونوں قیدیوں کے سوال کا جواب دینے سے پہلے حضرت یوسف نے ان کو توحید کی اور صراط مستقیم اختیار کرنے کی دعوت دینی چاہی۔ انبیاء اور انبیاء کے جانشینوں کی ہدایت ودعوت کا طریقہ ہی یہ ہے آپ نے پہلے کچھ غیبی اطلاع بطور معجزہ دی تا کہ دعوت توحید اور تعبیر خواب کی سچائی ان کے دلوں میں جم جائے۔ (تفسیر مظہری)

وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِي إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ

اور پکڑا میں نے دین اپنے باپ دادوں کا ابراہیم اور اسحٰق

وَيَعْقُوبَ ۚ مَا كَانَ لَنَا أَنْ نُشْرِكَ بِاللَّهِ

اور یعقوب کا ہمارا کام نہیں کہ شریک کریں اللہ کا

مِنْ شَيْءٍ ۚ ذَٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللَّهِ عَلَيْنَا

کسی چیز کو یہ فضل ہے اللہ کا ہم پر

وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا
اور سب لوگوں پر لیکن بہت لوگ
يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۸﴾
احسان نہیں مانتے

عقیدۂ توحید کا تاریخی تسلسل:

یعنی ہمارا خالص توحید اور ملت ابراہیمی پر قائم رہنا نہ صرف ہمارے حق میں بلکہ سارے جہان کے حق میں رحمت وفضل ہے کیونکہ خاندان ابراہیمی ہی کی شمع سے سب لوگ اپنے دلوں کے چراغ روشن کر سکتے ہیں لیکن افسوس ہے کہ بہت سے لوگ خدا کی اس نعمت عظیمہ کی قدر نہیں کرتے چاہیے یہ تھا کہ اس کا احسان مان کر راہ توحید پر چلتے وہ الٹی ناشکری کر کے شرک وعصیان کی راہ اختیار کر رہے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اور اپنے باپ دادا ابراہیم اور اسحٰق اور یعقوب کے دین کی پیروی اختیار کی ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انی ترکت سے الگ مستقل کلام ہو۔ جو دعوت کی تمہید اور خانوادہ نبوت سے اپنے کو ظاہر کرنے کیلئے آپ نے فرمایا ہوتا کہ وہ دونوں قیدی رغبت سے سنیں اور آپ کے بیان کا اعتبار کریں۔

مسئلہ: اسی جگہ سے یہ بات نکلتی ہے کہ اگر کسی جگہ کسی عالم کے مرتبے سے لوگ واقف نہ ہوں اور وہ اپنی دعوت پھیلانی چاہیے تو اگر وہ اپنے اوصاف کسی قدر بیان کردے تاکہ اس کی بات کی وقعت پیدا ہوجائے تو ناجائز نہیں اس تدبیر سے لوگوں کو اس کے علم سے فائدہ اندوز ہونے کا موقع مل جائے گا۔ یہ بات خودستائی کے ذیل میں نہیں آتی۔ اعمال کا مدار نیت پر ہے انبیاء کو تو تحدیث نعمت کا حکم دیا گیا ہے فرمایا ہے وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ۔

جن اولیاء نے اپنے مراتب قرب اور مدارج فوز کا کسی قدر ذکر کیا ہے مثلاً حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی (یا حضرت شیخ عالم سید الاولیاء محی الدین عبدالقادر جیلانی) افسوس بعض لوگ نادانی یا حسد کی وجہ سے ان پر طعن کرتے ہیں اور نہیں جانتے کہ یہ بات خودستائی میں داخل نہیں (بلکہ تحدیث نعمت ہے) (تفسیر مظہری)

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ
اے رفیقو قید خانہ کے بھلا کئی معبود جدا جدا بہتر
اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾
یا اللہ اکیلا زبردست

حکیمانہ انداز: یعنی مختلف انواع واشکال کے چھوٹے بڑے دیوتا جن پر تم نے خدائی اختیارات تقسیم کر رکھے ہیں ان سے لو لگانا بہتر ہے یا اس اکیلے زبردست خدا سے جس کو ساری مخلوق پر کلی اختیار اور کامل تصرف وقبضہ حاصل ہے اور جس کے آگے نہ کسی کا حکم چل سکتا ہے نہ اختیار، نہ اسے کوئی بھاگ کر ہرا سکتا ہے نہ مقابلہ کر کے مغلوب کر سکتا ہے۔ خود سوچو کہ سر عبودیت ان میں سے کس کے سامنے جھکایا جائے۔

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً
کچھ نہیں پوجتے ہوسوائے اُس کے مگر
سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ
نام ہیں جو رکھ لئے ہیں تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے نہیں
اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ
اُتاری اللہ نے اُن کی کوئی سند

یعنی یوں ہی بے سند اور بے ٹھکانے کچھ نام رکھ چھوڑے ہیں جن کے نیچے حقیقت ذرہ برابر نہیں۔ ان ہی نام کے خداؤں کی پوجا کر رہے ہو۔ ایسے جہل پر انسان کو شرمانا چاہیے۔ (تفسیر عثمانی)

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا
حکومت نہیں ہے کسی کی سوائے اللہ کے اُس نے فرما دیا کہ
اِلَّآ اِيَّاهُ
نہ پوجو مگر اُسی کو

فقط اللہ کی عبادت کرو:

یعنی قدیم سے انبیاء علیہم السلام کی زبانی یہی حکم بھیجتا رہا کہ خدا کی عبادت میں کسی کو شریک مت کرو۔ "وَسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ" (زخرف رکوع ۴) (تفسیر عثمانی)

یعنی عبادت کرنے کا حکم تو صرف اللہ کیلئے ہے وہ واجب الوجود بالذات ہے ہر چیز کا خالق اور موجد (عدم سے وجود میں لانے والا) ہے وہی منعم، مالک، ہر چیز پر غالب اور نفع وضرر پہنچانے والا ہے اس کے سوا نہ کوئی مالک اور قاہر ہے نہ کسی کے ہاتھ میں حقیقتاً کسی کا نفع وضرر ہے لہذا وہی بالذات

مستحق عبادت ہے اگر کسی دوسرے کی پوجا جائز ہوتی تو اسی کے حکم سے اس کا جواز ہوسکتا تھا مگر اس نے پیغمبروں کی زبانی حکم دے دیا ہے کہ اس کی ذات کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ (تفسیر مظہری)

ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ
یہی ہے راستہ سیدھا پر بہت
النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۰﴾
لوگ نہیں جانتے

سیدھا راستہ: یعنی توحید خالص کے راستہ میں اینچ پینچ کچھ نہیں۔ سیدھی اور صاف سڑک ہے جس پر چل کر آدمی بے کھٹکے خدا تک پہنچتا ہے لیکن بہت لوگ حماقت یا تعصب سے ایسی سیدھی بات کو بھی نہیں سمجھتے۔

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ
اے رفیقو قید خانہ کے ایک جو ہے تم دونوں میں سو پلائیگا
رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ
اپنے خاوند (مالک) کو شراب اور دوسرا جو ہے سو سولی دیا (پر چڑھے گا)
الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ۭ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ
جائیگا پھر کھائینگے جانور اس کے سر میں سے فیصل ہوا وہ کام جس کی
فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ﴿۴۱﴾
تحقیق تم چاہتے تھے

خوابوں کی تعبیر:

فرض تبلیغ ادا کرنے کے بعد یوسف علیہ السلام نے ان کے خوابوں کی تعبیر بیان فرمائی، کہ جس نے خواب میں شراب پلاتے دیکھا اس کی تعبیر یہ ہی ہے کہ وہ بیداری میں بادشاہ کو شراب پلائیگا۔ اور جس نے سر پر سے جانوروں کو روٹیاں کھاتے دیکھا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سولی دیا جائیگا۔ پھر جانور اس کے سر سے نوچ نوچ کر کھائیں گے۔ قضا وقدر کا فیصلہ یہ ہی ہے جو کسی کے ٹالے ٹل نہیں سکتا۔ جو بات تم پوچھتے تھے وہ میں نے بتلا دی۔ یہ بالکل طے شدہ امر ہے۔ جس میں تخلف نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ساقی زہر خورانی کی تہمت سے بری ہوگیا، اور خباز (نانبائی) کو جرم ثابت ہونے کی وجہ سے سزائے موت دی گئی۔ (تفسیر عثمانی)

میں کہتا ہوں اس تعبیر کا قرینہ شاید یہ ہو کہ باورچی نے کھانے میں واقعی زہر ملا دیا تھا اور ساقی بے قصور تھا (اس لئے بادشاہ کا صحیح فیصلہ یہی ہوسکتا تھا کہ باورچی کو صلیب دیدے اور ساقی کو رہا کر کے سابق عہدے پر فائز کر دے)

حضرت ابن مسعود نے فرمایا حضرت یوسف کا بیان سن کر دونوں قیدی کہنے لگے ہم نے تو کوئی خواب نہیں دیکھا تھا محض دل لگی کر رہے تھے اس پر حضرت یوسف نے فرمایا۔ جس کے بارے میں تم پوچھتے تھے وہ اسی طرح مکرر ہو چکا یعنی جس بات کو تم دریافت کرنا چاہتے تھے اُس کے متعلق اللہ کا فیصلہ ہو چکا تم نے خواب دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو قضائے خداوندی ویسی ہی ہو چکی ہے جیسا میں نے بیان کر دیا تم دونوں کا انجام یہی ہونا چاہئے۔ (تفسیر مظہری)

وَقَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ
اور کہہ دیا یوسف نے اُس کو جس کو گمان کیا تھا کہ بچے گا اُن دونوں میں
عِنْدَ رَبِّكَ
میرا ذکر کرنا اپنے خاوند (مالک) کے پاس

رہا ہونے والے قیدی کے ذریعہ پیغام:

یہاں ظن یقین کے معنی میں ہے جیسے "اَلَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ" میں۔ یعنی یوسف علیہ السلام کو دونوں میں سے جس شخص کی بابت یقین تھا کہ بری ہو جائیگا جب وہ قید خانہ سے نکلا تو فرمایا اپنے بادشاہ کی خدمت میں میرا بھی ذکر کرنا کہ ایک ایسا شخص بے قصور قید خانہ میں برسوں سے پڑا ہے۔ مبالغہ کی ضرورت نہیں۔ میری جو حالت تو نے مشاہدہ کی ہے بلا کم و کاست کہہ دینا۔ (تفسیر عثمانی)

فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِي
سو بھلا دیا اُس کو شیطان نے ذکر کرنا اپنے خاوند سے
السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ ﴿۴۲﴾
پھر رہا قید میں کئی برس

شیطان نے قیدی کو بھلوا دیا:

یعنی شیطان نے چھوٹنے والے قیدی کے دل میں مختلف خیالات و وساوس ڈال کر ایسا غافل کیا کہ اسے بادشاہ کے سامنے اپنے محسن بزرگ (یوسف علیہ السلام) کا تذکرہ یاد ہی نہ رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یوسف کو کئی سال اور قید میں رہنا پڑا۔ مدت دراز کے بعد جب بادشاہ نے ایک خواب دیکھا اور اس کی تعبیر کسی کی سمجھ میں نہ آئی تب اس شخص کو یوسف علیہ السلام یاد آئے جیسا کہ آگے آتا ہے "وَقَالَ الَّذِيْ نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ الخ"

بھلانے کی نسبت شیطان کی طرف اس لئے کی گئی کہ وہ القائے وساوس وغیرہ کا ذریعہ ہے جو سبب بنتا ہے نسیان کا۔ حضرت موسیٰ کے رفیق سفر نے کہا تھا "وَمَآ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ" (کہف۔ رکوع ۹) لیکن ہر ایک شر میں حق تعالیٰ کوئی خیر کا پہلو رکھ دیتا ہے۔ یہاں بھی گو اس نسیان کا نتیجہ تطویل قید کی صورت میں ظاہر ہوا۔

پیغمبرانہ شان کی نزاکت:

تاہم حضرت شاہ صاحبؒ کی نکتہ آفرینی کے موافق اس میں یہ تنبیہ ہوگئی کہ ایک پیغمبر کا دل ظاہری اسباب پر نہیں ٹھہرنا چاہیے۔ بلکہ ابن جریر اور بغوی وغیرہ نے بعض سلف سے نقل کیا ہے کہ وہ فَاَنْسٰهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ کی ضمیر یوسف علیہ السلام کی طرف راجع کرتے ہیں۔ گویا "اذکرنی عند ربک" کہنا ایک طرح کی غفلت تھی جو یوسف علیہ السلام کو عارض ہوئی۔ انہوں نے قیدی کو کہا کہ اپنے رب سے میرا ذکر کرنا حالانکہ چاہئے تھا کہ سب ظاہری سہارے چھوڑ کر وہ خود اپنے رب سے فریاد کرتے۔ بیشک کشف شدائد کے وقت مخلوق سے ظاہری استعانت اور اسباب کی مباشرت مطلقاً حرام نہیں ہے۔ لیکن ابرار کی حسنات مقربین کی سیات بن جاتی ہے۔ جو بات عامۃ الناس بے کھٹکے کر سکتے ہیں انبیاء علیہم السلام کے منصب عالی کے اعتبار سے وہ ہی بات ایک قسم کی تقصیر بن جاتی ہے۔ امتحان و ابتلاء کے موقع پر انبیاء کی شان رفیع اسی کو مقتضی ہے کہ رخصت پر نظر نہ کریں، انتہائی عزیمت کی راہ چلیں۔ چونکہ حضرت یوسف (علیہ السلام) کا "اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ" کہنا عزیمت کے خلاف تھا، اس لئے عتاب آمیز تنبیہ ہوئی کہ کئی سال تک مزید قید اٹھانی پڑی اور اسی لئے "انساء" کی نسبت شیطان کی طرف کی گئی۔ واللہ اعلم بالصواب۔ زیادہ تفصیل روح المعانی میں ہے۔ (تفسیر عثمانی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ میرے بھائی یوسفؑ پر رحم کرے اگر وہ (ایک انسان سے) اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ نہ کہتے تو جیل کے اندر اتنی طویل مدت نہ رہنا پڑتا۔ رواہ ابن المنذر وابن ابی حاتم وابن مردویہ۔

مالک بن دینار نے کہا جب یوسف نے ساقی سے فرمایا کہ اپنے آقا سے میرا تذکرہ کر دینا تو (اللہ کی طرف سے) کہا گیا یوسف مجھے چھوڑ کر تو نے دوسرے کو اپنا وکیل (ذمہ دار) بنایا اب میں ضرور تیری قید طویل کر دوں گا، حضرت یوسف رونے لگے اور عرض کیا میرے رب! مصائب کی کثرت نے میرے دل پر فراموشی طاری کر دی اور میں نے (بے سمجھے) ایک بات کہہ دی آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔

جبریلؑ کی گفتگو:

حسن بصری نے کہا حضرت جبرئیلؑ قید خانہ کے اندر حضرت یوسف کے پاس آئے آپ نے ان کو پہچان لیا اور فرمایا یا اخا المنذرین (اللہ کے عذاب سے ہلاک ہوجانے سے ڈرانیوالوں کے سردار) میں آپ کو (آج) ان گناہگاروں میں کیسے دیکھ رہا ہوں، حضرت جبرئیلؑ نے فرمایا اے پاک باپ دادا کے پاک بیٹے اللہ رب العالمین نے تم کو سلام فرمایا ہے اور فرمایا ہے کیا تم کو شرم نہیں آئی کہ (میرے ہوتے) تم نے آدمیوں سے سفارش کی خواستگاری کی قسم ہے اپنی عزت کی میں تم کو مزید چند سال جیل خانہ میں رکھوں گا۔ حضرت یوسف نے فرمایا کیا اللہ اس حالت میں مجھ سے راضی بھی ہوگا حضرت جبرئیل نے جواب دیا ہاں، حضرت یوسف نے فرمایا تو پھر مجھے (قید میں رہنے کی) پرواہ نہیں۔

کعب کا بیان ہے کہ حضرت جبرئیل نے حضرت یوسف سے کہا اللہ فرماتا ہے کہ تجھے کس نے پیدا کیا حضرت نے جواب دیا اللہ نے۔ جبرئیل نے کہا (اللہ فرماتا ہے) تجھے باپ کا چہیتا کس نے بنایا، یوسف نے جواب دیا اللہ نے۔ جبرئیلؑ نے کہا (اللہ فرماتا ہے) تجھے کنویں کی تکلیف سے کس نے نجات دی، یوسف نے کہا اللہ نے۔ جبرئیلؑ نے کہا (اللہ فرماتا ہے) تجھے خواب کی تعبیر کس نے سکھائی؟ یوسف نے کہا اللہ نے۔ جبرئیلؑ نے کہا (اللہ فرماتا ہے) چھوٹے بڑے گناہ کا رخ کس نے تیری طرف سے پھیر دیا، یوسف نے کہا اللہ نے۔ جبرئیل نے کہا (اللہ فرماتا ہے) پھر تو نے اپنے جیسے آدمی سے کیسے سفارش کی درخواست کی۔

آئندہ وہ حدیث آئے گی جو طبرانی نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر ایک بات (یوسف سے) نہ ہوجاتی کہ اللہ کے سوا دوسرے سے انہوں نے ازالہ مصیبت کی درخواست کی تو قید خانہ میں (مزید) رہنا نہ پڑتا۔

مصر کے بادشاہ کا خواب:

غرض جب سات سال گذرے اور حضرت یوسف کی کشائش کا وقت قریب آ گیا تو مصر کے شاہ اعظم یعنی ریان بن ولید نے ایک عجیب خواب دیکھا جس سے وہ دہشت زدہ ہوگیا اس نے دیکھا کہ سات موٹی گائیں دریا سے برآمد ہوئیں اور ان کے پیچھے سات گائیں اور دریا سے نکلیں جو نہایت دبلی تھیں، پھر دبلی گائیں موٹی گایوں کو نگل گئیں اور موٹی گائیں دبلی گایوں کے پیٹ میں گھس گئیں ان کا کوئی نشان بھی نہیں رہا۔ پھر (غلہ کی) سات سبز بالیاں دیکھیں جن میں دانہ پڑ چکا تھا اور سات خشک بالیاں دیکھیں جو کاٹنے کے قابل ہوگئی تھیں خشک بالیاں سبز بالیوں سے لپٹیں اور ان پر غالب آگئیں یہاں تک کہ ان کی سبزی بالکل جاتی رہی۔ بادشاہ نے جادوگروں کو، کاہنوں کو، اہل دانش وفہم کو اور خواب کی تعبیر دینے والوں کو جمع کیا اور ان سے اپنا خواب بیان کیا۔

بغوی نے لکھا ہے کہ ساقی نے بادشاہ کے سامنے دوزانو ہو کر کہا جیل خانہ

میں ایک آدمی ہے جو خواب کی تعبیر دیا کرتا ہے مجھے اس کے پاس جانے کی اجازت دیدیجئے، بادشاہ نے اس کو یوسف کے پاس بھیجدیا، حضرت ابن عباس نے فرمایا قید خانہ شہر کے اندر نہیں تھا۔

معجزہ کا اظہار ضروری ہے:

ولی پر اپنی کرامت کا اظہار ضروری نہیں مگر نبی پر اپنے معجزہ اور کرامت کا اظہار ضروری ہے کیونکہ معجزہ اور کرامت نبوت کی دلیل ہے اور جس طرح نبوت کا اعلان ضروری ہے اسی طرح دلائل نبوت کا اظہار اور اعلان بھی واجب اور ضروری ہے اس لئے حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب کی تعبیر سے پہلے اپنے معجزہ اور کرامت کو اس طرح بیان فرمایا، لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهِ إِلَّا نَبَّأْتُكُمَا بِتَأْوِيلِهِ قَبْلَ أَنْ يَأْتِيَكُمَا تا کہ دلیل نبوت بیان کرنے کے بعد ان کو توحید اور ملت ابراہیمی کے اتباع کی دعوت دے سکیں۔ (معارف کاندھلویؒ)

احکام ومسائل

آیات مذکورہ سے بہت سے احکام ومسائل اور فوائد وہدایات حاصل ہوتے ہیں ان میں غور کیجئے۔

پہلا مسئلہ: یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام جیل میں بھیجے گئے جو مجرموں اور بدمعاشوں کی بستی ہوتی ہے، مگر یوسف علیہ السلام نے ان کے ساتھ بھی حسن اخلاق، حسن معاشرت کا وہ معاملہ کیا جس سے یہ سب گرویدہ ہوگئے جس سے معلوم ہوا کہ مصلحین کے لئے لازم ہے کہ مجرموں، خطا کاروں سے شفقت وہمدری کا معاملہ کرکے ان کو اپنے سے مانوس ومربوط کریں، کسی قدم پر منافرت کا اظہار نہ ہونے دیں۔

دوسرا مسئلہ: آیت کے جملے إِنَّا نَرَاكَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ سے یہ معلوم ہوا کہ تعبیر خواب ایسے ہی لوگوں سے دریافت کرنا چاہیے جن کے نیک صالح اور ہمدرد ہونے پر اعتماد ہو۔

تیسرا مسئلہ: یہ معلوم ہوا کہ حق کی دعوت دینے والوں اور اصلاح خلق کی خدمت کرنے والوں کا طرز عمل یہ ہونا چاہیے کہ پہلے اپنے حسن اخلاق اور علمی وعملی کمالات کے ذریعہ خلق اللہ پر اپنا اعتماد قائم کریں خواہ اس میں ان کو کچھ اپنے کمالات کا اظہار بھی کرنا پڑے، جیسا یوسف علیہ السلام نے اس موقع پر اپنا معجزہ بھی ذکر کیا اور اپنا خاندان نبوت کا ایک فرد ہونا بھی ظاہر کیا۔ یہ اظہار کمال اگر اصلاح خلق کی نیت سے ہو اپنی ذاتی بڑائی ثابت کرنے کیلئے نہ ہو، تو یہ وہ تزکیہ نفس نہیں جس کی ممانعت قرآن کریم میں آئی ہے، فَلَا تُزَكُّوا أَنْفُسَكُمْ، یعنی اپنی پاک نفسی کا اظہار نہ کرو۔ (تفسیر مظہری)

چوتھا مسئلہ: تبلیغ وارشاد کا ایک اہم اصول یہ بتلایا گیا ہے کہ داعی اور مصلح کا فرض ہے کہ ہر وقت ہر حال میں اپنے وظیفہ دعوت وتبلیغ کو سب کاموں سے مقدم رکھے، کوئی اس کے پاس کسی کام کے لئے آئے وہ اپنے اصلی کام کو نہ بھولے۔

پانچواں مسئلہ: بھی اسی ارشاد واصلاح سے متعلق ہے کہ حکمت کے ساتھ وہ بات کہی جائے جو مخاطب کے دلنشین ہو سکے۔

چھٹا مسئلہ: اس سے یہ ثابت ہوا کہ جو معاملہ مخاطب کے لئے تکلیف دہ اور ناگوار ہو اور اس کا اظہار ضروری ہو تو مخاطب کے سامنے جہاں تک ممکن ہو ایسے انداز سے ذکر کیا جائے کہ اس کو تکلیف کم سے کم پہنچے۔

ساتواں مسئلہ: یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام نے جیل سے رہائی کے لئے اس قیدی سے کہا کہ جب بادشاہ کے پاس جاؤ تو میرا بھی ذکر کرنا، کہ وہ بے قصور جیل میں ہے، اس سے معلوم ہوا کہ کسی مصیبت سے خلاصی کیلئے کسی شخص کو کوشش کا واسطہ بنانا توکل کے خلاف نہیں۔ **آٹھواں مسئلہ:** یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کو اپنے برگزیدہ پیغمبروں کے لئے ہر جائز کوشش بھی پسند نہیں، کہ کسی انسان کو اپنی خلاصی کا ذریعہ بنائیں، ان کے اور حق تعالیٰ کے درمیان کوئی واسطہ نہ ہونا ہی انبیاء کا اصلی مقام ہے۔ (معارف مفتی صاحب)

وَقَالَ الْمَلِكُ إِنِّي أَرَىٰ سَبْعَ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ
اور کہا بادشاہ نے میں خواب میں دیکھتا ہوں سات گائیں
يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَسَبْعَ سُنْبُلَاتٍ
موٹی اُن کو کھاتی ہیں سات گائیں دُبلی اور سات
خُضْرٍ وَأُخَرَ يَابِسَاتٍ ۖ
بالیں ہری اور دوسری سوکھی

وہ سوکھی بالیں ہری بالوں پر لپٹتی ہیں اور انہیں خشک کردیتی ہیں یہ خواب بادشاہ مصر "ریان بن الولید" نے دیکھا۔ جو آخر کار حضرت یوسف علیہ السلام کی رہائی اور ظاہری عروج کا سبب بنا۔ یوسف علیہ السلام کے قصہ میں جابجا اس پر متنبہ فرمایا ہے کہ خدا جب کوئی بات چاہتا ہے غیر متوقع طریقہ سے اس کے ایسے اسباب فراہم کردیتا ہے جن کی طرف آدمی کا خیال نہیں جاتا۔

يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ أَفْتُونِي فِي رُؤْيَايَ إِنْ كُنْتُمْ
اے دربار والو تعبیر کہو مجھ سے میرے خواب کی اگر ہو تم
لِلرُّؤْيَا تَعْبُرُونَ ﴿٤٣﴾
خواب کی تعبیر دینے والے

یعنی اگر اس فن میں کچھ مہارت رکھتے ہو تو میرے خواب کی تعبیر بتلاؤ۔

قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ۚ وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِيْلِ
بولے یہ خیالی خواب ہیں اور ہم کو ایسے
الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾
خوابوں کی تعبیر معلوم نہیں

درباری تعبیر نہ بتا سکے:

معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ اس فن سے جاہل تھے۔ اپنے جہل کا صاف لفظوں میں اقرار کرنے سے شرمائے تو یوں بات بنادی کہ یہ کوئی خواب نہیں، محض پریشان خیالات ہیں، بسا اوقات انسان کو نیند میں ایسی صورتیں تخیل ہو جاتی ہیں جو لائق اعتناء نہیں، نہ ہم ایسے خوابوں کی تعبیر کا علم رکھتے ہیں۔ کیونکہ وہ علم تعبیر رؤیا کے اصول کے ماتحت نہیں ہوتے۔ (تفسیر عثمانی)

وَقَالَ الَّذِىْ نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ
اور بولا وہ جو بچا تھا اُن دونوں میں سے اور یاد آ گیا
اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِيْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ ﴿۴۵﴾
اُس کو مدت کے بعد میں بتاؤں تم کو اُس کی تعبیر سو تم مجھ کو بھیجو

اب ساقی کو یوسفؑ یاد آئے:

اب خواب کے سلسلے میں ساقی کو جو قید سے چھوٹ کر آیا تھا مدت کے بعد حضرت یوسفؑ یاد آئے اس نے بادشاہ اور اہل دربار سے کہا کہ اگر مجھے ذرا جانے اجازت ہو تو میں اس خواب کی تعبیر لاسکتا ہوں۔ قید خانہ میں ایک مقدس بزرگ فرشتہ صورت موجود ہے جو فن تعبیر کا ماہر ہے (ممکن ہے اس خواب کا قصہ بھی ذکر کیا ہو) میں تعبیر لینے کے لئے اس کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں۔ چنانچہ اجازت دی گئی۔ اس نے یوسف علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر وہ عرض کیا جو آگے آتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ
جا کر کہا اے یوسف اے سچے

پیغمبروں کی صداقت:

اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ کہنے سے یہ غرض تھی کہ آپ مجسم سچ ہیں۔ جو بات کبھی آپ کی زبان سے نکلی سچ ہو کر رہی امید ہے جو تعبیر اس خواب کی دینگے ہو بہو پوری ہو کر رہیگی۔ یہ لفظ بتلا رہا ہے کہ انبیا علیہم السلام کے صدق و دیانت کا نقش کس طرح عام و خاص کے قلوب پر بیٹھ جاتا ہے۔

يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ ،یعنی اس شخص نے جیل خانہ پہنچ کر حضرت یوسف علیہ السلام سے واقعہ کا اظہار اس طرح شروع کیا کہ پہلے یوسف علیہ السلام کے صدیق یعنی قول و فعل میں سچا ہونے کا اقرار کیا، پھر درخواست کی کہ مجھے ایک خواب کی تعبیر بتلائیے، خواب یہ ہے کہ بادشاہ نے یہ دیکھا ہے کہ سات بیل فربہ تندرست ہیں جن کو دوسرے سات بیل کھا رہے ہیں اور یہ کھانے والے بیل لاغر کمزور ہیں، نیز یہ دیکھا کہ سات خوشے گندم کے سرسبز ہرے بھرے ہیں اور سات خشک ہیں۔ (معارف مفتی اعظم)

اَفْتِنَا فِىْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ
حکم دے ہم کو اس خواب میں
سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ
سات گائیں موٹی اُن کو کھائیں سات دُبلی
وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ ۙ لَّعَلِّىْٓ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ
اور سات بالیں ہری اور دوسری سوکھی تا کہ لے جاؤں میں لوگوں
لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۶﴾
کے پاس شاید اُن کو معلوم ہو

خواب کی تفصیل:

یعنی خواب کی تعبیر اور اس کے ذریعہ سے آپ کی قدر و منزلت معلوم ہو۔ (تفسیر عثمانی)

اس شخص نے خواب بیان کرنے کے بعد کہا،

لَعَلِّىْٓ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُوْنَ. یعنی آپ تعبیر بتلا دیں گے تو ممکن ہے کہ میں ان لوگوں کے پاس جاؤں اور ان کی تعبیر بتلاؤں اور ممکن ہے کہ وہ اس طرح آپ کے فضل و کمال سے واقف ہو جائیں۔

تفسیر مظہری میں ہے کہ واقعات کی جو صورتیں عالم مثال میں ہوتی ہیں وہی انسان کو خواب میں نظر آتی ہیں، اس عالم میں ان صورتوں کے خاص معنی ہوتے ہیں، فن تعبیر خواب کا سارا مدار اس کے جاننے پر ہے کہ فلاں صورت مثالی سے اس عالم میں کیا مراد ہوتی ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو یہ فن مکمل عطا فرمایا تھا، آپ نے خواب سن کر سمجھ لیا کہ سات بیل فربہ

اور سات خوشے ہرے بھرے سے مراد سات سال ہیں جن میں پیداوار حسب دستور خوب ہوگی، کیونکہ بیل کو زمین کے ہموار کرنے اور غلہ اگھانے میں خاص دخل ہے اسی طرح سات بیل لاغر کمزور اور سات خشک خوشوں سے مراد یہ ہے کہ پہلے سات سال کے بعد سات سال سخت قحط کے آئیں گے، اور کمزور سات بیلوں کے فربہ بیلوں کے کھالینے سے یہ مراد ہے کہ پچھلے سات سال میں جو ذخیرہ غلہ وغیرہ کا جمع ہوگا وہ سب ان قحط کے سالوں میں خرچ ہوجائے گا صرف بیج کے لئے کچھ غلہ بچے گا۔

بادشاہ کے خواب میں تو بظاہر اتنا ہی معلوم ہوتا تھا کہ سات سال اچھی پیداوار کے ہونگے پھر سات سال قحط کے، مگر حضرت یوسف علیہ السلام نے اس پر ایک اضافہ یہ بھی بیان فرمایا کہ قحط کے سال کے بعد پھر ایک سال خوب بارش اور پیداوار کا ہوگا، اس کا علم یوسف علیہ السلام کو یا تو اس سے ہوا کہ جب قحط کا سال کل سات ہی ہیں تو عادۃ اللہ کے مطابق آٹھواں سال بارش اور پیداوار کا ہوگا، اور حضرت قتادہؒ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی یوسف علیہ السلام کو اس پر مطلع کردیا، تاکہ تعبیر خواب سے بھی کچھ زیادہ خبر ان کو پہنچے جس سے یوسف علیہ السلام کا فضل و کمال ظاہر ہوکر ان کی رہائی کا سبب بنے، اور اس پر مزید یہ ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے صرف تعبیر خواب ہی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اس کے ساتھ ایک حکیمانہ اور ہمدردانہ مشورہ بھی دیا، وہ یہ کہ پہلے سات سال میں جو زیادہ پیداوار ہو اس کو گندم کے خوشوں ہی میں محفوظ رکھنا، تاکہ گندم کو پرانا ہونے کے بعد کیڑا نہ لگ جائے یہ تجربہ کی بات ہے کہ جب تک غلہ خوشہ کے اندر رہتا ہے غلہ کو کیڑا نہیں لگتا۔ (معارف مفتی صاحب)

قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا ۚ فَمَا
کہا تم کھیتی کرو گے سات برس جم کر سو جو کاٹو
حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖٓ اِلَّا قَلِيْلًا
اُس کو چھوڑ دو اُس کی بال میں مگر تھوڑا سا
مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ﴿٤٧﴾ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ
جو تم کھاؤ پھر آئینگے اُس کے بعد
سَبْعٌ شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ
سات برس سختی کے کھا جائینگے جو رکھا تم نے
لَهُنَّ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ﴿٤٨﴾ ثُمَّ يَاْتِيْ
اُس کے واسطے مگر تھوڑا سا جو روک رکھو گے بیج کے واسطے پھر آئے گا

مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ
اِس کے پیچھے ایک برس اُس میں مینہ برسے
النَّاسُ وَفِيْهِ يَعْصِرُوْنَ ﴿٤٩﴾
گا لوگوں پر اور اس میں رس نچوڑینگے

بادشاہ کے خواب کی تعبیر:

یوسف علیہ السلام نے تعبیر بتلانے میں دیر نہ کی نہ کوئی شرط لگائی، نہ اس شخص کو شرمندہ کیا کہ تجھ کو اتنی مدت کے بعد اب میرا خیال آیا۔ اس سے انبیاء علیہم السلام کے اخلاق و مروت کا اندازہ ہوتا ہے۔ پھر وہ صرف خواب کی تعبیر مانگتا تھا۔ آپ نے تین چیزیں عطا فرمائیں۔ تعبیر، تدبیر، تبشیر، آپ کے کلام کا حاصل یہ تھا کہ سات موٹی گائیں اور سات ہری بالیں سات برس ہیں۔ جن میں متواتر خوشحالی رہیگی، کھیتوں میں خوب پیداوار ہوگی، حیوانات و نباتات خوب بڑھیں گے۔ اس کے بعد سات سال قحط ہوگا جس میں سارا پچھلا اندوختہ کھا کر ختم کر ڈالو گے۔ صرف آئندہ تخم ریزی کے لئے کچھ تھوڑا سا باقی رہ جائیگا۔ یہ سات سال دبلی گائیں اور سوکھی بالیں ہیں جو موٹی گائیوں اور ہری بالوں کو ختم کردینگی۔ تعبیر بتلانے کے دوران میں حضرت یوسفؑ نے از راہ شفقت و ہمدردی خلائق ایک تدبیر بھی تلقین فرمادی کہ اول سات سال میں جو پیداوار ہو اسے بڑی حفاظت سے رکھو اور کفایت شعاری سے اٹھاؤ۔ کھانے کے لئے جس قدر غلہ کی ضرورت ہو اسے الگ کرلو اور تھوڑا تھوڑا احتیاط سے کھاؤ۔ باقی غلہ بالوں میں رہنے دو تا اس طرح کیڑے وغیرہ سے محفوظ رہ سکے۔ اور سات سال کی پیداوار چودہ سال تک کام آئے۔ ایسا نہ کرو گے تو قحط کا مقابلہ کرنا دشوار ہوگا۔ یہ تعبیر و تدبیر بتلانے کے بعد انہیں بشارت سنائی جو غالباً آپ کو وحی سے معلوم ہوئی ہوگی یعنی سات سال قحط رہنے کے بعد جو سال آئیگا اس میں حق تعالیٰ کی طرف سے فریاد رسی ہوگی اور خوب مینہ برسے گا۔ کھیتی باڑی، پھل میوے نہایت افراط سے پیدا ہونگے، جانوروں کے تھن دودھ سے بھر جائینگے۔ انگور وغیرہ نچوڑنے کے قابل چیزوں سے لوگ شراب کشید کرینگے۔ یہ آخری بات سائل کے حسب حال فرمائی۔ کیونکہ وہ یہی کام کرتا تھا۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت یوسفؑ نے اول سات موٹی اور دبلی گایوں اور سات سبز اور سات خشک بالیوں کی مراد بیان کی اور دبلی گایوں کے موٹی گایوں کو کھا جانے اور خشک بالوں کے سبز بالوں سے لپٹ کر ان کو بھی خشک کردینے کا تعبیری مطلب بیان کیا پھر کال کے ختم ہونے اور ارزانی کا سال آنے کی بشارت دی۔ (بشارت کا تعلق اگرچہ خواب کی تعبیر سے نہ تھا مگر آپ نے بشارت اس

لئے دی) کہ قحط کے سالوں کی تعداد پیداوار کے سالوں سے نہ بڑھ جائے (اور اس طرح تعبیر میں غلطی ہوجائے کیونکہ دبلی گایوں اور خشک بالوں کی تعداد بھی سات ہی تھی اگر پندرھواں سال بھی قحط کا ہوتا تو سات سے ایک عدد بڑھ جاتا) بیضاوی نے لکھا ہے شاید آپ کو پیداوار اور ارزانی کا سال آنے کی اطلاع وحی سے ہوگئی ہو یا اپنی فراست ایمانی سے سمجھ لیا ہو کہ اللہ کا دستور اور ضابطہ یہی ہے کہ تنگی کے بعد فراخی عطا فرماتا ہے اس لئے کال کے بعد پیداوار کا سال ضرور آئے گا۔ (تفسیر مظہری)

مقام نبوت: اس ایک واقعہ میں مقام نبوت کی طرف بھی اشارہ مضمر ہے کہ ایک نبی کو منجانب اللہ کس درجہ کا تدبر، قوت فیصلہ، ضبط وکنٹرول اور نظم ونسق کا بہترین سلیقہ عطا ہوتا ہے کہ دوسروں کی حکومت میں جہاں وہ خود اجنبی اور اس کا مذہب مسلک اور طریقہ فکر سب کچھ اجنبی۔ مگر قلمدان وزارت اگر اسکے سپرد ہوتا ہے تو اپنی صلاحیتوں کے وہ جوہر دکھاتا ہے جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں اگر کہیں نظر آسکتی ہے تو صرف کسی نبی کے دامن عصمت کے پاک تاروں میں الجھی ہوئی۔ ورنہ کہیں نظر نہیں آسکتی۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُ

اور کہا بادشاہ نے لے آؤ اُس کو میرے پاس، پھر جب پہنچا اُس کے

الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ

پاس بھیجا ہوا آدمی کہا لوٹ جا اپنے خاوند (مالک) کے پاس اور پوچھ

مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ۭ

اُس سے کیا حقیقت ہے اُن عورتوں کی جنہوں نے کاٹے تھے ہاتھ اپنے

دربار میں حضرت یوسف علیہ السلام کی طلبی:

بادشاہ کچھ تو پہلے ہی ساقی کے تذکرے سے حضرت یوسفؑ کا معتقد ہوگیا تھا۔ اب جو ایسی موزوں و دلنشین تعبیر اور رعایا کی ہمدردی کی تدبیر سنی تو ان کے علم وفضل، عقل ودانش اور حسن اخلاق کا سکہ اس کے دل پر بیٹھ گیا۔ فوراً حکم دیا کہ ایسے شخص کو میرے پاس لاؤ، تا اس کی زیارت سے بہرہ اندوز ہوں اور اس کے مرتبہ اور قابلیت کے موافق عزت کریں۔

یوسفؑ نے پہلے اپنے معاملہ کی صفائی طلب کی:

قاصد پیام شاہی لے کر حضرت یوسف علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مگر یوسفؑ کی نظر میں اپنی دینی واخلاقی پوزیشن کی برتری اور صفائی اعلیٰ سے اعلیٰ دنیوی عزت ووجاہت سے زیادہ مہم تھی۔ آپ جانتے تھے کہ پیغمبر خدا کی نسبت لوگوں کی ادنی بدگمانی بھی ہدایت وارشاد کے کام میں بڑی بھاری رکاوٹ ہے۔ اگر آج میں بادشاہی فرمان کے موافق چپ چپاتے قید خانہ سے نکل گیا اور جس جھوٹی تہمت کے سلسلہ میں سالہا سال قید وبند کی مصائب اٹھائیں اس کا قطعی طور پر استیصال نہ ہوا تو بہت ممکن ہے کہ بہت سے ناواقف لوگ میری عصمت کے متعلق تردد اور شبہ میں پڑے رہ جائیں اور حاسدین کچھ زمانہ کے بعد ان ہی بے اصل اثرات سے فائدہ اٹھا کر کوئی اور منصوبہ میرے خلاف کھڑا کردیں۔ ان مصالح پر نظر کرتے ہوئے آپ نے حکم شاہی کے امتثال میں جلدی نہ کی بلکہ نہایت صبر واستقلال کا مظاہرہ کرتے ہوئے قاصد کو کہا کہ تو اپنے مالک (بادشاہ) سے واپس جاکر دریافت کرکہ تجھ کو ان عورتوں کے قصہ کی کچھ حقیقت معلوم ہے جنہوں نے دعوت کے موقع پر اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے۔ حضرت یوسفؑ کو ان عورتوں کے ناموں کی تفصیل کہاں معلوم ہوگی۔ یہ خیال کیا ہوگا کہ ایسا واقعہ ضرور عام شہرت حاصل کر چکا ہے۔ اس لئے واقعہ کے ایک ممتاز جزء (ہاتھ کاٹنے) کو ظاہر کرکے بادشاہ کو توجہ دلائی کہ اس مشہور ومعروف قصہ کی تفتیش وتحقیق کرے۔ غالباً اب وہ عورتیں بتلادیں گی کہ تقصیر کس کی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیحین کی حدیث میں حضرت یوسفؑ کے کمال صبر وتحمل کی اس طرح داد دی ہے۔ "لو لبثت فی السجن مالبث یوسف لاجبت الداعی" (اگر میں اتنی مدت قید میں رہتا جتنا یوسف رہے تو بلانے والے کی اجابت کرتا یعنی فوراً ساتھ ہو لیتا) محققین کہتے ہیں کہ اس میں حضرت یوسفؑ کے صبر وتحمل کی تعریف اور لطیف رنگ میں اپنی عبودیت کاملہ کا اظہار ہے۔ ہم نے اس مضمون کی تفصیل شرح صحیح مسلم میں کی ہے۔ یہاں اختصار کی وجہ سے زیادہ نہیں لکھ سکتے۔ (تفسیر عثمانی)

کہا اپنے آقا کے پاس لوٹ کر جاؤ اور اس سے پوچھو کہ جن عورتوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے ان کا کیا حال ہے۔ (کچھ تم کو بھی پتہ ہے کیا واقعہ ہوا تھا)۔

مسئلہ: اس آیت سے یہ مسئلہ استنباط کیا جاسکتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو آدمی کو اپنے اوپر سے تہمت کو دفع کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خصوصاً اگر پیشوا اور مقتدا ہو (تو اس کیلئے تو بہت ہی ضروری ہے کہ لگائی گئی تہمت سے اپنی برأت ثابت کرے۔ آپ نے عزیز کی بیوی کا نام لے کر ذکر نہیں کیا ایسا محض ادب اور احترام کے پیش نظر کیا (ورنہ اصل مجرم تو وہی تھی۔)

یوسف علیہ السلام کا صبر اور کرم:

اسحاق بن راہویہ نے مسند میں اور طبرانی نے معجم میں نیز ابن مردویہ نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے اپنے بھائی یوسف کے صبر اور کرم پر تعجب ہے اللہ ان کی مغفرت

کرے کہ ان کے پاس خواب کی تعبیر لینے آدمی پہنچا (اور انہوں نے تعبیر دے دی) اگر میں (ان کی جگہ) ہوتا تو جب تک جیل خانے سے باہر نہ آجاتا ایسا نہ کرتا۔ اور ان کے صبر اور کرم پر مجھے (اس لئے بھی) تعجب ہے اللہ ان کی مغفرت کرے کہ ان کے پاس رہائی کا حکم لے کر آدمی پہنچا اور انہوں نے باہر نکلنے سے انکار کر دیا اور اپنا عذر بیان کر دیا اگر میں (ان کی جگہ) ہوتا تو فوراً دروازے کی طرف دوڑ پڑتا۔ اگر ایک بات یوسف کے منہ سے نہ نکل جاتی تو وہ قید خانہ میں (مزید) سالوں کے لئے نہ رہتے انہوں نے اللہ کے علاوہ دوسروں سے مصیبت دور کرنے کی خواہش کی۔

عبدالرزاق اور ابن جریر نے اپنی تفسیروں میں عکرمہ کی روایت سے مرسلاً نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے یوسف اور ان کے کرم وصبر پر تعجب ہے اللہ ان کو بخشے، جب ان سے موٹی اور دبلی گایوں کی تعبیر پوچھی گئی (تو انہوں نے بغیر شرط پیش کئے تعبیر دیدی) اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو جب تک قید سے باہر نکلنے کی شرط نہ کر لیتا تعبیر نہ بتاتا اور مجھے تعجب ہے کہ جب قاصد (بادشاہ کا پیام طلب لے کر) ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے کہا اپنے آقا کے پاس لوٹ کر جاؤ اگر میں ان کی جگہ ہوتا اور اتنی مدت مجھے جیل خانہ کے اندر رہنا پڑتا جتنی مدت وہ رہے تو میں فوراً طلب کر قبول کر لیتا اور آگے آگے دروازے پر پہنچ جاتا اور عذر معذرت کا طلب گار نہ ہوتا۔ بلاشبہ وہ صاحب حلم اور بڑے بردبار تھے۔ اصل حدیث صحیحین میں مختصر آئی ہے۔ (تفسیر مظہری)

اِنَّ رَبِّىۡ بِكَيۡدِهِنَّ عَلِيۡمٌ ﴿۵۰﴾
میرا رب تو اُن کا فریب سب جانتا ہے

حضرت یوسفؑ نے ''سب کا فریب'' فرمایا، اس واسطے کہ ایک کا فریب تھا اور سب اس کی مددگار تھیں اور اصل فریب والی کا نام شاید حق پرورش کی وجہ سے نہیں لیا۔ حیاء کی وجہ سے گول مول فرمایا کیونکہ جانتے تھے کہ اصل حقیقت آخر کھل کر رہے گی۔ کذافی الموضح۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت یوسف علیہ السلام کی فضیلت:

اس موقع پر صحیح بخاری اور جامع ترمذی میں بروایت حضرت ابوہریرہؓ ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ اگر میں اتنی مدت جیل میں رہتا جتنا یوسف علیہ السلام رہے ہیں اور پھر مجھے رہائی کیلئے بلایا جاتا تو فوراً قبول کر لیتا۔

اور امام طبریؒ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ یوسفؑ کا صبر وتحمل اور مکارم اخلاق قابل تعجب ہیں جب ان سے جیل میں بادشاہ کے خواب کی تعبیر دریافت کی گئی اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو تعبیر بتلانے میں یہ شرط لگاتا کہ پہلے جیل سے نکالو پھر تعبیر بتلاؤں گا پھر جب قاصد رہائی کا پیغام لایا اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو فوراً جیل کے دروازے کی طرف چل دیتا۔ (قرطبی)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ تمام انبیاء میں افضل ہیں مگر کسی جزوی عمل میں کسی دوسرے پیغمبر کی افضلیت اس کے منافی نہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی افضلیت:

اس کے علاوہ جیسا تفسیر قرطبی میں فرمایا گیا ہے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کے طریق کار میں ان کے صبر وتحمل اور مکارم اخلاق کا عظیم الشان ثبوت ہے اور وہ اپنی جگہ قابل تعریف ہے لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طریق کار کو اپنی طرف منسوب فرمایا تعلیم امت اور خیر خواہی عوام کیلئے وہی مناسب اور افضل ہے کیونکہ بادشاہوں کے مزاج کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا ایسے موقع پر شرطیں لگانا یا دیر کرنا عام لوگوں کے لئے مناسب نہیں ہوتا۔ احتمال ہے کہ بادشاہ کی رائے بدل جائے اور پھر یہ جیل کی مصیبت بدستور قائم رہے یوسف علیہ السلام کو تو بوجہ رسول خدا ہونے کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ علم بھی ہوسکتا ہے کہ اس تاخیر سے کچھ نقصان نہیں ہوگا، لیکن دوسروں کو تو یہ درجہ حاصل نہیں، رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج ومذاق میں عامہ خلائق کی بہبود کی اہمیت زیادہ تھی، اس لئے فرمایا کہ مجھے یہ موقع ملتا تو دیر نہ کرتا۔ واللہ اعلم۔ (معارف مفتی صاحب)

قَالَ مَا خَطۡبُكُنَّ اِذۡ رَاوَدْتُّنَّ يُوۡسُفَ
کہا بادشاہ نے عورتوں کو کیا حقیقت ہے تمہاری جب تم نے پھسلایا یوسف کو
عَنۡ نَّفۡسِهٖ‌ؕ
اُسکے نفس کی حفاظت سے،

بادشاہ کی عورتوں سے تفتیش:

بادشاہ نے دریافت کرنے کا ایسا عنوان اختیار کیا گویا وہ پہلے سے خبر رکھتا ہے تا یہ دیکھ کر انہیں جھوٹ بولنے کی ہمت نہ ہو۔ نیز یوسف علیہ السلام کی استقامت وصبر کا اثر پڑا ہوگا کہ بدون اظہار برأت کے جیل سے نکلنا گوارا نہیں کرتے اور '' اِنَّ رَبِّىۡ بِكَيۡدِهِنَّ عَلِيۡمٌ '' کہہ کر ان کے کید کا اظہار فرما رہے ہیں۔ ادھر ساقی وغیرہ نے واقعات سنائے ہونگے ان سے بھی یوسف کی نزاہت اور عورتوں کے مکائد کی تائید ملی ہوگی۔ (تفسیر عثمانی)

قُلۡنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمۡنَا عَلَيۡهِ مِنۡ
بولیں حاشا للہ ہم کو معلوم نہیں اُس پر کچھ

سُوْٓءٍ ؕ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْـٰٔنَ
برائی بولی عورت عزیز کی اب
حَصْحَصَ الْحَقُّ ۡ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ
کھل گئی سچی بات میں نے پھسلایا تھا اُسکو اُس کے
نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۵۱﴾
جی سے اور وہ سچا ہے

سب عورتوں نے یوسفؑ کی پاکدامنی کا اقرار کرلیا:

سب عورتوں کی متفقہ شہادت کے بعد خود زلیخا نے بھی صاف اقرار کرلیا کہ قصور میرا ہے۔ یوسفؑ بالکل سچے ہیں بیشک میں نے ان کو اپنی جانب مائل کرنا چاہا تھا۔ لیکن وہ ایسے کاہے کو تھے کہ میرے داؤ میں آجاتے۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت یوسف علیہ السلام نے تحقیقات میں عزیز مصر کی بیوی کا نام نہ لیا تھا مگر اللہ جل شانہ جب کسی کو عزت عطا فرماتے ہیں تو خود بخود لوگوں کی زبانیں ان کے صدق وصفائی کے لئے کھل جاتی ہیں اس موقع پر عزیز کی بیوی نے ہمت کر کے اظہار حق کا اعلان خود کردیا، یہاں تک جو حالات وواقعات یوسف علیہ السلام کے آپ نے سنے ہیں ان میں بہت سے فوائد اور مسائل اور انسانی زندگی کے لئے اہم ہدایتیں پائی جاتی ہیں۔

ان میں سے آٹھ مسائل پہلے بیان ہو چکے ہیں مذکور الصدر آیات سے متعلق مزید مسائل اور ہدایات یہ ہیں:

نواں مسئلہ: یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مخصوص اور مقبول بندوں کے مقاصد پورا کرنے کیلئے خود ہی غیبی تدابیر سے انتظام فرماتے ہیں، ان کو کسی مخلوق کا ممنون احسان کرنا پسند نہیں فرماتے یہی وجہ ہوئی کہ یوسف علیہ السلام نے جو رہا ہونے والے قیدی سے کہا تھا کہ بادشاہ سے میرا ذکر کرنا اس کو تو بھلا دیا گیا، اور پھر پردہ غیب سے ایک تدبیر ایسی کی گئی جس میں یوسف علیہ السلام کسی کے ممنون بھی نہ ہوں، اور پوری عزت وشان کے ساتھ جیل کی رہائی کا مقصد بھی پورا ہوجائے۔

دسواں مسئلہ: وہ اپنا مطلب تعبیر خواب کا لے کر حاضر ہوا تو عام انسانی عادت کا تقاضا تھا کہ اس کو ملامت کرتے اس پر خفا ہوتے کہ تجھ سے اتنا کام نہ ہوسکا مگر یوسف علیہ السلام نے اپنے پیغمبرانہ اخلاق کا اظہار فرمایا، کہ اس کو ملامت تو کیا اس قصہ کا ذکر تک نہیں بھی کیا۔ (ابن کثیر وقرطبی)

گیارھواں مسئلہ: اس میں یہ ہے کہ جس طرح انبیاء علیہم السلام اور علماء امت کا یہ فریضہ ہے کہ وہ لوگوں کی آخرت درست کرنے کی فکر کریں ان کو ایسے کاموں سے بچائیں جو آخرت میں عذاب بنیں گے، اسی طرح ان کو مسلمانوں کے معاشی حالات پر بھی نظر رکھنا چاہیے کہ وہ پریشان نہ ہوں۔

بارھواں مسئلہ: یہ ہے کہ عالم مقتداء کو اس کی بھی فکر رہنی چاہیے کہ اس کی طرف سے لوگوں میں بدگمانی پیدا نہ ہو، اگرچہ وہ بدگمانی سراسر غلط ہی کیوں نہ ہو، اس سے بھی بچنے کی تدبیر کرنا چاہیے۔ کیونکہ بدگمانی خواہ کسی جہالت یا کم فہمی ہی کے سبب سے ہو بہرحال ان کی دعوت وارشاد کے کام میں خلل انداز ہوتی ہے لوگوں میں اس کی بات کا وزن نہیں رہتا، (قرطبی)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تہمت کے مواقع سے بھی بچو، یعنی ایسے حالات اور مواقع سے بھی اپنے آپ کو بچاؤ جن میں کسی کو آپ پر تہمت لگانے کا موقع ہاتھ آئے یہ حکم تو عام مسلمانوں کے لئے ہے خواص اور علماء کو اس میں دوہری احتیاط لازم ہے، خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو تمام عیوب اور گناہوں سے معصوم ہیں، آپ نے بھی اس کا اہتمام فرمایا ایک مرتبہ ازواج مطہراتؓ میں سے ایک بی بی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ کی ایک گلی سے گذر رہی تھیں کوئی صحابی سامنے آگئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دور ہی سے بتلا دیا کہ میرے ساتھ فلاں بی بی ہیں، یہ اس لئے کیا کہ کہیں دیکھنے والے کو کسی اجنبی عورت کا شبہ نہ ہوجائے، اس موقع پر حضرت یوسف علیہ السلام نے جیل سے رہائی اور شاہی دعوت کا پیغام ملنے کے باوجود رہائی سے پہلے اس کی کوشش فرمائی کہ لوگوں کے شبہات دور ہوجائیں۔

تیرھواں مسئلہ: اس میں یہ ہے کہ جس شخص کے حقوق کسی کے ذمہ ہوں اور اس حیثیت سے وہ واجب الاحترام ہو، اگر ناگزیر حالات میں اس کے خلاف کوئی کاروائی کرنی بھی پڑے۔ تو اس میں بھی مقدور بھر حقوق واحترام کی رعایت کرنا شرافت کا مقتضی ہے جیسے یوسف علیہ السلام نے اپنی برأت کے لئے معاملہ کی تحقیقات کے واسطے عزیز یا اس کی بیوی کا نام لینے کے بجائے ان عورتوں کا ذکر کیا، جنہوں نے ہاتھ کاٹ لئے تھے، (قرطبی) کیونکہ مقصد اس سے بھی حاصل ہوسکتا تھا۔

چودھواں مسئلہ: مکارم اخلاق کی تعلیم ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھوں سات سال یا بارہ سال جیل خانہ کی تکلیف برداشت کرنی پڑی تھی، رہائی کے وقت ان سے کوئی انتقام لینا تو کیا اس کو بھی برداشت نہ کیا کہ ان کو کوئی ادنیٰ تکلیف ان سے پہنچے۔ (معارف مفتی صاحب)

ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ
یوسف نے کہا یہ اس واسطے کہ عزیز معلوم کرلیوے کہ میں نے اُسکی
وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ﴿۵۲﴾
چوری نہیں کی چھپ کر، اور یہ کہ اللہ نہیں چلاتا فریب دغابازوں کا

اس تحقیق وتفتیش کا مقصد:

یعنی اتنی تحقیق وتفتیش اس لئے کرائی کہ پیغمبرانہ عصمت و دیانت بالکل آشکارا ہوجائے اور لوگ معلوم کرلیں کہ خائنوں اور دغا بازوں کا فریب اللہ چلنے نہیں دیتا۔ چنانچہ عورتوں کا فریب نہ چلا۔ آخر حق حق ہوکر رہا۔ (تفسیر عثمانی)

یہ (باتیں یعنی قاصد کو جواب دیدینا اس کے ساتھ نہ جانا) میں نے اس لئے کیں کہ اس کو (یعنی عزیز کو) یقین کے ساتھ معلوم ہوجائے کہ میں نے اس کے پس پشت اس کی غیر موجودگی میں (اس کی آبرو میں) کوئی خیانت نہیں کی اور یہ بھی (معلوم ہوجائے) کہ اللہ خیانت کرنے والوں کے فریب کو چلنے نہیں دیتا۔ (تفسیر مظہری)

اول یہ کہ ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّىْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ یعنی یہ تاخیر میں نے اس کی کہ عزیز مصر کو یقین ہوجائے کہ میں نے اس کی غیر موجودگی میں اس کے حق میں کوئی خیانت نہیں کی

عزیز مصر کی یقین دہانی کی زیادہ فکر اس لئے ہوئی کہ یہ بہت بری صورت ہوگی کہ عزیز مصر کے دل میں میری طرف سے شبہات رہیں، اور پھر شاہی اعزاز کی وجہ سے وہ کچھ نہ کہہ سکیں، تو ان کو میرا اعزاز بھی سخت ناگوار ہوگا، اور اس پر سکوت ان کیلئے اور زیادہ تکلیف دہ ہوگا۔

کہ اگر اسی اشتباہ کی حالت میں یوسف علیہ السلام کو شاہی اعزاز مل جاتا تو دیکھنے والوں کو یہ خیال ہوسکتا تھا کہ ایسی خیانت کرنے والوں کو بڑے بڑے رتبے مل سکتے ہیں اس سے ان کے اعتقاد میں فرق آتا اور خیانت کی برائی دلوں سے نکل جاتی۔ (معارف مفتی اعظم)

عورتوں کے بیانات:

بادشاہ نے تحقیق کرنی شروع کی ان عورتوں کو جنہیں عزیز کی بیوی نے اپنے ہاں دعوت پر جمع کیا تھا اور خود اسے بھی دربار میں بلوایا۔ پھر ان تمام عورتوں سے پوچھا کہ ضیافت والے دن کیا گزری تھی، سب بیان کرو۔ انہوں نے جواب دیا کہ حاشاللہ یوسفؑ پر کوئی الزام نہیں، اس پر بے سرو پا تہمت ہے، واللہ ہم خوب جانتی ہیں کہ یوسفؑ میں کوئی بدی نہیں، اس وقت عزیز کی بیوی خود بھی بول اٹھی کہ اب حق ظاہر ہوگیا واقعہ کھل گیا، حقیقت نتھر آئی، مجھے خود اس امر کا اقرار ہے کہ واقعی میں نے ہی اسے پھنسانا چاہا تھا، اس نے جو بروقت کہا تھا کہ یہ عورت مجھے پھسلا رہی تھی اس میں وہ بالکل سچا ہے، میں اس کا اقرار کرتی ہوں اور اپنا قصور آپ بیان کرتی ہوں تا کہ میرے خاوند یہ بات بھی جان لیں کہ میں نے اس کی کوئی خیانت دراصل نہیں کی، یوسفؑ کی پاکدامنی کی وجہ سے کوئی شر اور برائی مجھ سے ظہور میں نہیں آئی، بدکاری سے اللہ تعالیٰ نے مجھے بچائے رکھا ہے۔ میرے اس اقرار سے اور واقعہ کے کھل جانے سے صاف ظاہر ہے اور میرے خاوند جان سکتے ہیں کہ میں برائی میں مبتلا نہیں ہوئی، یہ بالکل سچ ہے کہ خیانت کرنے والوں کی مکاریوں کو اللہ تعالیٰ فروغ نہیں دیتا ان کی دغابازی کوئی پھل نہیں لاتی۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِىْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ
اور میں پاک نہیں کہتا اپنے جی کو بے شک جی تو سکھلاتا ہے
بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّىْ ؕ اِنَّ رَبِّىْ غَفُوْرٌ
برائی مگر جو رحم کردیا میرے رب نے بے شک میرا رب بخشنے والا
رَّحِيْمٌ ﴿۵۳﴾
ہے مہربان

یوسفؑ نے فخر نہیں کیا:

چونکہ حضرت یوسف نے اپنی برأت پر بہت زیادہ زور دیا۔ ممکن تھا کوئی سطحی آدمی اس سے فخر وناز اور غرور و اعجاب کا شبہ کرنے لگتا اس لئے اپنی نزاہت کی حقیقت کھول دی کہ میں کوئی شیخی نہیں مارتا نہ پاک صاف رہنے میں اپنے نفس پر بھروسہ کرسکتا ہوں۔ محض خدا کی رحمت واعانت ہے جو کسی نفس کو برائی سے روکتی ہے۔ یہ ہی رحمت خصوصی عصمت انبیاء علیہم السلام کی کفیل وضامن ہے ورنہ نفس انسانی کا کام عموماً برائی کی ترغیب دینا تھا۔ خدا تعالیٰ کی خصوصی توفیق ودستگیری نہ ہوتی تو میرا نفس بھی دوسرے نفوس بشریہ کی طرح ہوتا۔ "اِنَّ رَبِّىْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ" سے اشارہ کردیا، کہ نفس امارہ جب توبہ کرکے "لوامہ" بن جائے تو خدا اس کی پچھلی تقصیرات معاف فرما دیتا ہے۔ بلکہ رفتہ رفتہ اپنی مہربانی سے "نفس مطمئنہ" کے درجہ تک پہنچا دیتا ہے۔

(تنبیہ)۔ حافظ ابن تیمیہؒ اور ابن کثیرؒ وغیرہ نے "ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّىْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِىْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ" تک زلیخا کو مقولہ قرار دیا ہے یعنی زلیخا نے "اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ" کا اقرار کرکے کہا کہ اس اقرار واعتراف سے عزیز کو یہ معلوم کرانا ہے کہ میں نے اس کی پیٹھ پیچھے کوئی بڑی خیانت نہیں کی بیشک یوسفؑ کو پھسلانا چاہا تھا مگر میری مراودت ان پر کارگر نہیں ہوئی۔ اگر میں نے مزید خیانت کی ہوتی تو ضرور اس کا پردہ فاش ہوکر رہتا۔ کیونکہ خدا خائنوں کے مکر وفریب کو چلنے نہیں دیتا۔ ہاں میں اپنے نفس کو بری نہیں کرتی، جتنی غلطی مجھ سے ہوئی اس کا اقرار کررہی ہوں۔ دوسرے آدمیوں کی طرح نفس کی شرارتوں سے میں بھی پاک نہیں۔ ان سے تو یوسفؑ جیسا پاکباز انسان ہی

محفوظ رہ سکتا ہے۔ جس پر خدا کی خاص مہربانی اور رحمت ہے۔ ابوحیان نے بھی اس کو زلیخا کا مقولہ قرار دیا ہے لیکن "لیعلم" اور "لم اخنه" کی ضمیریں بجائے عزیز کے یوسف کی طرف راجع کی ہیں۔ یعنی اپنی خطا کا صاف اقرار اس لئے کرتی ہوں کہ یوسف کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کی عدم موجودگی میں کوئی غلط بات نہیں کہی نہ اپنے جرم کو ان کی طرف منسوب کیا۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانیؒ)

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفۡسِىۡ اور میں (بذات خود) اپنے نفس کو پاک نہیں قرار دیتا۔ اس کلام میں تنبیہ ہے اس امر پر کہ اس سے میری مراد اپنی پاکیزگی کا اظہار اور بر خود غرور نہیں بلکہ اللہ کے انعام کو ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اس نے مجھے محفوظ رکھا اور عصمت کی توفیق دی اور بادشاہ کو میرا پیرو بنایا۔ عصمت و ادب کیلئے۔

عناصر اربعہ کی خاصیتیں:

اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَةٌ ۢ بِالسُّوۡٓءِ کیونکہ نفس تو (از خود) بری ہی بات بتاتا ہے نفس سے مراد ہے نفس حیوانی جو عناصر اربعہ (مادیہ) سے پیدا ہوتا ہے عالم امر کے لطائف میں سے قلب اور روح ہے قلب اور روح کا حامل یہی نفس ہے چونکہ اس نفس کا تولیدی مرکز عناصر اربعہ مادیہ ہیں اس لئے اس کا بالطبع میلان (حیوانی) خواہشات اور اخلاق رذیلہ کی جانب ہے غضب اور غرور عنصر نار کا مقتضی ہے کمینگی اور دناءت کا اقتضاء زمین کا ہے نیرنگی اور صبر کا فقدان پانی کی خصوصیت ہے دل لگی اور لہو و لعب ہوا کا خاص کرشمہ ہے۔ (تفسیر مظہری)

زلیخا کی ندامت:

پھر زلیخا (عزیز مصر کی بیوی) نے کہا کہ میں اپنے نفس کو پاک نہیں کہتی اور نہ اسے ہر قسم کے جرم سے بری کرتی ہوں نفس میں تو طرح طرح کے بدخیالات اور ناجائز تمنائیں آتی ہی ہیں اور وہ برائی کرنے پر اکساتا ہی رہتا ہے لہٰذا نفس کے دھوکے اور پھسلائے میں آکر میں نے یوسف کو اپنے پھندے میں لانا چاہا (مگر وہ نہ آئے) کیونکہ نفس برائی پر ابھارتا تو ہے مگر جس کو اللہ رحم فرما کر بچالے (اس کو نہیں ابھارتا) بیشک میرا رب بخشنے والا مہربان ہے۔ یہ قول عزیز مصر کی بیوی زلیخا کا ہی ہے یہی بات زیادہ مشہور اور قابل قبول ہے اور واقعہ کے سیاق و سباق سے بھی یہی بات زیادہ مناسبت رکھتی ہے اور معنوی لحاظ سے بھی یہی زیادہ مطابق معلوم ہوتی ہے اور اسی کو امام ماوردیؒ نے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے اور امام ابن تیمیہؒ نے تو اس کے بارے میں ایک مستقل کتاب تصنیف کی ہے اور اس میں اس قول کی پوری حمایت و تائید کی ہے لیکن بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ قول حضرت یوسفؑ کا ہے (یعنی ذلک لیعلم سے لیکر غفور رحیم تک) جس کا مطلب یہ ہوا کہ یوسفؑ نے کہا کہ "تاکہ عزیز مصر جان لے کہ اس کے پیٹھ پیچھے اس کی بیوی کے بارے میں میں نے اس کی کوئی خیانت نہیں کی۔ (تفسیر ابن کثیر)

عجیب ساتھی:

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے ایک سوال فرمایا کہ ایسے رفیق کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے جس کا حال یہ ہو کہ اگر تم اس کا اعزاز و اکرام کرو، کھانا کھلاؤ، کپڑے پہناؤ تو وہ تمہیں بلاء اور مصیبت میں ڈال دے، اور اگر تم اس کی توہین کرو، بھوکا ننگا رکھو تو تمہارے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرے؟ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے زیادہ برا تو دنیا میں کوئی ساتھی ہو ہی نہیں سکتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ تمہارا نفس جو تمہارے پہلو میں ہے وہ ایسا ہی ساتھی ہے (قرطبی) اور ایک حدیث میں ہے کہ تمہارا سب سے بڑا دشمن خود تمہارا نفس ہے جو تمہیں برے کاموں میں مبتلا کر کے ذلیل و خوار بھی کرتا ہے اور طرح طرح کی مصیبتوں میں بھی گرفتار کر دیتا ہے۔

نفس کا تقاضا:

بہرحال آیت مذکورہ اور ان روایات حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نفس انسانی برے ہی کاموں کا تقاضا کرتا ہے لیکن سورۂ قیامہ میں اسی نفس انسانی کا لوامہ کا لقب دے کر اس کو یہ اعزاز بخشا ہے کہ رب العزت نے اس کی قسم کھائی ہے لَآ اُقۡسِمُ بِيَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ وَلَآ اُقۡسِمُ بِالنَّفۡسِ اللَّوَّامَةِ، اور سورۂ والفجر میں اسی نفس انسانی کو نفس مطمئنہ کا لقب دے کر جنت کی بشارت دی ہے، يٰۤاَيَّتُهَا النَّفۡسُ الۡمُطۡمَئِنَّةُ ارۡجِعِىۡۤ اِلٰى رَبِّكِ، اس طرح نفس انسانی کو ایک جگہ لَاَمَّارَةٌ ۢ بِالسُّوۡٓءِ کہا گیا، دوسری جگہ لوامہ، تیسری جگہ مطمئنہ۔

نفس کی قسمیں:

توضیح اس کی یہ ہے کہ ہر نفس انسانی اپنی ذات میں تو لَاَمَّارَةٌ ۢ بِالسُّوۡٓءِ یعنی برے کاموں کا تقاضا کرنے والا ہے لیکن جب انسان خدا و آخرت کے خوف سے اس کے تقاضے کو پورا نہ کرے تو اس کا نفس لوامہ بن جاتا ہے، یعنی برے کاموں پر ملامت کرنے والا اور ان سے توبہ کرنیوالا جیسے عام صلحاء امت کے نفوس ہیں، اور جب کوئی انسان نفس کے خلاف مجاہدہ کرتے کرتے اپنے نفس کو اس حالت پر پہنچادے کہ برے کاموں کا تقاضا ہی اس میں نہ رہے، تو وہ نفس مطمئنہ ہو جاتا ہے۔ صلحاء امت کو یہ حال مجاہدہ و ریاضت سے حاصل ہو سکتا ہے اور پھر بھی اس حالت کا ہمیشہ قائم رہنا یقینی نہیں ہوتا اور انبیاء علیہم السلام کو خود بخود عطاء خداوندی سے ایسا ہی نفس مطمئنہ بغیر کسی سابقہ مجاہدہ کے نصیب ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ اسی حالت پر رہتا ہے، اس طرح نفس کی تین حالتوں کے اعتبار سے تین طرح کے افعال اس کی طرف منسوب کئے گئے ہیں۔

حضرت یوسفؑ کی دُعاء:

امام بغویؒ نے نقل کیا ہے کہ جب بادشاہ کا قاصد جیل میں یوسف علیہ السلام کے پاس دوبارہ پہنچا، اور بادشاہ کی دعوت پہنچائی تو یوسف علیہ السلام نے سب جیل والوں کے لئے دعاء کی، اور غسل کر کے نئے کپڑے پہنے، جب دربارشاہی پر پہنچے، تو یہ دعا کی **حسبی ربی من دنیای وحسبی ربی من خلقه عزجاره وجل ثنائه ولا اله غیره**۔ یعنی میری دنیا کے لئے میرا رب مجھے کافی ہے اور ساری مخلوق کے بدلے میرا رب میرے لئے کافی ہے جو اس کی پناہ میں آ گیا وہ بالکل محفوظ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔"

جب دربار میں پہنچے تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہو کر اسی طرح دعا کی اور عربی زبان میں سلام کیا، السلام علیکم ورحمۃ اللہ اور بادشاہ کیلئے دعا عبرانی زبان میں کی۔

بادشاہ اگرچہ بہت سی زبانیں جانتا تھا مگر عربی اور عبرانی زبانوں سے واقف نہ تھا، یوسف علیہ السلام نے بتلایا کہ سلام تو عربی زبان میں کیا گیا ہے اور دعا عبرانی زبان میں،

بادشاہ سے گفتگو:

اس روایت میں یہ بھی ہے کہ بادشاہ نے یوسف علیہ السلام سے مختلف زبانوں میں باتیں کی، یوسف علیہ السلام نے اس کو اسی زبان میں جواب دیا، اور عربی اور عبرانی کی دو زبانیں مزید سنائیں، جن سے بادشاہ واقف نہ تھا، اس واقعہ نے بادشاہ کے دل میں یوسف علیہ السلام کی غیر معمولی وقعت قائم کر دی۔

پھر شاہ مصر نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ میں آپ سے اپنے خواب کی تعبیر بلاواسطہ سن لوں یوسف علیہ السلام نے پہلے اس کے خواب کی ایسی تفصیلات بتلائیں جواب تک بادشاہ نے بھی کسی سے ذکر نہیں کی تھیں، پھر تعبیر بتلائی۔

شاہ مصر نے کہا کہ مجھے تعبیر سے زیادہ اس پر حیرت ہے کہ یہ تفصیلات آپ کو کیسے معلوم ہوئیں۔

یوسف علیہ السلام کا مشورہ:

اس کے بعد شاہ مصر نے مشورہ طلب کیا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے تو یوسف علیہ السلام نے مشورہ دیا کہ پہلے سات سال جن میں خوب بارشیں ہونے والی ہیں ان میں آپ زیادہ سے زیادہ کاشت کرا کر غلہ اگانے کا انتظام کریں اور سب لوگوں کو ہدایت کریں کہ اپنی اپنی زمینوں میں زیادہ سے زیادہ کاشت کریں اور جتنا غلہ حاصل ہو اس میں سے پانچواں حصہ اپنے پاس ذخیرہ کرتے رہیں۔

اس طرح اہل مصر کے پاس قحط کے سات سال کے لئے بھی ذخیرہ جمع ہو جائے گا اور آپ ان کی طرف سے بے فکر ہوں گے، حکومت کو جس قدر غلہ سرکاری محاصل سے یا سرکاری زمینوں سے حاصل ہو اس کو باہر کے لوگوں کے لئے جمع رکھیں کیونکہ یہ قحط دور دراز تک پھیلے گا باہر کے لوگ اس وقت آپ کے محتاج ہوں گے اس وقت آپ غلہ دے کر خلق خدا کی امداد کریں اور معمولی قیمت بھی رکھیں گے تو سرکاری خزانہ میں اتنا مال جمع ہو جائے گا جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا، شاہ مصر اس مشورہ سے بے حد مسرور و مطمئن ہوا مگر کہنے لگا کہ اس عظیم منصوبہ کا انتظام کیسے ہو اور کون کرے، اس پر یوسف علیہ السلام نے فرمایا:

مسئلہ: حضرت یوسف علیہ السلام کے قول وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ میں نیک اور متقی پرہیزگار بندوں کے لئے یہ ہدایت ہے کہ جب ان کو کسی گناہ سے بچنے کی توفیق ہو جائے تو اس پر ناز نہ کریں، اور اس کے بالمقابل گناہگاروں کو حقیر نہ سمجھیں۔

مسئلہ: اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ سے یہ معلوم ہوا کہ کسی سرکاری عہدہ اور منصب کو طلب کرنا خاص صورتوں میں جائز ہے۔

عہدہ کی طلب:

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہؓ سے فرمایا کہ کبھی کوئی امارت طلب نہ کرو، کیونکہ تم نے خود سوال کر کے عہدہ امارت حاصل بھی کر لیا، تو اللہ تعالیٰ کی تائید نہیں ہوگی، جس کے ذریعہ تم لغزشوں اور خطاؤں سے بچ سکو، اور اگر بغیر درخواست اور طلب کے تمہیں کوئی عہدہ مل گیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید و اعانت ہوگی، جس کی وجہ سے تم اس عہدے کے پورے حقوق ادا کر سکو گے۔

اسی طرح صحیح مسلم کی ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی عہدہ کی درخواست کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **انالن نستعمل علیٰ عملنا من اراده**، یعنی ہم اپنا عہدہ کسی ایسے شخص کو نہیں دیا کرتے جو خود اس کا طالب ہو"۔

اگر آج بھی کوئی شخص یہ محسوس کرے کہ کوئی عہدہ حکومت کا ایسا ہے جس کے فرائض کو کوئی دوسرا آدمی صحیح طور پر انجام دینے والا موجود نہیں، اور خود اس کو یہ اندازہ ہے کہ میں صحیح انجام دے سکتا ہوں، تو اس کے لئے جائز ہے بلکہ واجب ہے کہ اس عہدہ کی خود درخواست کرے، مگر اپنے جاہ و مال کے لئے نہیں، بلکہ خدمت خلق کے لئے، جس کا تعلق قلبی نیت اور ارادہ سے ہے، جو اللہ تعالیٰ پر خوب روشن ہے۔ (قرطبی)

حضرات خلفائے راشدین کا خلافت کی ذمہ داری اٹھالینا اسی وجہ سے تھا کہ وہ جانتے تھے کہ کوئی دوسرا اس وقت اس ذمہ داری کو صحیح انجام نہ دے سکے گا صحابہ کرام حضرت علیؓ اور معاویہؓ و حضرت حسینؓ اور عبداللہ ابن زبیرؓ وغیرہ کے جو اختلافات پیش آئے وہ سب اسی پر مبنی تھے۔ کہ ان میں سے ہر ایک یہ خیال کرتا تھا کہ اس وقت فرائض خلافت کو میں اپنے مقابل سے زیادہ حکمت و قوت

کے ساتھ پورا کرسکوں گا جاہ مال کی طلب کسی کا مقصد اصلی نہ تھا۔

کیا کسی کافر حکومت کا عہدہ قبول کرنا جائز ہے:

تیسرا مسئلہ: یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہ مصر کی ملازمت قبول فرمائی حالانکہ وہ کافر تھا جس سے معلوم ہوا کہ کافر یا فاسق حکمران کی حکومت کا عہدہ قبول کرنا خاص حالات میں جائز ہے۔

امام تفسیر مجاہدؒ نے تو یہ قرار دی ہے کہ بادشاہ مصر اس وقت مسلمان ہو چکا تھا، مگر چونکہ قرآن وسنت میں اس کی کوئی دلیل موجود نہیں، اس لئے عام مفسرین نے اس کی وجہ یہ قرار دی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام بادشاہ مصر کے معاملہ سے یہ معلوم کر چکے تھے کہ وہ ان کے کام میں دخل نہ دے گا، اور کسی خلاف شرع قانون جاری کرنے پر ان کو مجبور نہ کرے گا، بلکہ ان کو مکمل اختیارات دے گا، جس کے ذریعہ وہ اپنی صوابدید اور قانون حق پر عمل کرسکیں گے، ایسے مکمل اختیار کے ساتھ کہ کسی خلاف شرع قانون پر مجبور نہ ہو کوئی کافر یا ظالم کی ملازمت اختیار کرلے تو اگرچہ اس کافر ظالم کے ساتھ تعاون کرنے کی قباحت پھر بھی موجود ہے، مگر جن حالات میں اس کو اقتدار سے ہٹانا قدرت میں نہ ہو، اور اس کا عہدہ قبول نہ کرنے کی صورت میں خلق اللہ کے حقوق ضائع ہونے یا ظلم وجور کا اندیشہ قوی ہو تو مجبوری اتنے تعاون کی گنجائش حضرت یوسف علیہ السلام کے عمل سے ثابت ہوجاتی ہے جس میں خود کسی خلاف شرع امر کا ارتکاب نہ کرنا پڑے، کیونکہ درحقیقت یہ اس کے گناہ میں اعانت نہیں ہوگی، گو سبب بعید کے طور پر اس سے بھی اس کی اعانت کا فائدہ حاصل ہوجائے اعانت کے ایسے اسباب بعیدہ کے بارے میں بحالات مذکورہ شرعی گنجائش ہے۔ جس کی تفصیل حضرات فقہاء نے بیان فرمائی ہے سلف صالحین صحابہ وتابعین میں بہت سے حضرات کا ایسے ہی حالات میں ظالم وجابر حکمرانوں کا عہدہ قبول کرلینا ثابت ہے۔ (قرطبی ومظہری)

تفسیر بحر محیط میں ہے کہ جہاں یہ معلوم ہو کہ علماء صلحاء اگر یہ عہدہ قبول نہ کریں گے تو لوگوں کے حقوق ضائع ہوجائیں گے انصاف نہ ہو سکے گا، وہاں ایسا عہدہ قبول کر لینا جائز بلکہ ثواب ہے۔ بشرطیکہ اس عہدہ میں خود اس کو خلاف شرع امور کے ارتکاب پر مجبوری پیش نہ آئے۔

مسئلہ: حضرت یوسف علیہ السلام کے قول اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ سے یہ ثابت ہوا، کہ ضرورت کے موقع پر اپنے کسی کمال یا فضیلت کا ذکر کردینا تزکیہ نفس یعنی پاکبازی جتلانے میں داخل نہیں، جس کی قرآن کریم میں ممانعت آئی ہے بشرطیکہ اس کا ذکر کرنا کبر وغرور اور فخر وتعالی کی وجہ سے نہ ہو۔ (معارف مفتی اعظم)

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِیْ بِهٖۤ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِیْ

اور کہا بادشاہ نے لے آؤ اس کو میرے پاس میں خالص کر رکھوں اس کو اپنے کام میں

یعنی میرا مشیر خاص رہے گا۔ (تفسیر عثمانی)

جب یوسفؑ کی بے گناہی بادشاہ پر ظاہر ہوگئی اور آپ کے علم وامانت کا مرتبہ بھی اس کو معلوم ہوگیا تو اس نے یوسف کو طلب کیا اور کہا میں براہ راست اپنے لئے ان کو رکھنا چاہتا ہوں۔

دربار میں آنے کی تیاری:

حسب الحکم قاصد آپ کے پاس پہنچا اور کہا چلئے بادشاہ نے طلب کیا ہے عبدالحکم نے فتوح مصر میں بطریق کلبی بوساطت ابوصالح حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا ہے کہ قاصد نے یوسف کے پاس پہنچ کر گذارش کی اب قیدخانہ کے کپڑے اتار کر نئے کپڑے پہن لیجئے اور بادشاہ کے پاس چلئے۔ ابن ابی شیبہ اور ابن المنذر نے فریدعمی کی روایت سے بیان کیا کہ یوسف نے جب عزیز مصر کو دیکھا تو دعا کی الٰہی میں تجھ سے اس کی خیر کے بجائے تیری خیر کا طلب گار ہوں۔ اور اس کے شر سے تیرے غلبہ کی پناہ پکڑتا ہوں۔ بغوی کا بیان ہے آپ کھڑے ہوگئے اور قیدیوں کے لئے دعا کی اے اللہ نیکوں کے دلوں کو ان پر مہربان کردے اور (شہر وملک کی) خبریں ان پر پوشیدہ نہ کر یہی وجہ ہے کہ ہر شہر کی خبروں سے وہاں کے قیدی بہت زیادہ باخبر ہوتے ہیں۔ قیدخانہ سے نکلے تو قیدخانہ کے دروازہ پر یہ بات لکھ دی یہ زندوں کا قبرستان ہے غموں کا گھر ہے دوستوں کی آزمائش اور دشمنوں کی خوشی کا مقام ہے پھر آپ نے قیدخانہ کا میل کچیل دھویا، بدن صاف پاک کیا اور خوبصورت کپڑے پہن کر بادشاہ کے پاس جانے کے ارادے سے چل دیئے۔

دربار میں پہنچنا:

وہب نے بیان کیا جب شاہی دروازہ پر پہنچے تو فرمایا میرا رب میرے لئے کافی ہے دنیا سے بے نیاز کرنے والا ہے میرا رب میرے لئے کافی ہے، اپنی مخلوق سے بے احتیاج کردینے والا ہے اس کی پناہ لینے والا غالب رہتا ہے اس کی ثنا بڑی ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کے بعد گھر کے اندر داخل ہوئے اور بادشاہ کے سامنے پہنچے تو دعا کی اے اللہ میں اس کی خیر کی بجائے تیری خیر کا تجھ سے طالب ہوں اور اس کے اور دوسروں کے شر سے تیری پناہ پکڑتا ہوں بادشاہ نے جب آپ کی طرف دیکھا تو آپ نے اس کو عربی میں سلام کیا بادشاہ نے کہا یہ کیا زبان ہے، فرمایا میرے چچا اسماعیلؑ کی زبان ہے پھر آپ نے بادشاہ کو عبرانی زبان میں دعا دی، بادشاہ نے پوچھا یہ کونسی زبان ہے فرمایا یہ میرے باپ دادا کی زبان ہے۔ بادشاہ ان دونوں زبانوں سے ناواقف تھا اگرچہ ستر زبانوں میں گفتگو کرسکتا تھا جس زبان میں بات کرتا تھا آپ اسی زبان میں جواب دیتے تھے مگر عبرانی اور عربی مزید جانتے تھے جن سے بادشاہ واقف نہ تھا، حضرت یوسف کی اس وقت عمر تیس سال کی تھی اس نوجوانی میں آپ

کے یہ کمالات دیکھ کر متحیر ہوگیا اور (اپنے قریب) بٹھایا۔(تفسیر مظہری)

فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ
پھر جب بات چیت کی اس سے کہا واقعی تو نے آج سے ہمارے
اَمِيْنٌ ﴿۵۴﴾
پاس جگہ پائی معتبر ہوکر

کچھ پہلے سے معتقد ہو چکا تھا۔ بالمشافہ باتیں سن کر بالکل ہی گرویدہ ہوگیا اور حکم دیدیا کہ آج سے آپ ہمارے پاس نہایت معزز و معتبر ہوکر رہینگے۔ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ "اب عزیز کا علاقہ موقوف کیا اپنی صحبت میں رکھا" (تفسیر عثمانی)

یوسفؑ نے خود تعبیر بتلائی:

جب بادشاہ نے ان سے باتیں کیں تو ان سے کہا کہ آپ ہمارے نزدیک آج (سے) بڑے معزز اور معتبر ہیں بغوی نے لکھا ہے بادشاہ نے حضرت یوسفؑ سے کہا میں اپنا خواب آپ کے منہ سے اپنے سامنے سننا چاہتا ہوں فرمایا بہت اچھا سنیئے۔ اے بادشاہ آپ نے خواب میں دیکھا سات سفید رنگ کی خوبصورت گائیں نیل میں سے برآمد ہوئیں اور ساحل نیل سے نکل کر آپ کے سامنے آئیں ان کے تھن دودھ سے بھرے ہوئے تھے اس کے بعد نیل کی کیچڑ سے سات دبلی گائیں برآمد ہوئی جو بھوکی تھیں ان کے پیٹ لگے ہوئے تھے ان کے پاس نہ دودھ تھا نہ تھن ان کی داڑھیں تھیں اور کیلے (جیسے نوکیلے دانت) تھے اور کتوں کے پنجوں کی طرح پنجے تھے اور درندوں کی ناک کی طرح ان کی ناکیں تھیں، درندوں کی طرح انہوں نے موٹی گایوں کو چیر پھاڑ ڈالا کھال کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، گوشت کھالیا، ہڈیوں کو ریزہ ریزہ کر دیا اور مینگنی کو چوس لیا۔ آپ یہ منظر دیکھ کر تعجب ہی کر رہے تھے کہ ایک ہی جڑ سے اناج کی سات سبز بالیں اور سات سیاہ (خشک) بالیں نمودار ہوئیں جڑ کے سوتے سب کے کیچڑ اور پانی کے اندر تھے آپ یہ تماشاہی دیکھ رہے تھے اور تعجب کر رہے تھے کہ جب جڑ ایک ہے اور سوتے سب کے پانی میں ہیں تو یہ سبز خوشہ دار اور وہ سوکھی سیاہ بالیں کہاں سے پیدا ہوگئیں یکایک ایک ہوا چلی جس کی وجہ سے خشک بالوں کے پتے جھڑ کر سبز خوشہ دار بالوں پر گرے اور سبز بالوں میں آگ لگ گئی اور وہ جل کر سیاہ ہوگئیں یہ خواب دیکھ کر آپ بیدار ہوگئے اور دہشت زدہ ہوگئے۔ بادشاہ نے کہا خدا کی قسم یہ خواب اگرچہ عجیب تھا مگر اس کی تعجب آفرینی اس بیان سے زیادہ نہیں جو میں نے آپ سے سنا۔ اے سچے انسان اب اس خواب کے متعلق آپ کیا مشورہ دیتے ہیں، آپ نے فرمایا میری رائے یہ ہے کہ ان پیداوار کے سالوں میں آپ کاشت بہت زیادہ کرائیں اور پیدا شدہ غلہ کو مع ان کے درختوں اور بالوں کے ذخیرہ کرلیں تاکہ (قحط کے سالوں میں) درخت اور بالیں (یعنی سب کا بھوسہ) جانوروں کی خوراک بن جائے اور لوگوں کو آپ یہ بھی حکم دیدیں کہ وہ اپنے غلہ کا پانچواں حصہ اٹھا کر الگ رکھ دیا کریں (اور اس طرح ہر سال کی پیداوار کا پانچواں حصہ ان کے پاس جمع ہو جائے) جو غلہ آپ اسٹاک کرلیں گے وہ تو مصر اور اطراف مصر کے لئے کافی ہو جائے گا اور جب دور کے اطراف سے لوگ آپ کے پاس غلہ کی طلب میں آئیں گے تو آپ کے پاس ان سے وصول کیا ہوا روپیہ اتنا جمع ہو جائے گا کہ آپ سے پہلے (مصر کے بادشاہوں میں سے) کسی کے پاس جمع نہ ہوا ہوگا۔ بادشاہ نے کہا اس کام کی سرانجام دہی کون کرے گا کون غلہ جمع کرے گا کون فروخت کرے گا یہ دھندا میری طرف سے کون کرے گا۔ (تفسیر مظہری)

قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّيْ
یوسف نے کہا مجھ کو مقرر کر ملک کے خزانوں پر میں نگہبان ہوں
حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۵﴾
خوب جاننے والا

یوسف علیہ السلام نے اپنی خدمات پیش کر دیں:

یعنی دولت کی حفاظت بھی پوری کرونگا اور اس کی آمد و خرچ کے ذرائع اور حساب و کتاب سے خوب واقف ہوں یوسف نے خود درخواست کر کے مالیات کا کام اپنے سر لیا۔ تا اس ذریعہ سے عامہ خلائق کو پورا نفع پہنچا سکیں۔ خصوصاً آنیوالے خوفناک قحط میں نہایت خوش انتظامی سے مخلوق کی خبر گیری اور حکومت کی مالی حالت کو مضبوط رکھ سکیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام دنیا کی عقل بھی کامل رکھتے ہیں۔ اور یہ کہ ہمدردی خلائق کے لئے مالیات کے قصوں میں پڑنا شان نبوت یا بزرگی کے خلاف نہیں سمجھتے۔ نیز ایک آدمی اگر نیک نیتی سے یہ سمجھے کہ فلاں منصب کا میں اہل ہوں اور دوسروں سے یہ کام اچھی طرح بن نہ پڑیگا تو مسلمانوں کی خیر طلبی اور نفع رسانی کی غرض سے اس کی خواہش یا درخواست کر سکتا ہے۔ اور اگر حسب ضرورت اپنے بعض خصائل حسنہ اور اوصاف حمیدہ کا تذکرہ کرنا پڑے تو یہ ناجائز مدح سرائی میں داخل نہیں۔ عبدالرحمٰن بن سمرۃ کی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص از خود امارت طلب کرے تو اس کا بار اسی کے کندھوں پر ڈال دیا جاتا ہے (غیبی اعانت مددگار نہیں ہوتی) یہ اس وقت ہے جب طلب کرنا محض نفس پروری اور جاہ پسندی وغیرہ اغراض کی بناء پر ہو۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانی)

عہدہ طلب کرنے کا مقصد:

یوسفؑ نے کہا مجھے ملک (مصر) پیداوار اور مال پر مقرر کردو میں (اس کام کی) بخوبی نگہداشت کرنے والا اور جاننے والا ہوں۔ حضرت یوسف نے اپنی امانت داری اور کارگذاری کا خود اظہار کیا اور خود عہدہ طلب کیا تا کہ اس کے ذریعے سے اللہ کے احکام مخلوق میں جاری کرسکیں، حق کو قائم کریں اور عدل کو دنیا میں پھیلائیں اسی کام کیلئے انبیاء آتے ہیں اور ان کی بعثت کی غرض یہی ہوتی ہے آپ کو معلوم تھا کہ میرے سوا اور کوئی اس کام کو کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا پس آپ نے عہدہ حکومت کی طلب اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے کی تھی جاہ واقتدار کی طلب نہ تھی، خلفاء راشدین کی خلافت کا مقصد بھی یہی تھا اور حضرت علیؓ کا حضرت معاویہؓ سے جھگڑا بھی اسی بنیاد پر تھا کیوں کہ آپ اس کام کے زیادہ اہل تھے حضرت معاویہؓ کے مقابلہ میں آپ کو اپنے نفس پر زیادہ قابو تھا اور احکام الٰہی کو جاری کرنے کی صلاحیت آپ میں حضرت معاویہؓ سے زیادہ تھی۔

بیضاوی نے کہا طلب عہدہ کی شاید یہ وجہ ہو کہ آپ نے یہ تو محسوس کرلیا تھا کہ بادشاہ مجھے کوئی کام سپرد کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے آپ نے عہدہ کی تعیین کردی اور ایسے کام کی ذمہ داری طلب کی جس کا فائدہ عمومی تھا اور سب لوگ اس سے مستفید ہوسکتے تھے۔

اس آیت سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ اگر انسان کو اپنی ذات پر اطمینان اور بھروسہ ہو تو حکومت کا کوئی عہدہ اور قضاء کی طلب جائز ہے اور اپنی اہلیت کار کے اظہار میں کوئی ہرج نہیں ہے ایک بات یہ بھی نکلتی ہے کہ بادشاہ کافر ہو یا ظالم اس کی طرف سے کسی کام پر مامور ہونا (بشرطیکہ وہ کام افادیت عامہ رکھتا ہو اور جاہ طلبی کا داعیہ نہ ہو) جائز ہے، ظالموں اور فاسقوں کی طرف سے ہمارے محترم اسلاف محکمہ قضا کی خدمت اسی غرض سے قبول کرتے رہے ہیں۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ (حاکم یوسف نہ تھے صرف مشیر تھے) بادشاہ آپ سے مشورہ لے کر خود حکم جاری کرتا تھا اور آپ کی رائے میں دخل نہ دیتا تھا، گویا اجراء احکام میں آپ کا تابع تھا۔ بغوی نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ میرے بھائی یوسفؑ پر رحم فرمائے اگر وہ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآىِٕنِ الْاَرْضِ نہ کہتے تو بادشاہ ان کو فوراً حاکم بنا دیتا مگر (اس لفظ کو کہنے کی وجہ سے) بادشاہ نے وہ سال ٹال دیا اس مدت میں یوسف بادشاہ کے پاس اس کے گھر میں رہتے رہے۔

تخت شاہی پر جلوہ افروزی:

بغوی نے دوسری سند سے حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا ہے کہ جس روز حضرت یوسف نے درخواست حکومت کی تھی اس دن سے جب ایک سال کی مدت گذر گئی تو بادشاہ نے آپ کو بلا کر تاج پہنایا اور شاہی تلوار باندھی اور جواہر سے جڑا ہوا تخت آپ کیلئے بچھوایا اور تخت کے گرد ریشمی پردہ لٹکا دیا تخت تیس ہاتھ لمبا اور دس ہاتھ چوڑا تھا، اس پر دس بستر بچھے ہوئے تھے اور ساٹھ باریک پردے تھے پھر تاج پہن کر آپ کو برآمد ہونے کا حکم دیا، آپ سر پر تاج رکھے برآمد ہوئے برف کی طرح آپ کا رنگ گورا اور چاند کی طرح چہرہ روشن تھا، بدن کی صفائی کی وجہ سے چہرے کا رنگ (یعنی عکس) بدن پر نظر آتا تھا آپ اس شان کے ساتھ جا کر تخت پر بیٹھ گئے تمام حکام آپ کے فرماں بردار ہوگئے بادشاہ مصر کی پوری حکومت آپ کو سپرد کر کے اپنے گھر میں چلا گیا۔ بادشاہ نے قطفیر کو اس کے عہدے سے معزول کردیا اور یوسفؑ کو اس کی جگہ مقرر کردیا۔ یہ قول ابن اسحاق کا ہے۔

ابن زید کا بیان ہے کہ ریان شاہ مصر کے پاس خزانے بہت تھے تمام خزانے اس نے یوسف کے تصرف میں دیدیئے۔

زلیخا سے نکاح:

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے ابن اسحاق کی روایت سے بیان کیا ہے اہل روایت نے ذکر کیا ہے کہ اسی زمانہ میں قطفیر کا انتقال ہوگیا اور بادشاہ نے اس کی بیوی زلیخا سے یوسف کا نکاح کرادیا، نکاح کے بعد یوسف زلیخا کے پاس پہنچے تو ان سے فرمایا کیا یہ اس سے بہتر نہیں ہے جو تم چاہتی تھیں، زلیخا نے جواب دیا: اے صدیق! مجھے آپ ملامت نہ کریں آپ کو معلوم ہے کہ میں خوبصورتی میں ایک ہی عورت تھی اور یہ بھی جانتے ہی ہیں کہ حکومت اور دنیا کے لحاظ سے میں کتنے عیش میں تھی اور میرا شوہر عورتوں کے قابل نہ تھا اور آپ کے حسن وصورت کی جو حالت تھی وہ بھی خداداد تھی اس لئے آپ کو دیکھ کر مجھ سے صبر نہ ہوسکا۔

غرض مصر کی حکومت یوسف کے لئے مستقل ہوگئی آپ وہیں مقیم ہوگئے، مرد اور عورت سب آپ کو پسند کرتے تھے آیت ذیل اس کی طرف اشارہ کررہی ہے۔ تفسیر مظہری۔

نکتہ: خوب سمجھ لو کہ خلیفہ راشد وہی ہے جو حفیظ وعلیم کا مصداق ہو پھر ابوبکرؓ وعمرؓ کے حال پر ایک نظر ڈالو یوسف صدیق کا نمونہ نظروں کے سامنے آجائے گا۔

اور ہم نے ایسے ہی عجیب طور پر یوسف کو زمین مصر میں جگہ دی یعنی اس ملک میں حکومت، اور تمکنت عطا کی اور اقتدار اور اختیار دیا کہ اس زمین سے جہاں چاہیں رہیں قید خانہ کی تنگی اور تکلیف کے بعد یہ وسعت اور فراخی عطا کی کہ جہاں چاہیں رہیں سارا ملک ان پر فریفتہ ہے اور یہ سب اللہ کی رحمت ہے اور ہم جس کو چاہیں اپنی رحمت سے پہنچائیں کوئی ہمارا ہاتھ پکڑنے والا نہیں اور ہم نیکوکاروں کے ثواب کو ضائع نہیں کرتے اور البتہ اہل ایمان اور اہل تقویٰ کو جو اجر آخرت میں ملے گا وہ اس دنیاوی اجر سے کہیں بہتر ہے جس کے سامنے دنیا کی دولت وثروت سب ہیچ ہے یعنی یوسف کو جو دنیاوی

سلطنت ملی وہ اس کی رحمت کا ایک حصہ ہے یوسف علیہ السلام نیکوکاری اور پرہیزگاری کی بدولت قعر چاہ سے نکل کر تخت جاہ پر پہنچے اور آخرت میں جو اجر وثواب ان کیلئے مقدر ہے وہ وہم وگمان سے بالا اور بالاتر ہے۔

بدنیا وعقبٰی کسے قدر یافت کہ اوجانب صبر وتقویٰ شناخت

خدا کی قدرت کا کرشمہ دیکھو کہ کہاں سے کہاں پہنچایا کنوئیں سے نکال کر مصر کا فرمانروا بنایا شاہ عبدالقادرؒ فرماتے ہیں یہ جواب ہوا ان کے سوال کا کہ اولاد ابراہیم اس طرح شام سے مصر میں آئی اور بیان ہوا کہ بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کو گھر سے دور پھینکا تا کہ ذلیل ہوں اور اللہ نے عزت دی اور ملک پر اختیار دیا ایسا ہی ہوا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو (موضح القرآن) (معارف کاندھلویؒ)

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْاَرْضِ يَتَبَوَّاُ

اور یوں قدرت دی ہم نے یوسف کو اس زمین میں جگہ پکڑتا تھا

مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ

اس میں جہاں چاہتا

حکومت میں آپ کا مقام ومرتبہ:

جہاں چاہتے اترتے اور جو چاہتے تصرف کرتے گویا ریان بن الولید برائے نام بادشاہ تھا حقیقت میں یوسفؑ بادشاہی کررہے تھے اور "عزیز" کہہ کر پکارے جاتے تھے۔ جیسا کہ آگے آئیگا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ بادشاہ آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہوگیا۔ نیز اسی زمانہ میں عزیز مصر کا انتقال ہوا تو اس کی عورت زلیخا نے آپ سے شادی کرلی۔ واللہ اعلم۔ محدثین اس پر اعتماد نہیں کرتے۔ (تفسیر عثمانی)

تفصیل اس کی یہ ہے کہ بادشاہ مصر نے ایک سال تجربہ کرنے کے بعد دربار میں ایک جشن منایا جس میں تمام عمال دولت اور معززین حکومت کو جمع کیا، اور یوسف علیہ السلام کے سر پر تاج رکھ کر اس مجلس میں لایا گیا، اور صرف خزانہ کی ذمہ داری نہیں بلکہ پورے امور مملکت کو عملاً ان کے سپرد کرکے خود گوشہ نشین ہوگیا (قرطبی ومظہری وغیرہ)

حضرت یوسف علیہ السلام نے امور سلطنت کو ایسا سنبھالا کہ کسی کو کوئی شکایت باقی نہ رہی، سارا ملک آپ کا گرویدہ ہوگیا اور پورے ملک میں امن اور خوش حالی عام ہوگئی خود حضرت یوسف علیہ السلام کو بھی حکومت کی اس تمام ذمہ داری میں کوئی دشواری یا رنج وتکلیف پیش نہیں آئی،

امام تفسیر مجاہدؒ نے فرمایا کہ یوسف علیہ السلام کے پیش نظر چونکہ اس سارے جاہ وجلال سے صرف اللہ تعالیٰ کے احکام کا رواج اور اس کے دین کی اقامت تھی، اس لئے وہ کسی وقت بھی اس سے غافل نہیں ہوئے، کہ شاہ مصر کو اسلام وایمان کی دعوت دیں، یہاں تک کہ مسلسل دعوت وکوشش کا یہ نتیجہ ظاہر ہوا کہ بادشاہ مصر بھی مسلمان ہوگیا۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِيعُ

پہنچا دیتے ہیں ہم رحمت اپنی جس کو چاہیں اور ضائع نہیں کرتے

اَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٥٦﴾ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ

ہم بدلہ بھلائی والوں کا اور ثواب آخرت کا

خَيْرٌ لِّلَّذِينَ اٰمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ﴿٥٧﴾

بہتر ہے ان کو جو ایمان لائے اور رہے پرہیزگاری میں

بھلائی اور نیکی کا انعام:

جو بھلائی اور نیکی کا راستہ اختیار کرے خدا اس کو دنیا میں بھی میٹھا پھل دیتا ہے۔ خواہ ثروت حکومت یا لذت عیش، حیات طیبہ اور غنائے قلبی۔ حضرت یوسف کو یہ سب چیزیں عنایت فرمائیں۔ رہا آخرت کا اجر، سو وہ ایک ایماندار و پرہیزگار کے لئے دنیا کے اجر سے کہیں بہتر ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں۔ "یہ جواب ہوا ان کے سوال کا کہ اولاد ابراہیم اس طرح "شام" سے آئی مصر میں اور بیان ہوا کہ بھائیوں نے حضرت یوسفؑ کو گھر سے دور پھینکا تا ذلیل ہو۔ اللہ نے عزت دی۔ اور ملک پر اختیار دیا۔ ایسا ہی ہوا ہمارے حضرت کو۔" (تفسیر عثمانی)

رحمت سے مراد ہے نعمت اور اجر سے مراد ہے فوراً یا کچھ مدت کے بعد نکلنے والا اچھا نتیجہ۔ المحسنین سے حضرت ابن عباس اور وہب کے نزدیک صبر کرنے والے مراد ہیں۔ مجاہد وغیرہ نے کہا، حضرت یوسف برابر بادشاہ کو اسلام کی دعوت دیتے رہے آخر بادشاہ مسلمان ہو ہی گیا اور بہت سے لوگ بھی مشرف باسلام ہوگئے اس طرح حضرت یوسفؑ کو دنیوی اجر مل گیا۔

یوسف علیہ السلام کی حُسنِ تدبیر:

جب حضرت یوسفؑ اطمینان کے ساتھ حکومت پر جم گئے تو انہوں نے غلہ جمع کرنے کی تدبیر کی۔ بڑی بڑی حفاظت گاہیں اور غلہ رکھنے کے گھر بنوائے اور قحط سالی کیلئے وہاں غلہ جمع کیا اور معمول کے مطابق بقدر ضرورت خرچ بھی کیا یہاں تک کہ پیداوار کی کثرت کے سال گذر گئے اور قحط سالی کا دور آ گیا، اور ایسا ہولناک قحط پڑا جس کی نظیر کبھی سننے میں آئی تھی نہ دیکھنے میں۔

روایت میں ہے کہ حضرت یوسف نے بادشاہ اور بادشاہ کے مصاحبین کے لئے ہر روز صرف ایک بار دوپہر کے وقت کھانا مقرر کیا تھا قحط سالی کے دور میں سب سے پہلے آدھی رات کے وقت بادشاہ ہی کو بھوک نے ستایا اور وہ بھوک بھوک کہہ کر چلا اٹھا، حضرت یوسفؑ نے فرمایا یہ کال کا زمانہ ہے۔ کال کے اول سال پبلک کا سارا اندوختہ ختم ہوگیا اور لوگ یوسف سے غلہ خریدنے

لگے، حضرت نے نقد روپیہ لے کر غلہ دے دیا اور اس طرح مصر کا ہر سکہ اور درہم و دینار آپ کے پاس آ گیا، دوسرے سال زیور اور جواہر لے کر اناج فروخت کیا، تیسرے سال چوپائے اور مویشی دے کر لوگوں نے غلہ لیا چوتھے سال غلام اور باندیاں دے کر غلہ حاصل کیا، پانچویں سال جائدادیں زمینیں اور گھر بھی غلے کے عوض بیچ ڈالے، چھٹے سال بچے فروخت کر دیئے اور ساتویں سال خود اپنی جانوں کا بیعنامہ کر دیا، یہاں تک کہ نقد جنس، زیور اور جانور باندی غلام سب کچھ یوسف کا ہو گیا، اہل مصر کی کوئی چیز نہیں رہی اور آخر میں اولاد بھی اپنی نہیں رہی بلکہ ہر شخص یوسف کا غلام ہو گیا۔

غرض یہ حالت دیکھ کر رعایا بول اٹھی کہ ایسا عالی قدر مالک کل بادشاہ اور کوئی نہیں ہوا جو ساری رعایا کے جان مال اور اولاد کا مالک ہو گیا ہو، یوسفؑ نے بادشاہ سے کہا اب آپ کی کیا رائے ہے بادشاہ نے کہا جو آپ کی رائے وہی میری رائے۔ ہم تو آپ کے تابع ہیں حضرت نے فرمایا تو میں اللہ کو اور آپ کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ تمام اہل مصر کو میں نے آزاد کر دیا، ان کی ساری املاک (زر و جواہر مویشی جانور) ان کو واپس کرتا ہوں۔

روایت میں آیا ہے کہ حضرت کال کے زمانے میں خود بھی بھوکے رہتے تھے، لوگوں نے کہا سارا غلہ ملک مصر کا تو آپ کے قبضے میں ہے اور آپ بھوکے رہتے ہیں، فرمایا میرا پیٹ بھرا ہو گا تو اندیشہ ہے کہ میں بھوکے کو بھول جاؤں گا بادشاہ کے باورچیوں کو بھی آپ نے حکم دے دیا تھا کہ بادشاہ کے لئے صرف دوپہر کو ہی کھانا تیار کریں کہیں پیٹ بھرنے کے بعد بادشاہ بھوکوں کو بھول نہ جائے، اسی بناء پر بادشاہ ناشتہ دوپہر کو کرتے ہیں (کہ صبح سے دوپہر تک بھوکے رہیں اور بھوکوں کو بھولنے نہ پائیں)

اہل مصر کے علاوہ چاروں طرف سے لوگ حضرت یوسفؑ کے پاس غلہ لینے آتے تھے مگر آپ کسی کو خواہ وہ کتنا بڑا آدمی ہو بار شتر سے زیادہ اناج نہیں دیتے تھے تاکہ تھوڑا تھوڑا سب لوگوں کو پہنچ جائے لوگوں کے آپ کے پاس ٹھٹ لگے رہتے تھے اور آپ سب کو دیتے تھے۔ کنعان اور شام کے باشندے بھی قحط میں مبتلا ہو گئے عمومی کال سے وہ بھی محفوظ نہیں رہے۔ حضرت یعقوبؑ اور آپ کے اہل و عیال مقام غرمات علاقہ فلسطین سرحد شام میں رہتے تھے ان لوگوں کی زندگی صحرائی زندگی تھی اونٹ اور بکریاں پالتے تھے حضرت یعقوب نے اپنے بیٹوں کو غلہ لینے کے لئے مصر بھیجا اور فرمایا مجھے اطلاع ملی ہے کہ وہاں کا بادشاہ مرد صالح ہے لوگوں کے ہاتھ غلہ فروخت کرتا ہے تم بھی تیار ہو جاؤ اور مصر جا کر غلہ لاؤ آپ نے یوسف کے بھائی بنیامین کو اپنے پاس روک لیا اور دوسرے بیٹوں کو روانہ ہو جانے کا حکم دے دیا۔ (تفسیر مظہری)

حضرت یوسف علیہ السلام کی شادی اور اولاد:

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ آپ کے خریدنے والے کا نام اطفیر تھا۔ یہ انہی دنوں میں انتقال کر گیا۔ اس کے بعد بادشاہ نے اس کی زوجہ راعیل سے حضرت یوسف علیہ السلام کا نکاح کر دیا۔ جب آپ ان سے ملے تو فرمایا کہو کیا یہ اس تمہارے ارادے سے بہتر نہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ اے صدیق مجھے ملامت نہ کیجئے، آپ کو معلوم ہے کہ میں حسن و خوبصورتی والی دھن دولت والی عورت تھی، میرے خاوند مردمی سے محروم تھے، وہ مجھ سے مل ہی نہیں سکتے تھے۔ ادھر آپ کو قدرت نے جس فیاضی سے دولت حسن کے ساتھ مالا مال کیا ہے وہ بھی ظاہر ہے پس مجھے اب ملامت نہ کیجئے۔ کہتے ہیں کہ واقعی حضرت یوسف علیہ السلام نے انہیں کنواری پایا پھر ان کے بطن سے آپ کو دو لڑکے ہوئے افراثیم اور میشا۔ افراثیم کے ہاں نون پیدا ہوئے جو حضرت یوشعؑ کے والد ہیں اور رحمت نامی صاحبزادی ہوئیں جو حضرت ایوب علیہ السلام کی بیوی ہیں۔ حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عزیز کی بیوی راستے میں کھڑی تھیں جو حضرت یوسف علیہ السلام کی سواری نکلی تو بے ساختہ ان کے منہ سے نکل گیا کہ الحمد للہ شان خدا کے قربان جس نے اپنی فرماں برداری کی وجہ سے غلاموں کو بادشاہی پر پہنچایا، اور اپنی نافرمانی کی وجہ سے بادشاہوں کو غلامی پر لا اتارا۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ

اور آئے بھائی یوسف کے پھر داخل ہوئے اس کے پاس

فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۵۸﴾

تو اس نے پہچان لیا ان کو اور وہ نہیں پہچانتے

بھائیوں کا مصر میں آنا:

موضح القرآن میں ہے "جب حضرت یوسف ملک "مصر" پر مختار ہوئے خواب کے موافق سات برس خوب آبادی کی اور ملک کا اناج بھرتے گئے۔ پھر سات برس کے قحط میں ایک بھاؤ میانہ باندھ کر بکوایا اپنے ملک والوں کو اور پردیسیوں کو سب کو برابر مگر پردیسی کو ایک اونٹ سے زیادہ نہ دیتے تھے۔ اس میں خلق بچی قحط سے اور خزانہ بادشاہ کا بھر گیا۔ ہر طرف خبر تھی کہ مصر میں اناج سستا ہے ان کے بھائی خریدنے کی غرض سے آئے" ان کے تن و توش، ہیئات، وضع قطع میں چنداں تغیر نہ ہوا تھا۔ ادھر حضرت یوسفؑ برابر اپنے باپ بھائیوں کا تفقد کرتے رہے ہونگے اور وہاں پہنچنے پر ان کا نام ونشان بھی دریافت کیا ہوگا جیسا کہ سلاطین واعیان سے ملاقات کرنے میں عموماً ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ بعض تفاسیر میں ہے کہ انہوں نے یوسف علیہ السلام سے اپنا نام، نسب وغیرہ بیان کیا۔ ہاں یوسف علیہ السلام جدائی کے وقت چونکہ بہت چھوٹے تھے اور بھائیوں کو پہلے سے ادھر خیال بھی نہ تھا، نہ بادشاہوں

کے یہاں عام آدمیوں کی یہ جرأت ہوسکتی ہے کہ ان کا نام ونسب وغیرہ دریافت کریں۔ اس لئے وہ یوسف کو نہ پہچان سکے۔ (تفسیر عثمانی)

اور یوسفؑ کے بھائی آئے اور یوسفؑ کے پاس پہنچے تو یوسفؑ نے ان کو پہچان لیا اور وہ یوسفؑ کو نہ پہچان سکے۔ یعنی دس بھائی یوسف کے پاس پہنچے۔ حضرت ابن عباس اور مجاہد نے فرمایا حضرت یوسفؑ نے پہلی ہی نظر میں بھائیوں کو پہچان لیا، حسن نے کہا اول نظر میں نہیں پہچانا جب انہوں نے اپنا تعارف کرایا تو پہچانا۔

بھائی یوسف علیہ السلام کو کیوں نہ پہچان سکے:

حضرت ابن عباس نے بھائیوں کے یوسفؑ کو نہ پہچاننے کی یہ وجہ بیان کی کہ کنوئیں میں ڈالنے اور اب سامنے آنے کے درمیان چالیس برس کی مدت گذر گئی تھی۔ طول زمانہ شناخت سے مانع ہوا عطاء نے کہا حضرت یوسفؑ اس وقت شاہانہ تاج پہنے شاہی تخت پر رونق افروز تھے اس لئے بھائی نہ پہچان سکے۔

احوال کی چھان بین:

حضرت یوسف نے بھائیوں کو دیکھا تو انہوں نے عبرانی زبان میں کلام کیا آپ نے فرمایا مجھے بتاؤ تم کون لوگ ہو اور تمہارا کیا کام ہے میں تم کو نہیں جانتا، بھائیوں نے کہا ہم ملک شام کے چرواہے ہیں، قحط کی تکلیف میں مبتلا ہو کر آپ کے پاس غلہ لینے آئے ہیں حضرت نے فرمایا شاید آپ لوگ ہمارے ملک میں یہاں کے احوال کی جستجو میں آئے ہیں، کہنے لگے خدا کی قسم ہم جاسوس نہیں ہیں سب ایک باپ کی اولاد ہیں ہمارا باپ پیر صادق ہے اس کو اللہ کے پیغمبروں میں شمار کیا جاتا ہے حضرت یوسفؑ نے کہا آپ لوگ کتنے ہیں بولے ہم بارہ (بھائی) تھے ہمارا ایک بھائی جاتا رہا، وہ ہم سب میں چھوٹا تھا جنگل کو گیا تھا وہاں مر گیا، باپ کی نظر میں وہ سب سے پیارا تھا آپ نے پوچھا یہاں تم کتنے ہو بولے دس ہیں فرمایا ایک اور کہاں ہے بولے باپ کے پاس رہ گیا ہے جب سے اس کا ماں جایا بھائی مرا ہے باپ کو اسی سے تسکین خاطر ہوتی ہے فرمایا کون جانے کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ سچ بھی ہے یا نہیں کہنے لگے بادشاہ سلامت ہم تو اجنبی ملک میں ہیں یہاں تو ہم کو جاننے والا کوئی نہیں ہے آخر حضرت یوسف نے ہر ایک کو ان کی تعداد کے مطابق ایک ایک اونٹ غلے کا دے دیا اور سب کا سامان سفر درست کرا دیا۔ جہاز سامان سفر کو کہتے ہیں۔ (تفسیر مظہری)

دس بھائی کنعان سے سفر کر کے مصر پہنچے، یوسف علیہ السلام شاہی لباس میں شاہانہ تخت وتاج کے مالک ہونے کی حیثیت میں سامنے آئے، اور بھائیوں نے ان کو بچپن کی سات سالہ عمر میں قافلہ والوں کے ہاتھ بیچا تھا جس کو اس وقت حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق چالیس سال ہو چکے تھے۔ (قرطبی، مظہری)

اول تو ان سے پوچھا کہ آپ لوگ مصر کے رہنے والے نہیں آپ کی زبان بھی عبرانی ہے آپ یہاں کیسے پہنچے، انہوں نے عرض کیا کہ ہمارے ملک میں قحط عظیم ہے اور ہم نے آپ کی تعریف سنی، اس لئے غلہ حاصل کرنے کیلئے آئے ہیں، یوسف علیہ السلام نے پھر پوچھا کہ ہمیں یہ کیسے اطمینان ہو کہ تم سچ کہہ رہے ہو، اور تم کسی دشمن کے جاسوس نہیں ہو تو ان سب بھائیوں نے عرض کیا کہ معاذ اللہ ہم سے ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ ہم تو اللہ کے رسول یعقوب علیہ السلام کے بیٹے ہیں جو کنعان میں رہتے ہیں۔

یوسف علیہ السلام کا ان سوالات سے مقصد ہی یہ تھا کہ یہ ذرا کھل کر پورے واقعات بیان کر دیں تب یوسف علیہ السلام نے دریافت کیا کہ تمہارے والد کے اور بھی کوئی اولاد تمہارے سوا ہے تو انہوں نے بتلا دیا کہ ہم بارہ بھائی تھے جن میں سے ایک چھوٹا بھائی جنگل میں گم ہو گیا، اور ہمارے والد کو سب سے زیادہ اسی سے محبت تھی اس کے بعد سے اس کے چھوٹے حقیقی بھائی کے ساتھ زیادہ محبت کرنے لگے، اور اسی لئے اس وقت بھی اس کو سفر میں ہمارے ساتھ نہیں بھیجا تا کہ وہ اس کی تسلی کا سبب بنے۔

بھائیوں کا خاص احترام:

یوسف علیہ السلام نے یہ سب باتیں سن کر حکم دیا کہ ان کو شاہی مہمان کی حیثیت سے ٹھہرائیں اور قاعدہ کے موافق غلہ دیدیں۔

تقسیم غلہ میں یوسف علیہ السلام نے ضابطہ کار یہ بنایا تھا کہ ایک مرتبہ میں کسی ایک شخص کو ایک اونٹ کے بار سے زیادہ نہ دیتے، مگر جب حساب کے موافق وہ ختم ہو جائے تو پھر دوبارہ دیدیتے تھے۔

دوسرا انتظام خفیہ یہ کیا کہ جو نقد یا زیور وغیرہ ان بھائیوں نے غلہ کی قیمت کے طور پر ادا کیا تھا، اس کے متعلق کارندوں کو حکم دیدیا، کہ اس کو چھپا کر انہی کے سامان میں اس طرح باندھ دو کہ ان کو اس وقت پتہ نہ لگے تا کہ جب یہ گھر پہنچ کر سامان کھولیں اور اپنا نقد وزیور بھی ان کو واپس ملے تو یہ پھر دوبارہ لینے کیلئے آسکیں۔ (معارف مفتی اعظم)

اور بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام اپنے چہرہ پر نقاب رکھتے تھے تا کہ مصر کی عورتیں فتنہ میں نہ پڑیں غرض یہ کہ جب بھائی یوسف کے سامنے پیش ہوئے تو یوسف علیہ السلام نے ان کو پہچان لیا اور بھائیوں نے ان کو نہ پہچانا، یوسف علیہ السلام ان کے ساتھ لطف وکرم سے پیش آئے اور عبرانی زبان میں ان سے ان کے حالات۔ پوچھے کہ تم کون لوگ ہو اور کہاں سے آئے ہو انہوں نے کہا ہم ملک شام کے رہنے والے ہیں ہمارا گزران معاش بکریوں پر ہے قحط کی مصیبت میں ہم بھی گرفتار ہیں اس لئے ہم تیرے پاس غلہ لینے آئے ہیں۔ معارف القرآن کاندھلویؒ

ابن کثیرؒ نے ائمہ تفسیر میں سے سدی اور محمد ابن اسحٰق وغیرہ کے حوالہ سے

جو تفصیل بیان کی ہے وہ اگر تاریخی اور اسرائیلی روایات سے بھی لی گئی ہو تو اس لئے کچھ قابل قبول ہے کہ نسق قرآنی میں خود اس کی طرف اشارے موجود ہیں۔

خواب کا دوسرا حصہ:

ان حضرات نے فرمایا کہ یوسف علیہ السلام کو ملک مصر کو وزارت حاصل ہونے کے بعد ابتدائی سات سال تعبیر خواب کے مطابق پورے ملک کیلئے بڑی خوش حالی اور رفاہیت کے آئے پیداوار خوب ہوئی اور زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے اور جمع کرنے کی کوشش کی، اس کے بعد اسی خواب کا دوسرا جزء سامنے آیا کہ قحط شدید پڑا، جو سات سال تک جاری رہا اس وقت یوسف علیہ السلام چونکہ پہلے سے باخبر تھے کہ یہ قحط سات سال تک مسلسل رہے گا اس لئے قحط کے ابتدائی سال میں ملک کے موجود ذخیرہ کو بڑی احتیاط سے جمع کر لیا اور پوری حفاظت سے رکھا۔

مصر کے باشندوں کے پاس بقدر ان کی ضرورت کے پہلے سے جمع کرا دیا گیا، اب قحط عام ہوا اور اطراف واکناف سے لوگ سمٹ کر مصر آنے لگے تو یوسف علیہ السلام نے ایک خاص انداز سے غلہ فروخت کرنا شروع کیا کہ ایک شخص کو ایک اونٹ کے بوجھ سے زیادہ نہ دیتے تھے جس کی مقدار قرطبی نے ایک وسق یعنی ساٹھ صاع لکھی ہے۔ جو ہمارے وزن کے اعتبار سے دوسو دس سیر یعنی پانچ من سے کچھ زیادہ ہوتی ہے۔

فلسطین میں آپ کی شہرت:

اور اس کام کا اتنا اہتمام کیا کہ غلہ کی فروخت خود اپنی نگرانی میں کراتے تھے، یہ قحط صرف ملک مصر ہی میں نہ تھا بلکہ دور دور کے علاقوں تک پھیلا ہوا تھا، ارض کنعان جو فلسطین کا ایک حصہ ہے اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا وطن ہے اور آج بھی اس کا شہر بنام خلیل ایک پررونق شہر کی صورت میں موجود ہے۔ یہیں حضرت ابراہیم واسحٰق اور یعقوب و یوسف علیہم السلام کے مزارات معروف ہیں یہ خطہ بھی اس قحط کی زد سے نہ بچا، اور یعقوب علیہ السلام کے خاندان میں بے چینی پیدا ہوئی ساتھ ہی ساتھ مصر کی یہ شہرت عام ہوگئی تھی کہ وہاں غلہ قیمتاً مل جاتا ہے، حضرت یعقوب علیہ السلام تک بھی یہ خبر پہنچی کہ مصر کا بادشاہ کوئی صالح رحم دل آدمی ہے وہ سب خلق خدا کو غلہ دیتا ہے تو اپنے صاحبزادوں سے کہا کہ تم بھی جاؤ مصر سے غلہ لے کر آؤ۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُونِي

اور جب تیار کر دیا ان کو ان کا اسباب کہا لے آئیو میرے پاس ایک

بِأَخٍ لَّكُمْ مِّنْ أَبِيكُمْ ۚ أَلَا تَرَوْنَ أَنِّي أُوفِي

بھائی جو تمہارا ہے باپ کی طرف سے تم نہیں دیکھتے ہو کہ میں پورا دیتا

الْكَيْلَ وَأَنَا خَيْرُ الْمُنزِلِينَ ﴿٥٩﴾

ہوں ماپ اور خوب طرح اتارتا ہوں مہمانوں کو

بنیامین کی طلب:

حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائیوں کی خوب مدارات اور مہمانداری کی۔ ایک ایک اونٹ فی کس غلہ دیا۔ یہ خاص مہربانی اور اخلاق دیکھ کر کہتے ہیں انہوں نے درخواست کی کہ ہمارے ایک علاتی بھائی (بنیامین) کو بوڑھے غمزدہ باپ نے تسکین خاطر کیلئے اپنے پاس روک لیا ہے کیونکہ اس کا دوسرا عینی بھائی (یوسف) جو باپ کو بیحد محبوب تھا مدت ہوئی جنگل میں ہلاک ہو چکا ہے۔ اگر بنیامین کے حصہ کا غلہ بھی ہم کو مرحمت فرمائیں تو بڑی نوازش ہوگی۔ یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ اس طرح غائب کا حصہ دینا خلاف قاعدہ ہے تم پھر آؤ تو بنیامین کو ساتھ لاؤ تب اس کا حصہ پا سکو گے۔ میرے اخلاق اور مہمان نوازی کو تم خود مشاہدہ کر چکے ہو، کیا اس کے بعد تمہیں اپنے چھوٹے بھائی کے لانے میں کچھ تردد ہو سکتا ہے؟ تفسیر عثمانی

تفسیر قرطبی میں اس کی تصریح مل گئی کہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی حضرت یوسف علیہ السلام کو روک دیا تھا کہ اپنے گھر اپنے متعلق کوئی خبر نہ بھیجیں۔

اور ایک احتمال یہ بھی ہے کہ وہ جانتے تھے کہ جب ان کا سامان ان کے پاس واپس پہنچ جائے گا اور والد ماجد کو علم ہوگا تو وہ اللہ کے رسول ہیں، اس واپس شدہ سامان کو مصری خزانہ کی امانت سمجھ کر ضرور واپس بھیجیں گے، اس لئے بھائیوں کا دوبارہ آنا اور یقینی ہو جائے گا۔

مسئلہ: کہ جب کسی ملک میں اقتصادی حالات ایسے خراب ہو جائیں کہ اگر حکومت نظم قائم نہ کرے تو بہت سے لوگ اپنی ضروریات زندگی سے محروم ہو جائیں تو حکومت ایسی چیزوں کو اپنے نظم اور کنٹرول میں لے سکتی ہے، اور غلہ کی مناسب قیمت مقرر کر سکتی ہے، حضرات فقہاء امت نے اس کی تصریح فرمائی ہے۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

پچھلے واقعات کا اظہار:

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ جب برادران یوسفؑ حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچے تو آپؑ نے تو انہیں پہچان لیا لیکن یہ نہ پہچان سکے۔ اس وقت آپؑ نے ایک پیالہ منگوایا اپنے ہاتھ پر رکھ کر اسے انگلی سے ٹھونکا، آواز نکلی ہی تھی اسی وقت آپؑ نے فرمایا لو یہ جام تو کچھ کہہ رہا ہے اور تمہارے متعلق ہی کچھ خبر دے رہا ہے، یہ کہہ رہا ہے کہ تمہارا ایک سوتیلا بھائی تھا یوسف نامی، تم اسے باپ کے پاس سے لے گئے اور اسے کنوئیں میں پھینک دیا۔ پھر اسے انگلی ماری اور ذرا سی دیر کان لگا کر فرمایا لو یہ کہہ رہا ہے کہ

پھر تم اس کے کرتے پر جھوٹا خون لگا کر باپ کے پاس گئے اور وہاں جا کر ان سے کہہ دیا کہ تیرے لڑکے کو بھیڑیے نے کھالیا۔ اب تو یہ حیران ہوگئے اور آپس میں کہنے لگے ہائے برا ہوا، بھانڈا پھوٹ گیا اس جام نے تو تمام سچی سچی باتیں بادشاہ سے کہہ دیں۔ بس یہی ہے جو آپ کو کنوئیں میں وحی ہوئی کہ ان کے اس کرتوت کو تو انہیں ان کی بے شعوری میں جتائے گا۔ (تفسیر ابن کثیر)

فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِیْ بِهٖ فَلَا كَیْلَ لَكُمْ عِنْدِیْ

پھر اگر اس کو نہ لائے میرے پاس تو تمہارے لئے بھرتی نہیں

وَلَا تَقْرَبُوْنِ (۶۰)

میرے نزدیک اور میرے پاس نہ آئیو

بنیامین نہ آیا تو تمہیں بھی نہیں ملے گا:

یعنی نہ لائے تو سمجھا جائیگا کہ تم جھوٹ بول کر اور دھوکہ دے کر خلاف قاعدہ ایک اونٹ زیادہ لینا چاہتے تھے۔ اس کی سزا یہ ہوگی کہ آئندہ خود تمہارا حصہ بھی سوخت ہوجائیگا، بلکہ میرے پاس یا میرے قلمرو میں آنے کی بھی اجازت نہ ہوگی۔ (تفسیر عثمانی)

قَالُوْا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ وَاِنَّا لَفٰعِلُوْنَ (۶۱)

بولے ہم خواہش کریں گے اس کے باپ سے اور ہم کو یہ کام کرنا ہے

یعنی گو باپ سے اس کا جدا کرنا سخت مشکل ہے تاہم ہماری یہ کوشش ہوگی کہ باپ کو کسی تدبیر سے راضی کرلیں۔ امید ہے کہ کسی نہ کسی طرح ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہوکر رہینگے۔ (تفسیر عثمانی)

وَقَالَ لِفِتْیٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِیْ

اور کہہ دیا اپنے خدمت گاروں کو رکھ دو انکی پونجی

رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ یَعْرِفُوْنَهَاۤ اِذَا انْقَلَبُوْۤا

ان کے اسباب میں شاید اس کو پہچانیں جب

اِلٰۤى اَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ (۶۲)

پھر کر پہنچیں اپنے گھر شاید وہ پھر آجائیں

قیمت بھی واپس کردی:

یعنی جو پونجی دے کر غلہ خریدا تھا، حکم دیا کہ وہ بھی خفیہ طور پر ان کے اسباب میں رکھ دو تا گھر پہنچ کر جب اسباب کھولیں اور دیکھیں کہ غلہ کے ساتھ قیمت بھی واپس دیدی گئی تو دوبارہ ادھر آنے کی ترغیب مزید ہو کہ ایسے کریم بادشاہ کہاں ملتے ہیں۔ اور ممکن ہے قیمت نہ موجود ہونے کی بنا پر دوبارہ آنے سے مجبور رہیں اس لئے قیمت واپس کردی، بعض نے کہا کہ یوسف علیہ السلام نے بھائیوں سے قیمت لینا مروت وکرم کے خلاف سمجھا۔ (تفسیر عثمانی)

قیمت واپس کرنے کی وجہ:

بعض علماء نے کہا کہ حضرت یوسف نے تکمیل احسان اور اتمام نوازش کے جذبہ کے زیر اثر بھائیوں کا سامان واپس رکھوادیا تاکہ وہ جانیں کہ بادشاہ کی ہم پر بڑی عنایت ہے کہ اس نے سامان بھی واپس کردیا اور اسی خیال کے تحت دوبارہ مصر کو لوٹ آئیں۔ بعض نے کہا حضرت یوسف نے باپ اور بھائیوں سے غلہ کی قیمت وصول کرنا اچھا نہ سمجھا اور ایسی حالت میں کہ باپ بھائی محتاج تھے، قیمت لینے کو کمینہ پن خیال کیا۔ کلبی نے کہا یوسف کو اندیشہ ہوا کہ کہیں باپ کے پاس اور روپیہ نہ ہو اور روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ لوگ لوٹ کر نہ آئیں۔ بعض نے کہا حضرت یوسف کو معلوم تھا کہ یہ امانت دار لوگ ہیں ان کی دیانت ان کو آمادہ کرے گی کہ یہ سرمایہ لوٹا کر لائیں یا اس پونجی کو اپنے لئے حلال نہ سمجھیں گے۔ (تفسیر مظہری)

فَلَمَّا رَجَعُوْۤا اِلٰۤى اَبِیْهِمْ قَالُوْا یٰۤاَبَانَا مُنِعَ

پھر جب پہنچے اپنے باپ کے پاس بولے اے باپ روک دی گئی

مِنَّا الْكَیْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَاۤ اَخَانَا نَكْتَلْ

ہم سے بھرتی سو بھیج ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو کہ بھرتی لے آئیں

وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۶۳)

اور ہم اس کے نگہبان ہیں

یعنی یوسف کی طرح اس کے متعلق کچھ تردد نہ کیجئے۔ اب ہم چوکنے ہوگئے ہیں پوری طرح حفاظت کرینگے۔ (تفسیر عثمانی)

قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَیْهِ اِلَّا كَمَاۤ اَمِنْتُكُمْ

کہا میں کیا اعتبار کروں تمہارا اس پر مگر وہی جیسا اعتبار کیا تھا

عَلٰۤى اَخِیْهِ مِنْ قَبْلُ فَاللّٰهُ خَیْرٌ حٰفِظًا

اس کے بھائی پر اس سے پہلے، سو اللہ بہتر ہے نگہبان،

وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ (۶۴)

اور وہی ہے سب مہربانوں سے مہربان

یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: کیسے اعتماد کروں؟

یعنی یہ ہی الفاظ" وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ "تم نے یوسف کو ساتھ لے جاتے وقت کہے تھے۔ پھر تمہارے وعدہ پر کیا اعتبار ہو۔ ہاں اس وقت ضرورت شدید ہے۔ جس سے اغماض نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے تمہارے ساتھ بھیجنا ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔ سومیں اس کو خدا کی حفاظت میں دیتا ہوں۔ وہ ہی اپنی مہربانی سے اس کی حفاظت کریگا۔ اور مجھ کو یوسف کی جدائی کے بعد دوسری مصیبت سے بچائیگا۔ (تفسیر عثانی)

وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ
اور جب کھولی اپنی چیز بست پائی اپنی پونجی کہ پھیر دی گئی ان کی
رُدَّتْ اِلَيْهِمْ ۭ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا نَبْغِيْ ۭ هٰذِهٖ
طرف، بولے اے باپ ہم کو اور کیا چاہئے (جو ہم چاہتے ہیں)
بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا ۚ وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا وَنَحْفَظُ
، یہ پونجی ہماری پھیر دی ہے، ہم کو اب جائیں تو رسد لائیں ہم اپنے گھر
اَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ۭ
کو اور خبرداری کرینگے اپنے بھائی کی اور زیادہ لیویں بھرتی ایک اونٹ کی

یعنی بنیامین کا حصہ۔ (تفسیر عثانی)

ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ ﴿۶۵﴾
وہ بھرتی آسان ہے

بنیامین کو لے جانے کی کوشش:

یعنی ایسی آسان بھرتی کو چھوڑنا نہیں چاہیے۔ جس طرح ہو بنیامین کو ہمارے ساتھ بھیج دیجئے۔ بعض نے ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ " کا اشارہ پہلے جو غلہ لائے تھے اس کی طرف کیا ہے اور "یسیر" کو بمعنی قلیل لیا ہے۔ یعنی جو پہلے لائے ہیں وہ حاجت کے اعتبار سے تھوڑا ہے۔ قحط کے زمانہ میں کہاں تک کام دیگا۔ لہذا ضروری ہے کہ جس طرح بن پڑے ہم دوبارہ جائیں اور سب کا حصہ لے کر آئیں۔

قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا
کہا ہرگز نہ بھیجوں گا اس کو تمہارے ساتھ یہاں تک کہ دو
مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ ۚ
مجھ کو عہد خدا کا کہ البتہ پہنچا دو گے اس کو میرے پاس مگر یہ کہ گھیرے

فَلَمَّآ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰي مَا
(گھر جاؤ) جاؤ تم سب پھر جب دیا اسکو سب نے عہد بولا اللہ
نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ﴿۶۶﴾
ہماری باتوں پر نگہبان ہے

آخر کار بنیامین کو بھیج دیا:

یعنی اگر تقدیر الٰہی سے کوئی ایسا حادثہ پیش آجائے جس میں تم سب گھر جاؤ اور نکلنے کی کوئی سبیل نہ رہے تب تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ہاں اپنے مقدور اور زندگی بھر بنیامین کی حفاظت میں کوتاہی نہ کرو گے۔ یہ پختہ عہد و پیمان اور قسمیں لے کر زیادہ تاکید واہتمام کے طور پر فرمایا" اَللّٰهُ عَلٰي مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ "یعنی جو کچھ عہد و پیمان ہم اس وقت کر رہے ہیں وہ سب خدا کے سپرد ہیں۔ اگر کسی نے خیانت اور بدعہدی کی وہ ہی سزا دیگا یا یہ کہ قول وقرار تو اپنے مقدور کے موافق پختہ کر رہے ہیں لیکن ان باتوں سے جو مقصد اصلی ہے وہ خدا کی حفاظت ونگہبانی سے ہی پورا ہو سکتا ہے۔ خدا نہ چاہے تو سارے اسباب وتدابیر رکھی رہ جائیں کچھ نہ ہو، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں۔" ظاہری اسباب بھی پختہ کر لئے اور بھروسہ اللہ پر رکھ۔ یہی حکم ہے ہر کسی کو۔" (تفسیر عثانی)

ہدایات ومسائل:

اولاد سے گناہ وخطا ہو جائے تو قطع تعلق کے بجائے ان کی اصلاح کی فکر کرنا چاہیے:

پہلی ہدایت: برادران یوسف علیہ السلام سے جو خطا اس سے پہلے سرزد ہوئی وہ بہت سے کبیرہ اور شدید گناہوں پر مشتمل تھی، مثلاً اول جھوٹ بول کر والد کو اس پر آمادہ کرنا کہ وہ یوسف علیہ السلام کو ان کے ساتھ تفریح کے لئے بھیج دیں دوسرے والد سے عہد کر کے اس کی خلاف ورزی، تیسرے چھوٹے معصوم بھائی سے بے رحمی اور شدت کا برتاؤ، چوتھے ضعیف والد کی انتہائی دل آزاری کی پرواہ نہ کرنا، پانچویں ایک بے گناہ انسان کو قتل کرنے کا منصوبہ بنانا چھٹے ایک آزاد انسان کو جبراً اور ظلماً فروخت کر دینا۔

یہ ایسے انتہائی اور شدید جرائم تھے کہ جب یعقوب علیہ السلام پر یہ واضح ہو گیا کہ انہوں نے جھوٹ بولا ہے اور دیدہ ودانستہ یوسف علیہ السلام کو ضائع کیا ہے تو اس کا مقتضی بظاہر یہ تھا کہ وہ ان صاحبزادوں سے قطع تعلق کر لیتے، یا ان کو نکال دیتے، مگر حضرت یعقوب علیہ السلام نے ایسا نہیں کیا، بلکہ وہ بدستور والد کی حفاظت میں رہے، یہاں تک کہ انہیں کو مصر سے غلہ لانے کے لئے بھیجا، اور اس پر مزید یہ کہ دوبارہ پھر ان کے چھوٹے بھائی کے متعلق والد سے عرض معروض کرنے کا موقع ملا، اور بالآخر ان کی بات مان کر چھوٹے صاحبزادہ کو بھی ان کے حوالہ کر دیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اولاد سے کوئی گناہ وخطا سرزد ہوجائے تو باپ کو چاہیے کہ تربیت کر کے ان کی اصلاح کی فکر کرے، اور بالاخر وہ سب اپنی خطاؤں پر نادم اور گناہوں سے تائب ہوئے ہاں اگر اصلاح سے مایوسی ہوجائے اور ان کے ساتھ تعلق قائم رکھنے میں دوسروں کے دین کا ضرر محسوس ہوتو پھر قطع تعلق کر لینا انسب ہے۔

دوسری ہدایت: اس حسن معاملہ اور حسن خلق کی ہے جو یہاں حضرت یعقوب علیہ السلام سے ظاہر ہوا، کہ صاحبزادوں کے اتنے شدید جرائم کے باوجود ان کا معاملہ ایسا رہا کہ دوبارہ چھوٹے بھائی کو ساتھ لے جانے کی درخواست کرنے کی جرات کر سکے۔

تیسری ہدایت: یہ بھی ہے کہ ایسی صورت میں بغرض اصلاح خطا کار کو جتلا دینا بھی مناسب ہے کہ تمہارے معاملہ کا تقاضا تو یہ تھا کہ تمہاری بات نہ مانی جاتی، مگر ہم اس سے درگذر کرتے ہیں، تاکہ وہ آئندہ شرمندہ ہوکر اس سے کلی طور پر تائب ہوجائے، جیسا کہ یعقوب علیہ السلام نے اول جتلایا، کہ کیا بنیامین کے معاملہ میں بھی تم پر ایسا ہی اطمینان کرلوں جیسا یوسفؑ کے معاملہ میں کیا تھا، مگر جتلانے کے بعد غالب احوال سے ان کا تائب ہونا معلوم کر کے اللہ پر توکل کیا، اور چھوٹے صاحبزادے کو ان کے حوالہ کر دیا۔

چوتھی ہدایت: یہ ہے کہ کسی انسان کے وعدہ اور حفاظت پر حقیقی طور سے بھروسہ کرنا غلطی ہے، اصل بھروسہ صرف اللہ تعالی پر ہونا چاہیے، وہی حقیقی کارساز اور مسبب الاسباب ہیں، اسباب کو مہیا کرنا پھر ان میں تاثیر دینا سب انہی کی قدرت میں ہے۔ اسی لئے یعقوب علیہ السلام نے فرمایا فاللہ خیر حافظاً۔

کعب احبار کا قول ہے کہ اس مرتبہ چونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے صرف اولاد کے کہنے پر بھروسہ نہیں، کیا بلکہ معاملہ کو اللہ تعالی کے سپرد کیا، اس لئے اللہ تعالی نے فرمایا کہ قسم ہے میری عزت وجلال کی کہ اب میں آپ کے دونوں بیٹوں کو آپ کے پاس واپس بھیجوں گا۔

پانچواں مسئلہ: اس میں یہ ہے کہ اگر دوسرے شخص کا مال یا کوئی چیز اپنے سامان میں نکلے اور قرائن قویہ اس پر شاہد ہوں کہ اس نے بالقصد ہمیں دینے ہی کیلئے ہمارے سامان میں باندھ دیا ہے تو اس کو اپنے لئے رکھنا اور اس میں تصرف کرنا جائز ہے۔ جیسے یہ پونجی جو برادران یوسفؑ کے سامان سے برآمد ہوئی، اور قرائن قویہ اس پر شاہد تھے کہ کسی بھول یا نسیان سے ایسا نہیں ہوا بلکہ قصداً اس کو واپس دیدیا گیا ہے، اس لئے حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس رقم کی واپسی کی ہدایت نہیں فرمائی، لیکن جہاں یہ اشتباہ موجود ہو کہ شاید بھولے سے ہمارے پاس آگئی وہاں مالک سے تحقیق اور دریافت کئے بغیر اس کا استعمال کرنا جائز نہیں۔

چھٹا مسئلہ: اس میں یہ ہے کہ کسی شخص کو ایسی قسم دینا نہیں چاہیے جس کا پورا کرنا بالکل اس کے قبضہ میں نہ ہو، جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام نے بنیامین کو صحیح وسالم واپس لانے کی قسم دی تو اس میں سے اس حالت کو مستثنیٰ کر دیا کہ یہ بالکل عاجز ومجبور ہوجائیں یا خود بھی سب ہلاکت میں پڑ جائیں

اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب صحابہ کرامؓ سے اپنی اطاعت کا عہد لیا تو خود اس میں استطاعت کی قید لگادی، یعنی جہاں تک ہماری قدرت واستطاعت میں داخل ہے ہم آپ کی پوری اطاعت کریں گے۔

ساتواں مسئلہ: اس میں یہ ہے کہ برادران یوسف سے عہد وپیمان لینا کہ وہ بنیامین کو واپس لائیں گے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفالۃ بالنفس جائز ہے یعنی کسی مقدمہ میں ماخوذ انسان کو مقدمہ کی تاریخ پر حاضر کرنے کی ضمانت کر لینا درست ہے۔ (معارف القرآن)

وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ

اور کہا اے بیٹو نہ داخل ہونا ایک دروازہ سے

وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ؕ

اور داخل ہونا کئی دروازوں سے جدا جدا

وَمَآ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ اِنِ

اور میں نہیں بچا سکتا تم کو اللہ کی کسی بات سے حکم

الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ

کسی کا نہیں سوائے اللہ کے اسی پر مجھ کو بھروسہ ہے اور اسی پر بھروسہ

فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۶۷﴾

چاہئے بھروسہ کرنے والوں کو

نظر بد اور حسد وغیرہ سے حفاظت:

برادران یوسفؑ پہلی مرتبہ جو مصر گئے تھے عام مسافروں کی طرح بلا امتیاز شہر میں داخل ہوگئے تھے۔ لیکن یوسف علیہ السلام کی خاص توجہات والطاف کو دیکھ کر یقیناً وہاں کے لوگوں کی نظریں ان کی طرف اٹھنے لگی ہوں گی۔ اب دوبارہ جانا خاص شان واہتمام سے بلکہ کہنا چاہیے کہ ایک طرح کی یوسفؑ کی دعوت پر تھا۔ بنیامین جس کی حفاظت ومحبت حضرت یعقوب علیہ السلام یوسفؑ کے بعد بہت کرتے تھے، بھائیوں کے ہمراہ تھے۔ یعقوب علیہ السلام کو خیال گذرا کہ ایک باپ کے گیارہ وجیہ وخوش رو بیٹوں کا خاص شان سے بہیئات اجتماعی شہر میں داخل ہونا خصوصاً اس برتاؤ کے بعد جو عزیز مصر (یوسف) کی طرف سے لوگ پہلے مشاہدہ کر چکے تھے، ایسی چیز ہے جس کی

طرف عام نگاہیں ضرور اٹھیں گی۔ ''العین حق'' نظر لگ جانا ایک حقیقت ہے (اور آج کل مسمریزم کے عجائبات تو عموماً اسی قوت نگاہ کے کرشمے ہیں) یعقوب علیہ السلام نے بیٹوں کو نظر بد اور حسد وغیرہ مکروہات سے بچانے کے لئے یہ ظاہری تدبیر تلقین فرمائی کہ متفرق ہو کر معمولی حیثیت سے شہر کے مختلف دروازوں سے داخل ہوں تا کہ خواہی نہ خواہی پبلک کی نظریں ان کی طرف نہ اٹھیں ساتھ ہی یہ بھی ظاہر کر دیا کہ میں کوئی تدبیر کر کے قضا و قدر کے فیصلوں کو نہیں روک سکتا۔ تمام کائنات میں حکم صرف خدا کا چلتا ہے۔ ہمارے سب انتظامات حکم الٰہی کے مقابلہ میں بیکار ہیں۔ ہاں تدبیر کرنا بھی اسی نے بتھایا ہے اور جائز رکھا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ بچاؤ کی تدبیر کر لے مگر بھروسہ خدا پر رکھے گویا لڑکوں کو سنایا کہ میری طرح تم بھی تہ دل سے خدا کی حفاظت پر بھروسہ رکھو۔ تدابیر پر مغرور نہ بنو۔ (تفسیر عثمانی)

(بیٹے جب حضرت یعقوب کے پاس سے جانے لگے تو) یعقوب نے کہا میرے بیٹو! شہر کے ایک دروازے سے (یعنی ساتھ ساتھ) داخل نہ ہونا بلکہ الگ الگ دروازوں سے گھسنا۔ حضرت یعقوب کے بڑے بیٹے بڑے حسین وجمیل، سروقامت، گل رخسانہ، صحت مند اور طاقت ور جوان تھے اور شاہ مصر کے نزدیک ان کی عزت زباں زد خلائق تھی اس وجہ سے حضرت یعقوب کو خیال ہوا کہ کہیں (اجتماعی ہیئت میں داخل ہوتے دیکھ کر) کسی کی نظر نہ لگ جائے۔

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا احتیاط تقدیر سے نہیں بچاتی۔ رواہ الحاکم۔ امام احمد نے حضرت معاذ بن جبل کی روایت سے اور بزاز نے حضرت ابوہریرہ کی روایت سے یہ حدیث بیان کی ہے۔ (تفسیر مظہری)

معارف ومسائل

آیات مذکورہ میں برادران کا یوسف علیہ السلام کے چھوٹے بھائی کو ساتھ لے کر دوسری مرتبہ سفر مصر کا ذکر ہے، اس وقت حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کو شہر مصر میں داخل ہونے کے لئے ایک خاص وصیت یہ فرمائی کہ اب تم گیارہ بھائی وہاں جا رہے ہو تو شہر کے ایک ہی دروازے سے سب داخل نہ ہونا بلکہ شہر پناہ کے پاس پہنچ کر متفرق ہو جانا اور شہر کے مختلف دروازوں سے داخل ہونا۔

سبب اس وصیت کا یہ اندیشہ تھا کہ یہ سب نوجوان اور ماشاء اللہ صحت مند، قد آور صاحب جمال وصاحب وجاہت ہیں، ایسا نہ ہو کہ جب لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ یہ سب ایک ہی باپ کی اولاد اور بھائی بھائی ہیں تو کسی بدنظر کی نظر لگ جائے، جس سے ان کو کوئی تکلیف پہنچے، یا اجتماعی طور سے داخل ہونے کی وجہ سے کچھ لوگ حسد کرنے لگیں، اور تکلیف پہنچائیں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کو یہ وصیت پہلی مرتبہ نہیں کی، اس دوسرے سفر کے موقع پر فرمائی، اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ پہلی مرتبہ تو یہ لوگ مصر میں مسافرانہ اور شکستہ حالت میں داخل ہوئے تھے نہ کوئی ان کو پہچانتا تھا نہ کسی سے ان کے حال پر زیادہ توجہ دینے کا خطرہ تھا مگر پہلے ہی سفر میں ملک مصر نے ان کا غیر معمولی اکرام کیا، جس سے عام ارکان دولت اور شہر کے لوگوں میں تعارف ہو گیا، تو اب یہ خطرہ قوی ہو گیا کہ کسی کی نظر لگ جائے یا سب کو ایک باشوکت جماعت سمجھ کر کچھ لوگ حسد کرنے لگیں، نیز اس مرتبہ بنیامین چھوٹے بیٹے کا ساتھ ہونا بھی والد کے لئے اور زیادہ توجہ دینے کا سبب ہوا۔

نظر بد کا اثر حق ہے:

اس سے معلوم ہوا کہ انسان کی نظر لگ جانا اور اس سے کسی دوسرے انسان یا جانور وغیرہ کو تکلیف ہو جانا یا نقصان پہنچ جانا حق ہے۔ محض جاہلانہ وہم وخیال نہیں اسی لئے حضرت یعقوب علیہ السلام کو اس کی فکر ہوئی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسکی تصدیق فرمائی ہے ایک حدیث میں ہے کہ نظر بد ایک انسان کو قبر میں اور ایک اونٹ کو ہنڈیا میں داخل کر دیتی ہے، اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن چیزوں سے پناہ مانگی، اور امت کو پناہ مانگنے کی تلقین فرمائی ہے، ان میں من کل عین لامۃ بھی مذکور ہے یعنی میں پناہ مانگتا ہوں نظر بد سے۔ (قرطبی)

نظر بد کا علاج:

صحابہ کرام میں ابوسہل بن حنیف کا واقعہ معروف ہے، کہ انہوں نے ایک موقع پر غسل کرنے کیلئے کپڑے اتارے تو ان کے سفید رنگ تندرست بدن پر عامر بن ربیعہ کی نظر پڑ گئی، اور ان کی زبان سے نکلا کہ میں نے تو آج تک اتنا حسین بدن کسی کا نہیں دیکھا، یہ کہنا تھا کہ فوراً سہل بن حنیف کو سخت بخار چڑھ گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ علاج تجویز کیا کہ عامر بن ربیعہ کو حکم دیا کہ وہ وضو کریں اور وضو کا پانی کسی برتن میں جمع کریں یہ پانی سہل بن حنیف کے بدن پر ڈالا جائے ایسا ہی کیا گیا، تو فوراً بخار اتر گیا، اور وہ بالکل تندرست ہو کر جس مہم پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جا رہے تھے اس پر روانہ ہو گئے، اس واقعہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عامر بن ربیعہ کو یہ تنبیہ بھی فرمائی:

علام یقتل احدکم اخاہ الا برکت ان العین حق

''کوئی شخص اپنے بھائی کو کیوں قتل کرتا ہے تم نے ایسا کیوں نہ کیا کہ جب ان کا بدن تمہیں خوب نظر آتا تو برکت کی دعاء کر لیتے نظر کا اثر ہو جانا حق ہے''۔

اچھی چیز میں برکت کی دُعاء کرو:

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب کسی شخص کو کسی دوسرے کی جان

وہاں میں کوئی اچھی بات تعجب انگیز نظر آئے تو اس کو چاہیے کہ اس کے واسطے یہ دعا کرے کہ اللہ تعالیٰ اس میں برکت عطا فرمائیں، بعض روایات میں ہے کہ ماشاء اللہ لاقوۃ الا باللہ کہے، اس سے نظر بد کا اثر جاتا رہتا ہے، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی کی نظر بد کسی کو لگ جائے تو نظر لگانے والے کے ہاتھ پاؤں اور چہرہ کا غسالہ اسکے بدن پر ڈالنا نظر بد کے اثر کو زائل کر دیتا ہے۔

قرطبی نے فرمایا کہ تمام علماء امت اہل سنت والجماعت کا اس پر اتفاق ہے کہ نظر بد لگ جانا اور اس سے نقصان پہنچ جانا حق ہے۔

تقدیر کا لکھا پورا ہو گیا:

حضرت یعقوب علیہ السلام نے جس حقیقت کا اظہار فرمایا، اتفاق ہوا بھی کچھ ایسا ہی کہ اس سفر میں بھی بنیامین کو حفاظت کے ساتھ واپس لانے کی ساری تدبیریں مکمل کر لینے کے باوجود سب چیزیں ناکام ہوگئیں، اور بنیامین کو مصر میں روک لیا گیا، جس کے نتیجہ میں حضرت یعقوب علیہ السلام کو ایک دوسرا شدید صدمہ پہنچا ان کی تدبیر کا ناکام ہونا جو اگلی آیت میں منصوص ہے اس کا مقصد یہی ہے کہ اصل مقصد کے لحاظ سے تدبیر ناکام ہوگئی، اگرچہ نظر بد یا حسد وغیرہ سے بچنے کی تدبیر کامیاب ہوئی، کیونکہ اس سفر میں ایسا واقعہ پیش نہیں آیا، مگر بتقدیر الٰہی جو حادثہ پیش آنے والا تھا اس طرف یعقوب علیہ السلام کی نظر نہ گئی اور نہ اس کے لئے کوئی تدبیر کر سکے، مگر اس ظاہری ناکامی کے باوجود ان کے توکل کی برکت سے یہ دوسرا صدمہ پہلے صدمہ کا بھی علاج ثابت ہوا اور بڑی عافیت وعزت کے ساتھ یوسف اور بنیامین دونوں سے ملاقات انجام کار نصیب ہوئی۔

امام تفسیر قتادہؒ نے فرمایا کہ ان سب بھائیوں کے قیام کا یوسف علیہ السلام نے یہ انتظام فرمایا تھا کہ دو دو کو ایک کمرہ میں ٹھہرایا، تو بنیامین تنہا رہ گئے، ان کو اپنے ساتھ ٹھہرنے کیلئے فرمایا جب تنہائی کا موقع آیا تو یوسف علیہ السلام نے حقیقی بھائی پر راز فاش کر دیا، اور بتلا دیا کہ میں ہی تمہارا حقیقی بھائی یوسف ہوں اب تم کوئی فکر نہ کرو اور جو کچھ ان بھائیوں نے اب تک کیا ہے اس سے پریشان نہ ہو۔

احکام ومسائل

مذکورہ دو آیتوں سے چند مسائل اور احکام معلوم ہوئے، اول یہ کہ نظر بد کا لگ جانا حق ہے، اس سے بچنے کی تدبیر کرنا اسی طرح مشروع اور محمود ہے جس طرح مضر غذاؤں اور مضر افعال سے بچنے کی تدبیر کرنا۔

دوسرے یہ کہ لوگوں کے حسد سے بچنے کیلئے اپنی مخصوص نعمتوں اور اوصاف کا لوگوں سے چھپانا درست ہے۔

تیسرے یہ کہ مضر آثار سے بچنے کے لئے ظاہری اور مادی تدبیریں کرنا توکل اور شان انبیاء کے خلاف نہیں۔

چوتھے یہ کہ جب ایک شخص کو کسی دوسرے شخص کے بارہ میں کسی تکلیف کے پہنچ جانے کا اندیشہ ہو تو بہتر یہ ہے کہ اس کو آگاہ کر دے اور اندیشہ سے بچنے کی ممکن تدبیر بتلا دے جیسے یعقوب علیہ السلام نے کیا۔

پانچویں یہ کہ جب کسی شخص کو دوسرے شخص کا کوئی کمال یا نعمت تعجب انگیز معلوم ہو اور خطرہ ہو کہ اس کو نظر بد لگ جائے گی تو اس پر واجب ہے کہ اس کو دیکھ کر بارک اللہ یا ماشاء اللہ کہہ لے تاکہ دوسرے کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔

چھٹے یہ کہ نظر بد سے بچنے کیلئے ہر ممکن تدبیر کرنا جائز ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کسی دعا اور تعویذ وغیرہ سے علاج کیا جائے جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفر بن ابی طالب کے دولڑکوں کو کمزور دیکھ کر اس کی اجازت دی کہ تعویذ وغیرہ کے ذریعہ ان کا علاج کیا جائے۔

ساتویں یہ کہ دانشمند مسلمان کا کام یہ ہے کہ ہر کام میں اصل بھروسہ تو اللہ تعالیٰ پر رکھے، مگر ظاہری اور مادی اسباب کو بھی نظر انداز نہ کرے، جس قدر جائز اسباب اپنے مقصد کے حصول کے لئے اس کے اختیار میں ہوں ان کو بروئے کار لانے میں کوتاہی نہ کرے، جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام نے کیا۔ (معارف مفتی اعظم)

وَلَمَّا دَخَلُوا مِنْ حَيْثُ أَمَرَهُمْ أَبُوهُمْ

اور جب داخل ہوئے جہاں سے کہا تھا ان کے باپ نے

یعنی مختلف دروازوں سے علیحدہ علیحدہ۔

مَا كَانَ يُغْنِي عَنْهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا

کچھ نہ بچا سکتا تھا ان کو اللہ کی کسی بات سے مگر

حَاجَةً فِي نَفْسِ يَعْقُوبَ قَضَاهَا ۚ وَإِنَّهُ

ایک خواہش تھی یعقوب کے جی میں سو پوری کر چکا، اور

لَذُو عِلْمٍ لِمَا عَلَّمْنَاهُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ

وہ تو خبردار تھا جو کچھ ہم نے اس کو سکھایا، لیکن

لَا يَعْلَمُونَ ﴿٦٨﴾

بہت لوگوں کو خبر نہیں

تقدیر غالب آ گئی: یعنی جس طرح کہا تھا داخل ہوئے تو اگرچہ نظر یا ٹوک نہ لگی لیکن تقدیر اور طرف سے آئی (بنیامین کو الزام سرقہ کے سلسلہ میں

روک لیا گیا) تقدیر دفع نہیں ہوتی۔ سو جن کو علم ہے ان کو تقدیر کا یقین اور اسباب کا بچاؤ دونوں حاصل ہو سکتے ہیں لیکن بے علم سے ایک ہو تو دوسرا نہ ہو، یا ہمہ تن اسباب پر نگاہ کر کے تقدیر کا انکار کر بیٹھتا ہے یا تقدیر پر یقین رکھنے کے یہ معنی سمجھ لیتا ہے کہ اسباب کو معطل کر دیا جائے، البتہ عارف اور باخبر لوگ تقدیر و تدبیر کو جمع کرتے اور ہر ایک کو اس کے درجہ میں رکھتے ہیں۔

وَلَمَّا دَخَلُوۡا عَلٰی یُوۡسُفَ اٰوٰۤی اِلَیۡہِ اَخَاہُ
اور جب داخل ہوئے یوسف کے پاس اپنے پاس رکھا اپنے بھائی کو
قَالَ اِنِّیۡۤ اَنَا اَخُوۡکَ فَلَا تَبۡتَئِسۡ بِمَا کَانُوۡا
کہا تحقیق میں ہوں بھائی تیرا سو غمگین مت ہو ان کاموں سے جو
یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۶۹﴾
انہوں نے کئے ہیں

راز و نیاز کی باتیں:

حضرت یوسفؑ نے بنیامین کے ساتھ "ممتاز" معاملہ کیا اور خلوت میں آہستہ سے آگاہ کر دیا کہ میں تیرا حقیقی بھائی (یوسف) ہوں۔ جو مظالم ان علاتی بھائیوں نے ہم پر کئے کہ مجھے باپ سے جدا کر کے کنوئیں میں ڈالا۔ غلام بنا کر بیچا۔ اور ہمارے باپ بھائی وغیرہ کو فراق کے صدمہ میں مبتلا کیا اب یہاں آتے ہوئے تمہارے ساتھ کوئی سختی کی، ان باتوں سے غمگین مت ہو، وقت آ گیا ہے کہ ہمارے سب غم غلط ہو جائیں اور سختیوں کے بعد حق تعالیٰ راحت و عزت نصیب فرمائے۔ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں "اس بھائی کو جو یوسفؑ نے آرزو سے بلایا اور وں کو حسد ہوا۔ اس سفر میں اس کو بات بات پر جھڑکتے اور طعنے دیتے۔ اب حضرت یوسفؑ نے تسلی کر دی"۔ (تفسیر عثمانی)

بنیامین کے ساتھ خصوصی معاملہ:

وَلَمَّا دَخَلُوۡا عَلٰی یُوۡسُفَ اور جب برادران یوسف یوسف کے پاس پہنچے۔ تو کہا آپ نے جو بھائی کو لانے کا حکم دیا تھا ہم اس کو لے آئے حضرت یوسف نے کہا تم نے بہت اچھا کیا ٹھیک کیا اور تم کو عنقریب اس کا اچھا بدلہ ملے گا پھر آپ نے ان کو عزت اور آرام کے ساتھ ٹھہرایا اور ان کی مہمانی کی اور دستر خوان بچھوایا اور حکم دیا کہ (آمنے سامنے) دو دو بیٹھیں (یعنی دو دو شریک ہو جائیں حکم کی تعمیل کی گئی اور دو، دو بیٹھ گئے) بنیامین تنہا رہ گئے اور رو پڑے اور کہنے لگے اگر میرا بھائی یوسف زندہ ہوتا تو مجھے اپنے ساتھ بٹھا لیتا حضرت یوسف نے فرمایا تمہارا یہ بھائی اکیلا رہ گیا ہے میں اس کو اپنے ساتھ بٹھا لیتا ہوں۔ چنانچہ آپ نے بنیامین کو اپنے ساتھ دستر خوان پر بٹھا کر کھلایا۔ پھر رات ہوئی تو آپ نے بستر کرانے کا حکم دے دیا اور فرمایا دو دو بھائی ایک بستر پر ساتھ سو جائیں۔ بنیامین اس وقت بھی تنہا رہ گئے تو حضرت نے فرمایا یہ میرے ساتھ میرے بستر پر سو جائے گا۔ سوتے میں بنیامین کو یوسف چمٹا لیتے تھے اور ان کی خوشبو سونگھتے تھے صبح تک یونہی کرتے رہے۔ روبیل کہنے لگا (بھائیو) ہم نے تو کبھی ایسا واقعہ دیکھا نہیں (کہاں بادشاہ مصر اور کہاں ہم اور ہم پر بادشاہ کی یہ مہربانی اور بنیامین پر یہ خصوصی عنایت) صبح کو حضرت یوسف نے بھائیوں سے فرمایا میں دیکھ رہا ہوں کہ (یہ شخص اکیلا ہے) اس کا کوئی دوسرا رفیق نہیں ہے اس لئے اس کو میں اپنے ساتھ اپنے گھر میں رکھوں گا اس کے بعد آپ نے ایک مکان میں قیام کرنے کا حکم دیا اور کھانا جاری کر دیا۔

اٰوٰۤی اِلَیۡہِ اَخَاہُ اور اپنے ساتھ اپنے بھائی (بنیامین) کو جمع کر لیا۔ اور اپنے ہی ساتھ اس کو ٹھہرایا۔ جب محفل چھٹ گئی اور تنہائی کا وقت آیا تو بنیامین سے پوچھا تمہارا کیا نام ہے بنیامین نے کہا، بنیامین، یوسف نے پوچھا بنیامین کا کیا معنی، بنیامین نے کہا مردہ کا بیٹا (وضع حمل کی حالت میں بنیامین کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا) حضرت یوسف نے کہا کیا تم پسند کرو گے کہ تمہارے مرحوم بھائی کی جگہ میں تمہارا بھائی بن جاؤں بنیامین نے کہا بادشاہ کی طرح بھائی کس کو نصیب ہے لیکن آپ یعقوب اور راحیل کے بیٹے نہیں ہیں یوسف یہ سن کر رو دیئے اور کھڑے ہو کر ان کو گلے لگا لیا اور

قَالَ اِنِّیۡۤ اَنَا اَخُوۡکَ کہا میں (حقیقت میں) تمہارا بھائی ہوں۔ یعنی یوسف ہوں۔

فَلَا تَبۡتَئِسۡ بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ اب تم ان کی ان حرکات سے رنجیدہ نہ ہو جو (ہمارے ساتھ) یہ لوگ کرتے رہے ہیں۔ اللہ نے ہم پر اپنا کرم کر دیا جو اطلاع میں نے تم کو دی ہے اس کی خبر ان کو نہ دینا۔ اس کے بعد آپ نے ہر بھائی کو ایک ایک بار شتر غلہ دے دیا اور بنیامین کو بھی اس کے نام کا ایک اونٹ بھر اناج دے دیا۔ (تفسیر مظہری)

فَلَمَّا جَهَّزَهُمۡ بِجَهَازِهِمۡ جَعَلَ السِّقَایَةَ
پھر جب تیار کر دیا ان کے واسطے اسباب
فِیۡ رَحۡلِ اَخِیۡهِ ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَیَّتُهَا
ان کا رکھ دیا پینے کا پیالہ اسباب میں اپنے بھائی کے پھر پکارا پکارنے
الۡعِیۡرُ اِنَّکُمۡ لَسٰرِقُوۡنَ ﴿۷۰﴾
والے نے اے قافلہ والو تم تو البتہ چور ہو

سگے بھائی کی محبت کی مجبوری:

یعنی جب یوسف علیہ السلام کے حکم سے ان کا غلہ لدوایا اور سامان سفر تیار کیا گیا تو ایک چاندی کا پیالہ اپنے بھائی بنیامین کے اسباب میں بلا اطلاع رکھدیا۔ جس وقت قافلہ روانہ ہونے لگا محافظین کو پیالہ کی تلاش ہوئی۔ آخران کا شبہ اسی قافلہ پر گیا، قافلہ تھوڑی دور نکلا تھا کہ محافظین میں سے کسی نے آواز دی کہ ٹھہرو۔ تم لوگ یقیناً چور معلوم ہوتے ہو۔

(تنبیہ): اگر یہ لفظ یوسفؑ کے حکم سے کہے گئے تو یہ مطلب ہوگا کہ کوئی مال چراتا ہے تم وہ ہو جنہوں نے باپ کی چوری سے بھائی کو بیچ ڈالا۔ (تفسیر عثمانی)

برتن کیسا تھا:

فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِىْ رَحْلِ اَخِيْهِ پھر جب ان کو سامان سفر دے کر تیار کردیا تو پانی پینے کا کٹورا اپنے بھائی (بنیامین) کے سامان میں رکھ دیا۔ یعنی خادموں کو حکم دے دیا کہ کٹورا بنیامین کے سامان میں چھپادو۔ خادموں نے چھپادیا۔

سقایہ اور صواع دونوں سے مراد ایک ہی چیز ہے۔ سقایہ پانی پینے کا برتن جس میں بادشاہ پانی پیتا تھا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا وہ برتن زبرجد کا تھا ابن اسحاق نے کہا چاندی کا تھا۔ کسی نے کہا سونے کا تھا۔ عکرمہ نے کہا چاندی کا تھا مگر مرصع تھا۔ غلے کے احترام میں حضرت یوسف نے اس کو غلہ ناپنے کا پیمانہ مقرر کردیا تھا اور اس میں آپ پانی بھی پیتے تھے۔ سدی نے کہا بھائی کے سامان میں وہ پیمانہ پوشیدہ کرادیا اور بھائی کو بتایا بھی نہیں۔ اس کو معلوم ہی نہ ہوا۔ کعب نے کہا جب حضرت یوسف نے بنیامین سے کہا میں تمہارا بھائی ہوں تو بنیامین نے کہا اب تو میں تم کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ آپ نے فرمایا تم واقف ہو کہ میری وجہ سے باپ پر کیسا غم پڑا تھا اب اگر میں تم کو روک لوں گا تو ان کا غم اور بڑھ جائے گا اور جب تک میں تم کو بدنام کرکے مشہور نہ کردوں اور کسی نازیبا فعل کی تمہاری طرف نسبت نہ کردوں اور ناروا حرکت کا مرتکب نہ قرار دے دوں اس وقت تک میں تم کو روک بھی نہیں سکتا (روکنے کا کوئی قانون نہیں اور جھوٹی وجہ حبس قائم کرنے میں تمہاری بدنامی ہوگی) بنیامین نے کہا کچھ بھی ہو مجھے پروا نہیں جو بات آپ چاہیں کریں، میں آپ کو نہیں چھوڑوں گا۔ حضرت یوسفؑ نے کہا تو میں اپنا ناپ تمہارے سامان میں پوشیدہ کرائے دیتا ہوں پھر تمہارے اوپر چوری کا الزام قائم کردوں گا تاکہ تم کو چھوڑ دینے (اور روانہ کردینے) کے بعد پھر تم کو لوٹا لینا میرے لئے ممکن ہو سکے بنیامین نے کہا آپ جو چاہے کریں۔

قافلے کی روانگی:

ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَيَّتُهَا الْعِيْرُ اِنَّكُمْ لَسَارِقُوْنَ

پھر ایک اعلانچی نے پکارا اے قافلے والو! تم یقیناً چور ہو۔

اور واقعہ بھی اسی طرح ہوا تھا، قافلہ روانہ ہوگیا اور حضرت یوسف نے اتنی تاخیر کی کہ قافلہ ایک منزل پہنچ گیا یا گھروں کی آبادی سے نکل گیا پھر ان کے پیچھے آدمی دوڑایا جس نے پیچھے سے پہنچ کر ندا دی۔ العیر لدے ہوئے اونٹ، مجازاً مراد اونٹوں والے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا یا خیل اللہ ارکبوا اے اللہ کے سوارو سوار ہو جاؤ۔ رواہ ابوداؤد من حدیث سمرۃ بن جندب (گھوڑوں کو خیل کہتے ہیں مگر حدیث میں گھوڑوں کے سوار مراد ہیں) آمدورفت رکھنے کی وجہ سے اونٹوں کو عیر کہا جاتا ہے۔ (تفسیر مظہری)

یوسف علیہ السلام نے کہا میں تیرا بھائی یوسف ہوں سو یہ لوگ جو تیرے ساتھ بدسلوکی کرتے ہیں اس کی وجہ سے غمگین نہ ہو اللہ نے بھائی کو بھائی سے ملادیا۔ سب غم غلط ہوگئے اللہ کی رحمت نے اور پھر ان کے حسد نے ہم کو اس منزل پر پہنچایا یہ وقت نہ رنج کا ہے اور نہ شکوہ اور شکایت کا ہے بلکہ حق تعالیٰ کے شکر کا وقت ہے بنیامین نے جب یہ سنا تو خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔ اور بزبان حال یہ کہنے لگے،

آنچہ می بینم بہ بیداری است یارب یا بخواب
خویشتن راد رچنیں راحت پس ازچندیں عذاب

یوسف علیہ السلام نے بنیامین کو تسلی دی۔ اور کہا کہ اب ہم تمہیں اپنے پاس رکھنے کی تدبیر کریں گے۔

حیلہ اور توریہ کا مسئلہ:

حق تعالیٰ کا یہ ارشاد جَعَلَ السِّقَايَةَ فِىْ رَحْلِ اَخِيْهِ اس امر کی دلیل ہے کہ کسی جائز غرض کے حصول کے لئے حیلہ کرنا جائز ہے البتہ ابطال حق یا احقاق باطل کے لئے حیلہ ناجائز ہے اور یہی فقہاء حنفیہ کا مذہب ہے مضائق اور تنگی کے مواقع سے نکلنے کے لئے حضرات انبیاء سے توریہ کرنا ثابت ہے۔ حضرت ابراہیم کا توریہ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ قرآن کریم میں مذکور ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا غزوات میں توریہ فرمانا اور اعداء اللہ کے قتل کرنے کیلئے صحابہ کو توریہ کی اجازت دینا کتب صحاح میں مذکور ہے۔ حالانکہ توریہ بھی ایک قسم کا حیلہ ہی ہے فرق اتنا ہے کہ توریہ حیلہ قولی ہے اور حیلہ میں فعل ہوتا ہے اور یوسف علیہ السلام کا یہ حیلہ یعنی بھائی کے سامان میں سقایہ کا رکھ دینا بظاہر حکم خداوندی سے تھا جیسا کہ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ صراحۃً اس پر دلالت کرتا ہے کہ یوسفؑ کا یہ کید اور یہ حیلہ بحکم خداوندی تھا اور اس کی مرضی کے مطابق تھا اور اس کے بعد حق تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ۗ وَفَوْقَ كُلِّ ذِىْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس قسم کا حیلہ اور کید وہی شخص کرتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص علم و معرفت عطا ہوا ہو اور ایسا علم موجب رفع درجات ہے

اورقرآن کریم میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایوب علیہ السلام کوحکم دیا وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ یعنی اے ایوبؑ! ''تم اپنے ہاتھ میں سینکوں کا ایک مٹھا اٹھالو اوراس سے مارلو اور قسم نہ توڑو''

یہ بھی ایک قسم کا حیلہ تھا جس کا اللہ تعالیٰ نے ایوب علیہ السلام کوحکم دیا تھا اورحضرت ابراہیم نے اپنی بیوی کے متعلق فرمایا هذا اختی یہ میری بہن ہے تاکہ کافر کے شر سے محفوظ رہیں معلوم ہوا کہ مضرت سے بچنے کیلئے حیلہ کا استعمال شرعاً محمود ہے اوراللہ کے نزدیک پسندیدہ ہے اوراس مقام پرحق جل شانہ نے یوسف علیہ السلام کے اس حیلہ کوبطریق استحسان ذکر فرمایا ہے۔ (معارف کاندھلویؒ)

قَالُوْا وَاَقْبَلُوْا عَلَيْهِمْ مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ ﴿۷۱﴾

کہنے لگے منہ کر کے ان کی طرف تمہاری کیا چیز گم ہوگئی

یعنی ہم کوخواہ مخواہ چور کیوں بناتے ہو۔ اگرتمہاری کوئی چیز گم ہوئی ہے وہ بتلاؤ ہم ابھی کہیں گئے نہیں ہمارے اسباب میں تلاش کرلو۔ (تفسیرعثمانی)

قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ

بولے ہم نہیں پاتے بادشاہ کا پیمانہ اور جوکوئی اس کو لائے اس کو ملے

حِمْلُ بَعِيْرٍ وَّاَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ ﴿۷۲﴾

ایک بوجھ اونٹ کا اور میں ہوں اس کا ضامن

محافظین نے کہا، بادشاہ کے پانی پینے کا پیالہ یا غلہ ناپنے کا پیمانہ گم ہوگیا ہے۔ اگر بدون حیل وحجت کے کوئی شخص حاضر کردیگا تو غلہ کا ایک اونٹ انعام پائیگا۔ میں اس کا ذمہ دار ہوں۔ (تفسیرعثمانی)

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي

بولے قسم اللہ کی تم کو معلوم ہے ہم شرارت کرنے کو نہیں آئے

الْاَرْضِ وَمَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ ﴿۷۳﴾

ملک میں اور نہ ہم کبھی چور تھے

یعنی مصر میں ہمارا چال چلن عام طور پرمعلوم ہے کیا کوئی بتلاسکتا ہے کہ ہم نے یہاں کبھی کچھ شرارت کی؟ نہ ہم شرارتوں کے لئے یہاں آئے، اور نہ چوروں کے خاندان سے ہیں۔ (تفسیرعثمانی)

قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿۷۴﴾

بولے پھر کیا سزا ہے اس کی، اگر تم نکلے جھوٹے

محافظین نے کہا کہ تم فضول حجتیں کررہے ہو۔ اگر مال مسروقہ تمہارے پاس سے برآمد ہوگیا تو کیا کروگے۔ (تفسیرعثمانی)

قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ فَهُوَ

کہنے لگے اس کی سزا یہ ہے کہ جس کے اسباب میں سے ہاتھ آئے

جَزَآؤُهٗ ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۷۵﴾

وہی اس کے بدلے میں جائے ہم یہی سزا دیتے ہیں ظالموں کو

اس دور میں چور کی سزا: یہ شریعت ابراہیمی میں چور کی سزا تھی۔ یعنی جس کے پاس سے چوری نکلے وہ ایک سال تک غلام ہوکر رہے۔ برادران یوسفؑ نے اپنے قانون شرعی کے موافق بے تامل سزا کا ذکر کردیا۔ کیونکہ انہیں پورا یقین تھا کہ ہم چور نہیں۔ نہ چوری کا مال ہمارے پاس سے برآمد ہوسکتا ہے۔ اس طرح اپنے اقرار سے خود پکڑے گئے۔ (تفسیرعثمانی)

فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ ثُمَّ

پھر شروع کیں یوسف نے ان کی خرجیاں دیکھنی اپنی بھائی کی خرجی

اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ ۭ

سے پہلے آخر کو وہ برتن نکالا اپنے بھائی کی خرجی سے

پیالہ برآمد ہوگیا:

یعنی اس گفتگو کے بعد محافظین ان کو ''عزیز مصر'' (یوسف علیہ السلام) کے پاس لے گئے اور سب ماجرا کہہ سنایا انہوں نے تفتیش کا حکم دیا۔ پہلے دوسرے بھائیوں کی خرجیاں (زنبیلیں اور بیگ وغیرہ) دیکھے گئے، پیالہ برآمد نہ ہوا۔ اخیر میں بنیامین کے اسباب کی تلاشی، ہوئی چنانچہ پیالہ اس میں سے نکل آیا۔ (تفسیرعثمانی)

فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ پس اپنے بھائی کے تھیلے سے پہلے دوسرے بھائیوں کے تھیلوں کی تلاشی شروع کی، یعنی بنیامین کے سامان کی تلاشی سے پہلے ایک ایک کر کے بھائیوں کے سامان کی تلاشی لی اورانہیں کی تلاشی سے آغاز کیا، تاکہ کسی کو شبہ نہ ہو۔ قتادہ۔ نے کہا ہم سے بیان کیا گیا ہے کہ جب بھی کسی کے سامان کو کھولتے اوراس کے تھیلے کے اندر دیکھتے تھے تو تہمت لگانے کے گناہ کے خوف سے استغفراللہ کہتے تھے (کیونکہ جانتے تھے کہ میں تلاشی غلط لے رہا ہوں یہ شخص چور نہیں ہے) جب سب کی تلاشی ہوچکی اورصرف بن یامین رہ گیا تو خود ہی بولے میرے خیال میں اس نے نہیں لیا ہے

(اس کی تلاشی لینے کی ضرورت نہیں) بھائیوں نے کہا خدا کی قسم جب تک اس کی بھی تلاشی نہ لی جائے گی ہم نہیں چھوڑیں گے، اس سے آپ کے دل کو بھی پورا اطمینان ہو جائے گا اور ہمارے دلوں کو بھی۔

بنیامین کو بھائیوں کی ملامت:

ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ ۭ آخر (بنیامین کا سامان کھولا اور) اپنے بھائی (بنیامین) کے تھیلے سے پیمانہ برآمد کر لیا۔ یہ دیکھ کر بھائیوں نے شرم کے مارے سر جھکا لیے اور بنیامین کی طرف رخ کر کے کہنے لگے تو نے یہ کیا حرکت کی ہمارے منہ کالے کر دیئے ہم کو رسوا کر دیا تو نے یہ لیا کب۔ اے اولاد راحیل تمہارے ہاتھوں ہمیشہ ہم پر مصیبت ہی آئی ہے، بنیامین نے کہا اولاد راحیل کو ہمیشہ تمہارے ہاتھوں مصائب اٹھانے پڑے ہیں تم نے ہی میرے بھائی کو لے جا کر جنگل میں ہلاک کیا (رہا یہ معاملہ تو) یہ پیمانہ اس نے میرے سامان میں رکھا جس نے تمہارے سامانوں میں تمہارا سرمایہ رکھا تھا۔ غرض (بنیامین) غلامی میں پکڑ لیا گیا اسی آدمی (یعنی تلاشی لینے والے) نے بنیامین کی گردن پکڑ کر یوسف کے روبرو پیش کر دیا جیسے چوروں کو لے جایا جاتا تھا۔ (تفسیر مظہری)

كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ۭ
یوں داؤ بتا دیا ہم نے یوسف کو

یا یوں تدبیر کی ہم نے یوسف کے لئے۔ (تفسیر عثمانی)

مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّآ
وہ ہرگز نہ لے سکتا تھا اپنے بھائی کو دین (قانون) میں اس بادشاہ
اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ ۭ
کے مگر جو چاہے اللہ

یہ تدبیر اللہ نے کی:

یعنی بھائیوں کی زبان سے آپ ہی نکلا کہ جس کے پاس مال نکلے غلام بنا لو۔ اس پر پکڑے گئے ورنہ حکومت مصر کا قانون یہ نہ تھا۔ اگر ایسی تدبیر نہ کی جاتی کہ وہ خود اپنے اقرار میں بندھ جائیں تو ملکی قانون کے موافق کوئی صورت بنیامین کو روک لینے کی نہ تھی۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت ابن عباس نے اس جگہ دین کا ترجمہ کیا سلطان (عملداری) اور قتادہ نے کہا حکم (اور قانون)

اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ ۭ ہاں اللہ کو منظور ہوتا تو وہ اس حکم کو بادشاہ کا حکم کر سکتا تھا (استثنا منقطع ہے) چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت یوسف نے اپنے بھائیوں سے دریافت کیا کہ تمہارے نزدیک چور کی سزا کیا ہونی چاہیے تو اللہ نے ان سے کہلوا دیا کہ چوری کی سزا یہ ہے کہ چور کو مالک مال کا غلام بن جانا ہوگا اس طرح بمشیت الٰہی حضرت یوسف کا مقصد حاصل ہو گیا۔ (تفسیر مظہری)

نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاۗءُ ۭ
ہم درجے بلند کرتے ہیں جس کے چاہیں

اللہ کی کارسازی:

یعنی جسے چاہیں حکمت و تدبیر سکھلائیں۔ یا اپنی تدبیر لطیف سے سربلند کریں۔ دیکھو وہ ہی لوگ جنھوں نے باپ کی چوری سے یوسف کو چند درہم میں بیچ ڈالا تھا۔ آج یوسف کے سامنے چوروں کی حیثیت میں کھڑے ہیں شاید اس طرح ان کی پچھلی غلطیوں کا کفارہ کرنا ہوگا۔ (تفسیر عثمانی)

معارف ومسائل

آیات مذکورہ میں اس کا بیان ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے حقیقی بھائی بنیامین کو اپنے پاس روک لینے کے لئے یہ حیلہ اور تدبیر اختیار کی کہ جب سب بھائیوں کو قاعدہ کے موافق غلہ دیا گیا تو ہر بھائی کا غلہ ایک مستقل اونٹ پر علیحدہ علیحدہ نام بنام بار کیا گیا۔

نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاۗءُ ۭ وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ

''یعنی ہم جس کے چاہتے ہیں درجات بلند کر دیتے ہیں، (جیسا اس واقعہ میں یوسف علیہ السلام کے درجات ان کے بھائیوں کے مقابلہ میں بلند کر دیئے گئے) اور ہر علم والے کے اوپر اس سے زیادہ علم والا موجود ہے''۔

مطلب یہ ہے کہ مخلوق میں ہم نے علم کے اعتبار سے بعض کو بعض پر فوقیت دی ہے۔ بڑے سے بڑے عالم کے مقابلہ میں کوئی اس سے زیادہ علم رکھنے والا ہوتا ہے اور اگر کوئی شخص ایسا ہے کہ پوری مخلوقات میں کوئی اس سے زیادہ علم نہیں رکھتا تو پھر رب العزت جل شانہ کا علم تو سب سے بالاتر ہے ہی۔

احکام ومسائل

آیات مذکورہ سے چند احکام و مسائل حاصل ہوئے:

اول: آیت وَلِمَنْ جَاۗءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ سے ثابت ہوا کہ کسی معین کام کے کرنے پر کوئی اجرت یا انعام مقرر کر کے اعلان عام کر دینا کہ جو شخص یہ کام کرے گا اس کو اس قدر انعام یا اجرت ملے گی، جیسے اشتہاری مجرموں کے گرفتار کرنے پر یا گمشدہ چیزوں کی واپسی پر اس طرح کے انعامی اعلانات کا عام طور پر رواج ہے، اگرچہ اس صورت معاملہ پر فقہی اجارہ کی تعریف صادق نہیں آتی مگر اس آیت کی رو سے اس کا بھی جواز ثابت ہو گیا۔ (قرطبی)

دوسرے اَنَابِهٖ زَعِيْمٌ سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی طرف سے حق مالی کا ضامن بن سکتا ہے اور اس صورت کا حکم جمہور فقہائے امت کے نزدیک یہ ہے کہ صاحب حق کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنا مال اصل مدیون سے یا ضامن سے جس سے بھی چاہے وصول کر سکتا ہے ہاں اگر ضامن سے وصول کیا گیا تو ضامن کو حق ہوگا کہ جس قدر مال اس سے لیا گیا ہے وہ اصل مدیون سے وصول کرے۔ (قرطبی خلافا لمالک)

تیسرے كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ سے معلوم ہوا کہ کسی شرعی مصلحت کی بناء پر معاملہ کی صورت میں کوئی ایسی تبدیلی اختیار کرنا جس سے احکام بدل جائیں جس کو فقہاء کی اصلاح میں حیلہ شرعیہ کہا جاتا ہے یہ شرعاً جائز ہے شرط یہ ہے کہ اس سے شرعی احکام کا ابطال لازم نہ آتا ہو ورنہ ایسے حیلے باتفاق فقہاء حرام ہیں جیسے زکوۃ سے بچنے کیلئے کوئی حیلہ کرنا یا رمضان سے پہلے کوئی غیر ضروری سفر صرف اس لئے اختیار کرنا کہ روزہ نہ رکھنے کی گنجائش نکل آئے یہ باتفاق حرام ہے ایسے ہی حیلے کرنے پر بعض اقوام پر عذاب الٰہی آیا ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے حیلوں سے منع فرمایا ہے اور باتفاق امت حرام ہیں، ان پر عمل کرنے سے کوئی کام جائز نہیں ہو جاتا بلکہ دوہرا گناہ لازم آتا ہے ایک تو اصل ناجائز کام کا دوسرے یہ ناجائز حیلہ جو ایک حیثیت سے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ چالبازی کا مرادف ہے اسی طرح کے حیلوں کے ناجائز ہونے کو امام بخاریؒ نے کتاب الحیل میں ثابت کیا ہے۔ (معارف مفتی اعظم)

وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ۝
اور ہر جاننے والے سے اوپر ہے ایک جاننے والا

یعنی دنیا میں ایک آدمی سے زیادہ دوسرا، دوسرے سے زیادہ تیسرا جاننے والا ہے مگر سب جاننے والوں کے اوپر ایک جاننے والا اور ہے جسے ''عالم الغیب والشہادہ'' کہتے ہیں۔

یوسف علیہ السلام نے خلاف واقعہ کچھ نہیں کہا:

(تنبیہ): واضح ہو کہ اس تمام واقعہ میں حضرت یوسف علیہ السلام کی زبان سے کوئی لفظ خلاف واقعہ نہیں نکلا۔ نہ کوئی حرکت خلاف شرع ہوئی زیادہ سے زیادہ انہوں نے ''توریہ'' کیا ''توریہ'' کا مطلب ہے ایسی بات کہنا یا کرنا جس سے دیکھنے سننے والے کے ذہن میں ایک ظاہری اور قریبی مطلب آئے لیکن متکلم کی مراد دوسری ہو جو ظاہری مطلب سے بعید ہے۔ اگر یہ ''توریہ'' کسی نیک اور محمود مقصد کے لئے کیا جائے تو اس کے جائز بلکہ محمود ہونے میں شبہ نہیں۔ اور کسی مذموم و قبیح غرض کیلئے ہو تو وہ ''توریہ'' نہیں دھوکہ اور فریب ہے۔ یہاں حق تعالیٰ کو منظور تھا کہ یعقوب علیہ السلام کے ابتلاء و امتحان کی تکمیل کر دی جائے۔ یوسفؑ کے بعد بنیامین بھی ان سے جدا ہوں ادھر مدت کے بچھڑے ہوئے دو عینی بھائی آپس میں مل کر رہیں۔ یوسف کو امتحان کی گھاٹیوں سے نکالنے کے بعد اول علاتی بھائیوں پھر عینی بھائی پھر والد بزرگوار اور سب کنبہ سے بتدریج ملائیں۔ دوسری طرف برادران یوسف سے جو غلطیاں ہوئی تھیں کچھ ٹھوکریں کھا کر وہ بھی عفو و رحم کے دروازہ پر پہنچ جائیں۔ اور نہ معلوم کیا کیا حکمتیں ہونگی جن کی وجہ سے یوسف علیہ السلام کو تھوڑا سا ''توریہ'' کرنے کی ہدایت ہوئی۔ انہوں نے پیالہ اپنے بھائی کے اسباب میں رکھا۔ پھر نہ کسی پر اس کی چوری کا الزام لگایا نہ یہ کہا کہ ہم فلاں کو چوری کی سزا میں پکڑتے ہیں صورتیں ایسی پیدا ہوتی چلی گئیں جن سے آخر میں بنیامین کے لئے اپنے بھائی کے پاس عزت و راحت کے ساتھ رہنے کی سبیل نکل آئی۔ مصلحۃً بعض ایسے الفاظ بیشک استعمال کئے جن کے معنی متبادر مراد نہ تھے یا بعض چیزوں پر سکوت کیا جن کی نسبت اگر کچھ بولتے تو راز فاش ہو کر اصل مقصد فوت ہو جاتا۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانی)

علمی برتری:

وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ اور ہر جاننے والے سے اوپر دوسرا جاننے والا ہے یعنی ہر ذی علم مخلوق سے زیادہ اللہ علیم ہے۔ علیم کا معنی ہے بہت زیادہ علم رکھنے والا (مراد اللہ) یا ہر ذی علم مخلوق سے اوپر دوسری ذی علم مخلوق ہے۔ خواہ یہ فوقیت علمی بعض لحاظ سے ہو جیسے حضرت خضر کو بعض اعتبار سے حضرت موسیٰ پر علمی فوقیت حاصل تھی (اگرچہ حضرت موسیٰ نبی مرسل ہونے کی وجہ سے صاحب شریعت تھے اور حضرت خضر پر علمی برتری رکھتے تھے مگر بعض کائناتی واقعات کا انکشاف حضرت خضر کو تھا حضرت موسیٰ کو نہ تھا) اسی بناء پر حضرت خضر نے حضرت موسیٰ سے کہا تھا موسیٰ جو علم مجھے اللہ نے عطا فرمایا ہے اس سے تم ناواقف ہو اور جو علم تم کو اللہ نے عطا فرمایا ہے اس کو میں نہیں جانتا۔ یہ حدیث بخاری نے حضرت خضر و موسیٰ کے طویل قصہ کے ذیل میں نقل کی ہے۔ یہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا تم اپنی دنیا کے کاموں کو (خود ہی) مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔ آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی شخص ہر اعتبار سے اور ہر حیثیت سے دوسرے سے برتر ہے ورنہ تسلسل علمی لازم آئے گا (اگر علم کی انتہا اللہ کی ذات پر نہ مانی جائے اور یونہی مخلوق میں باہم علمی برتری اور کامل برتری کا سلسلہ قائم کیا جائے تو یہ برتری کہیں جا کر نہیں ٹھہرے گی۔ علمی تسلسل کا یہی معنی ہے) حضرت ابن عباس نے فرمایا ہر عالم کے اوپر دوسرا عالم ہے اور یہ سلسلہ اللہ کی ذات پر جا کر ختم ہوتا ہے پس اللہ ہر عالم سے بڑھ کر علم رکھنے والا ہے۔ (تفسیر مظہری)

قَالُوْٓا اِنْ یَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّہٗ مِنْ

کہنے لگے اگر اس نے چرایا تو چوری کی تھی اسکے ایک بھائی نے بھی

قَبْلُ

اس سے پہلے

بھائیوں نے اپنا دامن صاف کر دکھایا:

یہ اشارہ یوسف علیہ السلام کی طرف تھا۔ اپنی پاکبازی جتانے کے لئے محض ناحق کوشی اور عناد سے بنیامین کے جرم کو پختہ کر دیا اور اتنی مدت کے بعد بھی یوسفؑ معصوم پر جھوٹی تہمت لگانے سے نہ شرمائے مفسرین نے اس موقع پر کئی قصے بیان کئے ہیں جن کی طرف برادران یوسفؑ نے چوری کے لفظ میں اشارہ کیا تھا۔ ان کے نقل کی یہاں حاجت نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

قَالُوْٓا اِنْ یَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّہٗ مِنْ قَبْلُ برادران یوسف نے کہا اگر یہ (بنیامین) چوری کرتا ہے تو (کوئی تعجب نہیں) اس سے پہلے اس کے ایک بھائی نے بھی چوری کی تھی۔ یعنی یوسف نے بھی چوری کی تھی جو اس کا ماں جایا تھا۔

یوسفؑ نے بت توڑا تھا:

سعید بن جبیر اور قتادہ نے کہا حضرت یوسف کے نانا کا ایک بت تھا وہ اس کی پوجا کرتا تھا حضرت یوسف نے خفیہ طور پر اس کو لے لیا اور توڑ کر راستہ میں پھینک دیا تاکہ نانا اس کی پوجا نہ کر سکے۔ کذا اخرج ابن مردویہ عن ابن عباس مرفوعاً۔ ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے سعید بن جبیر کی روایت سے بھی اسی طرح یہ حدیث نقل کی ہے۔

سخی گھرانہ:

بغوی نے لکھا ہے کہ مجاہد نے بیان کیا ایک روز ایک سائل آیا حضرت یوسف دسترخوان سے (چھپا کر) کچھ کھانا اٹھا لیتے تھے اور فقیروں کو دیدیتے تھے اس روز بھی ایسا ہی کیا۔

میں کہتا ہوں حضرت یوسف سخی گھرانے کے ایک فرد تھے اور فقیروں کو دینے پر حضرت یعقوب راضی تھے اس لیے یہ چوری نہ تھی بھائیوں نے یوسف کی جلن کی وجہ سے اس کو چوری کہا۔

یوسف علیہ السلام کی پرورش:

محمد بن اسحاق نے مجاہد کے حوالہ سے بیان کیا کہ حضرت یوسف کی والدہ راحیل کا انتقال ہوگیا تو آپ اپنی پھوپھی بنت اسحاق کے پاس رہنے لگے پھوپھی کو آپ سے بڑی محبت تھی اور پھوپھی نے ہی آپ کو پرورش کیا جب آپ بڑے ہوگئے حضرت یعقوب کو آپ سے حد سے زیادہ محبت ہوگئی اور آپ نے اپنی بہن سے کہا بہن اب تم یوسف کو مجھے دیدو۔ خدا کی قسم یوسف کا ایک ساعت بھی میری نظر سے غائب ہونا میرے لئے ناقابل برداشت ہوگیا ہے، بہن نے کہا ایسا نہیں ہوسکتا حضرت یعقوب نے فرمایا میں اس کو چھوڑنے والا نہیں۔ بہن نے کہا اچھا تو چندروز کے لئے میرے پاس رہنے دو۔ شاید چندروز کے بعد اللہ مجھے اس کی طرف سے صبر عطا کردے حضرت یعقوب نے یہ بات مان لی حضرت اسحاق کی کمر کا ایک پٹکا تھا اور بطور وراثت بڑی اولاد کو ملتا تھا حضرت یعقوب کی بہن آپ سے بڑی تھیں اس لئے وہ پٹکا بہن کو ملا تھا اور ان کے پاس تھا۔ بہن نے یہی پٹکا حضرت یوسف کی کمر سے (کپڑوں کے اندر) لپیٹ دیا۔ پھر خود ہی کہا حضرت اسحاق کا پٹکا گم ہوگیا ہے۔ گھر والوں کی تلاشی لی جائے گی، چنانچہ سب کی تلاشی لی گئی تو حضرت یوسف کے پاس برآمد ہوگیا، حضرت یعقوب کی بہن نے کہا اب تو یہ میری سپردگی میں رہے گا، حضرت یعقوب نے فرمایا اس نے اگر ایسا کیا ہے تو تمہاری ہی سپردگی میں رہے گا۔ (حضرت اسحاق کی شریعت میں چور کا مالک مال والا ہوجاتا تھا) غرض اس تدبیر سے حضرت یعقوب کی بہن نے حضرت یوسف کو مرتے دم تک اپنے پاس روکے رکھا۔ یہی بات آپ کے بھائیوں نے آپ کے متعلق کہی اِنْ یَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّہٗ مِنْ قَبْلُ (تفسیر مظہری)

فَاَسَرَّھَا یُوْسُفُ فِیْ نَفْسِہٖ وَلَمْ یُبْدِھَا لَھُمْ قَالَ

تب آہستہ سے کہا یوسف نے اپنے جی میں اور ان کو نہ جتایا کہا جی میں

اَنْتُمْ شَرٌّ مَّکَانًا وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ ﴿۷۷﴾

کہ تم بدتر ہو درجہ میں اور اللہ خوب جانتا ہے جو تم بیان کرتے ہو

یوسف علیہ السلام کا حوصلہ:

یعنی ایسا سخت لفظ سن کر بھی یوسفؑ بے قابو نہیں ہوئے، کیونکہ مصلحت خداوندی افشائے راز کو مقتضی نہ تھی یوسفؑ نے بات کو دل میں رکھا۔ جواب دیکر ان کے اتہام کی حقیقت نہ کھولی۔ اپنے جی میں کہا اَنْتُمْ شَرٌّ مَّکَانًا وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ "یعنی الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے، مجھے چور بناتے ہو؟ حالانکہ تم نے ایسی چوری کی کہ بھائی کو باپ سے چرا کر بیچ ڈالا۔ باقی میری چوری کا حال اللہ کو معلوم ہے۔ بعض مفسرین نے قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّکَانًا الخ کا مطلب یہ لیا ہے کہ یوسف نے ان کو خطاب کرکے کہا کہ تم بڑے ہی بدترین لوگ ہو۔ ابھی تو کہہ رہے تھے "وَمَا کُنَّا سٰرِقِیْنَ" ہم چوروں میں کے نہیں۔ جب ایک بھائی کے اسباب میں سے مال برآمد ہوا تو اس کے ساتھ دوسرے غیر حاضر بھائی کو بھی ملوث کرنے لگے

گویا چوری کرنا تمہارا خاندانی پیشہ ہے (العیاذ باللہ) خدا خوب جانتا ہے کہ تم اپنے بیان میں کہاں تک سچے ہو۔ وہ ہی تم کو غلط بیانیوں کی سزا دیگا۔ (تفسیر عثمانی)

روبیل کا غصہ:

جب حضرت یوسف نے بنیامین پر قبضہ کر لیا تو بھائی غضبناک ہو گئے۔ اولاد یعقوب کو غصہ آتا تھا تو ان کے غصہ کو برداشت کرنے کی تاب کسی میں نہیں رہتی تھی۔ روبیل کی تو یہ حالت تھی کہ اس کے غصہ کے سامنے کوئی چیز ٹھہری نہیں رہتی تھی جب وہ غصہ سے چیختا تھا تو حاملہ عورتوں کے حمل دہشت کی وجہ سے گر جاتے تھے لیکن یہ بھی ان کی خصوصیت تھی کہ غصہ کی حالت میں اگر نسل یعقوب میں سے کوئی شخص ان کے ہاتھ سے چھو دیتا تھا تو غصہ فرو ہو جاتا تھا۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ یہ خصوصیت اور حالت شمعون کی تھی۔

غرض سب بھائی یوسف کے پاس پہنچے روبیل نے کہا یا تو ہمارے بھائی کو واپس دو ورنہ میں ایسی چیخ ماروں گا کہ مصر کی ہر حاملہ عورت کا حمل گر جائے گا غصہ سے روبیل کے بدن کے بال کھڑے ہو گئے اور کپڑوں سے باہر نکل آئے حضرت یوسف کا ایک چھوٹا بچہ تھا آپ نے بچہ سے فرمایا: روبیل کے برابر جا کر اس کو ہاتھ سے چھو دو، دوسری روایت میں آیا ہے کہ آپ نے بچے سے فرمایا اس کا ہاتھ پکڑ کر میرے پاس لے آؤ۔ بچے نے جا کر روبیل کو ہاتھ لگا دیا۔ بچے کا ہاتھ لگانا تھا کہ روبیل کا غصہ جاتا رہا، کہنے لگا یہاں یعقوبؑ کے تخم کا کوئی تخم ضرور موجود ہے۔ حضرت یوسفؑ نے فرمایا (یعقوبؑ کے تخم کا تخم کیا) یعقوب کا بیٹا موجود ہے۔ اس روایت میں آیا ہے کہ روبیل کو دوبارہ غصہ آیا تو حضرت یوسفؑ نے اس کے ایک ٹھوکر ماری اور گریبان سے پکڑ کر زمین پر گرا دیا اور فرمایا عبرانیو! تم گمان کرتے ہو کہ تم سے زیادہ طاقت ور (دنیا میں) کوئی اور نہیں ہے جب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا اور بھائی سمجھ گئے کہ بنیامین کو کسی طرح چھڑا نہیں سکتے تو عاجزی کرنے لگے اور نرم پڑ گئے۔ (تفسیر مظہری)

قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗٓ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا

کہنے لگے اے عزیز اس کا ایک باپ ہے بوڑھا بڑی عمر کا سو رکھ لے ایک کو

فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۷۸﴾

ہم میں سے اس کی جگہ ہم دیکھتے ہیں تو ہے احسان کرنیوالا

بھائیوں کی منت سماجت:

یعنی بوڑھے باپ کو بڑا صدمہ پہنچے گا، وہ ہم سب سے زیادہ اس کو اور اس کے بھائی یوسف کو چاہتے تھے۔ یوسف کے بعد اب اسی سے اپنے دل کو تسلی دیتے ہیں۔ آپ اگر اس کی جگہ ہم میں سے کسی ایک کو رکھ لیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ آپ ہمیشہ مخلوق پر احسانات کرتے ہیں اور ہم پر خصوصی احسان فرماتے رہے ہیں۔ امید ہے ہم کو اپنے کرم سے مایوس نہ فرمائینگے۔ (تفسیر عثمانی)

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا

بولا اللہ پناہ دے کہ ہم کسی کو پکڑیں مگر جس کے پاس پائی

مَتَاعَنَا عِنْدَهٗٓ ۙ

ہم نے اپنی چیز

یوسف علیہ السلام نے کہا ہم بے انصافی نہیں کر سکتے:

یعنی خدا کی پناہ کہ ہم کسی کو بے سبب دوسرے کے بدلے میں پکڑنے لگیں، ہم تو صرف اسی شخص کو روکیں گے، جس کے پاس سے اپنی چیز ملی ہے۔ (وہ بنیامین ہے جو عینی بھائی ہونیکی حیثیت سے ہمارے پاس رہیگا) یہاں بھی اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗ کی جگہ ''الا من سرق'' نہیں فرمایا جو مختصر تھا۔ کیونکہ واقع کے خلاف ہوتا۔ (تفسیر عثمانی)

یوسف علیہ السلام نے کہا خدا کی پناہ! خدا بے انصافی سے بچائے کہ ہم اس شخص کے سوا جس کے پاس ہم نے اپنا مال پایا ہے کسی دوسرے شخص کو پکڑیں اگر ہم ایسا کریں تو ہمارے ظالم ہونے میں کوئی شک نہیں کہ جس کے پاس سے مال برآمد ہوا اس کو تو چھوڑ دیں اور اس کی جگہ دوسرے کو بے وجہ پکڑ لیں تو تمہارے دین کے اعتبار سے بھی یہ صریح ظلم اور بے انصافی ہے جاننا چاہیے کہ یوسف علیہ السلام کی یہ تمام کارروائی خداوند تعالیٰ کے حکم سے تھی بھائی کو روکنے کے لئے خدائے تعالیٰ نے یہ حیلہ بتلایا۔

چوں طمع خواہد ز من سلطان دیں   خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

وحی کا اتباع ضروری ہے:

اس لئے یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر میں اللہ کی وحی اور اس کے حکم کے خلاف کروں تو ظالم ٹھہروں اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی کے مجھ کو بنیامین کے روکنے کا حکم دیا ہے میں اگر اس کو چھوڑ دوں اور اس کے بدلہ دوسرے کو لے لوں تو اللہ کے نزدیک ظالم ٹھہروں گا۔ نبی پر یہ فرض ہے کہ اپنی وحی اور الہام کا اتباع کرے اگرچہ بظاہر وہ شریعت کے خلاف نظر آئے جیسا کہ قرآن کریم میں حضرت خضر علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو افعال خضر علیہ السلام سے سرزد ہوئے ان میں اللہ کی مخفی حکمتیں تھیں اور خوب سمجھ لو کہ یہ حکم ان لوگوں کی وحی اور الہام کا ہے جن کا مقبول خداوندی ہونا کسی نص قطعی سے ثابت ہو چکا ہو۔ اور اب قیامت تک کسی کا الہام کتاب وسنت کے خلاف حجت تو کیا ہوتا قابل التفات بھی نہیں۔

اگر شریعت ابراہیمی کا فتویٰ ان کو نہ بتلاتے تو بھائی گرفتار نہ ہوتا۔ بادشاہ کو کیا خبر تھی کہ شریعت ابراہیمی میں چور کی یہ سزا ہے تمہارے کہنے کے مطابق بادشاہ نے اس کو غلام بنالیا تم اگر بادشاہ کو نہ بتلاتے تو بادشاہ اپنے قانون پر چلتا اور بنیامین کو نہ لے سکتا محض پیالہ کے برآمد ہو جانے سے تم نے چوری کو کیسے تسلیم کرلیا چوری کے ثبوت کے لئے ایسی شہادت اور دلیل چاہیے جس میں کوئی شبہ نہ ہو چوری کے لئے یہ شرط ہے کہ مال مقام حرز و محفوظ سے نکالا گیا ہو اور مقام محفوظ سے نکالنا شہادت صحیحہ سے ثابت ہو جب چور کو سزا دی جاسکتی ہے۔ بہر حال میرا خیال یہ ہے کہ بنیامین کی گرفتاری میں تمہاری تسویل نفس کو کچھ نہ کچھ ضرور دخل ہے سو خیر جو ہوا سو ہوا۔ میرا چارہ کار صبر جمیل ہے اب مجھے امید ہے کہ عنقریب اللہ تعالیٰ تینوں بیٹوں کو میرے پاس لائے گا یعنی یوسف کو۔ بنیامین کو اور اس تیسرے بیٹے کو جو مصر میں رہ گیا ہے۔ اور شرم کی وجہ سے نہیں آیا۔

یہ بات یعقوب علیہ السلام نے حسن ظن کی بناء پر کہی کہ اللہ کی سنت یہ ہے کہ عسر کے بعد یسر عطا فرماتے ہیں نیز ان کو یقین تھا کہ یوسف ابھی زندہ ہیں کیونکہ ابھی تک یوسف علیہ السلام کے خواب کی تعبیر پوری نہیں ہوئی اور یوسف کا خواب بلاشبہ صحیح ہے وہ ضرور واقع ہو کر رہے گا یوسف کے رویائے صادقہ کا وقوع اور ظہور اس بات پر موقوف ہے کہ وہ ابھی صحیح و سالم زندہ ہوں اور وہ مع اپنے بھائیوں کے مجھے ملیں۔ (معارف کاندھلوی)

اِنَّآ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ ﴿۷۹﴾

تو تو ہم ضرور بے انصاف ہوئے

یعنی مجرم کے بدلہ میں بے قصور کو پکڑیں تو تمہارے خیال اور قانون کے موافق ہم بے انصاف ٹھہریں گے۔

فَلَمَّا اسْتَايْئَسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ؕ قَالَ

پھر جب نا امید ہوئے اس سے اکیلے ہو بیٹھے مشورہ کرنے کو بولا

كَبِيْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ

ان میں کا بڑا کیا تم کو معلوم نہیں کہ تمہارے باپ نے لیا ہے

عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَمِنْ قَبْلُ مَا

تم سے عہد اللہ کا اور پہلے جو قصور کر چکے ہو یوسف کے حق (قصہ)

فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ ۚ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ

میں سو میں تو ہرگز نہ سرکوں گا اس ملک سے

حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْٓ اَبِيْٓ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ ۚ وَهُوَ

جب تک کہ حکم دے مجھ کو باپ میرا یا قضیہ چکا دے اللہ میری طرف

خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۸۰﴾

اور وہ ہے سب سے بہتر چکانے والا

بڑے بھائی نے جانے سے انکار کر دیا:

جب حضرت یوسفؑ کا جواب سن کر مایوس ہو گئے تو مجمع سے ہٹ کر آپس میں مشورہ کرنے لگے۔ اکثروں کی رائے ہوئی کہ وطن واپس جانا چاہیے۔ ان میں جو عمر یا عقل وغیرہ کے اعتبار سے بڑا تھا اس نے کہا کہ باپ کے سامنے ہم کیا منہ لے کر جائینگے، جو عہد ہم سے لیا تھا اس کا کیا جواب دینگے۔ ایک تقصیر تو پہلے یوسفؑ کے معاملہ میں کر چکے ہیں جس کا اثر آج تک موجود ہے۔ اب بنیامین کو چھوڑ کر سب کا چلا جانا سخت بے حمیتی ہوگی۔ سو واضح رہے کہ بندہ تو کسی حال یہاں سے ٹلنے والا نہیں۔ الا یہ کہ خود والد بزرگوار مجھ کو یہاں سے چلے جانے کا حکم دیں یا اس درمیان میں قدرت کی طرف سے کوئی فیصلہ ہو جائے۔ مثلاً تقدیر سے میں یہیں مر جاؤں یا کسی تدبیر سے بنیامین کو چھڑا لوں۔

(تنبیہ): یہ کہنے والا غالباً وہی بھائی تھا جس نے یوسف علیہ السلام کے معاملہ میں بھی نرم مشورہ دیا تھا لا تقتلوا یوسف۔ (تفسیر عثمانی)

اِرْجِعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْكُمْ فَقُوْلُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّ ابْنَكَ

پھر جاؤ اپنے باپ کے پاس اور کہو اے باپ تیرے بیٹے نے

سَرَقَ ۚ وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَمَا

تو چوری کی اور ہم نے وہی کہا تھا جو ہم کو خبر تھی اور

كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ ﴿۸۱﴾

ہم کو غیب کی بات کا دھیان نہ تھا

تم جا کر ابا کو اطلاع دو:

یعنی مجھے چھوڑ دو اور تم سب جا کر باپ سے عرض کرو کہ ایسا واقعہ پیش آیا، جس کی کوئی توقع نہ تھی، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں "یعنی تم کو قول دیا تھا اپنی دانست پر۔ یہ کیا خبر تھی کہ بنیامین چوری کر کے پکڑا جائیگا۔ یا ہم نے چور کو پکڑ رکھنا بتایا اپنے دین کے موافق۔ یہ نہ معلوم تھا کہ بھائی چور ہے"۔ (تفسیر عثمانی)

بعض علماء نے کہا کہ حضرت یعقوب نے ان سے فرمایا عزیز مصر کو تو معلوم نہ تھا کہ چور کو چوری کی سزا میں غلام بنالیا جاتا ہے یہ بات اس کو تمہارے قول سے معلوم ہوئی اس کے جواب میں بیٹوں نے کہا ہم نے تو عزیز مصر سے وہی بات کہی جو ہم کو (اپنے مذہب سے) معلوم تھی۔ حضرت یعقوب اور آپ کی اولاد کا چور کے متعلق شرعی فیصلہ یہی ہوتا تھا۔

وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ اورغیب کی باتوں کے تو ہم حافظ تھے نہیں (یا یہ ترجمہ ہے کہ باطنی احوال کے تو ہم نگراں تھے نہیں) حضرت ابن عباس نے ترجمہ کیا ہم رات دن اس کے اٹھنے بیٹھنے اور آنے جانے کے تو نگراں تھے نہیں ممکن ہے رات کو اس کے سامان میں پیمانہ چھپا دیا گیا ہو (اور واقع میں اس نے نہ چرایا ہو) مجاہد اور قتادہ نے یوں مطلب بیان کیا کہ جب قسم کھا کر ہم نے عہد کیا تھا تو ہم کو معلوم نہ تھا کہ آپ کا بیٹا آئندہ چوری کرے گا (اور پکڑا جائے گا) اور آپ پر ویسی ہی بپتا پڑے گی جیسی یوسف کی پڑی تھی ہم نے جو اس کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا وہ انہی چیزوں سے کیا تھا جن سے حفاظت ممکن تھی۔

وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا اور اس بستی سے جہاں ہم تھے آپ دریافت کرلیں۔ قریہ سے مراد ہے مصر۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا مصر کا وہ گاؤں مراد ہے جہاں منادی نے آکر روکا تھا اور اسی جگہ سے ان کو مصر واپس لوٹنا پڑا تھا۔ (تفسیر مظہری)

معارف ومسائل

ان سے پہلی آیات میں مذکور تھا کہ مصر میں یوسف علیہ السلام کے حقیقی بھائی بنیامین کے سامان میں ایک شاہی برتن چھپا کر اور پھر ان کے سامان سے تدبیر کے ساتھ برآمد کر کے ان پر چوری کا جرم عائد کر دیا گیا تھا۔

مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت میں یہ ہے کہ جب برادران یوسف کے سامنے بنیامین کے سامان سے مال مسروقہ برآمد ہو گیا اور شرم سے ان کی آنکھیں جھک گئیں تو جھنجھلا کر کہنے لگے: اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ،

مسئلہ: وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا سے ثابت ہوا کہ انسان جب کسی سے کوئی معاملہ اور معاہدہ کرتا ہے تو وہ ظاہری حالات ہی پر محمول ہوتا ہے ایسی چیزوں پر حاوی نہیں ہوتا جو کسی کے علم میں نہیں، برادران یوسف نے والد سے جو بھائی کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا وہ اپنے اختیاری امور کے متعلق تھا اور یہ معاملہ کہ ان پر چوری کا الزام آگیا اور اس میں پکڑے گئے اس سے معاہدہ پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔

دوسرا مسئلہ: تفسیر قرطبی میں اس آیت سے یہ نکالا گیا ہے کہ اس جملہ سے ثابت ہوا کہ شہادت کا مدار علم پر ہے علم خواہ کسی طریق سے حاصل ہو، اس کے مطابق شہادت دی جاسکتی ہے۔ اس لئے کسی واقعہ کی شہادت جس طرح اس کو بچشم خود دیکھ کر دی جاسکتی ہے اسی طرح کسی معتبر ثقہ سے سن کر بھی دی جاسکتی ہے شرط یہ ہے کہ اصل معاملہ کو چھپائے نہیں، بیان کردے کہ یہ واقعہ خود نہیں دیکھا فلاں ثقہ آدمی سے سنا ہے اسی اصول کی بنا پر فقہاء مالکیہ نے نابینا کی شہادت کو بھی جائز قرار دیا ہے۔

مسئلہ: آیات مذکورہ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اگر کوئی شخص حق اور راستی پر ہے مگر موقع ایسا ہے کہ دیکھنے والوں کو ناحق یا گناہ کا شبہ ہوسکتا ہے تو اس کو چاہیے کہ اس اشتباہ کو دور کردے، تاکہ دیکھنے والے بدگمانی کے گناہ میں مبتلا نہ ہوں، جیسے اس واقعہ بنیامین میں پچھلے واقعہ یوسف علیہ السلام کی بناء پر موقع تہمت اور شبہ کا پیدا ہو گیا تھا، اس لئے اس کی صفائی کے لئے اہل بستی کی گواہی اور قافلہ والوں کی گواہی پیش کی گئی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے بھی اس کی تاکید فرمائی ہے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت صفیہ ام المؤمنین کے ساتھ مسجد سے ایک کوچہ میں تشریف لے جارہے تھے تو اس کوچہ کے سرے پر دو شخص نظر پڑے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دور ہی سے فرمادیا کہ میرے ساتھ صفیہ بنت حیی ہیں، ان دو حضرات نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ کے بارے میں کسی کو کوئی بدگمانی ہوسکتی ہے؟ تو فرمایا کہ ہاں شیطان انسان کی رگ رگ میں سرایت کرتا ہے، ہوسکتا ہے کہ کسی کے دل میں شبہ ڈال دے (بخاری، مسلم) (معارف مفتی اعظم)

وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ الَّتِيْٓ

اور پوچھ لے اس بستی سے جس میں ہم تھے، اور اس قافلہ سے جس

اَقْبَلْنَا فِيْهَا ۭ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۸۲﴾

میں ہم آئے ہیں اور ہم بے شک سچ کہتے ہیں

بستی والوں سے پوچھ لو:

یعنی آپ معتبر آدمی بھیج کر اس بستی والوں سے تحقیق کرلیں جہاں یہ واقعہ پیش آیا۔ نیز دوسرے قافلہ والوں سے دریافت فرمالیں جو ہمارے ساتھ رہے اور واپس آئے ہیں آپ کو ثابت ہوجائیگا کہ ہم اپنے بیان میں بالکل سچے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ۭ

بولا کوئی نہیں، بنالی ہے تمہارے جی نے ایک بات

فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ

اب صبر ہی بہتر (کام آئے۔ بن پڑے) ہے شاید اللہ لے آئے

بِهِمْ جَمِيْعًا ۗ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۸۳﴾

میرے پاس ان سب کو وہی ہے خبردار حکمتوں والا

یعقوب علیہ السلام کا صبر وتوکل:

پہلی بار کی بے اعتباری سے اس مرتبہ بھی حضرت یعقوبؑ نے بیٹوں کا اعتبار نہ کیا۔لیکن نبی کا کلام جھوٹ نہیں۔ بیٹوں کی بنائی بات تھی۔حضرت یوسفؑ بھی بیٹے تھے۔کذافی الموضح۔گویا ''لکم'' کا خطاب جنس ابناء کی طرف ہوا۔ واللہ اعلم۔بعض مفسرین نے یہ مطلب لیا ہے کہ تم یہاں سے حفاظت کے کیسے وعدے کر کے اصرار کے ساتھ لے گئے وہاں پہنچ کر اتنا بھی نہ کہا کہ اس کے اسباب میں سے پیالہ برآمد ہونے سے چوری کیسے ثابت ہوگئی،شاید کسی اور نے چھپادیا ہو۔مدافعت تو کیا کرتے یہ کہہ کر کہ پہلے اس کے بھائی نے بھی چوری کی تھی اس کے جرم کو پختہ کردیا۔تمہارے دل میں کھوٹ نہ ہوتا تو یہ طرزعمل اختیار نہ کرتے اب باتیں بنانے کیلئے آئے ہو۔بہرحال میں تو اس پر بھی صبر ہی کرونگا کوئی حرف شکایت زبان پر نہ لاؤنگا۔خدا کی قدرت ورحمت سے کیا بعید ہے کہ یوسف، بنیامین اور وہ بھائی جو بنیامین کی وجہ سے رہ گیا ہے سب کو میرے پاس جمع کردے وہ سب کے احوال سے خبردار ہے اور ہرایک کے ساتھ اپنی حکمت کے موافق معاملہ کرتا ہے۔اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ہرقسم کے یاس انگیز احوال اور مرور دھور کے بعد بھی انبیاء کے قلوب مایوس نہیں ہوسکتے۔وہ ہمیشہ خدا کی رحمت واسعہ پر اعتماد کرتے اور الطاف ومنن کے امیدوار رہتے ہیں۔(تفسیر عثمانی)

وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ

اور الٹا پھرا ان کے پاس سے، اور بولا اے افسوس یوسف پر

یعقوب علیہ السلام کا غم:

نیا زخم کھا کر پرانا زخم ہرا ہوگیا۔بے اختیار پکار اٹھے
''وَقَالَ يٰاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ'' (ہائے افسوس یوسف)　(تفسیر عثمانی)

وقال یاسفیٰ علیٰ یوسف اور افسوس وحسرت سے کہنے لگے ہائے یوسف۔اسف کا معنی ہے انتہائی حزن واندوہ۔اسف اصل میں اسفی بیاء متکلم تھا۔عبدالرزاق اور ابن جریر نے موقوفاً سعید بن جبیر کا قول نقل کیا ہے کہ سوائے امت محمدیہ کے کسی اور امت کو مصیبت کے وقت اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کہنے کی تعلیم نہیں دی گئی۔حضرت یعقوبؑ پر بھی بپتا پڑی تو انہوں نے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ نہیں کہا بلکہ حسرت وافسوس کا اظہار کیا۔بیہقی نے بھی یہ روایت شعب الایمان میں نقل کی ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ضعیف سند میں بوساطت حضرت ابن عباس اس کو مرفوعاً بیان کیا گیا ہے۔ثعلبی نے سعید بن جبیر کے طریق سے اس کو مرفوعاً بیان کیا ہے۔

قتادہ نے کہا حضرت یعقوبؑ کے سینے میں غم گھومتا تھا مگر زبان سے کلمہ خیر کے سوا کچھ نہیں کہتے تھے۔حسن نے کہا جس روز سے یوسف باپ کی گود سے جدا ہوئے اس روز سے یوم ملاقات تک اسی سال گذر گئے اور اس مدت میں یعقوبؑ کا آنسو خشک نہیں ہوا باوجودیکہ آپ کے زمانے میں روئے زمین پر آپ سے زیادہ اللہ کے نزدیک کسی کی عزت نہ تھی اور اللہ کو آپ سے زیادہ پیارا کوئی نہ تھا۔

افسوس کا اظہار:

یہ آیت دلالت کررہی ہے کہ مصیبت پر رونا اور اظہار افسوس کرنا جائز ہے بشرطیکہ اس میں نوحہ اور اس جیسی کوئی دوسری چیز شامل نہ ہو۔منہ پیٹنا ،گریبان پھاڑنا وغیرہ بھی نوحہ کی صف میں آتا ہے۔جو ناجائز ہے، ہاں غم واندوہ اور افسوس وحسرت کا اظہار غیراختیاری چیز ہے اور غیراختیاری چیز سے بچنے کا آدمی مکلّف نہیں۔

صاحبزادہ ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات:

صحیحین میں حضرت انس کا بیان آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت ابراہیم سکرات کی حالت میں تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حالت دیکھی تو دونوں آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے عرض کیا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ (رو رہے ہیں) فرمایا اے ابن عوف یہ دل کی رقت ہے۔اس کے بعد ایک اور حالت ہوئی تو فرمایا آنکھ روتی ہے دل غمزدہ ہے اور ہم (زبان سے) کوئی ایسی بات نہیں کہتے جس سے ہمارا رب ناراض ہو اے ابراہیم ہم تیری جدائی سے غمگین ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آنسو:

صحیحین میں حضرت اسامہ بن زید کی روایت سے مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک نواسے کی نزع کی حالت تھی خراٹا شروع ہوگیا تھا اسی حالت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پہنچ گئے اور یہ حالت دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔حضرت سعد نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ کیا تو آپ نے فرمایا یہ دل کی رقت ہے جو اللہ نے اپنے بندوں کے دلوں میں رکھ دی ہے اللہ اپنے رحم دل بندوں پر بھی رحم فرماتا ہے۔

صحیحین میں حضرت ابن عمر کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اللہ آنکھ سے رونے اور دل سے غمگین ہونے پر عذاب نہیں دیتا بلکہ اس کی وجہ سے عذاب دیتا ہے گویا رحم فرمادیتا ہے۔(یعنی معاف کردیتا ہے) اس کی کے لفظ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زبان کی طرف

اشارہ کیا ہے۔ اور میت کو عذاب دیا جاتا ہے اس پر اس کے گھر والوں کے رونے کی وجہ سے۔

یوسف ازشمہ جمال او　　خوشہ چیں شد قسم بحال او
دل ازعشق محمد ریش دارم　　رقابت باخدائے خویش دارم

گریبان پھاڑنا:

صحیحین میں حضرت ابن مسعود کی روایت سے آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جوشخص اپنے رخسار پیٹے گریبان پھاڑے اور جاہلیت کی ایسی پکار مچائے وہ ہم سے (متعلق) نہیں۔

حضرت ابوہریرہ کی روایت سے صحیحین میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں بیزار ہوں اس شخص سے جو مونڈن کرائے منہ، پیٹے اور کپڑے پھاڑے۔ (تفسیر مظہری)

وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ
اور سفید ہوگئیں آنکھیں اسکی غم سے

یعقوب علیہ السلام نابینا ہو گئے:

یعنی بے رونق یا بے نور ہوگئیں، علی اختلاف القولین۔ (تفسیر عثمانی)

فراق میں روتے روتے جس قدر بصارت گھٹتی جاتی تھی اسی قدر نور بصیرت میں زیادتی ہوتی جاتی تھی اور گریہ وزاری کی زیادتی سے لحظہ بلحظہ مراتب اور مدارج بلند اور برتر ہو رہے تھے پس وہ اندر ہی اندر گھٹے ہوئے اور خاموش تھے کسی مخلوق سے اپنے صدمہ کی شکایت نہیں کرتے تھے دل مبارک رنج وغم سے بھرا ہوا تھا مگر ظاہر نہ کرتے تھے۔

دردیست دریں سینہ کہ گفتم نتوانم
دیں طرفہ کہ آں نیز نہفتن نتوانم

بیٹوں کی طرف سے تسلی:

بیٹوں نے جب باپ کا یہ اضطراب دیکھا تو بولے اے باپ بخدا آپ تو ہمیشہ یوسف کو یاد کرتے رہیں گے یہاں تک کہ تم ان کے غم میں گھل کر مرنے کے قریب ہوجاؤ گے یا بالکل مرنے والوں میں سے ہوجاؤ گے یعقوب علیہ السلام نے گھر والوں کے جواب میں یہ کہا میں تو اپنی بے قراری اور پریشانی کا اور رنج وغم کا شکوہ فقط اللہ ہی سے کرتا ہوں تم سے تو کچھ نہیں کہتا اور میں جانتا ہوں اللہ کی طرف سے جو تم نہیں جانتے۔ میں خوب جانتا ہوں کہ یوسف کا خواب سچا ہے یعنی مجھ کو یقین ہے کہ یوسف ابھی مرا نہیں کیونکہ ابھی تک اس کا خواب پورا نہیں ہوا مجھے امید ہے کہ عنقریب یوسف مجھ سے ملے گا اور جو خواب اللہ نے اس کو دکھلایا ہے حرف بحرف اس کو پورا کرے گا نیز مجھے معلوم ہے کہ اللہ مضطر کی دعا قبول کرتا ہے اور مجھے معلوم ہے کہ خدا اپنے دعا کرنے والے بندہ کو محروم اور خالی ہاتھ نہیں چھوڑتا۔ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں کیا تم مجھ کو صبر سکھاؤ گے بے صبر وہ ہے جو خالق کے بھیجے ہوئے درد کی مخلوق کے آگے شکایت کرے میں تو اس سے کہتا ہوں جس نے مجھے درد دیا اور یہ بھی جانتا ہوں کہ یوسف زندہ ہے ضرور ملے گا اور اس کا خواب پورا ہوکر رہے گا یہ مجھ پر آزمائش ہے دیکھوں کس حد پر پہنچ کر بس ہو۔ (معارف کاندھلوی)

فَهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۸۴﴾
سو وہ آپ کو گھونٹ رہا تھا

انبیاء کی آزمائش:

حدیث میں ہے "نحن معاشر الانبیآء اشد بلآء ثم الامثل فالا مثل"۔ یعنی انبیاء کی جماعت حق تعالیٰ کی طرف سے سخت ترین امتحانوں میں مبتلاء کی جاتی ہے۔ پھر امتحان کی اقسام ہیں۔ ہر نبی کو حق تعالیٰ اپنی حکمت اور اس کی استعداد کے موافق جس قسم کے امتحان میں چاہے مبتلا کرتا ہے یعقوب علیہ السلام کے قلب میں یوسف کی فوق العادت محبت ڈال دی پھر ایسے محبوب اور ہونہار بیٹے کو جو خاندان ابراہیمی کا چشم وچراغ تھا، ایسے دردناک طریقے سے جدا کیا گیا غمزدہ اور زخم خوردہ یعقوبؑ کے جگر کو اس روح فرسا صدمہ نے کھالیا تھا۔ وہ کسی مخلوق کے سامنے نہ حرف شکایت زبان پر لاتے تھے نہ کسی سے انتقام لیتے، نہ غصہ نکالتے غم کی بات منہ سے نہ نکلتی۔ ہاں جب اپنے کو بہت گھونٹتے تو دل کا بخار آنکھوں کی راہ سے ٹپک پڑتا۔ بیسیوں برس تک چشم گریاں اور سینہ بریاں کے باوجود ادائے فرائض وحقوق میں کوئی خلل نہ پڑنے دیا۔ ان کا دل جتنا یوسفؑ کے فراق میں روتا تھا، اتنا ہی خدا کے حضور میں زیادہ گڑگڑاتا تھا۔ درد وغم کی شدت اور اشکباری کی کثرت جس قدر ان کی بصارت کو ضعیف کرتی اسی قدر نور بصیرت کو بڑھا رہی تھی۔ بے تابی واضطراب کا کیسا ہی طوفان اٹھتا، دل پکڑ کر اور کلیجہ مسوس کر رہ جاتے زبان سے اف نہ نکالتے، بنیامین کی جدائی سے جب پرانے زخم میں نیا چرکا لگا تو اس وقت بے اختیار "يٰۤاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ" صرف اتنا لفظ زبان سے نکلا۔ بقول حضرت شاہ صاحبؒ "ایسا درد اتنی مدت دبا رکھنا پیغمبر کے سوا کس کا کام ہوسکتا ہے"۔ (تفسیر عثمانی)

یعقوب علیہ السلام کی محبت:

بلاشبہ دنیا اور متاع دنیا کی محبت مذموم ہے قرآن وحدیث کی نصوص بے شمار اس پر شاہد ہیں، مگر دنیا میں جو چیزیں آخرت سے متعلق ہیں ان کی محبت درحقیقت آخرت ہی کی محبت میں داخل ہے یوسف علیہ السلام کے کمالات

صرف حسن صورت ہی نہیں بلکہ پیغمبرانہ عفت اور حسن سیرت بھی ہیں۔ اس مجموعہ کی وجہ سے ان کی محبت کسی دنیاوی سامان کی محبت نہ تھی، بلکہ درحقیقت آخرت ہی کی محبت تھی۔ انتہی۔ (معارف مفتی صاحب)

قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى

کہنے لگے قسم اللہ کی تو نہ چھوڑے گا یوسف کی یاد کو

تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ﴿۸۵﴾

جب تک کہ گھل جائے یا ہوجائے مردہ

قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ

بولا میں تو کھولتا ہوں اپنا اضطراب اور غم اللہ کے سامنے

وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾

اور جانتا ہوں اللہ کی طرف سے جو تم نہیں جانتے

یعقوب علیہ السلام کو تسلی:

موضح القرآن میں ہے۔ یعنی کیا تم کو مجھ صبر سکھاؤ گے؟ بے صبر وہ ہے جو مخلوق کے آگے خالق کے بھیجے ہوئے درد کی شکایت کرے۔ میں تو اسی سے کہتا ہوں جس نے درد دیا اور یہ بھی جانتا ہوں کہ (یوسف زندہ ہے ضرور ملے گا اور اس کا خواب پورا ہو کر رہے گا) یہ مجھ پر آزمائش ہے دیکھوں کس حد پر پہنچ کر بس ہو۔ (تفسیر عثمانی)

بغوی کا بیان ہے کہ حضرت یعقوب کے پاس ان کا ایک ہمسایہ آیا اور اس نے کہا یعقوبؑ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کی صحت بدن تباہ ہوگئی اور آپ فنا ہو چکے حالانکہ اپنے باپ کی عمر کو نہیں پہنچے ہیں فرمایا یوسف کے غم میں جو اللہ نے مجھے مبتلا کر دیا اس سے میری قوت ٹوٹ گئی اور اسی نے مجھے فنا کر دیا۔

اللہ نے یعقوبؑ کے پاس وحی بھیجی یعقوبؑ تو میرا شکوہ میری مخلوق سے کرتا ہے۔ یعقوب نے کہا اے میرے رب مجھ سے خطا ہوگئی تو میری خطا معاف فرما دے۔ اللہ نے فرمایا میں نے تجھے معاف کر دیا اس کے بعد حضرت یعقوب سے جب کیفیت اور حالت پوچھی جاتی تو فرماتے اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ۔

جبریلؑ نے یوسفؑ کو حالات کی اطلاع دی:

وہب اور سدی وغیرہ کا بیان ہے کہ حضرت جبرئیلؑ جیل خانہ کے اندر حضرت یوسف کے پاس پہنچے اور پوچھا صدیق کیا آپ نے مجھے پہچانا۔

حضرت یوسفؑ نے فرمایا میں ایک پاک صورت دیکھ رہا ہوں اور پاکیزہ خوشبو محسوس کر رہا ہوں۔ حضرت جبرئیلؑ نے فرمایا میں روح الامین ہوں، رب العالمین کا قاصد ہوں حضرت یوسف نے فرمایا آپ تو سب سے بڑھ کر پاکیزہ، مقربین کے سردار اور رب العالمین کے امین ہیں اور یہ گناہگاروں کے داخل ہونے کی جگہ ہے یہاں آپ کے آنے کا کیا سبب ہے حضرت جبرئیلؑ نے فرمایا: یوسف کیا آپ واقف نہیں کہ انبیاء کی پاکی وجہ سے اللہ (ناپاک) گھروں کو پاک کر دیتا ہے اور جس زمین میں پیغمبر داخل ہوتے ہیں وہ ہر زمین سے زیادہ پاک ہوجاتی ہے۔ اے اطہر الطاہرین اور اے منتخب نیک بندوں کی اولاد آپ کی وجہ سے اللہ نے قید خانہ کو اور اس کے ماحول کو پاک کر دیا۔ حضرت یوسفؑ نے فرمایا آپ نے مجھے صدیق کے نام سے کیوں پکارا اور منتخب پاک لوگوں میں میرا اشمار کیوں کیا، مجھے تو گناہگاروں کے مقام میں داخل کیا گیا ہے اور بد چلن لوگوں کے ناموں میں میرا نام بھی شامل کر دیا گیا ہے حضرت جبرئیلؑ نے فرمایا اللہ نے آپ کا نام صدیقوں میں شامل کیا مخلص منتخب بندوں میں آپ کا شمار کیا اور آپ کے صالح اسلاف کی فہرست میں آپ کو بھی داخل کر دیا اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے اپنے دل کو فتنہ میں نہ پڑنے دیا اور اپنی مالکہ کے کہے کو نہیں مانا حضرت یوسف نے پوچھا روح الامین کیا آپ کو یعقوب کی بھی کوئی اطلاع ہے حضرت جبرئیلؑ نے فرمایا جی ہاں اللہ نے ان کو صبر جمیل عطا فرمایا وہ آپ کے غم میں مبتلا ہوئے اور غم سے جی ہی جی میں گھٹتے رہے حضرت یوسف نے پوچھا ان کے غم کا کچھ اندازہ بھی ہے حضرت جبرئیلؑ نے فرمایا ان ستر عورتوں کے غم کے برابر جن کے بچے مر گئے ہوں حضرت یوسفؑ نے فرمایا جبرئیلؑ پھر ان کو اس کا اجر کس قدر ملے گا حضرت جبرئیلؑ نے فرمایا سو شہیدوں کے برابر حضرت یوسف نے فرمایا کیا آپ کو کچھ معلوم ہے کہ میری ان سے ملاقات بھی (کبھی) ہوگی حضرت جبرئیلؑ نے جواب دیا جی ہاں یہ سن کر حضرت یوسف کا دل خوش ہو گیا اور فرمایا جو کچھ مجھے پیش آیا اس کی مجھے کوئی پروا نہیں اگر میں یعقوبؑ کو دیکھ لوں۔

وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ اور اللہ کی باتوں کو جتنا میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ یعنی اللہ کی حکمت و رحمت کو جتنا میں جانتا ہوں کہ وہ پکارنے والے کو نامراد نہیں چھوڑتا اور جو بیقراری کے ساتھ اس کی طرف لوٹتا ہے اس کو رد نہیں کرتا۔ یا یہ مطلب ہے کہ از روئے الہام یوسف کے زندہ ہونے سے جو میں واقف ہوں تم واقف نہیں۔

عزرائیل سے ملاقات: روایت میں آیا ہے کہ حضرت عزرائیل علیہ السلام حضرت یعقوب کی ملاقات کو گئے حضرت یعقوبؑ نے پوچھا اے پاکیزہ خوشبو اور حسین صورت والے فرشتے کیا آپ نے میرے بچہ کی روح

قبض کی ہے حضرت عزرائیل نے جواب دیا۔ نہیں، یہ سن کر حضرت یعقوبؑ کو کچھ سکون ہوگیا اور آپ کو یوسف کے دیکھنے کی تمنا ہوئی۔

بعض علماء نے آیت کا مطلب یہ بیان کیا ہے میں جانتا ہوں کہ یوسف کا خواب سچا ہے میں اور تم سب آئندہ اس کو ضرور سجدہ کریں گے۔ سدی نے بیان کیا جب بیٹوں نے باپ کو بادشاہ کے حسن سلوک کی اطلاع دی تو آپ کو یوسف کے زندہ ہونے کا خیال پیدا ہوگیا اور (ملنے کی) خواہش بھی اور فرمایا شاید وہ یوسف ہو۔

ابن ابی حاتم نے نصر بن عربی کا بیان نقل کیا ہے نصر نے کہا مجھے اطلاع ملی ہے کہ حضرت یعقوبؑ کا ۲۴ سال حضرت یوسفؑ کے زندہ یا مردہ ہونے کی کوئی خبر نہیں ہوئی، آخر ایک روز موت کا فرشتہ انسانی شکل میں آپ کے سامنے آ کھڑا ہوا، حضرت نے دریافت کیا آپ کون ہیں ملک الموت نے کہا میں موت کا فرشتہ ہوں، حضرت یعقوب نے فرمایا میں تم کو یعقوب کے معبود کی قسم دیتا ہوں مجھے بتاؤ کیا تم نے یوسف کی جان قبض کر لی، ملک الموت نے جواب دیا نہیں۔ (تفسیر مظہری)

يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ

اے بیٹو جاؤ اور تلاش کرو یوسف کی اور اسکے بھائی کی

وَلَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ

اور ناامید مت ہو اللہ کے فیض سے بے شک ناامید نہیں ہوتے

مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝۸۷

اللہ کے فیض سے مگر وہی لوگ جو کافر ہیں

مؤمن مایوس نہیں ہوتا:

یعنی حق تعالیٰ کی مہربانی اور فیض سے ناامید ہونا کافروں کا شیوہ ہے۔ جنہیں اس کی رحمت واسعہ اور قدرت کاملہ کی صحیح معرفت نہیں ہوتی۔ ایک مسلمان کا کام یہ ہے کہ اگر پہاڑ کی چٹانوں اور سمندر کی موجوں کی برابر مایوس کن حالات پیش آئیں تب بھی خدا کی رحمت کا امیدوار رہے اور امکانی کوشش میں پست ہمتی نہ دکھلائے۔ جاؤ، کوشش کر کے یوسف کا کھوج لگاؤ اور اس کے بھائی بنیامین کے چھڑانے کا کوئی ذریعہ تلاش کرو۔ کچھ بعید نہیں کہ حق تعالیٰ ہم سب کو پھر جمع کر دے۔ تیسرے بھائی کا ذکر شاید اس لئے نہیں کیا کہ وہ باختیار خود محض بنیامین کی وجہ سے رکا ہے۔ بنیامین چھوٹ جائے تو وہ کیوں پڑا رہیگا۔ (تفسیر عثمانی)

یوسف و بنیامین کی تلاش:

اور دونوں کی تلاش کا رخ مصر ہی کی طرف قرار دیا جو بنیامین کے حق میں تو معلوم اور متعین تھا مگر یوسف علیہ السلام کو مصر میں تلاش کرنے کی ظاہر حال کے اعتبار سے کوئی وجہ نہ تھی، لیکن اللہ تعالیٰ جب کسی کام کا ارادہ فرماتے ہیں تو اسکے مناسب اسباب جمع فرما دیتے ہیں۔ اس لئے اس مرتبہ تلاش وتفتیش کے لئے پھر صاحبزادوں کو مصر جانے کی ہدایت فرمائی بعض حضرات نے فرمایا کہ یعقوب علیہ السلام کو پہلی مرتبہ عزیز مصر کے اس معاملہ سے کہ ان کی پونجی بھی ان کے سامان میں واپس کر دی اس طرف خیال ہوگیا تھا کہ یہ عزیز کوئی بہت ہی شریف و کریم ہے شاید یوسفؑ ہی ہوں۔

احکام و مسائل

امام قرطبی نے فرمایا کہ واقعہ یعقوب علیہ السلام سے ثابت ہوا کہ ہر مسلمان پر واجب ہے کہ جب اس کو کوئی مصیبت اور تکلیف اپنی جان یا اولاد یا مال کے بارے میں پیش آئے تو اس کا علاج صبر جمیل اور اللہ تعالیٰ کی قضاء پر راضی ہونے سے کرے، اور یعقوب علیہ السلام اور دوسرے انبیاء کی اقتداء کرے۔

دو گھونٹ: حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک انسان جس قدر گھونٹ پیتا ہے ان سب میں دو گھونٹ زیادہ محبوب ہیں، ایک مصیبت پر صبر اور دوسرے، غصہ کو پی جانا۔ اور حدیث میں بروایت حضرت ابو ہریرہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: من بث لم یصبر، یعنی جو شخص اپنی مصیبت سب کے سامنے بیان کرتا پھرے اس نے صبر نہیں کیا۔

یعقوب علیہ السلام کا ثواب:

اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوب علیہ السلام کو اس صبر پر شہیدوں کا ثواب عطا فرمایا، اور اس امت میں بھی جو شخص مصیبت پر صبر کرے گا اس کو ایسا ہی اجر ملے گا۔ (معارف القرآن)

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا

پھر جب داخل ہوئے اس کے پاس بولے

وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ

اے عزیز پڑی ہم پر اور ہمارے گھر پر سختی اور لائے ہیں

فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ

ہم پونجی ناقص سو پوری دے ہم کو بھرتی اور خیرات کر ہم پر اللہ

یَجْزِی الْمُتَصَدِّقِیْنَ ﴿۸۸﴾

بدلہ دیتا ہے خیرات کرنیوالوں کو

بھائیوں کی تیسری مرتبہ مصر روانگی:

باپ کے فرمانے پر مصر کو پھر روانہ ہوئے۔ کیونکہ یوسفؑ کا پتہ معلوم نہ تھا۔ یہ خیال کیا ہوگا کہ جس کا پتہ معلوم ہے (بنیامین) پہلے اس کی فکر کریں اور قحط کی وجہ سے غلہ کی ضرورت ہے۔ عزیز کو ادھر بھی توجہ دلائیں۔ اگر دینے لینے کے معاملہ میں کچھ نرم پایا تو بنیامین کے متعلق گفت وشنید کرینگے۔ چنانچہ پہلی بات انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام سے یہ ہی کہی کہ اے عزیز مصر! آجکل قحط وناداری کی وجہ سے ہم پر اور ہمارے گھر پر بڑی سختی گذر رہی ہے، سب اسباب گھر کا بک گیا۔ کچھ نکمی اور حقیر سی پونجی رہ گئی ہے وہ غلہ خریدنے کیلئے ساتھ لائے ہیں آپ کے مکارم اخلاق اور گذشتہ مہربانیوں سے امید ہے کہ ہماری ناقص چیزوں کا خیال نہ فرمائینگے اور تھوڑی قیمت میں غلہ کی مقدار گذشتہ کی طرح پوری دلوادینگے۔ یہ رعایت حقیقت میں ایک طرح کی خیرات ہوگی جو آپ ہم پر کرینگے یا اس کے علاوہ ہم کو بطور خیرات ہی کچھ دیدیجئے۔ خدا آپ کا بھلا کریگا۔ حضرت یوسف علیہ السلام یہ حال سن کر رو پڑے، شفقت ورحمدلی کا چشمہ دل میں جوش مار کر آنکھوں سے ابل پڑا۔ اس وقت حق تعالیٰ کے حکم سے اپنے تئیں ظاہر کیا کہ میں کون ہوں اور تم نے میرے ساتھ جو معاملہ کیا تھا، اس کے بعد میں کس مرتبہ پر پہنچا ہوں اگلی آیت میں اسی اظہار کی تمہید ہے۔

(تنبیہ): بعض نے تصدق کے معنی مطلق احسان کرنے کے لئے ہیں جیسے "قصر صلوٰۃ" کی حدیث میں 'صدقة تصدق الله بها عليكم'. (تفسیر عثانی)

فاوف لنا یعنی ان قلیل یا کھوٹے درہموں میں غلہ ہم کو اتنا ہی پورا پورا دیدیجئے جتنا اس سے پہلے آپ نے کھرے درہموں میں دیا تھا۔ اور جو قیمت کم رہ جائے وہ بطور خیرات آپ چھوڑ دیجئے۔ اکثر مفسروں نے تصدق علینا کا تفسیری مطلب یہی بیان کیا ہے لیکن ابن جریج اور ضحاک نے کہا کہ درخواست تصدق کا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنی خیرات میں ہمارے بھائی کو واپس کردیجئے۔ (تفسیر مظہری)

یہاں لفظ صدقہ سے حقیقی صدقہ مراد نہیں بلکہ معاملے میں رعایت کرنے کو صدقہ وخیرات کرنے سے تعبیر کردیا ہے کیونکہ بالکل مفت غلہ کا سوال توانہوں نے کیا ہی نہ تھا بلکہ کچھ نکمی چیزیں پیش کی تھیں اور درخواست کا حاصل یہ تھا کہ ان کم قیمت چیزوں کو رعایت کرکے قبول فرمالیں، اس کے علاوہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اولاد انبیاء کے لئے صدقہ وخیرات کی حرمت صرف امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہو جیسا کہ ائمہ تفسیر میں سے مجاہدؒ کا یہی قول ہے۔ (بیان القرآن، معارف مفتی صاحب)

صدقہ کا بدلہ:

ان الله يجزى المتصدقين، سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ صدقہ خیرات کرنے والوں کو جزائے خیر دیتے ہیں، مگر اس میں تفصیل یہ ہے کہ صدقہ خیرات کی ایک جزاء تو عام ہے جو ہر مومن کافر کو دنیا میں ملتی ہے، وہ ہے رد بلا اور دفع مصائب، اور ایک جزاء آخرت کے ساتھ مخصوص ہے یعنی جنت، وہ صرف اہل ایمان کا حصہ ہے، یہاں چونکہ مخاطب عزیز مصر ہے اور برادران یوسف کو ابھی تک یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ مومن ہے یا نہیں، اس لئے ایسا عام جملہ اختیار کیا جس میں دنیا وآخرت دونوں کی جزاء شامل ہے۔ (بیان القرآن) (معارف مفتی اعظم)

قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَاَخِيْهِ

کہا کچھ تم کو خبر ہے کہ کیا کیا تم نے یوسف سے اور اسکے بھائی سے

یعنی دونوں میں جدائی ڈالی اور دونوں سے بیر رکھا۔ (تفسیر عثانی)

یعقوب علیہ السلام کا خط:

عبداللہ بن یزید بن ابی فروہ کا قول روایت میں آیا ہے کہ حضرت یعقوب نے جب سنا کہ بنیامین کو روک لیا گیا تو ایک خط لکھ کر بیٹوں کے ہاتھ حضرت یوسف کو بھجوایا یہ بیٹوں کے تیسرے پھیرے کا ذکر ہے یعقوب اسرائیل اللہ (عبداللہ) بن اسحاق ذبیح اللہ بن ابراہیم خلیل اللہ کی طرف سے شاہ مصر کے نام، حمد وستائش کے بعد واضح ہو کہ ہم ایسے گھرانے والے ہیں جو ہمیشہ سپرد مصائب رہے ہیں میرے دادا ابراہیمؑ کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ان کو آگ میں ڈالا گیا پھر اللہ نے اس آگ کو ان کیلئے ٹھنڈک اور سلامتی بنادیا، میرے باپ کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ان کی گردن پر چھری رکھدی گئی تاکہ ان کو ذبح کردیا جائے مگر اللہ نے ان کا فدیہ (جنت سے مینڈھے کی شکل میں) بھیج دیا (اور ان کو محفوظ رکھا) اب رہا میں تو میرا ایک بیٹا تھا جو سب اولاد سے مجھے پیارا تھا اس کے بھائی اس کو جنگل کو لے گئے پھر (شام کو) اس کا خون آلودہ کرتا لاکر مجھے دے دیا اور کہا اس کو بھیڑیے نے کھالیا۔ اس پر روتے روتے میری آنکھیں جاتی رہیں پھر میرا ایک بیٹا اور تھا جو مرحوم کا ماں جایا بھائی تھا میں اس کو دیکھ کر تسلی حاصل کرلیتا تھا اب آپ نے اس کو روک لیا اور یہ خیال کیا کہ اس نے چوری کی ہے ہم ایسے خاندان والے ہیں جو چوری نہیں کرتے نہ چور ہمارے ہاں پیدا ہوتا ہے اگر آپ میرے بیٹے کو مجھے واپس کردیں تو بہتر ہے ورنہ آپ کو ایسی بددعا دوں گا کہ اس کا اثر آپ کی ساتویں نسل تک پڑے گا۔

خط کا اثر:

حضرت یوسفؑ نے خط پڑھا تو آنسوؤں کو روک نہ سکے اور سامنے آکر فرمایا

هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوسُفَ وَأَخِيهِ إِذْ أَنْتُمْ جَاهِلُونَ یعنی جب کہ تم کومعلوم نہ تھا کہ یوسف آخر میں کس مرتبہ تک پہنچے گا اس وقت تم نے یوسف اوراس کے بھائی کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا کچھ معلوم بھی ہے۔ بعض لوگوں نے جاہلون کا ترجمہ کیا ہے قصوروار گنہگار۔ حسن بصری نے ترجمہ کیا جب کہ تم جوان تھے اور جوانی کی جہالت میں مبتلا تھے۔ اس وقت تم نے کیا کیا تھا۔ (تفسیر مظہری)

إِذْ أَنْتُمْ جَاهِلُونَ ﴿٨٩﴾
جب تم کو سمجھ نہ تھی

یوسف علیہ السلام کی مروت:

اللہ اکبر۔ صبر اور مروت واخلاق کی حد ہوگئی کہ تمام عمر بھائیوں کی شکایت کا ایک حرف زبان پر نہ لائے۔ اتنا سوال بھی اس لئے کیا کہ وہ لوگ اپنے ذہنوں میں بیسیوں برس پہلے کے حالات کو ایک مرتبہ مستحضر کرلیں تاماضی وحال کے موازنہ سے خدا تعالٰی کے ان احسانات کی حقیقت روشن ہو، جو یوسفؑ پر ان مصائب وحوادث کے بعد ہوئے جن کی طرف آگے "لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا" میں اشارہ ہے۔ پھر سوال کا پیرایہ ایسا نرم اختیار کیا۔ جس میں ان کے جرم سے زیادہ معذرت کا پہلو نمایاں ہے یعنی جو حرکت اس وقت تم سے صادر ہوئی ناسمجھی اور بے وقوفی سے ہوگی۔ تمہیں کیا معلوم کہ یوسفؑ کا خواب پورا ہوکر اور ہلال ایک روز بدر بن کر رہیگا۔

قَالُوٓا أَءِنَّكَ لَأَنْتَ يُوسُفُ ط
بولے کیا سچ تو ہی ہے یوسف

اب بھائیوں نے پہچان لیا:

ممکن ہے اس سوال سے گھبرائے ہوں کہ اتنی مدت کے بعد یہ کون گھر کا بھید ی نکل آیا۔ پھر عزیز مصر کو یوسفؑ کے قصہ سے کیا مطلب۔ غیر معمولی مہربانیاں اور بنیامین کے ساتھ خصوصی برتاؤ پہلے سے دیکھ ہی رہے تھے۔ اس سوال نے دفعۃً ان کا ذہن ادھر منتقل کردیا ہو کہ کہیں یوسفؑ جسے ہم نے مصری قافلہ کے ہاتھ بیچ ڈالا تھا یہ ہی تو نہیں ہے۔ جب ادھر توجہ ہوئی تو بغور دیکھا ہوگا اور ممکن ہے یوسفؑ نے خود بھی اپنے کو اس دفعہ زیادہ واضح طور پر پیش کیا ہو، یا تصریحاً کہہ دیا ہو کہ میں یوسفؑ ہوں۔ غرض وہ سخت متعجب وحیرت زدہ ہوکر بول اٹھے۔ "إِنَّكَ لَأَنْتَ يُوسُفُ" (سچ بتاؤ کیا تم ہی یوسف ہو؟) (تفسیر عثمانی)

قَالُوٓا أَءِنَّكَ لَأَنْتَ يُوسُفُ، کہنے لگے کیا سچ مچ آپ ہی یوسف ہیں۔ یہ استفہام تقریری ہے (کیا واقعی آپ ہی یوسفؑ ہیں؟) ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ پہلے حضرت یوسفؑ پردے کے پیچھے سے کلام کرتے تھے پھر جب هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ فرمایا تو پردہ ہٹادیا اور نقاب اٹھادیا اس وقت بھائیوں نے پہچان لیا۔

کیسے پہچانا:

میں کہتا ہوں قصہ مذکورہ کا تفصیل بیان ابن اسحاق کے اس قول سے انکار کررہا ہے اور یہ بھی بعید از فہم۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ اس بات کو کہتے وقت آپ مسکرادیئے مسکرانے سے موتیوں کے ہار کی طرح اگلے دانت سامنے آگئے اور بھائیوں نے دیکھ کر ان کو یوسفؑ کے دانتوں کی طرح قرار دیا۔

عطاء کی روایت میں حضرت ابن عباس کا قول آیا ہے کہ بھائی یوسفؑ کو اس وقت تک نہ پہچان سکے جب تک آپ نے سر سے تاج نہ اتار دیا۔ آپ کے سر کے اوپر ایک جانب لہسن تھا جو موروثی تھا۔ حضرت یعقوبؑ کے بھی تھا حضرت اسحٰق کے بھی تھا اور (حضرت اسحٰق کی والدہ) حضرت سارہ کے بھی تھا، علامت کو پہچان کر بھائی بول اٹھے بلاشبہ آپ یوسفؑ ہیں۔

تفسیر قرطبی ومظہری میں بروایت ابن عباس نقل کیا ہے کہ اس موقع پر یعقوب علیہ السلام نے عزیز مصر کے نام ایک خط لکھ کر دیا تھا جس کا مضمون یہ تھا:

"من جانب یعقوب صفی اللہ، ابن اسحٰق ذبیح اللہ ابن ابن ابراہیم خلیل اللہ، بخدمت عزیز مصر،

امابعد، ہمارا پورا خاندان بلاؤں اور آزمائشوں میں معروف ہے میرے دادا ابراہیم خلیل اللہ کا نمرود کی آگ سے امتحان لیا گیا، پھر میرے والد اسحٰق کا شدید امتحان لیا گیا، پھر میرے ایک لڑکے کے ذریعے میرا امتحان لیا گیا جو مجھ کو سب سے زیادہ محبوب تھا یہاں تک کہ اس کی مفارقت میں میری بینائی جاتی رہی اس کے بعد اس کا ایک چھوٹا بھائی مجھ غم زدہ کی تسلی کا سامان تھا جس کو آپ نے چوری کے الزام میں گرفتار کرلیا، اور میں بتلاتا ہوں کہ ہم اولاد انبیاء ہیں نہ ہم نے کبھی چوری کی ہے، نہ ہماری اولاد میں کوئی چور پیدا ہوا، والسلام۔"

یوسف علیہ السلام نے جب یہ خط پڑھا تو کانپ گئے اور بے اختیار رونے لگے، اور اپنے راز کو ظاہر کردیا، اور تعارف کی تمہید کے طور پر بھائیوں سے یہ سوال کیا کہ تم کو کچھ یہ بھی یاد ہے کہ تم نے یوسفؑ اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا برتاؤ کیا تھا جب کہ تمہاری جہالت کا زمانہ تھا کہ بھلے برے کی سوچ اور انجام بینی کی فکر سے غافل تھے۔

اس کا ایک واضح جواب تو یہ ہے کہ یہاں لفظ صدقہ سے حقیقی صدقہ مراد نہیں بلکہ معاملے میں رعایت کرنے کو صدقہ وخیرات کرنے سے تعبیر کردیا ہے، کیونکہ بالکل مفت غلہ کا سوال تو انہوں نے کیا ہی نہ تھا، بلکہ کچھ نکمی چیزیں پیش کی تھیں اور درخواست کا حاصل یہ تھا کہ ان کم قیمت چیزوں کو رعایت کرکے قبول فرمالیں، اس کے علاوہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اولاد انبیا کیلئے

صدقہ وخیرات کی حرمت صرف امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہو جیسا کہ ائمہ تفسیر میں سے مجاہدؒ کا یہی قول ہے۔ (بیان القرآن)

قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَآ اَخِيْ

کہا میں یوسف ہوں اور یہ ہے میرا بھائی

یعنی جس سے مجھ کو جدا کیا تھا آج میرے پاس بیٹھا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ط

اللہ نے احسان کیا ہم پر

جدائی کو ملاپ سے، ذلت کو عزت سے، تکلیف کو راحت سے، تنگی کو عیش سے بدل دیا۔ جو غلام بنا کر چند دراہم میں فروخت کیا گیا تھا، آج خدا نے اسے ملک مصر کی حکومت بخشی۔ (تفسیر عثمانی)

اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ

البتہ جو کوئی ڈرتا ہے اور صبر کرتا ہے تو اللہ ضائع نہیں کرتا

اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۰﴾

حق نیکی والوں کا

اللہ کی نعمتوں کو یاد کرے:

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں "جس پر تکلیف پڑے اور وہ شرع سے باہر نہ ہو اور گھبرائے نہیں تو آخر بلاء سے زیادہ عطاء ہو۔ (تفسیر عثمانی)

قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا سے ثابت ہوا کہ جب انسان کسی تکلیف ومصیبت میں گرفتار ہو، اور پھر اللہ تعالیٰ اس سے نجات عطا فرما کر اپنی نعمت سے نوازیں تو اب اس کو گذشتہ مصائب کا ذکر کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کے اس انعام واحسان ہی کا ذکر کرنا چاہیے جو اب حاصل ہوا ہے۔ مصیبت سے نجات اور انعام الٰہی کے حصول کے بعد پچھلی تکلیف ومصیبت کو روتے رہنا ناشکری ہے۔ ایسے ہی ناشکر کو قرآن عزیز میں کنود کہا گیا ہے اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ، کنود کہتے ہیں اس شخص کو جو احسانات کو یاد نہ رکھے صرف تکلیفوں اور مصیبتوں کو یاد رکھے۔

اسی لئے یوسف علیہ السلام کو بھائیوں کے عمل سے عرصہ دراز تک جن مصیبتوں سے سابقہ پڑا تھا ان کا اس وقت کوئی ذکر نہیں کیا، بلکہ اللہ جل شانہ کے انعامات ہی کا ذکر فرمایا۔

صبر وتقویٰ ہر مصیبت کا علاج ہے:

انہ من یتق ویصبر سے معلوم ہوا کہ تقوی یعنی گناہوں سے بچنا اور تکلیفوں پر صبر وثبات قدم، یہ دو صفتیں ایسی ہیں جو انسان کو ہر بلاء ومصیبت سے نکال دیتی ہیں، قرآن کریم نے بہت سے مواقع میں انہی دو صفتوں پر انسان کی فلاح وکامیابی کا مدار رکھا ہے، ارشاد ہے: وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا "یعنی اگر تم نے صبر وتقویٰ اختیار کرلیا تو دشمنوں کی مخالفانہ تدبیریں تمہیں کوئی گزند اور نقصان نہ پہنچا سکیں گی۔"

یہاں بظاہر یہ دعویٰ معلوم ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام اپنے متقی اور صابر ہونے کا ادعاء کررہے ہیں کہ ہمارے صبر وتقویٰ کی وجہ سے ہمیں مشکلات سے نجات اور درجات عالیہ نصیب ہوئے، مگر کسی کو خود اپنے تقویٰ کا دعویٰ کرنا بنص قرآن ممنوع ہے۔ (معارف مفتی صاحب)

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ

بولے قسم اللہ کی البتہ پسند کرلیا تجھ کو اللہ نے ہم سے

كُنَّا لَخٰطِئِيْنَ ﴿۹۱﴾

اور ہم تھے چوکنے والے

بھائیوں کی شرمساری:

یعنی تجھ کو ہر حیثیت سے ہم پر فضیلت دی اور تو اسی لائق تھا ہماری غلطی اور بھول تھی کہ تیری قدر نہ پہچانی، آخر تیرا خواب سچا اور ہمارا حسد بیکار ثابت ہوا۔ (تفسیر عثمانی)

قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ط يَغْفِرُ اللّٰهُ

کہا کچھ الزام نہیں تم پر آج بخشے اللہ

لَكُمْ ز

تم کو

یوسف علیہ السلام کی کریمی:

یوسف علیہ السلام بھائیوں سے اتنا بھی سننا نہیں چاہتے تھے۔ فرمایا یہ تذکرہ مت کرو، آج میں تمہیں کوئی الزام نہیں دیتا۔ تمہاری سب غلطیاں معاف کرچکا ہوں۔ جو لفظ میں نے کہے محض حق تعالیٰ کا احسان اور صبر وتقویٰ کا نتیجہ ظاہر کرنے کی نیت سے کہے آج کے بعد تمہاری تقصیر کا ذکر بھی نہ ہوگا میں دعا کرتا ہوں کہ تم نے جو خطائیں خدا تعالیٰ کی کی ہیں وہ بھی معاف کردے۔ (تفسیر عثمانی)

وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۹۲﴾

اور وہ ہے سب مہربانوں سے مہربان

میری مہربانی بھی اسی کی مہربانی کا ایک پرتو ہے۔ (تفسیر عثمانی)

تثریب آنکھوں کی چربی چھیل دینا ثرب آنکھوں پر چھائی ہوئی چربی مجازاً کسی کو لعنت ملامت کرنا جس سے مجرم کی آبروریزی اور توہین ہو رہی ہو مطلب یہ ہے کہ آج جبکہ میں تم لوگوں کو لعنت ملامت کرسکتا ہوں لیکن کچھ نہیں کہتا تو پھر آئندہ کچھ برا بھلا کہنے کا تو احتمال ہی نہیں ہے یا یہ مطلب ہے کہ تمہارے اقرار کے بعد میں نے تم کو معاف کر دیا اللہ تم کو معاف کرے وہ ارحم الراحمین ہے اور میں نادار محتاج ہوں۔ جب میں نے معاف کر دیا تو اللہ تو بے نیاز اور غفور ہے وہ ضرور معاف کر دے گا اور توبہ کرنے والے پر مہربانی فرمائے گا۔

بیضاوی نے لکھا ہے جب بھائیوں نے یوسف کو پہچان لیا تو کہا آپ صبح شام ہم کو کھانے پر بلواتے ہیں اور ہم سے جو آپ کے معاملے میں قصور ہو گیا تھا اس کی وجہ سے ہم کو آپ سے شرم آتی ہے، حضرت یوسف نے کیسا کریمانہ جواب دیا، مصر والے مجھے گذشتہ نظر ہی سے دیکھتے تھے لوگ کہتے تھے سبحان اللہ ایک غلام جو بیس درہم میں بیچا گیا تھا، اللہ نے اس کو کہاں پہنچایا اب جو لوگوں کو معلوم ہوا کہ میں (غلام نہیں تھا) تمہارا بھائی ہوں اور حضرت ابراہیم کا پوتا ہوں تو تمہاری وجہ سے مجھے عزت مل گئی اور مصر والوں کی آنکھوں میں میری عظمت پیدا ہوگئی۔

اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى
لے جاؤ یہ کرتہ میرا اور ڈالو اس کو منہ پر میرے باپ کے کہ چلا
وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا ۚ وَاْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ
آئے آنکھوں سے دیکھتا ہوا، اور لے آؤ میرے پاس
اَجْمَعِيْنَ ﴿٩٣﴾
گھر اپنا سارا

یعقوبؑ کی آنکھوں کیلئے کرتہ بھیجا:

یعنی میں بحالت موجودہ شام کا سفر نہیں کرسکتا۔ تم جاؤ والدین اور اپنے سب متعلقین کو یہاں لے آؤ۔ چونکہ والد بزرگوار کی نسبت وحی سے یا بھائیوں کی زبانی سے معلوم ہوا ہوگا کہ بینائی نہیں رہی یا نگاہ میں فرق آ گیا ہے اس لئے اپنا قمیص دے کر فرمایا کہ یہ ان کی آنکھوں کو لگا دینا بینائی بحال ہو جائیگی۔ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں "ہر مرض کی اللہ کے ہاں دوا ہے۔ آنکھیں گئی تھیں ایک شخص کے فراق میں، اسی کے بدن کی چیز ملنے سے چنگی ہوئیں۔ یہ کرامت تھی حضرت یوسف علیہ السلام کی۔" اور کرامت نہ کہیں تب بھی آجکل واقعات ومشاہدات کی بناء پر یہ بات مان لی گئی ہے کہ کسی سخت صدمہ یا غیر معمولی خوشی کے اثر سے بعض نابینا دفعۃً بینا ہو گئے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا "میرا یہ کرتہ لے جا کر میرے باپ کے منہ پر ڈال دو (اس سے) وہ بینا ہو جائیں گے۔ یا یہ مطلب ہے کہ وہ میرے پاس بینا ہو کر آ جائیں گے حسن نے کہا حضرت یوسفؑ کو اللہ نے اطلاع دیدی ہوگی جب ہی تو آپ نے فرمایا کہ وہ بینا ہو جائیں گے اللہ کی طرف سے اطلاع پانے کے بغیر وہ ایسی بات نہیں کہہ سکتے تھے۔ مجاہد نے کہا حضرت جبرئیلؑ نے حضرت یوسف کو (اللہ کی طرف سے) حکم دیا تھا کہ حضرت یعقوب کو اپنا کرتہ بھیج دیجئے۔

یہ قمیض کہاں سے آیا تھا:

یہ قمیص حضرت ابراہیمؑ کا تھا جب آپ کو آگ میں ڈالا گیا تو کپڑے اتار لیے گئے تھے اس وجہ سے حضرت جبرئیل نے جنت سے ایک ریشمی قمیص لا کر آپ کو پہنا دیا تھا یہ کرتہ حضرت ابراہیمؑ کے پاس رہا پھر آپ کی وفات کے بعد حضرت اسحٰق کو میراث میں ملا اور حضرت اسحٰق کے بعد حضرت یعقوبؑ کو پہنچا۔ یوسف جب جوان ہو گئے تو حضرت یعقوب نے وہ کرتہ ایک نلکی میں سر بند کر بطور تعویذ حضرت یوسفؑ کے گلے میں ڈال دیا تا کہ آپکو نظر نہ لگے ہر وقت وہ یوسف کے گلے میں رہتا تھا، جب آپ کو کرتہ اتار کر کنوئیں میں ڈالا گیا تو حضرت جبرئیل نے آ کر تعویذ کھول کر اس میں سے کرتہ نکال کر حضرت یوسفؑ کو پہنا دیا پھر حضرت یوسفؑ جب بھائیوں سے مذکورہ بالا گفتگو کر رہے تھے تو حضرت جبرئیل نے آ کر کہا وہ قمیص بھیج دیجئے، اس کے اندر جنت کی خوشبو ہے۔ جس دکھی اور بیمار پر اس کو ڈالا جائے گا وہ تندرست ہو جائے گا اس اطلاع کے بعد آپ نے وہ کرتہ اپنے بھائیوں کے سپرد کر دیا اور فرمایا اس کو میرے باپ کے چہرے پر ڈال دینا وہ بینا ہو جائیں گے۔

میں کہتا ہوں حضرت مجدد قدس سرہ کے کشف سے یہ امر ثابت ہو گیا کہ حسن یوسفؑ دنیوی چیزوں سے نہ تھا بلکہ آپ کا حسن اور وجود جنت کی چیزوں کی جنس سے تھا تو اب کوئی ضرورت نہیں کہ ہم اس کرتے کو جنت سے آیا ہوا مانیں بلکہ اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ وہ حضرت یوسف کا پہنا ہوا تھا وجود یوسفؑ تو خود جنت کی چیزوں کی جنس میں سے تھا (آپ کی ہستی اس عدمی دنیا کی چیز ہی نہ تھی) تفسیر مظہری

تمام کنبہ کی دعوت:

وَاْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ "یعنی تم سب بھائی اپنے سب اہل وعیال کو میرے پاس مصر لے آؤ، اصل مقصد تو والد محترم کو بلانے کا تھا، مگر یہاں بالتصریح والد کے بجائے خاندان کو لانے کا ذکر کیا شاید اس لئے کہ والد کو یہاں لانے کے لئے کہنا ادب کے خلاف سمجھا، اور یہ یقین تھا ہی کہ جب والد کی بینائی عود کر آئے گی اور یہاں آنے سے کوئی عذر مانع نہیں رہے گا تو وہ خود ہی

ضرور تشریف لائیں گے۔ قرطبی نے ایک روایت نقل کی ہے کہ برادران یوسفؑ میں سے یہودا نے کہا کہ یہ کرتہ میں لے جاؤں گا کیونکہ ان کے کرتے پر جھوٹا خون لگا کر بھی میں ہی لے گیا تھا جس سے والد کو صدمات پہنچے، اب اس کی مکافات بھی میرے ہی ہاتھ سے ہونا چاہیے۔ (معارف مفتی اعظم)

بغوی نے لکھا ہے جب حضرت یوسفؑ نے اپنا تعارف کرا دیا تو پھر باپ کا حال پوچھا اور فرمایا میرے بعد میرے باپ کی کیا حالت ہوئی بھائیوں نے بتایا کہ باپ کی آنکھیں (روتے روتے) جاتی رہیں۔ حضرت یوسفؑ نے اپنا کرتہ ان کو دیا اور باپ کو بلوایا اور فرمایا۔

وَلَمَّا فَصَلَتِ الۡعِيۡرُ قَالَ اَبُوۡهُمۡ اِنِّىۡ
اور جب جدا ہوا قافلہ کہا انکے باپ نے میں
لَاَجِدُ رِيۡحَ يُوۡسُفَ
پاتا ہوں بو یوسف کی

خوشبوئے یوسف:

خدا کی قدرت یوسفؑ مصر میں موجود ہیں۔ کبھی نہ کہا کہ یوسفؑ کی خوشبو آتی ہے۔ کیونکہ خدا کو امتحان پورا کرنا تھا۔ اب بلانے کی ٹھہری تو ادھر قافلہ یوسفؑ کا قمیص لیکر مصر سے نکلا ادھر پیراہن یوسفی کی خوشبو یعقوبؑ کے مشام جان کو معطر کرنے لگی۔ ایک یہ کیا، پورا واقعہ ہی عجائب قدرت کا ایک مرقع ہے۔ یعقوبؑ جیسے مشہور و معروف پیغمبر شام میں رہیں اور یوسفؑ جیسی جلیل القدر شخصیت مصر میں بادشاہت کرے، یوسفؑ کے بھائی کئی مرتبہ مصر آئیں خود یوسفؑ کے مہمان بنیں، اس کے باوجود خداوند قدوس کی حکمت غامضہ اور مشیت قاہرہ کا ہاتھ باپ کو بیٹے سے بیسیوں برس تک علیحدہ رکھے اور خون کے آنسو رلا کر امتحان کی تکمیل کرائے۔ "جلت قدرتہ وعز سلطانہ"۔ (تفسیر عثمانی)

لَوۡلَاۤ اَنۡ تُفَنِّدُوۡنِ ﴿۹۴﴾
اگر نہ کہو مجھ کو کہ بوڑھا بہک گیا

کتنے فاصلے سے خوشبو آئی:

یعنی یہ بات کہتے ہوئے جھجکتا ہوں۔ کیونکہ تمہاری سمجھ میں نہیں آئیگی، کہ دو گے بڈھا سٹھیا گیا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

مجاہد نے کہا تین روز کی مسافت سے یوسفؑ کی خوشبو یعقوبؑ کو پہنچ گئی تھی۔ حضرت ابن عباس کے ایک قول میں آٹھ رات کی مسافت کا ذکر آیا ہے یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہوا قمیص یوسفؑ کی خوشبو لیکر یعقوب تک پہنچی تھی جس سے آپ کو جنت کی خوشبو محسوس ہوئی اس سے معلوم ہوا کہ زمین پر سوائے قمیص کی خوشبو کے جنت کی اور کوئی خوشبو نہیں تھی اسی لئے آپ نے اِنِّیۡ لَاَجِدُ رِيۡحَ يُوۡسُفَ فرمایا۔ فند کا معنی ہے بڑھاپے کی وجہ سے عقل میں نقصان آجانا اور تفنید (باب تفعیل) کا معنی ہے کسی کو سٹھیایا ہوا قرار دینا۔ اس لئے عجوز مفندۃ نہیں کہا جاتا کیونکہ عورت کا نقصان عقل ذاتی ہوتا ہے (صرف بڑھاپے کی وجہ سے نہیں ہوتا عورت ناقص العقل فطرتاً ہوتی ہے۔) (تفسیر مظہری)

بازگشتن برادران یوسف علیہ السلام از سفر سوم و بشارت بہرون

قال اللہ تعالیٰ وَلَمَّا فَصَلَتِ الۡعِيۡرُ قَالَ اَبُوۡهُمۡ ۔

الیٰ. انه هوا الغفور الرحيم.

(ربط) جب یوسف علیہ السلام نے باپ کی بینائی کے لئے قمیص عطا کی اور کہا کہ سب اہل وعیال کو لے کر آؤ۔ تو سب بھائی پیراہن یوسفی لے کر شاداں وفرحاں مصر سے کنعان کی طرف روانہ ہوئے اور جب قافلہ مصر سے کنعان روانہ ہوا۔ یعنی مصر کی آبادی سے باہر نکل گیا تو یعقوب علیہ السلام نے اپنے گھر والوں سے کہا جو اس وقت ان کے پاس تھے تحقیق میں یوسف کی بو محسوس کرتا ہوں اگر تم مجھ کو مخبوط الحواس نہ کہو کہ بڑھاپے کی وجہ سے بہک گیا اور بہکی ہوئی باتیں کر رہا ہے جب تک خدا تعالیٰ کو ابتلاء منظور تھا اس وقت تک یوسف علیہ السلام کی کوئی خبر معلوم نہ تھی۔ حالانکہ مصر کنعان سے بہت دور تھا۔ مصر سے کنعان میں اور کنعان سے مصر میں ہمیشہ قافلے آتے جاتے رہتے تھے پھر جب خدائے تعالیٰ کو ان کی مصیبت کا دور کرنا منظور ہوا تو بادصبا نے بحکم خداوند تعالیٰ خلاف عادت یوسف علیہ السلام کی بو حضرت یعقوب علیہ السلام تک پہنچا دی اور اتنی دور سے خوشبو کا پہنچنا بطور معجزہ اور خرق عادت تھا۔

انبیاء کے معجزات:

اس سے ثابت ہوا کہ ہر ایک بات خدا کی قدرت میں ہے ادھر قافلہ یوسف علیہ السلام کی قمیص لے کر مصر سے نکلا اور ادھر اس کی خوشبو یعقوب علیہ السلام کو محسوس ہونے لگی۔ یہ یعقوب علیہ السلام کا معجزہ تھا اور معجزہ نبی کا اختیاری فعل نہیں ہوتا۔ کہ جب چاہے اس کو کر سکے بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے خدا جب چاہتا ہے جب اعجاز کا ظہور ہوتا ہے انبیاء کرام ظاہر صورت کے اعتبار سے عام مخلوق سے ممتاز نہیں ہوتے اور جب کسی اعجاز کا ظہور ہوتا ہے تب ان کا امتیاز ظاہر ہوتا ہے اسی مضمون کو شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے یوں ادا کیا ہے ۔

یکے پرسید ازاں گم کردہ فرزند — کہ اے عاقل گہر پیر خردمند!!
زمصرش بوئے پیراہن شمیدی! — چرا درچاہ کنعانش نہ دیدی
بگفت احوال ما برق جہانست — دمے پیدا و دیگر دم نہانست
گہے برطارم اعلیٰ نشینم — گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

حضرت فاروق اعظمؓ کی کرامت:

فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں خطبہ دے رہے تھے اور مجاہدین کا لشکر نہاوند میں مشغول جہاد تھا یکا یک اثناء خطبہ میں فاروق اعظم نے سردار لشکر ساریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آواز دی یا ساریۃ الجبل، اے ساریہ پہاڑ کے پیچھے دیکھ مقام نہاوند میں تمام لشکر نے حضرت عمر کی آواز سنی یہ حضرت عمرؓ کی کرامت تھی کہ بلا اسباب ظاہری حضرت عمر کی آواز مدینہ کے ممبر سے نہاوند پہنچادی۔ ایسی کرامتوں کا ظہور کبھی کبھی ہوتا ہے ہمیشہ نہیں۔ کیونکہ کرامت ولی کا اختیاری فعل نہیں بلکہ اللہ کا فعل ہے اس طرح معجزہ بھی اللہ کا فعل ہے نبی کا فعل نہیں اس کا ظہور اللہ کے ارادہ اور مشیت پر موقوف ہے پس جو خدا اپنے مقبول بندہ کی آواز اتنی دور تک پہنچا سکتا ہے اور سنا سکتا ہے تو وہی خدا اپنے برگزیدہ بندہ کے پیراہن کی خوشبو کسی دوسرے برگزیدہ بندہ کو صدہا میل دور کے فاصلہ پر سونگھا سکتا ہے۔ (معارف کاندھلوی)

قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ ﴿۹۵﴾
لوگ بولے قسم اللہ کی تو تو اپنی اسی قدیم غلطی میں ہے

بیٹوں کا انکار:

یعنی یوسفؑ کی محبت، اس کے زندہ ہونے اور دوبارہ ملنے کا یقین تیرے دل میں جاگزیں ہے۔ وہ ہی پرانے خیالات ہیں جو یوسفؑ کی خوشبو بن کر دماغ میں آتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

فَلَمَّاۤ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ
پھر جب پہنچا خوشخبری والا ڈالا اس نے وہ کرتہ اس کے منہ پر
فَارْتَدَّ بَصِيْرًا ۚ
پھر لوٹ کر ہو گیا دیکھنے والا

بینائی لوٹ آئی:

یعنی بینائی واپس آگئی، دوبارہ حسب سابق نظر آنے لگا۔ (تفسیر عثمانی)

پھر جب بشارت دینے والا (یوسفؑ کے پاس سے) یعقوبؑ کے پاس پہنچا تو کرتہ یعقوبؑ کے چہرے پر ڈال دیا جس سے فوراً یعقوب لوٹ کر بینا ہو گئے۔

حضرت ابن مسعود نے فرمایا قافلے کے پہنچنے سے پہلے بشارت دہندہ پہنچا حضرت ابن عباس نے فرمایا وہ یہودا تھا۔ سدی کا بیان ہے یہودا نے کہا جب میں خون آلودہ کرتہ لے کر باپ کے پاس گیا تھا اور ان کی اطلاع دی تھی کہ یوسفؑ کو بھیڑیا کھا گیا تو اب میں ہی یہ کرتہ لے کر جاؤں گا اور اطلاع دوں گا کہ یوسفؑ زندہ ہیں جیسے ان کو غم دیا تھا ویسے ہی ان کو خوش بھی کروں گا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا کرتہ لے کر یہودا ننگے سر دوڑتا ہوا نکل چلا صرف سات روٹیاں ساتھ لی تھیں وہ بھی پوری نہ کھا سکا اور اسی فرسخ کی مسافت طے کر کے باپ کے پاس پہنچا۔ بعض نے کہا خوش خبری دینے والا مالک بن عرتھا فَارْتَدَّ بَصِيْرًا کا معنی یہ ہے کہ یعقوب دوبارہ بینا ہو گئے، کمزور سے طاقت ور اور بڑھاپے کے بعد جوان ہو گئے۔

یعقوب نے کہا کیا میں نے تم لوگوں سے نہیں کہہ دیا تھا کہ اللہ کی جو باتیں میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ یعنی یوسفؑ کے زندہ ہونے اور اس سے ملاقات ہونے کی اطلاع میں نے تم کو پہلے ہی دے دی تھی یا میں نے تم سے کہہ دیا تھا کہ اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو اور مجھے یوسفؑ کی خوشبو محسوس ہو رہی ہے۔

یعقوب علیہ السلام کی فکر:

بغوی کا بیان ہے، روایت میں آیا ہے کہ حضرت یعقوب نے پوچھا یوسف کس حال میں ہے بشارت دینے والے نے جواب دیا وہ مصر کے بادشاہ ہیں حضرت یعقوب نے فرمایا بادشاہ ہے تو میں کیا کروں میں پوچھتا ہوں تم نے کس مذہب پر ان کو چھوڑا بشیر نے کہا اسلام پر، فرمایا اب نعمت کامل ہو گئی۔ (تفسیر مظہری)

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ۚ اِنِّيْۤ اَعْلَمُ مِنَ
بولا میں نے نہ کہا تھا تم کو کہ میں جانتا ہوں
اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾
اللہ کی طرف سے جو تم نہیں جانتے

یعنی میں نے کہا نہ تھا یوسف کی خوشبو آرہی ہے۔ آخر سچ ہوا۔ یا بیٹوں کو کہا تھا کہ یوسف کو تلاش کرو۔ اللہ کی رحمت سے کیا بعید ہے کہ ہم سب کو پھر اکٹھا کر دے۔ دیکھ لو وہ ہی صورت ہوئی۔ (تفسیر عثمانی)

قَالُوْا يٰۤاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَاۤ اِنَّا كُنَّا
بولے اے باپ بخشوا ہمارے گناہوں کو بے شک ہم تھے
خٰطِئِيْنَ ﴿۹۷﴾
چوکنے والے

گناہ بخشوانے کی درخواست:

یعنی توجہ اور دعا کر کے خدا سے ہمارے گناہ معاف کرائیے۔ ہم سے بڑی بھاری خطائیں ہوئی ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ پہلے آپ معاف کر دیں۔

پھر صاف دل ہو کر بارگاہ رب العزت سے معافی دلوائیں کیونکہ جو خود نہ بخشے وہ خدا سے کہاں بخشوائے گا۔ (تفسیر عثمانی)

قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّىْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ
کہا دم لو بخشواؤں گا تم کو اپنے رب سے وہی ہے
الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۹۸﴾
بخشنے والا مہربان

تاخیر کا مقصد:

یعنی قبول کی گھڑی آنے دو، اس وقت اپنے مہربان خدا کے آگے تمہارے لئے ہاتھ اٹھاؤں گا، کہتے ہیں جمعہ کی شب یا تہجد کے وقت کا انتظار تھا۔ (تفسیر عثمانی)

شعبی نے کہا سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ کا یہ مطلب ہے کہ میں یوسف سے معاف کردینے کو کہوں گا وہ معاف کردیں گے تو پھر اللہ سے تمہارے لئے استغفار کروں گا۔ اللہ اسی وقت معاف کرتا ہے جب مظلوم (بھی اپنا حق) معاف کردے۔ بعض علماء نے کہا حضرت یعقوب جاننا چاہتے تھے کہ بیٹوں نے سچے دل سے توبہ کی ہے یا نہیں۔ یہ بات معلوم ہونے تک آپ نے دعا کو موخر کردیا۔

مصر جانے کی تیاری:

نووی نے لکھا ہے روایت میں آیا کہ بشارت دینے والے قاصد کے ساتھ حضرت یوسف نے دوسو اونٹنیاں اور بکثرت سامان بھی بھیجا تھا۔ تاکہ حضرت تمام اہل وعیال و متعلقین کو لے کر مصر آجائیں۔ چنانچہ آپ مصر جانے کو تیار ہوگئے اور زن ومرد بہتر اور مسروق کے بقول ۳۹۰ شخص روانہ ہوگئے جب یہ قافلہ مصر کے قریب پہنچا تو حضرت یوسف نے (اصل) شاہ مصر سے ساتھ چلنے کو کہا چنانچہ حضرت یوسفؑ اور بادشاہ چار ہزار فوج کے ساتھ استقبال کے لئے روانہ ہوگئے۔ مصر کے اور لوگ بھی حضرت یوسف کے معیت میں استقبال میں شریک تھے، حضرت یعقوب یہودا پر سہارا دیئے پیدل آرہے تھے، سواروں اور دوسرے لوگوں کو ملاحظہ فرمایا تو دریافت کیا یہودا کیا یہ فرعون مصر ہے، یہودا نے جواب دیا نہیں ابا یہ تو آپ کے صاحبزادے ہیں۔ (تفسیر مظہری)

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰۤى اِلَيْهِ
پھر جب داخل ہوئے یوسف کے پاس جگہ دی
اَبَوَيْهِ وَقَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ
اپنے پاس اپنے ماں باپ کو، اور کہا داخل ہو مصر میں اللہ نے

اٰمِنِيْنَ ؕ ﴿۹۹﴾
چاہا تو دل جمعی سے

استقبال:

شہر سے باہر استقبال کو نکلے۔ ماں باپ کو اپنے قریب جگہ دی (اس میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ بعض کا قول ہے کہ حضرت یوسف کی والدہ پیشتر وفات پاچکی تھیں۔ جیسا کہ سابق فوائد میں گذر چکا۔ یہاں خالہ کا ذکر ہے اور بعض کہتے ہیں کہ والدہ حیات تھیں۔ اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے ساتھ مصر تشریف لائی تھیں) سب کو فرمایا شہر میں چلو، قحط وغیرہ کا اب کچھ اندیشہ مت کرو۔ ان شاء اللہ بالکل دلجمعی اور راحت واطمینان سے رہو گے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ الفاظ شہر میں پہنچ کر کہے۔ گویا "ادخلوا مصر" الخ کے معنی ہوئے مصر میں قیام کرو بے کھٹکے۔ (تفسیر عثمانی)

میں کہتا ہوں شاید حضرت یوسف مصر سے روانہ ہو کر کسی خاص مقام تک پہلے پہنچ گئے اور وہاں کسی خیمہ یا محل میں اتر کر رک گئے تاکہ قافلہ وہاں پہنچ جائے تو اس کا استقبال کریں اور حضرت یعقوب اپنے متعلقین کے ساتھ اسی مقام پر پہنچ کر حضرت یوسف کے پاس (قصر یا خیمہ کے اندر) داخل ہوئے ہوں۔

بغوی نے لکھا ہے جب یوسف اور یعقوب ایک دوسرے کے قریب پہنچ گئے تو حضرت یوسفؑ نے سلام کرنا چاہا لیکن حضرت جبرئیلؑ نے روک دیا اور فرمایا پہلے وہ سلام کریں پھر آپ کرنا۔

میں کہتا ہوں شاید یہ اس محبوبیت الہیہ کا اثر تھا جو حضرت یوسفؑ میں نمودار ہوگئی تھی آخر حضرت یعقوبؑ نے ہی ابتدائی سلام کیا اور کہا اے غموں کے دور کرنے والے تجھے سلامتی ہو۔

یوسفؑ کی ماں:

اکثر اہل تفسیر کا قول ہے کہ ماں باپ سے مراد ہیں حضرت یعقوب اور حضرت یوسف کی خالہ لیا جس طرح دوسری آیت میں چچا کو اللہ نے باپ فرمایا ہے اور ارشاد فرمایا اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اسی طرح اس آیت میں خالہ کو ماں قرار دیا ہے۔ یا یہ وجہ ہے کہ حضرت یعقوب نے حضرت یوسف کی والدہ کے بعد لیا سے نکاح کرلیا تھا اور لیا ہی نے آپ کی پرورش کی تھی اور پرورش کرنے والی کو اماں کہا ہی جاتا ہے حضرت یوسف کی ماں بنیامین کی ولادت کے وقت مرچکی تھیں۔

حسن بصری کا قول ہے کہ ماں زندہ تھیں اور ابوین سے ماں باپ ہی مراد ہیں۔ بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ اللہ نے حضرت یوسف کی والدہ کو زندہ کردیا تھا اور وہ حضرت یعقوب کے ساتھ مصر آئی تھیں۔

باپ بیٹے کی ملاقات:

بغوی نے لکھا ہے روایت ہے کہ حضرت یوسفؑ اور حضرت یعقوبؑ دونوں نے اتر کر معانقہ کیا، ثوری نے کہا ہر ایک دوسرے کے گلے سے ملا اور دونوں رونے لگے یوسف نے کہا ابا میری وجہ سے آپ اتنا روئے کہ آپ کی نظر جاتی رہی کیا آپ کو یقین نہ تھا کہ قیامت کے دن ہم دونوں ضرور ملیں گے حضرت یعقوب نے فرمایا بیٹے یقین کیوں نہ تھا مجھے تو اس بات کا اندیشہ تھا کہ کہیں تیرا مذہب نہ بدل گیا ہو اور پھر (قیامت کے دن) میرے اور تیرے درمیان رکاوٹ حائل ہو جائے۔

شہر میں داخلہ:

وَقَالَ ادْخُلُوا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ

اور کہا (چلو) مصر کے اندر امن کے ساتھ اللہ نے چاہا تو رہو۔

یعنی تم کو شہر کے اندر داخل ہونے کے اجازت نامے کی ضرورت نہیں۔ شاہی اجازت نامہ کے بغیر اس زمانہ میں کوئی مصر میں داخل نہیں ہو سکتا تھا یا یہ مطلب ہے کہ اب کال اور دوسری مصائب کا آپ لوگوں کو کوئی اندیشہ نہیں۔ (تفسیر مظہری)

وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا
اور اونچا بٹھایا اپنے ماں باپ کو تخت پر اور سب گرے اس کے آگے
لَهٗ سُجَّدًا ۚ
سجدہ میں

تعظیم یوسف علیہ السلام:

یوسفؑ نے اپنی طرف سے والدین کی تعظیم کی، تخت پر بٹھلایا، لیکن خدا کو یوسفؑ کی جو تعظیم کرانی تھی اسے یوسفؑ کب روک سکتے تھے۔ اس وقت کے دستور کے موافق ماں باپ اور سب بھائی یوسف علیہ السلام کے آگے سجدہ میں گر پڑے۔ یہ سجدہ تعظیمی تھا، جو بقول حافظ عماد الدین ابن کثیر آدم کے زمانہ سے مسیح علیہ السلام کے عہد تک جائز رہا۔ البتہ شریعت محمدیہ نے ممنوع وحرام قرار دیا۔ جیسا کہ احادیث کثیرہ اس پر شاہد ہیں۔ بلکہ حضرت شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ نے وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ الخ سے حرمت کا اشارہ نکالا ہے۔ بعض مفسرین نے اس جگہ سجدہ کے معنی متبادر مراد نہیں لئے۔ محض جھک جانے کے معنی لئے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ سجدہ یوسفؑ کو نہ تھا بلکہ یوسفؑ کی عزت وعظمت دیکھ کر سب نے خدا کے سامنے سجدہ شکر ادا کیا۔ اس تقدیر پر وَخَرُّوْا لَهٗ'' میں لام سببیہ ہوگا۔ یعنی یوسفؑ کے عروج واقتدار کے سبب سے خدا کے آگے سجدہ میں گر پڑے۔

سجدہ اور تعظیم:

(تنبیہ) تعظیم اور عبادت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ غیر اللہ کی تعظیم کلیۃً ممنوع نہیں، البتہ غیر اللہ کی عبادت شرک جلی ہے۔ جس کی اجازت ایک لمحہ کے لئے کبھی نہیں ہوئی، نہ ہو سکتی ہے، ''سجود عبادت'' یعنی غیر اللہ کو کسی درجہ میں نفع وضرر کا مستقل مالک سمجھ کر سجدہ کرنا شرک جلی ہے۔ جس کی اجازت کبھی کسی ملت سماوی میں نہیں ہوئی۔ ہاں ''سجود تعظیم'' یعنی عقیدہ مذکورہ بالا سے خالی ہو کر محض تعظیم وتکریم کے طور پر سر بسجود ہونا شرائع سابقہ میں جائز تھا۔ شریعت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم نے اس کی بھی جڑ کاٹ دی۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں اقسام شرک پر جو دقیق بحث کی ہے اسے دیکھنا چاہیے۔ (تفسیر عثمانی)

بعض نے کہا زمین پر پیشانی رکھنا ہی مراد ہے مگر یہ سجدہ عبادت نہ تھا سجدہ احترام وتعظیم تھا اور اس زمانہ میں احترام وتعظیم کا یہی طریقہ رائج تھا اور گذشتہ امتوں کے لئے بھی غیر اللہ کو سجدہ تعظیمی کرنا جائز تھا۔ ہماری شریعت نے منسوخ کر دیا (اب کسی قسم کا سجدہ اللہ کے سوا کسی کو نہیں کیا جا سکتا) حضرت ابن عباس کا قول اس آیت کی تفسیر میں اس طرح آیا ہے وہ اللہ کے لئے سجدہ میں گر پڑے یوسف کے سامنے ادائے شکر کے طور پر۔ لہ کی ضمیر اللہ کی طرف راجع ہے (یوسفؑ کی طرف راجع نہیں ہے) میں کہتا ہوں گویا حضرت ابن عباس کی تفسیر پر یوسف مسجود لہ نہ تھے قبلہ سجود اور جہت سجدہ تھے اور یوسف کا قبلہ سجود ہونا اللہ کے حکم سے تھا جیسے ہمارے لئے کعبے کا بحکم الٰہی قبلہ سجود بنا دیا گیا ہے۔ اور جیسے آدم کو فرشتوں کے لئے قبلہ سجود بنا دیا گیا۔ (تفسیر مظہری)

وفات یعقوبؑ:

امام قرطبی فرماتے ہیں کہ اہل تاریخ کا بیان ہے کہ یعقوب علیہ السلام مصر میں یوسف علیہ السلام کے پاس ۲۴ برس تک نہایت خوش حالی اور فارغ البالی اور کمال عیش وعشرت کے ساتھ رہے جب ان کی وفات کا وقت آیا تو حضرت یوسف علیہ السلام کو وصیت کی کہ ان کے جسد مطہر کو شام کی مقدس زمین میں ان کے باپ اسحاق علیہ السلام کی قبر کے پاس دفن کرنا جب یعقوب علیہ السلام نے مصر میں وفات پائی تو یوسف علیہ السلام ان کی وصیت کے مطابق ساج کے ایک تابوت میں ان کے جسد کو رکھ کر شام لے گئے جس روز شام پہنچے اتفاق سے اسی روز یعقوب علیہ السلام کے بھائی عیص نے انتقال کیا، دونوں بھائی ایک ہی قبر میں دفن کئے گئے اور ایک ہی ساتھ دونوں پیدا ہوئے تھے اور ہر ایک کی عمر ایک سو سینتالیس ۱۴۷ برس ہوئی یوسف علیہ السلام اپنے باپ اور چچا کے دفن سے فارغ ہو کر مصر واپس آ گئے۔ (معارف کاندھلوی)

سجدہ کا مقصد:

وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ یعنی والدین اور سب بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کے سامنے سجدہ کیا، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ سجدہ شکر اللہ تعالیٰ کے لئے کیا گیا تھا، یوسف علیہ السلام کو نہیں تھا، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ سجدہ عبادت تو ہر پیغمبر کی شریعت میں غیر اللہ کے لئے حرام تھا، لیکن سجدہ تعظیم انبیاء سابقین کی شریعتوں میں جائز تھا جو شریعت اسلام میں ذریعہ شرک ہونے کی بناء پر ممنوع ہو گیا ہے، جیسا کہ حدیث صحیحین میں مذکور ہے کہ کسی غیر اللہ کے لئے سجدہ حلال نہیں۔ (معارف مفتی صاحب)

وَقَالَ يٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ

اور کہا اے باپ یہ بیان ہے میرے اس پہلے خواب کا

قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا ؕ

اس کو میرے رب نے سچ کر دیا

خواب کی تعبیر پوری ہوئی:

یعنی میرا اس میں کچھ دخل نہیں، خواب کی تعبیر پوری ہونی تھی وہ خدا نے پوری کر دکھائی۔ (تفسیر عثمانی)

فرمایا کہ ابا جان! یہ میرے اس خواب کی تعبیر ہے جو بچپن میں دیکھا تھا کہ آفتاب و ماہتاب اور گیارہ ستارے مجھے سجدہ کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے اس خواب کی سچائی کو آنکھوں سے دکھلا دیا۔

احکام و مسائل

۱۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے صاحبزادوں کی درخواست معافی و دعائے مغفرت پر جو یہ فرمایا کہ "عنقریب تمہارے لئے دعائے مغفرت کروں گا، اور فوراً دعا نہیں کی، اس تاخیر کی ایک وجہ بعض حضرات نے یہ بھی بیان کی ہے کہ منظور یہ تھا کہ یوسف علیہ السلام سے مل کر پہلے یہ تحقیق ہو جائے کہ انہوں نے ان کی خطا معاف کر دی ہے یا نہیں، کیونکہ جب تک مظلوم معافی نہ دے عند اللہ بھی معافی نہیں ہوتی، ایسی حالت میں دعائے مغفرت بھی مناسب نہ تھی۔

یہ بات اپنی جگہ بالکل صحیح اور اصولی ہے کہ حقوق العباد کی توبہ بغیر اس کے نہیں ہوتی کہ صاحب حق اپنا حق وصول کرے یا معاف کر دے، محض زبانی توبہ و استغفار کافی نہیں۔

۲۔ حضرت سفیان ثوریؒ کی روایت ہے کہ جب یہودا قمیص یوسف لے کر آئے اور یعقوب علیہ السلام کے چہرے پر ڈالا تو پوچھا کہ یوسف کیسے ہیں؟ انہوں نے بتلایا کہ وہ مصر کے بادشاہ ہیں، یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ میں اس کو نہیں پوچھتا کہ وہ بادشاہ ہیں یا فقیر، پوچھنا یہ ہے کہ ایمان اور عمل کے اعتبار سے کیا حال ہے، تب انہوں نے ان کے تقویٰ و طہارت کے حالات بتلائے یہ ہے انبیاء علیہم السلام کی محبت اور تعلق کہ اولاد کی جسمانی راحت سے زیادہ ان کی روحانی حالت کی فکر کرتے ہیں ہر مسلمان کو اسی کا اتباع کرنا چاہیے۔

۳۔ حضرت حسنؒ سے روایت ہے کہ جب بشارت دینے والا قمیص یوسف لے کر پہنچا تو یعقوب علیہ السلام چاہتے تھے کہ اس کو کچھ انعام دیں مگر حالات سازگار نہ تھے اس لئے عذر کیا کہ سات روز سے ہمارے گھر میں روٹی نہیں پکی، اس لئے میں کچھ مادی انعام تو نہیں دے سکتا، مگر یہ دعا دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تم پر سکرات موت کو آسان کر دیں، قرطبیؒ نے فرمایا کہ یہ دعا ان کے لئے سب سے بہتر انعام تھا۔ ۴۔ اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خوشخبری دینے والے کو انعام دینا سنت انبیاء ہے۔ صحابہ کرام میں حضرت کعب بن مالکؓ کا واقعہ مشہور ہے کہ غزوہ تبوک میں شرکت نہ کرنے پر جب ان پر عتاب ہوا اور بعد میں توبہ قبول کی گئی، تو جو شخص قبول توبہ کی بشارت لایا تھا، اپنا جوڑا کپڑوں کا اتار کر اس کو پہنا دیا۔

نیز اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ خوشی کے موقع پر اظہار مسرت کے لئے دوستوں وغیرہ کو کھانے کی دعوت دینا بھی سنت ہے حضرت فاروق اعظمؓ نے جب سورہ بقرہ پڑھ کر ختم کی تو خوشی میں ایک اونٹ ذبح کر کے لوگوں کو کھلایا۔

۵۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے صاحبزادوں نے حقیقت واقعہ ظاہر ہو جانے کے بعد اپنے والد اور بھائی سے معافی مانگی، اس سے معلوم ہوا کہ جس شخص کے ہاتھ یا زبان سے کسی شخص کو ایذا پہنچی، یا اس کا کوئی حق اس کے ذمہ رہا، اس پر لازم ہے کہ فوراً اس حق کو ادا کر دے یا اس سے معاف کرالے۔ صحیح بخاری میں بروایت ابو ہریرہؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص کے ذمہ کسی دوسرے کا کوئی حق مالی واجب ہو، یا اس کو کوئی ایذاء ہاتھ یا زبان سے پہنچائی ہو اس کو چاہیے کہ آج اس کو ادا کر دے یا معافی مانگ کر اس سے سبکدوشی حاصل کر لے قبل اس کے کہ قیامت کا وہ دن آ جائے جہاں کسی کے پاس کوئی مال حق ادا کرنے کے لئے نہ ہوگا اس لئے اس کے اعمال صالحہ مظلوم کو دیدیئے جائیں گے یہ خالی رہ جائے گا اور اگر اس کے اعمال بھی صالح نہیں تو دوسرے کے جو گناہ ہیں اس کے سر پر ڈال دیئے جائیں گے والعیاذ باللہ تعالیٰ۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْۤ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ

اور اس نے انعام کیا مجھ پر جب مجھ کو نکالا قید خانہ سے

وَجَآءَ بِكُمۡ مِّنَ الۡبَدۡوِ مِنۡۢ بَعۡدِ اَنۡ نَّزَغَ

اورتم کو لے آیا گاؤں سے بعد اس کے کہ جھگڑا ڈال چکا تھا

الشَّيۡطٰنُ بَيۡنِىۡ وَبَيۡنَ اِخۡوَتِىۡ ؕ اِنَّ رَبِّىۡ

شیطان مجھ میں اور میرے بھائیوں میں میرا رب

لَطِيۡفٌ لِّمَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الۡعَلِيۡمُ الۡحَكِيۡمُ ۝۱۰۰

تدبیر سے کرتا ہے جو چاہتا ہے بے شک وہی ہے خبردار حکمت والا

احسانات خداوندی کا شکریہ:

خداتعالیٰ کے احسانات ذکر فرمائے اوراس کی تدبیر لطیف کی طرف توجہ دلائی کہ کس طرح مجھ کوقید سے نکال کرملک کا حاکم مختار بنا دیا اوراس جھگڑے کے بعد جوشیطان نے ہم بھائیوں میں ڈال دیا تھا جبکہ کوئی امید دوبارہ ملنے کی نہ رہی تھی، کیسے اسباب ہمارے ملاپ کے فراہم کردیے اس موقع پر اپنی مصائب وتکالیف کا کچھ ذکر نہ کیا، نہ کوئی حرف شکایت زبان پرلائے، بلکہ بھائیوں کے واقعہ کی طرف بھی ایسے عنوان سے اشارہ کیا کہ کسی فریق کی زیادتی یاتقصیر ظاہر نہ ہونے پائے۔ مبادا بھائی سن کر محجوب ہوں۔ اللہ اکبر، یہ اخلاق پیغمبروں کے سواکس میں ہوتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

اورخدا نے میرے ساتھ (بڑا) احسان کیا کہ مجھے قید سے نکالا اورتم سب کو جنگل سے یہاں لے آیا۔ (یہ سب کچھ) اس کے بعد ہوا کہ شیطان نے میرے اورمیرے بھائیوں کے درمیان فساد ڈلوادیا تھا باوجودیکہ کنواں شدید ترین قید خانہ تھا لیکن حضرت یوسفؑ نے کرم ذاتی سے کام لے کراس کا ذکر نہیں کیا تاکہ بھائیوں کوشرمندگی نہ ہواس کے علاوہ جیل خانہ سے رہائی کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس لئے بھی کیا کہ کنویں سے نکل کرتو غلام ہونا پڑا اورعورتوں کے پھندے میں گرفتار ہونے سے سابقہ پڑا اورقید خانہ سے نکل کر بادشاہ بنائے گئے (توجیل خانہ سے نکالنا اللہ کا عظیم الشان احسان ہوا) البدو صحرائی میدان جہاں چرواہے اورصحرائی لوگ اپنے جانوروں کو لے کر رہتے ہیں۔

نزغ یعنی ہمارے درمیان فساد ڈلوادیا۔ یہ لفظ نزغ الرابض الدابۃ سے ماخوذ ہے ایڑ مار کرسوار نے گھوڑا اٹھایا اور چلایا۔

یعقوب علیہ السلام کا شکوہ:

بیضاوی نے لکھا ہے حضرت یوسفؑ نے اپنے ہرچیز کے ذخیرے اورخزانہ کی ماں باپ کوسیر کرائی کاغذ کا ذخیرہ دیکھ کرحضرت یعقوبؑ نے فرمایا اتنا کثیر انبار کاغذ کا تیرے پاس پڑا ہے اورتو نے ایک خط صرف آٹھ منزل کے فاصلے پر مجھے نہیں بھیجا۔ حضرت یوسفؑ نے جواب دیا جبرئیلؑ نے مجھے یہی ہدایت کی تھی حضرت یعقوبؑ نے فرمایا تو نے جبرئیلؑ سے اس کی وجہ کیوں دریافت نہیں کی۔ حضرت یوسفؑ نے کہا آپ حضرت جبرئیلؑ سے زیادہ بے تکلف ہیں آپ ہی دریافت فرمالیں حضرت یعقوب نے حضرت جبرئیلؑ سے (اطلاعی خط بھیجنے کی ممانعت کی) وجہ دریافت کی حضرت جبرئیلؑ نے کہا مجھے اللہ نے ایسا ہی حکم دیا تھا کیونکہ آپ نے وَاَخَافُ اَنۡ يَّاۡكُلَهُ الذِّئۡبُ کہا تھا اس پر اللہ نے فرمایا تم کو بھیڑیے کا تو اندیشہ ہوا اور میرا خوف نہیں ہوا۔

یعقوب علیہ السلام کی تدفین:

امام احمد نے الزہد میں مالک کی روایت سے لکھا ہے کہ حضرت یعقوب جب بہت کمزور اوراٹھنے بیٹھنے سے بھی معذور ہوگئے تو اپنے بیٹے یوسفؑ سے فرمایا کپڑوں کے اندر ہاتھ ڈال کر میری پشت پر ہاتھ رکھ کر رب یعقوبؑ کی قسم کھا کراقرار کرو کہ مجھے میرے باپ دادا کے ساتھ دفن کروگے میں زندگی کے کام میں ان کا شریک رہا تو مرنے کے بعد مجھے انہی کے قبرستان میں ان کے ساتھ دفن کرنا جب آپ کی وفات ہوگئی تو حضرت یوسف نے ایسا ہی کیا کنعان میں لے جا کر آباؤاجداد کے ساتھ دفن کردیا۔ (تفسیر مظہری)

سعید بن جبیر نے فرمایا سار کے تابوت میں حضرت یعقوبؑ کی میت کوبیت المقدس لے گئے اتفاق ایسا ہوا کہ اسی روز عیص کا بھی انتقال ہوگیا دونوں کوایک ہی مقبرے میں (یا ایک ہی قبر میں) دفن کیا گیا دونوں کی عمر ۱۴۷ برس ہوئی عیص اوریعقوبؑ ساتھ ہی ایک بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ (اگرچہ توام نہ تھے) جب حضرت یوسفؑ کے تمام دنیوی امور کامل طور پر درست ہوگئے تو آپ نے خیال کیا یہ راحت اورنعمت باقی رہنے والی تو ہے نہیں۔ دنیا کی کسی نعمت کوبقا نہیں اس لئے حسن خاتمہ کی دعا کی اور کہا۔ (تفسیر مظہری)

رَبِّ قَدۡ اٰتَيۡتَنِىۡ مِنَ الۡمُلۡكِ وَعَلَّمۡتَنِىۡ

اے رب تو نے دی مجھ کو کچھ حکومت اور سکھایا

مِنۡ تَاۡوِيۡلِ الۡاَحَادِيۡثِ ۚ

مجھ کوکچھ پھیرنا باتوں کا

اس سورت کے پہلے رکوع میں "تَاۡوِيۡلِ الۡاَحَادِيۡثِ" کی تفسیر گذرچکی۔ (تفسیر عثمانی)

موت کی دُعاء:

قتادہ نے کہا سوائے یوسفؑ کے اورکسی نبی نے اپنی موت کے دعا نہیں کی۔ میرے نزدیک یہ قول محل تامل ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی تھی

۔اللهم الرفيق الاعلىٰ. حضرت عائشہؓ نے فرمایا میں سنا کرتی تھی کہ کسی نبی کی وفات اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک اس کو دنیا وآخرت (میں سے ایک کو انتخاب کر لینے) کا اختیار نہیں دیدیا جاتا (اور وہ آخرت کو پسند نہیں کر لیتا) چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری میں جب سخت بحرانی کیفیت پیدا ہوگئی تو میں نے خود سنا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا. یہ سن کر میں نے یقین کر لیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو (دنیا اور آخرت میں سے ایک کو پسند کر لینے کا) اختیار دے دیا گیا۔ رواہ الشیخان فی الصحیحین وابن سعد۔

قصہ کا تکملہ:

حضرت یوسفؑ کے تمام دنیوی احوال جب درست ہو گئے اور ماں باپ اور دوسرے متعلقین بھی مل گئے تو اس وقت اپنے رب سے ملنے کا شوق غالب آیا اور مذکورہ دعا کی۔ حسن بصری نے فرمایا اس کے بعد آپ چند سال زندہ رہے دوسرے علماء کا خیال ہے ایک ہفتہ بھی گذرنے نہ پایا کہ آپ کی وفات ہوگئی۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت یوسفؑ حضرت یعقوبؑ سے کتنی مدت جدا رہے علماء کے اس سلسلہ میں مختلف اقوال ہیں کلبی نے کہا ۲۲ سال جدا رہے۔ بعض نے ۴۰ سال مدت جدائی بیان کی۔ حسن بصری نے کہا ۱۷ سال کی عمر میں کنوئیں میں ڈالے گئے اور باپ سے اسی برس غائب رہے اور حضرت یعقوب کی ملاقات کے بعد ۲۳ سال جیئے اور ۱۲۰ برس کی عمر میں وفات پائی۔ توریت میں آپ کی عمر ۱۱۰ سال ذکر کی گئی ہے۔

عزیز کی بیوی کے بطن سے حضرت یوسف کے تین بچے ہوئے افرائیم۔ میشا اور (تیسری لڑکی) رحمت

افرائیم کی نسل میں سے یوشع بن نون خادم موسیٰ ہوئے۔ رحمت حضرت ایوبؑ صابر کی بیوی تھیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت یعقوب کے بعد حضرت یوسف ساٹھ سال یا اس سے بھی زیادہ زندہ رہے بہر حال وفات کے وقت (برقول صحیح) آپ کی عمر ۱۲۰ برس تھی۔ اہل مصر نے سنگ مرمر کے ایک تابوت میں بند کر کے نیل میں آپ کو دفن کر دیا اس کی وجہ یہ ہوئی کہ آپ کی وفات کے بعد ہر محلے والوں نے اپنے محلّہ میں آپ کو دفن کرنا چاہا تا کہ اس محلے والوں کو برکت حاصل ہو اختلاف اتنا بڑھا کہ باہم جنگ ہونے اور لڑنے مرنے کا اندیشہ ہوگیا، آخر سب نے یہی مناسب سمجھا کہ آپ کو نیل کے اندر دفن کر دیا جائے۔ نیل کا پانی پورے شہر میں پھیلتا تھا اس طرح آپ کی برکت سے پورا شہر بہرہ اندوز ہوگا۔

عکرمہ نے کہا نیل کے دائیں جانب آپ کو دفن کیا گیا تھا جس کی وجہ سے وہ جانب بہت سرسبز اور غلہ آفریں ہو گیا اور دوسرا جانب خشک ہو گیا پھر آپ کو دائیں جانب سے نیل کے بائیں جانب منتقل کیا گیا تو دایاں جانب سوکھ گیا اور بایاں جانب سرسبز ہو گیا آخر نیل کے وسط میں دفن کر دیا۔ اس طرح نیل کے دونوں رخ سرسبز ہو گئے۔ حضرت موسیٰ کے زمانہ تک آپ کی قبر نیل ہی میں رہی۔ پھر حضرت موسیٰ نے آپ کا تابوت نیل سے نکلوا کر ملک شام کو منتقل کیا اور باپ دادا کے قبرستان میں دفن کر دیا۔ ابن اسحاق اور ابن ابی حاتم نے بحوالہ عروہ بن زبیر بیان کیا کہ اللہ نے جب حضرت موسیٰ کو حکم دیا کہ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر (شام کو) لے جاؤ تو اس کے ساتھ یہ بھی حکم دیا تھا کہ یوسفؑ کی ہڈیاں بھی ساتھ لے جانا مصر کی زمین میں نہ چھوڑنا بلکہ ارض مقدسہ میں لے جا کر دفن کر دینا۔ حضرت موسیٰ نے تلاش کی کہ کوئی یوسفؑ کی قبر کا نشان جاننے والا مل جائے تلاش کے بعد صرف ایک بڑھیا اسرائیلی ملی جس نے کہا کہ اے اللہ کے نبی میں یوسف کی قبر کا مقام جانتی ہوں اگر آپ مجھے اپنے ساتھ یہاں سے نکال کر لے جائیں اور سرزمین مصر میں چھوڑ کر نہ جائیں تو میں آپ کو قبر بتا دوں گی۔ حضرت موسیٰ نے فرمایا، میں تیری خواہش کے مطابق کر دوں گا حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل سے وعدہ کیا تھا کہ جس وقت چاند نکلے گا اس وقت یہاں سے روانہ ہوں گے، (چاند نکلنے کا وقت آ گیا اور حضرت یوسف کا تابوت اس وقت تک آپ برآمد نہ کر سکے اس لئے) آپ نے اللہ سے دعا کی کہ چاند کے طلوع میں کچھ تاخیر ہو جائے (تا کہ وعدہ خلافی نہ ہو) دعا قبول ہوئی اور چاند کے طلوع میں کچھ تاخیر ہوئی پھر بڑھیا آپ کو اپنے ساتھ لے گئی اور نیل کے پانی کے اندر ایک طرف کو حضرت یوسفؑ کی قبر دکھا دی جس کے اندر ایک مرمر کا صندوق حضرت موسیٰ نے نکلوا لیا اور اس کو اٹھا کر لے گئے۔

حضرت یوسفؑ کے بعد عمالقہ کے خاندان میں پے در پے مصر کے فرعون ہوتے رہے اور بنی اسرائیل ان کے زیر حکم رہے مگر حضرت یوسف کے مذہب پر قائم رہے۔ یہاں تک کہ حضرت موسیٰ پیغمبر بنا کر بھیجے گئے اور آپ کے ہاتھ سے اللہ نے فرعون کو ہلاک کرایا۔ (تفسیر مظہری)

معارف ومسائل

سابقہ آیات میں تو والد بزرگوار سے خطاب تھا، اس کے بعد جبکہ والدین اور بھائیوں کی ملاقات سے ایک اہم مقصد حاصل ہو کر سکون ملا تو براہ راست حق تعالیٰ کی حمد وثناء اور دعا میں مشغول ہو گئے، فرمایا:

اس دعا میں حسن خاتمہ کی دعا خاص طور پر قابل نظر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کا رنگ یہ ہوتا ہے کہ کتنے ہی درجات عالیہ دنیا و آخرت کے ان

کونصیب ہوں، اور کتنے ہی جاہ ومنصب ان کے قدموں میں ہوں وہ کسی وقت ان پر مغرور نہیں ہوتے بلکہ ہر وقت اسکا کھٹکا لگا رہتا ہے کہ کہیں یہ حالات سلب یا کم نہ ہو جائیں اس کی دعائیں مانگتے رہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ظاہری اور باطنی نعمتیں موت تک برقرار رہیں، بلکہ ان میں اضافہ ہوتا رہے۔

تفسیر ابن کثیر میں حضرت حسنؒ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ یوسف علیہ السلام کو جس وقت بھائیوں نے کنوئیں میں ڈالا تھا تو ان کی عمر سات سال کی تھی، پھر اسی سال والد سے غائب رہے اور والدین کی ملاقات کے بعد تیئس سال زندہ رہے، اور ایک سو بیس تھی اس کو اپنے ساتھ ارض کنعان فلسطین میں لے گئے، اور حضرت اسحٰق اور یعقوب علیہما السلام کے برابر دفن کر دیا۔ (مظہری)

حضرت یوسف علیہ السلام کے بعد قوم عمالیق کے فراعنہ مصر پر مسلط ہو گئے اور بنو اسرائیل ان کی حکومت میں رہتے ہوئے دین یوسف علیہ السلام پر قائم رہے مگر ان کو غیر ملکی سمجھ کر طرح طرح کی ایذائیں دی جانے لگیں، یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس عذاب سے نکالا۔ (تفسیر مظہری)

ہدایات اور احکام

آیات مذکورہ میں ایک مسئلہ تو یہ معلوم ہوا کہ والدین کی تعظیم وتکریم واجب ہے جیسا کہ یوسف علیہ السلام کے واقعہ سے ثابت ہوا۔ دوسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ یوسف علیہ السلام کی شریعت میں سجدہ تعظیمی جائز تھا، اسی لئے والدین اور بھائیوں نے سجدہ کیا مگر شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سجدہ کو خاص عبادت کی علامت قرار دیکر غیر اللہ کے لیے حرام قرار دیا گیا، قرآن مجید میں فرمایا لا تسجد واللشمس ولا للقمر ، اور حدیث میں ہے کہ حضرت معاذؓ جب ملک شام گئے اور وہاں دیکھا کہ نصاریٰ اپنے بزرگوں کو سجدہ کرتے ہیں تو واپس آ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سجدہ کرنے لگے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا اور فرمایا کہ اگر میں کسی کو سجدہ کرنا جائز سمجھتا تو عورت کو کہتا کہ اپنے شوہر کو سجدہ کیا کرے، اسی طرح حضرت سلمان فارسیؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کرنا چاہا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لا تسجد لی یاسلمان واسجد للحی الذی لایموت "یعنی اے سلمان! مجھے سجدہ نہ کرو بلکہ سجدہ صرف اس ذات کو کرو جو حی وقیوم ہے جس کو کبھی فنا نہیں۔" (ابن کثیر)

اس سے معلوم ہوا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے تعظیمی سجدہ جائز نہیں تو اور کسی بزرگ یا پیر کے لئے کیسے جائز ہو سکتا ہے۔

فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۣ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی
اے پیدا کرنے والے آسمان اور زمین کے تو ہی میرا کارساز ہے

الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِىْ مُسْلِمًا
دنیا میں اور آخرت میں موت دے مجھ کو اسلام پر

موت کی تمنا:

یا تو لقاء اللہ کے شوق میں فی الحال موت کی تمنا کی یا یہ مطلب ہے کہ جب کبھی موت آئے اسلام (یعنی کامل تسلیم ورضا) پر آئے۔

(تنبیہ): حدیث میں آیا ہے کہ کوئی شخص کسی مصیبت اور تکلیف سے گھبرا کر موت کی تمنا نہ کرے۔ اس سے مفہوم ہوتا ہے کہ حب لقاء اللہ یا اور کسی غرض صالح کی وجہ سے موت کی تمنا کر سکتا ہے۔ جیسے ساحرین فرعون نے دعا کی تھی "ربنا افرغ علینا صبرا و توفنا مسلمین" یا حضرت مریم نے کہا تھا یٰلَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْیًا مَّنْسِیًّا" اور معاذؓ کی حدیث میں ہے۔" واذا اردت بقوم فتنة فاقبضنی الیک غیر مفتون." اور مسند احمد میں حدیث ہے یکره الموت والموت خیر للمومن من الفتن. حضرت علیؓ نے ہجوم فتن کے وقت دعا کی اللهم خذنی الیک فقد سئمتهم وسئمونی" امام بخاریؒ کو جب امیر خراسان کے ساتھ جھگڑا پیش آیا تو یہ دعا کرنی پڑی۔ اللهم توفنی الیک "حدیث میں ہے کہ خروج دجال کے وقت ایک شخص کسی قبر پر گذر یگا اور فتن زلازل کو دیکھ کر کہیگا۔ 'یالیتنی مکانک'' کاش کہ میں تیری جگہ ہوتا۔

وَاَلْحِقْنِىْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۰۱﴾
اور ملا مجھ کو نیک بختوں میں

آباء کی رفاقت کا شوق:

یہ لفظ ایسے ہیں جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مرض الموت میں فرماتے تھے "اللهم فی الرفیق الاعلیٰ" حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں۔ "علم کامل پایا، دولت کامل پائی، اب شوق ہوا اپنے باپ دادا کے مراتب کا"۔ گویا" اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ " سے یہ غرض ہوئی کہ میرا مرتبہ اسحاق وابراہیم کے مراتب سے ملا دے۔ حضرت یعقوبؑ کی زندگی تک ملکی انتظامات میں رہے۔ ان کی وفات کے بعد اپنے اختیار سے چھوڑ دیا۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ حضرت یعقوبؑ نے وصیت فرمائی تھی کہ میری لاش "شام" لے جا کر دفن کرنا۔ چنانچہ جنازہ وہیں لے گئے۔ حضرت یوسفؑ نے فرمایا تھا کہ ایک زمانہ آئیگا جب "بنی اسرائیل" مصر سے نکلیں گے۔ اس وقت میری لاش بھی اپنے ہمراہ لے جائیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب بنی اسرائیل کو لیکر مصر سے نکلے، حضرت یوسفؑ کا تابوت بھی ساتھ لے گئے۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانی)

امام رازی فرماتے ہیں کہ میں اکثر اسی دعا کا ورد رکھتا ہوں۔

اہل سیر نے لکھا ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کی وفات کا وقت آیا تو آپ نے فرمایا کہ ایک وقت آئیگا کہ بنی اسرائیل مصر سے نکلیں گے اس وقت میرا تابوت بھی اپنے ہمراہ لے جائیں گے۔

وفات یوسف:

یوسف علیہ السلام نے ایک سودس سال یا ایک سو سات سال کی عمر میں وفات پائی اور عزیز کی عورت کے بطن سے ان کے دولڑکے پیدا ہوئے اور ایک لڑکی لڑکوں کے نام افرائیم اور میشا تھے اور لڑکی کا نام رحمت تھا۔ جو حضرت ایوب علیہ السلام کے عقد میں آئی جب آپ نے وفات پائی تو اہل مصر نے آپ کے دفن کے متعلق اختلاف کیا ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ میرے محلہ میں دفن ہوں تا کہ ان کی برکات سے مستفیض ہوں بالآخر ان کو سنگ مرمر یا سفید پتھر کے صندوق میں رکھ کر دریائے نیل کے قریب دفن کر دیا گیا۔

موسیٰ علیہ السلام آپ کا تابوت شام لے گئے:

اور جب حسب وصیت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکلے تو حضرت یوسفؑ کا تابوت بھی ساتھ لے گئے، اور شام میں لے جا کر ان کے آباءِ کرام کے پہلو میں ان کو دفن کر دیا اور یوسف علیہ السلام کے وصال کے بعد سلطنت مصر حسب سابق فراعنہ مصر کے ہاتھ میں منتقل ہوگئی یہاں تک کہ انہیں سلاطین مصر کے سلسلہ میں وہ فرعون ہوا جو موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں تھا۔ (معارف کاندھلوی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری دُعاء:

صحیحین میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ثابت ہے کہ انتقال کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگلی اٹھائی اور یہ دعا کی اے اللہ رفیق اعلیٰ میں ملا دے۔ تین مرتبہ آپ نے یہی دعاء کی۔

یوسفؑ کی دُعاء کا مقصد:

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی اس دعا کا مقصود یہ ہے کہ جب بھی وفات آئے اسلام پر آئے اور نیکوں میں مل جاؤں۔ یہ نہیں کہ اسی وقت آپ نے یہ دعا اپنی موت کے لئے کی ہو۔ اس کی بالکل وہی مثال ہے جو کوئی کسی کو دعا دیتے ہوئے کہتا ہے کہ اللہ تجھے اسلام پر موت دے۔ اس سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ ابھی ہی تجھے موت آجائے یا جیسے ہم مانگتے ہیں کہ خدایا ہمیں تیرے دین پر ہی موت آئے۔ یا ہماری یہی دعا کہ اللہ مجھے اسلام پر مار اور نیک کاروں میں ملا اور اگر یہی مراد ہو کہ واقعی آپ نے اسی وقت موت مانگی تو ممکن ہے کہ یہ بات اس شریعت میں جائز ہو۔ چنانچہ قتادہؒ کا قول ہے کہ جب آپ کے تمام کام بن گئے۔ آنکھیں ٹھنڈی ہوگئیں، ملک مال عزت آبرو خاندان برادری بادشاہت سب مل گئے تو آپ کو صالحین کی جماعت میں پہنچنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کسی نبی نے سوائے حضرت یوسفؑ کے آپ سے پہلے موت طلب نہیں کی۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں یہی سب سے پہلے اس دعا کے مانگنے والے ہیں۔ ممکن ہے اس سے مراد ابن عباسؓ کی یہ ہو کہ اس دعا کو سب سے پہلے کرنے والے یعنی خاتمہ اسلام پر ہونے کی دعا کے سب سے پہلے مانگنے والے آپ ہی تھے۔

بخاری ومسلم کی اسی حدیث میں ہے کہ تم میں سے کوئی کسی سختی کے نازل ہونے کی وجہ سے موت کی تمنا ہرگز نہ کرے۔ اگر وہ نیک ہے تو اس کی زندگی اس کی نیکیاں بڑھائے گی اور اگر وہ بد ہے تو بہت ممکن ہے کہ زندگی میں کسی وقت توبہ کی توفیق ہو جائے۔ بلکہ یوں کہے اے اللہ جب تک میرے لئے حیات بہتر ہے تو مجھے زندہ رکھ۔ مسند احمد میں ہے ہم ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے ہمیں وعظ نصیحت کی اور ہمارے دل گرما دیئے۔ اس وقت ہم میں سب سے زیادہ رونے والے (حضرت) سعد بن ابی وقاص (رضی اللہ عنہ) تھے۔ روتے ہی روتے ان کی زبان سے نکل گیا کہ کاش میں مرجاتا۔ آپ نے فرمایا سعد میرے سامنے موت کی تمنا کرتے ہو؟ تین مرتبہ یہی الفاظ دہرائے پھر فرمایا اے سعد اگر تو جنت کے لئے پیدا کیا گیا ہے تو جس قدر عمر بڑھے گی اور نیکیاں زیادہ ہونگی تیرے حق میں بہتر ہے۔

چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے آخری زمانے میں جب دیکھا کہ لوگوں کی شرارتیں کسی طرح ختم نہیں ہوتیں اور کسی طرح اتفاق نصیب نہیں ہوتا تو دعا کی کہ الہ العالمین مجھے تو اپنی طرف قبض کرلے یہ لوگ مجھ سے اور میں ان سے تنگ آچکا ہوں۔ حضرت امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ پر بھی جب فتنوں کی زیادتی ہوئی اور دین کا سنبھالنا مشکل ہو پڑا اور امیر خراسان کیساتھ بڑے بڑے معرکے پیش آئے تو آپ نے جناب باری سے دعا کی کہ خدایا اب مجھے اپنے پاس بلالے۔ (تفسیر ابن کثیر)

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ
یہ خبریں ہیں غیب کی ہم بھیجتے ہیں تیرے پاس
وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ
اور تو نہیں تھا ان کے پاس جب وہ ٹھہرانے لگے اپنا کام
وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۰۲﴾
اور فریب کرنے لگے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قصہ نبوت کی دلیل:

یعنی برادران یوسف جب ان کو باپ سے جدا کرنے اور کنوئیں میں ڈالنے کے مشورے اور تدبیریں کرر ہے تھے آپ ان کے پاس نہیں کھڑے تھے کہ ان کی باتیں سنتے اور حالات کا معائنہ کرتے ۔ پھر ایسے صحیح واقعات بجز وحی الٰہی کے آپ کو کس نے بتائے ۔ آپ رسمی طور پر پڑھے لکھے نہیں، کسی ظاہری معلم سے استفادہ کی نوبت نہیں آئی پھر یہ حقائق جن کی اس قدر تفصیل بائبل میں بھی نہیں، آپ کو خدا کے سوا کس نے معلوم کرائیں ۔ (تفسیر عثمانی)

معارف ومسائل

ان آیات میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ پورا بیان فرمانے کے بعد پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے:

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ "یعنی یہ قصہ غیب کی ان خبروں میں سے ہے جو ہم نے بذریعہ وحی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلایا ہے" آپ صلی اللہ علیہ وسلم برادران یوسفؑ کے پاس موجود نہ تھے۔ جبکہ وہ یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈالنے کا طے کر چکے تھے اور اس کے لئے تدبیریں کرر ہے تھے۔

اس اظہار کا مقصد یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کے اس قصہ کو پوری تفصیل کے ساتھ صحیح صحیح بیان کر دینا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور وحی کی واضح دلیل ہے، کیونکہ یہ قصہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے ہزاروں سال پہلے کا ہے نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں موجود تھے کہ دیکھ کر بیان فرما دیا ہو اور نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہیں کسی سے تعلیم حاصل کی کہ کتب تاریخ دیکھ کر یا کسی سے سن کر بیان فرما دیا ہو اس لئے بجز وحی الٰہی ہونے کے اور کوئی راستہ اس کے علم کا نہیں۔

امام بغوی نے فرمایا کہ یہود اور قریش نے مل کر آزمائش کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا تھا کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دعوائے نبوت میں سچے ہیں تو یوسف علیہ السلام کا واقعہ بتلایئے کہ کیا اور کس طرح ہوا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بوحی الٰہی یہ سب بتلا دیا ا ، وہ پھر بھی اپنے کفر وانکار پر جمے رہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صدمہ پہنچا۔

اخبار غیب اور علم غیب میں فرق:

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ یہ سب کچھ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعہ بتلاتے ہیں" یہی مضمون تقریبا انہی الفاظ کیساتھ سورۂ آل عمران آیت ۴۴ میں حضرت مریم کے قصہ میں آیا ہے، ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ اور سورۂ ہود کی آیت نمبر ۴۸ میں نوح علیہ السلام کے واقعہ سے متعلق آیا ہے تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ

ان آیتوں سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ حق تعالیٰ اپنے انبیاء علیہم السلام کو بہت سی غیب کی خبروں پر بذریعہ وحی مطلع کر دیتے ہیں خصوصاً ہمارے رسول سید الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کو ان غیب کی خبروں کا خاص حصہ عطا فرمایا ہے جو تمام انبیاء سابقین سے زیادہ ہے یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو قیامت تک ہونے والے بہت سے واقعات کا تفصیل یا اجمال سے پتہ دیا ہے کتب حدیث میں کتاب الفتن کی تمام حدیثیں اس سے بھری ہوئی ہوتی ہیں۔

عوام الناس چونکہ علم غیب صرف اسی کو جانتے ہیں کہ کوئی شخص غیب کی خبروں سے کسی طرح واقف ہو جائے اور یہ وصف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس لئے خیال کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب تھے مگر قرآن کریم نے صاف لفظوں میں اعلان فرما دیا ہے لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم الغیب سوائے خدا تعالیٰ کے اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ علم غیب اللہ جل شانہ کی صفت خاصہ ہے۔ اس میں کسی رسول یا فرشتہ کو شریک سمجھنا ان کو اللہ کی برابر بنانے کے مترادف اور عیسائیوں کا عمل ہے۔ جو رسول کو خدا کا بیٹا اور خدائی کا شریک قرار دیتے ہیں قرآن کریم کی مذکورہ آیتوں سے معاملہ کی پوری حقیقت واضح ہوگئی کہ علم غیب تو صرف اللہ تعالیٰ کی صفت خاصہ ہے اور عالم الغیب صرف اللہ جل شانہ ہی ہیں البتہ غیب کی بہت سی خبریں اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو بذریعہ وحی بتلا دیتے ہیں یہ قرآن کریم کی اصطلاح میں علم غیب نہیں کہلاتا ، اور عوام چونکہ اس باریک فرق کو نہیں سمجھتے تو غیب کی خبروں ہی کو علم غیب کہہ دیتے ہیں اور جب قرآنی اصطلاح کے مطابق غیر اللہ سے علم الغیب کی نفی کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس سے اختلاف کرنے لگتے ہیں جس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ ۔

اختلاف خلق از نام اوفتاد　　چوں بمعنی رفت آرام اوفتاد

وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ
اور اکثر لوگ نہیں ہیں یقین کرنیوالے اگرچہ
بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾
تو کتنا ہی چاہے

یعنی باوجودیکہ آپ کی صداقت پر ایسی واضح دلائل موجود ہیں، پھر بھی اکثر لوگ وہ ہیں جو کسی طرح ایمان لانے والے نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت ابن عباس نے فرمایا، اس آیت کا نزول عرب کے مشرکوں کے لبیک کہنے کے سلسلے میں ہوا۔ عرب کے مشرک (احرام یا طواف کعبہ کے وقت) ان الفاظ میں لبیک کہتے تھے، اے اللہ! ہم حاضر ہیں ہم حاضر ہیں

تیرا کوئی شریک نہیں، مگر وہ شریک ہے جس کو تو نے شریک بنالیا ہے اور تو اس کا مالک ہے وہ مالک نہیں۔ (تفسیر مظہری)

وَمَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ هُوَ
اور تو مانگتا نہیں انسے اس پر کچھ بدلہ یہ تو اور کچھ نہیں
اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿١٠٤﴾
مگر نصیحت سارے عالم کو

آپ کو کوئی نقصان نہیں:

یعنی نہیں مانتے نہ مانیں، آپ کا کیا نقصان ہے کچھ تبلیغ کی تنخواہ تو آپ ان سے مانگتے نہ تھے کہ وہ بند کر لیں گے نصیحت اور فہمائش تھی سو ہوگئی اور ہو رہی ہے۔ (تفسیر عثمانی)

یعنی آپ کتنی ہی ان کے مومن ہوجانے کی خواہش کریں اور کتنے ہی معجزات کا اظہار کریں لیکن اللہ نے چونکہ ان کے کافر رہنے کا فیصلہ کر دیا ہے اس لئے وہ ایمان نہیں لائیں گے اور آپ ان سے اس قرآن کو پیش کرنے یا خبریں بیان کرنے کی کوئی اجرت بھی تو نہیں مانگتے (کہ ان پر کچھ مالی بوجھ پڑتا ہو) یہ قرآن تو محض ایک عمومی نصیحت نامہ ہے (جس کو ماننے میں پیسے صرف کرنا نہیں پڑتے) جو اس کو نہ مانے گا تو اتمام حجت ہوجائے گا اور جو ایمان لانے والے ہیں ان کے لئے رحمت و بصیرت ہے۔ (تفسیر مظہری)

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
اور بہتیری نشانیاں ہیں آسمان اور زمین میں جن پر گزر ہوتا رہتا ہے
يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿١٠٥﴾
ان کا اور وہ ان پر دھیان نہیں کرتے

تکوینی نشانیاں:

یعنی جس طرح آیات تنزیلیہ سن کر آپ پر ایمان نہیں لاتے۔ ایسے ہی آیات تکوینیہ دیکھ کر خدا کی توحید کا سبق حاصل نہیں کرتے اصل یہ ہے کہ ان کا سننا اور دیکھنا محض سرسری ہے۔ آیات اللہ میں غور و فکر کرتے تو کچھ فائدہ پہنچتا۔ جب دھیان نہیں تو ایمان کہاں سے ہو۔ (تفسیر عثمانی)

معارف ومسائل:

پچھلی آیتوں میں انبیاء علیہم السلام کے بھیجنے اور دعوت حق دینے کا ذکر اور انبیاء کے متعلق کچھ شبہات کا جواب دیا گیا تھا، آیات مذکورہ میں سے پہلی آیت میں اس پر تنبیہ ہے کہ یہ لوگ انبیاء کی مخالفت کے انجام بد پر نظر نہیں کرتے، اگر یہ ذرا بھی غور کریں اور اپنے گردوپیش کے شہروں اور مقامات کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو انہیں معلوم ہوجائے گا کہ انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کرنے والوں کا انجام بد اس دنیا میں بھی کس قدر سخت ہوا ہے۔ قوم لوط علیہ السلام کی بستی الٹ دی گئی، قوم عاد و ثمود کو طرح طرح کے عذابوں سے نیست و نابود کر دیا گیا، اور آخرت کا عذاب اس سے زیادہ سخت ہے۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ
اور نہیں ایمان لاتے بہت لوگ اللہ پر مگر ساتھ ہی
مُّشْرِكُوْنَ ﴿١٠٦﴾
شریک بھی کرتے ہیں

مکہ والوں سے شرک:

یعنی زبان سے سب کہتے ہیں کہ خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہے مگر اس کے باوجود کوئی بتوں کو خدائی کا حصہ دار بنا رہا ہے چنانچہ مشرکین عرب ''تلبیہ'' میں یہ لفظ کہتے تھے ''لبیک اللھم لبیک لاشریک لک الا شریکا ھولک تملکه وما ملک'' کوئی اس کے لئے بیٹے بیٹیاں تجویز کرتا ہے۔ کوئی اسے روح و مادہ کا محتاج بتاتا ہے کسی نے احبار و رہبان کو خدائی کے اختیارات دیدیے ہیں بہت سے تعزیہ پرستی، قبر پرستی، پیر پرستی کے خس و خاشاک سے توحید کے صاف چشمہ کو مکدر کر رہے ہیں۔ ریا اور ہوا پرستی سے تو کتنے موحدین ہیں جو پاک ہونگے۔ غرض ایمان کا زبانی دعویٰ کر کے بہت کم ہیں جو عقیدہ یا عمل کے درجہ میں شرک جلی یا خفی کا ارتکاب نہیں کرتے (اعاذنا اللہ من سائر انواع الشرک) (تفسیر عثمانی)

بدشگونی کا کفارہ:

مسند میں ہے آپ فرماتے ہیں جو شخص کوئی بدشگونی لیکر اپنے کام سے لوٹ جائے وہ مشرک ہوگیا۔ صحابہ نے دریافت کیا حضور پھر اس کا کفارہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا یہ کہنا اللھم لاخیر الا خیرک ولاطیر الاطیرک ولاالٰه غیرک یعنی اے اللہ سب بھلائیاں سب نیک شگون تیرے ہی ہاتھ میں ہیں تیرے سوا کوئی بھلائیوں اور نیک شگونیوں والا نہیں۔

شرک کی باریکیاں اور تحفظ:

مسند احمد میں ہے کہ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا کہ لوگو شرک سے بچو وہ تو چیونٹی کی چال سے زیادہ پوشیدہ چیز ہے۔ اس پر حضرت عبداللہ بن حرب اور حضرت قیس بن مضارب کھڑے ہو گئے اور کہا

یا تو آپ اس کی دلیل پیش کیجئے یا ہم جائیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے آپ کی شکایت کریں۔ آپ نے فرمایا، لو دلیل لو، ہمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن خطبہ سنایا اور فرمایا لوگو! شرک سے بچو وہ تو چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ پوشیدہ ہے۔ پس کسی نے آپ سے پوچھا کہ پھر اس سے بچاؤ کیسے ہو سکتا ہے فرمایا یہ دعا پڑھا کرو: اللهم انا نعوذ بک ان نشرک بک شيئا نعلمه ونستغفرک ممالا نعلم۔

ایک اور روایت میں ہے کہ یہ سوال کرنے والے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ آپ نے پوچھا تھا کہ یارسول اللہ شرک تو یہی ہے کہ خدا کے ساتھ دوسرے کو پکارا جائے۔ اس حدیث میں دعا کے الفاظ یہ ہیں۔ اللهم انی اعوذبک ان اشرک بک وانا اعلم واستغفرک ممالا اعلم (مسند ابویعلیٰ) ابوداؤد وغیرہ میں ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے کوئی ایسی دعا سکھایئے جسے میں صبح شام اور سوتے وقت پڑھا کروں تو آپ نے فرمایا یہ دعا پڑھ اللهم فاطر السموت والارض عالم الغيب والشهادة رب كل شئى ومليكه اشهد ان لا اله الا انت اعوذ بک من شر نفسی ومن شر الشيطان وشركه، اور روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ دعا پڑھنی سکھائی، اس کے آخر میں یہ الفاظ ہیں وان اقترف علىٰ نفسى سوءً واجره الىٰ مسلم۔ (تفسیر ابن کثیر)

أَفَأَمِنُوا أَنْ تَأْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِنْ

کیا نڈر ہو گئے اس سے کہ آ ڈھانکے ان کو ایک آفت اللہ کے

عَذَابِ اللَّهِ أَوْ تَأْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً

عذاب کی یا آپہنچے قیامت

وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿١٠٧﴾

اچانک اور ان کو خبر نہ ہو

بے خوف کیوں ہو:

یعنی ایسے بے فکر و بے خوف کیوں ہو رہے ہیں۔ کیا انہوں نے عذاب الٰہی یا قیامت کے ہولناک حوادث سے محفوظ رہنے کا کچھ انتظام کر لیا ہے؟ (تفسیر عثمانی)

حضرت ابن عباس نے فرمایا لوگ بازاروں میں مشغول ہوں گے کہ ایک سخت چیخ لوگوں کو ہیجان میں ڈال دے گی۔ حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دو آدمی (بائع اور مشتری) کپڑا پھیلائے ہوئے (سودا کرنے میں مشغول) ہوں گے کہ قیامت آجائے گی نہ خرید و فروخت کر سکیں گے نہ کپڑے کو لپیٹ سکیں گے۔ یہ حدیث اور قیامت کی تشریح سورۂ اعراف کی آیت يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسَاهَا الخ کی تفسیر کے ذیل میں کر دی گئی ہے۔ (تفسیر مظہری)

مشرک، منافق اور ریا کار:

صحیحین میں ہے ابن مسعودؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ تیرا خدا کے ساتھ شریک ٹھہرانا حالانکہ اسی اکیلے نے تجھے پیدا کیا ہے۔ اسی طرح اس آیت کے تحت میں منافقین بھی داخل ہیں۔ ان کے عمل بھی اخلاص والے نہیں ہوتے بلکہ وہ ریاکار ہوتے ہیں اور ریاکاری بھی شرک ہے۔ تفسیر ابن کثیر

قُلْ هَٰذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ ۚ عَلَىٰ

کہدے یہ میری راہ ہے بلاتا ہوں اللہ کی طرف

بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي ۖ وَسُبْحَانَ

سمجھ بوجھ کر میں اور جو میرے ساتھ ہے، اور اللہ پاک ہے،

اللَّهِ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٠٨﴾

اور میں نہیں شریک بتانے والوں میں

پیغمبروں کا راستہ:

یعنی میرا راستہ یہی خالص توحید کا راستہ ہے۔ میں تمام دنیا کو دعوت دیتا ہوں کہ سب خیالات و اوہام کو چھوڑ کر ایک خدا کی طرف آئیں، اس کی توحید اس کی صفات و کمالات اور اس کے احکام وغیرہ کی صحیح معرفت صحیح راستہ سے حاصل کریں۔ میں اور میرے ساتھی اس سیدھے راستہ پر، حجت و برہان اور بصیرت و وجدان کی روشنی میں چل رہے ہیں۔ خدا نے مجھ کو ایک نور دیا۔ جس سے سب ہمراہیوں کے دماغ روشن ہو گئے۔ یہاں کسی کی اندھی تقلید نہیں۔ خالص توحید کا راہرو ہر قدم پر اپنے باطن میں معرفت و بصیرت کی خاص روشنی اور عبودیت محضہ کی خاص لذت محسوس کر کے بے ساختہ پکار اٹھتا ہے "سُبْحَانَ اللَّهِ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ" (تفسیر عثمانی)

سبیلی میرا طریقہ میرا راستہ۔ ادعوا الی اللہ یہ سبیلی کی تشریح ہے یعنی میں اللہ کی ہستی اور اس کی توحید پر ایمان لانے اور ہر نامناسب وصف سے اس کو پاک سمجھنے اور اسی کے قرب کی طلب کرنے کی طرف لوگوں کو بلاتا ہوں علیٰ بصیرۃ بصیرت سے مراد ہے یقین اور معرفت یعنی میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو خود تراشیدہ خیالات کو مانتے ہیں جن کا ان کو خود کوئی علم نہیں ہوتا۔

یا بصیرت سے مراد ہے۔ بیان اور واضح روشن دلیل و من اتبعنی یعنی جو لوگ مجھ پر ایمان رکھتے ہیں اور میری تصدیق کرتے ہیں وہ بھی اللہ کی طرف بلاتے ہیں کلبی اور ابن زید نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرنے والوں پر لازم ہے کہ جس راستے کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت دی ہے اس کی طرف وہ بھی لوگوں کو بلائیں اور قرآن کا ذکر کرتے رہیں یا یہ مطلب ہے کہ میں اور میرا اتباع کرنے والے بصیرت پر ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا من اتبعنی سے صحابہ کرام مراد ہیں۔ صحابہ راہ ہدایت پر تھے۔ معدن علم تھے کنز ایمان تھے اور اللہ کا لشکر تھے۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا جو سنت پر چلنا چاہیے وہ مردوں کے طریقے پر چلے یعنی صحابہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے راستہ پر چلے۔ صحابہ کا گروہ اس امت میں سب سے زیادہ پاک باطن گروہ تھا جن کا علم بہت گہرا تھا اور بناوٹ بالکل نہ تھی، اللہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت اور اپنے دین کی اشاعت کے لئے ان کا انتخاب کیا تھا وہ راہ مستقیم پر گامزن تھے تم لوگ انہیں کے اخلاق اور زندگی کے طریقوں کو اختیار کرو اور انہیں سے مشابہت پیدا کرو۔ و سبحن للہ یعنی میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں اور شرک سے اس کے پاک ہونے کا اعتراف و اقرار کرتا ہوں۔ (تفسیر مظہری)

عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اس تمام امت کے بہترین افراد ہیں جن کے قلوب پاک اور علم گہرا ہے تکلف کا ان میں نام نہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے رسول کی صحبت و خدمت کیلئے منتخب فرمالیا ہے تم انہی کے اخلاق و عادات اور طریقوں کو سیکھو۔ کیونکہ وہی سیدھے راستہ پر ہیں۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ

اور جتنے بھیجے ہم نے تجھ سے پہلے، وہ سب مرد ہی تھے کہ وحی بھیجتے تھے

اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ۭ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي

ہم ان کو بستیوں کے رہنے والے سو کیا ان لوگوں نے نہیں سیر کی

الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ

ملک کی کہ دیکھ لیتے کیسا ہوا انجام ان لوگوں کا جو ان سے

مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ

پہلے تھے اور آخرت کا گھر تو بہتر ہے پرہیز کرنے والوں کو

اتَّقَوْا ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۱۰۹

کیا اب بھی نہیں سمجھتے

کبھی کوئی فرشتہ نبی نہیں بنا:

یعنی پہلے بھی ہم نے آسمان کے فرشتوں کو نبی بنا کر نہیں بھیجا۔ انبیائے سابقین ان ہی انسانی بستیوں کے رہنے والے مرد تھے۔ پھر دیکھ لو ان کے جھٹلانے والوں کا دنیا میں کیا حشر ہوا۔ حالانکہ دنیا میں کافروں کو بھی بسا اوقات عیش نصیب ہو جاتا ہے۔ اور آخرت کی بہتری تو خالص ان ہی کیلئے ہے جو شرک و کفر سے پرہیز کرتے ہیں۔ یہ تنبیہ ہے کفار مکہ کو کہ اگلوں کے احوال سے عبرت حاصل کریں۔

(تنبیہ): اس آیت سے نکلتا ہے کہ کوئی عورت نبی نہیں بنائی گئی۔ حضرت مریم کو بھی قرآن نے "صدیقة" کا مرتبہ دیا ہے۔ نیز آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہل بوادی (جنگلی گنواروں) میں سے کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا۔ (تفسیر عثمانی)

کوئی عورت نبی یا رسول نہیں بنی:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے رسولوں کے متعلق لفظ رجالا سے معلوم ہوا کہ رسول ہمیشہ مرد ہی ہوتے ہیں عورت نبی یا رسول نہیں ہو سکتی۔

امام ابن کثیر نے جمہور علماء کا یہی قول نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی عورت کو نبی یا رسول نہیں بنایا۔ بعض علماء نے چند عورتوں کے متعلق نبی ہونے کا اقرار کیا ہے مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بی بی سارہ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ اور حضرت مریم ام عیسیٰ علیہ السلام کیونکہ ان تینوں خواتین کے بارے میں قرآن کریم میں ایسے الفاظ موجود ہیں جن سے سمجھا جاتا ہے کہ بحکم خداوندی فرشتوں نے ان سے کلام کیا، اور بشارت سنائی یا خود ان کو وحی الٰہی سے کوئی بات معلوم ہوئی مگر جمہور علماء کے نزدیک ان آیتوں سے ان تینوں خواتین کی بزرگی اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کا بڑا درجہ ہونا تو ثابت ہوتا ہے مگر وہ فرماتے ہیں کہ صرف یہ الفاظ ان کی نبوت و رسالت کے ثبوت کے لئے کافی نہیں۔

رسول شہر والوں سے بھیجے:

اور اسی آیت میں لفظ اهل القرىٰ سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول عموماً شہروں اور قصبوں کے رہنے والوں میں سے بھیجتے ہیں دیہات اور جنگل کے باشندوں میں سے رسول نہیں ہوتے کیونکہ عموماً دیہات اور جنگل کے باشندے سخت مزاج اور عقل و فہم میں کامل نہیں ہوتے۔ (ابن کثیر و قرطبی وغیرہ)

نُوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ یعنی جس طرح آپ کے پاس وحی بھیجی اسی طرح ان پیغمبروں کے پاس بھی وحی بھیجتے رہے، جس کی وجہ سے وہ دوسروں سے ممتاز ہو گئے۔ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى یعنی وہ قصبوں اور بستیوں کے رہنے والے تھے۔ صحرائی خانہ بدوش نہ تھے۔ صحرائی لوگ بد خلق، اکھڑ اور درشت خو ہوتے ہیں اور بستیوں، شہروں والے دانش مند، ذی علم اور حلیم الطبع ہوتے ہیں۔

حسن بصری نے کہا اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ اللہ نے نہ کسی جن

کو پیغمبر بنایا نہ کسی عورت کو نہ کسی خانہ بدوش صحرائی کو۔

میں کہتا ہوں اس آیت سے نبوت جن کی نفی نہیں ہوتی۔ (رجال جنات میں سے بھی ہوتے ہیں) اللہ نے فرمایا كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ ۔اسکے علاوہ اس جگہ انسانوں کے پاس پیغمبر بھیجنے کا ذکر ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جنات کے پاس جن کو پیغمبر بنا کر نہیں بھیجا گیا اللہ نے خود فرمایا ہے: لَوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ۔

پچھلے منکروں سے عبرت پکڑو:

یعنی آپ کی تکذیب کرنے والے مشرک ملک میں چل کر پھر کر اتنا نہیں دیکھتے کہ پہلے پیغمبروں کو اوران کے معجزات کو جھوٹا قرار دینے والوں کا کیسا برا نتیجہ ہوا ان کے برے انجام کو دیکھ کر ان کو عبرت حاصل کرنا اور آپ کی تکذیب نہ کرنا چاہیے تھا۔ یا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ سے مراد وہ لوگ ہیں جو دنیا میں ڈوبے ہوئے ہیں اور آخرت کی طرف سے غافل ہو کر دنیا پر ٹوٹے پڑتے ہیں ان کا انجام کیا ہوا۔ اس کو دیکھنے کیلئے دیدہ عبرت نگاہ کی ضرورت ہے ان لوگوں کو سمجھنا چاہیے کہ پچھلے دنیا پرستوں کا کیا انجام ہوا اور اللہ نے اپنے دوستوں اور اطاعت شعار بندوں کے ساتھ کیا سلوک کیا دنیا میں نازل شدہ عذاب سے ان کو بچا لیا اور آخرت میں جو کچھ ان کو دیا جائے گا وہ اس دنیا سے کہیں بہتر ہوگا۔ عقل سے کام لینے کی اور یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ آخرت ہی بہتر ہے۔ (تفسیر مظہری)

حَتّٰٓى اِذَا اسْتَايْئَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا
یہاں تک کہ جب نا امید ہونے لگے رسول اور خیال
اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ
کرنے لگے کہ ان سے جھوٹ کہا گیا تھا پہنچی
فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَآءُ ۭ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ
ان کی ہماری مدد پھر بچا دیا جن کو ہم نے چاہا اور پھرتا نہیں عذاب
الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۰﴾
ہمارا قوم گنہگار سے

مہلت سے دھوکہ نہ کھاؤ: یعنی تاخیر عذاب سے دھوکہ مت کھاؤ پہلی قوموں کو بھی لمبی مہلتیں دی گئیں۔ اور عذاب آنے میں اتنی دیر ہوئی کہ منکرین بالکل بے فکر ہو کر بیش از بیش شرارتیں کرنے لگے۔

پیغمبروں کیلئے حالات کی سنگینی:

یہ حالات دیکھ کر پیغمبروں کو ان کے ایمان لانے کی کوئی امید نہ رہی، ادھر خدا کی طرف سے ان کو ڈھیل اس قدر دی گئی کہ مدت دراز تک عذاب کے کچھ آثار نظر نہ آتے تھے۔ غرض دونوں طرف کے حالات و آثار پیغمبروں کیلئے یاس انگیز تھے یہ منظر دیکھ کر کفار نے یقینی طور پر خیال کر لیا کہ انبیاء سے جو وعدے ان کی نصرت اور ہماری ہلاکت کے کئے گئے سب جھوٹی باتیں ہیں۔ عذاب وغیرہ کا ڈھکوسلہ صرف ڈرانے کے واسطے تھا۔ کچھ بعید نہیں کہ ایسی مایوس کن اور اضطراب انگیز حالت میں انبیاء کے قلوب میں بھی یہ خیالات آنے لگے ہوں کہ وعدہ عذاب کو جس رنگ میں ہم نے سمجھا تھا وہ صحیح نہ تھا۔ یا وساوس وخطرات کے درجہ میں بے اختیار یہ وہم گذرنے لگے ہوں کہ ہماری نصرت اور منکرین کی ہلاکت کے جو وعدے کئے گئے تھے کیا وہ پورے نہ کئے جائیں گے؟ جیسے دوسری جگہ فرمایا۔ "وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ " (بقرہ۔ رکوع ۲۶)۔ جب مجرمین کی بے خوفی اور انبیاء کی تشویش اس حد تک پہنچ گئی اس وقت ناگہاں آسمانی مدد آئی۔ پھر جس کو خدا نے چاہا (یعنی فرمانبردار مومنین کو) محفوظ و مصمون رکھا۔ اور مجرموں کی جڑ کاٹ دی۔

(تنبیہ): اللہ تعالیٰ کی غیر محدود رحمت ومہربانی سے مایوس ہونا کفر ہے لیکن ظاہری حالات و اسباب کے اعتبار سے ناامیدی کفر نہیں۔ یعنی یوں کہہ سکتے ہیں کہ فلاں چیز کی طرف سے جہاں تک اسباب ظاہری کا تعلق ہے مایوسی ہے۔ لیکن حق تعالیٰ کی رحمت کاملہ سے مایوسی نہیں۔ آیت "حَتّٰٓى اِذَا اسْتَايْئَسَ الرُّسُلُ" میں یہی مایوسی مراد ہے جو ظاہری حالات و آثار کے اعتبار سے ہو، ورنہ پیغمبر خدا کی رحمت سے کب مایوس ہو سکتے ہیں۔

(تنبیہ): کفر کا وسوسہ کفر نہیں نہ کسی درجہ میں ایمان یا عصمت کے منافی ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم اپنے دلوں میں ایسی چیزیں (بے اختیار) پاتے ہیں جن کے زبان پر لانے سے ہم بہتر سمجھتے ہیں کہ جل کر کوئلہ ہو جائیں۔ آپ نے فرمایا کیا ایسا پاتے ہو؟ عرض کیا ہاں فرمایا "ذاک صریح الایمان " یہ تو کھلا ہوا ایمان ہے۔ (تفسیر عثمانی)

پیغمبر کس چیز سے مایوس ہوئے:

بیضاوی نے لکھا ہے کہ اس کا تعلق محذوف کلام سے ہے اصل کلام یوں تھا کہ ان کافروں کو اس بات سے فریب خوردہ نہ ہونا چاہیے کہ اتنے زمانے تک ان پر عذاب نہیں آیا اور اب تک تباہی سے بچے ہوئے ہیں کیونکہ ان سے پہلے لوگوں (مثلاً امت نوح وغیرہ) کو بڑی طویل مہلتیں دی جا چکی ہیں یہاں تک کہ پیغمبر بھی ان کے ایمان کی طرف سے مایوس ہو گئے تھے کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ باوجود کفر میں ڈوب جانے کے یہ لوگ عیش و آرام میں ہیں

مدت دراز سے چین وراحت میں پڑے ہوئے ہیں اور ان کا کچھ نہیں بگڑا۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس کے نزدیک آیت کا ظاہری مطلب ہی مراد ہے پیغمبر بھی بشر تھے اور بہ تقاضائے بشریت ان کو گمان ہونے لگا کہ ہم سے جو فتح ونصرت کا وعدہ کیا گیا تھا وہ غلط نکلا یہ گمان پیغمبروں کے ضعف قلب اور تقاضائے بشریت کا نتیجہ تھا پھر حضرت ابن عباس نے یہ آیت پڑھی حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ یہاں تک کہ پیغمبر اور اس پر ایمان لانے والے لوگ کہنے لگے کہ اللہ کی مدد کب آئیگی یہ مطلب وہی ہے جس کا حضرت عائشہؓ نے انکار کردیا (اور اسی وجہ سے کذبوا کی قرأت کا بھی انکار کردیا)

بیضاوی نے لکھا ہے اگر صحیح روایت سے حضرت ابن عباس کا یہ قول ثابت ہوجائے تو اس وقت ظن سے مراد ہوگا وسوسہ اور بے اختیار دل میں پیدا ہونے والا خیال۔ طیبی نے لکھا ہے روایت صحیح ہے بخاری نے بھی اس کو ذکر کیا ہے۔ تفسیر مظہری

وہ وعدہ اسی سال پورا ہوگا حضرات انبیاء کرام سے خطاء اجتہادی کا واقع ہونا عصمت کے منافی نہیں۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ میں اس کی تفصیل آئے گی۔ غرض یہ کہ جب عذاب کے نازل ہونے میں دیر ہوئی اور انبیاء کرام کے اندازہ اور تخمینہ کے مطابق عذاب نہ آیا تو انبیاء یہ گمان کرنے لگے کہ وعدہ عذاب کو جس رنگ میں ہم نے سمجھا تھا وہ صحیح نہ تھا تو جب رسولوں کی ناامیدی اور پریشانی اس حد کو پہنچ گئی تو اس وقت حسب وعدہ یکا یک اور ناگہاں ان کو مدد پہنچی اور وہ مدد یہ آئی کہ کافروں پر عذاب آیا اور لوگوں پر پیغمبروں کا صدق ظاہر ہوا کہ انبیاء نے جو نصر وظفر کی خبر دی تھی وہ سچی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ خداوند کریم کی انبیاء ومرسلین اور اولیاء اور محبین کے ساتھ سنت قدیمہ یہ ہے کہ جب ابتلاء اور امتحان اس حد کو پہنچ جائے کہ کلیجہ منہ کو آجائے۔ تب ان کو فتح اور ظفر کا منہ دکھلاتے ہیں اور ان کے دشمنوں کو جو ان کو برملا جھوٹا بتلا رہے تھے زیر وزبر اور تہ وبالا کرتے ہیں اس طرح سے اپنے دوستوں کی عزت اور دشمنوں کی ذلت کا تماشا دنیا کو دکھلاتے ہیں۔ پھر اس عذاب سے جو کافروں پر نازل ہوا جس کو ہم نے چاہا بچالیا گیا۔ یعنی اہل ایمان عذاب سے محفوظ رہے اور ہمارا عذاب جب آتا ہے تو مجرموں سے ہٹایا نہیں جاتا بلکہ وہ ضرور واقع ہوکر رہتا ہے اس آیت کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ دشمنوں پر عذاب نازل کرنے میں جلدی نہیں فرماتے بلکہ ان کو مہلت دیتے ہیں اور اپنے دوستوں کو یعنی پیغمبروں کو اور ان کے پیروؤں کو طرح طرح کی بلاؤں اور مصیبتوں سے ہلاتے ہیں یہاں تک کہ جب ان کی تکلیف اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ ظاہری اسباب سے ناامید ہوکر اپنے پروردگار سے یہ عرض کرنے لگتے ہیں مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اے اللہ ہماری مدد کر اور دشمنوں پر ہماری فتح کب ہوگی تب حق تعالیٰ کی طرف سے بشارت آتی ہے اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ جیسا کہ سورۂ بقرہ میں گزرا اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ

شاہ ولی اللہؒ کی تفسیر:

حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہ نے یہ تفسیر اختیار فرمائی چنانچہ فرماتے ہیں مہلت دادیم تا وقتیکہ ناامید شدند پیغمبران وگمان کردند قوم ایشاں کہ بدروغ وعدہ کردہ شد بالیشاں آمد بایشاں نصرت ما (فتح الرحمان) اور اسی طرح طبری نے سعید بن جبیر سے روایت کی ہے کہ کسی نے سعید بن جبیر سے اس آیت کے معنی پوچھے تو کہا کہ ناامید ہوئے پیغمبر اپنی قوم سے کہ وہ ان کو سچا جانیں اور مرسل الیھم (یعنی قوم) نے گمان کیا کہ رسولوں نے ان سے جھوٹ کہا تھا یعنی تاخیر عذاب سے قوم کو یہ گمان ہوا کہ رسولوں نے ہم سے جھوٹ کہا تھا کہ عذاب آئے گا وہ عذاب اب تک تو آیا نہیں آخر کب آئے گا۔ (معارف کاندھلوی)

لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي
البتہ ان کے احوال سے اپنا حال قیاس کرنا ہے
الْاَلْبَابِ
عقل والوں کو

ان قصوں سے عبرت حاصل کرو:

یعنی یہ کوئی افسانہ یا ناول نہیں۔ تاریخی حقائق ہیں۔ جن سے عقلمندوں کو سبق لینا چاہیے۔ (تفسیر عثمانی)

یعنی ان دانشمندوں کے لئے عبرت ہے جن کی عقلیں سلیم اور محسوس پرستی کی طرف میلان سے پاک ہیں قید چاہ سے مرتبہ شاہ پر فائز کرنا اور بورے سے اٹھا کر تخت شاہی پر پہنچانا بڑا عبرت آفریں ہے صبر کا انجام سلامتی اور عزت ہے اور فریب کا نتیجہ رسوائی اور ندامت ہے۔

لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ "یعنی ان حضرات کے قصوں میں عقل والوں کیلئے بڑی عبرت ہے"

اس سے مراد تمام انبیاء علیہم السلام کے قصے جو قرآن میں مذکور ہیں وہ بھی ہوسکتے ہیں اور خاص حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ جو اس سورۃ میں بیان ہوا ہے وہ بھی، کیونکہ اس واقعہ میں یہ بات پوری طرح روشن ہوکر سامنے آگئی کہ اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار بندوں کی کس کس طرح سے تائید ونصرت ہوتی ہے، کہ کنویں سے نکال کر ایک تخت سلطنت پر اور بدنامی سے نکال کر نیک نامی کی انتہاء پر پہنچا دیئے جاتے ہیں، اور مکر وفریب کرنے والوں کا انجام ذلت ورسوائی ہوتا ہے۔

مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ

کچھ بنائی ہوئی بات نہیں لیکن موافق ہے اس کلام کے

الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ

جو اس سے پہلے ہے اور بیان ہر چیز کا

وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

اور ہدایت اور رحمت ان لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں

قرآن ذریعہ ہدایت:

یعنی قرآن کریم جس میں یہ قصص بیان ہوئے کوئی جھوٹی بنائی ہوئی بات نہیں بلکہ تمام پہلی سچائیوں کی تصدیق کرنے والا اور ہر ضروری چیز کو کھول کر بیان کرنیوالا ہے۔ چونکہ ایماندار اس سے نفع اٹھاتے ہیں اس لحاظ سے ان کے حق میں خاص طور پر ذریعہ ہدایت و رحمت ہے۔ نفعنا الله بعلومه ورزقنا تلاوته آناء الليل وآناء النهار وجعله حجة لنا لا علينا آمين. تم سورۃ یوسف علیہ السلام بعون اللہ تعالیٰ۔ (تفسیر عثمانی)

(یہ قرآن) نہیں ہے تراشی ہوئی بات (کہ اس سے عبرت و نصیحت نہ ہو) بلکہ اس سے پہلے کی (آسمانی) کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے اور ہر (ضروری) بات کی تفصیل کرنے والا ہے اور ایمان والوں کے لئے ذریعہ ہدایت و رحمت ہے۔

یفتری از خود گڑھی ہوئی تراشی ہوئی۔ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ سے مراد ہے توریت وانجیل۔ کل شی سے مراد ہے ہر ضروری دینی بات جس کی بندوں کو حاجت ہوتی ہے ہر دینی امر کا ثبوت قرآن سے ملتا ہے خواہ براہ راست یا (حدیث کو اجماع اور اجتہاد کے) واسطہ سے۔ جو مسئلہ حدیث سے ثابت ہے وہی قرآن سے بھی ثابت ہے اللہ نے فرمایا ہے وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ہم نے ہر پیغمبر کو اس لئے بھیجا کہ بحکم خدا اس کی اطاعت کی جائے۔ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو۔ مآاتاکم الرسول فخذوه وما نها کم عنه فانتهوا رسول اللہ جو کچھ تم کو دیدیں لے لو اور جس چیز سے روک دیں رک جاؤ جو مسئلہ اجماع سے ثابت ہے وہی قرآن سے بھی ثابت ہے اللہ نے فرمایا ہے وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى ہدایت ظاہر ہونے کے بعد جو شخص رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کٹ جائے گا اور اہل ایمان کے راستہ کو چھوڑ کر دوسرے راستہ پر چلے گا تو ہم اس کو اسی کے اختیار کردہ راستہ پر چلنے دیں گے۔ اور جو مسئلہ قیاس سے ثابت ہے وہ بھی قرآن سے ہی ثابت ہے۔

اللہ نے فرمایا ہے: فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ اے عقل والو نصیحت حاصل کرو عبرت پکڑو۔

چونکہ اہل ایمان ہی قرآن سے نفع اندوز ہوتے ہیں اس لئے انہی کا خاص طور پر ذکر کیا (اگرچہ قرآن کی راہنمائی ہر شخص کیلئے عام ہے)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے صبر کی تلقین:

شیخ ابو منصور ماتریدی نے فرمایا حضرت یوسف اور ان کے بھائیوں کے قصہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے صبر کی تلقین ہے۔ یوسف کے بھائی تو یوسف کے ساتھ دین میں موافق تھے اور سب ایک باپ کے بیٹے تھے یوسف کے ساتھ انہوں نے بدسلوکی کی اور یوسف نے صبر کیا اور دانستہ ان کی خطاؤں سے درگذر کی اور معاف کر دیا، پس آپ کو تو اپنی قوم کی ایذاء رسانیوں پر زیادہ صبر کرنا چاہیے آپ کی قوم تو کافر اور جاہل ہے۔

وہب کا قول ہے کہ اللہ نے جو کتاب نازل کی اس میں قرآن کی طرح پوری سورت یوسف نازل فرمائی۔ (تفسیر مظہری)

مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ "یعنی نہیں ہے یہ قصہ کوئی گھڑی ہوئی بات، بلکہ تصدیق ہے ان کتابوں کی جو اس سے پہلے نازل ہو چکی ہیں، کیونکہ تورات وانجیل میں بھی یہ قصہ یوسف علیہ السلام کا مذکور ہے۔ اور حضرت وہب بن منبہ فرماتے ہیں کہ جتنی آسمانی کتابیں اور صحیفے نازل ہوئے ہیں یوسف علیہ السلام کے قصہ سے کوئی خالی نہیں۔ (مظہری)

کامل رہنمائی:

وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ "یعنی یہ قرآن تفصیل ہے ہر چیز کی مراد یہ ہے کہ قرآن کریم میں ہر اس چیز کی تفصیل موجود ہے جس کی دین میں انسان کو ضرورت ہے عبادات، معاملات، اخلاق، معاشرت، حکومت، سیاست وغیرہ انسانی زندگی کے ہر انفرادی یا اجتماعی حال سے متعلق احکام و ہدایات اس میں موجود ہیں اور فرمایا کہ یہ قرآن ہدایت اور رحمت ہے ایمان لانے والوں کے لئے"۔ اس میں ایمان لانے والوں کی تخصیص اس لئے کی گئی کہ اس کا نفع ایمان والوں ہی کو پہنچ سکتا ہے کافروں کے لئے بھی اگرچہ قرآن رحمت اور ہدایت ہی ہے مگر ان کی اپنی بدعملی اور نافرمانی کے سبب یہ رحمت و ہدایت ان کے لئے وبال بن گئی۔

شیخ ابو منصور نے فرمایا کہ پوری سورۂ یوسف اور اس میں درج شدہ قصۂ یوسف کے بیان سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا مقصود ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کچھ ایذائیں اپنی قوم کے ہاتھوں پہنچ رہی ہیں پچھلے انبیاء کو بھی پہنچتی رہیں، مگر انجام کار اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کو غالب فرمایا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ بھی ایسا ہی ہونے والا ہے۔ (معارف مفتی اعظم)

سورة الرعد

جو شخص خواب میں اس کی تلاوت کرے اس کو محتاجی ملتی رہے گی اور ایک قول ہے کہ اس کی وفات قریب ہوگی۔ (علامہ ابن سیرین رحمہ اللہ)

سُوْرَةُ الرَّعْدِ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ ثَلٰثٌ وَّاَرْبَعُوْنَ اٰيَةً وَّسِتُّ رُكُوْعَاتٍ
سورہ رعد مدینہ میں نازل ہوئی اور جس میں تینتالیس آیات اور چھ رکوع ہیں
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے
الٓمّٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ ۭ وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ
یہ آیتیں ہیں کتاب کی اور جو کچھ اترا
اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ
تجھ پر تیرے رب سے سو حق ہے لیکن بہت لوگ
لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝
نہیں مانتے

عظیم الشان کتاب:

یعنی جو کچھ اس سورت میں پڑھا جانے والا ہے وہ عظیم الشان کتاب کی آیتیں ہیں۔ یہ کتاب جو آپ پر پروردگار کی طرف سے اُتاری گئی۔ یقیناً حق وصواب ہے لیکن جائے تعجب ہے کہ ایسی صاف اور واضح حقیقت کے ماننے سے بھی بہت لوگ انکار کرتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

الٓمّٓرٰ، یہ حروف مقطعہ ہیں، جن کے معنی اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں، اُمت کو اس کے معنی نہیں بتلائے گئے، عام اُمت کو اس کی تحقیق میں پڑھنا بھی مناسب نہیں،

حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی قرآن کی طرح وحی الٰہی ہے

پہلی آیت میں قرآن کریم کے کلام الٰہی اور حق ہونے کا بیان ہے، کتاب سے مراد قرآن ہے اور وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ سے بھی ہوسکتا ہے کہ قرآن ہی مراد ہو۔ لیکن واؤ حرف عطف بظاہر یہ چاہتا ہے کہ کتاب اور الَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ دو چیزیں الگ الگ ہوں، اس صورت میں کتاب سے مراد قرآن اور الَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ سے مراد وہ وحی ہوگی جو علاوہ قرآن کے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر آئی ہے، کیونکہ اس میں تو کوئی کلام نہیں ہوسکتا کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر آنے والی وحی صرف قرآن میں منحصر نہیں، خود قرآن کریم میں ہے وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ کہتے ہیں وہ کسی اپنی غرض سے نہیں کہتے، بلکہ ایک وحی ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو بھیجی جاتی ہے، اس سے ثابت ہوا کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو قرآن کے علاوہ دوسرے احکام دیتے ہیں وہ بھی منزل من اللہ ہی ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ قرآن کی تلاوت کی جاتی ہے اور اس کی تلاوت نہیں ہوتی، اور اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کے معانی اور الفاظ دونوں اللہ جل شانہٗ کی طرف سے ہوتے ہیں، اور قرآن کے علاوہ حدیث میں جو احکام آپ صلی اللہ علیہ وسلم دیتے ہیں، ان کے بھی معانی اگرچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی نازل ہوتے ہیں، مگر الفاظ منزل من اللہ نہیں ہوتے، اسی لئے نماز میں ان کی تلاوت نہیں کی جاسکتی، (معارف القرآن)

اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا
اللہ وہ ہے جس نے اونچے بنائے آسمان بغیر ستون دیکھتے ہو

دنیا کی چھت:

یعنی اس دنیا کی ایسی عظیم الشان، بلند اور مضبوط چھت خدا نے بنائی جسے تم دیکھتے ہو۔ اور لطف یہ ہے کہ کوئی ستون یا کھمبہ یا گاڈر دکھائی نہیں دیتا۔ جس پر اتنی بڑی ڈاٹ کھڑی کی گئی بجز اس کے کیا کہا جائے کہ محض قدرت کے غیر مرئی ستون کے سہارے اس کا قیام ہے۔ "وَيُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ" (حج رکوع ۹)

نظریۂ کشش:

کشش اجسام کا نظریہ اگر صحیح ہو تو وہ اس آیت کے منافی نہیں۔ کیونکہ کشش کو عرفاً عمد نہیں کہتے اور اگر عمد کہا جائے تو مرئی نہیں ہے۔ "روی عن ابن عباس ومجاهد والحسن وقتادة وغير واحد انهم قالوا لها عمد ولكن لا نرى (ابن کثیر)

یعنی ان بزرگوں نے فرمایا کہ آسمانوں کے ستون ہیں جو ہم کو نظر نہیں آتے۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانی)

کرسی، عرش اور آسمان:

حدیث شریف میں ہے ساتوں آسمان اور ان میں اور ان کے درمیان میں جو کچھ ہے وہ کرسی کے مقابلہ میں ایسا ہے جیسے کہ چٹیل میدان میں کوئی حلقہ

ہوا اور کرسی عرش کے مقابلے پر بھی ایسی ہی ہے۔عرش کی قدر اللہ عزوجل کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔بعض سلف کا بیان ہے کہ عرش سے زمین تک کا فاصلہ پچاس ہزار سال کا ہے۔عرش سرخ یاقوت کا ہے۔بعض مفسر کہتے ہیں آسمان کے ستون تو ہیں لیکن دیکھے نہیں جاتے۔لیکن ایاس بن معاویہ فرماتے ہیں آسمان زمین پر مثل قبے کے ہے یعنی بغیر ستون کے ہے۔قرآن کے طرز عبارت کے لائق بھی یہی بات ہے اور آیت ویمسک السماء ان تقع علی الارض سے بھی یہی ظاہر ہے۔پس ترونہا اس نفی کی تاکید ہوگی۔یعنی آسمان بلاستون اس قدر بلند ہے اور تم آپ دیکھ رہے ہو، یہ ہے کمال قدرت۔

امیہ بن الصلت کے اشعار:

امیہ بن ابو الصلت کے اشعار میں ہے جس کے اشعار کی بابت حدیث میں ہے کہ اس کے اشعار ایمان لائے ہیں اور اس کا دل کفر کرتا ہے اور یہ بھی روایت ہے کہ یہ اشعار حضرت زید بن عمرو بن نفیل رضی اللہ عنہ کے ہیں جن میں ہے۔

وانت الذی من فضل من ورحمۃٍ	بعثت الی موسیٰ رسولا منادیا
فقلت لہ فاذھب و ھارون فادعوا	الی اللہ فرعون الذی کان طاغیا
وقولا لہ ھل انت سویت ھذہٖ	بلا وتد حتی استقلت کما ھیا
وقولا لہ انت رفعت ھذہ	بلا عمدٍ او فوق ذلک بانیا
وقولا لہ ھل انت سویت و سطھا	منیراً اذا ما جنک اللیل ھادیا
وقولا لہ من انبت الحب فی الثری	فیصبح منہ العشب یھتز رابیا
وقولا لہ من یرسل الشمس غدوۃ	فیصبح ما مست من الارض ضاحیا
و یخرج منہ حبہ فی رؤسہ	ففی ذاک ایات لمن کان واعیا

ارشاد فرمایا: اَللّٰہُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَھَا یعنی اللہ ایسا ہے جس نے آسمانوں کے اتنے بڑے وسیع اور بلند قبہ کو بغیر کسی ستون کے اونچا کھڑا کر دیا، جیسا کہ تم ان آسمانوں کو اسی حالت میں دیکھ رہے ہو۔

کیا آسمان آنکھوں سے نظر آتا ہے:

عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ نیلا رنگ جو ہمیں اوپر نظر آتا ہے آسمان کا رنگ ہے مگر فلاسفہ کہتے ہیں کہ یہ رنگ روشنی اور اندھیری کی آمیزش سے محسوس ہوتا ہے، کیونکہ نیچے ستاروں کی روشنی اور اس کے اوپر اندھیری ہے تو باہر سے رنگ نیلا محسوس ہوتا ہے، جیسے گہرے پانی پر روشنی پڑتی ہے تو وہ نیلا نظر آتا ہے، قرآن کریم کی چند ایات ایسی ہیں جن میں آسمان کے دیکھنے کا ذکر ہے، جیسے اسی آیت مذکورہ میں ترونہا کے الفاظ ہیں، اور دوسری آیت میں اِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ کے الفاظ ہیں، فلاسفہ کی یہ تحقیق اول تو اس کے منافی نہیں، کیونکہ ایسا ممکن ہے کہ آسمان کا رنگ بھی نیلگوں ہو، یا کوئی دوسرا رنگ ہو مگر درمیانی روشنی اور اندھیری کے امتزاج سے نیلا نظر آتا ہو، اس سے انکار کی کوئی دلیل نہیں کہ اس فضاء کے رنگ میں آسمان کا رنگ بھی شامل ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ قرآن کریم میں جہاں آسمان کے دیکھنے کا ذکر ہے وہ حکمی اور مجازی ہو کہ آسمان کا وجود ایسے یقینی دلائل سے ثابت ہے کہ گویا دیکھ ہی لیا۔(روح المعانی، معارف القرآن)

ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ

پھر قائم ہوا عرش پر

''اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ'' کے متعلق ''سورۂ اعراف'' آٹھویں پارہ کے آخر میں کلام کیا گیا ہے۔وہاں ملاحظہ کرلیا جائے۔

وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ کُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ

اور کام میں لگا دیا سورج اور چاند کو ہر ایک چلتا ہے وقت

مُّسَمًّی ؕ

مقرر پر (تک)

چاند اور سورج کا دورہ:

یعنی سورج اپنا دورہ ایک سال میں اور چاند ایک ماہ میں پورا کرتا ہے۔یا ''لِاَجَلٍ مُّسَمًّی'' کے معنی وقت مقرر تک لئے جائیں تو یہ مطلب ہوگا کہ چاند سورج اسی طرح چلتے رہیں گے قیامت تک ان مادہ پرستوں کی رد میں کسی عالم نے کیا خوب کہا ہے۔

والارض فیھا عبرۃ للمعتبر	تخبر من صنع ملیک مقتدر

(ترجمہ): اور زمین میں عبرتیں ہیں۔عبرت حاصل کرنے والے کے لئے زمین کی ساخت خبر دے رہی ہے کہ کسی ملیک مقتدر نے اس کو بنایا ہے۔

تسقی بمآء واحد اشجارھا	وبقعتہ واحدۃ قرارھا

(ترجمہ): ایک پانی سے سب درختوں کو سیراب کیا جاتا ہے اور ایک قطعہ زمین پر سب کا اقرار ہے مگر باوجود اس کے پھل مختلف ہیں کسی کا کیا مزہ اور کسی کا کیا۔

والشمس والھواء لیس یختلف	واکلھا مختلف لا یا تلف

(ترجمہ): جو دھوپ اور ہوا ان درختوں پر پڑ رہی ہے اس میں تو کوئی اختلاف نہیں مگر پھل مختلف ہیں ایک ہی درخت کے پھلوں کا مزہ یکساں نہیں ہوتا۔

لو ان ذامن عمل الطبائع	ادائنہ صنعتہ غیر صانع
لم یختلف وکان شیئًا واحدا	وھل یشبہ الاولاد الاوالدا!

اگر یہ طبیعت اور مادہ کا عمل ہوتا یا بغیر کسی کاریگر کے صنعت کا ہوتا تو پھلوں میں ان کے مزوں میں تفاوت اور فرق نہ ہوتا بلکہ سب کا مزہ ایک ہوتا

ہے جیسے اولاد والد کے مشابہ ہوتی ہے۔

الشمس والهواء يا معاند والمآء والتراب شيء واحد!
فما الذي او جب اتفاضلا الا لحكيم لم يرده باطلا

(ترجمہ): جب دھوپ اور ہوا اور پانی اور مٹی ایک ہے تو پھر یہ تفاوت اور فرق کہاں سے آیا۔ معلوم ہوا کہ یہ تفاوت کسی قادر حکیم کے ارادہ اور اختیار سے ہوا ہے جو کبھی خلاف حکمت کا ارادہ نہیں کرتا۔

(دیکھو روح المعانی ص ۹۳ جلد ۱۳) (معارف کاندھلویؒ)

سیاروں کی رفتار اور مدار:

اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ حق سبحانہٗ وتعالیٰ نے ہر ایک سیارے کے لئے ایک خاص رفتار اور خاص مدار مقرر کر دیا ہے اور وہ ہمیشہ اپنے مدار پر اپنی مقررہ رفتار کے ساتھ چلتا رہتا ہے، چاند اپنے مدار کو ایک ماہ میں پورا کر لیتا ہے، اور آفتاب سال بھر میں پورا کرتا ہے۔

ان سیاروں کا عظیم الشان وجود، پھر ایک خاص مدار پر خاص رفتار کے ساتھ ہزاروں سال سے یکساں انداز میں اسی طرح چلتے رہنا کہ نہ کبھی ان کی مشین گھستی ہے نہ ٹوٹتی ہے، نہ اس کو گریسنگ کی ضرورت ہوتی ہے، انسانی مصنوعات میں سائنس کی اس انتہائی ترقی کے بعد بھی اس کی نظیر تو کیا اس کا ہزارواں حصہ ملنا بھی ناممکن ہے، یہ نظام قدرت بآواز بلند پکار رہا ہے کہ اس کو بنانے اور چلانے والی کوئی ایسی ہستی ضرور ہے جو انسان کے ادراک وشعور سے بالاتر ہے۔ (معارف القرآن)

يُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ يُفَصِّلُ الۡاٰيٰتِ لَعَلَّكُمۡ
تدبیر کرتا ہے کام کی ظاہر کرتا ہے نشانیاں کہ (تاکہ) شاید
بِلِقَآءِ رَبِّكُمۡ تُوۡقِنُوۡنَ ﴿۲﴾
تم اپنے رب سے ملنے کا یقین کرو

تدبیر کائنات دلیل قیامت:

یعنی جس نے ایسی عظیم الشان مخلوقات کو پیدا کیا اُسے تمہارا دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے۔ نیز ایک باخبر، مدبر، بیدار مغز اور طاقتور گورنمنٹ باغیوں اور مجرموں کو ہمیشہ کے لئے یوں ہی آزاد نہیں چھوڑے رکھتی، نہ وفادار امن پسند رعایا کی راحت رسانی سے اغماض کر سکتی ہے۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ خداوند قدوس جو زمین وآسمان کے تخت کا تنہا مالک اور اپنی تدبیر وحکمت سے تمام مخلوقات علوی وسفلی کا انتظام باحسن اسلوب قائم رکھنے والا ہے۔ مطیع وعاصی کو یوں ہی مہمل چھوڑے رکھے۔ ضرور ہے کہ ایک دن وفاداروں کو وفاداری کا صلہ ملے اور مجرم اپنی سزا کو پہنچیں۔ پھر جب اس زندگی میں مطیع وعاصی کے درمیان ہم ایسی صاف تفریق نہیں دیکھتے تو یقیناً ماننا پڑے گا کہ اس زندگی کے بعد کوئی دوسری زندگی ہے جس میں سب کو آسمانی عدالت کے سامنے حاضر ہو کر عمر بھر کے اعمال کا پھل چکھنا ہوگا۔ (تفسیر عثمانیؒ)

ہر چیز کی تدبیر درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کا کام ہے، انسانی تدبیر برائے نام ہے

يُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ ''یعنی اللہ تعالیٰ ہی ہر کام کی تدبیر کرتا ہے۔ انسان جو اپنی تدبیروں پر نازاں ہے ذرا آنکھ کھول کر دیکھے تو معلوم ہوگا کہ اس کی تدبیر کسی چیز کو نہ پیدا کر سکتی ہے، نہ بنا سکتی ہے، اس کی ساری تدبیروں کا حاصل اس سے زیادہ نہیں کہ خداوند سبحانہٗ وتعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزوں کا صحیح استعمال سمجھ لے، تمام اشیاءِ عالم کے استعمال کا نظام بھی اس کی قدرت سے خارج ہے، کیونکہ انسان اپنے ہر کام میں دوسرے ہزاروں انسانوں، جانوروں اور دوسری مخلوقات کا محتاج ہے جن کو اپنی تدبیر سے اپنے کام میں نہیں لگا سکتا، قدرتِ خداوندی ہی نے ہر چیز کی کڑی دوسری چیز سے اس طرح جوڑی ہے، کہ ہر چیز کھنچی چلی آتی ہے، آپ کو مکان بنانے کی ضرورت پیش آتی ہے تو نقشہ بنانے والے آرکیٹیکٹ سے لے کر رنگ وروغن کرنے والوں تک سینکڑوں انسان اپنی جان اور اپنا ہنر لئے ہوئے آپ کی خدمت کو تیار نظر آتے ہیں، سامانِ تعمیر جو بہت سی دکانوں میں بکھرا ہوا ہے سب آپ کو تیار مل جاتا ہے، کیا آپ کی قدرت میں تھا کہ اپنے مال یا تدبیر کے زور سے یہ ساری چیزیں مہیا اور سارے انسانوں کو اپنی خدمت کے لئے حاضر کر لیتے، آپ تو کیا کوئی بڑی سے بڑی حکومت بھی قانون کے زور سے یہ نظام قائم نہیں کر سکتی بلاشبہ یہ تدبیر اور نظامِ عالم کا قیام صرف حی و قیوم ہی کا کام ہے، انسان اگر اس کو اپنی تدبیر قرار دے تو جہالت کے سوا کیا ہے۔

لَعَلَّكُمۡ بِلِقَآءِ رَبِّكُمۡ تُوۡقِنُوۡنَ۔ یعنی یہ سب کائنات اور ان کا عجیب وغریب نظام وتدبیر اللہ تعالیٰ نے اس لئے قائم فرمائے ہیں کہ تم اس میں غور کرو، تو تمہیں آخرت اور قیامت کا یقین ہو جائے، کیونکہ اس نظام عجیب اور پیدائش عالم پر نظر کرنے کے بعد یہ اشکال تو رہ نہیں سکتا کہ آخرت میں انسان کے دوبارہ پیدا کرنے کو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے خارج سمجھیں، اور جب داخلِ قدرت اور ممکن ہونا معلوم ہوگیا، اور ایک ایسی ہستی نے اس کی خبر دی جس کی زبان پوری عمر میں کبھی جھوٹ پر نہیں چلی، تو اس کے واقع اور ثابت ہونے میں کیا شک رہ سکتا ہے، (معارف القرآن)

وَهُوَ الَّذِىْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِىَ
اور وہی ہے جس نے پھیلائی زمین اور رکھے اس میں بوجھ (پہاڑ)
وَاَنْهٰرًا ۭ
اور ندیاں

یعنی پہاڑ جو ایک جگہ کھڑے ہیں اور دریا جو ہر وقت چلتے رہتے ہیں۔ (تفسیر عثمانیؒ)

وَهُوَ الَّذِىْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِىَ وَاَنْهٰرًا ۔ اور وہی وہ ذات ہے جس نے زمین کو پھیلایا اور اس میں بوجھل پہاڑ اور نہریں بنائیں۔"

زمین کا گول ہونا: زمین کا پھیلانا اس کے کرہ اور گول ہونے کے منافی نہیں، کیونکہ گول چیز جب بہت بڑی ہو تو اس کا ہر ایک حصہ الگ الگ ایک پھیلی ہوئی سطح ہی نظر آتا ہے، اور قرآن کریم کا خطاب عام لوگوں سے انہی کی نظروں کے مطابق ہوتا ہے، ظاہر دیکھنے والا اس کو ایک پھیلی ہوئی سطح دیکھتا ہے، اس لئے اس کو پھیلانے سے تعبیر کر دیا گیا۔

پہاڑ اور نہریں:

پھر اس کا توازن قائم رکھنے کے لئے نیز اور بہت سے دوسرے فوائد کے لئے اس پر اونچے اونچے بھاری پہاڑ قائم فرما دیئے، جو ایک طرف زمین کا توازن قائم رکھتے ہیں، دوسری طرف ساری مخلوق کو پانی پہنچانے کا انتظام کرتے ہیں، پانی کا بہت بڑا ذخیرہ ان کی چوٹیوں پر بحرِ منجمد (برف) کی شکل میں رکھ دیا جاتا ہے، جس کے لئے نہ کوئی حوض ہے اور نہ ٹنکی بنانے کی ضرورت ہے، نہ ناپاک ہونے کا احتمال ہے، نہ سڑنے کا امکان۔ (معارف القرآن)

وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا
اور ہر میوے کے رکھے اس میں
زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ
جوڑے دو دو قسم

یعنی چھوٹا بڑا، کھٹا میٹھا، سیاہ و سفید، گرم سرد اور جدید تحقیق کے موافق ہر ایک میں نر و مادہ بھی پائے جاتے ہیں۔

يُغْشِى الَّيْلَ النَّهَارَ ؕ
ڈھانکتا ہے دن پر رات کو

اس کے معنی سورہ اعراف میں آٹھویں پارے کے خاتمہ پر بیان ہو چکے وہاں دیکھ لیا جائے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ وَفِى
اس میں نشانیاں ہیں انکے واسطے جو کہ دھیان کرتے ہیں
الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ
اور زمین میں کھیت ہیں مختلف ایک دوسرے سے متصل (پاس پاس)
اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ
اور باغ ہیں انگور کے اور کھیتیاں ہیں اور کھجوریں ہیں
صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۣ وَنُفَضِّلُ
ایک کی جڑ دوسری سے ملی ہوئی اور بعضی بن ملی ان کو پانی بھی ایک
بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِى الْاُكُلِ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ
ہی دیا جاتا ہے، اور ہم ہیں کہ بڑھا دیتے ہیں ان میں ایک کو ایک
لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝
سے میووں میں ان چیزوں میں نشانیاں ہیں ان کو جو غور کرتے ہیں

قدرت کے کارنامے:

بلند آسمانوں کے مقابل پست زمین کا ذکر کیا۔ آسمان کے ساتھ چاند سورج کا بیان ہوا تھا کہ ہر ایک کی رفتار الگ ہے اور ہر ایک کا کام جداگانہ ہے۔ ایک کی گرم و تیز شعاعیں جو کام کرتی ہیں، دوسرے کی ٹھنڈی اور دھیمی چاندنی سے وہ بن نہیں پڑتا۔ اسی طرح یہاں زمین کے مختلف احوال اور اس سے تعلق رکھنے والی مختلف چیزوں کا ذکر فرمایا کہیں پہاڑ کھڑے ہیں کہیں دریا رواں ہیں، جو میوے اور پھل پیدا ہوتے ہیں اُن میں بھی شکل وصورت، رنگ، مزہ، چھوٹے بڑے بلکہ نر و مادہ کا اختلاف ہے۔ کبھی زمین دن کے اجالے سے روشن ہو جاتی ہے کبھی رات کی سیاہ نقاب منہ پر ڈال لیتی ہے۔ پھر طرفہ تماشا یہ ہے کہ چند قطعات زمین جو ایک دوسرے سے متصل ہیں، ایک پانی سے سیراب ہوتے ہیں، ایک سورج کی شعاعیں سب کو پہنچتی ہیں، ایک ہی ہوا سب پر چلتی ہے۔ اس کے باوجود اس قدر مختلف پھول پھل لاتے ہیں اور باہم پیداوار کی کمی زیادتی کا اتنا فرق ہوتا ہے جو دیکھنے والوں کو حیرت زدہ کر دیتا ہے۔ غور و فکر کرنے والے ان نشانوں کو دیکھ کر

سمجھ لیتے ہیں کہ ایک ہی ابرِ رحمت کی آبیاری یا ایک ہی آفتابِ ہدایت کی موجودگی میں انسانوں کے مادی و روحانی احوال کا اختلاف بھی کچھ مستبعد و مستنکر نہیں ہے اور یہ کہ لامحدود قدرت کا کوئی زبردست ہاتھ آسمان سے زمین تک تمام مخلوق کے نظام ترکیبی کو اپنے قبضہ میں لئے ہوئے ہے۔ جس نے ہر چیز کی استعداد کے موافق اُس کے دائرہ عمل واثر کی بہت مضبوط حد بندی کر رکھی ہے۔ پھر ایسے لامتناہی قدرت واختیار رکھنے والے خدا کو کیا مشکل ہے کہ ہم کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کردے اور اس عالم کے مخلوط عناصر کی کیمیاوی تحلیل کر کے ہر خیر وشر کو اس کے مستقر میں پہنچادے۔ (تفسیر عثمانی)

گلہائے رنگ رنگ:

وَفِي الْأَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ ۔ اور زمین میں پاس پاس ملے ہوئے (مختلف) قطعات ہیں کوئی عمدہ (اور پیداواری) ہے اور کوئی شور یلا نمکین کوئی نرم کوئی سخت، کوئی کھیتی کرنے کے قابل ہے درخت بونے کے قابل نہیں کوئی درختوں کی سرزمین ہے کھیتی کے ناقابل کسی میں سبزہ کم ہے (یا بنجر ہے) اور کئی سبزہ زار ہے اگر یہ فعل قادر مختار اور صانع حکیم کا نہیں تو پھر یہ اختلاف کیوں ہے اور کیوں خواص میں تفاوت ہے زمین کی طبیعت ایک ہی ہے لوازم طبیعت بھی یکساں ہیں سماوی اسباب کی تاثیر بھی ایک ہی جیسی ہے وضع اور نسبت میں بھی کوئی فرق نہیں پھر سوائے اس کے کہ ایک قادر مختار کی مشیت کی کارفرمائی قرار دی جائے اور کیا سبب اختلاف بتایا جا سکتا ہے۔

مجاہد نے کہا اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک باپ سے سب آدمی پیدا ہوئے لیکن کوئی اچھا ہے کوئی بُرا، حسن نے اس کی تشبیہ انسانوں کے دلوں سے دی ہے۔ زمین کا ایک خمیر تھا اللہ نے اپنے دستِ قدرت سے اس کو پھیلایا بچھایا اور پاس پاس اس کے جدا جدا ٹکڑے کر دیئے پھر اس پر آسمان سے پانی برسایا جس کی وجہ سے ایک ٹکڑے سے پھل پھول اور کھیتیاں درخت پیدا کئے اور دوسرے کو شور یلا نمکین کلر اور بنجر کر دیا، باوجودیکہ سب پر ایک ہی طرح کا پانی برسایا، آدمیوں کی حالت بھی اسی طرح ہے سب کو آدم سے پیدا کیا اور سب کے لئے ہدایت نامہ (کا پانی) آسمان سے اتارا کچھ دل تو اس کی وجہ سے نرم پڑ گئے اور ان کے اندر خشوع پیدا ہو گیا اور کچھ سخت ہو گئے اور غافل بن گئے۔ (تفسیر مظہری)

وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا
اور اگر تو عجیب بات چاہے تو عجب ہے ان کا کہنا کہ کیا جب ہو گئے
تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۬
ہم مٹی کیا نئے سرے سے بنائے جائینگے

قابل تعجب بات:

یعنی اس سے زیادہ عجیب بات کیا ہوگی کہ جس نے اول ایک چیز بنائی وہ دوبارہ بنانے پر قادر نہ ہو؟ (العیاذ باللہ) (تفسیر عثمانی)

یا آیت کا یہ مطلب ہے کہ مشرک جو آپ کے دعوائے رسالت کی تکذیب کر رہے ہیں باوجودیکہ کھلے ہوئے معجزات دیکھ رہے ہیں اور واضح دلائل بھی ان کے سامنے ہیں پھر بھی ایسی چیزوں کی پوجا کرتے ہیں جن میں نفع نقصان پہنچانے کی طاقت نہیں اور آپ کو ان کی اس حرکت پر تعجب ہو رہا ہے تو ان کا یہ قول بھی تعجب کے لائق ہے کہ ہم خاک ہو جانے کے بعد کیا دوبارہ از سرنو پیدا کیئے جائیں گے۔ حالانکہ اللہ ہی نے تمام وہ چیزیں جن کی تفصیل ذکر کردی گئی نیست سے ہست کی ہیں پھر ان کے مرنے کے بعد دوبارہ ان کو پیدا کرنا تو آسان ہے۔

آیاتِ مذکورہ اور دلائل واضحہ چاہتے ہیں کہ ان کا ایک (بااختیار) فاعل ہو اسی طرح دوبارہ پیدا ہونے کے امکان پر بھی ان سے استدلال کیا جا سکتا ہے ان سے اللہ کا قادر مطلق ہونا اور مختلف قابلیت کی چیزوں میں مختلف تصرفات کرنا ثابت ہو رہا ہے۔ (تفسیر مظہری)

مشرکین کی منطق:

حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور قدر کو پہچانا ہی نہیں، اس کی قدرت کو اپنی قدرت پر قیاس کرتے ہیں، حالانکہ آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی سب چیزیں اپنی اپنی حیثیت کا ادراک وشعور رکھتے ہیں، اور حکم حق کے تابع چلتے ہیں

خاک وباد وآب وآتش زندہ اند   بامن وتو مردہ باحق زندہ اند

(معارف القرآن)

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ الْاَغْلٰلُ
وہی ہیں جو منکر ہو گئے اپنے رب سے اور وہی ہیں
فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ
کہ طوق ہیں ان کی گردنوں میں اور وہ ہیں دوزخ والے وہ اسی
فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝
میں رہیں گے برابر

باغیوں کا انجام:

گویا یہ لوگ ''بعث بعد الموت'' کا انکار کر کے خداوند قدوس کی شہنشاہی

سے منکر ہیں۔ تو ایسے باغیوں کا انجام یہ ہی ہونا ہے کہ گلے میں طوق اور ہاتھ پاؤں میں ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا کر ابدی جیل خانہ میں ڈال دیئے جائیں جو حقیقت میں ایسے ہی مجرموں کے لئے بنایا گیا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ

اور جلد مانگتے ہیں تجھ سے برائی کو پہلے بھلائی سے

یعنی حق کو قبول نہیں کرتے جس سے دنیا و آخرت کی بھلائی ملے کفر اختیار کرتے ہیں اور کہتے ہیں عذاب لے آؤ۔

وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ۭ وَاِنَّ

اور گزر چکے ہیں ان سے پہلے بہت سے عذاب (مثالیں) اور

رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰي ظُلْمِهِمْ ۚ

تیرا رب معاف بھی کرتا ہے لوگوں کو باوجود ان کے ظلم کے،

وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝

اور تیرے رب کا عذاب بھی سخت ہے

عذاب کوئی مشکل نہیں:

یعنی پہلے بہتیری قوموں پر عذاب آچکے ہیں۔ تم پر لے آنا کیا مشکل تھا، بات صرف اتنی ہے کہ تیرا پروردگار اپنی شانِ حلم و عفو سے ہر چھوٹے بڑے جرم پر فوراً گرفت نہیں کرتا۔ وہ لوگوں کے ظلم و ستم دیکھتا اور درگذر کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ جب مظالم اور شرارتوں کا سلسلہ حد سے گذر جاتا ہے اُس وقت اُس کے تباہ کن عذاب سے بچنے کی کوئی صورت نہیں رہتی۔ (تفسیر عثمانی)

عَلٰي ظُلْمِهِمْ یعنی باوجودیکہ وہ اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ آیت منکرین قیامت کے متعلق ہے اور منکرین قیامت کی مغفرت اللہ کبھی نہیں کرے گا تو مغفرت سے مراد ڈھیل دینا فوراً پکڑ نہ کرنا یعنی اللہ حلیم ہے کافروں کو بھی باوجود ان کی بے جا حرکتوں کے ڈھیل دیتا رہتا ہے اور ان کو فی الفور عذاب نہیں دیتا۔ حالانکہ وہ عذاب آنے میں عجلت کے طلب گار ہوتے ہیں۔

گناہگاروں کیلئے امید گاہ:

سدی نے کہا کہ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰي ظُلْمِهِمْ مومنوں کے لئے خصوصیت کے ساتھ نازل ہوئی۔ قرآن مجید میں جتنی آیت گناہگار مومنوں کو امید مغفرت دلا رہی ہیں ان سب سے بڑھ کر امید گاہ مغفرت یہ آیت ہے اس آیت میں عَلٰي ظُلْمِهِمْ کا لفظ امید دلا رہا ہے کہ بغیر توبہ کے بھی مغفرت ہوسکتی ہے کیونکہ توبہ کرنیوالا ظلم پر نہیں رہتا۔ گناہ سے توبہ کرنے والا بے گناہ کی طرح ہوجاتا ہے یہ حدیث حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے ابن ماجہ نے مرفوعاً نقل کی ہے۔

ابن ابی حاتم اور بیہقی اور واحدی نے سعید بن مسیّب کی روایت سے مرسلاً بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر اللہ کی طرف سے معافی اور درگذر نہ ہوتی تو یہاں کوئی زندہ نہ رہتا اور اگر اس کی طرف سے عذاب کی دھمکی نہ ہوتی تو ہر ایک اس کی رحمت پر بھروسہ کر بیٹھتا۔ (تفسیر مظہری)

ابوحسان رمادی کا خواب:

ابن عساکر میں ہے کہ حسن بن عثمان ابوحسان رمادیؒ نے خواب میں اللہ تعالیٰ عزوجل کا دیدار کیا۔ دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ خدا کے سامنے کھڑے اپنے ایک امتی کی شفاعت کر رہے ہیں جس پر فرمان باری سرزد ہوا کہ کیا تجھے اتنا کافی نہیں کہ میں نے سورۂ رعد میں تجھ پر آیت وان ربک لذو مغفرة للناس علی ظلمهم نازل فرمائی ہے۔ ابوحسان فرماتے ہیں اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ

اور کہتے ہیں کافر کیوں نہ اتری اس پر کوئی نشانی

اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ

اس کے رب سے

یعنی جو نشانی ہم مانگتے ہیں وہ کیوں نہیں اُتری، جسے دیکھ کر ہم ایمان لانے پر مجبور ہوجاتے۔

اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝

تیرا کام تو ڈر سنا دینا ہے اور ہر قوم کے لئے ہوا ہے راہ بتانے والا

منہ مانگی نشانیاں دکھانا پیغمبر کا کام نہیں ہے:

یعنی آیات کا اُتارنا آپ کے قبضہ میں نہیں، یہ تو خدا کا کام ہے جو آیت پیغمبر کی تصدیق کے لئے مناسب ہو دکھلائے۔ آپ کا فرض اسی قدر ہے کہ خیر خواہی کی بات سنا دیں اور بُرائی کے مہلک انجام سے لوگوں کو آگاہ کر دیں۔ پہلے بھی ہر قوم کی طرف ہادی "راہ بتانے والے" اور نذیر "ڈرانے والے" آتے رہے ہیں۔ ان میں سے کسی کا یہ دعویٰ نہیں ہوا کہ جو نشان معاندین طلب کریں گے ضرور دکھلا کر رہیں گے۔ ہاں خدا کی راہ دکھانا ان کا کام تھا وہ ہی آپ کا ہے۔ البتہ وہ خاص خاص قوم کے لئے ہادی تھے آپ صلی

اللہ علیہ وسلم دنیا کی ہر قوم کے لئے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

سعید بن جبیر کے نزدیک ہادی سے مراد اللہ ہے۔ یعنی ہر قوم کو ہدایت یاب بنانا اور ہدایت پر قدرت دینا تو اللہ کا کام ہے وہی ہدایت پر قادر ہے۔ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ عکرمہ نے کہا ہادی سے مراد ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی آپ تو صرف ڈرانے والے اور ہر قوم کو راستہ دکھانے والے ہیں۔

رافضیوں کا غلط استدلال:

رافضی کہتے ہیں اصل آیت میں وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ علی ہر قوم کے ہادی علی ہیں تھا۔ عثمان نے حسد کی وجہ سے علی کا لفظ ساقط کر دیا۔ ان کو اللہ سزا دے، ان کو نہیں معلوم کہ اللہ نے قرآن کے متعلق وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ فرما دیا ہے ہم ہی قرآن کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اگر بفرض محال ان کے قول کو مان بھی لیا جائے تو پھر اصل آیت کی رو سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی حضرت علی کی فضیلت لازم آتی ہے کیونکہ آیت کا مفہوم اس وقت یہ ہوگا کہ آپ تو صرف ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم کے ہادی تو علی ہیں (یعنی آپ ہدایت کے درجہ پر فائز نہیں یہ کام تو علی کا ہے۔)

فرمائشیں عناد کی علامت ہیں:

اللہ کا علم کامل ہے قدرت تام ہے، قضاء وقدر کے دائرہ سے کوئی چیز باہر نہیں وہ ہر فرمائشی معجزہ کو پیدا کر سکتا اور قادر مطلق ہے ان کافروں کو ہدایت بھی کر سکتا ہے مگر مطلوبہ معجزات کی درخواست سے طلب ہدایت مقصود نہیں بلکہ محض عناد کے زیر اثر ایسی فرمائشیں کی جاتی ہیں اس لئے ان فرمائشوں کو پورا نہیں کرتا اور چونکہ ان کے کافر رہنے کا ازلی فیصلہ پہلے ہی ہو چکا ہے اس لئے ہدایت یاب ہونے کی ان کو توفیق بھی نہیں دیتا۔ ان تمام مضامین پر آیات ذیل دلالت کر رہی ہیں۔ (تفسیر مظہری)

اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى

اللہ جانتا ہے جو پیٹ میں رکھتی ہے ہر مادہ

کہ مذکر ہے، یا مونث، پورا یا ادھورا، اچھا ہے یا برا، وغیر ذلک من الاحوال. (تفسیر عثمانی)

حمل کی کم از کم مدت:

باتفاق علماء حمل کی مدت کم سے کم چھ ماہ ہے ایک شخص نے کسی عورت سے نکاح کیا چھٹے مہینے میں عورت کے بچہ پیدا ہو گیا، حضرت عثمانؓ نے عورت کو سنگسار کر دینے کا حکم دیدیا حضرت ابن عباسؓ مانع ہوئے اور فرمایا کتاب اللہ کی روشنی میں اگر میں تم سے اس مسئلہ میں مناظرہ کروں تو تمہارے پاس جواب نہ ہوگا۔ اللہ نے فرمایا وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا اس کا حالت حمل میں رہنا اور دودھ پینا تیس ماہ ہے۔ دوسری آیت میں آیا ہے وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اور اس کا دودھ چھڑانا دو سال میں ہوتا ہے دونوں آیتوں کے ملانے سے مدت حمل (کم سے کم) چھ ماہ رہتی ہے۔ حضرت عثمانؓ نے یہ سن کر تعزیری سزا منسوخ کر دی۔ ابن ہمام نے لکھا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے سزا ساقط کر دی اور کسی نے مخالفت نہیں کی تو یہ اجماع سکوتی ہو گیا کہ حمل کی مدت کم سے کم چھ ماہ ہے کبھی چھ ماہ کا بچہ پیدا ہوتا اور زندہ بھی رہتا ہے۔

زیادہ سے زیادہ مدت:

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک زیادہ سے زیادہ مدت حمل دو سال ہے۔

دارقطنی اور بیہقی نے سنن میں ابن المبارک کے طریق سے از داؤد بن عبدالرحمٰن از ابن جریج از جمیلہ بنت سعد ایک حدیث بیان کی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا تکلے کے سایہ کی بقدر بھی کوئی عورت حمل میں دو سال سے آگے نہیں بڑھتی دوسری روایت ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے حمل دو سال سے زیادہ نہیں ہوتا خواہ زیادتی تکلے کے سایہ کے برابر ہو۔

ابن ہمام نے کہا ظاہر ہے کہ حضرت عائشہؓ کی حدیث میں جو مدت آئی ہے وہ حضرت عائشہؓ کا قیاس نہیں ہے ایسے مسائل میں قیاس کو دخل نہیں صرف سماعی ہے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ نے ایسا ہی سنا ہوگا) لہٰذا مرفوع کے حکم میں ہے (یعنی حضرت عائشہؓ کا قول نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے۔

ایک شبہ: شبہ کیا جا سکتا ہے کہ ایک عورت کا شوہر چند سال گھر سے غائب رہا جب واپس آیا تو بیوی کو حاملہ پایا حضرت عمر نے اس عورت کو سنگسار کرا دینے کا ارادہ کیا حضرت معاذ نے فرمایا امیر المومنین اگر اس عورت پر آپ کو (شرعی) دست رس ہو بھی تب بھی اس کے پیٹ کے بچہ پر آپ کو کوئی دست رس نہیں ہو سکتا (یعنی آپ اس کو قتل نہیں کر سکتے جب بچہ پیدا ہو جائے تو عورت کو سنگسار کرا سکتے ہیں) غرض بچہ پیدا ہوا اور ایسا ہوا کہ اس کے دو اگلے دانت بھی نکل آئے تھے اس شخص نے بچہ کو دیکھا تو بولا قسم ہے رب کعبہ کی یہ میرا بچہ ہے۔ حضرت عمر نے عورت کی سزا منسوخ کر دی۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ دو سال سے زائد مدت حمل حضرت عمر نے تسلیم کر لی۔ (تفسیر مظہری)

جواب: یہ سزا کی منسوخی تو اس وجہ سے ہوئی کہ مرد نے اس بچہ کو اپنا بیٹا ہونا تسلیم کر لیا اور دعویٰ کیا کہ وہ اسی کا بیٹا ہے اور جس کا فراش ہوتا ہے بچہ اسی

کا شرعاً مانا جاتا ہے۔ خواہ وہ بچہ زناء کا ہی ہو مگر مانا جائے گا شوہر ہی کا) اسی لئے حضرت عمرؓ نے سزا موقوف کردی۔

عجیب تر:

امام شافعیؒ نے فرمایا یمن میں مجھ سے ایک شیخ نے بیان کیا تھا کہ اس کی بیوی کے پانچ بطن ہوئے اور ہر بطن میں پانچ پانچ بچے ہوئے میں کہتا ہوں ہندوستان میں ایک خبر مشہور ہوئی تھی کہ پورب کی طرف قاضی قدوہ کی بیوی کے ایک بطن میں ایک جھلی میں سو بچے ہوئے اور سب زندہ رہے۔ (تفسیر مظہری)

حمل کا یقینی علم:

وہ عالم الغیب ہیں، تمام کائنات ومخلوقات کے ذرہ ذرہ سے واقف اور ہر ذرہ کے بدلتے ہوئے حالات سے باخبر ہیں۔ اس کے ساتھ ہی تخلیق انسانی کے ہر دور اور ہر تغیر اور ہر صفت سے پوری طرح واقف ہونے کا ذکر ہے کہ حمل کا یقینی اور صحیح علم صرف اسی کو ہوتا ہے کہ لڑکا ہے یا لڑکی، یا دونوں یا کچھ بھی نہیں صرف پانی یا ہوا ہے، قرائن اور تخمینہ سے کوئی حکیم یا ڈاکٹر جو کچھ اس معاملہ میں رائے دیتا ہے اس کی حیثیت ایک گمان اور اندازہ سے زیادہ نہیں ہوتی، بسا اوقات واقعہ اس کے خلاف نکلتا ہے، ایکسرے کا جدید آلہ بھی اس حقیقت کو کھولنے سے قاصر ہے۔ (معارف القرآن)

صحیحین کی حدیث میں فرمانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ تم میں سے ہر ایک کی پیدائش چالیس دن تک اس کی ماں کے پیٹ میں جمع ہوتی رہتی ہے۔ پھر اتنے ہی دنوں تک وہ بصورت خونِ بستہ رہتا ہے۔ پھر اتنے ہی دنوں تک وہ گوشت کا لوتھڑا رہتا ہے۔ پھر اللہ تبارک وتعالیٰ خالق کل ایک فرشتے کو بھیجتا ہے جسے چار باتوں کو لکھ لینے کا حکم ہوتا ہے۔ اس کا رزق عمر اور نیک وبد ہونا لکھ لیتا ہے۔ اور حدیث میں ہے وہ پوچھتا ہے خدایا! مرد ہوگا یا عورت؟ شقی ہوگا یا سعید؟ روزی کیا ہے؟ عمر کتنی ہے؟ اللہ تعالیٰ بتلاتا ہے اور وہ لکھ لیتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں غیب کی پانچ کنجیاں ہیں جنہیں بجز اللہ تعالیٰ علیم وخبیر کے اور کوئی نہیں جانتا۔ کل کی بات اللہ کے سوا اور نہیں جانتا۔ پیٹ کیا بڑھتے ہیں اور کیا گھٹتے ہیں کوئی نہیں جانتا۔ بارش کب برسے گی اس کا علم بھی کسی کو نہیں۔

کون شخص کہاں مرے گا اسے بھی اسکے سوا کوئی نہیں جانتا۔ قیامت کب قائم ہوگی اس کا علم بھی اللہ ہی کو ہے۔ پیٹ کیا گھٹاتے ہیں، اس سے مراد حمل کا ساقط ہو جانا ہے۔ اور رحم میں کیا بڑھ رہا ہے کیسے پورا ہو رہا ہے یہ بھی اللہ کو بخوبی علم رہتا ہے۔ دیکھ لو کوئی عورت دس مہینے لیتی ہے کوئی نو کسی کا حمل گھٹتا ہے کسی کا بڑھتا ہے۔ نو ماہ سے گھٹنا نو ماہ سے بڑھ جانا اللہ کے علم میں ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَمَا تَغِيضُ الْأَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ ۚ وَكُلُّ
اور جو سکڑتے ہیں پیٹ اور بڑھتے ہیں اور
شَيْءٍ عِنْدَهُ بِمِقْدَارٍ ⑨
ہر چیز کا اس کے یہاں اندازہ ہے

اللہ کے ہاں ہر چیز حکمت کے تحت ہے:

یعنی حاملہ کے پیٹ میں ایک بچہ ہے یا زیادہ، پورا بن چکا ہے یا ناتمام ہے، تھوڑی مدت میں پیدا ہوگا یا زیادہ میں۔ غرض پیٹ کے گھٹنے بڑھنے کے تمام اسرار و اسباب اور اوقات و احوال کو پوری طرح جانتا ہے۔ اور اپنے علم محیط کے موافق ہر چیز کو ہر حالت میں اُس کے اندازہ اور استعداد کے موافق رکھتا ہے اسی طرح اُس نے جو آیات انبیاء علیہم السلام کی تصدیق کے لئے اتاری ہیں اُن میں خالص اندازہ اور مصالح وحکم ملحوظ رہی ہیں۔ جس وقت جس قدر بنی آدم کی استعداد و صلاحیت کے مطابق نشانات کا ظاہر کرنا مصلحت تھا اُس میں کمی نہیں ہوئی۔ باقی قبول کرنے اور منتفع ہونے کے لحاظ سے لوگوں کا اختلاف ایسا ہی ہے جیسے حوامل کے پیٹ سے پیدا ہونے والوں کے احوال تفاوت استعداد وتربیت کی بناء پر مختلف ہوتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِمِقْدَارٍ : یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہر چیز کا ایک خاص اندازہ اور پیمانہ مقرر ہے، نہ اس سے کم ہو سکتی ہے نہ زیادہ، بچے کے تمام حالات بھی اس میں داخل ہیں کہ اس کی ہر چیز اللہ کے نزدیک متعین ہے کہ کتنے دن حمل میں رہے گا، پھر کتنے زمانہ تک دنیا میں زندہ رہے گا، کتنا رزق اس کو حاصل ہوگا، اللہ جل شانہٗ کا یہ بے مثال علم اس کی توحید کی واضح دلیل ہے۔ (معارف القرآن)

عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيرُ الْمُتَعَالِ ⑨
جاننے والا پوشیدہ اور ظاہر کا سب سے بڑا برتر

علم الٰہی لامحدود ہے:

یہ علم الٰہی کی لامحدود وسعت واحاطہ کا بیان ہوا۔ یعنی دنیا کی کوئی کھلی چھپی چیز اُس سے پوشیدہ نہیں اور تمام عالم اُس کے زیر تصرف ہے۔ (تفسیر عثمانی)

عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيرُ الْمُتَعَالِ : غیب سے مراد وہ چیز ہے جو انسانی حواس سے غائب ہو۔ یعنی نہ آنکھوں سے اس کو دیکھا جا سکے نہ کانوں

سے سنا جا سکے، نہ ناک سے سونگھا جا سکے نہ زبان سے چکھا جا سکے، نہ ہاتھوں سے چھو کر معلوم کیا جا سکے۔

شہادت، اس کے بالمقابل وہ چیزیں ہیں جن کو انسانی حواس مذکورہ کے ذریعہ معلوم کیا جا سکے، معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی کی خاص صفت کمال یہ ہے کہ وہ ہر غیب کو اسی طرح جانتا ہے جس طرح حاضر و موجود کو جانتا ہے،

الکبیر، کے معنی بڑا اور متعال کے معنی بالا و بلند، مراد ان دونوں لفظوں سے یہ ہے وہ مخلوقات کی صفات سے بالا و بلند اور اکبر ہے۔

سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ
برابر ہے تم میں جو آہستہ بات کہے اور جو کہے پکار کر
بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۭ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ
اور جو چھپ رہا ہے رات میں اور جو گلیوں میں پھرتا ہے
بِالنَّهَارِ ﴿۱۰﴾
دن کو

تمہارے اعمال بھی معلوم ہیں:

علم الٰہی کا عموم بیان کر کے بلحاظ مناسبت مقام خاص احوال مکلفین کی نسبت بتلاتے ہیں کہ تمہارے ہر قول و فعل کو ہمارا علم محیط ہے، جو بات تم دل میں چھپاؤ یا آہستہ کہو اور جو علانیہ پکار کر کہو، نیز جو کام رات کی اندھیری میں پوشیدہ ہو کر کرو اور جو دن دیہاڑے برسر بازار کرو، دونوں کی حیثیت علم الٰہی کے اعتبار سے یکساں ہے۔ بعض مفسرین نے آیت کو تین قسم کے آدمیوں پر مشتمل بتلایا ہے۔ مَنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ (جو بات کو چھپائے) مَنْ جَهَرَ بِهٖ (جو ظاہر کرے) مَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۭ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ (جو اپنا کام رات کو چھپائے مثلاً شب کو چوری کرنا اور دن کو ظاہر کرے مثلاً دن میں نمازیں پڑھنا) اللہ تعالیٰ کو سب یکساں طور پر معلوم ہیں۔

لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ
اس کے پہرے والے ہیں بندہ کے آگے سے اور پیچھے سے
خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ
اسکی نگہبانی کرتے ہیں اللہ کے حکم سے

ہر آدمی کے ساتھ فرشتے مقرر ہیں:

یعنی ہر بندہ کے ساتھ خدا کے فرشتے مامور ہیں۔ جن میں بعض اُس کے سب اگلے پچھلے اعمال لکھتے ہیں اور بعضے خدا کے حکم کے موافق اُن بلاؤں کے دفع کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ جن سے حق تعالیٰ بندہ کو بچانا چاہتا ہے۔ جس طرح اس عالم میں خدا کی عام عادت ہے کہ جو چیز پیدا کرنا چاہے اُس کے ظاہری اسباب مہیا کر دیتا ہے، ایسے ہی اُس نے کچھ باطنی اسباب و ذرائع پیدا کئے ہیں جن کو ہماری آنکھیں نہیں دیکھتیں۔ لیکن مشیت الٰہی کی تنفیذ اُن کے واسطہ سے ہوتی ہے۔ (تفسیر عثمانی)

کتنے فرشتے مقرر ہیں:

ازالۃ الخفاء میں کنانہ عدوی کی روایت سے آیا ہے کہ حضرت عثمان بن عفان نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے بتائیے کہ بندے کے ساتھ کتنے فرشتے ہوتے ہیں۔ فرمایا ایک فرشتہ تیرے دائیں ہاتھ کی طرف ہے جو تیری نیکیوں پر مامور ہے اور وہ بائیں ہاتھ والے فرشتے کا سردار ہے جب تو کوئی ایک نیکی کرتا ہے تو وہ دس نیکیاں لکھتا ہے اور جب تو کوئی ایک بدی کرتا ہے تو بائیں ہاتھ والا فرشتہ کہتا ہے میں اس کو لکھ لوں تو دائیں ہاتھ والا کہتا ہے (ابھی ٹھہرو)۔ شاید توبہ و استغفار کر لے جب تین بار ایسا کہہ چکتا ہے تو دائیں ہاتھ والا فرشتہ کہتا ہے اچھا اب لکھ لو اللہ اس سے ہم کو بچائے، یہ بُرا ساتھی ہے نہ اس کو اللہ کا پاس و لحاظ ہے نہ اللہ سے شرم۔ اللہ فرماتا مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ بندہ کوئی لفظ زبان سے نہیں نکالتا مگر ایک محافظ تیار اس کے پاس لکھنے کے لئے موجود رہتا ہے (جو لکھ لیتا ہے) اور دو فرشتے تیرے آگے پیچھے ہیں، اللہ فرماتا ہے لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اور ایک فرشتہ تیری پیشانی پر مسلط ہے جب تو اللہ کے لئے اس کو نیچے رکھتا ہے تو وہ تجھے سر بلند کرتا ہے اور اگر تو غرور کرتا ہے تو وہ تجھے شکست کر دیتا ہے (ذلیل کر دیتا ہے) اور دو فرشتے تیرے لبوں پر مامور ہیں ان کا کام صرف یہ ہے کہ تو نبی پر جو درود پڑھے اس کی نگہداشت کریں اور ایک فرشتہ تیرے منہ کا محافظ ہے کہ سانپ (وغیرہ) کو منہ میں داخل ہونے نہیں دیتا اور دو فرشتے تیری دونوں آنکھوں پر مامور ہیں یہ ہر آدمی کے دس فرشتے ہوئے۔ رات کے فرشتے دن کے فرشتوں پر اترتے ہیں کیونکہ رات کے فرشتے دن کے فرشتوں سے الگ ہیں۔ پس ہر آدمی کے لئے بیس فرشتے ہیں اور ابلیس دن میں ہے اور اس کی اولاد رات کو آتی ہے۔ (از مفسر قدس سرہٗ)

فرشتوں کی ڈیوٹیاں اور کارگزاری:

بغوی نے صحیح سند سے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تم میں رات کے فرشتے اور دن کے فرشتے آگے پیچھے آتے جاتے رہتے ہیں فجر اور عصر کی نماز میں دونوں کا اجتماع ہوتا ہے رات بھر جو فرشتے تم میں رہتے ہیں (فجر کو) جب وہ چڑھ جاتے ہیں تو ان کا رب باوجودیکہ خود بخوبی واقف ہوتا ہے پھر بھی فرشتوں سے پوچھتا ہے تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا۔ فرشتے عرض کرتے ہیں ان کو ہم نے نماز پڑھتے چھوڑا اور جب ہم پہنچے تھے تب بھی وہ نماز پڑھ رہے تھے۔

مجاہد نے کہا ہر بندے پر ایک فرشتہ موکل (مقرر) ہے جو سوتے جاگتے اس کی حفاظت کرتا ہے اور ہر جن وانس اور کیڑے مکوڑے سے اس کی نگہداشت کرتا ہے۔ جو (ضرر رساں) چیز بھی بندے پر آنا چاہتی ہے فرشتہ اس سے کہتا ہے ہٹ پرے جا۔ ہاں اللہ ہی کا حکم کسی چیز کے آپہنچنے کا ہوتا ہے تو وہ چیز پہنچ جاتی ہے۔ کعب احبار نے کہا اگر اللہ فرشتوں کو تم پر مامور نہ کر دیتا جو کھانے پینے اور برہنگی کے وقت تمہارے قریب رہتے ہیں تو جنات تم کو جھپٹ لیتے یا یَحْفَظُوْنَہٗ سے مراد ہے کہ آدمی کے اعمال کی نگرانی کرتے ہیں کرتے ہیں اس مطلب پر معقبات سے مراد ہوں گے وہ دو فرشتے جو دائیں بائیں ہاتھ پر بیٹھے نیکیاں اور بدیاں لکھتے رہتے ہیں۔

عامر بن طفیلی اور اربد بن ربیعہ:

عبدالرحمٰن بن زید نے کہا اس آیت کا نزول عامر بن طفیلی اور اربد بن ربیعہ عامری کے سلسلہ میں ہوا۔ کلبی نے بروایت ابوصالح حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا ہے کہ عامر بن طفیل عامری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے کے ارادے سے چلے۔ آپ مسجد کے اندر صحابہ کی ایک جماعت میں تشریف فرما تھے، دونوں مسجد میں داخل ہوئے۔ عامر بن طفیل کانا تھا مگر تھا بہت ہی حسین خوبصورتی کی وجہ سے لوگ نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ ایک شخص نے عرض کیا یہ عامر بن طفیل آپ کی طرف آرہا ہے، فرمایا آنے دو اگر اللہ کو اس کی بھلائی منظور ہوگی تو اس کو ہدایت کر دے گا۔ عامر آکر کھڑا ہو گیا اور بولا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اگر میں مسلمان ہو جاؤں تو مجھے کیا ملے گا۔ فرمایا جو دوسرے مسلمانوں کے حقوق و فرائض ہوں گے وہی تمہارے ہوں گے (یعنی نفع و نقصان میں تم مسلمانوں کے برابر شریک ہو جاؤ گے) کہنے لگا اپنے بعد یہ حکومت میرے سپرد (کرنے کا وعدہ) کرو تو میں مسلمان ہو جاؤں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کا اختیار مجھے نہیں یہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہے جس طرح چاہے کرے، کہنے لگا تو آپ صحرائیوں (بدویوں اور خانہ بدوشوں) پر مجھے حاکم بنا دیں اور شہریوں (گھروں میں رہنے والوں) پر آپ حاکم رہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ بھی نہیں ہو سکتا بولا پھر آپ مجھے کیا دیں گے؟ فرمایا: میں گھوڑوں کی لگا میں تم کو سپرد کروں گا جن پر سوار ہو کر تم جہاد کرو گے۔ بولا کیا آج تک میرے پاس یہ نہیں ہیں (یعنی گھوڑے تو میرے پاس موجود ہیں جن پر سوار ہو کر میں جنگ کرتا ہوں) اچھا آپ میرے ساتھ اُٹھ کر آئیں میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ کر اس کے ساتھ ہو لئے۔ عامر نے اربد سے کہہ دیا تھا کہ جب تو مجھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ باتوں میں مشغول دیکھے تو ان کے پیچھے آکر تلوار سے حملہ کر دینا چنانچہ عامر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ جھگڑا اور گفتگو میں لوٹ پلٹ کرنے لگا تو اربد حملہ کرنے کے ارادے سے گھوم کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے آ گیا اور ایک بالشت تلوار نیام سے کھینچ بھی لی لیکن اللہ نے اس کو روک دیا اور وہ پوری تلوار نہ کھینچ سکا عامر اس کی طرف اشارے بھی کرتا رہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو منہ پھیر کر اربد کو دیکھا اور تلوار نکالنے کی کوشش میں مشغول پایا تو دعا کی، اے اللہ جس طرح تو چاہے میری طرف سے ان کا کام تمام کر دے (یعنی مجھے ان کا تدارک نہ کرنا پڑے تو غیب سے ان کو ختم کر دے) اس روز ابر نام کو نہ تھا دن سخت گرمی کا تھا اور فضا صاف تھی لیکن یکدم اربد پر بجلی ٹوٹ پڑی اور اس کو سوختہ کر دیا۔ عامر پیٹھ پھیر کر بھاگا اور کہنے لگا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو نے اپنے رب سے دعا کی اس نے اربد کو مار ڈالا خدا کی قسم میں تیرے اوپر اتنے کم مو گھوڑے اور نوجوان (سوار) چڑھا کر لاؤں گا کہ اس سارے میدان کو فوج سے بھر دوں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تجھے ایسا کرنے ہی نہ دے گا اور قبلہ کی دونوں شاخیں یعنی قبائل اوس وخزرج بھی تجھے ایسا نہ کرنے دیں گے (ان کی موجودگی میں تو کچھ نہیں کر سکتا) غرض عامر جا کر ایک سلولیہ عورت کے گھر جا کر اترا اور صبح کو اٹھ کر ہتھیار باندھے چہرہ کا رنگ بدلا ہوا تھا گھوڑے پر سوار ہو کر گھوڑے کو ایڑھ لگائی اور دوڑاتا ہوا صحرا میں پہنچا اور غرور سے کہنے لگا اے موت کے فرشتے میرے سامنے نکل کر آ۔ پھر کچھ شعر پڑھنے لگا، اور بولا قسم ہے لات و عزیٰ کی اگر دو پہر تک میں محمد اور اس کے ساتھی یعنی ملک الموت تک پہنچ گیا تو اپنا یہ برچھا۔ دونوں کے آر پار کر دوں گا۔ اللہ نے ایک فرشتہ بھیجا جس نے اپنے پر کی ایک چھپٹ اس کے منہ پر رسید کی اور عامر چکرا کر زمین پر گر پڑا اور اسی وقت اس کی زانوں پر ایک گلٹی نکل آئی مجبوراً سلولیہ عورت کے گھر لوٹ آیا اور کہنے لگا اونٹ کی گلٹی اور اور سلولیہ کے گھر میں موت۔ پھر گھوڑا منگوا کر سوار ہوا اور دوڑتا ہوا چل دیا آخر گھوڑے کی پشت پر مر گیا اور اسی طرح اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاء قبول فرمائی۔

طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ اربد بن قیس اور عامر بن طفیل مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، عامر نے کہا محمد اگر میں مسلمان ہو جاؤں تو آپ مجھے کیا دیں گے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو مسلمانوں کا فائدہ ہوگا وہ تمہارا بھی ہوگا اور جو مسلمانوں پر فرض ہوگا وہ تم پر بھی ہوگا۔ عامر نے کہا کیا اپنے بعد آپ میرے لئے یہ حکومت مقرر کر دیں گے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ نہ تم کو ملے گی نہ تمہاری قوم کو یہ سن کر عامر نے اربد سے (چپکے سے) کہا میں محمد کو باتوں میں لگالوں گا تم تلوار سے ان پر حملہ کر دینا غرض اس کے بعد دونوں لوٹ گئے (چلتے وقت) عامر نے کہا محمد ذرا میرے ساتھ اٹھ کر چلو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ کھڑے ہوئے اور کھڑے اس سے باتیں کرنے لگے، اربد نے تلوار سونت لی اور قبضہ پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ ہاتھ سوکھ گیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گردن پھیر کر اس کو دیکھ لیا پھر دونوں کو چھوڑ کر آپ واپس چلے آئے۔ دونوں چلے گئے جب مقام رقم میں پہنچے تو بحکم خدا اربد پر بجلی ٹوٹ پڑی اور بجلی نے اس کو ہلاک کر دیا اس پر اللہ نے آیات اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى .... شَدِيْدُ الْمِحَالِ تک نازل فرمائیں۔ (تفسیر مظہری)

صحیح بخاری کی حدیث میں ہے کہ فرشتوں کی دو جماعتیں حفاظت کے لئے مقرر ہیں ایک رات کے لئے دوسری دن کے لئے اور یہ دونوں جماعتیں صبح اور عصر کی نمازوں میں جمع ہوتی ہیں صبح کی نماز کے بعد رات کے محافظ رخصت ہو جاتے ہیں، دن کے محافظ کام سنبھال لیتے ہیں، اور عصر کی نماز کے بعد یہ رخصت ہو جاتے ہیں، رات کے فرشتے ڈیوٹی پر آ جاتے ہیں۔

حفاظت کے فرشتے:

ابوداؤد کی ایک حدیث میں ہے .... بروایت علی مرتضیٰؓ مذکور ہے، کہ ہر انسان کے ساتھ کچھ حفاظت کرنے والے فرشتے مقرر ہیں جو اس کی حفاظت کرتے رہتے ہیں کہ اس کے اوپر کوئی دیوار وغیرہ نہ گر جائے، یا کسی گڑھے اور غار میں نہ گر جائے، یا کوئی جانور یا انسان اس کو تکلیف نہ پہنچائے، البتہ جب حکم الٰہی کسی انسان کو بلاء و مصیبت میں مبتلا کرنے کے لئے نافذ ہو جاتا ہے تو محافظ فرشتے وہاں سے ہٹ جاتے ہیں۔ (روح المعانی)

ابن جریر کی ایک حدیث سے بروایت عثمان غنیؓ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان محافظ فرشتوں کا کام صرف دنیاوی مصائب اور تکلیفوں ہی سے حفاظت نہیں بلکہ وہ انسان کو گناہوں سے بچانے اور محفوظ رکھنے کی بھی کوشش کرتے ہیں، انسان کے دل میں نیکی اور خوف خدا کا داعیہ بیدار کرتے رہتے ہیں، جس کے ذریعہ وہ گناہ سے بچے، اور اگر پھر بھی وہ فرشتوں کے الہام سے غفلت برت کر گناہ میں مبتلا ہی ہو جائے تو وہ اس کے لئے دعاء اور کوشش کرتے ہیں کہ یہ جلد توبہ کر کے گناہ سے پاک ہو جائے، پھر اگر وہ کسی طرح متنبہ نہیں ہوتا تب وہ اس کے نامۂ اعمال میں گناہ کا کام لکھ دیتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ محافظ فرشتے دین و دنیا دونوں کی مصیبتوں اور آفتوں سے انسان کی سوتے جاگتے حفاظت کرتے رہتے ہیں، حضرت کعب احبارؒ فرماتے ہیں کہ اگر انسان سے یہ حفاظتِ خداوندی کا پہرہ ہٹا دیا جائے تو جنات ان کی زندگی وبال کر دیں، لیکن یہ سب حفاظتی پہرے اُسی وقت تک کام کرتے ہیں جب تک تقدیر الٰہی ان کی حفاظت کی اجازت دیتی ہے، اور جب اللہ تعالیٰ ہی کسی بندہ کو مبتلا کرنا چاہیں تو یہ حفاظتی پہرا ہٹ جاتا ہے۔ (معارف القرآن مفتی اعظم)

ابن عباسؓ فرماتے ہیں یہ دنیا کے بادشاہوں امیروں وغیرہ کا ذکر ہے جو پہرے چوکی میں رہتے ہیں۔ ضحاک فرماتے ہیں کہ سلطان اللہ کی نگہبانی میں ہوتا ہے امر اللہ سے یعنی مشرکین اور ظاہرین سے، واللہ اعلم ممکن ہے غرض اس قول سے یہ ہو کہ جیسے بادشاہوں امیروں کی چوکیداری سپاہی کرتے ہیں اسی طرح بندے کے چوکیدار خدا کی طرف سے مقرر شدہ ہوتے ہیں۔

دس فرشتے:

ایک غریب روایت میں تفسیر ابن جریر میں وارد ہوا ہے کہ حضرت عثمانؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپ سے دریافت کیا کہ فرمایئے بندے کے ساتھ کتنے فرشتے ہوتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ایک تو دائیں جانب نیکیوں کا لکھنے والا جو بائیں جانب والے پر امیر ہے۔ جب تو کوئی نیکی کرتا ہے وہ ایک کے بجائے دس لکھ لی جاتی ہیں۔ جب تو کوئی برائی کرے تو بائیں والا دائیں والے سے اس کے لکھنے کی اجازت طلب کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے ذرا ٹھیر جاؤ شاید توبہ و استغفار کر لے۔ تین مرتبہ وہ اجازت مانگتا ہے۔ تب تک بھی اگر اس نے توبہ نہ کی تو یہ نیکی کا فرشتہ اس سے کہتا ہے اب لکھ لے، اللہ ہمیں اس سے چھڑائے، تو یہ بڑا برا ساتھی ہے، اسے خدا کا لحاظ نہیں، یہ اس سے نہیں شرماتا۔ اللہ کا فرمان ہے کہ انسان جو بات زبان پر لاتا ہے اس پر نگہبان متعین اور مہیا ہیں اور دو فرشتے تیرے آگے پیچھے ہیں۔ فرمان خدا ہے لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ الخ اور ایک فرشتہ تیرے ماتھے کے بال تھامے ہوئے ہے۔ جب تو خدا کے لئے تواضع اور فروتنی کرتا ہے وہ تجھے بلند درجہ کر دیتا ہے اور جب تو اللہ کے سامنے سرکشی اور تکبر کرتا ہے وہ تجھے پست اور عاجز کر دیتا ہے اور دو فرشتے تیرے ہونٹوں پر ہیں، جو درود تو مجھ پر پڑھتا ہے اور اس کی وہ حفاظت کرتے ہیں۔ ایک فرشتہ تیرے منہ پر کھڑا ہے کہ کوئی سانپ وغیرہ جیسی چیز تیرے حلق میں نہ چلی جائے اور دو فرشتے تیری آنکھوں پر ہیں۔ پس یہ دس فرشتے ہر بنی آدم کے ساتھ ہیں۔ پھر دن کے الگ ہیں اور رات کے الگ ہیں۔ یوں ہر شخص کے ساتھ بیس فرشتے من جانب اللہ موکل ہیں۔ ادھر بہکانے کیلئے دن بھر تو ابلیس کی ڈیوٹی رہتی ہے اور رات کو اس کی اولاد کی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرشتہ:

مسند احمد میں ہے تم میں سے ہر ایک کے ساتھ جن ساتھی ہے اور فرشتہ ساتھی

ہے۔لوگوں نے کہا آپ کے ساتھ بھی؟ فرمایا ہاں لیکن اللہ نے اس پر میری مدد کی ہے، وہ مجھے بھلائی کے سوا کچھ نہیں کہتا (مسلم) یہ فرشتے بحکم خدا اس کی نگہبانی رکھتے ہیں۔بعض قراءتوں میں مِنْ اَمْرِ اللّٰہِ کے بدلے بامر اللہ ہے۔

اگر فرشتے نہ ہوں

کعبؒ کہتے ہیں اگر ابن آدم کے لئے ہر نرم وسخت کھل جائے تو البتہ ہر چیز اسے خود نظر آنے لگے اور اگر اللہ کی طرف سے یہ محافظ فرشتے مقرر نہ ہوں جو کھانے پینے اور شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں تو واللہ تم تو اچک لئے جاؤ۔

تقدیر اور تدبیر:

ابوامامہؓ فرماتے ہیں ہر آدمی کے ساتھ محافظ فرشتہ ہے جو تقدیری امور کے سوا کی اور تمام بلاؤں کو اس سے دفع کرتا رہتا ہے۔ ایک شخص قبیلہ مراد کا حضرت علیؓ کے پاس آیا۔انہیں نماز میں مشغول دیکھا تو کہا کہ قبیلہ مراد کے آدمی آپ کے قتل کا ارادہ کر چکے ہیں آپ پہرہ چوکی مقرر کر لیجئے۔آپ نے فرمایا ہر شخص کے ساتھ دو فرشتے اس کے محافظ مقرر ہیں، بغیر تقدیر کے لکھے کسی برائی کو انسان تک پہنچنے نہیں دیتے۔ سنو، اجل ایک مضبوط قلعہ ہے اور عمدہ ڈھال ہے۔اور کہا گیا ہے کہ بحکم خدا امرِ خدا سے اس کی حفاظت کرتے رہتے ہیں۔ جیسے حدیث شریف میں ہے، لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یہ جھاڑ پھونک جو ہم کرتے ہیں کیا اس سے خدا کی مقرر کی ہوئی تقدیر ٹل جاتی ہے؟ آپ نے فرمایا وہ خود اللہ کی مقرر کردہ ہے۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا

اللہ نہیں بدلتا کسی قوم کی حالت کو جب تک وہ نہ بدلیں

مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ وَ اِذَاۤ اَرَادَ اللّٰہُ بِقَوْمٍ

جو ان کے جیوں میں ہے، اور جب چاہتا ہے

سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ

اللہ کسی قوم پر آفت پھر وہ نہیں پھرتی، اور کوئی نہیں ان کا اس کے

مِنْ وَّالٍ ﴿۱۱﴾

سوا مددگار

قوموں کا عروج وزوال:

یعنی اللہ تعالیٰ اپنی نگہبانی اور مہربانی سے جو ہمیشہ اُس کی طرف سے ہوتی رہتی ہے کسی قوم کو محروم نہیں کرتا۔ جب تک وہ اپنی روش اللہ کے ساتھ نہ بدلے۔ جب بدلتی ہے تو آفت آتی ہے۔ پھر کسی کے ٹالے نہیں ٹلتی۔ نہ کسی کی مدد اُس وقت کام دیتی ہے۔ (تنبیہ) یہاں قوموں کے عروج وزوال کا قانون بتایا ہے، اشخاص وافراد کا نہیں۔قوم کی اچھی بُری حالت متعین کرنے میں اکثریت اور غلبہ کا لحاظ ہوتا ہے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

یہ شعر مشہور ہے

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ جو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

یہ بات اگرچہ ایک حد تک صحیح ہے، مگر آیت مذکورہ کا یہ مفہوم نہیں، اور اس کا صحیح ہونا بھی ایک عام قانون کی حیثیت سے ہے کہ جو شخص خود اپنے حالات کی اصلاح کا ارادہ نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی اس کی امداد ونصرت کا وعدہ نہیں، بلکہ یہ وعدہ اسی حالت میں ہے جب کوئی خود بھی اصلاح کی فکر کرے جیسا کہ آیت کریمہ اَلَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ہدایت کے راستے جب ہی کھلتے ہیں جب خود ہدایت کی طلب موجود ہو، لیکن انعاماتِ الٰہیہ اس قانون کے پابند نہیں، بسا اوقات اس کے بغیر بھی عطا ہو جاتے ہیں

دادِ حق را قابلیت شرط نیست   بلکہ شرطِ قابلیت داد ہست

خود ہمارا وجود اور اس میں بیشمار نعمتیں نہ ہماری کوشش کا نتیجہ ہیں نہ ہم نے کبھی اس کے لئے دعا مانگی تھی کہ ہمیں ایسا وجود عطا کیا جائے جس کی آنکھ، ناک، کان، اور سب قویٰ واعضاء درست ہوں، یہ سب نعمتیں بے مانگے ہی ملی ہیں

مانبودیم و تقاضا ما نبود   لطفِ تو نا گفتۂ ما می شنود

(معارف کاندھلویؒ)

هُوَ الَّذِیْ یُرِیْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا

وہی ہے کہ تم کو دکھلاتا ہے بجلی ڈر (ڈرانے کو) کو اور امید کو

وَّ یُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ﴿۱۲﴾ ۚ

اور اٹھاتا ہے بادل بھاری

شانِ انعام وانتقام:

پہلے بندوں کی حفاظت کا ذکر تھا، پھر بداعمالیوں سے جو آفت ومصیبت آتی ہے اُس کا ذکر ہوا، معلوم ہوا کہ خدا کی ذات شانِ انعام وانتقام دونوں کی جامع ہے۔اسی مناسبت سے یہاں بعض ایسے نشاناہائے قدرت کی طرف توجہ دلائی جن میں بیک وقت اُمید وخوف کی دو متضاد کیفیتیں پیدا کرنے کی صلاحیت ہے یعنی جب بجلی چمکتی ہے تو اُمید بندھتی ہے کہ بارش آئیگی۔اور ڈر بھی لگتا ہے کہ

کہیں گر کر ہلاکت کا سبب نہ بن جائے۔ بھاری بادل پانی کے بھرے ہوئے آتے ہیں تو خوشی ہوتی ہے کہ بارانِ رحمت کا نزول ہوگا، ساتھ ہی فکر رہتی ہے کہ پانی کا طوفان نہ آجائے، ٹھیک اسی طرح انسان کو چاہئے کہ رحمتِ الٰہی کا اُمیدوار رہے مگر مکر اللہ سے مامون اور بے فکر نہ ہو۔

وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ
اور پڑھتا ہے گرجنے والا خوبیاں اسکی اور سب فرشتے
خِيفَتِهٖ ج
اس کے ڈر سے

کڑک اور بجلی:

یعنی گرجنے والا بادل یا فرشتہ زبانِ "حال" یا "قال" سے حق تعالیٰ کی تسبیح وتحمید کرتا ہے۔ "وان من شئی اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ" (بنی اسرائیل۔ رکوع ۵) اور تمام فرشتے ہیبت وخوف کے ساتھ اُس کی حمد وثناء اور تسبیح وتمجید میں مشغول رہتے ہیں۔ (تنبیہ) "رعد" و "برق" وغیرہ کے متعلق آج کل کی تحقیق یہ ہے کہ بادلوں میں "قوت کہربائیہ موجبہ" پائی جاتی ہے اور زمین میں "کہربائیہ سالب" جو بادل زمین سے زیادہ نزدیک ہو اُس میں گاہ بگاہ زمین کی "سالب کہربائیہ" سرایت کر جاتی ہے۔ پھر اُس بادل کے اوپر بسا اوقات وہ بادل گذرتے ہیں جن میں "کہربائیہ موجبہ" موجود ہے۔ اور یہ قاعدہ تجربہ سے معلوم ہو چکا ہے کہ مختلف قسم کے "کہربائیہ" رکھنے والے دو جسم جب محاذی ہوں تو ہر ایک اپنے اندر دوسرے کی "کہربائیہ" کو جذب کرتا ہے تاکہ دونوں کی کہربائیہ متحد ہو جائے۔ اسی قاعدہ سے اوپر نیچے والے بادل جب ایک دوسرے کی قوتِ کہربائیہ کو اپنی طرف کھینچتے ہیں تو دونوں کے مل جانے سے شدید حرارت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اُس حرارت شدیدہ سے دونوں بادلوں کے حجم کے مناسب ایک آتشیں شعلہ اٹھتا ہے جو "صاعقہ" کہلاتا ہے اسی صاعقہ کی چمک اور روشنی "برق" کہلاتی ہے اور ہوا میں اُس کے سرایت کرنے سے جو آواز نکلتی ہے وہ "رعد" ہے۔ "کہربا" کا یہی آتشیں شرارہ کبھی بادلوں اور ہواؤں کو پھاڑ کر نیچے گرتا ہے۔ جس کے نہایت عجیب وغریب افعال وآثار مشاہدہ کئے گئے ہیں، علاوہ اس کے کہ وہ مکانوں کو گراتا، پہاڑوں کو شق کرتا اور جانداروں کی ہلاکت کا سبب بنتا ہے۔ بعض اوقات دیکھا گیا ہے کہ اس نے نہایت احتیاط سے ایک آدمی کے بدن سے کپڑے اُتار کر کسی درخت کی شاخ پر رکھ دیے ہیں مگر پہننے والے کے جسم کو کچھ صدمہ نہیں پہنچا۔ (دائرۃ المعارف فرید وجدی) جسے دیکھ کر خیال گذرتا ہے کہ بجلی کے اس آتشیں شعلہ میں کوئی ذی شعور اور ذی اختیار قوت غیر مرئی طریقہ سے کام کر رہی ہے۔ ہم کو ضرورت نہیں کہ اوپر بیان کئے ہوئے "نظریہ" کا انکار کریں۔ لیکن یہ بیان کرنے والے خود اقرار کرتے ہیں کہ "روح" کی طرح "قوت کہربائیہ" کی اصل حقیقت پر بھی اس وقت تک پردہ پڑا ہوا ہے۔ انبیاء علیہم السلام اور دوسرے اربابِ کشف وشہود کا بیان یہ ہے کہ تمام نظامِ عالم میں ظاہری اسباب کے علاوہ باطنی اسباب کا ایک عظیم الشان سلسلہ کارفرما ہے جو کچھ ہم یہاں دیکھتے ہیں وہ صرف صورت ہے لیکن اس صورت میں جو غیر مرئی حقیقت پوشیدہ ہے اُس کے ادراک تک عام لوگوں کی رسائی نہیں۔ صرف باطنی آنکھ رکھنے والے اُسے دیکھتے ہیں۔ آخر تم جو نظریات بیان کرتے ہو (مثلاً یہ ہی قوت کہربائیہ کا موجبہ سالبہ ہونا وغیرہ) اس کا علم بھی چند حکمائے طبیعین کے سوا بلا واسطہ کس کو ہوتا ہے۔ کم از کم اتنا ہی وثوق انبیاء کے مشاہدات وتجربات پر کر لیا جائے تو بہت سے اختلافات مٹ سکتے ہیں۔ احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ دوسرے نوامیس طبیعیہ کی طرح بادلوں اور بارشوں کے انتظامات پر بھی فرشتوں کی جماعتیں تعینات ہیں جو بادلوں کو مناسب مواقع پر پہنچانے اور ان سے حسب ضرورت ومصلحت کام لینے کی تدبیر کرتی ہیں۔ اگر تمہارے بیان کے موافق بادل اور زمین وغیرہ کی "کہربائیہ" کا مدبر کوئی غیر مرئی فرشتہ ہو تو انکار کی کونسی وجہ ہے؟ جس کو تم "شرارۂ کہربائیہ" کہتے ہو۔ چونکہ وہ فرشتے کے خاص تصرف سے پیدا ہوتا ہے لہٰذا اُسے وحی کی زبان میں "مخاریق من نار" (فرشتہ کا آتشیں کوڑا) کہہ دیا گیا تو کیا قیامت ہوگئی۔ اس کی شدت اور سخت اشتعال سے جو گرج اور کڑک پیدا ہوئی اگر حقیقت کو لحاظ کرتے ہوئے اُسے فرشتے کی ڈانٹ سے تعبیر فرمایا تو یہ نہایت ہی موزوں تعبیر ہے۔ بہر حال "سائنس" نے جس چیز کی محض صورت کو سمجھا۔ "وحی" نے اسکی روح اور حقیقت پر مطلع کر دیا۔ کیا ضرورت ہے کہ خواہ مخواہ دونوں کو ایک دوسرے کا حریف مقابل قرار دے لیا جائے۔ علامہ محمود آلوسیؒ نے "بقرہ" کے شروع میں اس پر معقول بحث کی ہے۔ فلیراجع۔ (تفسیر عثمانی)

گناہ چھوڑنے پر اللہ رحمت بھیجتے ہیں:

ابن عبد الملک کہتے ہیں کہ کوفے کے منبر پر حضرت علیؓ نے ہمیں خطبہ دیا۔ جس میں فرمایا کہ اگر میں چپ رہتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بات شروع کرتے اور جب میں پوچھتا تو آپ مجھے جواب دیتے۔ ایک دن آپ نے مجھ سے فرمایا خدائے تعالیٰ فرماتا ہے، مجھے قسم ہے اپنی عزت وجلال کی اپنی بلندی کی

جوعرش پر ہے کہ جس بستی کے جس گھر کے لوگ میری نافرمانیوں میں مبتلا ہوں پھر انہیں چھوڑ کر میری فرمانبرداری میں لگ جائیں تو میں بھی اپنے عذاب اور دکھ ان سے ہٹا کر اپنی رحمت اور سکھ انہیں عطا فرماتا ہوں۔ یہ حدیث غریب ہے اور اس کی سند میں ایک راوی غیر معروف ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

رعد و برق کی تسبیح:

وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ: اور اس کے خوف سے رعد اور دوسرے فرشتے اس کی پاکی اس کی تعریف کے ساتھ ساتھ بیان کرتے ہیں۔ یعنی سبحان اللّٰہ وبحمدہٖ کہتے ہیں۔ ترمذی اور نسائی نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا اور ترمذی نے اس کو صحیح بھی کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رعد کے متعلق دریافت کیا گیا تو فرمایا وہ ایک فرشتہ ہے جو بادل پر مامور ہے اس کے پاس آگ کے کوڑے ہوتے ہیں جن سے بادلوں کو ہنکاتا ہے۔

مِنْ خِيْفَتِهٖ اللہ کے خوف سے۔ خیفتہ کی ضمیر اللہ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ بعض نے کہا الملائکہ سے مراد وہ فرشتے ہیں جو رعد کے مددگار اور اس کے زیر حکم ہیں اس صورت میں من خیفتہ کی ضمیر اور رعد کی طرف لوٹائی جا سکتی ہے یعنی رعد کے خوف سے اس کے مددگار تسبیح کرتے ہیں۔

کڑک کے وقت کی دُعاء:

حضرت ابن عباس نے فرمایا جو شخص رعد کی آواز سن کر سبحان الذی یسبح الرعد بحمدہٖ والملائکۃ من خیفتہ وھو علی کل شئی قدیر پڑھے اور (بالفرض) اس پر بجلی گر پڑے تو وہ اپنے دین (اسلام) پر مرے گا۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رعد کی آواز سن کر باتیں کرنا چھوڑ دیتے تھے اور کہتے تھے سبحان من یسبح الرعد بحمدہٖ والملائکۃ من خیفتہ اور فرماتے تھے یہ زمین والوں کے لئے سخت دھمکی ہے۔

کڑک کیسے پیدا ہوتی ہے:

ترمذی، احمد اور نسائی نے بیان کیا اور ترمذی نے اس کو صحیح قرار دیا کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا یہودیوں نے حاضر ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا بتایئے رعد کیا ہے۔ فرمایا بادل کے فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے جس طرف اللہ حکم دیتا ہے وہ بادل کو ہنکاتا ہے بولے یہ آواز کیسی ہوتی ہے جو ہم کو سنائی دیتی ہے۔ فرمایا یہ اس کی آواز ہوتی ہے۔ ابن مردویہ نے حضرت جابر کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک فرشتہ ابر پر مامور ہے جو نافرمان بادلوں کو جمع کرتا ہے اسکے ہاتھ میں کوڑا ہے جب وہ کوڑا اٹھاتا ہے تو چمک پیدا ہو جاتی ہے جب ڈانٹتا ہے تو گرج پیدا ہوتی ہے اور جب مارتا ہے تو بجلی گرتی ہے۔ (از مفسر قدس سرہٗ)

جویبر نے ضحاک کی روایت سے بیان کیا کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا رعد (فرشتہ) بادلوں پر مامور ہے جہاں حکم ہوتا ہے بادلوں کو چلاتا ہے اور پانی کے سمندر اس کے انگوٹھے گڑھے میں (بھرے ہوئے) ہیں اور وہ اللہ کی پاکی بیان کرتا ہے اور جب وہ پاکی بیان کرتا ہے تو آسمان کا کوئی فرشتہ ایسا باقی نہیں رہتا جو اس کی تسبیح کے ساتھ خود بھی بلند آواز سے تسبیح نہ کرے اس وقت بارش اترتی ہے۔ حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارے رب نے فرمایا اگر میرے بندے میرے حکم پر چلتے تو میں رات میں ان کو بارش سے سیراب کرتا اور دن میں ان پر دھوپ نکال دیتا (تا کہ ان کے کاروبار کا نقصان نہ ہو۔ مترجم) اور ان کو رعد کی آواز بھی نہ سناتا (کہ وہ خوف زدہ ہو جائیں۔) (رواہ احمد بسند صحیح والحاکم) بیضاوی نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا کہ اسکو سننے والے تسبیح اور تحمید کرتے ہیں اور پکار کر کہتے ہیں سبحان اللّٰہ والحمد للّٰہ. یا یہ مطلب ہے کہ رعد تسبیح کرتا ہے یعنی بادل کی گرج اللہ کی وحدانیت اور کمال قدرت پر دلالت کرتی ہے اور اس کے فضل و نزول رحمت کا بھی اظہار کرتی ہے۔ میں کہتا ہوں یہ مطلب اس وقت ہوگا جب رعد کا فرشتہ ہونا ثابت نہ ہو۔ (تفسیر مظہری)

وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا مَنْ
اور بھیجتا ہے کڑک بجلیاں پھر ڈالتا ہے جس پر چاہے
يَّشَآءُ وَهُمْ يُجَادِلُوْنَ فِي اللّٰهِ وَهُوَ
اور یہ لوگ جھگڑتے ہیں اللہ کی بات میں اور اس کی
شَدِيْدُ الْمِحَالِ ؕ﴿۱۳﴾
آن (پکڑ) سخت ہے

ایک گستاخ کو نقد سزا:

ان جھگڑنے والوں پر عذاب کی بجلی نہ گرا دے۔ حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے ایک متکبر رئیس کے پاس آدمی بھیجا کہ اُسے میرے پاس بُلا لاؤ۔ قاصد نے اس کو کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تجھے بُلاتے ہیں کہنے لگا رسول اللہ کون ہے؟ اور اللہ کیا چیز ہے؟ سونے کا ہے یا چاندی کا، یا تانبے کا؟ (العیاذ باللہ) تین مرتبہ یہی گفتگو کی۔ تیسری مرتبہ جب وہ یہ گستاخانہ کلمات بک رہا تھا، ایک بادل اُٹھا فوراً بجلی گری اور اُس کی کھوپڑی سر سے جُدا کر دی۔ بعض روایات میں ہے کہ عامر بن طفیل اور اربد بن ربیعہ نے

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ ہم اسلام لاتے ہیں بشرطیکہ آپ کے بعد خلافت ہم کو ملے آپ نے انکار فرما دیا۔ دونوں یہ کہہ کر اُٹھے کہ ہم "مدینہ" کی وادی کو آپ کے مقابلہ میں پیدل اور سواروں سے بھر دیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ اُس کو روک دے گا اور "انصار مدینہ" روکیں گے۔ وہ دونوں چلے، راستہ میں "اربد" پر بجلی گری اور عامر طاعون کی گلٹی سے ہلاک ہوا۔ (فائدہ) رعد کی آواز سن کر کہنا چاہئے۔ "سبحان من يسبح الرعد بحمده والملائكة من خيفته اللهم لا تقتلنا بغضبك ولا تهلكنا بعذابك وعافنا قبل ذلك" (تفسیر عثمانیؒ)

خوف اور امید:

ابن عباسؓ نے ایک سائل کے جواب میں کہا تھا کہ برق پانی ہے۔ مسافر اسے دیکھ کر اپنی ایذا اور مشقت کے خوف سے گھبراتا ہے اور مقیم برکت و نفع کی اُمید پر رزق کی زیادتی کا لالچ کرتا ہے وہی بوجھل بادلوں کو پیدا کرتا ہے جو بوجہ پانی کے بوجھ کے زمین سے قریب آ جاتے ہیں۔ پس ان میں بوجھ پانی کا ہوتا ہے۔ پھر فرمایا کہ کڑک بھی اس کی تسبیح و تعریف کرتی ہے۔ اور جگہ ہے کہ ہر چیز اللہ کی تسبیح و حمد کرتی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ بادل پیدا کرتا ہے جو اچھی طرح بولتے ہیں اور ہنستے ہیں۔ ممکن ہے بولنے سے مراد گرجنا اور ہنسنے سے مراد بجلی کا ظاہر ہونا ہو۔ سعد ابن ابراہیم کہتے ہیں اللہ تعالیٰ بارش بھیجتا ہے اور اس سے اچھی بولی اور اس سے اچھی ہنسی والا کوئی اور نہیں۔ اس کی ہنسی بجلی ہے اور اس کی گفتگو گرج ہے۔

برق فرشتہ:

محمد بن مسلم کہتے ہیں کہ ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ برق ایک فرشتہ ہے جس کے چار منہ ہیں ایک انسان جیسا ایک بیل جیسا ایک گدھا جیسا ایک شیر جیسا۔ وہ جب دم ہلاتا ہے تو بجلی ظاہر ہوتی ہے۔

اگر بندے نافرمان نہ ہوتے:

مسند احمد میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ تمہارا رب العزت فرماتا ہے اگر میرے بندے میری پوری اطاعت کرتے تو میں راتوں کو بارشیں برساتا اور دن کو سورج چڑھاتا اور انہیں گرج کی آواز تک نہ سناتا۔ طبرانی میں ہے آپ فرماتے ہیں گرج سن کر اللہ کا ذکر کرو۔ کیونکہ ذکر کرنے والوں پر کڑاکا نہیں گرتا۔ وہ کڑاکا بھیجتا ہے جسے چاہے اس پر عذاب کرتا ہے۔ اس لئے آخر زمانہ میں بکثرت بجلیاں گریں گی۔ مسند کی حدیث میں ہے کہ قیامت کے قریب بجلی بکثرت گرے گی۔ یہاں تک کہ ایک شخص اپنی قوم سے آ کر پوچھے گا کہ صبح کس پر بجلی گری؟ وہ کہیں گے فلاں فلاں پر۔ (تفسیر ابن کثیر)

لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ؕ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ
اسی کا پکارنا سچ ہے اور جن لوگوں کو کہ پکارتے ہیں
دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ
اسکے سوا وہ نہیں کام آتے اُن کے کچھ بھی مگر جیسے کسی نے پھیلائے
كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ؕ
دونوں ہاتھ پانی کی طرف کہ آ پہنچے اسکے منہ تک اور وہ کبھی نہ پہنچے
وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿۱۴﴾
گا اس تک اور جتنی پکار ہے کافروں کی سب گمراہی ہے

غیر اللہ کو پکارنا بے سود ہے:

یعنی پکارنا اسی کو چاہئے جو ہر قسم کے نفع و ضرر کا مالک ہے۔ عاجز کو پکارنے سے کیا حاصل؟ اللہ کے سوا کون ہے جس کے قبضہ میں اپنا یا دوسروں کا نفع و ضرر ہے؟ غیر اللہ کو اپنی مدد کے لئے بُلانا ایسا ہے جیسے کوئی پیاسا کنوئیں کی من پر کھڑا ہو کر پانی کی طرف ہاتھ پھیلائے اور خوشامد کرے کہ میرے منہ میں پہنچ جا۔ ظاہر ہے قیامت تک پانی اُس کی فریاد کو پہنچنے والا نہیں۔ بلکہ اگر پانی اُس کی مٹھی میں ہو تب بھی خود چل کر منہ تک نہیں جا سکتا۔ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ "کافر جن کو پکارتے ہیں بعضے محض خیالات و اوہام ہیں بعضے جن اور شیاطین ہیں اور بعضی چیزیں ہیں کہ اُن میں کچھ خواص ہیں۔ لیکن اپنے خواص کی مالک نہیں۔ پھر اُنکے پکارنے سے کیا حاصل؟ جیسے آگ یا پانی اور شاید ستارے بھی اسی قسم میں ہوں۔" (تفسیر عثمانیؒ)

دعوتِ حق:

یہ بھی کہا گیا ہے کہ حق سے مراد اللہ ہے۔ اللہ کی ہر پکار حق کی طرف بلاوا ہے۔ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا دعوتِ حق توحید ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا دعوتِ حق لا الہ الا اللہ کی شہادت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ ہی کے لئے خاص ہے توحید اور شہادت کی دعوت۔

وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ (ظاہر ہے کہ) پانی اس کے منہ تک اُڑ کر پہنچنے والا نہیں وہ تو بے جان اور بے شعور چیز ہے اس کو معلوم بھی نہیں کہ کون اس کو پکار رہا ہے نہ وہ کسی کے بلاوے کو قبول کر سکتا اور نہ دعوت پر آ سکتا ہے۔ کافروں کے معبودوں کی بھی یہی حالت ہے کافر بتوں کو پکارتے ہیں بتوں کو ان کی پکار کا پتہ بھی نہیں ہوتا وہ بے شعور و بے جان ہیں وہ ان کی دعا قبول نہیں کر سکتے۔

مطلب کی یہ تشریح مجاہد اور عطانے کی ہے اور حضرت علی سے بھی یہی تفسیر منقول ہے۔ (تفسیر مظہری)

وَلِلّٰهِ يَسۡجُدُ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ طَوۡعًا
اور اللہ کو سجدہ کرتا ہے جو کوئی ہے آسمان اور زمین میں خوشی سے
وَّكَرۡهًا وَّظِلٰلُهُمۡ بِالۡغُدُوِّ وَالۡاٰصَالِ ﴿۱۵﴾
اور زور سے اور ان کی پرچھائیاں صبح اور شام

ہر چیز اللہ کو سجدہ کرتی ہے:

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں "جو اللہ پر یقین لایا خوشی سے سر رکھتا ہے اُس کے حکم پر اور جو نہ یقین لایا آخر اُس پر بھی بے اختیار اُسی کا حکم جاری ہے اور پرچھائیاں صبح اور شام زمین پر پسر جاتی ہیں یہی ہے اُن کا سجدہ۔" مطلب یہ ہے کہ جواہر ہوں یا اعراض کوئی چیز اللہ کے حکم سے تکوینی سے باہر نہیں ہو سکتی اُس کے نفوذ واقتدار کے سامنے سب منقاد اور سربسجود ہیں۔ سایہ کا گھٹنا بڑھنا داہنے بائیں مائل ہونا سب اسی کے ارادہ اور مشیت سے ہے۔ صبح شام کا ذکر شاید اس لئے کیا کہ ان وقتوں میں زمین پر سایہ کا پھیلاؤ زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

قُلۡ مَنۡ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ قُلِ
پوچھ کون ہے رب آسمان اور زمین کا کہدے اللہ ہے کہہ
اللّٰهُ ؕ قُلۡ اَفَاتَّخَذۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهٖۤ اَوۡلِيَآءَ لَا
پھر کیا تم نے پکڑے ہیں اسکے سوا ایسے حمایتی
يَمۡلِكُوۡنَ لِاَنۡفُسِهِمۡ نَفۡعًا وَّلَا ضَرًّا ؕ
جو مالک نہیں اپنے بھلے اور برے کے

جو رب ہے وہی معبود ہے:

یعنی جب ربوبیت کا اقرار صرف خدا کیلئے کرتے ہو پھر مدد کے لئے دوسرے حمایتی کہاں سے تجویز کر لئے۔ حالانکہ وہ ذرہ برابر نفع نقصان کا مستقل اختیار نہیں رکھتے۔

قُلۡ هَلۡ يَسۡتَوِى الۡاَعۡمٰى وَالۡبَصِيۡرُ ۙ اَمۡ
کہہ کیا برابر ہوتا ہے اندھا اور دیکھنے والا یا

هَلۡ تَسۡتَوِى الظُّلُمٰتُ وَالنُّوۡرُ ۚ
کہیں برابر ہے اندھیرا اور اجالا

موحد اور مشرک:

یعنی موحد ومشرک میں ایسا فرق ہے جیسے بینا اور نابینا میں اور توحید وشرک کا مقابلہ ایسا سمجھو جیسے نور کا ظلمت سے۔ تو کیا ایک اندھا مشرک جو شرک کی اندھیریوں میں پڑا ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہو اُس مقام پر پہنچ سکتا ہے جہاں ایک موحد کو پہنچنا ہے جو فہم وبصیرت اور ایمان وعرفان کی روشنی میں فطرتِ انسانی کے صاف راستہ پر چل رہا ہے؟ ہرگز دونوں ایک نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے۔ (تفسیر عثمانی)

بے بصیرت اور صاحبِ بصیرت آدمی:

نابینا سے مراد ہے بے عقل وبے بصیرت یا وہ شخص جو اپنی بصیرت سے کام نہ لے۔ اور بصیر سے مراد وہ بصیرت مند آدمی جو اپنی بصیرت سے عبادت کی حقیقت اور تقاضوں کو سمجھتا ہو اور جانتا ہو کہ عبادت وکارسازی کا مستحق کون ہے کس کی عبادت کی جائے اور کس کو کارساز سمجھا جائے۔ بعض علماء نے کہا اعمٰی سے مراد وہ معبود ہے جو تمہاری طرف سے لاعلم ہے اور بصیر سے مراد وہ معبود ہے جو تمہارے احوال سے واقف ہو۔ (تفسیر مظہری)

اَمۡ جَعَلُوۡا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوۡا كَخَلۡقِهٖ
کیا ٹھہرائے ہیں انہوں نے اللہ کے لئے شریک کہ انہوں نے کچھ
فَتَشَابَهَ الۡخَلۡقُ عَلَيۡهِمۡ ؕ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ
پیدا کیا ہے جیسے پیدا کیا اللہ نے پھر مشتبہ ہو گئی پیدائش ان کی نظر
كُلِّ شَىۡءٍ وَّهُوَ الۡوَاحِدُ الۡقَهَّارُ ﴿۱۶﴾
میں کہہ اللہ ہے پیدا کرنیوالا ہر چیز کا اور وہی ہے اکیلا زبردست

کیا بتوں نے بھی مخلوق پیدا کی ہے:

یعنی جیسی مخلوقات خدا تعالیٰ نے پیدا کی، کیا تمہارے دیوتاؤں نے ایسی کوئی چیز پیدا کی ہے جسے دیکھ کر اُن پر خدائی کا شبہ ہونے لگا۔ وہ تو ایک مکھی کا پر اور ایک مچھر کی ٹانگ بھی نہیں بنا سکتے بلکہ تمام چیزوں کی طرح خود بھی اسی اکیلے زبردست خدا کی مخلوق ہیں۔ پھر ایسی عاجز ومجبور چیزوں کو خدائی کے تخت پر بٹھا دینا کس قدر گستاخی اور شوخ چشمی ہے۔ (تفسیر عثمانی)

اللہ کے سوا کوئی خالق نہیں اجسام ہوں یا اعراض یا غیر مادی ارواح جس کو وہ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اگر وہ کسی چیز کو پیدا کرنا نہ چاہے تو اس کا پیدا ہونا

ممکن ہی نہیں لہٰذا اس کے سوا کسی کی عبادت جائز نہیں، جو لوگ (یعنی معتزلہ فرقہ والے) کہتے ہیں کہ بندے اپنے افعال کے خود خالق ہیں اللہ ان کے افعال کا خالق نہیں۔ وہ اسی گروہ میں سے ہیں جن کو دونوں (انسان اور خدا) کی تخلیق ایک جیسی معلوم ہوتی ہے۔ (تفسیر مظہری)

شرک سے حفاظت:

آیت اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰہِ شُرَکَآءَ شرکاء کی تفسیر کے ذیل میں ابن جریج کی روایت آئی ہے۔

جو چند وسائط سے حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت معقل بن یسار تک پہنچتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارے اندر شرک چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ پوشیدہ (طور پر داخل ہوجاتا ہے) میں تم کو ایسی بات بتاتا ہوں جس کی وجہ سے (اقسام) شرک چھوٹے ہوں یا بڑے سب دور ہوجائیں گے۔ صحابہ نے عرض کیا فرمایئے فرمایا (ہر شخص) ہر روز تین بار کہے اے اللہ میں دانستہ طور پر تیرے ساتھ شریک بنانے سے تیری پناہ لیتا ہوں اور نادانستہ شرک کی تجھ سے معافی چاہتا ہوں اور شرک یہ (بھی) ہے کہ مجھے اللہ نے اور فلاں شخص نے دیا اور (یہ بھی شرک ہے کہ) کوئی یوں کہے کہ اگر فلاں شخص نہ ہوتا تو فلاں شخص (مثلاً زید) مجھے مار ڈالتا۔ (تفسیر مظہری)

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِیَۃٌ
اتارا اس نے آسمان سے پانی پھر بہنے لگے نالے
بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّیْلُ زَبَدًا رَّابِیًا ؕ
اپنی اپنی موافق پھر اوپر لے آیا وہ نالا جھاگ پھولا ہوا
وَمِمَّا یُوْقِدُوْنَ عَلَیْہِ فِی النَّارِ ابْتِغَآءَ
اور جس چیز کو دھونکتے ہیں آگ میں واسطے زیور کے
حِلْیَۃٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُہٗ ؕ کَذٰلِكَ
یا اسباب کے اس میں بھی جھاگ ہے ویسا ہی یوں
یَضْرِبُ اللّٰہُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۬ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ
بیان (ٹھہراتا ہے) کرتا ہے اللہ حق اور باطل کو سو وہ جھاگ
فَیَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ
تو جاتا رہتا ہے سوکھ کر اور وہ جو کام آتا ہے لوگوں کے
فَیَمْكُثُ فِی الْاَرْضِ ؕ كَذٰلِكَ یَضْرِبُ
سو باقی رہتا ہے زمین میں اس طرح بیان کرتا ہے
اللّٰہُ الْاَمْثَالَ ؕ (۱۷)
اللہ مثالیں

حق و باطل کی مثال:

آسمان کی طرف سے بارش اُتری جس سے ندی نالے بہہ پڑے۔ ہر نالے میں اُس کے ظرف اور گنجائش کے موافق جتنا خدا نے چاہا پانی جاری کر دیا، چھوٹے میں کم بڑے میں زیادہ۔ پانی جب زمین پر رواں ہوا تو مٹی اور کوڑا کرکٹ ملنے سے گدلا ہوگیا۔ پھر میل کچیل اور جھاگ پھول کر اوپر آیا۔ جیسے تیز آگ میں چاندی تانبا، لوہا، اور دوسری معدنیات پگھلاتے ہیں تا زیور، برتن اور ہتھیار وغیرہ تیار کریں اُس میں بھی اسی طرح جھاگ اٹھتا ہے مگر تھوڑی دیر بعد خشک یا منتشر ہو کر جھاگ جاتا رہتا ہے اور جو اصلی کارآمد چیز تھی (یعنی پانی یا پگھلی ہوئی معدنیات) وہ ہی زمین میں یا زمین والوں کے ہاتھ میں باقی رہ جاتی ہے۔ جس سے مختلف طور پر لوگ منتفع ہوتے ہیں۔ یہ ہی مثال حق و باطل کی سمجھ لو۔ جب وحی آسمانی دین حق کو لے کر اُترتی ہے تو قلوب بنی آدم اپنے اپنے ظرف اور استعداد کے موافق فیض حاصل کرتے ہیں۔ پھر حق اور باطل باہم بھڑ جاتے ہیں تو میل اُبھر آتا ہے۔ بظاہر باطل جھاگ کی طرح حق کو دبا لیتا ہے لیکن اس کا یہ اُبال عارضی اور بے بنیاد ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس کے جوش وخروش کا پتہ نہیں رہتا۔ خدا جانے کدھر گیا۔ جو اصلی اور کارآمد چیز جھاگ کے نیچے دبی ہوئی تھی (یعنی حق وصداقت) بس وہ ہی رہ گئی۔ دیکھو! خدا کی بیان کردہ مثالیں کیسی عجیب ہوتی ہیں۔ کیسے موثر طرز میں سمجھایا کہ دنیا میں جب حق باطل بھڑتے ہیں یعنی دونوں کا جنگی مقابلہ ہوتا ہے تو گو برائے چندے باطل اونچا اور پھولا ہوا نظر آئے، لیکن آخر کار باطل کو منتشر کر کے حق ہی ظاہر و غالب ہو کر رہے گا۔ کسی مومن کو باطل کی عارضی نمائش سے دھوکا نہ کھانا چاہئے۔ اسی طرح کسی انسان کے دل میں جب حق اتر جائے کچھ دیر کے لئے اوہام و وساوس زور شور دکھلائیں تو گھبرانے کی بات نہیں، تھوڑی دیر میں یہ اُبال بیٹھ جائے گا اور خالص حق ثابت و مستقر رہے گا۔ گذشتہ آیات میں چونکہ توحید وشرک کا مقابلہ کیا گیا تھا اس مثال میں حق و باطل کے مقابلہ کی کیفیت بتلا دی، آگے دونوں کا انجام بالکل کھول کر بیان کرتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

پیغمبر اور امت کی مثال:

اور حدیث میں ہے میری اور تمہاری مثال اس شخص کی طرح ہے جس

نے آگ جلائی۔ جب آگ نے اپنے آس پاس کی چیزیں روشن کر دیں تو پتنگے اور پروانے وغیرہ کیڑے اس میں گر کر جان دینے لگے۔ وہ انہیں ہر چند روکتا ہے لیکن تس پر بھی وہ برابر گر رہے ہیں۔ بالکل یہی مثال میری اور تمہاری ہے کہ میں تمہاری کمر پکڑ پکڑ کر تمہیں روکتا ہوں اور کہہ رہا ہوں کہ آگ سے پرے ہٹو۔ لیکن تم میری نہیں سنتے نہیں مانتے۔ مجھ سے چھوٹ چھوٹ کر آگ میں گرے چلے جاتے ہو۔ (تفسیر ابن کثیر)

لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰى
جنہوں نے مانا اپنے رب کا حکم انکے واسطے بھلائی ہے

ایمان وعمل کا اجر:

یعنی ایمان وعمل صالح اختیار کیا اُن کے لئے دنیا وآخرت کی بھلائی ہے، حقیقی خوشی اور قلبی طمانیت وسکون اُن کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہوتا۔

وَالَّذِيْنَ لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهٗ لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا
اور جنہوں نے اسکا حکم نہ مانا اگر ان کے پاس ہو جو کچھ
فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَا
کہ زمین میں ہے سارا اور اتنا ہی اس کے ساتھ اور تو سب دیویں
فْتَدَوْا بِهٖ
(دے ڈالیں) اپنے بدلہ (چھڑائی) میں

انکار کی سزا: یعنی یہاں تو خیر جس طرح گذرے، لیکن آخرت میں اُن کی حالت ایسی پریشانی اور گھبراہٹ کی ہوگی کہ اگر تمام دنیا کے خزانے اُن کے ہاتھ میں ہوں بلکہ اسی قدر اور بھی تو تمنا کریں گے کہ ہم یہ سب فدیہ میں دے کر اس پریشانی سے چھوٹ جائیں وانی لھم ذلک۔

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ
ان لوگوں کے لئے ہے برا حساب

یعنی حساب میں کسی قسم کی رعایت اور درگذر نہ ہوگی ایک ایک بات پر پوری طرح پکڑے جائیں گے۔

وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۸﴾ اَفَمَنْ
اور ٹھکانا ان کا دوزخ ہے اور وہ بری (برا بچھونا) آرام کی جگہ ہے بھلا

يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ
جو شخص جانتا ہے کہ جو کچھ اترا تجھ پر تیرے رب سے حق ہے برابر
كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ۭ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۱۹﴾
ہوسکتا ہے اس کے جو کہ اندھا ہے سمجھتے وہی ہیں جن کو عقل ہے

حکمت کا تقاضا:

مؤمن وکافر دونوں کا الگ الگ انجام ذکر فرمانے کے بعد متنبہ کرتے ہیں کہ ایسا ہونا عین عقل وحکمت کے موافق ہے۔ کوئی عقل مند یہ نہیں کہہ سکتا کہ ایک نپٹ اندھا جسے کچھ نظر نہ آئے یوں ہی اناپ شناپ اندھیرے میں پڑا ٹھوکریں کھا رہا ہو، اُس شخص کی برابری کر سکتا ہے جس کے دل کی آنکھیں کھلی ہیں اور پوری بصیرت کے ساتھ حق کی روشنی سے مستفید ہو رہا ہے۔

الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ
وہ لوگ جو پورا کرتے ہیں اللہ کے عہد کو اور نہیں
الْمِيْثَاقَ ﴿۲۰﴾
توڑتے اس عہد کو

ایفائے عہد:

یعنی اللہ سے جو عہد ازل میں ہو چکا ہے (عھد الست) جس پر انسان کی فطرت خود گواہ ہے اور جو انبیاء کی زبانی عہد لئے گئے اُن سب کو پورا کرتے ہیں۔ کسی کو توڑتے نہیں۔ نیز بذاتِ خود کسی معاملہ میں خدا سے یا بندوں سے جو عہد و پیمان باندھتے ہیں (بشرطیکہ معصیت نہ ہو) اُس کی خلاف ورزی نہیں کرتے۔ (تفسیر عثمانی)

صحابہ کرام کا ایفائے عہد:

ابوداؤد نے بروایت عوف ابن مالکؓ یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرامؓ سے اس پر عہد اور بیعت لی کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے، اور پانچ وقت نماز کو پابندی سے ادا کریں گے اور اپنے امراء کی اطاعت کریں گے۔ اور کسی سے کسی چیز کا سوال نہ کریں گے۔

جو لوگ اس بیعت میں شریک تھے ان کا حال پابندی عہد میں یہ تھا کہ اگر گھوڑے پر سواری کے وقت ان کے ہاتھ سے کوڑا گر جاتا تو کسی انسان

سے نہ کہتے کہ یہ کوڑا اٹھا دو، بلکہ خود سواری سے اُتر کر اٹھاتے تھے۔

یہ صحابۂ کرامؓ کے دلوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت وعظمت اور جذبۂ اطاعت کا اثر تھا، ورنہ یہ ظاہر تھا کہ اس طرح کے سوال سے منع فرمانا مقصود نہ تھا، جیسے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ ایک مرتبہ مسجد میں داخل ہو رہے تھے، دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے ہیں، اور اتفاق سے ان کے دخولِ مسجد کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے یہ کلمہ نکلا کہ ''بیٹھ جاؤ'' عبداللہ بن مسعود جانتے تھے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ سڑک پر یا بے موقع کسی جگہ کوئی ہے تو وہیں بیٹھ جائے، مگر جذبۂ اطاعت نے ان کو آگے قدم بڑھانے نہ دیا، دروازہ سے باہر ہی جہاں یہ آواز کان میں پڑی اُسی جگہ بیٹھ گئے۔ (معارف القرآن)

وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ

اور وہ لوگ جو ملاتے ہیں جس کو اللہ نے فرمایا ملانا

صلہ رحمی:

یعنی صلہ رحم کرتے ہیں۔ یا ایمان کو عمل کے ساتھ یا حقوق العباد کو حقوق اللہ کے ساتھ ملاتے ہیں، یا اسلامی اخوت کو قائم رکھتے ہیں۔ یا انبیاء علیہم السلام میں تفریق نہیں کرتے کہ کسی کو مانیں کسی کو نہ مانیں۔ (تفسیر عثمانی)

قطع رحمی کی سزا:

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کا بیان ہے میں نے خود سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے اللہ نے فرمایا ہے میں ہی اللہ ہوں میں ہی رحمٰن ہوں میں نے رحم کو پیدا کیا ہے اور اپنے نام (رحمٰن) سے لفظ رحم کو مشتق کیا جو اس کو جوڑے رکھے گا میں اس کو (اپنے) ساتھ جوڑے رکھوں گا جو اس کو کاٹے گا اس سے میں قطع تعلق کرلوں گا۔ رواہ ابوداؤد۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ نے مخلوق کو پیدا کیا۔ پیدا کر چکا تو رحم نے کھڑے ہوکر رحمٰن کی کمر پکڑلی۔ اللہ نے فرمایا کیا ہے؟ رحم نے عرض کیا یہ اس کی جگہ ہے جو قطع تعلق سے تیری پناہ چاہتا ہے۔ اللہ نے فرمایا کیا تو اس بات سے خوش نہیں کہ جو تجھے جوڑے رکھے گا میں اسے (اپنے ساتھ) جوڑے رکھوں گا اور جو تجھے توڑے گا میں اس سے قطع تعلق کر لوں گا۔ رحم نے عرض کیا بیشک میں اس پر راضی ہوں اے میرے رب، اللہ نے فرمایا پس یہ (فیصلہ) تیرے لئے ہے۔ (متفق علیہ)

بغویؒ اور حکیم اور محمد بن نصر نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن تین چیزیں عرش کے نیچے ہوں گی۔ قرآن مجید، امانت، رحم، قرآن (بندوں سے یا بندوں کی طرف سے) حجت کرے گا اس کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن اور رحم ندا کرے گا خوب سن لو جس نے مجھے جوڑے رکھا اللہ اس سے تعلق رکھے گا اور جس نے مجھے توڑا اللہ اس سے قطع تعلق کرلے گا۔ رواہ البغوی والحکیم ومحمد بن نصر۔

حضرت انس بن مالک کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص چاہتا ہو کہ اللہ اس کے رزق میں وسعت اور عمر میں درازی عطا کرے تو وہ قرابت داروں کو جوڑے رکھے۔ متفق علیہ۔

حضرت ابوایوب انصاری راوی ہیں کہ ایک اعرابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرودگاہ پر سامنے سے آیا اور عرض کیا مجھے کوئی ایسی چیز بتا دیجئے جو مجھے جنت سے قریب اور دوزخ سے دور کردے فرمایا اللہ کی بندگی کر کسی چیز کو اس کا شریک نہ قرار دے، نماز قائم کر، زکوٰۃ ادا کر اور رشتہ داری کو جوڑے رکھ (یعنی قرابتداروں سے اچھا سلوک کر) رواہ البغوی۔

صلہ رحمی کا مطلب:

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رشتہ قرابت کو جوڑنے والا وہ نہیں جو برابر کا بدلہ دیدے بلکہ قرابت کو جوڑنے والا وہ ہے کہ اگر رشتۂ قرابت (کسی عزیز کی طرف سے) ٹوٹ گیا ہو تو وہ اس کو جوڑ دے (یعنی جو شخص تجھ سے عزیز داری اور قرابت ختم کرنے کی کوشش کر رہا ہو یا ختم کر چکا ہو تو اس سے قرابت پیدا کر اور رشتہ کو جوڑ) رواہ البخاری۔

سب سے پہلا حقدار:

حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری طرف سے حسن سلوک کا کون سب سے زیادہ مستحق ہے۔ فرمایا تیری ماں۔ اس نے عرض کیا اس کے بعد، فرمایا تیری ماں۔ اس نے عرض کیا اس کے بعد، فرمایا تیری ماں، اس نے عرض کیا اس کے بعد کون فرمایا تیرا باپ۔ دوسری روایت میں اتنا زائد ہے کہ تیرا باپ کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پھر تیرے قرابت دار حسبِ درجۂ قرابت۔ (متفق علیہ)

حضرت ابن عمر راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (باپ کے ساتھ یہ بھی) بہت اچھا سلوک، اور بر ہے کہ باپ کے منہ پھیرنے (یعنی مرنے) کے بعد اس کے دوستوں سے اچھا سلوک کیا جائے۔ (رواہ مسلم)

حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنے اپنے نسب کو جانو تاکہ رشتہ داروں کو جوڑے رکھو صلۂ رحم سے رشتہ داروں میں محبت، مال میں وسعت اور عمر میں برکت ہوتی ہے۔ رواہ الترمذی وقال حدیث غریب۔ (تفسیر مظہری)

وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ﴿۲۱﴾

اور ڈرتے ہیں اپنے رب سے اور اندیشہ رکھتے ہیں برے حساب کا

خوفِ خدا: یعنی حق تعالیٰ کی عظمت وجلال کا تصور کر کے لرزاں وترساں

رہتے ہیں اور یہ اندیشہ لگا رہتا ہے کہ دیکھئے وہاں جب ذرہ ذرہ کا حساب ہوگا، کیا صورت پیش آئے گی۔ (تفسیر عثمانیؒ)

وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ
اور وہ لوگ جنہوں نے صبر کیا خوشی کو اپنے رب کی

تکلیفوں پر صبر:

یعنی مصائب وشدائد اور دنیا کی مکروہات پر صبر کیا۔ کسی سختی سے گھبرا کر طاعت کے راستہ سے قدم نہیں ہٹایا نہ معصیت کی طرف جھکے اور یہ صبر و استقلال محض حق تعالیٰ کی رضاء وخوشنودی حاصل کرنے کے لئے دکھلایا، اس لئے نہیں کہ دنیا اُنہیں بہت صابر اور مستقل مزاج کہے۔ نہ اس لئے کہ بجز صبر کے چارہ نہ رہا تھا مجبور ہو گئے تو صبر کر کے بیٹھ رہے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

کون سا صبر مفید ہے:

صبر کے ساتھ ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ کی قید نے یہ بتلایا کہ مطلقاً صبر کوئی فضیلت کی چیز نہیں، کیونکہ کبھی نہ کبھی تو بے صبرے انسان کو بھی انجام کار ایک مدت کے بعد صبر آ ہی جاتا ہے، جو صبر غیر اختیاری ہو اس کی کوئی خاص فضیلت نہیں، نہ ایسی غیر اختیاری کیفیت کا...... اللہ تعالیٰ کسی کو حکم دیتے ہیں، اسی لئے حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا الصبر عند الصدمة الاولی۔ یعنی اصلی اور معتبر صبر تو وہی ہے جو ابتداءِ صدمہ کے وقت اختیار کر لیا جائے، ورنہ بعد میں تو کبھی نہ کبھی جبری طور پر انسان کو صبر آ ہی جاتا ہے، بلکہ قابلِ مدح وثناء وہ صبر ہے کہ اپنے اختیار سے خلافِ طبع امر کو برداشت کرے، خواہ وہ فرائض وواجبات کی ادائیگی ہو یا محرمات ومکروہات سے بچنا ہو۔

اسی لئے اگر کوئی شخص چوری کی نیت سے کسی مکان میں داخل ہو گیا مگر وہاں چوری کا موقع نہ ملا صبر کر کے واپس آ گیا، تو یہ غیر اختیاری صبر کوئی مدح و ثواب کی چیز نہیں، ثواب جب ہے کہ گناہ سے بچنا خدا کے خوف اور اس کی رضا جوئی کے سبب سے ہو۔ (معارف القرآن)

وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ
اور قائم رکھی نماز اور خرچ کیا ہمارے دیئے میں سے پوشیدہ (چھپے)
سِرًّا وَّعَلَانِيَةً
اور ظاہر (کھلے)

قیام نماز وادائے زکوٰۃ وصدقات:

پوشیدہ کو شاید اس لئے مقدم رکھا کہ پوشیدہ خیرات کرنا افضل ہے۔ الا یہ کہ کہیں مصلحت شرعی علانیہ دینے میں ہو۔ (تفسیر عثمانیؒ)

سِرًّا وَّعَلَانِيَةً چھپا کر اور کھلم کھلا۔ نفل خیرات چھپا کر دینی افضل ہے۔ (تاکہ شہرت طلبی کا شائبہ بھی نہ ہو) اور لوگوں کی بدگمانی کو دور کرنے اور دوسروں کو ترغیب دینے) کے لئے زکوٰۃ کھلم کھلا دینی بہتر ہے، مسلمان پر زکوٰۃ کا وجوب بہت کم ہوتا ہے اوّل تو اتنا مال ہی نہیں ہوتا کہ زکوٰۃ واجب ہو اور مال ہوتا بھی ہے تو اس کے اسلام کا تقاضا ہے کہ پہلے ہی سے ادا کر دے عموماً مسلمان نفل خیرات کرتا ہی رہتا ہے (اتنی کہ اس پر زکوٰۃ بہت کم ہی واجب ہوتی ہے) اس لئے سراً کو علانیہ سے پہلے ذکر کیا۔ (ورنہ زکوٰۃ کی ادائیگی دوسری خیرات پر مقدم ہے اس لئے علانیۃً کا لفظ سراً سے پہلا آنا چاہئے تھا) (تفسیر مظہری)

وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ
اور کرتے ہیں برائی کے مقابلہ میں بھلائی

برائی کے بدلہ اچھائی:

یعنی بُرائی کا جواب بھلائی سے دیتے ہیں۔ سختی کے مقابلہ میں نرمی برتتے ہیں کوئی ظلم کرتا ہے یہ معاف کرتے ہیں (بشرطیکہ معافی سے بُرائی کے ترقی کرنے کا اندیشہ نہ ہو) بدی سے بچ کر نیکی اختیار کرتے ہیں۔ اگر کبھی کوئی برا کام ہو جاتا ہے تو اس کے مقابلہ میں بھلا کام (یعنی توبہ اور اس گناہ کی تلافی) کرتے ہیں۔ (تفسیر عثمانیؒ)

اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ بلا شبہ نیکیاں گناہوں کو دور کر دیتی ہیں۔ حضرت ابوذرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تجھ سے کوئی گناہ ہو جائے تو اس کے پیچھے نیکی بھی کر یہ اس کو مٹا دیگی۔ (رواہ احمد بسند صحیح)

گناہ کے بعد نیکی:

ابن عساکر نے عمر بن اسود کی مرسل روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب دس گناہ تو نے کئے ہوں تو ایک نیکی بھی (ایسی) کر جس سے تو گناہوں کو اتار دے۔

حضرت عقبہ بن عامر راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص گناہوں کے بعد نیکیاں کر لیتا ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے کوئی اتنی تنگ زرہ پہن رکھی ہو۔ جس سے اس کا دم گھٹ رہا ہو (یعنی اتنے گناہ کئے کہ ہلاکت کے قریب پہنچ گیا) پھر اس نے ایک نیکی کر لی تو (زرہ کی) ایک کڑی ٹوٹ گئی پھر دوسری کڑی ٹوٹ گئی (اس طرح نیکیاں کرتے کرتے سب کڑیاں ایک کے بعد ایک ٹوٹ گئیں) یہاں تک کہ زرہ زمین پر گر پڑی۔ (رواہ الطبرانی)

ابن کیسان نے کہا آیت کا معنی یہ ہے کہ گناہ توبہ کے ذریعے سے دفع کر دیتے ہیں (یعنی حسنہ سے مراد توبہ ہے) امام احمد نے عطاء کی مرسل روایت نقل

کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تو نے گناہ کیا ہو تو فوراً اس کے بعد توبہ کر لے۔ چھپے گناہ کی توبہ مخفی طور پر اور علانیہ گناہ کی توبہ علانیہ (الزہد)

برائی کے بدلہ اچھائی کا اجر:

حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے کچھ رشتہ دار ایسے ہیں کہ میں ان کو جوڑے رکھنے کی کوشش کرتا ہوں اور وہ مجھ سے قرابت توڑتے ہیں، میں ان سے بھلائی کرتا ہوں وہ مجھ سے برائی کرتے ہیں۔ ان (کی زیادتیوں) کو برداشت کرتا ہوں اور وہ مجھ پر زیادتیاں کرتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تم ایسے ہی ہو جیسا کہہ رہے ہو تو تم ان پر خاک جھونک رہے ہو۔ (یعنی ان کو ناکام بنا رہے ہو وہ خسارے میں رہیں گے اور تم کامیاب ہو گے) جب تک تم اس (سلوک) پر قائم رہو گے اللہ کی طرف سے ان کے مقابلہ میں تمہاری حمایت ہوتی رہے گی۔ رواہ مسلم۔ (تفسیر مظہری)

حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کو وصیت فرمائی کہ بدی کے بعد نیکی کر لو، تو وہ بدی کو مٹا دے گی۔ مراد یہ ہے کہ جب اس بدی اور گناہ پر نادم ہو کر توبہ کر لی اور اس کے پیچھے نیک عمل کیا تو یہ نیک عمل پچھلے گناہ کو مٹا دے گا، بغیر ندامت اور توبہ کے گناہ کے بعد کوئی نیک عمل کر لینا گناہ کی معافی کے لئے کافی نہیں ہوتا۔ (معارف القرآن)

أُولَٰئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿٢٢﴾ جَنَّاتُ عَدْنٍ

ان لوگوں کیلئے ہے آخرت کا گھر باغ ہیں رہنے کے

یعنی جن میں ہمیشہ رہیں گے۔ (تفسیر عثمانی)

عدن کیا ہے: مجاہد کا بیان ہے کہ حضرت عمر نے ممبر پر آیت جَنّٰتُ عَدْنٍ تلاوت فرمائی پھر فرمایا لوگو! تم کو معلوم ہے کہ جنات عدن کیا ہیں۔ عدن جنت میں قصر ہے جس کے دس ہزار دروازے ہیں اور ہر دروازے پر پچیس ہزار فراخ چشم حوریں متعین ہیں اس قصر میں سوائے نبی صدیق، اور شہید کے اور کوئی داخل نہ ہوگا۔ (تفسیر مظہری)

يَدْخُلُونَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ آبَائِهِمْ

داخل ہوں گے ان میں اور جو نیک ہوئے ان کے باپ دادوں میں

وَأَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ

اور جوروؤں میں اور اولاد میں

قرابت کا فائدہ:

''آباء'' کا لفظ تغلیباً کہا ہے جس میں اُمہات (مائیں) بھی شامل ہیں۔ یہ جنت کی بشارت کے ساتھ مزید خوشخبری سنائی کہ ایسے کاملین کو جن کی خصال اوپر بیان ہوئیں جنت میں ایک نعمت و مسرت یہ حاصل ہو گی کہ وہ اور اُن کے ماں باپ، اولاد، بیویاں، جو اپنی نیکی کی بدولت دخول جنت کے لائق ہوں سب اکٹھے رہیں گے۔ حتیٰ کہ ان متعلقین میں سے اگر کوئی کم رتبہ ہوگا تو حق تعالیٰ اپنی نوازش و مہربانی سے درجہ بڑھا کر اُس مرد کامل سے نزدیک کر دیگا۔ ''وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ (طور۔ رکوع ۱) اس سے معلوم ہوا کہ بدون ایمان و عمل صالح کے محض کاملین کی قرابت کافی نہیں۔ ہاں ایمان و عمل صالح موجود ہو تو تعلق قرابت سے کچھ ترقی درجات ممکن ہے۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانی)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کاملوں کی عزت افزائی کرے گا اور ان کے دلوں کو خوش کرنے کے لئے ایسے لوگوں کو بھی ان کے مرتبے پر فائز کر دے گا جو اپنے اعمال کے لحاظ سے اس درجہ کے مستحق نہ ہوں گے اور کاملین کے اعمال کی طرح ان کے اعمال نہ ہوں گے آباء و اجداد اولاد اور بیویاں خواہ اہل جنت کے درجات پر فائز ہونے کے اہل نہ ہوں مگر جنتیوں کی خوشی کی خاطر ان کو بھی اہل جنت کا ساتھی کر دیا جائے گا۔ بشرطیکہ وہ مؤمن ہوں۔ صالح (یعنی مؤمن) ہونے کی شرط بتا رہی ہے کہ بغیر ایمان کے قرابت نسب مفید نہ ہوگی۔ آباء کے اندر بدلالت نص مائیں بھی داخل ہیں۔

ایک شبہ:

طبرانی حاکم اور بیہقی نے حضرت عمر کی روایت سے صحیح سند کے ساتھ۔ اور طبرانی نے حضرت ابن عباس و حضرت مسور بن مخرمہ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن میرے نسب اور رشتہ زوجیت کے علاوہ ہر نسب اور رشتہ زوجیت ٹوٹ جائے گا۔ ابن عسا کر نے صحیح سند سے حضرت ابن عمر کی روایت سے ان الفاظ کے ساتھ حدیث مذکورہ نقل کی ہے۔ ہر نسب اور رشتہ زوجیت علاوہ میرے نسب اور رشتہ زوجیت کے منقطع ہو جائے گا۔ اس حدیث سے معلوم ہو رہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت (نسبی و سسرالی) کے علاوہ اور کسی کی قرابت کام نہ آئے گی (اور آیت میں مؤمنوں کے لئے ان کی قرابت و زوجیت کا سودمند ہونا مذکور ہے)

جواب: تمام مؤمن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗ اُمَّهٰتُهُمْ حضرت اُبی کی قرأت میں اتنا لفظ اس کے بعد زیادہ ہے وھو اب لھم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مومنوں کے باپ ہیں۔

ایک اور روایت میں آیا ہے اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ سورۂ کوثر کی تفسیر میں ہم نے ذکر دیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق عاص بن وائل نے

لوگوں سے کہا کہ اس کو چھوڑ دو یہ تو دم بریدہ ہے اس کے پیچھے اس کی نسل نہیں ہے۔ اس پر اللہ نے نازل فرمایا اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ آپ کا دشمن ہی حقیقت میں دم بریدہ ہے اس کی نسل نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ عاص بن وائل کے بیٹے عمر اور ہشام تھے مگر عمر و ہشام مسلمان ہو گئے اس سے عاص کا ان سے کوئی رشتہ والدیت قائم نہیں رہا اور عاص کو لاولد کہہ دیا گیا، عمرو ہشام عاص کے وارث بھی انقطاع رشتہ کی وجہ سے نہ قرار پائے۔ بلکہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد ہو گئے۔ اس توضیح کی روشنی میں حدیث مذکور کا مطلب یہ ہوگا کہ قیامت کے دن میرا رشتہ اور نسب سود مند ہوگا اور سب رشتے منقطع ہو جائیں گے۔ میرا نسب و رشتہ براہ راست ہو یا بالواسطہ حاصل مطلب یہ کہ کافروں کا کافروں سے یا کافروں کا مؤمنوں سے رشتہ قرابت و زوجیت منقطع ہو جائے گا اور مومنوں کا باہمی رشتہ سود مند ہوگا۔ اسی مضمون کو اللہ نے آیت اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَئِذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ (الخ) میں بیان فرمایا ہے۔ (تفسیر مظہری)

وَالْمَلٰٓئِكَةُ یَدْخُلُوْنَ عَلَیْهِمْ مِّنْ كُلِّ
اور فرشتے آئیں انکے پاس ہر دروازے سے
بَابٍ ﴿۲۳﴾ سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ
کہیں گے سلامتی تم پر بدلے اسکے کہ تم نے صبر کیا، سو خوب ملا
عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۴﴾
عاقبت کا گھر

مجاہدین کا اعزاز:

صحیح حدیث میں جنت کے آٹھ دروازے بیان ہوئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اُن کاملین کی تعظیم و تکریم کے لئے خدا کے پاس فرشتے ہر طرف سے تحائف و ہدایا لے کر حاضر ہونگے۔ احادیث میں ہے کہ خلق اللہ میں سے اول وہ فقراء مہاجرین جنت میں داخل ہونگے جو سختیوں اور لڑائیوں میں سینہ سپر ہوتے اور رخنہ بندی کے وقت کام آتے تھے۔ جو حکم اُن کو ملتا اُس کی تعمیل کے لئے ہمیشہ مستعد رہتے۔ دنیا کی حاجتیں اور دل کے ارمان دل ہی میں لے کر یہاں سے رخصت ہو گئے۔ قیامت کے دن حق تعالیٰ فرمائے گا میرے وہ بندے کہاں ہیں (حاضر ہوں) جو میرے راستہ میں لڑے، میرے لئے تکلیفیں اٹھائیں اور جہاد کیا۔ جاؤ جنت میں بے کھٹکے داخل ہو جاؤ۔ پھر ملائکہ کو حکم ہوگا کہ میرے ان بندوں کے پاس حاضر ہو کر سلام کرو۔ وہ عرض کریں گے خداوندا! ہم تیری بہترین مخلوق ہیں کیا ہم بارگاہ قرب کے رہنے والوں کو حکم دیتے ہیں کہ ان زمینی باشندوں کے پاس حاضر ہو کر سلام کریں۔ ارشاد ہوگا، ہاں یہ میرے وہ بندے ہیں جنہوں نے توحید پر جان دی، دنیا کے سب ارمان اپنے سینوں میں لے کر چلے آئے، میرے راستہ میں جہاد کیا اور ہر تکلیف کو خوشی سے برداشت کرتے رہے۔ یہ سن کر فرشتے ہر طرف سے ان کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور کہیں گے "سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ" حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال کے آغاز میں قبور شہداء پر تشریف لے جاتے اور فرماتے "سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ" یہی طرز عمل ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کا رہا۔ (تفسیر عثمانی)

مؤمن کا اعزاز:

حضرت ابوامامہ کا بیان ہے کہ جنت کے اندر اپنی مسند (مسہری) پر مومن راحت اندوز ہوگا خادموں کی دو قطاریں اس کے سامنے ہوں گی، دونوں قطاروں کے سرے پر ایک بند دروازہ ہوگا دروازے پر فرشتہ اندر آنے کا طلبگار ہوگا۔ مؤمن اپنے قریبی خادم سے اور وہ خادم اپنے برابر والے خادم سے اور یونہی سلسلہ وار ہر خادم اپنے متصل خادم سے کہے گا کہ فرشتہ دروازہ پر خواستگار اجازت ہے۔ یہاں تک کہ آخر خادم جو دروازے سے متصل ہوگا وہ دروازہ کھول دے گا فرشتہ اندر آ کر سلام کرے گا اور واپس چلا جائے گا۔ (رواہ البغوی)

حضرت ابن عمر کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنت کے اندر سب سے پہلے وہ فقراء و مہاجرین داخل ہوں گے جن کے ذریعہ سے سرحدوں کی بندش ہوتی ہے اور مصائب سے بچاؤ ہوتا ہے۔ غریب دل کی خواہش دل ہی میں لے کر مر جاتے ہیں ان کی حاجت پوری نہیں ہوتی اللہ اپنی مشیت کے مطابق فرشتوں سے فرمائے گا ان کے پاس جاؤ اور ان کو سلام کرو۔ فرشتے عرض کریں گے اے ہمارے مالک ہم تیرے آسمان کے رہنے والے اور تیری مخلوق میں سب سے برگزیدہ ہیں کیا تو ہم کو حکم دے رہا ہے کہ ان کو جا کر سلام کریں، اللہ فرمائے گا یہ میرے بندے میری عبادت کرتے تھے کسی چیز کو میرا شریک نہیں قرار دیتے تھے انہی کے ذریعہ سے اسلامی سرحدوں کی بندش ہوتی تھی اور انہی کے سبب مصائب سے بچاؤ ہوتا تھا یہ ایسی حالت میں مرے کہ ان کی تمنا ان کے دلوں میں ہی رہی (دنیا میں ان کی حاجت پوری نہیں ہوئی، حسب الحکم ملائکہ ان کے پاس آئیں گے (اللہ نے فرمایا ہے) یَدْخُلُوْنَ عَلَیْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ۔ (تفسیر عثمانی)

سب سے پہلے جنت میں جانے والے:

سب سے پہلے جنت میں جانے والے تین قسم کے لوگ ہیں۔ فقراء مہاجرین جو مصیبتوں میں مبتلا رہے۔ جب انہیں جو حکم ملا بجالاتے رہے

انہیں ضرورتیں بادشاہوں سے ہوتی تھیں لیکن مرتے دم تک پوری نہ ہوئیں۔ جنت کو بروز قیامت اللہ تعالیٰ اپنے سامنے بلائے گا۔ وہ بنی سنوری اپنی تمام نعمتوں اور تازگیوں کے ساتھ حاضر ہوگی۔ اس وقت ندا ہوگی کہ میرے وہ بندے جو میرے راہ میں جہاد کرتے تھے۔ میری راہ میں ستائے جاتے تھے۔ میری راہ میں لڑتے بھڑتے تھے۔ وہ کہاں ہیں۔ آؤ بغیر حساب و عذاب کے جنت میں چلے جاؤ۔ اس وقت فرشتے خدا کے سامنے سجدے میں گر پڑیں گے اور عرض کریں گے کہ پروردگار ہم تو صبح وشام تیری تسبیح وتقدیس میں لگے رہے، یہ کون ہیں جنہیں ہم پر بھی تو نے فضیلت عطا فرمائی؟ اللہ رب العزت فرمائے گا یہ میرے وہ بندے ہیں جنہوں نے میری راہ میں جہاد کیا، میری راہ میں تکلیفیں برداشت کیں۔ اب تو فرشتے جلدی کر کے ان کے پاس ہر ہر دروازے سے جا پہنچیں گے، سلام کریں گے اور مبارکبادیاں پیش کریں گے کہ تمہیں تمہارے صبر کا بدلہ کتنا اچھا ملا۔ (تفسیر ابن کثیر)

مسند کی حدیث میں ہے، جانتے بھی ہو کہ سب سے پہلے جنت میں کون جائیں گے؟ لوگوں نے کہا خدا کو علم ہے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا سب سے پہلے جنتی مساکین مہاجرین ہیں جو دنیا کی لذتوں سے دور تھے جو تکلیفوں میں مبتلا تھے۔ جن کی امنگیں دلوں میں ہی رہ گئیں اور قضا آ گئی، رحمت کے فرشتوں کو حکم خدا ہوگا کہ جاؤ انہیں مبارک باد دو۔ فرشتے کہیں گے خدایا ہم تیرے آسمانوں کے رہنے والے تیری بہترین مخلوق ہیں۔ کیا تو ہمیں حکم دیتا ہے کہ ہم جا کر انہیں سلام کریں اور انہیں مبارکباد پیش کریں۔ جناب باری جواب دے گا یہ میرے وہ بندے ہیں جنہوں نے صرف میری عبادت کی۔ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا دنیوی راحتوں سے محروم رہے۔ مصیبتوں میں مبتلا رہے۔ کوئی مراد پوری نہ ہونے پائی اور یہ صابر وشاکر رہے اب تو فرشتے جلدی جلدی بہ شوق ان کی طرف دوڑیں گے۔ ادھر ادھر کے ہر دروازے سے گھسیں گے اور سلام کر کے مبارکباد پیش کریں گے۔ (تفسیر ابن کثیر)

حدیث میں ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب قبور شہداء پر جاتے تو یہ کہتے۔ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ، اور اسی طرح حضرت ابوبکر اور عمر وعثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم بھی کہا کرتے تھے۔ (معارف کاندھلوی رحمہ اللہ)

وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ

اور جو لوگ توڑتے ہیں عہد اللہ کا مضبوط کرنے کے

بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ

بعد اور قطع کرتے ہیں اس چیز کو جس کو فرمایا اللہ نے

بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ

جوڑنا اور فساد اٹھاتے ہیں ملک میں، ایسے لوگ ان کے واسطے

اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ﴿۲۵﴾

ہے لعنت، اور ان کے لئے ہے برا گھر

بدعہدی:

سُعداء کے مقابل یہاں اشقیاء کی عادات وخصال اور آخری انجام بتلایا ہے۔ ان کا کام یہ ہے کہ حق تعالیٰ سے بدعہدی کریں، جن چیزوں کے جوڑنے کا حکم تھا، انہیں توڑیں، ملک میں فتنہ وفساد کی آگ بھڑکائیں دوسروں پر اور اپنی جانوں پر ظلم کرنے سے نہ رکیں یہی لوگ ہیں جو خدا کی رحمت سے دور پھینک دیے گئے اور سب سے زیادہ بُرے مقام پر پہنچنے والے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

بغاوت اور قطع رحم:

حضرت ابوبکر کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آخرت میں جو سزا رکھی گئی ہے اس کے باوجود دنیا میں جس گناہ کی سزا اللہ کی طرف سے جلد ملنے کا استحقاق ہوجاتا ہے وہ بغاوت اور قطع رحم ہے (اس سے زیادہ جلد عذاب دنیا کو لانے والا کوئی گناہ نہیں) رواہ احمد والبخاری فی الادب وابوداؤد والترمذی وابن ماجۃ والحاکم وابن حبان۔ حضرت جبیر بن مطعم راوی ہیں میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرما رہے ہیں رحم کو کاٹنے والا جنت میں نہیں جائے گا۔ متفق علیہ۔

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ راوی ہیں، میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا، ان لوگوں پر اللہ کی رحمت نازل نہیں ہوتی جن میں قرابت رحم کو کاٹنے والا موجود ہو۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان۔ حضرت عبداللہ بن عمر کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (احسان کر کے) احسان جتلانے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ نہ ماں باپ کا نافرمان نہ ہمیشہ مخمور رہنے والا (نشہ کا خوگر) رواہ النسائی والدارمی۔ (تفسیر مظہری)

عہد کی قسمیں:

الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ : یعنی یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے عہد کو پختہ کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے عہد میں وہ عہد بھی داخل ہے جو ازل میں حق تعالیٰ کی ربوبیت اور وحدانیت کے متعلق تمام پیدا ہونے والی روحوں سے لیا گیا تھا، جس کو کفار ومشرکین نے دنیا میں آ کر توڑ ڈالا اور اللہ کے ساتھ سینکڑوں ہزاروں رب اور معبود بنا بیٹھے۔

اور وہ تمام عہد بھی اس میں داخل ہیں جن کی پابندی عہد لا الہ الا اللہ کے ضمن

میں انسان پر لازم ہو جاتی ہے، کیونکہ کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دراصل ایک عظیم معاہدہ کا عنوان ہے جس کے تحت میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے ہوئے تمام احکام کی پابندی اور جن چیزوں سے روکا گیا ہے ان سے پرہیز کا عہد بھی آجاتا ہے، اس لئے جب کوئی انسان کسی حکم خداوندی یا حکم رسول سے انحراف کرتا ہے تو اس عہد ایمانی کی عہد شکنی کرتا ہے، یہ معلوم ہوا کہ عہد شکنی اور رشتہ داروں وعزیزوں سے قطع رحمی لعنت اور جہنم کا سبب ہے، نعوذ باللہ منہ،

بڑی صلہ رحمی:

اور صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بڑی صلہ رحمی یہ ہے کہ آدمی اپنے باپ کے انتقال کے بعد ان کے دوستوں سے وہی تعلقات قائم رکھے جو باپ کے سامنے تھے۔

اور بخاری ومسلم کی حدیث میں بروایت انسؓ مذکور ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے رزق میں وسعت اور کاموں میں برکت عطا فرماویں تو اس کو چاہئے کہ صلہ رحمی کرے، صلہ رحمی کے معنی یہی ہیں کہ جن سے رشتہ داری کے خصوصی تعلقات ہیں ان کی خبرگیری اور بقدر گنجائش امداد واعانت کرے۔

اور حضرت ابو ایوب انصاریؓ فرماتے ہیں کہ ایک گاؤں والا اعرابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان پر حاضر ہوا، اور سوال کیا کہ مجھے یہ بتلا دیجئے کہ وہ عمل کونسا ہے جو مجھے جنت سے قریب اور جہنم سے دور کر دے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، اور نماز قائم کرو زکوٰۃ ادا کرو اور صلہ رحمی کرو۔ (بغوی)

اور صحیح بخاری میں بروایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صلہ رحمی اتنی بات کا نام نہیں کہ تم دوسرے عزیز کے احسان کا بدلہ ادا کر دو اور اس نے تمہارے ساتھ کوئی احسان کیا ہے تو تم اس پر احسان کر دو، بلکہ اصل صلہ رحمی یہ ہے کہ تمہارا رشتہ دار عزیز تمہارے حقوق میں کوتاہی کرے، تم سے تعلق نہ رکھے تم پھر بھی محض اللہ کے لئے اس سے تعلق کو قائم رکھو، اور اس پر احسان کرو،

صلہ رحمی کے فوائد:

رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے اور ان کے تعلقات کو نبھانے ہی کے خیال سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے نسب ناموں کو محفوظ رکھو، جن کے ذریعہ تمہیں اپنی رشتہ داریاں محفوظ رہ سکیں، اور تم ان کے حقوق ادا کر سکو، پھر ارشاد فرمایا کہ صلہ رحمی کے فوائد یہ ہیں کہ اس سے آپس میں محبت پیدا ہوتی ہے اور مال میں برکت اور زیادتی ہوتی ہے، اور عمر میں برکت ہوتی ہے (یہ حدیث ترمذی نے روایت کی ہے)۔

اسلام کی تعلیم راہبانہ انداز سے ترکِ تعلقات کی نہیں، بلکہ ضروری تعلقات کو قائم رکھنے اور ان کے حقوق ادا کرنے کو ضروری قرار دیا گیا ہے، ماں باپ کے حقوق، اولاد، بیوی اور بہن بھائیوں کے حقوق، دوسرے رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے حقوق اللہ تعالیٰ نے ہر انسان پر لازم کئے ہیں، ان کو نظر انداز کر کے نفلی عبادات میں یا کسی دینی خدمت میں لگ جانا بھی جائز نہیں، دوسرے کاموں میں لگ کر ان کو بھلا دینا تو کیسے جائز ہوتا۔ (معارف القرآن)

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ

اللہ کشادہ کرتا ہے روزی جس کو چاہے اور تنگ کرتا ہے

دنیا کے عیش معیار نہیں ہے:

یعنی دنیا کے عیش وفراخی کو دیکھ کر سعادت وشقاوت کا فیصلہ نہیں ہوتا۔ نہ یہ ضروری ہے کہ جس کو دنیا میں خدا نے رزق اور پیسہ زیادہ دیا ہے وہ اس کی بارگاہ میں مقبول ہو۔ بہت سے مقبول بندے بطور آزمائش وامتحان یہاں عسرت کی زندگی بسر کرتے ہیں اور مردود مجرموں کو ڈھیل دی جاتی ہے وہ مزے اُڑاتے ہیں۔ یہ ہی دلیل اس کی ہے کہ اس زندگی کے بعد کوئی دوسری زندگی ہے جہاں ہر شخص کو اس کے نیک وبد اعمال کا پورا پھل مل کر رہے گا۔ بہرحال دنیا کی تنگی وفراخی مقبول ومردود ہونے کا معیار نہیں بن سکتا۔

بناداں آں چناں روزی رساند   کہ دانا اندرش حیران بماند

اللہ تعالیٰ وسعت کے ساتھ رزق دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگ کرتا ہے۔ رزق کا کم اور زیادہ ہونا کفر اور ایمان پر موقوف نہیں، اور کفار اترائے ہوئے ہیں، دنیاوی زندگی پر اور اس کی عیش وعشرت پر اور ان کا یہ اترانا بالکل فضول ہے۔ اس لئے کہ دنیاوی زندگی آخرت کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں مگر بہت تھوڑا اسامان۔ حدیث میں ہے کہ دنیا آخرت کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے کوئی اپنی انگلی سمندر میں ڈبو کر نکالے اور دیکھے کہ کیا لائی۔ (رواہ الامام احمدؒ) (معارف کاندھلویؒ)

وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا

اور ریفتہ ہیں دنیا کی زندگی پر اور دنیا کی زندگی کچھ نہیں

فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ﴿۲۶﴾

آخرت کے آگے مگر متاعِ حقیر

دنیا پر نہ اتراؤ:

یعنی اسی کو مقصود سمجھ کر اتراتے اور اکڑتے ہیں۔ حالانکہ آخرت کے

مقابلہ میں دنیا کی زندگی محض ہیچ ہے جیسے ایک شخص اپنی انگلی سے سمندر کو چھوئے تو وہ تری جو انگلی کو پہنچی ہے سمندر کے سامنے کیا حقیقت رکھتی ہے۔ دنیا کی آخرت کے مقابل اتنی بھی حقیقت نہیں۔ لہٰذا عقلمند کو چاہئے کہ فانی پر باقی کو مقدم رکھے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے بذات خود مقصود نہیں۔ یہاں کے سامانوں سے اس طرح تمتع کرو جو آخرت کی کامیابی کا ذریعہ بنے جیسے صحابہ رضی اللہ عنہم نے کیا۔

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ
اور کہتے ہیں کافر کیوں نہ اتری اس پر کوئی نشانی اس کے رب سے
مِّن رَّبِّهِ ۚ قُلْ إِنَّ اللَّهَ يُضِلُّ مَن
کہہ دے اللہ گمراہ (بچلاتا ہے) کرتا ہے جس کو چاہے اور راہ
يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ أَنَابَ ﴿٢٧﴾
دکھلاتا ہے اپنی طرف اس کو جو رجوع ہوا

کافروں کی فرمائش کا جواب:

سینکڑوں نشان دیکھتے تھے مگر وہ ہی مرغے کی ایک ٹانگ پکڑی ہوئی تھی کہ جو ہم کہتے جائیں وہ نشان دکھاؤ۔ مثلاً مکہ کے پہاڑوں کو ذرا اپنی جگہ سے سرکا کر کھیتی باڑی کے لئے زمین وسیع کردو۔ یا زمین کو پھاڑ کر چشمے اور نہریں نکال دو یا ہمارے پُرانے بزرگوں کو دوبارہ زندہ کر کے ہم سے بات چیت کرادو۔ غرض کوئی نشان ایسا دکھلاؤ جو ہم کو ایمان لانے پر مجبور کر دے۔ اُس کا جواب دیا کہ بیشک خدا ایسے نشان دکھلانے پر قدرت رکھتا ہے لیکن اس کی حکمت و عادت مقتضی نہیں کہ تمہاری فرمائشیں پوری کیا کرے، پیغمبروں کی تصدیق کے لئے جس قدر ضرورت ہے اس سے زائد نشانات دکھلا چکا اور دکھلا رہا ہے۔ دوسرے سینکڑوں معجزات سے قطع نظر کر کے اکیلا قرآن ہی کیسا عظیم الشان نشان پیغمبر کی صداقت کا ہے۔ جب تم ان نشانوں کو دیکھ کر راہ راست پر نہ آئے اور حق کی طرف رجوع نہ ہوئے تو معلوم ہوا کہ قدیم قانون کے موافق خدا کی مشیت یہ ہی ہے کہ تم کو تمہاری پسند کردہ گمراہی میں چھوڑے رکھے۔ بلاشبہ اگر تم اتنے بڑے بڑے نشان دیکھ کر اس کی طرف رجوع ہوتے تو وہ اپنی عادت کے موافق تم کو آگے بڑھاتا اور حقیقی کامیابی تک پہنچنے کی راہیں دکھاتا۔ جب تم نے خود یہ نہ چاہا تو اس کی حکمت بھی اسی کو مقتضی ہے کہ تمہیں مجبور نہ کرے۔ پھر فرمائشی نشان دکھلانے کی کیا ضرورت رہی، بلکہ نہ دکھلانے میں تمہارا فائدہ ہے کیونکہ سنۃ اللہ یہ ہے کہ فرمائشی نشان اسی وقت دکھلائے جاتے ہیں جب کسی قوم کا تباہ کرنا مقصود ہو۔

حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا، اے محمد! اگر تم چاہو تو ہم ان کو فرمائشی نشان دکھلا دیں، اس پر بھی نہ مانیں تو ایسا عذاب بھیجا جائے گا جو دنیا میں کسی پر نہ آیا ہو۔ اور اگر تم چاہو تو رحمت و توبہ کا دروازہ کھلا رکھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری شق کو اختیار فرمایا۔ چنانچہ یہ ہی معاندانہ فرمائشیں کرنے والے بہت سے بعد کو مسلمان ہوگئے۔ (تفسیر عثمانی)

الَّذِينَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُم
وہ لوگ جو ایمان لائے اور چین پاتے ہیں ان کے
بِذِكْرِ اللَّهِ
دل اللہ کی یاد سے

اطمینان حاصل کرنے کا نسخہ:

یہ خدا کی طرف رجوع ہونے والوں کا بیان ہوا۔ یعنی ان کو دولت ایمان نصیب ہوتی ہے اور ذکر اللہ (خدا کی یاد) سے چین واطمینان حاصل کرتے ہیں۔ کیونکہ سب سے بڑا ذکر تو قرآن ہے۔ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ۔ جسے پڑھ کر ان کے دلوں میں یقین کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ شبہات اور وساوس شیطانیہ دور ہو کر سکون واطمینان میسر آتا ہے۔ ایک طرف اگر حق تعالیٰ کی عظمت و مہابت دلوں میں خوف و خشیت پیدا کرتی ہے تو دوسری طرف لا محدود رحمت و مغفرت کا ذکر قلبی سکون و راحت کے سامان بہم پہنچاتا ہے۔ غرض ان کا دل ہر طرف سے ٹوٹ کر ایک خدا کی طرف جم جاتا ہے اور ذکر اللہ کا نور ان کے قلوب سے ہر طرح کی دنیوی وحشت اور گھبراہٹ کو دور کر دیتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُم بِذِكْرِ اللَّهِ : اور ان کے دل اللہ یاد سے مطمئن ہو جاتے ہیں، یعنی ان کے دلوں میں ایمان یقین جم جاتا ہے۔ ہر طرح کا شک زائل ہو جاتا ہے۔ ذکر سے مراد ہے قرآن مجید اور اطمینان سے مراد ہے ایمان۔ کیونکہ ایمان دلوں کا سکون ہے اور نفاق دلوں کی بے چینی۔ یا یہ مطلب ہے کہ اللہ کی یاد سے شیطانی وسوسے زائل ہو جاتے ہیں (اس مطلب پر ذکر سے مراد ہوگی اللہ کی یاد صرف قرآن مراد نہ ہوگا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر آدمی کے دل کے دو خانے ہوتے ہیں ایک خانہ میں فرشتہ (کا ظہور) ہوتا ہے اور دوسرے خانہ میں شیطان (کا ظہور) ہوتا ہے۔ جب آدمی اللہ کی یاد کرتا ہے تو شیطان پیچھے کو سمٹ جاتا ہے اور اللہ کی یاد نہیں کرتا تو شیطان اپنی چونچ آدمی کے دل کے اندر رکھ دیتا ہے اس طرح وسوسہ پیدا ہو جاتا ہے۔ رواہ ابن ابی شیبۃ فی المصنف عن عبد اللہ بن شقیق و رواہ البخاری تعلیقاً عن ابن عباس مرفوعاً۔ حضرت ابن عباس کی روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے آدمی کے دل پر شیطان مالش کرتا ہے جب آدمی اللہ کی یاد کرتا

ہے تو شیطان پیچھے کو سکڑ جاتا ہے اور جب اللہ کی یاد سے غافل ہوتا ہے تو شیطان اس کے دل میں وسوسہ ڈال دیتا ہے۔

دلوں کی روزی:

یا آیت کا یہ مطلب ہے کہ اہل ایمان کے پاک وصاف دلوں کی روزی اللہ کی یاد ہے اللہ کی یاد سے ان کو چین اور سکھ ملتا ہے، جیسے مچھلیوں کو پانی میں پرندوں کو ہوا میں اور وحشی جانوروں کو جنگل میں لیکن اگر غفلت آفریں کوئی اندرونی خیال دل میں آجاتا ہے یا اہل غفلت کی صحبت اثر انداز ہوجاتی ہے تو دلوں کا چین جاتا رہتا ہے بے چینی اور عدم سکون پیدا ہوجاتا ہے جیسے پانی سے باہر مچھلی کو اور خشکی کے جانور کو پانی کے اندر اور وحشی جانوروں کو پنجرے میں اضطراب ہوتا ہے۔

صوفیہ صافیہ کے خادموں کے لئے ان حالات کا مشاہدہ بالکل بدیہی ہے ہر مرشد برحق خدمت گذار ان حالات کو دیکھا کرتا ہے اس مطلب پر اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے مراد ہوں گے پاک باطن روشن دل صوفیہ۔ (تفسیر مظہری)

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ۝۲۸
سنتا ہے! اللہ کی یاد ہی سے چین پاتے ہیں دل

ذکر اللہ:

یعنی دولت، حکومت، منصب، جاگیر یا فرمائشی نشانات کا دیکھ لینا، کوئی چیز انسان کو حقیقی سکون واطمینان سے ہم آغوش نہیں کرسکتی۔ صرف یاد الٰہی سے جو تعلق مع اللہ حاصل ہوتا ہے وہ ہی ہے جو دلوں کے اضطراب ووحشت کو دور کرسکتا ہے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ: خوب سن لو اللہ کی یاد سے ہی (پاک صاف) دلوں کو چین ملتا ہے۔

شبہ: بغوی نے اس جگہ ایک شبہ اور اس کا جواب لکھا ہے۔ شبہ کیا جاسکتا ہے کہ اللہ نے دوسری آیت میں فرمایا ہے۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ ۔ بس مومن وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو اُن کے دل ڈر جاتے ہیں اور اس جگہ ذکر الٰہی کو مومن کے قلب کا اطمینان فرمایا گیا ہے۔ ایک حالت میں خوف اور اطمینان ایک دل میں کیسے جمع ہوسکتے ہیں۔

جواب: اس شبہ کا جواب اس طرح دیا گیا ہے کہ عذاب کے ذکر کے وقت مومن کا دل ڈر جاتا ہے اور ثواب کے وعدہ کے ذکر کے وقت اس کے اندر اطمینان پیدا ہوجاتا ہے۔ وہ ڈرتا ہے اللہ کے انصاف اور عذاب سے اور چین پاتا ہے اللہ کے فضل وکرم کے ذکر سے۔ اس جواب کا حاصل یہ ہے کہ اطمینان وخوف میں باہم تضاد ہے (لیکن ایک حالت میں دونوں کا اجتماع نہیں ہوتا، اطمینان کی حالت جدا ہوتی ہے اور خوف کی جدا۔

میرے نزدیک طمانیت اور خوف میں کوئی تضاد نہیں طمانیت انس سے پیدا ہوتی ہے اور انس خوف کی حالت میں بھی ہوتا ہے بلکہ خوف وامید بھی ایک حالت میں جمع ہوسکتے ہیں۔ حضرت انسؓ راوی ہیں کہ ایک جوان کے مرنے کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس تشریف لے گئے اور پوچھا تجھے اپنے دل کی کیا) کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ اس نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اللہ سے امید رکھتا ہوں اور اپنے گناہوں کا مجھے خوف بھی ہے۔ فرمایا ایسے موقع پر جس بندہ کے دل میں یہ دونوں باتیں جمع ہوتی ہیں اللہ ضرور اس کو اس کی امید کے مطابق عطا فرماتا ہے اور جس چیز سے اس کو خوف ہوتا ہے اس چیز سے محفوظ رکھتا ہے رواہ الترمذی وابن ماجہ ترمذی نے اس روایت کو غریب کہا ہے۔ (تفسیر مظہری)

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى
جو لوگ ایمان لائے اور کام کئے اچھے خوشحالی (خوبی) ہے
لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ ۝۲۹
ان کے واسطے اور اچھا ٹھکانا

طُوبیٰ کیا ہے:

مترجم محققؒ نے طوبیٰ کے لغوی معنی لئے ہیں اس کے اندر جنت کا وہ درخت بھی آگیا ہے جسے صحیح حدیث میں طوبیٰ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

حضرت ابن عباس نے طوبیٰ کا ترجمہ کیا ہے خوشی اور خنکی چشم۔

ا۔ حضرت ابن عمر راوی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے طوبیٰ کا ذکر آیا تو فرمایا ابوبکر کیا تم کو معلوم ہے کہ طوبیٰ کیا ہے حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی خوب جانتے ہیں۔

فرمایا طوبیٰ جنت میں ایک درخت ہے جس کی لمبائی سے اللہ ہی واقف ہے اس کی ایک شاخ کے نیچے ستر برس تک گھوڑا سوار چلتا رہے تو اس کو طے نہ کرپائے (ازالۃ الخفا)

سعید بن جبیر نے کہا حبشی زبان میں طوبیٰ باغ (جنت) کو کہتے ہیں۔ بغوی کا بیان ہے کہ حضرت ابوامامہ حضرت ابوہریرہ اور ابودرداء نے فرمایا طوبیٰ جنت میں ایک درخت ہے جو تمام جنتوں پر سایہ فگن ہے۔

عبید بن عمیر نے کہا طوبیٰ جنت عدن کے اندر رسول اللہ کے (جنتی) مکان میں ایک درخت ہے جس کی شاخیں مؤمن کے ہر جنتی مکان اور بالا

خانہ پر سایہ فگن ہیں۔ سوائے سیاہ رنگ کے ہر رنگ اور ہر پھول اور ہر پھل اور ہر میوہ اللہ نے اس درخت میں پیدا کیا ہے اس کی جڑ سے دو چشمے نکلتے ہیں کافور اور سلسبیل مقاتل نے کہا اس کا ہر پتہ ایک گروہ پر سایہ فگن ہے اور ہر پتہ پر ایک فرشتہ اللہ کی طرح طرح کی تسبیح بیان کرنے میں مشغول ہے۔

طوبیٰ درخت کا پھیلاؤ:

حضرت ابو سعید خدری راوی ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ طوبی کیا ہے فرمایا جنت میں ایک درخت ہے (جس کا پھیلاؤ) سو سال کی رفتار کے برابر ہے اہل جنت کے کپڑے اس کے شگوفوں سے برآمد ہونگے رواہ ابن حبان۔

معاویہ بن قرہ نے اپنے باپ کی مرفوع روایت سے بیان کہ طوبی ایک درخت ہے جس کو اللہ نے اپنے ہاتھ سے بویا ہے اس کے اندر اپنی روح سے پھونکا اس درخت سے زیور اور کپڑے پیدا ہوں گے اور اس کی شاخیں حصار جنت کے باہر دکھائی دیں گی۔

بغوی نے اپنی سند سے حضرت ابو ہریرہ کا قول نقل کیا ہے کہ جنت کے اندر ایک درخت ہے جس کے سایہ میں ایک گھوڑا سوار سو برس تک چلتا رہے تب بھی قطع نہ کر سکے اگر تم اس کا ثبوت چاہتے ہو تو

پڑھو وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ (متفق علیہ) امام احمد نے یہ روایت کرنے کے بعد اتنا زائد بیان کیا کہ اس کے پتے جنت کو ڈھانپ لیں گے۔

نہاد بن سری نے الزہد میں اور بغوی نے (تفسیر) میں آخر میں اتنا اور بھی اس کو بیان کیا کہ اس بیان کی اطلاع کعب کو پہنچی تو انھوں نے کہا یہ سچ ہے قسم ہے اس خدا کی جس نے موسی پر تورات اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن نازل کیا اگر کوئی شخص سہ سالہ یا چہار سالہ اونٹ پر سوار ہو کر اس درخت کے تنہ کے گردا گرد چکر لگائے تو دورہ پورا نہ کر سکے یہاں تک کہ (عمر ختم ہو جائے) اور پیر فرتوت ہو کر گر پڑے اللہ نے اس کو اپنے ہاتھ سے بویا ہے اور اپنی روح اس میں پھونکی ہے اس کی شاخیں جنت کے باہر سے نظر آئیں گی (یعنی پوری جنت پر وہ سایہ فگن ہوگا) جنت کی ہر نہر اسی درخت کی جڑ سے نکلتی ہے۔

درخت سے اونٹنی برآمد:

حضرت ابو ہریرہ کا قول ہے کہ جنت میں ایک درخت ہے جس کو طوبی کہا جاتا ہے اللہ اس سے فرمائیگا میرا بندہ جو کچھ چاہتا ہے تو شگافتہ ہو کر اپنے اندر سے اس چیز کو برآمد کر دے حسب الحکم درخت پھٹے گا اور اس کے اندر سے بندہ کی خواہش کے مطابق گھوڑا زین اور لگام پورے ساز سمیت برآمد ہو جائے گا اور بندہ کی خواہش کے مطابق اونٹنی اپنے کجاوے نکیل اور سامان سمیت برآمد ہو جائے گی اور کپڑے بھی پھٹکر اس درخت سے نکلیں گے رواہ بغوی وابن ابی الدنیا

نقل کیا ہے کہ طوبی جنت کے اندر ایک درخت ہے۔ جنت کا ہر درخت اسی سے پیدا ہے اس کی شاخیں حصار جنت سے باہر دکھائی دیں گی۔

گھوڑوں، اونٹوں کی بارش:

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں طوبی کو حکم ہوگا کہ میرے بندوں کے لئے بہترین چیزیں ٹپکا۔ تو اس میں سے گھوڑے اور اونٹ برسنے لگیں گے، سجے سجائے اور زین لگام وغیرہ کسے کسائے اور عمدہ بہترین لباس وغیرہ۔

طوبیٰ کا تفصیلی تعارف:

ابن جریرؒ نے اس جگہ ایک عجیب و غریب اثر وارد کیا ہے۔ وہبؒ کہتے ہیں کہ جنت میں ایک درخت ہے جس کا نام طوبی ہے کہ جس کے سائے تلے سوار سو سال تک چلتا رہیگا لیکن ختم نہ ہوگا۔ اس کی ترو تازگی کھلے ہوئے چمن کی طرح ہے۔ اس کے پتے بہترین اور عمدہ ہیں۔ اس کے خوشے عنبریں ہیں۔ اس کے کنکر یاقوت ہیں اس کی مٹی کافور ہے۔ اس کا گارا مشک ہے اس کی جڑ سے شراب کی دودھ کی اور شہد کی نہریں بہتی ہیں۔ اس کے نیچے جنتیوں کی مجلس کی ہو ل گی۔ یہ بیٹھے ہوئے ہونگے جوان کے پاس فرشتے اور اونٹنیاں لیکر آئیں گے جن کی زنجیریں سونے کی ہوں گی۔ جن کے چہرے چراغ جیسے چمکتے ہوئے ہوں گے۔ بال ریشم جیسے نرم ہوں گے جن پر یاقوت جیسے پالان ہوں گے جن پر سونا جڑاؤ ہو رہا ہوگا۔ جن پر ریشمی جھولیں ہوں گی۔ وہ اونٹنیاں ان کے سامنے پیش کریں گے۔ اور کہیں گے کہ یہ سواریاں تمہیں بھجوائی گئی ہیں اور دربار خدا میں تمہارا بلاوا ہے۔ یہ ان پر سوار ہوں گے۔ وہ پرندوں کی رفتار سے بھی تیز رفتار ہوں گی۔ جنتی ایک دوسرے سے ملکر چلیں گے۔ اونٹنیوں کے کان سے کان بھی نہ ملیں گے پوری فرمانبرداری کے ساتھ چلیں گی۔ راستے میں جو درخت آئیں گے وہ خود بخود ہٹ جائیں گے کہ کسی کو اپنے ساتھی سے الگ نہ ہونا پڑے یوں ہی رحمان و رحیم خدا کے پاس پہنچیں گے خدائے تعالی اپنے چہرے سے پردے ہٹا دے گا یہ اپنے رب کے منہ کو دیکھیں گے اور کہیں گے اللھم انت السلام و الیک السلام و حق لک الجلال و الا کرام.

ان کے جواب میں اللہ تعالی رب العزت فرمائیگا انا السلام و من السلام تم پر میری رحمت سابق ہو چکی اور محبت بھی میرے ان بندوں کو مرحبا ہو جو بن دیکھے مجھ سے ڈرتے رہے۔ میری فرمانبرداری کرتے رہے۔ جنتی کہیں گے باری تعالی نہ تو ہم سے تیری عبادت کا حق ادا ہوا نہ تیری پوری قدر ہوئی۔ ہمیں اجازت دے کہ تیرے سامنے سجدہ کریں اللہ تعالی فرمائے گا یہ محنت کی جگہ نہیں ہے نہ عبادت کی یہ تو نعمتوں راحتوں اور مالا مال ہونے کی جگہ ہے۔ عبادتوں کی تکلیف جاتی رہی۔ مزے لوٹنے کے دن آگئے۔ جو چاہو مانگو پاؤ

گے، تم میں سے جو شخص جو مانگے اسے دونگا۔ پس یہ مانگیں گے۔ کم سے کم سوال والا کہے گا تو خدایا تو نے دنیا میں جو پیدا کیا تھا جس میں تیرے بندے ہائے وائے کررہے تھے۔ میں چاہتا ہوں کہ شروع دنیا سے آخر دنیا تک جو دنیا میں جتنا کچھ تھا مجھے عطا فرما۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو نے کچھ نہ مانگا۔ اپنے مرتبے سے بہت کم چیز مانگی۔ اچھا ہم نے دی۔ میری بخشش اور دین میں کیا کمی ہے؟ پھر فرمائے گا جن چیزوں تک میرے ان بندوں کے خیالات کی رسائی بھی نہیں وہ انہیں دو۔ چنانچہ دی جائیں گی یہاں تک کہ ان کی خواہشیں پوری ہو جائیگی۔ ان چیزوں میں جو انہیں یہاں ملیں گے تیز رو گھوڑے ہوں گے، ہر چار پر یاقوتی تخت ہوگا، ہر تخت پر سونے کا ایک ڈیرہ ہوگا، ہر ڈیرے میں جنتی فرش ہوگا جن پر بڑی بڑی آنکھوں والی دو دو حوریں ہوں گی، جو دو دو حلے پہنے ہوئے ہونگی جن میں جنت کے تمام رنگ ہوں گے اور تمام خشبوئیں ان خیموں سے باہر سے ان کے چہرے ایسے چمکتے ہونگے گویا وہ باہر بیٹھی ہیں۔ ان کی پنڈلی کے اندر کا گودا باہر سے نظر آرہا ہوگا جیسے سرخ یاقوت میں ڈورا پرویا ہوا ہو اور وہ اوپر سے نظر آرہا ہو۔ ہر ایک دوسرے پر اپنی فضیلت ایسی جانتی ہوگی جیسی فضیلت سورج کی پتھر پر۔ اسی طرح جنتی کی نگاہ میں بھی دونوں ایسی ہی ہوں گی۔ یہ ان کے پاس جائے گا اور ان سے بوس وکنار میں مشغول ہو جائے گا۔ وہ دونوں اسے دیکھ کر کہیں گی واللہ ہمارے تو خیال میں بھی نہ تھا کہ خدا تم جیسا خاوند ہمیں دیگا۔ اب بحکم خدا اسی طرح صف بندی کیساتھ سواریوں پر یہ واپس ہوں گے اور اپنی منزلوں میں پہنچیں گے۔ دیکھو تو سہی خدائے وہاب نے انہیں کیا کیا نعمتیں عطا فرما رکھی ہیں؟ وہاں بلند درجہ لوگوں میں اونچے اونچے بالا خانوں میں جو نرے موتی کے بنے ہوئے ہوں گے۔ جن کے دروازے سونے کے ہونگے۔ جن کے تخت یاقوت کے ہونگے جن کے فرش نرم اور موٹے ریشم کے ہوں گے۔ جن کے منبر نور کے ہوں گے جن کی چمک سورج کی چمک سے بالاتر ہوگی۔ اعلیٰ علیینؔ میں ان کے محل ہوں گے، یاقوت کے بنے ہوئے نورانی جن کے نور سے آنکھوں کی روشنی جاتی رہے لیکن خدائے تعالیٰ ان کی آنکھیں ایسی نہ کرے گا۔ جو محلات یا قوت سرخ کے ہونگے ان میں سبز ریشمی فرش ہونگے اور جو زرد یاقوت کے ہونگے ان کے فرش سرخ مخمل کے ہوں گے جو زمرد اور سونے کے جڑاؤ کے ہونگے اور انکے تختوں کے پائے جواہر کے ہوں گے۔ ان کی چھتیں لنو لنو کی ہوں گی۔ ان کے برج مرجان کے ہوں گے۔ ان کے پہنچنے سے پہلے ہی خدائی تحفے وہاں پر پہنچ چکے ہوں گے۔ سفید یاقوتی گھوڑے غلمان لئے کھڑے ہونگے جن کا سامان چاندی کے جڑاؤ کا ہوگا۔ ان کے تخت پر اعلیٰ ریشمی نرم دبیز فرش بچھے ہوں گے۔ یہ ان سواریوں پر سوار ہو کر بے تکلف جنت میں جائینگے، دیکھیں گے کہ ان کے گھروں کے پاس نورانی منبروں پر فرشتے

ان کے استقبال کے لئے بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ ان کا شاندار استقبال کریں گے مبارکباد دینگے۔ مصافحہ کریں گے پھر یہ اپنے گھروں میں داخل ہونگے انعامات خدا وہاں موجود پائیں گے اور دو پھلی پھولی جن میں دو جنتیں ہری بھری پائیں گے اور دو پھلی پھولی جن میں دو چشمے پوری روانی سے جاری ہوں گے اور ہر قسم کے جوڑ دار میوے ہوں گے اور خیموں میں پاکدامن بھولی بھالی پردہ نشین حوریں ہوں گی۔ جب یہ یہاں پہنچ کر راحت و آرام میں ہوں گے اس وقت اللہ رب العزت فرمائے گا میرے پیارے بندو! تم نے میرے وعدے سچے پائے؟ کیا تم میرے ثوابوں سے خوش ہو گئے؟ وہ کہیں گے کہ خدایا ہم خوب خوش ہو گئے، بہت ہی رضامند ہیں دل سے راضی ہیں کلی کلی کھلی ہوئی ہے، تو بھی ہم سے خوش رہ، اللہ تعالیٰ فرمائے گا اگر میری رضامندی نہ ہوتی تو میں اپنے اس مہمان خانے میں تمہیں کیسے داخل ہونے دیتا؟ اپنا دیدار کیسے دکھاتا؟ میرے فرشتے تم سے مصافحہ کیوں کرتے؟ تم خوش رہو بآرام رہو تمہیں مبارک ہو تم پھلو پھولو اور سکھ چین اٹھاؤ، میرے یہ انعامات گھٹنے اور ختم ہونے والے نہیں، اس وقت وہ کہیں گے خدا ہی کی ذات سزاوار تعریف ہے جس نے ہم سے غم ورنج کو دور کر دیا اور ایسے مقام پر پہنچایا کہ جہاں ہمیں کوئی تکلیف کوئی مشقت نہیں، یہ اسی کا فضل ہے، وہ بڑا ہی بخشنے والا اور قدردان ہے یہ سیاق غریب ہے اور یہ اثر عجیب ہے ہاں اسکے بعض شواہد بھی موجود ہیں، چنانچہ صحیحین میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بندے سے جو سب سے اخیر جنت میں جائے گا فرمائے گا کہ مانگ وہ مانگتا جائے گا اور کریم دیتا جائے گا یہاں تک کہ اس کا سوال پورا ہو جائے گا۔ اب اس کے سامنے کوئی خواہش باقی نہیں رہے گی تو اب اللہ تعالیٰ خود اسے یاد دلائے گا کہ یہ مانگ یہ مانگ یہ مانگے گا اور پائے گا پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا یہ سب میں نے تجھے دیا اور اتنا ہی اور بھی دس مرتبہ عطا فرمایا، صحیح مسلم شریف کی قدسی حدیث میں ہے کہ اے میرے بندو تمہارے اگلے پچھلے انسان جنات سب ایک میدان میں کھڑے ہو جائیں اور مجھ سے دعائیں کریں اور مانگیں، میں ہر ایک کے تمام سوالات پورے کروں لیکن میرے ملک میں اتنی بھی کمی نہ آئے گی جتنی کمی سوئی کے سمندر میں ڈبونے سے سمندر کے پانی میں آئے۔ الخ خالد بن معدانؒ کہتے ہیں، جنت کے ایک درخت کا نام طوبیٰ ہے، اس میں تھن ہیں جن سے جنتیوں کے بچے دودھ پیتے ہیں کچے گرے ہوئے بچے جنت کی نہروں میں ہیں۔ قیامت کے قائم ہونے تک پھر چالیس سال کے بن کر اپنے ماں باپ کے ساتھ جنت میں رہیں گے۔ (تفسیر ابن کثیر)

كَذٰلِكَ اَرۡسَلۡنٰكَ فِىۡۤ اُمَّةٍ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ

اسی طرح تجھ کو بھیجا ہم نے ایک امت میں کہ گزر چکی ہیں

قَبۡلِهَآ أُمَمٌ لِّتَتۡلُوَاْ عَلَيۡهِمُ ٱلَّذِيٓ

اس سے پہلے بہت امتیں تاکہ سناوے تو ان کو جو حکم بھیجا

أَوۡحَيۡنَآ إِلَيۡكَ

ہم نے تیری طرف

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد:

یعنی جس طرح ہم اپنی طرف رجوع ہونے والوں کو کامیابی کی راہ دکھاتے ہیں اسی طرح اس امت کی رہنمائی کے لئے ہم نے تجھے مبعوث کیا، تا جو کتاب اپنی رحمت کاملہ سے تجھ پر اتاری ہے آپ ان کو پڑھ کر سنا دیں، آپ کا پیغمبر بنا کر بھیجا جانا کوئی انوکھی بات نہیں پہلی امتوں کی طرف بھی پیغمبر بھیجے جا چکے ہیں جو اس وقت تکذیب کرنیوالوں کا حشر ہوا ان لوگوں کو بھی پیش نظر رہنا چاہئے۔

وَهُمۡ يَكۡفُرُونَ بِٱلرَّحۡمَٰنِۚ

اور وہ منکر ہوتے ہیں رحمٰن سے

قریش رحمٰن کے منکر تھے:

یعنی رحمان نے اپنی رحمت کاملہ سے قرآن اُتارا "اَلرَّحۡمٰنُ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ" اور آپ کو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا، مگر انہوں نے سخت ناشکری اور کفران نعمت پر کمر باندھ لی رحمان کا حق ماننے سے منکر ہو گئے بلکہ اس نام سے ہی وحشت کھانے لگے، اسی لئے "حدیبیہ" کے صلح نامہ میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھنے پر جھگڑا کیا۔" وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمُ اسۡجُدُوۡا لِلرَّحۡمٰنِ قَالُوۡا وَمَا الرَّحۡمٰنُ۔" (فرقان۔ رکوع ۵) (تفسیر عثمانی)

ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے بھی قتادہ کا یہ بیان نقل کیا ہے، اس کی توضیح اس طرح ہے کہ جب قریش اور صحابہ کا صلح نامہ لکھنے پر اتفاق ہو گیا اور سہل بن عمرو قریش کی طرف سے آ گیا سورۃ الفتح میں تفصیل کے ساتھ ہم نے لکھ دیا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی سے فرمایا، لکھو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، قریش بولے ہم تو الرحمٰن کو نہیں جانتے ہم تو صرف یمامہ والے رحمٰن (یعنی مسیلمۂ کذاب) کو جانتے ہیں (ہم اللہ کو رحمٰن نہیں کہتے) تم وہی لکھو جو پہلے لکھتے تھے، یعنی باسمک اللھم (سے تحریر شروع کرو) وَهُمۡ يَكۡفُرُوۡنَ بِالرَّحۡمٰنِ کا یہی مطلب ہے (یعنی یہ لوگ اللہ کے رحمٰن ہونے کا انکار کرتے ہیں) (تفسیر مظہری)

قُلۡ هُوَ رَبِّي لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ عَلَيۡهِ تَوَكَّلۡتُ

تو کہہ وہی رب میرا ہے کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا، اسی پر میں

وَإِلَيۡهِ مَتَابِ ﴿۳۰﴾

نے بھروسہ کیا ہے اور اسی کی طرف آتا ہوں رجوع کر کے

توکل علی اللہ:

یعنی جس رحمٰن سے تم انکار کرتے ہو وہ ہی میرا رب ہے اور وہ ہی اللہ ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ "قُلِ ادۡعُوا اللّٰهَ اَوِ ادۡعُوا الرَّحۡمٰنَ اَيًّا مَّا تَدۡعُوۡا فَلَهُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰى" (بنی اسرائیل۔ رکوع ۱۲)

میرا آغاز و انجام سب اُسی کے ہاتھ میں ہے میں اُسی پر توکل کرتا ہوں، نہ تمہارے انکار و تکذیب سے مجھے ضرر اندیشہ ہے نہ اس کی امداد و اعانت سے مایوس ہوں۔ (تفسیر عثمانی)

طبرانی وغیرہ نے حضرت ابن عباس کے حوالہ سے لکھا ہے کہ قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تم جو کچھ کہہ رہے ہو اگر وہ صحیح ہے تو ہمارے مردہ اسلاف کو ہم سے ملا دو تاکہ ہم ان کو دیکھیں اور ان سے باتیں کریں اور وہ تمہاری تصدیق کریں۔

وَلَوۡ أَنَّ قُرۡءَانٗا سُيِّرَتۡ بِهِ ٱلۡجِبَالُ أَوۡ

اور اگر کوئی قرآن ہوا ہوتا کہ چلیں اس سے پہاڑ یا ٹکڑے ہووے

قُطِّعَتۡ بِهِ ٱلۡأَرۡضُ أَوۡ كُلِّمَ بِهِ ٱلۡمَوۡتَىٰۗ بَل

اس سے زمین یا بولیں (بولنے لگیں) اس سے مردے تو کیا ہوتا

لِّلَّهِ ٱلۡأَمۡرُ جَمِيعًاۗ

بلکہ سب کام تو اللہ کے ہاتھ میں ہیں

قرآن پاک: یہاں قرآن سے مراد عام کتاب ہے جیسا کہ ایک حدیث صحیح میں "زبور" پر لفظ قرآن کا اطلاق ہوا ہے یعنی اگر کوئی کتاب ایسی اتاری جاتی جس سے تمہارے یہ فرمائشی نشان پورے ہو جاتے تو وہ بجز اس قرآن کے اور کونسی ہو سکتی تھی۔ یہ ہی قرآن ہے جس نے رُوحانی طور پر پہاڑوں کی طرح جمے ہوئے لوگوں کو اُن کی جگہ سے ہٹا دیا قلوب بنی آدم کی زمینوں کو پھاڑ کر معرفت الٰہی کے چشمے جاری کر دیے وصول الی اللہ کے راستے برسوں کی جگہ منٹوں میں طے کرائے، مُردہ قوموں اور دلوں میں ابدی زندگی کی روح پھونک دی جب ایسے قرآن سے تم کو شفاء و ہدایت نصیب نہ ہوئی تو فرض کرو تمہاری طلب کے موافق اگر یہ قرآن مادی اور حسی طور پر بھی وہ سب چیزیں دکھلا دیتا جن کی فرمائش کرتے ہو تب ہی کیا امید تھی کہ تم ایمان لے آتے اور نئی حجتیں اور کج بحثیاں شروع نہ کرتے تم ایسے ضدی اور سرکش واقع

ہوئے ہو کہ کسی نشان کو دیکھ کر ایمان لانے والے نہیں۔ اصل یہ ہے کہ سب کام (ہدایت واضلال) اللہ کے ہاتھ میں ہیں جسے وہ نہ چاہے قیامت تک ہدایت نہیں ہوسکتی لیکن وہ اسی کو چاہتا ہے جو اپنی طرف سے قبول حق کی خواہش اور تڑپ رکھتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

مسند میں ہے حضرت داؤد پر قرآن اس قدر آسان کر دیا گیا تھا کہ ان کے حکم سے سواری کسی جاتی اس کے تیار ہونے سے پہلے ہی وہ قرآن کو ختم کر دیتے سوا اپنے ہاتھ کی کمائی کے وہ اور کچھ نہ کھاتے تھے پس مراد یہاں قرآن سے زبور ہے کیا ایماندار اب تک اس سے مایوس نہیں ہوئے کہ تمام مخلوق ایمان نہیں لانے کی، کیا وہ مشیت خدا کے خلاف کچھ کر سکتے ہیں، رب کی یہ منشا ہی نہیں، اگر ہوتی تو روئے زمین کے لوگ مسلمان ہو جاتے بھلا اس قرآن کے بعد کس معجزے کی ضرورت دنیا کو رہ گئی؟ اس سے بہتر اس سے واضح اس سے صاف اس سے زیادہ دلوں میں گھر کرنے والا اور کون سا کلام ہوگا؟ اسے تو اگر بڑے بڑے پہاڑ پر اتارا جاتا تو وہ بھی خشیت خدا سے چکنا چور ہو جاتا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ہر نبی کو ایسی چیز ملی کہ لوگ اس پر ایمان لائیں میری ایسی چیز خدا کی یہ وحی ہے پس مجھے امید ہے کہ سب نبیوں سے زیادہ تابعداروں والا میں ہو جاؤں گا مطلب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے معجزے ان کے ساتھ ہی چلے گئے اور میرا یہ معجزہ جیتا جاگتا رہتی دنیا تک رہے گا نہ اس کے عجائبات ختم ہوں نہ یہ کثرت تلاوت سے پرانا ہو نہ اس سے علماء کا پیٹ بھر جائے یہ فضل ہے دل لگی نہیں، جو سرکش اسے چھوڑ دے گا اللہ اسے توڑ دے گا جو اس کے سوا اور میں ہدایت تلاش کرے گا اسے خدا گمراہ کر دے گا۔ (تفسیر ابن کثیر)

اَفَلَمْ يَايْـَٔسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ لَّوْ يَشَآءُ
سو کیا خاطر جمع نہیں ایمان والوں کو اس پر اگر چاہے
اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا
اللہ تو راہ پر لائے سب لوگوں کو

بعض مسلمانوں کے خیال کی تصحیح:

شاید بعض مسلمانوں کو خیال گذرا ہو گا کہ ایک مرتبہ ان کی فرمائش ہی پوری کر دی جائے شاید ایمان لے آئیں ان کو سمجھایا کہ خاطر جمع رکھو اگر خدا چاہے تو بدون ایک نشان دکھلائے ہی سب کو راہِ راست پر لے آئے، لیکن یہ اُس کی عادت وحکمت کے خلاف ہے اُس نے انسان کو ایک حد تک کسب و اختیار کی آزادی دے کر ہدایت کے کافی اسباب فراہم کر دیے، جو چاہے اُن سے منتفع ہو، کیا ضرورت ہے کہ اُن کی فرمائشیں پوری کی جائیں باوجود کافی سامان ہدایت موجود ہونے کے اگر معاندین نہیں مانتے اور اپنے ایمان کو بیہودہ فرمائشوں پر معلق کرتے ہیں تو ہم نے یہ ارادہ بھی نہیں کیا کہ ساری دنیا کو ضرور منوا ہی دیا جائے۔ آخر ''لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ'' والی بات بھی تو پوری ہو کر رہے گی۔ (تفسیر عثمانی)

اَفَلَمْ يَايْـَٔسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا کیا (ان کافروں کے ایمان لانے سے) اہل ایمان ابھی ناامید نہیں ہوئے باوجود یہ کہ ان معجزات سے بڑھ چڑھ کر یہ کافر معجزات دیکھ چکے پھر بھی ایمان نہ لائے چاند پھٹنے کا معجزہ انہوں نے دیکھا پھر بھی تصدیق نہیں کی کنکریوں کا کلام کرنا، انہوں نے دیکھ لیا اور ایمان نہ لائے، پہاڑوں کے رواں کرنے اور دوش ہوا پر قطع مسافت کرنے سے تو چاند کے پھٹنے کا معجزہ زیادہ مؤثر ہونا چاہئے اور مردوں کے کلام کرنے سے کنکریوں کا بولنا زیادہ مشکل ہے، جب یہ معجزات ان کو قبول ایمان پر آمادہ نہ کر سکے تو فرمائشی معجزات کی تکمیل کیا ایمان بخش ہوسکتی ہے۔ (تفسیر مظہری)

وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا
اور برابر پہنچتا رہے گا منکروں کو ان کی کر
صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ
توت پر صدمہ (دھڑکا) یا اترے گا ان کے گھر سے
دَارِهِمْ حَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ
نزدیک جب تک کہ پہنچے وعدہ اللہ کا بے شک اللہ
لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿۳۱﴾
خلاف نہیں کرتا اپنا وعدہ

ان کا علاج جہاد ہے:

یعنی یہ کفار مکہ فرمائشی نشانوں سے ماننے والے نہیں، یہ تو اس طرح مانیں گے کہ برابر کوئی آفت و مصیبت خود ان پر یا ان کے آس پاس والوں پر پڑتی رہے جسے دیکھ کر یہ عبرت حاصل کریں مثلاً جہاد میں مسلمانوں کے ہاتھوں سے کچھ قتل ہونگے کچھ قید کیے جائینگے کچھ دوسری طرح کے مصائب کا شکار ہونگے یہ ہی سلسلہ رہے گا جب تک خدا کا وعدہ پورا ہو یعنی مکہ فتح ہو اور ''جزیرۃ العرب'' شرک کی گندگی سے پاک وصاف ہو جائے بے شک خدا کا وعدہ اٹل ہے، پورا ہو کر رہے گا، بعض مفسرین نے اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف خطاب مانا ہے یعنی آپ ان کی بستی کے قریب اتریں گے جیسا کہ حدیبیہ میں ہوا اس وقت ''قارعۃ'' سے وہ سرایا مراد ہونگے جن میں آپ بہ نفس

نفیس شریک نہ ہوتے تھے بعض سلف سے منقول ہے کہ آیت تمام کفار کے حق میں عام ہے، مکہ والوں کی تخصیص نہیں۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ قارعہ کے معنی مصیبت اور آفت کے ہیں معنی آیت کے یہ ہیں کہ ان مشرکین کے مطالبات تو اس لئے منظور نہیں کئے گئے کہ ان کی بدنیتی اور ہٹ دھرمی معلوم تھی کہ پورے کرنے پر بھی یہ ایمان لانے والے نہیں۔ (معارف القرآن)

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَأَمْلَيْتُ
اور ٹھٹھا کر چکے ہیں کتنے رسولوں سے
لِلَّذِينَ كَفَرُوا ثُمَّ أَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ
تجھ سے پہلے سو ڈھیل دی میں نے منکروں کو پھر ان کو پکڑ لیا سو کیسا
كَانَ عِقَابِ ﴿۳۲﴾
تھا میرا بدلہ

ڈھیل سے بے خوف نہ ہو:

یعنی سزا ملنے میں دیر ہو تو مت سمجھو کہ چھوٹ گئے، گذشتہ مجرموں کو بھی پہلے ڈھیل دی گئی، پھر جب پکڑا تو دیکھ لو کیا حشر ہوا، آج تک اُن کی تباہی کی داستانیں زبانوں پر ہیں۔

أَفَمَنْ هُوَ قَائِمٌ عَلَىٰ كُلِّ نَفْسٍ بِمَا
بھلا جو لئے کھڑا ہے ہر کسی کے سر پر جو کچھ اس نے کیا ہے (اوروں
كَسَبَتْ ۗ وَجَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ
کی برابری ہو سکتا ہے) اور مقرر کرتے ہیں اللہ کیلئے شریک

خدا کسی سے غافل نہیں:

یعنی جو خدا ہر شخص کے ہر عمل کی ہر وقت نگرانی رکھتا ہے، ایک لمحہ کسی سے غافل نہیں، ذرا کوئی شرارت کرے اُسی وقت تنبیہ کر سکتا اور سزا دے سکتا ہے کیا مجرم اُس سے چھوٹ کر کہیں بھاگ سکتے ہیں؟ یا اُس کی مثل پتھر کی وہ مورتیاں ہو سکتی ہیں جو نہ دیکھتی ہیں نہ سنتی ہیں نہ اپنے یا دوسرے کے نفع و ضرر کا پتہ اختیار رکھتی ہیں تعجب ہے کہ ایسے خدا کی موجودگی میں انسان ایسی عاجز و حقیر مخلوق کے آگے سر جھکائے اور اس کی خدائی کے اختیارات تفویض کر دے اس ظلم کی بھی کوئی انتہا ہے کہ علیم الکل اور بہمہ صفت موصوف خدا کے شریک وہ ہوں جنہیں خود اپنے وجود کی خبر نہیں، خوب سمجھ لو کہ جو کچھ ہم خفیہ یا علانیہ کرتے ہیں سب خدا کی آنکھ کے سامنے ہے۔ لوگوں کی ان مشرکانہ گستاخیوں سے وہ بے خبر نہیں، جلد یا بدیر سزا مل کر رہے گی۔

قُلْ سَمُّوهُمْ ۚ
کہہ ان کا نام لو

یعنی ذرا آگے بڑھ کر اُن شرکاء کے نام تو لو اور پتے تو بتاؤ، کیا خداوند قدوس کی یہ صفات سن کر جو اُوپر بیان ہوئیں کوئی حیادار اُن پتھروں کا نام بھی لے سکتا ہے؟ اور بے حیائی سے ''لات'' و ''عزیٰ'' کے نام لینے لگو تو کیا کوئی عاقل اُدھر التفات کر سکتا ہے؟

أَمْ تُنَبِّئُونَهُ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْأَرْضِ
یا اللہ کو بتلاتے ہو جو وہ نہیں جانتا زمین میں

خدا کا کوئی شریک نہیں ہے:

یعنی خدا کو تمام رُوئے زمین پر اپنی خدائی کا کوئی شریک (حصہ دار) معلوم نہیں (کیونکہ ہے ہی نہیں جو معلوم ہو) کیا تم اُسے وہ چیز بتلاؤ گے جسے وہ نہیں جانتا؟ (العیاذ باللہ) (تنبیہ) زمین کی قید اس لئے لگائی کہ بت پرستوں کے نزدیک شرکاء (اصنام) کی قیامگاہ یہ ہی زمین تھی، ابوحیان نے ''لَا يَعْلَمُ'' کی ضمیر ''مَا'' کی طرف لوٹائی ہے، یعنی کیا خدا کو بتلاتے ہو کہ آپ کی خدائی کے حصہ دار وہ بت ہیں جو ادنیٰ سا علم بھی نہیں رکھتے۔ (تفسیر عثمانی)

پس کیا تم بتوں کے وہ اوصاف بتا سکتے ہو جن کی وجہ سے وہ مستحق عبادت ہو سکیں اور ایسے شریکوں کی صفات بیان کر سکتے ہو جو مستحق عبادت قرار پا سکیں۔

أَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ ۗ
یا کرتے ہو اوپر ہی اوپر باتیں

شرک کی کوئی حقیقت نہیں ہے:

پہلے فرمایا تھا اُن شرکاء کا ذرا نام لو، پھر متنبہ فرمایا کہ جس چیز کا واقع میں ثبوت ہی نہیں اُس کا نام کیا لیا جا سکتا ہے؟ اب بتلاتے ہیں کہ کسی چیز کو خدا کا شریک ٹھہرانا خالی الفاظ اور صورت محض ہے جس کے نیچے کوئی حقیقت نہیں، مجرّد ظن و تخمین اور باطل اوہام سے چند بے معنی الفاظ بامعنی نہیں بن جاتے۔ شاید ''بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ'' میں ادھر بھی اشارہ ہو کہ جو مشرکانہ باتیں وہ کر رہے ہیں اگر کورانہ تقلید و تعصب سے خالی ہو کر اپنے ضمیر کی طرف رجوع کریں تو خود اُن کا ضمیر بھی ان لغویات سے انکار کرے گا، اس لئے کہنا چاہئے کہ یہ سب اُوپر اُوپر کی باتیں ہیں جن کو انسانی ضمیر اور انسانی فطرت دونوں مردود ٹھہرا چکے ہیں۔

بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ

یہ نہیں بلکہ بھلے سجھا دیے ہیں منکروں کو ان کے فریب

وَصُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ ۭ

اور وہ روک دیئے گئے ہیں راہ سے

فقط دھوکہ ہے:

یعنی کچھ بھی نہیں، شرک کی حمایت میں اُن کی یہ مستعدی اور توحید کے مقابلہ میں اس قدر جدو جہد خالی نفس کا دھوکہ اور شیطان کا فریب ہے، اسی نے اُن کو راہِ حق سے روک دیا ہے۔

وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۳۳﴾

اور جس کو گمراہ کرے اللہ سو کوئی نہیں اس کو راہ بتانے والا

ہدایت اللہ کے پاس ہے:

یعنی جسے خدا ہدایت کی توفیق نہ دے اسے کون راہ پر لا سکتا ہے اور وہ اُسی کو توفیق دیتا ہے جو باختیارِ خود ہدایت کے دروازے اپنے اوپر بند نہ کرلے۔

لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا

ان کو مار پڑتی ہے دنیا کی زندگی میں

مجاہدین کے ہاتھوں سے یا بلا واسطہ قدرت کی طرف سے۔

وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنَ

اور آخرت کی مار تو بہت ہی سخت ہے اور کوئی نہیں ان کو

اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ﴿۳۴﴾

اللہ سے بچانے والا

یعنی بے سزا دیے چھوڑے گا نہیں پھر وہاں کی سزا کا کیا پوچھنا۔

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ تَجْرِيْ

حال جنت کا جس کا وعدہ ہے پرہیز گاروں سے بہتی ہیں

مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ اُكُلُهَا دَآئِمٌ

اس کے نیچے نہریں میوہ اس کا ہمیشہ ہے

جنت کا تعارف:

جس کی کوئی نوع کبھی ختم نہ ہوگی اور ہمیشہ وہ ہی ملے گا جس کی خواہش کرینگے۔ "لَا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ" (واقعہ۔رکوع۱) (تفسیر عثمانی)

اُكُلُهَا دَآئِمٌ اس کے پھل ہمیشہ ہوں گے کبھی منقطع نہ ہوں گے۔ بزار اور طبرانی کا بیان ہے کہ حضرت ثوبان نے فرمایا، میں نے خود سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمار ہے تھے جنت والوں میں سے جو شخص بھی جنت کا کوئی پھل لے گا فوراً اس کی جگہ ویسا ہی دوسرا پھل دوبارہ آ جائے گا۔ (تفسیر مظہری)

ابویعلیٰ میں ہے کہ ایک دن ظہر کی نماز میں ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے کہ آپ ناگاہ آگے بڑھے اور ہم بھی بڑھے، پھر ہم نے دیکھا کہ آپ نے گویا کوئی چیز لینے کا ارادہ کیا پھر آپ پیچھے ہٹ آئے، نماز کے خاتمہ کے بعد حضرت ابی بن کعبؓ نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ! آج تو ہم نے آپ کو ایسا کام کرتے ہوئے دیکھا کہ آج سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ آپ نے فرمایا ہاں میرے سامنے جنت پیش کی گئی جو تروتازگی سے مہک رہی تھی، میں نے چاہا کہ اس میں سے ایک خوشہ انگور کا توڑ لاؤں لیکن میرے اور اس کے درمیان آڑ کر دی گئی، اگر میں اسے توڑ لاتا تو تمام دنیا اسے کھاتی اور پھر بھی ذرا سا بھی کم نہ ہوتا، ایک دیہاتی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ جنت میں انگور ہوں گے؟ آپ نے فرمایا ہاں، اس نے کہا کتنے بڑے خوشے ہوں گے؟ فرمایا اتنے بڑے کہ اگر کوئی کالا کوا مہینہ بھر اڑتا رہے تو بھی اس خوشے سے آگے نہ نکل سکے، اور حدیث میں ہے کہ جنتی جب کوئی پھل توڑیں گے اسی وقت اس کی جگہ دوسرا لگ جائے گا حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جنتی خوب کھائیں پئیں گے لیکن نہ تھوک آئے گی نہ ناک آئے گا نہ پیشاب نہ پاخانہ، مشک جیسی خوشبو والا پسینہ آئے گا، اور اسی سے کھانا ہضم ہو جائے گا جیسے سانس بے تکلف چلتا ہے اسی طرح تسبیح و تقدیس الہام کی جائے گی (مسلم وغیرہ) ایک اہلِ کتاب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ فرماتے ہیں جنتی کھائیں پئیں گے؟ آپ نے فرمایا ہاں ہاں اس کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے کہ ہر شخص کو کھانے پینے اور جماع اور شہوت کی اتنی قوت دی جائے گی جتنی یہاں سو آدمیوں کو مل کر ہو اس نے کہا، اچھا تو جو کھائے گا پئے گا اسے پیشاب پاخانے کی بھی حاجت ہوگی، پھر جنت میں گندگی کیسی؟ آپ نے فرمایا نہیں بلکہ پسینے کے راستے سب ہضم ہو جائے گا اور وہ پسینہ مشک بو ہوگا (مسند و نسائی) فرماتے ہیں کہ جس پرندے کی طرف کھانے کے ارادے سے جنتی نظر ڈالے گا وہ اسی وقت بھنا بھنایا اس کے سامنے گر پڑے گا بعض روایتوں میں ہے کہ پھر وہ اسی طرح بحکم خدا زندہ ہو کر اڑ جائے گا قرآن میں ہے، وہاں بکثرت میوے ہونگے کہ نہ کٹیں نہ ٹوٹیں نہ ختم ہوں نہ گھٹیں سایے

جھکے ہوئے، شاخیں نیچی، سایہ بھی ہمیشگی والے ہوں گے۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَّظِلُّهَا ؕ
اور سایہ بھی

جنت کے سائے:

یعنی سایہ بھی ہمیشہ آرام دہ رہے گا نہ کبھی دھوپ کی تپش ہوگی نہ سردی کی تکلیف۔ ''لَا یَرَوۡنَ فِیۡهَا شَمۡسًا وَّلَا زَمۡهَرِیۡرًا'' (دھر رکوع ۱) (تفسیر عثمانی)

خطیب دمشق حضرت بلال بن سعدؒ فرماتے ہیں کہ بندگان خدا کیا تمہارے کسی عمل کی قبولیت کا یا کسی گناہ کی معافی کا کوئی پروانہ تم میں سے کسی کو ملا؟ کیا تم نے یہ گمان کر لیا ہے کہ تم بیکار پیدا کئے گئے ہو اور تم خدا کے بس میں آنے والے نہیں ہو، واللہ اگر اطاعتِ خداوندی کا بدلہ دنیا میں ہی ملتا تو تم تمام نیکیوں پر جم جاتے، کیا تم دنیا پر ہی فریفتہ ہو گئے ہو؟ کیا اسی کے پیچھے مر مٹو گے؟ کیا تمہیں جنت کی رغبت نہیں؟ جس کے پھل اور جس کے سائے ہمیشگی رہنے والے ہیں۔ (ابن ابی حاتم) (تفسیر ابن کثیر)

تِلۡكَ عُقۡبَى الَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا ۖ
یہ بدلہ ہے ان کا جو ڈرتے رہے

یعنی خدا سے ڈر کر شرک و کفر کو چھوڑے رکھا۔

وَّعُقۡبَى الۡكٰفِرِيۡنَ النَّارُ ﴿۳۵﴾
اور بدلہ منکروں کا آگ ہے

اہل حق اور اہل باطل کا انجام ایک دوسرے کے بالمقابل بیان فرمایا، ''وَبِضِدِّهَا تَتَبَيَّنُ الۡاَشۡيَاء''۔

وَالَّذِيۡنَ اٰتَيۡنٰهُمُ الۡكِتٰبَ يَفۡرَحُوۡنَ بِمَاۤ
اور وہ لوگ جن کو ہم نے دی ہے کتاب خوش ہوتے ہیں اس سے
اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ
جو نازل ہوا تجھ پر

قرآن خوشی کا پیغام ہے:

جن کو اب قرآن دیا ہے (یعنی مسلمان) اور جن کو پہلے تورات'' و ''انجیل'' وغیرہ دی گئی (یعنی یہود و نصاریٰ) اُس چیز کو سن کر خوش ہوتے ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی مسلمانوں کا خوش ہونا تو ظاہر ہے کہ وہ اسی کتاب کو فلاح دارین کی کلید جانتے تھے، باقی یہود و نصاریٰ میں جو لوگ اہل علم و انصاف اور فی الجملہ حق پرست تھے ان کے لئے بھی ایک طرح مسرت کا موقع تھا کیونکہ وہ دیکھتے تھے کہ قرآنِ کریم کیسی فراخدلی سے اُن کی اصل کتابوں کی تصدیق اور اُن کے انبیاء کی تعریف و تعظیم میں رطب اللسان ہے بلکہ سچے احبار و رُہبان کے وجود کو بھی معرض مدح میں پیش کرتا ہے۔ ''ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنۡهُمۡ قِسِّيۡسِيۡنَ وَرُهۡبَانًا'' چنانچہ اسی قسم کے منصف و حق پرست یہود و نصاریٰ آخر کار مشرف باسلام ہوئے۔

وَمِنَ الۡاَحۡزَابِ مَنۡ يُّنۡكِرُ بَعۡضَهٗ ؕ
اور بعضے فرقے نہیں مانتے اسکی بعضی بات

اہل کتاب کا انکار:

یعنی یہود و نصاریٰ یا عرب کے جاہلوں میں وہ جماعتیں بھی ہیں جو قرآن سے اس لئے ناخوش ہیں کہ انہیں اس کی بعض چیزوں سے انکار ہے اور یہ وہی چیزیں ہیں جو ان کی تحریف و تبدیل یا آراء و اہواء کے خلاف قرآن نے بیان کی ہیں۔

قُلۡ اِنَّمَاۤ اُمِرۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ اللّٰهَ وَلَاۤ اُشۡرِكَ
کہہ مجھ کو یہی حکم ہوا ہے کہ بندگی کروں اللہ کی اور شریک نہ کروں
بِهٖ ؕ اِلَيۡهِ اَدۡعُوۡا وَاِلَيۡهِ مَاٰبِ ﴿۳۶﴾
اسکا، اسی کی طرف بلاتا ہوں اور اسی کی طرف ہے میرا ٹھکانا

کسی کی خوشی کی پرواہ نہیں:

یعنی کوئی خوش ہو یا ناخوش، میں تو اسی خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کی بندگی کرتا ہوں جس کو سب انبیاء اور مِلَل بالاتفاق مانتے چلے آئے، اُسی کے احکام و مرضیات کی طرف ساری دنیا کو دعوت دیتا ہوں اور خوب جانتا ہوں کہ میرا انجام اسی کے ہاتھ میں ہے میں اُسی کی طرف رجوع کرتا ہوں وہیں میرا ٹھکانا ہے وہ ہی مجھ کو آخر کار غالب و منصور اور مخالفین کو مغلوب و رسوا کرے گا لہٰذا کسی کے خلاف و انکار کی مجھے قطعاً پروا نہیں۔

وَكَذٰلِكَ اَنۡزَلۡنٰهُ حُكۡمًا عَرَبِيًّا ؕ
اور اسی طرح اتارا ہم نے یہ کلام حکم عربی زبان میں

علم و حکمت کا خزانہ:

یعنی جیسے پیشتر دوسری کتابیں اُتاری گئیں اس وقت یہ قرآن اتارا جو عظیم الشان معارف و حِکَم پر مشتمل اور حق و باطل کا آخری فیصلہ کرنے والا ہے پھر جس طرح ہر

پیغمبر کو اسی کی زبان میں کتاب دی گئی جو اس کی قومی زبان تھی ایسے ہی محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو عربی قرآن دیا گیا بلاشبہ قرآن جیسی معجز و جامع کتاب ایسی ہی زبان میں نازل ہونی چاہیے تھی، جو نہایت بلیغ، وسیع، جامع، منضبط، واضح پر مغز اور پُر شوکت ہونے کی وجہ سے "اُم الالسنہ" اور "ملکۃ اللغات" کہلانے کی مستحق ہے۔

وَلَئِنِ اتَّبَعۡتَ اَهۡوَآءَهُمۡ بَعۡدَ مَا
اور اگر تو چلے ان کی خواہش کے موافق بعد اس علم کے
جَآءَكَ مِنَ الۡعِلۡمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنۡ
جو تجھ کو پہنچ چکا کوئی نہیں تیرا اللہ سے حمایتی
وَّلِیٍّ وَّلَا وَاقٍ ﴿۳۷﴾
اور نہ بچانے والا

فقط قرآن کی پیروی کرو:

یعنی کسی کے انکار و ناخوشی کی ذرہ بھر پروا نہ کرو، حق تعالیٰ نے جو علم عظیم تم کو دیا ہے اُس کی پیروی کرتے رہو اگر بالفرض تم ان لوگوں کی خواہشات کی طرف جھک گئے تو اس کے وبال سے کون بچا سکتا ہے یہ خطاب ہر طالب حق کو ہے اور اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم مخاطب ہیں تو آپ کو سامنے رکھ کر دوسروں کو سنانا مقصود ہے جیسا کہ پہلے متعدد مواضع میں اس کی نظائر گذر چکیں۔

وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلًا مِّنۡ قَبۡلِكَ وَجَعَلۡنَا
اور بھیج چکے ہیں ہم کتنے رسول تجھ سے پہلے
لَهُمۡ اَزۡوَاجًا وَّذُرِّیَّةً ؕ وَمَا كَانَ لِرَسُوۡلٍ
اور ہم نے دی تھیں ان کی جورو ئیں اور اولاد اور نہیں ہوا کسی رسول
اَنۡ یَّاۡتِیَ بِاٰیَةٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ لِكُلِّ
سے کہ وہ لے آئے کوئی نشانی مگر اللہ کے اذن سے ہر
اَجَلٍ كِتَابٌ ﴿۳۸﴾
ایک وعدہ ہے لکھا ہوا

پیغمبر پر نکتہ چینی بلا وجہ ہے:

یعنی پیغمبر عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو نئی کتاب اور نئے احکام دے کر بھیجنا کیا اچنبھے کی بات ہوگئی جو اتنی حجتیں نکالی جاتی ہیں آخر ان سے پہلے بھی ہم نے جو پیغمبر بھیجے وہ آسمان کے فرشتے نہ تھے اسی دنیا کے رہنے والے آدمی تھے جو کھانا کھاتے اپنی ضروریات اپنے ہاتھوں سے انجام دیتے اور بیوی بچے رکھتے تھے۔ اُن میں کسی کو یہ قدرت نہ تھی کہ لوگ جو نشانی مانگتے ضرور دکھلا دیتا بلکہ موجودہ پیغمبر کی طرح ہر چیز میں خدائے عظیم کے منتظر رہتے تھے وہ وہی نشان دکھاتے اور وہی احکام سناتے تھے جس کا اذن خدا کے یہاں سے ہوتا۔ خدائی اذن کا حال یہ ہے کہ اُس کے یہاں ہر زمانہ اور ہر قرن کے مناسب جداگانہ حکم لکھا ہوا ہے اور ایک وعدہ ٹھہرا ہوا ہے جس کو نہ کوئی نبی بدل سکتا ہے نہ فرشتہ پھر جب ہر ایک پیغمبر اپنے زمانہ کے مناسب احکام لائے اور اپنی صداقت کے نشان دکھانے میں پبلک کی خواہشات کے پابند نہیں رہے نہ اپنے کو حوائج بشریہ اور تعلقات معاشرت سے پاک اور برتر ظاہر کیا تو ان ہی چیزوں کا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں پایا جانا ان کار نبوت کی دلیل کیسے بن سکتی ہے؟ (تفسیر عثمانی)

کفار و مشرکین کا نظریہ:

کفار و مشرکین کا رسول و نبی کے متعلق ایک عام تخیل یہ تھا کہ وہ جنس بشر اور انسان کے علاوہ کوئی مخلوق مثل فرشتوں کے ہونی چاہئے، جس کی وجہ سے عام انسانوں سے ان کی برتری واضح ہو جائے، قرآن کریم نے ان کے اس خیالِ فاسد کا جواب متعدد آیات میں دیا ہے کہ تم نے نبوت و رسالت کی حقیقت اور حکمت کو ہی نہیں پہچانا، اس لئے ایسے تخیلات کے درپے ہوئے، کیونکہ رسول کو حق تعالیٰ ایک نمونہ بنا کر بھیجتے ہیں کہ امت کے سارے انسان ان کی پیروی کریں انہی جیسے اعمال و اخلاق سیکھیں، اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی انسان اپنے ہم جنس انسان ہی کی پیروی اور اتباع کر سکتا ہے، جو اس کی جنس کا نہ ہو اس کی پیروی انسان سے ناممکن ہے، مثلاً فرشتہ کو نہ بھوک لگے نہ پیاس نہ نفسانی خواہشات سے اس کو کوئی واسطہ، نہ اس کو نیند آوے نہ مکان ہو، اب اگر انسانوں کو ان کے اتباع اور پیروی کا حکم دیا جاتا تو ان کے لئے ان کی قدرت سے زائد تکلیف ہو جاتی، اس جگہ بھی مشرکین کا یہی اعتراض پیش ہوا، خصوصاً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تعددِ ازدواج سے ان کا یہ شبہ اور بڑھا، اس کا جواب پہلی آیت کے ابتدائی جملوں میں یہ دیا گیا کہ ایک یا ایک سے زیادہ نکاح کرنے اور بیوی بچوں والا ہونے کو تم نے کس دلیل سے نبوت و رسالت کے خلاف سمجھ لیا، اللہ تعالیٰ کو تو ابتداء آفرینش سے یہی سنت رہی ہے کہ وہ اپنے پیغمبروں کو صاحبِ اہل و عیال بناتے ہیں، جتنے انبیاء علیہم السلام پہلے گذرے ہیں، اور ان میں سے بعض کی نبوت کے تم بھی قائل ہو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت:

صحیح بخاری و مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تو روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں (یعنی ایسا نہیں کہ ہمیشہ روزے ہی رکھا کروں)

اور فرمایا کہ میں رات میں سوتا بھی ہوں اور نماز کے لئے کھڑا بھی ہوتا ہوں (یعنی ایسا نہیں کہ ساری رات عبادت ہی کروں) اور گوشت بھی کھاتا ہوں، عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، جو شخص میری اس سنت کو قابلِ اعتراض سمجھے وہ مسلمان نہیں۔

ہر چیز کا وقت مقرر ہے:

لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ، اجل کے معنی مدّتِ معینہ اور میعاد کے آتے ہیں، اور کتاب اس جگہ بمعنی مصدر ہے، یعنی تحریر، معنی یہ ہیں کہ ہر چیز کی میعاد اور مقدار اللہ تعالیٰ کے پاس لکھی ہوئی ہے اس نے ازل میں لکھ دیا ہے کہ فلاں شخص فلاں وقت پیدا ہوگا اور اتنے دن زندہ رہے گا کہاں کہاں جائے گا کیا کیا کام کرے گا، کس وقت اور کہاں مرے گا۔

اسی طرح یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ فلاں زمانے میں فلاں پیغمبر پر کیا وحی اور احکام نازل ہوں گے کیونکہ احکام کا ہر زمانے اور ہر قوم کے مناسب حال آتے رہنا ہی مقتضائے عقل و انصاف ہے، اور یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ فلاں پیغمبر سے فلاں وقت کس کس معجزہ کا ظہور ہوگا۔

اس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مطالبہ کہ فلاں قسم کے احکامِ قرآن میں تاویل کرائیں، یا یہ مطالبہ کہ فلاں خاص معجزہ دکھلائیں ایک معاندانہ اور غلط مطالبہ ہے، جو رسالت و نبوت کی حقیقت سے بے خبر ہونے پر مبنی ہے۔

ائمہ تفسیر میں سے حضرت سعید بن جبیرؒ اور قتادہؒ وغیرہ نے اس آیت کو بھی احکام و شرائع کے محو و اثبات یعنی مسئلہ نسخ کے متعلق قرار دیا ہے، اور آیت کا مطلب یہ بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جو ہر زمانے اور ہر قوم کے لئے مختلف رسولوں کے ذریعہ اپنی کتابیں بھیجتے ہیں، جن میں احکام شریعت اور فرائض کا بیان ہوتا ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ سب احکام دائمی ہوں اور ہمیشہ باقی رہیں، بلکہ قوموں کے حالات اور زمانے کے تغیرات کے مناسب اپنی حکمت کے ذریعہ جس حکم کو چاہتے ہیں مٹا دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں ثابت اور باقی رکھتے ہیں اور اصل کتاب بہر حال ان کے پاس محفوظ ہے، جس میں پہلے ہی سے یہ لکھا ہوا ہے کہ فلاں حکم جو فلاں قوم کے لئے نازل کیا گیا ہے یہ ایک خاص میعاد کے لئے یا خاص حالات کی بناء پر ہے جب وہ میعاد گذر جائے گی یا وہ حالات بدل جائیں گے تو یہ حکم بھی بدل جائے گا اس امّ الکتب میں اس کی میعاد اور وقتِ مقرر بھی پوری تعیین کے ساتھ درج ہے، اور یہ بھی کہ اس حکم کو بدل کر کونسا حکم لایا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے جو عمر یا رزق وغیرہ کسی کی تقدیر میں لکھ دیئے ہیں وہ بعض اعمال کی وجہ سے کم یا زیادہ ہو سکتے ہیں اور دُعاء کی وجہ سے بھی تقدیر بدل جا سکتی ہے۔

اس آیت میں اسی مضمون کا بیان اس طرح کیا گیا کہ کتابِ تقدیر میں لکھی ہوئی عمر یا رزق یا مصیبت یا راحت وغیرہ میں جو تغیر و تبدل کسی عمل یا دُعاء کی وجہ سے ہوتا ہے اس سے مراد وہ کتابِ تقدیر ہے جو فرشتوں کے ہاتھ یا ان کے علم میں ہے اس میں بعض اوقات کوئی حکم کسی خاص شرط پر معلق ہوتا ہے، جب وہ شرط نہ پائی جائے تو یہ حکم بھی نہیں رہتا، اور پھر یہ شرط بعض اوقات تو تحریر میں لکھی ہوئی فرشتوں کے علم میں ہوتی ہے، بعض اوقات لکھی نہیں ہوتی صرف اللہ تعالیٰ کے علم میں ہوتی ہے، جب وہ حکم بدلا جاتا ہے تو سب حیرت میں رہ جاتے ہیں، اس طرح کی تقدیر معلق کہلاتی ہے۔ (معارف القرآن)

لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ہر مدت (اور ہر چیز کے وقت) کے لیے (اللہ کی طرف سے ازل میں) ایک مقرر تحریر ہے (اس تحریر میں ہر چیز کی ابتداء اور انتہاء لکھی ہوئی ہے)۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ نے ازل میں لکھ دیا ہے کہ زید فلاں وقت پیدا ہوگا اور اتنی مدت تک زندہ رہے گا، کافر ہوگا یا مؤمن وغیرہ وغیرہ۔ (تفسیر مظہری)

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ ۚ وَعِنْدَهٗ
مٹاتا ہے اللہ جو چاہے اور باقی رکھتا ہے اور اسی کے
اُمُّ الْكِتٰبِ ﴿۳۹﴾
پاس ہے اصل کتاب

اللہ مختارِ کل ہے:

یعنی اپنی حکمت کے موافق جس حکم کو چاہے منسوخ کرے، جسے چاہے باقی رکھے جس قوم کو چاہے مٹائے جسے چاہے اُس کی جگہ جما دے، جن اسباب کی تاثیر چاہے بدل ڈالے جن کی چاہے نہ بدلے، جو وعدہ چاہے شرائط کی موجودگی میں ظاہر کرے جو چاہے شرائط نہ پائے جانے کی بناء پر موقوف کر دے۔ غرض ہر قسم کی تبدیل و تغییر، محو و اثبات نسخ احکام اُسی کے ہاتھ میں ہے قضا و قدر کے تمام دفاتر اُسی کے قبضہ میں ہیں اور سب تفصیلات و دفاتر کی جڑ جسے "اُم الکتاب" کہنا چاہئے اُسی کے پاس ہے یعنی "علم ازلی محیط"، جو ہر قسم کے تبدل و تغیر سے قطعاً منزّہ و مُبرّیٰ اور لوح محفوظ کا ماخذ ہے۔

اسباب: حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ "دنیا میں ہر چیز اسباب سے ہے، بعضے اسباب ظاہر ہیں بعضے چھپے ہیں، اسباب کی تاثیر کا ایک طبعی اندازہ ہے، جب اللہ چاہے اس کی تاثیر اندازہ سے کم یا زیادہ کر دے، جب چاہے ویسی ہی رکھے۔ آدمی کبھی کنکر سے مرتا ہے اور کبھی گولی سے بچتا ہے اور ایک اندازہ ہر چیز کا اللہ کے علم میں ہے جو ہرگز نہیں بدلتا۔ اندازے کو تقدیر کہتے ہیں، یہ دو تقدیریں ہوئیں ایک بدلتی ہے اور ایک نہیں بدلتی، جو تقدیر بدلتی ہے اُس کو معلق اور جو نہیں بدلتی اُس کو مُبرم کہتے ہیں۔" جن احادیث و آثار سے بعض افاضل کو قضاءِ مُبرم کے بدلنے کا شبہ ہوا ہے اُن کے متعلق یہاں تفصیل کا موقع نہیں۔ ان شاء اللہ مستقل تفسیر میں لکھا جائے گا، اگر خدا نے توفیق دی، وهو الموفق والمستعان۔ (تفسیر عثمانی)

اللہ جو چاہے مٹا دے جو چاہے باقی رکھے:

طبرانی نے ضعیف سند سے بیان کیا کہ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا میں نے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے اللہ جو کچھ چاہتا ہے مٹا تا ہے اور جو کچھ چاہتا ہے قائم رکھتا ہے سوائے بدبختی اور خوش بختی اور زندگی اور موت کے (یعنی ان چاروں کو نہیں بدلتا) ابن مردویہ نے حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت سے حضرت رباب کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ رزق (کی وسعت و کثرت) کو مٹا بھی دیتا ہے اور رزق میں زیادتی بھی کر دیتا ہے اور عمر (کی میعاد) کو مٹا بھی دیتا ہے اور اس میں زیادتی بھی کر دیتا ہے ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آیت **بمحو اللہ ما یشآء** الخ کے متعلق دریافت کیا گیا فرمایا یہ ہر شب قدر میں ہوتا ہے اللہ (مرتبہ) اٹھاتا ہے اور پناہ (یعنی دوزخ سے پناہ) دیتا ہے اور رزق دیتا ہے سوائے زندگی اور موت اور شقاوت و سعادت کے کہ ان میں تبدیلی نہیں کرتا۔ (از مؤلف رحمہ اللہ)

حضرت ابن عباس نے فرمایا اللہ جو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جو چاہتا ہے قائم رکھتا ہے سوائے رزق اور عمر اور سعادت و شقاوت کے یعنی یہ امور نہیں بدلے جاتے۔

بغوی نے لکھا ہے ہم کو حضرت حذیفہ بن اسید کی روایت سے یہ فرمان رسول پہنچا ہے کہ استقرار نطفہ کے چالیس یا پنتالیس دن کے بعد ایک فرشتہ داخل ہوتا ہے اور عرض کرتا ہے اے میرے رب یہ شقی ہے یا سعید یہ دونوں باتیں لکھدی جاتی ہیں پھر فرشتہ کہتا ہے اے رب یہ نر ہے یا مادہ یہ دونوں امور بھی لکھ دیئے جاتے ہیں پھر اسکا عمل اثر، عمر اور رزق لکھ دیا جاتا ہے پھر یہ تحریریں لپیٹ دی جاتی ہیں جن کے اندر اس کے بعد نہ زیادتی ہوتی ہے نہ کمی۔

صحیحین میں حضرت ابن مسعود کی روایت سے آیا ہے کہ ہم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور آپ سچے تھے اور اللہ کی طرف سے آپ کو سچا بنایا گیا تھا کہ آدمی کی بناوٹ ماں کے پیٹ میں چالیس روز تک بصورت نطفہ پھر اتنے ہی روز بصورت علقہ (لوتھڑا، خون جما ہوا) پھر اتنی ہی مدت بصورت مضغہ (گوشت کی بوٹی) رہتی ہے پھر اللہ اس کی طرف ایک فرشتہ چار باتوں کے لیے بھیجتا ہے فرشتہ اس کا عمل اس کی زندگی اس کا رزق اور اس کا شقی (دوزخی) یا سعید (جنتی) ہونا لکھ دیتا ہے اس کے بعد اس میں روح پھونکی جاتی ہے۔

بغوی نے حضرت عمر اور حضرت ابن مسعود کا قول نقل کیا ہے دونوں حضرات نے فرمایا اللہ سعادت و شقاوت کو بھی مٹا دیتا ہے اور رزق و مدت حیات کو بھی اور کچھ ثابت رکھتا ہے یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ حضرت عمر کعبہ شریف کا طواف کرنے میں رو رہے تھے اور کہہ رہے تھے اے اللہ اگر تو نے مجھے اہل سعادت میں لکھا ہے تو ان میں قائم رکھ (میرا نام ان کی فہرست سے نہ مٹا) اور اگر تو نے میرے لیے شقاوت لکھدی ہے تو میرا نام (اہل شقاوت کی فہرست سے) مٹا دے اور اہل سعادت و مغفرت میں لکھدے بلاشبہ تو جو کچھ چاہے مٹا دیتا ہے اور جو کچھ چاہے قائم رکھتا ہے تیرے ہی پاس **اُم الکتاب** (اصل کتاب، ہر چیز کا تحریر نامہ) ہے ایسی ہی روایت حضرت ابن مسعود سے بھی آئی ہے۔

عمر میں کمی زیادتی:

بعض آثار میں آیا ہے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بعض آدمیوں کی عمر کے تیس سال باقی ہوتے ہیں لیکن جب وہ قرابت کو قطع کرتا ہے (قطع رحم کرتا ہے) تو لوٹا کر تیس سال کے تین دن کر دیئے جاتے ہیں اور بعض آدمیوں کی عمر کے تین دن باقی رہتے ہیں اور وہ کنبہ کی پرداخت (صلۂ رحمی) کرتا ہے تو تین دن کھینچ کر تیس سال کر دیئے جاتے ہیں، یہ اثر نقل کرنے کے بعد بغوی نے حضرت ابو درداء کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی کی عمر کے جب صرف تین گھنٹے رہ جاتے ہیں تو) اللہ رات کے آخری تین گھنٹوں میں نزول اجلال فرماتا ہے اور کتاب مندرج شدہ کو پہلے گھنٹہ میں ملاحظہ فرماتا ہے کہ اس کے سوا کوئی بھی اس کتاب کو نہیں دیکھ سکتا پس جو کچھ چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جو کچھ چاہتا ہے ثبت فرما دیتا ہے (یا برقرار رکھتا) ہے۔

ابن مردویہ راوی ہیں کہ حضرت علی نے اس آیت کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں اس کی تفسیر کر کے تیری آنکھیں ٹھنڈی کروں گا اور اپنے بعد آنے والی اپنی امت کی آنکھیں بھی اس کی تشریح سے ٹھنڈی کر دوں گا صدقہ کرنا صحیح طور پر ماں باپ سے اچھا سلوک اور اقسام خیر، بدبختی کو نیک نصیبی سے بدل دیتے ہیں اور عمر بڑھا دیتے ہیں۔

حضرت مجددؒ کا واقعہ:

میں کہتا ہوں حضرت عمر اور حضرت ابن مسعود کی روایت کے مطابق مقامات مجددیہ میں ایک واقعہ ذکر کیا گیا ہے ایک شخص ملا طاہر لاہوری تھے حضرت مجدد صاحب رحمہ اللہ کے دونوں صاحبزادگان حضرت محمد سعید اور حضرت محمد معصوم کے معلم تھے حضرت مجدد قدس سرہٗ نے بنظر کشف ملاحظہ فرمایا کہ مُلّا طاہر کی پیشانی پر لکھا ہے ملّا طاہر لاہوری شقی۔ حضرت نے اس کا ذکر اپنے لڑکوں سے کر دیا صاحبزادگان تو ملا طاہر کے شاگرد تھے ہی اس لیے انہوں نے حضرت سے درخواست کی کہ اللہ سے دعاء کر دیجئے، اللہ اس شقاوت کو مٹا کر سعادت سے بدل دے حضرت نے فرمایا، میں نے لوح محفوظ میں لکھا دیکھا ہے کہ یہ قضاء مبرم ہے جس کو بدلا نہیں جا سکتا لڑکوں نے دعاء کرنے کے لیے اصرار کیا حضرت مجدد نے فرمایا مجھے یاد آیا کہ حضرت غوث الثقلین شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی نے فرمایا تھا، میری دعاء سے قضاء مبرم بھی بدل جاتی ہے اس لیے میں دعاء کرتا ہوں اور بارگاہ الٰہی میں عرض کرتا ہوں اے اللہ تیری رحمت وسیع ہے تیرا فضل کسی ایک پر ختم نہیں ہو جاتا میں تجھ سے امید کرتا ہوں اور تیرے ہمہ گیر فضل سے درخواست کرتا ہوں کہ میری دعا قبول فرمالے اور ملا طاہر کی پیشانی سے شقاوت کی تحریر مٹا کر اس کی جگہ سعادت کے نقوش ثبت کر دے جیسے تو نے میرے آقا (حضرت غوث اعظم) کی دعاء قبول فرمائی تھی حضرت مجدد قدس سرہٗ کا بیان ہے اس دعاء کے بعد وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے آ گیا کہ

گویا میری نظر کے سامنے لفظ شقی ملا طاہر کی پیشانی سے مٹا کر اس کی جگہ لفظ سعید لکھ دیا گیا اور اللہ کے لیے یہ بات دشوار نہیں۔

شبہ: حضرت مفسر کا بیان ہے اس تقریر کے بعد میرے دل میں ایک اشکال پیدا ہو گیا کہ کسی کی دعاء سے قضاء مبرم کے ٹل جانے کا معنی ہی کیا ہو سکتا ہے اگر قضاء مبرم بھی ٹل جاتی ہے تو وہ مبرم ہی کب ہوئی ایسی قضاء کو مبرم کہنا ہی غلط ہے۔

جواب: اس اشکال کا جواب اللہ نے میرے دل میں اس طرح القاء کیا کہ قضاء معلق دو طرح کی ہوتی ہے ایک وہ جس کا معلق ہونا لوحِ محفوظ میں لکھ دیا گیا ہے دوسری وہ قضاء جس کا مبرم ہونا لوحِ محفوظ میں درج نہیں اس کا معلق یا مبرم ہونا صرف اللہ کے علم میں ہے لوح محفوظ میں چونکہ اس کی تعلیق مکتوب نہیں اس لیے (تحریر لوح کے اعتبار سے) اس کو قضاء مبرم کہا جاتا ہے حضرت غوث الثقلین نے جس قضاء مبرم کا اپنی دعاء سے بدل جانا ذکر کیا ہے اس سے مراد یہی قضاء ہے جو لوح محفوظ میں (مبرم یعنی) غیر معلق ہے اور علم الٰہی میں معلق (غیر مبرم) ہے ملا طاہر کی بدبختی بھی اسی قسم کی تھی، لوح میں غیر معلق یعنی مبرم تھی، لیکن اللہ کے علم میں معلق (غیر مبرم) تھی اس لیے بدل دی گئی، واللہ اعلم۔

مٹانے اور باقی رکھنے کا مطلب:

ضحاک اور کلبی نے آیت یَمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَیُثْبِتُ کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ کراما کاتبین آدمی کے تمام افعال و اقوال اپنے رجسٹروں میں لکھ لیتے ہیں ان میں کچھ ایسے اعمال و اقوال بھی ہوتے ہیں جن کا نہ کوئی ثواب ہوتا ہے نہ عذاب مثلاً کوئی کہتا ہے میں نے کھا لیا، میں نے پی لیا، میں وہاں گیا، میں گھر سے نکلا، یہ کلام اگر سچا ہوتا ہے تو اس پر نہ ثواب مرتب ہوتا ہے نہ عذاب اور کچھ اعمال ایسے ہوتے ہیں جو موجب ثواب و عذاب ہوتے ہیں اول قسم کے اندراجات کو اللہ کراما کاتبین کے رجسٹروں سے مٹا دیتا ہے اور دوسری قسم کی تحریروں کو قائم رکھتا ہے۔ کلبی نے اتنا مزید بیان کیا کہ جمعرات کے دن ایسے لاحاصل اعمال و اقوال مٹائے جاتے ہیں۔

عطیہ نے حضرت ابن عباس کا قول تشریح آیت کے ذیل میں اس طرح بیان کیا کہ جو شخص اللہ کی اطاعت کرتا ہے لیکن آخر نافرمانی کرنے لگتا ہے اور اسی گمراہی پر مر جاتا ہے تو اللہ اس کے سابق نیک اعمال مٹا دیتا ہے اور جو شخص مرتے دم تک اطاعت پر قائم رہتا ہے اللہ اس کی نیکیاں قائم رکھتا ہے۔

مسلم نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمام آدمیوں کے سارے دل ایک آدمی کے دل کی طرح رحمٰن کی چٹکی میں ہیں جس طرح چاہتا ہے پھیر دیتا ہے پھر حضور نے یہ دعاء کی اے اللہ اے دلوں کو پھیر دینے والے ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت پر پھیر دے (یعنی اپنی اطاعت پر قائم رکھ)۔

عکرمہ نے کہا اللہ اپنے بندوں کے جو گناہ توبہ سے معاف کرنا چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور گناہوں کے بدلے نیکیاں ثبت کر دیتا ہے، اس نے خود دوسری آیت میں فرمایا ہے، اُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِہِمْ حَسَنٰتٍ۔

مسلم نے حضرت ابوذرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن بعض آدمیوں کی پیشی ہوگی تو حکم ہوگا اس کے سامنے اس کے صغیرہ گناہ رکھو، حسب الحکم صغیرہ گناہ اس کے سامنے لائے جائیں گے اور کبیرہ گناہ مخفی رکھے جائیں گے اور کہا جائے گا فلاں دن تو نے یہ یہ کام کیے تھے وہ شخص اقرار کرتا جائے گا انکار نہیں کرے گا مگر کبائر سے خوف زدہ رہے گا کبائر اس سے پوشیدہ رکھے جائیں گے اللہ تعالیٰ فرمائے گا، ہر گناہ کی جگہ اس کو ایک نیکی دے دو بندہ عرض کرے گا میرے گناہ تو اور بھی تھے جو میں یہاں نہیں دیکھتا راوی کا بیان ہے یہ فرمانے کے وقت میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہنس دیئے کہ آپ کی کچلیاں بھی نمودار ہو گئیں مؤلف نے کہا میں کہتا ہوں شاید یہ عمل ان لوگوں کے لیے ہوگا جو محبوبیت کے سمندر میں غرق ہیں صاف بدن عالی قدر صوفی ہیں۔

بغوی نے کہا ام الکتاب لوحِ محفوظ ہے جس کے مندرجات میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوتا، عطاء نے کہا حضرت ابن عباس نے فرمایا اللہ کی ایک لوح محفوظ ہے (اتنی بڑی کہ) بقدر پانسو برس کی راہ کے (اس کی لمبائی ہے) یا سفید موتی کی بنی ہوئی ہے اس کے دونوں پٹھے یاقوت کے ہیں اللہ روزانہ تین سو تیس بار اس کو ملاحظہ فرماتا ہے جو کچھ چاہتا ہے (اس میں سے) مٹا دیتا ہے اور جو کچھ چاہتا ہے برقرار رکھتا ہے۔ (تفسیر مظہری)

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ ان آیات کے ترجمہ "ہر قضائے موقت را نامہ ہست یعنی چوں قضائے الٰہی بوجہے متحقق شود آنرا در عالم ملکوت ثبت می کنند بودی ساز خدا ہر چہ می خواہد ونزدیک اوست ام الکتاب یعنی لوح محفوظ، مترجم گوید صورت حادثہ در عالم ملکوت خلق می فرماید بعد ازاں اگر خواہد محو کند و اگر خواہد ثابت دارد شاید کہ معنی چنیں باشد ہر زمانے را شریعتے مست نسخ می کند خدائے تعالیٰ انچہ می خواہد و ثابت می گذارد وانچہ خواہد ونزدیک اوست لوح محفوظ، واللہ اعلم۔ (فتح الرحمان)

صفتِ تقدیر اور علم ازلی:

حاصل کلام یہ کہ ان آیات میں حق تعالیٰ نے اپنی صفت تقدیر اور علم ازلی کو بیان کیا کہ حق تعالیٰ نے حوادث اور واقعات کے لئے ایک وقت مقدر اور مقرر فرمایا ہے ان میں خدا کی مرضی سے رد و بدل بھی ہوتا رہتا ہے اور ایک حکم قطعی ہے وہ کبھی نہیں بدلتا پہلے کو قضاء معلق اور دوسرے کو مبرم کہتے ہیں۔ (تفسیر معارف القران کاندھلوی رحمہ اللہ)

حضرت عمر فاروقؓ کی دُعاء:

حضرت عمر بن خطابؓ بیت اللہ شریف کا طواف کرتے ہوئے روتے روتے یہ دعاء پڑھا کرتے تھے، اے اللہ! اگر تو نے مجھ پر برائی اور گناہ لکھ رکھے ہیں تو انہیں مٹا دے، تو جو چاہے مٹاتا ہے اور باقی رکھتا ہے، ام الکتاب تیرے پاس ہی ہے تو

اسے سعادت اور رحمت کر دے، حضرت ابن مسعودؓ بھی یہی دعا کیا کرتے تھے کعبؒ نے امیر المؤمنین حضرت عمرؓ سے کہا کہ اگر ایک آیت کتاب اللہ میں نہ ہوتی تو میں قیامت تک جو امور ہونے والے ہیں سب آپ کو بتا دیتا پوچھا کہ وہ کونسی آیت ہے آپ نے اسی آیت کی تلاوت فرمائی، ان تمام اقوال کا مطلب یہ ہے کہ تقدیر کی الٹ پلٹ خدا کے اختیار کی چیز ہے چنانچہ مسند احمد کی ایک حدیث میں ہے کہ بعض گناہوں کی وجہ سے انسان اپنی روزی سے محروم کر دیا جاتا ہے، اور تقدیر کو دعاء کے سوا کوئی چیز بدل نہیں سکتی، اور عمر کی زیادتی کرنے والی بجز نیکی کے کوئی چیز نہیں، نسائی اور ابن ماجہ میں بھی یہ حدیث ہے اور صحیح حدیث میں ہے کہ صلہ رحمی عمر بڑھاتی ہے اور حدیث میں ہے کہ دعاء اور قضا دونوں کی مڈ بھیڑ آسمان و زمین کے درمیان ہوتی ہے ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اللہ عزوجل کے پاس لوح محفوظ ہے جو پانچ سو سال کے راستے کی چیز ہے، سفید موتی کی ہے، یاقوت کے دو پٹھوں کے درمیان، تریسٹھ بار اللہ تعالےٰ اس پر توجہ فرماتا ہے جو چاہتا ہے مٹاتا ہے جو چاہتا ہے برقرار رکھتا ہے۔ ام الکتاب اسی کے پاس ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِىْ نَعِدُهُمْ
اور اگر دکھلا دیں ہم تجھ کو کوئی وعدہ جو ہم نے کیا ہے ان سے
اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا
یا تجھ کو اٹھالیویں سو تیرا ذمہ تو پہنچا دینا ہے اور ہمارا ذمہ ہے
الْحِسَابُ ﴿٤٠﴾
حساب لینا

تمام وعدے پورے ہو کر رہیں گے:

یعنی جو وعدے اُن سے کئے گئے ہیں، ہم کو اختیار ہے کہ ان میں سے بعض آپ کے سامنے پورے کر دیں یا آپ کی وفات کے بعد ظاہر کریں۔ نہ آپ کو اُن کے ظہور کی فکر میں پڑنا چاہئے اور نہ تاخیر و امہال دیکھ کر ان لوگوں کو بے فکر ہونا چاہئے، خدا کے علم میں ہر چیز کا ایک وقت مناسب ہے جس کے پہنچنے پر وہ ضرور ظاہر ہو کر رہے گی، آپ اپنا فرض (تبلیغ) ادا کئے جایئے، تکذیب کرنیوالوں کا حساب ہم خود بیباک کر دیں گے۔ (تفسیر عثمانی)

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِى الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا
کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم چلے آتے ہیں زمین کو گھٹاتے اسکے
مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ
کناروں سے

اشاعت اسلام:

یعنی سرزمین مکہ کے آس پاس اسلام کا اثر پھیلتا جاتا اور کفر کی عملداری گھٹتی جاتی ہے بڑے بڑے قبائل اور اشخاص کے قلوب پر اسلام کا سکہ بیٹھ رہا ہے۔ اوس و خزرج کے دل حق و صداقت کے ساتھ مفتوح ہو رہے ہیں اس طرح ہم آہستہ آہستہ کفر کی حکومت کو دباتے چلے آرہے ہیں کیا یہ روشن آثار ان مکذبین کو نہیں بتلاتے کہ خدا کا فیصلہ ان کے مستقبل کے متعلق کیا ہو چکا ہے۔ ایک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ اسلام آج جس رفتار سے بڑھ رہا ہے وہ کسی طاقت سے رُکنے والا نہیں، لہٰذا انجام بینی اسی میں ہے کہ آنیوالی چیز کو آئی ہوئی سمجھیں۔

وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ ؕ
اور اللہ حکم کرتا ہے کوئی نہیں کہ پیچھے ڈالے اس کا حکم

اللہ کا فیصلہ اٹل ہے: یعنی اُس کا تکوینی حکم اور فیصلہ اٹل ہے جب وقت آجائے تو کس کی طاقت ہے کہ ایک منٹ کے لئے ملتوی کر کے پیچھے ڈال دے۔

وَهُوَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿٤١﴾
اور وہ جلد لیتا ہے حساب

یعنی جہاں حساب کا وقت آن پہنچا پھر دیر نہ لگے گی، یا جو چیز یقیناً آنیوالی ہے اُسے جلد ہی سمجھو۔

وَقَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ
اور فریب کر چکے ہیں جو ان سے پہلے تھے سو اللہ کے ہاتھ میں ہے
جَمِيْعًا ؕ
سب فریب

اللہ کی تدبیر کامیاب ہے:

وہ نہ چاہے تو سب فریب رکھے جائیں یا یہ کہ خدا ان کے فریب کا توڑ کرتا ہے۔ "مکر" اصل میں خفیہ تدبیر کو کہتے ہیں، اگر برائی کے لئے کی جائے بری ہے اور برائی کو دور کرنے کے لئے ہو تو اچھی ہے یعنی انہوں نے چھپ چھپ کر ناپاک تدبیریں کیں لیکن خدا کی تدبیر سب پر غالب رہی، اُس نے وہ تدبیریں اُن ہی پر الٹ دیں "وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ" (فاطر۔ رکوع ۵)

يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ؕ
جانتا ہے جو کچھ کماتا ہے ہر ایک جی

یعنی جس سے کوئی حرکت وسکون اور کھلا چھپا کام پوشیدہ نہیں اس کے آگے کسی کا مکر کیا چل سکتا ہے وہ ان مکاروں کو خوب مزا چکھائے گا۔

وَسَيَعْلَمُ الْكُفّٰرُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۴۲﴾

اور اب معلوم کئے لیتے ہیں کافر کہ کس کا ہوتا ہے پچھلا گھر

کافر انجام دیکھ لیں گے:

یعنی جیسے اگلوں نے اپنے مکر کا انجام دیکھ لیا ہو موجودہ کفار کو بھی قدر عافیت معلوم ہوا چاہتی ہے۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ؕ

اور کہتے ہیں کافر تو بھیجا ہوا نہیں آیا کہہ دے

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًاۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۙ

اللہ کافی ہے گواہ میرے اور تمہارے بیچ میں

اللہ کی گواہی کافی ہے:

یعنی تمہارے جھٹلانے سے کچھ نہیں ہوتا، جبکہ خداوند قدس میری صداقت کے بڑے بڑے نشان دکھلا رہا ہے قرآن جو اس کا کلام ہے، جیسے اپنے کلام الٰہی ہونے کی شہادت دیتا ہے اسی طرح میرے پیغمبر برحق ہونے کا گواہ ہے، اگر آنکھیں کھول کر دیکھو تو سخت ناموافق حالات میں سچ کا اس شان سے پھیلتے جانا اور دشمنوں تک کے دلوں میں گھر کرنا، اور جھوٹ کا مغلوب ومقہور ہو کر سمٹتے رہنا خدا کی طرف سے کھلی ہوئی گواہی میری حقانیت کی ہے۔ (تفسیر عثمانی)

یعنی میری سچائی نبوت کے لیے اللہ کی شہادت کافی ہے اس نے میری رسالت کی صداقت ایسے دلائل سے واضح کر دی ہے کہ ان کے بعد کسی اور شاہد کی ضرورت نہیں، اور وہی قیامت کے دن فیصلہ کرے گا، اس روز ان منکروں کے پاس کوئی عذر نہ ہوگا۔ (تفسیر مظہری)

وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ﴿۴۳﴾

اور جس کو خبر ہے کتاب کی

اہل کتاب کی گواہی:

یعنی جن کو قرآن کا علم اور ان کے حقائق کی خبر ہوگئی ہے وہ بھی دل سے گواہ ہیں کہ میں نے کچھ جھوٹ نہیں بنایا۔ نیز جنہیں پہلی کتب سماویہ اور ان کی پیشین گوئیوں کی اطلاع ہے اُن کے دل گواہی دیتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ٹھیک اُن پیشین گوئیوں کے مطابق تشریف لائے ہیں جو سیکڑوں برس پیشتر موسیٰ اور مسیح کر چکے تھے، علیہما وعلیٰ نبینا الصلوٰۃ والسلام، اے خدا! تو گواہ رہ کہ جس چیز کی گواہی تو نے اور تیری کتاب والوں نے دی، یہ عاجز خاطی بھی صدق دل سے اُس کی گواہی دیتا ہے تم سورۃ الرعد بعون اللہ وحسن توفیقہ۔ (تفسیر عثمانی)

جیسے حضرت عبداللہ بن سلام وغیرہ، رہا کافروں کا انکار تو اس کی بنا محض حسد، عناد اور مال وجاہ کی طلب پر ہے حرص وہوا اور حسد ان کو اقرار کرنے سے روک رہے ہیں اس تفسیر کی بناء پر بعض علماء نے کہا کہ پوری سورت اگرچہ مکی ہے مگر یہ آیت مدنی ہے۔

میں کہتا ہوں آیت کو اگر ہم مکی ہی قرار دیں تب بھی آیت میں اہل کتاب مراد ہونا ناممکن نہیں ہے گویا اللہ نے کفار مکہ سے فرمایا کہ اگر تم کو محمد کی رسالت کا یقین نہیں ہے تو اہل کتاب سے دریافت کرلو معتبر اہل کتاب تصدیق کریں گے اور محمد کی نبوت کی شہادت دیں گے۔

حسن اور مجاہد نے کہا الکتاب سے مراد لوح محفوظ ہے اور من عندہ علم الکتب سے مراد اللہ ہے۔ (تفسیر مظہری)

عبداللہ بن سلام کا اسلام لانا:

غریب حدیث میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے علماء یہود سے کہا کہ میرا ارادہ ہے کہ اپنے باپ ابراہیم واسمٰعیل کی مسجد میں جا کر عید منائیں، مکے پہنچے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہیں تھے، یہ لوگ جب حج سے لوٹے تو آپ سے ملاقات ہوئی، اس وقت آپ ایک مسجد میں تشریف فرما تھے، اور لوگ بھی آپ کے پاس تھے یہ بھی مع اپنے ساتھیوں کے کھڑے ہوگئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف دیکھ کر پوچھا کہ آپ ہی عبداللہ بن سلام ہیں، کہا ہاں، فرمایا قریب آؤ، جب قریب گئے تو آپ نے فرمایا کیا تم میرا ذکر تورات میں نہیں پاتے؟ انہوں نے فرمایا آپ خدا تعالیٰ کے اوصاف میرے سامنے بیان فرمایئے، اسی وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام آئے آپ کے سامنے کھڑے ہو گئے اور حکم دیا کہ کہو قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ آپ نے پوری سورت پڑھ کر سنائی، ابن سلام نے اسی وقت کلمہ پڑھ لیا، مسلمان ہوگئے، مدینے واپس چلے آئے لیکن اپنے اسلام کو چھپائے رہے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینے پہنچے اس وقت آپ کھجور کے ایک درخت پر چڑھے ہوئے کھجوریں اتار رہے تھے جو آپ کو خبر پہنچی اسی وقت درخت سے کود پڑے، ماں کہنے لگیں کہ اگر (حضرت موسیٰ) (علیہ السلام) بھی آجاتے تو تم درخت سے نہ کودتے، کیا بات ہے؟ جواب دیا کہ اماں جی (حضرت) موسیٰ کی نبوت سے بھی زیادہ خوشی مجھے ختم المرسلین کی یہاں تشریف آوری سے ہوئی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

سورۂ ابراهیم

جوشخص خواب میں اس کی تلاوت کرے اوراس کی تعبیر یہ ہے کہ وہ توبہ کرنے والوں اور تسبیح کرنے والوں میں سے ہوگا۔ (علامہ ابن سیرین رحمہ اللہ)

سُوْرَةُ اِبْرٰهِيْمَ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ اِثْنَتَانِ وَخَمْسُوْنَ اٰيَةً وَّسَبْعُ رُكُوْعَاتٍ
سورہ ابراہیم مکہ میں اتری اوراس کی باون آیتیں ہیں اورسات رکوع ہیں
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے
الٓرٰ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ
یہ ایک کتاب ہے کہ ہم نے اتاری تیری طرف کہ تو نکالے لوگوں کو
مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ
اندھیرں سے اجالے کی طرف ان کے رب کے حکم سے

عظمتِ قرآن:

یعنی اس کتاب کی عظمت شان کا اندازہ اس بات سے کرنا چاہئے کہ ہم اس کے اتارنے والے اور آپ جیسی رفیع الشان شخصیت اس کی اٹھانیوالی ہے اور مقصد بھی اس قدر اعلیٰ وارفع ہے جس سے بلندتر کوئی مقصد نہیں ہوسکتا وہ یہ کہ خدا کے حکم وتوفیق سے تمام دنیا کے لوگوں کوخواہ عرب ہوں یا عجم ،کالے ہوں یا گورے، مزدور ہوں یا سرمایہ دار، بادشاہ ہوں یا رعایا۔ سب کو جہالت واوہام کی گھٹا ٹوپ اندھیریوں سے نکال کر معرفت وبصیرت اور ایمان وایقان کی روشنی میں کھڑا کرنے کی کوشش کی جائے۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت جریر کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے اسلام میں کوئی اچھا طریقہ قائم کیا اس کواس طریقے (پر چلنے کا اور قائم کرنے) کا ثواب بھی ملے گا اوراس طریقے پر جتنے لوگ چلیں گے ان کے ثواب کے برابر بھی اجر ملے گا (بعدکو) اس طریقہ پرعمل کرنے والوں کے ثواب میں کمی نہیں کی جائے گی (ایسا نہ ہوگا کہ ان کا ثواب گھٹا کر طریقہ حسنہ قائم کرنے والے کا ثواب بڑھادیا جائے) اورجس نے اسلام میں کوئی طریقہ براجاری کیا اس پراس برے طریقہ (کواختیار کرنے) کا گناہ بھی ہوگا اور (آئندہ) جولوگ اس طریقے پرعمل کریں گے ان کا گناہ بھی ہوگا مگراس سے برے طریقہ پر چلنے والوں کے گناہ (اورسزا) میں کوئی کمی نہیں ہوجائیگی۔ رواہ مسلم۔

ابن عساکر نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت ابوسعیدؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے مدینے والو، لوگ علم میں تمہارے تابع ہیں، مدینے والوں سے مراد ہیں انصار اور مہاجر، دوسرے لوگ مہاجرین وانصار کے تابع ہیں مگر انصار، دین (خلافت میں) مہاجرین کے تابع ہیں، دونوں حدیثوں میں کوئی تضادنہیں ہے۔

حضرت ابورافعؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنے گھروالوں کے لئے شیخ (سب کا بزرگ) ایسا ہے جیسے امت کے لئے پیغمبر، رواه ابن النجار والجليلي في مشيخته حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنے گھر میں شیخ ایسا ہے جیسے اپنی قوم (امت) میں پیغمبر۔ رواه ابن حبان في الضعفاء.

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا علماء انبیاء کے وارث ہیں رواه احمد والترمذي وابوداؤد ابن ماجة والدارمي عن كثير بن قيس. ترمذی نے راوی کا نام قیس بن کثیر بتایا ہے۔

حضرت ابوسعید خدریؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اورلوگ تمہارے متبع ہیں لوگ تمہارے پاس اطراف ملک سے دین سیکھنے آتے ہیں تم ان سے اچھا سلوک کرو بھلائی کی ان کونصیحت کرو۔ (رواہ الترمذی)

بعض علماء نے لکھا ہے کہ حدیث الشيخ في بيته كالنبي في قومه میں قومه کی ضمیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راجع ہے۔ (اور النبی سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں) اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمام کتابیں عربی میں اتاری گئی تھیں پھر حضرت جبرئیل نے ان کا ترجمہ مختلف (انبیاء کی) زبانوں میں کیا۔ (تفسیر مظہری)

سورۃ کے مضامین:

اس سورۃ کے شروع میں رسالت ونبوت اوران کی کچھ خصوصیات کا بیان ہے، پھر توحید کا مضمون اوراس کے شواہد کا ذکر ہے اسی سلسلہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ ذکر کیا گیا ہے، اوراسی کی مناسبت سے سورۃ کا نام سورہ ابراہیم رکھا گیا ہے۔

حروفِ مقطعات:

الٓرٰ، ان حروف مقطعات میں سے ہیں جن کے متعلق بار بار ذکر کیا جاچکا ہے کہ اس میں اسلم اور بے غبار طریقہ سلف صالحین کا ہے کہ اس پر ایمان ویقین رکھیں کہ جو کچھ اس کی مراد ہے وہ حق ہے لیکن اس کے معانی کی تحقیق وتفتیش کے درپے نہ ہوں۔

قرآن امن وہدایت کی کتاب:

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ، میں نحوی ترکیب کے لحاظ سے زیادہ واضح

اور صاف صاف بات یہ ہے کہ اس کو لفظ ہٰذا محذوف کی خبر قرار دی جائے اور جملہ کے معنی یہ ہوں کہ یہ وہ کتاب ہے جس کو ہم نے آپ کی طرف نازل کیا ہے اس میں نازل کرنے کی نسبت حق تعالیٰ شانہ کی طرف اور خطاب کی نسبت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرنے میں دو چیزوں کی طرف اشارہ پایا گیا جتنا جتنا لوگ اس کے قریب آئیں گے، اسی انداز سے ان کو دنیا میں بھی امن وامان اور عافیت واطمینان نصیب ہوگا اور آخرت میں بھی فلاح وکامیابی حاصل ہوگی، اور جتنا اس سے دور ہونگے اتنا ہی دونوں جہان کی خرابیوں بربادیوں مصیبتوں اور پریشانیوں کے غار میں گریں گے۔

آیت کے الفاظ میں یہ نہیں کھولا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے ذریعہ کس طرح لوگوں کو اندھیریوں سے نجات دے کر روشنی میں لائیں گے، لیکن اتنی بات ظاہر ہے کہ کسی کتاب کے ذریعہ کسی قوم کو درست کرنے کا طریقہ یہی ہوتا ہے کہ اس کتاب کی تعلیمات وہدایات کو اس قوم میں پھیلا یا جائے اور ان کو اس کا پابند کیا جائے۔

قرآن کریم کی تلاوت بھی مستقل مقصد ہے:

مگر قرآن کریم کی ایک مزید خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کی تلاوت اور بغیر سمجھے ہوئے اس کے الفاظ کا پڑھنا بھی بالخاصہ انسان کے نفس پر اثر انداز ہوتا ہے، اور اس کو برائیوں سے بچنے میں مدد دیتا ہے، کم از کم کفر وشرک کے کیسے ہی خوب صورت جال ہوں قرآن پڑھنے والا اگرچہ بے سمجھے ہی پڑھتا ہو ان کے دام میں نہیں آسکتا، ہندوؤں کی تحریک شدھی سنگھٹن کے زمانے میں اس کا مشاہدہ ہو چکا ہے کہ ان کے دام میں صرف کچھ وہ لوگ آئے جو قرآن کی تلاوت سے بھی بیگانہ تھے، آج عیسائی مشنریز یاں مسلمانوں کے ہر خطہ میں طرح طرح کے سبز باغ اور سنہرے جال لئے پھرتی ہیں لیکن ان کا اگر کوئی اثر پڑتا ہے تو صرف ان گھرانوں پر جو قرآن کی تلاوت سے بھی غافل ہیں خواہ جاہل ہونے کی وجہ سے یا نئی تعلیم کے غلط اثر سے۔

بعثت کے مقاصد:

شاید اسی معنوی اثر کی طرف اشارہ کرنے کے لئے قرآن کریم میں جہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد بتلائے گئے ہیں وہاں تعلیم معانی سے پہلے تلاوت کا جداگانہ ذکر کیا گیا ہے۔

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ،

یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تین کاموں کے لئے بھیجا گیا ہے پہلا کام قرآن مجید کی تلاوت ہے اور ظاہر ہے کہ تلاوت کا تعلق الفاظ سے ہے، معانی سمجھے جاتے ہیں ان کی تلاوت نہیں ہوتی، دوسرا کام لوگوں کو برائیوں سے پاک کرنا اور تیسرا کام قرآن کریم اور حکمت یعنی سنت رسول کی تعلیم دینا ہے۔

الفاظ اور معانی دونوں ہدایت ہیں:

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم ایک ایسا ہدایت نامہ ہے جس کے معانی سمجھ کر اس پر عمل کرنا تو اصل مقصد ہی ہے اور اس کا انسانی زندگی کی اصلاح میں موثر ہونا بھی واضح ہے اس کے ساتھ اس کے الفاظ کی تلاوت کرنا بھی غیر شعوری طور پر انسان کے نفس کی اصلاح میں نمایاں اثر رکھتا ہے۔

اس آیت میں باذن خداوندی اندھیریوں سے نکال کر روشنی میں لانے کی نسبت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کر کے یہ بھی بتلا دیا گیا ہے کہ اگرچہ ہدایت کا پیدا کرنا حقیقۃً حق تعالیٰ کا فعل ہے مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ کے بغیر اس کو حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ﴿١﴾ اللّٰهِ الَّذِيْ

رستہ (راہ) پر (کی طرف) اس زبردست خوبیوں والے اللہ کے جس

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ

کا ہے جو کچھ کہ موجود ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں

اس راہ میں ناکامی نہیں ہے:

یعنی صحیح معرفت کی روشنی میں اس راستہ پر چل پڑیں جو زبردست وغالب، ستودہ صفات، شہنشاہ مطلق اور مالک الکل خدا کا بتایا ہوا اور اس کے مقام رضا تک پہنچانے والا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

ارشاد فرمایا کہ وہ روشنی اللہ کا راستہ ہے جس پر گامزن ہونے والا نہ اندھیرے میں چلنے والے کی طرح بھٹکتا ہے نہ اس کو لغزش ہوتی ہے نہ وہ مقصد تک پہنچنے میں ناکام ہوتا ہے، اللہ کے راستہ سے مراد وہ راستہ ہے جس پر چل کر انسان خدا تک پہنچ سکے، اور اس کی رضا کا درجہ حاصل کر سکے۔

اس جگہ لفظ اللہ تو بعد میں لایا گیا، اس سے پہلے اس کی دو صفتیں عزیز اور حمید ذکر کی گئی ہیں، عزیز کے معنی عربی لغت کے اعتبار سے قوی اور غالب کے ہیں اور حمید کے معنی وہ ذات جو حمد کی مستحق ہو ان دو صفتوں کو اصل نام حق سے پہلے لانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ راستہ جس ذات قدوس کی طرف لے جانے والا ہے وہ قوی اور غالب بھی ہے اور ہر حمد کی مستحق بھی، اس لئے اس پر چلنے والا نہ کہیں ٹھوکر کھائے گا نہ اس کی کوشش رائیگاں ہوگی بلکہ اس کا منزل مقصود پر پہنچنا یقینی ہے شرط یہ ہے کہ اس راستہ کو نہ چھوڑے۔

وَوَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدِ ﴿٢﴾

اور مصیبت ہے کافروں کو ایک سخت عذاب سے

بدنصیب لوگ:

یعنی جولوگ ایسی کتاب نازل ہونے کے بعد کفر وشرک اور جہالت وضلالت کی اندھیری سے نہ نکلے ان کو سخت عذاب اور ہلاکت خیز مصیبت کا سامنا ہے آخرت میں یا دنیا میں بھی۔ (تفسیر عثمانی)

اِلَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ
جو کہ پسند رکھتے ہیں زندگی دنیا کی آخرت سے
وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا
اور روکتے ہیں اللہ کی راہ سے اور تلاش (نکالنا چاہتے ہیں) کرتے
عِوَجًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ۝
ہیں اس میں کجی وہ راستہ بھول کر جا پڑے ہیں دور

کافروں کی حالت:

یہ کافروں کا حال بیان فرمایا کہ ان کا اوڑھنا بچھونا یہی دنیا ہے۔ آخرت کے مقابلہ میں اسی کو پسند کرتے اور ترجیح دیتے ہیں۔ شب وروز اسی کی محبت میں غرق رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی چاہتے ہیں کہ دنیا کی محبت میں پھنسا کر خداتعالیٰ کی خوشنودی کے راستہ سے روک دیں۔ اسی لئے یہ فکر رہتی ہے کہ خدا کے دین میں کوئی عیب نکالیں اور سیدھے راستہ کو ٹیڑھا ثابت کریں۔ فی الحقیقت یہ لوگ راستہ سے بھٹک کر بہت ہی دور جا پڑتے ہیں جن کے واپس آنے کی توقع نہیں۔ خدا کی سخت مار پڑ گی تب آنکھیں کھلیں گی۔ (تفسیر عثمانی)

اہل علم کی ایک غلطی:

جیسے آجکل بے شمار اہل علم اس میں مبتلا ہیں کہ اپنے دل میں ایک خیال کبھی اپنی غلطی سے کبھی کسی دوسری قوم سے متاثر ہو کر گھڑ لیتے ہیں، پھر قرآن وحدیث میں اس کے مویدات تلاش کرتے ہیں، اور کہیں کوئی لفظ اس خیال کی موافقت میں نظر پڑ گیا تو اس کو اپنے حق میں قرآنی دلیل سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ طریقہ کار اصولاً ہی غلط ہے کیونکہ مومن کا کام یہ ہے کہ اپنے خیالات وخواہشات سے خالی الذہن ہو کر کتاب وسنت کو دیکھے، جو کچھ ان سے واضح طور پر ثابت ہو جائے اسی کو اپنا مسلک قرار دے۔

تین بری خصلتیں:

تفسیر قرطبی میں ہے کہ اگرچہ اس آیت میں صراحۃً یہ تین خصلتیں کفار کی بیان کی گئی ہیں اور انہی کا یہ انجام ذکر کیا گیا ہے کہ وہ گمراہی میں دور چلے گئے ہیں، لیکن اصول کی رو سے جس مسلمان میں بھی یہ تین خصلتیں موجود ہوں وہ بھی اس وعید کا مستحق ہے ان تین خصلتوں کا خلاصہ یہ ہے:

۱- دنیا کی محبت کو آخرت پر غالب رکھیں، یہاں تک کہ دین کی روشنی میں نہ آئیں۔
۲- دوسروں کو بھی اپنے ساتھ شریک رکھنے کے لئے اللہ کے راستہ سے روکیں۔
۳- قرآن وسنت کو ہیر پھیر کر کے اپنے خیالات پر منطبق کرنے کی کوشش کریں۔ نعوذ باللہ منہ۔ (معارف مفتی اعظم)

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ
اور کوئی رسول نہیں بھیجا ہم نے مگر بولی بولنے والا اپنی
قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ۭ
قوم کی تاکہ ان کو سمجھائے

طبعی تربیت کالحاظ:

یعنی جس طرح آپ کو ہم نے لوگوں کی ہدایت کے لئے یہ عظیم الشان کتاب عطا فرمائی، پہلے بھی ہر زمانہ میں سامان ہدایت بہم پہنچاتے رہے ہیں۔ چونکہ طبعی ترتیب کے موافق ہر پیغمبر کے اولین مخاطب اسی قوم کے لوگ ہوتے ہیں جس میں سے وہ پیغمبر اٹھایا جاتا ہے اس لئے اسی کی قومی زبان میں وحی بھیجی جاتی رہی۔ تا احکام الٰہیہ کے سمجھنے سمجھانے میں پوری سہولت رہے۔

قرآن عربی میں نازل کرنے کی حکمت:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت دعوت میں گوتمام جن وانس شامل ہیں، تاہم جس قوم میں سے آپ اٹھائے گئے اس کی زبان عربی تھی اور ترتیب طبعی کے موافق شیوع ہدایت کی یہی صورت مقدر تھی کہ آپ کے اولیں مخاطب اور مقدم ترین شاگرد ایسی سہولت اور خوبی سے قرآنی تعلیمات وحقائق کو سمجھ لیں اور محفوظ کر لیں کہ ان کے ذریعہ سے تمام اقوام عالم اور آنیوالی نسلیں درجہ بدرجہ قرآنی رنگ میں رنگی جاسکیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا عربوں نے اپنے نبی کی صحبت میں رہ کر اپنی قومی زبان میں جس سے انہیں بیحد شغف تھا، قرآنی علوم پر کافی دسترس پائی، پھر وہ مشرق ومغرب میں پھیل پڑے اور روم وفارس پر چھا گئے۔ اس وقت قدرت نے عجمی قوموں میں ایسا زبردست جوش اور داعیہ کلام الٰہی کی معرفت اور زبان عربی میں مہارت حاصل کرنیکا پیدا فرمادیا کہ تھوڑی مدت کے بعد وہ قرآنی علوم کی شرح وتبیین میں اپنے معاصر عربوں سے گوئے سبقت لے گئے بلکہ عموماً علوم دینیہ وادبیہ کا مدار ثریا تک پرواز کرنے والے عجمیوں پر رہ گیا۔ اس طرح خدا کی حجت بندوں پر تمام ہوتی رہی اور وقتاً فوقتاً قرآنی ہدایات سے مستفید ہونیکے اسباب فراہم ہوتے رہے۔ فالحمدلله علىٰ ذلك۔ بہرحال خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم

کے خاص قوم عرب میں سے اٹھائے جائیں اگر کچھ وجوہ موجود ہیں (اور یقیناً ہیں) تو ان ہی وجوہ کے نتیجہ میں اس سوال کا جواب بھی آجاتا ہے کہ قرآن عربی زبان میں اتار کر خداوند عالم نے عربوں کی رعایت کیوں کی؟ قومہ سے مراد وہ قوم جس میں پیغمبر پیدا ہوا اور مبعوث ہوا۔ (تفسیر عثمانی)

ہر رسول اپنی قوم کا ہم زبان تھا:

اگر عبرانی زبان بولنے والوں کی طرف کوئی رسول بھیجا تو رسول کی زبان بھی عبرانی ہی تھی، فارسیوں کے رسول کی زبان بھی فارسی، بربریوں کے رسول کی زبان بربری رکھی گئی، خواہ اس صورت سے کہ جس شخص کو رسول بنایا گیا وہ خود اسی قوم کا فرد ہو اور مادری زبان اسی قوم کی زبان ہو، یا یہ کہ اس کی پیدائشی اور مادری زبان اگرچہ کچھ اور ہو مگر اللہ تعالیٰ نے ایسے اسباب پیدا فرمائے کہ اس نے اس قوم کی زبان سیکھ لی، جیسے حضرت لوط علیہ السلام اگرچہ اصل باشندے عراق کے تھے، جہاں کی زبان فارسی تھی، لیکن ملک شام کی طرف ہجرت کرنے کے بعد انہی لوگوں میں شادی کی اور شامیوں کی زبان ہی ان کی زبان بن گئی، تب اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک خطہ شام کا نبی بنایا۔ (معارف القرآن)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات:

صحیح بخاری و مسلم میں بروایت جابرؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام انبیاء کے درمیان اپنی پانچ امتیازی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ مجھ سے پہلے ہر رسول و نبی خاص اپنی قوم و برادری کی طرف مبعوث ہوا کرتا تھا، اللہ تعالیٰ نے مجھے تمام اقوام بنی آدم کی طرف مبعوث فرمایا۔

حق تعالیٰ نے اس عالم میں انسانی آبادی کو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع فرمایا، اور انہی کو انسانوں کا سب سے پہلا نبی اور پیغمبر بنایا، پھر انسانی آبادی جس طرح اپنی عمرانی اور اقتصادی حیثیت سے پھیلتی اور ترقی کرتی رہی، اسی کی مناسبت سے رشد و ہدایت کے انتظامات بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف رسولوں، پیغمبروں کے ذریعہ ہوتے رہے۔ زمانہ کے ہر دور اور ہر قوم کے مناسب حال احکام اور شریعتیں نازل ہوتی رہیں یہاں تک کہ عالم انسانی کا نشو و نما سن کمال کو پہنچا تو اللہ تعالیٰ نے سید الاولین والآخرین امام الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پوری دنیا کا رسول بنا کر بھیجا اور جو کتاب و شریعت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دی وہ پورے عالم اور قیامت تک کے پورے زمانے کے لئے کامل و مکمل کر کے دی، اور ارشاد فرمایا: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ. ''یعنی میں نے آج تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا، اور اپنی نعمت تمہارے لئے پوری کر دی''۔

عربی زبان کی خصوصیت:

اول یہ کہ عربی زبان آسمان کی دفتری زبان ہے، فرشتوں کی زبان عربی ہے، لوح محفوظ کی زبان عربی ہے جیسا کہ آیت قرآن بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ سے معلوم ہوتا ہے اور جنت جو انسان کا وطن اصلی ہے، اور جہاں اس کو لوٹ کو جانا ہے اس کی زبان بھی عربی ہے طبرانی، مستدرک حاکم، شعب الایمان بیہقی میں بروایت حضرت عبداللہ ابن عباسؓ منقول ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

احبوا العرب لثلاث لانی عربی والقراٰن عربی وکلام اھل الجنة عربی، (اس روایت کو حاکم نے مستدرک میں صحیح کہا ہے، جامع صغیر میں بھی صحیح کی علامت بتائی ہے، بعض محدثین نے اس کو ضعیف و مجروح کہا ہے) حافظ حدیث ابن تیمیہؒ نے کہا ہے کہ مضمون اس حدیث کا ثابت ہے درجہ حسن سے کم نہیں، (فیض القدیر شرح جامع صغیر)

معنی حدیث کے یہ ہیں ''کہ تم لوگ تین وجہ سے عرب سے محبت کرو، ایک یہ کہ میں عربی ہوں، دوسرے یہ کہ قرآن عربی ہے، تیسرے یہ کہ اہل جنت کی زبان عربی ہے۔''

تفسیر قرطبی وغیرہ میں یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی زبان جنت میں عربی تھی، زمین پر نازل ہونے اور توبہ قبول ہونے کے بعد عربی ہی زبان میں کچھ تغیرات ہو کر سریانی زبان پیدا ہو گئی۔ (معارف القرآن)

تمام کتب کی اصل زبان عربی تھی:

اس سے ان روایات کی بھی تائید و تقویت ہوتی ہے جو حضرت عبداللہ بن عباسؓ وغیرہ سے منقول ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی کتابیں انبیاء پر نازل فرمائی ہیں ان کی اصلی زبان عربی ہی تھی، جبرئیل امین نے قومی زبان میں ترجمہ کر کے پیغمبروں کو بتلایا اور انہوں نے اپنی قومی زبان میں امتوں کو پہنچایا، یہ روایات علامہ سیوطیؒ نے اتقان میں اور آیت مذکورہ کے ذیل میں اکثر مفسرین نے نقل کی ہیں، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سب آسمانی کتابوں کی اصل زبان عربی ہے، مگر قرآن کریم کے سوا دوسری کتابیں ملکی اور قومی زبانوں میں ترجمہ کر کے دی گئی ہیں اس لئے ان کے معانی تو سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں مگر الفاظ بدلے ہوئے ہیں۔

قرآن کی خصوصیت:

یہ صرف قرآن کی خصوصیت ہے کہ اس کے معانی کی طرح الفاظ بھی حق تعالیٰ ہی کی طرف سے آئے ہوئے ہیں، اور شاید یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے یہ دعویٰ کیا کہ سارا جہان جن و انس جمع ہو کر بھی قرآن کی ایک چھوٹی سورۃ بلکہ ایک آیت کی مثال نہیں بنا سکتے، کیونکہ وہ معنوی اور لفظی حیثیت سے کلام الٰہی اور ایک صفت الٰہی ہے، جس کی کوئی نقل نہیں اتار سکتا، معنوی حیثیت سے تو دوسری آسمانی کتابیں بھی کلام الٰہی ہیں۔ مگر ان میں شاید اصل عربی الفاظ کے بجائے ترجمہ ہونے ہی کی وجہ سے یہ دعویٰ کسی دوسری آسمانی

کتاب نے نہیں کیا، ورنہ قرآن کی طرح کلام الٰہی ہونے کی حیثیت سے ہر کتاب کی یکتائی اور بے مثال ہونا یقینی تھا۔

عربی کے انتخاب کی وجوہات:

عربی زبان کے انتخاب کی ایک وجہ خود اس زبان کی ذاتی صلاحیتیں بھی ہیں کہ ایک مفہوم کی ادائیگی کے لئے اس میں بے شمار صورتیں اور طریقے ہیں۔

اور ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مسلمان کو اللہ تعالیٰ نے فطری طور پر عربی زبان سے ایک مناسبت عطا فرمائی ہے جس کی وجہ سے ہر شخص بآسانی عربی زبان بقدر ضرورت سیکھ لیتا ہے یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ جس ملک میں پہنچے تھوڑے ہی عرصہ میں بغیر کسی جبر و اکراہ کے پورے ملک کی زبان عربی ہوگئی، مصر، شام، عراق سب میں کسی کی زبان بھی عربی نہ تھی، جو آج عربی ممالک کہلاتے ہیں۔

ایک یہ وجہ بھی ہے کہ عرب لوگ اگرچہ اسلام سے پہلے سخت بداعمالیوں کے شکار تھے، مگر اس قوم کی صلاحیتیں اور ملکات اور جذبات ان حالتوں میں بھی بے نظیر تھے، یہی وجہ تھی کہ حق تعالیٰ نے اپنے سب سے بڑے اور آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ان میں پیدا فرمایا اور ان کی زبان کو قرآن کے لئے اختیار فرمایا، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے پہلے انہی کی ہدایت وتعلیم کا حکم دیا وانذر عشیر تک الاقربین۔

مثالی معاشرے کا قیام:

پوری دنیا میں ایک ایسا مثالی معاشرہ پیدا ہوگیا جس کی نظیر اس سے پہلے آسمان وزمین نے نہیں دیکھی تھی، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بے مثال جماعت کو قرآنی تعلیمات کے پھیلانے اور شائع کرنے کے لئے کھڑا کردیا اور فرمایا: بلغوا عنی ولو اٰیۃ، ''یعنی مجھ سے سنی ہوئی بات کو امت تک پہنچادو''۔ جاں نثار صحابہ نے اس ہدایت کو پلے باندھا اور دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچ کر قرآن اور اس کی تعلیمات کو جہان میں پھیلا دیا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر پچیس سال گزرنے نہ پائے تھے کہ قرآن کی آواز مشرق ومغرب میں گونجنے لگی۔

دوسری طرف حق تعالیٰ نے تقدیری اور تکوینی طور پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت دعوت جس میں دنیا کے مشرکین اور اہل کتاب یہود ونصاریٰ سب داخل ہیں ان میں ایک خاص ملکہ اور جذبہ تعلیم وتعلم اور تصنیف وتالیف، تبلیغ واشاعت کا ایسا پیدا فرمادیا کہ اس کی نظیر دنیا کی پچھلی تاریخ میں نہیں ملتی، اس کے نتیجہ میں عجمی اقوام میں نہ صرف قرآن وسنت کے علوم حاصل کرنے کا قوی جذبہ پیدا ہوا بلکہ عربی زبان کو حاصل کرنے اور اس کی ترویج واشاعت میں عجمیوں کا قدم عرب سے پیچھے نہیں رہا۔

عربی زبان کا لٹریچر:

یہ ایک حیرت انگیز حقیقت ہے کہ اس وقت عربی لغت اور محاورات اور اس کے قواعد نحو وصرف (گرامر) پر جتنی کتابیں دنیا میں موجود ہیں وہ بیشتر عجمیوں کی لکھی ہوئی ہیں قرآن وسنت کی جمع وتدوین پھر تفسیر وتشریح میں بھی ان کا حصہ عربوں سے کم نہیں رہا۔

تعلیمات قرآنیہ ہر قوم میں پہنچ گئیں:

اس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اور آپ کی کتاب عربی ہونے کے باوجود پورے عالم پر محیط ہوگئی اور دعوت وتبلیغ کی حد تک عرب وعجم کا فرق مٹ گیا، ہر ملک وقوم اور ہر عجمی زبان کے لوگوں میں ایسے علماء پیدا ہوگئے جنہوں نے قرآن وسنت کی تعلیمات کو اپنی قومی زبانوں میں نہایت سہولت کے ساتھ پہنچا دیا، اور رسول کو قوم کی زبان میں بھیجنے کو جو حکمت تھی وہ حاصل ہوگئی۔

آخر آیت میں فرمایا کہ ہم نے لوگوں کی سہولت کے لئے اپنے رسولوں کو ان کی زبان میں اس لئے بھیجا کہ وہ ہمارے احکام ان کو اچھی طرح سمجھا دیں لیکن ہدایت اور گمراہی پھر بھی کسی انسان کے بس میں نہیں، اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت میں ہے وہ جس کو چاہتے ہیں گمراہی میں رکھتے ہیں جس کو چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں وہی بڑی قوت اور حکمت والے ہیں۔

افضل واکمل زبان:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ قوم عرب میں مبعوث ہوئے اور لغت عرب تمام لغات عالم میں سب سے اشرف اور اکمل اور افصح اور ابلغ ہے اس لئے آپ پر عربی زبان میں کتاب الٰہی کا نزول اولیٰ اور انسب ہوا اور حضور پرنور چونکہ اشرف الرسل اور اکمل الرسل ہیں اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کتاب اسی زبان میں نازل کی گئی کہ جو تمام لغات میں سب سے اشرف اور اکمل ہے کسی زبان میں عربی زبان جیسا نہ لغت تھا اور نہ صرف ونحو اور نہ بلاغت ہے، کافیہ اور شافیہ اور تلخیص المفتاح کا تو کیا ذکر کروں امریکہ اور برطانیہ کے پاس انگریزی زبان کے قواعد کی میزان منشعب اور پنج گنج اور نحومیر بھی نہیں اگر ہے تو لائے اور دکھلائے۔ (معارف کاندھلوی)

فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ
پھر راستہ بھلاتا (بھٹکاتا ہے) ہے اللہ جس کو چاہے اور راستہ دکھلاتا
يَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۴
(دیتا ہے) ہے، جس کو چاہے اور وہ ہے زبردست حکمتوں والا

ہر کسی نے اپنی مرضی کی چیز خریدی:

یعنی تبیین وہدایت کے سامان مکمل کردیے پھر جس نے ان سامانوں سے منتفع ہونا چاہا اس کی دستگیری فرما کر راہ پر لگا دیا جس نے روگردانی کی

اسے گمراہی میں چھوڑے رکھا۔ وہ زبردست اور غالب ہے۔ چاہے تو سب کو زبردستی راہ ہدایت پر لگادے لیکن اس کی حکمت مقتضی ہوئی کہ انسان کو کسب واختیار کی ایک حد تک آزادی دے کر رحمت وغضب دونوں کے مظاہر کو دنیا میں باقی رہنے دے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ

اور بھیجا تھا ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر

اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ

کہ نکال اپنی قوم کو اندھیروں سے اجالے کی

وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ

طرف اور یاد دلا ان کو دن اللہ کے البتہ اس میں نشانیاں ہیں اس کو جو

لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝

صبر کرنے والا ہے شکر (حق ماننے والا) گزار

موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ یاد کرو:

"نشانیاں دیکر" یعنی معجزات دیکر جو "آیات تسعہ" کے نام سے مشہور ہیں یا آیات تورات مراد ہوں۔ اور "یاد دلا انکو دن اللہ کے" یعنی ان دنوں کے واقعات یاد دلاؤ، جب ان پر شدائد ومصائب کے پہاڑ ٹوٹے پھر اللہ تعالیٰ نے ان سے نجات دی اور اپنی مہربانی مبذول فرمائی۔ کیونکہ دونوں قسم کے حالات سننے سے صابر وشاکر بندوں کو عبرت حاصل ہوتی ہے۔ کہ مصیبت کے وقت گھبرانا اور راحت کے وقت اترانا نہیں چاہئے۔ جو لوگ پہلے کامیاب ہوئے ہیں وہ سختیوں پر صبر اور نعمائے الٰہیہ پر شکر کرنے سے ہوئے ہیں۔ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ڏ بِمَا صَبَرُوْا ۭ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ (اعراف۔ رکوع ۱۶)۔ (تفسیر عثمانی)

گزشتہ اقوام کو یاد کرو:

ایام اللہ سے حضرت ابن عباس حضرت ابی بن کعب مجاہد اور قتادہ کے نزدیک اللہ کی نعمتیں مراد ہیں۔

محاورہ میں بولا جاتا ہے کہ فلاں شخص ایام العرب کا عالم ہے یعنی عرب کی لڑائیوں سے واقف ہے اس تقریر پر کلام کا مطلب اس طرح ہوگا کہ اپنی قوم کو وہ واقعات بتاؤ جو اللہ نے گزشتہ ایام میں ظاہر کئے خواہ وہ بصورت نعمت ہوئے ہوں یا بشکل مصیبت ہیں اور مقاتل کے نزدیک وہ واقعات مراد ہیں جو گزشتہ امتوں عاد وثمود اور قوم نوح کو پیش آئے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ. بلاشبہ ان واقعات میں (اللہ کی ہستی اس کی قدرت وحکمت اور توحید کی) بڑی نشانیاں ہیں۔

صبر وشکر ضروری ہے:

لِّكُلِّ صَبَّارٍ ہر ایسے آدمی کے لئے جو (مصیبت اور طاعت اور گناہ سے اجتناب پر) ہے۔

شَكُوْرٍ. (اور نعمتوں پر) بڑا شکر ادا کرنے والا ہو۔ مراد یہ ہے کہ ہر مؤمن کے لئے اس میں بڑی نشانیاں ہیں صبار اور شکور کے الفاظ سے اس طرف اشارہ ہے کہ ہر مومن کے اندر صبر وشکر کی صفت ہونی لازم ہے۔ بیہقی نے شعب الایمان میں اور ابن ابی حاتم نے باسناد ابوظبیان حسب روایت علقمہ حضرت ابن مسعودؓ کا قول نقل کیا ہے کہ صبر آدھا ایمان ہے اور یقین پورا ایمان۔

بیہقی نے حضرت انسؓ کی روایت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے کہ ایمان دو حصوں کا مجموعہ ہے ایمان کا آدھا حصہ صبر میں اور آدھا حصہ شکر میں ہے۔ طبرانی نے مکارم الاخلاق میں اور ابو یعلی نے نقل کیا ہے کہ ایمان صبر وسماحت (ایثار) کا نام ہے۔

مسلم اور امام احمد نے حضرت صہیبؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مومن کا بھی عجیب معاملہ ہے اس کا ہر کام خیر ہی خیر ہے مؤمن کے علاوہ کسی اور کو یہ بات نصیب نہیں اگر اس کا سکھ پہنچتا ہے تو وہ شکر کرتا ہے اور یہ اس کیلئے خیر ہو جاتا ہے اور دکھ پہنچتا ہے تو صبر کرتا ہے اور یہ اس کے لئے خیر ہو جاتا ہے۔

مسند احمد کی مرفوع حدیث میں ایام اللہ کی تفسیر خدا کی نعمتوں سے مروی ہے لیکن ابن جریر میں یہ روایت ابی بن کعبؓ سے مرفوعا بھی آئی ہے اور یہی زیادہ ٹھیک ہے۔ ہم نے اپنے بندوں بنی اسرائیل کے ساتھ جو احسان کئے فرعون سے نجات دلوانا اس کے ذلیل عذابوں سے چھڑوانا، اس میں ہر صابر وشاکر کے لئے عبرت ہے جو مصیبت میں صبر کے اور راحت میں شکر کے خوگر ہیں۔ قتادہؒ فرماتے ہیں اچھا بندہ وہ ہے جو سختی کے وقت صبر کرے اور نرمی کے وقت شکر کرے۔ صحیح حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں مؤمن کا تمام کام عجیب ہے اسے مصیبت پہنچے تو صبر کرتا ہے وہی اس کے حق میں بہتر ہوتا ہے اور اگر اسے راحت وآرام ملے شکر کرتا ہے، اس کا انجام بھی اس کے لئے بہتر ہوتا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

"ایام اللہ" کا معنی:

ایام، یوم کی جمع ہے، جس کے معنی دن کے مشہور ہیں لفظ ایام اللہ دو معنی کے لئے بولا جاتا ہے اور وہ دونوں یہاں مراد ہوسکتے ہیں، اول وہ خاص ایام

جن میں کوئی جنگ یا انقلاب آیا ہے جیسے غزوہ بدر واحد اور احزاب وحنین وغیرہ کے واقعات یا پچھلی امتوں پر عذاب نازل ہونے کے واقعات ہیں جن میں بڑی بڑی قومیں زیروزبر یا نیست ونابود ہوگئیں، اس صورت میں ایام اللہ یاد دلانے سے ان قوموں کو کفر کے انجام بد سے ڈرانا اور متنبہ کرنا مقصود ہوگا۔

دوسرے معنی ایام اللہ کے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور احسانات کے بھی آتے ہیں تو ان کو یاد دلانے کا مقصد یہ ہوگا کہ شریف انسان کو جب کسی محسن کا احسان یاد دلایا جائے تو وہ اس کی مخالفت اور نافرمانی سے شرما جاتا ہے۔

عمل کی تدبیر:

قرآن مجید کا اسلوب اور طریق اصلاح عموماً یہ ہے کہ جب کوئی حکم دیا جاتا ہے تو ساتھ ہی اس حکم پر عمل آسان کرنے کی تدبیریں بھی بتلائی جاتی ہیں یہاں پہلے جملہ میں موسیٰ علیہ السلام کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کی آیات سنا کر یا معجزات دکھا کر اپنی قوم کو کفر کی اندھیری سے نکالو، اور ایمان کی روشنی میں لاؤ، اس کی تدبیر اس جملہ میں یہ ارشاد فرمائی کہ نافرمانوں کو راہ راست پر لانے کی دو تدبیریں ہیں ایک سزا سے ڈرانا، دوسرے نعمتوں اور احسانات کو یاد دلا کر اطاعت کی طرف بلانا، جملہ ذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ میں یہ دونوں چیزیں مراد ہوسکتی ہیں۔ کہ پچھلی امتوں کے نافرمانوں کا انجام بد ان پر آنے والے عذاب اور جہاد میں ان کا مقتول یا ذلیل وخوار ہونا ان کو یاد دلائیں، تاکہ وہ عبرت حاصل کر کے اس سے بچ جائیں اسی طرح اس قوم پر جو اللہ تعالیٰ کی عام نعمتیں دن رات برستی ہیں اور جو مخصوص نعمتیں ہر موقع پر ان کے لئے مبذول ہوئی ہیں۔

مثلاً وادی تیہ میں ان کے سروں پر ابر کا سایہ، خوراک کے لئے من وسلویٰ کا نزول پانی کی ضرورت ہوئی تو پتھر سے چشموں کا بہہ نکلنا وغیرہ ان کو یاد دلا کر خدا تعالیٰ کی اطاعت اور توحید کی طرف بلایا جائے۔

ماضی میں نشانیاں ہیں:

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ. اس میں آیات سے مراد نشانیاں اور دلائل ہیں اور صبار صبر سے مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں بہت صبر کرنے والا اور شکور شکر سے مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں بہت شکر گزار، جملہ کے معنی یہ ہیں کہ ایام اللہ یعنی پچھلے واقعات خواہ جو منکروں کی سزا اور عذاب سے متعلق ہوں یا اللہ تعالیٰ کی انعامات واحسانات سے متعلق بہرحال ماضی کے واقعات میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کی بڑی نشانیاں اور دلائل موجود ہیں اس شخص کی لئے جو بہت صبر کرنے والا اور بہت شکر کرنے والا ہو۔

صبر کا اجر:

صحیح مسلم اور مسند احمد میں بروایت حضرت صہیبؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مؤمن کا ہر حال خیر ہی خیر اور بھلا ہی بھلا ہے۔ اور یہ بات سوائے مؤمن کے اور کسی کو نصیب نہیں کیونکہ مؤمن کو اگر کوئی راحت، نعمت یا عزت ملتی ہے تو وہ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوتا ہے جو اس کے لئے دین ودنیا میں خیر اور بھلائی کا سامان ہو جاتا ہے (دنیا میں تو حسب وعدۂ الٰہی نعمت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے اور قائم رہتی ہے اور آخرت میں اس کے شکر کا اجر عظیم اس کو ملتا ہے) اور اگر مؤمن کو کوئی تکلیف یا مصیبت پیش آجائے تو وہ اس پر صبر کرتا ہے اس کے صبر کی وجہ سے وہ مصیبت بھی اس کے لئے نعمت وراحت کا سامان ہو جاتی ہے (دنیا میں اس طرح کہ صبر کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی معیت نصیب ہوتی ہے، قرآن کا ارشاد ہے اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ اور اللہ جس کے ساتھ ہو انجام کار اس کی مصیبت راحت سے تبدیل ہو جاتی ہے، اور آخرت میں اس طرح کہ صبر کا اجر عظیم اللہ تعالیٰ کے نزدیک بے حساب ہے، جیسا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ۔

خلاصہ یہ ہے کہ مؤمن کا کوئی حال برا نہیں ہوتا اچھا ہی اچھا ہے وہ گرنے میں بھی ابھرتا ہے اور بگڑنے میں بھی بنتا ہے۔

نہ شوخی چل سکی بادصبا کی
بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی

ایمان وہ دولت ہے جو مصیبت وتکلیف کو بھی راحت ونعمت میں تبدیل کر دیتی ہے۔

امت محمدیہ کی دانشمندی وبردباری:

حضرت ابوالدرداءؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ میں آپ کے بعد ایک ایسی امت پیدا کرنے والا ہوں کہ اگر ان کی دلی مراد پوری ہو اور کام حسب منشاء ہو جائے تو وہ شکر ادا کریں گے، اور اگر ان کی خواہش اور مرضی کے خلاف ناگوار اور ناپسندیدہ صورت حال پیش آئے تو وہ اس کو ذریعہ ثواب سمجھ کر صبر کریں گے اور یہ دانشمندی اور بردباری ان کی اپنی ذاتی عقل وحلم کا نتیجہ نہیں بلکہ ہم ان کو اپنے علم وحلم کا ایک حصہ عطا فرمادیں گے۔ (مظہری)

صبر وشکر کی حقیقت:

شکر کی حقیقت کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو اس کی نافرمانی اور حرام وناجائز کاموں میں خرچ نہ کرے اور زبان سے بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے اور اپنے افعال واعمال کو بھی اس کی مرضی کے مطابق بنائے۔

اور صبر کا خلاصہ یہ ہے کہ خلاف طبع امور پر پریشان نہ ہو، اپنے قول وعمل میں ناشکری سے بچے، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کا دنیا میں بھی امیدوار رہے اور آخرت میں صبر کے اجر عظیم کا یقین رکھے۔ (معارف مفتی اعظم)

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ

اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم کو یاد کرو

اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ

اللہ کا احسان اپنے اوپر جب چھڑا دیا تم کو فرعون کی قوم سے

يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ

وہ پہنچاتے تھے تم کو برا عذاب

مثلاً تم کو غلام بنا رکھا تھا اور سخت بیگاریں لیتے تھے۔ (تفسیر عثمانی)

وَيُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ

اور ذبح کرتے تمہارے بیٹوں کو اور زندہ رکھتے تمہاری عورتوں کو

وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۝

اور اس میں مدد ہوئی تمہارے رب کی طرف سے بڑی

انعام سے آزمائش:

کہ تم کو غلامی کی ذلت سے نکالا اور دولت آزادی سے مالا مال کیا۔ "بلاء" کے اصل معنی آزمائش کے ہیں۔ تکلیف وراحت دونوں حالتوں میں بندے کے صبر وشکر کی آزمائش ہے۔ " وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً " (الانبیاء۔ رکوع ۳) وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ۔ (اعراف۔ رکوع ۲۱)۔ چونکہ فرعونیوں سے نجات دینا بڑی نعمت تھی تو یہاں آزمائش انعام سے ہوئی جسے مترجم محققؒ نے بطور حاصل معنی لفظ "مدد" سے تعبیر کیا۔ اس قسم کی آیت سورۂ بقرہ اور اعراف میں گزر چکی ہے وہاں کے فوائد ملاحظہ کر لئے جائیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ

اور جب سنا دیا تمہارے رب نے اگر احسان مانو گے تو

لَاَزِيْدَنَّكُمْ

اور بھی دوں گا تم کو

شکر سے نعمت بڑھتی ہے:

موسیٰ علیہ السلام کا مقولہ ہے یعنی وہ وقت بھی یاد کرو جب تمہارے پروردگار نے اعلان فرمادیا کہ اگر احسان مان کر زبان ودل سے میری نعمتوں کا شکر ادا کرو گے تو اور زیادہ نعمتیں ملیں گی۔ جسمانی وروحانی اور دنیوی واخروی ہر قسم کی۔ (تفسیر عثمانی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس کو شکر دیا گیا (شکر کرنے کی توفیق دی گئی) وہ زیادتی سے محروم نہ رہے گا۔ رواہ ابن مردویہ عن ابن عباسؓ۔ (تفسیر مظہری)

شکر اور ناشکری کے نتائج:

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ

لفظ تاذن، اذن اور اطلاع دینے اور اعلان کرنے کے معنی میں ہے مطلب آیت کا یہ ہے کہ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان عام فرمادیا ہے کہ اگر تم نے میری نعمتوں کا شکر ادا کیا کہ ان کو میری نافرمانیوں اور ناجائز کاموں میں خرچ نہ کیا اور اپنے اعمال وافعال کو میری مرضی کے مطابق بنانے کی کوشش کی تو میں ان نعمتوں کو اور زیادہ کر دوں گا۔ یہ زیادتی نعمتوں کی مقدار میں بھی ہو سکتی ہے۔ اور ان کے بقاء ودوام میں بھی، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کو شکر ادا کرنے کی توفیق ہوگئی وہ کبھی نعمتوں میں برکت اور زیادت سے محروم نہ ہوگا (رواہ ابن مردویہ عن ابن عباسؓ مظہری)۔ اور فرمایا کہ اگر تم نے میری نعمتوں کی ناشکری کی تو میرا عذاب بھی سخت ہے، ناشکری کا حاصل یہی ہے کہ اللہ کی نعمتوں کو اس کی نافرمانی اور ناجائز کاموں میں صرف کرے یا اس کے فرائض وواجبات کی ادائیگی میں سستی کرے اور کفران نعمت کا عذاب شدید دنیا میں بھی یہ ہوسکتا ہے کہ یہ نعمت سلب ہوجائے یا ایسی مصیبت میں گرفتار ہوجائے کہ نعمت کا فائدہ نہ اٹھا سکے اور آخرت میں بھی عذاب میں گرفتار ہو۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے شکر گزاروں کے لئے تو اجر وثواب اور نعمت کی زیادتی کا وعدہ اور وہ بھی بلفظ تاکید وعدہ فرمایا ہے لازیدنکم لیکن اس کے بالمقابل ناشکری کرنے والوں کے لئے یہ نہیں فرمایا کہ لاعذبنکم یعنی میں تمہیں ضرور عذاب دوں گا بلکہ صرف اتنا فرما کر ڈرایا ہے کہ میرا عذاب بھی جس کو پہنچے وہ بڑا سخت ہوتا ہے اس خاص تعبیر میں اشارہ ہے کہ ہر ناشکرے کا گرفتار عذاب ہونا کچھ ضروری نہیں معافی کا بھی امکان ہے۔ (معارف القرآن)

وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ۝

اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب البتہ سخت ہے

ناشکری:

موجودہ نعمتیں سلب کر لی جائینگی اور ناشکری کی مزید سزا الگ رہی۔ حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک سائل آیا آپ نے ایک

کھجور عنایت فرمائی اس نے نہ لی یا پھینک دی۔ پھر دوسرا سائل آیا اس کو بھی ایک کھجور دی، وہ بولا ''سبحان اللہ تمرۃ من رسول اللہ صلعم یعنی رسول اللہ کا تبرک ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جاریہ کو حکم دیا کہ ام سلمہؓ کے پاس جو چالیس درہم رکھے ہیں وہ اس (شکر گزار) سائل کو دلوادے۔ (تفسیر عثانی)

شکر نعمت نعمتت افزوں کند　　کفر نعمت نعمتت بیروں کند

نعمتِ ایمان کا شکر:

اس لئے بعض بزرگوں کا قول ہے کہ اگر اسلام اور ایمان کی نعمت کا شکر کرو گے تو اللہ تعالیٰ اس میں زیادتی فرمائے گا اور مقام احسان اور مشاہدہ تک پہنچادے گا۔

بذکرش جملہ موجودات گویا　　ہمہ ادراز روئے شوق جویا

وَقَالَ مُوسٰۤى اِنْ تَكْفُرُوْۤا اَنْتُمْ وَمَنْ
اور کہا موسیٰ نے اگر کفر (منکر ہو گے) کرو گے تم اور جو لوگ زمین
فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِىٌّ حَمِيْدٌ ۝٨
میں ہیں سارے تو اللہ بے پرواہ ہے سب خوبیوں والا

اللہ شکر کا محتاج نہیں:

یعنی کفران نعمت کا ضرر تم ہی کو پہنچے گا۔ خدا کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اسے تمہارے شکریوں کی کیا حاجت ہے۔ کوئی شکر ادا کرے یا نہ کرے، بہرحال اس کے حمید و محمود ہونے میں کچھ کمی نہیں آتی۔ صحیح مسلم میں حدیث قدسی ہے جس میں حق تعالیٰ نے فرمایا ''اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے، پچھلے، جن وانس سب کے سب ایک اعلیٰ درجہ کے متقی شخص کے نمونہ پر ہو جائیں تو اس سے میرے ملک میں کچھ بڑھ نہیں جاتا۔ اور اگر سب اگلے پچھلے جن وانس مل کر بفرض محال ایک بدترین انسان جیسے ہو جائیں (العیاذ باللہ) تو اس سے میرے ملک میں ذرہ برابر کمی نہیں ہوتی۔'' (تفسیر عثانی)

ناشکری کا نقصان تمہیں ہوگا:

اس کی حمد ابدی ازلی ہے خود اس کی ذات سے پیدا ہو رہی ہے فرشتے بھی اس کی حمد کرتے ہیں اور کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی حمد میں مشغول ہے۔ پورا کلام اس طرح تھا اگر تم ناشکری کرو گے تو اپنے آپ کو خود نقصان پہنچاؤ گے اپنی ذات کو مستحق عذاب اور ثواب سے محروم بناؤ گے اللہ بے نیاز اور مستحق حمد ہے۔

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ
کیا نہیں پہنچی تم کو خبر ان لوگوں کی جو پہلے تھے تم سے قوم
نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۬ۛ وَالَّذِيْنَ مِنْ
نوح کی اور عاد اور ثمود اور جو ان سے پیچھے ہوئے
بَعْدِهِمْ ۛؕ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ؕ
کسی کو ان کی خبر نہیں مگر اللہ کو

پچھلی قوموں سے عبرت:

یہ موسیٰ علیہ السلام کے کلام کا تتمہ ہے۔ یا اسے چھوڑ کر حق تعالیٰ نے اس امت کو خطاب فرمایا ہے۔ بہرحال اس میں بتلایا کہ جو بیشمار قومیں پہلے گزر چکیں ان کے تفصیلی پتے اور احوال بجز خدا کے کسی کو معلوم نہیں۔ البتہ چند قومیں جو عرب والوں کے یہاں زیادہ مشہور تھیں ان کے نام لیکر اور بقیہ کو ''وَالَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ'' میں درج کر کے متنبہ فرماتے ہیں کہ ان اقوام کا جو کچھ حشر ہوا کیا وہ تم کو نہیں پہنچا۔ تعجب ہے اتنی قومیں پہلے تباہ ہو چکیں اور ان کے حال سے ابھی تک تمہیں عبرت حاصل نہ ہوئی۔

(تنبیہ): ابن عباسؓ نے ''لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ'' کو پڑھ کر فرمایا ''کذب النسابون'' (یعنی انساب کی پوری معرفت کا دعویٰ رکھنے والے جھوٹے ہیں) عروۃ بن الزبیر فرماتے ہیں کہ ہم نے کسی کو نہیں پایا، جو معد بن عدنان سے اوپر (تحقیقی طور پر) نسب کا حال بتاتا ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوْۤا
آئے ان کے پاس ان کے رسول نشانیاں لے کر پھر لوٹائے (الٹے
اَيْدِيَهُمْ فِىْۤ اَفْوَاهِهِمْ
دے لئے) انہوں نے اپنے ہاتھ اپنے منہ میں

قوم کی گستاخیاں:

یعنی کفار فرط غیظ سے اپنے ہاتھ کاٹنے لگے جیسے دوسری جگہ ہے۔ ''عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ'' یا انبیاء کی باتیں سن کر فرط تعجب سے ہاتھ منہ پر رکھ لئے یا ہاتھ منہ کی طرف لیجا کر اشارہ کیا کہ بس چپ رہیے۔ یا ہماری اس زبان سے اس جواب کے سوا کوئی توقع نہ رکھو، جو آگے آرہا ہے۔ یا پیغمبر کی باتیں سن کر ہنستے تھے اور کبھی ہنسی کے دبانے کو منہ پر ہاتھ رکھ لیتے تھے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایدیھم کی ضمیر کفار کی طرف اور افواھھم کی ''رسل'' کی طرف راجع ہو، یعنی ملعونوں نے اپنے ہاتھ پیغمبروں کے منہ میں اڑا دیے کہ وہ بالکل بول نہ سکیں یا دونوں ضمیریں رسل کی طرف ہوں۔ یعنی گستاخانہ طور پر انبیاء کے ہاتھ پکڑ کر انہی کے منہ میں ٹھونس دیے بعض کے نزدیک یہاں

''ایدی'' سے مراد نعمتیں ہیں۔ یعنی جو عظیم الشان نعمتیں انبیاء نے پیش کی تھیں مثلاً شرائع الٰہیہ وغیرہ وہ ناقدری سے ان ہی کی طرف لوٹا دیں کسی کو قبول نہ کیا جیسے ہمارے محاورات میں کہتے ہیں کہ میں نے فلاں شخص کی چیز اس کے منہ پر ماری۔ بہرحال کوئی معنی لئے جائیں سب کا حاصل یہ ہے کہ انہوں نے نعمت خداوندی کی ناقدری کی اور انبیاء علیہم السلام کی دعوت قبول نہ کی ان کے ساتھ بڑی بے رخی بلکہ گستاخی سے پیش آئے۔

وَقَالُوٓا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ وَاِنَّا
اور بولے ہم نہیں مانتے جو تم کو دے کر بھیجا اور ہم کو تو شبہ ہے
لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ﴿۹﴾
اس راہ میں جس کی طرف تم ہم کو بلاتے ہو خلجان
قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ
میں ڈالنے والا بولے ان کے رسول کیا اللہ میں شبہ ہے جس نے
وَالْاَرْضِ ؕ
بنائے آسمان اور زمین

نظام کائنات کی شہادت:

یعنی خدا کی ہستی اور وحدانیت تو ایسی چیز نہیں جس میں شک وشبہ کی ذرا بھی گنجائش ہو، انسانی فطرت خدا کے وجود پر گواہ ہے۔ علویات وسفلیات کا عجیب وغریب نظام شہادت دیتا ہے کہ اس مشین کے پرزوں کو وجود کے سانچہ میں ڈھالنے والا پھر انہیں جوڑ کر نہایت محکم ومنظم طریقہ سے چلانے والا بڑا زبردست ہاتھ ہونا چاہئے جو کامل حکمت واختیار سے عالم کی مشین کو قابو میں کئے ہوئے ہے۔ اسی لئے کٹر سے کٹر مشرک کو بھی کسی نہ کسی رنگ میں اس بات کے اعتراف سے چارہ نہیں رہا کہ بڑا خدا جس نے آسمان وزمین وغیرہ کرات پیدا کئے وہ ہی ہوسکتا ہے جو تمام چھوٹے چھوٹے دیوتاؤں سے اونچے مقام پر براجمان ہو۔ انبیاء کی تعلیم یہ ہے کہ جب انسانی فطرت نے ایک علیم وحکیم قادر وتوانا منبع الکمالات خدا کا سراغ پالیا پھر اوہام وظنون کی دلدل میں پھنس کر اس سادہ فطری عقیدہ کو کھلونا یا چیستاں کیوں بنایا جاتا ہے۔ وجدان شہادت دیتا ہے کہ ایک قادر مطلق اور عالم الکل خدا کی موجودگی میں کسی پتھر یا درخت یا انسانی تصویر یا سیارہ فلکی یا اور کسی مخلوق کو الوہیت میں شریک کرنا فطرت صحیحہ کی آواز کو دبانے یا بگاڑنے کا مرادف ہے۔ کیا خداوند قدوس کی ذات وصفات میں (معاذ اللہ) کچھ کمی محسوس ہوئی

جس کی مخلوق خداؤں کی جمعیت سے تلافی کرنا چاہتے ہو۔

يَدْعُوْكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ
وہ تم کو بلاتا ہے تاکہ بخشے تم کو کچھ گناہ تمہارے

بخشش کی دعوت:

یعنی ہم نہیں بلاتے۔ فی الحقیقت ہمارے ذریعہ سے وہ تم کو اپنی طرف بلا رہا ہے کہ توحید وایمان کے رستہ پر چل کر اس کے مقام قرب تک پہنچو۔ اگر تم اپنی حرکتوں سے باز آکر ایمان وایقان کا طریق اختیار کرلو تو ایمان لانے سے پیشتر کے سب گناہ (بجز حقوق وزواجر کے) معاف کردیگا۔ پھر ایمان لانیکے بعد جیسا عمل کروگے اس کے موافق معاملہ ہوگا۔

وَيُؤَخِّرَكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ
اور ڈھیل دے تم کو ایک وعدہ تک جو ٹھہر چکا ہے

یعنی کفر وشرارت پر قائم رہنے کی صورت میں جو جلد تباہ کئے جاتے اس سے محفوظ ہوجاؤ گے اور جتنی مدت دنیا میں رہو گے سکون واطمینان کی زندگی گزاروگے۔ ''يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا'' اور ''فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً'' وغیرہ نصوص کے موافق۔ (تفسیر عثمانی)

اس آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ جن سابق قوموں کو کفر پر قائم رہنے کی وجہ سے ہلاک کیا گیا ان کی ہلاکت کفر پر اصرار رکھنے کے ساتھ مشروط تھی اور یہ قضاء ہلاکت معلق تھی اگر وہ ایمان لے آتے تو ان کی عمریں طویل ہوجاتیں (اور انتہائے عمر سے پہلے ہلاک نہ ہوتے)۔ (تفسیر مظہری)

قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۭ تُرِيْدُوْنَ
کہنے لگے تم تو یہی آدمی ہو ہم جیسے تم چاہتے ہو کہ
اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُنَا
روک دو ہم کو ان چیزوں سے جن کو پوجتے رہے ہمارے
فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۰﴾
باپ دادے، سو لاؤ کوئی سند کھلی ہوئی

معجزات کی فرمائش:

یعنی اچھا خدا کی بحث کو چھوڑیے۔ آپ اپنی نسبت کہیں کیا آپ آسمان کے فرشتے ہیں؟ یا نوع بشر کے علاوہ کوئی دوسری نوع ہیں؟ جب کچھ نہیں ہم ہی جیسے

آدمی ہو تو آخر کس طرح آپ کی باتوں پر یقین کر لیں۔ آپ کی خواہش یہ ہوگی کہ ہم کو قدیم مذہب سے ہٹا کر اپنا تابع بنا لیں تو خاطر جمع رکھئے یہ کبھی نہ ہوگا اگر آپ اپنا امتیاز ثابت کرنا اور اس مقصد میں کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو کوئی ایسا کھلا ہوا نشان یا خدائی سرٹیفکٹ دکھلایئے جس کے سامنے خواہی نہ خواہی سب کی گردنیں جھک جائیں۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہماری فرمائش کے موافق معجزات دکھلائیں۔

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ
ان کو کہا ان کے رسولوں نے ہم تو یہی آدمی ہیں
مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ
جیسے تم لیکن اللہ احسان کرتا ہے اپنے بندوں میں
مِنْ عِبَادِهٖ
جس پر چاہے

اللہ نے نبوت سے سرفراز کیا:

یعنی تمہارا یہ کہنا درست ہے کہ ہم نہ فرشتے ہیں نہ کوئی اور مخلوق بلکہ نفس بشریت میں تم ہی جیسے ہیں لیکن نوع بشر کے افراد میں احوال و مدارج کے اعتبار سے کیا زمین و آسمان کا تفاوت نہیں۔ آخر اتنا تو تم بھی مشاہدہ کرتے ہو کہ حق تعالیٰ نے جسمانی، دماغی، اخلاقی اور معاشی حالات کے اعتبار سے بعض انسانوں کو بعض پر کس قدر فضیلت دی ہے۔ پھر اگر یہ کہا جائے کہ خدا نے اپنے بعض بندوں کو ان کی فطری قابلیت اور اعلیٰ ملکات کی بدولت روحانی کمال اور باطنی قرب کے اس بلند مقام پر پہنچا دیا جسے "مقام نبوت" یا "منصب رسالت" کہتے ہیں تو اس میں کیا اشکال واستبعاد ہے؟ بہر حال دعویٰ نبوت سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہم اپنی نسبت بشر کے سوا کوئی دوسری نوع ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ ہاں اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے بندوں میں سے بعض پر ایک خصوصی احسان فرماتا ہے جو دوسروں پر نہیں ہوتا۔

وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ
اور ہمارا کام نہیں کہ لے آئیں تمہارے پاس سند
اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ
مگر اللہ کے حکم سے اور اللہ پر بھروسہ چاہئے
الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱﴾
ایمان والوں کو

معجزات اللہ کے اختیار میں ہیں:

یعنی اب رہا سند اور سارٹیفکٹ لانے کا قصہ، سو خدا کے حکم سے ہم پہلے ہی اپنی نبوت کی سند اور روشن نشانیاں دکھلا چکے ہیں۔" کما قال جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ " جو آدمی ماننا چاہے اس کے اطمینان کے لئے وہ کافی سے زیادہ ہیں۔ باقی تمہاری فرمائشیں پوری کرنا، تو یہ چیز ہمارے قبضہ میں نہیں۔ نہ ہماری تصدیق عقلاً اس پر موقوف ہے۔ خدا تعالیٰ اپنی حکمت کے موافق جو سند اور نشان چاہے، تم کو دکھلائیگا، فرمائشی نشانات دیکھنے سے ایمان نہیں آتا، اللہ کے دینے سے آتا ہے، لہٰذا ایک ایماندار کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہئے۔ اگر تم نہ مانو گے اور ہماری عداوت وایذا رسانی پر تیار ہو گے تو ہمارا بھروسہ اسی خدا کی مہربانی اور امداد پر رہیگا۔ (تفسیر عثمانی)

وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا
اور ہم کو کیا ہوا کہ بھروسہ نہ کریں اللہ پر اور وہ سمجھا چکا ہم کو ہماری
سُبُلَنَا ؕ
راہیں

یعنی حق تعالیٰ ہم کو جام توحید و عرفان پلا کر حقیقی کامیابی کے راستے بتا چکا پھر کیسے ممکن ہے کہ ہم اس پر توکل نہ کریں۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ؕ وَعَلَى
اور ہم صبر کریں گے ایذاء پر جو تم ہم کو دیتے ہو
اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۱۲﴾
اور اللہ پر بھروسہ چاہئے بھروسے والوں کو

ہم توکل نہیں چھوڑ سکتے:

یعنی تم خواہ کتنی ہی ایذاء پہنچاؤ خدا کے فضل سے ہمارے توکل میں فرق نہیں پڑسکتا۔ متوکلین کا یہ کام نہیں کہ سختیاں دیکھ کر توکل اور استقامت کی راہ سے ہٹ جائیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۔ اور اللہ ہی پر اہل ایمان کو بھروسہ کرنا چاہئے۔ اس کلام سے انبیاء نے دوسرے ساتھی ایمانداروں کو ہدایت کر دی کہ کافروں کے مقابلے میں تم کو اللہ پر اعتماد کرنا چاہئے اور اپنے توکل علی اللہ کا بھی اظہار کر دیا۔ آیت سے در پردہ یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ اللہ پر ہی بھروسہ رکھنا تقاضا ایمان ہے۔ کیونکہ مؤمن کا جب یہ پختہ عقیدہ ہو جاتا ہے کہ خیر وشر کو پیدا کرنے والا اور نفع وضرر پہنچانے والا اللہ کے سوا اور کوئی نہیں تو لازمی طور پر وہ اپنے تمام معاملات اللہ کے سپرد کر دیتا ہے۔ (تفسیر مظہری)

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ

اور کہا کافروں نے اپنے رسولوں کو ہم نکال دیں گے

مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِىْ مِلَّتِنَا ؕ

تم کو اپنی زمین سے یا لوٹ آؤ ہمارے دین میں

قوم والوں کا فیصلہ:

یعنی اپنے توکل وغیرہ کو رہنے دو، زیادہ بزرگی مت جتاؤ، بس اب دو باتوں میں سے ایک بات ہو کر رہیگی۔ یا تم (بعثت سے پہلے کی طرح) چپ چاپ ہم میں رل مل کر رہو گے اور جس کو تم نے بہکایا ہے وہ سب ہمارے پرانے دین میں واپس آئینگے ورنہ تم سب کو ملک بدر اور جلاوطن کیا جائیگا۔ (تفسیر عثمانی)

فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۳﴾

تب حکم بھیجا ان کو ان کے رب نے ہم غارت کرینگے ان ظالموں کو

وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ

اور آباد کرینگے تم کو اس زمین میں انکے پیچھے

اللہ تعالیٰ کا فیصلہ:

یعنی یہ تم کو کیا نکالیں گے ہم ہی ان ظالموں کو تباہ کر کے ہمیشہ کے لئے یہاں سے نکال دینگے کہ پھر کبھی واپس نہ آسکیں۔ اور ان کی جگہ تم کو اور تمہارے مخلص وفاداروں کو زمین میں آباد کرینگے دیکھ لو کفار مکہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو ہمیشہ کے لئے مکہ سے نکالنا چاہا وہ ہی نکلنا آخر اس کا سبب بن گیا کہ وہاں اسلام اور مسلمانوں کا دائمی تسلط ہوا اور کفار کا نشان باقی نہ رہے۔

ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِىْ وَخَافَ

یہ ملتا ہے اس کو جو ڈرتا ہے کھڑے ہونے سے میرے سامنے اور ڈرتا ہے

وَعِيْدِ ﴿۱۴﴾

میرے عذاب کے وعدہ سے

شرطِ کامیابی:

یعنی مذکورہ بالا کامیابی ان لوگوں کے لئے ہے جو خدا سے ڈرتے ہیں یہ خیال کر کے کہ وہ ہماری تمام حرکتوں کو برابر دیکھ رہا ہے اور ایک دن حساب دینے کیلئے اس کے سامنے کھڑا ہونا ہے جہاں اس کے بے پناہ عذاب سے کوئی بچانے والا نہ ہوگا۔ (تفسیر عثمانی)

وَاسْتَفْتَحُوْا

اور فیصلہ (فتح) لگے مانگنے پیغمبر

پیغمبروں کی دعائیں:

یعنی پیغمبروں نے خدا سے مدد مانگی اور فیصلہ چاہا۔ چنانچہ نوح علیہ السلام نے کہا تھا۔ "فَافْتَحْ بَيْنِىْ وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا وَّنَجِّنِىْ الخ" لوط علیہ السلام نے کہا "رَبِّ نَجِّنِىْ وَاَهْلِىْ مِمَّا يَعْمَلُوْنَ" شعیب علیہ السلام نے عرض کیا رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ"۔ موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ الخ" اور کفار نے بھی جب دیکھا کہ اتنی طویل مدت سے عذاب کی دھمکیاں دی جاری ہیں لیکن اس کے آثار کچھ نظر نہیں آتے تو استہزاء اور تمسخر سے کہنے لگے "رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ" (ص رکوع ۲) اور اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (انفال۔ رکوع ۴) یہ تو قریش کے مقولے ہیں، قوم نوح نے کہا تھا۔ "فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ"۔ قوم شعیب نے کہا "فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا" وغیرہ ذلک۔ غرض دونوں طرف سے فیصلہ کی جلدی ہونے لگی۔ (تفسیر عثمانی)

بعض اہل علم کہتے ہیں کہ آیت استفتحوا کا انبیاء کے قصہ سے کوئی تعلق نہیں یہ بالکل الگ آیت ہے اور اس کا نزول مکہ والوں کے متعلق ہوا اہل مکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا سے قحط میں مبتلا ہو گئے تھے اسلئے انہوں نے فتح یعنی بارش کیلئے اللہ سے دعا کی مگر اللہ نے ان کی مراد پوری نہیں کی اور بجائے پانی کے دوزخ میں دوزخیوں کے جوف کا گندہ پانی پلائے جانے کی وعید سنادی۔

وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿۱۵﴾

اور نامراد ہوا ہر ایک سرکش ضدی (ضد کرنیوالا)

سرکشوں کی گرفت:

یعنی پیغمبروں کا خدا کو پکارنا تھا کہ مدد آئی اور ہر ایک سرکش اور ضدی نامراد ہو کر رہ گیا۔ جو کچھ خیالات پکار کھے تھے ایک ہی پکڑ میں کافور ہو گئے نہ وہ رہے نہ ان کی توقعات رہیں۔ ایک لمحہ میں سب کا خاتمہ ہوا۔ (تفسیر عثمانی)

یا جبار ایسے شخص کو کہتے ہیں جس کے دل میں رحم کا گزر بھی نہ ہو۔ اور ناحق خونریزی کرتا رہے۔ یا جبار ایسے شخص کو کہتے ہیں جو انتہائی غرور کی وجہ سے کسی کا اپنے اوپر کوئی حق نہ سمجھے (اور ہر ذمہ داری سے اپنی ذات کو بالا قرار دے) بغوی نے لکھا ہے کہ جبار اس کو کہتے ہیں جو اپنی ذات سے اعلیٰ اور بالا کسی کو نہ سمجھے۔ (تفسیر مظہری)

مِّنْ وَّرَآىِٕهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ

پیچھے اس کے دوزخ ہے اور پلائیں گے اس کو پانی

صَدِيْدٍ ﴿۱۶﴾

پیپ کا

عذاب آخرت:

یعنی یہ تو یہاں کا عذاب تھا اس کے بعد آگے دوزخ کا بھیانک منظر ہے جہاں شدت کی تشنگی کے وقت ان کو پیپ یا پیپ جیسا پانی پلایا جائیگا۔ (تفسیر عثمانی)

يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ

گھونٹ گھونٹ پیتا ہے اس کو اور گلے سے نہیں اتار سکتا

پیپ پلائی جائے گی:

یعنی خوشی سے کہاں پی سکیں گے۔ حدیث میں ہے کہ فرشتے لوہے کے گرز سر پر مار کر زبردستی منہ میں ڈالیں گے۔ جس وقت منہ کے قریب کرینگے شدت حرارت سے دماغ تک کی کھال اتر کر نیچے لٹک پڑیگی، منہ میں پہنچ کر گلے میں پھنسے گا بڑی مصیبت اور تکلیف کے ساتھ ایک ایک گھونٹ کر کے حلق سے نیچے اتارینگے۔ پیٹ میں پہنچنا ہوگا کہ آنتیں کٹ کر باہر آجائینگی۔

"وَسُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ (محمد رکوع ۲)

وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِى الْوُجُوْهَ. (کہف رکوع ۴)

(اعاذ نااللّٰه منها وسائر المؤمنين)

وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا

اور چلی آتی ہے اس پر موت ہر طرف (جگہ) سے

هُوَ بِمَيِّتٍ ۭ وَمِنْ وَّرَآىِٕهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ ﴿۱۷﴾

اور وہ نہیں مرتا اور اس کے پیچھے عذاب ہے سخت

بے پناہ تکلیف:

یعنی اس کا پینا کیا ہوگا ہر طرف سے موت کا سامنا کرنا ہوگا سر سے پاؤں تک ہر عضو بدن پر سکرات موت طاری ہونگے شش جہت سے مہلک عذاب کی چڑھائی ہوگی۔ اس زندگی پر موت کو ترجیح دینگے۔ لیکن موت بھی نہیں آئیگی۔ جو سب تکلیفوں کا خاتمہ کردے۔ ایک عذاب کے پیچھے دوسرا تازہ عذاب آتا رہیگا۔ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ (نساء رکوع ۸)

ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى (اعلی۔ رکوع ۱) سچ ہے اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائینگے مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائینگے۔ اللهم احفظنا۔ (تفسیر عثمانی)

امام احمد، ترمذی، نسائی، ابن جریر ابن ابی حاتم، ابن المنذر، بیہقی بغوی نے اور ابن ابی الدنیا نے صفۃ النار میں اور حاکم نے اپنی صحیح اسناد سے حضرت ابوامامہؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کے سلسلہ میں فرمایا، صدید کو دوزخی کے قریب لایا جائے گا تو اس کو برداشت نہ ہوگی اور زیادہ قریب لایا جائے گا تو اس کے چہرہ کو بھون ڈالے گا اس کے سر کی کھال گر پڑے گی جب اس کو پے گا تو انتڑیوں کو کاٹ کر دبر سے نکل جائے گا۔ پس اللہ فرمائے گا وَسُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِى الْوُجُوْهَ.

وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ اور موت (یعنی تکلیفیں اور قسم قسم کے عذاب) ہر طرف سے اس پر آئیں گے یعنی ہر طرف سے اس کو طرح طرح کا عذاب گھیر لے گا۔ یا الموت سے مراد موت کی سختیاں اور شدائد ہیں اور کل مکان سے مراد ہے جسم کا ہر حصہ یعنی ہر حصہ، جسم سے اس پر موت کی سختیاں آئیں گی۔ ابن ابی شیبہ، ابن جریر، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے ابراہیم تیمی کا قول نقل کیا ہے۔ کہ ہر (بن) مو سے اس پر موت (کی شدت) آئے گی۔

وَمَا هُوَ بِمَيِّتٍ اور وہ مردہ نہ ہوگا کہ تکلیف سے چھوٹ جائے۔ ابن جریج نے کہا سانس گلے میں اٹکی رہے گی نہ منہ سے باہر نکلے گی نہ اندر ہی اترے گی۔ ابن المنذر نے فضیل بن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ اس سے مراد سانس کا (گلے میں) بند ہو جانا ہے۔

وَمِنْ وَّرَآىِٕهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ۔ اور اس (عذاب) کے بعد اس سے بھی سخت عذاب ہوگا۔ بعض علماء نے کہا کہ عذاب غلیظ سے مراد ہے دوزخ میں ہمیشہ رہنا کبھی نہ نکلنا۔ (تفسیر مظہری)

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ

حال ان لوگوں کا جو منکر ہوئے اپنے رب سے ان کے عمل ہیں

كَرَمَادِ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ

جیسے وہ راکھ کہ زور کی چلے اس پر ہوا آندھی کے دن

عَاصِفٍ ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ۭ

کچھ ان کے ہاتھ میں نہ ہو گا اپنی کمائی میں سے

ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿۱۸﴾

یہی ہے بہک کر دور جا پڑنا

اعمالِ کفار:

بعض کفار کو یہ خیال ہو سکتا تھا کہ آخر ہم نے دنیا میں بہت سے اچھے کام صدقہ خیرات کی مد میں کئے ہماری خوش اخلاقی لوگوں میں مشہور ہوئی، بہتیرے آدمیوں کی مصیبت میں کام آئے اور کسی نہ کسی عنوان سے خدا کی پوجا بھی کی، کیا یہ سب کیا کرایا اور دیا لیا اس وقت کام نہ آئیگا؟ اس کا جواب اس تمثیل میں دیا یعنی جسے خدا کی صحیح معرفت نہیں۔ محض فرضی اور وہمی خدا کو پوجتا ہے اس کے تمام اعمال محض بے روح اور بے وزن ہیں۔ وہ محشر میں اسی طرح اڑ جائینگے جس طرح آندھی کے وقت جب زور کی ہوا چلے تو راکھ کے ذرات اڑ جاتے ہیں۔ اس وقت کفار نیک عمل سے بالکل خالی ہاتھ ہونگے حالانکہ وہ ہی موقع ہوگا جہاں نیک عمل کی سب سے زیادہ ضرورت ہوگی۔ اللہ اکبر! یہ کیسی حسرت کا وقت ہوگا کہ جن اعمال کو ذریعہ قرب ونجات سمجھے تھے وہ راکھ کے ڈھیر کی طرح عین اس موقع پر بے حقیقت ثابت ہوئے جب دوسرے لوگ اپنی نیکیوں کے ثمر شیریں سے لذت اندوز ہو رہے ہیں

کہ بازار چنداں کہ آگندہ تر
تہی دست رادل پراگندہ تر

(تفسیر عثمانی)

اعمال سے مراد ہیں کافروں کی وہ نو دتراشیدہ نیکیاں جن کے ثواب کے وہ امیدوار تھے جیسے (ان کی مفروضہ) خیرات، کنبہ پروری، اعانت فقراء، آزادی غلاماں وغیرہ۔ ان تمام کارہائے خیر کی بنیاد چونکہ خداشناسی پر نہ تھی اور ان سے اللہ کی خوشنودی مطلوب نہیں تھی۔ یا بتوں کے نام پر یہ نیکیاں کی جاتی تھیں جو ان کے کسی عمل اور عبادت سے واقف نہ تھے اور نہ بدلہ دینے کی ان میں طاقت تھی اس لئے اللہ نے ایسی خوش اعمالیوں کو آندھی کی خاک سے تشبیہ دی جس کو آندھی اڑا کر لے جاتی ہے۔ (تفسیر مظہری)

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ
تو نے کیا نہیں دیکھا کہ اللہ نے بنائے آسمان اور زمین
بِالْحَقِّ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ
جیسی چاہئے اگر چاہے تم کو لے جائے اور لائے کوئی
جَدِيْدٍ ﴿١٩﴾ وَّمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ﴿٢٠﴾
پیدائش (مخلوق) نئی اور یہ اللہ کو کچھ مشکل نہیں

آخرت کی زندگی:

یعنی شاید کفار کو یہ خیال گزرے، کہ جب مٹی میں مل کر مٹی ہو گئے پھر دوبارہ زندگی کہاں۔ قیامت اور عذاب وثواب وغیرہ سب کہانیاں ہیں، ان کو بتلایا کہ جس خدا نے آسمان وزمین کامل قدرت وحکمت سے پیدا کئے اسے تمہارا ازسرنو دوبارہ پیدا کرنا، یا کسی دوسری مخلوق کو تمہاری جگہ لے آنا کیا مشکل ہے؟ اگر آسمان وزمین کے محکم نظام کو دیکھ کر یہ یقین ہوتا ہے کہ اس کا پیدا کرنے اور قائم رکھنے والا کوئی صانع حکیم ہے جیسا کہ لفظ بالحق میں تنبیہ فرمائی، تو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس نے اشرف المخلوقات (انسان) کو محض بے نتیجہ پیدا کیا ہوگا اور اس کی تخلیق وایجاد سے کوئی عظیم الشان مقصد متعلق نہ ہوگا یقیناً اس زندگی کے بعد کوئی دوسری زندگی ہونی چاہئے۔ جس میں آدم کی پیدائش کا مقصد عظیم اکمل واتم طریقہ سے آشکار ہو۔ (تفسیر عثمانی)

وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ۔ اور یہ بات اللہ کے لئے کچھ بھی دشوار بھی نہیں ہے وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ایسا نہیں ہے کہ ایک چیز پر وہ قادر ہو اور دوسری چیز اس کی قدرت سے خارج ہو۔ اور جو ایسا قادر مطلق ہو وہی مستحق ہے اس امر کا اسی کی پرستش اور اطاعت کی جائے اور اسی سے ثواب کی امید رکھی جائے اور اسی کی ناراضگی سے خوف کیا جائے۔ (تفسیر مظہری)

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا
اور سامنے کھڑے ہوں گے اللہ کے سارے

یعنی سب سے بڑی عدالت میں پیشی ہوگی۔ (تفسیر عثمانی)

فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا
پھر کہیں گے کمزور بڑائی والوں کو ہم تو تمہارے تابع تھے
كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا
سو بچاؤ (سو کچھ دفعہ کرو گے ہم سے اللہ کے عذاب میں
مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ
سے کچھ) گے ہم کو اللہ کے کسی عذاب سے کچھ

تابع ومتبوع کا جھگڑا:

یہ اتباع اپنے متبوعین سے کہیں گے۔ یعنی دنیا میں تم بڑے بن کر بیٹھے تھے اور ہم نے تمہاری بہت تابعداری کی تھی۔ آج اس مصیبت کی گھڑی میں کچھ تو کام آؤ، کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ عذاب الٰہی کے کسی حصہ کو ہم سے ذرا ہلکا کر دو۔ یہ دوزخ میں جانے کے بعد کہیں گے یا میدان

حشر میں، ابن کثیرؒ نے پہلے احتمال کو ترجیح دی ہے لقولہ تعالیٰ وَاِذْ يَتَحَاجُّوْنَ فِي النَّارِ فَيَقُوْلُ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا الآیۃ وغیر ذلک من الآیات. واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانی)

قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ ۭ سَوَآءٌ عَلَيْنَآ

وہ کہیں گے اگر ہدایت (راہ پر لاتا) کرتا ہم کو اللہ تو البتہ ہم تم کو ہدایت (راہ پر لاتے)

اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ ﴿٢١﴾

کرتے اب برابر ہے ہمارے حق میں ہم بے قراری کریں یا صبر کریں ہم کو نہیں خلاصی

سرداروں کا جواب:

یعنی اگر خدا دنیا میں ہم کو ہدایت کی توفیق دیتا تو ہم تم کو بھی اپنے ساتھ سیدھے راستہ پر لے چلتے۔ لیکن ہم نے ٹھوکر کھائی تو تمہیں بھی لے ڈوبے۔ یا یہ مطلب ہے کہ اس وقت اگر خدا تعالیٰ ہم کو اس عذاب سے نکلنے کی کوئی راہ بتلاتا تو ہم تمہیں وہ ہی راہ بتا دیتے۔ اب تو تمہاری طرح ہم خود مصیبت میں مبتلا ہیں اور مصیبت بھی ایسی جس سے چھٹکارے کی کوئی صورت نہیں۔ نہ صبر کرنے اور خاموش رہنے سے فائدہ، نہ گھبرانے اور چلانے سے کچھ حاصل۔ (تفسیر عثمانی)

بے کار اور جبری صبر:

ابن ابی حاتم طبرانی اور ابن مردویہ نے حضرت کعب بن مالک کی مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ دوزخی کہیں گے آؤ ہم صبر کریں (شاید اللہ کو رحم آ جائے) چنانچہ پانچ سو برس تک صبر کریں گے اور جب یہ دیکھیں گے کہ کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو کہیں گے سواء اجزعنا الخ۔

محمد بن کعب قرظی کا بیان ہے مجھے یہ روایت پہنچی ہے کہ دوزخی دوزخ کے منتظمین سے کہیں گے اُدْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ اپنے رب سے دعا کرو کہ وہ ایک دن ہی ہمارے عذاب میں تخفیف کر دے منتظمین دوزخ جواب دیں گے الم یاتکم رسلکم بالبینات کیا تمہارے پاس تمہارے پیغمبر احکام واضحہ لے کر نہیں پہنچے تھے دوزخی کہیں گے پہنچے کیوں نہ تھے اس پر منتظمین جواب دیں گے اُدْعُوْا وَمَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ تم خود دعا کرو کافروں کی دعا کا سوائے ناکامی کے اور کچھ نتیجہ نہیں۔ جب وہ ناامید ہو جائیں گے تو کہیں گے يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ اے مالک (داروغہ جہنم) تمہارا رب تو ہمارا کام تمام ہی کر دے (یعنی موت ہی دے دے تو اس عذاب سے چھوٹ جائیں) مالک ان کو اسی برس تک کوئی جواب نہیں دے گا۔ اسی برس میں ہر سال تین سو ساٹھ دن کا ہی ہوگا لیکن ہر دن ہزار برس کا ہوگا (یعنی ہمارے ہزار برس کے برابر ہوگا) اسی برس کے بعد جواب دے گا تم کو یہیں رہنا ہوگا جب وہ ناامید ہو جائیں گے۔ تو ایک دوسرے سے کہے گا تم پر جو مصیبت آنی تھی وہ آ ہی گئی (اب جزع فزع کرنا بیکار رہے) ہم کو صبر کرنا چاہئے۔ ممکن ہے صبر سے کچھ اچھا نتیجہ نکل آئے جس طرح دنیا میں جن لوگوں نے اللہ کی اطاعت پر صبر کیا اور ہر دکھ کو برداشت کیا تھا۔ تو ان کو (آج) فائدہ ہوا۔ غرض بالاتفاق (مجبوراً) صبر کریں گے اور طویل مدت تک صبر رکھیں گے (مگر بے سود) پھر جزع فزع کریں گے اور طویل مدت تک کریں گے (لیکن کچھ نتیجہ نہ ہوگا) آخر پکار اٹھیں گے سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ۔ یعنی کوئی بچنے کا مقام نہیں۔ اس کے بعد ابلیس کھڑا ہو کر ان کو خطاب کرے گا اور کہے گا اللہ نے بلاشبہ تم سے سچا وعدہ کیا تھا اور میں نے جو وعدے تم کو دیئے تھے اس کے خلاف ہوا مگر تم پر میری کوئی زبردستی نہ تھی میں نے تو تم کو صرف دعوت دی تھی تم نے میری دعوت مان لی۔ لہٰذا آج مجھے ملامت نہ کرو خود اپنے کو ملامت کرو۔ ابلیس کا یہ کلام سن کر لوگوں کو خود اپنے سے نفرت ہو جائے گی۔ اس پر ندا آئے گی جتنی نفرت تم کو (آج) اپنے سے ہے اس سے زیادہ نفرت اللہ کو تم سے اس وقت تھی جب تم کو ایمان کی دعوت دی جا رہی تھی اور تم انکار کر رہے تھے۔ یہ ندا سن کر وہ پکار اٹھیں گے اے ہمارے رب (نبی کے قول اور تیرے وعدے کی سچائی) ہم نے دیکھ لی اور سن لیا۔ اب ہم کو (دنیا میں) پھر لوٹا دے ہم اچھے عمل کریں گے ہم کو یقین آ گیا۔ اللہ ان کی تردید میں فرمائے گا۔ وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا۔ الآیات۔ وہ تیسری مرتبہ پکاریں گے۔ اے ہمارے رب ہم تیری دعوت قبول کریں گے اور پیغمبروں کا بھی اتباع کریں گے تو تھوڑی مدت کی ہم کو مہلت دیدے۔ اللہ فرمائے گا کیا تم نے اس سے پہلے قسم کھا کر نہ کہا تھا کہ ہم کو فنا نہیں۔ پھر وہ چوتھی مرتبہ پکاریں گے اے ہمارے رب تو ہم کو (یہاں سے) نکال دے ہم جو کام پہلے کر چکے ہیں ان کے سوا دوسرے عمل کریں گے۔ اللہ ان کی رد میں فرمائے گا کیا ہم نے تم کو ایسی اور اتنی زندگی نہیں دی تھی کہ اس میں جو نصیحت پکڑنے والا تھا نصیحت پکڑ لیتا اور کیا تمہارے پاس ڈرانے والا نہیں پہنچا تھا۔ پھر ایک مدت تک توقف کرنے کے بعد اللہ ان سے فرمائے گا کیا میرے احکام تم کو پڑھ کر نہیں سنائے گئے تھے اور تم ان کی تکذیب کرتے تھے۔ یہ بات سن کر وہ کہیں گے ہم پر آئندہ ہمارا رب رحم (بالکل) نہیں کرے گا۔ اس کے بعد پکار اٹھیں گے اے ہمارے رب ہم پر ہماری بدبختی غالب آ گئی تھی ہم لوگ گمراہ ہو گئے تھے اے ہمارے رب (اب کی بار) ہم کو یہاں سے نکال لے اگر پھر ہم نے دوبارہ ایسا کیا تو ہم بلاشبہ ظالم ہوں گے۔ اللہ فرمائے گا اس میں ذلت کے ساتھ رہو مجھ سے بات بھی نہ کرو۔ اس وقت وہ بالکل مایوس ہوں گے اور دعا کا سلسلہ ختم ہو جائے گا اور باہم نوحہ کریں گے۔

دوزخیوں کا رونا:

حضرت عبدالرحمٰن ابن زیدؒ فرماتے ہیں کہ دوزخی لوگ کہیں گے کہ دیکھو یہ

مسلمان خدا کے سامنے روتے دھوتے تھے۔ اس وجہ سے وہ جنت میں پہنچے۔ آؤ ہم بھی اللہ کے سامنے روئیں گڑگڑائیں۔ خوب روئیں پیٹیں گے، چیخیں چلائیں گے، لیکن بے سود رہیگا، تو کہیں گے جنتیوں کے جنت میں جانے کی ایک وجہ صبر کرنا تھی، آؤ ہم بھی خاموشی اور صبر اختیار کریں۔ اب ایسا صبر کریں گے کہ ایسا صبر کبھی نہیں دیکھا گیا لیکن یہ بھی لا حاصل رہے گا۔ اس وقت کہیں گے ہائے صبر بھی بے سود اور بے قراری بھی بے نفع۔ ظاہر تو یہ ہے کہ پیشواؤں اور تابعداروں کی یہ بات چیت جہنم میں جانے کے بعد ہوگی۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ

اور بولا شیطان جب فیصل ہو چکا سب کام بے شک

اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ

اللہ نے تم کو دیا تھا سچا وعدہ اور میں نے تم سے وعدہ کیا

فَاَخْلَفْتُكُمْ ؕ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ

پھر (سو) جھوٹا کیا اور میری تم پر کچھ

سُلْطٰنٍ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ

حکومت نہ تھی مگر یہ کہ میں نے بلایا تم کو پھر تم نے مان لیا

لِيْ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ مَاۤ اَنَا

میری بات کو سو الزام نہ دو مجھ کو اور الزام دو اپنے

بِمُصْرِخِكُمْ وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ؕ اِنِّيْ

آپ کو نہ میں تمہاری فریاد کو پہنچوں نہ تم میری فریاد کو

كَفَرْتُ بِمَاۤ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ؕ اِنَّ

پہنچو میں (مجھ کو قبول نہیں) منکر ہوں جو تم نے مجھ کو شریک بنایا تھا

الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۲﴾

اس سے پہلے البتہ جو ظالم ہیں ان کے لئے ہے عذاب دردناک

ابلیس کا خطاب:

یعنی حساب کتاب کے بعد جب جنتیوں کے جنت میں اور دوزخیوں کے دوزخ میں جانے کا فیصلہ ہو چکے گا اس وقت کفار دوزخ میں جا کر یا داخل ہونے سے پہلے ابلیس لعین کو الزام دینگے کہ مردود تو نے دنیا میں ہماری راہ ماری اور اس مصیبت میں گرفتار کرایا۔ اب کوئی تدبیر مثلاً سفارش وغیرہ کا انتظام کر۔ تا عذاب الٰہی سے رہائی ملے۔ تب ابلیس ان کے سامنے لیکچر دیگا جس کا حاصل یہ ہے کہ بیشک حق تعالیٰ نے صادق القول پیغمبروں کے توسط سے ثواب و عقاب اور دوزخ و جنت کے متعلق سچے وعدے کئے تھے جن کی سچائی دنیا میں دلائل و براہین سے ثابت تھی اور آج مشاہدے سے ظاہر ہے۔ میں نے اس کے بالمقابل جھوٹی باتیں کہیں اور جھوٹے وعدے کئے۔ جن کا جھوٹ ہونا وہاں بھی ادنیٰ فکر و تامل سے واضح ہو سکتا تھا اور یہاں تو آنکھ کے سامنے ہے۔ میرے پاس نہ حجت و برہان کی قوت تھی نہ ایسی طاقت رکھتا تھا کہ زبردستی تم کو ایک جھوٹی بات کے ماننے پر مجبور کر دیتا۔ بلاشبہ میں نے بدی کی تحریک کی اور تم کو اپنے مشن کی طرف بلایا تم جھپٹ کر خوشی سے آئے اور میں نے جدھر شہ دی ادھر ہی اپنی رضا و رغبت سے چل پڑے اگر میں نے اغوا کیا تھا تو تم ایسے اندھے کیوں بن گئے کہ نہ دلیل سنی نہ دعوے کو پرکھا آنکھیں بند کر کے پیچھے ہو لئے انصاف یہ ہے کہ مجھ سے زیادہ تم اپنے نفسوں پر ملامت کرو میرا جرم اغوا بجائے خود رہا۔ لیکن مجھے مجرم گردان کر تم کیسے بری ہو سکتے ہو آج تم کو مدد دینا تو درکنار، خود تم سے مدد لینا بھی ممکن نہیں۔ ہم اور تم دونوں اپنے اپنے جرم کے موافق سزائیں پکڑے ہوئے ہیں۔ کوئی ایک دوسرے کی فریاد کو نہیں پہنچ سکتا تم نے اپنی حماقت سے دنیا میں مجھ کو خدائی کا شریک ٹھہرایا (یعنی بعض تو براہ راست شیطان کی عبادت کرنے لگے اور بہتوں نے اس کی باتوں کو ایسی طرح مانا اور اس کے احکام کے سامنے اس طرح سر تسلیم و انقیاد خم کیا جو خدائی احکام کے آگے کرنا چاہئے تھا) بہر حال اپنے جہل و غباوت سے جو شرک تم نے کیا تھا اس وقت میں اس سے منکر اور بیزار ہوں۔ یا "بما اشر کتمونی" میں بائے سببیت لیکر یہ مطلب ہو کہ تم نے مجھ کو خدائی کا رتبہ دیا اس سبب سے میں بھی کافر بنا۔ اگر میری بات کوئی نہ پوچھتا تو میں کفر و طغیان کے اس درجہ میں کہاں پہنچتا۔ اب ہر ایک ظالم اور مشرک کو اپنے کئے کی سزا دردناک عذاب کی صورت میں بھگتنا چاہئے شور مچانے اور الزام دینے سے کچھ حاصل نہیں۔ گزشتہ آیت میں ضعفاء و مستکبرین (عوام اور لیڈروں) کی گفتگو نقل کی گئی تھی اسی کی مناسبت سے یہاں دوزخیوں کے مہا لیڈر (ابلیس لعین) کی تقریر نقل فرمائی چونکہ عوام کا الزام اور ان کی استدعا دونوں جگہ یکساں تھی شاید اسی لئے شیطان کی گفتگو کے وقت اس کا ذکر ضروری نہیں معلوم ہوا۔ واللہ اعلم۔ مقصود ان مکالمات کے نقل کرنے سے یہ ہے کہ لوگ اس افراتفری کا تصور کر کے شیاطین الانس والجن کی اتباع سے باز رہیں۔ (تفسیر عثمانی)

شفاعت کبریٰ:

ابن جریر، ابن مردودیہ، ابن ابی حاتم، بغوی، طبرانی اور ابن المبارک نے حضرت عقبہ بن عامرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب اللہ اگلوں پچھلوں کو سب کو جمع کر کے ان کا فیصلہ کر چکے گا تو اہل ایمان کہیں گے ہمارے رب نے ہمارے درمیان فیصلہ کر دیا اب کوئی شخص ایسا ہو جو ہمارے رب سے ہماری سفارش کر دے، لوگ کہیں گے آدمؑ ایسے ہو سکتے ہیں اللہ نے اپنے ہاتھ سے ان کو بنایا تھا اور ان سے کلام کیا تھا چنانچہ سب لوگ جا کر حضرت آدمؑ سے گزارش کریں گے کہ ہمارا رب ہمارا فیصلہ کر چکا اور حکم جاری کر چکا اب آپ اٹھ کر ہماری شفاعت کر دیجئے۔ حضرت آدمؑ کہیں گے نوحؑ کے پاس جاؤ۔ لوگ حضرت نوحؑ کے پاس جائیں گے۔ حضرت نوحؑ حضرت ابراہیمؑ کے پاس جانے کی ہدایت کر دیں گے لوگ حضرت ابراہیمؑ کے پاس جائیں گے آپ حضرت موسیٰؑ کا راستہ بتا دیں گے لوگ حضرت موسیٰؑ کے پاس جائیں گے آپ حضرت عیسیٰؑ کا حوالہ دیدیں گے۔ جب لوگ حضرت عیسیٰؑ کے پاس پہنچیں گے تو آپ کہیں گے میں تم کو پتہ بتاتا ہوں تم نبی امی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ وہ سب سے زیادہ صاحب فخر (فضیلت) ہیں۔ آخر لوگ میرے پاس آئیں گے اور اللہ مجھے کھڑے ہو کر گزارش کرنے کی اجازت دے گا پھر میری مجلس ایک بے نظیر پاکیزہ ترین خوشبو سے مہکا دی جائے گی ایسی مہک ہوگی کہ کسی نے ایسی خوشبو نہیں سونگھی پھر میں اپنے رب کے سامنے حاضر ہو کر شفاعت کروں گا اللہ میری شفاعت قبول فرمائے گا اور سر کے بالوں سے پاؤں کے ناخن تک مجھے نور ہی نور کر دے گا سر تا قدم میرے لئے نور کر دے گا۔

کافروں کو سفارشی نہ ملے:

یہ بات دیکھ کر کافر کہیں گے مسلمانوں کو تو سفارشی مل گیا اب ہماری سفارش کون کرے خود ہی جواب دیں گے اب تو ابلیس ہی جس نے ہم کو گمراہ کیا تھا ہمارے سامنے ہے اور کوئی سفارشی موجود ہی نہیں ہے چنانچہ یہ لوگ ابلیس سے جا کر کہیں گے۔ مؤمنوں کو تو شفاعت کرنے والا مل گیا اب تو اٹھ کر ہماری شفاعت کر تو نے ہی ہم کو گمراہ کیا تھا، ابلیس جونہی اٹھے گا اس کی مجلس میں بدترین بو اڑنے لگے گی، ایسی بدبو تو کسی نے سونگھی ہی نہ ہوگی پھر ابلیس ان کو جہنم کی طرف لے جائے گا۔

شیطان اس وقت جو تقریر کرے گا حق تعالیٰ نے اس آیت میں اس کا ذکر کیا ہے جب اہل جنت جنت میں اور اہل نار دوزخ میں پہنچ جائیں گے تو تمام اہل دوزخ جمع ہو کر متفقہ طور پر ابلیس کو لعنت ملامت کریں گے کہ تو نے ہم کو تباہ و برباد کیا تو اس وقت ابلیس کھڑا ہوگا اور الزام دفع کرنے کے لئے (آگ کے منبر کا ذکر تفسیر قرطبی ص ۳۵۶ جلد ۹ اور صادی حاشیہ جلالین ص ۲۸۲ جلد ۲ میں وہاں دیکھ لیا جائے) کے ایک منبر پر کھڑا ہو کر خطبہ دے گا)۔

عقبہ بن عامر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا کہ جب اللہ تعالیٰ اولین و آخرین کو جمع کر کے فیصلہ کر دے گا اور خدا کے رسول شفاعت سے فارغ ہو جائیں گے تو کفار کہیں گے کہ مؤمنوں نے تو اپنا شفیع پالیا یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پالیا جو ان کے لئے بارگاہ خداوندی میں شفاعت کرے گا۔ کاش کوئی ہمارا سفارشی ہو جاتا۔ کفار کہیں گے سوائے ابلیس کے کون ہے جو ہماری سفارش کرے جس نے ہم کو گمراہ کیا۔ بس کفار جمع ہو کر ابلیس کے پاس آئیں گے اور کہیں گے تم ہمارے پیشوا ہو تم ہمارے واسطے اٹھو کیونکہ تمہیں نے ہم کو یہ راہ بتلائی تھی پس وہ اپنے مقام سے اٹھے گا اور اس کی مجلس سے ایسی سخت بدبو اٹھے گی جو کسی نے اس سے پہلے نہ سونگھی ہوگی اور پھر گریہ وزاری اور چیخ و پکار بلند ہوگی اس وقت شیطان اٹھے گا اور یہ کہے گا ان اللّٰہ وعدکم وعدا لحق اور اس طرح ان سے اپنی بیزاری ظاہر کرے گا ابلیس کے اس خطبہ سے کفار کی کمر ٹوٹ جائے گی اور دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ (معارف کاندھلوی)

وَاُدْخِلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

اور داخل کئے گئے جو لوگ ایمان لائے تھے اور کام کئے تھے

جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ

نیک باغوں میں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں ہمیشہ (رہا کریں انہی میں)

فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ

رہیں ان میں اپنے رب کے حکم سے

یہ بطور مقابلہ کفار کی سزا کے بعد مومنین کا انجام بیان فرمایا۔ (تفسیر عثمانی)

تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ﴿۲۳﴾

ان کی ملاقات ہے وہاں سلام

جنت کا سلام:

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ دنیا میں ''سلام'' دعا ہے سلامتی مانگنے کی، وہاں ''سلام'' کہنا مبارکباد ہے سلامتی ملنے پر۔ (تفسیر عثمانی)

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا

تو نے نہ دیکھا کیسی بیان کی اللہ نے ایک مثال

ایمان کی مثال:

یعنی دیکھئے اور غور کیجئے کیسی باموقع اور معنی خیز مثال ہے۔ عقلمند جس قدر اس میں غور کرے سینکڑوں باریکیاں نکلتی چلی آئیں۔ (تفسیر عثمانی)

كَلِمَةً طَيِّبَةً
بات ستھری

''ستھری بات'' میں کلمہ توحید، معرفت الٰہی کی باتیں، ایمان وایمانیات قرآن، حمد وثنا، تسبیح وتہلیل، سچ بولنا سب داخل ہے۔ (تفسیر عثمانی)

كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ
جیسے ایک درخت ستھرا

اکثر روایات وآثار میں یہاں ''ستھرے درخت'' کا مصداق کھجور کو قرار دیا ہے گو دوسرے ستھرے درخت بھی اس کے تحت میں مندرج ہو سکتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ﴿٢٤﴾
اس کی جڑ مضبوط ہے اور ٹہنے (شاخیں) ہیں آسمان میں

یعنی اس کی جڑیں زمین کی گہرائیوں میں پھیلی ہوں کہ زور کا جھکڑ بھی جڑ سے نہ اکھیڑ سکے اور چوٹی آسمان سے لگی ہو یعنی شاخیں بہت اونچی اور زمینی کثافتوں سے دور ہوں۔ (تفسیر عثمانی)

تُؤْتِيٓ أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍۭ بِإِذْنِ رَبِّهَا
لاتا ہے پھل اپنا ہر وقت پر اپنے رب کے حکم سے

یعنی کوئی فصل پھل سے خالی نہ جائے یا فرض کیجئے بارہ مہینے صبح وشام اس پر تازہ پھل لگا کرے۔ (تفسیر عثمانی)

ترازو کو بھرنے والے کلمات:

ترمذی نے حضرت عبداللہ بن عمرو کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سبحان اللہ پڑھنا (قیامت کے دن) میزان (عدل) کا آدھا حصہ ہوگا اور الحمد للہ (پڑھنا) میزان کو (نیکیوں سے) بھر دے گا اور لا الٰہ الا اللہ کو (اللہ تک پہنچنے سے) کوئی مانع نہیں۔

کلمہ طیبہ: ترمذی نے حسن کی سند سے حضرت ابوہریرہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب بھی کوئی بندہ خلوص کے ساتھ لا الٰہ الا اللہ کہتا ہے تو ضرور اس کے لئے آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ کلمہ عرش تک پہنچ جاتا ہے بشرطیکہ اس کا قائل کبیرہ گناہوں سے بچتا رہے گا۔ ترمذی نسائی، ابن حبان اور حاکم نے حضرت انس کی روایت سے بیان کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح بھی کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شجرہ طیبہ کھجور کا درخت ہے اور شجرہ خبیثہ حنظل (اندرائن) کا درخت ہے۔

کھجور کا درخت:

حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا درختوں میں ایک درخت ایسا ہے جس کے پتے نہیں جھڑتے اور وہ مسلمان کی طرح ہوتا ہے بتاؤ وہ کونسا درخت ہے، حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا لوگوں کے خیالات صحرائی درختوں کی طرف جا پڑے اور میرے دل میں آیا کہ ایسا درخت کھجور ہوتا ہے مگر میں چھوٹا تھا اس لئے جھجکا (اور کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی) آخر حاضرین نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضور خود ہی بیان فرماویں فرمایا وہ کھجور کا درخت ہے۔

یہ درخت کونسا اور کہاں ہے؟ اس کے متعلق مفسرین کے اقوال مختلف ہیں مگر زیادہ اقرب یہ ہے کہ وہ کھجور کا درخت ہے اس کی تائید تجربہ اور مشاہدہ سے بھی ہوتی ہے اور روایات حدیث سے بھی، کھجور کے درخت کے تنہ کا بلند اور مضبوط ہونا تو مشاہدہ کی چیز ہے، سب ہی جانتے ہیں اس کی جڑوں کا زمین کی دور گہرائی تک پہنچنا بھی معروف ومعلوم ہے اور اس کا پھل بھی ہر وقت اور ہر حال میں کھایا جاتا ہے جس وقت سے اس کا پھل درخت پر ظاہر ہوتا ہے اس وقت سے پکنے کے زمانہ تک ہر حال اور ہر صورت میں اس کا پھل مختلف طریقوں سے چٹنی واچار کے طریقہ سے یا دوسرے طریقہ سے کھایا جاتا ہے۔ پھر پھل پک جانے کے بعد اس کا ذخیرہ بھی پورے سال باقی رہتا ہے، صبح وشام، دن اور رات، گرمی اور سردی، غرض ہر موسم اور ہر وقت میں کام دیتا ہے اس درخت کا گودا بھی کھایا جاتا ہے اس سے میٹھا رس بھی نکالا جاتا ہے اس کے پتوں سے بہت سی مفید چیزیں چٹائیاں وغیرہ بنتی ہیں اس کی گٹھلی جانوروں کا چارہ ہے۔ بخلاف دوسری درختوں کے پھلوں کے کہ وہ خاص موسم میں آتے ہیں اور ختم ہو جاتے ہیں ان کا ذخیرہ نہیں رکھا جاتا ہے اور نہ ان کی ہر چیز سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔

اور ترمذی، نسائی، ابن حبان اور حاکم نے بروایت انس رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شجرہ طیبۃ (جس کا ذکر قرآن میں ہے) کھجور کا درخت ہے اور شجرہ خبیثۃ حنظل کا درخت۔ (مظہری)

اور مسند احمد میں بروایت مجاہدؒ مذکور ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ ایک روز ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے، کوئی صاحب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھجور کے درخت کا گودہ لائے اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے ایک سوال کیا کہ درختوں میں سے

کا ایک ایسا درخت بھی ہے جو مرد مؤمن کی مثال ہے (اور بخاری کی روایت میں اس جگہ یہ بھی مذکور ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس درخت کے پتے کسی موسم میں جھڑتے نہیں) بتلاؤ وہ درخت کونسا ہے؟ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میرے دل میں آیا کہ کہہ دوں وہ کھجور کا درخت ہے مگر مجلس میں ابوبکرؓ وعمرؓ اور دوسرے اکابر صحابہ موجود تھے، ان کو خاموش دیکھ کر مجھے بولنے کی ہمت نہ ہوئی پھر خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ کھجور کا درخت ہے۔

اس مثال کی وجہ:

مؤمن کی مثال اس درخت سے دینے کی ایک وجہ یہ ہے کہ کلمہ طیبہ میں ایمان اس کی جڑ ہے جو بہت مستحکم اور مضبوط ہے، دنیا کے حوادث اس کو ہلا نہیں سکتے مؤمنین کاملین صحابہ وتابعین بلکہ ہر زمانہ کے پکے مسلمانوں کی ایسی مثالیں کچھ کم نہیں کہ ایمان کے مقابلہ میں نہ جان کی پروا کی نہ مال کی اور نہ کسی دوسری چیز کی، دوسری وجہ ان کی طہارت ونظافت ہے کہ دنیا کی گندگیوں سے متاثر نہیں ہوتے، جیسے بڑے درخت پر سطح زمین کی گندگی کا کوئی اثر نہیں ہوتا، یہ دو وصف تو اَصْلُهَا ثَابِتٌ کی مثال ہیں تیسری وجہ یہ ہے کہ جس طرح کھجور کے درخت کی شاخیں بلند آسمان کی طرف ہوتی ہیں مؤمن کے ایمان کے ثمرات یعنی اعمال بھی آسمان کی طرف اٹھائے جاتے ہیں، قرآن کریم میں ہے اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف اٹھائے جاتے ہیں پاکیزہ کلمات، مطلب یہ ہے کہ مؤمن جو اللہ تعالیٰ کا ذکر تسبیح تہلیل، قراۃ قرآن وغیرہ کرتا ہے یہ صبح وشام اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچتے رہتے ہیں۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ جس طرح کھجور کا پھل ہر وقت، ہر حال میں لیل ونہار کھایا جاتا ہے مؤمن کے اعمال صالحہ بھی ہر وقت ہر موسم اور ہر حال ہر موسم میں صبح شام جاری ہیں اور جس طرح کھجور کے درخت کی ہر چیز کار آمد ہے مؤمن کا ہر قول وفعل اور حرکت وسکون اور اس سے پیدا ہونے والے آثار پوری دنیا کے لئے نافع ومفید ہوتے ہیں بشرطیکہ وہ مؤمن کامل اور تعلیمات خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا پابند ہو۔

مذکورہ تقریر سے معلوم ہوا کہ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ میں اکل سے مراد پھل اور کھانے کے لائق چیزیں ہیں اور حین سے مراد ہر وقت ہر حال ہے، اکثر مفسرین نے اسی کو ترجیح دی ہے، بعض حضرات کے دوسرے اقوال بھی ہیں۔

درخت اور ایمان میں مشابہت:

بغوی نے لکھا ہے درخت کی تکمیل تین اجزاء سے ہوتی ہے زمین کے اندر جمے ہوئے ریشے تنہ اور شاخیں، ایمان کی تکمیل بھی تین ہی چیزوں سے ہوتی ہے (دل سے) تصدیق زبان سے اقرار اور اعضاء جسم سے عمل۔

ابوظبیان نے حضرت ابن عباسؓ کا قول بیان کیا کہ شجرہ طیبہ جنت کے اندر ایک درخت ہے۔ حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے (خلوص کے ساتھ) **سبحان اللہ العظیم وبحمدہ** کہا اس کے لئے کھجور کا ایک درخت جنت میں بودیا جاتا ہے (رواہ الترمذی، تفسیر مظہری)

وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ
اور بیان کرتا ہے اللہ مثالیں لوگوں کے واسطے تاکہ
يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۵﴾ وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ
وہ فکر (سوچیں) کریں اور مثال گندی بات کی

کفر کی مثال:

کلمہ کفر، جھوٹی بات اور ہر ایک کلام جو خدا تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہو "کلمہ خبیثہ" میں داخل ہے۔ (تفسیر عثمانی)

اور گندہ کلمہ کی (یعنی کلمہ کفر وشرک کی) مثال ایسی ہے جیسے ایک خراب درخت ہو (مراد درخت حنظل ہے) کہ وہ زمین کے اوپر ہی اوپر سے اکھاڑ لیا جائے (اور) اس کو (زمین میں) کچھ ثبات نہ ہو (خراب فرمایا یا اعتبار اس کی بو اور مزہ اور رنگ کے یا اس کے پھل کی بو اور مزہ اور رنگ کے، یہ صفت طیبہ کے مقابل ہوئی اور اوپر سے اکھاڑنے کا مطلب یہ ہے کہ جڑ اس کی دور تک نہیں ہوتی اوپر ہی رکھی ہوتی ہے یہ اَصْلُهَا ثَابِتٌ کے مقابل فرمایا اور مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ اسی کی تاکید کے لئے فرمایا اور اس کی شاخوں کا اونچا نہ جانا اور اس کے پھل کا تفکھا مطلوب نہ ہونا ظاہر ہے یہی حال کلمہ کفر کا ہے کہ گو کافر کے دل میں اس کی جڑ ہے مگر حق کے سامنے اس کا مضمحل ومغلوب ہو جانا مشابہ اسی کی ہے جیسے اس کی جڑ ہی نہیں، قال تعالیٰ جُثَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ اور شاید مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ کی تصریح سے کفر کا یہی اضمحلال ومغلوبیت بتلانا مقصود ہو اور چونکہ اس کے اعمال مقبول نہیں ہوتے اس لئے گویا اس درخت کی شاخیں بھی فضاء میں نہیں پھیلی اور چونکہ اس کے اعمال پر رضائے الٰہی مرتب نہیں ہوتی۔ (معارف القرآن)

کفار کی مثال:

اس کے بالمقابل دوسری مثال کفار کی شجرۃ خبیثہ سے دی گئی، جس طرح کلمۃ طیبۃ سے مراد قول لا الہ الا اللہ یعنی ایمان ہے اسی طرح کلمۃ خبیثۃ سے مراد کلمات کفر اور افعال کفر ہیں، شجرہ خبیثہ سے مراد مذکورہ حدیث میں حنظل کو قرار دیا گیا ہے اور بعض نے لہسن وغیرہ کہا ہے۔

اس شجرہ خبیثہ کا حال قرآن نے یہ بیان کیا ہے کہ اس کی جڑیں زمین کے اندر زیادہ نہیں ہوتیں اس لئے جب کوئی چاہے اس درخت کے پورے جثہ کو زمین سے اکھاڑ سکتا ہے، اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ کے یہی معنی ہیں

کیونکہ اجتثت کے اصل معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کے جثہ کو پورا پورا اٹھا لیا جائے۔
مطلب یہ ہے کہ اس کلمہ طیبہ پر ایمان رکھنے والے کی دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ مرتے دم تک اس کلمہ پر قائم رہتا ہے خواہ اس کے خلاف کتنے ہی حوادث سے مقابلہ کرنا پڑے اور آخرت میں اس کلمہ کو قائم و برقرار رکھ کر اس کی مدد کی جاتی ہے صحیح بخاری ومسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ آخرت سے مراد اس آیت میں برزخ یعنی قبر کا عالم ہے۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ
جیسے درخت گندا

گندہ درخت:

اکثر نے اس سے حنظل (اندرائن) مراد لیا ہے گو عموم لفظ میں ہر خراب درخت شامل ہو سکتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ مَا لَهَا مِنْ
اکھاڑ (پھینکا) لیا اس کو زمین کے اوپر سے کچھ نہیں اس کو
قَرَارٍ ﴿۲۶﴾
ٹھہراؤ (جماؤ)

دونوں مثالوں کا حاصل:

یعنی جڑ کچھ نہ ہو، ذرا اشارہ سے اکھڑ جائے۔ گویا اس کے بودے پن اور ناپائیداری کو ظاہر فرمایا، دونوں مثالوں کا حاصل یہ ہوا کہ مسلمانوں کا دعوائے توحید و ایمان پکا اور سچا ہے جس کے دلائل نہایت صاف و صحیح اور مضبوط ہیں موافق فطرت ہونیکی وجہ سے اس کی جڑیں قلوب کی پہنائیوں میں اتر جاتی ہیں اور اعمال صالحہ کی شاخیں آسمان قبول سے جالگتی ہے۔ الیه یصعد الکلم الطیب والعمل الصالح یرفعه (فاطر۔ رکوع ۲) اس کے لطیف وشیریں ثمرات سے موحدین کے کام و دہن ہمیشہ لذت اندوز ہوتے ہیں۔ الغرض حق وصداقت اور توحید ومعرفت کا سدا بہار درخت روز بروز پھولتا پھلتا اور بڑی پائیداری کے ساتھ اونچا ہوتا رہتا ہے اس کے برخلاف جھوٹی بات اور شرک وکفر کے دعوائے باطل کی جڑ، بنیاد کچھ نہیں ہوتی۔ ہوا کے ایک جھٹکے میں اکھڑ کر جا پڑتا ہے۔ ناحق بات ثابت کرنے میں خواہ کتنے ہی زور لگائے جائیں لیکن انسانی ضمیر اور فطرت کے مخالف ہونیکی وجہ سے اس کی جڑیں دل کی گہرائی میں نہیں پہنچتیں۔ تھوڑا دھیان کرنے سے غلط معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اسی لئے مشہور ہے کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے یعنی سچ کی طرح اپنے پاؤں نہیں چلتا۔ نہ اس سے دل میں نور پیدا ہوتا ہے۔ امام فخر الدین رازیؒ نے صوفیاء کے طرز پر ان مثالوں کے بیان میں بہت اطناب سے کام لیا ہے یہاں اس کے نقل کی گنجائش نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ (زمین کے اندر) اس کا جماؤ نہ ہو۔ اسی طرح اس کلمہ کی حالت ہے جو رضائے الٰہی کے لئے نہ ہو۔ اس کا کبھی کوئی فائدہ نہیں ابن مردودیہ نے بوساطت حبان بن شعبہ، حضرت انسؓ بن مالک کا قول بیان کیا کہ شجرہ خبیثہ شربانہ ہے حضرت انسؓ سے پوچھا گیا شربانہ کیا ہے؟ فرمایا اندرائن۔ میں کہتا ہوں ظاہر یہ ہے کہ شجرہ طیبہ کے اندر کھجور کا درخت بھی داخل ہے اور شجرہ خبیثہ کا لفظ درخت حنظل کو بھی شامل ہے۔ (تفسیر مظہری)

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کلمہ طیبہ سے مراد لا الہ الا اللہ کی شہادت ہے۔ پاکیزہ درخت کی طرح کا مؤمن ہے اس کی جڑ مضبوط ہے۔ یعنی مؤمن کے دل میں لا الہ الا اللہ جما ہوا ہے۔ اس کی شاخ آسمان میں ہے۔ یعنی اس توحید کے کلمہ کی وجہ سے اس کے اعمال آسمان کی طرف اٹھائے جاتے ہیں۔ اور بھی بہت سے مفسرین سے یہی مروی ہے کہ مراد اس سے مؤمن کے اعمال ہیں اور اس کے پاک اقوال اور نیک کام۔ مؤمن مثل کھجور کے درخت کے ہے ہر وقت ہر صبح ہر شام اس کے اعمال آسمان پر چڑھتے رہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھجور کا ایک خوشہ لایا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی آیت کا پہلا حصہ تلاوت فرمایا اور فرمایا کہ پاک درخت سے مراد کھجور کا درخت ہے۔

مسلمان کے مشابہ درخت:

صحیح بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے منقول ہے کہ ہم آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے بتلاؤ وہ کون سا درخت ہے جو مسلمان کے مشابہ ہے جس کے پتے جھڑتے نہیں، نہ جاڑوں میں نہ گرمیوں میں، جو اپنا پھل ہر موسم میں لاتا رہتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں میرے دل میں آیا کہ کہہ دوں کہ وہ درخت کھجور کا ہے لیکن میں نے دیکھا کہ مجلس میں (حضرت ابوبکرؓ ہیں حضرت عمرؓ ہیں اور اور وہ خاموش ہیں تو میں بھی چپکا ہو رہا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ درخت کھجور کا ہے۔ جب یہاں سے اٹھ کر چلے تو میں نے اپنے والد (حضرت) عمرؓ سے یہ ذکر کیا تو آپ نے فرمایا پیارے بچے اگر تم یہ جواب دیدیتے تو مجھے تو تمام چیزوں کے مل جانے سے بھی زیادہ محبوب تھا۔ (تفسیر ابن کثیر)

شاہ ولی اللہؒ کی تشریح:

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ فرماتے ہیں، حق جل شانہ نے اس آیت میں ایک خاص اسلوب سے ایمان اور کفر کے فرق کو بتلایا ہے وہ یہ کہ دین اسلام کی مثال ایک نہایت وعمدہ وشیریں نہایت نفع بخش پھل دار درخت جیسی ہے جو عالم

ملکوت سے اتار کر مکہ میں نصب کیا گیا جو بوجہ علو و رفعت یہ کہلانے کا مستحق ہے کہ اس کی جڑ زمین میں قائم ہوئی اور پھر اس کی جڑیں اور شاخیں پھوٹنی شروع ہوئیں۔ اور اطراف عالم میں پھیلتی گئیں اور کلمہ ناپاک کی مثال ایک ناپاک وخراب درخت جیسی ہے جسے لوگ بوجہ گندگی کے اکھاڑ کر پھینک دیتے ہیں اور وہ سرسبز نہیں ہونے پاتا۔ اسی طرح جو کفر و شرک عالم میں پھیلا ہوا تھا اسلام نے اسے مٹایا اور مٹا تا رہا اس تمثیل کے بعد اللہ تعالیٰ نے دو گروہوں کا حال بیان فرمایا ایک گروہ وہ تھا کہ جو اعلاء کلمہ حق میں ساعی و کوشاں تھا۔

اور دوسرا گروہ وہ تھا، جو کفر کا پیشوا تھا اور کفر اور شرک کی ترویج میں ساعی وکوشاں تھا گروہ اول کی بابت اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ انہیں دین اسلام پر ثابت قدم رکھے گا اور آخرت میں ان کے درجات بلند کرے گا اور دوسرے گروہ کی جس نے اللہ تعالیٰ کی نعمت یعنی دین حق کو کفر اور ضلالت سے تبدیل کر رکھا تھا مذمت کی اور آخرت میں ان کا برا ٹھکانہ قرار دیا مگر وہ اول کے مصداق اولین مہاجرین اولیں ہیں جن کے سردفتر ابوبکر صدیقؓ تھے جن کی وجہ سے دین اسلام نے رواج پایا اور گروہ ثانی جہلائے قریش تھا اس گروہ کا سردفتر ابوجہل تھا گروہ اول کے بالمقابل گروہ ثانی والے ذلیل وخوار اور گرفتار مصیبت وبلا ہوئے اور آیت میں جس تثبیت کا ذکر ہے اس سے توفیق الٰہی مراد ہے جو بندہ کو قبر میں عطا کی جاتی ہے اور جس وقت منکر نکیر اس سے آکر سوال کرتے ہیں تو وہ توفیق الٰہی سے جواب راست دیتا ہے۔ (معارف کاندھلوی)

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ
مضبوط کرتا ہے اللہ ایمان والوں کو مضبوط بات سے
فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ
دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں

مؤمن کی استقامت:

یعنی حق تعالیٰ توحید وایمان کی باتوں سے (جن کی مضبوطی و پائیداری پہلی مثال میں ظاہر کی گئی) مومنین کو دنیا وآخرت میں مضبوط وثابت قدم رکھتا ہے رہی قبر کی منزل جو دنیا وآخرت کے درمیان برزخ ہے اس کو ادھر یا اُدھر جس طرف چاہیں شمار کر سکتے ہیں۔ چنانچہ سلف سے دونوں قسم کے اقوال منقول ہیں۔ غرض یہ ہے کہ مؤمنین دنیا کی زندگی سے لے کر محشر تک اسی کلمہ طیبہ کی بدولت مضبوط اور ثابت قدم رہیں گے۔ دنیا میں کیسی ہی آفات وحوادث پیش آئیں کتنا ہی سخت امتحان ہو، قبر میں نکیرین سے سوال وجواب ہو، محشر کا ہولناک منظر ہوش اڑا دینے والا ہو ہر موقع پر یہی کلمہ توحید ان کی پامردی اور استقامت کا ذریعہ بنے گا۔ (تفسیر عثمانی)

القول الثابت سے مراد ہے کلمہ توحید جس کا اعتراف خلوص کے ساتھ کیا گیا ہو خلوص دل سے کلمہ توحید کا اقرار دل میں جم جاتا ہے اور اس کا ثواب اللہ کے ہاں ثابت ہو جاتا ہے دین کے معاملات میں دنیا کے اندر جو دکھ اور آلام اہل ایمان پر آتے ہیں ان کے ایمان کو نہیں ہلا سکتے وہ ایمان پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہتے ہیں جیسے حضرت زکریا حضرت یحییٰؑ حضرت جرجیسؑ حضرت شمعونؑ اصحاب اخدود۔

ائمہ ستہ نے حضرت براء بن عازبؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مسلمان سے جب قبر میں سوال کیا جاتا ہے تو وہ شہادت دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں آیت يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ کا یہی مطلب ہے۔ دوسری روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آیت يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ کا نزول عذاب قبر کے سلسلہ میں ہوا۔ صاحب قبر سے کہا جائے گا تیرا رب کون ہے وہ جواب دیگا اللہ میرا رب ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم میرے پیغمبر ہیں۔ (متفق علیہ)

حضرت عثمانؓ راوی ہیں کہ مردہ کے دفن سے فارغ ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس توقف فرماتے تھے اور ارشاد فرماتے تھے اپنے بھائی کے لئے دعائے مغفرت کرو اور اللہ سے اس کے لئے ثابت قدم رہنے کی درخواست کرو۔ اس وقت اس سے سوال کیا جا رہا ہے۔ رواہ ابوداؤد۔

صحیح بخاری وصحیح مسلم میں حضرت انسؓ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بندہ کو جب قبر میں رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھی واپس آنے لگتے ہیں تو مردہ ان کی جوتیوں کی آواز سنتا ہے (اس وقت) دو فرشتے آکر اس کو بٹھاتے ہیں اور کہتے ہیں تو اس شخص یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کیا کہتا ہے، مؤمن جواب دیتا ہے میں شہادت دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول تھے کہا جاتا ہے اپنے دوزخ والے ٹھکانے کو دیکھ کہ اس کی جگہ اللہ نے جنت میں ٹھکانہ عطا فرما دیا، مومن دونوں ٹھکانوں کو دیکھتا ہے۔ منافق اور کافر سے جب پوچھا جاتا ہے تو اس شخص کی بابت کیا کہتا تھا تو وہ کہتا ہے مجھے کچھ نہیں معلوم۔ جو بات اور لوگ کہتے تھے میں بھی کہتا تھا فرشتے اس کو کہتے ہیں نہ تو نے جانا اور نہ (قرآن میں) پڑھا پھر اس پر لوہے کے ہتھوڑوں کی مار پڑتی ہے اور وہ چیختا ہے اس کی چیخوں کو سوائے جن وانس کے سب قریب والے سنتے ہیں۔

قبر میں سوال وجواب:

حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میت

کو قبر میں دفن کیا جاتا ہے تو دو سیاہ فام نیلے (یعنی نیلی آنکھوں والے) فرشتے اس کے پاس آتے ہیں ایک کا نام منکر اور دوسرے کا نام نکیر ہے دونوں فرشتے پوچھتے ہیں تو اس شخص کے متعلق کیا کہتا تھا مردہ کہتا ہے وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول تھے میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں فرشتے کہتے ہیں ہم تو جانتے ہی تھے کہ تو یہ کہے گا پھر اس کی قبر میں ستر ستر ہاتھ ہر طرف وسعت کردی جاتی ہے اور روشنی کردی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے سو جاؤ وہ سو جاتا ہے۔ پھر وہ کہتا ہے میں واپس جا کر اپنے گھر والوں کو (اس کیفیت کی) اطلاع تو دیدوں۔ فرشتے کہتے ہیں اس دلہن کی طرح (محبت آرام اور سکون کے ساتھ) سو جا جس کو سوائے اس شخصیت کے جو سب گھر والوں میں اس کو پیاری ہوتی ہے اور کوئی نہیں اٹھاتا (آخر وہ سو جائے گا)۔ یہاں تک کہ اللہ اس کو اس کی خوابگاہ سے اٹھائے گا۔ اور اگر مردہ منافق ہوگا تو جواب دے گا میں نے لوگوں کو ایک بات کہتے سنا تھا میں نے بھی ویسے ہی کہہ دیا مجھے کچھ نہیں معلوم (کہ یہ اللہ کے رسول تھے یا نہ تھے) فرشتے کہیں گے ہم تو پہلے ہی جانتے تھے کہ تو یہ بات کہے گا پھر زمین کو حکم دیا جائے گا تو اس پر مل جا (یعنی ایسا دبا کہ تیرے دونوں حصے آپس میں مل جائیں)۔ زمین اس منافق کو اتنا دبائے گی کہ اس کی پسلیاں ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر نکل جائیں گی۔ اس طرح یہ برابر عذاب میں مبتلا رہے گا یہاں تک کہ اللہ اس کو اس کی خوابگاہ سے اٹھائے گا۔ رواہ الترمذی۔

عذاب قبر سے پناہ:

مسند میں ہے کہ ایک انصاری کے جنازے میں ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ قبرستان پہنچے۔ ابھی تک قبر تیار نہ تھی۔ آپ بیٹھ گئے اور ہم بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آس پاس ایسے بیٹھ گئے گویا ہمارے سروں پر پرند ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں جو تنکا تھا اس سے آپ زمین پر لکیریں نکال رہے تھے جو سر اٹھا کر دو تین مرتبہ فرمایا کہ عذاب قبر سے پناہ چاہو۔ بندہ جب دنیا کی آخری اور آخرت کی پہلی گھڑی میں ہوتا ہے تو اس کے پاس آسمان سے نورانی چہرے والے فرشتے آتے ہیں گویا کہ ان کے چہرے سورج جیسے ہیں۔ ان کے ساتھ جنتی کفن اور جنتی خوشبو ہوتی ہے۔ اس کے پاس جہاں تک اس کی نگاہ کام کرے وہاں تک بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر ملک الموت آ کر اس کے سرہانے بیٹھ جاتے ہیں اور فرماتے ہیں اے پاک روح اللہ تعالیٰ کی مغفرت اس کی رضامندی کی طرف چل۔ وہ اس آسانی سے نکل آتی ہے جیسے کسی مشک سے پانی کا قطرہ ٹپک آیا ہو۔ ایک آنکھ جھپکنے کے برابر کی دیر بھی وہ فرشتے اسے ان کے ہاتھ میں نہیں رہنے دیتے فوراً لے لیتے ہیں اور جنتی کفن اور جنتی خوشبو میں رکھ لیتے ہیں۔ خود اس روح میں سے بھی مشک سے بھی عمدہ خوشبو نکلتی ہے کہ روئے زمین پر ایسی عمدہ خوشبو نہ سونگھی گئی ہو۔ وہ اسے لے کر آسمانوں کی طرف چڑھتے ہیں۔ فرشتوں کی جس جماعت کے پاس سے گذرتے ہیں وہ پوچھتے ہیں کہ یہ پاک روح کس کی ہے۔ یہ اس کا جو بہترین نام دنیا میں مشہور تھا وہ بتلاتے ہیں اور اس کے باپ کا نام بھی۔ آسمان دنیا تک پہنچ کر دروازے کھلواتے ہیں۔ آسمان کا دروازہ کھل جاتا ہے اور وہاں کے فرشتے اسے دوسرے آسمان تک اور دوسرے آسمان کے تیسرے آسمان تک اسی طرح ساتویں آسمان پر وہ پہنچتا ہے۔ اللہ عزوجل فرماتا ہے میرے بندے کی کتاب علیین میں لکھ لو اور اسے زمین کی طرف لوٹا دو۔ میں نے اسی سے اسے پیدا کیا ہے اور اسی سے دوبارہ نکالوں گا۔ پس اس کی روح اسی کے جسم میں لوٹا دی جاتی ہے۔ اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں۔ اسے اٹھا کر بٹھاتے ہیں اور سوال کرتے ہیں کہ تیرا رب کون ہے؟ وہ جواب دیتا ہے اللہ تعالیٰ، وہ پھر پوچھتے ہیں کہ تیرا دین کیا ہے؟ وہ جواب دیتا ہے کہ اسلام۔ پھر سوال ہوتا ہے کہ وہ شخص کون ہے جو تم میں بھیجا گیا تھا؟ وہ کہتا ہے وہ رسول اللہ تھے۔ فرشتے پوچھتے ہیں تجھے کیسے معلوم ہوا؟ وہ کہتا ہے میں نے کتاب اللہ پڑھی اس پر ایمان لایا اسے سچا مانا۔ اسی وقت آسمان سے ایک منادی دیتا ہے کہ میرا بندہ سچا ہے اس کے لئے جنتی فرش بچھا دو اور اسے جنتی لباس پہنا دو اور جنت کی طرف کا دروازہ کھول دو۔ پس جنت کی روح پرور خوشبودار ہواؤں کی لپٹیں اسے آنے لگتی ہیں۔ اس کی قبر بقدر درازیٔ نظر وسیع کردی جاتی ہے اس کے پاس ایک شخص خوبصورت نورانی چہرے والا عمدہ کپڑوں والا اچھی خوشبو والا آتا ہے اور اس سے کہتا ہے آپ خوش ہو جائیے۔ اسی دن کا وعدہ آپ دیئے جاتے تھے۔ یہ اس سے پوچھتا ہے کہ آپ کون ہیں؟ آپ کے چہرے سے بھلائی ہی بھلائی نظر آتی ہے۔ وہ جواب دیتا ہے کہ میں تیرا نیک عمل ہوں۔ اس وقت مسلمان آرزو کرتا ہے کہ خدایا قیامت جلد قائم ہو جائے تو میں اپنے اعمال وعیال اور ملک ومال کی طرف لوٹ جاؤں اور کافر بندہ جب دنیا کی آخری ساعت اور آخرت کی اول ساعت میں ہوتا ہے۔ اس کے پاس سیاہ چہرے کے آسمانی فرشتے آتے ہیں اور ان کے ساتھ جہنمی ٹاٹ ہوتا ہے۔ جہاں تک نگاہ پہنچے وہاں تک وہ بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر حضرت ملک الموت علیہ السلام آ کر اس کے سرہانے بیٹھ کر فرماتے ہیں، اے خبیث روح اللہ تعالیٰ کے غضب و غصہ کی طرف چل۔ اس کی روح جسم میں چھپتی پھرتی ہے جسے بہت سختی کے ساتھ نکالا جاتا ہے۔ اس وقت ایک آنکھ جھپکنے جتنی دیر میں اسے فرشتے ان کے ہاتھوں سے لے لیتے ہیں اور اسے جہنمی بورے میں لپیٹ لیتے ہیں۔ اس میں سے ایسی بدبو نکلتی ہے کہ روئے زمین پر اس سے زیادہ بدبو نہیں پائی گئی۔ اب یہ اسے لے کر اوپر کو چڑھتے ہیں یہ خبیث روح کس کی ہے، وہ اس کا بدترین نام

جو دنیا میں تھا بتلاتے ہیں اور اس کے باپ کا نام بھی۔ آسمان دنیا تک پہنچ کر دروازہ کھلوانا چاہتے ہیں لیکن کھولا نہیں جاتا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ الخ کی تلاوت فرمائی کہ نہ ان کے لئے آسمان کے دروازے کھلیں نہ وہ جنت میں جاسکیں۔ یہاں تک کہ سوئی کے ناکے میں سے اونٹ گزر جائے۔ اللہ تعالیٰ حکم فرماتا ہے کہ اس کی کتاب سجین میں لکھ لو جو سب سے نیچے کی زمین میں ہے پس اس کی روح وہیں سے پھینک دی جاتی ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ الخ کی تلاوت فرمائی۔ یعنی خدا کے ساتھ جو شرک کرے گویا کہ وہ آسمان سے گر پڑا۔ یا تو اسے پرندا چک لے جائیں گے یا آندھی کسی دور کے گڑھے میں پھینک مارے گی۔ پھر اس کی روح اسی جسم میں لوٹائی جاتی ہے۔ اس کے پاس دو فرشتے پہنچتے ہیں جو اسے اٹھاتے بٹھاتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ تیرا رب کون ہے؟ وہ جواب دیتا ہے کہ ہائے ہائے مجھے معلوم نہیں۔ پھر پوچھتے ہیں تیرا دین کیا ہے؟ وہ کہتا ہے ہائے ہائے مجھے اس کا بھی علم نہیں۔ پھر پوچھتے ہیں وہ کون تھا جو تم میں بھیجا گیا تھا؟ وہ کہتا ہے ہائے ہائے مجھے معلوم نہیں۔ اسی وقت آسمان سے ایک منادی کی ندا آتی ہے کہ میرا بندہ جھوٹا ہے اس کے لئے جہنم کی آگ کا فرش کردو اور دوزخ کی جانب کا دروازہ کھول دو۔ وہاں سے اسے دوزخی ہوا اور دوزخ کا بھپارہ پہنچتا رہتا ہے اور اس کی قبر اس پر اتنی تنگ ہوجاتی ہے کہ اس کی پسلیاں ایک دوسرے میں گھس جاتی ہیں۔ بڑی بری اور ڈراؤنی صورت والا برے میلے کچیلے خراب کپڑوں والا بڑی بدبو والا ایک شخص اس کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے اب غمناک ہوجاؤ۔ اسی دن کا تجھ سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ یہ پوچھتا ہے تو کون ہے؟ تیرے چہرے سے برائی برستی ہے۔ وہ کہتا ہے میں تیرے اعمال بد کا مجسمہ ہوں۔ تو یہ دعا کرتا ہے کہ خدایا قیامت قائم نہ ہو۔ (ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ وغیرہ)

نیک و بد کی موت:

مسند میں ہے کہ نیک بندے کی روح نکلنے کے وقت آسمان و زمین کے درمیان کے فرشتے اور آسمانوں کے فرشتے سب اس پر رحمت بھیجتے ہیں اور آسمانوں کے دروازے اس کے لئے کھل جاتے ہیں ہر دروازے کے فرشتوں کی دعا ہوتی ہے کہ اس کی پاک اور نیک روح ان کے دروازے سے چڑھائی جائے الخ۔ اور برے شخص کے بارے میں ہے کہ اس کی قبر میں ایک اندھا گونگا فرشتہ مقرر ہوتا ہے۔ جس کے ہاتھ میں ایک گرز ہوتا ہے کہ اگر وہ کسی بڑے پہاڑ پر مار دیا جائے تو وہ مٹی بن جائے۔ اس سے وہ اسے مارتا ہے یہ مٹی ہوجاتا ہے۔ اسے اللہ عزوجل پھر لوٹاتا ہے جیسا تھا ویسا ہی ہوجاتا ہے وہ اسے پھر وہی گھن مارتا ہے۔ یہ ایسا چیختا ہے کہ اس کی چیخ کو سوائے انسانوں اور جن کے ہر کوئی سنتا ہے۔ حضرت براءؓ فرماتے ہیں، اسی آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں مراد اس سے قبر کے سوالوں کے جواب میں مومن کو استقامت کا ملنا ہے۔

نیکیاں ساتھ ہوتی ہیں:

ابن جریر میں فرمان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہے اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ میت تمہاری جوتیوں کی آہٹ سنتی ہے جبکہ تم اسے دفنا کر واپس لوٹتے ہو۔ اگر وہ ایمان پر مرا ہے تو نماز اس کے سرہانے ہوتی ہے زکوٰۃ دائیں جانب ہوتی ہے روزہ بائیں طرف ہوتا ہے نیکیاں مثلاً صدقہ، خیرات صلہ رحمی، بھلائی لوگوں سے احسان وغیرہ اس کے پیروں کی طرف ہوتے ہیں۔ جب اس کے سر کی طرف سے کوئی آتا ہے تو نماز کہتی ہے یہاں سے جانے کی جگہ نہیں، دائیں طرف سے زکوٰۃ روکتی ہے بائیں طرف سے روزہ اور پیروں کی طرف سے اور نیکیاں۔ پس اس سے کہا جاتا ہے بیٹھ جاؤ۔ وہ بیٹھ جاتا ہے اور اسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا سورج ڈوبنے کے قریب ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دیکھو جو ہم پوچھیں اس کا جواب دو۔ وہ کہتا ہے تم چھوڑو پہلے میں نماز ادا کرلوں۔ وہ کہتے ہیں وہ تو تو کرے گا ابھی ہمیں ہمارے سوالوں کا جواب دے۔ وہ کہتا ہے اچھا تم کیا پوچھتے ہو؟ وہ کہتے ہیں اس شخص کے بارے میں تو کیا کہتا ہے اور کیا شہادت دیتا ہے۔ وہ پوچھتا ہے کیا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں؟ جواب ملتا ہے کہ ہاں آپ ہی کے بارے میں۔ یہ کہتا ہے کہ میری گواہی ہے کہ آپ رسول اللہ ہیں، آپ خدا کے پاس سے ہمارے پاس دلیلیں لیکر آئے، ہم نے آپ کو سچا مانا۔ پھر اس سے کہا جاتا ہے کہ تو اسی پر زندہ رکھا گیا اور اسی پر مرا اور اسی پر ان شاء اللہ دوبارہ اٹھایا جائے گا۔ پھر اس کی قبر ستر ہاتھ پھیلا دی جاتی ہے اور نورانی کردی جاتی ہے اور جنت کی طرف ایک دروازہ کھول دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے دیکھ یہ ہے تیرا اصلی ٹھکانا۔ اب تو اسے خوشی اور راحت ہی راحت ہوتی ہے پھر اس کی روح پاک روحوں میں سبز پرندوں کے قالب میں جنتی درختوں میں رہتی ہے اور اس کا جسم جس سے اس کی ابتدا کی گئی تھی اسی کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے یعنی مٹی کی طرف۔ یہی اس آیت کا مطلب ہے۔

دنیا و آخرت کی ثابت قدمی:

حضرت طاؤسؒ فرماتے ہیں دنیا میں ثابت قدمی کلمہ توحید پر استقامت ہے اور آخرت میں ثابت قدمی منکر نکیر کے جواب کی ہے۔ قتادہؒ فرماتے ہیں خیر اور عمل صالح کے ساتھ دنیا میں رکھے جاتے ہیں اور قبر میں بھی۔ ابو عبداللہ حکیم ترمذیؒ اپنی کتاب نوادر الاصول میں لائے ہیں کہ صحابہ کی جماعت کے پاس آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی مسجد میں فرمایا کہ گزشتہ رات میں نے عجیب باتیں دیکھیں، دیکھا کہ میرے ایک امتی کو عذاب قبر نے گھیر رکھا ہے۔ آخر اس کے وضو نے آکر اسے چھڑا لیا۔ میرے ایک امتی کو دیکھا کہ

شیطان اسے وحشی بنائے ہوئے ہیں لیکن ذکر اللہ نے آ کر اسے خلاصی دلوائی۔ ایک امتی کو دیکھا کہ عذاب کے فرشتوں نے اسے گھیر رکھا ہے اس کی نماز نے آ کر اسے بچالیا۔ ایک امتی کو دیکھا کہ پیاس کے مارے ہلاک ہو رہا ہے۔ جب حوض پر جاتا ہے دھکے لگتے ہیں اس کا روزہ آیا اور اس نے اسے پانی پلا دیا اور آسودہ کر دیا۔ آپ نے ایک اور امتی کو دیکھا کہ انبیاء حلقے باندھ باندھ کر بیٹھے ہیں یہ جس حلقے میں بیٹھنا چاہتا ہے وہاں والے اسے اٹھا دیتے ہیں اسی وقت اس کی جنابت کا غسل آیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر میرے پاس بٹھا دیا۔ ایک امتی کو دیکھا کہ چاروں طرف سے اسے اندھیرا گھیرے ہوئے ہے اور اوپر نیچے سے بھی وہ اسی میں گھرا ہوا ہے کہ اس کا حج اور عمرہ آیا اور اسے اندھیرا میں سے نکال کر نور میں پہنچا دیا۔ ایک امتی کو دیکھا کہ وہ مؤمنوں سے کلام کرنا چاہتا ہے لیکن وہ اس سے بولتے نہیں اسی وقت صلہ رحمی آئی اور اعلان کیا کہ اس سے بات چیت کرو، چنانچہ وہ بولنے چالنے لگتے ہیں۔ ایک امتی کو دیکھا کہ وہ اپنے منہ پر سے آگ کے شعلے ہٹانے کو ہاتھ بڑھا رہا ہے اتنے میں اس کی خیرات آئی اور اس کے منہ پر پردہ اور اوٹ ہو گئی اور اس کے سر پر سایہ بن گئی اپنے ایک امتی کو دیکھا کہ عذاب کے فرشتوں نے اسے ہر طرف سے قید کر لیا ہے لیکن اس کا نیکی کا حکم اور برائی سے منع کرنا آیا اور ان کے ہاتھوں سے چھڑا کر رحمت کے فرشتوں سے ملا دیا۔ اپنے ایک امتی کو دیکھا کہ گھٹنوں کے بل گرا ہوا ہے اور خدا میں اور اس میں حجاب ہے، اسکے اچھے اخلاق آئے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اللہ کے پاس پہنچا آئے۔ اپنے ایک امتی کو دیکھا کہ اس کا نامۂ اعمال اس کے بائیں طرف سے آ رہا ہے لیکن اس کے خوف خدا نے آ کر اسے اس کے سامنے کر دیا۔ اپنے ایک امتی کو میں نے جہنم کے کنارے کھڑا دیکھا اسی وقت اس کا خدا سے کپکپانا آیا اور اسے جہنم سے بچالے گیا۔ میں نے اپنے ایک امتی کو دیکھا کہ اسے اوندھا کر دیا گیا ہے کہ جہنم میں ڈال دیں لیکن اسی وقت خوف خدا سے اس کا رونا آیا اور ان آنسوؤں نے اسے بچالیا۔ میں نے ایک امتی کو دیکھا کہ پل صراط پر لڑکنیاں کھا رہا ہے کہ اس کا مجھ پر درود پڑھنا آیا اور ہاتھ تھام کر سیدھا کر دیا اور وہ پار اتر گیا۔ ایک کو دیکھا کہ جنت کے دروازے پر پہنچا، لیکن دروازہ بند ہو گیا۔ اسی وقت لاالہ الا اللّٰہ کی شہادت پہنچی، دروازے کھلوا دیئے اور اسے جنت میں پہنچا دیا۔ قرطبیؒ اس حدیث کو وارد کر کے فرماتے ہیں یہ حدیث بہت بڑی ہے، اس میں ان مخصوص اعمال کا ذکر ہے جو مخصوص مصیبتوں سے نجات دلوانے والے ہیں (تذکرہ)۔ اس بارے میں حافظ ابو یعلیٰ موصلیؒ نے بھی ایک غریب مطول حدیث روایت کی ہے جس میں ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ملک الموت سے فرماتا ہے تو میرے دوست کے پاس جا، میں نے آسانی سختی سے ہر طرح آزمالیا ہے ہر ایک کی حالت میں اسے اپنی خوشی میں خوش پایا، تو جا اور اسے میرے پاس لے آ کہ میں اسے ہر طرح کا آرام وعیش دوں ملک الموت علیہ السلام اپنے ساتھ پانچ سو فرشتوں کو لے کر چلتے ہیں۔ ان کے پاس جنتی کفن وہاں کی خوشبو اور ریحان کے خوشے ہوتے ہیں جس کے سرے پر بیس رنگ ہوتے ہیں ہر رنگ کی خوشبو الگ الگ ہوتی ہے۔ سفید ریشمی کپڑے میں اعلیٰ مشک بہ تکلف لپٹی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ سب آتے ہیں ملک الموت علیہ السلام تو اس کے سرہانے بیٹھ جاتے ہیں اور فرشتے اس کے چار طرف بیٹھ جاتے ہیں ہر ایک کے ساتھ جو کچھ جنتی تحفہ ہے وہ اسکے اعضاء پر رکھ دیا جاتا ہے ا سفید ریشم اور مشک اذخر اس کی ٹھوڑی تلے رکھ دیا جاتا ہے۔ اس کے لئے جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور اس کی روح کبھی جنتی پھولوں سے کبھی جنتی لباسوں سے کبھی جنتی پھلوں سے اس طرح بہلائی جاتی ہے جیسے روتے ہوئے بچے کو لوگ بہلاتے ہیں۔ اس وقت اس کی حوریں ہنس کر اس کی چاہت کرتی ہیں، روح ان مناظر کو دیکھ کر بہت جلد جسمانی قید سے نکل جانے کا قصد کرتی ہے ملک الموت فرماتے ہیں ہاں اے پاک روح بغیر کانٹے کی بیریوں کی طرف اور لدے ہوئے کیلوں کی طرف اور لمبی لمبی چھاؤں کی طرف اور پانی کے جھرنوں کی طرف چل۔ واللہ ماں جس قدر بچے پر مہربان ہوتی ہے اس سے بھی زیادہ ملک الموت اس پر شفقت ورحمت کرتا ہے اس لئے کہ اسے علم ہے کہ یہ محبوب خدا ہے۔ اگر اسے ذرا سی بھی تکلیف پہنچی تو میرے رب کی ناراضگی مجھ پر ہوگی۔ بس اس طرح اس روح کو اس جسم سے الگ کر لیتا ہے جیسے گندھے ہوئے آٹے میں سے بال۔ انہیں کے بارے میں فرمان خدا ہے کہ ان کی روح کو طیب فرشتے فوت کرتے ہیں۔ اور جگہ فرمان ہے کہ اگر وہ مقربین میں سے ہے تو اس کے لئے آرام وآسائش ہے۔ یعنی موت آرام کی اور آسائش کی ملنے والی اور دنیا کے بدلے کی جنت۔ ملک الموت اس کی روح کو قبض کرتے ہی روح جسم سے کہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ عزوجل تجھے جزائے خیر دے تو خدا کی اطاعت کی طرف جلدی کرنے والا اور خدا کی معصیت سے دیر کرنے والا تھا۔ تو نے آپ بھی نجات پائی اور مجھے بھی نجات دلوائی۔ جسم بھی روح کو ایسا ہی جواب دیتا ہے۔ زمین کے وہ تمام حصے جن پر یہ عبادت خدا کرتا تھا اس کے مرنے سے چالیس دن تک روتے ہیں۔ اسی طرح آسمان کے وہ کل دروازے جن سے اس کے نیک اعمال چڑھتے تھے اور جن سے اس کی روزیاں اترتی تھیں اس پر روتے ہیں۔ اسی وقت وہ پانچ سو فرشتے اس جسم کے اردگرد کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس کے نہلانے میں شامل رہتے ہیں۔ انسان اس کی کروٹ بدلے، اس سے پہلے خود فرشتے بدل دیتے ہیں اور اسے نہلا کر انسانی کفن سے پہلے اپنا ساتھ لایا ہوا کفن پہنا دیتے ہیں۔ ان کی خوشبو سے پہلے اپنی خوشبو لگا دیتے ہیں اور اس کے گھر کے

دروازے سے لے کر اس کی قبر تک دورخ صفیں باندھ کر کھڑے ہوجاتے ہیں اوراس کے لئے استغفار کرنے لگتے ہیں۔ اس وقت شیطان اس زور سے رنج کے ساتھ چیختا ہے کہ اس کے جسم کی ہڈیاں ٹوٹ جائیں اور کہتا ہے میرے لشکر یوتم برباد ہوجاؤ ہائے یہ تمہارے ہاتھوں سے کیسے بچ گیا؟ وہ جواب دیتے ہیں کہ یہ تو معصوم تھا۔ جب اس کی روح کو لے کر ملک الموت چڑھتے ہیں تو حضرت جبریل علیہ السلام ستر ہزار فرشتوں کو لے کر اس کا استقبال کرتے ہیں۔ ہر ایک اسے جداگانہ بشارت خداوندی سناتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی روح عرش خدا کے پاس پہنچتی ہے وہاں جاتے ہی سجدے میں گر پڑتی ہے اس وقت جناب باری کا ارشاد ہوتا ہے کہ میرے بندے کی روح کو بغیر کانٹوں کی بیریوں میں اور تہ بہ تہ کیلوں کے درختوں میں اور لمبے سایوں میں بہتے پانیوں میں جگہ دو۔ پھر جب اسے قبر میں رکھا جاتا ہے تو دائیں طرف نماز کھڑی ہوجاتی ہے، بائیں طرف روزہ کھڑا ہوجاتا ہے۔ سر کی طرف قرآن آجاتا ہے، نمازوں کو چل کر جانا پیروں کی طرف ہوتا ہے ایک کنارے صبر کھڑا ہوجاتا ہے۔ عذاب کی ایک گردن لپکتی آتی ہے لیکن دائیں جانب سے نماز اسے روک دیتی ہے کہ یہ ہمیشہ چوکنا رہا اب اس قبر میں آکر ذرا راحت پائی۔ وہ بائیں طرف سے آتی ہے یہاں سے روزہ یہی کہہ کر اسے آنے نہیں دیتا۔ سرہانے سے آتی ہے یہاں سے قرآن اور ذکر یہی کہہ کر آڑے آتے ہیں۔ وہ پائنتیوں سے آتی ہے یہاں سے اس کی نمازوں کے لئے چل کر جانا اسے روک دیتا ہے غرض چوطرف سے خدا کے محبوب کے لئے روک ہوجاتی ہے اور عذاب کو کہیں سے راہ نہیں ملتی۔ وہ واپس چلا جاتا ہے اس وقت صبر کہتا ہے کہ میں دیکھ رہا تھا کہ اگر تم سے ہی یہ عذاب دفع ہوجائے تو مجھے بولنے کی کیا ضرورت؟ ورنہ میں بھی اس کی حمایت کرتا۔ اب دو فرشتے بھیجے جاتے ہیں ایک کو نکیر کہا جاتا ہے دوسرے کو منکر۔ یہ اچک لے جانے والی بجلی جیسے ہوتے ہیں۔ ان کے دانت سیہ جیسے ہوتے ہیں۔ ان کے سانس سے شعلے نکلتے ہیں ان کے بال پیروں تلے لٹکتے ہوتے ہیں۔ ان کے دونوں کندھوں کے درمیان اتنی اتنی مسافت ہوتی ہے ان کے دل نرمی اور رحمت سے بالکل خالی ہوتے ہیں ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں ہتھوڑے ہوتے ہیں کہ اگر قبیلہ ربیعہ اور قبیلہ مضر جمع ہوکر اسے اٹھانا چاہیں تو ناممکن۔ وہ آتے ہی اسے کہتے ہیں اٹھ بیٹھ۔ یہ اٹھ کر سیدھی طرح بیٹھ جاتا ہے۔ اس کا کفن اس کے پہلو پر آجاتا ہے وہ اس سے پوچھتے ہیں۔

تیرا رب کون ہے؟ تیرا دین کیا ہے؟ تیرا نبی کون ہے؟ صحابہؓ سے نہ رہا گیا۔ انہوں نے کہا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے ڈراؤنے فرشتوں کو کون جواب دے سکے گا؟ آپ نے اسی آیت یثبت اللہ الخ کی تلاوت فرمائی اور فرمایا وہ بے جھجک جواب دیتا ہے کہ میرا رب اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے اور میرا دین اسلام ہے جو فرشتوں کا بھی دین ہے اور میرے نبی محمد ہیں جو خاتم النبیین تھے (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ وہ کہتے ہیں آپ نے صحیح جواب دیا اب تو وہ اس کے لئے اس کی قبر کو اس کے دائیں سے اس کے بائیں سے اس کے آگے سے اس کے پیچھے سے اس کے سر کی طرف سے اس کے پاؤں کی طرف سے چالیس چالیس ہاتھ کشادہ کردیتے ہیں۔ وہ دو سو ہاتھ کی وسعت کردیتے ہیں اور چالیس ہاتھ کا احاطہ کردیتے ہیں اور اس سے فرماتے ہیں اپنے اوپر نظریں اٹھا۔ یہ دیکھتا ہے کہ جنت کا دروازہ کھلا ہوا ہے وہ کہتے ہیں اے خدا کے دوست چونکہ تو نے خدا کی بات مان لی ہے تیری منزل یہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے اس وقت جو سرور و راحت اس کے دل کو ہوتی ہے وہ لازوال ہوتی ہے۔ پھر اس سے کہا جاتا ہے اب اپنے نیچے کی طرف دیکھ۔ یہ دیکھتا ہے کہ جہنم کا دروازہ کھلا ہوا ہے فرشتے کہتے ہیں دیکھ اس سے خدا نے تجھے ہمیشہ کے لئے نجات بخشی۔ پھر تو اس کا دل اتنا خوش ہوتا ہے کہ یہ خوشی ابدالآباد تک ہٹتی نہیں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اس کے لئے ستتر دروازے جنت کے کھل جاتے ہیں۔ جہاں سے بادِ صبا کی لپٹیں خوشبو اور ٹھنڈک کے ساتھ آتی رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ اسے اللہ عزوجل اس کی اس خواب گاہ سے قیامت کے قائم ہوجانے پر اٹھائے۔ اسی اسناد سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ برے بندے کے لئے ملک الموت سے فرماتا ہے جا اور میرے اس دشمن کو لے آ۔ اسے میں نے روزی میں برکت دے رکھی تھی۔ اپنی نعمتیں عطا فرما رکھی تھیں۔ لیکن پھر بھی یہ میری نافرمانیوں سے نہ بچا۔ اسے لے آ تاکہ میں اس سے انتقام لوں۔ اور اسی وقت حضرت ملک الموت علیہ السلام اس کے سامنے نہایت بد اور ڈراؤنی صورت میں آتے ہیں۔ ایسی کہ کسی نے اتنی بھیانک اور گھناؤنی صورت نہ دیکھی ہو۔ بارہ آنکھیں ہوتی ہیں جہنم کا خاردار لباس ساتھ ہوتا ہے۔ پانچ سو فرشتے جو جہنمی آگ کے انگارے اور آگ کے کوڑے اپنے ساتھ لئے ہوتے ہیں ان کے ساتھ ہوتے ہیں۔ ملک الموت وہ خاردار کھال جو جہنم کی آگ کی ہے اس کے جسم پر مارتے ہیں، روئیں روئیں میں آگ کے کانٹے گھس جاتے ہیں۔ پھر اس طرح گھماتے ہیں کہ اس کا جوڑ جوڑ ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ پھر اس کی روح اس کے پاؤں کے انگوٹھے سے کھینچتے ہیں اور اس کے گھٹنوں پر ڈال دیتے ہیں۔ اس وقت خدا کا دشمن بے ہوش ہوجاتا ہے۔ پس ملک الموت اسے اٹھا لیتے ہیں۔ فرشتے اپنے جہنمی کوڑے اس کے چہرے پر اور پیٹھ پر مارتے ہیں پھر ملک الموت اسے دبوچتے ہیں اور اس کی روح اس کی ایڑیوں کی طرف سے کھینچتے ہیں اور اس کے گھٹنوں پر ڈال دیتے ہیں پھر اس کے تہ بند باندھنے کی جگہ پر ڈال دیتے ہیں۔ یہ دشمن خدا اس وقت پھر بے تاب ہوجاتا ہے۔ فرشتہ موت پھر اس بے ہوشی کو اٹھا لیتا ہے اور فرشتے پھر اس کے چہرے اور کمر پر کوڑے برسانے لگتے ہیں۔ آخر یہاں تک کہ روح

سینے پر چڑھ آتی ہے پھر حلق پر پہنچتی ہے پھر فرشتے اس جہنمی تانبے اور جہنمی انگاروں کو اس کی ٹھوڑی کے نیچے رکھ دیتے ہیں اور ملک الموت علیہ السلام فرماتے ہیں اے لعین وملعون روح چل سینک میں اور جھلستے پانی میں اور کالے سیاہ دھوئیں کے غبار میں جس میں نہ تو خنکی ہے نہ اچھی جگہ۔ جب یہ روح قبض ہوجاتی ہے تو اپنے جسم سے کہتی ہے اللہ تجھ سے سمجھے تو مجھے خدا کی نافرمانیوں کی طرف بھگائے لئے جارہا تھا۔ خود بھی ہلاک ہوا اور مجھے بھی برباد کیا۔ جسم بھی روح سے یہی کہتا ہے۔ زمین کے وہ تمام حصے جہاں یہ خدا کی معصیت کرتا تھا اس پر لعنت کرنے لگتے ہیں۔ شیطانی لشکر دوڑتا ہوا شیطان کے پاس پہنچتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم نے آج ایک کو جہنم میں پہنچادیا۔ اس کی قبر اس قدر تنگ ہوجاتی ہے کہ اس کی دائیں پسلیاں بائیں میں اور بائیں دائیں میں گھس جاتی ہیں۔ کالے ناگ بختی اونٹوں کے برابر اس کی قبر میں بھیجے جاتے ہیں جو اس کے کانوں اور اس کے پاؤں کے انگوٹھے سے اسے ڈسنا شروع کرتے ہیں اور اوپر چڑھتے آتے ہیں یہاں تک کہ وسط جسم میں مل جاتے ہیں۔ دو فرشتے بھیجے جاتے ہیں جن کی آنکھیں تیز بجلی جیسی جن کی آواز گرج جیسی جن کے دانت درندے جیسے جن کے سانس آگ کے شعلے جیسے جن کے بال پیروں کے نیچے تک جن کے دو مونڈھوں کے درمیان اتنی اتنی مسافت ہے جن کے دل میں رحمت و رحم کا نام و نشان بھی نہیں جن کا نام ہی منکر نکیر ہے۔ جن کے ہاتھ میں لوہے کے اتنے بڑے ہتھوڑے ہیں جنہیں ربیعہ اور مضر مل کر بھی نہیں اٹھا سکتے۔ وہ اسے کہتے ہیں اٹھ بیٹھ۔ یہ سیدھا بیٹھ جاتا ہے اور تہہ باندھنے کی جگہ اس کا کفن آپڑتا ہے۔ وہ اس سے پوچھتے ہیں تیرا رب کون ہے۔ تیرا دین کیا ہے۔ تیرا نبی کون ہے؟ یہ کہتا ہے مجھے تو کچھ خبر نہیں۔ وہ کہتے ہیں ہاں نہ تو نے معلوم کیا نہ تو نے پڑھا۔ پھر اس زور سے ہتھوڑا اسے مارتے ہیں کہ اس کے شرارے اس کی قبر کو پر کردیتے ہیں۔ پھر لوٹ کر اس سے کہتے ہیں اپنے اوپر کو دیکھ یہ ایک کھلا ہوا دروازہ دیکھتا ہے وہ کہتے ہیں واللہ اگر تو خدا کے فرماں بردار رہتا تو تیری یہ جگہ تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اب تو اسے وہ حسرت ہوتی ہے جو کبھی اس کے دل سے جدا نہیں ہونے کی۔ پھر وہ کہتے ہیں اب اپنے نیچے دیکھ۔ وہ دیکھتا ہے کہ ایک دروازہ جہنم کا کھلا ہوا ہے۔ فرشتے کہتے ہیں اے دشمن خدا۔ چوں کہ تو نے اللہ کی نامرضی کے کام کئے ہیں اب تیری جگہ یہ ہے۔ واللہ اس وقت اس کا دل رنج و افسوس سے بیٹھ جاتا ہے۔ جو صدمہ اسے کبھی بھولنے کا نہیں۔ اس کے لئے ستتر دروازے جہنم کے کھل جاتے ہیں جہاں سے گرم ہوا اور بھاپ اسے ہمیشہ ہی آیا کرتی ہے۔ یہاں تک کہ اسے اللہ تعالیٰ اٹھا بٹھائے۔ یہ حدیث بہت غریب ہے اور یہ سیاق بھی بہت عجیب ہے اور اس کا راوی یزید رقاشی جو حضرت انسؓ کے نیچے کا راوی ہے اس کی غرائب ومنکرات بہت ہیں اور ائمہ کے نزدیک وہ ضعیف الروایت ہے، واللہ اعلم۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول:

ابوداؤد میں ہے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی شخص کے دفن سے فارغ ہوتے تو وہاں ٹھہر جاتے اور فرماتے اپنے بھائی کے لئے استغفار کرو اور اس کے لئے ثابت قدمی طلب کرو اس وقت اس سے سوال ہو رہا ہے۔ حافظ ابن مردویہ نے فرمان باری وَلَوْتَرٰٓی اِذِالظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ الخ کی تفسیر میں ایک بہت لمبی حدیث وارد کی ہے، وہ بھی غرائب سے پر ہے۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

قبر کا عذاب وثواب قرآن وحدیث سے ثابت ہے:

حدیث یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب قبر میں مومن سے سوال کیا جائے گا تو ایسے ہولناک مقام اور سخت حال میں بھی وہ بتائید ربانی اس کلمہ پر قائم رہے گا اور لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دے گا اور پھر فرمایا کہ ارشاد قرآنی یُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ کا یہی مطلب ہے۔ (یہ روایت حدیث حضرت براء بن عازبؓ نے نقل فرمائی)۔ اسی طرح تقریباً چالیس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے معتبر اسانید کے ساتھ اسی مضمون کی حدیثیں منقول ہیں جن کو امام ابن کثیر نے اس جگہ اپنی تفسیر میں جمع کیا ہے اور شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے اپنے منظوم رسالہ التثبیت عند التبییت میں اور شرح الصدور میں ستر احادیث کا حوالہ نقل کر کے ان روایات کو متواتر فرمایا ہے ان سب حضرات صحابہ کرام نے آیت مذکورہ میں آخرت سے مراد قبر اس آیت کو قبر کے عذاب وثواب سے متعلق قرار دیا ہے۔

مرنے اور دفن ہونے کے بعد قبر میں انسان کا دوبارہ زندہ ہو کر فرشتوں کے سوالات کا جواب دینا پھر اس امتحان میں کامیابی اور ناکامی پر ثواب یا عذاب کا ہونا قرآن مجید کی تقریباً دس آیات میں اشارۃً اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ستر احادیث متواترہ میں بڑی صراحت و وضاحت کے ساتھ مذکور ہے جس میں مسلمان کو شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہی۔ (معارف القرآن)

اجمالاً اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ کسی چیز کا نظر نہ آنا اس کے موجود نہ ہونے کی دلیل نہیں ہوتی۔ جنات اور فرشتے بھی کسی کو نظر نہیں آتے مگر موجود ہیں۔ ہوا نظر نہیں آتی مگر موجود ہے جس کائناتی فضا کا اس زمانہ میں راکٹوں کے ذریعہ مشاہدہ ہو رہا ہے وہ اب سے پہلے کسی کو نظر نہ آتی تھی مگر موجود تھی، خواب دیکھنے والا خواب میں کسی مصیبت میں گرفتار ہو کر سخت عذاب میں بے چین ہوتا ہے مگر پاس بیٹھنے والوں کو اس کی کچھ خبر نہیں ہوتی۔

اصول کی بات یہ ہے کہ ایک عالم کو دوسرے عالم کے حالات پر قیاس کرنا خود غلط ہے جب خالق کائنات نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دوسرے عالم میں پہنچنے کے بعد اس عذاب وثواب کی خبر دیدی تو اس

پر ایمان واعتقاد رکھنا لازم ہے۔

آخر آیت میں فرمایا وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ، یعنی اللہ تعالیٰ مؤمنین کو تو کلمہ طیبہ اور قول ثابت پر ثابت قدم رکھتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں قبر ہی سے ان کے لئے راحت کے سامان جمع ہو جاتے ہیں مگر ظالموں یعنی کفار و مشرکین کو یہ خداوندی نصرت وامداد نہیں ملتی، منکر نکیر کے سوالات کا صحیح جواب نہیں دے سکتے ، اور انجام کار ابھی سے ایک قسم کے عذاب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ
اور بچلا (راہ بھلا دیتا ہے) دیتا ہے اللہ بے انصافوں کو

بے انصافوں سے مراد یہاں کفار و مشرکین ہیں وہ دنیا میں بھی بچلے اور اخیر تک بچلتے رہیں گے۔ کبھی حقیقی کامیابی کا رستہ ہاتھ نہ لگے گا۔ (تفسیر عثمانی)

وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ﴿۲۷﴾
اور کرتا ہے اللہ جو چاہے

مشیت خداوندی:

یعنی اپنی حکمت کے موافق جیسا معاملہ جس کے ساتھ مناسب ہوتا ہے کرتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ۔ اور اللہ جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے۔ کسی کو ایمان کی توفیق دیتا ہے کسی کو توفیق ایمان سے محروم رکھتا ہے کسی کو ایمان پر قائم رکھتا ہے کسی کو قائم نہیں رکھتا اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت ابو درداءؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ نے آدمؑ کو پیدا کیا، پیدا کرنے کے بعد ان کے دائیں شانہ پر ہاتھ مارا اور ان کی گوری نسل باہر آ گئی۔ گویا (کثرت میں) وہ چھوٹی چیونٹوں کی طرح تھی اور بائیں شانہ پر ہاتھ مارا تو کالی نسل جیسے کوئلہ باہر آ گئی پھر اس نسل کے متعلق جو دائیں شانہ میں تھی فرمایا (یہ) جنت کی طرف (جانے والے ہیں) اور مجھے پروا نہیں اور اس نسل کے متعلق جو بائیں شانہ میں تھی فرمایا (یہ) دوزخ کی طرف (جانے والے ہیں) اور مجھے پروا نہیں۔

حضرت ابی بن کعبؓ روای ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تمام آسمان و زمین والوں کو اللہ عذاب دے تو وہ عذاب دے سکتا ہے اور وہ ظالم نہیں ہوگا اور اگر سب پر رحم فرمائے گا تو اس کی رحمت ان کے اعمال سے ان کے لئے بہتر ہوگی اگر (کوہ) احد کے برابر سونا تم راہ خدا میں دے دو تو جب تک تقدیر پر تمہارا ایمان نہ ہوگا اللہ اس کو قبول نہیں فرمائے گا اور جان لو کہ جو کچھ تم کو پہنچے گا۔ وہ تم سے چوکنے والا نہیں اور جو کچھ نہیں پہنچے گا وہ کسی طرح پہنچنے والا نہیں۔ اگر اس کے خلاف عقیدہ پر مرو گے تو دوزخ میں جاؤ گے۔ حضرت ابن مسعودؓ حضرت حذیفہ بن یمانؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ سے بھی اسی طرح کی احادیث منقول ہیں۔ رواہ احمد وابن ماجۃ۔ (تفسیر مظہری)

وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ۔ ''یعنی اللہ تعالیٰ کرتا ہے جو چاہتا ہے'' کوئی طاقت نہیں جو اس کے ارادہ اور مشیت کو روک سکے۔

ضروری عقیدہ:

حضرت ابی بن کعبؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، حذیفہ بن یمانؓ وغیرہ حضرات صحابہؓ نے فرمایا ہے کہ مؤمن کو اس کا اعتقاد لازم ہے کہ اس کو جو چیز حاصل ہوئی وہ اللہ کی مشیت اور ارادہ سے حاصل ہوئی، اس کا ٹلنا ناممکن تھا اسی طرح جو چیز حاصل نہیں ہوئی اس کا حاصل ہونا ممکن نہ تھا اور فرمایا کہ اگر تمہیں اس پر یقین واعتماد نہ ہو تو تمہارا ٹھکانا جہنم ہے۔ (معارف مفتی اعظم)

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا
تو نے نہ دیکھا ان کو جنہوں نے بدلہ کیا اللہ کے احسان کا ناشکری
وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴿۲۸﴾
اور اتارا اپنی قوم کو تباہی کے گھر میں

سرداران قریش:

اس سے کفار و مشرکین کے سردار مراد ہیں، خصوصاً رؤسائے قریش جن کے ہاتھ میں اس وقت عرب کی باگ تھی یعنی حق تعالیٰ نے ان پر کیسے احسان کئے ان کی ہدایت کے لئے پیغمبر علیہ السلام کو بھیجا، قرآن اتارا اپنے حرم اور بیت کا مجاور بنایا، عرب کی سرداری دی، انہوں نے ان نعمتوں اور احسانات کا بدلہ یہ کیا کہ خدا کی ناشکری پر کمربستہ ہو گئے اس کی باتوں کو جھٹلایا اس کے پیغمبر سے لڑائی کی، آخر اپنی قوم کو لیکر تباہی کے گڑھے میں جا گرے۔ (تفسیر عثمانی)

بخاری نے صحیح بخاری میں حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ واللہ وہ کفار قریش تھے (یعنی کفار قریش آیت میں مراد ہیں) حضرت عمرؓ نے فرمایا وہ (ناشکرے) قریش تھے اور اللہ کی نعمت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تھی۔ ابن جریر نے عطاء بن یسار کا قول نقل کیا ہے کہ بدر کی جنگ میں جو لوگ مکہ والوں میں سے مارے گئے وہ مراد ہیں اللہ نے ان کو پیدا کیا حرم کا ساکن بنایا جہاں ہر طرف سے پھل اور غلہ لایا جاتا تھا۔ (اور چین کے ساتھ مکہ والے بیٹھے کھاتے تھے) اصحاب فیل (نے جب کعبہ پر چڑھائی کی تو اللہ نے ان) کو مکہ والوں کی طرف سے دفع کیا ان کے لیے رزق کے دروازے کھول دیئے (شام و یمن کو) سردی و گرمی کے زمانہ میں سفر کرنے کا ان کو خوگر اور مانوس بنایا (تا کہ غلہ، پھل، کپڑا اور ہر ضرورت کی چیزان کو بافراط مل سکے) اور انہی میں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول بنا کر بھیجا۔ تا کہ آپ ان کو قرآن پڑھ

کر سنائیں ان کے عقائد واخلاق کو پاکیزہ اور ستھرا بنائیں اوران کو قرآن وحکمت کی تعلیم دیں اور تمام لوگوں کوان کا تابع بنایا لیکن انہوں نے ان تمام نعمتوں کی ناشکری کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن بن گئے اور ہدایت کو چھوڑ کر گمراہی پر قائم رہے۔ آخر قحط ہفت سالہ میں مبتلا ہوئے اور بدر کے دن قید بھی ہوئے اور مارے بھی گئے اور ذلیل بھی ہوئے اور مرتے دم تک اللہ کی مذکورہ نعمتوں سے محروم ہو گئے۔ (تفسیر مظہری)

جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۖ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿٢٩﴾ وَجَعَلُوا

جو دوزخ ہے داخل ہونگے اس میں اور وہ برا ٹھکانا ہے اور ٹھہرائے

لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلُّوا عَنْ سَبِيْلِهٖ ۗ

اللہ کے لئے مقابل کہ بہکائیں لوگوں کو اس کی راہ سے

یعنی خدا کے احسانات سے متاثر ہو کر منعم حقیقی کی شکر گزاری اور اطاعت شعاری میں لگتے، یہ تو نہ ہوا الٹے بغاوت پر کمر بستہ ہو گئے، خدا کے مقابل دوسری چیزیں کھڑی کر دیں جن پر خدائی اختیارات تقسیم کئے اور عبادت جو خدائے واحد کا حق تھا، وہ مختلف عنوانوں سے ان کے لئے ثابت کرنے لگے تا اس سلسلہ میں اپنے ساتھ دوسروں کی راہ ماریں اور انہیں بہکا کر اپنے دام سیادت میں پھنسائے رکھیں۔ (تفسیر عثمانی)

بنی مغیرہ اور بنی امیہ:

ابن مردویہ کی روایت ہے کہ حضرت ابن عباس نے حضرت عمرؓ سے عرض کیا امیر المومنین آیت اَلَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا میں کون لوگ مراد ہیں حضرت عمرؓ نے فرمایا قریش کے وہ دو (قبیلے) جو سب سے زیادہ بدکار تھے۔ بنی مغیرہ اور بنی امیہ۔ بنی مغیرہ کے شر سے تو بدر کی لڑائی میں تمہاری حفاظت ہو چکی (یعنی بدر میں ان کا زور ٹوٹ گیا) اور بنی امیہ کو ایک وقت تک مزے اڑانے کا موقع دیا گیا ہے۔ بغوی نے بھی اسی طرح حضرت عمرؓ کا قول نقل کیا ہے:

ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، طبرانی، حاکم اور ابن مردویہ نے اسی طرح کا قول حضرت علیؓ کا بھی مختلف روایات سے نقل کیا ہے اور حاکم نے اسکو صحیح بھی کہا ہے۔

میں کہتا ہوں بنی امیہ کو حالت کفر میں مزے اڑانے کو موقع دیا گیا۔ یہاں تک کہ ابوسفیان معاویہؓ اور عمرو بن عاصؓ وغیرہ مسلمان ہو گئے پھر یزید اور اس کے ساتھیوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی اور اہل بیت کی دشمنی کا جھنڈا انہوں نے بلند کیا آخر حضرت حسینؓ کو ظلماً شہید کر دیا اور یزید نے دین محمدی کا ہی انکار کر دیا اور حضرت حسینؓ کو شہید کر چکا تو چند اشعار پڑھے جن کا مضمون یہ تھا آج میرے اسلاف ہوتے تو دیکھتے کہ میں نے آل محمد اور بنی ہاشم سے ان کا کیسا بدلہ لیا۔ یزید نے جو اشعار کہے تھے ان میں آخری شعر یہ تھا:

ولست من جندب ان لم انتقم
من بنی احمد ماکان فعل

احمد نے جو کچھ (ہمارے بزرگوں کے ساتھ بدر میں) کیا اگر احمد کی اولاد سے میں نے اس کا انتقام نہ لیا تو میں بنی جندب سے نہیں ہوں۔)

یزید نے شراب کو بھی حلال قرار دیدیا تھا شراب کی تعریف میں چند شعر کہنے کے بعد آخری شعر میں اس نے کہا تھا:

فان حرمت یوماعلیٰ دین احمد
فخذ ھاعلیٰ دین المسیح بن مریم

(اگر شراب دین احمد میں حرام ہے تو (ہونے دو) مسیح بن مریم کے دین (یعنی عیسائیت) کے مطابق تم اس کو (حلال سمجھ کر) لے لو۔)

اور اس کے ساتھیوں اور جانشینوں کے یہ مزے ایک ہزار مہینے تک رہے اس کے بعد ان میں سے کوئی نہیں بچا۔ (تفسیر مظہری)

قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ ﴿٣٠﴾

تو کہہ مزا اڑا لو پھر تم کو لوٹنا ہے طرف آگ کی

عذاب کی دھمکی:

یعنی بہتر ہے۔ بیوقوفوں کو جال میں پھنسا کر چند روز جی خوش کر لو اور دنیا کے مزے اڑا لو، مگر تا کجے آخر دوزخ کی آگ میں ہمیشہ رہنا ہے۔ کیونکہ اس مزے اڑانے کا یہ ہی نتیجہ ہوگا۔ گویا یہ جملہ ایسا ہوا جیسے ایک طبیب کسی بد پرہیز مریض کو خفا ہو کر کہے "کل ماترید فان مصیرک الی الموت" جو تیرا جی چاہے کھا کیونکہ ایک دن یہ مرض تیری جان لے کر رہیگا۔ (تفسیر عثمانی)

جہاں تک ممکن ہو آدمی اپنی نفسانی خواہشات سے بہرہ اندوز ہو۔

تمتعو اگرچہ امر کا صیغہ ہے لیکن امر سے مراد حکم نہیں ہے بلکہ یہ ایک تہدید اور عذاب کی دھمکی ہے اور اس بات کی اطلاع ہے کہ تمہاری یہ گمراہیاں تم کو عذاب میں لے جائیں گی۔ اسی لئے امر کے بعد فرمایا کہ آخر تم کو دوزخ میں جانا ہے گویا دوزخ میں جانے کا تم کو حکم دے دیا گیا ہے۔ (تفسیر مظہری)

قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ

کہہ دے میرے بندوں کو جو ایمان لائے ہیں قائم رکھیں نماز اور خرچ

وَيُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً

کریں ہماری دی ہوئی روزی میں سے پوشیدہ (چھپے اور کھلے) اور ظاہر

اہل ایمان کو تنبیہ:

کفار کے احوال ذکر کرنے کے بعد مؤمنین مخلصین کو متنبہ فرماتے ہیں کہ وہ پوری طرح بیدار رہیں، وظائف عبودیت میں ذرا فرق نہ آنے دیں، دل و جان سے خالق کی عبادت اور مخلوق کی خدمت کریں کہ وہ بھی بہترین عبادت ہے۔ نمازوں کو انکے حقوق وحدود کی رعایت کے ساتھ خشوع وخضوع سے ادا کرتے رہیں۔ خدا نے جو کچھ دیا ہے اس کا ایک حصہ خفیہ یا علانیہ مستحقین پر خرچ کریں۔ غرض کفار جو شرک اور کفران نعمت پر تلے ہوئے ہیں ان کے بالمقابل مؤمنین کو جان و مال سے حق تعالیٰ کی طاعت وشکرگزاری میں مستعدی دکھلانا چاہیے۔ (تفسیر عثانی)

سِرًّا وَّعَلَانِيَةً (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ صلی اللہ علیہ وسلم میرے ان بندوں سے جو ایمان لے آئے ہیں کہہ دیجئے کہ وہ نمازیں قائم کریں اور جو کچھ ہم نے ان کو عطا کیا ہے اس میں سے پوشیدہ اور ظاہر طور پر راہ خدا میں کچھ خرچ کریں۔ اہل ایمان کو خصوصی طور پر نماز پڑھنے اور راہ خدا میں خرچ کرنے کی ہدایت کرنے کا حکم دیا اور مؤمنوں کو خاص طور پر عبادی فرمایا اور اپنے بندے قرار دیا اس سب سے مقصود اہل ایمان کی عزت افزائی ہے۔ اور اس امر پر تنبیہ کرنی مقصود ہے کہ اہل ایمان ہی حقیقتاً حقوق عبدیت کو ادا کرنے اور تعمیل احکام کرنے والے ہیں وہ امر کی تعمیل کریں گے۔ (تفسیر مظہری)

مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ
پہلے اس سے کہ آئے وہ دن جس میں نہ سودا (خرید وفروخت)
وَلَا خِلٰلٌ ﴿۳۱﴾
ہے نہ دوستی

قیامت میں پہلے نیکیاں کام آئیں گی:

یعنی نماز اور انفاق فی سبیل اللہ وغیرہ نیکیاں اس دن کام آئینگی، بیع وشراء یا محض دوستانہ تعلقات سے کام نہ نکلے گا۔ یعنی نہ وہاں نیک عمل کہیں سے خرید کر لاسکو گے نہ کوئی ایسا دوست بیٹھا ہے جو بدون ایمان وعمل صالح کے محض دوستانہ تعلقات کی بناء پر نجات کی ذمہ داری کرلے (ربط) پہلے کفار کی ناشکری کا ذکر تھا پھر مؤمنین کو مراسم طاعت کی اقامت کا حکم دیکر شکرگزاری کی طرف ابھارا۔ آگے چند عظیم الشان نعمائے الٰہیہ کا ذکر فرماتے ہیں جو ہر مؤمن وکافر کے حق میں عام ہیں، تاانہیں سن کو مؤمنین کو شکرگزاری کی مزید ترغیب ہو اور کفار بھی غور کریں۔ تو اپنے دل میں شرمائیں کہ وہ کیسے بڑے منعم ومحسن شہنشاہ سے بغاوت کررہے ہیں۔ اسی ضمن میں خدا تعالیٰ کی عظمت ووحدانیت کے دلائل بھی بیان ہوگئے۔ ممکن ہے انہیں سن کر کوئی عاقل منصف شرکیات سے باز آجائے یا عظمت وجبروت کے نشانات میں غور کرکے اس کی گرفت اور سزا سے ڈر جائے۔ (تفسیر عثانی)

مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ۔ قبل اس کے کہ وہ دن آجائے کہ اس میں نہ خرید وفروخت ہوگی (کہ کوئی قصوروار کوئی ایسی چیز خرید کر دیدے جو اس کے قصور کا بدلہ ہو سکے) اور نہ کوئی دوستی ہوگی (کہ دوست اپنے دوست کی سفارش کرکے بچالے)۔ (تفسیر مظہری)

اعلانیہ اور خفیہ عمل:

بعض علماء نے فرمایا کہ زکوٰۃ فرض، صدقۃ الفطر وغیرہ علانیہ ہونے چاہئیں تاکہ دوسروں کو بھی ترغیب ہو، اور نفلی صدقہ خیرات کو پوشیدہ دینا بہتر ہے کہ نام ونمود کا خطرہ نہ رہے، اور اصل مدار نیت اور حالات پر ہے اگر اعلان واظہار میں نام ونمود کا شائبہ آجائے تو صدقہ کی فضیلت ختم ہوجاتی ہے خواہ فرض ہو یا نفل اور اگر نیت یہ ہو کہ دوسروں کو بھی ترغیب ہو تو فرض اور نفل دونوں میں اعلان واظہار جائز ہے۔

"خُلَّةٌ" کا معنی:

مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ لفظ خلال، خلۃ کی جمع بھی ہوسکتی ہے جس کے معنی بے غرض دوستی کے ہیں، اور اس لفظ کو باب مفاعلۃ کا مصدر بھی کہہ سکتے ہیں جیسے قتال، دفاع وغیرہ اس صورت میں اس کے معنی دو شخصوں کے آپس میں دونوں طرف سے مخلصانہ دوستی کرنے کے ہوں گے، اس جملہ کا تعلق اوپر کے بیان کئے ہوئے دونوں حکم یعنی نماز اور صدقہ کے ساتھ ہے۔

مطلب یہ ہے کہ آج تو اللہ تعالیٰ نے طاقت، فرصت عطا فرما رکھی ہے کہ نماز ادا کریں اور اگر پچھلی عمر میں غفلت سے کوئی نماز رہ گئی ہے تو اس کی قضاء کریں اسی طرح آج مال تمہاری ملک اور قبضہ میں ہے اس کو اللہ کے لئے خرچ کرکے دائمی زندگی کا کام بنا سکتے ہو لیکن وہ دن قریب آنے والا ہے جب کہ یہ دونوں قوتیں اور قدرتیں تم سے لے لی جائیں گی نہ تمہارے بدن نماز پڑھنے کے قابل رہیں گے نہ تمہاری ملک اور قبضہ میں کوئی مال رہے گا جس سے ضائع شدہ حقوق کی ادائیگی کرسکو، اور اس دن میں کوئی بیع وشراء اور خرید وفروخت بھی نہ ہوسکے گی کہ آپ کوئی ایسی چیز خرید لیں جس کے ذریعہ اپنی کوتاہیوں اور گناہوں کا کفارہ کرسکیں، اور اس دن میں آپس کی دوستیاں اور تعلقات بھی کام نہ آسکیں گے کوئی عزیز دوست کسی کے گناہوں کا بار نہ اٹھا سکے گا اور نہ اس کے عذاب کو کسی طرح ہٹا سکے گا۔

موت کا دن:

"اس دن" سے مراد بظاہر حشر وقیامت کا دن ہے اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ موت

کا دن ہو، کیونکہ یہ سب آثار موت ہی کے وقت ظاہر ہوجاتے ہیں نہ بدن میں کسی عمل کی صلاحیت رہتی ہے نہ مال ہی اس کی ملک میں رہتا ہے۔ (معارف مفتی اعظم)

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ

اللہ وہ ہے جس نے بنائے آسمان اور زمین اور اتارا آسمان سے پانی

مِنَ السَّمَآءِ مَآءً

پانی کا اترنا:

یعنی آسمان کی طرف سے پانی اتارا یا یہ مطلب ہو کہ بارش کے آنے میں بخارات وغیرہ ظاہری اسباب کے علاوہ غیر مرئی سماوی اسباب کو بھی دخل ہے۔ دیکھو آفتاب کی شعاعیں تمام اشیا کی طرح آتشیں شیشہ پر بھی پڑتی ہیں لیکن وہ اپنی مخصوص ساخت اور استعداد کی بدولت انہی شعاعوں سے غیر مرئی طور پر اس درجہ حرارت کا استفادہ کرتا ہے جو دوسری چیزیں نہیں کرتیں۔ چاند سمندر سے کتنی دور ہے مگر اس کے گھٹنے بڑھنے سے سمندر کے پانی میں جزر و مد پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر بادل بھی کسی سماوی خزانہ سے غیر محسوس طریقہ پر مستفید ہوتا ہو تو انکار کی کونسی وجہ ہے۔ (تفسیر عثمانی)

فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ

پھر اس سے نکالی روزی تمہاری میوے

جوہر حیات:

یعنی حق تعالیٰ نے اپنے کمال قدرت وحکمت سے پانی میں ایک قوت رکھی جو درختوں اور کھیتوں کے نشو ونما اور باوآور ہونے کا سبب بنتی ہیں۔ اسی کے ذریعہ سے پھل اور میوے ہمیں کھانے کو ملتے ہیں۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ

اور کہنے (کام میں دیں تمہارے کشتیاں کہ چلیں) میں کیا تمہارے کشتی کو کہ چلے دریا میں اس کے حکم سے

سمندروں کی تسخیر:

یعنی سمندر کی خوفناک لہروں میں ذرا سی کشتی پر سوار ہو کر کہاں سے کہاں پہنچتے ہیں اور کس قدر تجارتی یا غیر تجارتی فوائد حاصل کرتے ہو یہ خدا ہی کی قدرت اور حکم سے ہے۔ کہ سمندر کے تھپیڑوں میں ذرا سی ڈونگی کو ہم جدھر چاہیں لئے پھرتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ﴿۳۲﴾ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ

اور کام میں لگایا (دیں) تمہارے ندیوں (ندیاں) کو اور کام میں لگا دیا تمہارے

وَالْقَمَرَ دَآئِبَیْنِ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ ﴿۳۳﴾

سورج اور چاند کو ایک دستور پر برابر اور کام میں لگا دیا تمہارے رات اور دن کو

یعنی ندیوں میں پانی کا آنا اور کہیں سے کہیں پہنچنا گوشتی کی طرح تمہارے کہنے میں نہیں، تاہم تمہارے کام میں وہ بھی لگی ہوئی ہیں۔

سورج چاند کی تسخیر:

اسی طرح چاند سورج جو ایک معین نظام اور ضابطہ کے موافق برابر چل رہے ہیں کبھی تھکتے نہیں نہ رفتار میں فرق پڑتا ہے۔ یا رات اور دن ایک دوسرے کے پیچھے ٹھہری ہوئی عادت کے موافق ہمیشہ چلے آتے ہیں یہ سب چیزیں گو اس معنی سے تمہارے قبضہ میں نہیں کہ تم جب چاہو اور جدھر چاہو ان کی قدرتی حرکت وتاثیر کو پھیر دو تاہم تم بہت سے تصرفات وتدابیر کر کے ان کے اثرات سے بیشمار فوائد حاصل کرتے ہو اور انسانی تصرف وتدبیر سے قطع نظر کر کے بھی وہ قدرتی طور پر ہر وقت تمہاری کسی نہ کسی خدمت میں لگے ہوئے ہیں، تم سوتے ہو وہ تمہارا کام کرتے ہیں تم چین سے بیٹھے ہو وہ تمہارے لئے سرگرداں ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

مسخر کر دینے کا مطلب:

پھر فرمایا کہ اللہ جل شانہٗ نے ہی کشتیوں اور جہازوں کو تمہارے کام میں لگا دیا کہ وہ اللہ کے حکم سے دریاؤں میں چلتے پھرتے ہیں۔ لفظ سخر جو اس آیت میں آیا ہے اس سے مراد یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کا استعمال تمہارے لئے آسان کر دیا ہے لکڑی، لوہا اور ان سے کشتی جہاز بنانے کے اوزار وآلات اور ان سے صحیح کام لینے کی عقل ودانش یہ سب چیزیں اسی کی دی ہوئی ہیں اس لئے ان چیزوں کے موجد اس پر ناز نہ کریں، کہ یہ ہم نے ایجاد کی یا بنائی ہے کیونکہ جن چیزوں سے ان میں کام لیا گیا ہے ان میں کوئی چیز بھی نہ تم نے پیدا کی ہے نہ کر سکتے ہو، خالق کائنات کی بنائی ہوئی لکڑی، لوہے، تانبے اور پیتل ہی میں تصرفات کر کے یہ ایجاد کا سہرا آپ نے اپنے سر لیا ہے، ورنہ حقیقت دیکھو تو خود آپ کا اپنا وجود اپنے ہاتھ پاؤں، اپنا دماغ اور عقل بھی تو آپ کی بنائی ہوئی نہیں۔

اس کے بعد فرمایا کہ ہم نے تمہارے لئے سورج اور چاند کو مسخر کر دیا کہ یہ دونوں ہمیشہ ایک حالت پر چلتے ہی رہتے ہیں، دائبین، داب سے مشتق ہے، جس کے معنی عادت کے ہیں مراد یہ ہے کہ ہر وقت اور ہر حال میں چلنا

ان دونوں سیاروں کی عادت بنادی گئی کہ کبھی اس کے خلاف نہیں ہوتا مسخر کرنے کے یہ معنی نہیں کہ وہ تمہارے حکم اور اشاروں پر چلا کریں۔ اگر شمس وقمر کو اس طرح انسان کا مسخر کردیا جاتا کہ وہ انسانی حکم کے تابع چلا کرتے تو انسانوں کے باہمی اختلاف کا یہ نتیجہ ہوتا کہ ایک انسان کہتا کہ آج آفتاب دو گھنٹے بعد نکلے کیونکہ رات میں کام زیادہ ہے، دوسرا چاہتا کہ دو گھنٹے پہلے نکلے کہ دن کے کام زیادہ ہیں اس لئے رب العزت جل شانہٗ نے آسمان اور ستاروں کو انسان کا مسخر تو بنایا، مگر اس معنی سے مسخر کیا کہ وہ ہر وقت ہر حال میں حکمت خداوندی کے ماتحت انسان کے کام میں لگے ہوئے ہیں، یہ نہیں کہ ان کا طلوع وغروب اور رفتار انسان کی مرضی کے تابع ہوجائے۔

اسی طرح یہ ارشاد کہ ہم نے رات اور دن کو تمہارے لئے مسخر کردیا، اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ ان دونوں کو انسان کی خدمت اور راحت کے کام میں لگا دیا۔

وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ "یعنی اللہ تعالیٰ نے دیا تم کو ہر اس چیز میں سے جو تم نے مانگی"۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کی عطاء اور بخشش کسی کے مانگنے پر موقوف نہیں، ہم نے تو اپنا وجود بھی نہیں مانگا تھا اسی نے اپنے فضل سے بے مانگے عطا فرمایا۔

ما نبود یم وتقاضا ما نبود　　　لطف تو نا گفتہ ما می شنود

اسی طرح آسمان، زمین، چاند، سورج وغیرہ پیدا کرنے کی دعا کس نے مانگی تھی، یہ سب کچھ مالک نے بے مانگے ہی دیا ہے، اسی لئے قاضی بیضاوی نے اس لفظ کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو ہر وہ چیز دیدی جو مانگنے کے قابل ہے اگرچہ تم نے مانگا نہ ہو۔ (معارف القرآن، مفتی اعظم)

وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ط

اور دیا تم کو ہر چیز میں سے جو تم نے مانگی

تمام ضرورتوں کی کفالت:

یعنی جو چیزیں تم نے زبان قال یا حال سے طلب کیں ان میں سے ہر چیز کا جس قدر حصہ حکمت ومصلحت کے موافق تھا مجموعی طور پر تم سب کو دیا۔ (تفسیر عثمانی)

بیضاوی نے لکھا ہے شاید مراد یہ ہے کہ تمہاری ضرورتوں کا جو تقاضا تھا اور تمہاری حاجتیں (فطری طور پر جس چیز کی خواہش مند تھیں وہ سب کچھ تم کو دیا خواہ زبان سے تم نے مانگا ہو یا نہ مانگا۔ لفظ کل کثرت کے اظہار کے لئے استعمال کیا گیا ہے (استغراق حقیقی مراد نہیں ہے) جیسے محاورے میں بولا جاتا ہے۔ فلاں شخص سب کچھ جانتا ہے (یعنی بقدر ضرورت) اس کے پاس ہر شخص آگیا یعنی بہت آدمی آگئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ یعنی بہت چیزوں کے دروازے ہم نے ان پر کھول دیئے۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ط

اور اگر گنو احسان اللہ کے نہ پورے کرسکو

بے شمار نعمتیں:

یعنی خدا کی نعمتیں اتنی بیشمار بلکہ غیر متناہی ہیں کہ اگر تم سب ملکر اجمالاً ہی گنتی شروع کرو تو تھک کر اور عاجز ہو کر بیٹھ جاؤ۔ اس موقع پر امام رازیؒ نے نعمائے الٰہیہ کا بیشمار ہونا، اور علامہ ابوالسعودؒ نے ان کا غیر متناہی ہونا ذرا بسط سے بیان فرمایا ہے اور صاحب روح المعانی نے ان کے بیانات پر مفید اضافہ کیا۔ یہاں اس قدر تطویل کی گنجائش نہیں۔　(تفسیر عثمانی)

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گنو گے تو پوری گنتی نہیں کرسکتے یعنی ان کے انواع واقسام کو بھی نہیں گن سکتے افراد کا تو ذکر ہی کیا ہے افراد نعمت تو ان گنت ہیں ان سب کا شکر ادا کرنا تمہاری طاقت سے باہر ہے لیکن اللہ نے اپنے کرم سے ادائے شکر نہ کرسکنے کے اقرار کو ہی اہل ایمان کے لئے شکر کے قائم مقام قرار دیدیا ہے اور جو لوگ شکر سے عاجزی کا اقرار کرتے ہیں ان کو اپنا شکر گزار بندہ فرمایا ہے اور جو لوگ شکر نہ کرسکنے کے باوجود اپنی عاجزی کا اقرار نہیں کرتے ان کے متعلق فرمایا ہے۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ۔ بیشک انسان بے صبرا ناشکرا ہے سختی اور مصیبت میں اللہ کا شکوہ کرتا اور بے صبری کا اظہار کرتا ہے اور نہیں جانتا کہ اس کا رب جواد ہے کریم ہے حکیم ہے یہ مصیبت بھی پر از مصلحت ہے تقاضائے حکمت ہے، خواہ اس کی حکمت سمجھ میں نہ آئے اور آسائش ونعمت ملتی ہے تو آدمی شکر ادا نہیں کرتا۔ ناشکرے کی ضد شکر گزار ہے ظاہر ہے کہ شکر اور عدم شکر باہم ضد ہیں اور بالواسطہ ظلم کی ضد کو صبر کہا جاتا ہے کیونکہ ظلم کا لغوی معنی ہے کسی چیز کو بے محل رکھدینا مصیبت پر صبر کرنا برمحل ہے مصیبت کا تقاضا صبر ہے پس اگر مصیبت پر صبر نہ کیا جائے بے صبری کے ساتھ شکایت کرنے لگے تو یہ ظلم ہوجائے گا اسی وجہ سے آیت میں ظلوم سے مجازاً مراد ہے بے صبرا۔ بعض علماء نے کہا کہ انسان کو ظلوم کہنے کی وجہ یہ ہے کہ گناہ کر کے آدمی اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے دنیا اور آخرت میں مبتلائے عذاب ہوجانے کے اسباب فراہم کردیتا ہے یا یوں کہو کہ شکر نعمت کو ترک کر کے آدمی اپنے نفس کو نعمت سے محروم کردیتا ہے یہی اپنے نفس پر ظلم ہوا یا یوں کہا جائے کہ ناشکرا آدمی نعمت پر ظلم کرتا ہے کہ اس کا شکر ادا نہیں کرتا۔ یا غیر منعم کا شکریہ ادا کرتا ہے اور منعمِ حقیقی کا شکر نہیں کرتا تو اس طرح شکر کا استعمال بے محل کرتا ہے ایک حدیث میں آیا ہے کہ اللہ نے فرمایا میرے اور جن وانس کے معاملات عجیب ہیں۔ میں پیدا کرتا ہوں اور وہ

دوسروں کو پوجتے ہیں ، میں رزق دیتا ہوں اور وہ دوسروں کا شکر ادا کرتے ہیں۔ رواہ الحاکم والبیہقی عن ابی الدرداءؓ۔ (تفسیر مظہری)

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ﴿۳۴﴾
بے شک آدمی بڑا بے انصاف ہے ناشکر

بے انصاف انسان:

یعنی جنس انسان میں بہتیرے بے انصاف اور ناسپاس ہیں جو اتنے بیشمار احسانات دیکھ کر بھی منعم حقیقی کا حق نہیں پہچانتے۔ (تفسیر عثمانی)

صبح شام استغفار:

طلق بن حبیب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ خدا کا حق اس سے بہت بھاری ہے کہ بندے اسے ادا کرسکیں اور خدا کی نعمتیں اس سے بہت زیادہ ہیں کہ بندے ان کی گنتی کرسکیں لوگو صبح شام توبہ استغفار کرتے رہو۔ صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ خدایا تیرے ہی لئے سب حمد وثنا سزاوار ہے۔ ہماری ثنائیں ناکافی ہیں۔ پوری اور بے پرواہ کرنے والی نہیں۔ خدایا تو معاف فرما۔

تین رجسٹر:

بزار میں آپ کا فرمان ہے کہ قیامت کے دن انسان کے تین دیوان نکلیں گے ایک میں نیکیاں لکھی ہوئی ہونگی، دوسرے میں گناہ ہوں گے، تیسرے میں خدا کی نعمتیں ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ اپنی نعمتوں میں سے سب سے چھوٹی نعمت سے فرمائے گا کہ اٹھ اور اپنا معاوضہ اس کے نیک اعمال سے لے لے۔ اس سے اس کے سارے ہی عمل ختم ہوجائینگے۔ پھر بھی وہ یکسو ہوکر کہے گی کہ باری تعالیٰ میری پوری قیمت وصول نہیں ہوئی۔ خیال کیجئے ابھی گناہوں کا دیوان یونہی الگ تھلگ رکھا ہوا ہے اور تمام نعمتوں کا دیوان بھی یونہی رکھا ہوا ہے۔ اگر بندے پر خدا کا ارادہ رحم وکرم کا ہوا تو اب وہ اس کی نیکیاں بڑھادے گا اور اس کے گناہوں سے تجاوز کرجائیگا اور اس سے فرمادیگا کہ میں نے اپنی نعمتیں تجھے بغیر بدلے کے بخش دی۔ اس کی سند ضعیف ہے۔ مروی ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے خدائے تعالیٰ جل وعلا سے دریافت کیا کہ میں تیرا شکر کیسے ادا کروں؟ شکر کرنا خود بھی تو تیری ایک نعمت ہے۔ جواب ملا کہ داؤد اب تو شکر ادا کرچکا جبکہ تو نے یہ جان لیا اور اس کا اقرار کرلیا کہ تو میری نعمتوں کے شکر کی ادائیگی سے قاصر ہے۔

انسانوں کی ناشکری:

آخر آیت میں فرمایا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ، یعنی انسان بہت بے انصاف اور بڑا ناشکرا ہے''۔ یعنی مقتضی انصاف کا تو یہ تھا کہ کوئی تکلیف ومصیبت پیش آئے تو صبر وسکون سے کام لے۔ زبان اور دل کو شکایت سے پاک رکھے اور سمجھے کہ یہ جو کچھ پیش آیا ہے ایک حاکم حکیم کی طرف سے آیا ہے وہ بھی مقتضائے حکمت ہونے کی بناء پر ایک نعمت ہی ہے اور جب کوئی راحت ونعمت ملے تو دل اور زبان ہر عمل سے اس کا شکر گزار ہو مگر عام انسانوں کی عادت اس سے مختلف ہے کہ ذرا مصیبت وتکلیف پیش آجائے تو بے صبری میں مبتلا ہوجائیں اور کہتے پھریں اور ذرا نعمت ودولت مل جائے تو اس میں مست ہوکر خدا تعالیٰ کو بھلا دیں اسی لئے مؤمنین مخلصین کی صفت پچھلی آیت میں صبار اور شکور بتلائی گئی ہے۔ (معارف مفتی اعظم)

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ
اور جس وقت کہا ابراہیم نے

قریشیوں کو نصیحت:

رؤسائے قریش جن کی ناشکرگزاری اور شرک وکفر کا بیان اوپر اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ الخ میں ہوا تھا انہیں ابراہیم علیہ السلام کا قصہ یاد دلا کر متنبہ کرتے ہیں کہ تم جن کی اولاد ہونیکی وجہ سے کعبۃ اللہ اور حرم شریف کے مجاور بنے بیٹھے ہو، انہوں نے اس کعبہ کی بنیاد خالص توحید پر رکھی تھی، ان ہی کی دعاؤں سے خدا تعالیٰ نے یہ شہر (مکہ) آباد کیا اور پتھریلے ریگستان میں ظاہری وباطنی نعمتوں کے ڈھیر لگادیے۔ وہ دنیا سے یہ ہی دعائیں اور وصیتیں کرتے ہوئے رخصت ہوئے کہ ان کی اولاد شرک کا طریقہ اختیار نہ کرے۔ اب تم کو سوچنا اور شرمانا چاہئے کہ کہاں تک ان کی وصایا کا پاس کیا یا ان کی دعا سے حصہ پایا اور کس حد تک خدا تعالیٰ کے احسانات پر شکر گزار ہوئے۔ (تفسیر عثمانی)

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ
اے رب کردے اس شہر کو امن والا اور دور رکھ مجھ کو اور میری اولاد کو
اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ﴿۳۵﴾
اس بات سے کہ ہم پوجیں مورتوں کو

دعائے ابراہیمؑ:

یعنی مکہ کو ''حرم آمن'' بنادے (چنانچہ خدا نے بنادیا) نیز مجھ کو اور میری اولاد کو ہمیشہ بت پرستی سے دور رکھ۔ غالباً یہاں ''اولاد'' خاص صلبی اولاد مراد ہے۔ سو آپ کی صلبی اولاد میں یہ مرض نہیں آیا اور اگر عام ذریت مراد ہو تو کہا

جائیگا کہ دعاء بعض کے حق میں قبول نہیں ہوئی ۔ باوجودیکہ حضرت ابراہیمؑ معصوم پیغمبر تھے مگر یہ دعا کا ادب ہے کہ دوسروں سے پہلے آدمی اپنے لئے دعا کرے۔ اس قسم کی دعائیں جو انبیاء سے منقول ہیں ان میں یہ اشارہ ہوتا ہے کہ پیغمبروں کی عصمت بھی خود ان کی پیدا کی ہوئی نہیں بلکہ حق کی حفاظت وصیانت سے ہے۔ اس لئے وہ ہمیشہ اسی کی طرف التجاء کرتے ہیں۔ جوان کی عصمت کا ضامن وکفیل ہوا ہے۔

(تنبیہ): حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمہ اللہ کے نزدیک ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعائیں مکہ کی آبادی اور تعمیر کعبہ کے بعد کی ہیں۔ سورۂ بقر میں اول پارہ کے ختم پر جس دعا کا ذکر ہے وہ البتہ بنائے کعبہ کے وقت حضرت اسمٰعیلؑ کی معیت میں ہوئی، یہ دعائیں اس کے بہت زمانہ بعد پیرانہ سالی میں کی گئیں۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت ابراہیمؑ نے اس جگہ مکہ سے خوف کو دور کرنے اور شہر کو پرامن بنانے کی دعا کی اور آیت اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا میں یہ درخواست کی کہ اس وادی کو امن کی بستی بنادے (یعنی یہاں وادی میں ایک شہر بسادے جو پرامن ہو۔)

قرآن کا مقصد:

اور یہ ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے قصص اور حالات کے بیان سے قرآن کریم کا مقصد ان کی تاریخ بیان کرنا نہیں ہوتا بلکہ ان میں انسانی زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق ہدایتی اصول ہوتے ہیں انہی کو جاری رکھنے کے لئے یہ واقعات قرآن میں بار بار دہرائے جاتے ہیں۔

اولادِ اسماعیل:

اللہ جل شانہٗ نے اپنے خلیل کی دعا قبول فرمائی ان کی اولاد شرک وبت پرستی سے محفوظ رہی اس پر یہ سوال ہوسکتا ہے کہ اہل مکہ تو عموماً اولاد ابراہیم علیہ السلام ہیں ان میں تو بت پرستی موجود تھی، بحر محیط میں اس کا جواب بحوالہ سفیان بن عینیہ یہ دیا ہے کہ اولاد اسمٰعیل علیہ السلام میں کسی نے درحقیقت بت پرستی نہیں کی، بلکہ جس وقت مکہ پر قوم جرہم کے لوگوں نے قبضہ کرکے اولاد اسمٰعیل علیہ السلام کو حرم سے نکال دیا، تو یہ لوگ حرم سے انتہائی محبت وعظمت کی بناء پر یہاں کے کچھ پتھر اپنی ساتھ اٹھالے گئے تھے ان کو حرم محترم اور بیت اللہ کی یادگار کے طور پر سامنے رکھ کر عبادت اور اس کے گرد طواف کیا کرتے تھے، جس میں کسی غیر اللہ کی طرف کوئی رخ نہ تھا، بلکہ جس طرح بیت اللہ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھنا یا بیت اللہ کے گرد طواف کرنا اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت ہے، اسی طرح وہ اس پتھر کی طرف رخ اور اس کے گرد طواف کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے منافی نہ سمجھتے تھے، اس کے بعد یہی طریقہ کار بت پرستی کا سبب بن گیا۔ (معارف مفتی اعظم)

سفیان بن عینیہ کی یہ تشریح قرآن کے بھی خلاف ہے اور سنت واجماع کے بھی۔ خبر متواتر سے ثابت ہے کہ اللہ کی کتاب میں مشرکوں سے مراد اہل مکہ (نسل اسماعیل) ہیں اور اللہ نے صراحت کے ساتھ فرمایا ہے وقال الذین اشرکوا لوشآء اللہ مآ اشرکنا ولآ اباؤنا ولا حرمنا من دونہ من شیٔ اس کے علاوہ بھی دوسری آیات سے (یہی) ثابت ہے (کہ اہل مکہ مشرک تھے اور ان کے باپ دادا بھی)۔ (تفسیر مظہری)

رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ

اے رب انہوں نے گمراہ (گمراہی میں ڈالا) کیا بہت لوگوں کو

یعنی یہ پتھر کی مورتیاں بہت آدمیوں کی گمراہی کا سبب ہوئیں۔ (تفسیر عثمانی)

فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ

سو (جو کوئی میرے رستہ پر چلا) جس نے پیروی کی میری سو وہ تو میرا

فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۶﴾

ہے اور جس نے میرا کہنا نہ مانا سو تو بخشنے والا مہربان ہے

ابراہیمی کون ہے:

یعنی جس نے توحید خالص کا راستہ اختیار کیا اور میری بات مانی وہ میری جماعت میں شامل ہے۔ جس نے کہنا نہ مانا اور ہمارے راستہ سے علیحدہ ہوگیا تو آپ اپنی بخشش اور مہربانی سے اس کو توبہ کی توفیق دے سکتے ہیں۔ آپ کی مہربانی ہو تو وہ ایمان لاکر اپنے کو رحمت خصوصی اور نجات ابدی کا مستحق بنا سکتا ہے۔ یا یہ مطلب ہو کہ آپ کو قدرت ہے اسے بھی بحالت موجودہ بخش دیں گو آپ کی حکمت سے اس کا وقوع نہ ہو۔

(تنبیہ): سورۂ مائدہ کے آخر میں ہم نے حضرت خلیلؑ کے اس قول اور مسیح علیہ السلام کے مقولے میں فرق بیان کیا ہے وہاں ملاحظہ کرلیا جائے۔ (تفسیر عثمانی)

مشرک کیلئے رزق کی دُعاء:

اس دعا میں صرف اہل ایمان کو رزق عطا کرنے کی دعا اس لئے کی کہ مشرک کے غیر مغفور ہونے کی صراحت سے آپ کو خیال پیدا ہوگیا کہ مشرک سے اللہ دنیا میں بھی انتقام لے گا اور اپنے پیدا کیے ہوئے پھلوں سے محروم رکھے گا۔ (چونکہ یہ خیال غلط تھا اس لئے اس کے جواب میں) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ الخ اور جو کفر کرے گا اس کو تھوڑی مدت (بقدر مدت زندگی) میں بہرہ اندوز رکھوں گا، پھر اس کو عذاب دوزخ کی طرف کھینچ کرلے جاؤں گا (یعنی کافروں کو دنیوی نعمتوں سے محروم نہیں رکھوں گا۔ ہاں آخرت میں اس کی مغفرت نہ ہوگی)۔ (تفسیر مظہری)

حکیمانہ دُعاء:

دعا تو ہر انسان مانگتا ہے مگر مانگنے کا سلیقہ ہر ایک کو نہیں ہوتا انبیاء علیہم السلام

کی دعائیں سبق آموز ہوتی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ کیا چیز مانگنے کی ہے اس دعائے ابراہیمی کے دو جز ہیں ایک شہر مکہ کو خوف وخطر سے آزاد جائے امن بنا دینا، دوسرے اپنی اولاد کو بت پرستی سے ہمیشہ کے لئے نجات دلانا۔

کامیابی کے دو بنیادی اصول:

غور سے کام لیا جائے تو انسان کی صلاح وفلاح کے یہی دو بنیادی اصول ہیں، کیونکہ انسانوں کو اگر اپنے رہنے سہنے کی جگہ میں خوف وخطر اور دشمنوں کے حملوں سے امن واطمینان نہ ہو تو نہ دنیوی اور مادی اعتبار سے ان کی زندگی خوشگوار ہوسکتی ہے اور نہ دینی اور روحانی اعتبار سے، دنیا کے سارے کاموں اور راحتوں کا مدار تو امن واطمینان پر ہونا ظاہر ہی ہے جو شخص دشمنوں کے نرغوں اور مختلف قسم کے خطروں میں گھرا ہوا اس کے سامنے دنیا کی بڑی سے بڑی نعمت کھانے پینے، سونے جاگنے کی بہترین آسانیاں، اعلیٰ قسم کے محلات اور بنگلے، مال و دولت کی بہتات سب تلخ ہو جاتی ہیں۔

دینی اعتبار سے بھی ہر طاعت وعبادت اور احکام الٰہیہ کی تعمیل انسان اسی وقت کرسکتا ہے جب اس کو کچھ سکون واطمینان نصیب ہو۔

اس لئے حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کی پہلی دعا میں انسانی فلاح کی تمام ضروریات معاشی واقتصادی اور دینی واخروی سب داخل ہوگئیں اس ایک جملہ سے حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی اولاد کے لئے دنیا کی تمام اہم چیزیں مانگ لیں۔

اولاد کی معاشی راحت:

اس دعا سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اولاد کی ہمدردی اور ان کی معاشی راحت کا انتظام بھی حسب قدرت باپ کے فرائض میں سے ہے، اس کی کوشش زہد اور ترک دنیا کے منافی نہیں۔

دوسری دعا میں بھی بڑی جامعیت ہے کیونکہ وہ گناہ جس کی مغفرت کا امکان نہیں، وہ شرک وبت پرستی ہے اس سے محفوظ رہنے کی دعا فرمادی، اس کے بعد اگر کوئی گناہ سرزد بھی ہو جائے تو اس کا کفارہ دوسرے اعمال سے بھی ہوسکتا ہے اور کسی کی شفاعت سے بھی معاف کئے جاسکتے ہیں، اور اگر عبادت اصنام کے لفظ صوفیائے کرام کے اقوال کے مطابق اپنے وسیع مفہوم میں لیا جائے کہ ہر وہ چیز جو انسان کو اللہ سے غافل کرے وہ اس کا بت ہے۔ اور اس کی محبت سے مغلوب ہو کر خدا تعالیٰ کی نافرمانی پر اقدام کر لینا ایک طرح سے اس کی عبادت ہے تو اس دعا یعنی عبادت اصنام سے محفوظ رہنے میں تمام گناہوں سے حفاظت کا مضمون آجاتا ہے بعض صوفیاء کرام نے اس معنی میں اپنے نفس کو خطاب کر کے غفلت ومعصیت پر ملامت کی ہے۔

سودۂ گشت ازسجدۂ راہ بتاں پیشانیم
چند برخود تہمت دین مسلمانی نہم

اور عارف رومیؒ نے فرمایا ہے۔

ہر خیال شہوتے در رہ بتے ست

(معارف القرآن)

حضرت ہاجرہ اور اسمٰعیلؑ کو مکہ میں ٹھہرانے کا واقعہ:

حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس دعا کا واقعہ یہ ہے کہ بیت اللہ شریف کی تعمیر جو طوفان نوح میں بے نشان ہوگئی تھی جب اللہ تعالیٰ نے اس کی دوبارہ تعمیر کا ارادہ فرمایا تو اپنے خلیل ابراہیم علیہ السلام کو اس کے لئے منتخب فرما کر ان کو ملک شام سے ہجرت کر کے حضرت ہاجرہؑ اور صاحبزادے اسمٰعیل علیہ السلام کے ساتھ اس بے آب وگیاہ مقام کو مسکن بنانے کے لئے مامور فرمایا۔

صحیح بخاری میں ہے کہ اسمٰعیل علیہ السلام اس وقت شیر خوار بچے تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حسب حکم ان کو اور ان کی والدہ ہاجرہؑ کو موجودہ بیت اللہ اور چاہ زمزم کے قریب ٹھہرا دیا اس وقت یہ جگہ پہاڑوں سے گھری ہوئی ایک چٹیل میدان تھی دور دور تک نہ پانی نہ آبادی، ابراہیم علیہ السلام نے ان کے لئے ایک توشہ دان میں کچھ کھانا اور ایک مشکیزہ میں پانی رکھ دیا تھا۔

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ملک شام کی طرف واپس ہونے کا حکم ملا، جس جگہ حکم ملا تھا وہیں سے تعمیل حکم کے لئے روانہ ہوگئے، بیوی اور شیر خوار بچہ کو اس لق ودق جنگل میں چھوڑنے کا جو طبعی اور فطری اثر تھا اس کا اظہار تو اس دعا سے ہوگا جو بعد میں کی گئی مگر حکم ربانی کی تعمیل میں اتنی دیر بھی گوارا نہیں فرمائی کہ حضرت ہاجرہؑ کو خبر دیدیں اور کچھ تسلی کے الفاظ کہہ دیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ جب حضرت ہاجرہؑ نے ان کو جاتے ہوئے دیکھا تو بار بار آوازیں دیں کہ اس جنگل میں آپ ہمیں کس پر چھوڑ کر جا رہے ہیں جہاں نہ کوئی انسان ہے نہ زندگی کا سامان مگر خلیل اللہ نے مڑ کر نہیں دیکھا تب حضرت ہاجرہؑ کو خیال آیا کہ اللہ کا خلیل ایسی بے وفائی نہیں کرسکتا، شاید اللہ تعالیٰ ہی کا حکم ملا ہے تو آواز دے کر پوچھا کہ کیا آپ کو اللہ تعالیٰ نے یہاں سے چلے جانے کا حکم دیا ہے تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مڑ کر جواب دیا کہ ہاں، حضرت ہاجرہؑ نے یہ سن کر فرمایا **اذا لا یضیعنا** ''یعنی اب کوئی پرواہ نہیں''۔ جس مالک نے آپ کو یہاں سے چلے جانے کا حکم دیا ہے وہ ہمیں بھی ضائع نہ کرے گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام آگے بڑھتے رہے، یہاں تک کہ ایک پہاڑی کے پیچھے پہنچ گئے جہاں ہاجرہؑ واسمٰعیلؑ علیہما السلام آنکھوں سے اوجھل ہوگئے، تو اس وقت بیت اللہ کی طرف متوجہ ہو کر یہ دعا مانگی جو اس آیت میں مذکور ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مذکورہ دعا کے ضمن میں بہت سی ہدایات اور مسائل ہیں، ان کا بیان یہ ہے:

(۱) حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک طرف تو مقام خلیل اللہ کا حق ادا

کیا کہ جس وقت اور جس جگہ ان کو یہ حکم ملا کہ آپ ملک شام واپس چلے جائیں، اس بے آب و گیاہ لق و دق میدان میں اہلیہ اور شیر خوار بچے کو چھوڑ کر چلے جانے اور حکم ربانی کی تعمیل میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں فرمائی۔ اس کی تعمیل میں اتنی دیر لگانا بھی گوارا نہیں فرمایا کہ اہلیہ محترمہ کے پاس جا کر تسلی کر دیں، اور کہہ دیں کہ مجھے یہ حکم ملا ہے آپ گھبرائیں نہیں، بلکہ جس وقت جس جگہ حکم ملا فوراً حکم ربانی کی تعمیل کے لئے چل کھڑے ہوئے۔ (معارف مفتی اعظم)

رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ

اے رب میں نے بسایا ہے اپنی ایک اولاد کو میدان میں کہ جہاں

ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا

کھیتی نہیں تیرے محترم (حرمت والے) گھر کے پاس اے رب

لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ

ہمارے تا کہ قائم رکھیں نماز کو سو رکھ بعضے لوگوں کے دل کہ مائل

تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ

(جھکتے رہیں) ہوں ان کی طرف اور روزی دے

لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ۝۳۷

ان کو میووں سے شاید وہ شکر کریں

تعمیر کعبہ:

یعنی اسمٰعیل علیہ السلام کو، کیونکہ دوسری اولاد حضرت اسحٰق وغیرہ "شام" میں تھے خدا تعالیٰ کے حکم سے آپ حضرت اسمٰعیلؑ کو بحالت شیر خوارگی اور ان کی والدہ ہاجرہؑ کو یہاں چٹیل میدان میں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ بعدہ قبیلہ جرہم کے کچھ لوگ وہاں پہنچے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسمٰعیلؑ کی تشنگی اور ہاجرہ کی بیتابی کو دیکھ کر فرشتے کے ذریعہ سے وہاں "زمزم" کا چشمہ جاری کر دیا۔ جرہم کے خانہ بدوش لوگ پانی دیکھ کر اتر پڑے اور ہاجرہ کی اجازت سے وہیں بسنے لگے اسمٰعیل علیہ السلام جب بڑے ہوئے تو اسی قبیلہ میں ان کی شادی ہوئی۔ اس طرح جہاں آج مکہ ہے ایک بستی آباد ہوگئی، حضرت ابراہیم گاہ بگاہ ملک شام سے تشریف لایا کرتے تھے۔ اور اس شہر اور شہر کے باشندوں کے لئے دعا فرماتے کہ خداوند! میں نے اپنی ایک اولاد کو اس بنجر اور چٹیل آبادی میں تیرے حکم سے تیرے معظم و محترم گھر کے پاس لا کر بسایا ہے تا یہ اور اس کی نسل تیرا اور تیرے گھر کا حق ادا کریں تو اپنے فضل سے کچھ لوگوں کے دل ادھر متوجہ کر دے کہ وہ یہاں آئیں جس سے تیری عبادت ہو اور شہر کی رونق بڑھے، نیز ان کی روزی اور دلجمعی کیلئے غیب سے ایسا سامان فرمادے کہ (غلہ اور پانی جو ضروریات زندگی ہیں ان سے گزر کر) عمدہ میوے اور پھلوں کی یہاں افراط ہو جائے تا کہ یہ لوگ اطمینان قلب کے ساتھ تیری عبادت اور شکر گزاری میں لگے رہیں۔ حق تعالیٰ نے یہ سب دعائیں قبول فرمائیں۔ آج تک ہر سال ہزاروں لاکھوں آدمی مشرق و مغرب سے کھنچ کھنچ کر وہاں جاتے ہیں اعلیٰ قسم کے میوے اور پھلوں کی مکہ میں وہ افراط ہے جو شاید دنیا کے کسی حصہ میں نہ ہو۔ حالانکہ خود مکہ میں ایک بھی ثمردار درخت موجود نہ ہوگا۔ بعض سلف سے منقول ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے دعا میں "اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ" (کچھ آدمیوں کے دل) کہا تھا ورنہ سارا جہان ٹوٹ پڑتا۔ (تفسیر عثمانی)

بے آب و گیاہ وادی:

بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ۔ ایسے وادی میں جہاں کھیتی نہیں ہے لغت میں وادی پہاڑی نالے کو کہتے ہیں پھر (توسیع استعمال کے بعد) چند پہاڑوں یا ریت کے ٹیلوں کے درمیانی میدان پر اس لفظ کا اطلاق ہونے لگا مکہ کی بستی بھی ایسے ہی میدان میں تھی جو پہاڑوں سے گھرا ہوا تھا۔ چونکہ یہ وادی پتھریلا علاقہ تھا نا قابل روئیدگی تھا اس لئے اس کو غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ فرمایا۔

مکہ کی حرمت:

عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ، تیرے ممنوعہ گھر کے پاس، بیت اللہ سے مراد وہ بیت اللہ ہے جو طوفان نوح سے پہلے موجود تھا۔

فتح مکہ کے روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ نے جس روز آسمان و زمین بنائے (اسی روز) اس شہر کو باحرمت (ممنوعہ) قرار دے دیا۔ پس روز قیامت تک اللہ کی عطا کی ہوئی حرمت کی وجہ سے یہ (شہر) ممنوعہ (باحرمت) رہے گا یہاں کسی کے لئے لڑنا حلال نہیں اور ایک ساعت سے زیادہ میرے لئے بھی یہاں قتال جائز نہیں۔ روز قیامت تک خدا داد حرمت کی وجہ سے یہ باحرمت (ممنوعہ) رہے گا۔ یہاں کانٹے یعنی جھاڑیاں (بھی) نہ کاٹے جائیں نہ یہاں کے شکار کو (بھگا کر) باہر نکالا جائے نہ یہاں گری پڑی چیز کوئی اٹھائے سوائے اس غرض کے کہ اس چیز کی شناخت کرائی ہو (کہ شناخت کر کے اس کا مالک لے لے) نہ یہاں کی گھاس کاٹی جائے حضرت عباسؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذخر، (مرچیا گند) اس سے مستثنیٰ کر دیجئے یہ لوہاروں کے اور مکہ والوں کے گھروں کے کام میں آتی ہے۔ فرمایا اذخر مستثنیٰ ہے۔ متفق علیہ۔ رواہ ابن عباس۔

حضرت سارہ اور حضرت حاجرہؓ:

واقدی اور ابن عساکر نے عامر بن سعید کے سلسلہ سے حسب ذیل

روایت کی ہے۔ حضرت سارہ حضرت ابراہیمؑ کی بی بی تھیں مدت تک حضرت کے پاس رہیں لیکن کوئی اولاد نہیں ہوئی جب حضرت ہاجرہؓ کے بطن سے حضرت اسمٰعیلؑ پیدا ہو گئے تو حضرت سارہ کو جذبہ رقابت نے ابھارا اور آپ کے دل میں کچھ احساس افسردگی و انتقام پیدا ہو گیا اور انہوں نے قسم کھالی کہ ہاجرہ کے تینوں ناک کان کاٹیں گی (تاکہ بدصورت ہو جائیں اور حضرت ابراہیمؑ کو ان سے نفرت ہو جائے) حضرت ابراہیم نے فرمایا کیا تم اپنی قسم پوری کرنی چاہتی ہو۔ حضرت سارہ نے عرض کیا میں کیا کروں (میری قسم پوری ہونے کی کیا صورت ہو؟) حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا ہاجرہ کے کانوں میں سوراخ کر دو اور اس کا ختنہ کر دو۔ حضرت سارہ نے ایسا ہی کیا حضرت ہاجرہ نے کان چھدنے کے بعد دو بالیاں کانوں میں پہن لیں۔ اس سے ان کا حسن اور بڑھ گیا حضرت سارہ بولیں اس سے تو میں نے اس کے حسن میں اور اضافہ کر دیا غرض حضرت سارہ نے پسند نہیں کیا کہ حضرت ابراہیمؑ حضرت ہاجرہ کے ساتھ رہیں۔

نطاق کا استعمال:

بخاری نے صحیح میں اور بغوی نے اپنی سند سے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے نطاق حضرت ہاجرہؓ نے اس غرض سے پہنا کہ قدموں کے نشانوں کو پیچھے نطاق کا سرا مٹاتا چلے اور حضرت سارہ کو ان کا نشان قدم معلوم نہ ہو (عرب کی عورتوں نے نطاق کا استعمال حضرت ہاجرہ سے ہی سیکھا تھا۔)

مکہ میں پہنچنا:

غرض حضرت ابراہیمؑ حضرت ہاجرہ اور ان کے لڑکے اسماعیلؑ کو لے کر بیت اللہ کے پاس پہنچے اور مسجد سے بالائی مقام پر زمزم کے اوپر ایک بڑے درخت کے پاس دونوں کو بٹھایا۔ حضرت اسماعیلؑ (ان دنوں) شیر خوار تھے، حضرت ہاجرہ کا دودھ پیتے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ نے ایک خورجین جس میں چھوارے تھے اور ایک مشکیزہ پانی سے بھرا ہوا حضرت ہاجرہ کے پاس رکھ دیا پھر لوٹ پڑے، حضرت ہاجرہ نے پیچھا کیا اور کہا ابراہیمؑ آپ ہم کو اس ویران وادی میں (جہاں نہ کوئی آدمی ہے نہ کچھ اور چیز) چھوڑ کر کہاں جا رہے ہیں؟ حضرت ہاجرہ نے یہ بات کئی بار کہی مگر حضرت ابراہیمؑ نے منہ پھیر کر نہیں دیکھا۔ آخر حضرت ہاجرہ نے کہا کیا اللہ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ چل دیئے، جب ہاجرہ کی نظر سے غائب ہو گئے تو کعبے کی طرف منہ کر کے دونوں ہاتھ اٹھا کر ان الفاظ میں دعا کی

رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِندَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُم مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ.

پانی کا ختم ہونا:

حضرت اسماعیل کی والدہ مشکیزہ کا پانی پیتی رہی اور بچہ کو دودھ پلاتی رہیں یہاں تک کہ پانی ختم ہو گیا اور پیاس لگی اور بچہ بھی پیاسا ہو گیا تو چل دیں بچہ کی طرف نظر اٹھائی تو بچہ اپنی زبان منہ میں گھمار ہا تھا یہ منظر دیکھ کر (بے تاب ہو گئیں اور) نظر پھیر لی اور چل کر کوہ صفا پر پہنچ گئیں۔ وہاں سے قریب ترین پہاڑ صفا ہی تھا۔ صفا پر چڑھ کر اوپر کھڑی ہو کر وادی کی طرف دیکھنے لگیں کہ شاید کوئی نظر آ جائے۔ جب کوئی نظر نہ آیا تو صفا سے اتر کر وادی میں پہنچیں اور قوت کے ساتھ دوڑنے والے آدمی کی طرح کرتہ کا دامن اوپر کو اٹھا کر دوڑ کر وادی سے گزر کر مروہ پہاڑی پر پہنچیں اور ادھر اُدھر نظر دوڑائی کہ کوئی نظر پڑ جائے لیکن کوئی دکھائی نہ دیا اس طرح سات بار کیا۔ حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اسی لئے (حاجی) لوگ صفا و مروہ کے درمیان دوڑتے ہیں آخر (مرتبہ) جب مروہ پر پہنچیں تو ایک آواز سنی اور خود اپنے آپ سے کہنے لگیں چپ۔ پھر کان لگا کر سنا تو پھر آواز سنائی دی۔ کہنے لگیں میں نے آواز تو سن لی اگر تیرے پاس کچھ مدد کا سامان ہو (تو، لا)

زمزم کا چشمہ:

اچانک زمزم کے مقام پر ایک فرشتہ نمودار ہوا اور زمین کو ایڑی یا پر مار کر اس نے کھودا فوراً پانی نکل آیا حضرت ہاجرہ پانی کا گھیرا بنانے لگیں اور اپنے ہاتھ سے چلو بنا کر پانی لے کر مشکیزہ میں بھرنے لگیں جونہی چلو بھر کر اٹھاتی تھیں پانی اور ابل آتا تھا۔ حضرت ابن عباس کا بیان ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسماعیلؑ کی والدہ پر اللہ کی رحمت ہو اگر وہ زمزم کو یونہی رہنے دیتیں یا یہ فرمایا کہ اگر وہ چلو نہ بھرتیں تو زمزم ایک جاری چشمہ ہو جاتا غرض حضرت ہاجرہ نے خود پانی پیا اور اپنے بچہ کو دودھ بھی پلایا فرشتہ نے کہا تم ہلاکت کا اندیشہ نہ کرو۔ یہاں اللہ کا گھر ہے یہ لڑکا اور اس کے والد اللہ کے گھر کی تعمیر کریں گے اللہ اپنے گھر والوں کو ضائع نہیں کرے گا۔ کعبہ اس زمانہ میں ٹیلہ کی شکل پر زمین سے کچھ اونچا تھا۔ سیلاب آ کر اس کے دائیں بائیں کناروں کو کاٹ کر لے جاتا تھا۔ حضرت ہاجرہ اسی حالت میں رہتی رہیں۔

بنی جرہم:

آخر بنی جرہم کا ایک قافلہ ادھر سے گزرا اور آ کر مکہ سے نشیبی مقام پر اس نے پڑاؤ ڈالا۔ قافلہ والوں نے دیکھا کہ کچھ پرندے پانی کے اوپر اڑ رہے ہیں۔ کہنے لگے یہ پرندے یقیناً پانی پر گھوم رہے ہیں لیکن ہم تو اس وادی سے پہلے گزر چکے ہیں یہاں تو پہلے کوئی پانی نہ تھا کچھ لوگوں کو (تفتیش احوال کے لئے) بھیجا انہوں نے جا کر دیکھا تو پانی موجود پایا۔ لوٹ کر آئے اور

ساتھیوں کو اطلاع دیدی اس کے بعد قافلہ والوں نے آ کر حضرت اسماعیلؑ کی والدہ سے گزارش کی کہ ہم کو اپنے پاس رہنے کی آپ اجازت دیدیں حضرت ہاجرہ نے فرمایا اچھا لیکن پانی پر تمہارا کوئی (مالکانہ) حق نہ ہوگا۔ قافلے والوں نے اس کا اقرار کرلیا۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسماعیلؑ کی والدہ انس کی طالب تھیں (تنہائی کی وحشت دور کرنا چاہتی تھیں) پانی پر قبضہ انہی کا رہا قافلہ والوں نے اپنے متعلقین کو بھی بلوایا اور سب وہیں مقیم ہوگئے رفتہ رفتہ بہت خاندان بن گئے۔

حضرت اسماعیلؑ کی شادی:

اسماعیل بھی جوان ہوگئے بنی جرہم سے عربی بھی انہوں نے سیکھ لی اور جوان ہونے کے بعد سب کے محبوب بن گئے۔ بنی جرہم نے اپنی ہی ایک عورت سے ان کا نکاح بھی کردیا ورا اسماعیلؑ کی والدہ کی وفات بھی ہوگئی۔

حضرت اسماعیلؑ کا نکاح ہو چکا تھا کہ حضرت ابراہیمؑ (اپنی دعا کی) برکت کا معائنہ کرنے کے لئے تشریف لائے۔ باقی حصہ ہم نے سورت بقرہ کی آیت وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى کی تفسیر کے ذیل میں نقل کردیا ہے۔

پیغمبرانہ استقامت:

دوسری طرف اہل وعیال کے حقوق اور ان کی محبت کا یہ حق ادا کیا کہ پہاڑی کے پیچھے ان سے اوجھل ہوتے ہی حق تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کی حفاظت اور امن واطمینان کے ساتھ رہنے کی دعا فرمائی، ان کی راحت کا سامان کردیا، کیونکہ وہ اپنی جگہ مطمئن تھے کہ تعمیل حکم کے ساتھ جو دعا کی جائے گی بارگاہ کریم سے وہ ہرگز رد نہ ہوگی اور ایسا ہی ہوا کہ یہ بیکس و بےبس عورت اور بچہ نہ صرف خود آباد ہوئے بلکہ ان کے طفیل میں ایک شہر آباد ہوگیا اور نہ صرف یہ کہ ان کو ضروریات زندگی اطمینان کے ساتھ نصیب ہوئیں بلکہ ان کے طفیل میں آج تک اہل مکہ پر ہر طرح کی نعمتوں کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔

یہ ہے پیغمبرانہ استقامت اور حسن انتظام، کہ ایک پہلو کی رعایت کے وقت دوسرا پہلو کبھی نظر انداز نہیں ہوتا، وہ عام صوفیائے کرام کی طرح مغلوب الحال نہیں ہوتے اور یہی وہ تعلیم ہے جس کے ذریعہ ایک انسان انسان کامل بنتا ہے۔

غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ ،حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب حق تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ملا کہ شیر خوار بچے اور اس کی والدہ کو اس خشک میدان میں چھوڑ کر ملک شام چلے جائیں تو اسی حکم سے اتنا تو یقین ہو چکا تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کو ضائع نہ فرمادیں گے بلکہ ان کیلئے پانی ضرور مہیا کیا جائے گا۔ اس لئے بواد غیر ذی ماءٍ نہیں کہا، بلکہ غیر ذی زرع فرما کر درخواست یہ کی کہ ان کو پھل اور ثمرات عطا ہوں خواہ کسی دوسری جگہ ہی سے لائے جائیں، یہی وجہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں آج تک بھی کاشت کا کوئی خاص انتظام نہیں، مگر دنیا بھر کے پھل اور ہر چیز کے ثمرات وہاں اتنے پہنچتے ہیں کہ دوسرے بہت سے شہروں میں ان کا ملنا مشکل ہے۔ (بحر محیط)

بیت اللہ کی پہلی تعمیر:

عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۔ سے ثابت ہوا کہ بیت اللہ شریف کی بنا، حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے ہو چکی تھی جیسا کہ امام قرطبیؒ نے تفسیر سورۂ بقرہ میں متعدد روایات سے ثابت کیا ہے کہ سب سے پہلے بیت اللہ کی تعمیر آدم علیہ السلام نے کی ہے جب ان کو زمین پر اتارا گیا، تو بطور معجزہ جبل سراندیپ سے اس جگہ تک ان کو پہنچایا گیا، اور جبرئیل امین نے بیت اللہ کی جگہ نشاندہی بھی کی، اس کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام نے اس کی تعمیر کی، وہ خود اور ان کی اولاد اس کے گرد طواف کرتے تھے، یہاں تک کہ طوفان نوح میں بیت اللہ کو اٹھالیا گیا اور اس کی بنیادیں زمین میں موجود رہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو انہی بنیادوں پر بیت اللہ کی نئی تعمیر کا حکم ملا، حضرت جبرئیل امین نے قدیم بنیادوں کی نشان دہی کی، پھر یہ بنا ابراہیمی عہد جاہلیت عرب میں منہدم ہوگئی تو قریش جاہلیت نے از سر نو تعمیر کی، جس کی تعمیر میں ابوطالب کے ساتھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نبوت سے پہلے حصہ لیا۔

اس میں بیت اللہ کی صفت مُحَرَّمْ کی گئی ہے محرم کے معنی معزز کے بھی ہوسکتے ہیں اور محفوظ کے بھی، بیت اللہ شریف میں یہ دونوں صفتیں موجود ہیں، کہ ہمیشہ معزز اور مکرم رہا ہے اور ہمیشہ دشمنوں سے محفوظ بھی رہا ہے۔

نماز کی پابندی:

لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ،حضرت خلیلؑ نے شروع دعا میں اپنے بچے اور اس کی والدہ کی بےبسی اور خستہ حالی ذکر کرنے کے بعد سب سے پہلے جو دعا کی وہ یہ کہ ان کو نماز کا پابند بنادے کیونکہ نماز دنیا وآخرت کی تمام خیرات وبرکات کے لئے جامع ہے، اس سے **معلوم** ہوا کہ اولاد کے حق میں اس سے بڑی کوئی ہمدردی اور خیر خواہی نہیں کہ ان کو نماز کا پابند بنادیا جائے۔ اور اگرچہ وہاں اس وقت صرف ایک عورت اور بچہ کو چھوڑا تھا، مگر دعا میں صیغہ جمع کا استعمال فرمایا جس سے **معلوم** ہوا کہ حضرت خلیل علیہ السلام کو یہ **معلوم** ہو چکا تھا کہ یہاں شہر آباد ہوگا اور اس بچہ کی نسل چلے گی، اس لئے دعا میں ان سب کو شریک کرلیا۔

نکتہ: فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ ،افئدۃ، فواد کی جمع ہے جس کے معنی دل کے ہیں اس جگہ لفظ افئدہ کو نکرہ اور اس کے ساتھ حرف من لایا گیا، جو تبعیض اور تقلیل کے لئے آتا ہے اس لئے معنی یہ ہوئے کہ کچھ لوگوں کے قلوب ان کی طرف مائل کردیجئے، امام تفسیر حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ اگر اس دعا میں یہ حرف تبعیض وتقلیل نہ ہوتا بلکہ افئدۃ الناس کہہ دیا جاتا تو ساری دنیا کے مسلم وغیر مسلم یہود ونصاریٰ اور مشرق ومغرب کے سب آدمی

مکہ پر ٹوٹ پڑتے جوان کے لئے باعث زحمت ہو جاتا، اس حقیقت کے پیش نظر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا میں یہ الفاظ فرمائے کہ کچھ لوگوں کے قلوب ان کی طرف مائل کر دیجئے۔

پھل: وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ، ثمرات، ثمرہ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں پھل، اور عادۃ ان پھلوں کو کہا جاتا ہے جو کھائے جاتے ہیں اس اعتبار سے دعا کا حاصل یہ ہوگا کہ ان لوگوں کو کھانے کیلئے ہر طرح کے پھل عطا فرمایئے۔ (معارف مفتی اعظم)

رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ وَمَا
اے رب ہمارے تو تو جانتا ہے جو کچھ ہم کرتے ہیں چھپا کر اور
يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ
جو کچھ کرتے ہیں دکھا (کھول کر) کر اور مخفی نہیں اللہ پر کوئی چیز زمین
وَلَا فِي السَّمَآءِ ﴿۳۸﴾
میں نہ آسمان میں

یعنی زمین و آسمان کی کوئی چیز آپ سے پوشیدہ نہیں۔ پھر ہمارا ظاہر و باطن کیسے مخفی رہ سکتا ہے۔ یہ جو فرمایا "جو ہم کرتے ہیں چھپا کر اور جو کرتے ہیں دکھا کر" اس میں مفسرین کے کئی اقوال ہیں لیکن تخصیص کی کوئی وجہ نہیں۔ الفاظ عام ہیں جو سب کھلی چھپی چیزوں کو شامل ہیں حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ ظاہر میں دعا کی سب اولاد کے واسطے اور دل میں دعا منظور تھی پیغمبر آخر الزمان کی۔ (تفسیر عثمانی)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ
شکر ہے اللہ کا جس نے بخشا مجھ کو اتنی بڑی عمر میں
اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۹﴾
اسمٰعیل اور اسحٰق بے شک میرا رب سنتا ہے دعا کو

اسمٰعیل و اسحٰق کی ولادت:

یعنی بڑھاپے میں اسحٰق سارہ کے اور اسمٰعیل ہاجرہ کے بطن سے غیر متوقع طور پر عنایت کئے۔ جیسے آپ نے اولاد کے متعلق میری دعا "رب ھب لی من الصلحین۔" سنی یہ دعائیں بھی قبول فرمایئے۔ (تفسیر عثمانی)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ تعریف ہے اس اللہ کو جس نے باوجود بڑھاپے کے مجھ کو اسمٰعیل واسحٰق (دونوں بچے) عطا فرمائے۔ یعنی بڑھاپے کی وجہ سے میں مایوس ہو گیا تھا ایسی حالت میں اللہ نے اولاد عطا فرمائی یہ اللہ کی عظیم الشان نعمت اور شان قدرت ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جب حضرت ابراہیمؑ کی عمر ننانوے سال کی تھی تو حضرت اسمٰعیلؑ پیدا ہوئے اور ایک سو بارہ سال کی عمر میں حضرت اسحاق کی ولادت ہوئی۔ ابن جریر نے سعید بن جبیر کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت ابراہیم کو ایک سو سترہ سال کی عمر میں حضرت اسحاق کے پیدا ہونے کی بشارت دی گئی تھی۔

اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَآءِ میرا رب دعا کو خوب سننے والا ہے یعنی دعا قبول کرنے والا ہے۔ سمع الملک الکلام بادشاہ نے بات سن لی یعنی بات کا اثر لے لیا۔ آیت بتا رہی ہے کہ حضرت ابراہیم نے اپنے رب سے دعا کی تھی اور اولاد ہونے کی درخواست کی تھی اللہ نے دعا قبول فرمالی اور ناامیدی کی حالت میں نرینہ اولاد عطا کی۔ (تفسیر مظہری)

رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ
اے رب میرے کر مجھ کو کہ قائم رکھوں نماز اور میری اولاد میں سے بھی اے رب میرے

یعنی میری ذریت میں ایسے لوگ ہوتے رہیں جو نمازوں کو ٹھیک طور پر قائم رکھیں۔ (تفسیر عثمانی)

رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ ﴿۴۰﴾
اور قبول کر میری دعا

یعنی میری سب دعائیں قبول فرمایئے۔ (تفسیر عثمانی)

دُعاء کی اہمیت:

رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ اے میرے رب اور میری دعا (یا عبادت) قبول فرما۔ ترمذی نے حضرت انسؓ کی روایت سے امام احمد نے اور بخاری نے الادب میں اور چاروں اصحاب السنن نے اور ابن حبان نے اور حاکم نے حضرت نعمان بن بشیرؓ کی روایت سے اور ابویعلیٰ نے حضرت براء بن عازبؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دعا (سے مراد) ہی عبادت ہے۔ ترمذی نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دعا عبادت کا مغز ہے۔ (تفسیر مظہری)

رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ
اے ہمارے رب بخش مجھ کو اور میرے ماں باپ کو اور سب ایمان
يَقُوْمُ الْحِسَابُ ﴿۴۱﴾
والوں کو جس دن قائم ہو حساب

والد کیلئے دُعاء:

یہ دعا غالباً اپنے والد کے حالت کفر پر مرنے کی خبر موصول ہونے سے پہلے کی۔ تو مطلب یہ ہوگا کہ اسے اسلام کی ہدایت کر کے قیامت کے دن مغفرت کا مستحق بنا دے۔ اور اگر مرنے کی خبر ملنے کے بعد دعا کی ہے تو شاید اس وقت تک خدا تعالیٰ نے آپ کو مطلع نہیں کیا ہوگا کہ کافر کی مغفرت نہیں ہوگی۔ عقلاً کافر کی مغفرت محال نہیں سمعاً ممتنع ہے۔ سو اس کا علم سمع پر موقوف ہوگا اور قبل از سمع امکان عقلی معتبر رہے گا۔ بعض شیعہ نے یہ لکھا ہے کہ قرآن کریم میں ابراہیم علیہ السلام کے باپ کو جو کافر کہا گیا ہے وہ ان کے حقیقی باپ نہ تھے بلکہ چچا وغیرہ کوئی دوسرے خاندان کے بڑے تھے۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانی)

رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ ۔ اے میرے رب مجھے بخش دے اور میرے والدین کو۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے والدین مسلمان تھے۔ آذر آپ کا چچا تھا اور تارخ آپ کے باپ کا نام تھا۔ تفصیل سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ چونکہ اب کا لفظ چچا کے لئے بھی بولا جاتا ہے اس لئے اگر والدی کی جگہ ابوی کا لفظ استعمال کیا جاتا تو خیال ہو سکتا کہ شاید حضرت نے آذر کے لئے بھی دعا مغفرت کی تھی باوجودیکہ آذر مشرک تھا اور مشرک ناقابل مغفرت ہے۔ اس خیال کو دفع کرنے کے لئے والدی فرمایا یعنی حقیقی ماں اور حقیقی باپ۔ اور بالفرض اگر آزر کو (حقیقی) باپ مان بھی لیا جائے تو اس کے لئے دعا مغفرت کی وجہ خود ہی اللہ نے بیان فرما دی ہے کہ ابراہیمؑ نے باپ کے لئے دعا مغفرت صرف اس وعدہ کی وجہ سے کی تھی کہ اس سے وعدہ کر لیا تھا لیکن جب ان پر ظاہر ہو گیا کہ ان کا باپ اللہ کا دشمن ہے تو اس سے بیزار ہو گئے اور بیزاری کا اظہار کر دیا اللہ نے ارشاد فرمایا ہے۔ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرٰهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَا إِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِّلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ ۔ (تفسیر مظہری)

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ
اور ہرگز مت خیال کر کہ اللہ بے خبر ان کاموں سے جو کرتے
الظّٰلِمُوْنَ ۥ
ہیں بے انصاف

ظالم عاقل نہ ہوں:

ایک رکوع پہلے بہت سے نعمائے عظیمہ کا ذکر کر کے فرمایا تھا۔ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ (انسان بڑا ظالم اور ناشکرگزار ہے۔) بعدہٗ حضرت ابراہیمؑ کا قصہ سنا کر کفار مکہ کو بعض خصوصی نعمتیں یاد دلائیں۔ اور ان کے ظلم و شرک کی طرف اشارہ کیا۔ اس رکوع میں متنبہ فرماتے ہیں کہ اگر ظالموں کو سزا ملنے میں کچھ دیر ہو تو یہ مت سمجھو کہ خدا ان کی حرکات سے بے خبر ہے، یاد رکھو ان کا کوئی چھوٹا بڑا کام خدا سے پوشیدہ نہیں۔ البتہ اس کی عادت نہیں ہے کہ مجرم کو فوراً پکڑ کر تباہ کر دے۔ وہ بڑے سے بڑے ظالم کو مہلت دیتا ہے کہ یا اپنے جرائم سے باز آ جائے یا ارتکاب جرائم میں اس حد تک پہنچ جائے کہ قانونی حیثیت سے اس کے مستحق سزا ہونے میں کسی طرح کا خفا باقی نہ رہے۔

آیت کا مخاطب کون ہے:

(تنبیہ): "لاتحسبن" کا خطاب ہر اس شخص کو ہے جسے ایسا خیال گزر سکتا ہو اور اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے تو آپ کو مخاطب بنا کر دوسروں کو سنانا مقصود ہوگا۔ کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا کہ ایسا خیال مت کرو۔ حالانکہ ایسا خیال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب بھی نہ آ سکتا تھا تو دوسروں کے حق میں اس طرح کا خیال کس قدر واجب الاحتراز ہونا چاہئے۔ (تفسیر عثمانی)

یا آیت میں خطاب عمومی ہے ہر وہ شخص مخاطب ہے جو اللہ کی ذات وصفات سے ناواقف ہونے کی وجہ سے اللہ کو غافل خیال کرتا ہے اور اللہ کی طرف سے ڈھیل ملنے کو اللہ کی ناواقفیت پر محمول کرتا ہے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ آیت میں مظلوم کے لئے پیام تسلی اور ظالم کے لئے عذاب کی دھمکی ہے۔ (تفسیر مظہری)

إِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيهِ
ان کو تو ڈھیل (چھوڑ رکھا ہے) دے رکھی ہے اس دن کیلئے کہ پتھرا (کھلی رہ جائیں گی) جائیں گی آنکھیں
الْأَبْصَارُ ۝٤٢

قیامت کی ہولنا کی:

یعنی قیامت کے دن ہول اور دہشت سے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ (تفسیر عثمانی)

إِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيهِ الْأَبْصَارُ ۔ کیونکہ ان کو صرف اس روز تک مہلت دے رکھی ہے۔ جس میں ان لوگوں کی نگاہیں پھٹی رہ جائیں گی۔ یعنی اس دن کے ہول سے آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی پلک نہ جھپکے گی یا یہ مطلب ہے کہ نظریں اٹھ جائیں گی اور اپنی جگہ سے ہٹ جائیں گی۔ (تفسیر مظہری)

مُهْطِعِينَ مُقْنِعِي رُءُوسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ
دوڑتے ہوں گے اوپر اٹھائے اپنے سر پھر کر نہیں آئیں گی ان کی

اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ وَاَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ ﴿۴۳﴾
طرف انکی آنکھیں اور دل انکے اڑ گئے ہونگے

خوف وحیرت:

یعنی محشر میں سخت پریشانی اور خوف وحیرت سے اوپر کو سر اٹھائے ٹکٹکی باندھے گھبرائے ہوئے چلے آئیں گے۔ جدھر نظر اٹھ گئی ادھر سے ہٹے گی نہیں، ہکا بکا ہو کر ایک طرف دیکھتے ہونگے۔ ذرا پلک بھی نہ جھپکے گی۔ دلوں کا حال یہ ہوگا کہ عقل وفہم اور بہتری کی توقع سے یکسر خالی اور فرط دہشت وخوف سے اڑے جا رہے ہونگے۔ غرض ظالموں کے لئے وہ سخت حسرتناک وقت ہوگا۔ رہے مؤمنین قانتین، سوان کے حق میں دوسری جگہ آچکا ہے۔ ''لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ'' (الانبیاء رکوع ۷)

وافئدتھم ھواء۔ اوران کے دل بالکل بدحواس ہوں گے۔ یعنی انتہائی دہشت اور حیرت کی وجہ سے ان کے دل فہم وعقل سے خالی ہو جائیں گے۔ احمق آدمی کے متعلق کہا جاتا ہے: قلبه هواء اس کا دل (فہم سمجھ اور قوت سے) خالی ہے (مطلب یہ کہ اس کا دماغ کھوکھلا ہے) قتادہؒ نے کہا ان کے دل سینوں سے نکلنے لگیں گے اور حلق میں آکر اٹک جائیں گے نہ منہ سے باہر آئیں گے نہ اپنی جگہ پر لوٹیں گے۔ پس دل ہوا ہو جائیں گے یعنی ان کے اندر کچھ نہ ہوگا۔ آسمان وزمین کی درمیانی خلاء کو اسی وجہ سے ہوا کہا جاتا ہے۔ سعید بن جبیرؒ نے کہا ان کے دل بے تاب اور بے قرار ہوں گے کسی جگہ ان کو قرار نہ ہوگا۔

وَاَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ
اور ڈرا دے لوگوں کو اس دن سے کہ آئے گا ان پر عذاب

یا تو قیامت کا دن اور عذاب اخروی مراد ہے یا موت کا وقت اور اس کے سکرات وقبض روح کی شدت یا دنیوی عذاب سے ہلاک ہونے کا دن ارادہ کیا جائے۔ (تفسیر عثمانی)

فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَآ اَخِّرْنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ
تب کہیں گے ظالم اے رب ہمارے مہلت دے ہم کو تھوڑی مدت
قَرِيْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ ۭ
تک کہ ہم قبول کرلیں تیرے بلانے کو اور پیروی کرلیں رسولوں کی

مہلت کی درخواست:

اگر یہ کہنا دنیا میں عذاب یا موت کی شدت دیکھ کر ہو تب تو مطلب ظاہر ہے کہ ابھی چند روز کی ہم کو اور مہلت دیجئے۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ اپنا رویہ درست کرلیں گے۔ یعنی حق کی دعوت کو قبول کر کے انبیاء کی پیروی اختیار کریں گے کما قال تعالیٰ ''حَتّٰىٓ اِذَا جَاۗءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا'' (المؤمنون رکوع ۶)

اور اگر ان کا یہ مقولہ قیامت کے دن ہوگا تب مہلت طلب کرنے کے معنی یہ ہونگے کہ ہم کو دوبارہ تھوڑی مدت کے لئے دنیا میں بھیج دیجئے پھر دیکھئے ہم کیسی وفاداری دکھلاتے ہیں، کما قال تعالیٰ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا۔ (السجدہ رکوع ۲) (تفسیر عثمانی)

اَوَلَمْ تَكُوْنُوْٓا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ
کیا تم پہلے قسم نہ کھاتے تھے کہ تم کو نہیں
مِّنْ زَوَالٍ ﴿۴۴﴾
دنیا (کچھ زوال) سے ٹلنا

جوابِ درخواست:

یعنی تم وہی تو ہو جن میں کے بعض مغرور بے باک زبان قال سے اور اکثر زبان حال سے قسمیں کھاتے تھے کہ ہماری شان وشکوہ کو کبھی زوال نہیں نہ کبھی مر کر خدا کے پاس جاتا ہے۔ ''واقسموا باللہ جھد ایمانھم لا یبعث اللہ من یموت'' (نحل رکوع ۵) یہ ان کے جواب میں خدا کی طرف سے کہا جائیگا۔ (تفسیر عثمانی)

یہ بھی مطلب بیان کیا گیا ہے کہ (زوال سے مراد ہے دار آخرت کی طرف منتقل ہو جانا) انہوں نے قسمیں کھا کر کہا تھا کہ ہم کو دار آخرت کی طرف پہنچنا نہیں (قیامت نہیں ہوگی اور دوبارہ کوئی زندہ کر کے نہیں اٹھایا جائے گا) دوسری آیت میں یہی مضمون آیا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے واقسموا باللہ جھد ایمانھم لا یبعث اللہ من یموت) انہوں نے پختہ قسمیں کھا کر کہا کہ جو مر جائے گا اس کو اللہ دوبارہ زندہ نہیں کرے گا۔ (تفسیر مظہری)

وَّسَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا
اور آباد تھے تم بستیوں میں انہی لوگوں کی جنہوں نے ظلم کیا
اَنْفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ
اپنی جان پر اور کھل چکا تھا تم کو کہ کیسا کیا ہم نے ان سے

وَضَرَبۡنَا لَكُمُ الۡاَمۡثَالَ ﴿۴۵﴾

اور بتلائے ہم نے تم کو سب قصے

باوجود علم کے ظالموں کی پیروی:

یعنی تمہارے پچھلے ان ہی بستیوں میں یا ان کے آس پاس آباد ہوئے، جہاں اگلے ظالم سکونت رکھتے تھے۔ اور ان ہی کی عادات واطوار اختیار کیں، حالانکہ تاریخی روایات اور متواتر خبروں سے ان پر روشن ہو چکا تھا کہ ہم اگلے ظالموں کو کیسی کچھ سزا دے چکے ہیں اور ہم نے امم ماضیہ کے یہ قصے کتب سماویہ میں درج کر کے انبیاء علیہم السلام کی زبانی ان کو آگاہ بھی کر دیا تھا، مگر انہیں ذرہ بھر عبرت نہ ہوئی۔ اسی سرکشی، عناد اور عداوت حق پر اڑے رہے۔ حِكۡمَةٌۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغۡنِ النُّذُرُ (القمر رکوع ۱)۔ (تفسیر عثمانی)

وَتَبَيَّنَ لَكُمۡ كَيۡفَ فَعَلۡنَا بِهِمۡ وَضَرَبۡنَا لَكُمُ الۡاَمۡثَالَ اور (کیا ان کے آثار قدیمہ کا مشاہدہ کر کے اور ان کی تباہیوں اور بربادیوں کی خبریں سن کر) تم پر ظاہر (نہ) ہو گیا تھا کہ ہم نے ان کے ساتھ کیا کیا اور (کیا) تمہاری عبرت کے لئے ہم نے (ان کے احوال کی) مثالیں (نہیں) بیان کر دی تھیں۔ یعنی کیا ہم نے پیغمبروں کی معرفت اور ان کی زبانی نہیں بیان کر دیا تھا کہ تم کفر واستحقاق عذاب میں گزشتہ اقوام کی طرح ہو یا یہ مطلب کہ گزشتہ اقوام کے حالات واعمال اور ان کے نتائج جو ندرت میں مشہور کہاوتوں کی طرح ہو گئے تھے تم سے بیان نہ کر دیئے تھے۔ یا یہ مطلب ہے کہ تمہاری سبق آموزی کے لئے ہم نے قرآن میں مثالیں نہیں بیان کر دی تھیں۔ (تفسیر مظہری)

وَقَدۡ مَكَرُوۡا مَكۡرَهُمۡ وَعِنۡدَ اللّٰهِ مَكۡرُهُمۡ ؕ

اور یہ بنا چکے ہیں اپنا داؤ اور اللہ کے آگے ہے ان کا داؤ

سب مخالفانہ داؤ ناکام:

یعنی سب اگلے پچھلے ظالم اپنے اپنے داؤ کھیل چکے ہیں۔ انبیاء کے مقابلہ میں حق کو دبانے اور مٹانے کی کوئی تدبیر اور سازش انہوں نے اٹھا نہیں رکھی۔ ان کی سب تدبیریں اور داؤ گھات خدا کے سامنے ہیں اور ایک ایک کر کے محفوظ ہیں۔ وہ ہی ان کا بدلہ دینے والا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

وَقَدۡ مَكَرُوۡا مَكۡرَهُمۡ وَعِنۡدَ اللّٰهِ مَكۡرُهُمۡ ؕ وَاِنۡ كَانَ مَكۡرُهُمۡ لِتَزُوۡلَ مِنۡهُ الۡجِبَالُ

"یعنی ان لوگوں نے دین حق مٹانے اور دعوت قبول کرنے والے مسلمانوں کو ستانے اور ایذاء پہنچانے کے لئے بھرپور تدبیریں کیں اور اللہ تعالیٰ کے پاس ان کی سب کھلی اور چھپی ہوئی تدبیریں سامنے موجود ہیں، وہ سب سے واقف اور ان کو ناکام بنا دینے پر قادر ہیں۔ اگر چہ ان کی تدبیریں ایسی عظیم اور سخت تھیں کہ ان کے مقابلہ پر پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ہٹ جائیں مگر اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے سامنے یہ ساری تدبیریں گرد اور ناکام ہو کر رہ گئیں۔

جن مخالفانہ تدبیروں کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے مراد پچھلی ہلاک شدہ قوموں کی تدبیریں ہوں، مثلاً نمرود، فرعون، قوم عاد وثمود وغیرہ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس میں موجود مشرکین عرب کا حال بیان کیا گیا ہو کہ انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں بڑی گہری اور دوررس سازشیں اور تدبیریں کیں مگر اللہ تعالیٰ نے ان سب کو ناکام بنا دیا۔ (معارف القرآن)

وَاِنۡ كَانَ مَكۡرُهُمۡ لِتَزُوۡلَ مِنۡهُ الۡجِبَالُ ﴿۴۶﴾

اور نہ ہو گا ان کا داؤ کہ ٹل جائیں اس سے پہاڑ

حقیقت ٹل نہیں سکتی:

یعنی انہوں نے بہتیرے داؤ کر کے دیکھ لئے۔ مگر خدا کی حفاظت کے آگے سب ناکام رہے۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ ان کی مکاریاں پہاڑوں کو ان کی جگہ سے ٹلا دیں یعنی انبیاء علیہم السلام اور شرائع حقہ جو پہاڑوں سے زیادہ مضبوط ومستقیم ہوتے ہیں ان کی مکاریوں سے ڈگمگا جائیں؟ حاشا وکلا۔ اس تفسیر کے موافق "وَاِنۡ كَانَ مَكۡرُهُمۡ" میں "ان" نافیہ ہو گا اور آیت کا مضمون "وَلَا تَمۡشِ فِي الۡاَرۡضِ مَرَحًا اِنَّكَ لَنۡ تَخۡرِقَ الۡاَرۡضَ وَلَنۡ تَبۡلُغَ الۡجِبَالَ طُوۡلًا" (بنی اسرائیل رکوع ۴) کے مشابہ ہو گا۔ بعض مفسرین نے "ان" شرطیہ اور واؤ وصلیہ لے کر آیت کا مطلب یہ لیا ہے کہ انہوں نے بڑے بڑے داؤ چلے جو حفاظت الٰہی کے سامنے ہیچ ثابت ہوئے۔ اگر چہ ان کے داؤ فی حد ذاتہ ایسے زبردست تھے جو ایک مرتبہ پہاڑوں کو بھی اپنی جگہ سے ہلا ڈالیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَاِنۡ كَانَ مَكۡرُهُمۡ لِتَزُوۡلَ مِنۡهُ الۡجِبَالُ۔ اور واقعی ان کی تدبیریں ایسی تھیں کہ ان سے پہاڑ بھی ٹل جائیں۔ ان نافیہ ہے اور لتزول میں لام تاکید نفی کے لئے ہے اور جبال سے مراد ہے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی نبوت کا معاملہ اور قوانین شریعت اور آیات خداوندی مطلب یہ ہے کہ ان کا مکر ایسا نہیں کہ اس سے پہاڑ ٹل جائیں یعنی نبوت محمدیہ اور احکام الہیہ ان کی سازشوں سے باطل نہیں ہو سکتے نہ ان کی فریب کاریوں سے ان میں زوال آ سکتا ہے۔ یا اِنۡ اِنَّ کا مخفف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور شریعت الٰہیہ اور احکام خداوندی جو پہاڑوں کی طرح پائیدار ہیں انہوں نے اپنی سازشوں سے ان کو اکھاڑ دینا چاہا اور ارادہ کیا کہ فریب ومکر سے ان کی بیخ کنی کر دیں لیکن ایسا ناممکن ہے۔ حسن نے کہا ان

کا مکر پہاڑوں کو ان کی جگہ سے نہیں ہٹا سکتا۔ ابن جریج کی قرأت میں لِتَزُول کی جگہ لَتَزُولُ آیا ہے۔ ان مخففہ ہے اور لام تاکیدی فضل کے لئے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کا مکر بلاشبہ ایسا تھا کہ پہاڑ بھی اس کی وجہ سے اپنی جگہ سے ہٹ جائیں یعنی ان کا شرک بہت سخت تھا اور اتنا بڑا جرم تھا کہ اس سے پہاڑ بھی اپنی جگہ چھوڑ کر اکھڑ جائیں۔ یہی مضمون ایک اور آیت میں آیا ہے۔ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا استقلال:

اور اکثر مفسرین نے وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ میں لفظ ان کو حرف نفی قرار دے کر یہ معنی کئے ہیں کہ اگرچہ انہوں نے بہت سی تدبیریں کیں اور چالیں چلیں، لیکن ان کی تدبیروں اور چالوں سے یہ ممکن نہ تھا کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائیں اور پہاڑ سے مراد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کا عزم واستقلال ہے کہ کفار کی کوئی چال اس پر اثر انداز نہیں ہو سکی۔ (تفسیر مظہری)

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ
سو خیال مت کر کہ اللہ خلاف کریگا اپنا وعدہ اپنے رسولوں سے

یعنی وہ وعدہ جو "اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا" اور "كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ" وغیرہ آیات میں کیا گیا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۴۷﴾
بیشک اللہ زبردست ہے بدلہ لینے والا

نہ مجرم اس سے چھوٹ کر بھاگ سکتا ہے نہ وہ خود ایسے مجرموں کو سزا دیے بدون چھوڑ سکتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ
جس دن بدلی جائے اس زمین سے اور زمین اور بدلے جائیں
وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۴۸﴾
آسمان اور لوگ نکل کھڑے ہوں سامنے اللہ اکیلے زبردست کے

زمین وآسمان کی تبدیلی:

قیامت کو یہ زمین وآسمان بہیات موجودہ باقی نہ رہیں گے یا تو ان کی ذوات ہی بدل دی جائیں گی یا صرف صفات میں تغیر ہوگا اور بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ شاید متعدد مرتبہ تبدیل وتغیر کی نوبت آئیگی۔ واللہ اعلم۔ سامنے کھڑے ہونے کا مطلب وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا الخ" کے تحت میں گزر چکا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

عبدالرزاق، عبد بن حمید، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیروں میں اور بیہقی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن مسعودؓ کا قول اس آیت کی تشریح کے ذیل میں نقل کیا ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا یہ زمین بدل کر ایسی زمین کردی جائے گی جو چاندی کی طرح ہوگی جہاں نہ کبھی حرام خون بہایا گیا ہوگا نہ کوئی اور گناہ کیا گیا ہوگا۔ بیہقی نے یہ حدیث مرفوعاً بھی بیان کی ہے۔ یعنی حضرت ابن مسعودؓ کا قول نہیں ہے، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے اور حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں اور موقوفاً بھی یعنی حضرت ابن مسعودؓ کا قول بھی قرار دیا ہے اور موقوف ہونے کو ترجیح دی ہے۔ میں کہتا ہوں اس جگہ موقوف حدیث بھی مرفوع کی طرح ہے۔ واقعات قیامت کا بیان اجتہاد فکر ورائے سے کوئی صحابی نہیں کر سکتا کہ جس سے غلطی کا امکان ہو سکے۔ مبدأ ومعاد ملائکہ نبوت، جنت و دوزخ اور مستقبل کے سلسلے میں جو اقوال کسی صحابی کی طرف منسوب ہیں وہ یقیناً صحابی کے از خود نہیں ضرور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنے ہوئے ہیں، احتیاطاً یا کسی اور وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ان کی نسبت نہیں کی گئی پس تبدیل ارض وسماء کے سلسلے میں بھی جو حضرت ابن مسعودؓ کا قول ہے وہ یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلعم کا فرمان ہے۔ مترجم

ایک دوسری سند سے ابن جریر وحاکم نے بیان کیا کہ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا، یہ زمین بدل کر سفید زمین ہو جائے گی جیسے خالص چاندی۔ احمد، ابن جریر، ابن ابی حاتم نے حضرت ابوایوب کی روایت سے اور (صرف) ابن جریر نے حضرت انسؓ کی روایت سے (موقوفاً) بیان کیا، قیامت کے دن اللہ اس زمین کو چاندی کی ایسی زمین سے بدل دے گا جس پر گناہ نہیں کیا گیا ہوگا۔ ابن جریر نے ابوحمزہؒ کے سلسلے سے حضرت زید کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کے ذیل میں فرمایا۔ یہ زمین چاندی کی طرح سفید ہو جائے گی۔ ابن ابی الدنیا نے صفت الجنۃ میں حضرت علیؓ کی روایت سے اس آیت کی تشریح کے ذیل میں بیان کیا کہ (حضرت علیؓ نے فرمایا) زمین چاندی کی ہوگی اور آسمان سونے کا۔ ابن جریر نے مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ زمین ایسی ہوگی جیسے چاندی اور آسمان بھی ایسا ہی ہوگا۔ عبد بن حمید نے عکرمہ کا قول نقل کیا ہے۔ عکرمہ نے کہا ہم کو یہ (روایت) پہنچی ہے کہ یہ زمین لپیٹ دی جائے گی اور اس کے برابر ایک اور زمین ہوگی۔ اس زمین سے اُس زمین کی طرف لوگوں کو لے جا کر جمع کیا جائے گا۔ صحیحین میں حضرت سہل بن سعد کی روایت آئی ہے، حضرت سہل نے فرمایا کہ میں نے خود سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے: قیامت کے دن لوگوں کو ایک سفید زمین پر جمع کیا جائے گا، جس کا رنگ خاکستری (سفیدی آفریں مٹیالا) ہوگا اور چھنے ہوئے آٹے کی ٹکیہ کی طرح (ہموار وہم رنگ) ہوگی جس میں کسی

کی کوئی (عمارت منارہ گنبد وغیرہ کوئی) نشانی نہ ہوگی۔

چمڑے کی طرح پھیلا دی جائے گی:

بیہقی نے بسند سدی صغیر بحوالہ کلبی از ابوصالح اس آیت کی تشریح میں حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ اس میں کمی بیشی کر دی جائے گی۔ ٹیلے پہاڑ وادیاں، درخت اور جو کچھ اس زمین میں ہے ختم کر دیا جائے گا اور عکاظ کے چمڑے کی طرح اس کو کھینچ کر پھیلایا جائے گا وہ چاندی کی طرح ایک سفید زمین ہوگی جس پر کوئی خون نہیں بہایا گیا ہوگا اور نہ کوئی گناہ کیا گیا ہوگا اور آسمانوں کے سورج و چاند ستارے ختم کر دیئے جائیں گے۔

حاکم نے حضرت ابن عمرؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ جب قیامت کا دن ہوگا تو چمڑے کی طرح زمین کو کھینچ کر پھیلا دیا جائے گا اور سب مخلوق کو (اس پر) جمع کیا جائے گا۔

حاکم نے عمدہ سند کے ساتھ حضرت جابرؓ کی روایت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن چمڑے کے کھینچنے کی طرح زمین کو کھینچ کر پھیلا دیا جائے گا پھر کسی آدمی کے لئے قدموں کے رکھنے سے زیادہ جگہ نہ ہوگی، پھر سب سے پہلے مجھے پکارا جائے گا اور میں سجدہ میں گر پڑوں گا پھر مجھے اجازت ملے گی تو اٹھ کر کھڑا ہو جاؤں گا اور عرض کروں گا۔ اے میرے رب! یہ جبرئیلؑ ہیں (حضرت جبرئیلؑ اس وقت رحمان کے دائیں جانب ہوں گے اور جبرئیلؑ نے اس سے پہلے رحمٰن کو کبھی نہ دیکھا ہوگا) انہوں نے مجھے اطلاع دی تھی کہ آپ نے ان کو میرے پاس بھیجا تھا، جبرئیلؑ خاموش ہوں گے کوئی بات نہیں کریں گے۔ اللہ فرمائے گا۔ اس نے سچ کہا تھا پھر اللہ مجھے شفاعت کرنے کی اجازت عطا فرمائے گا۔ میں عرض کروں گا اے میرے رب تیرے بندے زمین کے تمام اطراف میں ہیں۔ یہی مقام محمود ہوگا (اللہ کی حمد کرنے کا مقام جس پر قیامت کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فائز کیا جائے گا۔)

جنتیوں کی روٹی:

صحیحین میں حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن زمین ایک روٹی ہوگی جو اللہ اپنے ہاتھ سے اہل جنت کی مہمانی کے لئے تیار کرے گا جیسے تم لوگ سفر کیلئے اپنی روٹی تیار کرتے ہو (اس حدیث میں نزلا لاهل الجنة کا لفظ آیا، ہم نے نزل کا ترجمہ مہمانی کیا ہے خواہ مہمان کے لئے تیار کیا ہوا کھانا یا کوئی اور چیز جو کھانے کے لئے کھانے سے پہلے کی پیش کی جائے) دراوری نے کہا نزل اس چیز کو کہتے ہیں جو طعام مہمانی سے پہلے مہمان کو پیش کی جاتی ہے مراد یہ ہے کہ اہل جنت کو جنت میں پہنچنے تک مختلف مواقف ومقامات پر بطور نزل زمین کی روٹی پیش کی جائیگی اور آخر وہ جنت میں پہنچ جائیں گے۔

اسی طرح ابن مرجان نے الارشاد میں بیان کیا ہے کہ زمین بدل کر ایک روٹی کر دی جائے گی (جس کو) مؤمن اپنے قدموں کے درمیان سے (اٹھا کر) کھائے گا اور حوض (غالباً کوثر یا تسنیم) کا پانی پیئے گا۔ ابن حجر نے لکھا ہے اس سے مستفاد ہوتا ہے کہ میدان حشر کے سارے مواقف کی پوری مدت میں مؤمنوں کو بھوک کی سزا نہیں دی جائے گی بلکہ اللہ اپنی قدرت سے زمین کی فطرت بدل دے گا کہ اللہ کی مشیت کے مطابق مومن اپنے قدموں کے نیچے سے بغیر کمائی اور تکلیف کے اٹھا کر (روٹی) کھائیں گے اسی کی تائید کرتا ہے سعید بن جبیر کا وہ قول جو ابن جریر نے نقل کیا ہے کہ زمین سفید روٹی ہو جائے گی جو مومن اپنے قدموں کے نیچے سے (اٹھا کر) کھائے گا۔ اسی طرح کا محمد بن کعبؒ کا قول بھی مروی ہے۔ بیہقی نے عکرمہ کا قول نقل کیا ہے کہ زمین بدل کر سفید مثل روٹی کے ہو جائے گی جس کو اہل اسلام حساب سے فراغت کے وقت تک کھاتے رہیں گے۔ امام ابو جعفر یعنی امام باقرؒ کا قول بھی روایت میں اسی طرح آیا ہے۔

محشر کی بھوک اور پیاس:

خطیب نے حضرت ابن مسعودؓ کا قول نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کا حشر ایسی حالت میں ہوگا کہ بہت زیادہ بھوکے ہوں گے ایسے بھوکے کبھی نہیں ہوئے ہوں گے بہت زیادہ پیاسے ہوں گے ایسے پیاسے کبھی نہیں ہوئے ہوں گے بالکل برہنہ ہوں گے کبھی ایسے ننگے نہ رہے ہوں گے اور ایسے تھکے ہوئے ہوں گے کہ کبھی ایسے نہ تھکے ہوں گے۔ پس جس نے (دنیا میں) اللہ کے لئے کھانا کھلایا ہوگا اللہ (اس روز) اس کو کھانا کھلائے گا اور جس نے اللہ کے لئے پانی پلایا ہوگا اللہ اس کو پانی پلائے گا اور جس نے اللہ کے واسطے لباس پہنایا ہوگا اللہ اس کو لباس پہنائے گا اور جس نے (اللہ کے لئے) کوئی عمل کیا ہوگا اللہ اس کے لئے کافی ہوگا۔

زمین آگ بن جائے گی:

ابن جریر نے محمد بن کعب کا قول اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں نقل کیا ہے ابن کعبؒ نے کہا آسمان باغ ہو جائیں گے اور سمندر کی جگہ آگ ہو جائے گی اور زمین تبدیل کر کے کچھ اور کر دی جائے گی۔ حضرت ابن مسعودؓ کا ایک قول آیا ہے کہ قیامت کے دن ساری زمین آگ ہو جائے گی۔ کعب احبارؒ کا قول ہے کہ سمندر کی جگہ آگ ہو جائے گی۔

لوگ کہاں ہوں گے:

مسلم نے حضرت ثوبان کی روایت سے لکھا ہے کہ ایک یہودی عالم نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر دریافت کیا جس روز زمین دوسری زمین میں تبدیل کر دی جائے گی اس روز لوگ کہاں ہوں گے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پل سے ورے تاریکی میں۔

مسلم نے حضرت عائشہؓ کا بیان نقل کیا ہے، ام المومنین نے فرمایا، میں نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیان فرمایئے کہ جس روز زمین تبدیل کردی جائے گی تو لوگ کہاں ہوں گے فرمایا، صراط پر۔ بیہقی نے کہا اس حدیث میں صراط کا لفظ مجازاً استعمال کیا گیا ہے چونکہ لوگوں کو (اس کے بعد) صراط سے گزرنا ہی ہوگا اس لئے بطور مجاز صراط پر ہونے کی صراحت فرمائی اب حضرت ثوبان کی روایت سے اس روایت کی مطابقت ہوجائے گی ثوبان کی روایت میں "پل سے ورے تاریکی میں" میں آیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ امر بھی ہے کہ تبدیل ارضی یعنی اس زمین سے منتقل ہوکر ارض موقف پر پہنچنا توزجرہ (جھڑکی یا جھنجھوڑ) کے وقت ہوگا (جو پل صراط پر پہنچنے سے پہلے ہوگا)

چہروں کی خاک:

بیہقیؒ نے حضرت ابی بن کعب کا قول نقل کیا ہے کہ آیت وَحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً کی تشریح میں آپ نے فرمایا، دونوں خاک ہوجائیں گے جو کافروں کے چہروں پر پڑے گی مومنوں کے چہروں پر نہیں پڑے گی وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ کا یہی مطلب ہے کافروں کے چہروں پر اس روز خاک ہوگی جن پر سیاہی چڑھی ہوگی۔

تبدیلی کیسے ہوگی؟

سیوطی نے لکھا ہے قدماء کے درمیان اس مسئلہ میں اختلاف رہا ہے کہ کیا تبدیل ارض سے صرف تبدیل اوصاف (احوال رنگ، ہیبت وغیرہ) ہے یا تبدیل ذات ہی ہوجائے گی موخر الذکر قول کو ابن ابی حمزہ نے ترجیح دی ہے اور صراحت کی ہے کہ یہ دنیا کی زمین نابود ہوجائے گی اور موقف قیامت کی نئی زمین پیدا کی جائے گی۔

شیخ ابن حجر نے لکھا ہے کہ تبدیل ارض کی احادیث اور زمین کو کھینچ کر پھیلانے اور اس میں کمی بیشی کرنے کی احادیث میں کوئی تضاد نہیں، کیونکہ یہ سارے حوادث ارض دنیا پر واقع ہوں گے اور موقف کی زمین اس کے علاوہ ہوگی۔ یہ زمین بدل جائے گی تو ایک جھڑکی سے سب لوگ یہاں سے نکل کر ارض محشر میں پہنچ جائیں گے۔

(حضرت مفسر نے فرمایا) میں کہتا ہوں کہ مومنوں کے قدموں کے نیچے کی زمین روٹی بن جائے گی اور کافروں کے قدموں کے نیچے کی زمین خاک اور آگ ہوجائے گی۔

دومرتبہ تبدیلی:

قرطبی نے لکھا ہے کہ صاحب افصاح نے ان تمام متضاد احادیث کا تعارض دور کرنے کیلئے کہا ہے کہ زمین وآسمان کی تبدیلی دومرتبہ ہوگی، پہلی مرتبہ نفخہ صعق (پہلی مرتبہ صور پھونکنے) سے پہلے ہوگی کہ ستارے جھڑ جائیں گے چاند اور سورج بے نور ہوجائیں گے، آسمان تانبے کی طرح سرخ ہو جائے گا اس کا پوست اتارلیا جائے گا۔ پہاڑ اڑے اڑے پھریں گے سمندر آگ ہوجائیں گے، زمین میں لرزہ پیدا ہوجائیگا اور وہ پارہ پارہ ہوجائے گی۔ اس کی ہیئت ہی بدل جائے گی، پھر پہلا صور پھونکا جائے گا تو آسمان لپیٹ دیئے جائیں گے، آسمان بدل کر دوسرا آسمان ہوجائے گا اور زمین کو کھینچ کر پھیلا دیا جائے گا اور ویسا ہی دوبارہ کردیا جائے گا جیسے وہ پہلے تھی اس کے اندر قبریں ہوں گی جن کے اندر مردے ہوں گے۔

پھر (دوبارہ صور پھونکے جانے پر) زمین میں دوسری تبدیلی ہوگی یہ اس وقت ہوگا جب لوگ میدان حشر میں کھڑے ہوں گے ایسی حالت میں روئے زمین، جس کو ساہرہ کہا جائے گا اور اس پر حساب فہمی ہوگی، بدل دیا جائیگا اس وقت زمین چاندی کی ہوگی، سفید خاکستری رنگ ہوگا جس پر نہ خون ریزی کی گئی ہوگی نہ کوئی گناہ کیا گیا ہوگا اس تبدیلی کے وقت لوگ صراط پر کھڑے ہوں گے اور سب اس میں سما جائیں گے جو بچیں گے وہ جہنم کے پل پر ٹھہرے ہوں گے۔ دوزخ اس وقت منجمد ہوگی، حضرت عبداللہ کی روایت میں جو آیا ہے کہ زمین آگ ہوجائے گی اس سے یہی مراد ہے۔ جب لوگ صراط سے گزر جائیں گے اور (مومن) انبیاء کے حوضوں پر پہنچ کر قیام کریں گے اور حیاض انبیاء کا پانی پئیں گے تو زمین روٹی کی ایک ٹکیہ بنادی جائے گی جو جنت میں جانیوالے ہوں گے وہ سب اس روٹی میں سے کھائیں گے جنت کے بیل کی جگر یا مچھلی کی جگری کا ان کے لئے سالن ہوگا۔

مساجد: طبرانی نے الاوسط میں، اور ابن عدی نے ضعیف سند کے ساتھ بیان کیا ہے کہ قیامت کے دن سوائے سجدوں کے سب زمین نابود ہوجائے گی۔ مساجد کو باہم ملا دیا جائے گا۔ (یعنی تمام مساجد یکجا جمع کردی جائیں گی۔)

میں کہتا ہوں اگر یہ روایت صحیح ثابت ہوجائے تو شاید سب مساجد کی زمین جنت کی زمین بنادی جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا میرے گھر اور میرے ممبر کے درمیان جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے۔ رواہ الشیخان فی واحمد والنسائی عن عبداللہؓ بن زید وفی الصحیحین والترمذی عن ابی ہریرۃؓ۔

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ۔ اور (قبروں سے نکل کر حساب فہمی اور جزاوسزا پانے کے لئے) (تفسیر مظہری)

تبدیلی کا ایک اور معنیٰ:

اور تبدیل زمین وآسمان کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ بالکل ہی اس زمین کے بدلے میں دوسری زمین اور اس آسمان کی جگہ دوسرے آسمان بنادیئے جائیں روایات حدیث جو اس کے متعلق منقول ہیں، ان میں بھی بعض سے صرف صفات کی تبدیلی معلوم ہوتی ہے بعض سے ذات کی تبدیلی۔

امام حدیث بیہقی نے بسند صحیح حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے اس آیت کے بارے میں یہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ محشر کی زمین بالکل نئی زمین چاندی کی طرح سفید ہوگی اور یہ زمین ایسی ہوگی جس پر کسی نے کوئی گناہ نہیں کیا ہوگا جس پر کسی کا ناحق خون نہیں گرایا گیا، اسی طرح مسند احمد اور تفسیر ابن جریر کی حدیث میں یہی مضمون بروایت حضرت انسؓ مذکور ہے۔ (تفسیر مظہری)

صحیحین بخاری ومسلم میں حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز لوگ ایک ایسی زمین پر اٹھائے جائیں گے جو ایسی صاف وسفید ہوگی جیسے میدے کی روٹی، اس میں کسی کی کوئی علامت (مکان، باغ، درخت، پہاڑ، ٹیلہ وغیرہ کی) کچھ نہ ہوگی، یہی مضمون بیہقی نے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے۔

اور حاکم نے سند قوی کے ساتھ حضرت جابرؓ سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز یہ زمین اس طرح کھینچی جائے گی جیسے چمڑے کو کھینچا جائے جس سے اس کی سلوٹیں اور شکن نکل جائیں (اس کی وجہ سے زمین کے غار اور پہاڑ سب برابر ہو کر ایک سطح مستوی بن جائے گی) اور اس وقت تمام اولاد آدم اس زمین پر جمع ہوگی اس ہجوم کی وجہ سے ایک انسان کے حصہ میں صرف اتنی ہی زمین ہوگی، جس پر وہ کھڑا ہو سکے پھر محشر میں سب سے پہلے مجھے بلایا جائے گا میں رب العزت کے سامنے سجدہ میں گر پڑوں گا پھر مجھے شفاعت کی اجازت دی جائے گی تو میں تمام مخلوق کے لئے شفاعت کروں گا کہ ان کا حساب کتاب جلد ہو جائے

بیان القرآن میں حضرت حکیم الامتؒ نے فرمایا کہ ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں، ہو سکتا ہے کہ پہلے نفخہ صور کے وقت اسی موجودہ زمین کی صفات تبدیل کی جائیں اور پھر حساب کتاب کے لئے ان کو کسی دوسری زمین کی طرف منتقل کیا جائے۔ (معارف القرآن)

تفسیر مظہری میں مسند عبد ابن حمید سے حضرت عکرمہؒ کا ایک قول نقل کیا ہے جس سے اس کی تائید ہوتی ہے اس کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے کہ یہ زمین سمٹ جائے گی اور اس کے پہلو میں ایک دوسری زمین ہوگی جس پر لوگوں کو حساب کتاب کے لئے کھڑا کیا جائے گا۔

صحیح مسلم میں بروایت حضرت ثوبانؓ منقول ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک یہودی عالم آیا اور یہ سوال کیا کہ جس دن یہ زمین بدل جائے گی تو آدمی کہاں ہوں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ پل صراط کے پاس ایک اندھیری میں ہوں گے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ زمین سے بذریعہ پل صراط دوسری طرف منتقل کئے جائیں گے اور ابن جریر نے اپنی تفسیر میں متعدد صحابہ وتابعین کے یہ اقوال نقل کئے ہیں کہ اس وقت موجودہ زمین اور اس کے سب دریا آگ ہو جائیں گے گویا یہ سارا علاقہ جس میں اب دنیا آباد ہے اس وقت جہنم کا علاقہ ہو جائے گا اور حقیقت حال اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے، بندہ کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں۔

زباں تازہ کردن باقرار تو　　نینگیختن علت از کار تو

آخری آیات میں اہل جہنم کا یہ حال بتلایا گیا ہے کہ مجرم لوگوں کو ایک زنجیریں باندھ دیا جائے گا یعنی ہر جرم کے مجرم الگ الگ جمع کر کے یک جا باندھ دیئے جائیں گے اور ان کو جو لباس پہنا دیا جائے گا وہ قطران کا ہوا جس کو تارکول کہا جاتا ہے اور وہ ایک آتش گیر مادہ ہے کہ آگ فوراً پکڑ لیتا ہے۔
(معارف القرآن مفتی اعظم)

وَتَرَى الْمُجْرِمِينَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِينَ فِي
اور دیکھے تو گنہگاروں کو اس دن باہم جکڑے ہوئے
الْأَصْفَادِ ﴿٤٩﴾
زنجیروں میں

یعنی ایک نوعیت کے کئی کئی مجرم اکھٹے زنجیروں میں باندھے جائینگے۔ کما قال تعالیٰ۔ "اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ (صافات رکوع۲) وقال تعالیٰ" وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ" (تکویر رکوع۱) (تفسیر عثمانی)

سَرَابِيلُهُم مِّن قَطِرَانٍ
کرتے انکے ہیں گندھک کے

جہنمی کرتے:

جس میں آگ بہت جلد اور تیزی سے اثر کرتی ہے اور سخت بدبو ہوتی ہے پھر جیسی جہنم کی آگ ویسی ہی وہاں کی گندھک سمجھ لیجئے۔

وَتَغْشَىٰ وُجُوهَهُمُ النَّارُ ﴿٥٠﴾
اور ڈھانکے لیتی ہے انکے منہ کو آگ

چہرہ چونکہ حواس ومشاعرہ کا محل اور انسان کے ظاہری اعضاء میں سب سے اشرف عضو ہے اس لئے اس کو خصوصیت سے ذکر فرمایا جیسے دوسری جگہ تطلع علی الافئدة میں قلب کا ذکر کیا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ

تا کہ بدلہ دے اللہ ہر ایک جی کو اس کی کمائی کا بیشک اللہ جلد کرنے

سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۵۱﴾

والا ہے حساب

یعنی جس بات کا پیش آنا بالکل یقینی ہے اسے دور مت سمجھو کما قال تعالیٰ ''اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ (الانبیاء رکوع ۱) یا یہ مطلب ہے کہ جس وقت حساب ہوگا پھر دیر نہ لگے گی۔ تمام اولین وآخرین جن وانس کے ذرہ ذرہ عمل کا حساب بہت جلد ہو جائے گا۔ کیونکہ نہ خدا پر کوئی چیز مخفی ہے نہ اس کو ایک شان دوسری شان سے مشغول کرتی ہے مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ (لقمان۔ رکوع ۳)

حساب کی مدت:

سیوطیؒ نے کہا یعنی ایک سے حساب فہمی اس کو دوسرے کی حساب فہمی سے نہیں روکتی۔ (ایک ہی وقت میں سب کا حساب لے لے گا) سیوطی نے جلالین میں یہ بھی لکھا ہے کہ آدھے دن یعنی اس دنیوی دن کی نصف مدت میں سب کی حساب فہمی کر لے گا۔ اس کا ثبوت حدیث سے ملتا ہے۔ نخعی کا بیان ہے وہ لوگ (غالباً صحابہؓ) خیال کرتے تھے کہ قیامت کے دن اللہ لوگوں کے حساب سے آدھے دن کی مدت میں فارغ ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ ایک فریق جنت میں اور دوسرا فریق دوزخ میں قیلولہ کرے گا (دوپہر گزارے گا) رواہ ابونعیم وابن المبارک۔

ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ وہ صرف دوپہر تک کا وقت ہوگا پھر اولیاء اللہ (جنت کے اندر) کشادہ چشم حوروں کے ساتھ مسہریوں پر (دوپہری گزاریں گے یعنی) قیلولہ کریں گے اور اللہ کے دشمن شیطانوں کے ساتھ جکڑے ہوئے ہوں گے۔ میں کہتا ہوں، مذکورہ بالا اقوال صحابہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آدھے دن سے مراد ہے آخرت کا آدھا دن (اس سے دنیوی دن کا آدھا حصہ مراد نہیں ہے)۔

جاہلیت کے کاموں کی سزا:

مسند احمد میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں میری امت میں چار کام جاہلیت کے ہیں جوان سے نہ چھوٹیں گے، حسب پر فخر، نسب میں طعنہ زنی، ستاروں سے بارش کی طلبی، میت پر نوحہ، سنو نوحہ کرنیوالی نے اگر اپنی موت سے پہلے توبہ نہ کر لی، تو اسے قیامت کے دن گندھک کا کرتا اور کھجلی کا دوپٹہ پہنایا جائے گا۔ مسلم میں بھی یہ حدیث ہے اور روایت میں ہے کہ وہ جنت دوزخ کے درمیان کھڑی کی جائے گی۔ گندھک کا کرتا ہوگا اور منہ پر آگ کھیل رہی ہوگی۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہر ایک کو اس کے کاموں کا بدلہ دے گا، بروں کی برائیاں سامنے آ جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ بہت ہی جلد ساری مخلوق کے حساب سے فارغ ہو جائیگا۔ (تفسیر ابن کثیر)

هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ وَلِيَعْلَمُوْٓا

یہ خبر پہنچا دینی ہے لوگوں کو اور تاکہ چونک جائیں

اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّلِيَذَّكَّرَ اُولُوا

اس سے اور تاکہ جان لیں کہ معبود وہی ہے ایک ہے اور تاکہ سوچ

الْاَلْبَابِ ﴿۵۲﴾

لیں عقل والے

یعنی خواب غفلت سے بیدار ہو جائیں اور خدا سے ڈر کر اس کی آیات میں غور کریں جس سے اس کی وحدانیت کا یقین حاصل ہو اور عقل وفکر سے کام لیکر نصیحت پر کاربند ہوں۔ تم سورۃ ابراہیم علیہ السلام وللہ الحمد والمنۃ۔ (تفسیر عثمانی)

ان آیات میں اللہ نے بلاغ قرآنی کے تین فائدے بیان فرمائے تمام آسمانی کتابیں نازل ہونے کی یہی تین حکمتیں ہیں:

(۱) پیغمبروں کے ذریعہ سے لوگوں کو اللہ کی نافرمانی سے ڈرانا تاکہ اتمام حجت ہو جائے۔ (۲) انسان کی قوت فکریہ کی تکمیل۔ قوت فکریہ کا انتہائی کمال اعتراف توحید ہے۔ (۳) قوت عملیہ کی درستی جو نصیحت پذیری اور اختیار تقویٰ سے حاصل ہوتی ہے۔ (تفسیر مظہری)

بحمد اللہ

الحمد للہ گلدستہ تفاسیر کی تیسری جلد ختم ہوئی